نامہ جنوری ۲۰۰۰

قیمت ۲۰ روپے

THE HYDERABAD DECCAN
CIGARETTE FACTORY PVT LTD
HYDERABAD INDIA
STATUTORY WARNING
CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

پیش کئے جانے والے پروگرام

عمومی

نمبر	پروگرام	میڈیم
1	ڈیولپمنٹ اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی	انگریزی میڈیم
2	ڈیولپمنٹ اسٹڈیز میں ایم فل	انگریزی میڈیم
3	تاریخ میں ماسٹرس ڈگری	تلگو میڈیم
4	معاشیات میں ماسٹرس ڈگری	تلگو میڈیم
5	نظم و نسق عامہ میں ماسٹرس ڈگری	تلگو میڈیم
6	سیاسیات میں ماسٹرس ڈگری	تلگو میڈیم
7	ریاضیات میں ماسٹرس ڈگری	انگریزی میڈیم
8	آرٹس میں بیچلرس ڈگری (بی-اے)	انگریزی / تلگو / اردو میڈیم
9	کامرس میں بیچلرس ڈگری (بی-کام)	انگریزی / تلگو / اردو میڈیم
10	سائنس میں بیچلرس ڈگری (بی ایس سی)	انگریزی / تلگو / اردو میڈیم
11	غذا اور تغذیہ میں سرٹیفکیٹ پروگرام (سی پی ایف این)	تلگو اور اردو میڈیم
12	انوائرنمنٹل اسٹڈیز میں پی.جی. ڈپلوما (پی جی ڈی ای ایس)	انگریزی میڈیم

پروفیشنل

نمبر	پروگرام	میڈیم
13	لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں ماسٹرس ڈگری (ایم ایل آئی ایس سی)	انگریزی میڈیم
14	بزنس اڈمنسٹریشن میں ماسٹرس ڈگری (ایم بی اے)	انگریزی میڈیم
15	لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں بیچلرس ڈگری (بی ایل آئی ایس سی)	انگریزی میڈیم
16	پبلک ریلیشنس میں بیچلرس ڈگری (بی پی آر)	انگریزی میڈیم
17	مارکٹنگ مینجمنٹ میں پی.جی. ڈپلوما (پی جی ڈی ایم ایم)	انگریزی میڈیم
18	رائٹنگ فار ماس میڈیا میں ڈپلوما / پی.جی. ڈپلوما	تلگو میڈیم
19	بزنس فینانس میں پی جی ڈپلوما (پی جی ڈی بی ایف)	انگریزی میڈیم
20	مشروم کلٹیویشن میں سرٹیفکیٹ کورس (سی پی ایم سی)	انگریزی میڈیم
21	کمپیوٹنگ میں سرٹیفکیٹ کورسس (سی آئی سی)	انگریزی میڈیم

مزید تفصیلات کیلئے ربط پیدا کیجئے :

پبلک ریلیشنز آفیسر

پروفیسر جی رام ریڈی مارگ، روڈ نمبر 46، جوبلی ہلز، حیدر آباد-500033 (اے-پی)

دستخط

رجسٹرار

Advt. No. Dr. BRAOU/102/PR/99

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

اشاعت کا ۳۲ واں سال

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۳
شمارہ ۱

12

سالنامہ جنوری ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

سرورق : شعیب کارٹونسٹ

کمپیوٹر کتابت : SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373
طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۲۰ روپے — زرسالانہ : ۱۵۰ روپے — بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716
(رہائش) 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت انشائیے

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

(افسانہ)

(عیدی)

شیطان کی آنت (ناول)

(نثری سہرا)

(حق تو یہ ہے ۔۔۔ ترجمہ)

(تاثرات)

(ایک سنجیدہ تحریر)

چورن (منظومات)

ادار یہ)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ماہنامہ شگوفہ بیسویں صدی میں تیس سال سے زائد عرصہ تک طنز و مزاح کی صحت مند روایات کو مستحکم کرتا ہوا۔ اکیسویں
ںدی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری تین چار دہے ۱۹ویں صدی کے اواخر کی طرح سماجی اور تہذیبی اعتبار سے بڑی
ہمیت کے حامل تھے۔ اس عہد کی قدیم و جدید قدروں کے ٹکراؤ کی بازگشت عصری ادب میں صاف سنائی دیتی ہے۔ ادیب و شاعر اقدار
ں شکست و ریخت اور ٹکراؤ کے طوفان میں گھرے اپنے نقطہ نظر کو تخلیقی شان کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان
کے حالات، عالمی سطح پر کمیونزم کے زوال، مسلم ملکوں کی آویزش اور زبان اردو کے گوناگوں مسائل نے اردو کے ادیبوں کو خاص طور
سے متاثر کیا۔ تخلیق کاروں نے پیچیدہ حالات کے عکس کو احتجاج کے رنگوں سے سجایا۔ طنز اس دور کی تحریروں کے رگ و پے کا اہم
نصر رہا ہے۔ محرومیوں، ناکامیوں اور نا اتفاقیوں سے دوچار اردو کا قاری طنز سے تسکین محسوس کرنے لگا، کہ طنز کی کاٹ سے جسم کی
مد کھل جاتی ہے اور خون کے دباؤ میں کمی ہوتی ہے۔ بعض ادیبوں اور شاعروں نے طنز کی اس تلخی میں مزاح کی آمیزش کے ذریعہ
ان رلانے اور کچھ کھو کر سکون پانے کی کیفیت کو شگفتہ روپ دیا۔ جس کے نتیجہ میں آنسو خون کے ساتھ بہنے سے پہلے ہنستے ہنستے نکل
تے ہیں اور یوں انسان جذباتی اینٹھن اور دباؤ سے نجات پالیتا ہے۔

شگوفہ، آج اردو کا واحد رسالہ ہے جس نے جغرافیائی حدوں کو توڑ کر سارے طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات کو اپنے صفحات پر
یش کیا اور ایک نئے عزم کے ساتھ اکیسویں صدی کی جانب اپنے قدم بڑھا رہا ہے یہ صدی ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کی پیغامبر ہے۔
س تشکیل نو میں جہاں کہیں سماج کے قدم لڑکھڑائیں گے۔ ظلم، ناانصافی، عدم رواداری، ریشہ دوانیوں اور جبر کا دور دورہ ہوگا۔ طنز و
زاح نگار اپنی تحریروں کے ذریعہ ان کا پردہ چاک کرے گا اور شگوفہ ان تلخ و شیریں مشاہدات و تجربات پر مبنی ادبی تحریروں کو مطبوعہ
ںظ کی صورت میں پیش کر کے طنز و مزاح نگاروں کی ترجمانی کا حق ادا کرتا رہے گا۔

نئے سال، نئی صدی اور عید الفطر کی مبارکباد کے ساتھ ہم نئی صدی کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔
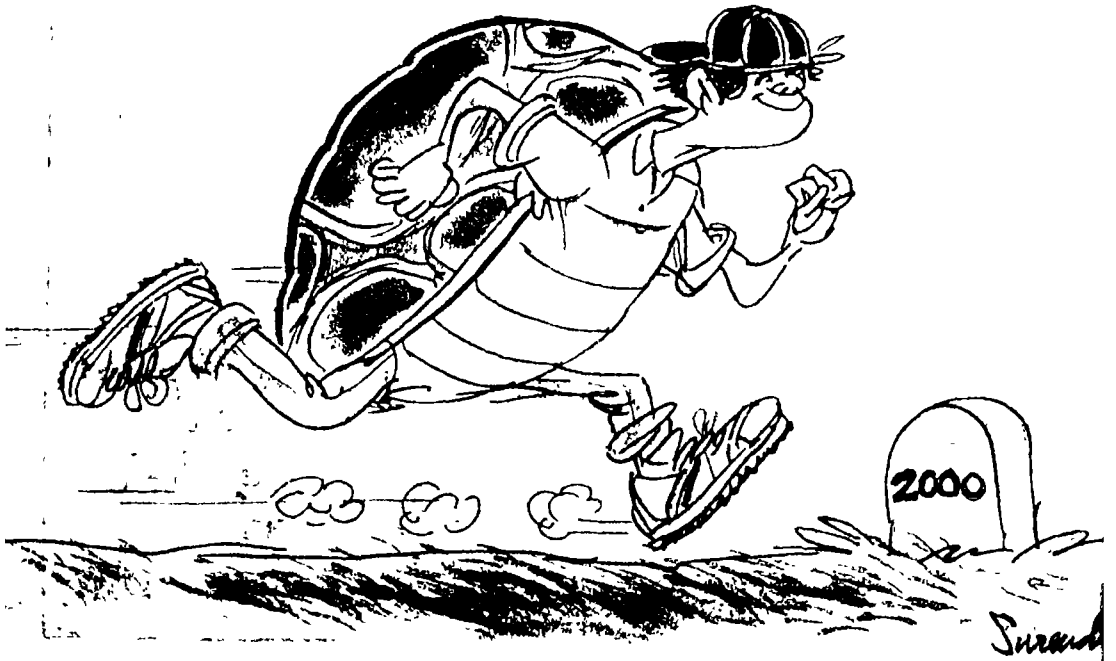
یوسف ناظم

سنہ گنے جاتے تھے اس سنہ کیلئے
۲۰۰۰ عیسوی کا استقبال

آپ کے ماننے نہ ماننے سے اب کوئی فرق واقع نہیں ہونے والا ہے۔ اکیسویں صدی جو آئی نہیں ،زبردستی لائی گئی ہے ،وہ ہمارے حساب سے ایک سیزیرین صدی ہے۔ قدرتی ولادت اس ولادت کو کہتے ہیں جس میں بخشش خداوندی کے علاوہ قوت بازو کا بھی دخل ہوتا ہے اور نومولود کو ایک پالن ہاری پالنے (INCUBATOR) میں چند دن رکھ کر پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ہم چونکہ جمہوریت اور رائے عامہ کے پرستاروں میں سے ایک ہیں اس لئے اس صدی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم تو اس مبارک و مسعود موقع پر ایک سہرا کہنے کیلئے بھی اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے لیکن اہل ادب نے ہمیں بتایا کہ سہرا صرف شادی کے موقع پر کہا جاتا ہے اور یہ کہ شادی کا مطلب صرف شادمانی نہیں بلکہ اس تقریب میں دو نفوس یعنی نوشہ اور عروس کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس توجہ کے بعد ہم نے سہرے کی تصنیف کا کام کسی اچھے موقع کے لئے ملتوی کر دیا۔

یہ ایک اتفاق ہے کہ اکیسویں صدی کا نیا سال "یوم ہزارہ" سے شروع ہوا ہے۔ (یوم ہزارہ ہماری دوسری غلطی ہے جو پہلی غلطی کی تصحیح کیلئے ضروری تھی) ہم اس وقت صرف سال نو کے بارے میں اپنے خیالات پیش کریں گے۔ اس سال نو کی آمد کی خوشی سب سے زیادہ چاند پر منائی گئی۔ وہاں فی الحال انسانوں کی آبادی نہیں لیکن خوشی اور غمی ایسی کیفیتیں ہیں جن کیلئے انسانوں کی موجودگی ضروری نہیں ہے۔ اسی لئے بعض دن بے حد اداس ہوتے ہیں اور بالکل مفلسی کا چراغ دکھائی دیتے ہیں اور بعض دن اتنے روشن اور اتنے خوش گوار ہوتے ہیں کہ زمین پر سانس لینے والی ہر مخلوق کے دل میں ولولے ہی ولولے جوش مارنے لگتے ہیں اور ننھی سی جان والی چیونٹیاں بھی ہاتھیوں سے دو بدو جنگ اور زور آزمائی کے لیے مچلنے لگتی ہیں۔ اس سال نو کی آمد آمد پر بھی یہی کیفیت تھی اور کہا جاتا ہے کہ چاند اس خوشی میں پھولے نہیں سما سکا۔ ۱۳۲ سال کی طویل مدت میں اتنا ضخیم چاند کبھی نمودار نہیں ہوا۔ اس کی ضخامت ، کشادگیٔ دل کا باعث تھی۔ یہ چاند کی فراخ دلی کا پہلا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے بھی ممکن ہے چاند نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت کبھی دیا ہو لیکن اس وقت ایسے واقعات کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ کرہ ارض پر گنیز ریکارڈس آفس کا قیام دیر سے عمل میں آیا اور چاند کے معاملات اس آفس کے دائرہ عمل میں لائے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ۲۲ ڈسمبر ۱۹۹۹ عیسوی کا چاند ، روایتی چاندوں کے مقابلے میں زیادہ روشن بھی تھا۔ یہ صحیح معنوں میں چشم ماروشن ، دل ماشاد کی کی فرض دغایت کے ساتھ تادیر چمکتا رہا۔ یہ شب بھی تو چودھویں کی شب تھی۔ اس رات مفلسوں کی بھی عید ہوگئی۔ اتنی بڑی روٹی اس سے پہلے انھوں نے دیکھی نہیں تھی۔ دیکھنا تو ایک طرف رہا انھوں نے سوچا تک نہیں تھا کہ روٹی اتنی بڑی بھی ہوسکتی ہے۔ اسے دیکھ لینے سے جو مسرت انھیں حاصل ہوئی ، اس کی وجہ سے وہ روٹی نہ ملنے کی حسرت بالکل بھول گئے۔ قناعت صرف غریبوں کے دل میں جاگزیں ہو کر رہ گئی ہے۔ قناعت کو بغاوت بننے میں کئی ہزارے "خرچ" ہوجاتے ہیں۔ عوام الناس بہر حال دل ہی دل میں سوچ رہے ہیں کہ نیا سال بھی چاند کی طرح روشن اور آبدار ہوگا۔ "آب دار" کا

مطلب اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پینے کے پانی کی قلت دور ہوجائے گی۔ یہ خوش فہمی ہے۔ پانی کے چشموں کے لئے تھوڑی سی زمین اور درکار ہے۔ اگر زمین پر خون کی ندیاں رواں دواں رہیں تو پانی کے چشمے اگر پیدا ہو بھی گئے تو ان کے بہنے کے لئے جگہ کہاں سے آئے گی۔ آب زم زم کے نمونے کے چشمے تو پیدا ہونے سے رہے۔ اس کے لیے ایڑیاں رگڑنی پڑتی ہیں۔

۲۲ دسمبر کے چاند کو دیکھ کر ہمارے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش نے انگڑائی لی۔ انگڑائی لینا ایک شاعرانہ ترکیب ہے۔ اس سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ ایک خواہش پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے بھی ان گنت چودھویں کے چاند ہمارے مطالعے میں آئے ہیں اور اکثر دیکھے دوستوں پر ہم نے اپنے نادیدہ عزیز دوست ابن انشا کو یاد بھی کیا ہے جنھوں نے کہا تھا کہ

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا تیرا

لیکن اس چاند کے نظارے سے ہمارے دل میں یہ تمنا جاگی کہ آنے والے سال میں ہمارے ملک کے نسوانی چہروں میں زیادہ نہیں کم سے کم ۲۲ فیصد چہرے ایسے تابدار اور روشن پیدا ہوں جو سنہ ۲۰۰۰ کے ہونے والے مقابلہ حسن میں حصہ لینے کے لیے منتخب کئے جاسکیں۔ قسمت مہربان رہی تو اگلے سال بھی حسینہ عالم کا تاج ہمارے ہی حصے میں آئے گا۔ اولمپک کھیلوں میں جو چاہے ہو، ہمیں اس کی زیادہ فکر نہیں ہے۔

توقع یہ کی جارہی ہے کہ ۲۰۰۰ عیسوی میں ہماری معیشت بھی ۲۲ دسمبر ۹۹ کے چاند کی طرح چمکدار ہوگی اور اس خوشی میں ہم ایک قرطاس ابیض نہیں بلکہ قرطاس سیمیں شائع کریں گے۔ یہ کاغذ سیم خام سے تیار کیا جائے گا، جو ہر قسم کی خام خیالی سے مبرا ہوگا۔ ہماری معیشت نے پچھلے چند برسوں میں خاص ترقی کی ہے۔ تھوڑا بہت روپیہ ادھر ادھر ضرور ضائع ہوا ہے اور چند بڑے لوگوں کے ذمے سرکاری [illegible] سے بھی زیادہ حقیر رقمیں ہیں جن کی وصولی یا عدم وصولی سے ہماری معیشت متاثر نہیں ہوسکتی۔ [illegible] انحصار ان قرضوں پر ہے جو ہم برسوں سے خوشدلی کے ساتھ قبول کرتے رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ آنے والے سال میں بھی یہ درآمدات برقرار رہیں گی اور جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے امدادی رقومات میں ہمارے بڑے لوگوں کی نجی ضروریات کے مطابق اضافہ ہوتا رہے گا۔ لوگوں کو یہ بھی توقع ہے کہ صحرائے نجد کے مجنوں کے جواب میں ہمارے یہاں بھی بیسیوں مجنوں مزید پیدا ہوں گے۔ یہ مجنوں مذہبی جنون کے مجنوں ہونگے اور سب پیچھے کی طرف بھاگنے کے ماہرین ہونگے۔ ان میں اگر کوئی لیلی ہوئی بھی تو وہ "ڈوپٹہ اوڑھ کر اٹھا" ان سے دور بھاگے گی۔ ہمارا ملک چونکہ چھاپے خانوں کا ملک ہے، اس لئے ماہ بماہ جگہ جگہ چھاپے بھی پڑتے رہیں گے۔ اگر سرکاری چھاپے ہوئے تو ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور اگر کچھ ہاتھ آیا تو دوسرے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہوگی۔ ملک میں آسان روپئے Easy Money کی فراوانی ہوگی اس کیلئے چاقو کی نوک استعمال میں لائی جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں رہائشی عمارتیں بھی کھڑی کی جائیں گی لیکن عوام کی رہائش بالعموم فٹ پاتھ پر ہوگی جس کیلئے لاتعداد وسیع اور طویل فٹ پاتھ تعمیر ہونگے۔ فلائی اوور پل بھی بنائیں جائیں گے۔ جو بس بنتے رہیں گے اور ان پر صرف کی جانے والی دولت "خوان نعما" پر رکھ دی جائے گی۔ جو ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالے گا وہی اس کا حق دار ہوگا ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو فقط منہ تکتے رہ جائیں۔ یہ لوگ ووٹ دینے کے کام آئیں گے۔ کسی نجومی نے کہا ہے کہ نیا سال انتخابات کیلئے بہترین سال ہوگا۔ ان انتخابات میں ہر وہ امیدوار جو حساب کتاب کا ماہر ہو کسی ایک حلقے سے نہیں کم سے کم دو حلقوں سے امیدواری کریگا اور چونکہ وہ حساب کتاب کا ماہر ہوگا اس لئے دونوں حلقوں سے کامیاب ہوکر اسمبلی یا پارلیمان میں جائے گا۔ روپئے کی گردش کا سلسلہ برقرار رکھنے کی غرض سے یہ امیدوار اپنے ایک حلقہ میں ایک اور

الیکشن کروائے گا۔ اچھی، مضبوط اور مستحکم معیشت کے لیے بار بار انتخابات ضروری ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ کسی بیرونی ملک (غالباً آسٹریلیا) میں الیکشن میں کامیاب ہونے والے ایک امیدوار نے یہ چاہا کہ وہ پارلیمنٹ کی ممبری سے دستبردار ہوکر خود کوئی کاروبار کرے۔ ان سے کہا گیا وہ ضرور دست بردار ہوں لیکن ان کی دستبرداری کی وجہ سے از سر نو الیکشن پر جو رقم خرچ ہوگی وہ اپنی گرہ سے ادا کرنی ہوگی۔ موصوف اس طرح مصرعے پر گرہ لگانے سے قاصر رہے۔ ہمارے یہاں ایسا کوئی قانون نافذ کرنا شخصی آزادی جیسی مقدس و متبرک چیز کی بے حرمتی سمجھا جاتا ہے، اس لئے جو بھی منتخب امیدوار استعفیٰ دیتا ہے اسے خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیا جاتا ہے۔ یہ خوش دلی ہماری دیرینہ روایت ہے۔ کسی منتخب امیدوار پر جرمانہ عائد کرنے کی بات ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور اس کے مستعفی ہونے سے ایک الیکشن برپا ہونے کے علاوہ اور کیا ہوگا۔ سیلاب تو آنے سے رہا، ابھی تو آیا تھا۔ سرکار سے جو ہوسکا وہ بخیر و خوبی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئی۔

ہر نیا سال ہم کسی نہ کسی موزوں شخصیت یا برادری کے نام سے موسوم کرتے رہے ہیں۔ اسے سالانہ انتساب کہا جاتا ہے۔ انتساب نویسی کی ہم تقریب تو نہیں مناتے حالانکہ "رسم اجراء" کے نمونے پر انتسابی تقریب بھی منائی جاسکتی ہے۔ اس نکتہ پر بعد میں سونچا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو یہ طے کرنا ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ عیسوی کا انتساب کس کے نام کیا جائے۔ عورتوں کا، بچوں کا، بوڑھوں کا ان سب کا سال منایا جاچکا ہے اور یہ سب لوگ اپنے اپنے نام کے سال میں بے حد مستفید ہوئے اور بے حد خوش و خرم رہے۔ ہم انتساب کا تجربہ کرنے کے بعد اس بات کے قائل ہوگئے ہیں کہ لوگوں کو سکھ پہنچانے کا بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیا سال کسی ایک برادری کے نام لکھ دیا جائے۔ اس میں روپیہ پیسہ تو دور کی بات رہی ہلدی پھٹکری بھی نہیں لگتی۔ ہم اس سلسلہ کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ مفاد عامہ کا یہی تقاضہ ہے۔

اتفاق سے سنہ ۲۰۰۰ عیسوی بہت اہم سال ہے۔ یہ ایک نئی اور ہوشربا صدی کا پہلا سال ہے۔ اس کا انتساب کرتے وقت بہت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کسی ایک برادری یا قبیلے کے نام انتساب کرنے سے ظاہر ہے دوسرے کئی قبیلوں اور برادریوں کی دل شکنی ہوتی ہے لیکن کیا کیا جائے، انتساب نہایت مخصوص اور محدود چیز ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ اس کی نوعیت ایک تبرک کی سی ہے۔ ایسا تبرک جو عام طور پر بانٹا نہ جاسکے۔ اس کی مثال اس ادبی ایوارڈ کی سی ہے جو کوئی اکیڈیمی یا ادارہ ہر سال کسی ایک شخص کو خوش کرنے اور بیسوں کو ناراض کرنے کیلئے دیتا ہے اور لوگ اسے حاصل کرنے کیلئے صرف اپنے دل میں خواہش نہیں کرتے بلکہ علی الاعلان اس کے لئے کوشاں اور سرگرداں ہوتے ہیں۔ (ممکن ہے یہ بھی ہمارا تجربہ ہو۔ نہ بھی ہو تو آپ کا قیاس ہوگا یہی) موجودہ حالات میں ایسا کون شخص ہے جو کسی نہ کسی کی نظر میں مشتبہ نہ ہو۔ خواتین تو بالعموم بدظن رہتی ہی ہیں، مرد بھی کچھ کم بدگمانی نہیں فرماتے۔ پڑوسی دزدیدہ نگاہوں سے پڑوسیوں کی نگرانی کرتے ہیں اور خود بھی زیر نگرانی رہتے ہیں۔ اس مسئلہ کی تھاہ پانے کی ہمت مردانہ کسی میں ہے نہ ہمت زنانہ، اس لئے ہم صرف ایک انتساب نامہ لکھنے کی کوشش کریں گے۔

پچھلے انتسابات میں ہمیں چند انتسابات خاص طور پر پسند آئے تھے۔ ان میں ایک سال عورتوں کے نام لکھا گیا تھا تو دوسرا سال بچوں کے لیے۔ ایک سال کا انتساب (بطور ہمدردی) بوڑھوں کے نام کیا گیا تھا اور اس سال ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کی عمر رفتہ اسے بہتیر آواز دیئے لوٹ آئی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ نہ تو کہیں کوئی غزل چھیڑی گئی اور نہ کسی نے ساز کی فرمائش کی۔ لیکن اس انتساب کی خوبی اور کشش تھی کہ بوڑھوں کی عمر رفتہ دوڑی دوڑی "غالبان خستہ" کے گھر پہنچ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ہندوستانی سال کے احترام میں مغربی ملکوں نے کئی گولیاں ایجاد کیں۔ (یہ الگ قصہ ہے۔ حکایت لذیذ ہے لیکن ہمارے پاس اسے بیان کا وقت ہے نہ فی الوقت اس

لی ضرورت)۔

۲۰۰۰ء کے سال نو کے لیے ہم سوچتے ہیں کہ کیوں نہ اسے "سالوں کا سال" کہا جائے بعد اس نام کی تشریح عوام کے صوابدید پر چھوڑ دی جائے ۔ ساری خدائی ایک طرف ہوجائے گی لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس سال کی تنی تنقید کسی سے ممکن نہ ہوگی۔ سال نو کے انتساب کے فرض سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں اکیسویں صدی کے انتساب کا بھی اہم فریضہ انجام دینا ہی چاہئے ۔ یہ صدی اس لئے اہم ہے کہ دو ہزار سالہ کی پہلی صدی ہے ۔ اسے ہم داداؤں کی صدی کہنا پسند کریں گے ۔ یہ انتساب بین الاقوامی سطح پر قبول کیا جانا چاہئے کیونکہ داداؤں کی تعداد دوسرے ملکوں اور مملکتوں میں نسبتاً زیادہ ہے ۔ داداؤں کی پیدائش اور پرورش یوں بھی ان ملکوں میں زیادہ تیزی اور توجہ سے ہوتی ہے جو طاقتور ملک کہلاتے ہیں۔ پدی اور پدی کے شوربے والے ملکوں میں بھی دادا ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ صرف اپنے اپنے دائرے میں اور میونسپل حدود میں اپنے جوہر دکھا سکتے ہیں۔ اولمپک داداؤں کی فصل اور نسل اس سرزمین پر نہیں ہوتی۔ اس بیان میں قدرے انکسار کا بھی پہلو شامل ہے ورنہ ہم "دل ناتواں" نہیں ہیں اور مقابلے کی تمنا دل میں اور اس کا سودا سر میں رکھتے ہیں ۔ ☆

۲۰۰۰ء کا استقبال ہم اس مصرعے سے کرتے ہیں"

سن گنے جاتے تھے اس سنہ کے لئے

"ہوئے ہم دوست جس کے"
مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا نیا مجموعہ

نئی دہلی: مزاح نگار و خاکہ نگار مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا نیا مجموعہ "ہوئے ہم دوست جس کے" تخلیق کار پبلشرز ۔ دہلی کے زیر اہتمام جناب انیس امروہوی نے شائع کیا ہے ۔ اس سے قبل مجتبیٰ حسین کے شخصی خاکوں کے تین مجموعے آدمی نامہ ، سو ہے وہ بھی آدمی اور چہرہ در چہرہ شائع ہو چکے ہیں۔ جنہیں ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے ۔

"ہوئے ہم دوست جس کے" میں (۱۷) ادبی شخصیات جناب راج بہادر گوڑ، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، وحید اختر، پروفیسر شکیل الرحمن، پروفیسر قمر رئیس، قتیل شفائی، پروفیسر رشید الدین خاں، ابراہیم شفیق، عوض سعید، ف۔ س۔ اعجاز، سیدہ شانِ معراج، استاد محمود مرزا، رشید قریشی، دیوکی نندن پانڈے، علی باقر اور وہاب عندلیب کے خاکے شامل ہیں۔ یہ کتاب دکنی زبان کے منفرد شاعر حمایت اللہ کے نام معنون ہے ۔ (۱۴۰) صفحات پر مشتمل اس دیدہ زیب کتاب کی قیمت صرف (۸۰) روپئے ہے اور اسے تخلیق کار پبلشرز ۔104/B۔ یاور منزل ۔ آئی بلاک ، لکشمی نگر ، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲ سے حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ ☆

مجتبیٰ حسین
نئی دہلی

حسن کی جلوہ سامانیاں

ہمارا ملک کسی اور معاملہ میں ترقی کرے یا نہ کرے حسن کے معاملہ میں ضرور ترقی کرتا جارہا ہے ۔ چنانچہ پچھلے پانچ چھ برسوں میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ پوری چار ہندوستانی حسینائیں حسن کے عالمی مقابلوں میں اول آچکی ہیں ۔ سشمیتا سین ، ایشوریہ رائے اور ڈیانا ہیڈن کے بعد اب یکتا مکھی نے حسینۂ عالم کا خطاب جیت لیا ہے ۔ ساری دنیا میں ہندوستان کے حسن جہاں سوز کا ڈنکا بج رہا ہے ۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک امریکی دوست ہندوستان آئے تو ہم نے ان کے لئے تاریخی مقامات جیسے لال قلعہ ، قطب مینار ، جامع مسجد اور راشٹرپتی بھون وغیرہ کی سیر کا پروگرام بنایا ۔ دوسرے دن جب ہم نے ان کے یہاں چلنے کے لئے کہا تو بولے " بھیا ! میں یہاں ان کھنڈرات کو دیکھنے تھوڑا ہی آیا ہوں ۔ میں نے روم اور لندن میں بہت سے کھنڈرات دیکھ رکھے ہیں ۔ انہیں دیکھ کر کیا کروں گا ۔ میں تو یہاں ہندوستان کے حسن کو دیکھنے آیا ہوں ۔ جس کا چرچا ان دنوں ساری دنیا میں ہورہا ہے " ۔ اس پر ہم نے دست بستہ عرض کی " حضور ! اس معاملہ میں آپ ہمیں بھی کھنڈر ہی سمجھئے ۔ مانا کہ ایک زمانہ میں ہم بھی حسن کے بہت دلدادہ اور پرستار تھے ۔ کئی حسیناؤں سے ہماری بھی راہ و رسم تھی ۔ ہم نے زندگی بھر کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کا بیڑہ تو نہیں اٹھایا البتہ حسینوں کے ناز اٹھانے کا بڑا لمبا تجربہ رکھتے ہیں ۔ اگر حسیناؤں کے ناز اٹھانے کا کوئی عالمی مقابلہ منعقد ہو تو بلاشبہ اس انعام کے ہم ہی مستحق قرار پائیں گے ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حسن اور عشق کا جب بھی موازنہ ہوتا ہے تو ترازو کا پلڑا ہمیشہ حسن کی جانب ہی جھک جاتا ہے اور یوں عشق کی رسوائی کے سامان فراہم ہوجاتے ہیں ۔ یادش بخیر ! ماضی کی حسیناؤں نے اپنے عشوہ و غمزہ و ادا کے ذریعہ ہمارے دل میں عشق کے جو طوفان برپا کئے تھے ان طوفانوں کی شدت کو ناپنے کی آج تک کسی کو توفیق عطاء نہیں ہوئی ۔ ماضی بعید میں حسیناؤں نے ہمارے دل پر جو گھاؤ لگائے ہیں وہ اب تک مندمل نہیں ہوپائے ہیں اور دو ایک زخموں سے تو اب بھی لہو رستا رہتا ہے ۔ اب تو سینہ کے ان داغوں کو لے کر ہی ہم لاٹھی ٹیکتے ہوئے اس دنیا سے جائیں گے ۔ عشق صادق پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا احساس حسن بے پرواہ کو کہاں ہوتا ہے ۔ حسن نے ہمارے دل کے گھاؤ نہ دیکھے تو نہ سہی لیکن دنیا نے کب ہم سے ان کا حال پوچھا ۔ دل کے پھپھولوں پر کس نے پھایا رکھا ۔ مانا کہ میاں مجنوں میاں فرہاد اور میاں رومیو نے عشق کے میدان میں بڑا نام کمایا ہے لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کیوں کہ اس زمانہ میں نام کمانا بہت آسان تھا ۔ گریباں چاک کرکے صحرا میں نکل جانے ، سر پر صحرا کی ریت ڈالنے ، جوئے شیر لانے کے ارادہ سے دس بارہ روپئے کا تیشہ لے کر پہاڑ کی طرف نکل جانے اور بہکی بہکی باتیں کرنے کے سوائے عاشق صادق کو کرنا بھی کیا پڑتا تھا ۔ حسن کو آئسکریم تو نہیں کھلانی پڑتی تھی ۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دعوتوں کا اہتمام تو نہیں کرنا پڑتا تھا ۔ سنیما کی ٹکٹیں تو بک نہیں کرانی پڑتی تھیں ۔ حسیناؤں کے جنم دن پر اچھے اچھے قیمتی تحفے تو نہیں دینے پڑتے تھے اور وہ بھی بیروزگاری کے دنوں میں ۔ آپ اب ہندوستان میں حسن کا دیدار کرنے آئے ہیں تو ہم ان حسیناؤں کو ان کی اصلی حالت میں ، جیسی کہ وہ چالیس برس پہلے تھیں ، کیسے دکھائیں اور اب ہم حسن کو دیکھنے کی وہ نظر بھی کہاں سے لائیں جو چالیس برس پہلے تک ہماری آنکھوں میں تھی ۔ آپ نے یہاں آنے میں بڑی دیر کردی ۔ اس زمانہ میں آتے تو ہم آپ کو بتاتے کہ حسن کی رعنائیاں ، جلوہ سامانیاں ، عشوہ طرازیاں ، کرشمہ سازیاں اور بلاخیزیاں کس کو کہتے ہیں ، حسن کی وہ ملکائیں جو کسی زمانہ میں ہمارے دل پر حکمرانی کیا کرتی تھیں ۔ اب طاق نسیاں ہوچکی ہیں ۔ اب چراغ رخ زیبا لے کر ڈھونڈو

بھی تو نہیں ملتیں"۔

ہمارے امریکی دوست نے کہا "نعوذ باللہ ، میں کیوں بھلا آپ کی ان شخصی حسیناؤں کو دیکھنے کی کوشش کروں جن میں سے اکثر کی صورتیں بھی اب شاید لالہ و گل میں نمایاں ہو چکی ہونگیں۔ میں تو تازہ بہ تازہ،نو بہ نو ہندوستانی حسن کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

ہم نے کہا "بھیا! اب ہندوستان میں ہندوستانی حسن کیا دیکھنے کو ملتا ہے۔سب پر مغرب کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ چھاپ کا مطلب یہ کہ بالکل عریاں حسن دکھائی دیتا ہے۔ جسے آپ حسن کہتے ہیں وہ اتنا خالص ہوتا ہے کہ اس کے بدن پر لباس برہنگی کے سوائے کوئی اور لباس نہیں ہوتا۔ آپ کو وہ ہندوستانی حسن اب کہاں دیکھنے کو ملے گا جو اگرچہ سات پردوں میں ملفوف ہوتا تھا مگر پھر بھی اس کی ساری کی ساری رعنائیاں ہویدا ہوجاتی تھیں۔ دور کیوں جائیے ہمارے عالم شباب میں ہمارے گھر کے سامنے سے دو آنکھیں برقعہ میں سے دنیا کو دیکھتی ہوئی گزرا کرتی تھیں۔ ایسی آنکھیں ہم نے آج تک کسی حسینہ عالم کے چہرہ پر نہیں دیکھیں۔ سبحان اللہ کیا آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں ہمیں وہ ہونٹ بھی دکھائی دیتے تھے جو کچھ بولنا چاہتے تھے ، وہ کان بھی نظر آتے تھے جو کچھ سننا چاہتے تھے ، وہ دل گداز بھی دکھائی دیتا تھا جو برقعہ میں دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ ہنسی بھی دکھائی دیتی تھی جو اس کے ملفوف بدن کے روم روم میں ٹھاٹھیں مار رہی ہوتی تھی۔ حسن کے موجودہ بین الاقوامی مقابلوں کے ججوں کو ایسی آنکھیں کہاں دیکھنے کو ملی ہونگی۔ حسن کی پوشیدگی حسن کو جتنا اجاگر کرتی ہے اتنا برہنگی نہیں کرتی"۔

ہمارے امریکی دوست نے کہا "بھیا! تم اپنی موجودہ مجبوریوں ، محرومیوں اور کوتاہیوں کی مدد سے ایک خوبصورت عقیدہ بنالینے کا ہنر خوب جانتے ہو۔ میں ہندوستان اس لئے نہیں آیا ہوں کہ حسن پوشیدہ کو ڈھونڈتا پھروں۔ جو حسن میرے سامنے عیاں بلکہ عریاں ہے اسے دیکھنا چاہتا ہوں"۔

غرض ہمارے امریکی دوست چار دن دلی میں رہے۔ کوئی تاریخی عمارت نہیں دیکھی۔ البتہ سارا سارا دن کناٹ پلیس میں حسن کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ انہیں کتنا حسن ملا یہ ہم نہیں جانتے۔

حسن کے عالمی مقابلوں کے بارے میں اب ہم کیا عرض کریں۔ حسن کو بازار کے مال کی طرح سب کے سامنے سجانا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ یکتا مکھی حسینہ عالم بن گئیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن اگر ہم خدانخواستہ اس عالمی مقابلہ کے جج ہوتے اور ہمیں ہر حسینہ سے تخلیہ میں ملنے کا موقعہ عطا کیا جاتا تو یقین مانئیے ان میں سے ہر ایک کے سر پر اپنے مبارک ہاتھوں سے حسینہ عالم کا تاج رکھتے اور باقی حسیناؤں کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتے۔ مقابلہ حسن کے جج کو ہماری طرح فراخ دل ہونا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن کے ہمارے معیار کے مطابق بیچاری مس وینی زولا، جو دوسرے نمبر پر آئیں ، اول نمبر پر آنے کی مستحق تھیں۔ یوں بھی حب الوطنی اور مقابلہ حسن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حسینہ عالم کے انتخاب کے لئے کیا معیار رکھا جاتا ہے۔ ان مقابلوں کے ججوں نے اردو شاعری تو نہیں پڑھی ہوگی اگر پڑھ لیتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ہماری شاعری میں حسن کا جو معیار مقرر کیا گیا ہے اس پر ان کی کوئی بھی حسینہ عالم پوری نہیں اترتی۔ دور کیوں جائیے ہماری شاعری میں جب حسینہ انگڑائی ہی لیتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے آسمان پر قوس و قزح سی تن گئی ہے۔ افسوس کہ انگریزی زبان میں انگڑائی کے لئے مناسب لفظ تک موجود نہیں ہے۔ پھر اردو شاعری کے معشوق کی کمر تو ازار بند بنانے والی کمپنیوں کے لئے ایک مستقل دھمکی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ حسینان عالم چاہے کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں اردو شاعروں کے چونچلوں کی تاب نہیں لاسکتیں۔ سنا ہے کہ مقابلہ حسن میں حسیناؤں کی ذہانت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بیہودہ شرط ہے جس کی بناء پر ہم ساری حسینان عالم کو یکسر مسترد کرسکتے ہیں۔

بھلا سوچئیے آج تک کہیں آگ اور پانی اور حسن اور ذہانت کا کبھی ملاپ ہوا ہے۔ حسینہ جتنی غبی اور کند ذہن ہوگی اس کا حسن اتنا ہی بے مثال اور لاجواب ہوگا۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ حسن کے عالمی مقابلوں میں ہندوستانی حسیناؤں کی پے در پے جیت کا ایک بنیادی سبب ان کا حسن نہیں بلکہ ان کی انگریزی دانی ہے۔ چونکہ حسن کے عالمی مقابلوں میں بنیادی طور پر انگریزی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے جو حسینہ انگریزی میں تبادلہ خیال کرتی ہے اسے "خوش خلقی" کے پانچ نمبر تو یونہی مل جاتے ہیں۔ اٹلی، اسپین، لاطینی، امریکہ، مشرق بعید اور مشرق وسطی کی حسینائیں چونکہ انگریزی نہیں جانتیں اس لئے پیچھے رہ جاتی ہیں اور ہماری کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہندوستانی لڑکیاں ان سے آگے کو نکل جاتی ہیں۔

چاہے کچھ بھی ہو حسن کے عالمی مقابلوں کے ذریعہ اب حسن کو بھی ایک کاروبار اور ایک پیشہ کی حیثیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ ایک ادارہ جب ایک حسینہ عالم کو منتخب کرنے پر لاکھوں روپیہ خرچ کرکے حسن کو منڈی لے جائے گا تو وہ اس رقم کو واپس بھی حاصل کرے گا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ بیشتر حسینان عالم بعد میں ٹوتھ پیسٹوں، صابنوں، عطریات اور آرائش جمال کی اشیاء کو فروخت کرنے میں مصروف ہوجاتی ہیں اور ان اشیاء کے اشتہارات میں ہر طرح کے پوز میں نظر آجاتی ہیں اور وہ بھی ایک خاص عرصہ تک ہی ان کے دیدار ہوسکتے ہیں کیونکہ حسن ایک ناپائیدار چیز ہے۔ حسن کی آج جو جلوہ سامانی ہوتی ہے وہ ایک عرصہ بعد بے سرو سامانی میں تبدیل ہوجاتی ہے جو لوگ ہندوستان میں حسن کے کاروبار کو آئے دن فروغ دیتے جارہے ہیں انہیں ہم ایک خطرہ سے بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک کی جو معاشی حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ اگر کل کو حکومت حسن پر بھی ٹیکس لگادے تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑجائیں۔ لہذا حسن کو حسن ہی رہنے دیں اور اسے کاروبار نہ بننے دیں۔ اس میں حسن کی بھلائی ہے۔ ☆

طرحی غزل

طالب خوندمیری
حیدرآباد

میں نے جب عہدِ وفا کے لئے اصرار کیا
دو منٹ بعد ہی اس شوخ نے انکار کیا

شدتِ عشق کا اس طرح سے اظہار کیا
ان کو " ای میل " کیا، فیکس کیا، تار کیا

ایک اسپیڈ بریکر تھا گلی میں ان کی
اپنے دشمن کو پٹسخ کر اسے ہموار کیا

اپنا سگریٹ جلانے کو جو مانگی ماچس
یار نے میری طرف شعلۂ رخسار کیا

تیز بارش میں انھیں چھت پہ بلایا لیکن
خود بھی بیمار پڑے ان کو بھی بیمار کیا

ڈر سے بجلی کے وہ دوڑے تھے لپٹنے مجھ سے
ہائے اس وقت ہی، کیوں فون نے بیدار کیا

دو کا ہندسہ ہی کہاں کم تھا مگر آپ نے شیخ
دو کو پھر تین کیا، تین کو پھر چار کیا

آپ نے روزہ نہ رکھا تو کوئی بات نہیں
کم سے کم پورا رمضان تو افطار کیا

ذہن میں تھا جو " خیالوں کا سمندر " طالبؔ
ناؤ میں بیٹھ کے کاغذ کی، اسے پار کیا

☆●☆

قطعات

(۱)

کیا ذرا سا غور سے دیکھا تمھیں،
مجھ سے لڑنے اس طرح کیوں اڑ گئیں ؟
سچ بتاؤ آئینہ ہے سامنے،
اس میں اتنی جھرّیاں کیوں پڑ گئیں

(۲)

آسائشیں نصیب ہوئی ہیں تو دیکھئے
وہ سورما بھی جیتے ہیں اب کس ادا کے ساتھ
کل تک جو زور آزما، طوفاں کے ساتھ تھے
پنجہ لڑا رہے ہیں وہ " دستِ صبا " کے ساتھ

(۳)

مرا دل جس پہ اپنے پیار کی برسات کرتا ہے
وہی، سب ناروا برتاؤ میرے ساتھ کرتا ہے
محبت تو جھڑکتا ہے وہ سب کے سامنے، لیکن
اکیلے میں ملیں تو فلسفہ پر بات کرتا ہے

(۴)

وہ ہمیشہ کھنکتے سکوں پر
جان و دل سے نثار ہوتی ہے
صرف جیبوں پہ ہے نظر اس کی
" بھیک " سرمایہ دار ہوتی ہے

●☆●

فیاض احمد فیضی
702 - Daulat Complex,
Pathe Bapu Rao Marg,
MUMBAI - 400008.

ہیلو موبائیل نمبر 786

"ابو، موبائیل فون استعمال کرنے والوں کا چہرہ کیوں بگڑ جاتا ہے ؟ "۔ ہمارے چھوٹے صاحبزادے نے ایک دن ہم سے اچانک یہ سوال پوچھ لیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں ہمارا ننھا سا موبائیل فون اپنے قد سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔

ہمیں یہ سوال سن کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ حیرت اس لئے کہ ہم نے اپنے گھر میں کئی آئینے لگا رکھے ہیں۔ چھوٹے، بڑے اور درمیانہ سائز کے بھی، تاکہ جب کبھی ہمارا چہرہ بگڑنے لگے ہمیں فوراً پتہ چل جائے۔ متوسط طبقے کے آدمی کو ان آئینوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے ورنہ غریب آدمی کو اپنی دیواروں کے اکھڑے ہوئے پلستر سے اور امیر آدمی کو ان ہی دیواروں کے اندر چھپائی ہوئی دولت سے اپنی حالت کا اندازہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ متوسط طبقے کے جن لوگوں کے گھر میں آئینہ نہیں ہوتا وہ اپنی بیوی کے چہرے پر اپنی بگڑتی ہوئی زندگی کی کہانی پڑھ لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے بچے کے سوال کو سن کر افسوس یوں ہوا کہ ہم نے اتنے سارے بگڑے ہوئے بلکہ خوفناک چہروں کے ہاتھ میں موبائیل دیکھنے کے باوجود موبائیل کیوں خرید لیا۔ یہ سوال سن کر ہمیں موبائیل سے اپنی محبت کے انجام پر رونا آرہا تھا۔ مگر اس محبت کا آغاز بھی کہاں رومان انگیز تھا!

چار یا پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ موبائیل فون نے ہمارے ملک میں نیا نیا قدم ہی رکھا تھا اور ابھی اسے سونیا گاندھی کی طرح ہندوستانی شہریت لینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس زمانے میں موبائیل سیٹ کے دام ہماری ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر تھے اور موبائیل پر گفتگو کرنا اتنا مہنگا تھا کہ ایک منٹ کی گفتگو کا اتنا بل بن جاتا تھا کہ اس سے دو غریب آدمیوں کو پیٹ بھر کھانا کھلایا جاسکتا تھا۔ اس طرح ہماری اگلے مہینے کی تنخواہ بھی اس کی نذر ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ ان دنوں ہم موبائیل لے کر اترانے والوں پر حسرت بھری نظریں ڈالنے کے بعد اپنے چہرے کے تاثرات کو استہزائیہ مسکراہٹ سے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ یادش بخیر، اس زمانے میں ہم پاکستانی کرکٹ ٹیم کی فتح پر پٹاخے تو نہیں چھوڑتے تھے لیکن دور درشن کے بور پروگراموں پر پاک ٹی وی کو ضرور ترجیح دیتے تھے لہٰذا سچ پوچھئے تو آج بھی دیتے ہیں اور اگر دور درشن نے اپنا چال چلن نہیں بدلا تو آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ ان ہی دنوں ہم نے پاکستان ٹی وی پر ایک ڈرامہ دیکھا تھا۔ اس میں ایک غریب کلرک اپنے والدین کے منع کرنے کے باوجود یا اسی کے سبب موبائیل فون خرید لیتا ہے تاکہ دوستوں پر رعب ڈال سکے۔ مگر اس کے بعد گھر اور دفتر دونوں ہی جگہ اسے موبائیل فون کی وجہ سے مقبولیت کم اور رسوائی زیادہ ہاتھ لگتی ہے۔ پھر بھی وہ اسے سینے سے لگائے گھومتا ہے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کی طرح وہ پتلون کی کمر میں موبائیل اس لئے نہیں لٹکا سکتا کہ شلوار قمیص ایجاد کرنے والوں کو موبائیل کی آمد کا علم نہیں تھا۔ یوں بھی پاکستانی عوام پتلون پر شلوار کو ابھی تک اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ امریکہ نے ابھی تک شلوار قمیص پر پابندی عائد نہیں کی ہے۔ بہر حال ڈرامے کا انجام یہ تھا کہ جب موبائیل کا پہلا دل دہلا دینے والا بل آتا ہے تو ہیرو کے ہاتھوں کے طوطے نہیں اڑتے اس لئے کہ وہ تو موبائیل سیٹ کی خریداری کے وقت ہی اڑ چکے تھے۔ البتہ اس کے ہوش ضرور اڑ جاتے ہیں اور وہ اپنے والد کی نصیحت اور ڈائرکٹر کی ہدایت کے مطابق موبائیل کو لے کر گھر سے باہر نکلتا ہے

جہاں ایک فقیر جھولی پھیلائے پہلے سے کھڑا ہے۔ یہ جھولی، آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ موبائیل سے بھردی جاتی ہے اور فقیر حیران پریشان کھڑا رہ جاتا ہے کہ اس نوازش پر وہ ہیرو کو دعائیں دے یا بددعائیں۔

اس کے بعد پاکستان ٹی وی کے پردے پر ایک اسپورٹیڈ کار کا اشتہار دکھایا جانے لگا جسے خریدنے کی ترغیب ایک ایسی حسینہ دے رہی تھی جس نے ننھے منے بچوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اس نے کئی دن سے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ چوں کہ ہمیں اسپورٹیڈ کار اور حسینہ دونوں ہی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور ہم اپنی حسرتوں میں اضافہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے ٹی وی بند کردیا اور سوچنے لگے کہ کاش ہم وہ فقیر ہوتے جس کی جھولی میں موبائیل فون ڈال دیا گیا تھا۔ ہم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ موبائیل فون فقیر کے حوالے کردینے کے بعد ہیرو نے اس کا بل ادا کیا یا نہیں۔ ہم تو بس اس کے بعد کئی راتوں تک اپنے خوابوں میں فقیروں کا بھیس بدل کر اہل کرم کے تماشے کے منتظر رہے مگر اسے دیکھنا ہمیں نصیب ہی نہیں ہوا۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک شہر میں سینکڑوں، ہزاروں اچھے بھلے لوگ ایک ہاتھ کان پر رکھ کر دوسرا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے، کھلے منھ کے ساتھ دکھائی دینے لگے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سبھی کو قوالی گانے شوق چرانے لگا ہے۔ غور سے دیکھا تو وہ موبائیل پر گفتگو کررہے تھے۔ انتہائی اہم گفتگو۔ ہم حیران ہوئے کہ ان ہزاروں لوگوں کو موبائیل کی کتنی سخت ضرورت رہتی ہوگی اور جب تک موبائیل کا ظہور نہیں ہوا تھا، ان لوگوں کی زندگی کتنے عذاب میں رہی ہوگی اور ان کی پچھلی نسلیں بھی بغیر موبائیل کے اس جہاں رنگ و بو سے کتنی اداس گزری ہوں گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی اپنی دو تہائی زندگی عیش و آرام کی چیزیں حاصل کرنے کا عذاب جھیلتا ہے اور بقیہ ایک تہائی زندگی ان چیزوں کے حاصل ہوجانے کے عذاب میں گزارتا ہے۔

لیکن سچ پوچھئے تو سب سے زیادہ عذاب سے ہم گزر رہے تھے اور ہمارے جیسے نہ جانے کتنے لوگ تھے جو ہماری طرح موبائیل کا درد لئے گھوم رہے تھے پہلے ہم یہ سوچتے تھے کہ تنخواہ میں اضافے کے بقایا جات ایک ساتھ ملیں گے تو بال بچوں کے لئے نئے کپڑے سلائیں گے، اپنے لئے لکھنے کی نئی سیکنڈ ہینڈ میز خریدیں گے۔ گھر کی دیواروں کو رنگ و روغن لگائیں گے اور باقی رقم مستقبل کے لئے بنک میں محفوظ کردیں گے۔ مگر اب ہم پر ایک ہی دھن سوار تھی، موبائیل خریدیں گے۔ راستہ چلتے موبائیل پر زور زور سے گفتگو کرکے دوسروں پر رعب ڈالیں گے۔ دفتر کے لئے گھر سے نکلیں گے تو کہہ کر نکلیں گے کہ تھوڑی دیر بعد ہمیں موبائیل پر فون کرنا اور بس اسٹاپ پر یا بھری بس کے اندر ہمارے موبائیل کی گھنٹی بجے تو اسے دیر تک بجنے دیں گے تاکہ آس پاس کے تمام لوگوں کو خبر ہوجائے کہ ہم بھی جیب میں موبائیل اور منھ میں زبان رکھتے ہیں۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم دیکھتے رہے کہ موبائیل فون کی قیمتیں آہستہ آہستہ کم ہوتی رہیں مگر وہ ہماری پہنچ سے باہر ہی رہا۔ پہلے وہ صرف کار نشینوں کے پاس دکھائی دیتا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک ہاتھ سے کار ڈرائیو کرتے تھے اور ان کا دوسرا ہاتھ ضرورت پڑنے پر ان کی اپنی سکریٹری سے ہٹ کر موبائیل سے کھیلنے لگتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ موٹر سائیکل اور اسکوٹر چلانے والوں کے پاس آگیا۔ یہ وہ سواریاں ہیں جنھیں بہت سے نوجوان دونوں ہاتھ چھوڑ کر بھی چلالیتے ہیں، ان کی یہ مہارت موبائیل کے کام آنے لگی۔ اس کے بعد یہ ستم ہوا کہ جن لوگوں کے پاس پیڈل کی سائیکل جیسی چیزیں تھیں ان کی شناخت بھی موبائیل کی وجہ سے قائم ہونے لگی۔ لیکن اس دن تو حد ہوگئی جب ہم ایک سیاسی افطار پارٹی میں پہنچے جہاں سیاست دانوں، اسمگلروں اور غنڈوں کے علاوہ صرف ہم تھے یا موبائیل فون تھا جو ویٹروں کے علاوہ ہر شخص کے ہاتھ میں تھا۔ ہم جس میز پر بیٹھے وہاں ایک ہیبت ناک شکل کا امیر آدمی موبائیل پر محو گفتگو تھا:

- ارے بھائی تو کدھر ہے۔ میں کب سے تیرے کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ارے تو بھی اسی پارٹی میں ہے۔ ہاں مگر بھیڑ اتنی ہے کہ

تو دکھائی نہیں دیتا ہے۔ تو پھر میری ٹیبل پر ہی آجانا۔ میں دو نمبر گیٹ کے پاس دوسری ٹیبل پر بیٹھا ہوں۔ ہاں ہاں کھمبے کے پیچھے۔ اپنی ٹیبل پر ایک آدمی بنا موبائیل کے بیٹھا ہے۔ دور سے سمجھ میں آجائے گا"۔

ہم وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ کھلی معیشت اور کھلے بازار کا کمال یہی ہے کہ نت نئی اشیاء کا ایک ہرا بھرا جنگل اگ آیا ہے مگر اس جنگل میں انسان کہیں کھو گیا ہے۔ راستہ بھر ہم سوچتے رہے کہ موبائیل جیسی گھٹیا چیز ہم کیوں خریدیں جو ہر غنڈے اور بدمعاش کے پاس موجود ہے۔ اچانک دیکھا تو ہمارے محلے کے ایک عالم و فاضل مولانا موبائیل پر گفتگو کرتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ موصوف رمضان میں تراویح پڑھاتے تھے اور الیکشن کے دوران سیاسی جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ کبھی کبھی رمضان کے آس پاس الیکشن آجاتا تو بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے۔ وہ قریب آئے تو ان کی گفتگو سنائی دی:

"ہاں بھئی پچھلے سال تو الحمدللہ عیدیں منائی گئیں۔ ایک بریلوی عید، ایک دیوبندی عید۔ امسال دیکھئے اللہ مالک ہے۔ ہیلو، ہیلو بھئی آواز نہیں آرہی ہے۔ یہ موبائیل بھی کیا شیطانی آلہ ہے۔ ہاں ہیلو آپ سن رہے ہیں نا؟"

وہ باآواز بلند ہماری طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گذر گئے۔ اب موبائیل سے ہماری نفرت کم ہو گئی تھی۔ بھئی موبائیل تو مولانا بھی رکھتے ہیں پھر ہم کیوں نہیں رکھ سکتے۔ ممکن ہے افطار پارٹی میں بہت سے لوگوں نے نقلی موبائیل لٹکا رکھا ہو۔ جب آدمی دوسروں کو ڈرانے کے لئے نقلی ریوالور رکھ سکتا ہے تو رعب ڈالنے کی خاطر نقلی موبائیل کیوں نہیں رکھ سکتا۔ مگر مولانا کا موبائیل تو اصلی ہی ہوگا، اس پر گفتگو جو کر رہے تھے۔ لیکن مولانا کو تو قاعدے سے افطار پارٹی میں ہونا چاہئے تھا وہ یہاں کیا کر رہے تھے؟

گھر پہنچے تو زی ٹی وی سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ بہار کے وزیر اعلیٰ کو چارہ گھوٹالے میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ہم سکتے میں آگئے۔ کچھ عرصہ قبل تک موصوف جب بھی ٹی وی پر دکھائی دیتے تھے، اپنے موبائیل پر کسی نہ کسی سے نمائشی گفتگو کرتے نظر آتے تھے۔ دوران گفتگو ان کا چہرہ خوشی سے دمکتا رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں اخباری نامہ نگاروں کو ہاتھ ہلا کر خاموش رہنے کا اشارہ بھی کرتے رہتے تھے۔ سچ پوچھئے تو موصوف کی وجہ سے موبائیل کی شان بڑھ جاتی تھی اور موبائیل کی بدولت موصوف کے چہرے کا بھولپن کسی حد تک چھپ جاتا تھا۔ پھر نہ جانے کس بدخواہ کے مشورے پر انہوں نے ٹی وی کیمرے کے سامنے موبائیل کا استعمال ترک کر دیا۔ اسی کے ساتھ ان کا زوال شروع ہو گیا۔ پہلے چارہ گھوٹالہ عام ہوا پھر وہ وزیر اعلیٰ کی چارپائی سے اتر کر جیل کی چار دیواری میں مقید ہو گئے۔ کچھ بھی ہو جائے، ہم موبائیل ضرور لیں گے۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ آدمی بڑا نہ بھی ہو تو بڑا معلوم ہوتا ہے۔

چند ہفتوں بعد ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، شگفتہ مدیر شگوفہ، ممبئی تشریف لائے تو ان کے ہمراہ ایک ماہر اطلاعیات بھی تھے۔ ہم نے شام کی چائے کے بعد اپنے مہمانوں سے ان کے ارادے دریافت کئے تو وہ بولے کہ آج تو فلم دیکھیں گے "۔

ہم نے کہا: "آپ کے لئے ہم فلم میگزین منگا دیتے ہیں اس سے دل بہلائیے۔ اس میں بھی وہی سب بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے"۔

کہنے لگے: "نہیں، ہم تو سنیما ہال میں فلم دیکھیں گے، وہ بھی بالکل نئی"۔

تھیٹر پہنچے تو خدا کا شکر ہے فلم شروع ہو چکی تھی۔ سنیما کے پردے پر ہیرو اور ہیروئن اظہار عشق کے لئے ایک سو ہیں گواہوں کی موجودگی میں بلکہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ڈانس کر رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ ہم یہ روح پرور منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ موبائیل کی گھنٹی بجی۔ ہم نے دیکھا اگلی سیٹ پر ایک خاتون نے موبائیل پر جلدی جلدی بولنا شروع کیا:

"ڈارلنگ، میں آج دیر سے گھر آؤں گی۔ تم کھانا پکا لینا، ہم ساتھ کھائیں گے"۔

ہمارے مہمانوں نے پہلے اس خاتون کو اور پھر ہمیں حیرت سے دیکھا اس لئے کہ موصوفہ کے ایک ڈارلنگ تو ان کے ساتھ بھی یوں تشریف رکھتے تھے کہ ان کا ہاتھ موصوفہ کے کاندھے پر دراجمان تھا اور موصوفہ کا سر ڈارلنگ نمبر 2 کے کاندھے پر ٹکا تھا۔

ہم سوچنے لگے واقعی موبائیل بڑی مفید شئے ہے۔ اگر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور رومیو جولیٹ کے پاس بھی موبائیل ہوتا تو ان کا انجام کتنا مختلف ہوتا۔ ذرا تصور کیجئے سوہنی، مٹی کے گھڑے پر تیرتے ہوئے مہیوال سے اپنی کیفیت بیان کررہی ہوتی اور ڈوبنے سے پیشتر مہیوال کو آخری موبائیل سلام بھی کرسکتی تھی یا ممکن ہے وہ تیرنے کا خطرہ مول ہی نہیں لیتی اور مہیوال کو موبائیل پر فون کرکے اسے اپنے پاس آنے کا حکم صادر کردیتی۔ اور فرہاد .... خیر جانے دیجئے قصہ مختصر یہ کہ داستانیں کتنی دل چسپ اور ہیجان انگیز ہوجاتیں۔

فلم کے پردے پر ہیروئن کی شادی ہیرو کے دوست سے طے ہوگئی ہے جس کے پاس موبائیل بھی ہے۔ ہیرو جوئے خانے میں بیٹھا نقلی روپئے ہار رہا ہے اور غم بھلانے کے لئے بغیر پانی یا سوڈا ملائے بوتل منھ سے لگائے شراب پی رہا ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اگر کہیں مرزا غالب کے پاس موبائیل ہوتا تو وہ خرقہ و سجادہ رہن رکھنے کی بجائے موبائیل ہی رہن رکھ کر دعوت آب و ہوا کا اہتمام کرلیتے۔ اگر ان کا موبائیل رہن ہونے سے بچ جاتا تو وہ کوتوال شہر کے ہاتھوں گرفتار بھی نہ ہوتے کیوں کہ مولانا حالی، شیفتہ یا ان کی منظور نظر ڈومنی یا پھر خود مفتی صدر الدین آزردہ اپنے موبائیل پر انہیں بتادیتے کہ "مرزا صاحب، ہوشیار .... کوتوال آرہا ہے"۔ اور جب ہتھکڑیاں لئے ہوئے، مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کوتوال جوئے خانے پر پہنچتا تو دیکھتا کہ مرزا صاحب اور ان کے دوسرے پنٹر (Punter) میلاد شریف میں مشغول ہیں۔ عود و عنبر کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا ہے اور مرزا صاحب جالی دار ٹوپی اوڑھے جھوم جھوم کر میلاد خوانی کررہے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا کہ مرزا صاحب خط کتابت یعنی مراسلے کو مکالمہ بنانے کی بجائے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ہدایت کردیتے: "کیوں خواہ مخواہ ڈاک کا بکھیڑا پالتے ہو۔ سیدھے سیدھے موبائیل گھماؤ، غزل سناؤ، اصلاح لو اور چھٹی کرو۔ ہاں اس بات کا خیال ضرور رہے کہ موبائیل کا بل تم ادا کرو۔ ورنہ اگلی بار تم چیخ چیخ کر مرجاؤ گے، تمہاری آواز مجھ تک نہیں پہنچے گی۔ ہرگز ہرگز نہیں پہنچے گی۔ بل کا طالب، غالب۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم خطوط غالب کو آڈیو کیسٹ اور سی ڈی کی شکل میں پاتے۔ البتہ مرتبین اور محققین کے اختلافات اور انکشافات سے محروم ہی رہ جاتے۔

لیکن میر تقی میر اگر موبائیل کے مالک ہوتے تو انہیں اس کے استعمال کی مہلت شاید ہی ملتی کیوں کہ فکر سخن انہیں اس بات کا موقع ہی نہیں دیتی۔ ہاں کبھی کبھی وہ اپنے عطار سے ضرور رابطہ قائم کرتے، بیماری دل کا حال بیان کرتے اور کہتے "نسخہ اسی کے ہاتھ سے بنوانا اور اسی کے ہاتھ سے بھجوانا جس کے سبب میں اکثر بیمار رہا کرتا ہوں"۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میر صاحب اپنا موبائیل اپنے کسی عقیدت مند نواب کے منھ پر دے مارتے اور کہتے "تم کیا جانو سخن کیا ہوتا ہے اور سخن فہمی کسے کہتے ہیں۔ بس بیٹھے روپیہ گنا کرو"۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میر صاحب موسم بہار میں دامن اور گریباں چاک کرنے کی بجائے جنون میں موبائیل ہی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتے۔۔

جوش ملیح آبادی ہر آدھے گھنٹے بعد اپنی کسی محبوبہ سے بذریعہ موبائیل رابطہ قائم کرکے اسے اپنے ہوٹل کا پتہ اور کمرہ نمبر ضرور بتاتے یا پھر مجاز سے موبائیل پر رابطہ قائم کرکے اسے ہوش میں رہنے اور اپنے سامنے گھڑی رکھ کر شراب پینے کی تلقین کرتے۔ فراق گورکھپوری سے آئی ایس ڈی پر لائن ملاتے اور کہتے "خدارا مجھے ہندوستان بلالو۔ مولویوں کی یہ نگری میرے لئے کوفہ بن چکی ہے"۔ حفیظ جالندھری کو موبائیل کرتے اور کہتے "میاں، پاکستان کا قومی ترانہ لکھ کر شہر بھر میں اتراتے پھرتے ہو۔ ارے شعر لکھو شعر۔ مگر تم کیا جانو

کہ جگر کی آگ کیا ہوتی ہے !"

ہم یہ سب سوچتے رہے اور فلم ختم ہوئی۔ باہر نکلے تو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کے دوست سگریٹ لینے کے لئے پان کی دکان پر رک گئے۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو پنواڑی موبائیل فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔ آگے بڑھے تو دیوار پر اشتہار پینٹ کئے ہوئے تھے۔
" بابو بھائی پلمبر۔ نلوں کی مرمت کے لئے مشہور، رابطہ موبائیل 9820021225۔ دوسرا اشتہار کسی حکیم صاحب کا تھا " بڑھاپے کو پاس نہ آنے دیں۔ ساٹھ برسوں کا تجربہ رکھنے والے حکیم۔ مفت ہوم ڈیلیوری کے لئے موبائیل نمبر 9821161596 "۔ ہم نے دیکھا ہمارے دونوں دوست بھی ان اشتہارات کو غور سے پڑھ رہے تھے۔

اب پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ کیا ہم شہر کے آخری آدمی ہوں گے جو موبائیل خریدے گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اگلی صبح موبائیل کمپنی کو فون کر کے ہم نے کہہ دیا کہ ہم بھی موبائیل مالکوں کی بھیڑ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس جو سب سے سستا موبائیل سیٹ ہے وہ ہمیں بھیج دیں۔ کمپنی کا سیلز ایگزیکٹیو ہمارے دفتر پہنچا تو ہم نے چھوٹتے ہی سوال کیا: " آپ جلد از جلد کب ہماری موبائیل لائن جاری کرسکتے ہیں ؟ "

وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا: " اگر آپ چیک دیں گے تو تین دن بعد اور اگر نقد ادا کریں گے تو کل ہی۔ اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کا موبائیل نمبر 786 پر ختم ہو "۔

ہم نے جلدی سے کہا: " ہمیں آپ کوئی بھی نمبر دیجئے مگر لائن کل شروع ہوجانی چاہیے "۔

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا: " آپ پہلے مسلمان ہیں جسے 786 نمبر میں دلچسپی نہیں ہے۔ دہلی کی موبائیل کمپنی نے 786 والے نمبروں کا نیلام کیا ہے اور وہاں کے مسلمانوں نے اسے پچاس ہزار روپئے پریمیم دے کر یہ نمبر خریدا ہے "۔

اب ہمارے حیرت زدہ ہونے کی باری تھی۔ مذہب کو تو ہم نہ جانے کب، کہاں چھوڑ آئے تھے اور صرف مسلک کے ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ شاید گلوبلائزیشن کا کمال تھا کہ ہمارا عقیدہ مسلک سے بھی سکڑ کر محض نمبروں تک محدود ہوتا جارہا تھا اور وہ بھی نیلامی میں دستیاب تھا۔ ہمارا بس چلے تو ہم آئندہ اپنی دولت سے جنت میں بھی ریزرویشن کرانے کی کوشش کرنے لگیں گے۔

رات بھر ہمیں نیند نہیں آئی۔ صبح اٹھ کر پہلے موبائیل کو کان سے لگایا۔ ابھی ہماری نئی زندگی کی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی۔ کم بخت نقد دام بھی لے گیا اور فون جاری بھی نہیں کیا۔ وقت گزاری کی خاطر ہم نے اخبار اٹھایا تو ہر خبر پھیکی پھیکی لگی۔ آخری صفحے پر پہنچے تو ایک کالمی خبر تھی " سنگاپور کے فقیر بھی موبائیل استعمال کرنے لگے "۔ خبر پڑھی تو معلوم ہوا وہاں کے بھکاری اتنے خوشحال ہوگئے ہیں کہ اپنی پھٹی ہوئی جیب میں موبائیل رکھتے ہیں۔ دوسری خبر اس سے بھی بری تھی " موبائیل کے استعمال سے کینسر کا خطرہ "۔ پتہ چلا موبائیل کی ریڈیائی لہروں سے کینسر بھی ہوسکتا ہے۔ ہم نے گھبرا کر اخبار پھینک دیا اور فون کی طرف لپکے۔ ہم ابھی موبائیل کا آرڈر منسوخ کرائے دیتے ہیں۔

اتنے میں ہمارے موبائیل کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ دوسرے کمرے سے بیگم اور بچے دوڑے چلے آئے۔ ہم نے موبائیل کان سے لگایا۔ دوسری طرف کوئی خاتون تھیں بلکہ دوشیزہ رہی ہوگی۔ آواز آئی: " ہیلو موبائیل نمبر 786۔ یو آر ویلکم ٹو اے بی ایل موبائیل فیملی۔ آپ کو اپنا نیا موبائیل مبارک ہو "۔ ☆

●☆●☆●

مرزا مصطفیٰ علی بیگ
حیدرآباد

اولڈ ایج میں

پھر آگیا خیال تیرا اولڈ ایج میں
واپس ہوا شباب میرا اولڈ ایج میں

اپنی گزر رہی ہے بڑی احتیاط سے
تم بھی سنبھل کے رہنا ذرا اولڈ ایج میں

جو ہائی جمپ کرتے تھے عہد شباب میں
کرتے نہیں ہیں چوں و چرا اولڈ ایج میں

دیواریں تھام تھام کے چلتے ہیں اب مگر
لب پر ہے پھر بھی "ماہ لقا" اولڈ ایج میں

تھے جو فدا یہ حسن کے سب ینگ ایج کے
اب کیا غرور کیسی ادا اولڈ ایج میں

یہ زیورات اور یہ میک اپ فضول ہے
کیوں دے رہی ہو خود کو سزا اولڈ ایج میں

تکتا تھا جسکا راستہ میں راونڈ دی کلاک
اس کی گلی کو بھول گیا اولڈ ایج میں

جن سے کبھی ہماری محبت کی پینگ تھی
اب کیا بتائیں ان کا پتہ اولڈ ایج میں

●☆●

افتخار وصی بیتیا

غزل

دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا انسان کو
اپنے آگے کچھ سمجھتا ہی نہیں بھگوان کو

جاہلوں کی دسترس میں علمیت آتی نہیں
علمیت گرداتے ہیں علم کے فقدان کو

شاعری کا ماحصل کیا ہوگا ایسے دور میں
میں نے کل بکری چراتے دیکھا ہاتھی وان کو

اب کرے ایجاد کوئی، کیوں بھلا آب حیات؟
موت نے بخشا نہیں جب حضرت لقمان کو

پوچھتے ہیں رہنما سے پیاز اور سرسوں کا تیل
اور کس منزل پہ لے جاؤگے ہندوستان کو

میری نظروں میں وہی ہے ماہر علم العروض
اک غزل میں باندھ دے جو مختلف ارکان کو

اس کی باتوں سے ٹپکتی ہے جہالت افتخار
کس نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سونپ دی نادان کو

قطعات

کارگل میں جنگ ہوتی ہے تو ہونے دو میاں
اس توے پر آؤ سینکیں ہم سیاسی روٹیاں
ہے غنیمت اپنے حق میں جنگ کا ہونا وحی
اب نہ کوئی ہم سے چھینیگا ہماری کرسیاں

رفیعہ منظور الامین
3B فیر ویو روڈ نمبر 7 بنجارہ ہلز
حیدر آباد 34

برد کھاوا

"کاش میں اپنی بیوی کا شوہر نہیں دوست ہوتا"۔ میں نے حقیقی کرب کے ساتھ سوچا ۔۔ سچی بات تو یہ تھی کہ جب تک میری شادی اس سے نہیں ہوئی تھی تب اس کی قربت مجھے زیادہ حاصل رہتی تھی ۔۔۔۔ لیکن شادی کے بعد پٹاپٹ اس کی اتنی سہیلیاں اگ آئیں کہ میں حیران رہ گیا ۔۔۔۔ شادی سے پہلے حویلی میں آتے جاتے اگر کبھی میرا اس کا سامنا ہوجاتا تو ایک گلابی سمندر سا اس کے کانوں تک چڑھ آتا اور وہ کسی بہانے بھاگ جاتی لیکن جب میں اپنے گھر کے باغ میں پڑھتا بیٹھتا تو روشن دان میں اس کا چہرہ چمکتا اور وہ کاغذ کے ہوائی جہازوں سے میرا نشانہ تاکتی وہ کبھی وہاں نہیں ہوتی تب بھی مجھے یقین ہوتا کہ وہ ضرور وہاں ہوگی، روشن دان کی دوسری طرف ۔۔۔۔ میرے بارے میں سوچ رہی ہوگی اور میں پیڑ پر چڑھ کر روشن دان سے جھانکتا تو وہ واقعی وہاں ہوتی، چمکتی آنکھیں، انگلی میں ڈوپٹہ مروڑتی ہوئی ۔۔۔۔ میں ڈر کر فوراً اتر آتا ۔۔۔۔ کسی نے دیکھ لیا تو! حالانکہ مجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ میری منگیتر تھی لیکن وہ زمانہ ہی ایسا اندھا تھا ۔۔۔۔ خالہ، چچی، پھوپی، ممانی سب ہی بے وردی دارو غنیں تھیں۔ کم از کم اس وقت تو ایسا ہی لگتا تھا۔

ویسے شادی کے دن ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ جب میری بیوی سہیلیوں کے جھرمٹ میں آرسی مصحف کی رسم کے لئے آئی تھی۔ جو نظریں مجھ پر اٹھ رہی تھیں وہ سیدھی سادی اور معصوم ہرگز نہیں تھیں ۔۔۔۔ وہ نشتر تھیں، سنگینیں تھیں، دو نالی بندوقیں تھیں اور میری ڈھال! میری ڈھال صرف میرے ماتھے سے ابلتا پسینہ۔

"بے چارا ابھی جنگل سے آیا ہے مہرو ۔۔۔۔ تجھے سدھانا پڑے گا" ۔۔۔۔ ایک آواز آئی جو سریلی ہونے کے باوجود مجھے زہر لگی۔ وہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔

اب ۔۔۔۔ شادی کے بعد گھر کے باہر میرے نام کا بورڈ ہے جو بیوی کی پسند کا ہے وارڈ روب میں میرے کپڑے میری بیوی کی پسند کے ہیں۔ اس وقت چائے کا جو برانڈ میں نے پیا وہ میری بیوی کی پسند ہے۔ ہوا میں یہ سرسراتے پردے بھی بیوی نے پسند کئے ۔ اور میری بیوی! وہ میری پسند کا خمیازہ ہے۔ جو مجھے ناپسند ہیں وہ میری بیوی کی سہیلیاں ۔۔۔۔ وہ آتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے ں کی دکان میں آگ لگادی ہو۔ جب میں کوشش کر کے خود کو سنجیدہ بنائے رکھتا ہوں تو ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی ہیں اور ں بولوں تو میری بیوی کو عجیب سوالیہ نظروں سے گھورنے لگتی ہیں کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ مرد ذات کی اصلیت پر اتر آؤں ۔۔۔۔ کی کمر میں چٹکی لوں تو کسی کو اندھیرے میں حیران کردوں اور کسی کو کچھ نہیں تو ایک Love Letter ہی لکھ دوں۔ ان سے ـا تو چھوٹے ۔۔۔۔ پھر خیال آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے شریف النفس مردوں کے لئے بنائے ایجنڈے میں یہ بات نہیں لکھی تھی۔

سہیلیاں صاف اڑالیجاتی ہیں میری بیوی کو

کبھی سوچتا ہوں کہ میں کتنا بدنصیب ہوں ۔۔۔۔ جس انسان کے کئی دوست ہوں اور پھر بھی وہ اپنی بیوی کا ہی انتظار کرتا

رہے تو وہ یقیناً بدنصیب ہی ہوگا۔ بات یہ ہے کہ میرے سارے ہی دوست جو ہمیشہ ایک جان دو قالب ہوا کرتے تھے۔ اب بھی ایک جان دو قالب ہیں لیکن اب اپنی بیویوں کے ساتھ اور وہ مسخرے مجھ پر ہی پھبتی کستے ہیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے۔ اب صرف عامر ہی ایسا ہے جو یاری نبھائے جارہا ہے بے چارہ وہ بھی اس لئے کہ وہ ابھی کنوارہ تھا۔

گھنٹی بجی ملازم نے دروازہ کھولا

"ارے آؤ آؤ عامر.... خوب آئے بھئی"... میں نے بیٹھے بیٹھے ہی ہانک لگائی۔

عامر نڈھال بے بس لیسے صوفے میں دھنس گیا جیسے شادی شدہ ہو۔ عامر کی عادت تھی کہ جب وہ صوفے پر بیٹھتا تو انگوٹھے کے ناخن سے صوفے کی ٹیپسٹری پر گہرے گہرے نشان بنایا کرتا۔ مجھے اس کی اس خصلت سے بڑی الجھن ہوتی۔ لیکن جب وہ ایسا نہیں کرتا تھا مجھے تب بھی الجھن ہوتی تھی کیوں کہ اس کا ایسا نہ کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ کسی ذہنی بھونچال سے دوچار ہے۔

لگتا ہے آج پھر یہ حضرت بردکھاوے میں فیل ہو کر آئے ہیں۔ میں نے سوچا.... پچھلے تین موقعوں پر ایسا ہی ہوا تھا جب کہ عامر بردکھاوے کے لئے گیا اور مسترد ہوا۔ یہ سب کچھ اس کے جدت پسند دانتوں کی وجہ سے ہوا کرتا تھا۔ جنھوں نے اچھا خاصہ جانا مانا رستہ چھوڑ کر باتھی دانت فیشن اپنایا تھا۔ ویسے اس کی شخصیت بڑی جاذب نظر تھی لیکن اس کی طرف اٹھنے والی ہر نظر آگے کو نکلے ہوئے دانتوں میں الجھ کر رہ جاتی تھی۔ میں نے کئی بار اسے رائے دی کہ دانت ٹھیک کروالو۔ لیکن اس کی منطق کچھ اور تھی وہ قدرت کے کاموں میں اپنی صناعی شامل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی شرط تھی کہ جو بھی لڑکی اس کی زندگی کی ساتھی بنے گی۔ اسے جوں کا توں قبول کرے۔

"اور بھئی... شادی کا دانتوں سے کیا تعلق؟"..... یہ ایک اور دلیل تھی اس کی۔

جب بڑی دیر تک عامر نے میری بیوی کی پسند کی ٹیپسٹری ستیاناس نہیں کی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔

"اگر وہ صوفہ زیادہ آرام دہ ہے تو آکر میرے قریب بیٹھ جاؤ اور اپنی گٹھری کھولو.... بہت ہوچکا"۔ میں نے کہا۔

"گٹھری! کہاں؟"..... عامر نے ہونق کی طرح بغلیں جھانکیں۔ اس میں شئے لطیف کی کمی تھی۔

"آج یہ صورت پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"۔ میں نے دوسری طرح پچھاڑا۔

"بارہ، کہاں؟"..... ابھی تو گیارہ بجکر انسٹھ منٹ ہی ہوئے ہیں"

اور میرے دل سے اس کے لئے بد دعا نکلی۔ ایک تو پہلے ہی سے میں چھٹی کے دن مہرد کے روپوش ہوجانے کی وجہ سے زخم خوردہ سا بیٹھا تھا اور اب یہ عامر اور بھی نمکدان ثابت ہو رہا تھا۔

"تم کس دروازے سے اندر آئے ہو؟"۔ میں نے اس سے پوچھا اور اس نے بیوقوفوں کی طرح دروازے کی طرف ہاتھ اٹھادیا۔

"باہر جانے کا بھی وہی راستہ ہے"۔ میں نے لاتعلقی سے اخبار سنبھال لیا۔

تب کہیں جاکر اس کے ہوش ٹھکانے آئے۔ اس نے اٹھ کر ملازم کو چائے لانے کی ہدایت کی اور بڑی رازداری سے میرے قریب آبیٹھا۔

"خدا کی قسم میں اس بار جاکر یونہی واپس نہیں آؤنگا"۔ اس نے جذباتی ہو کر کہا۔

"ہاں وہ جگہ ہی ایسی ہے جہاں کا ریٹرن ٹکٹ نہیں ملتا"۔ اب میں نمکدان بن گیا۔

"مذاق بند کرو۔ میں سنجیدہ ہوں"۔ اس نے میرا اخبار چھین کر ایک طرف ڈالدیا اور اس کی جگہ کسی اخبار کا ایک تراشا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ ضرورت رشتہ کا ایک اشتہار تھا۔ اس بار عامر نے حیرت انگیز جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ بجائے اس کے کہ خام معالے تجربہ

کار دوستوں کے حوالے کرتا۔اس نے خط و کتابت کے سارے مراحل طے کر لئے تھے اور اب بردکھاوے کے حدود میں داخل ہوگیا تھا۔

"تو جاؤ اپنا تھوبڑا بھی دکھا آؤ"۔مجھے ٹھیس پہنچی تھی۔

یہ کیا کہ ہم جیسے باوصف تجربہ کاروں کو یکلخت درگزر کر دیا گیا تھا۔

"بس یہیں تو بات اٹکتی ہے"....اس نے گھٹنے پر مکہ مار کر کہا۔بہت سے لوگوں کی یہی عادت ہوتی ہے۔شائد اسی لئے پٹے پٹتے بڑھاپے میں گھٹنے بے دم ہوجاتے ہیں۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے" عامر نے کہا

میں اسکا مطلب سمجھ گیا

"میں نے آج تک کسی لڑکی کا اغواء نہیں کیا ہے"۔میں نے کہا۔اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔اب وہ سچ مچ ناراض ہوگیا تھا۔میں نے بڑی مشکل سے ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"بات یہ ہے کہ بردکھاوے کے لئے اس بار تمہیں پیش ہونا ہوگا"

عامر بڑی رسائی سے بول گیا۔

انتہائی غصہ،انتہائی ڈر یا انتہائی حیرت کے عالم میں انسان اعلیٰ سوسائٹی کے اصول،تہذیبی حد بندیاں سب کچھ بھلا بیٹھتا ہے یہی حال میرا بھی ہوا۔مجھے جب ہوش آیا تو میں نے خود کو کرسی پر اکڑوں بیٹھے ہوئے پایا۔

"یہ کوئی غیر قانونی حرکت نہیں ہوگی"....عامر توضیح کر رہا تھا... تمہیں صرف ایک اچھا سا سوٹ پہن کر میرے ساتھ جانا ہوگا تم چپ رہوگے بات چیت سب میں کرلونگا"۔

"اس کے بعد؟" میری نظروں میں بڑے بڑے جوتے تیزی سے گھومنے لگے جن سے زئیں....زئیں"... آوازیں آرہی تھیں۔

"اس کے بعد کی فکر تم نہ کرو"....عامر بولا...."تم آرام سے کسی ہل اسٹیشن چلے جانا اور میں صرف شادی کے دن سہرا باندھ کر طلوع ہونگا"۔

"یہ اس لڑکی کے ساتھ سراسر ناانصافی ہوگی....دھوکہ!" میری رگ حمیت پھڑکی۔

"اس کی بھی تم فکر نہ کرو... تم ہم میاں بیوی کے معاملوں میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو جی؟"...اس نے اس طرح ناگواری سے کہا جیسے واقعی اس کی شادی ہو چکی ہو اور میں دخل در معقولات کر رہا ہوں۔"میں اسے اتنی محبت دوں گا،اتنی محبت دوں گا..."

میں نے تخیل میں خود کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا پایا اور کانپ گیا۔

لیکن آخر کار اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے اپنے جگری.... بے جگرے.... دوست کی مدد کے لئے تیار ہوگیا...میری تھوڑی سی مدد سے میرا دوست ایک بیوی کا شوہر بن سکتا تھا۔

میں نے شام میں اپنی بیوی کا پسندیدہ سوٹ پہنا اور عامر کے ساتھ کار میں چل پڑا۔

وہ اوپری منزل کا متوسط درجے کا لیکن صاف ستھرا اپارٹمنٹ تھا۔دروازہ کھولنے والا ملازم لڑکا ہمیں بٹھاکر اندر چلا گیا۔ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی ہمت بندھائی۔کچھ دیر بعد چائے کی ٹرالی لئے ایک قبول صورت لڑکی داخل ہوئی اس کا لباس اچھے ذوق کا تھا اور گہرے رنگ کا چشمہ اس کی گندمی شکل پر بھلا لگ رہا تھا اس کا بات چیت کا انداز سادہ اور حقیقت پسند تھا۔

"اصل میں.... ماں باپ کے انتقال کے بعد صبیحہ کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔سمجھئے کہ میں ہی اس کا سب کچھ ہوں۔وہ تو

شادی کے لئے بھی تیار نہیں تھی۔ میرے بھانے بھانے پر راضی ہو گئی۔ لیکن میں درمیانی کڑی میں یقین نہیں رکھتی۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ آپ خود ہی اندر جاکر ملاقات کر لیجئے گا"۔ اس نے بہ یک وقت ہم دونوں پر نظر ڈالی جیسے اندازہ لگانا چاہتی ہو کہ اصلی دولہا کون ہے۔ میری الجھن بڑھ گئی۔ ڈرامے کو بہت آگے بڑھانا مناسب نہیں تھا۔ اگر مہرو کو اس بات کا پتہ چل گیا تو کیا ہو گا۔ پیروں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ میں نے خود کی ہمت بندھائی۔ پل بھر کی تو بات تھی۔ اندر گیا۔ صورت دکھائی اور فرار شد۔

"آپ اپنے دوست کو بھی ساتھ لیجا سکتے ہیں"۔ لڑکی ہم دونوں ہی سے مخاطب تھی۔

"شکریہ"... ہم نے ٹو ایٹ میں جواب دیا اور دھڑکتے دل سے اٹھکر کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ لڑکی صبیحہ ہی ہو سکتی تھی... وہ پلٹی اور میرے قدموں تلے زمین کھسک گئی کمرہ گھومنے لگا۔ دیواریں تڑکنے لگیں۔ صاف قیامت کے آثار تھے کیوں کہ وہ لڑکی صبیحہ کوئی اور نہیں میری بیوی مہرو تھی۔ میرے پاؤں تو زمین نے پکڑلئے۔ لیکن عامر ....وہ شاطر ایک ہی جست میں کمرے سے باہر تھا۔

جب بہت ہی بوجھل خاموشی ختم ہوئی تو مہرو میرے کندھے پر سر رکھے سسک سسک کر اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔

"..... اسکا رشتہ کہیں جمتا ہی نہیں تھا۔ صبیحہ بہت پیاری لڑکی ہے لیکن اس کی دو آنکھیں دو رنگوں کی ہیں۔ آخر ہم سہیلیوں نے مل کر یہ اسکیم بنائی کہ صبیحہ کی جگہ مجھے دکھا دیا جائے .... تم میرا یقین کر رہے ہو نا ...؟" ..... وہ بیچ بیچ میں مجھ سے تیقن مانگتی رہی اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھاکر اسے اس بات کا وقت ہی نہیں دیا کہ وہ خود مجھ سے پوچھتی کہ تم یہاں کیا کر رہے تھے۔؟ لیکن دل میں خدشہ ضرور تھا کہ بات یہاں آئی گئی نہیں ہوئی... فی الحال تو میں نے اسے ایک فراخ دل شوہر کی طرح "معاف" کر دیا۔

لیکن ایک عجیب معجزہ ہوا۔ جب ہم واپس کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ صبیحہ اور عامر دریچے میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ صبیحہ کی نظریں عامر کے دانتوں پر اور عامر صبیحہ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ مہرو اور میں انہیں اس عالم وارفتگی میں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ آئے۔ ☆

شفیقہ فرحت
24 تپتی اپارٹمنٹس، ٹی ٹی نگر
بھوپال 462003

اکیسویں صدی

اکیسویں صدی کو پکڑنے جکڑنے کیلئے ہم سب بھاگے جارہے ہیں۔ صدی آگے آگے ہم پیچھے پیچھے، چیختے، چلاتے، شور مچاتے جیسے اکتیس دسمبر کو رات گیارہ بج کر انسٹھ منٹ پر اگر ہم نے اسے نہیں دبوچا تو وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ ہم بیسویں صدی کی سرحد پر ہی بے دم سے کھڑے کے کھڑے بلکہ گرے پڑے رہ جائیں گے اور وہ کبڈی کھیلتی ہوئی ہو تو کرتی آفیشل لائین آف کنٹرول کے اس پار چلی جائے گی اور ادھر پہنچ کر جیتنے والے شریر بچے کی طرح ہمیں انگوٹھا دکھائے گی منہ چڑائے گی۔۔۔!

اے حضور۔۔۔وہ جائے گی تو کہاں۔۔۔؟ کہ
راستے سب بند ہیں کوچہء قاتل کے سوا

پہلی جنوری ۲۰۰۰ء کو وہ ہمیں وہیں ٹھٹھری سکڑی کھڑی ملے گی جہاں پر ہر پہلی جنوری کو ملتی ہے۔ جہاں ایک ہزار نو سو سالوں سے ہر آنے والی صدی ملا کرتی تھی۔ نہ رات کے اندھیرے میں کوئی کمی پیشی ہوگی نہ سورج کی پہلی کرن زیادہ تیز چمکیلی رنگیلی ہوگی۔ بلکہ ہوسکتا ہے سخت کہرے اور برف باری کی وجہ سے پہلی کرن اس وقت نکلے جب چار سو پانچ سو چھبیسویں ستائیسویں کرن نکلنی چاہئے۔ اب دیکھئے نا آج شہر بھوپال میں "سورج میاں" اور "سوریہ دیوتا" آٹھ بجے (8-a.m.) تک آرام کررہے ہیں جبکہ انھیں سرکاری اطلاعات کے مطابق 6.5 a.m. سے کام پہ لگ جانا چاہئے تھا!

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نئی صدی کے استقبال میں ساری رات اربوں کھربوں پٹاخے چھوڑے جائیں، آسمان سے گفت و شنید کرنے والے انار چھوڑے جائیں اور سینکڑوں ہزاروں قسم کی نئی نئی آتش بازی کی چیزوں کے مظاہرے ہوں تو ان کے پھیلے پھیلائے دھوئیں میں سورج آپ ہی نظارہ سوز ہوکر "پردے میں منہ چھپالے" یاد رہے کہ اس دھوئیں میں وہ دھواں بھی شامل ہوگا جو گلی گلی، سڑک سڑک اور نیشنل انٹرنیشنل ہائی وے پہ دوڑنے والی گاڑیوں سے برآمد ہوگا اور وہ گاڑیاں جن پر منچلے اور دل والے "ہپی نیو ایئر" اور "ہپی نیو ملینیم" کے فلک شگاف نعرے بلند کرتے آدھی رات سے صبح کے پچھلے پہر تک گھومیں گے۔ لہٰذا جب سورج نکلے گا ہی نہیں تو صدی کی مجال ہے کہ وہ روئے زمین پر قدم رکھے! ویسے بھی پچھلی صدی اتنا کچھ دیکھ چکی ہے اور جھیل چکی ہے کہ نئی صدی خوشی خوشی تو آئے گی نہیں۔ قہراً و جبراً آنے والے کا دنیا کے کونے کونے میں یعنی ایمسٹرڈم، لندن، نیویارک سے بھوبنیشور، جھمری تلیا، ماڈنگا، ٹونگا (دنیا کا سب سے چھوٹا ملک) تک ایسا استقبال۔۔۔؟ اللہ۔ اللہ۔ کہیں میلوں لمبا کیک بن رہا ہے جس میں سینکڑوں ٹن میدہ، شکر، مکھن اور لاکھوں انڈے میوے وغیرہ وغیرہ ڈالے جائیں گے۔ کہیں ہزاروں فٹ اونچی ہوٹل تعمیر ہورہی ہے۔ شہر لندن میں دنیا کا سب سے بڑا گنبد ملینیم ڈوم والس بنتے تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور صاحب سٹی آف لائیٹس (روشنیوں کے شہر) کی خبر تو آپ نے بھی پڑھ لی ہوگی۔ جہاں پورے سال رات اور دن چراغاں ہوگا۔ یعنی سورج کو چراغ دکھائیں گے۔۔۔! حیف۔ صد حیف۔ ہزار حیف بلکہ لاکھ حیف۔۔۔!! اب فرمایئے کیا عقل کا بھی ماتم کریں جبکہ ہر چہار اطراف سے عقل کی فراوانی کے دعوے ہورہے ہیں۔

ہمیں تو یہ لگ رہا ہے کہ یورپی ممالک میں عقل بنانے کے کارخانے کھل گئے ہیں اور یہ "شئے غیر مطلوب" اتنی زیادہ تعداد اور مقدار میں مارکٹ میں آگئی ہے کہ اس کی سیل (Sale) لگانی پڑ رہی ہے۔

خیر اگر آپ کی نظروں سے گذر بھی چکی ہے تب بھی اس کا دوبارہ گوش گزار اور نظر نواز کرنا زیادہ نامناسب نہ ہوگا کہ اچھی چیزوں کو یاد کرنے اور بری چیزوں کو سمجھنے کیلئے ان کا ایک سے زیادہ مرتبہ مطالعہ لازمی ہے۔

"یہ ہے یو کے کا شہر نارویچ، جو نئی صدی کے استقبال کیلئے تمام تر روشنیوں میں غرق ہونے کا منتظر ہے ... منصوبے کے مطابق ۳۱ ڈسمبر کی شب ۱۲ بجے تمام شہر میں مدھر گھنٹیاں بج اٹھیں گی۔ سٹی سنٹر، سٹی ہال اور کاسل (قلعہ) روشنی کی کرنوں کے خصوصی رقص سے منور ہوجائے گا ... دریا میں دو ہزار موم بتیوں کا ایک قافلہ تیرتا ہوا نظر آئے گا ... یہ جلوہ یعنی سٹی آف لائیٹس محض ۳۱ ڈسمبر کی شب تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ تمام سال جاری رہے گا۔"

اگر کوئی ٹورسٹ کمپنی آدھے پاؤ ٹکٹ پر لے جاتی ہو روشنیوں کے اس شہر کی زیارت سال کے ختم ہونے ہونے تک، جب چراغوں میں روشنی نہ رہے، ہم غریب ہندوستانی بھی کر آئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے بھونیشور کے Sun temple پر پڑنے والی سورج کی پہلی کرن کے دیدار کرنے ہزاروں ٹورسٹ بیرونی ممالک سے آنے والے ہیں۔ لیکن یہ خبر بھی اس سردی میں گرم ہے کہ سمندری طوفان کو بھی اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کا شوق چرایا ہے۔ لہٰذا ابت سے ٹورسٹ اپنا ٹکٹ واپس کررہے ہیں اور پانچ دس ستارہ ہوٹلوں کی بکنگ کینسل کروا رہے ہیں۔ بیچارے بھارت ورش کی قسمت میں تو ہر طرف سے گھاٹا ہی گھاٹا ہے!

خیر اس نفع نقصان سے ہمارا آپ کا کیا لینا دینا اور آپ اینٹ پتھر اور کھانے پینے کی چیزوں پر بھی نہ جائیے کہ شراب سے لے کر تالی مٹھائی، مرغ مچھلی، برگر پیزا ہر ایک پر نئی صدی کی چھاپ لگ چکی ہے۔ شراب کے گلاس، چائے کافی کے مگ، بالٹی ٹب، کھانے کھلانے سے لے کر کھانا پکانے کے برتن، گدے، تکئے، بستر چادر، رومال، تولیہ ہر ایک پر اس کا نام لکھا، چھپا ہے۔ کہیں ڈھکا کہیں چھپا ... لپ اسٹک، کریم، شیمپو، صابن، پرفیوم کون سی ایسی چیز ہے جو اس کے نام سے منسوب نہ ہو۔ چالیس گز اور چار گرہ والے لباس تک تو آنے والی صدی کے سحر سے بچ نہیں پائے۔ آثار یہ ہیں، آثار کیا حال حالات یہ ہیں کہ ۳۱ ڈسمبر کی رات تک گھر نئی صدی کے کاٹھ کباڑے سے بھر جائے گا اور گھر کی ہر اچھی بری چیز جنک (Junk) صرف کباڑ خانوں میں پھینک دی جائے گی اور تو اور جانے کتنے بچے سائنس کے کرشموں اور والدین کی رضا، و رغبت سے پہلی تاریخ کو عالم آب و گل میں نازل ہونگے۔ جانے انہیں تائید غیبی بھی حاصل ہوگی یا نہیں!

یہ سب تو ہوگا لیکن وہ کمپیوٹر حضرت Y2K کیا گل کھلانے والے ہیں کیا تباہی مچانے والے ہیں ابھی تک تو ان کی ہر "کل" کے سیدھے ہونے کی خبر نہیں۔ ایک طرف لوگ نئی صدی کے کیک، چاکلیٹ، غبارے، کھلونے بنانے میں جٹے ہوئے ہیں تو دوسری طرف اس جن کو قابو میں کرنے میں سرگرداں ہیں۔ اگر اس مہم میں صدی کی آخری گھڑی تک کامیابی نہ ہوئی تو اہل مغرب کی بجلی پانی سب بند، بینک بند، ڈاک خانے بند، گویا زندگی بند۔ تمام نظام حیات درہم برہم کہ وہاں تو انسان نے اپنے ہاتھ باندھ لئے ہیں۔ باندھ کیا لئے ہیں کاٹ لئے ہیں۔ اب ان کٹے ہاتھوں سے وہ کیسے نئی صدی کا استقبال کرے گا؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس عبرتناک انجام کے بعد آگے کے بجائے پیچھے مڑجائے۔ ایک صدی پیچھے ... صدی پیچھے ... پیچھے

اور پیچھے ... اور الٹے پیروں چلتا چلتا اس جگہ تک پہنچ جائے جہاں سے دنیا کا آغاز ہوا تھا۔ اس لمحے کو پکڑ لے جب انسان نے پہلی سانس لی تھی۔ انجانے میں اس دولت کو سمیٹ کر جھولی میں بھر لے جس میں محبت، ایمانداری، رواداری کی دولت تھی، خلوص کی خوشبو تھی، محنت کی دولت تھی۔ جس میں درختوں کی سرسراہٹ تھی، ہواؤں کے گیت تھے، ندیوں کا رقص تھا۔

لیکن حضور یہ تو خواب ہیں جو دیکھے بھی نہیں جاسکتے۔ جو گیا سو گیا، جو گزر گیا وہ گزر گیا۔ ماضی، حال اور مستقبل، ان کی ایک دوسرے سے جگہ کوئی نہیں بدل سکتا۔ دنیا کا کوئی سال نہیں۔ سیاست اور شطرنج کی کوئی چال نہیں ....!

تو پھر آیئے ہم بھی استقبال کریں اس صدی کا جس میں آسمان روئی کے گالے بن بن کر اڑے گا اور فضاء میں بکھر بکھر کر حسن اور نور کا معیار نیا احساس پیش کرے گا۔ جہاں والدین نور نظر لخت جگر کو نہ جانیں گے نہ پہچانیں گے۔ جہاں آسمان سے پانی کے قطروں کے بجائے نوٹوں کی بارش ہوگی۔ زمین سے چاول گیہوں کی جگہ سونے چاندی کی فصل اگے گی۔ جہاں علمیت ہوگی انسانیت نہیں۔ فن ہوگا اخلاقیات نہیں!

خیر کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو اچھا ہے۔ ویسے کچھ سے بہت کچھ تک پہنچنے میں دیر کتنی لگتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک صدی ....! تو اس صدی سے اس صدی تک کے لئے ہم کہیں ہپی نیو ایئر۔ ہپی ملینیم HAPPY MELLENNIUM۔ HAPPY NEW YEAR تالیاں بجائیں، گیت گائیں، سر ہلا کر سر ملا کر اگر ناچنا آتا ہو ناچیں، سب کے ساتھ، قدم سے قدم ملا کر۔ اگر کھڑے کے کھڑے رہ گئے تو کچل جائیں گے، وقت روندتا ہوا آگے نکل جائے گا۔

اگر ناچنا نہ آتا ہو تو اشاروں پر نچانا سیکھ لیں۔ اس صدی کو.... ہر صدی کو....!

گھر جمائی

اسرار جامعی
جامعہ نگر، دلی ۲۵

اے میرے رفیقانِ سخن وقت دعا ہے
سسرال میں داماد برا آ کے پھنسا ہے
تھا ساس سسر پہ جو کبھی دھونس جماتا
دروازے پہ بیگم کے غریب الغربا ہے
آیا تھا "دولھا" بن کے کیا گھر میں چراغاں
اب تو مری بیٹھک میں ڈھبری نہ "دیا" ہے
کھانے میں فقط بھات بنے اور آم کی چٹنی
بریانی میسر ہے نہ مرغے کا پتا ہے
باہر سے تھکا آ کے طلب کرتا ہوں جب چائے
تو ساس ہی دھتکار کے کہتی ہیں کہ "نا" ہے
سالوں نے نظر پھیر لی سالی نے دغا دی
پارا بھی سسر جی کا شب و روز چڑھا ہے
دائی ہو کہ سر پنچ ہو کہ ہوں ساس کی اماں
ان سب کے لئے میرا وجود ایک بلا ہے
وہ میں کہ جو آیا تھا اکڑتا ہوا گھر سے
اب میری اکڑفوں کا نہیں کچھ بھی پتا ہے
رہ رہ کے یہ دل چاہتا ہے زور سے بھوکوں
کٹنے سے بھی افسوس میرا حال برا ہے
گھر چھوڑ کے سسرال کے در پر جو پڑا ہوں
ماں باپ بہن بھائی ہر اک شخص خفا ہے
کہتے ہیں کہ بیٹا جو مرا مرد خودی تھا
وہ مرد بھی اب مرد سے مرد ود بنا ہے
"نوشاہ میاں" مجھکو کہا کرتے تھے جو لوگ
اب "مرد بہو" سب نے مرا نام دھرا ہے
احباب بھی اب طنز کیا کرتے ہیں مجھ پر
کہتے ہیں نہ اس شخص کو کچھ شرم و حیا ہے
غیرت ہے حمیت ہے نہ کچھ نفس کی عزت
داماد ہے یہ شخص کہ بیچ بیچ کا گدھا ہے

اقبال کی برسی

جب کہا اقبال کی برسی کے موقع پر جناب !
آج دلی میں مشاعرہ ہے اک مزاحیہ
آپ خود بھی آیئے احباب کو بھی لایئے !
رو کے بولے مر گئے وہ ڈاکٹر اقبال کیا
میں نے پوچھا جانتے ہیں آپ بھی اقبال کو
سن کے بولے کیوں نہیں اچھی طرح ہوں جانتا
ڈاکٹر اقبال اچھے آدمی تھے شہر کے
آپ کرتے تھے علاج اکثر ہماری بھینس کا

نگاہ مرد مومن

خفا ان سب سے ناحق ہیں یہ دنیا بھر کے کٹھ ملے
کہا اقبال نے جو کچھ انہیں کی ہیں یہ تفسیریں
جنابِ شیخ سے وہ اس لئے نظریں لڑاتی ہیں
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خدمت اردو

اردو زباں کی کرتے ہیں خدمت جو لوگ اب
اس کے طفیل جلد ہی سے پھول پھل گئے
اتنی ترقی کی ہے ترقی کی دوڑ میں
اردو کو پیچھے چھوڑ کے آگے نکل گئے

اردو کی ترقی

اردو زباں ہے کتنی ترقی پہ جامعی
مشہور ہوگئی ہے یہ سارے جہان میں
اس کا سبب ہے اتنا بھی اردو ادب نہیں
نقاد جتنے ہوگئے ہیں اس زبان میں

ڈاکٹر عابد معز

آپسی جال

میں چند احباب کے ساتھ چائے کی میز پر بیٹھا وطن کی سیاسی صورتحال پر بات کر رہا تھا۔ ایک اور دوست آئے اور سینہ پھ
کر ایک کاغذ ہمارے درمیان رکھتے ہوئے اعلان کیا "تازہ اور گرما گرم خبر لے آیا ہوں۔"

احباب خبر پڑھنے میں جٹ گئے۔ میں نے سوال کیا کہ "آپ کو یہ خبر کہاں سے ملی؟"

"میرے اپنے ذرائع ہیں"۔ موصوف نے ڈینگ ماری۔

کسی نے پوچھا۔ "کیا آپ کے ذرائع باوثوق ہیں؟"

"یقیناً میں ضعیف ذرائع پر تکیہ نہیں کرتا۔"

ایک دوست نے ان کی ٹانگ کھینچی۔ "زیادہ اڑنے کی ضرورت نہیں۔ انٹرنیٹ سے اخبار ڈاؤن لوڈ کر کے لا رہے ہو۔"

"یار کچھ دیر کیلئے برداشت کر لیا ہوتا۔ ویسے انٹرنیٹ سے بہت ساری معلومات پلک جھپکتے حاصل ہوجاتی ہیں جس سے خو
اعتمادی آتی ہے۔" موصوف نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیئے۔

"خود اعتمادی تو خیر کیا آتی ہے، شیخی مارنے کا حوصلہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔" اسی دوست نے طنز کیا۔

اس واقعہ سے مجھے تحریک ہوئی کہ دیکھوں انٹرنیٹ کیا بلا ہے؟ یوں بھی پچھلے دو چار برسوں سے انٹرنیٹ ہمارے حواس پر چھا
ہوا ہے۔ انٹرنیٹ رکھنا اور انٹرنیٹ کے حوالے سے بات کرنا بلکہ انٹرنیٹ کے سہارے زندگی گزارنا اسٹیٹس سمبل ہے۔ ہر کس
ناکس کی تان انٹرنیٹ پر ٹوٹتی ہے۔ چار دن قبل میری پھوپی نے انٹرنیٹ کے ذریعہ اپنے لڑکے سے بات کرنے کی روداد سنائی تھی
کل شام انڈے بیچنے والا مجھے انٹرنیٹ کے حوالے سے انڈے خریدنے پر اکسا رہا تھا۔ "صاحب آپ کے گھر میں بہت کم انڈے
استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے انٹرنیٹ پر دیکھا ہے کہ دنیا میں ہر انسان کے حصہ میں یومیہ ڈیڑھ انڈا آتا ہے۔ آپ کے گھر فی کس
آدھے انڈے سے بھی کم انڈوں کی کھپت ہے۔"

دو دن بعد میرے ایک دوست نے انٹرنیٹ کے ذریعہ خریدی گئی کراکری کی نمائش کے لئے چائے پر بلایا ہے۔

انٹرنیٹ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اور انٹرنیٹ کی تعریف کوئی ماہر ہی کرسکتا ہے۔ ایک عام آدمی انٹرنیٹ کو اپنے حساب
سے جانتا اور سمجھتا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے میرے ایک ساتھی کے بموجب انٹرنیٹ وہ سہولت ہے جو باس کے سکریٹری کو میسر
ہے اور ہمیں نہیں۔ اس لئے کہ ہم باس کے چمچے نہیں ہیں۔ مجھے انٹرنیٹ Mosquito Net اور Fish Net کی طرح ایسا دام
جال لگتا ہے جس میں ہم یعنی انسان پھنستے جاتے ہیں۔ آپ کو اختلاف اگر ہے تو کسی انٹرنیٹ رکھنے والے سے پوچھ لیجئے۔ وہ کس طرح
اور کیسے انٹرنیٹ میں پھنسا رہتا ہے۔ منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں اور گھنٹے دنوں میں۔ ہم انٹرنیٹ میں بلا لحاظ عمر، رنگ
نسل، قوم و ملک پھنسے ہوئے ہیں۔ حضرت میر سے معافی کی درخواست کے ساتھ عرض ہے:

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب انٹرنیٹ کے اسیر ہوئے

میں ٹھہرا اردو کا آدمی، انگریزی الفاظ اور جملوں کو اردو میں منتقل کر کے سکون ملتا ہے اور بات آسانی سے سمجھ میں بھی آتی ہے۔ ذہن میں انٹرنیٹ کے لئے "آپسی جال" "آپسی دام" یا "انتر جال" جیسے الفاظ ابھرنے لگے جنہیں میں ماہرین کی نذر کر رہا ہوں۔

انٹرنیٹ کے ذریعہ ہم کہیں بھی اور کسی کے پاس بھی پہنچ سکتے ہیں۔ ہزاروں میل دور رہنے والے انجان لوگوں کے حضور میں حاضری دے کر ان کی خیریت دریافت کرسکتے ہیں لیکن انٹرنیٹ تک رسائی ہر ایک کے لئے اتنی آسان نہیں ہے۔ ہزاروں روپئے چاہئیں۔ اپنے لوازمات اور متعلقین کے ساتھ کمپیوٹر درکار ہے۔ ٹیلی فون کی لائین ضروری ہے اور انٹرنیٹ سے جڑے رہنے کیلئے کرایہ دینا پڑتا ہے۔ مجھ جیسے ایسے لوگ جو اپنے بل بوتے پر انٹرنیٹ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کیلئے انٹرنیٹ کیفے کے دروازے کھلے ہیں۔ وہاں جائیں اور حسب سکت آپسی دام میں گرفتار ہوں۔ مفت چائے اور کافی نوش کرنے کی سہولت رہتی ہے۔ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے انٹرنیٹ کے ذریعہ کسی بھی موضوع پر دنیا جہاں کی معلومات اکٹھا کی جاسکتی ہیں۔ انٹرنیٹ میں داخل ہوکر حکم کیجئے کہ مجھے فلاں موضوع پر انفارمیشن چاہئے پھر دیکھئے اس موضوع پر کہاں کہاں سے معلومات ملتی ہیں۔ آپ حیرت اور اطلاعات کے بوجھ تلے ڈوبتے جاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب آپ حاصل شدہ معلومات سے پریشان ہو اٹھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ کون صحیح اطلاعات فراہم کر رہا ہے اور کون آپ کو بھٹکا رہا ہے۔ اس انفارمیشن کا کیا فائدہ جب آپ اسے استعمال نہ کر سکیں۔ ایک انٹرنیٹ کیفے میں چائے کا عجیب و غریب ذائقہ چکھنے کے بعد میں نے چائے کے بارے میں معلومات مانگیں۔ انٹرنیٹ اطلاعات کا خزانہ لٹانے لگا۔ چائے کی کتنی اقسام ہیں، کہاں اگائی جاتی ہیں، اسے کیسے تیار کیا جاتا ہے، دنیا میں سب سے زیادہ چائے کہاں پی جاتی ہے، چائے میں موجود عناصر کی خصوصیات کیا ہیں۔ ہمیں چائے کی عادت کیوں پڑتی ہے۔ چائے کے کیا فائدے اور نقصانات ہیں۔ چائے سے کونسی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ چائے پینے کے لئے ہم کتنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ چائے اگانے، بیچنے اور پینے والوں کی انجمنیں کہاں کہاں ہیں۔ انکے پتے کیا ہیں اور ان کی خواہشات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ صرف چائے پر ملنی والی انفارمیشن سے گھبرا کر میں نے چائے نوشی ترک کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

انٹرنیٹ کے ذریعہ ہم انجان لوگوں سے مل سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ انکے مسائل کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان سے دوستی کرسکتے ہیں۔ ان سے خط و کتابت کرسکتے ہیں۔ ان سے بحث کرسکتے ہیں۔ یہ ایک ایسی جادوئی سہولت ہے جو آگے جا کے نہ جانے کیا گل کھلائے گی۔ میں اپنے گھر بیٹھا ہونو لولو کی ایک حسینہ سے متعارف ہوا تھا۔ فلموں میں ہزارہا مرتبہ دکھائے گئے آپس میں ٹکرانے والے سین کے ری پلے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ویزا اور دیگر بندشوں سے بے نیاز میں اسے دیکھ اور سن سکتا تھا۔ گھنٹوں ہم باتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ آخر وہ میرے دام محبت میں گرفتار بھی ہو گئی۔ میرے ہوش ٹھکانے اس وقت آئے جب اس نے انٹرنیٹ پر مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہے۔

"کون روکے گا ہمیں۔" اس نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

اس کے اعتماد کو دیکھ کر میں نے چند سوالات کئے۔ "شادی ہم کہاں کریں گے، ہم کہاں رہیں گے، کیا تم میرے یہاں آؤ گی یا میں تمہارے پاس آجاؤں، ہمارے کتنے بچے ہونگے ..."

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "نہ تم میرے پاس آؤ گے اور نہ ہی میں تمہارے پاس، ہم انٹرنیٹ پر شادی کریں گے اور رہیں گے بھی انٹرنیٹ ہی میں اور ہاں اتنا جلد بچوں کے بارے میں سوچنا مناسب نہیں ہے۔"

اس کے جواب پر میں افلاطونی محبت اور شادی سے باہر نکل کر حقیقی دنیا میں لوٹ آیا اور اس کے بعد سے انٹرنیٹ پر کسی

سے خواہ مخواہ ہی دوستی کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔

انٹرنیٹ پر ہم اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر جگہ حاصل کرکے اپنا ہوم پیج کھولئے۔ اس صفحہ پر تصویر کے ساتھ اپنا تعارف کروائیے۔ دوسرے صفحوں پر اپنے خاندان، گھر، شہر اور مشاغل کے بارے میں بتلائیے۔ ساتھ ہی اپنے خیالات کی تشہیر بھی کیجئے۔ کوئی آپ تک پہنچے یا نہ پہنچے آپ خود انٹرنیٹ پر اپنے آپ کو دیکھئے اور لطف اٹھائیے۔ شاعر حضرات اپنا کلام انٹرنیٹ پر پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنا کلام عرض کرنے جیسا مزہ کہاں سے آئے گا۔ ہم جیسے ادیب جن کو قاری نہیں ملتے اپنی تخلیقات کو انٹرنیٹ پر پیش کرکے مطمئن اور سرشار ہوسکتے ہیں کہ ہم نے اپنی تخلیقات کو قارئین تک پہنچا کر اپنا فرض اور قرض ادا کردیا ہے۔ آگے قارئین کی مرضی۔

انٹرنیٹ پر شاپنگ کی سہولت بھی ہے۔ انٹرنیٹ پر بازار لگتا ہے۔ گھر بیٹھے دوکانوں کی سیر کیجئے۔ سامان الٹ پلٹ کر دیکھئے۔ اشیاء پسند آئیں تو بھاؤ تاؤ کیجئے۔ سودا طے ہونے پر آرڈر دیجئے۔ آپ کے اکاونٹ سے پیسے وصول کرلئے جائیں گے اور اشیاء آپ تک پہنچادی جائیں گی۔ آپ مسافت اور شاپنگ کی تھکن سے محفوظ رہتے ہیں۔ وقت بھی بچتا ہے۔ جس کو آپ انٹرنیٹ دیکھنے میں استعمال کرسکتے ہیں۔ میں بعض مرتبہ انٹرنیٹ پر بیٹھا کھانے کا آرڈر دیتا ہوں۔ ہوٹل سے کھانا آجاتا ہے اور کھاتے ہوئے بھی میں انٹرنیٹ میں الجھا رہتا ہوں۔

قصہ مختصر انٹرنیٹ نے دنیا کو سکوڑ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا ایک چھوٹے گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے جسے گلوبل ویلج یا عالمی گاؤں کا نام دیا جاتا ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ انسان نے دنیا کا آغاز چھوٹے چھوٹے قریوں سے کیا تھا۔ اس نے گاؤں گاؤں جوڑ کر شہر بنائے۔ چھوٹے شہر بڑے اور بہت بڑے شہر بنے اور پھر اس نے ساری دنیا کو ہی ایک گاؤں بنا دیا...... واہ رے سائنس کی ترقی! ☆

شیر خرمے کے دو ایڈیشن

ایک عام

ایک ڈی لکس

کئی لوگ اسے عید الفطر کہتے ہیں، بہتوں کے ہاں یہ رمضان کی عید کہلاتی ہے۔ پھر بہت سے ہم جیسے لوگ ہیں جو اسے صرف سویوں اور شیر خرمے کی عید ملتے ہیں۔ یہ زاویہ نگاہ کی بات ہوتی ہے۔

سویاں طرح طرح کی ہوتی ہیں (صرف طرح مصرعہ نہیں ہوتیں) عاشق کی عقل کی طرح موٹی بھی ہوتی ہیں اور محبوب کی کمر کی طرح پتلی بھی ہوتی ہیں لیکن نہیں محبوب کی کمر تو ہوتی ہی نہیں ہے۔ کہا گیا ہے "

میاں لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے

(آبرو کے زمانے میں محبوب کو میاں ہی کہا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہر خاتون جواں مرد ہے اور ہر مرد..... جیسا بھی ہے آپ کو معلوم ہی ہے۔)

اس لئے کمر کی عدم موجودگی میں سویوں کو لب نازک سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے کیونکہ یہ اکثر و بیشتر صورتوں میں گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ہوا کرتے ہیں۔ میر تقی میر نے تو یہی کہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں خوشبو، لپ اسٹک کی ہوا کرتی ہے اور رنگ جھڑ جایا کرتا ہے (رنگ کی اب زیادہ پرواہ بھی نہیں کرنی چاہئے۔ ایک سال کے عرصے میں لوگوں کے کتنے رنگ نظر آگئے) سویوں کی پرکھ اور جان کاری رکھنے والوں کا خیال ہے کہ موٹی سویاں بہتر ہوتی ہیں۔ بھونی جانے کے بعد بھی ان میں دم خم رہتا ہے۔ باریک سویاں تو بیچاری دوسرے درجے کی شہریوں کی طرح دب کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن یہ عید، اصل میں شیر خرمے کی عید ہوتی ہے کیونکہ یہی صحیح لفظ ہے۔ سویاں تو شیر خرمے کا جز ہوا کرتی ہیں، اصل نہیں ہوتیں۔ لیکن اب شیر خرمہ بھی حکومتوں کی طرح برائے نام رہ گیا ہے۔ شیر خرمے سے لطف اندوز ہونے کا صحیح زمانہ وہ تھا جب ہمارے ہاں صحیح النسل بھینسیں تولد ہوا کرتی تھیں اور بڑی ہو کر قیامت ڈھایا کرتی تھیں۔ (اب تو شاید بھینسیں بھی ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ پیدا ہونے لگی ہیں۔ قطرہ قطرہ دودھ دیتی ہیں اور وہ بھی دوا کے مزے کا) اصل دودھ اس دودھ کو کہا جاتا ہے جس پر دو انچ موٹی بالائی جم جاتی تھی۔ اس زمانے میں اصل دودھ دینے والی بھینسوں کی پہچان یہ تھی کہ بھینس تو پانی میں رہتی تھی اور صرف اس کے سینگ دیکھ کر لوگ اس کی قیمت لگاتے تھے۔ (ادب میں بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ کتاب کا گٹ اپ دیکھ کر کتاب خریدی جاتی ہے) اب تو بھینس کو چاروں طرف سے الٹ پلٹ کر دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ بھینس ہے بھی یا نہیں۔ بھینسوں کو جب اطلاع مل جاتی ہے کہ ان کی معقول قیمت لگائی جاچکی ہے تو وہ صحیح دودھ دینے میں کوتاہی نہیں کرتی تھیں ورنہ ناراض ہو کر اندر ہی اندر اپنا دودھ خود پی لیتی تھیں۔ (اسے دودھ چرانا کہا جاتا تھا۔ بدن چرانے کی ترکیب بھی یہیں سے نکلی ہے) نادان بھینسیں جنھیں نئے ایڈمنسٹریشن کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اب بھی اصلی دودھ دینے میں تامل نہیں کرتیں لیکن مجموعی طور پر

ب بھینسوں میں عقل آگئی ہے اور ان میں بھی کاہلی، سستی اور تاہلی کی صفات پیدا ہوگئی ہیں۔ اب اگر سینگ دیکھ کر بھینس
ریدی جائے گی تو وہ دودھ نہیں دے گی صرف سینگ مارے گی۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو بھینسیں پانی میں دیر تک کھڑے ہوکر اپنا
قت ضائع کرتی ہیں ان کا دودھ خود بخود پتلا ہوجاتا ہے (پانی بھی اس سیاست کی طرح گدلا ہوگیا ہے) اس لئے کچھ دلو بھیا لوگ اب
ھینسوں کو بھی ڈرائی کلین کروانے لگے ہیں۔ (آدمیوں کے کپڑے ان جگہوں پر نہیں دھل سکتے۔ جینس (Jeans) کی بات اور ہے)
یسی ہی ڈرائی کلین کی ہوئی بھینسوں کا دودھ شیر خرمے میں استعمال کیا جانا چاہیے کیونکہ شیر خرما سال میں ایک ہی مرتبہ کھایا جاتا ہے۔

شیر خرما وہ پکوان ہے جس میں پکوان کا معاملہ کم اور حیران ہونے کا معاملہ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ شیر خرمے میں بادام، پستہ،
رد نجی، کھجوریں، سویاں، اسی طرح شریک ہیں جس طرح اچھے شعر میں زبان، بندش لطف و نشر، مضمون آفرینی وغیرہ ضروری ہیں۔ ان
ب چیزوں کی صفائی، پسائی، دھلائی اور گھلائی کئی دن پہلے سے کرنی پڑتی ہے اور انھیں ایسے نیچے پانچ کر ایسی جگہ رکھ دینا پڑتا ہے کہ جب
ن کی ضرورت پڑے تو کسی کو یاد نہ آئے کہ کہاں رکھی ہوئی ہیں۔ آدھا دن ان کی تلاش میں نکل جائے۔ شیر خرمے کیلئے صرف دودھ
ین وقت پر ایک دن پہلے منگوانا پڑتا ہے اور دودھ منگوانے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ جگہ جگہ سے منگوایا جائے ایک ہی جگہ سے دودھ
نگوانے میں خطرہ یہ ہے کہ دودھ پتلا آتا ہے لیکن دو چار جگہ سے منگوانے میں فائدہ یہ جبکہ ایک دوکان سے دودھ پتلا آتا ہے تو دوسری
دکان سے اس سے بھی پتلا۔ دودھ گرم کرتے وقت ان ہمہ اقسام کے دودھوں میں تھوڑا سا پانی اپنی طرف سے بھی ملا دیا جائے۔ شیر
رما تیار کرنے کی صحیح ترکیب یہی ہے۔

عید اگر اچانک آجائے (ایسا بھی ہوا کرتا ہے) تو سارے شہر میں گھبراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ (شہر میں کسی نہ کسی چیز کا
ٹتے رہنا ضروری ہے) اور ہر شخص دودھ کی تلاش میں گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ دودھ بیچنے والے پانی کی فکر میں نکل پڑتے ہیں۔
ا ہے درزیوں کے ہاں بھی لائین لگ جاتی ہے اور جو کپڑا جس کے ہاتھ لگ جاتا ہے اسی کا ہوجاتا ہے کیونکہ شاعر کہتا ہے جو بھی ہاتھ
ھا کر اٹھالے جام اسی کا ہے۔ عید کے دن اسی لئے اکثر لوگ ایسے کپڑوں میں نظر آتے ہیں جو یا تو قافیے کی طرح تنگ ہوتے ہیں یا
اسی بیانوں کی طرح پھیلے ہوئے۔ شیر خرما یوں تو آپ جب چاہیں کھا سکتے ہیں لیکن یہ صرف عید کے دن کی خاص الخاص ڈش ہے۔
ید کے بغیر شیر خرما یا شیر خرمے کے بغیر عید ایسی ہی ہے جیسے آدمی تن تنہا ہنی مون منانے کی کوشش کررہا ہو۔ عید کے دن کے
ر خرمے اور کسی اور دن کے شیر خرمے میں وہی فرق ہوتا ہے جو برتھ ڈے کیک اور معمولی کیک میں ہوا کرتا ہے۔ (برتھ ڈے کیک
جب ہیپی برتھ ڈے ٹو یو بی کاڑھ دیا جاتا ہے تو اس کی قیمت میں ۱۰ روپیے کا اضافہ ہوجاتا ہے)۔

شیر خرما ہی وہ تنہا ڈش ہے جو کسی ہوٹل میں نہیں ملتی اور اگر کسی ہوٹل میں شیر خرما فروخت کیا جاتا ہے تو سمجھ لیجئے یہ اصل شیر
ا نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے شراب کی ناجائز کشید۔ شیر خرمے کی بھٹیاں نہیں ہوا کرتیں۔ یہ ہوٹل میں کشید کرنے کی چیز نہیں۔
ں کی تیاری میں جب نسوانی ہاتھوں کا دخل نہ ہو تو وہ شیر خرما شادی کی اس بارات کی طرح ہوتا ہے جس میں صرف سہرے لے جایا جارہا
، دلہن نہ ہو۔ جو لوگ غور سے یعنی دل لگا کر شیر خرما کھاتے ہیں، انھیں شیر خرمے میں چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی ہے۔ یہ وہ لوگ
تے ہیں جو پھول کا نغمہ اور رنگ کی آواز سننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ کان کھول کر شیر خرما کھائے۔
ھیں بھی کھلی رہیں تو کوئی حرج نہیں۔ شیر خرمے کے تعلق سے یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ مرد گھر کا پورا کھانا پکا سکتے ہیں لیکن
ر خرما نہیں تیار کرسکتے۔ آج تک کوئی ایسا شوہر دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا جسے شیر خرما تیار کرنے پر مجبور یا مامور کیا گیا ہو۔ شیر خرمے
یہ پہلو بھی کچھ کم خوشگوار نہیں۔

شیر خرمے پر روزہ داروں کا حق تو خیر ہوتا ہی ہے لیکن غیر روزہ داروں کا حق بھی برابر کا ہوا کرتا ہے۔ بعض گھروں میں شیر خرمے پر غیر روزہ داروں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔

شیر خرمے کے بارے میں اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسے کھایا جائے یا پیا جائے۔ یہ مسئلہ آج بھی حل طلب ہے۔ (یہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرح ہے جس کا کردار ابھی طے ہونا باقی ہے) بعض لوگ شیر خرما کھاتے ہیں اور بعض لوگ پیتے ہیں۔ اس بات کا انحصار اپنی اپنی عادتوں پر ہوتا ہے لیکن شیر خرمے کے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ اسے پہلے کھانا چاہئے اور پھر پی لینا چاہئے (اسے شیر خرما کھاپی لینا کہا جاتا ہے)۔

عید کی ملاقات بہت مختصر ہوتی ہے تاکہ آدمی کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ گھروں میں جاکر شیر خرما کھاپی سکے۔ کئی نوجوان ایک ہی دن میں تیس تیس پیالیاں شیر خرما شکم نشین کرلیتے ہیں۔ ان میں سے کئی رن آوٹ ہوجاتے ہیں۔ جو جیالے ہوتے ہیں، پورا دن گزرنے پر بھی ناٹ آوٹ رہتے ہیں..... شیر خرمے میں دقت یہ ہے کہ اس سے کھانے یا پینے کی مشق نہیں کی جاسکتی۔ جو کچھ کمال دکھانا ہوتا ہے بغیر مشق کے ایک ہی دن میں دکھانا ہوتا ہے۔ شیر خرما کھانے کے بعد تھوڑا سا عطر ضرور لگالینا چاہئے۔ خوشبو سے آدمی تازہ دم ہوجاتا ہے۔ اکثر مائیں عید کی نماز کے لیے جب اپنے بیٹوں کو بھیجتی ہیں تو دعائیں دے کر بھیجتی ہیں کہ بیٹا زیادہ سے زیادہ گھروں سے شیر خرما کھاکر پلٹنا۔ راستے میں کہیں ہمت نہ ہار جانا۔

لیکن جتنی خوشی شیر خرما کھانے میں ہوتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ شیر خرما کھلانے میں ہوتی ہے۔ اس میں بس احتیاط کرنی چاہئے کہ پیالیاں جن میں شیر خرما پیش کیا جائے اتنی بڑی ہوں کہ ان میں دو چمچے شیر خرما سما سکے۔

بعض گھروں میں شیر خرمے کے دو ایڈیشن نکالے جاتے ہیں ایک عام اور ایک ڈی لکس۔ ڈی لکس ایڈیشن شیر خرما ان لوگوں کی قسمت میں ہوتا ہے جو ...... آپ خود سمجھ جائیے کہ یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں۔

عید کے دن کسی کو شیر خرما کھانے سے روکنا مناسب نہیں ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ شیر خرمے کے بعد اگر پان پیش کریں تو اس میں چونا ذرا زیادہ لگادیں۔ کم سے کم دوسروں کے گھروں میں امن رہے گا۔

لیکن شیر خرمے کے بغیر بھی تو عید مبارک کہا جاسکتا ہے۔ ان دو لفظوں میں بھی کچھ کم مٹھاس نہیں ہوتی۔ ☆

ڈاکٹر حبیب ضیا
حیدرآباد

عید

عید کے معنی خوشی کے ہیں۔ کسی کو اچانک بہت زیادہ خوشی ملتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے بے وقت کی عید نائی۔ بہت دنوں تک غائب رہنے کے بعد کوئی آتا ہے تو اسے کہتے ہیں تم تو عید کا چاند ہوگئے۔ وقت گزر جانے کے بعد بے موقع کام یں تو "عید کے پیچھے ٹر" والی کہاوت استعمال کی جاتی ہے۔

ماہ رمضان کا چاند دیکھتے ہی لوگ عید کی تیاری شروع کردیتے ہیں۔ عید کیلئے خریدی جانے والی چیزوں میں سب سے پہلا نمبر پڑوں کا آتا ہے۔ بعض لوگ سہولت کی خاطر علی الحساب بیس پچیس میٹر کپڑا ایک ہی پرنٹ کا خرید لیتے ہیں۔ صدر خاندان کا شرٹ بانے کے بعد جو کپڑا بچتا ہے اس میں سلسلہ وار بچوں کی عمر اور قد کے لحاظ سے ناپ دے کر چار پانچ جتنے بھی شرٹ درکار ہوں سلوا یتے ہیں۔ یہی فارمولا لڑکیوں کے کپڑوں کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ نماز پڑھ کر مختلف گھروں کے شیر خرمے کا ذائقہ چکھنے کے لئے جب یہ یونیفارم والی ٹیم باہر نکلتی ہے تو ہر کسی کی نظریں اس پر جم جاتی ہیں۔ کیثرالعیال دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے شاء اللہ نکل جاتا ہے۔ "ہم دو ہمارے دو" والا دیکھتا ہے تو زبان کو لگام دیئے بغیر پوچھتا ہوا آگے نکل جاتا ہے "گھر میں اور کتنے ہیں؟"

عید کی آمد سے قبل زکوٰۃ دینے کے فرض سے بھی سبکدوشی ضروری ہے۔ اکثر لوگ زکوٰۃ کے کپڑے خریدنے کے لئے ایسی کان تلاش کرتے ہیں جہاں کم سے کم روپیوں میں زیادہ سے زیادہ زکوٰۃ کا ثواب اور شہرت مل جائے۔ ایک ساڑی کی قیمت میں تین اڑیاں ایسے ہی ثواب کمانے والوں کے لئے فروخت ہوتی ہیں۔

عید اور شیر خرما لازم و ملزوم ہیں۔ شیر خرما پینے کی چیز ہے۔ لیکن بعض ماہر پکوان خواتین اس میں سوئیوں کے علاوہ گھی، بادام، رد نجی، زعفران اور کھجور کثیر مقدار میں ملاتی ہیں کہ وہ گاڑھا ہو کر شیر قورمہ بن جاتا ہے۔ ہر [illegible] ایک نئی چیز منہ میں آتی ہے۔ کبھی پنڈ کھجور کا بڑا ٹکڑا تو کبھی کشمش اور کبھی غلطی سے رہ جانے والا ثابت بادام۔ تھوڑی دیر کیلئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر خرما نہیں بلکہ انی معجون ہے۔

عید کے دن ہر گھر میں سوئیاں ابالی جاتی ہیں۔ سوئیوں کا میٹھا بنتا ہے اور سوئیوں کا شیر خرما بنتا ہے۔ شیر خرما صرف گھر پر ہی میں لایا جاتا بلکہ اڑوس پڑوس، دوست احباب اور رشتہ داروں کے پاس خاص اہتمام سے بھیجا بھی جاتا ہے۔ مختلف گھروں کے شیر رمے کے جو حصے آتے ہیں انہیں خالی کرنا اور رکھنا بڑے معرکے کا کام ہے۔ ایک گھر سے آئے ہوئے شیر خرمے میں باریک سوئیاں ہوتی ہیں تو ایک میں موٹی۔ ایک میں بیمار چرونجی کی کثرت ہوتی ہے تو ایک میں صحت مند بادام۔ ایک کٹورے میں چمچے کو وٹا دیں تو اس کی تہہ سے دودھ پیئے ہوئے مست کھجور برآمد ہوتے ہیں تو ایک میں کھوپرا تیرنے کے موڈ میں رہتا ہے۔ سوئیوں کا ی یہی حال ہوتا ہے۔ ابلی ہوئی، بہت ابلی ہوئی، بہت زیادہ ابلی ہوئی اور حلوہ نما، جیسی بھی ہوں کھوپرا اپنی رنگینیوں سمیت ضرور وجود رہتا ہے۔ عید کے دن ہوشیار خواتین باورچی خانے میں دو خالی بگونے رکھتی ہیں۔ مختلف جگہوں سے آنے والے کٹوروں کو یک بگونے میں اور طشتریوں کو دوسرے بگونے میں انڈیل کر حصہ بھیجنے والے کو شکریہ، سلام اور عید مبارک کہلا بھیجتی ہیں۔ جب نہیں اطمینان ہوجاتا ہے کہ اب کہیں سے حصہ نہیں آئے گا وہ چستی کے ساتھ اس نورنگ شیر خورے اور ملٹی کلر سوئیوں کے حصے انا شروع کردیتی ہیں۔ اوپر سے اپنے ہاتھ کے تلے ہوئے کاجو اور اپنے ہی ہاتھوں سے رنگا ہوا کھوپرا بکھیر دیتی ہیں۔ آن کی آن میں

سارے لوگوں سے نبٹ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاتی ہیں۔

نوکر جتنا پرانا ہوتا ہے مالک کے لئے اتنا ہی عذاب جان بنتا ہے۔ ایک گھر میں ماما برسوں سے کام کرتی چلی آرہی تھی۔ پکوان گھر کی صفائی کے ساتھ ہاتھ کی صفائی میں بھی اسے کامل مہارت تھی۔ مالکن اسے نکال باہر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن جب بھی کوئی چیز چوری ہوجاتی تو اسے یوں کوستی "خدا کرے تیرے دیدے گھٹنے پھوٹ جائیں" ماما کو یہ کوسا یقیناً برا لگتا تھا چونکہ اس کے ستارے طاقتور تھے اس لئے اسے کوسا لگتا نہیں تھا۔ ایک عید کے موقع پر اس نے فرمائش کی کہ اسے بالکل ویسی ہی ساڑی چاہئے جیسی مالکن پہنے گی۔ مالک تو خوشی خوشی تیار ہوگئے لیکن مالکن کے وقار کا مسئلہ تھا۔ اس کی فرمائش کو انہوں نے ایک ہی لات میں ٹھکرا دیا۔ اس دل جلی نے مالکن کو یوں کوسنا دیا "خدا کرے اس گھر کا شیر خرما پھٹ جائے"۔ ماما کے دل سے نکلی ہوئی بد دعاء سیدھی شیر خرمے کو جا لگی اور سارا کا سارا شیر خرما پھٹ کر شیر قورما بن گیا۔

عید کے دن شیر خرمے کے علاوہ عیدی کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عیدی دینے والے اپنی استطاعت اور لینے والے کی حیثیت دیکھ کر عیدی دیتے ہیں۔ اکثر والدین عید کی آمد سے ایک ماہ قبل اپنے بچوں کو باقاعدہ تربیت دیتے ہیں کہ جو بھی ملنے آئے خواہ وہ دور کا رشتہ دار ہو یا قریبی دوست۔ ضد کرکے زبردستی عیدی وصول کریں اور جب تک اس کا ہاتھ جیب کا رخ نہ کرے اس کا شیر خرما حرام کر دیں۔ اس جرمانے سے ڈر کر لوگ آنے والی عید کیلئے ان گھروں پر سرخ خطرے کا نشان لگا دیتے ہیں۔

ایک نئے پیش امام کو عید کی نماز سے قبل ایک بڑا مجمع ہاتھ آیا۔ انہوں نے موقع کو غنیمت جان کر کہنا شروع کیا:

"آج آپ نماز پڑھنے آئے ہیں مگر آپ کا دل کہیں اور ہے۔ آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ جلدی سے سجدے مار کر کسی سینما ہال کا رخ کریں گے مگر میں ایسا نہیں ہونے دونگا۔ مجھے اتنا بڑا مجمع پھر کبھی نہیں ملے گا۔"

انہوں نے بہت ہی موثر انداز میں حاضرین کے حال پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے آنے والے کل سے ہوشیار کیا۔ اس کے بعد وہ ان نوجوانوں سے مخاطب ہوئے جو چست لباس پہن کر آئے تھے۔ ان کی عید کی خوشیاں پیش امام صاحب نے اس طرح ملیا میٹ کیں۔

"آج کے نوجوان فیشن پرستی میں مگن ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آج آپ اپنے والدین کے منع کرنے پر بھی ایسا لباس پہن کر یہاں آسکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ کل آپ کو سفید ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا کر یہاں لایا جائے گا۔"

بہر حال اس وعظ کو سننے کے بعد لوگوں کا موڈ بن گیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو تیار کرلیا کہ اس سال تو یہاں سے نکل کر دوست احباب کے پاس جائیں گے۔ آئندہ حال ہوسکتا ہے کہ دوست احباب پھول نچھاور کرنے آئیں۔

وعظ ختم ہوتا ہے۔ لوگوں کی وقتی پریشانی بھی رفع دفع ہوجاتی ہے۔ اس دوران کسی کی جیب خالی ہوئی تو کسی کا جوتا غائب ہوا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے چلتا رہے گا۔ سب خوش خوش اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ عورتیں سج دھج کر تیار رہتی ہیں۔ انعام کے لئے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ رنگ برنگی کشتی پوش پڑی ہوئی کشتیاں ایک گھر سے دوسرے گھر لیجائی جاتی ہیں۔ سڑکوں پر گلی نکڑوں پر لوگ بلالحاظ مذہب و ملت انتہائی گرم جوشی سے گلے ملتے ہیں اور عید کی مبارکباد دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بہر حال عید کی رونق ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

خدا کرے یوں ہی عید ہر گھر آئے اور ہر سال اپنی بہاریں لٹاتی رہے۔

●☆●☆●

خواتین کا ریزرویشن
(تینتیس فی صدی)

سنیل کمار تنگ
کاغذی محلہ، سیوان بہار

اپنی جگہ بنائے گی اپنے وطن میں اب
گھر سے نکل کے آئے گی سنسد بھون میں اب
آنا پڑے گا مرد کو اس کی شرن میں اب
سپنے حسین جاگے ہیں عورت کے من میں اب
اب مرد گھر میں بیٹھ کے چولہا جلائیں گے
نیتا گری کو چھوڑ کے روٹی پکائیں گے

جمپر پہننا چھوڑیں گی اب تنگ لڑکیاں
دھارن کریں گی شوق سے کھادی کی ساڑیاں
کھنکا کریں گی اب تو سیاست کی چوڑیاں
مرغوں سے بیس ہو کے رہیں گی یہ مرغیاں
اب حسن کا محاذ یہاں گل کھلائے گا
جمہوریت میں ایک نیا رنگ لائے گا

کہتے ہیں جو کہ دیس کی حالت سنبھالیں گے
جمہوریت کی ڈوبتی کشتی نکالیں گے
دراصل اپنے فن کا وہ سکہ اچھالیں گے
کتنے کہاں تک ان کو بھلا آپ ٹالیں گے
بیگم کو وہ چناؤ لڑائیں گے پیار سے
سنسد میں وہ تو آئیں گے پیچھے کے دوار سے

جب عورتیں بھی جیت کے سنسد میں آئیں گی
تو قومی اتحاد کا منظر دکھائیں گی
ہر قوم کو یہ پیار کا لیسن پڑھائیں گی
مذہب کی راجنیت کے چھکے چھڑائیں گی
مسلم کی عیدگاہ نہ ہندو کے دھام پر
ہوگی جو بحث بھی تو محبت کے نام پر

اک بھیڑ سی لگے گی سیاسی دکان پر
آئے گی ہاتھ جوڑے حسینہ مکان پر
مانگے گی ووٹ اپنے چناوی نشان پر
بجلی گرا کے جائے گی اک اک جوان پر
بندوق چپ رہے گی سیاسی تناؤ میں
گولی چلے گی آنکھ سے اب کے چناؤ میں

ہوجائے پہلے پاس خواتین کا تو بل
نیچی رہیں گی ٹوپیاں اونچی رہے گی بل
بھاری پڑے گا مونچھ پہ چہرے کا کالا تل
مردوں کا اب تو خوف سے دھڑکا کرے گا دل
حاوی جو ہوگی دیس پہ تینتیس فی صدی
کیا خوب رنگ لائے گی اکیسویں صدی

سرکار راجنیت حکومت کو دیکھئے کرسی کو دیکھ لیجئے وزارت کو دیکھئے
سازش کی چال اور سیاست کو دیکھئے پارٹی کو کشمکش کو بغاوت کو دیکھئے

یہ جتنے لفظ ہیں سبھی تانیث ہیں جناب
پھر کیوں رہے نہ ان کا الکشن میں رعب داب

پردہ نشین لڑتی ہیں آنگن میں دوستو ! اور اپوڈیٹ کھیت میں خرمن میں دوستو !
رکھے گا کون اب انہیں چلمن میں دوستو ! آئیں گی کھل کے اگلے الکشن میں دوستو !

لڑنے پہ اعتراض ہے کیوں اپنے راج میں
فطرت ہی عورتوں کی ہے لڑنا سماج میں

احکام اہلیہ پہ سر اپنا جھکائیے اے تنگ اب زبان پہ تالا لگائیے
تینتیس فی صدی پہ ہی قربان جائیے عزت بچائیے میاں عزت بچائیے

بیگم کو آپ نے تو منسٹر بنادیا
پھر بل کے بھی بردہ میں جھنڈا اٹھالیا

سید اسد اللہ حسینی چکر
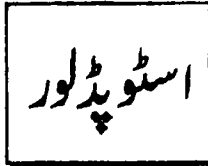
6949 Laurel Canyon Blud
APT # 201, N. Hollywood
CA 91605. U.S.A.

اسٹوپڈلور

کان بھی پھٹنے لگے اور سر بھی چکرائے " ہنی "
گو کہ اب تو ہو گئی ہے چار سو چالیس پونڈ
خود کشی کی دھمکیوں سے ڈرنے والا میں نہیں
سینکڑوں لوگوں میں تیرے قد و قامت کے سبب
" آئی لو یو " اور " یولوی " تو پھر کیا چاہیے
دفن کر دینا مجھے تو اپنے ہی بیڈروم میں
یہ تری خوش قسمتی ہے بعد اس کے گر تجھے

میرے بازو لپیٹ کر جب تو غزل گائے " ہنی "
پر مجھے تو " ٹین ایجر " ہی نظر آئے " ہنی "
چاہے تو زندہ رہے چاہے تو مرجائے " ہنی "
جس طرف دیکھوں ادھر تو ہی نظر آئے " ہنی "
جو ترا " ہسبنڈ " ہے اب وہ بھاڑ میں جائے " ہنی "
گر ترے پہلو میں میرا دم نکل جائے " ہنی "
کوئی " اسٹوپڈلور " چکر سا مل جائے " ہنی "

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس
حیدرآباد

کوّا چلا ہنس کی چال

بڑے بوڑھوں سے پوچھا، حکیموں اور دیدوں سے دریافت کیا، پنڈتوں اور ملاؤں سے بحث کی لیکن کوئی یہ نہیں بتا سکا کہ کوا آخر ہنس کی چال ہی کیوں چلتا ہے ؟ نقل کرنا ہی تھا تو کبوتر کی چال کی نقل کرتا جو اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ اسے دیکھ کر ہمارے شاعروں کو معشوق کی چال یاد آتی ہے ۔ یہ چال بھی کیا غضب کی چیز ہوتی ہے ۔ شاعروں کی آدھی جان چال ہی پر قربان ہوتی ہے اور باقی آدھی جان خال پر ۔ ویسے تو مور کی چال بھی نہایت دلکش ہوتی ہے لیکن مرزا شرافت کا خیال ہے کہ مور کی چال لاکھ خوبصورت سہی لیکن اس کے پیروں کا تصور اس کی ساری دلکشی برباد کردیتا ہے ۔ ظاہر ہے مرزا شرافت کی اس رائے میں شرافت کم، شر اور آفت زیادہ ہے لیکن ہم مرزا کو رائے زنی سے نہیں روک سکتے ۔ یہ ان کا جمہوری حق ہے ۔ جمہوریت نے انسانوں کو اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو لیکن اظہار خیال کا حق وافر مقدار میں دیا ہے ۔ یہ اس کا اتنا بڑا فیضان ہے کہ مرزا اس پر بھوکے رہ کر بھی ایک گھنٹہ اظہار خیال کرسکتے ہیں ۔ جانوروں میں ہاتھی کی چال بھی بڑی البیلی اور مست ہوتی ہے وہ اس طرح جھومتے ہوئے چلتا ہے جیسے کہہ رہا ہو " ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں " ۔ ہر قدم پر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں رہ گیا وہاں رہ گیا ۔ لیکن وہ اسی انداز میں چلتے چلا جاتا ہے ۔ ذاتی طور پر مرزا کو اپنے علاوہ گھوڑے کی چال پسند آئی تھی لیکن وہ بھی صرف دو موقعوں پر پہلی مرتبہ اس وقت جب وہ بزعم خود اپنے خوبصورت چہرے کو سہرے کے پیچھے چھپائے گھوڑے پر بیٹھے تھے اور دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ انہوں نے جس گھوڑے پر رقم لگائی تھی وہ ریس میں اول آیا تھا ، جس کی بدولت مرزا کو اپنی قسطوں میں ہاری ہوئی بڑی رقم کا چھوٹا سا حصہ حاصل ہوا تھا جسے مرزا شرافت نے نہایت شرافت کے ساتھ جہاں سے جیتا تھا وہیں ٹھکانے لگا دیا ۔ ریس کے شیدائیوں کو دیکھا گیا کہ جب ریس کھیلنے جاتے ہیں تو گھوڑے کی طرح تازہ دم اور چاق و چوبند ہوتے ہیں لیکن واپسی کے وقت بیشتر اداس ، تھکے تھکائے ، سر جھکائے اس طرح چلتے ہیں جیسے ریس کورس سے نہیں بلکہ دھوبی گھاٹ سے آرہے ہوں ۔ ہم نے جب مرزا سے اپنے اس تاثر کا اظہار کیا تو وہ اندر ہی اندر سلگ کر لیکن بظاہر ٹھنڈے لہجے میں بولے " تمہاری اس بات سے گدھوں کو قطعی غصہ نہیں آئے گا ؟ " ہم نے پوچھا کیوں ؟ بولے " اس لئے کہ گدھے ریس نہیں کھیلتے ۔ " ہمیں بھی گھوڑے کی چال پسند ہے لیکن شرط یہ ہے کہ گھوڑا شطرنج کی بساط پر ہو ۔ شطرنج کا گھوڑا دو خانے سیدھا چلتا ہے اس کے بعد یکلخت دائیں یا بائیں خانے پر بلہ بول دیتا ہے ۔ اسے ڈھائی گھر کی چال کہتے ہیں ۔ یہ ایسی خطرناک ، غیر یقینی اور اچانک ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے نکل جاتی ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں ہاری ہوئی بازی جیتی جاسکتی ہے ۔ انگریزوں نے ہندوستان میں بہت سی ہاری ہوئی بازیاں محض اپنی ڈھائی گھر کی چال کی بدولت جیتیں ۔ شطرنج کی بازی میں ہمارے نواب اور والیان ریاست بھی کم نہیں تھے لیکن ان میں اور انگریزوں میں فرق یہ تھا کہ ہمارے نوابوں اور جاگیرداروں نے ایک مربع فٹ شطرنج نقشے کو اپنی بساط بنایا تو انگریزوں نے ہندوستان کے نقشے کو اپنی بساط بنایا اور دیسی حکمرانوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کیا اور یہاں کے سیاہ سفید کے مالک ہوگئے ۔

ذکر کوے کی چال کا تھا ۔ ہم شطرنج کی چال تک پہنچ گئے ۔ کوا بڑا سیانا ہوتا ہے ۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس نے ہنس کی نقل

کیوں کی۔ بھلا ہنس کہاں اور کوا کہاں۔ معلوم نہیں کوے کو ہنس کی نقالی کا شوق کب چرایا۔ کتب تواریخ اس ذکر سے خالی ہیں۔ البتہ منشی منقار کا خیال ہے کہ شائد اقبال کے دور سے کوے نے ہنس کی چال چلنا شروع کی کیونکہ علامہ اقبال نے کہا تھا "

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

علامہ کی اس نصیحت کو انسانوں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا، ہمیشہ کیلئے۔ لیکن کوے نے ان کی یہ بات گرہ میں باندھ لی اور بلبل و طاؤس کی نقل کرنے کی بجائے ہنس کی چال چلنے کی کوشش کی کیونکہ علامہ نے بلبل و طاؤس کی تقلید سے منع کیا تھا، ہنس کی تقلید سے نہیں۔ ہم منشی منقار کے اس خیال کی تردید نہیں کرسکتے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ماہر طیور کہتے ہیں۔ دراصل منشی منقار کے گھر میں کوئی ڈیڑھ درجن مرغیاں پلی ہوئی ہیں۔ انہیں کے بل پر وہ اپنے آپ کو ماہر طیور سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مرزا محتاط نے ان کے اس دعوے کو چیلنج کیا کہ "مرغیاں پالنے سے کوئی ماہر طیور تھوڑا ہی ہوتا ہے۔" منشی منقار تڑ سے بولے "سالم علی کے ہاں تو مرغیاں بھی نہیں تھیں پھر بھی انہیں ملک کا مایہ ناز ماہر طیور سمجھا گیا۔ مولوی لقا بھی شریک محفل تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ منشی منقار نے انہیں وارننگ دی کہ وہ اس مسئلہ میں لب کشائی نہ کریں۔ "وہ کیوں بھلا؟" مولوی لقا نے تیوری چڑھائی۔

اس لئے کہ آپ نے اقبال پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ کتاب تو درکنار ایک مضمون تک نہیں لکھا۔ اس کے باوجود آپ اپنے آپ کو ماہر اقبالیات کہتے ہیں جب ہمیں آپ کے ماہر اقبالیات ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تو آپ کو ہمارے ماہر طیور ہونے میں شک کیوں ہے؟

مرزا لقا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ منشی منقار نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ دکھتی رگ دبانے کی یہی تو فائدہ ہے کہ آدمی قائل ہو یا نہ ہو لاجواب ضرور ہوجاتا ہے۔

ہنس کو ہم نے نہیں دیکھا لیکن سنتے ہیں کہ اس کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ موتی کھاتا ہے اور دودھ پیتا ہے۔ اگر دودھ میں پانی ملاکر اس کے سامنے رکھ دیا جائے تو وہ صرف دودھ پئے گا اور برتن میں پانی چھوڑ دیگا۔ اچھا ہوا کہ یہ ہنس صرف کہانیوں میں پایا جاتا ہے، اگر حقیقی دنیا میں اس کا وجود ہوتا تو دودھ بیچنے والوں کیلئے بڑی پریشانی کا باعث ہوتا۔ لوگ صبح ہوتے ہی ایک ہاتھ میں دودھ کا برتن اور بغل میں ایک ہنس کو دبائے ڈیری فارم کا رخ کرتے تاکہ گوالے کے مزعومہ خالص دودھ کی جانچ کرسکیں۔

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی یہ صفت کاش کہ ہمارے ارباب انصاف میں بھی ہوتی۔ کوے کے بجائے ہمارے نظام عدل کے ارباب مجاز کو ہنس کی چال چلنا چاہئے تاکہ عدالتوں میں دودھ کا پانی اور پانی کا دودھ نہ ہونے پائے۔ مرزا شرافت کا خیال ہے کہ دنیا میں آج بھی ہنس پائے جاتے ہیں لیکن ان پر برا وقت آیا ہوا ہے۔ وہ بے چارے دانہ دنکا چگ رہے ہیں اور کوے بڑے ٹھاٹ سے موتی کھارہے ہیں۔ یہ کوے بھی مقدر کے سکندر ہیں۔ برسوں پہلے کہنے والے نے کہا تھا۔ تسلط زاغ نے پایا ہما کے آشیانے پر " گویا کوے ہما کے آشیانے میں رہتے ہیں اور ہنس کی غذا، یعنی موتی کھاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہما اور ہنس بے گھر اور بھوکے پھرتے ہیں لیکن کوئی انہیں پوچھتا ہی نہیں۔ وقت ہی ایسا آیا ہے کہ ہر چیز کی قلب ماہیت ہوگئی ہے۔ ارذل اعلیٰ ہوگئے ہیں اور جو اعلیٰ تھے ارذل ہوگئے ہیں۔ پتھر تیر رہے ہیں اور لپلے ڈوب گئے ہیں۔ بدلی ہوئی قدروں کے اس دور میں اگر ہنس ہوتا تو کوا اس کی چال نہ چلتا بلکہ ہنس کو کوے کی نقل کرنی پڑتی۔ نقل بذات خود بری چیز نہیں ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے نہایت مفید ہے۔ بچہ بڑوں کی نقل سے ہی

بہت کچھ سیکھتا ہے لیکن نقل کیلئے بہر حال عقل ضروری ہے ۔ اندھی تقلید نقصان کا باعث ہوتی ہے ۔ ایک مرتبہ کسی اونٹ کے گلٹی نکل آئی ۔ وہ لوہار کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کی گلٹی کو داغ دے ۔ لوہار نے بھٹی سے سرخ تپتی ہوئی سلاخ نکالی اور اونٹ کو داغ دیا ۔ کچھ ہی دنوں میں اونٹ تندرست ہوگیا ۔ کہیں دور سے ایک کوڑا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا ۔ ایک مرتبہ اس کی کمر میں تکلیف ہونے لگی تو وہ سیدھے لوہار کے پاس گیا اور کہا کہ اسے داغ دے ۔ لوہار نے بہترا سمجھایا لیکن کوڑا نہ مانا ۔ ناچار لوہار نے گرم گرم سلاخ بھٹی سے نکالی اور کوڑے کی کمر پر رکھ دی ۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کوڑے کا کیا حال ہوا ۔

کوا جب ہنس کی چال چلتا ہے تو دو باتوں کا احتمال رہتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ وہ خود اپنی چال بھول جائے گا ۔ دوسری یہ کہ ہنس کی اندھی تقلید بسا اوقات اندھے کنویں میں گرا دیتی ہے چنانچہ راویان شیریں سخن بیان کرتے ہیں کہ کسی دھوبی کے پاس ایک گدھا تھا ۔ دھوبی بڑا ظالم تھا ۔ وہ گدھے سے کام تو لیتا لیکن اسے کھانے کو کچھ نہ دیتا بلکہ کام ختم ہوتے ہی ڈنڈے مار کر اسے گھر سے باہر بھگا دیا کرتا تھا ۔ روز روز کے فاقوں اور ڈنڈوں سے گدھا عاجز آگیا ۔ ایک دن جب دھوبی نے اسے گھر کے باہر کردیا تو وہ سیدھے جنگل کی طرف ہولیا تاکہ باقی ماندہ زندگی جنگل کے کسی گوشے میں گذار دے ۔ جنگل میں کچھ دور جانے کے بعد گدھے کو راستے میں شیر کی کھال پڑی ملی ۔ گدھے کے دماغ میں ایک ترکیب آئی ۔ اس نے وہ کھال خوب اچھی طرح اوڑھ لی ۔ شیر کی کھال میں جب وہ آگے بڑھا تو جنگل کے دوسرے جانور اسے شیر سمجھ کر ڈر کر بھاگنے لگے ۔ گدھے نے سوچا کہ دھوبی سے بدلہ لینے کا حربہ مل گیا ہے ۔ شیر بن کر اس کے مظالم کا بدلہ لیا جاسکتا ہے ۔ یہ سوچ کر وہ واپس بستی کی طرف چل پڑا ۔ گاؤں والوں نے دور سے گدھے کو دیکھا تو سمجھے کہ شیر آرہا ہے ۔ پھر کیا تھا بھگدڑ مچ گئی ۔ لوگ ہراسانی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑنے لگے ۔ گدھے نے لوگوں کو سہم کر گھروں میں دبکتے دیکھا تو سوچا کہ لوگ مجھے شیر سمجھ کو خوف زدہ ہورہے ہیں کیوں نہ انہیں شیر کی طرح دہاڑ کر اور ڈرایا جائے ۔ اس نے اپنا منہ اوپر اٹھایا اور زور کی آواز نکالی ۔ آن کی آن میں گاؤں والوں کو معلوم ہوگیا کہ جسے شیر سمجھ کر وہ ہیبت زدہ ہوگئے تھے وہ تو گدھا ہے ۔ پھر کیا تھا ۔ غصے اور جھلاہٹ میں وہ لاٹھیاں لے کر نکلے اور گدھے پر پل پڑے ۔

عقلمندوں کی لکھی ہوئی اس طرح کی ساری حکایات اپنی جگہ لیکن ہنس کی چال کی کشش اپنی جگہ ۔ ہمارا خیال ہے کہ چال کے ساتھ چلن بھی ضروری ہے ۔ چلن کے بغیر چال بے کار ہے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو ۔ اصل چیز آدمی کا چلن ہے ۔ اگر چلن یعنی احوال درست ہوں تو چال بھی خود بخود اچھی معلوم ہوتی لیکن اگر چال ناپسندیدہ ہو تو محض چال سے بات نہیں بنتی ۔ پس منظر اور پیش منظر میں یکسانیت لازمی ہے لیکن مرزا شرافت کا خیال ہے کہ یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں ۔ آج کے زمانے میں ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا ۔ آج کل لوگ صرف چال دیکھتے ہیں اور چال سے متاثر ہوتے ہیں ۔ چال کے پیچھے چھپے حال کو کوئی نہیں دیکھتا ۔ اگر کسی کی چال ہنس کی ہے تو لوگ اسے ہنس ہی مانتے چاہے وہ کوا ہی کیوں نہ ہو ۔ شائد اسی رجحان کا نتیجہ ہے کہ آج ہر شخص ہنس کی چال کا قتیل نظر آتا ہے ۔ شادی بیاہ، بسم اللہ، عقیقہ، چھٹی، چہلم، نہ جانے کتنی رسومات ہیں جن میں آدمی ہنس کی چال چلنے کی کوشش میں مارا جاتا ہے حالانکہ ایسے موقعوں پر پاسبان عقل برابر تاکید کرتا رہتا ہے کہ "میاں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ" لیکن ہنس کی چال چلنے کے شوق میں آدمی کے پیر چادر سے باہر نکل ہی جاتے ہیں اور سیدھے کسی "رہن سیٹھ" کا رخ اختیار کرتے ہیں ۔

انگریزوں کے زمانے میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا بڑا طبقہ وضع قطع، لباس، طرز معاشرت غرض ہر معاملے میں انگریزوں کی نقل کیا کرتا تھا ۔ گویا ہنس اور کوے کی مثل پوری طرح صادق آرہی تھی ۔ حالانکہ نہ سفید فام انگریز ہنس تھے اور نہ سیاہ فام ہندوستانی کوے لیکن اس کے باوجود سوٹ پہننا، ٹائی باندھنا، چھری کانٹے سے کھانا مہذب ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی ۔ دفتر میں "کالا صاحب"

گورے صاحب سے زیادہ نخرہ دکھاتا لیکن اصلیت کہیں دبائے سے دبتی ہے۔ان کالے صاحبوں کی ہندوستانی خصلت کہیں نہ کہیں ظاہر ہو ہی جاتی تھی۔ کالا صاحب گورے صاحب کی چال تو چلتا لیکن جب کبھی لاشعوری طور پر اس کی دیسی خصلت ظاہر ہوتی تو ہم وطن ماتحتوں کو مذاق کا اچھا موضوع ہاتھ آتا۔خیر وہ انگریزوں کا دور تھا۔انگریز ہندوستان کے حاکم تھے۔ چونکہ حاکموں کی تقلید کو محکوم اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں اس لئے اگر اس زمانے میں بعض ہندوستانیوں نے انگریزوں کی نقل کی تو اس کا کسی حد تک جواز نکل سکتا ہے۔ لیکن اس کو کیا کہئے کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑے نصف صدی ہو گئی لیکن انگریزوں کی نقل کی عادت آج بھی ہمارے اندر باقی ہے جس کے نتیجہ میں ہم نہ مکمل مغربی بن سکے اور نہ پورے مشرقی رہ سکے۔نہ ہنس کی چال آئی نہ اپنی چال باقی رہی۔ لیکن شکر ہے ادھر کچھ دنوں سے محفلوں اور تقریبات میں سوٹ کے شانہ بشانہ شیروانی بھی نظر آرہی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ہم ہنس کی چال کے سحر سے آزاد ہو رہے اور ہم کو اپنی چال یاد آرہی ہے۔کوے اور انسان میں یہی فرق ہے۔کوا اپنی چال بھول گیا تو بھول ہی گیا جبکہ انسان کو کبھی نہ کبھی اپنی اصلی چال ضرور یاد آتی ہے۔درحقیقت انسان وہی ہے جسے اپنی اصلیت یاد رہے۔جو اپنی اصلیت کو بھول جائے شائد وہ انسان بھی نہیں ہے۔ ☆

فضل جاوید
1862 MIG Colony
BHEL R.C. Puram
Hyderabad - 502032.

ایک خاتون کی خفیہ دعائیں

اے اللہ! میں ایک صاف گو خاتون ہوں۔ لگی لپٹی باتیں ہیں کر نہیں سکتی۔ جب بھی مصلے پر بیٹھ کر نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو دنیا و آخرت میں اپنی بھلائی کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ لیکن جب جانماز چھوڑ کر اٹھ جاتی ہوں تو عجیب عجیب سی دعائیں مانگنے کو دل چاہتا ہے۔ اس لئے یہ سب دعائیں جو وقتاً فوقتاً میرے ذہن میں آتی رہتی ہیں انھیں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتی ہوں۔ اے اللہ تو میری ان دعاؤں کو اسی طرح قبول فرما جس طرح تو اپنے نیک بندوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔

۱) اے اللہ! تجھ سے دنیا کی کوئی چیز چھپی نہیں۔ تو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ہمارے گھر کے سامنے فائیو اسٹار ہوٹل کا سوئمنگ پول ہے۔ سوئمنگ پول کا ہونا یوں تو کوئی بری بات نہیں اس میں تیرنے سے صحت اچھی رہتی ہے اور تیرنا اچھی ورزش میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن کسی کو نیم برہنہ نہاتا یا تیرتا دیکھنا کہاں کا اخلاق ہے۔ اس سے دل میں کئی قسم کے گناہ جنم لیتے ہیں۔ آج کل میرے شوہر جیسے ہی شام کو آفس سے گھر لوٹتے ہیں سیدھے زینے طے کرتے ہوئے ٹیریس پر پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی آرام کرسی کو بھی مستقلاً وہیں رکھ چھوڑا ہے۔ شام کی چائے وہیں پر منگوائی جاتی ہے۔ پہلے تو وہ تھکے تھکائے آفس سے آتے ہی صوفے پر نیم دراز ہوتے اور چائے کی فرمائش کر کے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے اور جوتے موزے اتارتے۔ لیکن ان کے اس معمول میں تبدیلی سے دل میں تجسس پیدا ہوا اور ایک شام میں خود ہی چائے لے کر ٹریس پر چلی گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ صاحب آرام کرسی پر آگے کو جھکے ہوئے کسی چیز کا نظارہ کر رہے ہیں۔ قریب گئی تو ششدر رہ گئی سوئمنگ پول میں تنگ دھڑنگ لڑکیاں نت نئے فیشن کے سوئمنگ سوٹس پہنے تیر رہی ہیں۔ مجھے قریب دیکھ کر وہ جھینپ مٹاتے ہوئے بولے :

" بیگم! روز شام کی چائے تم بھی ہمارے ساتھ پینا۔ اس کھلی فضاء میں ایسے دلفریب نظارے دن بھر کی ذہنی تھکاوٹ دور کر دیتے ہیں۔ اپنی چھت سوئمنگ پول سے بہت دور ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ کل ایک دور بین خرید لاؤں "۔

اے اللہ میرے شوہر کی اس آرام کرسی کو اس طرح توڑ دے کہ وہ اس پر کبھی نہ بیٹھ سکیں۔ اے اللہ! سارے شہر کی دو کانوں سے دور بینوں کو آؤٹ آف اسٹاک کر دے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

۲) میرے شوہر ایک کمپنی میں بڑے افسر ہیں۔ کمپنی کی کار ہے۔ ڈرائیور ہے۔ سب آرام و آسائش ہیں لیکن پھر بھی کچھ کمیاں ہیں جو ایک تنخواہ میں پوری نہیں ہو پاتیں۔ ہمارا مذہب مساوات کا درس دیتا ہے لیکن یہ سبق لوگوں کو یاد نہیں رہتا۔ ہمارے پڑوس میں محکمہ اکسائز کے ایک افسر رہتے ہیں۔ سنا ہے ان کے پاس دو نمبر کا مال بہت ہے۔ ان کے گھر جھاڑو برتن کپڑے دھونے والی بائی ہمارے پاس بھی کام کرتی ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ ان کے گھر میں نوٹوں سے بھرے ہوئے کئی سوٹ کیس ہیں اور گھر کے ممبر باری باری رات میں جاگ کر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اے پروردگار! ان کے گھر میں انکم ٹیکس والوں کا دھاوا ڈال دے تاکہ جلدی

ہیں وہ نوٹوں سے بھرا کم از کم ایک سوٹ کیس تو ہمارے آنگن میں پھینک دیں۔ اے مالک دو جہاں اس بات کا بھی خیال رہے کہ نوٹ پچاس اور پانچ سو کے نہ ہوں بلکہ سو اور پچاس کے ہوں تاکہ آسانی سے زیور اور کپڑوں کی دو کانوں پر انہیں بھنوا سکوں۔ کمپنی کی کار سے پڑوسنوں پر رعب نہیں ڈلتا۔ اس سے میں اپنی خود کی کار بھی خرید سکتی ہوں۔ سوٹ کیس میں بند پڑے نوٹوں کا یہ صحیح استعمال ہو گا نا اللہ میاں!

۳) اے اللہ! تو عورت کی فطرت کو خوب جانتا ہے۔ اپنے علاوہ کسی اور عورت کا سایہ بھی وہ اپنے شوہر کے ساتھ بانٹ نہیں سکتی۔ آج کل سکریٹری کے نام سے رنگ برنگی تتلیاں بھولے بھالے افسروں کو اپنی اداؤں کے جال میں پھانس لیتی ہیں۔ میرے شوہر کی پہلی سکریٹری شادی کر کے امریکہ چلی گئی ہے۔ اس سے مجھے کوئی شکایت نہیں تھی وہ کافی ریزرو اور صورت شکل کی بھی کچھ خاص نہ تھی لیکن اس کی جگہ جس نئی سکریٹری کا انتخاب میرے شوہر نے کیا ہے وہ کافی شوخ، الھڑ اور خوبصورت بھی ہے۔ آج کل میرے شوہر دیر گئے تک آفس میں مشغول رہتے ہیں۔ جب گھر آتے ہیں تو ایک انجانی سی پرفیوم سے مہکتے ہوئے آتے ہیں۔ یہ پرفیوم کم از کم میرے گھر میں تو نہیں ہے۔ اب تو ان کے کوٹ پر بال بھی چپکنے لگے ہیں۔ اے اللہ! تو اس نامراد چڑیل سکریٹری کو گنجا کر دے اور اس خوبصورت فتنے کے چہرے پر تیزاب ڈلوا دے۔ شاید میں کچھ زیادہ مانگنے لگی ہوں اللہ میاں، تیزاب ڈلوا کر گنہ گار بننا نہیں چاہتی۔ فی الوقت اسے گنجا کر دے تاکہ روز کوٹ پر سے بال صاف کرتے کرتے مجھے کڑھنا نہ پڑے۔ گنجے پن ہی سے میرے شوہر کے عشق کا بھوت اتر سکتا ہے۔

۴) خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے کے لئے جب کھڑی ہوتی ہوں تو تھوڑی دیر بعد ذہن میں طرح طرح کے خیالات گھر کرنے لگتے ہیں۔ کبھی ہماری پڑوسن یاسمین یاد آتی ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے جلتی رہتی ہے اور دوسروں کے سامنے مجھے نیچا دکھانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ میں کوئی نئی ساڑی پہن کر کسی پارٹی میں چلی جاؤں تو دوسری پارٹی میں وہ مجھ سے بھی اچھی ساڑی پہن کر آتی ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ سب کے سامنے کہتی ہے کہ میں نے اگروال کی دوکان سے پچھلی پارٹی میں جو ساڑی خریدی تھی وہ تین ہزار کی تھی اور اب وہ جو پہن کر آئی ہے وہ ساڑھے چار ہزار کی ہے۔ اس طرح وہ مجھے جلاتی ہے۔ جب نماز کے لئے کھڑی ہوتی ہوں تو اسے نیچا دکھانے کی ترکیبیں یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں آتی رہتی ہیں۔ جنہیں بعد میں میں روبہ عمل لاتی ہوں۔ کس سے بدلہ لینا ہے کس کو نیچا دکھانا ہے۔ اکسٹرا بجٹ منظور کروانے کے لئے شوہر سے کس طرح پیش آنا چاہئے۔ مسز چودھری کو ادھار مانگنے پر کس طرح ٹالنا چاہئے۔ یہ سب پلاننگ نماز کے دوران ہوتی ہے۔ اے اللہ! تو سب کے دلوں کا حال جانتا ہے۔ کیا یاسمین اور دوسرے بھی نماز میں میری ہی طرح سوچتے ہیں؟ اگر یہ گناہ ہے تو مجھے معاف فرما اور ایسی ترکیبیں نماز کے بعد میرے ذہن میں لاتا جا۔

۵) میرے شوہر کی کار کا ڈرائیور بڑا نیک اور ایماندار شخص ہے۔ آفس میں اور آفس سے باہر جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی تفصیل مجھے بتاتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کچھ نمک مرچ بھی لگاتا ہو گا۔ لیکن زیب داستان کے لئے اسکا ایسا کرنا مجھے بالکل برا نہیں لگتا۔ میرے شوہر جوانی کی دہلیز پار کر کے بڑھاپے کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں لیکن میں محسوس کر رہی ہوں کہ ان کا دل دن بہ دن چنچل ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل وہ خوبصورت تنہا لڑکیوں کو کار رکوا کر لفٹ دیتے ہیں۔ یہ کلموئیاں تو اسی تاک میں رہتی ہیں۔ مردوں کو بس میں کرنے کے گر انہیں خوب آتے ہیں۔ میرے شوہر تھوڑے دل پھینک بھی واقع ہوئے ہیں۔ اے اللہ! ان کے دل کا بائی پاس سرجری کروا دے تاکہ ان کا دل پھر سے تر و تازہ ہو جائے۔ پچھلی چھچھوری عورتیں ان کے دل و دماغ سے غائب ہو جائیں اور ان کا دل صرف مجھے دیکھ کر دھڑکے۔ اللہ میاں! یہ تو شاید جو کھم کا کام ہے میں بائی پاس سرجری کی دعاء واپس لیتی ہوں۔ مگر اے اللہ! اتنا تو کر دے کہ جب کبھی

میرے شوہر کسی خوبصورت لڑکی کو کار میں لفٹ دیں تو ان کی کار کے ٹائر میں چار انچ لمبا کیل ایسی جگہ چبھادے جہاں سے پنکچر بنانے والا کوسوں دور موجود نہ ہو۔ یا الٰہی! یہ تو میرے لئے اور مصیبت کی بات ہوگی اس ویرانے میں انہیں گھیرے اڑانے سے کون روک سکتا ہے۔ ایسے وقت وہ ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لے جاتے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ پنکچر کسی گنجان آبادی والی سڑک پر ہو اور وہ لفٹ والی آٹو رکشاء پکڑ کر اپنی راہ لے .... ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔

۶) میں ایک گھریلو خاتون ہوں۔ شوہر کی خدمت اور بچوں کی تربیت ہی میری زندگی کا نصب العین ہے۔ زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر کبھی کبھی اپنے شریک حیات کو راضی کر کے بچوں کے ساتھ ایک لمبے ڈرائیو پر نکل جاتی ہوں۔ کہیں گول گپے کھائے جارہے ہیں تو کہیں آئس کریم سے تواضع ہورہی ہے۔ بچے برگر اور پزا پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔ بہرکیف اسی طرح کچھ دیر کے لئے ساری کلفت دور ہوجاتی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے کچھ عجیب و غریب حسرتیں دل میں اجاگر ہورہی ہیں۔ جب سے رابڑی دیوی نے بہار کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے میرے دل میں امنگوں اور آرزوؤں کا طوفان سر اٹھانے لگا ہے۔ لالو پرساد یادو کو لوگ للو سمجھتے ہیں لیکن ہے وہ بڑا عقلمند۔ وہ اپنے آپ کو "کنگ میکر" کہتا ہے تو کیا غلط کہتا ہے۔ اب تو وہ "کوئین میکر" Queen Maker بھی ہے۔ سیدھی سادی گرہستن کو ریاست کا وزیر اعلیٰ بنا دینا کسی معمولی انسان کے بس کی بات نہیں۔ میرے اللہ! میرے شوہر کے دماغ میں لالو پرساد یادو کی تھوڑی عقل داخل کردے تاکہ وہ میرے لئے پارلیمنٹ کی ایک نشست کے حصول کے لئے جٹ جائیں۔ اے رب العالمین، تو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ آج کل گھر چلانا جتنا مشکل کام ہے حکومت چلانا اتنا ہی آسان۔ جب ایک گرہستن بہار کی حکومت چلا سکتی ہے تو دوسری گرہستن دہلی کی گدی پر کیوں نہیں بیٹھ سکتی۔ میں نے تو ابھی سے تئے صد ہزار سالہ میں اپنی عقل و فراست سے ہندوستان کو دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بہ دوش کھڑا کرنے کی پالیسیاں بھی بنالی ہیں۔ یا اللہ! تو میری مدد فرما .... آمین ثم آمین!! ☆

ڈاکٹر محبوب راہی

دیئے دن میں جلانا چاہتے ہیں
وہ دیپک راگ گانا چاہتے ہیں

مجھے گھر سے بھگانا چاہتے ہیں
وہ میرا گھر بسانا چاہتے ہیں

غزل لائے ہیں لکھ کر الٹی سیدھی
ترنم سے سنانا چاہتے ہیں

سہارا لیکے وہ بیساکھیوں کا
مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں

نہیں کرتے کبھی نفرت میں کوئی
محبت بھی جتانا چاہتے ہیں

صدا ایسی کہ کوے جمع ہوجائیں
مگر ملہار گانا چاہتے ہیں

میں ان سے دور جانا چاہتا ہوں
وہ میرے پاس آنا چاہتے ہیں

مرے بیٹے مرے ہی باپ بن کر
مجھے بیٹا بنانا چاہتے ہیں

مگر میں تو پرندہ بھی نہیں ہوں
پرندے آشیانا چاہتے ہیں

سمنٹ اور لوہا، کھاد اور چارہ کھا کر
اور اب کیا اور کھانا چاہتے ہیں

بچھا کر راستے میں میرے کانٹے
وہ کوئی گل کھلانا چاہتے ہیں

مجھے دنیا کی نظروں سے گرا کر
سر آنکھوں پر بٹھانا چاہتے ہیں

گدھے تو ہیں مزے میں، کس لئے ہم
انہیں انساں بنانا چاہتے ہیں

نظر آتا نہیں اب کوئی چوہا
برائے حج وہ جانا چاہتے ہیں

انہیں دھوتے ہیں اپنے پاپ سارے
تو گنگا میں نہانا چاہتے ہیں

ہنسی آتی ہے ان کی حرکتوں پر
وہ جب مجھ کو رلانا چاہتے ہیں

مرے بھائی ہیں یوسفؑ کے برادر
جو مجھ کو بیچ کھاتا چاہتے ہیں

زمانے بھر کے جو بدھو ہیں راہی
مجھے بدھو بنانا چاہتے ہیں

محمد برہان حسین
پتہ: ۱۰۱ عرفان ریزیڈنسی
ریڈ ہلز، حیدرآباد۔ ۴

چوتھا جھنگا کیوں نہیں سوکھا

کچھ اوپر نصف صدی قبل کی بات ہے کہ موسم گرما میں حیدرآباد کے اکثر گھروں کے کشادہ صحنوں میں تخت اور پلنگ بچھائے جاتے تھے۔ چھڑکاؤ کئے ہوئے صحن کی مٹی سے سوندھی فرحت بخش خوشبو آتی تھی۔

بڑے بوڑھے اور بوڑھیاں اپنے پلنگ پر پوتوں یا نواسوں کو پنکھا جھلتے ہوئے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اگرچہ پنکھا جھلنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور کہانیاں ہی اس قدر پیچیدہ اور بعض اوقات خوفناک ہوتی تھیں کہ بچے دبک کر سوجاتے تھے۔

دادیاں اور نانیاں لوریاں بھی گایا کرتی تھیں لیکن بہو یا داماد کی موجودگی میں عمداً اپنی آوازوں کو بے سری کرلیا کرتی تھیں۔ اس طرح بچے بور ہوکر جلدی سوجاتے تھے۔

سہگل صاحب نے بھی ماسٹر پیس لوری گائی تھی: "سوجا راجکماری سوجا سوجا۔ من بلہاری سوجا"۔ یہ لوری راجکماری کو سلانے کیلئے نہیں تھی اور نہ ہی راجکماری سوتی تھی۔ وہ سوتی ہوئی بن جاتی تھی تاکہ سہگل صاحب کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم ہوجائے۔ اس زمانے کے مرد اور فلمی ہیرو اس قدر بے باک نہیں تھے جیسے اب ہیں۔

بہ قول پاکستانی مزاح کار معین اختر ہندوستانی ہیرو ہر دو منٹ بعد ہیروئن کو گود میں اٹھالیتے ہیں جبکہ پاکستانی ہیرو ایسا نہیں کرتے۔ اسکی وجہ شریعت کا خوف نہیں بلکہ ہیروئینوں کی ماشاءاللہ اچھی صحت ہوتی ہے۔

معین اختر کا کہنا ہیکہ کسی سین میں ایک پاک۔ ہیروئن گیہوں کے کھیت میں تین بار اچھل کر کودی تھی تو اس کھیت میں تین سال تک گیہوں کی فصل اگ نہ سکی... خیر ہمیں دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ ہاں ہم اس قومی سانحہ پر ہمدردی کا نوٹ ان کے سفیر کے حوالے کرسکتے ہیں۔

سہگل صاحب کی چانس والی لوری کے بعد لتا منگیشکر نے لوریاں گائیں جن کو سن کر بچے سو نہیں سکتے تھے اور روتے تھے "یہ دل مانگے مور (More)" کہتے تھے۔

ہندی فلموں میں ڈیزی ایرانی اور ہنی ایرانی بچہ اداکاراؤں کا دور آیا تو ہر فلم میں ان کو سلانے کیلئے لوریاں رکھی جاتی تھیں۔ اس صورتحال سے لوگ اسقدر تنگ آگئے تھے کہ جب ڈیزی ایرانی لیٹتی تو تیسرے درجہ سے آواز آتی "ارے یار! یہ پٹی لوری بغیر نہیں سوتی۔ چلو باہر سگریٹ پی کر آئیں۔"

اس کے بعد محمد رفیع صاحب کی لوریاں اور بابل کے گیت آئے۔ ان کی گائی ہوئی لوریاں سن کر بچوں کے کان کھلنے لگتے اور دل دہل جاتے اور مائیں بچوں کو کلیجہ سے لگاکر چیخ اٹھتیں "ریکارڈ بجانا بند کرو۔ میرا بچہ مرجائے گا"۔ برمن صاحب کی گائی ہوئی دھیرے سے جانا بگین میں "سن سن کر تو بچے تو کیا پودے، بھونرے اور پرند تک سوجاتے تھے۔

زمانہ بدل گیا۔ بچوں کی پیدائش لیبر نرسنگ ہوم میں ہونے لگی جہاں سڑکوں کی ٹرافک کا شور، ٹیپ ریکارڈس کی اسٹریوفونک بے

ہنگم میوزک کا شور، اذاں سے پہلے بچوں کے کانوں میں پڑجاتا۔ اس لئے لوریوں کے زمانے لدگئے اور جاوید اختر نے "شعلے" کیلئے ڈائیلاگ لکھا۔ "سوجا بیٹا سوجا! ورنہ گبر سنگھ آجائے گا"۔ یہ سن کر بچے سوئیں یا نہ سوئیں لیکن بڑے بڑے پولیس افسران بھی سہم جاتے تھے۔

ماقبل تاریخ کے دور سے ہی بچوں کو سلانے کیلئے بزرگ خواتین خوفناک کہانیاں سناتی رہیں اور کبھی ایسی بور اور پیچیدہ کہانیاں سناتیں کہ بچے بنا پانی مانگے سوجاتے تھے۔ ایسی ہی ایک پیچیدہ کہانی میری نانی سناتی تھیں اور میں نے کبھی پوری کہانی نہیں سنی تھی۔ حتیٰ کہ میں جوان ہوگیا۔ پھر ایک ایکٹریس پہ فریفتہ ہوا اور رات بھر آہیں بھرتا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نانی نے مجھے یہ کہانی پوری سنائی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ لوری والی کہانیاں کس قدر سبق آموز ہوا کرتی تھیں اور اس پر تعجب بھی ہوا کہ اتنی فلسفیانہ کہانیاں بچوں کو کیوں سنائی جاتی تھیں۔

چنانچہ اس کہانی میں یہ سبق ہے کہ موجودہ انسانی سماج ایک کپڑے کی طرح بنا ہوا ہے اور ایک تاگہ کو اگر چھیڑا جائے تو سارا کپڑا تھرا اٹھتا ہے۔ کہانی یوں تھی:

ایک تھا بھوئی۔ لایا چار جھینگے ... جھینگے کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہانی ساحلی آندھرا کی ہے۔ خیر ہم کو اس سے بحث نہیں ہے اور یہ کام ہم کسی یونیورسٹی کے شعبہ اردو پر چھوڑتے ہیں جو کسی زندہ جھینگے کو پکڑ کر اسکے "حیات اور کارنامے" کے زیر عنوان پی ایچ ڈی (Ph.D) کا مقالہ لکھوائے گا۔

غرض بھوئی نے چاروں جھینگے سوکھنے کیلئے دھوپ میں رکھے۔ شام میں دیکھا تو تین جھینگے سوکھ گئے ایک نہیں سوکھا۔ بھوئی غالباً آبی جانداروں کی زبان جانتا تھا۔

اس نے جھینگے سے پوچھا: "کیوں رے جھینگے تو کیوں نہیں سوکھا؟"
جھینگے نے کہا: "تنکہ میرے آڑے آیا تھا"۔
بھوئی نے پوچھا: "کیوں رے تنکے تو کیوں آڑے آیا۔"
تنکے نے کہا: "گھوڑا مجھے کھایا نہ تھا۔"
گھوڑے نے دولتی جھاڑ کر کہا: "مجھے نوکر ڈالا نہ تھا"۔
بھوئی نوکر کی طرف پلٹا تو اس نے کہا: "بی بی مجھے دیئے نہیں تھے۔"

بھوئی نے مسکرا کر بی بی کو دیکھا تو بی بی نے کہا: "تمہارا یہ پوتا (بچہ) روتے ہی رہتا ہے۔ باپ کو کھاتا کی۔ دادی کو کھاتا کی۔"
بھوئی نے بی بی کے حملے کو سمجھا اور بات ختم کرنے کیلئے بچہ کی طرف پلٹا۔ بچہ نے کہا: "مجھے چیونٹی کاٹی تھی ڈیڈی (بھوئی کا بچہ شاید "کنورٹیڈ" تھا)۔

چیونٹی نے آخر میں کہا: "بچہ تمہارا آفت کا پرکالہ ہے۔ میری بل میں انگلی ڈالا تو میں کیا کرتی۔"

اتوار کو ہم لنگی اور کرتے میں بازار گئے۔ اس لباس کو عام طور پر آرام کے دن کا لباس سمجھا جاتا ہے اور بڑے سیٹھ لوگوں کی طرح ہم جیسے کمزور متوسط طبقہ کے مرد بھی کم از کم اتوار کو پہن کر بازار میں گھومتے ہیں۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ تمام آبی جانداروں کی قیمتیں سمندر سے فضا میں مارے جانے والے راکٹس کی طرح آسمان سے باتیں کررہی ہیں۔
دکاندار نے وجہ بتائی۔ "تھوک بیوپاریوں نے قیمتیں اچانک بڑھادیں صاحب۔ کہتے ہیں کہ بنڈی کے کرائے بڑھ گئے۔"

بنڈی والے نے کہا: "کیا کریں صاحب بیڑی مہنگی ہوگئی ہے اور آپ کو تو معلوم ہے"

کب دیپ جلے بن پانی کے

کب راہ کٹے بن بیڑی کے

ہم نے سوچا، یشونت سنہا وزیر فینانس نے تو بیڑی پر تازہ ٹیکس نہیں لگایا ہے پھر بیڑی مہنگی ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ ڈیزل پر ٹیکس بڑھنے سے لاری ٹرانسپورٹ مہنگا ہوگیا ہے۔

یشونت سنہا ڈیزل کی قیمت کو انٹر نیشنل مارکٹ میں ڈیزل کی قیمت کے مساوی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو بیڑی کا تو خیال ہی نہیں آیا وہ تو یہی سوچ کر خوش تھے کہ ٹرک ڈرائیورز زیادہ تر سردار لوگ ہیں، ہندوؤں پر اسکا اثر نہیں پڑیگا جو بی جے پی کو ووٹ دیتے ہیں۔

ویسے بھی آزادی کے بعد سے کانگریس ہو کہ بی جے پی، ہر حکومت ٹیکس بڑھاتے وقت یہی دہائی دیتی ہے کہ زائد ٹیکس کا بوجھ اونچے طبقہ پر پڑیگا اور غریب عوام پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑیگا۔

اس پالیسی نے عوام کو اس قدر قلاش کردیا ہے کہ وہ محض سوکھی روٹیاں توڑ کر سخت محنت کرتے ہیں۔ ننگے رہتے ہیں اور قطار لگاکر ووٹ دیتے ہیں۔

سنہا صاحب کو پتہ نہیں قیمتوں کے بڑھنے سے عوام پر کیا اثر پڑتا ہے۔ سلیمان صاحب کا کہا ہوا لطیفہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے بیڑی مانگی۔

اس نے ساتھیوں سے کہا: "امو! بیڑی کہاں سے لاتے میاں! یہ زمانہ ایک بیڑی پینے کا ہے کیا؟ ایک پی کے آٹھ کے منہ میں دھواں پھونکنے کا ہے۔"

ٹیکسوں کے بوجھ تلے صابن اس قدر مہنگا ہوا کہ بنانے والوں نے صابن کا وزن کم کرنا شروع کردیا۔ چونکہ سروے کے مطابق ہندوستانی عوام مہنگا صابن نہیں خرید سکتے لہذا بڑے صابن کی قیمت برقرار رکھ کر چھوٹا صابن دیا جاتا ہے۔ یہی حالت رہی تو عام آدمی کو ایک ہفتہ اوپر کا بدن دھونا پڑیگا اور ایک دن نیچے کا۔

اس سے سماجی مسائل پیدا ہوگئے۔ عام عورت اسنو، پاوڈر نہیں استعمال کرسکتی اور وہ شوہر کو اچھی نہیں لگتی۔ عورتوں کو ایکٹرسیں اچھی لگتی ہیں۔ مردوں نے تو کپڑے دھونے کے صابن کی مہنگائی کے مسئلہ کا یہ حل نکالا کہ جینز پینٹس استعمال کرنے لگے کہ دھونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ... بس ایک دفعہ خوشبو چھڑک لینا کافی ہوتا ہے!

البتہ غریبوں کو اچھے کپڑے اس وقت مل جاتے ہیں جب کوئی سیٹھ یا سیٹھانی مرجاتی ہے۔ ہم نے ایک چوکیدار کے کمرہ میں قیمتی ایرانی قالین دیکھا۔ معلوم ہوا کہ اس قالین پر سیٹھ کو مرنے کے بعد لٹایا گیا تھا۔

جب سے بس کے کرایے میں اضافہ ہوا ہے شرفو میاں دفتر کو دو اسٹیج پیدل اور دو اسٹیج بس سے جاتے ہیں ... پتہ نہیں انٹر نیشنل سطح پر جانے کیلئے انھیں اور کیا کرنا پڑیگا۔ وہ روز رات سوتے وقت ایک گلاس دودھ پیا کرتے تھے۔ جب سے دودھ مہنگا ہوکر انٹر نیشنل سطح کو چھو گیا ہے ان کی بیوی نے آدھا گلاس دودھ اور آدھا گلاس پانی ملا کر انھیں دینا شروع کردیا تھا اور گلاس تھماتے ہوئے وہ روز یہ ضرور کہتی: "کم بخت پانی جیسا دودھ آرہا ہے، کیا کرنا کچھ میں نہیں آتا" اور شرفو میاں بھی جواب میں یہ ضرور کہتے "اس سے لینا بند کردو بھئی" اور سوجاتے ... دونوں کو معلوم تھا کہ حالات ان کے قابو میں نہیں رہے۔

پہلے وہ بیمار ہوتے تو دودھ پیتے تھے اور کہتے تھے "والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ دودھ میں بڑی شفاء ہے" اور اس سے نعمت

ی رہتی ہے ۔"

اب ان کی بیوی انہیں پانی میں ساگودانہ ابال کر دیتی ہے تو وہ پی کر کہتے ہیں ۔ بھئی اس سے طبیعت بڑی ہلکی رہتی ہے ۔ یہ دودھ سے بہتر چیز ہے ۔"

حکومت کے ترجمان نے کہا ۔ ڈیزل کی قیمت میں اضافہ سے غریب عوام کو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ غریب پیدل چلتا ہے اور مر کر بھی لوگوں کے کندھوں پر جاتا ہے ۔ بڑا آدمی ہی ڈیزل کا بوجھ اٹھائے گا ۔"

البتہ کیروسین غریب کے استعمال کی چیز ہے تو سنا صاحب نے اسکو وا جپائی جی کے کہنے سے چھوا تک نہیں ۔ چونکہ کیروسین غریب دلہنوں کو جلانے کے کام آتا ہے ۔ حکومت نے غریب سے یہ سہولت نہیں چھینی ہے ۔

شرفو میاں کا بیان ہے کہ ایک شادی کی بات چیت میں دلہا کا باپ بڑے مطالبے رکھ رہا تھا ۔ اسکوٹر ۔ فریج ۔ ٹی وی ۔ جوڑے کی رقم ۔ فلیٹ وغیرہ ۔ لڑکی کے باپ نے کہا ۔ میں اتنے روپئے نہیں دے سکوں گا ۔ تو دلہا کے باپ نے نوکر کو آواز دی ۔ "ارے رامو ۔ کیروسین لے آیا ؟"

لڑکی کے باپ نے بلب اور پنکھے کو دیکھ کر کہا : "آپ کے ہاں بجلی ہے تا پھر کیروسین ؟"

دلہا کے باپ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا : "بھئی شادی کا گھر ہے ۔ کیروسین گھر میں رہنا چاہئے ۔ ہم تو شادی کی بات چیت کے ساتھ ہی بہو کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔"

یہ سنتے ہی دلہن کے باپ نے اپنا سر اسکے پاؤں میں رکھ دیا اور رو کر کہا : "آپ کے سارے مطالبے پورے کر دونگا مگر آپ کیروسین مت منگوائیے ۔"

ادھر چیف منسٹر چندرا بابو نائیڈو ۔ نے اپنے اراکین اسمبلی کو یوگا کرانا شروع کر دیا ہے تاکہ وہ ٹیکسوں کا بوجھ اٹھا سکیں ۔ عوام کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ ان پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈالا ہی نہیں جاتا اور عوام کبھی یہ جان ہی نہ سکیں گے کہ چوتھا جھینگا کیوں نہیں سوکھا اور کون آڑے آیا تھا ۔ یعنی بیڑی کیوں مہنگی ہوئی اور دودھ کیوں نہیں پیا ! ۔

سید رحیم الدین توفیق
حیدرآباد

پردیسی

پردیسی ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور شائد کسی کے لئے بھی نہیں۔ پردیسیوں پر کئی افسانے و ناول لکھے گئے ہیں اور فلمیں بھی بنی ہیں جن کے نقطۂ عروج پر پردیسی اپنے دیس واپس جاتا اور محبوبہ اور اس کے متعلقین کو پریشان کرتا ہے اور انجام بخیر اس کے واپس آنے پر۔ یوں بھی ہمیں رات دن پردیسیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بلکہ چند خود ساختہ لیڈروں کے خیال میں ہم خود پردیسی ہیں کیوں کہ ہمارے آباد اجداد باہر سے آئے تھے۔ فلموں میں اکثر گانوں میں پردیسیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک فلم میں ہیروئین آسمان پر بادل دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتی ہے : "پردیسی بالما بادل آیا ایسے میں جیا تلملائے آ"۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی یہ پکار پردیسی تک نہیں پہنچے گی مگر اس سے اس کے جیا کی تلملاہٹ کچھ کم ضرور ہوجاتی ہے جیسے چوٹ لگنے پر "سی" کرنے سے آرام ملتا ہے۔

ایک فلم میں ہیروئین اچھل کود کرتے ہوئے انکشاف کرتی ہے :

" اک پردیسی میرا دل لے گیا
جاتے جاتے میٹھا میٹھا غم دے گیا "

ایک اور فلم میں ہیرو جو ملاح ہے درد بھری دلوں کو تڑپانے والی آواز میں پکار اٹھتا ہے :

" پردیسیوں سے نہ انکھیاں ملانا "

یہ ایک قسم کا مشورہ بھی ہے کہ اگلا گرا پچھلا ہوشیار۔ مگر آج کل کے بچے کہاں بزرگوں کی نصیحت پر کان دھرتے ہیں۔ چنانچہ ایک منچلی لڑکی ایک پردیسی سے انکھیاں لڑا بیٹھی اور اب اس کے پیچھے پڑی ہے کہ "پردیسی پردیسی جانا نہیں مجھے چھوڑ کے مجھے چھوڑ کے" ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر وہ اسی طرح اس کے پیچھے پڑی رہی تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بھاگ جائے گا۔ اب وہ کب بھاگتا ہے یہ اس قوت برداشت پر منحصر ہے۔ غرض پردیسی غیر مشروط طور پر واپس آجاتا ہے چاہے آسمان پر بادل ہوں نہ ہوں۔ وہ میٹھے میٹھے غم کا، ں سے میٹھا مداوا کردیتا ہے اور ملاح کو ڈانٹ پلاتا ہے کہ خبردار جو آئندہ کسی کو ایسا غلط مشورہ دیا اور پردیسیوں کو بدنام کیا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ پردیسیوں نے محبت کے جھنڈے گاڑے اور ایسی داستانیں چھوڑی ہیں کہ لوگ آج بھی مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

رانجھا ہزارہ کا تخت چھوڑ کر آیا اور ہیر کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ اپنی سدھ بدھ بھول گیا پھر وہ محبت میں جیت کر بھی ہار گیا اس ہار میں بھی اس کی جیت چھپی ہوئی تھی۔ یہ جیت ہار کا گورکھ دھندہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ آج بھی پنجاب کے لوگ ہیر کا گا کر سنتے ہیں بعض دکھی دل تو رو رو کر ہلکان بھی ہوتے ہیں۔ مہینوال بھی پردیسی تھا اس نے پردیس میں سود بٹہ کا کاروبار کرنے کے لئے سوہنی کی بھینسوں کو چرانے کو ترجیح دی۔ بہی کھاتے لکھنے سے زیادہ اسے بھینسوں کا دودھ دوہنا آسان معلوم ہوا۔ اس ں میں بینک اور فینانس کمپنیوں کا چکر نہیں تھا۔ اس نے سوہنی کے دل میں محبت کی ایسی آگ بھڑکائی کہ وہ اس آگ کو ے کے ذریعہ دریا پار کر کے بجھاتی اور ایک دن جاتے بوجھتے کچے گھڑے پر بیٹھ کر دریا برد ہوگئی۔ نہ جنازہ اٹھا نہ کہیں مہینوال کا انجام کیا ہوا یہ ہمیں فی الوقت یاد نہیں ضرور وہ بھی اسی طرح مرکھپ گیا ہوگیا۔ کیوں کہ مرنا برحق ہے۔ آخر

کب تک جیتا سوہنی کے بغیر۔
دیکھا گیا ہے کہ بد قسمت دیسیوں کا ستارہ پردیس میں جاکر چمکتا ہے ۔ پردیس میں اسے دولت، شہرت، عزت، روٹی، کپڑا، مکان اور "ممبیا" زبان میں نوکری اور چھوکری سب کچھ مل جاتا ہے ۔ لوگ پردیس اپنی قسمت آزمانے ہی جاتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو مہان بھارت پر ہمیشہ پردیسیوں نے ہی حکومت کی۔ باہر سے کئی حملے ہوئے اور ہندوستان نے ان حملہ آوروں کو گلے لگالیا مگر یہ پردیسی یہاں آئے تو انہوں نے اس کو اپنا دیس بنالیا۔ اسے ترقی دی سجایا، سنوارا۔ کہتے ہیں بابر کو یہاں کی آب و ہوا بالکل پسند نہیں آئی۔ چنانچہ اس نے اپنے وطن میں دفن کرنے کی وصیت کی تھی۔ اس ناپسندیدہ آب و ہوا میں جینا گوارا تو کرلیا چار سال کے لئے ہی سہی مگر مرنے کے بعد اپنے وطن کی مٹی میں ملنے کی خواہش کا اظہار، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ بابر کی مصلحت بابر جانے۔ مگر اس کا اندازہ یوں صحیح ثابت ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا نے رفتہ رفتہ اس کے وارثوں کو صحیح معنوں میں دیسی بنادیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت دلی تا پالم رہ گئی۔ ایک حملہ آور پردیسی نادر شاہ تو بڑا بے ایمان نکلا۔ اس کی نیت بہت خراب تھی۔ اس نے نہ صرف محمد شاہ رنگیلے کی مہمان نوازی کے مزے لوٹے، اس کا پگڑی بدل بھائی بنا دو دن تک قتل عام کروایا بلکہ جاتے جاتے دو نایاب چیزیں تخت طاؤس بالجبر اور کوہ نور مکاری سے اپنے ساتھ لے گیا۔ پگڑی بدل بھائی بنانے کی وجہ یہی کوہ نور ہیرا تھا جو بادشاہ کی پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ مغلوں کے بعد انگریز آئے تجارت کی اجازت مانگی اور بن بیٹھے حکمران۔ مگر ان پردیسیوں نے ہمیشہ خود کو مہمان سمجھا اور ملک کو خوب لوٹا جب آکر ان کی رعایا نے کہا کہ چلو بھاگو بہت ہوچکی مہمانی اور وہ بڑی مشکل سے جانے پر مجبور ہوگئے۔ مگر جاتے جاتے ایسے مسائل چھوڑ گئے کہ ہندوستانی قوم آج تک پریشان ہے۔

ہمارا شہر حیدر آباد بھی پردیسیوں کی سرپرستی کے لئے بدنام ہے۔ یہ ہر پردیسی کو گلے لگالیتا ہے اور اتنی مہمان نوازی ہوتی ہے کہ مہمان میزبان بن جاتا ہے۔ خود ہمارے حکمران کے آباد و اجداد پردیسی تھے جنہوں نے حالات کی بدامنی کا فائدہ اٹھا کر حکومت قائم کرلی۔ اس حکومت میں پردیسیوں کی بڑی پذیرائی ہوئی بڑے عہدوں پر ان کو مامور کیا گیا۔ خطابات عطا ہوئے جائیدادیں دی گئیں۔ گھر کی مرغیاں یعنی دیسی حضرات پیچ و تاب کھاتے کہ ان کا حق مارا جارہا ہے۔ مگر باہر کی دال نے ثابت کردیا کہ اس میں بھی "پروٹین" گھر کی مرغیوں سے کم نہیں ہے۔ یہاں جو بھی پردیسی آیا نہال ہوگیا۔ مگر ایک چوٹی کے پردیسی شاعر کو یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور وہ واپس چلے گئے۔ عمر کے آخری دو چار سال انہوں نے ایک اور ملک میں گزارے اور حکومت کی ناقدری کا شکوہ کرتے اور اپنے غلط فیصلے پر پچھتاتے ہوئے وہیں پیوند خاک ہوگئے۔ کون کہتا ہے کہ قسمت کا لکھا پورا نہیں ہوتا۔ حیدر آباد میں مارواڑیوں کو بڑی حقارت سے دیکھا جاتا کہ ایک لوٹا اور دھوتی سے آئے تھے اب دیکھو کیا بن بیٹھے ہیں۔ مگر ان کو مالدار بنانے والے ہمارے دیسی فضول خرچ لوگ ہی تھے جو وقت پڑنے پر ان کے پاس اپنے گہنے اور کپڑے رہن رکھ کر وقت ضرورت سود پر قرضہ لیتے تھے اور پھر ان ہی کو گالیاں دیتے تھے۔ ہمیں یہ احسان فراموشی اچھی نہیں لگی۔ آج ہم حیدر آباد میں جدھر دیکھتے ہیں پردیسی ہی پردیسی نظر آتے ہیں۔ کپڑے کا بیوپار، سونے چاندی کا بیوپار ہیرے جواہرات کا بیوپار، ہوٹل۔ الغرض ہر بزنس پر پردیسیوں کی یلغار ہے۔ مقامی تاجر اگر ہیں تو وہ یا تو فٹ پاتھ کے دوکاندار ہیں یا پھر ٹھیلے بنڈی والے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب باہر کے لوگ یہاں آکر پھل پھول رہے ہیں تو مقامی لوگ کیوں ترقی نہیں کرتے۔ پچھلے چند برسوں میں اللہ تعالیٰ نے جب اپنی عرب قوم پر رحمتیں نازل کیں اور پانی کی قلت کو پٹرول کے ذریعہ دور کردیا تو ساری دنیا کی غریب قوموں کے افراد اس طرف دوڑ پڑے۔ لوگ دوسرے یورپی ممالک بھی گئے مگر اب وہ NRI کہلاتے ہیں۔

جب ہم ریٹائرڈ ہوئے تو ہمیں گریجویٹی وغیرہ وغیرہ کا روپیہ ملا۔ ہم نے اپنے کئی معاملے نپٹائے۔ ادھوری خواہشیں پوری کیں اور جب ہر طرف سے فارغ ہوئے تو خیال آیا کہ انگریزی کہاوت Save for rainy days اسکیم کے تحت کچھ بچانا چاہئے اور اس سرمایہ کو ایسی جگہ مشغول کرنا چاہئے کہ یہ جوں کا توں رہتے ہوئے آمدنی کا ذریعہ بنے۔ ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اک "پردیسی" پر آکر ٹک گئیں۔ ہم اپنا بچا کچا اثاثہ لے کر "پردیسی" کے در پر گئے۔ ہمیں کچھ دیر بٹھایا گیا اور ریسپشنسٹ نے اطلاع دی کہ ایک شکار آیا ہوا ہے اور جال میں انتظار کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم اندر گئے تو دو تین اعلیٰ خاندان کی مہذب خواتین بیٹھی ہوئی تھیں اور کرسی پر ایک نہایت ہی مہذب اور خوشرو بڑھاپا براجمان تھا۔ اس نے ہم سے ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر راز داری سے پوچھا آپ کو یہاں کا پتہ کس نے بتایا، ہمارا ماتھا ٹھنکا ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ ہمیں پولیس کا مخبر سمجھتے ہوئے کہیں ہماری ممبر شپ قبول کرنے سے انکار نہ کردے یا پھر ممکن ہے دو معتبر اصحاب کی ضمانت مانگے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم نے جھٹ سے اپنے ایک عزیز کا نام بتایا۔ جنھوں نے اس کے پاس لاکھوں روپئے رکھوائے تھے۔ پھر ان کے بھائی کا ذکر کیا جو کرنل تھے، کرنل صاحب اس کے بہت ہی پرانے دوست نکلے۔ پھر اس نے اتنے بڑے بڑے لوگوں کے نام لئے کہ ہم احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے۔ غرض Formalities پورے ہوئے اور اس نے چھ پوسٹ ڈیٹڈ چیک دئے ہم نے کہا یہ تو صرف چھ ہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا یہی تو بات ہے باقی چیک ہم آپ کو دیوالی پر دیں گے۔ اس طرح ہم آپ کو عید ملنے کے لئے بلانا چاہتے ہیں کیا آپ ہم سے عید نہیں ملیں گے۔ ہم دیوالی پر گئے مگر ویسا گرم جوشی سے استقبال نہیں ہوا۔ ریسپشنسٹ نے ایک چپراسی کو پکار کر کہا ان کے لئے ایک "K" اور پھر دوسرے کے لئے "R" منگوایا۔ بعد میں پتہ چلا کہ "کے" سے مراد قلاقند ہے اور "آر" سے مراد رس گلہ۔ اس بار آخری چیک جمع کرانے کے بعد ہم گھر میں یونہی ہنسی مذاق کر رہے تھے کہ دیکھیں اس دفعہ "K" ملتا ہے یا "R" کہ ایک دن صبح صبح ہمیں کسی نے فون پر بتایا کہ پردیسی کے آفس پر دو دن سے تالا پڑا ہے اور لوگ "در گریہ" پر آہ و زاری کر رہے ہیں کہ پردیسی نے اس دیوالی پر سب کا دیوالہ نکال دیا۔ کئی لوگوں نے اپنے ہونٹ سی لئے اور آنسو پی گئے کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑجائیں اور انکم ٹیکس والے پیچھے نہ پڑجائیں۔ اکثر لوگوں کا اور خصوصاً خواتین کا یہ شکوہ تھا کہ یہ ان کی بیٹیوں کی شادی کی رقم تھی۔ کیا تماشہ ہے سینکڑوں لڑکیاں پیسے کی وجہ سے بن بیاہی بیٹھی ہیں اور یہ لڑکیاں ہیں کہ پیسہ دوسروں کے حوالے ہونے سے کنواری بیٹھی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ڈولیاں قسمت والوں کی ہی سجتی ہیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارا پیسہ تو حلال کا تھا پھر ہم کیوں لٹ گئے۔ پھر خیال آیا گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ ایک مولانا کے سامنے ہم نے یہ شکوہ کیا تو انہوں نے کہا حضرت آپ نے اپنی حلال کی کمائی کو حرام کی کمائی کا ذریعہ بنایا تھا سو یہ سزا ملی۔ ہم لاجواب ہوگئے کیوں کہ ہم کوئی عالم نہیں ہیں۔ حکومت پر دباؤ ڈالا گیا کہ پردیسی کو واپس لاؤ۔ مگر اس محاذ پر معاملہ کچھ ٹھنڈا ہے۔ غرض سانپ نکل چکا ہے اور لوگ بجائے لکیر کے اپنا ماتھا پیٹ رہے ہیں۔ خود کردہ را علاج نیست!۔

اقبال ہاشمی
18-2-888/10/223 چھاؤنی غلام مرتضیٰ
فلک نما، حیدرآباد

غزل

وہ اہلیہ ہیں مری اور ان کا شوہر میں
یہ اور بات کہ لگتا ہوں ان کا شوفر میں

پہنچ گیا تھا حماقت کی انتہا پر میں
طفیلیوں کو سمجھتا رہا سخن در میں

بس ایک لفظ سے میرا وقار گھٹتا ہے
نکال دوں میں اگر - بل - تو ہوں کلکٹر میں

بڑے خلوص سے دفنا کے اپنے شعروں کو
بنا ہوا ہوں اسی قبر کا مجاور میں

سبھی میں آئے ہیں جب سے سیاسی ہتھکنڈے
خود اپنے آپ ہی ہونے لگا تو نگر میں

اٹھا رہا تھا ادھر مرغ چونچ میں سورج
نہار پیٹ ادھر پی گیا سمندر میں

وہ جن کو نان بنانے سے شرم آتی ہے
انھیں کے واسطے کھانے لگا ہوں برگر میں

ملے جو بھیک ، بھکاری بنا کے چھوڑوں گا
ابھی تو حسن کا ادنیٰ سا ہوں گداگر میں

یہ شاعری ہے تری ہاشمی کہ تک بندی
ہنسی نہ روک سکا تیرے شعر سن کر میں

☆●☆

قطعات

(۱)

دے کر صدی کو آخری دھکا نیا برس
تانوے کے پھیر سے نکلا نیا برس
پچھلے برس کی طرح سے اقبال ہاشمی
نکلے گا اب کی بار بھی ٹیڑھا نیا برس

(۲)

ہم بحر سے خارج ہیں وتد کے نہ سبب کے
مرکز ہیں مگر بحر کے ہر غیظ و غضب کے
جب ہوگی ضرورت تو ، امیران ادب کو
یاد آئیں گے بھٹکے ہوئے ضمام ادب کے

(۳)

مزاح و طنز کے فنکار لوٹ لیتے ہیں
بزور شوخیِ گفتار لوٹ لیتے ہیں
مشاعرہ جسے کہتے ہیں اک تماشا ہے
مشاعرہ تو اداکار لوٹ لیتے ہیں

(۴)

ڈالروں کا ذکر اپنے لب پہ صبح و شام ہے
غیر کی دولت پہ غور و فکر ، اپنا کام ہے
عیش کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑتے ہیں ہم
جرأتوں کا نام لیکن مفت میں بدنام ہے

○☆○

سگِ لیلیٰ (گیارہویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی

سیکس ٹری

اس سے پہلے کہ ہنی ڈارلنگ کی مالکن کے بہکاوے میں آکر ڈاکٹر ڈبی۔ ڈی کتا والا کے طالب علم ہمارے ساتھ کوئی ناشائستہ سلوک کرتے ہم نے اپنے بچاؤ کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا،

"افسوس، ایک کتے کے لئے آپ جیسے پڑھے لکھے نوجوان، ایک انسان کے ساتھ کتے کا سا سلوک کرنے پر اتر آئے ہیں کتنے سنگدل ہیں آپ لوگ"!!

ہماری بات ختم ہوتے ہی، کتے کی مالکن بلبلا کر بول اٹھی؛

"وڑی سنگدل یہ لوگ نہیں تم ہونی"۔ تم کو ہمارا بیمار ہنی ڈارلنگ کے اوپر ترس نیں آتا"۔ دو دن سے یہ نہ بسکٹ کھاتا ہے نی، دودھ پیتا ہے خالی ہوا کے اوپر جیتا ہے نی!"۔

ہنی ڈارلنگ کی مالکن کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا، طالب علموں کے گروپ میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ہنی ڈارلنگ کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرا، جو اس وقت اپنی مالکن کی نرم گرم گود سے چپٹا ہوا تھا۔ اس طالب علم کی اصلی نیت ہم اچھی طرح بھانپ چکے تھے۔ کتے پر ہاتھ پھیرنے کے بہانے وہ کتے کی مالکن پر ہاتھ پھیرنا چاہتا تھا، اس کی دیکھا دیکھی دوسرے طالب علم بھی نزدیک پہنچ گئے۔ ان کے دلوں میں بھی کتے کی مالکن کے لئے پیار امڈ آیا تھا۔ اور کم بخت ہنی ڈارلنگ بھی جانے کس مٹی کا بنا تھا، اپنی مالکن کو پروانوں میں گھیرا دیکھ کر بجائے اس کے کہ شمع کے گرد منڈلاتے ان بوالہوس پروانوں کو بھونک بھونک کر دور بھگاتا الٹا خوش ہو رہا تھا، کم بخت ماڈرن سوسائٹی کا پروردہ جو ٹھہرا، جہاں کتا تو کتا، شوہر بھی کسی غیر مرد کے منہ سے اپنی بیوی کے حسن و شباب کی تعریف سن کر مکرر ارشاد، کی فرمائش کرتا ہے۔

نوجوان طالب علموں کی ٹولی نے کتے کی مالکن کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یا یوں کہئے۔ مزید قرب حاصل کرنے کے لئے ملیاچانک ہمیں خونخوار نظروں سے گھورنا شروع کر دیا بلکہ ایک نے تو تنکھے لہجے میں فرمایا؛

"آپ نے ایک تو بے چارے بیمار کتے کو اپنی احمقانہ حرکتوں سے اس قدر دہلا دیا کہ وہ بھونکنے پر مجبور ہو گیا، اس پر سینہ زوری یہ کہ اب آپ لتے پیارے کتے کی اتنی پیاری، اتنی شاندار مالکن کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں"۔

اس الزام تراشی کے جواب میں ہم نے سوچا کہ قبل اس کے کہ یہ نوجوان ہم پر چڑھ بیٹھیں ان کا منہ بند کر دینا چاہئے، چنانچہ طنزیہ لہجے میں جوابی حملہ کیا۔ "بہت خوب یہ تو وہی بات ہوئی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔ گستاخی میں نہیں نوجوان آپ لوگ فرما رہے ہیں کتے کی مالکن کی شان میں، جائیے جا کر لیکچر روم میں کتوں کی بولیاں بولیے، ورنہ میں ابھی جا کر ڈاکٹر صاحب سے آپ سب کی شکایت کرتا ہوں۔ پھر کتے کی تو کیا، اپنی بولی بھی بھول جائیں گے آپ سب!!۔

ہماری اس گیدڑ بھبکی نے اثر دکھایا۔ سارے نوجوانوں کا نہ صرف یہ کہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا بلکہ کتے کی مالکن سے دور بھی ہٹ گئے۔ اسی لمحہ بھاری بھر کم قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک بھاری بھر کم شخصیت نمودار ہوئی جسے دیکھتے ہی تمام طالب علم وہاں سے کائی کی

طرح چھٹ گئے ۔

نووارد یقیناً ڈاکٹر دیدار خاں، دلدار خاں کتا والا عرف ڈاکٹر ڈی ۔ ڈی ۔ کتا والا تھے ۔ ورنہ طالب علموں کی ٹولی اس طرح منظر سے غائب نہ ہوتی ۔ ڈاکٹر موصوف انتہائی قوی الجثہ تھے ، اس پر سر اور داڑھی کے کھچڑی بال اس قدر گھنے اور بے ترتیب تھے کہ ان کا چہرہ مہرہ، کسی خوفناک بل ڈاگ سے بالکل مشابہ تھا ۔ اپنے بھاری بھرکم جثے کے باعث ذرا سی مشقت سے غالباً موصوف کا سانس پھولنے لگتا تھا ، شاید اوپری منزل کی سیڑھیاں طے کر کے آئے تھے سانس کی دھونکنی دور ہی سے سنائی دے رہی تھی بلکہ اس کے جھکڑ بھی محسوس ہو رہے تھے ۔ ڈاکٹر پر نظر پڑتے ہی کتے کی مالکن کی باچھیں کھل گئیں اس نے "ہائے ڈاک" کہہ کر ایک زور دار ہانک لگائی ۔ لیکن ہمیں ہائے ڈاک کی جگہ "ہائے ڈاگ" سنائی دیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی جواباً پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہائے ، کا جواب ہائے سے دیا ۔ "ہائے مسز فنی مال پانی!" ڈاکٹر صاحب کے اس انکشاف پر ہم نے دل ہی دل میں کہا : "تو ہنی ڈارلنگ کی اس فنی ڈارلنگ کا سرنیم مال پانی ہے لیکن محترمہ کے سراپے میں تو صرف مال ہی مال تھا ، شرم و حیا کے پانی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا محترمہ کا نام مال پانی کے بجائے مسز مالا مال ہونا چاہئے تھا ۔ اس بیچ ڈاکٹر صاحب نزدیک پہنچ چکے تھے فنی ڈارلنگ کی گود میں مزے کرتے ہنی ڈارلنگ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا :

"کیا بات ہے ! ہنی ڈارلنگ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ؟"

"یس ڈاک ... !" محترمہ نے روتی صورت بنا کر کہا ... "وڑی دو دن سے ہنی ڈارلنگ نہ کچھ کھاتا ہے نی پیتا ہے نہ اپنا پیارا پیارا آواز میں ہم کو پکارتا ہے ، لگتا ہے اس کو ہمارا پڑوسن مسز مچھر دانی کا نظر لگ گیا نی" !

فنی ڈارلنگ کی اس اطلاع پر ڈاکٹر صاحب نے راست مریض کی طرف رجوع کیا ، اس کے بالوں بھرے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی زبان میں کچھ کلمات ادا کئے جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئے ہمیں تو سوائے بھوں بھوں کے کچھ سنائی نہیں دیا گویا معاملہ ہو بہو کچھ ایسا تھا ۔

زبان میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا خود آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ڈاکٹر ڈی ۔ ڈی کتا والا ، فنی ڈارلنگ کے چہیتے کتے ہنی ڈارلنگ کی مزاج پرسی سے جیسے ہی فارغ ہوئے ، غالباً پہلی بار انہیں وہاں ہماری موجودگی کا احساس ہوا ، موصوف چونکہ جانوروں کے ڈاکٹر تھے ، وہ بھی کتوں کے اسپیشلسٹ یعنی سگ شناس تھے لہذا مردم شناسی کی حس سے ایک دم عاری تھے چنانچہ ہمارے تعلق سے انہیں یہ مغالطہ ہوگیا کہ ہم شاید مسز فنی مال پانی کے کوئی دم چھلے ہیں ، ورنہ وہ یہ سوال ہرگز نہیں کرتے "مسز مال پانی یہ شاید آپ کے بوائے فرینڈ ہیں ! ذرا تعارف تو کرائیے ان سے !" ڈاکٹر صاحب کا یہ سوال ، مسز مال پانی کے تن بدن میں آگ لگا گیا ، جلے کٹے لہجے میں بولیں : "وڑی یہ کیا بولتا آپ ڈاک ، یہ تو ہمارا ہنی ڈارلنگ کا دشمن ہے نی ، اس کا بس چلے تو یہ ہمارا ہنی ڈارلنگ کو شوٹ کر دے گا نی !"

اس سے پہلے کہ مسز مالی پانی اپنی اداؤں اور شباب کی گپھاؤں میں ڈاکٹر کو الجھا کر انہیں بھی ہمارے خلاف کر دیتی ، ہم نے فوراً اپنی صفائی پیش کر ڈالی ۔ "ڈاکٹر صاحب انہیں خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ میں ان کے ہنی ڈارلنگ کا دشمن ہوں ، آپ خود سوچئے ، آج تک کتا ہی انسان کو کاٹتا آیا ہے کبھی کسی انسان نے کتے کو نہیں کاٹا کم از کم کوئی ذی ہوش انسان کتے سے "پنگا" نہیں لیتا اور یہی بات میری بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے ، میں دراصل آپ سے ایک خاص معاملے میں مشورہ کرنے آیا ہوں !!" ہمارا

معروضہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے پوچھا: "آپ نے میری سیکس ٹری (Sex Tree) سے اپوائنٹمنٹ لیا ہے ؟"

"سیکس ٹری..." ہم زیر لب بڑبڑائے، سیکس ٹری سے موصوف کی کیا مراد تھی۔ یہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "سیکس ٹری سے آپ کی کیا مراد ہے ، میں کچھ سمجھا نہیں ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر صاحب نے جواباً ہمیں سر سے پیر تک کھنگالنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "صورت شکل سے تو تم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو پھر بھی تمہیں سیکس ٹری کا مطلب نہیں معلوم! لگتا ہے اب سے پہلے تمہیں کسی بڑے آدمی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ برخوردار جو لوگ اپنے اپنے فیلڈ میں سیکسٹرا آرڈی نری (Sextra - ordinary) ہوتے ہیں وہ کم از کم دو چار سیکٹریز ضرور رکھتے ہیں۔ میں نے تو صرف ایک ہی سیکس ٹری پر اکتفا کیا ہے !" موصوف کی وضاحت پر بات پوری طرح ہماری سمجھ میں آگئی سیکس ٹری سے ان کی مراد تھی سکریٹری، البتہ اس سے ایک بات یہ صاف ہوئی کہ ڈاکٹر موصوف کافی ہوس خیز بھی ہیں۔ یہ ہوس خیزی ہی تو تھی جس نے سکریٹری جیسے گھسے پٹے لفظ کو سیکس ٹری میں بدل کر اسے کافی "ملذز" کر دیا تھا۔ بات جیسے ہی سمجھ میں آئی، ہم نے جواباً سچ کہہ دیا: "ڈاکٹر صاحب آپ کی سیکس ٹری سے تو میں نے اپوائنٹمنٹ نہیں لیا ہے البتہ مجھے آپ کے پاس مسٹر دارو والا نے بھیجا ہے "۔

"دارو والا! - کون دارو والا ؟" ڈاکٹر صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا ہم نے جواب میں دارو والا کا مفصل تعارف پیش کر دیا۔

"مسٹر پسٹن جی پالن جی دارو والا، محکمہ انسداد بے رحمی جانوراں والے "۔ مفصل تعارف نے اثر دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب کسی قدر نرم لہجے میں بولے "اوہ اچھا اچھا۔ ویسے میں بغیر اپوائنٹمنٹ کے کسی سے نہیں ملتا لیکن تم ایک کتا ایکسپرٹ کے ذریعے آئے ہو اس لئے ایک کام کرو جا کر میری سیکس ٹری سے میری طرف سے گزارش کرو کہ آج کے اپوائنٹمنٹس میں سے کوئی ایک کینسل کر کے اس کا ٹائم تمہیں دے دے "۔

"تھینک یو ڈاکٹر بہت بہت شکریہ، بڑی بڑی مہربانی ...!" ہم نے دہرے ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ جواباً گردن اکڑائے مسز مال پانی سے مخاطب ہو کر بولے ... "آئیے مسز مال پانی آپ کے ہنی ڈارلنگ کی مکمل چیکنگ کر کے نئی دوائیں لکھ دیتے دیتا ہوں۔ آئیے !"

اتنا کہہ کر ڈاکٹر موصوف نے بڑے پیار اور احتیاط سے ہنی ڈارلنگ کو فنی ڈارلنگ کی گود سے اپنی باہوں میں لے لیا اور پلٹ کر شاید اپنے خاص کمرے کی طرف جانے لگے، مسز مال پانی بھی ان کے ساتھ ہولی... ہم بھلا پیچھے رہتے ہم بھی ان کے پیچھے ہو لئے۔ چلتے چلتے موصوف نے مسز مال پانی سے کہا:

"ارے ہاں آپ کے ہنی ڈارلنگ کی ناسازی طبیعت میں الجھ کر میں آپ کے ہبی (HUBBY) ڈارلنگ کے بارے میں پوچھنا ہی بھول گیا۔ کیا حال چال ہیں ان دنوں آپ کے ہبی ڈارلنگ کے ؟"

جواب میں فنی ڈارلنگ بولیں:

"ورّی ڈاک ... دو تین روز سے ہنی ڈارلنگ کو گم سم دیکھ کر میں خود "اپ سٹ" ہوں نی، ایسے میں ہبی (HUBBY) ڈارلنگ کی طرف دھیان دینے کا ٹائم کس کے پاس ہے نی، کل ہنی ڈارلنگ کے ساتھ ہبی ڈارلنگ کو بھی لیکے آؤں گی، خود ہی حال چال پوچھ لینا نی!!"

مسز مال پانی کے جواب سے اندازہ ہوا کہ موصوفہ نے ہنی ڈارلنگ کے علاوہ ایک عدد ہبی ڈارلنگ بھی پال رکھا ہے۔ ہم نے سوچا موصوفہ سے خواہ مخواہ دو، دو چونچیں ہوجانے سے ہر دو کی طبیعت پر جو تکدر چھا گیا تھا اسے دور کر کے ماحول کو خوشگوار بنانے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے لہذا بڑی اپنائیت سے پوچھا:

"مسز مال پانی آپ کا ہبی (HUBBY) کیا ہنی ڈارلنگ جتنا ہے یا اس سے بڑا ؟"

مسز مال پانی جواب میں بجائے خوش ہونے آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولی ... "مسٹر تم کو وڑی بات کرنے کا تمیز نئیں ہے تو کائے کو بات کرتا تم ؟"

ہم نے بڑبڑا کر کہا ... " ارے مگر میں نے کون سی بدتمیزی کی جو آپ اتنا ہتھے سے اکھڑ رہی ہیں۔ میں نے تو صرف اتنا ہی پوچھا ہے کہ آپ کا ہبی، ہنی ڈارلنگ جتنا ہے یا اس سے بڑا ... "

"دیکھا ڈاک دیکھا۔ یہ آدمی ایک دم کریک معلوم ہوتا۔ وڑی ہمارے ہبی کو کتا بولتا نی" مسز مال پانی جھنجھلا کر بولی

ڈاکٹر صاحب اسے پچکارتے ہوئے بولے : " doent be Sexcited "۔ پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولے .... مسٹر۔ ہبی " (HUBBY) کوئی کتا نہیں، مسز مال پانی کے شوہر یعنی مسٹر مال پانی ہیں اور اعلیٰ سوسائٹی میں Husband کو HUBBY کہتے ہیں "۔

(جاری)

محمد اسد اللہ
۳۰، گلستان کالونی، پانڈے گارڈن (ویسٹ)
پولیس لائن ٹاکلی، ناگپور ۱۳-۴۴۰۰ (بھارت)

ڈانٹ

بچپن کو کسی نے جنتِ گمشدہ کہا ہے۔ یہ اطلاع ہم تک بچپن میں نہیں پہنچی تھی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ہمیں اس وقت کا شدت سے انتظار رہتا تھا جب ہمارا بچپن بھی کسی اکنی کی طرح اچانک کھو جائے کہ وہ ہمارے لئے اس وقت اکنی ہی کی طرح بے قیمت تھا۔ دل و جان سے ہم یہ چاہتے تھے کہ بچپن کے زنداں سے نکل بھاگیں اور آناً فاناً بڑے آدمی بن کر مستقبل کے سنہرے تخت پر براجمان ہو جائیں کیونکہ ہماری جنت بڑا بن جانے ہی میں پوشیدہ تھی۔ ایسا کیوں تھا اس کا بیان تو آگے آئے گا، مگر آج ہم اس مستقبل کے محل یعنی فی الحال کے زنداں میں پہنچ کر سوچتے ہیں کہ اگر بڑا بن جانا ہی جنت ہے تو یقیناً احمقوں کی جنت ہوگی، جن کی آج بھی کمی نہیں۔ یہ نامراد طبقہ عظیم بن جانے کی خیالی جنت میں سانس لیتا ہے اور حسد و رقابت کی آگ میں سمندر کی طرح جلتا ہے۔

اب آئیے، اس سوال پر کہ آخر ہمیں بچپن کی ان آسودہ فضاؤں سے نکل بھاگنے کی کیوں سوجھی؟ جواب یہ ہے کہ یوں تو اس دنیا کی ہر شے لاجواب تھی، سوائے ایک ڈانٹ کے جو ہر فرد کی نوک زباں پر اس طرح ٹنگی رہتی جیسے کھونٹیوں پر ٹوپیاں ہوا کرتی ہیں۔ ڈانٹ اور گھرکیوں کی یہ ننھی منی ٹوپیاں ہمارے ہی چھوٹے چھوٹے سروں پر فٹ بیٹھتی تھیں لہٰذا یہ خراجِ عقیدت ہمیں دن بھر میں کئی مرتبہ پیش کیا جاتا تھا۔ اسی ڈانٹ پھٹکار نے جنتِ ارضی کا سارا سکون درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا گویا اس کا جنت پن ہی ختم ہو گیا تھا۔ جس طرح شجرِ ممنوعہ کے چکھتے ہی حضرت آدم کو خداوند عالم کی زبردست ڈانٹ سننی پڑی تھی، بس پھر کیا تھا، اس کے بعد وہ بھری پری جنت جنت نہ رہی۔

والدین کا خیال ہے کہ بچوں کو ڈانٹنا ان کا پیدائشی حق بھی ہے اور فرض بھی اور ڈانٹ بچوں کی پیدائشی سزا ہے۔ خدا جانے یہ لوگ اپنا حق وصول کرتے ہیں، فرض ادا کرتے ہیں یا بچپن میں ان پر ہوئے مظالم کا حساب برابر کرتے ہیں۔

جس قسم کی زندگی ہم آپ گزار رہے ہیں اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زندگی بذات خود ایک ڈانٹ ہے۔ بلکہ موت بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جیسے کسی نے ہمارے ہاتھوں سے کارِ جہاں چھین لیا اور دنیا سے یہ کہہ کر چلتا کر دیا کہ "چل بھاگ نکلے یہ تیرے بس کا روگ نہیں۔"

ڈانٹ کبھی زندگی بن کر ہم پر برستی اور کبھی موت بن کر ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ڈانٹ سننے کے بعد ہمارے اندر جو زبردست قسم کی جھنجھناہٹ سر سے پیروں تک پیدا ہوتی ہے اس کے نتیجہ میں ہمارا قبلہ تبدیل ہو جاتا ہے گویا ایک نئی راہ بلکہ نئی زندگی مل گئی ہو۔ حضرت آدم کو بھی یہ دنیاوی زندگی ایک ڈانٹ کے بعد ملی تھی اور ہمیں بجائے ڈانٹنے کے یہ زندگی عطا کر دی کہ وہ آئندہ دونوں کام آئے گی۔

ڈانٹ دراصل ایک آئینہ ہے جس میں ہم پر عائد کی گئی پابندیوں کا چہرہ نمایاں ہے۔ ڈانٹ کے اسی آئینہ میں ڈانٹنے والے کی

شبیہ بھی موجود ہے۔ اسے اپنا قد آپ سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈانٹنے والا اپنے قد و قامت کی دلربائی سے آپ کو مسحور کردینا چاہتا ہے چنانچہ وہ ڈانٹ کو نامہ بر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ڈانٹ اگر واقعی کسی منصف کے بیان کی طرح معتبر اور غیر جانبدار ہوتی تو کیا ہے بلکہ ماتحتوں کو بھی اپنے اعلیٰ افسران پر گرجتے برستے دیکھا جاسکتا تھا لیکن ڈانٹ اقتدار کی لونڈی اور اس پر اعلیٰ طبقہ کی اجارہ داری ہے۔

اگر آپ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ڈانٹ ہمیشہ کسی غلطی کے سرزد ہونے پر ہی پڑتی ہے تو آپ سراسر غلطی پر ہیں۔ ہمیں آپ کے افسر اعلیٰ ہونے کا شرف حاصل نہیں ورنہ ڈانٹ پلانے کا یہ سنہری موقع ہم ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

ہر بڑا شخص یا ادارہ جو اپنی بڑائی کسی پر تھوپنا چاہتا ہے، ڈانٹ کو ایجنٹ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے عتاب اور انانیت سے بچنے کیلئے احتیاط باقاعدگی اور مستعدی کو بطور ڈھال استعمال کیا جائے تب بھی وہ ایسے موقع ضرور ڈھونڈ نکالتا ہے جب ادارہ کے مفاد، نظم و ضبط یا امن عامہ کیلئے آپ کو ڈانٹنا اس کے فرائض منصبی میں شمار ہوتا ہے۔

اس موقع پر عقلمند لوگ اپنا کام کرجاتے ہیں اس سے پہلے کہ افسر اعلیٰ ڈانٹ کے روپ میں اپنی برتری ظاہر کرے وہ خوشامد کی شکل میں اس کی چھوٹی عظمت کا اعتراف کرکے اس کے عتاب کا نشانہ اپنے کسی ساتھی کو بناکر ایک ٹکٹ میں دو مزے لوٹتے ہیں۔

جب کبھی میں اپنے گھر میں اپنے بچوں کو ڈانٹتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے گویا تھرمس میں گرم چائے بھرنے سے پہلے ہلکا گرم پانی انڈیل رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں میرے بچے اس شوگر کوٹیڈ ڈانٹ کو ہضم کرلیں گے ورنہ میں سوچتا ہوں کہ جب وہ گھر سے باہر نکل کر اپنے ہی آنگن میں لگے آم کے پیڑ پر پتھر اچھالیں گے تو پڑوسی کی اس زہرناک ڈانٹ کا مقابلہ کیسے کریں گے جس کے لہجے کی سفاکی ان کیلئے اجنبی ہے۔ وہ حیران ہونگے کہ ذرا سی بات کیلئے پڑوسی اس قدر غضبناک کیوں ہے؟ وہ نہیں سمجھیں گے مگر میں سمجھتا ہوں کہ بظاہر ہمارے شیشے ٹوٹ جائیں گے " جیسے بے ضرر سے جملہ میں پیڑ پر جھولتے ہوئے آموں کو دیکھ کر اندر ہی اندر ابلنے والا جوالا مکھی چھپا ہوا ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ بچے آسان ڈانٹ سے مشکل ڈانٹ اور سچی ڈانٹ سے جھوٹی ڈانٹ کی طرف جائیں۔

جھوٹی ڈانٹ وہ ہوتی ہے جس میں ڈانٹنے والے کا جذبہ اصلی اور متعصبانہ ہوا کرتا ہے مگر الفاظ منافقانہ ہوتے ہیں۔ ایسی ڈانٹ کا انداز کہہ مکرنیوں کا سا ہوتا ہے۔

آج تک ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ ایسے کام نہ کرو کہ کسی کی ڈانٹ سننی پڑے۔ ہم سوچتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے۔ کام بھلا ہو یا برا اس پر دو طرح کے لوگوں کا ردعمل سامنے آئے گا۔ ایک خوش ہوگا اور دوسرا آپ کو ڈانٹ پلانے کا موقع تلاش کرے گا اور برس پڑے گا۔ ڈانٹ کے درمیانی اسٹیشنوں سے گزرے بغیر منزل تک پہنچنا اکثر دشوار ہوتا ہے۔ آپ نیک کام کررہے ہوں، تب بھی راستہ یہی ہے کہ طلسمی کہانیوں کے شہزادہ کی طرح پیچھا کرتی ہوئی شیطانی چیخوں اور ڈانٹ پھٹکار پر کان نہ دھرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں ورنہ پتھر کا نصف آدمی بن کر رہ جائیں گے۔۔

ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ ڈانٹ امن اور جنگ کے درمیان ایک Buffer State کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نہ مکمل اندھیرا ہے نہ اجالا بلکہ ایک لکیر ہے جو اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتی ہے۔ یہی حیثیت دھمکی کو بھی حاصل ہے مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ دھمکی یا تو جنگ کا آغاز ثابت ہوتی ہے یا اختتام۔ اس کے برعکس ڈانٹ ایک موڑ ہے جہاں سے راستے تاریکی اور بے معنویت کے چیتھڑے اتار پھینکتے ہیں اور معنویت کے چمچاتے ہوئے نئے لباس سے آراستہ ہوکر منزلوں کی طرف گامزن ہوجاتے ہیں۔ ☆

●☆●☆●

ڈاکٹر عباس متقی، حیدرآباد

درد کولھا نے پریشان کردیا

عموماً دواخانوں میں لوگ اس لئے جاتے ہیں کہ انہیں آرام میسر آئے لیکن بعض دواخانے ایسے ہوتے ہیں کہ ان دواخانوں میں جانے کے بعد آرام تو نہیں ملتا البتہ کچھ پریشانیوں میں اضافہ ضرور ہوجاتا ہے۔ اب یہ کس سے مخفی ہے کہ بعض دواخانوں میں دوا نہیں ملتی اور بعض دواخانوں میں دوا تو ملتی ہے لیکن ساتھ ساتھ جھڑکیاں، دھکے اور غم بھی کھانا پڑتا ہے۔ ہم جس دواخانے کا تذکرہ کرنے جارہے ہیں اس کا وجود ہو یہ ضروری نہیں۔ ہم صوفی آدمی ہیں، ہر وجود میں عدم کو اور ہر عدم میں وجود کو نمایاں دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کی آب و ہوا، غذاء اور ایک دن آڑ ملنے والے پانی نے ہمیں اتنا تندرست تو رکھا ہے کہ اپنی بیماری کا حال اپنے قلم سے لکھنے کے موقف میں ہیں بلکہ اگر ہمدرد اور مہربان ڈاکٹر مل جائے جو ہمارے درد پر نظر رکھے، درد میں اضافہ کرنے والی اپنی فیس پر نہیں تو ہم اپنی شیریں بیانی، فصاحت و بلاغت کے دریا بہا سکتے ہیں۔ حال کولھا نثر میں ہی نہیں نظم میں سنا سکتے ہیں۔ غرض کولھے کا درد بھی عجیب درد ہوتا ہے۔ آزادی سے آتا ہے، آزادی سے جاتا ہے۔ ہمیں پتہ تو نہیں یہ درد کب سے شروع ہوا البتہ اس کا علاج ہم مسلسل چار مہینوں سے کررہے ہیں۔ بیٹھ کر جب اٹھتے ہیں تو ہر سمت، ہر جہت سے اس کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے گویا ہم کھڑا ہونا نہیں الیکشن میں کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔ ہر آدمی کو کھڑے ہونے کیلئے اسی طرح کی ہمہ جہتی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، اس کے کاندھے پر پاؤں رکھا، اس کے کاندھے پر ایمان چھوڑا، اس کے کاندھے پر کردار رکھا، کھڑا تو ہوگیا، اب کھڑے ہونے والے کو اس سے کیا غرض کہ اس کوشش میں کیا کیا چھوٹ گیا۔ بعض لوگ تو اس شدومد سے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کی نظر سے گر جاتے ہیں لیکن جس شخص کو لوگوں کی نظر سے گر جانے کا خوف ہوتا ہے وہ دوسروں کے کاندھوں پر کھڑا ہونا تو درکنار خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے تک احتراز کرے۔ ہمارا تو یہ عالم ہے کہ درد کولھا کے سبب جب اپنی دونوں ٹانگوں پر آرام سے کھڑے نہیں ہوسکتے تو دوسروں کے کاندھوں پر کھڑے ہونے کی کیا کوشش کریں گے اور یوں بھی جسکا قد خدا نے خود اونچا رکھا ہو وہ دوسروں کے کاندھوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ جو دوسروں کے کاندھوں پر اپنے وجود کو ڈالتا ہے اس میں اور اسکی منزل میں چند قدموں سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہوتا۔

جب ہم اپنے تمام ہی دوست ڈاکٹروں سے (جو بغیر فیس لئے ہمارا علاج کرتے ہیں بلکہ بعض وقت دوائی بھی منگوا دیتے ہیں) اپنا معائنہ کروا چکے اور ان کی شکست فاش کے اثرات دیکھ چکے تو تھک ہار کر بیٹھ رہنے کا ارادہ کرلیا لیکن کولھے کا درد بیٹھنے کہاں دیتا ہے۔ کھڑے ہوگئے بلکہ ایک پاؤں پر کہ دوسرا پاؤں رکھتے تو جی چاہتا کہ دونوں ہی پاؤں زمین سے اٹھالیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم کسی کی صراحی دار گردن میں محبت سے باہیں ڈال کر لٹک جائیں۔ اب ہم بچے تو رہے نہیں جو یہ شوق پورا کرلیں اور جس زمانے میں یہ شوق پورا کرنے کی عمر تھی کم بخت کولھے میں درد ہی نہیں تھا۔ درد دل شادی سے پہلے، درد کولھا شادی کے بعد والا معاملہ ہے۔ کولھے کے درد کے سبب ہم "کولھا پھینک" مشہور ہوگئے ہیں۔ تعجب ہے کل تک ہم "دل پھینک" مشہور تھے اور آج "کولھا پھینک" بہر حال زندگی بھر کچھ نہ کچھ پھینکتے رہے ہیں جسکا خمیازہ آج بھگت رہے ہیں۔ پہلے قدم پر ہم پاؤں اور دوسرے قدم پر کولھا اٹھاتے ہیں۔ غرض ایک ہمدرد نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر گویا شہر کے قریب بلکہ شہر ہی میں ایک دواخانہ کھلا ہے۔ کئی ڈاکٹروں نے مل کر کھولا ہے۔

اس لئے فیس کئی "قسطوں" میں لی جاتی ہے ۔ مریض کو سب مل کر دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے مریض یا تو مرض سے چھٹکارا پالیتا یا خود مرض مریض سے ۔ ہم چونکہ تو صلاح دینے والے نے کہا کہ اول الذکر والا ہی معاملہ زیادہ ہوتا ہے ۔ مشورہ اخلاص سے دیا جائے تو لوگ خودکشی) تک کرلیتے ہیں، یہاں تو معاملہ محض علاج کا تھا۔

ہم مولانا کے ساتھ دواخانہ وارد ہوئے ۔ دواخانہ کیا تھا مانو محل ہو ہر طرف ہرا بھرا چمن ،ہمہ اقسام کے پھول کھلے ہوئے پھاٹک پر لکھا تھا "خوش آمدید ۔ آپ تشریف لے آیئے ۔ شکریہ ۔ اب الوداع کہنا ہمارا کام ہے ۔ " ہم اس جملے کے تہہ در تہہ معانی پر غور کرنے لگے ۔ عموماً اس دواخانے میں امراء علاج کیلئے جاتے ہیں جنکے تیمار دار زیادہ مستعد ہوتے ہیں۔ امراء کا عالم ہی عجیب ہوتا ہے ۔ زندگی میں وہ جتنے فیض رساں ہوتے ہیں اپنی موت کے بعد وہ اس سے زیادہ فیض رساں ہوجاتے ہیں۔ اس لئے تیمار داروں کو ان کی زندگی سے کم ان کی موت سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے ۔ ہم نے باہر ہی باہر محل نما دواخانے کا نظارہ کرتے ہوئے تعریف کی اور ہرے بھرے چمن کے بارے میں گفتگو کرنے لگے تو موصوف نے کہا کہ آپ نے اس دواخانے کے پیچھے نہیں دیکھا ۔ ہم نے کہا دواخانے کے پیچھے کیا ہے ۔ ارشاد فرمایا ۔ نئے طرز کا قبرستان ہے ۔ امراء کیلئے بنایا گیا ہے ۔ نام ہی عجیب و غریب رکھا ہے "گلشن امراء" قرعہ اندازی سے جگہ ملتی ہے ۔ خیر آپ کو اس سے کیا۔ جھونپڑوں میں رہ کر "گلشن امراء" کے خواب نہیں دیکھا کرتے ۔ چلئے ریسپشنسٹ ایک نہایت خوب صورت "نازک اندام اور خوش گفتار خاتون تھیں ۔ دم بھر کے لیے یوں لگا جیسے ہم دواخانے میں نہیں کوئی غیر ملکی طیارے میں ہیں۔ ہائے کتنی سبک انگلیوں سے اس نے ہمارا نام لکھا۔ ڈاکٹر سید عباس متقی ،ایسا لگا ہم آج ہی کے دن کیلئے ڈاکٹر ہوئے ہیں۔ جی چاہا کہ اس کی خوش نما تحریر پر اپنی تمام اسناد خواہ وہ جعلی ہی کیوں نہ ہوں قربان کردیں ۔ اسناد کالجوں میں تو کام نہیں آئیں ،حسیناؤں کے قدموں میں قربان کے تو کام آسکتی ہیں ۔ ہائے وہ تبسم جس پر مجموعہ ہائے شاعری قربان ،افسوس ہوا کہ کس ضعیفہ دبے دفا کیلئے شعر کہے تھے ۔ شعر تو اس موصوف پر کہے جانے چاہئیں ۔ آواز سے مانو بسم اللہ خاں نے شہنائی چھیڑ دی ہو ۔ نوشاد نے پیانو پر ہاتھ رکھ دیا ہو ۔ روی شنکر نے ستار چھیڑ دیا ہو ۔ اس کا دیدار کیا ہوا ہم اچھے بھلے ہوگئے ۔ کولھے کا درد عروج پاکر دل میں آٹپکا ۔ اچھی صورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں ۔ اچھے بھلے کو بیمار اور بیمار کو بھلا چنگا کردیتی ہیں ۔ حسن کے ساتھ ذہانت و فطانت کا عنصر ہو تو کیا کہنے ۔

موصوفہ نے مختلف سوالوں کے بعد آخری بار تبسم فرمایا اور کہا: " اگر آپ کو کمر کے اوپر دکھانا ہے you go right اور کمر سے نیچے کوئی تکلیف ہے تو بائیں جانب چلے جائیے آپ کا علاج ہوجائے گا ۔ علاج ہوجائے گا اس نے اس بے اعتنائی سے کہا کہ اگر وہ حسین نہ ہوتیں تو کبھی یقین ہی نہیں آتا ۔ عارض گل گوں پر ایک الوداعی نظر ڈال کر پلٹے تو اچھوں کی طرح چلنے لگے ۔ لیکن اداکاری آخر کب تک تھوڑی ہی دیر میں فرس شطرنج کی چال پر آگئے ۔ بائیں جانب چل نکلے تو دیر تک چلتے رہے کاؤنٹر آیا تو وہاں لکھا تھا "ادھر تشریف لائیے " ! وہاں کوئی موصوف تھے یہ ڈاکٹر لوگ بھی بہت ہوشیار ہوتے ہیں ۔ صرف دروازے پر حسینوں کو بٹھاتے ہیں۔ اندر ضعیف کھوسٹ بوڑھے ہوتے ہیں ۔ انہیں دیکھ کر تو کولھا پہلو بدلنے لگا ۔ موصوف نے پوچھا کمر کے نیچے دکھانا ہے ۔ ہم نے کہا " بالکل "

کہنے لگے : " کہاں تکلیف ہے آپ کو " ۔

ہم نے کہا : " کولھے میں ہے ،کولھے میں " ۔

ٹھیک ہے سیدھی جانب جو دروازہ نظر آرہا ہے وہ " کولھے والوں " کا ہے ۔ آپ اس میں گھس کر چٹھی بتائیں ۔ ہم نے مرزا سے کہا : مرزا عجیب دواخانہ ہے ۔ دواخانہ ہے یا اے ۔ جی ۔ آفس ۔ بس سیکشن بدلتے رہیئے ۔ مرزا نے دلاسہ دیا کہ بڑا دواخانہ ہے بڑے لوگ یہاں آتے ہیں بڑے لوگوں کی یہ بڑی باتیں ہیں ۔ ہائی ٹیک کا زمانہ ہے ۔ " اسپیشلائزیشن " کا دور دورہ ہے ۔ غرض ہم اپنا کولھا

سنبھالنے کولھے، والوں کے سیکشن میں جا پہنچے وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھتا تو گمان ہوتا کہ وہ مرزا سے بات کر رہا ہے۔ ہم سے بات کرتا تو لگتا کہ وہ مرزا کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں اس کی نظروں کی غمازی میں ناکام تھیں۔ ایک زمانے کے بعد اچانک بچپن کی یاد تازہ ہو گئی۔ کہنے لگا "کولھے میں تکلیف ہے "۔ ہم نے کہا تھی، اب شروع ہو رہی ہے۔ بائیں کولھے میں یا سیدھے کولھے میں۔ یہ بڑا دواخانہ ہے۔ بائیں کولھے میں درد ہے تو ادھر جائیے اور اگر سیدھے کولھے میں درد ہے تو اندر جائیے۔ ہم تھک گئے تھے۔ سوچا سیدھا ہی کو کھالیں۔

کولھا کولھا ہوتا ہے۔ فرق ہی کیا ہے جو دوا دی جائے گی استعمال کر لیں گے۔ لیکن مرزا کہاں ماننے والے تھے۔ کہہ دیا کہ سیدھا کولھا سیدھا ہوتا ہے بایاں کولھا بایاں۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مرزا کے آگے کس کی چلی ہے جو اپنی چلتی۔ ان کے پیچھے چلنا ہی پڑا۔ ایک راہ داری طے کر کے ہم شعبہ بایاں کولھا پہنچے۔ وہاں ایک ضعیفہ کو بیٹھا پایا۔ بہت افسوس ہوا۔ کولھے میں شدید تکلیف ہونے لگی۔ ہم سوچنے لگے۔ کاش وہ حسینہ یہاں ہوتی کہ دراصل یہاں اس کا حقیقی مقام تھا۔ دنیا میں کس کو اسکا حقیقی مقام مل رہا ہے جو اس بے چاری کو میسر آتا۔ میڈم نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بلڈ پریشر چیک کیا۔ بخار دیکھا، نبض ملاحظہ کی۔ ہم نے سوچا جب علاج کی تمہید باندھی جا رہی ہے تو مکمل علاج ہی اسی شعبہ سے متعلق ہوگا۔ لیکن یہ سب دیکھ کر اس نے کہا اچھا تو آپ کے بائیں کولھے میں شدید تکلیف ہے۔

ہم نے کہا: "جی ہاں! "چار مہینوں سے یہ دکھ جھیل رہا ہوں۔

کہنے لگیں یہ بتائیے: درد اٹھتے وقت ہوتا ہے یا بیٹھتے وقت۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب ہم بیٹھ کر اٹھتے ہیں تو درد ہوتا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ اس نے کیس شیٹ مرزا کے ہاتھ میں تھما دی اور کہنے لگیں انہیں B ہوم میں لے جائیے۔ بی ہوم کا راستہ کچھ زیادہ دور نہ تھا لیکن ہم دور نکل گئے تھے۔ تعجب ہے درد میں بھی تفریق کا لحاظ۔ بڑے لوگوں کے چوچلے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ مرزا آگے آگے اور ہم مرزا کے پیچھے پیچھے۔ بی ہوم آگیا۔

وہاں ایک نرس ہمارے استقبال کو حاضر تھی۔ ادھر ادھر چیک کیا۔ بخار دیکھا، اور بڑبڑایا نارمل۔ ہم خوش ہو گئے کہ چلئے اتنا گھومنے کے باوجود ہمارا بخار نارمل ہے۔

میڈم نے ہمیں اوندھا لٹا دیا اور تھوڑی دیر کولھے کا معائنہ کرنے لگیں ہم خوش ہو گئے کہ چلئے یہاں علاج ہو جائے گا۔ اس نے پھر ہمیں سیدھا بٹھا دیا پوچھا۔ یہ درد رات کو ہوتا ہے یا دن کو۔ اب تو برداشت کی حد ہو گئی تھی۔ ہم نے کہا میڈم درد ہوتا ہے رات دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔ طبیعت قدرے جھلا سی گئی۔ کہنے لگیں۔ مسٹر غصہ میں مت آیئے۔ آپ کا علاج ایک اسپیشلسٹ کرنے والا ہے۔ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ اس کے دلاسے سے ہم غصہ بھول گئے۔ "رات میں ہوتا ہے "! روکھائی سے کہنے لگیں۔ یہ دن کے درد والوں کا ہوم ہے آپ آگے نکل جائیے۔ ہم نے سوچا کہیں بہت آگے نہ نکل پائیں۔ آخرش منزل آگئی۔ کوئی شخص بیٹھا فائلیں دیکھ رہا تھا۔ ہمیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ہم نے اسے اپنا کارڈ دیا۔ ہمیں اندر لے گیا تلوے سے تلوے تک دیکھ ڈالا کہنے لگا۔ آپ کے کولھے میں درد ہے: "ہاں"۔

بائیں کولھے میں ہے: "ہاں"

رات میں ہوتا ہے: "ہاں"

بیٹھ کر جب کھڑے ہوتے ہیں تب ہوتا ہے: "ہاں"

ہم اس بے خیالی میں ہاں، ہاں کہے جا رہے تھے کہ اگر وہ کہتا کہ آپ گدھے ہیں تو ہم ضرور کہہ دیتے "ہاں!"

اب آخری بات دریافت کرنی ہے وہ یہ کہ یہ کولہے کا درد پرانا ہے یا نیا ہے۔

اس سوال پر جی میں آیا کولہا پکڑ کر بیٹھ جائیں۔ ہم نے گفتگو کو بلاوجہ طول دینا نہ چاہا کہہ دیا 4 ماہ کا ہے۔ ہم نے یوں ہی کہا جیسے کوئی حاملہ مدت حمل بتا رہی ہو۔ اتنا سننا تھا کہ دفعتہً وہ ہمارا ہاتھ تھامے ہوئے باہر آیا اور دور ایک سکشن کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں جائیے بائیں کولہے کے پرانے درد کا علاج جو رات میں اٹھتے وقت ہوتا ہے اس "ہوم" میں ہوتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مذاق کی حد کیا ہوگی۔ آج کل سوچ بھی مختصر ہو گئی ہے۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ وہ مطلوب سکشن آگیا۔ بڑے ہی خوش لباس اور خوش اخلاق لوگ تھے۔ ہمارا مطلب ہے خواتین تھیں۔ ہم ہر خوش پوش خاتون کو بلاوجہ خوش اخلاق بھی سمجھ لیتے ہیں جسکا احساس بعد میں ہوتا ہے اور بعض وقت بہت بعد میں ہوتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھ جانا چاہیئے کہ کپڑوں کا تعلق اخلاق سے ہرگز نہیں، اگر ایسا ہوتا تو جبری طور پر معمولی کپڑے پہننے والے اختیاری طور سے بڑے اخلاق والے ہوتے۔

البتہ یہاں آکر ایک گونہ سکون ملا۔ یہاں ہمیں بٹھا دیا گیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ مگر مرزا حسین نرسوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہمارے کولہے کی بابت گفتگو کرنے لگے۔ آدمی کو جلنے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ حسینوں سے دور ہو اور اس کا دوست حسینوں میں۔ ہم نے سوچا اے کاش مرزا کو کولہے کا درد ہوتا اور ہم ان نرسوں سے مرزا کے کولہے سے متعلق گفتگو کرتے۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ یکایک نرسوں کی یلغار ہوئی۔ ڈاکٹر نے ادھر ادھر معائنہ شروع کر دیا کہنے لگی اب آپ سے آخری بات پوچھنی ہے۔ ہم نے کہا آخری بات تو ذرا پہلے پوچھ لی گئی کہنے لگی۔ یہ قطعی آخری بات ہے۔

ہم نے کہا: "پوچھیئے"

کہنے لگیں: "آپ اپنے کولہے کا علاج حکومت کے روپئے پیسے پر کروائیں گے یا اپنے روپئے پیسے سے"۔

ہم اس سوال پر حیران رہ گئے۔ کون اس دور میں حکومت کے روپئے پر علاج کروانا نہیں چاہتا۔ ایسا تو وہ بھی چاہتے ہیں جو خود حکومت کا علاج کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہم نے کہا جہاں حکومت کے ہم پر ڈھیر سارے احسانات ہیں وہاں ایک اور احسان سہی۔ بس کہہ دیا۔ میڈم۔ ہم بھی حکومت کے روپئے پر اپنا علاج کروائیں گے۔

کہنے لگی: "آپ ادھر سے اسپتال کے باہر نکل جائیے وہاں فارم مل رہے ہیں۔ فارم بھر دیجئے اور دستخط کر کے لے آئیے۔ علاج شروع کر دیا جائے گا۔ جب ہم اسپتال سے باہر نکلے تو دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ فارم دینے والے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر جب ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ایک کھڑکی تھی جو بند تھی اور اس پر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر لکھا تھا: "فارم ختم ہو گئے ہیں ایک مہینہ کے بعد تشریف لائیے!"۔ ☆

یوسف اعجاز
ٹورانٹو (کینیڈا)

کار کے کھلونے .... کل اور آج

یہ ان دنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئے تھے ایک روز جب والد
صاحب نے گھر آکر یہ خوشخبری دی کہ انہوں نے نئی کار خریدی ہے تو ہماری خوشی کی حد نہیں رہی۔ اتنی خوشی کہ بانچھیں کھلنے لگے۔
باچھیں کھل گئیں۔ لڈو پھوٹنے لگے۔ آتش بازی سی ہوتی محسوس ہوئی۔ کیا مجال کہ آنکھ سے آنسو نکلے ہوں۔ یہ دوسری بات ہے ہم
سے نہیں تو آپے سے باہر ضرور ہوگئے تھے۔ کار خریدنا ویسے نہ کوئی حیرت انگیز بات تھی اور نہ کوئی نیا مشغلہ۔ یا کوئی اچنبھا۔
بھی ہم خوش تھے کہ اللہ نے یہ دن بھی دکھلایا۔ امیدیں بر آئیں نہ منتوں کی ضرورت ہوئی۔ نہ تعویذ اور عملیات کی۔ پرانی کار جو
پرانی کار نہ تھی ایکدم بہت ہی قدیم، ناکارہ اور پھینک دینے کے لائق بن گئی۔ اس میں بیٹھنا اب ایک توہین تھی۔ توہین کس کو گوارا
۔ ہمیں پرانی کار کے خواہ مخواہ ایک ایک کر کے وہ دن بھی یاد آنے لگے جب وہ رینگتی سسکتی اور بعض وقت بغیر نوٹس کے
کے بیچ رک جاتی تھی۔ سوائے دھکا دینے کے کسی اور طریقے سے آگے نہ بڑھتی۔ پیچھے والے ہزاروں ہارن بجا بجا کر تنگ
ہے ہیں۔ طعنے تشنے موٹی دبی گالیاں طنزیہ مسکراہٹیں، قہقہے اور حقارت آمیز نگاہیں۔ ایک فلم کے سین کی طرح یاد آنے لگیں۔ حد تو
تھی کہ بازو چلنے والے سیکل رکشا، آٹو رکشا والے، سیکل سوار جیسے فاتحانہ انداز میں مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔
نئی کار میں بیٹھ کر ہم بھی ہمارے آس پاس اور پیچھے والوں کے ہارن کا جواب ہارن سے دے سکتے۔ اینٹ کا جواب پتھر۔ مگر واہ رے
نئی کار کہ اس کی ہر چیز بجتی تھی سوائے ہارن کے۔ پرانی کار بھی کیا شے تھی کہ وہ سوائے سرخ لائٹ کے ہر لائٹ پر رک جاتی۔
والے اس کے شور و غل سے تیزی کے ساتھ ایک طرف ہو جاتے جیسے شاہی سواری گزر رہی ہو۔ ان کے لئے صرف دو ہی راستے
۔ راستہ دو یا جان دے دو۔ مغرب میں تو یہ رواج ہے کہ بعض دلچلے پرانی کار اونے پونے داموں خرید کر نئی کار کی قیمت میں لیتے
کرتے ہیں جیسے انہوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری ہو۔ مگر تیسری دنیا کے نئے آزاد ہونے والے ممالک اور نئی دنیا میں یہ سلسلہ تو سرے
غائب ہے۔

والد صاحب کا اعلان اس لئے بھی جانفزا تھا کہ انہوں نے 1954ء کی شیورلٹ خریدی تھی اور یہ بھی بتلایا تھا کہ وہ Fully
Load یا Fully Equiped ہے۔ یعنی بجائی بجلی کار سے بہتر اور کیا چاہئے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ یہ بات تو کانوں
سنی سنیما، اخباروں، اشتہاروں میں دیکھی اور پڑھی تھی مگر محسوس کبھی نہیں کیا تھا۔ ہم کو یہ بعد میں پتہ چلا کہ لدی لدائی بجلی کار سے
مطلب اور سوپر ڈوپر کار کے معنی تھے کار میں ریڈیو اور پھر ریڈیو ایسا ویسا بھی نہیں مثلاً فلاں کے اے ایم ریڈیو تھا جس کے پانچ بٹن
ڈی لکس ریڈیو کے بارے میں تھوڑا اور غور کیا تو پتہ چلا کہ اس وقت کولا کی لہروں کے دوش پر ہم سے مخاطب ہونے والے
تین ہی اسٹیشن تھے۔ سونے پر سہاگہ شہر سے باہر ڈرائیو کرتے ہوئے ریڈیو کی لہریں ان اسٹیشنوں کو پکڑنے سے قاصر تھیں۔
سے خاندان اور صاحب کار اس وہم پر اعتقاد رکھتے تھے کہ کار کے لئے ریڈیو نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے ڈرائیور کی توجہ اور دھیان
جاتا ہے اور حادثے کا خطرہ ہے۔ مگر 1954ء کی کار نے اس فلسفے کو فرانے بھرتے ہوئے پیچھے چھوڑ دیا۔ اب وہی چیز خیر

روایتی سنز یا کلب، دھیان بانٹ دینے والی نہیں رہی۔ ان دنوں خاندان کی کار میں تفریح اور منورنجن کے لئے صرف کار کی کھڑکیاں تھیں جو اپنے آرام، تازہ ہوا کے لئے کھولی اور بند کی جاسکتی تھیں۔

نئی کار میں سیٹ کے اوپر پلاسٹک کا شفاف Cover لگا تھا۔ ہم ابھی اسی ہچکچاہٹ اور تذبذب میں تھے کہ مہمانوں کے لئے یہ پلاسٹک کا غلاف رکھا جائے کہ نکال دیا جائے۔ پرانی کار میں تو ایک چادر تھی جو وقتاً فوقتاً حسب موقع حسب توفیق نکال دی جاتی تھی۔ سچ ہے اللہ جس جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ پتہ چلا پلاسٹک کا یہ غلاف سیٹ کے ساتھ نیچے کے حصوں میں کیلوں سے ٹھونک کر مستقل بنا دیا گیا تھا۔ پرانی کار میں پیچھے بیٹھنے والے سیٹ کو اپنی رانوں سے اس قدر رگڑتے اور طرح طرح کی آوازیں پیدا کرتے کہ وہ بجائے خود اچھا خاصہ تفریح طبع کا سامان تھا۔ ڈرائیور کی پوری توجہ ایک مرکز پر رہتی یا نہیں مگر ایک بات یقینی تھی کہ اسکو کسی ریڈیو کی ضرورت نہیں تھی۔

1954 سے 1999 تک ایک طویل وقفہ ہے۔ ایک نسل کی مکمل تبدیلی۔ جو جوان ہو رہے تھے وہ اپنے والد کے جانشین ہو کر مسند پر سوار ہیں اور خود اب والد بزرگوار ہو چکے ہیں۔ کار بھی وقت کی رفتار کے ساتھ کروٹ لے چکی ہے وہ بھی نئی جنریشن کو متعارف کرا رہی ہے۔ موجودہ کار کو ہر ضرورت، ہر سیر و تفریح اور آرام سے لیس ہونا چاہئے اور دیکھا جائے تو ہوا بھی ایسا ہی ہے۔ تفریح یا چھٹیوں پر لمبی ڈرائیو پر جانے سے قبل از وقت منصوبہ بندی درکار ہے۔ منصوبے اور نقشے کی تیاری درد سر کا ایک جز ہیں۔ کار کے انجن، ٹائر کو دیکھنے کے لئے میکانک کے پاس چھوڑ کر ایک دو دن ان کے نخرے اور ناز سنے پڑتے ہیں خوشامد، نظر کرم کے لئے دوہرے ہو جانا باعث شرم نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے کہ وقت پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ پھر یہ تو میکانک ہے جو ڈاکٹروں کے پیشہ ورانہ زمرہ میں ہے اور دونوں کے عادات و اطوار ایک ہی طرح کے ہیں جس سے جان چھڑانا آسان نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد سلسلہ اس قدر طول پکڑتا ہے کہ اسکو صحت ہی ادا کر سکتی ہے۔ پھر ہمارے پندرہ سالہ صاحبزادے ہیں جو ذہانت اور موجودہ سائنسی ایجادات اور ترقیوں سے لیس گھر کے ریسیڈنٹ انجینیئر بنے بیٹھے ہیں۔ ریسیڈنٹ انجینیئر تمام تاروں سے لیس ہو کر ٹرانسفارمرس، اسپلیٹرز Spliters، چارجرس اور ٹیلی فون لئے حاضر خدمت ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اب ہم کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک بٹن دباتے ہی مطلوبہ آپریشن، ریموٹ کنٹرول کے ذریعے چالو اور پھر طرہ یہ کہ کئی سو گز کے فاصلے سے بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔ دروازے کا قفل کھل جاتا ہے۔ دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ پیچھے سامان رکھنے کے لئے ٹرنک یا ڈکی Dicky کو ریموٹ کے ذریعہ کھول دیا جاتا ہے۔ موسم کا لحاظ کرتے ہوئے اسی ریموٹ کنٹرول سے کار بھی گھر بیٹھے اسٹارٹ ہو گئی۔ دور ہی دور سے ہر کام جاری ہے۔ کار میں بیٹھ کر سکون قلب حاصل ہونے کے بعد کھڑکیوں کو دوسرا بٹن دبا کر کھولا یا بند کیا جاسکتا ہے۔ اس مکمل Fully Equiped Van کے کیا کہنے۔ عیش ہی عیش۔ آرام ہی آرام۔ کار میں لگا کروز کنٹرول۔ کئی اسپیکروں کے ساتھ ساؤنڈ کی نفاست، اے ایم ایف ایم ریڈیو اور اسٹیریو سسٹم، سی ڈی CD پلیر۔ آگے اور پیچھے موسم کے کنٹرول کے لئے بٹن، موٹر انڈ آگے پیچھے ہونے والی سیٹ، پاور ونڈو، دروازے کے لاک پھر ان ضروریات کے کیا کہنے کہ سی ڈیز CDs کو رکھنے کے لئے ایک ڈبہ، ہمہ ذوق اور ہمہ اقسام کے آڈیو ٹیپ، کسی کو منہ چڑھانے، شکایت کرنے، بور ہونے کا موقعہ ہی نہیں۔ ہونے پر سہاگہ دوسرے کی پسند ناپسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذاتی سماعت کے لئے ایر فونز Ear Phones کانوں میں نہ روئی رکھنے کی ضرورت اور نہ Ear Plug کی۔ کار میں دو سل فون Cel Phone کہ باہر کی دنیا سے سمبندھ نہ ٹوٹے۔ گھر کی خیر خبر، مقامی افواہیں گپ شپ، سننے کو ملتی رہیں اور پھر اسی سیل

فون Cel Phone کے ذریعے پیچھے بیٹھنے والا سامنے بیٹھنے والے کی خیر خبر رکھتا ہے۔ ساتھ ہی شخصی تعلق بھی قائم ہے۔ پیچھے مڑکر دیکھنے اور سڑک سے نظر ہٹانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے ورنہ سی ڈی CD اور آڈیو کے شور اور غل غپاڑے میں کس کو ہمت ہے کہ چیخ چیخ کر گلا پھاڑے۔ اسی ٹمنٹ کی بدولت نقار خانے میں طوطی کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اب کھڑکی سے باہر دیکھنا مناظر کا لطف اٹھانا اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کی کس کو ضرورت یا خواہش ہے۔ کون پرواہ کرتا ہے کہ اب یہ سب ایک گزرا حادثہ یا آوٹ ڈیٹ OutDated ہو گیا ہے۔ لیپ ٹاپ Laptop کمپیوٹر، مکمل رنگین مانیٹر، فیکس موڈم Fax Modem، سی ڈی روم CD.Rom یا گیم گیئر Gamegear سب ہی سے لیس اور آراستہ ہے پھر ہمہ اقسام کے کارٹریجز Cartridges بھی زاد راہ ہیں۔ اگر خوانخواستہ کوئی اچھا منظر اتفاقاً نظر آ گیا تو دیکھ لیا ورنہ وڈیو وہ سب تصویریں اتار دیتا ہے جو تیزی کے ساتھ کلک Click ہونے والے تین کیمروں سے بچ گیا۔

دن بھر کی ڈرائیونگ کے بعد بھوک پیاس کے لڈو کھانے کے بجائے دین Van میں خیر سے ایک چھوٹا سا ریفریجٹر بھی لگا ہے اگر حسن اتفاق یا بد قسمتی سے کار کا فیوز جل گیا تو ہر چیز ایک دم ساکت ہے۔ دنیا ایکدم رک گئی۔ بجلی غائب۔ سگریٹ جلانے کا لائٹر خاموش۔ سی ڈی اور ٹیپ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ قیامت آ گئی۔ موت کا عالم۔ ڈرائیور پر سوالات کی بوچھار۔ عدالتی جرح۔ زندگی و بال جان اور دو بھر اس موت سی خاموشی، بیراسانی، بوریت میں ناتجربہ کاری اور دھوپ میں سفید کئے ہوئے بال اب بے بسی، بے سرو سامانی کی چغلی کھانے لگتے ہیں۔ ایسی ڈوبتی نیا، کشتی کو طوفان سے نکالنے کے لئے دور خلاء میں والد کی صورت ایسے ابھر کر آتی ہے گویا کوئی اس کشتی کو منجدھار سے نکالنے کے لئے آ گیا ہو۔ ایک طنزیہ، تجربہ کارانہ مسکراہٹ جیسے ہدایت دینے لگتی ہے۔ کیا کسی کو کوئی گیم یا کھیل آتا ہے۔ مثلاً ISPY۔ ☆

ظفر کمالی

At. Ranipur,
P.O. Barharia,
Dist. Siwan (Bihar)

رب دنیا میں تو مانگا کیے قرآن کا صدقہ
بروزِ حشر ان کو چاہیے ایمان کا صدقہ

معیشت کی ترقی کا یہی فن ہم نے سیکھا ہے
کبھی امریکا کا صدقہ کبھی جاپان کا صدقہ

یہاں استاد انگلش بھوجپوری میں پڑھاتے ہیں
بٹا کرتا ہے ایسے علم کے عرفان کا صدقہ

دبی ماڈرن عاشق ہے جو گھر سے بھاگ جاتا ہے
کرے کب تک گوارا دور سے مسکان کا صدقہ

وہ گنگا ہو کہ جمنا سب یہاں الٹی ہی بہتی ہیں
کہ اب ملنے لگا فرعون کو ہامان کا صدقہ

چلے آئے ہیں مہمانوں میں ہم بھی بن بلائے ہی
وہ دعوت کھائیں گے ہم کھائیں گے مہمان کا صدقہ

گزاری عمر ہم نے اس طرح دورِ گرانی میں
کہیں سے چائے خیراتی کہیں سے پان کا صدقہ

اگر حاجت غزل کی ہو کہو استاد سے جا کر
عنایت کیجیے حضرت ہمیں دیوان کا صدقہ

ہتھیلی پر جمے سرسوں لگا دے جونک پتھر میں
عجب تاثیر رکھتا ہے یہ دسترخوان کا صدقہ

وہ ٹھیکہ ہو کہ پرمٹ یا چیرمینی ادارے کی
وزیرِ محترم کی شان میں گن گان کا صدقہ

اگر ہم سے کوئی کشمیر مانگے گا تو کہہ دیں گے
میاں پی ایم سے مانگو جا کے ہندوستان کا صدقہ

چناؤ میں دوبارہ جیت کر اتنا نہ اتراؤ
تمہاری فتح تو ووٹر کے ہے نسیان کا صدقہ

نظر آتی ہے مرزا داغ کی غزلوں میں جو شوخی
بقول ناقد اعظم ہے منّی جان کا صدقہ

خدا کی دین مت سمجھو کہ ہم زندہ سلامت ہیں
عنایت ہے کسی دادا کی یا ہے ڈان کا صدقہ

ملی اک نوکری اچھی ملا استاد پاشا☆ سا
ظفر کیا اور تم کو چاہیے سیوان کا صدقہ

☆ جنا[illegible] جمال پاشا

فاطمہ تاج
گھر باؤلی میر چوک، حیدر آباد

"اڑن کھٹولا"

اپریل 97ء کا ماہنامہ "شگوفہ" جو زندہ دلان حیدر آباد (ہمیں چھوڑ کر) کا ترجمان بھی ہے جب دوبارہ ہمارے ہاتھ لگا تو ہم نے حسبِ روایت ٹائٹل اور پھر فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے مضامین کا مطالعہ شروع کیا۔ (پرانی بات جب زیادہ پرانی ہوجاتی ہے تو نئی معلوم ہوتی ہے۔ ہے نا؟) اور جب جناب پرویز یداللہ مہدی کے مضمون کا عنوان "زمینی اڑن طشتریاں" دیکھا تو ہم خود بھی "اڑن طشتری" کی طرح اپنی الماری تک پہنچ گئے .... مگر پھر کسی غیر مرئی طاقت نے ہمیں اس مضمون کے دوبارہ مطالعہ پر اکسایا اور پھر ہم یہ مضمون پڑھتے ہوئے ملتے رہے چند ہی منٹوں میں ہنسی کا بیڑا پار کر ہی لیا اور پھر حافظہ کی گرین لائٹ، اسپارک کرنے لگی تو ہم نے اڑن طشتری کی طرح دوبارہ بھری اڑان اپنی الماری کی طرف اور بڑی چابکدستی سے چابی گھما کر جھٹکے سے الماری کا دروازہ کھولا اور نچلے الماری کے خانوں کا جائزہ لینے بیٹھ گئے نیچے فرش پر، جائزہ کے دوران کافی الٹ پلٹ رہی۔ الماری ہماری وحشت سے ہو گئی لرزہ براندام ... اوپر کے خانوں میں جمی ہوئی کتابیں، رسالے، البم برسنے لگے ہم پر "اولوں" کی طرح .... لیکن ہم؟ ہم موجِ بلا کے سبھی تھپیڑوں سے بے نیاز جاری رکھے ہوئے تھے تلاش ....

بات دراصل یہ تھی کہ جن زمینی اڑن طشتریوں کا ذکر مذکورہ مضمون میں کیا گیا تھا وہی تذکرہ کافی عرصہ پہلے ہم اپنے مضمون "اڑن کھٹولا" میں حسب حیثیت کر چکے تھے ہم نے بھی مضمون اپنے تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر لکھا تھا لیکن تساہل نے کسی کو سنانے کا موقع دیا اور نہ کہیں شائع کروانے کا۔

زمینی اڑن طشتریوں کی بات پر ہمارے حافظے نے بھی اڑان بھری اور بالآخر وہ مضمون ہمارے ہاتھ لگ ہی گیا اور ہم نے اپنے ذاتی مضمون کو اجنبی قاری کی طرح پڑھنا شروع کیا ... اور پھر ہماری ننھی منی یادوں کا آسمان بڑا وسیع ہوتا گیا۔

"جب اماں نے ہمارا سر اپنی گود میں رکھ کر کھلے چھت پر ٹھنڈی سی چاندنی میں ہمیں طلسماتی کہانی سناتے ہوئے کہا "شکار کے دوران شہزادہ راستہ بھٹک گیا جب رات ہو گئی تو وہیں خوفناک جنگل میں گھنے درخت کے نیچے لیٹ گیا تاروں کی ہلکی سی روشنی میں ایک چھما کا سا ہوا اور سارا جنگل روشن ہو گیا اچانک شہزادے کو پازیب کی چھن چھن سنائی دی ساتھ ہی نقرئی قہقہے جلترنگ سا بجانے لگے بربط پر سریلی آواز میں کوئی نغمہ بھی سنائی دیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک عجیب و غریب "تخت نما" سواری آسمان سے سامنے والے گھنے درخت پر اتر آئی ایسا لگتا تھا کہ ستاروں کی جھلملاہٹ لئے یہ پریوں کا تخت صرف شہزادے کے لئے اتر آیا ہو یہ تخت "رتھ" جیسا تھا سامنے ایک پہیا اور دائیں بائیں ایک ایک پہیا تمام پہیے سونے کے تھے ہیرے جڑے اس تخت پر نیلے لباس میں بے حد حسین ایک پری "کنیزوں" کے درمیان نیم دراز تھی، شہزادے نے سوچا وہ اس خوبصورت نیلی پری کو اپنی شہزادی بنائے گا اور پھر شہزادے نے آواز دی ... اے نیلی پری! آواز سنتے ہی پل بھر میں وہ تخت غائب ہو گیا"۔

ہم نے اماں سے پوچھا: "وہ تخت تھا یا "رتھ"؟"

اماں نے کہا: وہ اڑن کھٹولا تھا بیٹی! جو "آدم زاد" کی آواز سے غائب ہو جاتا ہے۔" اماں ہمیں سمجھا رہی کہ کیا" معلوم تھا کہ چند برسوں

میں اڑن کھٹولوں کا چلن عام ہوجائے گا۔ اور ان کی یہ لاڈلی بیٹی بھی (پری نہ ہونے کے باوجود) اڑن کھٹولے میں سفر کیا کرے گی، تو خیر!
ہم جب بھی آٹو رکشا میں کہیں جاتے ہیں تو اسے اڑن کھٹولا ہی سمجھتے ہیں جو ہمیں پلک جھپکتے ہی نئے پل سے پرانے پل تک اور پرانے شہر سے نئے شہر تک لے آتا ہے اس کے بھی تین ہی پہئے ہیں سونے کے نہیں تو ربر کے سہی سریلے نغمے، جلترنگ و بربط کی آواز نہیں تو کیا اس سے بھی ماڈرن موسیقی کی لہریں نہیں بلکہ دھاریں نکلتی ہیں .... گھرر گھرر .... کھڑ کھڑ .... چرر چوں چوں چرر چوں چوں سی ی ی ..... آٹو رکشا کے ابتدائی دور میں ہم نے ایک دفعہ آٹو والے سے کہا کہ ہمیں معظم جاہی میوہ مارکٹ جانا ہے اور میوہ خرید کر فوراً واپس ہوجانا ہے آٹو ڈرائیور نے گردن سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا تو ہم تیزی سے آٹو میں بیٹھ گئے بیٹھنے کی دیر تھی کہ آٹو ڈرائیور نے میٹر "ڈاؤن" اور ہمیں "اپ" کردیا یعنی اتنی تیزی سے آٹو اسٹارٹ کیا کہ ہمارا سر جا لگا بلکہ جا ٹکرایا آٹو کی آہنی سلاخوں والی چھت سے ... چند لمحوں کے لئے ہم تاریکیوں میں گم ہوگئے اور جب سنبھلے تو مارکٹ کے چوراہے کے پاس میوے کی دکان کے سامنے ہم نے خود کو پایا۔ ہم حیرت زدہ تھے کہ اس قدر جلد ہم یہاں کیسے پہنچ گئے ہو نہ ہو یہ اڑن کھٹولا ہے۔ اور یہ "آدم زاد" کے بھیس میں کوئی طلسماتی مخلوق .... ہم نے ڈرائیور کو غور سے دیکھا ... تو چھٹی کی دادیاں یاد آگئیں !!!

بہر حال میوے کے ٹوکرے آٹو میں رکھے سو سو کے دو نوٹ میوے والے کو دئے ڈیڑھ سو کا بل تھا (اس زمانے میں) اس سے پہلے کہ دکان دار پچاس روپئے واپس کرے ہمارا اڑن کھٹولا اڑان بھر چکا تھا ... منزل کی طرف .... گھر پہنچ کر ٹوکرے ہمیں ہی اتارنے تھے تین ٹوکروں میں سے جوں توں کر کے ہم نے دو ٹوکرے اتارے ہی تھے کہ .... اڑن کھٹولا نظر سے اوجھل ہوگیا ....

اس طرح کے کئی عجیب و غریب واقعات سے ہم گزرتے رہے اور اب یہ حال ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم آٹو ڈرائیور کو "شتر بے مہار" نہیں ہونے دیتے، اس کی باگ ڈور (جو نظر نہیں آتی) ہم اپنے ہی ہاتھ میں رکھتے ہیں، مجال ہے جو آٹو والا ہماری بتائی ہوئی حد سے آگے گزر جائے، آٹو میں بڑی شاہراہوں سے لیکر شہرِ نگاراں کی گلیوں تک کا سفر اب ہم بڑی خود اعتمادی سے کرنے لگے ہیں بالکل بے خوف و خطر ..... بر سبیل تذکرہ ہم سوار ہوتے وقت ہی ڈرائیور کو بتادیتے ہیں کہ ہم "آٹو ڈرائیور اصلاح سوسائٹی" کے عہدیدار ہیں .... اگر ڈرائیور سمجھدار ہو تو ٹھیک ہے لیکن جاہل مطلق سے جب پالا پڑتا ہے تو ہم اس کا آٹو نمبر نوٹ کر کے اسے مرعوب کر ہی دیتے ہیں! ☆

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ، بیتیا ۸۴۵۴۳۸

"اکیسویں صدی کو سلام"

آئیے۔ آئیے۔ یو آر موسٹ ویل کم۔ خوش آمدید۔ سواگتم! آپ کا آنا مبارک ہو۔ آپ سے ملنے کی تمنا لئے کتنے لوگ دنیا
ے گزر گئے اور کچھ گزرنے کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ کم سے کم وہ لوگ جاتے جاتے آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور
ت ممکن ہے کہ ملنے کی خوشی میں ان کا ہارٹ فیل ہوجائے۔ آپ کے استقبال کی تیاریاں برسوں سے ہورہی ہیں۔ دنیا کے سارے
مالک اس تیاری میں لگے ہیں کہ آپ کا استقبال شاندار ڈھنگ سے ہو۔ اس کے لئے وہ کچھ نہ کچھ کررہے ہیں۔ کچھ کام تو کھلے عام کررہے
ں اور کچھ چھپ کر کررہے ہیں۔ اب یہی دیکھنا ہے کہ کون ملک بازی مارتا ہے۔ ایک ملک کی حکومت آپ کو سی ٹی بی ٹی کا تحفہ دینے
الی تھی لیکن پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ انکا مزاج بدل گیا اور سی ٹی بی ٹی کے فارمولے کو منسوخ کردیا گیا ہے۔ شائد وہ لوگ آپ کا
ستقبال جوہری اسلحات کے گلدستہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ اب جو ملک جتنا چاہے بم بنائے اور اس کا استعمال کرلے۔ چاہے تو پڑوسی
ے کو صلح و آشتی کا پیغام بھی جوہری بم کے ذریعہ بھیجے۔ یہ بھی خوب انداز ہے کہ "نہیں مانو گے تو بم پٹخ دوں گا"۔ یعنی انسانیت کی
ا۔ جوہری بم سے ہی ممکن ہے۔ دوسرا ملک شائد آپ کا استقبال اور بھی وسیع پیمانے پر کرنا چاہتا ہے۔ اس نے دہشت گردوں کی در
ازی کا بہانہ بناکر ہمسایہ ملک پر حملہ کردیا ہے تاکہ اس ملک کو ہتھیانے کے بعد آپ کے استقبال کا دائرہ وسیع ہوجائے۔ وہاں کی
وام پر بم باری ہورہی ہے اور میڈیا کہہ رہا ہے کہ شدت پسندوں کے ٹھکانوں پر حملہ کیا جارہا ہے۔ اے مہمان محترم، ویسے تو ہم لوگوں کی
ر بہت چھوٹی ہے اور عالمی جنگ ہوئے، بہت دن ہوگئے ہیں۔ آپ اس جنگ کے بارے میں کتابوں میں پڑھا کرتے ہیں۔ لیکن
ھنے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ کوئی ایسی صورت نکالئے۔ جس سے ہم لوگ عالمی جنگ کا نظارہ
سکیں۔ اسی بہانے آبادی بھی کم ہوجائے گی اور بہت سے مسئلوں کا حل خود بخود ہوجائے گا۔ آپ کا استقبال شاندار ڈھنگ سے
نے کے لئے ایک ملک کی فوج نے حکومت پر ہی قبضہ کرلیا ہے اور وہاں کی جمہوری حکومت کو برطرف کردیا ہے تاکہ بصد اہتمام
پ کو "گارڈ آف آنر" پیش کیا جاسکے۔ لوگوں کے بنیادی حقوق ختم کردئے گئے ہیں۔ جمہوری حکومت نے عوام کو بنیادی حقوق دے
انہیں خود سر بنا دیا ہے۔ جب کسی کو اس کے بنیادی حقوق دے دئے جاتے ہیں تو وہ اپنی الگ ڈفلی بجانے لگتا ہے۔ سارے
ادات کی جڑ یہی ہے۔ جب انسان خود سر بنجائے تو اس سے شیطان بھی پناہ مانگنے لگتا ہے۔ لوگ فوجی حکومت میں کتنے سکون کے
تھ رہتے ہیں۔ نہ کوئی جلسہ نہ جلوس، نہ کوئی ریالی نہ ہڑتال۔ اس ملک کی جمہوری حکومت اگر آپ کا استقبال کرتی تو آپ کو کیا خاک
آتا۔

اے اکیسویں صدی، ہم آپ کا استقبال اپنے جمہوری نظام میں کررہے ہیں، جس نظام کا دنیا میں جوڑ نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے
آپ کی قیادت میں ہم ترقی کی منزلوں سے کافی دور نکل جائیں گے۔ ہمارا کیا، ہمارے پاؤں کے نشان ڈھونڈنے سے نہیں ملیں
ے۔ آپ کے آنے کی خوشی میں ہم پھولے نہیں سمارہے ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ ہماری راہ میں روڑے اٹکانے والے بھاگ
یں گے۔ گزشتہ صدی میں بھی ہم نے ترقی کے منازل طے کیے لیکن بہت ساری منزلیں رہ گئیں، جہاں ہمیں پہنچنے سے کبھی مذہب

کے نام پر تو کبھی انسانیت کے نام پر روک دیا گیا۔ ہمیں آپ پر بھروسہ ہے کہ آپ کی رفاقت میں ہم مذہب اور انسانیت کے جھانسے میں نہیں آئیں گے۔ اے اکیسویں صدی، آپ کا آنا ہمارے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوگا۔ آپ کے نام پر ہم ایسے ایسے گل کھلائیں گے کہ زمانہ دیکھتا رہ جائے گا۔ ہمارے یہاں جمہوریت کا بول بالا ہے۔ ہماری جمہوری حکومت دیگر ممالک کی حکومتوں سے بالکل الگ ہے۔ اس لئے ہم آپ کا استقبال فوجی حکومت سے بھی شاندار ڈھنگ سے کریں گے۔ دوسرے ممالک یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ ایک مہنگائی کا مارا اور قرض سے لدا ملک نئی صدی کا استقبال اس ڈھنگ سے کررہا ہے۔ اصل میں ہمارے یہاں کا چلن ہے کہ میزبان بھلے ہی بھوکا رہ جائے لیکن مہمان کی تواضع میں مرغ و ماہی کی کمی نہیں رہتی۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں قرض دینے والے ممالک حسد و جلن کی وجہ سے قرض دینا بند کردیں لیکن ان کے قرض نہ دینے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہاں، تھوڑی گرانی بڑھ جائے گی۔ لیکن مہنگائی سہنے کی قوت ہمارے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہم غذا کم اور غم زیادہ کھاتے ہیں۔

ہم لوگ نا امید ہونا نہیں جانتے اور ویسے بھی نا امیدی کفر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں نا امید ہونے نہیں دیا جاتا۔ دن بھر میں کئی کئی مرتبہ ہمارے رہنما آکر وعدوں کا ثمر ہمارے حلق میں انڈیل جاتے ہیں۔ ہماری جمہوریت بانجھ بھی نہیں ہے۔ وہ پھل دے رہی ہے لیکن چونکہ اس پھل پر ہمارے رہنماؤں کا پہلا حق بنتا ہے۔ اس لئے پھل کا نذرانہ پہلے انہیں پیش کیا جاتا ہے۔ اور ان سے جو کچھ بچتا ہے وہ ہمارے افسران ملکر بانٹ لیتے ہیں۔ افسران نہیں رہیں گے تو جمہوریت کی حفاظت کون کرے گا۔ جب پھل وافر مقدار میں آنے لگیں گے تو عوام کو بھی مل جائیں گے۔ یہ ہمیں امید ہے۔ چونکہ ہم لوگ غذا کم اور غم زیادہ کھانے کے عادی ہیں۔ اس لئے غموں کا انتظام یہاں بھرپور رہتا ہے۔ جتنا چاہیں اتنا غم کھائیں کوئی روکنے والا نہیں۔ غم دوراں، غم جاناں، غم عاشقی، غم روزگار وغیرہ وغیرہ بہت سارے غموں کا اہتمام ہے۔ ہمیں بھروسہ ہے کہ آپ کی آمد سے ہمارے غموں میں کچھ اور اضافہ ہوجائے گا۔ جس سے ہماری جمہوریت کو چار چاند لگیں گے۔

اے اکیسویں صدی، تیرا آنا ہر زاویے سے سودمند ہو۔ بیسویں صدی میں ہم جس مقام پر پچھڑے تھے اسی مقام سے ہماری اسپیڈ تیز ہوجائے اور ہماری ترقی کی راہیں ہموار ہوجائیں۔ ہم پر انگلیاں اٹھانے والا کوئی نہ ہو۔ جمہوریت پر لگے داغ دھبے تیرے آنے سے خوشنما گل بوٹے دکھائی دینے لگیں گے۔ جہاں کم داغ ہوں گے وہاں کچھ اور داغ ملاکر اسے جدید آرٹ کی شکل دے دی جائے گی۔ تاکہ وہ لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ مذہب کو سب سے زیادہ خطرہ امن سے ہوتا ہے۔ امن سے زندگی گزارنے والے رفتہ رفتہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ موج مستی کی زندگی میں مذہب بیچارے کا کہاں گزارا ہوتا ہے۔ ایسے میں مذہبی رواداری میں زنگ لگنی شروع ہوجاتی ہے۔ اس لئے آپ کی قیادت میں کچھ نہ کچھ ایسی بات ہوتی رہنی چاہئے جس سے عوام کو اپنا مذہب یاد رہے۔ غریبی دور کرنے میں جہیز ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ اسے مسدود کرنا مضحکہ اور نا سمجھی ہے۔ کبھی کبھی کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے اور مزید جہیز حاصل کرنے کے لئے بیوی کی قربانی کے بنا کام نہیں چلتا ہے۔ بیسویں صدی میں اس عمل کو روکنے کے لئے کافی ہنگامہ ہوا، مگر یہ عمل رکا نہیں۔ اگر کچھ حاصل کرنے کے لئے قربانی دینا جرم ہے تو پھر آزادی حاصل کرنے کے لئے اتنے لوگوں نے قربانی کیوں دی۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی رفاقت میں ہم کوئی ایسا حربہ ڈھونڈ لیں گے جس سے زیادہ سے زیادہ جہیز حاصل ہوسکے گا۔ ایسا کر کے ہم جلد از جلد غریبی دور کریں گے۔ ساری دنیا راکٹ سے چاند پر جارہی ہے۔ چاند پر ہی کیا زہرہ اور مریخ پر جانے کی بات چل رہی ہے۔ ہم بھی جانے کی سوچ رہے ہیں۔ لیکن ہمارا ملک بہت غریب ہے۔ اس میں بہت زیادہ خرچ لگتا ہے۔ اب یہی دیکھئے نا، جب ہم نے بم بنایا تو دوسرے ممالک نے ہمیں امداد دینا بند کردیا۔ کہنے لگے، غریب ہو کر بم بنا[illegible] ہے

۔ اب آپ ہی بتلایئے ، کیا ہم بنانا گناہ ہے ، غریب صرف چٹنی روٹی ہی کھائے وہ ادھار لیکر کیا پلاؤ گوشت نہیں کھاسکتا۔ یہ تو سراسر نا انصافی ہے۔ آخر اس کا بھی تو دل ہے اس کے بھی کچھ ارمان ہیں۔ ہمارے ہم بنانے پر دنیا والوں نے ہنگامہ مچا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے میں زہرہ اور مریخ پر جانے کی بات کریں تو وہ ہمارا محاصرہ کریں گے۔ ہمیں پابندیوں میں جکڑ لیں گے۔ اس لئے ہمیں کوئی شارٹ کٹ راستہ بتایئے تاکہ ہم ان کے جانے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ اور وہ پیچھا کر کے بھی ہمیں قرض دیتے رہیں۔

اے اکیسویں صدی ، ہم آپ کو ایک سو ایک سلام کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ ہمارا دل خوشی میں یہ جان کر جھوم رہا ہے کہ آپ دقیانوسی نہیں ہیں ، جو جیسا چاہے ویسا ہی ترقی کرے ، اس بات پر آپ کا مکمل ایمان ہے۔ ہم سیاست میں بھی جم کے ترقی کریں گے اور پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیں گے۔ ذات پات ، امیری غریبی اور مذہب کو ضرورت سے زیادہ اپنی سیاست میں جگہ دیں گے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ ہم نے سوچا ہے کہ اس کمی کو دور کرنے کے لئے کچھ قدم اٹھائے جائیں۔ دو اور دو چار بتانے والوں کے ساتھ دو اور دو پانچ بتانے والوں کو بھی سند دی جائے۔ ڈکشنری سے لفظ فیل کو نکال دیا جائے۔ جس نے بھی ایک بار اسکول کی زیارت کرلی اسے پڑھا لکھا مان لیا جائے۔ اس طرح ہمارے یہاں پڑھے لکھوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ بیکاری دور کرنے کے لئے لوگوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہیں روزی کمائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جہاں اکیسویں صدی کے آنے سے اتنی ساری ترقیوں کے امکان روشن ہیں۔ ہم اپنی تہذیب کو پیچھے نہ رکھیں۔ اسے بھی اکیسویں صدی کی دھوپ دکھا دی جائے۔ کیونکہ بیسویں صدی میں ، ہم جب کوئی ایسا ویسا قدم اٹھانا چاہتے تھے۔ یہ گھسی پٹی تہذیب ہمارا راستہ روک لیتی تھی۔ ہمیں کافی ضبط سے کام لینا پڑتا تھا۔ نئی صدی کی آمد پر ہمارے ضبط کی رسی ٹوٹ گئی ہے۔ اب ہم یہ بانگ دہل وہی کریں گے جسے کرنا اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے۔ تبھی جاکر ہم ایک مہذب قوم میں شمار ہوں گے۔ ہم اپنی روایات و اقدار کو بالائے طاق رکھ کر نئی صدی کی باتیں مانیں گے۔ ہم نئی صدی میں نئی تہذیب کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔

اے اکیسویں صدی ، ہم آپ کا استقبال جاڑے کی ٹھٹھرتی ہوئی رات میں اس لئے کر رہے ہیں کہ ہمیں آپ سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہم آپ سے مایوس نہیں ہوں گے اور جب ہم مایوس نہیں ہوں گے تو آپ کو بھی مایوس نہیں کریں گے۔

غزلیں

محبوب مانجھوی
بلاسپور۔ایم پی

رٹ کے دو چار ورق، حافظ قرآں کہلاؤ
قوم و ملت کے بہی خواہ، نگہباں کہلاؤ!

شرک پر شرک کرو، صاحبِ ایماں کہلاؤ
قبر پر سجدہ کرو اور مسلماں کہلاؤ!

تم ہو مختار جو کہدو تو کہیں رات کو دن
تم جو چاہو تو بیاباں کو گلستاں کہلاؤ

حکم کردو تو ہے شان سے الٹی گنگا
اہل گلشن سے گلستاں کو بیاباں کہلاؤ!

بیچ کر آبروئے ملک و وطن غیر کے ہاتھ
جاں نثارانِ وطن اور نگہباں کہلاؤ!

قتل و خون، جنگ و جدل، قہر و غضب، جور و جفا
کام شیطان کا کرتے رہو، انساں کہلاؤ!

چھین لو حسنِ غزل، روحِ غزل، غزلوں سے
اور شہنشاہ تغزل و سخنداں کہلاؤ!

خار ہی خار اگا کر سرِ گلشن محبوبؔ
شوق سے روحِ چمن، جانِ بہاراں کہلاؤ!

●☆●

رؤف رحیم
شکر گنج، حیدرآباد

جب چاہے ہم پہنچتے ہیں انگلینڈ ہانگ کانگ
افیون اور گانجے کے بل پر ہے یہ چھلانگ
ہڑتال میں حسین یہ کرنے لگے ہیں مانگ
سیندور سے جیالے بھریں اب ہماری مانگ
کیا ہوگی ان سے فون پہ پھر رائٹ گفتگو
جو نمبری ہیں ہوتا ہے نمبر بھی ان کا رانگ
ہم کو بھی لوگ فلسفی شاعر نہ کیوں کہیں
ہے اپنی شاعری میں بھی کچھ اوٹ کچھ پٹانگ
خود اپنے ہاتھ پاؤں کو ہے توڑنے کی بات
کوچے میں اس حسین کے کیا جست کیا پھلانگ
یہ فن الگ ہے اس کے ہیں سب داؤ پیچ الگ
میدان عاشقی میں کوئی کنگ ہے نہ کانگ
شاگرد نے گرا کے وہی ٹانگ توڑ دی
ہر بات میں اڑاتے تھے واعظ جو اپنی ٹانگ
اک لومڑی کی چال جو پائی ہے آپ نے
چیتے سے ہم نے چھین کے لائی ہے یہ چھلانگ
کٹ جھتی کا ان کی مداوا ہو کس طرح
ہر بات ان کی ہوتی ہے مرغی کی ایک ٹانگ
سرمایہ اپنا کرتے رہو نذر عمر بھر
اس پر بھی کم نہوگی کبھی مرشدوں کی مانگ
یہ فرق ہو قدوں میں تو کیا عاشقی چلے
عاشق ہے ایک لونگ تو معشوق اس کی لانگ
نقصاں شاعری سے ہوا ہم کو یہ رحیمؔ
چرچا ہمارے عشق کا ہوتا ہے چار دانگ

مشتاق رضا
۳۰۱ پر بھوآلی بھیونڈی،
تھانے، مہاراشٹرا

سفید کوا

کچھ دے دلا کر کام نکالنے کا طریقہ ہمارے سسٹم میں کب راہ پا گیا ہوگا اس سے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا بے حد مشکل ہے۔ ہمارے مورخین بھی اس ضمن میں خاموش ہیں لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ طریقہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ یہ دنیا۔ اس لئے کام نکالنے کیلئے اگر آپ کو کسی افسر کی مٹھی گرم کرنی پڑے تو نہ تعجب کا اظہار کیجئے گا اور نہ ہی تاسف کا کیوں کہ یہ تو ایک چلن ہے ہماری جائز اور ناجائز ضرورتوں نے جنم دیا ہے۔ سرکاری، نیم سرکاری یا پھر غیر سرکاری دفاتر میں بابوؤں کی میزوں پر نیم مردگی کے عالم میں پڑے ہوئے کاغذی گھوڑوں کو مہمیز کرنے والی جادو اثر دوا ہی کا نام رشوت ہے۔ جو گھوڑوں کے جاگنے کے حق میں کہیں زیادہ اثر کا درجہ رکھتی ہے اور انہیں چونا، تمباکو ملنے یا گٹکا چبانے کی خواب آلود اور مست کن کیفیت سے نکال کر فعال، مستعد اور چاق و چوبند بنا دیتی ہے۔

ہواؤں کا رخ بدلنے کا حوصلہ تو اب ہم میں رہا نہیں ہے۔ بس فقط ٹی وی پر نشر کئے جانے والے جینس پتلونوں یا اسٹرانگ ٹی وغیرہ کے اشتہارات میں یہ جوش اور جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں بھی وقت کے دھارے میں بہنے والے تنکے دھارے کا رخ موڑا نہیں کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے ہم سبھی تن بہ تقدیر اس دھارے میں بہے چلے جارہے ہیں۔ اپنے انجام سے بے خبر ہماری حیثیت تو ابن بطوطہ کے زمانے کی بادبانی کشتی کی سی ہوکر رہ گئی ہے بس

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

پرانے وقتوں میں لوگ افسروں، حاکموں اور بادشاہوں کی خدمت میں بیش بہا، قیمتی اور نادر تحائف اور نذرانے پیش کیا کرتے تھے اور ان کے عوض حسب منشاء مراعات حاصل کیا کرتے تھے۔ رشوت دینے کا یہ ایک مہذب اور مستحسن طریقہ تھا۔ شعراء حضرات تو محض قصیدہ خوانی کے ذریعہ اپنا الو سیدھا کرلیا کرتے تھے۔ یعنی بہ الفاظ دیگر الو بنالیا کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں صورتحال بدل چکی ہے۔ اب یہ کام اتنا آسان نہیں رہا ہے۔ اس لئے لوگ بذات خود الو بننے پر اکتفا کرلیتے ہیں یعنی اپنے جائز کاموں کیلئے بھی متعلقہ افسران کی نت نئے طریقوں سے دلجوئی کرتے ہیں۔ چونکہ یہ طریقے خالص جمہوری طرز کے ہیں اس لئے مل بانٹ کر کھانے کے عمل نے انہیں خاصہ پیچیدہ اور طویل بنا دیا ہے۔ متعلقہ افسران کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جس کی پہلی اور اہم کڑی چپراسی ہوتا ہے۔ کام نکالنے کیلئے چپراسی سے لے کر افسر بالا تک کو خوش رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے ورنہ آپ کی فائل ان گنت فائلوں کے ڈھیر میں اوپر نیچے دب کر رہ سکتی ہے اور آپ کا کام ہفتوں نہیں، مہینوں نہیں سالوں تک التواء میں پڑ سکتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ پولیس ڈپارٹمنٹ رشوت خوری کے معاملے میں بہت بدنام تھا۔ اب بھی نیک نام نہیں ہے مگر اب سرطان کے مرض کی طرح اس طریقہ کار نے پورے سسٹم کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اب کوئی محکمہ ایسا نہیں رہا ہے جس میں اس کی

عمل داری نہ ہو۔ ہم نے ایک کامیاب بیورو کریٹ، ایک کامیاب صنعت کار اور ایک کامیاب سیاست داں سے فرداً فرداً ان کی کامیابی کا راز جاننا چاہا۔ اس وعدے پر کہ راز کو راز ہی رہنے دیا جائے گا، انھوں نے گول مول جوابات دیئے۔ ان سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ ان کی کامیابیاں بھی اسی طریقہ کار کی مرہون منت تھیں۔

درحقیقت گاندھی جی کی تحریک ستیہ گرہ کے بعد ہم نے کچھ دے دلا کر کام نکالنے کی تحریک کے سوا کسی تحریک کو اتنا پراثر، نتیجہ خیز اور مقبول عام و خاص نہیں پایا۔ بس شرط ہے آپ کا صاحب استطاعت ہونا۔ بھلے ہی آپ میں کوئی اور خوبی اور صلاحیت نہ ہو ناممکن کے لفظ کو اپنی لغت سے نکال پھینکئے۔ میدان عمل میں اتر آیئے پھر دیکھئے کامیابی اور کامرانی کیسے آپ کے قدم چومتی ہے۔ کام کیسا ہی پیچیدہ اور مشکل کیوں نہ ہو، اسے انجام دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔

بس یہ کہ رشوت دینے کے معاملے میں فراخدلی اور فیاضی کو ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔ میرٹ لسٹ میں آپ کے بچے کی شمولیت سرفہرست کروانے میں آپ کو کمال حاصل ہوگا۔ بھلے ہی آپ کا بچہ ڈاکٹر بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو لیکن آپ کی تمنا ہے کہ وہ ڈاکٹر بن جائے تو یقیناً ڈاکٹر بن جائے گا خواہ ادب کا ڈاکٹر ہو یا میڈیکل سائنس کا۔ وکیل بنانا چاہیں تو وکیل بنایئے۔ انجینیری کی سند دلوایئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی کے جھنڈے گڑوایئے۔ سنگین الزامات کے مقدمات سے بری کروایئے۔ چاہے اس نے کسی کی عزت کے ساتھ کھلواڑ ہی کیوں نہ کی ہو۔ لیکن یاد رہے کہ رشوت دینے کے معاملات میں ہچکچاہٹ اور آنا کانی آپ کے بچے کی ترقی کیلئے سم قاتل بن سکتی ہے۔ اپنے ہونہار کے مستقبل کے دشمن مت بنئے۔ گنگا بہہ رہی ہے اگر آپ کو ڈبکی لگانے میں جھجک ہوتی ہو تو ڈبکی نہ سہی فقط ہاتھ تو دھولیجئے۔ رشوت خور افسران میں اتنی انسانیت تو ہوتی ہے کہ وہ بعض معاملات میں آسان قسطوں میں ادائیگی کو بخوشی تسلیم کرتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ کام بھی قسطوں میں کرتے ہیں لیکن یہ ہر طور یہ سرمایہ کاری ہوتی ہے منفعت بخش۔ جو لوگ دور اندیش ہوتے ہیں وہ اخراجات کی مختلف مدوں میں ایک اضافی مد قائم کرلیتے ہیں کیونکہ اس طرح کا لین دین تو اب روزانہ کا معمول بن گیا ہے جس طرح زہر کا تریاق زہر ہی ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح اینٹی کرپشن والوں کا منہ بھی کرپشن ہی کے ذریعہ بند کیا جاسکتا ہے۔

لے کے رشوت پھنس گیا ہے
دے کے رشوت چھوٹ جا

اس لئے یہ اضافی مد اور بھی ضروری ہوجاتی ہے۔

جنگلی جانوروں کے تحفظ کیلئے بنائے گئے زریں اصول جیو اور جینے دو کا اطلاق اب اس فیلڈ میں بھی ہونے لگا ہے۔ رشوت ستانی سے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ وبا صرف ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے مگر صاحب ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تو گلوبل پرابلم ہے جو کرہ ارض کے طول و عرض کو محیط کئے ہوئے ہے۔ گذشتہ دنوں پڑوسی ملک سے ایک صاحب ہمارے مہمان ہوئے۔ ہم نے ان سے استفسار کیا کہ کیا آپ کے ملک میں رشوت کھائی جاتی ہے؟ ہمارے اٹ پٹے سوال پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے پھر گویا ہوئے۔ ارے صاحب ہمارے ہاں کھانے کیلئے اور ہے ہی کیا؟... اور اگر کچھ ہوتا بھی تو کیا ہم وہ کھاتے یہ نہ کھاتے۔ پھر کوا تو ہر جگہ کالا ہی ہوتا ہے نا... پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ واقعی کوا ہر جگہ کالا ہی ہوتا ہے پھر ہم سفید کوے کی موجودگی کے امکانات پر کیوں غور کرتے رہے تھے۔

●☆●☆●

ظفر کمالی (سیوان)

شریفانہ سہرا

بہ تقریب شادی خانہ آبادی مفتاح الہدیٰ صاحب
پرانا قلعہ، سر سید چوک (سیوان)
بہ تاریخ : ۱۲/ اپریل ۱۹۹۸ء بہ مطابق ۱۴/ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
حسب فرمائش : پروفیسر شوکت علی خاں و سید واصف حسینی
نوشتہ : ظفر کمالی

یادداشت!

اس وقت جو صاحب ہمارے درمیان نوشہ بنے طویل ترین مسکراہٹ کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے میں مصروف ہیں، جن کے چہرے پر دولہن اور صبر کی برکتوں کا نور نمایاں ہے، مشہور شاعر حضرت یکتا سیوانی مرحوم کے پوتے اور ہم سب کے بزرگ جناب شمس الہدیٰ کے صاحب زادے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مثل یاد آتی ہے۔ جن کی جسامت پر ان کی شرافت ہمیشہ غالب رہی ہے۔ خیر سے ہمارے بڑے پرانے دوست اور ہم راز ہیں۔ ان کی شادی کا انتظار کرتے کرتے دوست بے زار اور بچے عیال دار ہوگئے لیکن یہ خود کو کبھی عاقل بالغ تسلیم کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی ذاتی ڈکشنری میں عاقل اور بالغ کے معنی یہ ہیں کہ انسان پی ایچ ڈی سے کم نہ ہو اور سرکاری نوکر ضرور ہو۔ اس لئے ایم اے کرنے کے بعد جب دوستوں نے سسرالی پلاؤ کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا تو یہ سرکش گھوڑے کی طرح بھڑکنے اور دولتیاں جھاڑنے لگے۔ والد نے اپنی اور والدہ کی ضعیفی کا واسطہ دیا لیکن اس سے پہلے کہ کان پر جوئیں رینگیں یہ خود رینگنے لگتے۔ تنگ آکر بہی خواہوں نے دشمنوں کا ساتھ دیا اور ایسی خوفناک افواہیں اڑائیں کہ غیرت و حمیت کو ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے لیکن پتھر کا یہ اچار نہ گلنا تھا نہ گلا۔

نوشہ کے اطوار دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑی کہ ان کو کبھی براہ راست مسئلہ کی سنگینی کا احساس دلاؤں کہ مبادا میرا نام بھی معتوبین کی فہرست میں شامل نہ ہوجائے لیکن جب پانی سر سے گزرتے دیکھا تو گھما پھرا کر ان کو ٹٹولنا شروع کیا۔ یہ ہمیشہ طرح دے جاتے۔ میں جوانی کے تقاضوں کا ذکر چھیڑتا تو یہ نوکری کی فضیلتیں بیان کرنا شروع کردیتے۔ میں شادی کے مذہبی پہلو پر روشنی ڈالتا تو یہ گفتگو کا رخ موسم کی جانب موڑ دیتے۔ چوہے بلی کا یہ کھیل وقفے وقفے سے جاری رہا۔ ایک دن انھوں نے بڑی رازداری سے ایک فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ فلم اس وجہ سے مسترد کرنی پڑی کہ سنیما ہال میں شاگردوں کی فوج ظفر موج موجود ہوگی۔ اب کباب میں ہڈی بننے سے جانے لیکن اس مخصوص فلمی دعوت سے یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ حضرت میں بلوغت کے جراثیم موجود ہیں۔ میں نے پروفیسر محمود حسن کے ہاتھ پاؤں جوڑے جو سالوں بھر پابندی سے رشتے طے کرانے اور دعوتیں کھانے میں مصروف رہتے ہیں اور بلا مبالغہ سینکڑوں رفتہ جوانیوں کو ٹھکانے لگا چکے ہیں کہ اس کار خیر کو انجام دلاکر ثواب دارین کے مستحق ہوں۔ انھوں نے ازراہ محبت میری درخواست قبول فرمائی اور نوشہ کو کئی رشتے سجھائے۔ سید واصف حسین نے حق دوستی ادا کرنے کیلئے قرب و جوار کے مزارات پر چادر

چڑھانے اور بتاشے تقسیم کرنے کی منت مانی لیکن نوشہ موصوف حسب سابق اڑیل ٹٹو بنے ریسرچ و نوکری کا پرانا راگ الاپتے رہے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ شادی بہ ذات خود ایک تحقیقی دبستان ہے۔ اس سے ریسرچ کے تمام آداب اور تحقیق کے مخفی گوشوں سے کماحقہ واقفیت ہوجاتی ہے۔ رہی نوکری کی بات تو شادی ہوتے ہی آپ ان کے نوکر ہو ہی جائیں گے۔ میری پیٹھ پر دھمو کے رسید کرتے ہوئے زور دار قہقہہ لگایا اور بڑے تیقن کے ساتھ کہنے لگے کہ شادی کا سہرا تو ایک نہ ایک دن سر چڑھنا ہی ہے۔ اس سے پہلے پی ایچ ڈی کا سہرا ہی بندھ جائے تو کیا حرج ہے۔ پھر تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولے کہ اس مقدس کام میں میرا تعاون فرمائیں۔

نوشہ کی عاجزی اور ریسرچ کی شدید خواہش کو دیکھتے ہوئے میں نے محبت و مروت میں مدد کا وعدہ کرلیا کہ شادی کے راستے کا ایک بڑا پتھر تو ہٹ جائے۔ یہ مروت مجھے کافی مہنگی پڑی۔ وعدے کی انگلی پکڑکر پہلے انہوں نے پہنچا پکڑا اور پھر میرا دماغ یوں نچوڑا جیسے نٹ چھتے سے شہد نچوڑتے ہیں۔ ریسرچ انہوں نے کی لیکن جینا حرام میرا ہوا۔ تحقیق کے بہانے انہوں نے گھر گھیر لیا۔ جس وقت شرفائے شہر سونے کیلئے بستروں پر جاتے ہیں یہ اس وقت اٹھ بیٹھتے اور سیوان سے رانی پور چل پڑتے۔ صبح کی اذان پر باہر نکلتا تو یہ کاغذات کا پلندہ بغل میں دبائے دروازے پر کھڑے ہوتے۔ کبھی جی چاہتا کہ مجنوں کی طرح گریبان پھاڑوں اور جنگل میں نکل جاؤں لیکن نوشہ کی شرافت پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ میں انہیں ٹو دی پوائنٹ لکھنے کی ہدایتیں دیتا لیکن یہ ایران توران کی ہانکنے لگتے۔ تحریر میں نرم روی اختیار کرنے کی بات کہتا تو یہ گھونسے لہرا لہرا اور دانت پیچ پیچا کر لکھتے۔ خدا خدا کرکے ریسرچ کا یہ ہفت خواں بھی طے ہوا اور ان کے نام سے پہلے ڈاکٹر کا دم چھلہ لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹری کی مفتاح نے ان کی قسمت کا تالا کھول دیا یعنی ان کی نوکری بھی پختہ ہوگئی اور یہ سیوان سے پٹنہ اور پٹنہ سے آرا کا طواف کرنے لگے۔

ایک روز یوں ہی ملنے ملانے کیلئے طارق حسین کے یہاں گیا۔ انہوں نے یہ دھماکہ خیز خبر سنائی کہ مفتاح کے منتر میں یکایک جونک لگ گئی ہے اور وہ بڑی شدت سے تمہیں تلاش کررہے ہیں۔ انہوں نے ہی یہ خوش گوار انکشاف کیا کہ شوکت علی خاں اپنے تمام سرکردہ و ناکردہ تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے کی تربیت دے رہے ہیں۔ سر سید چوک پر ملاقات ہوئی تو خندہ دنداں نما کے ساتھ اس فریہ انداز میں گرم جوشی سے ہاتھ ملایا جیسے ابھی ابھی ثریا پر فتح و کامرانی کے جھنڈے نصب کرکے آئے ہوں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ "بھئی شادی طے ہوگئی۔ ہوشیاری برات چلنا ہے۔"

دریافت کیا: کس کی؛ جھینپ کر بولے۔ "خاکسار کی"

"خاکسار کس کا تخلص ہے؟"

کہنے لگے۔ "میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں۔ قطعی سنجیدہ ہوں۔ برات میری جائے گی۔ آپ کو یقین نہ ہو تو مسجد میں چلئے، حلف اٹھا لیتا ہوں۔"

"ہاں بھئی! اس زمانے میں قرآن کا یہی تو ایک مصرف رہ گیا ہے۔"

چہرا تمتما اٹھا۔ ابھی یہ آپے بلکہ جامے سے باہر ہونے کو باقاعدہ تیاریاں ہی کررہے تھے کہ میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ کچھ نارمل ہوئے تو کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔

"برات بقر عید کے پانچویں روز چلنا ہے۔" میں نے پوچھا۔

بھائی میرے! قربانی تو تین روز اور بعض کے یہاں چار روز جائز ہے پھر آپ نے اپنی قربانی کیلئے شریعت کے کس مسئلہ کی روشنی میں پانچویں روز کا انتخاب کیا؟

بولے۔ "یہ مسئلہ مسائل کی باتیں آپ والد صاحب سے دریافت کرلیجئے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر آپ کو میری شادی منظور
نہ صرف یہ کہ برات میں چلنا ہے بلکہ نثری سہرا بھی پڑھنا ہے۔"
میں نے فریاد کی کہ سہرا پڑھنے سے شعرائے سیوان میری جان کے دشمن ہوجائیں گے کہ یہ دور مادیت کا ہے۔ وہ یہ ہرگز
نہیں کرسکتے کہ داد اور چھوٹ ان کے علاوہ کسی اور کی جھولی میں جائے۔ لیکن نوشہ نے ایک نہ سنی اور ری پیٹ کر سہرا لکھنے کا
وعدہ لیا اور بہ طور رشوت تازہ برفیاں بھی کھلائیں۔ میں نے کہا بھی کہ اس رشوت کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی آج کل ملک
رشوت کانڈوں میں پھنسا ہوا ہے، اس میں مزید اضافہ نہ میرے حق میں مفید ہوگا اور نہ ملک کے حق میں۔
کہنے لگے: "اب زیادہ خوشامد پن نہ کرائیے اور جلد از جلد سہرا لکھ دیجئے۔ کوثر سیوانی نے تو لکھ بھی دیا۔ سہرے میں بھائی سراج
عبدالقیوم، آفتاب عالم، حبیب احمد، عبدالشکور اور محبوب عالم کا نام ضرور ہو۔ مصباح بھائی جواب میرے ہم زلف ہوچکے ہیں کا
ذکر خاص ہونا چاہئے۔ حفیظ، محافظ اور منہاج میاں کا نام اہتمام سے آئے کہ یہ شہ بالے ہیں"۔ پھر انہوں نے سسرال کے
قصے پڑھنے شروع کردیئے۔
"صاحب، ایسی سسرال مقدر سے ملا کرتی ہے۔ میری ہونے والی ماشاء اللہ، چشم بددور، اب میں کیا بتاؤں کیسی ہیں۔ سب
بہنوں میں چھوٹی ہیں۔" لفظ چھوٹی پر ان کا بہت زور تھا۔ "اللہ رکھے، تین تین سالے ہیں۔ ایک گنڈک میں ہیں، دوسرے ٹیلی
فون آفس میں اور تیسرے کا تعلق بینک سے ہے۔ بڑے شریف اور دل دار ہیں صاحب۔ نوکری حاصل کرنے میں مجھے جو نذرانہ دینا
تھا اس کی بھرپائی ان لوگوں نے کردی۔ شادی سے پہلے ہی جہیز کی پہلی قسط انہوں نے بھیج دی۔" اس وقت ان کا جوش دیدنی تھا۔
ڈرائنگ روم پلس لائبریری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "وہ نئی الماری دیکھ رہے ہیں، اس کا شیشہ کتنا دل آویز ہے۔ کل تک
ٹی وی بھی آجائے گا۔"
میں نے دریافت کیا: "حضور والا! کل تک تو آپ تلک جہیز کے نام سے ایسے بے زار تھے جیسے مردان راہ خدا ماسوا اور سیاست
سے پھر یہ کایا کیسے پلٹ ہوگئی؟" تڑپ کر بولے "نہیں، نہیں! آپ غلط سمجھے۔ میں نے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ میں لالچی
کیوں بھلا؟ انہوں نے جو کچھ دیا ہے اور جو کچھ دیں گے اپنی مرضی سے۔ اگر وہ اپنی خوشی سے دے رہے ہیں تو پھر ان کا دل کیسے
توڑوں کہ دل توڑنا گناہ عظیم ہے۔"
اس دکھتی رگ پر دیر تک انگلی رکھنا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ کہیں نوشہ کا موڈ نہ خراب ہوجائے اور ایسی نایاب دعوت
ہاتھ سے نکل جائے۔
گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے مستقل کلیجہ تھامے ہوئے ہیں۔
گھبرا کر پوچھا: "کیا بھئی! میری بات دل کو لگ گئی؟ کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کیجئے۔"
بے اختیار ہنسنے لگے۔ لیکن کلیجے سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ تحقیقی نظر سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ ہاتھ کلیجے پر نہیں پاکٹ پر ہے۔
پوچھا: "سچ سچ بتلائیے معجون شباب آور ہے؟"۔
شرم سے دہرے ہوتے ہوئے بولے: "کچھ ایسا ہی سمجھئے۔"
شرم سے جوئیں نکالنے کیلئے دفعتاً ہاتھ اٹھایا تو پاکٹ میں کسی تصویر کی جھلک محسوس ہوئی۔ اب معاملہ سمجھ میں آیا۔ جیب میں
ان کی ایسے تھی جیسے کابک میں بٹیر۔ جسے یہ دونوں ہاتھوں سے دابے ہوئے تھے۔ اسی وقت شوکت صاحب آگئے۔ توجہ ہٹائی تو

نہوں نے کہا: "شرافت سے دکھادو نہیں توہم زبردستی دیکھیں گے۔" نوشہ نے کمال سعادت سے تصویر نکالی اور ان کی ہتھیلی پر اس طرح رکھ دی جیسے بہ قول غالب، صاحب کے کفِ دست پہ چکنی ڈلی۔ شوکت صاحب نے تصویر کو ایک نظر غور سے دیکھا اور پہلے تو یا ہو کا نعرہ مارا پھر ایسی آہ سرد بھری جس سے دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں۔

عرض کیا: "اللہ مبارک کرے۔ جب تصویر کے ساتھ یہ لگاؤ ہے تو صاحبِ تصویر کے ساتھ کیسا معاملہ ہوگا۔" کہنے لگے:

"ظفر بھائی! ہمارے گھر والے بھی عجیب ہیں۔ وہ برسوں سے شادی کی صرف زبانی باتیں کرتے رہے اگر انہوں نے یہ تصویر پہلے دکھا دی ہوتی تو خدا کی قسم اس وقت میری کرکٹ ٹیم تیار ہوتی۔" پھر یکایک بولے "برات کا قیام مینا بازار کے نزدیک ..."

"جہیز کا جوڑا خریدنے میں آسانی ہوگی۔"

"افوہ! آپ پہلے پوری بات تو سنیئے۔ برات مینا بازار کے نزدیک اردو لائبریری میں ٹھیرے گی۔" "واللہ! لائبریری میں قارئین اکٹھے کرنے کا اس سے عمدہ انتظام اور کیا ہوسکتا ہے۔ اردو لائبریریاں سمینار نہ سہی، برات کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی سرکس کے شو بھی منعقد کرائیں تو ان کی ماضی کی رونق، چہل پہل اور شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے۔"

شوکت صاحب تڑپ کر بولے۔ "کیا آج کل کے سمینار کسی سرکس سے کم ہوتے ہیں۔ لوگ کیسی کیسی قلابازیاں کھاتے ہیں صاحب؟"

اسی پر نوشہ نے زوردار احتجاج کیا: "آپ لوگ میری شادی کی گفتگو میں یہ بار بار سرکس کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟"

"منہ مت کھلواؤ۔ شادی کی ہاں کہنے میں تم نے کسی سرکس سے کم کرتب دکھائے ہیں کیا؟"

اس سے پہلے کہ شوکت صاحب اور نوشہ شاہراہ پر ہی گتھم گتھا ہوجائیں اور اسی بہانے دراندازوں کو شہر میں گڑبڑ پھیلانے کا سنہرا موقع دستیاب ہوجائے میں دونوں کو گھسیٹ کر ایک ہوٹل میں لے گیا اور رس ملائیاں کھلاکر آپس میں صلح صفائی کروادی۔

نوشہ نے شادی کی تیاری بڑی دلجمعی سے کی۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ ایک ایک سامان کی خریداری خود سے کی کہ کسی نقص یا کمی کا احتمال باقی نہیں رہے ورنہ اہل سسرال اور ان کی نصف بہتر ناراض نہ ہوجائیں۔ فیروز آباد جاکر چوڑیاں لائے۔ بنارسی ساڑیوں کے لئے برادرم شفیع اللہ کو ساتھ لے کر بنارس جا دھمکے اور کھڑے ہوکر اپنی نگرانی میں ساڑیوں کی بنائی کرائی۔ شادی کے جوڑے پر ایک ہزار اکیاون مرتبہ "یا فتاح" کا ورد کرکے دم کیا۔ سوتے وقت چہرے پر ابٹن اور ہلدی پابندی سے ملتے رہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مہینوں سے شوکت صاحب کے نسخہ خاص کے کشتہ جات اور مقویات کا استعمال کرکے اپنی فرضی کمزوریوں میں بتدریج اضافہ کرتے رہے۔

ایک دن نوشہ نے بڑی لجاجت سے فرمائش کی کہ بہ طور حفظ ماتقدم کچھ شادیانہ لٹریچر دیجئے کہ میری نروس نس میں کمی آئے۔ میں نے غیرت دلائی کہ حضرت، آج کل مڈل اسکول کے لڑکے شادی شدہ مردوں کے کان کاٹ رہے ہیں۔ آپ ادب کے ڈاکٹر ہوکر یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں؟ اگر آپ کو کامیاب دولہا عرف رہنمائے شوہر باتصویر جیسی کتابوں کا اتنا ہی شوق ہے تو اس سے بہتر ہے کہ شاعر مشرق کا کلام غور سے پڑھئے۔ وہاں کس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارا نہیں
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارا نہیں

جیسے اشعار میں صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ یہاں خودی سے مراد شادی ہے تو پھر سارے حجابات یک لخت دور ہوجائیں گے اور
ی جست میں قصہ تمام ہوجائے گا۔ بات نوشہ کی سمجھ میں آگئی۔ خوشی کے مارے برا حال ہوگیا اور اسی دن سے اشعار اقبال کے
و جزوِ ایمان سمجھنے لگے۔

نوشہ مظلوم شرافت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اہل موتیہاری اپنی قسمت پر ناز کریں کہ اس پر آشوب دور میں جب شرافت اور
ت جیسے الفاظ لغات تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں انہیں ایسا مہذب، شریف، خوش مزاج، خوش اطوار، بامروت اور بااخلاق داماد
ہوا۔ آج جدھر نگاہ اٹھایئے، حسن کا توبہ شکن جام چھلکتا نظر آتا ہے لیکن قربان جایئے اس شخص پر کہ جس نے نہ کبھی دیوار
اور نہ کسی کو کفن پھاڑ محبت نامے لکھے۔ جو نفس کشی کے لئے روزوں اور ہومیو پیتھک دواؤں کا سہارا لیتا رہا۔ نظر اور دل کے
روکنے کیلئے سید واصف حسین اور پرنسپل طارق کے ہمراہ فٹ پاتھ کی چائے پیتا اور عالمی سیاست پر ان کے ظریفانہ تبصرے سنتا
بھولے بھٹکے طبیعت بے قابو ہوئی تو "دربار" اور "کرشنا" میں فلموں کے پوسٹر دیکھ لیئے۔

صاحبو، کہنے کو تو میرے پاس بہت کچھ ہے لیکن نوشہ زنان خانے میں جانے کیلئے بے تاب ہے۔ پلاؤ بھی ٹھنڈا ہورہا ہے۔
الحال دعا مانگیں کہ دولہا پھلے، پھولے، پھیلے اور ہر سال کامیابیوں کی نئی تاریخ رقم کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔ ☆
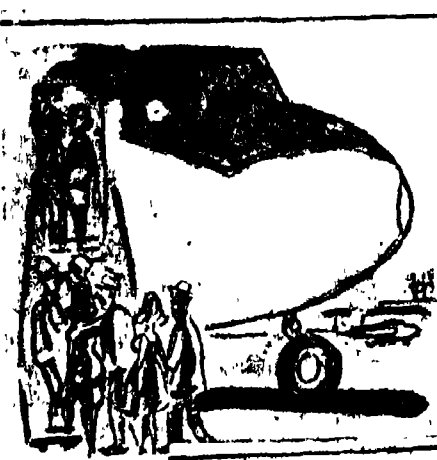
بانسخ بہاری کلکتہ

پر و مس کا!

پڑھ پڑا کر کلام جس تس کا
ہے یہ عنوان میری تھیسس کا

اب بھی کر ٹھیک اپنا کیرکٹر
منہ کرے گا تو بند کس کس کا

شکل معصوم لیکن اندر سے
ایک تنکا ہے وہ تو ماچس کا

وہ جو گھر کا پتا دیا جانم
فون نمبر ہے اس میں آفس کا

کیا سنوارے وہ گیسوئے اردو
پیٹ خالی ہو نان سے جس کا

یہ مقالہ ہے یا ہے موکالا
تیرے فن پر جو تیرے مولس کا

اب بڑھاپا سوار ہے بانسخ
کچھ تو رکھئے بھرم پرومس کا

☆●☆

کہتے ہیں جسے املیٰ
شیخ کا کہنا ہے
تانیث ہے "املا" کی

●☆●

تنہائی جو تڑپائے
ماہیے کہہ لینا
جب یاد مری آئے

●☆●

اوزان تو پہچانے
خاک سخن ور ہے
جو بحر نہیں جانے

●☆●

اشعار کی کثرت ہے
فکر مجھے کیوں ہو
استاد سلامت ہے

●☆●

بلی سے کہے بلاّ
رات کو چھتر پہ
کمبخت نہ یوں چلاّ

●☆●

واعظ بھی کرے غیبت
دور یہ کیسا ہے
لاحول ولا قوت

●☆●

ماہیے
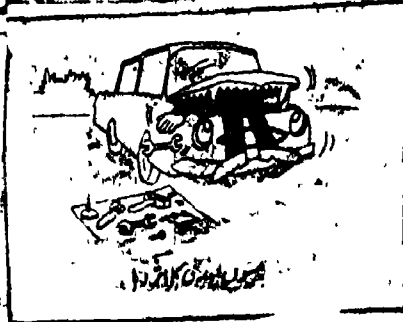
اس دور کا افسوں ہے
شکل ذرا دیکھو
لیلیٰ ہے کہ مجنوں ہے

●☆●

وہ حسن کی بستی ہے
شیخ جی کہتے ہیں
صحت جہاں سستی ہے

●☆●

جب پیٹ لگا گھٹنے
قول ہے پرکھوں کا
خیرات لگی بٹنے

●☆●

کہہ شعر بنا کر دھن
فعلن فعاعیلن
مفعول مفاعیلن

●☆●

ہری شنکر پرسائی
ہندی سے ترجمہ: ایف۔ایم سلیم

نیا کیلنڈر

ایک کیلنڈر اور بیکار ہوگیا۔ ورق ورق میلا ہوگیا اور ہر تصویر کا رنگ اڑگیا۔ ہر سال ایسا ہی ہوتا ہے۔ جنوری میں دیوار پر چمکیلی تصویروں کا ایک کیلنڈر ٹنگ جاتا ہے اور دسمبر تک تصویر کی چمک اڑجاتی ہے۔ ہر تصویر بارہ مہینوں میں بدرنگ ہوجاتی ہے۔

پرانے کیلنڈر کی تصویر بچے کاٹ لیتے ہیں اور اس کو کہیں چپکا دیتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں، بچوں کا دل بہل جاتا ہے، لیکن یہ ان کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ ہے۔ سال دو سال ہم ان سے کہتے ہیں، لو بیٹو جو سال ہم نے بگاڑ دیا، اسے لو، اس کی تصویر سے دل بہلاؤ، بیتے ہوئے کل کی بدرنگ مرجھائی تصویریں ہیں یہ، مستقبل کی کوئی چمکیلی تصویر ہم تمہیں نہیں دے سکتے۔ ہم اس میں خود دھوکہ کھاچکے ہیں اور کھاتے رہے ہیں۔ دینے والے ہمیں بھی تو ہر سال کے شروع میں رنگین تصویر دیتے ہیں کہ لو اچھا گو، ردو مت، آنے والے سال کی رنگین تصویر ہے۔ مگر وہ کچے رنگ کی ہوتی ہے۔ سال ختم ہوتے، ہوتے وہ بھدی ہوجاتی ہے۔ دھوکے کی یہ لمبی روایت ہے۔ دھوکہ تو ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ہم تمہیں دیتے ہیں۔ کسی دن تم ان بدرنگ تصویروں کو ہمارے سامنے ہی پھاڑ کر پھینک دو گے اور ہمارے منہ پر تھوکو گے۔

نیا سال آگیا۔ پہلے ہم 15 اگسٹ سے نیا سال گنتا تھا۔ اب ویسا کرتے ڈر لگتا ہے۔ دل میں ٹیس ہوتی ہے کہ ہائے، اتنے سال ہوگئے پھر بھی، جواب ملتا ہے۔ کوئی جادو تھوڑے ہی ہے لیکن طرح طرح کے جادو تو ہورہے ہیں۔ یہی کیوں نہیں ہوتا؟ افسر کے اتنے بڑے مکان بن جاتے ہیں کہ وہ راشٹرپتی (صدر جمہوریہ) کو کرایہ پر دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ کس جادو سے گودام میں رکھے گندم کا ہر دانہ سونے کا ہوگیا؟ اسے بودیا جائے گا، تو پھر سونے کی فصل کٹ جائے گی۔

جنوری سے سال تبدیل کرنے میں نہ درد اٹھتا ہے ہائے ہوتی اور نہ "پھر بھی" کا سوال اٹھتا ہے۔ آخری ہفتہ میں کچھ یادیں ضرور تازہ ہوجاتی ہیں۔ ۲۳۔ جنوری یاد دلاتی ہے کہ سبھاش بابو نے کہا تھا، "تم مجھے خون دو میں تمہیں آزادی دوں گا"۔ خون تو ہم نے دے دیا، مگر آزادی کسے دی گئی؟ پھر ۲۴ یا ۲۵ تاریخ کو لال قلعے پر بہت بڑا مشاعرہ ہوتا ہے، جس میں بڑے شاعر محنت کر کے گھٹیا شاعری کر کر لاتے ہیں اور چھوٹے شاعر محنت سے اور گھٹیا ترجمہ کرتے ہیں۔ ہندی اور اردو کے کوی و شاعر خاص طور سے "اوور ایکٹنگ" کرتے ہیں۔ یوں ان زبانوں کی ساری حالیہ شاعری گھٹیا ہیرو کی "اوور ایکٹنگ" ہے۔ پھر ۲۶ جنوری کو "یوم جمہوریہ" کے موقع پر ہم دستور کی کتاب نکال کر جمہوریت کے ہدایتی اصول اور بنیادی حقوق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی وقت گرد گرد دل کر کے الفاظ کانوں میں پڑتے ہیں کہ یہ ملک تو صرف ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان، پارسی، عیسائی وغیرہ ودیشی ہیں اور خاص کر مسلمان تو "دیش دروہی" ہیں۔ مگر دفاع سے متعلق اہم راز پاکستان کو بتاتے ہوئے جو پکڑے گئے وہ "شدھ برہمن" ہیں۔ یہ بھی جادو ہے۔

پھر ۳۰ جنوری ہمارے باپ سے کبھی کہا جاتا تھا کہ آزادی کی گھاس غلامی کے گھی سے اچھی ہوتی ہے۔ ہم تب بچے تھے، مگر ہم نے بھی اسے سنا، سمجھا اور اقرار کیا۔ آزاد ہوگئے، تو ہم نے کہا اچھا اب ہم فخر کے ساتھ گھاس بھی کھالیں گے۔ نعرہ لگانے والوں سے پوچھا گئے کہ کب تک کھاتے رہیں گے۔

مگر ہم نے دیکھا کہ کچھ لوگوں نے اپنی کالی کالی بھینسیں آزادی کی گھاس پر چھوڑ دیں اور گھاس ان کے پیٹ میں جانے لگی۔ تب بھینس والوں نے انہیں نچوڑ لیا اور دودھ کا گھی بنا کر ہمارے سامنے ہی پینے لگے۔

میرا ایک دوست یہی کہتا ہے : پرسائی تم پر بھیڑ حاوی ہے، تم ہمیشہ بھیڑ کی بات بھیڑ کے لئے لکھتے ہو۔ دیکھتے نہیں اچھے ادیبوں کو یہی فکر لگی رہتی ہے کہ بھیڑ کے دباؤ سے کیسے بچا جائے۔

دھوکہ ہی ہوا نہ! ہمیں اور ہمارے باپو کو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ آزادی کی گھاس تو ہوگی۔ مگر کبھی کبھی بعضوں کے پاس بھینسیں بھی ہوں گی۔ اب ہم ان سے کہتے ہیں: "یارو تم بھی آزادی کی گھاس کھاؤ نہ!"

وہ جواب دیتے ہیں: "کھا تو رہے ہیں، تم گھاس سیدھے کھالیتے ہو اور ہم بھینسوں کی معرفت کھالیتے ہیں۔ وہ اگر گھی بن جاتی ہے تو ہم کیا کریں۔"

اور ہم اپنے باپ کو، کوستے ہیں کہ تم نے اسی وقت اس بارے میں صاف صاف باتیں کیوں نہیں کرلیں۔ وہ کالی بھینسوں والی شرط کیوں مان لی؟ کیا حق تھا تمہیں تمہاری طرف سے گھاٹے کا سودا کرنے کا؟

سوشلسٹ معاشیات کے پروفیسر سے پوچھتے ہیں تو، وہ اپنی الجھی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے : compulsions of a backword economy" معاشی پچھڑے پن کی مجبوریاں ہیں یہ!"

ہیں تو، گھر سے دکان تک پہونچتے ہوئے بھاؤ بڑھ جاتے ہیں۔ ملک ایک قطار میں بدل گیا ہے۔ چلتی پھرتی قطار ہے۔ جو کبھی چاول کی دکان پر کھڑی ہوتی ہے۔ پھر سرک کر شکر کی دکان پر چلی جاتی ہے۔ آدمی زندگی قطار میں کھڑے کھڑے بیت رہی ہے۔

زرخیز زمین کے باشندے پروردگار سے ہاتھ پھیلا کر دعا کرتے ہیں کہ اس سال امریکہ میں گیہوں خوب پیدا ہو اور جاپان میں چاول ہم "مدر لینڈ" نہ کہکر، فادر لینڈ، کہنے لگیں تو ٹھیک رہے گا۔ روٹی ماں سے مانگی جاتی ہے۔ باپ سے نہیں۔ فادر لینڈ کہیں گے تو یہ مانگیں اور شکایتیں نہیں ہوں گی۔

میں پھر بھیڑ کے چکر میں پڑ گیا۔ چھوٹا آدمی ہمیشہ بھیڑ سے کتراتا ہے۔ ایک تو اسے اپنی شناخت کے گم ہو جانے کا ڈر رہتا ہے، دوسرے کچل جانے کا۔ جو چھوٹا ہے اور اپنی شناخت کو ہمیشہ اجاگر رکھنا چاہتا ہے، اسے ریچ بھیڑ میں نہیں گھسنا چاہئے۔

ایک ترکیب ہے، جس سے چھوٹا آدمی بھی بھیڑ میں خاص اور سب کی نظر کا مرکز بن سکتا ہے۔ اسے بکرے کی یا کتے کی بولی بولنا چاہئے۔ بھیڑ کا مقصد جب سستا اناج لینا ہو اور وہ اس کے لئے آگے بڑھ رہی ہو، تب چھوٹا آدمی بکرے کی بولی بول اٹھے، تو وہ آدمی ایک دم خاص ہو جائے گا۔ اور سب کی توجہ حاصل کرلے گا۔ لوگ مجھ سے کہیں زیادہ ہشیار ہیں۔ میرے بتانے سے پہلے ہی سے وہ، یہ ترکیب جانتے ہیں اور بھوکوں کی بھیڑ میں بکروں کی بولی بول رہے ہیں۔

ادیب کی حالت خستہ ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میرا الگ سے کچھ نام ہو جائے۔ سب کے ساتھ ہونے سے خصوصیت ختم ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے دن بھر اس کے جوتے گھستے ہیں اور شام کو وہ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر کہتا ہے کہ کوئی ہمیں بھیڑ سے بچاؤ۔ دوسری طرف بھیڑ کہتی ہے کہ ہمیں ان سے بچاؤ۔

سیاست کی بو آتی ہے، ان باتوں سے؟

ادیب کو انسان سے دلچسپی ہے۔ سیاست وغیرہ سے کیا؟ لیکن آدمی کا مقدر طے کرنے والی ایک سیاست بھی ہے۔ ادیب دعوے کے ساتھ کہتا ہے:

کل اگر فاشسٹ تاناشاہی آگئی۔ تو اے آزاد مفکر، اے بھیڑ دشمن، تیری آزاد فکر کا کیا ہوگا؟ پھر تو تیرا گلا دب جائے گا اور اگر نے اپنی خودی سے کوئی آواز نکالنے کی کوشش کی تو گلا ہی کٹ جائے گا۔

بھیڑ کی بات چھوڑ دیں۔ ادیبوں کی بات کریں۔ میرے دو دوست ادیبوں کو ان کی بعد کی کتابوں پر ایوارڈ ملا۔ پہلے کی کتابوں پر ہیں۔ تب شاید ان کی عمر کم تھی اور اچھی تخلیق کو اعزاز سے نوازنے کی کوئی روایت نہیں ہے۔

جانسن نے لارڈ چیسٹر فیلڈ کو ایک چھٹی میں لکھا تھا کہ: "مائی لارڈ" کیا "پیٹرن" وہ ہوتا ہے جو کنارے پر کھڑا کھڑا آدمی کو پانی میں بہتے دیکھتا رہے اور جب وہ کسی طرح بچ کر باہر نکل آئے تو اسے گلے لگالے"۔

ایوارڈ اور معاشی مدد لکھنے کے لئے ملتی ہے یا لکھنا بند کرنے کے لئے؟ میں دینے والوں کے پاس جاؤں اور کہوں۔ سر میں لکھنا بند کر رہا ہوں۔ اس کام کے لئے مجھے آپ کیا دیں گے؟

سر پوچھے گا: کب سے بند کر رہے ہو؟

اگلی پہلی تاریخ سے

سر کہے گا: "تم کل سے ہی بند کر دو تو میں تمہیں ماہانہ مدد مقرر کر دیتا ہوں۔ خبردار لکھا تو بند کر دوں گا۔

میں کہوں گا: ایسا ہے تو آج سے ہی بند کر دوں گا۔ آج سے ہی تنخواہ مقرر کر دیجئے۔

خیر، ایک غریب ادیب ادھر شہر میں گھوم رہا ہے۔ اس کو دو بڑے آدمیوں سے غریبی کا سرٹیفیکیٹ چاہئے اور دو بے ایمان بندہ کھانے والوں نے اس کو غریبی کا سرٹی فیکیٹ دے دیا ہے۔ اب دیکھیں اس کو کلکٹر آفس کے کتنے چکر کاٹنے پڑتے ہیں؟ ☆

محمود شریف محمودؔ
حیدرآباد

غزل

ان کا گر سامنا نہیں ہوتا
عشق کا حادثا نہیں ہوتا

دال میں ہے کدو مگر صاحب
بے مٹن دالچا نہیں ہوتا

کام کرتے نہیں کبھی لیڈر
جس میں گھپلا چھپا نہیں ہوتا

کوئی دکھتا نہیں حسیں چہرہ
جس پہ پوڈر لگا نہیں ہوتا

پرس کوئی نہیں حسینوں کا
جس میں اک آئینا نہیں ہوتا

حسن کا ہے مقابلہ اس میں
یہ نہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوتا

بال ان کے کمر کو چھوتے ہیں
سر پہ جب گھونسلا نہیں ہوتا

یہ ہے محمودؔ بھوت فیشن کا
سر پہ چڑھ کر جدا نہیں ہوتا

●☆●

اقبال شانہؔ
حقل، سعودی عرب

قینچی

کوئی چھوٹی ہو یا بڑی قینچی
کاٹ سکتی ہو جو وہی قینچی

عشق میں دل پہ چل گئیں چھریاں
جیب پر ہائے چل گئی قینچی

ایک درزن سے آشنائی ہے
ہے تصور میں اک نئی قینچی

تیز چلتی ہے اس قدر بیگم
یہ زباں ہے یا آپ کی قینچی

آپریشن کے بعد غلطی سے
پیٹ میں ان کے رہ گئی قینچی

کاٹ کر جیب، جیب کترے نے
میری پاکٹ میں چھوڑ دی قینچی

ہم حجامت نہیں کیا کرتے
احتیاطاً خرید لی قینچی

رات چھاپے میں گھر سے پولیس نے
ایک چھوٹی سی ضبط کی قینچی

جیسے خنجر کوئی پکڑتا ہے
اس طرح اس نے تھام لی قینچی

چھیلنے کے لئے بس اک آلو
لے کر آئے ہیں وہ بڑی قینچی

میرے کپڑوں کی آج خیر نہیں
ہاتھ میں ان کے آگئی قینچی

آپ کی جیب کاٹ دے شانہؔ
کوئی ایسی نہیں بنی قینچی

●☆●

خراج تحسین

ڈاکٹر انور سدید

مسکراہٹیں اگانے والا۔ کرنل محمد خان

احمد شاہ پطرس بخاری کی طرح کرنل محمد خان کو بھی یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ اپنی پہلی کتاب "بجنگ آمد" کی اشاعت کے فوراً بعد شہرت کے ہفت آسمان پر پہنچ گئے اور پھر یہ کتاب نہ صرف ان کے تشخص کی پہچان بن گئی۔ بلکہ "پطرس کے مضامین" کی طرح اس کتاب کو بھی مزاحیہ ادب میں ایک مستقل مقام دے دیا گیا۔ اگر چہ کرنل محمد خان کی تخلیقی مزاح کی دو کتابیں "بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" اور مضامین کی کتاب "بدیسی مزاح" بھی شائع ہوئی ہیں لیکن انہیں "بجنگ آمد" جیسی پذیرائی نہ مل سکی اور ان کی شہرت صرف یہ تھی کہ ان کتابوں کے سرورق پر "بجنگ آمد" کے مصنف کرنل محمد خان کا نام درج تھا۔

"بجنگ آمد" 1966 میں اس وقت شائع ہوئی جب پاکستانی قوم 1965 کی جنگ کے زخموں کا اندمال کر رہی تھی کرنل محمد خان ایک فوجی تھے انہوں نے ان زخموں کا "فوجیانہ علاج" تجویز کیا اور ان زخموں پر مزاح کی پھوار بکھیرنے لگے اردو ادب کے متوالوں نے اس کتاب کی طرف دیکھا تو اس کے عقب سے انہیں ایک ایسا سیدھا سادہ حکم کی لکیر مستقیم چلنے اور حقیقت کو صداقت سے پیش کرنے والا فوجی نظر آیا جو خود اپنی ذات کو مزاح کا ہدف بنا سکتا تھا اور دوسروں میں مسرتیں بانٹ سکتا تھا۔ پھر اس کتاب نے مزاح کی دولت کثیر کو تقسیم کرنا شروع کیا تو اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور کرنل محمد خان کو پطرس بخاری، ضمیر جعفری، شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء اور ابراہیم جلیس جیسے نثر نگاروں کی صف میں مقام بلند عطا کر دیا گیا۔ اگر چہ انہوں نے گزشتہ دس پندرہ برس میں کوئی مزاح پارہ نہیں لکھا تھا۔ "بدیسی مزاح" کی اشاعت کے بعد انہوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا تھا۔ کہ اب ان کی کوئی نئی کتاب نہیں آئے گی۔ لیکن طنز مزاح کے میدان سے کبھی غیر حاضر شمار نہیں کئے گئے۔ 23 اکتوبر 99ء کو ان کے سانحہ ارتحال کی خبر آئی تو اس پر اردو دنیا آب دیدہ ہو گئی کہ تشنج زدہ قوم کے اعصاب کو آسودگی عطا کرنے والا ایک نامور مزاح نگار جس کا کوئی مثل نہیں تھا، اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ ان کے نامور معاصر مشتاق احمد یوسفی نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

> "مزاح کو کرنل محمد خان نے ایک رچے بسے لہجے سے روشناس کرایا اور ایک نیم لفٹین کی کہانی کو امر کر دیا۔ وہ پہلے مزاح نگار ہیں جنہوں نے یہ بتایا کہ سوانح حیات اس طرح بھی لکھی جا سکتی ہے اردو مزاح کو انہوں نے اس بلند مقام پر پہنچایا جہاں پہنچنے سے پہلے بڑے بڑوں کی سانس اکھڑ جاتی ہے"۔

شوکت صدیقی نے رائے دی کہ "کرنل محمد خان کی طنز میں تلخی نہیں تھی اس میں ترشی اور شیرینی کا امتزاج تھا۔ مزاح میں ایسی سحر رعنائی تھی جسے پڑھ کر قاری کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی"۔

کرنل محمد خان کا مزاح اسلوب کی اس جہت سے تعلق رکھتا ہے جس کو انگریزی میں ہیومر ان یونیفارم۔ یعنی وردی پوشوں کا مزاح کہا جاتا ہے۔ ممتاز عالمی جریدہ "ریڈرز ڈائجسٹ" نے اس قسم کے مزاح کے لئے علیحدہ گوشہ مقرر کر رکھا تھا جو ہر ماہ باقاعدگی سے چھپتا تھا۔ اور قوموں اور جغرافیائی حدوں کی حفاظت کرنے والے فوجیوں کی فطری اور غیر ارادی بوالعجبیوں کا تعارف کراتا اور بے

پیروڈی کے چند اشعار

روشن لال بنارسی

اس نے یوں اپنی چاند کھجلائی
• کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی •

●☆●

ان کے سر سے وگ سرک کر کیا گری روشن میاں
• ذرہ ذرہ روکش خورشید عالم تاب تھا ، •

●☆●

دم لگاؤ بجائے حسرتِ دم
• ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

●☆●

پاؤں میں زنجیر ڈالو ہتھکڑی چاہے لگاؤ
• یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا •

●☆●

پوسٹر کہتے ہیں لیڈر غم گسارِ قوم ہے
• عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا •

●☆●

تیرے ابا سے نہیں اپنی پٹائی کا گلہ
• اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا •

●☆●

ہم کہاں کے شاعر تھے ہم کہاں کے غالب تھے
• بے سبب ہوا روشن ، معتقد ، جہاں اپنا •

●☆●

ہائے اس دور کے معشوق ، ملے اور چلے
• باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا •

●☆●

کوئی حسین نظر آئے جب کہیں روشن
• کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا •

●☆●

جب تک ترے ابا نے مجھے دھر کے نہ پیٹا
• میں معتقدِ فتنہ محشر نہ ہوا تھا •

میں نیٹ ہی پیتا ہوں وہ ٹھرا ہو کہ رم ہو
• اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے •

●☆●

علم نجوم یوں مرا پیشہ تو ہے مگر
• جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر •

●☆●

ڈیڈی مجھے جہیز کی خاطر نہ بیچئے !
• انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں •

●☆●

کرسی کے لہو سے ہے وہ بیگانہ وفا
• ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے •

●☆●

یہ شخص بھوک سے جو یہاں نیم جان ہے
• فرما ہدوائے کشورِ ہندوستان ہے •

●☆●

کیا خوب تم نے حق ادا اردو کا کردیا
• بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے •

●☆●

ہماری جیب میں پیسہ ہی اب نہیں آتا
• ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے •

●☆●

جو ناک ہی میں نہ آیا تو پھر وہ دم کیسا ؟
• جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے ؟ •

●☆●

ٹکٹ چناؤ کا پا کر پھرے ہے اتراتا
• وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے •

●☆●

تمہارے ہاتھ میں ہے بس حساب کنبہ کا
• مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا •

سومیا مکرجی
انگریزی سے ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علی خاں،
حیدرآباد

سات سمندر پار

راجدھانی ایکسپریس سے کلکتہ جاتے ہوئے مجھے ایک دلچسپ حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میری سیٹ سے ملحق برتھ پر چار شادی شدہ ہستیاں اپنا قبضہ جمائے ہوئی تھیں۔ ان میں ایک تو نیا بیاہتا جوڑا تھا، جس کے چونچلے دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی سرگوشیاں چوری چھپے سننے کے لئے میں اپنے دونوں کانوں کو تیز کئے ہمہ تن "گوش" بنا بیٹھا تھا۔ یہ "فاختہ کا جوڑا" اپنی چھٹیاں گزارنے "کولا" شہر لوٹ رہا تھا۔ دوسرا بوڑھا جوڑا دلی سے اپنے لڑکے کے ہاں چند دن گزار کر کلکتہ واپس ہو رہا تھا۔ ان سب سے میں اتنا قریب تھا کہ باوجود ٹرین کی گڑگڑاہٹ کے ان کی باتیں مجھے آسانی سے سنائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد ٹرین کے جھکولوں سے میری آنکھ لگ گئی۔ جب میں اس ادھ کچی نیند سے بیدار ہوا تو نوجوان جوڑے کی حالت کچھ غیر سی دکھائی دی۔ بڑا تعجب ہوا کہ ابھی ابھی یہ دونوں کیسی "فاختہ والی محبت" سے سرشار تھے مگر اب ایک دوسرے سے ایسے جھگڑ رہے تھے جیسے بے وجہ چڑیا گھر میں کھوے اکثر ایک دوسرے پر پل پڑتے ہیں۔ لڑکا کبھی اپنی دلہن کو کھاجانے والی نظروں سے دیکھتا تو کبھی اپنا سر اخبار کے کھڑکھڑاتے ہوئے کاغذ میں چھپا لیتا۔ لڑکی بھی غصہ سے بھری اپنی کجلوئی آنکھوں میں تیرتے پانی کو پی جانے کی کوشش میں اپنی نظریں ریل کی کھڑکی کے باہر کر لیتی۔ اس جھگڑے کی تہ تک پہنچنے کیلئے مجھے اپنے کان اور تیز کرنے پڑے۔ تب معلوم ہوا کہ یہ جوڑا شادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنے اپنے گھر لوٹ رہا ہے۔ ان دونوں کے والدین کلکتہ شہر سے کچھ فاصلہ پر واقع مواضعات میں رہتے ہیں۔ لڑکی چاہتی تھی کہ اسٹیشن سے سیدھے وہ اپنے میکہ جائے۔ کئی دن ہوئے وہ اپنے ماں باپ کی صورت دیکھنے کیلئے ترس گئی تھی۔ ان کی یاد اسے ہمیشہ تڑپاتی رہی لیکن لڑکا مصر تھا کہ کچھ ریت رسم کو بھی نبھانا پڑتا ہے۔ سعادت مندی اس ہی میں ہے کہ بہو پہلے اپنے سسرال جائے۔ چند دن رہ کر پھر وہ اپنے ماں باپ کے گھر جاسکتی ہے۔ لیکن لڑکی اس فیصلے سے ناخوش تھی اور بہت ضبط کرنے کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے شبنم کی طرح ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

بوڑھا جوڑا ان دونوں کی حالت سے کافی دکھی تھا مگر ان کو ان کی لمبی زندگی کی کٹھنائیوں سے ملا ہوا سبق دخل در معقولات کرنے پر آمادہ ہونے سے روک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لڑکے نے پہل کی اور اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھا تاکہ وہ اس کا کوئی تشفی بخش حل تلاش کرسکیں۔ بوڑھے جوڑے نے پوری دلچسپی سے اس کی باتیں سنیں۔ بڑے میاں اس گتھی کو سلجھانے میں آگے بڑھے اور ایک مجسٹریٹ کی طرح اپنا فیصلہ سنایا، "جو مقام اسٹیشن سے قریب تر ہو دونوں کو وہیں جانا چاہئے۔"

لڑکی خوشی سے اچھل پڑی اور لگی تالیاں بجانے لیکن لڑکے نے کہا۔ "جناب۔ ہمارے ہاتھوں میں کوئی ٹیپ تو ہے نہیں کہ ان دونوں مقامات کا صحیح فاصلہ ناپا جاسکے۔ میرے خیال سے کوتاگر اور سالٹ لیک دونوں ہی تقریباً برابر برابر دوری پر ہی ہیں۔" مجسٹریٹ صاحب نے پینترا بدلا۔ "ٹھیک ہے۔ جن کے ماں باپ تم دونوں کو لینے اسٹیشن پر آئیں، ان ہی کے ساتھ تم ان کے گھر جانا۔" اس بار بھی لڑکی ہی کی جیت ہوئی۔ اس کے چہرے کے سفید رنگ سے سرخی جھانک رہی تھی۔ "میرے ماں باپ ہی ہمیں لینے اسٹیشن آرہے

ہیں۔ نوشہ میاں کا منہ لٹک گیا اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگے :

"کاش! میرے والد کے پاس بھی ایک کار ہوتی اور سفید لباس میں ملبوس ایک صحت مند شوفر ہوتا!!"

مجسٹریٹ صاحب کی بیوی جو خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہی تھی یکایک برس پڑیں۔ "جی ہاں! مہاشے جی۔ آپ نے ہمیشہ اچھے ہی فیصلے کئے ہیں۔ غالباً آپ کو آج سے تیس سال پہلے کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب ہم دونوں نئے بیاہتا شادی کے بعد پہلی مرتبہ کلکتہ لوٹ رہے تھے۔ تو کس کا گھر ریلوے اسٹیشن سے قریب تھا؟ میرا بالی گنج یا آپ کا سڑا گانو بنڈل؟ ہمیں لینے کیلئے آپ کے والدین محترمین یا میرے ماتا پتا اسٹیشن پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کس کی موٹر اسٹیشن سے باہر کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی؟ آپ کے والدین کی یا میرے پتا جی کی؟ اور ان سب حقائق اور سہولتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ نے مجھے میرے سسرال ہی کی طرف گھسیٹا تھا۔"

یوں لگا کہ کسی جوشیلی ندی نے اپنا بندھ توڑ دیا ہو۔ شور مچاتا ہوا پانی سب کے سر سے اونچا ہو اٹھا۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اس بوڑھے جوڑے کو راستہ تمام چپ سی لگ گئی۔ مگر فاختہ فاختنی، کبھی کبھی چونچیں ملا لیا کرتے تھے......

کئی سالوں بعد میں نے بھی ایک سے دو ہونے کی ٹھانی۔ شکر خدا کا کہ میرے ماں باپ اور میری شریمتی جی کے ماتا پتا ایک دوسرے سے کوسوں دور بسے ہوئے تھے۔ یعنی سات سمندر پار!۔☆

مرزا کھونچ
نیاٹولہ، بیتیا ۸۴۵۴۳۸، بہار

مناجات

مجھکو نواز دے اے مرے رب العالمین
ورنہ بگڑنے والی ہے فوراً میری مشین

ایمان دے کہ ظلم کا پنجہ مروڑ دوں
باطل کا زور ایک ہی گھونسہ میں توڑ دوں

ہوجائے اس طرف جو عنایت مرے خدا
کرلوں میں دشمنوں سے بغاوت مرے خدا

اللہ میرے ملک پہ کچھ کیجئے کرم
بیکاری دور ہو یہاں منگائی بھی ہو کم

کرسی پہ مار ہو نہ کہیں ہو کوئی فساد
بس ہر جگہ وطن میں رہے قومی اتحاد

وہ شوق دے کہ شاعروں کے کام آسکوں
اور کوچہ رقیب میں بھی نام پاسکوں

توکردے مجھ کو دولت و عزت سے مالا مال
لیکن بہک نہ جاؤں میں اتنا رہے خیال

مرزا کی یہ دعائیں خدایا قبول کر
بندوں سے لو لگائے نہ وہ تجھ کو بھول کر

☆●☆

رشید عارف
پٹنہ

غزل

سسرال میں کھڑا ہوں گنہگار کی طرح☆
ہر شخص ہے یہاں کا حولدار کی طرح

یہ سوٹ اور ٹائی کہاں اور تم کہاں
صورت سے لگ رہے ہو چھری مار کی طرح

کس کی مجال تھی کہ ملاتا نگاہ بھی
اطوار میرے ہوتے جو رنگدار کی طرح

لرزے ہے دل ہمارا سر راہ خوف سے
جب گھورتا ہے کوئی چھری مار کی طرح

چوری ڈکیتی جھانسہ وغیرہ بہت ہیں کام
کیوں مارے مارے پھرتے ہو بیکار کی طرح

رشتوں کا احترام بھی باقی نہیں رہا
اب شادیاں بھی ہوتی ہیں بیوپار کی طرح

مجروح کی زمین میں عارف کی یہ غزل
لگتی ہے ایک شوخ کی گفتار کی طرح

●☆●

☆ میرا سسرال تھانہ کے قریب ہے

فرید سحر، نرساپور

غزل

ہائے کیا زندگی ہوگئی
ان سے پھر کرکری ہوگئی

میں نے ہمت سے سچ کہدیا
دوستی دشمنی ہوگئی

اس میں میرا نہیں کچھ قصور
لیٹ میری گھڑی ہوگئی

ان کا بگڑا نہیں کچھ مگر
جگ میں میری ہنسی ہوگئی

وقت دے کر بھی آتے نہیں
ایسی اب عاشقی ہوگئی

ہنس کے ملنا غضب ہوگیا
میری پاکٹ تہی ہوگئی

اس کا کنگن میں لایا نہیں
اور وہ سر پھری ہوگئی

جھوٹ کہہ کر وہ قائد بنا
ایسی اب لیڈری ہوگئی

جب سے شاعر بنا ہوں میاں
میری شہرت بڑی ہوگئی

نام سنتے ہی ان کا سحر
ایسی کیوں تھرتھری ہوگئی

☆●☆

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

دو شادیاں کر لیں تھیں خادم نے جہالت میں
ہے آج کمر ٹیڑھی بچوں کی کفالت میں

جیتے تو ہیں سب بوڑھے پر ضعف کی حالت میں
ہوتی ہے یہی درگت عمروں کی طوالت میں
اس وقت ہی مرجانا ہر حال میں بہتر تھا
جب گھر سے نکالا تھا بیٹوں نے علالت میں

مسجد کے امام اکثر چائے کو ترستے ہیں
دیتا ہے مجھے لاکھوں اللہ وکالت میں

اس وقت کی دوائیں کھالو تو خدا یاد
جب پیر مغاں اپنے رہتے ہیں جلالت میں

بے جوڑ کی شادی کا انجام برا دیکھا
بیوی بھی خجالت میں، شوہر بھی خجالت میں

اس دور سیاست میں ہم نے تو یہی دیکھا
بگلوں کی ہوئی پیشی کوؤں کی عدالت میں

لکھ پڑھ کے بھی ہم جیسے پہنچے نہ جہاں منہ پھٹ
وہ نام کمایا ہے بیٹوں نے جہالت میں

☆●☆

یہ کیا شہروں کی حالت ہو گئی ہے
عمارت ہی عمارت ہو گئی ہے

وہاں اپنی زباں کو بند رکھئے
جہاں تعریف بدعت ہو گئی ہے

وفا کو مرتبانوں میں سجا دو
یہ شے اب بے ضرورت ہو گئی ہے

نشے سے آدمی کیسے بچے گا
طلب بڑھ کر ضرورت ہو گئی ہے

خدا را ان کو دیوانہ نہ کہیئے
جنہیں اپنوں سے وحشت ہو گئی ہے

کوئی محراب و منبر پر ہے قابض
کسی کے گھر کی ملت ہو گئی ہے

ہم اچھی بات تو کرتے نہیں ہیں
شکایت اپنی عادت ہو گئی ہے

بڑے شہروں کی سیر آکے نہ کرنا
بہت منہ پھٹ حجامت ہو گئی ہے

شبنم کارواری

"چوڑیاں"

کہنیوں تک جا لگی ہیں چوڑیاں
سائز میں تھوڑی بڑی ہیں چوڑیاں

جس میں کم ہے جوہر مردانگی
اس نے گویا پہن لی ہیں چوڑیاں

تھی وہ میری موت کی جھوٹی خبر
اس نے سچ مچ توڑلی ہیں چوڑیاں

چوڑی ہے ان کی ہتھیلی اس لئے
سخت مشکل سے چڑھی ہیں چوڑیاں

چوڑیاں سونے کی گنتی میں ہیں کم
سب سے زیادہ کانچ کی ہیں چوڑیاں

☆●☆

●☆●

نصرت ظہیر

کچھ اور فلیش بیک

کئی فلیش بیک ایک ساتھ چل رہے ہیں۔

ایک اور منظر، زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریبات کا ادبی اجلاس ہو رہا ہے۔ مجھے مشہور انقلابی رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے برابر والی کرسی پر جگہ ملی ہے۔ مزاح نگار حضرات اپنے مضامین پڑھ رہے ہیں۔ ہزاروں کا مجمع بڑے شوق و ذوق سے انھیں سن رہا ہے۔ مگر میرا ذہن کہیں اور ہے۔

گوڑ صاحب کی قربت مجھے لڑکپن اور نوجوانی کے بیچ کی عمر کے اس موسم میں لے گئی جس میں خوابوں کی فصل بوئی جاتی ہے۔ جب خوابوں کے ننھے منے بیسیجوں کی معصوم کونپلیں دماغ کی زمین کو چیر کر سر ابھارتی ہیں اور فکر کی وادیوں کو گلزار بنائے رکھتی ہیں۔

مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، سجاد ظہیر، پی سی جوشی اور اپنے سہارنپور کے راجندر کمار گرگ .... اور یہ حیدرآبادی بزرگ، راج بہادر گوڑ...... یہ بھی تو ہمارے ہیرو تھے!

"حیات" میں ان کے مضامین پڑھ کر ہم ساتھیوں کی رگوں میں خون کی گردش بڑھ جاتی تھی!

ہاں! ہم حیات لے کے چلے تھے۔

سارے زمانے کو، کل کائنات کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے تاکہ نسل آدم جلد سے جلد اس حسین مستقر تک پہنچ سکے جو اس کا مقدر ہے۔ مقدور بھر اس کی کوشش بھی کی۔

راہ دشوار تھی، قدم ٹھیک سے نہیں جمتے تھے۔ پھر بھی ہم چل رہے تھے۔

ہمارے بت ہمیں پکار رہے تھے۔ چلے چلو۔

چلے، چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔

مگر نہ جانے، کب، کہاں اور کیسے ہم راہ بھول گئے۔ اپنی ہی بنائی ہوئی کسی بھول بھلیاں میں گم ہو گئے۔ اب یوں ہے کہ ....

نکلے تھے کہاں جانے کے لئے پہنچے ہیں کہاں معلوم نہیں
اب اپنے بھٹکتے قدموں کو منزل کے نشاں معلوم نہیں

کیوں ہوا ایسا؟

گولیاں چل رہی ہیں۔ بارود پھٹ رہا ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ زندانوں میں ہلچل ہے۔ قیدی اپنی زنجیریں توڑ رہے ہیں۔ انقلاب کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے۔ اپنے ہی خون اور پسینے میں نہائے ہوئے، تھکن سے چور، کروڑوں جسم اس گم شدہ جنت کے دروازوں کی طرف بے تاب آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جہاں سے ازل کے کسی منحوس لمحے نے انھیں بے دخل کر دیا تھا۔

مگر دروازے نہیں کھلتے

آخر کیوں وہ دروازے نہیں کھلے۔ کیوں۔ آخر کیوں!؟

کیوں کہ جی ایک "کیوں" ہے جس نے مجھ جیسے نہ جانے کتنے کمزور دماغوں کو مجسم سوال بنا کر رکھ دیا ہے۔

میں گوڑ صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اب وہی باقی رہ گئے ہیں۔ نہ مخدوم ہیں نہ فیض، نہ ساحر نہ سجاد، نہ جوش نہ کرگ ن میں سے کوئی موجود ہوتا تو ان سے پوچھتا۔ مگر نہیں پوچھ پاتا۔

اجلاس میں گونجنے والے قہقہے مجھے چونکا دیتے ہیں۔

فیاض احمد فیضی اپنا دلچسپ مضمون پڑھ رہے ہیں۔ پورا حیدرآباد ہنسی سے لوٹ پوٹ ہے۔

فیضی کو ... نے پڑھا ہے اور انہوں نے مجھے۔ اس کا یقین مجھے یوں ہے کہ ان کی آنکھوں میں اس احساس شناسائی کی جھلک میں نے ... دیکھی ہے جو ایک ہم پیشہ وہم شوق سے ملتے ہی بے ساختہ ابھر آتی ہے۔

... ان سے ... نہیں۔ مگر نہیں مل پاتا۔ وہ بہت مختصر وقفہ کے لئے حیدرآباد آئے ہیں۔ اس شام کی تقریبات ختم ہونے سے پہلے ہی انہیں جانا پڑتا ہے۔

ادبی اجلاس کے بعد محفل لطیفہ گوئی منعقد ہوئی۔ جسے آپ لطیفوں کا مشاعرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو دوسرے مشاعروں سے اس لئے بہتر تھا اس میں کوئی لطیفہ ترنم سے نہیں پڑھا گیا۔ (دوسرے مشاعروں میں ترنم سے غزل کو لطیفہ بنایا جاتا ہے) حیدرآباد کے نامی گرامی لطیفہ بازوں نے اس مشاعرے میں شرکت کی۔ دہلی سے ڈاکٹر خلیق انجم بھی آئے ہوئے تھے۔ حیدرآبادیوں کی حس مزاح کی داد دیجئے کہ ڈاکٹر انجم نے جب لطیفے سنائے تو ہال کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کہیں پر تالی تک نہیں بجی۔ مگر جب انہوں نے سنجیدگی سے گفتگو کی تو حاضرین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ ہر گوشہ قہقہہ زار تھا اور یوں لگتا تھا کہ تالیوں اور ہنسی کے شور سے چھت پھٹ جائے گی!

ہاں قہقہے پر یاد آیا۔ حیدرآباد والے عموماً قہقہے لگانے سے گریز کرتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب سے اس کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے فرمایا:

چار سو سال تک چارمینار کے زیر سایہ شائستگی کی تربیت پانے والی تہذیب سے اردو میں بہت زیادہ پھکڑپن کی توقع نہ کیجئے۔ اسی لئے وہ دکھنی زبان کا استعمال کرتے ہیں اردو میں یہ لوگ بہت سوچ سمجھ کر خندہ زنی کرتے ہیں۔ شمالی ہند میں جسے مسکراہٹ کہتے ہیں اسے حیدرآباد والوں نے تبسم زیر لب کے درجہ پر رکھا ہے۔ جسے ہنسنا کہتے ہیں وہ یہاں مسکراہٹ کے درجہ پر ہے۔ اس حساب سے اگر کسی حیدرآبادی کے آپ کو دانت تک دکھائی دے جائیں تو سمجھ لیجئے یا تو اس کی داڑھ میں درد ہے یا پھر قہقہہ لگا رہا ہے۔ کھل کر قہقہہ نہ لگانے کی ایک اور بھی وجہ ہے!

میں نے بے تابی سے پوچھا: "وہ کیا؟"

کہنے لگے قہقہے میں قاف بہت ہوتا ہے۔ اس لئے اگر بہت ہی ضروری ہو تو حیدرآباد والے کھکھہ لگا لیتے ہیں اور بس!

ماہنامہ "شگوفہ" کے دفتر میں اس کے مدیر مصطفیٰ کمال سے مسئلہ "قاف" پر گفتگو چل رہی تھی میں نے پوچھا: کہ جس شہر کی بنیاد قلی قطب شاہ جیسے شخص نے ڈالی ہو کہ جس کے نام میں ایک چھوڑ کئی واضح ترین قاف موجود تھے، اس شہر میں قاف کا قافیہ اتنا تنگ کیوں ہے۔

مصطفیٰ کمال نے شمالی ہند کے پیمانے سے ہنستے ہوئے یعنی مسکراتے ہوئے بتایا۔ یہ سب قدرت کا کھیل ہے۔ جنوبی ہند والے اپنے حلق کی مخصوص عضلاتی بناوٹ کی وجہ سے قاف نہیں بول پاتے۔ اس پر مجھے دل ہی دل میں جنوبی ہند کے حساب سے ہنسی آگئی! — (مطبوعہ: قومی آواز، دہلی) ☆

منظور الامین، حیدر آباد

کایا صدی کی چوکھٹ پر

آج ہم تاریخ کی ایک ایسی دہلیز پر کھڑے ہیں جس میں داخل ہونے پر دنیا کے شاندار مستقبل کی پرشکوہ تعمیر ہمارے استقبال کو تیار ہے۔ قارئین آپ کو نیا سال، نئی صدی اور نئی کایا صدی یا صد ہزار سالہ Millennium مبارک ہو۔ مرزا غالب کی زبان سے ہم کہیں گے :

تم سلامت رہو ہزار برس ☆ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مرزا غالب آج اگر زندہ ہوتے تو اپنے مصرع میں ترمیم کر کے یوں کہتے : اک برہمن نے کہا ہے صدی اچھی ہے ، نئی صدی اور نئی کایا صدی ہمارے سامنے ہے ۔ دیکھنا اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

بیسویں صدی عالم انسانیت کیلئے بہت سے انوکھے تحفے لے کر آئی تھی۔ صرف ایک پہلو رفتار کو لیجئے ۔ آج سے کوئی 175 برس پہلے تک ماضی کی ہزارہا صدیوں میں انسان زیادہ سے زیادہ 45 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کیا کرتا تھا۔ وہ بھی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر۔ بیسویں صدی میں انسان چاند پر جا پہنچا۔ قیاس فرمایئے ، چاند تک پہنچنے والے پہلے خلا بازوں کے سفر کی رفتار تھی 18000 میل فی گھنٹہ یعنی ایک سیکنڈ میں 5 میل ، مائکرو سافٹ کے مشہور ماہر بل گیٹس نے اپنی کتاب The Speed of Thoughts میں لکھا ہے کہ اکیسویں صدی ، رفتار یا Velocity کی صدی ہوگی۔ یہی دیکھئے نا آج لوگ لندن سے نیویارک کون کورڈ Concord جہاز میں سفر کرتے ہیں تو جہاز آواز کی رفتار (1120 فیٹ فی سیکنڈ) کو شکست دے کر پرواز کرتا ہے ۔ لندن سے مسافر اگر سویرے نو بجے اس جہاز میں روانہ ہو تو چار ہزار میل کا نیویارک تک کا فاصلہ بحر اوقیانوس پر سے طے کرنے پر جب جہاز نیویارک پہنچتا ہے تو اس وقت وہاں صبح کے نو ہی بجتے ہیں ۔ بیسویں صدی (1903) ہی میں رائٹ برادرز نے پہلی بار ہوائی جہاز بنا کر اس میں پرواز کی۔ 1920 میں سائنس دان رودر فورڈ نے ایٹم کی تقسیم کی۔ اسی برس یعنی 1920 ہی میں اطالوی انجینئر مارکونی کی کوششوں سے پیٹسبرگ (امریکہ) میں پہلا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا ۔ 1926 میں جان بیرڈ نے ٹیلی ویژن ایجاد کیا۔ 1957 میں روس نے پہلا مصنوعی سیارہ اسپٹنک خلاء میں بھیجا۔ 1969 میں نیل آرم اسٹرانگ اور ایڈون آلڈرن چاند پر جا پہنچے اور 1980 سے انٹرنیٹ عالمی پیمانے پر استعمال ہونے لگا۔

ان سب ایجادات میں عوامی فائدے مضمر رہے ۔ ان سے انسان شہرت کے بام عروج تک جا پہنچا مگر اس نے جہاں آسمانی بلندیوں کو چھولیا وہاں وہ پاتال میں گر گیا۔ اس نے خشخاش کی کاشت تو کی مگر افیون بنالی (انگریزوں نے چینیوں کو افیمی بنادیا تھا) ۔ اس نے ایٹم کی تقسیم تو کی مگر ایٹم بم بنالیا۔ اس نے مصنوعی سیارہ تو بنایا مگر آسمانی جنگ (Star War) بھی شروع کردی۔ اس نے بڑی بڑی زمینی جنگیں بھی لڑیں۔ (1914-1918 پہلی جنگ عظیم ، 1939-1945 دوسری جنگ عظیم) ان جنگوں میں لاکھوں انسان مرے اور کروڑوں بے گھر ہوئے ۔ یہ سلسلہ آج بھی دنیا کے کئی علاقوں میں چھوٹے پیمانے پر جاری ہے ۔ مار دھاڑ ، دہشت گردی ، آگ زنی ، قتل و غارتگری اور کشت و خون کا یہ تباہ کن رقص آج بھی دیکھا جاسکتا ہے اور انسان بے بسی سے یہ تانڈو نرتیہ دیکھ رہا ہے اور خاموش ہے ۔

گھروں کی راکھ سے پوچھیں اتہ پتہ چل کر
یہیں کہیں پہ ہمارا غریب خانہ تھا

اس سیاق و سباق میں یونیسکو کے چارٹر کا حرف آغاز برمحل اور مناسب ہے :
"چونکہ جنگیں انسانی ذہن کی اختراع ہیں اس لئے ان کے دفاع کی تعمیر انسانوں کے ذہنوں ہی میں کرنا چاہئے"

As wars begin in the minds of men, it is in the minds of men that the defences of peace be constructed.

قوموں کی شہرت، نام یا بدنامی، امن کے کردار، ان کے اعمال، ان کے افعال اور طور طریقوں کی بناء پر ہوتی ہے ۔ یہ بات افراد پر بھی صادق آتی ہے ۔ ٹوجو، اسٹالین، ہٹلر، مسولینی، سوداگران موت تھے جنھوں نے کروڑوں کو تہ تیغ کردیا ۔ یہ صحیح ہے کہ جنگیں انسانی ذہن ہی کی پیداوار ہوتی ہیں ۔ انسانی ذہن ہی میں عناد و فساد کے جراثیم پرورش پاتے ہیں ۔ ان کا قلع قمع بھی انسان ہی کے ذہن میں کرنا ضروری ہے ۔ بُرے افعال کی سزاء بھی یہیں مل جاتی ہے ۔

دیکھنا کتنی خونریز تھی بیسویں صدی ! اس صدی میں انسانوں کا اتنا خون بہا کہ سمندر بھی خونین ہوگئے ۔ وقت آگیا ہے کہ اکیسویں صدی میں بیسویں صدی کے خونین داغ دھو دیئے جائیں ۔ وقت آگیا ہیکہ امن یا شانتی کے اہم مسئلہ کو انسانی ایجنڈے میں سرفہرست رکھا جائے تاکہ آنے والی صدیاں امن و عافیت اور امن مسلسل سے عبارت ہوں ۔

طنز و مزاح کے مشہور شاعر خواہ مخواہ نے کتنے خوبصورت انداز میں اور سلیقے سے بات کہہ دی ہے جو سب کے لئے چراغ راہ کا کام دے سکتی ہے :

ذہن و دل میں خوش نما مہتابیاں روشن کرو
خامیاں اپنی جلاؤ خوبیاں روشن کرو

ڈاکٹر طیب انصاری
10-3-5/6/1 مہدی پٹنم
حیدرآباد 28

رؤف رحیم کی طنزیہ شاعری

رؤف رحیم کے طنزیہ کلام کا تازہ مجموعہ نوک جھونک ان کے مزاج کا آئینہ دار ہے۔ وہ کبھی نچلے بیٹھنے والے آدمی نہیں ہیں۔ کوئی اور کام نہ ہو تو ان کی معاصرین سے نوک جھونک ضرور چلتی رہتی ہے۔ چھیڑ خوباں سے ہوتی تو بھی کوئی بات تھی مگر ان کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

یہ رحیم صاحب تو کچھ عجیب شاعر ہیں!

بہر حال!!!

رؤف رحیم کے شعری مجموعے بساط دل، خدا خیر کرے، نشاط الم اور اب نوک جھونک ان کی جودت طبع اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ اپنے والد بزرگوار کے سعادت مند بیٹے نے اپنے والد حضرت شمس الدین تاباں کا کلام زنجیر و زنار کے نام سے اور ان کے استاد حضرت صفی اورنگ آبادی کے کلام کو گلزار صفی کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ معتمد بھی ہیں۔ مثلاً: معتمد ادبستان دکن، معتمد بزم تاباں، معتمد بزم حکمت، معتمد بزم جمیل اور زندہ دلان حیدرآباد کے شریک معتمد اور پھر ملازمت الگ! ۔ پتا نہیں یہ اتنا سب ہوتے ہوئے شعر کہنے کے لئے وقت کہاں سے نکال لاتے ہیں۔ شعر ایسا ویسا بھی نہیں کہتے بلکہ مصطفیٰ کمال کے الفاظ میں:

> "مستقبل پر ان کی نظر ہے۔ نیا محاورہ، نئی سائنس اور نئے صالح اقدار انہیں پسند ہیں۔ شاعر کا یہ متوازن رویہ مزاحیہ شاعری کی نئی منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ فن شعر پر رؤف رحیم کو عبور حاصل ہے"۔

وغیرہ وغیرہ!!!

کیوں نہ ہو رؤف رحیم کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ مصطفیٰ کمال زندگی کے ہر معاملہ میں محتاط ہیں وہ توازن کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ کسی کی تعریف بھی کریں گے تو یہاں بھی احتیاط برتی جائے گی مگر رؤف رحیم کے معاملہ میں ان کا رویہ مختلف ہے۔ سنئے وہ کیا کہتے ہیں:

> "تلخی دوراں نے ان کے لہجہ میں کڑواہٹ نہیں پیدا کی بلکہ وہ ہر طرح کی بے راہ روی پر شیریں انداز میں اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں"۔
>
> اس لئے انہیں رؤف رحیم کے مستقبل سے اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔

مصطفیٰ کمال کے پیش نظر رؤف رحیم کا تازہ مجموعہ کلام نوک جھونک رہا ہے۔ میں مصطفیٰ کمال کے ان چند تاثرات کو وسیع تر کلام کی روشنی میں دیکھتا ہوں اور ان پر صاد کرتا ہوں۔ رؤف رحیم کا سنجیدہ کلام ہو کہ مزاحیہ و طنزیہ۔ مجھے ان کے کلام میں فکر و خیال کی

یکسانیت نظر آتی ہے اور جو بات مجھے اچھی لگی وہ ہے رؤف رحیم کا اپنے معاشرہ سے اٹوٹ رشتہ۔ رؤف رحیم کی ساری شاعری ماحول دین ہے۔ یہ اپنے ماحول کا معاشرہ کا آدمی ہے اور جس معاشرہ میں سانسیں لیتا ہے اسی معاشرہ کے اچھے برے کی نمائندگی کرتا ہے۔
اردو کی مزاحیہ شاعری ہو کہ دکنی مزاحیہ کلام۔ اس شاعری کا وصف خاص یہ رہا ہے کہ اس کی بنیادیں خواب و خیال سے نہیں ہمارے سماج سے جڑی ہیں۔ اردو شعراء میں نظیر اکبر آبادی سے لیکر اکبر الہ آبادی تک اور دکنی شاعری میں دہقانی سے لیکر حمایت اللہ تک ان تمام شعراء کو پڑھ جائیے آپ حقیقتوں اور زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہوں گے۔ رؤف رحیم کے معاصرین میں حمایت اللہ کے علاوہ مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، بمباٹ، خواہ مخواہ اور دوسرے شعراء نے اپنے پیش رو شعراء ڈنڈا اور خطیب کی تقلید میں سماجی، مذہبی اور سیاسی مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ سماج میں پائی جانے والی ناانصافی، عدم مساوات، سنگ دلی، تعصب، رشوت ستانی اور جیسی لعنتوں کے خلاف جارحانہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ زندگی سے محبت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ہم ان برائیوں کے خلاف سخت لہجہ اختیار کریں۔ رؤف رحیم خود بھی اس بات کا شعور رکھتے ہیں اس کی وجہ سے ان کے لہجے میں مزاح سے کہیں زیادہ طنز گہرا نظر آتا ہے۔ رؤف رحیم کی خوش بختی یہ ہے کہ وہ محمد قلی قطب شاہ کے بسائے شہر میں رہتے ہیں جو حقیقی حیدرآباد ہے اور آج جسے ہم پرانا حیدرآباد یا پرانا شہر سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی پرانے شہر میں انسانی زندگی کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ یہی پرانا شہر ہماری تہذیب ہمارے مذہب اور ہماری سیاست کا اہم مرکز ہے۔ اس پرانے شہر کی خوبیاں خرابیاں رؤف رحیم کے ذہن کو تازگی بخشتی ہیں اور قلب کو تڑپا دیتی ہیں۔ رؤف رحیم کے قلب و ذہن کی یہی متضاد کیفیات ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔

کہتا ہوں سچ تو لوگ برا مانتے ہیں آج
میں کیا کروں کہ ہے یہ زباں میری بے لگام

یہ صحیح ہے کہ حق گوئی اکثر مہنگی پڑتی ہے۔ لوگ تلخ گوئی کا برا مانتے ہیں رؤف رحیم کو اس بات کا پتا ہے وہ کہتے ہیں

بولا ہے کڑوا بول تو میٹھے کی آس کیوں
املی کا پیڑ بوئیں تو کیسے لگے گا آم

رؤف رحیم کی شاعری میں املی کے پیڑ زیادہ اور آم کے درخت بہت کم ہیں۔ اس میں رؤف رحیم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور تو اس معاشرہ کا ہے جس میں وہ زندہ ہیں۔ درج ذیل اشعار کی تلخی بلکہ زہرناکی سماج ہی کی دین ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

کس طرح غذاؤں میں وٹامن ہوں میسر　☆۔☆　بیسنوں میں ملاوٹ بھی ہے ناقص بھی ہیں کھادیں

ٹی وی کی عنایت ہے کہ بے شرم ہے اولاد　☆۔☆　کچھ فرق ہی باقی نہ رہا عیب و ہنر میں

بڑھ گئے چار قدم اس طرح شیطانوں سے　☆۔☆　اب تو شیطان ڈرا کرتے ہیں انسانوں سے

خالی ہے پولیس کا خزانہ　☆۔☆　پیدل کو چالان کریں گے

دیکھنے کے واسطے گاندھی کا چیلہ ہے مگر　☆۔☆　جھانک کر اندر سے دیکھو تو وہ ناتھورام ہے

ملت کی آبرو کو ملاتا ہے خاک میں　☆۔☆　لیڈر ہمارا کتنا بڑا خاکسار ہے

رؤف رحیم نے معاشرہ کے اندر پائی جانے والی برائیوں کا برملا اظہار کیا ہے۔ چونکہ رؤف رحیم خود بھی اسی معاشرہ کا ایک حصہ ہیں اس لئے ان کی زندگی بھی موجودہ حالات سے مختلف نہیں ہے۔

ویسے ہے شاعر مزاح و طنز کا بے شک رحیم
شومیٔ قسمت کہ اس کی نوحہ خواں ہے زندگی

رؤف رحیم کا رشتہ زندگی سے اٹوٹ ہے اس لئے ان کی شاعری زندگی کا نوحہ بن گئی ہے۔ ستاروں پر کمندیں پھینکنے والا انسان خود اپنے ہاتھوں پابہ زنجیر ہے۔ جدید معاشرہ کا یہی المیہ ہے اور اسی المیہ کا آئینہ اور ترجمان رؤف رحیم کی شاعری ہے۔

رؤف رحیم کے یہاں طنز گہرا ہے اور مزاح بھی ہلکا پھلکا۔ مزاح کی شیرینی و لطافت آپ کو مزہ دے جاتی ہے۔

منہ کا مزہ بدلنے کے لئے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

تمہیں کیا نہیں میسر، ہے پڑوس کی بھی مرغی
نہ کھلاؤ گھر بلا کر مجھے دالچہ بگھارا

●☆●

رنگ کالا ہے اس کا گر
نام رکھا ہے اس نے قمر

●☆●

رہتا ہے جو شوہر یہاں بیگم کے اثر میں
گھر کا ہے نہ وہ گھاٹ کا ہے میری نظر میں

●☆●

زن مریدی ہے میری فطرت میں
میں کبھی بھی خلاف خو نہیں گیا

رؤف رحیم نے اس طرح خود تنقیدی رویہ کے ذریعہ بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ خود احتسابی یقیناً بہت بڑی بات ہے۔ اعلیٰ ظرفی کی بات ہے۔ یہ علو ہمتی سب کے بس کا روگ نہیں ہے۔

جو چبائے ہونٹ اپنے تو رحیم کی خطا کیا
کوئی گھانس ہی نہ ڈالے تو کرے گا کیا بیچارہ
کررہا ہوں شاعری کے معرکے سرائے رحیم
گھر میں آٹا دال چاول اور ترکاری نہیں

مختصر یہ کہ رؤف رحیم کا سفر ابھی جاری ہے۔ دیکھیں وہ مستقبل میں کیا گل کھلاتے ہیں، کتنے معرکے سر کرتے ہیں؟!۔ ☆

☆ قلمی معاونین سے التماس ہے کہ اپنی ہر تخلیق پر مکمل پتہ ضرور لکھیں۔
☆ مضامین صاف اور صفحہ کی ایک جانب لکھیں۔

محمد روشن علی کرنل
7-2-217,
Mankammathota
Karimnagar.

غزلیں

مری کمائی پہ قبضہ تو بی بی جان کا ہے
کہ ان کے ذمہ بجٹ پورے خاندان کا ہے

نہیں میں مانگتا ان سے کبھی بھی پینے کو
مرا مطالبہ سگریٹ اور پان کا ہے

گنے دکان و مکاں رہط میں کدھر جاؤں
خیال، سر پہ دکاں، دوش پر مکان کا ہے

ہوا کپاس میں نقصان لے لیے پھانسی
یہ سلسلہ تو میرے بھارتی کسان کا ہے

اکڑ یہ کیسی تمہاری کمائی کچھ بھی نہیں
یہ کار بنگلہ سب ہی مرے باوا جان کا ہے

مرے کلام کو کہتی ہے فالتو بکواس
"تمام شہر میں چرچا میرے بیان کا ہے"

مردنگا پر نہ ہنسو گا کہا جو کرنل نے
یہ شعر واقعی اک فوج کے جوان کا ہے

●☆●

حج بھی کر کے آئے نانا، منہ میں گالی ہے سو ہے
رم و سکی سے توبہ کرلی، جاری سیندھی ہے سو ہے

چہلہ، چھٹی اور ختنہ بھی، عید بھی ہے، قربانی بھی
تنخواہ رشوت دونوں بڑپ ہیں، قرضہ باقی ہے سو ہے

فیر اینڈ لولی صندل صابن، دن میں سو سو بار ملے
چہرہ گورا کیسے ہوگا، رنگت کالی ہے سو ہے

پنڈت کی پرلوک گئی ہے، اور زاہد کی زیرِ زمیں
دونوں نویلی لے آئے ہیں، اپنی پرانی ہے سو ہے

ہونڈہ، ٹی وی، سونا چاندی، جہیز بھی لائی لاکھوں کا
اتنا سب کچھ لانے پر بھی، قتل کی دھمکی ہے سو ہے

آئی ضعیفی کرنل پر بھی، انجر پنجر لوز ہوئے
آنکھوں پر چشمہ بھی آیا، نظر بھٹکتی ہے سو ہے

☆●☆

جسم ہی گداز ہے
اور نہ قد دراز ہے

رنگ بھی جلا ترا
اس پہ اتنا ناز ہے

زیرِ زن کے جو رہا
کون سرفراز ہے

متر سے بھی مت کہو
راز پھر بھی راز ہے

معتبروں پہ چار سو
نذر ہے نیاز ہے

مفلسی کی عاشقی
بے بسی کا ساز ہے

خر دماغ بن گیا
کس ہنر پہ ناز ہے

☆●☆

شعیب ربانی

ممتاز کارٹونسٹ شعیب ربانی ایگری کلچر کے گریجویٹ ہیں۔ لیکن خاندان کے علمی و ادبی ماحول نے انہیں ایگری کلچر کے بجائے کلچر کے مشاہدہ کی طرف مائل کیا اور ایک کارٹونسٹ کی حیثیت سے انھوں نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ صحافت سے بی سی جے اور درجہ اول میں یم سی جے کی ڈگریاں حاصل کرچکے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوئے لیکن صرف ۲۵ دن کی مختصر ملازمت کے بعد کارٹونسٹ کی حیثیت سے روزنامہ دکن کرانیکل میں ان کا تقرر ہوگیا۔ ۱۹۸۳ء سے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے لیے تعلیمی دستاویزی فلمیں بھی بنانے لگے۔ شعیب کے کارٹون مانٹریال، (کینڈا)، بان، جاپان اور لندن میں منعقدہ کارٹون کے بین الاقوامی مقابلوں کے لیے منتخب ہوچکے ہیں اور ان نمائشوں میں انہیں انعامات سے بھی سرفراز کیا گیا۔ اسی طرح ان کے تعلیمی ویڈیو پروگراموں کو بھی ملک اور بیرون ملک میں پسند کیا گیا اور کئی انعامات انہیں حاصل ہوئے۔ شعیب نے جملہ ۱۴۲ تعلیمی دستاویزی فلمیں بنائیں۔ اس سلسلہ میں ان کو سونی، آبی سی ڈی (جاپان) کے علاوہ لندن اور بلغاریہ میں انعامات حاصل ہوچکے ہیں۔

ان دنوں شعیب روزنامہ سیاست سے بہ حیثیت کارٹونسٹ وابستہ ہیں۔ ان کے کارٹون "سیاست" میں روزانہ شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سیاست کے لیے "بچوں کا صفحہ" اور ہفتہ واری انگریزی سپلمنٹ "ہیلو سیاست" بھی ترتیب دیتے ہیں۔

شعیب کے روزانہ شائع ہونے والے کارٹونوں کا ایک دلچسپ انتخاب اس شمارہ میں شریک ہے۔ (ادارہ)۔☆

"آخر چوروں کو بھی اصلی مال کا پتہ چل گیا۔"

خبردار! اس بار کوئی چھوٹی کرسی سنبھالنے کی ضرورت نہیں سیدھے وزیراعظم کی کرسی ہی مانگو ورنہ تائید واپس لے لو!!

"جی نہیں! میں کسی بھی فینانس کمپنی کا مالک نہیں ہوں، میں تو بس پکڑنے بھاگ رہا ہوں۔"

ایک مہینہ کی تنخواہ ہی تو دے رہے ہیں آمدنی نہیں!

میں ذرا امی جان کے پاس جا رہی ہوں! انہوں نے چائے پر بلایا ہے!!

کارگل! جی نہیں صاحب یہ تو اپنے شہر کا نقشہ ہے جہاں مختلف لینڈ گرابرس نے قبضہ کرلیا ہے

"جب تک یہ 'ممل' درمیان میں رہے گا
فاصلے کم نہ ہوں گے۔"

ہم تو کئی سالوں سے سڑک کے ساتھ ساتھ
ان گڑھوں کا ٹیکس بھی ادا کر رہے ہیں

استاد! تم تو کہتے تھے یہاں کے پولیس والوں
کو بندوق چلانا تو کیا اٹھانا بھی نہیں آتا!!

شعیب
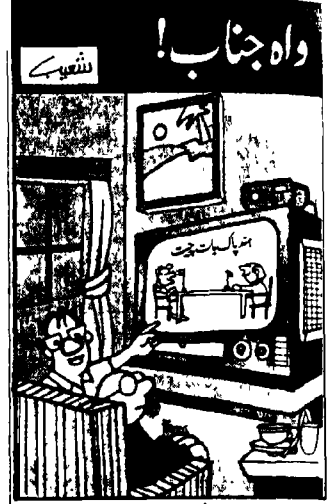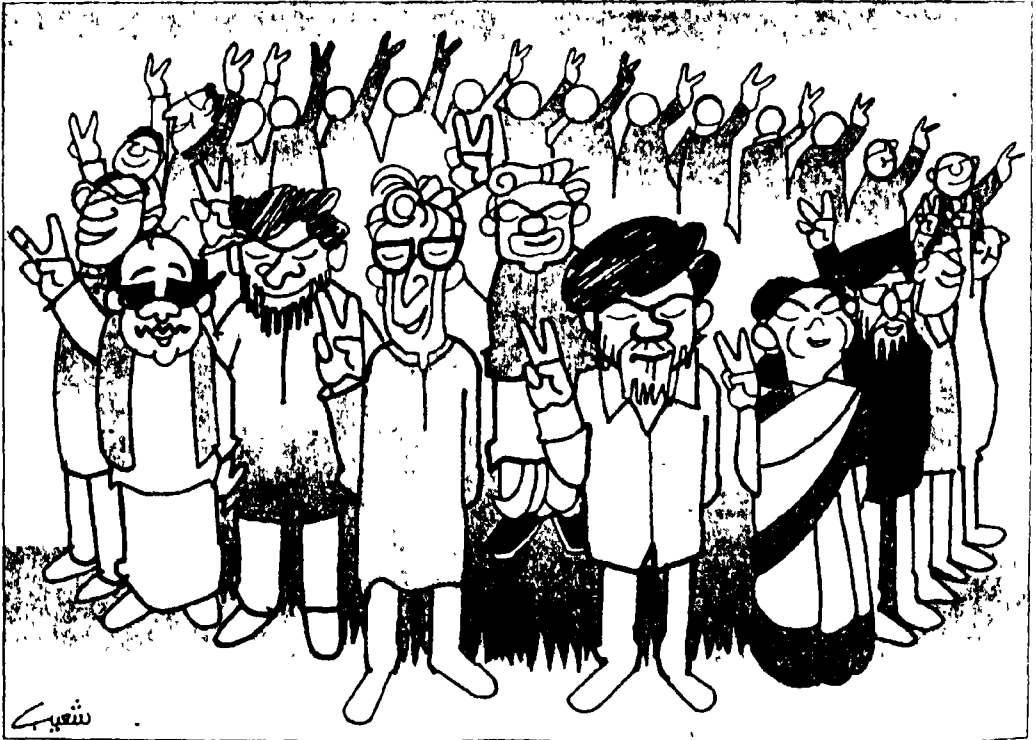
ہم سب مل کر آگے بڑھیں

سورنا آندھرا پردیش تعمیر کریں

Release Order No. 312/Advt. I/C3/99 Dt 28-12-99

جناب این محمد فاروق
وزیربلدی نظم و نسق، اردو اکیڈمی، اقلیتی بہبود

جناب سید شاہ نورالحق قادری
صدر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش

عزت مآب جناب این چندرابابو نائیڈو
وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش

عہدہ کا جائزہ:
یکم نومبر ۱۹۹۸ء
ایک سال کی تکمیل ۲ نومبر ۱۹۹۹

۷-۶۳۴-۴-۱۱، اے سی گارڈس - حیدر آباد ۵۰۰۰۰۴

جناب سید شاہ نورالحق قادری ایڈوکیٹ، صدر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کامیابیوں اور کارناموں کا ایک سال

اسٹوڈنٹس اسکالر شپس (ای بی سی)	(۶) ہزار طلبہ
اسٹوڈنٹس اسکالر شپس (میرٹ)	(۴) ہزار طلبہ
قومی زبان (چھ شماروں کی اشاعت)	(۳) ہزار کاپیاں
بسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈ	(۲۵۶)
بسٹ اردو ٹیچرس ایوارڈ	(۴۰)
اردو لائبریریوں کو امداد	(۷۰) لائبریریاں
کتابوں کا اردو میں ترجمہ و اشاعت	(۳) کتابیں
اردو گھروں کی تعمیر	(۲۴) اردو گھر
اردو تنظیموں کیلئے گرانٹ ان ایڈ	(۶۶) تنظیمیں
اردو اوپن اسکول	(۱۰۰) اسکول
محکمہ اقلیتی بہبود کی اسکیمات سے آگاہی کیلئے بروشر اور کیلنڈر کی اشاعت	(۱۰) ہزار

اردو مدارس کے لئے انفراسٹرکچر سہولتوں کی فراہمی	(۸۵۴) مدارس
ڈپلما ان کمپیوٹر اپلی کیشن کورس	(۶۸) طلبہ کیلئے تربیت
ڈپلما ان ٹرانسلیشن کورس	(۳۰) طلبہ کی تربیت
اردو ٹائپ رائٹنگ کورس (لوئر اور ہائر)	(۴۰) طلبہ کی تربیت
اردو شارٹ ہینڈ کورس	(۲۰) طلبہ کی تربیت
مسودات کی اشاعت کیلئے اعانت	(۹۳) مصنفین
اردو رسائل و جرائد کی اعانت	(۸) رسائل
اردو خبر رساں ایجنسیوں کی اعانت	(۶) ایجنسیاں
ادارہ جات کی امداد برائے انعقاد سمینار و مشاعرہ	(۲۰) ادارے

ایم۔ اے۔ نعیم
ڈائرکٹر و سکریٹری

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ
اشاعت کا ۳۲ واں سال

جلد ۳۳
شمارہ ۲

حیدرآباد

فروری ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کمپیوٹر کتابت : SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373 طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپئے زرسالانہ : ۱۵۰ روپئے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ ٹیچرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد
فون : (آفس) 4745716
(رہائش) 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

نریندر لوتھر (آئی اے ایس)
سابق چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش

ایس سر۔ نو سر

بیوروکریسی [illegible] اور بابوگیری وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہر قسم کے نظام حکومت کا لازمی جز ہے۔ جمہوریت میں اس کی [illegible] ہے کیونکہ اس طرز حکومت کا اعلانیہ نصب العین مفاد عامہ ہوتا ہے۔ نوکر شاہی ہی سیاسی پالیسیوں کے مبہم [illegible] کی صراحت کرتی ہے اور انہیں عملی جامہ پہناتی ہے۔ بیوروکریسی کو بالترتیب تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) اعلیٰ ترین سروس جسے "افسر شاہی" کہا جاسکتا ہے۔ (۲) "نوکر شاہی" یعنی درمیانے درجے کی سروس (۳) "کلاسیکل سروس" جسے محرری یا بابوگیری کہا جاسکتا ہے۔

"افسر شاہی" کو ہندوستان میں آئینی حیثیت دی گئی ہے۔ آئین کی دفعہ 312 کے تحت "آئی اے ایس اور آئی پی ایس" تشکیل دی گئی۔ بعد میں ایک اور سروس "جنگلات" یعنی "انڈین فارسٹ سروس" بھی بنائی گئی۔ باقی کی نوکریاں مرکزی خدمات یا سنٹرل سرویسس ہیں جو صرف مرکزی حکومت کے تحت ہوتی ہیں۔ اس طرح ہر ریاست کی اپنی سرویسیں بھی ہوتی ہیں۔

جس وقت ہندوستان کے آئین پر آئین ساز اسمبلی میں بحث ہورہی تھی، اس وقت کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے افسر شاہی کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ 10 اکٹوبر 1949 کو انہوں نے کہا تھا کہ ایک نڈر اور بے باک سروس جمہوریت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس سرویس کے ممبروں کو اپنی رائے دینے کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔" اسی لئے ان خدمات کے لئے انتخاب کا ایک [illegible] سسٹم بنایا گیا۔ انہیں دباؤ کے بغیر غیر جانبدار طریقے سے خدمات انجام دینے کے لئے اور سیاسی تانا شاہی سے بچانے کے لئے ان کی خدمات کی شرائط اور مقررہ میعاد کے تحفظات دیئے گئے۔ دوسری طرف خدمات بخوبی انجام دینے کے لئے انہیں معیاری اطوار اور چال چلن کا پابند بھی کیا گیا۔

نوکر شاہی، افسر شاہی کے تحت اور اس کی ہدایات کے مطابق کام کرتی ہے۔ جمہوریت میں افسر شاہی وزیروں کی وساطت سے عوام کو جوابدہ ہوتی ہے۔ افسر شاہی راست کابینہ کے تحت کام کرتی ہے۔ اگرچہ پالیسی کی تشکیل عوام کے منتخبہ نمائندے وزیر کرتے ہیں لیکن دراصل پالیسی کی محرک افسر شاہی ہوتی ہے۔ تشکیل کے بعد وہ پالیسی کو روبہ عمل لانے کے لئے بہترین ذرائع اور طریقے ڈھونڈتے ہیں۔ کسی فیصلہ پر عمل کے نتائج اور عواقب کے بارے میں بھی وہ اپنے وزیر کو صلاح و مشورہ اور وارننگ بھی دیتے ہیں لیکن بالآخر وہ وزیر اور کابینہ کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد کی نسل کے سیاست دانوں نے افسر شاہی کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے ملحوظ خاطر رکھا لیکن گذرتے وقت کے ساتھ اس رویہ میں تبدیلیاں آتی گئیں حتیٰ کہ وزیروں نے پالیسی پر دھیان دینے کے بجائے روزمرہ کے کاموں میں دخل اندازی شروع کردی۔ کئی وزیروں کا کہنا تھا کہ اگر ہم ایسے چھوٹے کام بھی نہیں کرسکتے تو ہمیں وزیر بننے کا کیا فائدہ ہوا۔

آندھرا پردیش کے محکمہ ہیلتھ میں پچاس ہزار سے زیادہ لوگ کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں میں سے بہت سے لوگوں کی کوشش

ہوتی ہے کہ ان کا تبادلہ کسی بڑے شہر سے باہر نہ ہو۔ میرا ایک وزیر پالیسی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا، لیکن تبادلوں کے احکامات جاری کرتا رہتا تھا۔ میں نے تنگ آکر احکام جاری کئے کہ تبادلوں کا کام وزیر کو سونپ دیا گیا ہے، اس کے لئے ڈاکٹروں کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ مرضی پر ہی حکم دے دیتا تھا۔ اس لئے اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ڈاکٹر کا تبادلہ صبح ہوا اور شام کو منسوخ ہوگیا۔

ہم نے کابینہ کی منظوری کے بعد یہ پالیسی بنائی کہ جو ڈاکٹر دو سال کی چھٹی لے کر مشرق وسطیٰ جاکر نوکری کرلیتے تھے، وہ اگر چھٹی کی میعاد کے اختتام پر سر دیس سے رجوع نہ ہوں تو انہیں برخواست کردیا جائے گا۔ اس طرح ہم نے تقریباً ایک سو ڈاکٹروں کو برطرف کردیا۔ اس کے بعد جب اگلا کیس آیا تو اس پر وزیر نے لکھ دیا کہ اس ڈاکٹر کو وارننگ دے دی جائے۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر ناانصافی ہوگی لیکن وزیر اپنے حکم پر قائم رہا۔ اس پر میں نے فائل چیف منسٹر کو بھیج دی۔ انہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ اس پر وزیر نے میرے خلاف چیف منسٹر کے کان بھرنے شروع کردیئے۔ چند مہینوں کے بعد وزیر کو چیف منسٹر کے خلاف سازش کے شک میں برطرف کردیا گیا۔

نیا وزیر اپنے ایک چہیتے جونیر افسر کو ترقی دینا چاہتا تھا لیکن میں نے کہا کہ قاعدہ کی رو سے یہ ممکن نہیں۔ جب اس کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو پھر اس نے مجھ سے درخواست کی کہ کسی طرح اس کو ترقی دے دی جائے۔ میں نے پھر کہا کہ "یہ ممکن نہیں" اس پر اس نے بھی شکایتوں کا سلسلہ شروع کردیا۔

ان مثالوں سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "افسر شاہی" کو غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے میں کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے خلاف بھی میں کئی مثالیں دے سکتا ہوں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ کئی وزیر بھی اصول پسند ہوتے ہیں۔ جب میں بلدیہ میں اسپیشل آفیسر تھا تو اس وقت کے وزیر اعلی وینگل راؤ اور وزیر چلا سبا راؤ نے میری بھرپور پشت پناہی کی۔ انہوں نے کبھی بھی کسی کام میں دخل اندازی نہیں کی، اور آخر میرا تبادلہ میری ہی درخواست پر کیا گیا۔

ایک بار انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں میرے ایک وزیر نے مجھ سے میرے محکمہ کے ایک ملازم کی ترقی کی سفارش کی۔ اپنے مفاد کے لئے سیاسی سفارش کروانا سروس کے ضابطہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اسی بناء پر میں نے اس ملازم کو چارج شیٹ کردیا۔ اگلے دن وزیر نے مجھ کو بلاکر کہا کہ "میں نے تو اس کی ترقی کی سفارش کی تھی اور آپ نے اسے چارج شیٹ کردیا۔" میں نے اسے سروس رول سمجھایا تو وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب میرا تبادلہ ہوجائے گا لیکن کچھ نہیں ہوا۔ میں وہاں مزید چار سال رہا اور اس وزیر کے ساتھ تاحیات میرے تعلقات بہت اچھے رہے۔ اس کے بعد کبھی کسی وزیر نے مجھ سے سفارش نہیں کی۔

وزیر اور افسر شاہی کا رشتہ بڑا اہم اور نازک ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا ضروری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ افسر شاہی کو عوام کے احساسات اور مشکلات کا علم کم ہوتا ہے۔ منتری سرکاری طور طریقوں سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ انگلستان کے ایک وزیر "بٹلر" نے اپنے محکمہ کے سکریٹری سے کہا تھا کہ "میرا کام آپ کو یہ بتانا ہے کہ عوام کیا برداشت نہیں کریں گے۔" یہ فطری بھی ہے کیونکہ منتری اور عوام کا باہمی ربط گہرا ہوتا ہے۔ ایک بار مجھے آنجہانی انجیا نے سمجھایا تھا کہ افسر لوگ تو درخواست گزاروں کو کہہ سکتے ہیں کہ ہم مل نہیں سکتے۔ اگر میں باتھ روم میں بھی ہوں تو میرے ملنے والے دروازہ کھول کر اندر آجاتے ہیں۔ اکثر لوگ وزیر کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام افسر شاہی کو قابو میں لانا ہے۔ اس کے برعکس افسروں کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ وزیر کو جتنا اندھیرے میں رکھا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ایسے رویے سے باہمی تناؤ بڑھتا ہے۔

مجھے اپنی سروس کے دوران اچھے اور برے دونوں قسم کے وزیروں سے سابقہ پڑا ہے لیکن میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ہمارا باہمی رشتہ "رقابت" کا نہ ہو بلکہ اشتراک کا ہو۔ کئی بار مجھ سے بھی غلطیاں ہوئی ہوں گی لیکن جان بوجھ کر نہیں اور ایک آدھ واقعہ کو چھوڑ کر کسی وزیر یا وزیر اعلیٰ نے مجھے کوئی سبق سکھانے کی کوشش نہیں کی۔

جمہوریت میں جلد بازی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے طریقہ کار میں ہی تاخیر کا پیوند لگا ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ جمہوریت میں حکومت ہر فیصلہ کے لئے جوابدہ ہوتی ہے۔ آج کل میڈیا کی وجہ سے یہ جوابدہی اور بھی تیکھی ہوگئی ہے۔ اس لئے افسر شاہی پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔ اس کے خلاف عوامی نمائندے جلدی میں ہوتے ہیں۔ یہ بھی باہمی تناؤ اور ٹکراؤ کی ایک وجہ ہوتی ہے۔ جب چائے بہت گرم ہو تو اسے طشتری میں ڈال کر اور پھونک کر پیا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹھنڈی جمہوریت میں وزیر گویا پیالہ اور افسر شاہی طشتری ہوتے ہیں۔

تمام افسر ذہین، محنتی اور دیانت دار نہیں ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقریباً 25 فیصد افسر ایسے ہوتے ہیں۔ ایک چوتھائی عامیانہ اور باقی کے پچاس فیصد ہر قسم کے عیبوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا معیار ذرا زیادہ کڑا ہو لیکن اکثر حکومتیں پچیس فیصد افسروں کے بل بوتے پر ہی چلتی ہیں۔ اگر افسر شاہی کو بالکل آدھا کردیا جائے تو سرکار کے کاموں میں بہتری آئے گی۔ یہی پچیس فیصد افسر کا ہے بگاہے مشکل میں پڑجاتے ہیں۔ وہ ہر حکم پر سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ وہ وزیر کی ہر بات پر "یس سر" نہیں کہتے۔ وہ ان کی من مانیوں میں حائل ہوتے ہیں اور وہ افسر "نو سر" کہتے ہیں۔

اس کے برخلاف کچھ ایسے بھی افسر ہوتے ہیں جو ہر وزیر کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں اور بخوشی ان کی سازشوں میں ملوث ہوجاتے ہیں۔ وہ ہر بات میں یس سر کہتے ہیں۔ ایسے افسر خطرناک ہوتے ہیں اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں۔

بی بی سی نے کچھ برس پہلے ایک دلچسپ سیریل "یس منسٹر" دکھایا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح وزیر اپنے افسروں کے بغیر مشکلوں میں پھنس جاتا ہے۔ لیکن افسر اگر زیادہ چالاکی دکھائے تو ایک ہوشیار وزیر اسے راہ راست پر بھی لاسکتا ہے۔

اکثر عوام سیاست دانوں کے "جرائم" کے لئے افسر شاہی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ افسران وزیروں کو ایک حد تک روک سکتے ہیں۔ انہیں وارننگ دے سکتے ہیں لیکن اگر وہ کسی بات پر تل جائیں تو اس کے لئے افسر ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ کئی بار وزیر اپنی من مانی کرنے کے لئے افسروں کے تبادلے کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کئی افسر گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور اس کا خمیازہ انہیں بعد میں بھگتنا پڑتا ہے۔

ایک بار مجھے ایک غیر متعلقہ وزیر نے کسی معطل شدہ افسر کو بحال کرنے کے لئے کہا۔ میں نے جواب دیا کہ معطل کرنے سے پہلے اس کیس کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور کیا جاچکا ہے۔ ہاں اگر اس میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو اسے دیکھا جاسکتا ہے۔

وزیر نے کہا: "یہ حکومت کے وقار کا معاملہ اور میں بحیثیت وزیر کہہ رہا ہوں۔"

میں نے جواب دیا: "وقار تو تب متاثر ہوگا اگر بغیر کسی وجہ سے اسے بحال کردیا جائے۔" جب وہ زیادہ غصے میں آیا تو میں نے کہا: "آپ میرے وزیر کو لکھ بھیجئے کہ میں نے آپ کا حکم نہیں مانا۔" کچھ مہینوں کے بعد وہ وزیر برطرف کردیا گیا لیکن یہ محض اتفاقیہ بات تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میرا تبادلہ کروادیتا۔"

ایسی بات نہیں کہ اعلیٰ سطح کے تمام افسر دودھ سے دھلے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی کافی کالی بھیڑیں ہوتی ہیں۔ لیکن عوام حکومت کو نچلی سطح کی بیوروکریسی، نوکر شاہی، کلرکوں اور انسپکٹروں کے رویہ سے جانچتی ہے۔ انتظامیہ کی اس سطح کو انگریزی میں Cutting Edge کہا جاتا ہے۔ عوام کی پریشانی اس سطح کی نوکر شاہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کاروبار میں "معمول" یا "ہفتہ" دینا پڑتا ہے۔ ہر کام کے

لئے کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے اور ان کو ہٹانا آسان نہیں۔ کرپشن ہماری گھٹی میں ہے۔ ہم نے کرپشن کے لحاظ سے حکومتوں اور ملکوں کا سروے کیا ہے۔ اس کے مطابق ہم دنیا کے 100 ممالک میں سے 26 ویں نمبر پر آتے ہیں۔ کرپشن کا الزام عموماً نوکر شاہی پر لگایا جاتا ہے، لیکن ہمارا پورا سماج کرپٹ ہے۔ سبزی فروش، ردی خریدنے والا، دوکان دار، آٹو ڈرائیور، پرائیویٹ اسکول میں ڈونیشن لینے والے یا کسی بھی غیر سرکاری شخص کو لیجئے، کیا وہ کرپشن کا ملزم بلکہ مجرم نہیں؟ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ جب شادی کے لئے لڑکے کے بارے میں بات ہوتی ہے تو فخریہ کہا جاتا ہے کہ لڑکے کی تنخواہ تو بہت زیادہ نہیں لیکن "اوپر" سے کافی کما لیتا ہے۔ اس لئے کرپشن کم کرنے کے لئے سماج کی اصلاح کی مہم کی ضرورت ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیورو کریسی میں سدھار نہیں لایا جاسکتا۔ کئی غیر سرکاری ادارے مثلاً "لوک ستا" وغیرہ اس میدان میں کام کررہے ہیں۔ حکومتیں بھی کئی قسم کے قانون بنارہی ہیں۔ مثلاً آندھرا پردیش میں وژن 2020 دستاویز جاری کیا گیا ہے۔ اس کے تحت Right to Information Act نافذ کیا جائے گا۔ ٹاملناڈو نے یہ Act نافذ کردیا ہے۔ اس کے علاوہ شہری حقوق کے چند محکموں نے بھی جاری کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کام کمپیوٹر سے کئے جائیں گے جس سے حکومت کی کارکردگی میں بہتری آنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن کمپیوٹر کو چلانے کیلئے ہاتھ کی ضرورت ہے۔ ہاتھ جسم کے ساتھ لگا ہوا ہے اور جسم انسانی دماغ کے تابع ہے اور انسانی دماغ میں ہی کرپشن بھی رہتی ہے۔ اس لئے جب تک دماغ کی "صفائی" نہ کی جائے کرپشن کا صفایا مشکل ہے۔ اس کے لئے ایک اصول پسند اور سخت رویہ والی حکومت کی ضرورت ہے۔ یہ کام ملی جلی (کولیشن) سرکار کے لئے مشکل ہے۔ اس کی بنیاد اور بقاء مصلحت پر مبنی ہے۔ اور مصلحت سے کرپشن ختم نہیں ہوتی۔

تو کیا ڈکٹیٹر شپ حالات سدھار سکتی ہے؟ تاریخ میں آج تک کوئی ایسا ڈکٹیٹر پیدا نہیں ہوا جو جلد یا بدیر کرپٹ نہ ہوگیا ہو۔ اس لئے ہمیں کرپشن اور دوسرے مسائل کا علاج جمہوریت کے ڈھانچہ میں ہی ڈھونڈنا ہوگا۔ اس مہم میں سیاست دانوں اور بیورو کریسی کو مل جل کر کام کرنا ہوگا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ سیاست اور بیورو کریسی میں ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جائے جو آدرش وادی اور اصول پرست ہوں، جو یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اس جگہ کو جیسا پایا تھا اسے اس سے بہتر حالت میں چھوڑ رہے ہیں۔ "ایڈمنڈ برک" نے کہا تھا کہ بدی کے پنپنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ نیک لوگ کچھ نہ کریں اور جہاں برے لوگ آپس میں گٹھ بندھن کریں وہاں اچھے لوگوں کا بھی تعاون و اشتراک ضروری ہوجاتا ہے۔ کیا ہم اس کے لئے تیار نہیں؟ ☆

مجتبیٰ حسین

آئی اے ایس افسر کی ٹانگ

دیکھتے ہی دیکھتے خود ہماری نظروں کے سامنے ہماری جمہوریت کے اوپر سے پچاس برس بیت گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جمہوریت کے ہاتھوں قوم پر جو کچھ بیتی ہے یا بیت رہی ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ہماری نظر میں جمہوریت کا مطلب اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ سال کے سال یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک پریڈ کا اہتمام کیا جائے اور اس کے بعد جب بھی پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد ہو تو شور شرابا اور ہنگامہ برپا کیا جائے۔ نئی نئی پارٹیاں بنائی جائیں اور لیڈر لوگ ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جاتے رہیں۔ سرکاریں گرائی جائیں اور اقدار کی مٹی پلید کی جائے۔ ہمیں دہلی میں رہتے ہوئے 28 برس بیت گئے۔ اس لمبے عرصہ میں ہم صرف ایک مرتبہ ہی یوم جمہوریہ کی پریڈ کو دیکھنے گئے تھے۔ اول تو یہ پریڈ دہلی کی شدید سردی میں آراستہ کی جاتی ہے جس کی وجہ سے جمہوریت کے ساتھ ساتھ ہر چیز ٹھٹھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی ہماری ہمت نہ ہوئی کہ اس پریڈ کو دیکھنے جائیں۔ اس ملک میں جمہوریت کو ٹھٹھرنا ہے تو وہ ٹھٹھرتی رہے۔ ہم کیوں بلاوجہ ٹھٹھریں۔ جمہوریت کے ہاتھوں سال بھر تو یونہی ٹھٹھرتے رہتے ہیں۔ پھر اس میں جو جھانکیاں نکالی جاتی ہیں ان کا کوئی مطلب ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ یوم جمہوریہ کی کسی پریڈ میں آج تک ہمیں ایسی کوئی جھانکی نظر نہیں آئی جس میں عام آدمی کے مسائل اور اس کے دکھ درد کو پیش کیا گیا ہو۔ ہمارا بس چلے تو ایک جھانکی "رشوت ستانی" کی نکالیں جس میں یہ دکھایا جائے کہ کس کس طرح عام آدمی سے رشوت لی جاتی ہے۔ "ملاوٹ" کی بھی ایک شاندار جھانکی ہو سکتی ہے۔ ایک جھانکی اس "مردنی" کی نکالی جائے جسے وہ وقت حاصل کرنے کی خاطر ہمارا عام آدمی کتنا ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ایک جھانکی پارٹیاں بدلنے والے لیڈروں کی نکالی جائے بلکہ فوج کے ساتھ ساتھ ان لیڈروں کے ایک دستہ کو بھی مارچ پاسٹ میں شامل کیا جائے اور ان کے عین پیچھے ننگے بھوکے انسانوں کا ایک دستہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ قاتلوں، شرپسند عناصر، فرقہ پرستوں اور منافع خور تاجروں کے دستے بھی پریڈ میں ضرور شامل ہوں۔ جہیز نہ لانے والی لڑکیوں کو جلانے کی ایک جھانکی بھی شامل ہونی چاہئے۔ سچ پوچھئے تو ایسی جھانکیوں کے بغیر ہماری جمہوریت کی تصویر کہاں مکمل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "جشن جمہوریہ" کے دن ہم کچھ بھی نہیں کرتے کیوں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دن کیا کریں۔ پہلے کبھی ٹیلی ویژن پر اس پریڈ کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ اب وہ بھی چھوڑ دیا ہے چنانچہ اس یوم جمہوریہ کے موقع پر یونہی وقت گزارنے کے لئے ہم نے اخبار پڑھنا شروع کیا تو ہماری نظر ایک خبر پر پڑی۔ جس کے مطابق بہار کے محکمہ سرکاری زبان کے سکریٹری اور سینیئر آئی اے ایس عہدیدار مسٹر بی کے ورما نے سکریٹری امور داخلہ کو ایک خط لکھ کر آگاہ کیا ہے کہ بہار کے وزیر سرکاری زبان روپ نارائن جھا ان کی ٹانگ توڑنے کی دھمکی دے رہے ہیں (حالانکہ سرکاری زبان کا محکمہ اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ سب مل کر سرکاری زبان کی ٹانگ توڑیں) خبر کے مطابق مسٹر روپ نارائن جھا نے ایک دن دوپہر کے وقت سخت غصہ کی حالت میں مسٹر بی کے ورما کو فون کر کے کہا "ہم تمہاری ٹانگ توڑ دیں گے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ اتنا سننے کے بعد مسٹر ورما عجلت ممکنہ اپنی ٹانگوں کی مدد سے چل کر اپنے گھر چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے مذکورہ بالا خط سکریٹری امور داخلہ کو روانہ کر دیا۔ مسٹر ورما کا کہنا ہے کہ وزیر سرکاری زبان اکثر اوقات ان سے ایسے کام کرنے کو کہتے ہیں جو سرکاری قواعد کے مطابق جائز نہیں ہوتے۔ مسٹر ورما

بھی ایسے احکامات کی تعمیل سے معذوری ظاہر کرتے ہیں تو وزیر سرکاری زبان ناراض ہوجاتے ہیں اور اب تو وہ مسٹر ورما کی ٹانگ توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مسٹر ورما نے اپنے خط میں یہ گزارش کی ہے کہ ان کی ٹانگوں کی حفاظت کے لئے مناسب سکیوریٹی کا بندوبست کیا جائے اور جب تک یہ بندوبست نہیں کیا جاتا تب تک وہ دفتر نہیں جائیں گے۔ دیکھا جائے تو مسٹر ورما کی گزارش نہایت جائز ہے کیوں کہ ایک آئی اے ایس عہدیدار کی شخصیت میں ٹانگ ہی ایک ایسا عضو ہوتا ہے جسے بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور جب ٹانگ کا وجود ہی خطرہ میں پڑجائے تو بیچارہ آئی اے ایس عہدیدار اپنی باقی ماندہ شخصیت کو لے کر کیا کرے۔

جس کو ہو اپنی ٹانگ عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

ماشاء اللہ زندگی میں کئی آئی اے ایس عہدیداروں سے ہمارے بھی مراسم رہ چکے ہیں جیسے بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، ہاشم علی اختر، خواجہ عبدالغفور، حسن الدین احمد وغیرہ۔ خدا کے فضل سے ان شریف النفس عہدیداروں کا شمار ان آئی اے ایس عہدیداروں میں ہوتا تھا جنہوں نے زندگی بھر اپنی ٹانگوں کا استعمال اسی مقصد کے لئے کیا جس مقصد کے لئے قدرت نے انہیں ان کے جسموں میں پیوست کردیا تھا یعنی صرف چلنے پھرنے کے لئے۔ انہوں نے کسی معاملہ میں اپنی ٹانگ نہیں اڑائی حالانکہ بعض آئی اے ایس عہدیداروں کی شہرت جسے آپ بدنامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی ٹانگ کی وجہ سے ہوتی ہے جو ہر اچھے بھلے معاملہ میں بلاوجہ اڑ جاتی ہے۔ کتنے ہی ضرورت مندوں اور غرض مندوں کے کام آئی اے ایس عہدیداروں کی اس ٹانگ کی وجہ سے رکے رہتے ہیں۔ کئی برس پرانی بات ہے۔ ایک بار کسی چھوٹے سے کام کے سلسلہ میں ہم بے خیالی میں ایک آئی اے ایس عہدیدار کے کمرہ میں چلے گئے تھے۔ پہلے تو انہوں نے بڑے غصہ کے ساتھ ہمیں دیکھا اور جب ہم نے اپنے کام کی بات کی تو بولے "آپ اجازت لئے بغیر میرے کمرہ میں کیسے آگئے ؟"

ہم نے کہا: "مگر اب تو ہم آپ کے کمرہ میں آچکے ہیں۔ اب کیا ہوسکتا ہے "

بولے : "تب تو آپ کمرہ سے باہر جاکر دوبارہ اجازت لے کر آئیں"۔

ہم نے کہا: "اگر آپ ہمارا کام کرنے کا وعدہ کریں تو ہم دوبارہ اجازت لے کر آپ کے کمرہ میں آنے کو بھی تیار ہیں ورنہ ہمارے دوبارہ یہاں آنے کا کیا فائدہ"

بولے : "پہلے آپ اجازت لے کر آیئے تو سہی۔ کام اگر جائز ہوا تو کردیں گے۔ ابھی سے ہم کیسے وعدہ کردیں"۔

اور ہم الٹے پاؤں وہاں سے نکل آئے۔ اتفاق سے ان کے افسر بالا جو خود بھی آئی اے ایس عہدیدار ہونے کے علاوہ ان کے محکمہ کے سکریٹری بھی تھے ہمیں اچھی طرح جانتے تھے۔ ہم نے سوچا تھا کہ اتنے معمولی سے کام کے لئے انہیں کیا زحمت دیں۔ سو ہم وہاں سے نکل کر سیدھے سکریٹری کے کمرہ میں اجازت لئے بغیر چلے گئے۔ بہت خوش ہوئے، چائے منگائی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اتنے میں عہدیدار موصوف بھی ڈرتے سہمتے ہوئے سکریٹری کے کمرہ میں چلے آئے۔ (یہ اور بات ہے کہ اجازت لے کر آئے تھے) سکریٹری نے جب ہم سے ان کا تعارف کرانا چاہا تو ہم نے کہا: "حضور ہم انہیں اچھی طرح جانتے ہیں"۔

اب یہ سکریٹری کی بڑائی تھی کہ انہوں نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ ہم انہیں کیسے جانتے ہیں۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ سکریٹری کے پاس ایک ایسی ٹانگ تھی جو صرف چلنے پھرنے کے کام آتی تھی جب کہ ان کے جونیر عہدیدار کے پاس ایسی ٹانگ تھی جو اڑانے کے کام آتی ہے۔ بہرحال آئی اے ایس افسر کی ٹانگ کی اپنی ایک الگ اہمیت ہوتی ہے لیکن بہار کے سکریٹری سرکاری زبان مسٹر ورما کا معاملہ دوسرا ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کا وزیر ہر معاملہ میں غلط ٹانگ اڑا رہا ہے تو انہوں نے

اپنی آئی اے ایس ٹانگ بھی اڑا دی ۔ اسے کیا کہیے کہ اب ہماری جمہوریت میں وزیر کی ٹانگ کو عہدیدار کی ٹانگ پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وزیر اپنی ٹانگ اڑانے کی خاطر آئی اے ایس عہدیدار کی ٹانگ کو توڑنا شروع کردیں۔ مانا کہ حکومت آئی اے ایس عہدیدار کی ٹانگ کی حفاظت کے لئے کسی محافظ کا بندوبست کردے گی لیکن اگر وزیر نے ان کی ٹانگ کی بجائے ان کے جسم کے کسی اور عضو کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا تو کیا ہوگا۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ آئی اے ایس عہدیدار کے ہر عضو کی حفاظت کے لئے ایک الگ محافظ مقرر کیا جائے ۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال بھی دسمبر کے مہینہ میں ہی جب راجستھان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی تو وہاں کے وزیر آب پاشی نے اپنے محکمہ کے سکریٹری اور سینئیر آئی اے ایس عہدیدار مسٹر پی کے دیو کی پٹائی کی تھی۔ نہ صرف پٹائی کی تھی بلکہ اس عہدیدار کا ایک انگوٹھا بھی غالباً اس غلط فہمی میں توڑ دیا تھا کہ کہیں عہدیدار بھی ان کی طرح انگوٹھا چھاپ نہ ہو۔ معلوم ہوا تھا کہ اس وزیر نے اس سے پہلے بھی کئی آئی اے ایس عہدیداروں کی پٹائی کی تھی۔

یوم جمہوریہ کے موقعہ پر ہمیں یہ باتیں اس لئے یاد آئیں کہ جب اس ملک میں آئی اے ایس عہدیداروں کے جمہوری حقوق تک محفوظ نہیں ہیں تو وہاں ہم جیسوں کے جمہوری حقوق کے بارے میں کون سوچے گا۔ ایسی ہی وجوہات ہیں جن کے باعث جمہوریت پر سے ہمارا اعتقاد اٹھتا چلا جارہا ہے ۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی کی ٹانگ ٹوٹے یا نہ ٹوٹے ہماری جمہوریت کی ٹانگ تو آئے دن ٹوٹتی چلی جارہی ہے بلکہ ہمیں تو حیرت ہے کہ اب تک کس طرح چل رہی ہے ۔ ☆

یوسف ناظم

چاندی کے ورق والی مٹھائی

یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی خاص اہمیت ہے کیوں کہ جب سے روپیہ گردش میں آیا ہے گردش ہی کررہا ہے۔ کبھی نظر میں آتا ہے اور کبھی نہیں۔ پوشیدہ روپیہ بھی اکثر صورتوں میں اس پھول کی طرح ہوتا ہے جو ہرے ہرے پتوں میں چھپا رہتا ہے لیکن کب تک۔ جن لوگوں نے اپنی دولت زیرزمین دفن کرکے رکھی تھی وہ انڈر گراونڈ دولت بھی لاتعداد سڑکیں اور بے انتہا عمارتیں بن جانے کی وجہ سے غیر مستحق لوگوں کے ہاتھ لگ گئی اور سرکار کو قانون بنانا پڑا کہ اس دولت پر بھی سرکار کا حق ہے۔ چلئے جرائم کی فہرست میں ایک جرم کا اضافہ ہوگیا۔ یہ واقعہ جس کا ہم ذکر کرنا چاہ رہے ہیں ہماری راجدھانی میں وقوع پذیر ہوا اور ایک وزیر کے گھر پر خود انہی کے مہمانوں کی موجودگی میں۔ شاید دوپہر کے کھانے کا وقت تھا اور وزیر موصوف نے کسی خوشی کے موقع پر اپنے دوستوں اور پرستاروں کو مدعو کر رکھا تھا۔ (وزیروں کے پرستار بھی ان کی "اداکاری" کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں) ہوا یوں کہ جب معزز میزبان نے مٹھائی کا ایک ڈبہ کھولا (یا ڈبہ خود کھل گیا) تو اس میں سے ہرے ہرے کرارے کرنسی نوٹ جھانکنے لگے جو کوشش کے باوجود چھپائے نہ جاسکے۔ یہ پانچ سو روپے کے نوٹ تھے اور تعداد میں اتنے تھے کہ ان کا حاصل جمع دس لاکھ تک پہنچتا تھا۔ اس رقم کو بعض لوگ خطیر کہتے ہیں اور بعض لوگ حقیر۔ اب یہ تو لینے اور دینے والے کی حیثیت پر منحصر ہے کہ اسے کس لقب سے یاد کیا جائے لیکن ایسے واقعے کی نظیر بہرحال تلاش پر بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ برسرعام ایسے تحفے اچھے نہیں معلوم ہوتے حالانکہ جس کسی نے بھی مٹھائی کے اس ڈبے کو دیکھا اس کا جی یہی چاہا کہ کاش وزیر محترم یہی مٹھائی مہمانوں میں تقسیم کرتے۔ ان کی یہ خواہش گو زبان پر نہیں آئی لیکن آنکھیں بہرحال بولتی اور گنگناتی رہیں۔ دو چار مہمانوں کی تو رال بھی ٹپکی جو معزز میزبان کے سفید براق کرتے کے دامن کو تر کرگئی۔ موصوف سمجھے کہ یہ شاید ان کے پسینے کے قطرے ہیں جو ان کی پیشانی پر اچانک نمودار ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنے رومال سے اپنی بھیگی ہوئی پیشانی پونچھی اور مہمانوں سے کہا یہ ڈبہ انہیں بستی کے کسی تاجر نے بھیجا تھا لیکن اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا کیوں کہ یہ نہ تو الیکشن کا موقع ہے نہ پارٹی فنڈ جمع کرنے کی مہم۔ مہمان وزیر موصوف کی پختہ دماغی کے قائل تو تھے ہی ان کی حاضر دماغی کے بھی قائل ہوگئے۔ لیکن جو لوگ اس موقعے پر موجود نہیں تھے انھوں نے جب اس خوش گوار واقعے کی خبر سنی تو ان میں سے بہتوں نے یہ کہا کہ بھئی ٹوپی میں سے خرگوش کا برآمد ہونا تو ہم نے سنا تھا لیکن مٹھائی کے ڈبے میں سے دولت؟ یہ کون سا جادو ہے۔ اس سرکار نے تو بنگال کے جادوگر سرکار کی ہوا نکال دی!

ہمارا خیال ہے یہ مٹھائی کا ڈبہ نئے ہزارہ اور نئی صدی کی ایجادات میں سے ایک بلکہ پہلی ایجاد ہے۔ پچھلے ہزارے میں ہم لوگ یعنی ذہین لوگ، صرف بریف کیس، استعمال کرتے تھے۔ بعد میں اس بریف کیس نے اٹیچی کیس اور پھر سوٹ کیس کی صورت اختیار کی لیکن جب یہ تینوں کیسس، کسی سرکاری دواخانے کے مریضوں میں شامل، سیریس کیس بن گئے اور ان کی شناخت آسان ہوگئی۔ آسان ہوگئی کا مطلب یہ ہے کہ ہر بریف کیس کو شبہے کی نظر سے دیکھا جانے لگا تو اہل ہنر نے چند دوسرے نسخے آزمانے شروع کیے۔ انھی نسخوں میں سے ایک نسخہ مٹھائی کا ڈبا ہے۔ کارڈبورڈ کے ایک ڈبے میں "کہنے کو مٹھائی ہے کھلنے پر خزانہ ہے" ہم چاہیں گے

کہ مٹھائی کی ایسی دو کانیں جگہ جگہ کھلیں اور ایسے ڈبے ہر گھر میں کم سے کم سال میں ایک مرتبہ تو پہنچیں اور ہم کہہ سکیں۔ نیا سال مبارک ہو!

لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر نیا سال، سب کے 12 کیوں بجادیتا ہے۔ ہوتے تو یہ شب کے بارہ ہیں لیکن سب کے بارہ بھی یہی ہیں۔ (یہ فرق جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کرچکے ہیں۔ دو علاقوں کا ہے ایک علاقہ بنگال ہے دوسرا گجرات)۔ اہل بنگال سین کو شین اور اہل گجرات شین کو سین بولتے ہیں۔ کسی بھی بنگالی باشندے سے کہئے "ہیپی نیو ایر ٹو یو" وہ جواب میں کہے گا "شیم ٹو یو" جب کہ اہل گجرات کسی کو شربت نہیں پلاسکتے سربت پلاتے ہیں اور بے حد خوش ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ہمارا تلفظ بھی علیحدہ علیحدہ کلچر کا نشانِ شناخت ہے۔ اہلِ حیدرآباد میں اکثر زعمائے قوم قاف کی خیریت کا لحاظ نہیں رکھتے اسی طرح اہل پنجاب قاف کو درجہ کمال پر پہنچادیتے ہیں۔ تلفظ اور لہجے کا کلچر خواہ کچھ ہو، پورے ملک میں مٹھائی کا کلچر یکساں ہے۔

بڑے شہروں میں لوگ کسی نہ کسی وجہ سے پریشان رہتے ہی ہیں۔ دلی میں لوگ اس وقت صرف سردی کی وجہ سے پریشان ہیں ان کی پریشانی یہ بھی ہے کہ ممبئی کے جس تاجر نے مٹھائی کا یہ ڈبہ، موصوف کو تحفے میں بھیجا اس کا اسم شریف اور پتہ کیا ہے۔ لوگوں کو یقین ہے کہ اس گمنام لیکن اعلیٰ مقام شخص کے گھر پر فیاکس بھی ہوگا اور انٹرنیٹ بھی۔ یہ انٹرنیٹ پتہ نہیں جال ہے یا جعل۔؟

اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی آخری بات بھی ہونی چاہئے۔ وہ آخری بات یہ ہے کہ چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی مٹھائی آپ نے بھی چکھی ہوگی۔ وہ بھی کوئی مٹھائی تھی۔ اصل مٹھائی تو یہ تھی کہ ڈبے میں صرف چاندی اور سونے کے ورق تھے۔ مٹھائی برائے نام تھی۔ ☆

افتخار وصی
بیتیا۔ بہار

بیسویں صدی کا المیہ

تاجروں کے ہاتھوں جب رسوا ہوا سرسوں کا تیل
ہو کے رسوا دیش کو رسوا کیا سرسوں کا تیل

گوشت مچھلی ہو کہ چٹنی سب کے سب ہیں بے مزہ
جب سے بازاروں سے غائب ہوگیا سرسوں کا تیل

تیل مالش کرنے والے مر رہے ہیں بھوک سے
ندیوں میں سیکڑوں ٹن بہہ گیا سرسوں کا تیل

جس نے کی اس میں ملاوٹ وہ نہیں پکڑا گیا
صرف پکڑا جارہا ہے جابجا سرسوں کا تیل

چاولوں کو چھوتا نہیں ہوں ڈراپسی کے خوف سے
تل کا سویا بین کا بادام کا سرسوں کا تیل

بڑھتی آبادی کو کم کرنے میں اس کا ہاتھ ہے
مہرباں ہندوستاں پر ہے بڑا سرسوں کا تیل

کس نے لی ہے سیکڑوں کی جان ناحق افتخار
جب کسی نے مجھ سے پوچھا کہہ دیا سرسوں کا تیل

●☆●

ڈاکٹر ظفر کمالی
Vill. Ranipur
P.O. Barharia,
Dist. Siwan
Bihar - 841232.

پیٹ کا ترانہ

سنیے فسانہ پیٹ کا	گا رہے ہیں ہم ترانہ پیٹ کا
سب عقیدت سے جھکائیں گردنیں	ہے مقدس آستانہ پیٹ کا
جس قدر پھیلائیے پھیلے گا وہ	ہے انوکھا شامیانہ پیٹ کا
توند کہتے ہیں جسے سب خاص و عام	وہ تو ہے نقار خانہ پیٹ کا
عاشقی ساری دھری رہ جائے گی	جب پڑے گا تازیانہ پیٹ کا
دور رہتا ہے سدا ہڑتال سے	کیوں ہمارا کارخانہ پیٹ کا
چور ڈاکو کا جسے خطرہ نہیں	وہ خزانہ ہے خزانہ پیٹ کا
دوستی کی ہیں کئی قسمیں مگر	سب سے افضل دوستانہ پیٹ کا
بھوکے بچے پوچھتے ہیں بار بار	کب بجے گا شادیانہ پیٹ کا
بھیجو کھانے کے اولمپک میں اسے	ہے کہاں دیسا یگانہ پیٹ کا

پیٹ پوجا میں ظفر معروف ہے
کیا کرے جب ہے زمانہ پیٹ کا

●☆●

رضوان اللہ، نئی دہلی

خودی کی تفسیر تازہ

خودی کیا ہے پرستاں میں پریدن
خودی کیا ہے گلستاں میں چمیدن
خودی ہے مالِ شیریں راچشیدن
خودی ہے خونِ ناحق راچکیدن

خودی ہر فن میں بازی مارتا ہے
خودی بے جا وجا للکارتا ہے

خودی ملت کا غم خاموش خوردن
جنازہ اس کا خود بردوش بردن
خودی ایواں میں جامہ دریدن
خودی ارکان ایواں راخریدن

خریدن کرسی صوفے میں خودی ہے
چریدن لنچ و بوفے میں خودی ہے

خودی کی آزمائش ہے الکشن
خودی پیما ہے مقدارِ کمیشن
خودی تسلیم کرتی ہے ڈونیشن
خودی اوروں کو رکھتی ہے اٹینشن

خودی قربان گاہِ ہمسراں ہے
حریفوں کے لئے برقِ تپاں ہے

خودی کی شرطِ اول ہے محبت
محبت پر بھی دولت کو ہے سبقت
خودی کو فقر سے پرخاش و نفرت
خودی کو نفس سے ملتی ہے قوت

جہانبانی خودی سے استعارہ
زیاں کاری خودی کا اک اشارہ

خودی پوشیدہ ہنر کارِ جنوں میں
خودی پوشیدہ خاکستر میں خوں میں
خودی پوشیدہ تخریب سکوں میں
خودی پوشیدہ پوشش زردگوں میں

خودی مسجد کو ملبے میں بدل دے
یہ وہ ہاتھی ہے جو چیونٹی کچل دے

خودی رقصیدنِ لالہ رخاں ہے
خودی ارزیدنِ رطل گراں ہے
خودی اندیشہ بے چارگاں ہے
خودی بے چارہ سیش و ناگیاں ہے

دواخانوں کے اندر لا دوائی
معالج کی خودی ہے بے لوائی

خودی تیشے میں ہے ترشول میں ہے
خودی پتھر میں جو تھی دھول میں ہے
خودی کی قاہری معمول میں ہے
خودی گندے کنول کے پھول میں ہے

غرض ہر سو خودی کی حکمرانی
خودی کی زد میں ہے یہ دارفانی

سکوں کا بے طرب ہونا خودی ہے
سحر کا تیرہ شب ہونا خودی ہے
فرد کا بے ادب ہونا خودی ہے
جنوں کا بے سبب ہونا خودی ہے

خودی انجام سے نا آگہی ہے
خودی خود سے بھی بے پروا رہی ہے

اظہر حسن صدیقی، کراچی، پاکستان

عادتوں کے غلام

وقت گزاری کے لئے یوں تو بہت سے مشغلے ہیں اور یار لوگ وقتاً فوقتاً ان کو اپناتے بھی رہتے ہیں مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ
ر آپ کو کسی جگہ انتظار کرنا پڑے یا پھر کہیں مجبوراً بیٹھنا پڑے اور وہاں آپ کے لئے کوئی دلچسپی کا سامان بھی نہ ہو تو سب سے اچھا
شغلہ یہ ہے کہ وہاں بیٹھے ہوئے یا آتے جاتے لوگوں کی عادات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنا شروع کردیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ ذرا
ر بعد ہی آپ کو یہ مشغلہ اتنا دلچسپ لگے گا کہ آپ کو وقت گزرنے کا بالکل احساس نہیں رہے گا۔ ایک بات جو آپ ان تمام
اتین و حضرات میں مشترک پائیں گے وہ یہ ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں آپ یہ محسوس کریں گے کہ ان میں سے اکثر لوگ کسی نہ کسی
اص عادت کا شکار ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو بالکل سیدھے سادھے طریقے پر تھوڑی دیر ہی نچلے بیٹھ سکیں یا بغیر کسی خاص
داز میں ہاتھ چلائے یا منہ بنائے بات چیت کرسکیں۔ یہ عادات صرف مردوں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہیں، عورتیں، بچے اور
ڑھے سب ان کا یکساں شکار ہیں بلکہ جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کی یہ عاداتیں اور زیادہ پختہ ہوتی جاتی ہیں۔ ایسی خواتین
حضرات میں دو باتیں ہم نے مشترک پائی ہیں ایک تو یہ کہ ان لوگوں کو اس بات کا ذرا احساس نہیں ہوتا کہ یہ لوگ ایسی کسی عادت
ں جتلا ہیں اور دوسری یہ کہ ایسی عادتیں چھوڑتے ہوئے بہت کم لوگوں کو پایا گیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے بعض لوگ تو ٹی وی پر
قاعدہ پروگراموں میں آتے رہتے ہیں اور پھر اپنی فلمیں بھی ضرور دیکھتے ہونگے۔ پھر جب سے وی سی آر اور ویڈیو ٹیپ کا سلسلہ چلا ہے
لوں کے ہاں شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کی بھی کافی فلمیں بنتی رہتی ہیں۔

سب سے زیادہ مختلف قسم کی عادتیں لوگ باگ باتیں کرتے وقت یا خالی بیٹھے ہوئے اختیار کرتے ہیں۔ ان میں سر فہرست
ت بات پر کندھے اچکا کر بات کرنا اور ہاتھوں کو مختلف انداز میں گھمانا پھیلانا اور چلانا شامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی ہاتھ
ت چیت کرتے وقت اور خصوصاً تقریر کے وقت بات کو موثر انداز میں اپنے سامعین تک پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں
ر کہی جانے والی بات کی اہمیت جتاتے ہیں مگر ایک ہی انداز میں بار بار ہاتھوں کا استعمال بہت ہی مضحکہ خیز لگتا ہے۔ اگر آپ کو
ماری بات کا یقین نہ آئے تو ایک روز کسی پیشہ ور مقرر کی تقریر ٹی وی پر آواز بند کرکے دیکھئے۔ انشاء اللہ اس کے بعد آپ کو کسی
احیہ پروگرام کو دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ بعض حضرات کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ خالی بیٹھے بیٹھے انگلیاں ہی چٹخاتے
ہتے ہیں یا ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں مختلف انداز میں پھنساتے رہتے ہیں یا ملتے رہتے ہیں یا تھوڑی تھوڑی دیر
ر جمائیاں لیتے رہتے ہیں۔ بعض حضرات کی یہ عادت ہوتی ہے کہ خالی بیٹھے انگلی سے خلاء میں تصویریں بناتے رہتے ہیں یا پھر لگتا ہے
کچھ لکھ رہے ہیں اور جب اپنا لکھا ہوا یا اپنی بنائی ہوئی تصویر پسند نہیں آتی تو اسے ہاتھ سے خلاء میں سے مٹا بھی دیتے ہیں۔ ہمارے دو
لیسے جاننے والے ہیں جو بات کرتے ہیں یا سوچتے ہیں اپنے سر کے پیچھے کے بالوں کی چند لٹوں کو پکڑ کر مروڑتے رہتے ہیں۔ بالکل ایسا
تا ہے گویا سر میں چابی دے رہے ہیں۔ ہم نے انہیں کئی بار ٹوکا بھی کہ اب بس کیجئے، آپ کافی چابی دے چکے ہیں، اب کچھ دیر
لیئے ان بالوں کی خطا معاف کردیجئے۔ ہمارے کہنے سے اس وقت تو انہوں نے بالوں کو فوراً چھوڑ دیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد دیکھا کہ انہوں
نے بے خیالی میں اور عادتاً پھر سے چابی دینی شروع کردی۔

ایک مشہور و معروف گلوکارہ ہیں جن کو آپ نے ثقافتی پروگراموں میں اکثر دیکھا ہو گا ورنہ پھر ٹی وی پر تو یقیناً دیکھا ہو گا۔ ان کے گانے کا ایک خاص انداز ہے۔ داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کھول کر چاروں انگلیوں اور انگوٹھے کو ملا کر آگے ہاتھ بڑھا کر گاتی ہیں گویا گانا ہتھیلی میں پیش کر رہی ہوں۔ ان کی یہ عادت اس قدر پکی ہے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ اگر وہ اب اپنا انداز بدلنا چاہیں تو شاید گانا ہی بھول جائیں۔ اسی طرح ایک اور گلوکارہ ہیں جو کلمے کی انگلی اور انگوٹھے سے چٹکی بنا کر گاتی ہیں۔ ہمیں اس بات کا مکمل یقین ہے کہ اگر کہیں گانا گاتے میں یہ چٹکی کھل جائے تو شاید گانا ان کے ہاتھ سے نکل جائے یا پھر سر ہاتھوں سے جاتے رہیں گے۔ ایک اور خاتون ہیں وہ جب تک ہر گانے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ناک کا ایک سرا نہ اچکائیں شاید ٹھیک سے گا ہی نہ سکیں گی بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ ٹھیک کیا بالکل نہ گا سکیں گی۔ کچھ یہی حال پوپ یا پھر پاپ میوزک والوں کا ہے کہ اگر ان کے ہاتھ پیر باندھ کر انہیں اسٹیج پر بٹھا دیا جائے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کے منہ سے آواز تک نہیں نکلے گی، گانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ کچھ موسیقاروں کو وقتاً فوقتاً گلا کھنکھارنے کی اس قدر عادت ہوتی ہے کہ اگر آپ چاہیں تو تھوڑی ہی دیر میں گھڑی دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ اب کتنے منٹ بعد وہ دوبارہ گلا صاف کریں گے۔ اسی طرح مختلف گانے والوں کو طرح طرح کے منہ بنانے اور ہونٹوں کو مختلف زاویوں سے ٹیڑھا کرنے اور سکوڑنے کی اس قدر پختہ عادت ہوتی ہے کہ اپنی اس عادت کو بار بار دہرائے بغیر وہ گانا گا ہی نہیں سکتے۔ جس طرح کوئی طبلچی چاہے اس نے کتنی ہی دیر تک طبلہ بجایا ہو جب بھی دوبارہ شروع کرے گا ہتھوڑی سے طبلے کی جوڑی کی دوبارہ تھوڑی دیر تک ضرور ٹھوکا پیٹی کرے گا۔ کچھ یہی حال لاؤڈ اسپیکر لگانے والوں کا ہوتا ہے کہ جب تک ہیلو ٹیسٹنگ ٹیسٹنگ ون ٹو تھری... نہ کرلیں ان کی تسلی نہیں ہوتی اور ٹیسٹنگ بھی ضروری ہے کہ بزبان انگریزی ہو گی خواہ بقیہ دیگر پروگرام کسی بھی دوسری زبان میں ہوں۔ آپ کراچی سے پشاور تک چلیں جائیں، اس عادت اور معمول میں ذرا بھی فرق نہیں پائیں گے۔

مختلف عادتوں کی غلامی کسی ایک مخصوص طبقہ یا گروہ پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ معاشرے کے ہر طبقے اور گروہ کے افراد اس کے شکار پائے جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان لوگوں کی عادتیں دوسرے گروہ کے لوگوں سے ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ کھلاڑیوں کا بھی اپنا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے جس کو وہ اس حد تک اپنائے رکھتے ہیں اور اس کے اس قدر پابند ہوتے ہیں کہ بغیر اس کو دہرائے وہ بالکل کھیل نہیں سکتے۔ اگر آپ کو کرکٹ کے مایہ ناز کھلاڑی حنیف محمد کا کھیل دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو گا تو آپ نے ضرور نوٹ کیا ہو گا کہ موصوف ہر گیند کھیلنے سے پہلے بلے کو ایک خاص انداز میں ضرور گھماتے تھے اور ایک ہاتھ سے ٹوپی کا اگلا سرا چھوتے تھے اور پھر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آگے بڑھ کر پچ پر سے خیالی گھاس پھوس صاف کرتے تھے اور یہ کام وہ جب تک کھیل سے ریٹائر نہیں ہوئے بڑی باقاعدگی سے سرانجام دیتے رہے۔

پاکستان کے ایک سابق فاسٹ بالر آصف مسعود کا بھی گیند پھینکنے کا ایک الگ طریقہ تھا۔ سب لوگ تو گیند پھینکنے کے لئے وکٹوں کی طرف دوڑتے ہیں اور پھر جا کر گیند پھینکتے ہیں مگر یہ صاحب بقول شخصے پہلے ریورس گیئر میں چلتے تھے یعنی پہلے دو قدم پیچھے کی طرف چلتے تھے اور پھر گیند پھینکنے کے لئے آگے دوڑتے تھے اور جب تک وہ کھیلتے رہے چاہے دن بھر ہی گیند پھینکنا ہو، اس معمول میں سر مو فرق نہیں آیا۔ کچھ یہی حال سلو بالر اور اسپنر عبدالقادر کا ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ اگر گیند پھینکتے وقت اپنا اچھلنا کودنا بند کردیں تو گیند نہیں پھینک سکتے۔ بعض ٹینس کے کھلاڑیوں کو آپ نے دیکھا ہو گا کہ سروس کرتے وقت پہلے گیند کو ایک ٹپہ ضرور دیتے ہیں اور اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دیں تو شاید صحیح سروس ہی نہ کر سکیں۔

کچھ عادتیں تو لوگوں میں اس قدر عام ہیں کہ بغیر توجہ دیئے ہوئے بھی آپ ان کی طرف لامحالہ متوجہ ہو جائیں گے۔ ان میں ناک اور

کان میں مستقل انگلی کا استعمال اور پھر اس کا بغور ملاحظہ دانت کریدنا، ماتھے کو سکوڑنا، آنکھوں کو مختلف انداز میں گھمانا یا منہ بار بار صاف کرنا، ناخنوں کو دانتوں سے کاٹتے رہنا، ٹوپی کو اگر پہنی جائے تو ایک خاص انداز سے اور ایک مخصوص زاویے پر رکھنا اور اسے بار بار ٹھیک کرنا بھی شامل ہے۔ ویسے اس قسم کی بعض عادات میں حضرت فرائڈ کی جنسی جذبے کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے مگر ہمیں تو صرف بے خیالی اور بے چینی کی علامات نظر آتی ہیں جس کا ایک منظر اس طرح نظر آتا ہے کہ بعض حضرات پانچ منٹ سے زیادہ ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے ہیں اور آپ گھڑی دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ وہ کب جگہ بدلیں گے۔

ادیبوں اور شاعروں کی عادتیں بھی الگ طرح کی ہوتی ہیں۔ اکثر شاعروں کا شعر پڑھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی کبھی فرق نہیں ہوتا۔ بہزاد لکھنوی مرحوم تو آپ کو یاد ہونگے۔ وہ شعر پڑھتے وقت گلے میں پڑی ہوئی کپڑے کی دھجیوں میں ایک ہاتھ کی انگلیاں ڈال کر زور زور سے ہلاتے جاتے تھے۔ بعض شاعر شعر پڑھتے وقت سامعین سے باتیں کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جب کہ کچھ حضرات شعر پڑھتے وقت مستقل بالوں میں ہاتھ پھیرتے رہتے ہیں۔ شعراء اور شاعرات میں سے بھی اکثر نے شعر سنانے کا ایک مخصوص انداز اپنایا ہوا ہے مثلاً عرض کیا ہے۔ شعر پیش خدمت ہے۔ توجہ چاہتا ہوں۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے وغیرہ وغیرہ۔ حال ہی میں ہندوستان سے آئے ہوئے ایک شاعر نے ایک نیا ہی انداز اپنایا ہوا تھا یعنی وہ شعر پڑھتے ہوئے فرماتے تھے۔ شعر حاضر کرتا ہوں۔ بھارت سے آنے والی تمام شاعرات کا بھی ایک خاص انداز اور عادت ہوتی ہے مثلاً وہ سامعین سے مخاطب ہوکر اس قسم کے فقرے ضرور دہراتی ہیں۔ یہ شعر بطور خاص آپ کے لئے ہے یا آپ کی نذر ہے۔ ☆

مرزا کھونچ
نیاٹولہ۔بیتیا۔بہار

"الوداع اے صدی بیسویں"

تیرے دم سے ہوا مینڈکوں کو زکام
ہیں جو اہل سیاست ہوئے بے لگام
میں کہاں تک گناؤں تری خوبیاں
تیرے لفڑے میں الجھا ہے ہر خاص و عام
الوداع اے صدی بیسویں نیک نام

جتنی اخلاقی قدروں کی تھیں کھیتیاں
چر گئیں وہ سبھی جدتی بکریاں
دو گھرانوں کا سنگم کراتی تھیں جو
بن گئی ہیں تجارت بھی وہ شادیاں
باپ لینے لگا اپنے بیٹے کا دام
الوداع اے صدی بیسویں نیک نام

کالے دھندے پہ چھائی ہوئی ہے بہار
اہل ایمان کو آ گیا ہے بخار
ہو گئی سچے لوگوں کی کھٹیا کھڑی
اور دھڑلے سے جھوٹوں کا بیڑا ہے پار
جس میں ننگے ہیں سب تم وہی ہو حمام
الوداع اے صدی بیسویں نیک نام

ظلم شادی شدہ پہ یوں ڈھایا گیا
اک کنوارے کو پی ایم بنایا گیا
دے رہے تھے سدا مونچھ پر تاؤ جو
ہوش ان کا ٹھکانے لگایا گیا
چڑھتے سورج کو سب کر رہے ہیں سلام
الوداع اے صدی بیسویں نیک نام

تھی گھوٹالوں سے تیری بڑی دوستی
سی بی آئی کو تو نے سدا مات دی
وہ جو پکڑے گئے سب تھے احمق بڑے
تو نے ان کو بچانے کی کوشش بھی کی
کیا کیا جائے جب ہو مقدر ہی خام
الوداع اے صدی بیسویں نیک نام

کچھ ادب پر بھی مرزا نوازش ہوئی
بھرے ہٹ کے شعروں کی بارش ہوئی
خوب افسانے لکھے گئے بے محل
اور تنقید کے بل پہ سازش ہوئی
کیسی تحکم فضیحت ہوئی صبح و شام
الوداع اے صدی بیسویں نیک نام

ایس ایم معین قریشی، کراچی

بیوروکریٹ کی عید

صاحبو! چھوٹا آدمی ہونے میں بھی بڑے فائدے ہیں۔ اب دیکھئے نا ہم نے اپنی عید پرسکون اور شایان شان طریقے سے منائی... اور کیوں نہ مناتے۔ نہ ہم کوئی وزیر ہیں نہ مشیر اور نہ سفیر۔ ہم کوئی عوامی شخصیت بھی نہیں یعنی نہ سینیٹر، نہ ایم ایل اے نہ ایم پی اور نہ کونسلر وغیرہ۔ ہم کوئی بیوروکریٹ بھی نہیں کہ ہمارا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پہ ہوتا۔ مختصر یہ کہ ابن انشاء کے الفاظ میں:

میں کسی شہر کا تاجر بھی نہ والی نہ وزیر
نہ کسی شاہ معاصر کا جگر گوشہ ہوں
نہ کسی بادشاہ زادی کی محبت کا اسیر
سر میں سودائے ریاست نہ امارت کا جنوں

ہم تو سیدھے سادے اور معمولی سے پاکستانی شہری ہیں لہذا عید کے دن ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی دباؤ سے آزاد تھے۔ ہم راوی سب ہی کے لئے یوں چین نہیں لکھتا۔ بہت سے حالات میں عید کی خوشیاں اور رونقیں اصول ماتحتی یا (آداب غلامی؟) کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں؟ اور بیوروکریٹ اس کی ایک بین مثال ہے۔ عید کے دن ایک ایسے ہی بڑے صاحب سے ہماری یادگار اور عبرتناک ملاقات ہوئی۔ ہوا یوں کہ گھر پر عزیز و اقارب سے عید مل کر دن چڑھے ہم اپنے چند دوستوں سے ملاقات کے لئے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے ہم اپنے ایک بہت عزیز دوست کے گھر آئے جو ایک خاصے اہم سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ وہاں پہنچے تو انہوں نے پژمردہ چہرے اور نڈھال جسم کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔

ہم نے ان سے سوال کیا: "عید کیسی گذر رہی ہے؟"

ایک سرد آہ بھر کر بولے:

ناکامیوں کی یاس کی آہ و فغاں کی عید
ہوگی کسی کی عید ہماری کہاں کی عید

ہم نے کہا: "خدا خیر کرے۔ بھابی بچے وغیرہ کہاں ہیں؟"

موصوف خاموش رہے۔ ہم نے پوچھا: "کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟" دوسری طرف مکمل خاموشی رہی۔ ہم نے دریافت کیا: "خدانخواستہ خاندان میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے؟" ادھر سے کچھ جواب نہیں آیا۔ ہم نے جھلا کر حضرت داغ دہلوی کے الفاظ میں انہیں جھنجھوڑا۔

لگ گئی چپ تجھے اے داغ کہاں کی ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

اس پر وہ یوں گویا ہوئے: "میرا حال تم نہ سن سکوگے۔ بس یوں سمجھ لو کہ صبح سے ہر لمحہ تکلیف دہ گزر رہا ہے۔ ہر تدبیر الٹ رہی ہے اور ہر قدم پر مایوسی ہورہی ہے۔"

ہم نے انہیں دلاسا دیا: "بھائی کچھ تفصیل سے آگاہ کرو۔ کچھ کھلو، کچھ بولو کہ اس سے دل کا غبار ہلکا ہوتا ہے۔ ممکن ہے میں تمہارے کچھ کام آسکوں۔ کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا۔"

اب وہ سنبھل کر بیٹھے اور فرمایا: "آج صبح میں نے حسب معمول نماز عید باغ قائد اعظم میں پڑھی۔ تم کو معلوم ہے اس جگہ سارے شہر کے وی آئی پی خصوصاً انتظامیہ کی بڑی بڑی توپیں جمع ہوتی ہیں۔ لہذا میں بھی وہیں جاتا ہوں تاکہ کچھ ساتھیوں، کچھ وزیروں اور کچھ دیگر اہم شخصیتوں سے ایک ساتھ ملاقات ہوجائے۔"

"کیا تم ان سب سے ذاتی مراسم رکھتے ہو؟" ہم نے مداخلت کی۔

"ہرگز نہیں" انہوں نے جواب دیا۔ "اور یہ ضروری بھی نہیں۔ میں تو وہاں صرف اس لئے جاتا ہوں کہ بڑے بڑے لوگوں کی خدمت میں کورنش بجا لاؤں۔ کون جانے ان میں سے کون کس وقت تمہارے مستقبل کو بنانے یا بگاڑنے کیلئے تم پر مسلط کردیا جائے۔ اس لازمی کارروائی میں ایک گھنٹہ صرف ہوا۔"

"تو گویا نظریہ ضرورت کی اس تکمیل کے بعد تمہیں فراغت نصیب ہوئی۔" ہم نے لقمہ دیا۔

نہیں بھائی انہوں نے ہماری بات کی تردید کی۔ "فراغت میرے نصیب میں کہاں۔ گھر لوٹا تو دیکھا کہ درجن بھر ملاقاتی یہاں میری اپنی زیارت کے لئے موجود تھے۔ ان میں میرے نائب افسر سے لے کر نائب قاصد تک کے درجے کے لوگ شامل تھے۔ مجھے مجبوراً ان کے استقبال کے لئے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجانی پڑی۔ دراصل ان کی آمد میرے لئے سخت باعث کوفت تھی کیونکہ اس وقت تک میں اپنے بیوی بچوں سے بھی نہیں مل سکا تھا۔"

اس پر ہم نے ان کے احساس مروت کو یہ کہہ کر للکارا۔ "بے چارے اسٹاف والوں کو شاذ و نادر ہی اپنے باس کے قریب پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کا حق ہے کہ وہ تم سے اپنی محبت کا اظہار کریں۔"

ہماری اس بات سے ان کی پیشانی پر بل آگئے۔ منہ بسور کر کہنے لگے۔ "بے شک محبت کا اظہار کریں لیکن گدھے کے اسٹائل میں نہیں۔" "کیا مطلب؟" ہم سراپا حیرت تھے۔

انہوں نے وضاحت کی۔ "ایک پشتو ضرب المثل کے مطابق جب گدھا کسی سے اظہار محبت کرتا ہے تو اسے دولتیاں رسید کرتا ہے۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔"

"تو تمہارا کہنا یہ ہے کہ تمہارے ملاقاتیوں نے تمہیں دولتیاں ماریں۔" ہم نے طنز کیا۔

"ٹھڈے مارے۔" انہوں نے غضبناک ہوکر بتایا۔ "وہ عید ملنے نہیں میری قوت برداشت کا امتحان لینے کے لئے آئے تھے۔ سب سے پہلے میرا اسسٹنٹ ڈپٹی آستین چڑھا کر جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے جل تو جلال تو کا ورد شروع کردیا۔ ادھر اس نے آناً فاناً مجھے قابو کرکے نہ جانے کب کب کے بدلے چکائے۔ مجھے اپنے "آرم لاک" میں لے کر کئی منٹ تک میرا سینہ کوٹتا رہا۔ پھر دوسروں نے بھی اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ میں آدھ موا ہوکر صوفے میں دھنس گیا۔"

"اور یوں وہ لوگ تمہارا بھرکس نکال کر رخصت ہوئے۔" ہم نے گرہ لگائی۔

"رخصت کہاں ہوئے۔" انہوں نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔ "محض رسماً میں نے ان سے کچھ چکھنے کو کہا مگر وہ تو معلوم ہوتا تھا برسوں کے فاقہ زدہ ہیں۔ اشارہ ملتے ہی ڈشوں پر ٹوٹ پڑے اور منٹوں میں صفایا کردیا۔"

"تو اس طرح رسم دنیا نبھانے کے بعد تمہاری جان چھوٹی۔" ہم نے خیال ظاہر کیا۔

"پھر غلط بولے۔" اب ان کے لہجے میں تلخی آتی جارہی تھی۔ "تمام واقعات میرے ساتھ پیش آئے ہیں لہذا مجھے ہی اپنا دکھڑا سنانے دو۔ ان سے نمٹ کر مجھے ایک سماجی اور ایک مذہبی فریضے کی ادائیگی کا خیال آیا۔"

"تو اس طرح مذہبی فریضہ بہت خوب۔ یعنی؟" ہم نے جاننا چاہا۔

انھوں نے مطلع فرمایا: "عید کے دن دو مقامات پر ضرور جاتا ہوں ایک سسرال اور دوسرا قبرستان۔ اس بار میں نے سوچا کہ ان سے پہلے باس سے فارغ ہوجاؤں کیونکہ وہ باغ جناح میں نظر نہیں آئے تھے۔ میرے باس ایڈیشنل سکریٹری کے مرتبہ کے افسر ہیں۔ میں نے بیگم اور بچوں سے تھوڑی دیر کے لئے اجازت لی اور اپنے غریب خانے سے نکل کر ان کے دولت خانے کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صاحب تو سکریٹری صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ میں آدھا گھنٹہ ان کا منتظر رہا مگر بے سود۔"

"اور پھر گھر لوٹ آئے؟" ہم نے ایک بار پھر بے صبرے پن کا مظاہرہ کیا۔ اس پر وہ گرجے، برلاخ پا ہوکر گرجے۔ "ایسا کرو بقیہ روداد تم ہی سنادو۔"

ہم نے معذرت کرکے انہیں دوبارہ سلسلہ کلام وہیں سے شروع کرنے پر آمادہ کرلیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ فرمانے لگے۔ "میری اگلی منزل میرا گھر نہیں بلکہ سکریٹری صاحب کی کوٹھی تھی۔ خیال یہ تھا کہ باس بھی وہیں مل جائیں گے تو ایک ساتھ دونوں کو بھگتا دوں گا لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ سکریٹری صاحب محکمہ کے متعلقہ وزیر کی خدمت میں ہدیہ عجز و نیاز پیش کرنے گئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں وزیر محترم کے بنگلہ پر گیا تاکہ "ایک پنتھ تین کاج" کرکے چھٹکارا پاؤں لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت! وہاں معلوم ہوا کہ وزیر صاحب وزیر اعلیٰ صاحب سے اپنی یک جہتی کا اظہار کرنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اس جگہ چونکہ میری دال نہیں گلتی لہذا ناکام و نامراد واپس لوٹ آیا۔"

یہ سمجھ کر کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگیا ہے ہم نے بات سمیٹنے کی غرض سے کہا۔ "تو اس تمام مصیبت کے بعد آخر کار تمہیں اس چکر سے نجات ملی۔"

یہ سن کر وہ بھڑک اٹھے اور ہمیں ڈانٹنے لگے۔ "یہ تم خضر کے ساتھی کا کردار کب سے ادا کرنے لگے جو بار بار بیچ میں ٹوکتے ہو۔ چکر ختم نہیں ہوا۔ گھر واپس آیا تو یہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ بیگم میرا انتظار کرتے کرتے بے زار ہوکر بچوں کے ساتھ میکے چلی گئی تھیں۔ گھر انھوں نے نوکر کے حوالے کردیا تھا جسے میں نے ابھی ریلیو کیا ہے تاکہ وہ غریب بھی اپنے دوستوں اور عزیزوں سے مل آئے اور اب... بس میں ہوں میری تنہائی ہے۔ گھر میں ہر چیز موجود ہے مگر میرا حال یہ ہے کہ بقول اکبر الہ آبادی:

سویاں دودھ شکر میوہ سب مہیا ہے
مگر یہ سب ہے مجھے ناگوار عید کے دن

یہ اطمینان کرلینے کے بعد کہ ان کی طویل داستان الم واقعی ختم ہوگئی ہے ہم نے اپنے بیورو کریٹ دوست سے اظہار ہمدردی کیا اور پھر تھوڑی دیر بعد رخصت کی اجازت چاہی لیکن انھوں نے ہمیں کھوسے سے پکڑ کر رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ التجا کی۔

قسم تم کو میرے سر کی مرے پہلو سے مت سرکو
اگر سرکو تو یوں سر کو قلم کرکے مرے سرکو

کاش ہم ایسا کرسکتے۔ (یعنی نہ سرکتے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی تھوڑی سی دیر کی اجازت لے کر گھر سے نکلے تھے لہذا ہمیں مجبوراً ان کے پہلو سے سرکنا پڑا ورنہ ایسی ہی ایک قید تنہائی اور اس کے بعد پانی پت کی لڑائی ہماری تاک میں لپٹے گھر پر ہماری منتظر ہوتی!۔ ☆

تمیز پرواز
۶-۱۴ قاضی پورہ، مدھول

غزل

بجلی کو اندھیروں کو نیا سال مبارک
پولس کو لیٹروں کو نیا سال مبارک

آکر بھی جو لوگوں کے گھروں تک نہیں پہنچے
ان ڈاک کے ڈھیروں کو نیا سال مبارک

کمزور بھی بن جاتے ہیں شہ زور گھڑی بھر
میخانے کے شیروں کو نیا سال مبارک

پائل جہاں بجتی ہے، جہاں رقص ہے جاری
نغمات کے ڈیروں کو نیا سال مبارک

مچھلی کی طرح ہاتھ میں آتے ہوئے لمحے
راتوں کے مچھیروں کو نیا سال مبارک

ہنڈہ ہے تو ہوتا ہے لگن ہر کہیں پرواز
شادی کے بھی پھیروں کو نیا سال مبارک

●☆●

احمد علوی

(نذرِ شوکت تھانوی)

اک نجومی کو دکھایا ایک دن میں نے جو ہاتھ
اس نے فرمایا بتاؤں راز کی اک تم کو بات

بند کر رکھے ہیں لقتا ب نے سارے راستے
صرف ب خطرہ ہے تیری زندگی کے واسطے

وجہ بربادی تری ب کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگانی میں تری ب سے برا کچھ بھی نہیں

کچھ نہیں بگڑے گا تیر اور تلوار سے
بچ نہیں سکتا کسی بھی طرح ب کی مار سے

سانپ سے بچ جائے گا پر مار دے گا تجھ کو بوم
ب میں تیری موت ہے یہ کہتا ہے علم نجوم

علم کہتا ہے مرا بے بات کی باتوں سے بچ
ان کڑکتی بجلیوں بادل سے برساتوں سے بچ

بند گوبھی اور بینگن کی محبت چھوڑ دے
فرش پر سو بیڈ اور بستر کی چاہت چھوڑ دے

پہلی ہی فرصت میں دیدے نیک بیوی کو طلاق
مار ہی ڈالے گا تجھ کو بارہ بچوں کا فراق

خیریت چاہے اگر باجی رسالہ مت منگا
زہر ہے تیرے لئے بکرے کی بریانی نہ کھا

برفی و بالائی اور بنگالی رس گلہ ہے زہر
جن پر تو مرتا ہے بشرہ اور بسم اللہ ہے زہر

دور رہنا ہے اگر تجھ کو اندھیری قبر سے
بیگل اتساہی سے بچنا اور بشیر بدر سے

برقعے و بنیان اور بو ایک ہیں تیرے لئے
بیل بندر اور بچھو ایک ہیں تیرے لئے

ایک ہے تیرے لئے بدشکل ہو یا بیوٹی فل
باغ میں بلبل کے نغمے موت کا تیری بگل

ب سے اتنا ڈر گیا ہوں بولنا بھی بند ہے
گفتگو لکھ کر کروں منھ کھولنا بھی بند ہے

ب کو جب سوچا تو ب ہی ب کا ہس پھیلا ہے جال
ب ہی ب چاروں طرف ہے ب تو ہے پورا دبال

ب سے بیٹی ب سے بیٹا ب سے ہی بنتا ہے باپ
سوچئے کیا زندگی میں ب سے بچ سکتے ہیں آپ

شرٹ میں اور شیروانی میں بٹن بھی بیس ہیں
کیا کہوں اب میرے منھ میں دانت بھی بتیس ہیں

سردیوں میں بوائیل انڈا زہر لگتا ہے مجھے
گرمیوں میں برف بھی تو قہر لگتا ہے مجھے

بیسوں بائیسویں تدکیں مجھ پر ہیں گراں
اک قیامت بن کے آتا ہے مہینہ بارھواں

کیا کہوں بیوی کے اک بوسے سے بھی ڈرتا ہوں میں
بیوی کو وائف سمجھ کر کس کیا کرتا ہوں میں

جاتی ہیں باراتیں کیونکہ سب کی سب بابل کے گھر
اس لئے رہتی ہے میری بس دلہے پر نظر

ب سے بم بارود اور بندوقیں بھی ب سے بنیں
ب سے برتن ب سے بچے ان سے کس طرح بچیں

ب سے بچتے بچتے مولا بن گیا ہوں بے وقوف
ب سے ناممکن ہے بچنا کردے مجھ کو ب پروف

●●●

بابو آر کے
اچل پور سٹی

قصہ افطار پارٹی کا

جہاں رمضان المبارک کی ہر ساعت باعث رحمت ہوتی ہے وہیں اس مہینہ کی مصروفیات بھی رنگا رنگ کیفیات کی حامل ہوتی ہیں۔ سحری کا اہتمام، نمازوں کا نظم، روزوں کی گہما گہمی، افطار کی ہماہمی اور عید کی تیاریاں و شادمانیاں... گویا ایسی ہی ان گنت رنگینیوں سے رمضان کا دامن بھرا رہتا ہے۔ خصوصاً اس مہینہ کی افطار پارٹیاں دل آویز بھی ہوتی ہیں اور مصلحت آمیز بھی۔ ویسے تو عرصہ دراز سے ہم بھی ان افطار پارٹیوں کے سیاسی فوائد کے قائل رہے ہیں اس لئے اس مرتبہ رمضان کے آخری عشرے میں ہم نے بھی ایسی ہی ایک افطار پارٹی کے انعقاد کا ارادہ کرلیا۔ برسبیل تذکرہ یہ بات بھی آپ کو بتادیں کہ اس قسم کی افطار پارٹیوں میں جزا و خیر کے جذبے کم اور سیاسی حربے زیادہ ہوا کرتے ہیں اور یہی سب ہماری افطار پارٹی میں بحسن و خوبی موجود تھا۔ چونکہ الیکشن متوقع تھے اور ہم جانتے تھے کہ الیکشن سے قبل اس نوعیت کی افطار پارٹی سیاسی استحکام کے لئے انتہائی سودمند ہوتی ہے۔ بس یہی سوچ کر ہم نے اپنے دولت کدہ پر افطار پارٹی کے انعقاد کی تیاریاں شروع کردیں۔ اس کام کے لئے سب سے پہلے تو ہم نے شہر کی سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیات کے اسمائے گرامی نوٹ کئے۔ بعد ازاں چیدہ چیدہ صحافیوں، رہنماؤں، شاعروں اور ادیبوں کو ایک فہرست میں قلمبند کیا۔ اس موقعہ پر اپنی افطار پارٹی میں شرکت کے لئے ہم نے سماج کے مختلف شعبہ حیات سے متعلق انہیں مسلم حضرات کو مدعوئین کی فہرست میں شامل کیا جن کی غیر روزہ داری اور معتبر روزہ خوری کے ہم گزشتہ کئی رمضان سے قائل رہتے آئے تھے۔ تو صاحب ہم نے اس افطار پارٹی میں ٹھونک بجا کر چھان پھٹک کر غیر روزہ دار مسلم حضرات کو مدعو کرڈالا کیونکہ ہمیں علم تھا کہ آج کل ہمارے سماج میں کسی بھی افطار پارٹی کی کامیابی جہاں غیر روزہ دار حضرات کی شرکت پر انحصار کرتی ہے وہیں روزہ دار حضرات کی شرکت ان افطار پارٹیوں کو ناکام بنا دیا کرتی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ افطار پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہم نے استقبالیہ کمیٹی کے اراکین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "دیکھو، مہمانوں کی آمد کے وقت تم لوگ گیٹ پر چوکس و چوکنا رہنا اور ہال میں داخل ہونے والے ہر مہمان کے چہرے بشرے کو باریکی سے پڑھنا اور جب اسکی غیر روزہ داری کا اچھی طرح اطمینان ہوجائے تب ہی اسے افطار پارٹی میں شریک ہونے دینا ورنہ نہیں... اور اس قدر کڑی جانچ پڑتال کے بعد بھی اگر کوئی مہمان روزہ رکھنے کے جرم کا ارتکاب کربیٹھے تو ایسے شخص کو بلالحاظ مقام و مرتبہ ہماری افطار پارٹی سے کھلواڑ کرنے کی پاداش میں ذلیل و خوار کرنا اور بلا چوں و چرا افطار پارٹی کے دروازے اس پر بند کردینا۔"

استقبالیہ کمیٹی کے اراکین کو اسقدر سمجھانے کے بعد ہم مطمئن ہوگئے اور پھر افطار پارٹی کے انتظام میں جٹ گئے۔ چونکہ ان سیاسی افطار پارٹیوں میں شرکت کے لئے جب مہمانوں کا غیر روزہ دار ہونا ضروری گردانا گیا ہو تب ایسی صورت میں میزبان پہ روزہ خوری کی اخلاقی ذمہ داری کچھ زیادہ ہی آن پڑتی ہے اور یہی ذمہ داری ہم پہ آئی تھی اور اس کو ہم نے نبھایا بھی یعنی خوب مزے لے لے کر دن بھر ہم افطاری کے لوازمات چکھتے اور چکھتے رہے۔ لیکن بعد نماز عصر ہم نے اپنے چہرے پہ روزہ دار کی کسمپرسی کی روداد رقم کرنی شروع کردی جس کے لئے سب سے پہلے تو ہم نے اپنے کرخت لہجہ کو تھوڑا دھیما پن دیا پھر نقاہت سے پلکیں جھپکانے لگے، سمیٹ

سمیٹ کر آنکھوں میں دم لانے لگے۔ بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیر پھیر کر پیاس کی شدت اور روزے کی حدت کا برملا اظہار کرنے لگے اور پھر ان تمام حرکتوں کے بعد ... جب شان روزہ داری پوری طرح ہم میں سرایت کر گئی تب ہم نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے آپ کو اس افطار پارٹی کے لئے سینٹ پر سینٹ فٹ پا کر یک گونہ سکون پایا۔

خیر صاحب، بعد نماز عصر افطار پارٹی کے لئے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک ایک کرکے غیر روزہ دار بصورت روزہ دار نمودار ہونے لگے۔ بعد ازاں بلکہ قبل اذان مغرب ہم نے مہمانوں کے روبرو افطار کے لوازمات سجا دیئے۔ انواع و اقسام کے پھلوں اور مٹھائیوں کے توشے بچھا دیئے۔ ادھر فیرنی، بریانی، کباب اور سموسے مہمانوں کے صبر کا امتحان لینے لگے اور ادھر ہم ہر ایک سے مصافحہ کرنے لگے۔ چونکہ ابھی افطار میں خاصا وقت تھا اور اس افطار پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار بھی کرنا تھا اس لئے حسب روایت افطار پارٹی مہمانوں نے روزے اور رمضان کے علاوہ ہر موضوع پہ اظہار خیال اور گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھا اور پھر یہ ہوا کہ الیکشن کے لئے امیدواروں کو پارٹیوں کے ٹکٹ بھی اسی افطار پارٹی میں بٹنے لگے۔ اسی پارٹی میں اکیسویں صدی میں جانے کی تیاریوں کے چرچے ہوئے اور یہیں پر روزہ دار کی طرح نحیف و زار، ایم ایف حسین کے ساتھ سحری کی طرح پر کشش مادھوری ڈکشٹ کی بے وفائی کے تذکرے بھی ہوئے اور جہاں یہ سب ہو رہا ہو وہاں بیچارے صحافی حضرات بھلا کہاں پیچھے رہنے والے تھے ... انہوں نے بھی اپنے لئے صحافتی راحت کی رقم یہیں مقرر کروالی نیز اسی افطار پارٹی میں ادیبوں اور شاعروں نے اردو اکیڈیمی کی حالیہ تشکیل پر مدقوق چہروں کے ساتھ گریہ و زاری کی ... اور اپنی افطار پارٹی میں یہ سب دیکھ دیکھ کر، سن سن کر ہم مسرت سے سرشار ہوگئے اور یہ حقیقت ہیکہ اس قدر کامیاب افطار پارٹی کے لئے ہم اللہ رب العزت کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ ویسے ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس افطار پارٹی کے بظاہر اسپانسر تو ہم تھے لیکن در پردہ مالیہ علاقے کے ایم پی صاحب نے ادا کیا تھا ... الغرض اتنی کارگزاریوں کے باوجود بھی اگر آپ ہمیں کامیاب سیاستداں نہ مانیں تو یہ آپ کا قصور ہے ہمارا نہیں۔ ☆

جہان قدر چغتائی، بھوپال

فقط دم کی کسر ہے

ہم کو آج بھی وہ اپنے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ بخوبی یاد ہے جب ہم بندر کی طرح بے خوف اچھلا کودا کرتے تھے ۔ ایسا ہی لڑکپن چارلس ڈارون کا گزرا ہوگا جس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ آدمی کبھی بندر تھا ۔ ڈارون کی یہ تھیوری آج تک بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے ۔ لوگ اس کی بات کو جھٹلاتے ہیں ۔ اس کو جھوٹا فلاسفر قرار دیتے ہیں ۔ ہم بھی ڈارون کی رائے سے متفق نہیں ۔ آدمی کی ذات بندر سے الگ ہے ۔ اگر دونوں ایک ہوتے تو بندر مداری کی ڈگڈگی پر کیسے ناچتا ۔ بندر بھی آدمی کو نچاتا ہوا کسی گلی کوچے میں دکھا جاسکتا تھا ۔ بندر آدمی کو نہیں نچا سکتا اس لئے آدمی اشرف المخلوقات قرار پایا گویا کہ وہ کسی دوسرے جانور سے بہتر اپنے آپ کو ثابت کرنے میں ناکام رہا ہو ۔

تھوڑے دن پہلے ہماری ریڑھ کی ہڈی میں درد پیدا ہوا جس نے ہمیں اٹھنے بیٹھنے میں پریشان کردیا ۔ حکیم دوید کے پاس گئے مرہم لگایا، تیل ملا، مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔ نہ لیٹے چین نہ بیٹھے ۔ احباب نے کہا میاں یوں کام نہ چلے گا کسی مشہور اور معروف ہڈی کے ڈاکٹر کو جاکر اپنا درد بتاؤ ۔ معلوم ہوا کہ شہر میں ایک سے ایک بڑا ہڈی کا ڈاکٹر پڑا ہے ۔ پہلے زمانے میں مشہور پیر ہوا کرتے تھے جن کو مرید اڑایا کرتے تھے ۔ آج کل ڈاکٹر پیر کی طرح اڑتے ہیں ۔ مریض ان کو اڑاتے اور مشہور کرتے ہیں ۔ قہر درویش برجان درویش ایک ڈاکٹر کے پاس گئے ۔ اس نے ہم کو مشینوں کے حوالے کردیا ۔ ہڈی کی فوٹوگرافی سے پہلے سونوگرافی، خون پسینہ کی جانچ، خون بھی ہمارا ملٹی نیشنل کمپنی کی طرح نکلا ۔ سینکڑوں خرابیوں کی جانچ ہوئی ۔ ہزاروں خرچ کئے تو پتہ چلا کہ ہماری دم کی ہڈی بال کے برابر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے ۔ ارے بھئی! اشرف المخلوقات کے جسم میں یہ دم کی ہڈی کہاں سے آگئی ۔ ہم کو ڈارون یاد آگئے ۔ اپنے لڑکپن کی حرکتیں اور ہڈی کے ڈاکٹر کا فیصلہ سن کر ہم کو یقین آگیا کہ آدمی پہلے بندر تھا، آج بھی بندر ہے اور مستقبل میں بھی بندر ہی رہے گا ۔ آپ کو حق ہے ہماری رائے سے منحرف ہونے کا ۔

جب ہم پر یہ راز فاش ہوا کہ ہمارے جسم میں دم کی ہڈی تو ہے مگر دم نہیں ہے تو ہم اپنا درد بھول کر افسوس کرنے پر مجبور ہوگئے ۔ ہمارے بزرگوں کو کرسی کی طرح پتھر پر بیٹھنے کی عادت نے انہیں ایک خوبصورت اور بہت کام کی چیز سے محروم کردیا ۔ اگر آج وہ دم ہوتی تو ہم اس سے وہ وہ کام لیتے جو ہاتھی بھی اپنی سونڈ سے نہیں لے سکا ۔ دم کی اہمیت یا بندر جانے یا ہندوستان ۔ دم گئی دم کی نشانی رہ گئی ۔ اگر ہوتی تو کام میں لاتے ۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر آج آدمی کے پاس دم رہ گئی ہوتی تو وہ اس دم سے وہ کرشمے دکھاتا جو اس کے ہاتھ اب تک نہیں دکھا سکے ۔ اگر ہم وزیراعظم ہوتے اور لال قلعہ سے تقریر کرتے تو اپنی ہی دم کی چھتری اپنے سر کے اوپر لگالیتے ۔ ہماری تقریر سن کر ہزاروں لاکھوں دمیں تالیوں کے بجائے ہوا میں لہراتیں تو ہمیں لگتا کہ دموں پر بہار آئی ہے اور مجمع دم باغ ہوگیا ہے ۔ تقریر کرتے وقت آس پاس باڈی گارڈ کے اٹینشن کی پوزیشن میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ دم اس وقت بھی باڈی گارڈ ثابت ہوتی ۔ اگر ہم ایک عام آدمی ہوتے تو وزیروں کی کاریں دم کے چھومر سے صاف کرتے دیکھتے ۔ اگر پولیس کے ڈی آئی جی ہوتے تو پبلک پر پولیس کا لاٹھی چارج نہیں کرتے دم چاج کر کے مجمع کو منتشر کرتے ۔ دم دار وزیراعظم کی سواری جب راجدھانی کی سڑک سے

گزرتی تو کیا عالم ہوتا۔ ہزاروں عوام سڑک کے دونوں جانب الٹے کھڑے ہو کر ان کے گزرتے وقت جب دمیں ہلاتے تو لگتا راجد ھانی کی سڑکوں پر سونے کی فصل لہرا رہی ہے۔ اخباروں میں بڑے بڑے فوٹو چھپتے۔ "دم دار وزیر اعظم، دم دار عوام"۔

ہم نے آدمی کی ترقی دیکھی۔ آدمی کی ارتقائی منزلوں کو پہچانا۔ اس کے اعمال اور افعال کا عمیق جائزہ لیا۔ لگ بھگ سو سال کے حالات ہماری نظر کے سامنے سے گزرے جن کی روشنی میں آج ہم یہ کہنے اور فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اگر آدمی کے جسم میں دم باقی رہتی تو یہ آدمی وہ حرکتیں ہرگز نہ کرتا جو یہ دم نہ ہونے کی وجہ سے کر گیا ہے۔ کبھی گیڈر نے کسی دوسرے گیڈر کو ہزاروں لاکھوں سال پرانی دنیا میں کبھی پتھر کھینچ کر مارا ہو تو کوئی ہم کو بتلائے۔ کسی بندر نے بندریا کو درخت کی ٹہنی سے پٹائی کرتے دیکھا ہو تو قصہ ہمیں سنادے۔ اس لئے جانور کے جسم میں دم جانور کو خطرناک کام کرنے سے روکتی ہے۔ اگر دنیا میں امن چاہتے ہو تو اس کے جسم پر دم واپس لاؤ۔ جب آدمی کو دم مل جائے گی تو یہ سارے میزائل اور ایٹم بم جہاں بھی ہوں وہیں کے وہیں رہ جائیں گے کسی پر پھینکے نہیں جائیں گے۔ غرض کہ دم ہزاروں مفید کاموں کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات کی عکاسی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ خوشی کے موقع پر دم سربلند ہوتی ہوئی، غم اور غصہ کے عالم میں سرنگوں اور ٹیڑھی ہوتی ہوئی۔ وقت رخصت ہاتھ کی جگہ وہ ہلتی اور لہلہاتی۔ بس تو یہ طے ہے کہ جسم پر دم کی کسر آدمی کا نقصان عظیم ہے۔ اب یہ دنیا کے بے دم مگر دم کی بڑی رکھنے والے آدمیوں کا کام ہے کہ وہ اپنے ایک ساتھی کی بات مانیں یا نہ مانیں۔ بھیا ابوالکلام اور قدیر ماموں آپ دونوں نے اپنی سائنس کی معلومات سے تو پٹاخے بنا کر چلوادئے اگر ذرا سی توجہ دے کر اس آدمی کی کسی ترکیب سے دم واپس لاکر دکھادیتے تو یہ خدا کی مخلوق پر ایک بڑا احسان ہوتا۔ کسی کو ہو نہ ہو مگر ہم کو تو ضرورت ہے ایک اچھی خوبصورت، لمبی، لچکدار اور چمکدار بالوں والی دم کی۔ ☆

ڈبویا دم کے نہ ہونے نے جو ہوتی دم تو کیا ہوتا؟

منظور عثمانی
۶۱۷، ہملٹن روڈ، کشمیری گیٹ، دہلی

فورن رٹرن شاعر

داغ نے آج کی لاچار اردو زبان کے بارے میں کل بڑے فخر سے فرمایا تھا:

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

واقعی بات ہے بھی کچھ ایسی ہی بلکہ جب سے اردو غریب کی جڑیں اپنے ہی گھر اپنوں ہی کے ہاتھوں کاٹی جارہی ہیں تب سے تو اس کی "سارے جہاں" میں دھوم کچھ زیادہ ہی ہونے لگی ہے۔ بلا سے اپنے گھر میں کم ہوگئی ہے۔ ویسے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ دھوم یہاں نہیں وہاں تو ہے۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اس کی دھوم میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس حد تک کہ پہلے جنگل میں مور ناچتا تھا تو بیچارے کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا لیکن آج اردو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اردو کا شاعر جنگل تو کیا "صحرائے سہارا" تک میں بت سوں کے سامنے جاکر نہ صرف ناچ بلکہ گا کر سناتا ہے اور داد پاتا ہے۔ دردغ برگردن راوی (جو وہ خود ہوتے ہیں) چنانچہ وہ شاعر بھی جسے اپنے دیس میں بار بار ونس مور ونس مور تو کجا ایک بار (Once) سننا بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ الٹا ہوٹنگ سے بیچارے کی تواضع کی جاتی ہے لیکن اپنوں کے ستائے ہوئے یہی لوگ جب دیار غیر میں جاکر غزل سرا ہوتے ہیں تو ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ادھر سامعین ایک ایک پیسہ وصول کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔ خرچ بھی تو بلانے چلانے لینے دینے پر بہت آتا ہے۔ نہ جانے کیوں شاعر پر کئے گئے خرچ کا آنہ پائی تک وصول کرلیا جاتا ہے۔ شاعر کی کمائی یونہی نہیں ہوجاتی "کما کے کرتا ہے"۔ ایک بار فیض احمد فیض کہیں کھانے پر مدعو تھے نہ معلوم میزبان کیسے کھانے کے بعد کلام سنانے کی فرمائش کرنا بھول گیا۔ وہاں سے نکل کر فیض صاحب بولے "آج تو روٹی بغیر کئے دھرے ہی نصیب ہوگئی"۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس حملے میں خوشی کا عنصر کم حسرت کا زیادہ ہے۔ داد کو ترسا ہوا شاعر تو تحسین ناشناس تک کو شہد کے گھونٹ سمجھ کر اس وقت تک انڈیلتا رہتا ہے جب تک سامع ہی No more نہ کہہ اٹھے۔

ایک زمانہ تھا کہ دلی کا شاعر کسی اور کو اپنے علاوہ اہل زبان ماننے تک کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ میر اپنی مجبوریوں کی بناء پر لکھنؤ گئے رہے، گھر بسایا یہاں تک وہیں وفات پائی لیکن مرتے مرگئے پر بڑے سے بڑے مستند لکھنوی شاعر کو اس خدائے تکبر نے نہیں وددلا۔ مصحفی نے اپنی ساری زندگی دلی کے نام کردی لیکن امرد پن کی تہمت سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ جب اسی دلی کا شاعر دوبا، کے مشاعرے کے واسطے دعوت نامہ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرتا نظر آتا ہے تو دہائی دینے کو جی چاہتا ہے اور کامیابی کی صورت میں یہی شاعر اپنے اس اقبال پر علامہ اقبال کے سر میں سر ملا کر گاتا نظر آتا ہے۔

"دشت تو دشت ہے صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے"

دوسرا مصرعہ اس لئے نقل نہیں کیا اردو کے شعرا نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے کے علاوہ کیا ہی کیا ہے۔

ایسے بدیس جانے والے شعراء کے سلسلے میں اکبر یاد آگئے

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بیچارا کمیٹی ہی میں جاکر کود اچھل آیا

کتنی کاوش، کتنے چاؤ اور ارمانوں سے دعوت نامہ مانگا یا جتایا۔ جاتا ہے۔ غالب کی طرح

تم جانو تم کو غیر سے گر رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

"کچھ ہیں" کی شہرت کے "حامل" (اس سے غرض نہیں کہ "کچھ ہیں" کے مقام اعلیٰ پر فائز ہونے کے لئے کتنے توڑ جوڑ کتنی Lobbying، کتنی حق تلفیاں، کتنی اردو فروشی روا رکھی گئیں) ۔ حضرات کے کانوں میں ذرا بھنک پڑی کہ کوئی "دھلنیے یا دو بلائیے" جیسے مرض سخن فہمی یا گوئی بھی لاحق ہے۔ شہر میں نزول ہوا ہے۔ فوراً ایک شام ان کے نام نہ سہی تو جائے وائکیلی بیچ کے نام۔ از عمر رفتہ کنواریوں کی طرح بجے سجائے شاعر بڑے ارمانوں کے ساتھ اکٹھے ہوجاتے اس امید کے ساتھ شاید وہ موصوف کی نظروں میں آجائیں اور مہربان ہو کے بلالیں۔ انھیں کسی وقت تو ان کے نام کے ساتھ بھی "فوران رٹرن" کا دم چھلا لگ جائے۔ مہمان ذی وقار کی مدارات میں ان میزبانوں کا حال ان پیاسے میخواروں کی طرح ہوجاتا ہے جو پیر مغاں کو دیکھ کر دہائیاں دینے لگتے ہیں۔ ان کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں (شعرا حضرات کے گھر کی یہی تو کھیتی ہے جسے اگاتے اگاتے بیچارے خود کھیت ہوجاتے ہیں) ۔

شعر گوئی بھی بڑا خطرناک مرض ہے۔ ایک ان سنایا شعر (کتنی ہی چھوٹی بحر کا کیوں نہ ہو) ہی پیٹ میں ہلڑ مچادیتا ہے چہ جائیکہ پوری غزل نہ سنائی جائے تو جان پہ بن جاتی ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ شاعر کو مارنا ہو تو اسے اکسا کر ان سنا چھوڑ دو۔ اس طرح آپ اسے ان میں جتنی بار چاہو بغیر جرم قتل عمد میں ماخوذ ہوئے پل پل مار سکتے ہیں۔ شعری حاجت روائی کے لئے کتنی شدید حاجت ہوتی ہے (سامع کی) اس کا اندازہ ہمارے اس شاعر دوست کی روداد سے لگا سکتے ہیں جو عمرہ کی نیت سے ارضِ پاک تشریف لے گئے تھے بہت نیک اور صلح واقع ہوئے ہیں۔ صلاح ادب کے نقیب بھی ہیں لیکن وہاں بھی اجابتِ شعری سے باز نہ آئے۔ آپ جانیں شعرا کے لئے اپنے اشعار دوسروں کے گوش گزار کرنا حوائج ضروریہ کے زمرے میں آتا ہے اس لئے خالص حفظِ جان کی خاطر آٹھ دس سامعین بہ ہزار دقت وہاں بھی جتالئے جو تندہ یا بندہ اللہ تعالیٰ بھی بڑے مسبب الاسباب ہیں۔ ہم نے ازراہ مذاق ان سے پوچھ لیا کہ وہاں تو محفل شعر و سخن کیا بپا ہوئی ہوگی؟ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے یہ فرمایا "الحمد للہ! کار وفا وہاں بھی ادا ہوا"

ہم نے کہا: "کیسے؟ وہاں ایسے اجتماعات کی نہ گنجائش ہے اور نہ اجازت"۔

جواباً بولے: "چھپ کر جوتے بھی اندر رکھ لئے مبادا نعلین چغلیں نہ ثابت ہوں۔ ہم نے ہنسکر کہا "یارا جوتے بغل میں داب کر بھاگتے تو سنا تھا در بغل بیٹھنا آج ہی سنا ہے"۔ نہ جانے جہاں دس بیس جوتے اکٹھے ہوئے دعوت گناہ کیوں دینے لگتے ہیں۔

ہاں صاحب! خلیجی ملکوں میں رہنے والے شعراء یا آدھ شعرا پتہ نہیں کیوں شاعروں کو دیکھتے ہی پیالمن کی آس لگائے سہاگن کی چوڑیوں کی طرح بجنے لگتے ہیں۔ یہ ان کا مسئلہ نہیں ان کا مسئلہ خرچ کرنا ہے۔ چنانچہ ہر سال ان ریگ زاروں میں ایک چھوٹا موٹا مشاعرہ منعقد کر ڈالتے ہیں اور اپنے اور مدعو شعراء کی تسکین کا ذریعہ پیدا کرلیتے ہیں۔ کیوں کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اپنے ملک میں جو انھیں سب سے زیادہ V.I.P بناکر پیش کرتا ہے احسان چکائی کے طور پر اسے ہی مدعو بھی کیا جاتا ہے۔ "من ترا حاجی بگو تم تو مرا حاجی بگو"۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ لوگ اپنے آبائی وطن میں اترتے ہیں تو ہر امیدوار مقامی شاعر ان کی تواضع میں بچھ بچھ جاتا ہے بلکہ انھیں بڑے سے بڑا بناکر پیش کرنے میں پیش پیش رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ انھیں پیا چاہیں اور وہ بھی سہاگن کہلائیں (فوران رٹرن) ۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ وطن سے نکال کر اسے ہی عزت بخشی جاتی ہے جو اچھا "شعر گو" چاہے نہ ہو لیکن "شعر کا" ضرور بالضرور اچھا ہونا چاہئے۔ انہی جیسوں کے بارے میں دلاور فگار کا کہنا ہے کہ :

یہ دعا مانگ سلامت رہے آواز تری
رہ گئے شعر تو مانگے سے بھی مل جائیں گے

اپنے گلے کے سہارے انٹرنیشنل شہرت کا محل لئے جب یہ لوگ اپنے دیش رٹرن ہوتے ہیں (کہیں سے بھی) تو اہل وطن کو ان کی شاعری سے زیادہ ان کی واپسی (Returning) کی مار سہنی پڑتی ہے اور بندگانِ عاجز یہ تمنا کرنے لگتے ہیں کہ یہ:

"ہوتے کیوں نہ غرقِ صحرا !"

مزید براں یہ بھی جب یہ لوٹ کر آتے ہیں تو للذا مشاعرہ لوٹ کر آتے ہیں (واضح ہو کہ اکیلی مشاعرہ کی لٹائی ہی قانون شکنی کے ضمن میں نہیں آتی اور یہ لوٹنے والے کو لٹیرے کے مذموم لقب سے یاد کیا جاتا ہے)۔ اس پر طرفہ یہ کہ فورین رٹرن صاحب نصیب دشمناں اگر، قلم دراز بھی واقع ہوئے ہوں تو ایک طول و طویل سفر نامہ لکھکر سند باد جہازی کی ایسی تیسی کرنا بھی ان پر لازم آتا ہے۔ سفر نامہ نگاری کا بھوت ان پر پیر تسمہ پا کی طرح اس وقت تک سوار رہتا ہے جب تک سفر نامہ تولد نہ ہوجائے۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔

اب ان شواہد کی روشنی میں آپ ہی ایمان سے کہیں کہ استاد داغ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم بھی بیانگ دہل کیوں نہ کہیں

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

رہی اپنے وطن میں اپنی زبان کی ناقدری کی بات تو گھر کی مرغی دال برابر کب نہیں رہی بس فرق اتنا ضرور واقع ہوا ہے اب پیاری اردو دال سے بھی زیادہ گئی گزری بنادی گئی۔ ماں بیٹی کی جان کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گئی؟ یہ معمہ ہمارے آپ کے تو کیا اکبر کے پلے نہیں پڑا ۔۔ ☆

اکیسویں صدی میں

راکٹ خرید لیں گے اکیسویں صدی میں
ہم چاند پر رہیں گے اکیسویں صدی میں
خط بیسویں صدی میں آیا تھا جانِ من کا
اسکو جواب دیں گے اکیسویں صدی میں
مقروض ہم رہے ہیں ہر اک صدی میں یارو
نیلام گھر کریں گے اکیسویں صدی میں
بیگم سے ڈرتے ڈرتے گزری ہے زندگانی
ہمت سے کام لیں گے اکیسویں صدی میں
دیکھیں گے لوگ انٹرنیٹ پر ہماری صورت
بے ساختہ ہنسیں گے اکیسویں صدی میں
" ای میل " پر مسلسل ہم رابطہ بس اپنا
" فی میل " سے رکھیں گے اکیسویں صدی میں
دل میں جناب ہم نے یہ آج ٹھان لی ہے
چوری غزل کریں گے اکیسویں صدی میں
تم جو نہیں چلوگی گر ساتھ ساتھ جاناں
چلنا ہی چھوڑ دیں گے اکیسویں صدی میں
منگنی کی بھول ہم سے بس ہوگئی تھی یارو
شادی نہیں کریں گے اکیسویں صدی میں
دینے کی جان مشقیں ہر روز کر رہے ہیں
ہم تم پہ مرمٹیں گے اکیسویں صدی میں
سمجھے گا کون آخر شانہؔ غزل تمہاری
کیا شاعری کریں گے اکیسویں صدی میں

●☆●

منگنی

اقبال شانہؔ
(حقل، سعودی عرب)

میں نے شادی کے بعد کی منگنی
ہوگئی یہ عجیب سی منگنی
اسقدر اہتمام ہے جاناں
کوئی شادی ہے یا تری منگنی
اپنی قسمت ہے یار " میوزیکل "
بیانڈ باجے سے ہوگئی منگنی
دل کی حالت عجیب لگتی ہے
ہورہی ہے جناب کی منگنی
ان کی ڈائریکٹ ہوگئی شادی
آج تک بھی نہ ہوسکی منگنی
رات میں نے یہ خواب میں دیکھا
یار کی خود کشی ، مری منگنی
ہم کو شادی سے خوف آتا ہے
احتیاطاً کبھی نہ کی منگنی
شکل اتنی مری بری تو نہیں
اس نے دیکھی جو توڑ دی منگنی
تیری شادی نہ ہوسکی شانہؔ
کر ادا شکر ہوگئی منگنی

تمنا مظفر پوری
گیا

"وہ"

ضمیر کی تیسری قسم وہ ہے۔ جو غائب ہے۔ غائب سے مراد یہ ہے کہ جس کا ذکر تو ہو مگر وہ سامنے موجود نہ ہو۔ لہذا اسے طلسمی لفظ کہنا چاہئے ویسے لفظ "وہ" بڑا رومان پرور اور مسرت آفریں ہے۔ گفتگو کرنے والا اس کی لذت میں کھوجاتا ہے۔

لفظ "وہ" کو طلسمی اس لئے کہنا پڑا کہ شخصیت تو موجود نہیں ہوتی مگر اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یعنی دور رہ کر بھی وہ حاضر ہے اور دور کی چیز تو ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔ آپ نے بھی سنا ہوگا کہ دور کا ڈھول سہانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کی برائی پیٹھ پیچھے کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔

"وہ" کی رومانیت کا مزا لینا ہے تو اپنی بیگم کی گفتگو چھپ کر سنئے جب وہ اپنی پڑوسن یا کسی عزیز رشتہ دار خاص کر سکھی سہیلی سے بات کررہی ہوں۔ آپ کا ذکر جب آتا ہے تو وہ آپ کا نام نہیں لیتیں بلکہ "وہ" کہتی ہے۔ "وہ" کہتے وقت ان کا چہرہ اور بھی حسین ہوجاتا ہے (اگر پہلے سے کم حسین ہوں) گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی آجاتی ہے۔ ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتے ہیں اور پورے چہرے پر فخر کا ایک مسرت انگیز جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ آپ خود بھی "وہ" کہہ کر دیکھئے نا! کس طرح ہونٹ گول ہوجاتے ہیں جیسے خوشی میں سیٹی بجارہے ہوں۔

ذکر بالا میں "وہ" آپ اپنی بیوی کے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان ایک اور "وہ" ہے یعنی میاں بیوی اور "وہ"۔ یہ "وہ" تیسری ہستی ہوتی ہے اپنی بیوی کے علاوہ کوئی دوسری عورت محبوبہ یا داشتہ۔ داشتہ اس لئے کہہ رہا ہوں۔ شادی کے بعد بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کا وجود ایک خاص بات ہوگی۔ خاص شخصیت ہوگی خاص رشتہ ہوگا مگر وہ بیوی نہیں ہوسکتی۔ داشتہ کا رشتہ اچھا ہو یا نہ ہو مگر لفظ بہت پیارا ہے۔ ساتھ ہی اہم بھی۔ اس کی اہمیت کا پتہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ لوگ اپنی داشتہ سے ملنے کے لئے اپنی بیوی سے طرح طرح کے بہانے بناتے ہیں۔ چھپ کر ملنے کی راہ نکالتے ہیں اور گھر سے غائب رہتے ہیں اور تقریباً ہر ملاقات پر خرچ ہوتا ہے۔ لہذا اس ملاقات پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ اپنی دولت پانی کی طرح بہاتے ہیں لہ بعض حضرات اپنی بیوی کے زیورات بھی چرا کر بیچ دیتے ہیں یا "وہ" تک پہنچادیتے ہیں۔ آخر نوبت یہ آتی ہے کہ "وہ" کی خاطر وہ کنگال اور دیوالیہ ہوجاتے ہیں۔

داشتہ کی اہمیت اپنی منکوحہ سے بڑھ کر ہوتی ہے بلکہ ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس اہمیت کے متعلق رئیس امروہوی مرحوم نے ایک قطعہ کہا تھا آخری مصرع آپ بھی سن لیجئے اور داشتہ کی اہمیت کا اندازہ کیجئے:

بیوی می آید بہ رکشہ داشتہ آید بہ کار

امید ہے آپ اس ایک مصرع سے ہی بیوی اور داشتہ کے فرق کو سمجھ گئے ہوں گے۔

ابھی ابھی میں نے میاں بیوی اور "وہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پر میاں بیوی اور وہ میں "وہ" کا تعلق شوہر سے ہے اور شوہر جناب کا تعلق باہر سے ہے یعنی ان کا برابر ہی باہر آنا جانا ہوتا ہے۔ لہذا وہ اپنی "وہ" سے باہر ہی ملتے ہیں اور اپنی وہ کو بہت دنوں تک راز میں

رکھتے ہیں۔ ہاں جب پانی سر سے اونچا ہونے لگتا ہے اور گھر کی دولت اور خوشی اس میں ڈوبنے لگتی ہے تو معاملہ سامنے آتا ہے۔ لیکن جب وہ کا تعلق بیوی سے ہو تو معاملہ خطرناک بلکہ دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند کے تحت بنتا ہے اگر کسی کی بیوی اپنے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد سے شوہر جیسا تعلق رکھے اور اس کا علم شوہر نامدار کو ہوجائے تو شوہر دو خون کا مرتکب ہوتا ہے یا کم از کم ایک خون اور ایک طلاق کا مقدمہ اس پر چلتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ حتیٰ کہ اپنی بہن اور بیٹی کو ایسا کرتے وہ دیکھ لے تو وہ بہت کچھ کرسکتا ہے مگر دفعہ ۳۰۲ کا مجرم نہیں ہوسکتا لیکن "وہ" اگر بیوی سے تعلق رکھتا ہے تو معاملہ بڑا خطرناک ہوجاتا ہے بلکہ شوہر کے لئے پھانسی کا پھندہ بن جاتا ہے۔

وہ کی طلسمی نوعیت کی ایک اور مثال پیش ہے۔ کبھی کبھی بلکہ اکثر ہی کہئے وہ کا استعمال اشارہ کے طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن اشارے کے طور پر اس کا استعمال "متزلزل" ہوتا ہے۔ متزلزل سے میری مراد یہ ہے کہ وہ کا اشارہ کبھی کبھی صحیح تفہیم نہیں کرپاتا یا یوں کہئے کہ اشارے کی صحیح ترسیل نہیں ہوپاتی ہے۔ جیسے زید اور بکر کے درمیان ہوا۔

قصہ یوں ہے کہ زید اور بکر دونوں جگری دوست تھے۔ یک جان دو قالب دونوں ایک دوسرے کا ہر راز جانتے تھے۔ اتفاق سے زید کو نوجوانی کا ایک روگ لگ گیا اور وہ ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگیا۔ اپنے عشق کی کہانی وہ اپنے دوست بکر کو خوب چٹخارہ لے لے کر سنایا کرتا تھا کہ آج اس کی محبوبہ ملی تو ایسے باتیں ہوئیں۔ ایسا ہوا ویسا ہوا۔

اتفاق کی بات ایک دن کالج سے واپسی پر راستے میں زید کی نظر اپنی محبوبہ پر پڑگئی۔ جو بازار سے لوٹ رہی تھی۔ اس کے دل میں خواہش ہوئی کہ اپنے دوست کو بھی اپنی محبوبہ دکھلادے اور اپنی پسند اور خوش قسمتی کی اس سے داد حاصل کرے۔

زید نے بکر کو متوجہ کرکے اپنی محبوبہ کی طرف اشارہ کیا: "وہ دیکھو میری محبوبہ جارہی ہے"

مگر بدقسمتی سے اشارہ صحیح ترسیل نہ کرسکا اور قیامت آگئی۔ دراصل زید کی محبوبہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ تھی اور زید نے جس کی طرف اشارہ کیا تھا بکر نے اس کی جگہ دوسری کو سمجھ لیا۔ بس کیا تھا وہ چراغ پا ہوگیا کیوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں، ایک اس کی وہ تھی اب اپنی "وہ" کی بات آئی تو اس کے دماغ کا فیوز اڑنا یقینی تھا۔ مرنے مارنے کی نوبت آگئی۔

اس لئے اشارے کے طور پر وہ کا استعمال ذرا نازک ہے بلکہ خطرناک ہے۔ ویسے اشارے کے طور پر وہ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ ضمیر ہے اور اسم کے بدلے آتا ہے۔ وہ کی معنی خیزی اور طلسم ریزی کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ وہ واحد بھی ہے اور جمع بھی جبکہ ضمیر کی پہلی اور دوسری قسموں کے واحد اور جمع کے الفاظ الگ الگ ہیں۔ لیکن وہ کی جمع وہ ہی ہے۔ یعنی چت بھی میری اور پٹ بھی میری۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے وہ ہی وہ۔ ہر طرح سے وہ ہی وہ۔ اس طرح وہ ہی وہ کہنے کو آپ فضول گوئی پر محمول نہ کریں۔ کیوں کہ وہ معرفت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

وہ سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ سب کا پالنے والا ہے۔ وہی سب کو روزی دیتا ہے اور جب چاہتا ہے وہ مار دیتا ہے۔ کوئی خوشی اور غم ہو ہم سب اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ ہر دم ہماری مدد فرماتا ہے۔ اب دیکھئے نا۔ یہاں پر وہ کی مثال پیش کرنے میں مجھے کچھ پریشانی ہونے لگی تو "وہ" سامنے آگیا اور اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اور جب وہ سامنے آجائے تو اب دوسری بات کہاں ہوسکتی ہے سجدہ ریز ہونے کے سوا۔ ☆

●☆●

دلشاد رضوی
حیدرآباد

انسان اور بندر

مرغی کا شوہر مرغا کبھی کبھار جب بہتر موڈ میں آجاتا ہے تو ایک ٹانگ پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس کی اس ناشائستہ حرکت کے مزید کیا اسباب و وجوہات ہیں یہ تو مرغا ہی جانے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلے ہی اس بارے میں آہستہ سے کچھ اپنی شریک حیات مرغی کے گوش گزار کرچکا ہوتا ہو کیونکہ ان دونوں کے باہمی پیار بھرے تعلقات سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔ اب اگر مرغی اسکی رازداں نہ ہوگی تو کیا مرغی والا ہوگا؟ کافی غور و خوص کے بعد یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ مرغا ایک ٹانگ پر کھڑا ہو اور مرغی اس رازہائے سربستہ سے واقف ہی نہ ہو لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ صاحب بہادر کو مرغے کی یہ ادا کیوں بھاگئی۔ جیسے مغربی باشندوں کی ہر بات بلکہ ان کے سارے قواعد و ضوابط کی شان ہی کچھ جداگانہ ہے۔ چاہیں تو مرد سے مرد کی شادی کروادیں، اب کوئی بتلائے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ہمارے ہاں جیسے مسٹر فلاں کی منکوحہ مسز فلاں ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح ان کے ہاں مسٹر فلاں کا منکوحہ مسٹر فلاں ہوتا ہے۔ پھر اگر کسی حسین لڑکی سے شادی کرنی ہو تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں لیکن ذرا سا فرق تو نمایاں رہتا ہے۔ وہ ایسے کہ اگر موسم سرد ہو، برف کے سفید گالے بکھر رہے ہوں تو صاحب بہادر گرم نرم کوٹ پہنے، سر پر ٹوپی، ہاتھ میں دستانے، پیر میں موزے اور ٹائی سے گلا بند ہو لیکن کیا مجال کہ نازک اندام پھدکتی میڈم بھی ایسی ہی کوئی نامعقول حرکت کر بیٹھے۔ وہ تو سلیولیس گون پہنے گوری گوری عریاں ٹانگیں دکھلاتی اٹھلاتی پھرے۔ بھلے ٹھنڈ سے معصوم کا خون ہی کیوں نہ جمنے لگے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مغربی تہذیب پر سیاہ بدنما داغ نہ لگ جائے! اور اب تو خیر سے ٹاپ لیس (Topless) کا قانون بھی لاگو ہوگیا ہے یعنی اب اچھلتی کودتی لڑکیاں اگر چاہیں تو دھڑلے سے بازاروں میں جس طرح چاہیں نکل جائیں۔ کسی کی مجال ہے کہ قانون کے سامنے زبان ہلائے۔ ویسے بھی اسی میں بڑی سہولتیں کارفرما ہیں جیسے کوئی ممتا بھری ماں اپنے لاڈلے کو دودھ پلانا چاہے تو بلا روک ٹوک یوں لگے کہ جیسے کوئی بندریا اپنے بندر بچے کو دودھ پلارہی ہو۔ پھر ایسی برفیلی جگہوں پر شراب ہی تو ہے جو خون کی روانی کو جسم میں گرما گرم رکھتی ہے۔ چنانچہ ہر کس و ناکس شراب کی چسکیاں لیتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں لیکن لوگ گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں تاکہ وقت مقررہ پر کارروائی مکمل کرلیں۔ پر کوئی منچلا ایسا بھی ہے جو گھڑا سامنے رکھ کر پیتا ہے تاکہ اس گھڑے ہی کے اندر ہی من کا مزا لے سکے لیکن صاحب قاعدہ قانون بھی تو کوئی چیز ہے۔ قانون کے مطابق آدمی اتنا پیئے کہ دوسرے اس کے رعب میں نہ آنے پائیں۔ ایسا بھی کیا کہ صاحب خود تو پی پلا کر موج مستی منائیں اور بیچارے راہ گیروں کو جان کی امان بھی نہ ملے۔ چنانچہ سمندر پار کا پیمانہ ہمارے جام جم سے قطعاً مختلف ہے۔ وہاں ساقی سے یہ گلہ نہیں کیا جاتا کہ تونے اتنا کیوں نہیں پلایا کہ میرے ہوش ہی جاتے رہتے۔ لیکن واہ ری انگریزی پولیس کہ تونے قانون بنانے میں ساری دنیا کو مات دیدی۔ اب اگر کوئی بلانوش پینے میں حد سے تجاوز کرجائے تو دیکھئے کہ وہاں کی پولیس کیونکر انسانیت کا ثبوت دیتی ہے۔ نہ تھرڈ ڈگری کا چلن نہ ہی کوئی مارپیٹ۔ بلانوش کو سیدھے سیدھے تھانہ کی ہوا کھلائیں اور بس ایک ٹانگ پر کھڑا کردیں۔ اب جو مرغے نے انہیں دیکھا تو بغلیں جھانکنے لگا۔ بولا ہائے رے انسان، یہ تجھے کیا ہوگیا۔ میں نے تو جانور ہونے کے ناطے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونا گوارا کرلیا لیکن تو تو اشرف المخلوقات سے ہے، تونے کیوں جانوروں کی نقل کرنی شروع کردی۔ ارے اب حیوانوں کی کونسی حرکت بچی ہے جسے تونے اختیار نہیں کیا، بیچارے شرم کر، ایسا بھی کیا کہ دنیا مجھ کو انسان اور تجھ کو جانور سمجھنے لگے۔ لیکن بیچارے مرغے کو کیا معلوم کہ مغربی تہذیب جانوروں ہی کی حرکات پر فریفتہ ہوگئی ہے اور یہی تو بیسویں صدی کا کمال تھا کہ گو وہ جانوروں کو انسان نہ بنا سکی لیکن انسان کو جانور بنا کر رکھ دیا! ☆

محمد روشن علی کرنل
7-2-217, Mankammathota,
Karimnagar-505002. A.P.

غزل

بنا کے اس کو دلہن پالکی میں لے آیا
اندھیری شب میں نہیں چاندنی میں لے آیا

دکھا دکھا کے اسے خواب چاند تاروں کے
پھرا کے محل سرا جھونپڑی میں لے آیا

حسین ساتھی کو پایا تو بادلا بن کر
نمائشوں میں پھرا پارٹی میں لے آیا

لگانا چاہا جو گل اس نے اس کے جوڑے میں
تو پھول گوبھی کے فل ٹوکری میں لے آیا

نہیں ہے یاد کہ نرگس تھی یا مدھو بالا
کسی کا عشق مجھے شاعری میں لے آیا

نہ دن کو چین نہ راتوں میں نیند کرنل کو
بڑی حسین بلا زندگی میں لے آیا

☆●☆

م۔ آصف آروی
برہ بترا۔ آرہ

ہوگیا نبیانوے کا انتقال
واقعی یہ سانحہ ہے پرملال

اب ہوئے گدی نشیں سن بیس سو
راج ان کا بھی رہے گا ایک سال

راج گدی کب سدا کس کی رہی
سب کے اوپر وقت لاتا ہے زوال

اے نئی سرکار تجھ سے عرض ہے
تو نہ ہم سب کو پریشانی میں ڈال

سال کا ہوتا ہے قاتل پہلا دن
مرغ لاکھوں بے سبب کردے حلال

پھر بھی اے سن بیس سو خوش آمدید
تو مگر رکھ مرغ تک اپنا جلال

سال نو آصف کا بچ یہ قول ہے
ہو شرافت پر حکومت جب کمال

●☆●

ڈاکٹر جمال احمد خاں سوری
(لندن)

غزل

ہم نہ غالب ہوئے نہ میر ہوئے
زلف بیگم کے بس اسیر ہوئے

جب سے بیگم ہمارے گھر آئیں
ان کے فیشن سے ہم فقیر ہوئے

قدر بیگم کو کب ہوئی میری
ان کی نظروں میں ہم حقیر ہوئے

روز تحفے کہاں سے لاتے ہم
ہم کہاں اس قدر امیر ہوئے

ناز ہوتا ہے سب کو بیگم پر
"ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے"

ایک ہی غم ہے میری بیوی کو
میرے شوہر نہ کیوں وزیر ہوئے

میری غزلوں سے آج پھر ان کو
ہوگیا شک کہ ہم شریر ہوئے

بعد شادی کے چند سالوں میں
فکر فردا کے غم سے پیر ہوئے

خاک بیگم ڈرینگی اب ہم سے
جب کے ڈھیلے مرے شریر ہوئے

جب سے شوہر میاں جمال ہوئے
زن مریدوں کے وہ سفیر ہوئے

☆●☆

متین عمادی
منگل تالاب، پٹنہ

الیکشن کارگل

عنوان دیکھ کر آپ یہ دھوکا نہ کھائیں کہ میں گل صاحب کے کارناموں کو پیش کرنے جارہا ہوں۔ بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ الیکشن بھی ایک "کارگل" ہے۔ یہاں بھی بڑی بڑی سیاسی پہاڑیاں ہیں۔ ان کو سر کرنے کے لئے نیتاؤں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں۔ حکومت کی ساری مشنری اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ اسکول، کالج، آفس اور بینک کے کرمچاریوں کی جان پر بن آتی ہے۔ الیکشن پر خرچ ہونے والے روپئے کے لئے سرکاری خزانے کا منہ کھل جاتا ہے۔

خدا نہ کرے کوئی الیکشن کے جھمیلے میں پڑے یقین مانئے یہ بڑا خراب جھمیلا ہے مگر کیا کیجئے آپ سرکاری یا کسی نیم سرکاری دفتر میں ملازم ہوئے اور یہ جھمیلا آپ کی قسمت میں، بحالی کے بعد ہی لکھ دیا جاتا ہے۔ اقبال کا شعر:

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال نے آج کی جمہوریت کو تصور کی آنکھوں سے کتنا پہلے دیکھ لیا تھا۔ افسوس ہے کہ اقبال نے پیشین گویاں نہیں کیں۔ اگر وہ پیشین گوئی کرتے تو شاید یہ سب کچھ لکھ جاتے کہ ہمارے دیس میں ایسی جمہوری حکومت ہوگی جس میں 99 فی صد ہمارے قوم دروغ گو ہوں گے۔ جس میں مذہب کے نام پر فتنہ و فساد برپا ہوگا۔ جس میں لیڈر اقتدار کی کرسی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچی جائے گی۔ چاہے ٹانگ رہے یا جائے ہمارے دیس میں ایسی جمہوری حکومت ہوگی جس میں مجرم جیل کے اندر رہ کر پرچہ نامزدگی داخل کرے گا اور الیکشن جیتے گا۔ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے نیتا غنڈوں کی پرورش کریں گے۔ ملک میں ہونے والے ہر حادثے میں غیر ملکی ہاتھ نظر آئے گا اور اپنا ہاتھ پاک و صاف دکھائی دے گا۔ تعصب کی بنیاد پر پولیس کارروائیاں تیز ہو جائیں گی۔ ہر طرف گھوٹالے ہی گھوٹالے نظر آئیں گے۔ شہروں اور سڑکوں کے نام بدلنے میں قوم کی عزت سمجھی جائے گی۔ بابری مسجد شہید ہوجائے گی اور اس کو شہید کرنے والے بڑے مجرم کو عدالت کی طرف سے صرف ایک دن قید کی سزا ہوگی۔ گرانی اپنے عروج پر ہوگی اور پیاز 80 روپئے کیلو بک جائے گی۔ سرسوں تیل کا دام بڑھانے کے لئے ڈراپسی کا ہوا کھڑا کیا جائے گا۔ ہر کام رشوت کے سہارے ہوگا۔ نیتا اپنی کالی کمائی سوئٹزرلینڈ میں جمع کریں گے۔

1998ء کے پارلیمنٹ الیکشن میں مجھے پریسائیڈنگ آفیسر بنایا گیا۔ سخت الجھن ہوئی کہ پہلی بار پریسائیڈنگ افیسر بن گیا ہوں۔ بڑی ذمہ داری ہے کیسے الیکشن کراؤں گا۔ پھر سوچا تین دن ٹریننگ ہوگی کام سیکھ جاؤں گا۔ ٹریننگ میں بیلٹ بکس کھولنے اور بند کرنے سے لے کر پیکٹ بنانے اور ڈائری بھرنے تک کا کام بڑی وضاحت سے بتایا گیا۔ جی خوش ہوگیا کہ اب کیا ہے۔ کام آسان ہے۔ ہماری پولنگ پارٹی کو الیکشن کارگل کے لئے ایک ٹرک پر اس طرح بٹھا دیا گیا جیسے ہم لوگ پولنگ آفیسر نہیں ہیں بلکہ بیانڈ پارٹی ہیں۔ ٹرک ناہموار دیہی راستے پار کرتا رہا اور زبان یا حفیظا کا ورد کرتی رہی۔ بہت دور جاکر ایک جگہ ایسی آئی کہ زمین دور تک کٹی ہوئی تھی۔

ٹرک ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور آگے جانے سے انکار کردیا۔ ہم لوگوں نے ڈرائیور کی خوشامد کی اور کہا بھائی منزل دور ہے
صورت اس گڈھے کو پار کرو۔ وہ نیچے اترا۔ گڈھے کا معائنہ کیا۔ دیر تک سوچتا رہا پھر کہیں سے دوچار اینٹ لے آیا۔ گڈھے میں ر
ٹرک اتارنے کا ارادہ کیا۔ سب نے کہا ہم لوگ اتر جاتے ہیں۔ ٹرک کو ہلکا کردیتے ہیں تم کو پار کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ بگڑ گیا
آپ کو اپنی جان پیاری، میری جان پیاری نہیں ہے؟ بیٹھئے ٹرک لٹے گا تو سب مریں گے۔ بچیں گے تو سب بچیں گے۔ آخر
لوگ ٹرک پر سوار ہوگئے اس نے گاڑی گڈھے میں اتاری پھر اوپر چڑھائی۔ ہر ہچکولے پر دل منہ کو آرہا تھا۔ خیریت ہوئی کہ ا
کوئی دل کا مریض نہ تھا ورنہ موت کے بکس میں خود ہی پول ہوجاتا۔ خدا خدا کر کے سب اپنی منزل پر اترتے گئے۔ ہماری منزل آ
تھی۔ تین بجے شب اپنی منزل یعنی بوتھ پر اترا۔ ہر طرف تاریکی کا غلاف، چاروں طرف کھیت اور درخت، ایک متنفس دکھائی نہیں
تھا۔ یہ داستہ کیدر ایسا لگ رہا تھا جیسے بھوت بنگلہ ہو اور ہم لوگوں کی آخری آرام گاہ کے لئے یہ جگہ رکھی گئی ہے۔ میں نے ٹارچ
تو ساتھ آئے ہوئے دو پولیس والوں نے کہا حضور ٹارچ نہ جلائے۔ نکسلائٹ ایریا ہے۔ ہم سب نے خود کو کمرے میں بند کر کے ٹ
جلادی اور دھیمی دھیمی سانس لیتے ہوئے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ ملٹری کی ایک جیپ بیلٹ پیپر لے کر آئی۔ اس جیپ
میرے ہی بوتھ پر قیام کیا اور ہم لوگوں کی جان میں جان آئی۔ کسی صورت ووٹنگ کا عمل گزار کر وہاں سے واپسی ہوئی۔ جان بچنے
لئے جتنی منتیں مانگی تھیں انہیں گھر آکر پورا کیا اور ارادہ کیا کہ اب کبھی الیکشن کارگل پر نہیں جاؤں گا۔ مگر میرے ارادے سے کیا
ہے نیتاؤں نے 13 مہینے ہی کے بعد سرکار الٹ دی اور 99ء میں پھر الیکشن سر پر مسلط ہوگیا۔ آخر پولنگ کا دن نزدیک آیا۔
پولنگ آفیسر ہونے کا لیٹر مل گیا۔ گزشتہ الیکشن کی پرچھائی نظر میں گھوم گئی۔ حواس باختہ ہوگیا۔ منہ بنا کر بیگم سے کہا پھر الیکشن آ
ہے اور علاقہ وہی ہے۔ انہوں نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا اللہ نگہبان ہے۔ گھبراتے کیوں ہیں۔ گزشتہ سال کیسے بچ کر چلے آئے۔
کے بھی اللہ حفاظت کرے گا۔ یہ بتائیے پیسہ کتنا مل رہا ہے۔ میں نے کہا ساڑھے پانچ سو۔ وہ پھر بولیں چلئے کچھ کام نکل جائے گا۔
کی لمبی فہرست پیش کر دی گئی۔

اندر سے دہل رہا تھا پھر بھی جی کڑا کر کے الیکشن کارگل پر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ الیکشن پر جانے سے ایک دن پہلے
کر اٹھا تو دیکھا بیگم سل کے پاس بیٹھی چنے کی دال پیس رہی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ناشتے میں پوری بنانے کا ارادہ ہے۔ انہوں نے
اٹھا کر ایسی نظروں سے دیکھا جو اس بڑھاپے میں کم نصیب ہوتی ہے۔ بیٹی نے کہا آپ الیکشن پر جارہے ہیں نا! امی حلوہ بنا رہی
ساتھ لے جائیے گا۔ میں خوش ہوا کہ الیکشن کارگل کے لئے اس سے مقوی غذا اور کیا ہوسکتی ہے۔ میں نے فرمائش کی کہ تھوڑی
خستہ غری بھی بنا دینا۔ شام تک وہ فرمائش بھی پوری ہوگئی۔ بیٹے کو کچھ روپے دیئے کہ ایک ڈبا امول بٹر اور سلائس بریڈ کا ایک بڑا پیا
لے آؤ چار دن کا معاملہ ہے۔ ایک بیگ میں ایک جوڑا کپڑا، مکھن، سلائس بریڈ، حلوہ، غری، منہ دھونے کے لئے پیسٹ اور برش
رات ہی کو سب سامان درست کرلیا کیوں کہ صبح 6 بجے روانہ ہونا تھا۔ گزشتہ الیکشن کا نظارہ آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اس حول نے
میں مروڑ پیدا کر دیا۔ بار بار بیت الخلاء کی دوڑ شروع ہوگئی۔ صبح تک بستر پر لگ گیا الیکشن کارگل کا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ سوچا اس مروڑ
خدا کی مصلحت ہوگی۔ اس کو جان بخشی کی یہی صورت بہتر لگی ہوگی۔ اس کے ارادے کو کون جان سکتا ہے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ لیکن
کو حلوہ گھوٹنے کی محنت، غری بنانے کی زحمت اور پانچ سو روپے چھوٹنے کا دکھ تھا۔ بچے خوش تھے کہ حلوہ جی بھر کے کھائیں گے
سلائس بریڈ پر مکھن لگا کر کھانے میں کیا مزا آئے گا۔ ☆

●☆●

سگ لیلیٰ (بارہویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی
حال مقیم امریکہ

بیچ کا سیزن

جب سے ہم اس "کتا سم" پر نکلے تھے، عجیب عجیب واقعات، سانحات اور حادثات سے دوچار ہو رہے تھے۔ پہلے پہل واٹلڈ لائیف ایکسپرٹ پسٹن جی پالن جی دارو والا ملے تو آدمی کی صورت لیکن بہت جلد کتے کی دم ثابت ہوئے اور اب ڈاکٹر ڈی کتا والا کی ڈسپنسری میں تازہ شاک یہ لگا کہ مسز مال پانی کے ہبی (HUBBY) جنہیں ہم نے کتا سمجھا، وہ شوہر نکلے گویا بقول شاعر۔

جنہیں چوپایہ سمجھے تھے وہ آخر مرد نر نکلے

دو پائے کو چوپایہ سمجھنے کی غلطی ہم سے ہو چکی تھی اور اس غلطی کو بنیاد بنا کر مسز مال پانی اس سے پہلے کہ ہمارے خلاف کوئی نیا محاذ کھڑا کرتیں ہم نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے مدلل لہجہ میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کیا، "ڈاکٹر صاحب، محترمہ کے ہبی (HUBBY) کو ہنی ڈارلنگ کے قبیلے سے وابستہ کرنے میں بخدا میری کوئی خطا نہیں کیونکہ جیسا کہ آپ نے فرمایا اعلیٰ سوسائٹی میں شوہر حضرات صرف ہسبنڈس (HUSBANDS) نہیں، ہبی (HUBBY) کہلاتے ہیں۔ اس طرح میری معلومات کے مطابق اونچی سوسائٹی کی بیویاں اپنے شوہروں کو ہنی (HONEY) بھی کہتی ہیں اور آپ کے مریض کی مالکن نے کتے اور شوہر دونوں کے ناموں کو خلط ملط کر کے خود ہی اپنے شوہر کا مذاق اڑایا ہے اور الزام میرے سر پر رکھ رہی ہیں ...! ہماری اس دلیل پر مسز مال پانی ہکا بکا رہ گئیں اور ڈاکٹر صاحب بھی غالباً چکرا گئے تھے۔ چنانچہ بڑبڑا کر بولے "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ابھی آپ جا کر میری سیکس ٹری سے کل ہی کا اپوائنٹمنٹ سے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔" یہ کہہ کر موصوف نے ہمیں سیڑھیوں ہی سے چلتا کر دیا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمیں چلتا کرنے سے پہلے وہ خود ہی سیڑھیاں عبور کر کے مسز مال پانی اور ان کی ہنی ڈارلنگ کے ہمراہ اپنے مخصوص چیک اپ روم کی طرف چلتے بنے اور یہ تک بتانے کی زحمت نہیں کی کہ ان کی سیکس ٹری، کرسمس ٹری، کی طرح کس کمرے میں ہماری راہوں میں آنکھیں بچھائے مسکراتی ہوئی ملے گی!!

عجیب بھول بھلیوں کا سا چکر تھا۔ ایک ناہنجار کتے کی خاطر دھکے کھائے جا رہے تھے۔ ہر بار منزل سامنے نظر آتی لیکن افسوس کمند اسی وقت ٹوٹ جاتی جب کہ لب بام صرف دو چار ہاتھ رہ جاتا۔ اس مرتبہ ہم شاید بیچ کا تل استعفاء پیش کر کے اس عشق کا خاتمہ بالخیر کر دیتے جسکی ابھی تک ٹھیک سے ابتداء بھی نہیں ہوئی تھی اگر بیچ میں ڈاکٹر بی بی کتا والا کی "سیکس ٹری" کا شوشہ نہ نکل آتا۔ پتہ نہیں فی الحال یہ شوشہ اپنی اصلی شکل میں کہاں، کس جگہ روپوش تھا۔ ایک بات البتہ بالکل واضح تھی کہ سیکس ٹری کا خاص کیبن (Cabin) اوپری منزل پر ہرگز نہیں تھا ورنہ ڈاکٹر صاحب ہمیں سیڑھیوں کے پاس سے چلتا نہیں کرتے۔ پھر یقیناً نیچے راہداری میں جو دو رویہ کیبن بنے ہوئے تھے انہی میں سے کسی ایک میں سیکس ٹری کی نشست و برخاست کا اہتمام ہوگا۔ اپنے تئیں اس نتیجہ پر پہنچتے ہی ہم نے کیبنوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ بالآخر آخری سرے والا کیبن، سیکس ٹری کا ثابت ہوا۔ دروازے پر لگی چوکور دھاتی تختی پر "سیکس ٹری" لکھا ہوا تھا۔ ہم دروازے تک تو پہنچ گئے لیکن اندر جانے کی ہمت کسی طرح نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اندر سے کتے کے

بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ البتہ جس چیز نے ہمیں عادت کے مطابق سرپہ پاؤں رکھ کر بھاگنے سے روکے رکھا وہ تھی پس منظر موسیقی کتے کی بھوں بھوں کیساتھ بڑی خوبی سے تال دے رہی تھی۔ کسی "میوزیکل کتے" کی آواز سے پہلی بار پالا پڑا تھا۔ نتیجتاً خوف کی تجسس کا جذبہ حاوی ہوگیا اور ہم نے بے اختیار ہوکر دروازے پر دستک دی جس کے جواب میں میوزیکل کتے کی آواز یک لخت ہوگئی اور تھوڑے سے توقف کے بعد ایک مہین نسوانی آواز سنائی دی۔ "کم ان پلیز (please come in) !!

ہم اس مہین آواز کی ڈور سے کھنچے کھنچے کیبن میں داخل ہوئے اور سب سے پہلے میوزیکل کتے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں ہر کونا خالی نظر آیا تو ٹیبل پر نظر ڈالی۔ ٹیبل پر ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا دکھائی دیا جو اس بات کا منھ بولتا ثبوت تھا کہ میوزیکل کتا کی شکل میں اس میں بند ہے۔ گویا سیکس ٹری صاحبہ کتے کی محض آواز سے محظوظ ہورہی تھیں۔ اس طرف سے اطمینان حاصل ہو۔ ہم نے سیکس ٹری کی طرف نگاہ کی۔ دل سے بے ساختہ ڈاکٹر صاحب کے لئے ان کے شاندار انتخاب اور اس سے زیادہ اس انتخا موصوف نے جس نام سے منسوب کیا تھا اس کے لئے داد و دعاء دونوں ایک ساتھ نکلے۔

خدا گواہ ہے کہ اس سے پہلے اتنی شاندار، اتنی گھنی، اتنی تناور، اتنی سایہ دار سیکس ٹری ہماری نظر سے نہیں گزری تھی۔ غریب الوطنی کی کیفیت میں اس گھنی چھاؤں تلے بیٹھ جانے کو جی چاہا۔ بڑے جبر اور برداشت سے جی کی اس چاہ کو دبانے میں کام ہوئے۔ بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اگر حیوانات کے ڈاکٹر ایسی لذیذ اور مقوی سیکس ٹری رکھنے لگیں تو پھر لوگ کتے، بلیوں کے سا اپنی بیماریوں کے علاج کیلئے ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کو چھوڑ کر حیوانات کے ڈاکٹروں کے ہاں جانے لگیں گے۔ سیکس ٹری کی چھاؤں میں پہنچ کر تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر چچا غالب کی طرح ہم بھی وہاں پہنچ گئے جہاں پہنچ کر غالب نے فرمایا تو

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی !!

سیکس ٹری نے ہمیں اپنے روبرو پاکر خالص پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں اگر کوئی خدمت کرنا ہی ہے تو بس اس طرح مسکراتی رہئے۔ ہری بھری، پھل دار اور جوان رہئے" دل سے بے ساختہ یہ نکلی۔ حالانکہ محترمہ نے پہلے ہی جملے میں اردو کی ٹانگ توڑ دی تھی، ہمارے اس عیسائی دوست کی طرح جو خود کو دھڑلے سے اردو دا ہیں اور ایسے جملے "چھوڑتے" رہتے ہیں۔ "میں اردو کا موٹا موٹا کتاب پڑھتی ہے، میرا بیوی بھی اردو بولتا ہے!" اس جملہ معترضہ قطع نظر حسن ہماری نظر میں زبان کا محتاج نہیں ہوتا کہ منھ کھولے بغیر ہی یہ حسن والے مطلب کی ہر بات کہہ جاتے ہیں۔ یوں بھی ش کی کمان اگر کسی ہوئی ہو تو تیر اپنے آپ ہی چلتے اور زد میں آنے والے کو بہت کچھ سمجھا ہی دیتے ہیں۔ سیکس ٹری صاحبہ ہمارے ج کی منتظر تھیں۔ ہم نے فی الحال دل کی بات کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے مطلب کی بات کہی۔ "محترمہ۔ آپ سے دست بستہ درخواست۔ کسی طرح ڈاکٹر صاحب سے فی الفور یعنی کہ ارجنٹ اپوائنٹمنٹ دلوا دیجئے پلیز۔!!"

"مشکل۔ Impossible" محترمہ نے سامنے رکھے ڈیسک کیلنڈر پر درج ملاقاتیوں کی لمبی چوڑی فہرست کی طرف دیکھتے ہ کہا۔ ہم نے جواباً مکھن آلودہ لہجے میں کہا۔ "پلیز کچھ کیجئے۔ کہیں بھی کسی دو اپوائنٹمنٹ کے بیچ میں سینڈوچ کی طرح پہنچا دیجئے مجھے آپ کی اور آپ کے کتے کی عمر دراز کرے!" "درازی عمر والے بالخصوص کتے کی درازی عمر والے شوشے نے ہماری درخواست کو قابل اعتناء بنا دیا تھا۔ محترمہ کے ہشاش بشاش چہرے اور تروتازہ پھولوں کی طرح کھلی کھلی آنکھوں میں اپنے لئے اپنائیت کا رنگ نظ محترمہ نے مسکرا کر پوچھا: "آپ کو کیسا مالوم، میں کتا بھی پالتی ؟"

جواب میں اسی کمھن آلود لہجے میں عرض کیا: "آپ کے چہرے کا تیج، آپ کی آنکھوں کا اطمنان، صاف بتاتا ہے کہ آپ کے خوش و خرم دکھائی دینے کا راز ہے ایک شاندار وفادار کتا۔ جو آپ کو کسی ساتھی، کسی ہمدرد کی کمی محسوس ہونے نہیں دیتا بلکہ خود ہی آپ کے سارے دکھ بانٹ لیتا ہے ۔ اسی لئے تو کتے کا شمار وفادار چوپایوں میں ہوتا ہے اور آپ بھی شاید اس سے ایک پل کی دوری برداشت نہیں کر سکتیں تب ہی تو جب وہ پاس نہیں ہوتا تو اسکی آواز سے دل بہلایا کرتی ہیں ۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا، ابھی میرے آنے سے پہلے آپ جس میوزیکل کتے کی سریلی آواز سن رہی تھیں وہ یقیناً آپ ہی کے کتے کی ہے ۔"

ہمارے انکشاف پر محترمہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مارے خوشی کے اپنے کتے کی تعریف سن کر پھول کر کپا ہو گئیں ۔
ہم نے انہیں اور پھلانے کیلئے کہا۔ "آپ کا کتا یقین جانئے اس جہاں فانی کا واحد کتا ہے جس کی آواز میں کوئل کی سریلی تان، پپیہے کا دل گداز درد، جھرنوں کا لوچ، ندی کا شور سبھی آپس میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔" ہم نے دل پر جبر کر کے کتے کی تعریفوں کے پل باندھے حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اگر کبھی غلطی سے عنان حکومت ہمارے ہاتھ لگ جائے تو سب سے پہلا حکم جو صادر فرمائیں گے وہ اس دنیا سے یا کم از کم اپنی عملداری سے کتوں کا نام و نشان تک مٹا دینے کا فرمان ہو گا ۔
سیکس ٹری صاحبہ ہماری اصلی نیت سے بے خبر ڈسک کیلنڈر پر درج ملاقاتیوں کی فہرست کو دوبارہ غور سے دیکھتی ہوئی بولیں ۔ "کوئی اور سیزن ہوتا تو میں تمہارے لئے پانچ دس منٹ کا ٹائم کیسا بھی کر کے نکال لیتی لیکن پرابلم یہ ہے کہ یہ کتا لوگ کا سیزن ہے ۔ اس سیزن میں ڈاکٹر صاحب کا شیڈول ایک دم ٹائیٹ!"

"کتوں کے سیزن سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟ میں کچھ سمجھا نہیں !" بات واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی ۔ ہمارے سوال کے جواب میں محترمہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "او یو ناٹی (Oh you naughty) مسخری کرتا ہے ۔؟" سیکس ٹری صاحبہ ایسی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگیں جیسے ہم جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے خود انہی کی زبانی ، اس بات کا مطلب سمجھنا چاہتے ہوں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ محترمہ کا چھوڑا ہوا کتوں کے سیزن کا شوشہ واقعی ہمارے لئے ناقابل فہم تھا۔ چنانچہ ہم نے گلے کو چھو کر بات بات میں قسمیں کھانے والی لڑکیوں کی طرح اعتراف کیا۔ "قسم سے میں بالکل نہیں جانتا کہ کتوں کا سیزن کسے کہتے ہیں ؟ یہ کیا ہوتا ہے ؟ سچ مانئے میں نے تو اب تک آم کے سیزن، انگور کے سیزن، شادیوں کے سیزن کے بارے میں سنا تھا۔ یہ کتوں کا سیزن آج پہلی بار سنا ہے !!"

"اے مسٹر تم سچی میں اتنا Innocent ہے یا خالی پیلی بنتا ہے ؟" محترمہ نے بدستور ناقابل یقین نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم شادی کا سیزن کا بات بولا نا، شادی کا سیزن کے بعد کون سے سیزن آتا بولو... ؟"

ہم نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "شادی کے سیزن کے بعد... کون سے سیزن آتا ہے ... ہاں طلاق کا سیزن آتا!" سکریٹری صاحبہ جھنجھلا کر بولیں ۔ "ارے ارے ارے ۔ کیسا اڑیا آدمی ہے بابا تم، شادی کے بعد سیدھا طلاق کے اوپر چلا گیا ۔ ارے ان دونوں کا بیچ میں بھی تو ایک سیزن اور آتا، بچہ لوگ کا بابا لوگ کا بنے کا، لوگ کا سیزن... "

ہم نے فوراً اپنی بھول کا اعتراف کرتے ہوئے کہا "سوری سوری، یہ بیچ کا سیزن تو میرے ذہن سے ہی نکل گیا!"
محترمہ نے مسکرا کر فرمایا ۔ "کتا لوگ میں آج کل یہ ہی شادی اور طلاق کے بیچ والا سیزن چل رہا ہے ۔" سیکس ٹری صاحبہ کی وضاحت پر ہم نے اپنی عقل کا ماتم کیا کہ ہمارا دھیان اس طرف کیوں نہیں گیا ۔ لیکن کم بخت دماغی نے ہمیں یعنی ایک مرد کو ایک عورت یعنی سیکس ٹری کے سامنے اسطرح شرمسار کر دیا کہ سوائے سر جھکانے کے کوئی چارہ نہ تھا !! ۔☆ (جاری)

●☆●

گوپال چترویدی
ہندی سے ترجمہ: ایف ایم سلیم

اغواء کے پہلو

نیند دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ "کمبھ کرن" سوتے رہے، لنکا جل گئی۔ ہمارے سوتے سوتے "ملینیم" آگیا۔ صبح اٹھے تو اغواء کئے گئے مسافر صحیح سلامت لوٹ چکے تھے۔ ہمیں خوشی کے ساتھ ساتھ غم بھی ہوا۔ سرکار کو سودا منظور ہی تھا تو صرف تین دہشت گردوں کا سودا کیوں کیا۔ پورے چھتیس سے چھٹکارہ پالیتی۔ ملک سے "دہشت" کا ڈنک نکل جاتا اور صرف امن چین کی "وادی" بچ جاتی۔ مفت میں روٹی توڑنے کے لئے اپنے بھائی ہی کافی ہیں۔ غیر ملکیوں کو ایسی سہولت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بڑے آدمی اپنے گھر کی کھدائی کر کے کبھی چھت کے نیچے تو کبھی "فلش" کے اوپر نوٹوں کی گڈیاں چھپاتے ہیں۔ یہ محض غلط فہمی ہے کہ ایسا وہ صرف "انکم ٹیکس" والوں کو دھوکہ دینے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی ان کا یا ان کے لاڈلے کا اغواء ہونا ہی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کو خود کا ہی سہارا ہوتا ہے۔ کہنے کو شہر میں پولیس ہے لیکن اس کا اصلی کام بڑوں کی "سواری" کے لئے سڑک کی صفائی کا ہے۔ اس انتظام کے دوران اگر کوئی چور اچکا پکڑا جاتا ہے تو یہ اس کی بد قسمتی ہے۔ ہمارے نیک دل وردی والے ارادتاً ایسی حرکت نہیں کرتے۔

اغواء کرنے والوں کی سہولت کے لئے ہر بڑا آدمی سیل فون سے لیس رہتا ہے۔ "کڈنیپر" اس کی جان کی قیمت لگاتے ہیں۔ وہ ان کی شکل، گفتگو کے معیار اور چال چلن سے ان کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ ساگ سبزی سے لے کر سیاست تک مول تول کرنا ہماری قومی روایت ہے۔ مثلاً کڈنیپر نے پچاس لاکھ کی مانگ کی۔ اغواء کیا گیا بڑا آدمی ان کو اسی وقت جواباً کہتا ہے "بھیا! اتنا مانگو گے تو گھر والے جواب تک نہیں دیں گے۔ بیوی سوچے گی کہ لاکھوں گنوانے سے بہتر ہے یہ بلا جہاں قید ہے وہیں رہے۔ بیٹے خود مختاری کے خیال سے خوش ہوں گے۔ رامو بھروسے کا نوکر ہے اگر بیس بات طے ہوسکے تو ہم اس سے کہہ کر منگوادیتے ہیں۔ نہیں تو آپ کی مرضی۔

اغواء کرنے والے سڑک کے خطروں سے خوب واقف ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی سرکاری سواری "کالا قدمی" کرتی رہتی ہے۔ کہیں بیٹھے بٹھائے پولیس والے نے دھر دبوچا تو تہاڑ جیل کا سفر کرنا پڑے گا۔ چنانچہ وہ رامو بھیا والی بات مان لیتے ہیں۔

ہمارا یہ ایقان ہے کہ سرکار نے ایسے ہی مصیبتوں کے وقت کے لئے دہشت گردوں کو کالے دھن کی طرح سنبھال کر رکھا ہے۔ اسے بھی اپنی خفیہ ایجنسیوں پر اتنا ہی اعتبار ہے جتنا کہ عوام کو پولیس پر۔ اغواء کرنے والوں کی عنایت ہے کہ انھوں نے ہوائی جہاز کے اغواء کے لئے کھٹمانڈو کا انتخاب کیا۔ مگر وہ کلکتہ، پٹنہ، دہلی یا ممبئی کا انتخاب کرتے تو ہم کون سا انہیں روک لیتے۔ اغواء کرنے والوں کے لئے ہوائی جہاز اتنا ہی لازمی ہے جتنا کہ ایک چھوٹی بچی کا ایکسلیٹر (خود رو سیڑھیاں) میں پھنس کر جان دے دینا۔ ایکسلیٹر نے جب جان لینے کی ٹھان ہی لی ہے تو اس کی دیکھ بھال کرنے والے ایمپلائز اور آفیسر محض مجبور ہیں۔ وہ صرف تماشا دیکھتے ہیں۔

اسی طرح امرتسر میں ہم سب نے دیکھا۔ اغواء شدہ جہاز آیا، اترا ٹہلا اور چلا گیا۔ ہمارے اعلیٰ افسر سوچتے رہے کہ اسے اب روکیں تب روکیں اور وہ پر سفر پر روانہ ہوگیا۔ یوں اس میں ان کا بھی کیا قصور ہے؟ وہ سب تجربے کار افسر ہیں۔ ان کا فیصلہ نہ لینا یا دیر سے لینا ہی اچھے فیصلے کی نشانی ہے۔ وہ فوج کے افسر تو ہیں نہیں کہ سرحد پر بندوق کے ٹریگر پر انگلی رکھے بیٹھے ہیں اور بنا سوچے اسے دھڑا دھڑ دبائے چلے جارہے ہیں۔ اڈمنسٹریشن یوں تو چلتا نہیں ہے۔ قابل افسر ہر موقع پر منتری، نیتا یا ایم ایل اے یا پھر کسی ایم پی کے "پریشر" کا انتظار کرتا ہے۔ پھر اسے ذاتی طور پر بھلے برے کی ترازو پر تولتا ہے اور تب بھی کچھ فیصلے کی "سکوپ" بچی ہے تو کوئی فیصلہ کرتا ہے۔

امرتسر میں حالات بالکل جدا تھے فیصلہ کمیٹی کو لینا تھا اور کمیٹی کبھی فیصلہ لینے کے لئے نہیں بنائی جاتی۔ 12 افراد کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہے۔ ساری معلومات حاصل کرنا اہم ہے۔ اغواء کرنے والوں کے پاس چاقو چھری یا پستول ہے یا نہیں؟ آیا ان کے پاس ہتھگولے تھے؟ اگر تھے تو کتنے تھے؟ اے کے 47 ان کے پاس تھی یا یہ صرف پائلٹ کا خیال تھا؟ انہوں نے یہ بھی پتہ لگانے کی کوشش کی کہ جہاز میں ضرورت کے مطابق پٹرول ہے یا نہیں۔ بجائے ان کو صحیح اطلاع دینے کے "کڈنیپروں" نے ثابت کردیا کہ پٹرول چاہے کم ہو، مگر ہے۔ چنانچہ وہ لاہور کے لئے اڑگئے۔ ان حالات میں جہاز کو جبراً روکنے کی ہدایت وہ کیسے دیتے۔ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی ہے۔ اس کمیٹی کو دوسرے کندھے نظر ہی نہیں آئے۔ وہ ایک دوسرے کے کندھے دیکھتی رہی اور جہاز کو جانے دیا۔

دہشت پسندی کے جدید دور میں ہر سرکار میں ایک عدد وزیر خارجہ اس لئے ہوتا ہے کہ جہاز کا اگر کوئی "کڈنیپر" اغوا کرلے تو اسے وہ اپنی کوششوں سے چھڑالے ہمارے وزیر خارجہ کو کرائسس مینجمنٹ گروپ کا احسان مند ہونا چاہئے کہ اس نے انہیں اپنی اہلیت اور کارگزاری دکھانے کا پورا موقع دیا۔

منتری نے ریسرچ کی اور دیکھا کہ دہشت گردوں کی اس واردات سے ہندوستان اور امریکہ قریب آئے ہیں۔ طالبان اور پاکستان کے ارادے بھلے ایک ہوں۔ ان کی آواز الگ الگ ہے۔ پھر بھی وزیر خارجہ کو اپنے "پتے" کمزور لگے تو انہوں نے جیل سے تین دہشت گرد جو کر نکال کر اپنی کوششوں کے "پتوں" میں فٹ کردئے۔ اس چالاک چال میں اغوا کرنے والے کامیاب ہوکر اپنے گھر چلے گئے۔ سرکار کامیاب ہوکر "ہیپی نیو ائیر" کہتی ہوئی دہلی چلی آئی۔ تمہاری بھی جئے۔ جئے ہماری بھی جئے جئے!۔ ☆

سمر کول
انگریزی سے ترجمہ:
ڈاکٹر میر گوہر علی خاں

ایک متفقہ رائے

میرے پڑوسی شری سورج بھارتی نہایت شریف، بھولے بھالے مگر خوددار شخص ہیں لیکن خوشی ان سے کوسوں دور رہتی ہے۔ یہ تو ہیں ان بیاہے مگر اپنے گھر میں تیرہ (13) نوجوان لڑکیوں کی پرورش کر رہے ہیں، جو کسی نہ کسی طرح سے ان کی رشتہ دار ہیں۔ ان کے گھر مزید دو داماد براجمان ہیں اور تیسرا جس کی بات پکی ہو چکی ہے کبھی کبھار قدم رنجا فرماتا ہے۔

گزشتہ کئی سالوں سے وہ اپنی چھٹیاں منانے کی سوچ رہے ہیں۔ اس بار تو انہوں نے اپنا بستر باندھ لیا اور سوٹ کیس میں ضرورت کی ساری چیزیں بھی رکھ لیں بعد ازاں ان ساری لڑکیوں کے سامنے اپنی چھٹیاں ان کے آبائی گاؤں میں گزارنے کا اعلان بھی کر دیا جو گنگا کنارے واقع ہے۔

"چلو۔ اب اس تھکا دینے والے دن رات کے کام۔ کام کو چھوڑ کر ہم چند دن آرام کرنے کے لئے اپنے آبائی گاؤں چلتے ہیں۔"

بڑی لڑکی نے جھٹ سے ان کے اس خیال پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر ڈالا۔

"چھٹیاں تو منائیں گے مگر آپ کے اس اجاڑ گاؤں میں نہیں۔ ہمیں بہار چلنا چاہئے تا کہ ہم نلندہ کے کھنڈرات اور دوسری آثار قدیمہ کی عمارتیں دیکھ سکیں۔"

دوسری نے تڑسے جواب دیا: "میں تو مدراس چلنا پسند کرونگی تا کہ وہاں کی سلک ساڑی خرید سکوں۔"

تیسری کب نچلی بیٹھنے والی تھی۔ بولی: "نہیں۔ میں تو حیدرآباد جاؤں گی اور لاڈ بازار سے چم چم کرتی ہوئی چوڑیوں کے جوڑے خریدوں گی۔"

چوتھی کو ان تینوں بہنوں کے خیالات سے اتفاق نہیں ہوا کہنے لگی:

"چلئے۔ ہم تو اوٹی چلتے ہیں۔ جہاں ہمیں تازہ ہوا کھانے کو ملے گی۔"

پانچویں نے چیں بہ چیں ہو کر کہا: "میں یہاں وہاں جانے والی نہیں ہوں۔ اگر جاؤں گی تو صرف گوہاٹی۔ وہاں کے پھول دار شال جو خریدنے ہیں مجھے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے باقی آٹھ بہنوں کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا کہ شاید وہ سب اس کے خیال سے متفق ہو جائیں گی۔ مگر ان سبھوں نے آنکھیں پھیر لیں اور شری بھارتی سے کہا کہ وہ کہیں بھی جانے کیلئے تیار ہیں مگر نہ جائیں گی تو اس گنگا کنارے والے گاؤں کو، یہ بحث ہو ہی رہی تھی کہ ہونے والے داماد آدھمکے۔ کہنے لگے۔ چلو ہم BAILADILLA چلتے ہیں۔ شاید وہاں کوئلہ کی کان میں پتھروں میں چھپا ہوا ایک آدھ ہیرا ہمیں مل جائے۔

اس مشورہ پر سب لڑکیوں کی رال ٹپکنے لگی۔ اتنے میں دروازے کی کال بل بجی اور دونوں داماد اندر چلے آئے۔ جب اس اہم مسئلہ کی بابت انہیں علم ہوا تو کہنے لگے کہ یہ تو سری سورج جی کا گھریلو مسئلہ ہے۔ انہیں اپنی رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے مگر پھر بھی وہ

لڑکیوں ہی کی طرف داری کریں گے کہ انہیں کوئی چھوٹے سے گاؤں کو نہ لے جایا جائے۔ چاہے وہ ان کا آبائی گاؤں ہی کیوں نہ ہو۔

یہ ساری کہانی سناتے ہوئے سری سروج جی نے مجھ سے مشورہ لیا۔ "کہئے اب ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے ؟"

"آپ نے خود کیا سوچا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"اگر وہ میرے آبائی گاؤں کو نہیں چلنا چاہتی ہیں تو میں اپنا بستر بند کھول دونگا اور سوٹ کیس میں رکھی ساری چیزیں جہاں اور جیسی تھیں پھر سے انہیں وہیں رکھ دونگا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا ہرگز مت کیجئے۔ بچیوں کو پھر سے سمجھانے کی کوشش کیجئے۔"

"میں نے حتی المقدور اپنی کوشش کر ڈالی ہے مگر وہ سب کہتی ہیں کہ اگر ان دونوں دامادوں کی بات نہ مانی جائے تو ان کی ہتک ہوگی اور ان کی یہ بے عزتی ان سے برداشت نہیں ہوگی۔"

"نہیں جناب۔ یہ تو کوئی "پرش ہٹ" نہیں بلکہ "استری ہٹ" ہے۔ اس قصے میں مردوں کو خواہ مخواہ گھسیٹا جارہا ہے۔" میں نے کہا۔

میرے ان جملوں سے شری سروج کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے ان سے پھر سوال کیا۔

"کہئے تو۔ آخر کہاں جانے کا تصفیہ ہوا ؟"

"وہ سب کے سب اپنا اپنا سامان اٹھائے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑی ہیں۔"

"لیکن ایک ریلوے اسٹیشن سے ان ساری جگہوں کے لئے کوئی بھی تو ریل نہیں جائے گی ؟"

"ریل۔ ریل کا کیا سوال ہے جناب ؟" اب کی بار ان کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ "وہ سبھوں میں اس بات پر اتفاق ہوگیا ہے کہ وہ اب صرف ریلوے اسٹیشن تک ہی جائیں گی ؟" ☆
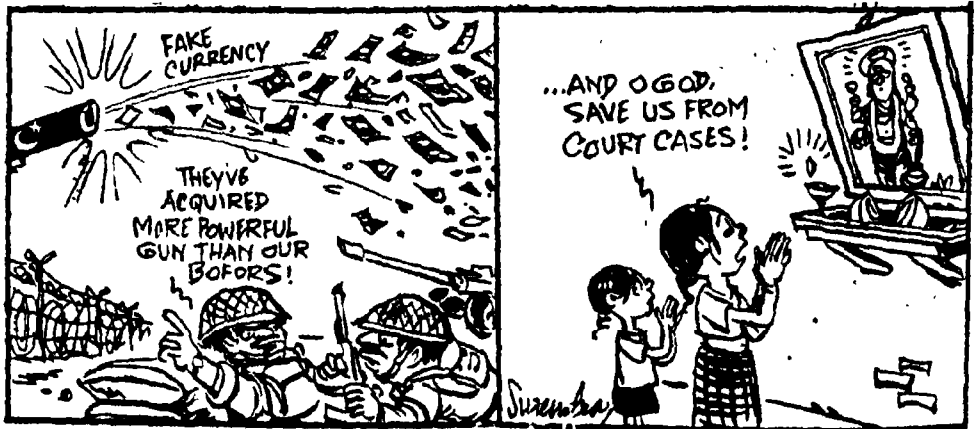
ڈاکٹر سید عبدالرحیم۔ناگپور
سابق ڈائرکٹر وسنت راؤ نائیک گورنمنٹ
انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنس۔ناگپور

ہوائی

انشائیہ نگاری اردو زبان کے نثری ادب میں ایک دلچسپ صنف ہے ۔اس صدی کی چھٹی دہائی میں یہ صنف ایک تحریک بن کر اہل ادب کے سامنے آئی جس کے نتیجہ میں " انشائیہ " کی ادبی اصطلاح وضع کی گئی ۔ دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی ادب سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی وجہ تسمیہ اور خصوصیات و عناصر پر بحث کی گئی اور پھر اردو زبان میں انشائیہ نگاری کے حدود متعین کئے گئے ۔

انشائیہ کا لفظ انشاء سے مشتق ہے جس کے معنی تحریر اور عبارت کے ہیں اور لغوی معنی " کچھ بات دل سے پیدا کرنا " ہیں ۔ (فرہنگ آصفیہ جلد اول 251) موخر الذکر معنی ہی انشائیہ نگاری میں سب سے اہم ہیں ۔ انگریزی زبان میں اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے "لائٹ پرسنل ایسے " کہا گیا ہے ۔اردو ادب کی یہ نوزائیدہ صنف اپنے پورے مفہوم و متقضیات کے ساتھ شخصیت کا انکشاف ہے جو ایک بے تکلف تحریر کے ذریعہ اپنی ذات و کائنات کے حوالے سے ہمیں ایک نئی فکر عطا کرتا ہے ۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ فطری طور پر انشائیہ نگار ہیں ۔ان کے انشائیوں کے دو مجموعے " بوڑھے کے رول میں " اور " پر پرزے " منظر عام پر آچکے ہیں ۔ ان دونوں مجموعوں کے ذریعہ موصوف ہند و پاک میں انشائیہ نگار کی حیثیت سے ایک معتبر مقام حاصل کر چکے ہیں ۔ ان کے انشائیے اندرون اور بیرون ملک کے موقر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔

زیر نظر کتاب " ہوائیاں " ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی ان ریڈیو ٹاکس کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو ناگپور اور اورنگ آباد سے نشر کی گئیں ۔ پہلے سے طے شدہ موضوعات یا عنوانات پر لکھنا اور ان کا حق ادا کرنا ایک مشکل کام ہے ۔ لیکن ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے اپنی انشائیہ نگاری کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ان موضوعات کا حق ادا کر دیا ۔ادب برائے ریڈیو کے عنوان سے وہ لکھتے ہیں :

" ادب برائے ریڈیو کی امتیازی خصوصیت ہے کہ یہ لکھا نہیں جاتا ، لکھوایا جاتا ہے ۔ پڑھا نہیں جاتا ، پڑھوایا جاتا ہے ۔ نہ یہ ادب برائے ادب ہے نہ ادب برائے زندگی بلکہ ادب برائے سامعین ہے ۔ سامعین اسے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں ۔ سنتے سنتے جب درد سر ... ریڈیو کا بٹن آف کر دیتے ہیں ۔ یہ اس ادب کا سب سے اہم افادی پہلو ہے ۔ "

... ریڈیو " میں وہ لکھ چکے ہیں کہ یہ ادب برائے سامعین ہے ، اس لئے سامعین کی دلچسپی کے پیش نظر انہیں ... پڑا ۔ انشائیہ میں مزاح جزو اعظم ہے ۔اس جزو کو ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے کچھ زیادہ ہی مقدار میں ... کو پڑھ کر ایک انبساطی کیفیت ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ کہیں زیر لب تبسم پر آمادہ ... زبان کی شائستگی اور شگفتہ بیانی ہمیں زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے نکال کر چند لمحوں ... کہیں اپنی ذات کا تعارف کرواتے ہیں اور کہیں انکشاف ذات کے عمل سے شخصی ... ناپسند سے آگاہ کرتے ہیں ۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

ان کو ! یہ ... چٹخروں میں ... اس مشورہ ... کی بابت انہیں علم

"شادی کے بعد چند عبوری ماہ و سال گذر جائیں تو شوہر کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات پر ایک بڑا طنز ہے ۔ جب آدمی بذات خود ایک چلتے پھرتے لطیفے میں ڈھل چکا ہو تو لوگوں کو ہنسانے کے لئے کاغذ قلم کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے ۔ قرضداروں سے سہما ہوا، بیوی سے ڈرا ہوا، نونہالوں سے لدا ہوا شوہر ایک ان کہا اور ان سنا لطیفہ ہی تو ہے ۔" (شادی کے بعد)

ڈاکٹر محمد اسد اللہ کو اشعار اور مصرعوں کے برمحل استعمال کا خوب سلیقہ ہے ۔ اس ضمن میں ایک اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں۔

نوشہ میاں کے آخر تک سمجھ میں نہیں آتا کہ ان پر ڈھیر سارے پھول کیوں چڑھا دیئے گئے ہیں اور جس دولہے پر سہرہ نہ چڑھایا جائے تو وہ سوچتا رہتا ہے کہ آخر اسے کفن کیوں نہیں بنایا گیا ۔ ممکن ہے پھولوں سے لدے کسی نوشہ کو دیکھ کر مشہور شاعر فانی بدایونی نے عمر گزشتہ کی میت والی ترکیب وضع کی ہو ۔ گو یہ بات انہوں نے آتی جاتی سانسوں کے متعلق ان الفاظ میں بیان کی تھی:

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

ڈاکٹر محمد اسد اللہ دم گفتگو جو لہجہ اختیار کرتے ہیں اس کی سبک روی دم تحریر بھی محسوس کی جاسکتی ہے ۔ ان کا طنز بڑا لطیف اور ہلکا پھلکا ہوتا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پہلے ڈاکٹر نے ہمارے مسوڑوں میں انجکشن لگا کر انہیں قوم کی طرح بے حس کر دیا ۔" (ہمارا پہلا دانت نکلوانا)

"ایک اردو بورڈ ہی کیا یہاں تو ہر موڑ پر زندگی میں املا اور ہجے کی غلطیاں ہیں ۔" (میں ذرا جلدی میں ہوں)

ڈاکٹر محمد اسد اللہ کے بعض فقرے مقولہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے:

"ازدواجی زندگی کی ابتداء میں حاصل ہونے والی بے پناہ مسرتوں کو عمر بھر قسطوں میں لوٹانا پڑتا ہے ۔" (شادی کے بعد)

"پروقار شخصیت وہی سمجھی جاتی ہے جو علامتی شاعری کی طرح سمجھ میں نہ آئے ۔" (شادی کے بعد)

ان کے قلم کی بے راہ روی میں راہ روی اور الفاظ و خیالات کی بے ربطی میں ایک ربط ہے ۔ وہ اپنے افکار و واقعات کے اظہار میں اور اپنی منتشر تحریروں میں مخصوص نظم و ضبط رکھتے ہیں اور اپنے مرکزی خیال سے زیادہ دور نہیں جاتے ۔ انگریزی اور مراٹھی ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے ۔ ان دونوں زبانوں سے استفادہ کی قوت نے انہیں فکر و فن کی شادری عطا کی جس کے نتیجہ میں ان کی تحریر میں استفادہ بھی ہے اور ایجاد بھی ۔

حالانکہ ہوائیاں میں شامل انشائیے ریڈیائی ہیں لیکن انشائیہ نگاری کا کمال دیکھئے کہ یہ تمام تحریریں ناظرین کے لئے بھی اتنی ہی دلچسپ ہیں جتنی سامعین کے لئے رہ چکی ہیں ۔ ایک تو اردو زبان کی شیرینی اور اس پر انشائیہ کا چٹخارہ ۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی سویٹ ڈش پر خشک میوے کتر کر ہوائیاں سجادی ہیں ۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے نہ تو ہوا میں گرہ لگائی ہے ۔ نہ ہوائی اڑائی ہے ۔ میں نہ تو ان کا ہوا خواہ ہوں نہ ان کی ہوا باندھ رہا ہوں البتہ یہ چاہتا ہوں کہ ہوائیاں ہوا میں نہ اڑ جائیں ۔ آج کی ہماری مصروف اور بے اطمینان زندگی میں ہمیں خود فراموشی کے چند لمحات بھی میسر آجائیں تو بساغنیمت ہے ۔ ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے ہوائیاں لکھ کر قاری کے ہاتھ میں ایسا لائٹ لٹریچر دے دیا ہے جس کو پڑھ کر ہم میں ایک خوشگوار استعجاب کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔

مجھے قوی امید ہے کہ ان کے یہ پرلطف انشائیے اہل ادب سے داد تحسین ضرور حاصل کریں گے ۔ ☆

●☆●

ڈاکٹر شیخ رحمن اکولوی

سر سید احمد خان کی ظرافت

جو فطری جبلتیں، انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہیں ان میں نمایاں ترین جبلت "ظرافت" ہے۔ سرسید احمد خاں کے ہاں، ان کی تحریروں اور تقریروں میں ظرافت اور شوخیِ طبع کی جھلکیاں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ خاص بات یہ تھی کہ ان کی ظرافت میں بھی مطلق تصنع نہیں تھا ان کے دریائے ظرافت میں دو صورتوں میں خاص طور پر جوار بھاٹا اٹھتا۔ جب کوئی ان کی تکفیر یا تذلیل کرتا یا وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے درمیان ہوتے۔ لیکن اعلیٰ ظرفی کا دامن یہاں بھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹتا اور بات تہذیب کی حد سے تجاوز نہ کرتی۔ مولوی علی بخش خاں، جب مکہ معظمہ سے سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لائے تو اس موقع پر سرسید نے "تہذیب الاخلاق" میں لکھا۔ "ہماری تکفیر کی بدولت ان کو حجِ اکبر نصیب ہوا ..... سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے"۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سرسید کے ہاں مولانا شبلی اور سید ممتاز علی بیٹھے ہوئے تھے۔ سرسید کا ایک بہت ضروری کاغذ گم ہو گیا۔ وہ اسے تلاش کرنے لگے۔ مولانا شبلی کو کاغذ ایک طرف پڑا ہوا مل گیا۔ انہوں نے تفریح کی خاطر اس کاغذ پر ہاتھ رکھ دیا کہ سرسید کو پریشان کیا جا سکے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں سرسید بھانپ گئے کہ کاغذ مولانا شبلی دبائے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مولانا شبلی سے کہا: "بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے شیطان اسے اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت، ذرا دیکھئے تو سہی میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں؟"

سرسید پادریوں سے دل برداشتہ تھے۔ اس دل برداشتگی کی وجہ ان کی تصنیف "اسباب بغاوت ہند" کی ان سطور سے واضح ہے:

"پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس معماروں کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی اور ناراضگی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا"۔

پادریوں سے بالمشافہ نوک جھونک سے متعلق دو واقعات کا نقل کرنا یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ایک دفعہ ریل کے سفر میں دو انگریزوں سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ ان میں سے ایک پادری تھا۔ جسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ سرسید یہی شخص ہے۔ اس نے سرسید سے کہا: "مدت سے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا"۔

سرسید نے کہا: "میں نہیں سمجھا، آپ کس کی باتیں کرنی چاہتے تھے"۔

اس نے دہرایا: "خدا کی"

سرسید نے نہایت سنجیدگی سے کہا: "میری تو کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لئے میں ان کو نہیں جانتا"۔

اس نے تعجب سے کہا: "آپ خدا کو نہیں جانتے؟"

انہوں نے کہا: "مجھی پر کیا موقوف ہے جس سے ملاقات نہ ہوئی ہو، اس کو کوئی بھی نہیں جانتا؟"

پھر کسی شخص کا نام لے کر انہوں نے پادری سے پوچھا: "آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا: "نہیں! میں اس سے کبھی نہیں ملا"۔

سرسید نے کہا: "پھر جس سے میں کبھی ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مجھ کو اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اس کو میں کیوں کر جان سکتا ہوں"۔

پادری یہ سن کر خاموش ہو رہا۔ کیوں کہ خود اس کے عقیدے کے مطابق خدا ایسا ہی ہونا چاہیے جس کے ساتھ ملنا جلنا، کھانا پینا، لین دین، انسان کی مانند ہوسکے۔

ایک دفعہ دلی کے مشنری کالج اور علی گڑھ کالج کا میچ تھا۔ مشنری کالج کی ٹیم کے ساتھ دو پادری پروفیسر علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ سرسید نے انہیں ڈنر پر بلایا۔ کھانے کے بعد، ان میں سے ایک نے سرسید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ سچا مذہب ہی ایسی چیز ہے جو انسان میں نیکی پیدا کرتا ہے"۔ پادری، اسلام کو، جس کی تعلیم علی گڑھ کالج میں ہوتی تھی، سچا مذہب کہہ ہی نہیں سکتا تھا، اس کی مراد یقیناً عیسائی مذہب سے تھی۔

سرسید نے اس کی بات سن کر کہا: "دنیا میں مذہب سے زیادہ بدتر چیز، اور تمام برائیوں اور جرائم کا مخزن کوئی نہیں ہے تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر ظلم، بے رحمیاں اور قتل اور خونریزیاں دنیا میں صرف مذہب کے سبب سے ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور جو جرائم شیطان نے کرائے ہیں وہ ایک طرف رکھے جائیں تو بھی مذہبی جرائم اور برائیوں کو غلبہ رہے گا"۔ پادری یہ سن کر بغلیں جھانکنے لگا کیوں کہ یہ بات وہ خود بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عیسائی مذہب کی بدولت دنیا میں جس قدر خونریزی ہوئی ہے اس کی مثال کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔

سرسید کی ظرافت کی ایک نمایاں خصوصیت تھی اس کی بیساختگی۔ ایک مجلس میں سرسید احمد خاں سے ہاتھ ملانے کے لئے کسی انگریز نے ہاتھ بڑھایا اور اپنے تعارف میں کہا: "میں جج ہوں"

سرسید نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: "میں جج کا باپ ہوں"۔ اس پر انگریز حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ بعد میں سرسید نے اس کی حیرت دور کردی کہ ان کے بیٹے سید محمود جج ہیں"۔

سرسید بعض اوقات کسی مسئلے کی نسبت اپنی اصل رائے کا اظہار ظریفانہ پیرانہ میں کرتے تھے۔ یہ ان کی ادا ئے خاص تھی۔ جس زمانے میں وہ بنارس میں تھے ان کا ایک مضمون اس موضوع پر شائع ہوا کہ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ایک صاحب، خوشی خوشی سرسید سے ملنے آئے۔ سرسید سے اس مضمون کا ذکر کر کے کہنے لگے: "جب آپ کے نزدیک اجماع حجت شرعی نہیں تو خلیفہ اول کی خلافت کیوں کر ثابت ہوگی"۔

سرسید نے کہا: "حضرت! نہ ہوگی تو ان کی نہ ہوگی۔ میرا کیا بگڑے گا؟"

سید صاحب یہ سن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے۔ کہنے لگے: "کیوں جناب! اگر خلافت کے مسئلہ پر اختلاف کے وقت آپ ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے؟"

سرسید نے کہا: "حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لئے کوشش کرتا، مجھ سے تو جہاں تک ہوسکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور یقیناً کامیاب ہوتا"۔ یہ سن کر سید صاحب نے سیدھے گھر کی راہ لی۔

یہ واقعہ بظاہر ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت مسئلہ خلافت سے متعلق سرسید نے اپنی اصل رائے ظاہر کی ہے۔ وہ کسی خلافت کے ملنے یا نہ ملنے کو ضروریات دین میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ خلافت وہ محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے

اور جو کچھ خلفاء نے اپنے عہد میں کیا اس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھہراتے تھے بلکہ خود خلفاء کو اس کے لئے ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ لندن میں تھے انہیں ڈیوک آف آرگائل کے ہاں ڈنر پر بلایا گیا۔ جب شراب سامنے آئی تو انہوں نے کہا: میں نوح کی شراب نہیں پیتا، صرف آدم کی شراب (یعنی پانی) پیتا ہوں"۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے سرسید سے استفسار کیا: "اگر نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جائے تو کچھ قباحت تو نہیں؟"
انہوں نے جواب دیا: "مخدومی! نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ لفظاً بہ لفظ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی"۔

سرسید عام طور پر اپنے مخالفین کی تحریروں کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ لیکن کسی معاملے میں دوست احباب مصر ہوجاتے تو وہ قلم اٹھانے پر مجبور ہوجاتے۔ دوستوں ہی کے اصرار پر انہوں نے مولوی علی بخش خاں کی کتاب "تائید اسلام" کے جواب میں ایک مضمون "دافع البہتان" تحریر کیا۔ اس مضمون کو سرسید نے ذیل کے ان فقروں پر ختم کیا: "جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا۔ تعجب کرے گا کہ جناب مولوی علی بخش نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر عائد کئے ہیں؟ بظاہر سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ للاحج کو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں، سب کرلیں، حج کے بعد تو پاک ہی ہوجاویں گے۔ جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بدپرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب کو معلوم ہونا چاہئے کہ گو حج میں سب گناہ معاف ہوگئے ہوں اور شبلی اور جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے"۔

تاریخ الفنسٹن کے جس ترجمے کی بنیاد پر سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھوایا گیا تھا اسے اخبار "شعلہ طور" کانپور میں ہو بہو نقل کر کے مولوی سید امداد العلی نے لکھا: "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے؟"
سرسید اس زمانے میں ولایت میں تھے۔ اخبار ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے مولوی مہدی علی خاں کو لکھا: "دیکھو! دشمنی آدمی کو ایسا اندھا کردیتی ہے۔ میرے ترجمے کو نقل کر کے لکھا ہے کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہے وہ کیسا جہنمی ہے"۔ حالانکہ خود بھی اس عبارت کو لکھتے ہیں۔ پھر مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور انہوں نے اردو سے"۔

سرسید کی مخالفت میں آئے دن اخبارات و رسائل میں کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہتا تھا۔ وہ بھی اپنی مخالفت کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ جب کسی اخبار میں ان پر کوئی چوٹ نہ ہوتی۔ اسے دیکھ کر تعجب کرتے۔
چنانچہ "تہذیب الاخلاق" میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہوگیا ہے جس کو بازار میں لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی: "کیا آج بازار کے لونڈے مرگئے"۔ "سرسید کی شوخی طبع سے متعلق حالی رقمطراز ہیں: "یہی زندہ دلی تھی جو ان سے سخت محنت کراتی تھی اور تکان اور ماندگی اور ملال و کلال کو کبھی ان کے پاس نہ آنے دیتی تھی"۔

۲۳ مارچ ۱۸۹۸ء کو یہ اعلیٰ ظرف اور بلند ہمت انسان، زندگی کو روتا چھوڑ، اپنے معبود حقیقی سے جا ملا۔

خاک ہو کے بھی مہکتے ہیں گلابوں کی طرح
چند چہرے جو مقدس ہیں کتابوں کی طرح

●☆●

عمران نقوی

شعری مزاح پڑھنے کی چیز نہیں

ممتاز مزاح نگار جناب طالب حسین زیدی حال میں دوسری بار پاکستان گئے تھے روز نامہ "نوائے وقت" نے اس موقع پر ان کا انٹرویو شائع کیا۔ قارئین شگوفہ کے مطالعہ کے لئے یہ انٹرویو زیر نظر شمارہ میں شائع کیا جارہا ہے۔ ☆

سید طالب حسین زیدی حیدرآباد (دکن) کے رہنے والے ہیں اور اس مکتبہ طنز و مزاح سے نمایاں ہوئے جو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کے رسالہ "شگوفہ" نے نثری حوالے سے آراستہ کیا۔ ان کے معاصرین میں مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ اور خواجہ عبدالغفور شامل ہیں۔ زیدی صاحب نے لاہور پر ایک مزاحیہ نظر ڈال کر نہایت عمدہ سفرنامہ تخلیق کیا ہے جسے مزاحیہ سفرنامہ کی روایت میں قابل قدر اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ لفظ کا گھونگھٹ اس طرح اٹھاتے ہیں کہ لفظ مسکرانے لگتا ہے۔ سید طالب حسین زیدی، گزشتہ دنوں دوسری مرتبہ لاہور آئے تو ہم نے انہیں "ایوان وقت" میں مدعو کیا۔ ان سے ہونے والی گفتگو نذر قارئین ہے:

- آپ لکھنے لکھانے کی طرف کب اور کیسے آئے؟

☆ یوں تو میں پینتیس چالیس برس تک چھوٹی عمر ہی سے صرف پڑھتا رہا، لیکن کوئی دس بارہ برس ادھر جب میں نے "بجنگ آمد" پڑھی تو لکھنے کی طرف مائل ہوا۔ مزاج بچپن ہی سے "شوخیانہ" تھا اسے پڑھا تو خیال آیا کہ مشاہدے میں آنے والی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اگر ضبط تحریر میں لایا جائے تو لوگوں کی دلچسپی کے لئے ایک اچھا مسالہ تیار ہوسکتا ہے بس اسی وقت سے یہ سلسلہ شروع ہوا ورنہ پہلے کوئی موضوع چھیڑ کر احباب مجھ سے خطوط لکھوایا کرتے تھے۔

- مزاح تخلیق کرنے کی بنیادی وجہ؟

☆ اپنی بات اور خیالات کو لوگوں تک ہنسی ہنسی میں سلیقے اور شگفتگی سے پہنچا کر انہیں لطف اندوز ہوتے اور ہنستے مسکراتے دیکھنے کی خواہش، یہ بڑا خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ مگر یہ معاملہ ہوتا بڑا نازک اور حساس ہے۔ کیوں؟ مزاح اور "پھکڑپن" فاصلہ قدمے دارد"..... اس فن میں وہی کامل ہوگا جو پھکڑپن سے اپنا پہلو بچا کر چلے۔

- بھارت اور پاکستان میں تخلیق ہونے والے نثری مزاح کا موازنہ آپ کس طرح کریں گے؟

☆ یہ بڑا مشکل سوال ہے بے شک ہمارے یہاں بھی مزاح تخلیق کرنے والوں میں بڑے بڑے نام آتے ہیں اور ان کی تخلیقات دوسرے رسالوں کے علاوہ حیدرآباد سے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی ادارت میں تیس بتیس برس سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والے منفرد رسالے "شگوفہ" میں چھپتی رہتی ہیں، جو صرف مزاحیہ تخلیقات ہی پیش کرتا ہے جہاں تک موازنہ کا تعلق ہے تو میں کہوں گا یہاں بھی موجودہ لکھنے والوں میں یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر اور پرویز یداللہ مہدی خوب لکھتے ہیں اور شوق و ذوق سے پڑھے جاتے ہیں اور پاکستان میں کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی، سید ضمیر جعفری مزاح نگاری میں ایسے دیو قامت نام ہیں جنہیں دونوں ملکوں

میں یکساں مقبولیت حاصل ہے اور ان کی فکری و علمی بلندی کا یہ عالم ہے کہ ان کے مزاح کی تہ تک پہنچنے کے لئے خود قاری کا ایک لائبریری ہونا لازمی ہے ورنہ بات بالا بالا گزر جاتی ہے اور وہ ہونقوں کی طرح پلکیں جھپکاتا رہ جاتا ہے۔ ان عظیم مزاح نگاروں کی تخلیقات کو پڑھتے ہوئے ذہن میں بے ساختہ یہ خیال ضرور آتا ہے کہ قلم کو ہاتھ میں لینے سے پہلے آخر ان لوگوں نے کتنے کتب خانے چاٹ ڈالے ہیں؟

● آپ شعری مزاح کو کس حد تک قابل قبول قرار دیتے ہیں؟

☆ صرف سن کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی حد تک۔ میرے ناقص خیال میں یہ پڑھنے کی چیز نہیں ہوتی۔

● اردو کا سب سے بڑا مزاح نگار؟

☆ وہی جو سب سے بڑا شاعر بھی ہے۔ یعنی نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، نواب اسد اللہ خان غالب۔

● کرنل محمد خان مرحوم کو اردو کے مزاحیہ نثری سرمایہ میں آپ کیا مقام دیں گے؟

☆ وہی جو شعری سرمایہ میں غالب کا مقام ہے۔ اگر آپ مجھے جانبدار نہ سمجھے تو میں کہوں گا کہ کرنل صاحب نے مزاح، واقعہ اور سوانح نگاری کو جو بانکپن اور ایک نیا اسلوب دیا ہے، وہ منفرد ہے ان ہی سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم بھی ہوگیا اور اب جو بھی اس اسلوب کو اختیار کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا اجر، ثواب جاریہ کے طور پر سارے کا سارا کرنل صاحب ہی کے کھاتے میں کریڈٹ ہو گا۔ بے شک! بجنگ آمد اور بسلامت روی کا شمار ہمیشہ زندہ رہنے والی کلاسیکل کتابوں میں کیا جائے گا۔

● آپ اردو مزاح کے حوالے سے بھارت کے چند بڑے لوگوں میں کن شعراء اور مضمون نگاروں کے نام لینا چاہیں گے؟

☆ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں مزاحیہ شاعری سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں اس کے بارے میں میرا علم بھی صفر کے برابر ہے اردو ایک بین الاقوامی زبان بن گئی ہے۔ جو اب ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس زبان کے الفاظ تو اب انگریزی ڈکشنری آکسفورڈ میں شامل ہوگئے ہیں اردو کے تمام بڑے ادیب اور شاعر قومی نہیں بلکہ اب بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں اور سب کی مشترکہ ملکیت ہیں۔

● اکیسویں صدی میں مزاح کی ضرورت آپ کس حد تک محسوس کرتے ہیں؟

☆ میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ اکیسویں صدی کا نام لے کر آخر اس قدر دہشت کیوں پھیلائی جارہی ہے؟ وہ کوئی آگ کا دریا تو نہ ہو گا جس میں ہمیں ڈوب کر جانا ہے مسائل سے دوچار اس کارخانہ سود و زیاں کی چیرہ دستیوں سے عاجز انسانیت کو تھوڑا سا احساس راحت، تھکے ہوئے ذہنوں اور بوجھل لمحوں کو کچھ سکون و آسودگی مزاح اگر دے سکتا ہے اور میرے خیال میں مزاح ہی دے سکتا ہے تو پھر اس کی ضرورت جتنی پچھلی صدیوں میں تھی اور موجودہ صدی میں ابھی ایک سال اور ڈیڑھ مہینے تک ہے آنے والی صدی میں بھی اتنی ہی رہے گی۔

● ہمارے ہاں بعض لوگ کلام غالب کے مزاحیہ پہلو کو بہت اہمیت دیتے ہیں اس ضمن میں آپ کا کیا خیال ہے؟

☆ بے شک، وہ بہت صحیح اور درست کرتے ہیں۔ بیسیوں آلام جسمانی و روحانی اور غم روزگار میں مجسم گرفتار ہونے کے بعد جس کی نقاہت کا یہ عالم کہ کھڑے ہونے کی جب کوشش کرتا تو اتنی دیر میں کامیاب ہوتا جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ پھر بھی خوش رہنا اور خوشیوں کی سوغات بانٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہر ہر لفظ سے علم و حکمت کے خزانے لٹانا اور بات بات: ، شوخی و زندہ دلی کے شگوفے کھلانا، اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ جس سے دکھی انسانیت آج بھی فیض یاب ہورہی ہے۔☆

مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگلپور

"ادھر بھاگ ادھر بھاگ"

عبدالمجید شمس کی کتاب "حیات و کائنات" کی رسم اجراء کے موقع پر غبار بھٹی، احمد یوسف، رضوان احمد، مناظر عاشق ہرگانوی اور بہت سے لوگ موجود تھے۔ رسم اجراء کے بعد شعراء حضرات کلام سنانے لگے۔ پروفیسر سید حسن سرور کی باری آئی تو انہوں نے مصرع گنگنایا:

اب کیسے بچے جان ادھر آگ ادھر آگ

پروفیسر عطا کاکوروی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

بچانی ہو اگر جان ادھر بھاگ ادھر بھاگ

●☆●

داڑھی کا شاعر

پروفیسر جمشید حسن جامی، نینا جوگن، سلیمہ جمشید، شبانہ نازنین اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے حالات حاضرہ پر تبصرہ کررہے تھے۔ کانپور کی ایک خبر پر سلیمہ جمشید نے پوچھا: "فنا نظامی تو کانپور ہی کے شاعر ہیں نا؟"

نینا جوگن نے جواب دیا: "ہاں۔ اور کانپور میں ہی ان کے ساتھ وہ لطیفہ ہوا تھا"۔

"کون سا؟"۔ شبانہ نازنین نے پوچھا

"اناؤنسر نے ہنستے ہوئے انہیں دعوت سخن دی۔ "اب ملک کے چوٹی کے شاعر حضرت فنا نظامی تشریف لائیں"۔

فنا نظامی مائک پر آئے اور ریش دراز پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے کہا: "چوٹی کے شاعر دوسرے ہوں گے۔ میں تو داڑھی کا شاعر ہوں"۔

●☆●

ہومیو پیتھک ڈاکٹر

پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر لطف الرحمن، ڈاکٹر رئیس انور اور مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ پروفیسر لطف الرحمن نے سنایا کہ کسی رسالہ میں پچھلے دنوں یہ شعر پڑھا ہے:

گھبراتے ہیں، کتراتے ہیں، لہراتے ہو رکے لوگ
سردی ہے تو پانی میں اتر کیوں نہیں جاتے

پروفیسر شمیم احمد برجستہ بولے: "اگلے شمارہ میں یہ خط چھپنا چاہیے کہ: "شاعر ضرور ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہے"۔

●☆●

دے کے خط (مراسلے)

ڈاکٹر صاحب
شگوفہ کا سالنامہ شگوفے کا اصلی سالنامہ معلوم ہوتا ہے یعنی اصلی شگوفہ۔
یوسف ناظم ممبئی

●☆●

مکرمی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب' السلام علیکم

"شگوفہ" سالنامہ کے لئے آپ کو مبارکباد دینا چاہوں گا، بہت دیدہ زیب رسالہ نکالا ہے آپ نے ساتھ ہی روح پرور بھی۔ مضامین اور شعر و سخن معیاری ہیں۔ آفرین ہے آپ کو جہاں تک مزاح کا تعلق ہے ہندوستان میں Shankars Weekly دس سال پہلے بند ہوگیا، مغرب میں مشہور زمانہ PUNCH کا خاتمہ ہوا، یہ سہرا اردو ادب کے سر آپ نے باندھا ہے کہ "شگوفہ" اردو طنز و مزاح کا واحد نمائندہ رسالہ 32 سال سے اب بھی اسی آب و تاب سے شائع ہورہا ہے اور اردو زبان و ادب کا سر اونچا کئے ہوئے ہے۔

خدا آپ کو تادیر سلامت رکھے اور "شگوفہ" ہر ماہ اسی طرح کھلتا رہے اور اپنی خوشبوئیں چمنستان دہر میں پھیلاتا رہے، آمین۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

منظور الامین، حیدرآباد

●☆●

محترمی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

کرنل محمد خان مرحوم پر ڈاکٹر انور سدید کا مضمون / خراج تحسین پڑھ کر کچھ سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ محمد خاں اگست ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جناب طالب حسین زیدی نے اپنے ایک حالیہ مضمون جو شگوفہ میں چھپا ہے لکھا ہے کہ وفات کے وقت کرنل مرحوم (۹۰) سال کے تھے۔ اگر پیدائش ۱۹۲۰ء کی ہے تو وفات (اکتوبر ۹۹ء) کے وقت ان کی عمر صرف ۷۹ سال کی ہوگی۔

دوسری بات: انور سدید صاحب کے بیان کے مطابق محمد خان کو آرمی میں کمیشن ۱۹۴۵ء میں ملا۔ یہ درست نہیں ہوسکتا۔ "بجنگ آمد" میں کرنل مرحوم کے ابتدائی فوج کے حالات لکھے گئے ہیں۔ کمیشن پانے کے بعد انھوں نے مصر، عراق، لیبیا، برما اور رانچی (بہار) میں سروس کی اور ۱۴۔ اگست ۱۹۴۳ء کو مری (پاکستان) میں شادی۔ اس وقت وہ نہ صرف میجر تھے بلکہ پرمننٹ کمیشن حاصل کرچکے تھے۔ دو سال کی قلیل مدت میں کسی فوجی افسر کا اتنا غیر ممالک میں سروس کرنا اور میجر کے عہدہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔ میں یہ اس لئے وثوق سے کہہ رہا ہوں چونکہ میں خود ایک سابقہ فوجی ہوں۔ مضمون نگار سے یقیناً سہو ہوئے ہیں۔ براہ کرم اپنے آئندہ شماروں میں کسی ایسے صاحب کا مضمون شائع کریں جو کرنل مرحوم کے حیات اور کارناموں / خدمات سے بخوبی واقف ہے۔

میرے خیال میں شفیق الرحمن نہایت موزوں ہوں گے۔ وہ اور محمد خان ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ شفیق الرحمن کو ۱۹۴۱ء میں آرمی میڈیکل کور میں کمیشن ملا تھا۔ دونوں نہ صرف ہمعصر رہے ہیں بلکہ ان کی آرمی سروس بھی متوازی لائنوں میں گزری۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے محمد خاں کو برگیڈیر پر ترقی ہونے والی تھی۔ صدر ایوب خاں کے اسٹاف آفیسر سے Protocol کے سلسلے میں ان بن ہوگئی اور محمد خان قبل از وقت فوج سے علیحدہ ہوگئے۔ شفیق الرحمن (۱۰) سال بعد میجر جنرل (ریر ایڈمرل) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے (بزم آرائیاں میں محمد خاں نے اپنے فوج سے علیحدگی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے)۔

پاکستانی اخبارات اور رسائل میں محمد خان مرحوم پر ان کی وفات کے بعد لکھا جاچکا ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مرحوم کے ہم عصر ادیبوں کے خیالات (معتبر ترین) اور مضامین شائع کئے جاسکیں۔ شفیق الرحمن کے علاوہ محمد خالد اختر (پ ۱۹۱۹) اور مشتاق احمد یوسفی (پ ۱۹۲۳ء) ان کے ہم عمر کہے جاسکتے ہیں۔ ان تینوں بزرگوں سے مرحوم کے مراسم تھے۔ مشفق خواجہ کو ۱۵۔۱۶ سال عمر میں چھوٹے ہیں بغیر چھان بین کئے غیر مصدقہ مضامین نہیں لکھتے۔

محمد اسمٰعیل، حیدرآباد

●☆●

ڈاکٹر صاحب،

شگوفہ ملا۔ جو اسم بامسمٰی ثابت ہورہا ہے۔ ہارٹ اٹیک (۷ دسمبر) کی وجہ سے ڈاکٹر نے ہر طرح کی پابندی عائد کردی ہے۔ مزاحیہ رسائل و کتب کو چھوڑ کر۔ گویا شگوفہ بھی بیماری کے مطابق بحالی صحت کا دوا کی طرح ایک جز بن گیا ہے۔ یوں بھی ہندو پاک میں شگوفہ مواد اور پابندی اشاعت میں آپ اپنا جواب ہے اور اب تو شگوفہ میں چھپنے والے شاعر ہی عرب امارات، یو کے اور یو ایس اے کے مزاحیہ مشاعروں میں مدعو کئے جارہے ہیں۔ اس اعزاز کے آپ مستحق ہیں۔ اس طرح ملک کے مزاحیہ ادب و رسائل میں آپ کا ہمسر کوئی نہیں۔ مبارک ہو۔

جلیل ساز، ناگپور (منہ پھٹ ناگ پوری)

●☆●

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

ماہنامہ شگوفہ کا سالنامہ کل کی ڈاک سے موصول ہوا۔ شکریہ۔ امسال کا سالنامہ پچھلے کئی سالوں کے مقابلہ میں بہتر اور دیدہ زیب ہے۔ اس کے لئے آپ کی سعی پیہم پر مبارک باد۔

افتخار وصی، بیتیا

●☆●

مکرمی کمال بھائی

سالنامہ شاندار تھا۔ خوبصورت ٹائٹل کے لئے شعیب کارٹونسٹ کو میری طرف سے مبارکباد۔

علی خواجہ منگلور

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

اشاعت کا ۳۳ واں سال

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۳

شمارہ ۳

مارچ ۲۰۰۰ء

کمپیوٹر کتابت: SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپئے — زرِ سالانہ: ۱۵۰ روپئے — بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون: (آفس) 4745716

(رہائش) 4576064

نامور مزاح نگار کرنل محمد خاں

کو خراج عقیدت

شگوفہ کا ایک شمارہ

کرنل محمد خاں کے نام

مئی ۲۰۰۰ء میں شائع ہو گا۔
کرنل محمد خاں کے فن اور شخصیت کا جائزہ
اور محمد خاں کی منتخب تخلیقات

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

حق تو یہ ہے (ترجمہ)

ادب کا جغرافیہ

چورن (منظومات)

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفر نامہ	50روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	30روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	60روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	60روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	40روپے
آئی ایم ساری	مصطفی علی بیگ	کلام	80روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	کلام	100روپے
بہ فرض محال	خواہ مخواہ	کلام	75روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	کلام	50روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	کلام	65روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسین	سفر نامہ	45روپے
درگت	ٹی این راز	کلام	70روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	کلام	50روپے
الف تماشہ	نریندر لوتھر	کلام	30روپے

مجتبیٰ حسین

پھر وہی "کتابوں کا میلہ"

دہلی میں آئے دن میلے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ صنعتی میلہ، زرعی میلہ، موٹروں کا میلہ، پولٹری فارمنگ کا میلہ، گھڑیوں کا میلہ، پکوان کا میلہ۔ کوئی ایک میلہ ہو تو گنائیں بھی انواع و اقسام کے میلوں کی وجہ سے ہی دہلی میں زندگی کا میلہ چلتا رہتا ہے یہ اور بات ہے کہ ان میلوں کے چلنے کی وجہ سے ہمارا چلنا پھرنا دوبھر ہو جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ مقام جسے پرگتی میدان کہتے ہیں اور جہاں آئے دن ایسے میلے منعقد ہوتے رہتے ہیں ہمارے گھر سے راستہ میں پڑتا ہے اگر کوئی میلہ نہ لگا ہو تو ہم اپنے گھر سے انڈیا گیٹ یا کناٹ پلیس تک بمشکل بیس منٹ میں پہنچ جاتے ہیں اور اگر کوئی میلہ چل رہا ہو (مخفی مباد پرگتی میدان میں سال کے آٹھ دس مہینوں تک تو ایسے میلہ ضرور چلتے ہیں) تو ہمیں اپنے گھر سے کناٹ پلیس تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں میلوں سے الرجی سی ہو گئی ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے راستے یہ میلے مسائل نہ ہوتے تو آج ہماری زندگی مختلف ہوتی۔ جو وقت اب ہم ٹریفک کے شور شرابے اور بھیڑ بھاڑ میں ضائع کرتے ہیں، اس وقت کو کسی اور اچھے کام میں لگاتے۔ یہ ضرور ہے کہ اتنے سارے میلوں میں ہماری دلچسپی صرف ایک میلہ میں رہتی ہے اور جسے کتابوں کا میلہ کہتے ہیں۔ اور ہم اس میں ہر سال پابندی سے جاتے بھی ہیں۔ لیکن اب ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جو وقت ہم کتابیں پڑھنے میں صرف کر سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ وقت تو ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ میں گنوا دیتے ہیں۔ اب کتابوں کے میلے میں بھی جا کر کیا کریں۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے کتابوں کے چودھویں بین الاقوامی میلے کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نئے نئے ذرائع ابلاغ کے رونما ہونے کے باوجود کتابوں کی ضرورت ہر دور میں رہے گی۔ اور مطبوعہ لفظ کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ماشاء اللہ اٹل بہاری واجپائی خود مصنف ہیں اور ان کی ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے جس کے اب تک کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اب وہ ایسی بات نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے خیر سے ہم بھی مصنف ہیں اردو میں سولہ سترہ کتابیں لکھ چکے ہیں اور دوسری زبانوں میں ہماری جو کتابیں شائع ہوئی ہیں انہیں جوڑ لیا جائے تو ہماری کتابوں کی تعداد تیس سے اوپر چلی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ہم اس بیان سے مطمئن نہیں ہو سکتے کہ ہماری مطبوعہ کتابوں کی ضرورت ہر دور میں رہے گی کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ ہم اور ہمارے مطبوعہ الفاظ کتنے مشکل دور سے گزر رہے ہیں بلاشبہ ہم نے ساری زندگی کتابوں کے درمیان گزاری ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا کہ اگر یہ کتابیں نہ ہوتیں تو شاید آج ہم بھی ایک کامیاب و کامران زندگی گزار رہے ہوتے ہم نے بی اے کا امتحان درجہ دوم میں محض اس لئے کامیاب کیا کہ امتحانات کے زمانہ میں جب ہمیں اصولاً نصابی کتابوں کو پڑھنا چاہیے تھا ہم پریم چند، منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، چارلس ڈکنس، ہیمنگوے، مارک ٹوین، سامرسٹ مام وغیرہ کو پڑھنے میں لگے رہے اگر یہ نہ پڑھتے تو کیا عجب کہ امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرتے اور آج ہمارا شمار نجلے ہی پڑھے لکھے لوگوں میں نہ ہوتا بڑے لوگوں میں تو ہوتا۔ یقین مانئے کتابوں میں اتنے کھوئے رہتے تھے کہ کتابی چہروں کو پڑھنے کی فرصت تک نہیں نکال پاتے تھے۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ایک لمبے عرصہ تک صرف کتابی زندگی گزاری۔ کتابی باتیں کیں اور کتابی حرکتیں کیں۔ آج تو ان کتابوں کے نام بھی ہمیں یاد نہیں رہے جنہیں ہم راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھا کرتے تھے۔ میکسم گورکی کی "ماں" تو اتنی عقیدت سے پڑھی تھی

کہ دو دن اپنے کمرہ سے باہر نہیں نکل پائے تھے ۔ آج کوئی اس کتاب کا ذکر تک نہیں کرتا ۔ ورڈسورتھ اور ملٹن نے ہمیں ایک عرصہ تک اتنا الجھائے رکھا کہ عملی زندگی میں کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر پائے ۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ان کتابوں میں کیا لکھا تھا ۔ البتہ یہ کتابیں ضرور ہماری الماریوں میں بند ہیں ۔ پھر جب ہم نے خود کتابیں لکھنی شروع کیں تو کتاب کا تصور ہی بدل گیا ۔ اس لئے کہ ہم نے جس زبان میں لکھنا شروع کیا وہاں کتاب کے چھاپنے کو کتاب کا چھاپنا نہیں کہتے بلکہ کتاب کو "زیور طبع" سے آراستہ کرنا کہتے ہیں اور بسا اوقات یہ "زیور طبع" کچھ اتنا موہوم اور مدھم ہوتا ہے کہ کتاب چھپنے کے بعد بھی "غیر مطبوعہ" ہی رہتی ہے ۔ اس لئے ہماری زبان میں مطبوعہ کتاب کے مقابلہ میں "مخطوطے" کو اہمیت دی جاتی ہے ۔ چنانچہ محققین آئے دن ان مخطوطوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور مطبوعہ کتابوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ۔ پھر بھی ہماری شخصی انفرادیت یہ ہے کہ ہماری ابتدائی کتابیں اس زمانہ میں چھپی تھیں ۔ جب اردو میں "اکیڈیمی یافتہ" ادب پیدا ہونا شروع نہیں ہوا تھا ۔ یعنی ادب کی اشاعت کے لئے اردو اکیڈیمیوں کی جانب سے جزوی مالی تعاون ملنا شروع نہیں ہوا تھا ۔ خدا کے فضل سے ہم نے بعد میں بھی اپنی کتابوں پر اکیڈیمیوں کے جزوی مالی تعاون کی آنچ نہ آنے دی ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب بھی کسی بک اسٹال پر اردو کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ان کتابوں کے مصنفوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کیوں کہ ہمیں اندازہ رہتا ہے کہ کتاب کے بک اسٹال پر آنے تک اس کے مصنف کو کہاں کہاں ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے بلکہ کتاب کے چھپنے کے بعد بھی اس کی ذلت و خواری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ اردو کتابیں اب خریدی نہیں جاتیں بلکہ ان کتابوں کو ان کے مصنفین نہایت عجز و انکسار کے ساتھ کسی ایسے شخص کی خدمت میں اعزازی طور پر پیش کرتے ہیں جس کے بارے میں انہیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ اس کتاب کو پڑھے گا بھی یا نہیں ۔ گویا کتاب کے لکھنے سے لے کر اس کے فروخت ہونے تک مصنف کے ذلیل و خوار ہونے کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب بھی کسی اردو کتاب کو دیکھ لیتے ہیں تو ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہم دنیا کی مظلوم ترین شئے کا دیدار کر رہے ہیں ۔ آپ یقین کریں کہ ہمارے پاس روزانہ کم از کم دو کتابیں تو اردو مصنفین کی طرف سے تحفتاً آجاتی ہیں ۔ ہم سے خواہش کی جاتی ہے کہ ہم کتاب کے ملنے کی اطلاع مصنف کو ضرور دیں اور ہوسکے تو اپنی زریں رائے سے بھی نوازیں ۔ اب ہم ان مصنفین کو کیسے سمجھائیں کہ میاں اور بھی غم ہیں زمانہ میں محبت کے سوا ۔ اگر ہم صدق دل سے رائے دینے لگ گئے تو ہماری حیات مستعار کے دن یونہی ضائع ہو جائیں گے ۔ ہمیں رائے دینے کے علاوہ اور بھی تو کئی بیکار کام کرنے پڑتے ہیں ۔ یہ کون کرے گا آخر ایسی ہی باتوں کی وجہ سے اب کتابوں کے میلے میں جانے کو جی نہیں چاہتا ۔ ہماری الماریاں ایسی کتابوں سے بھری پڑی ہیں اور روزانہ ان کی وجہ سے ہمارے بال بچوں سے جھگڑا ہو جاتا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کتابوں کی وجہ سے گھر میں ضروری چیزوں کے رکھنے کی گنجائش نہیں نکل پاتی ۔ اس صورتحال سے نپٹنے کا ایک طریقہ ہم نے یہ نکالا ہے کہ پچھلے دنوں ہم نے ایسی بعض کتابیں ایک اردو ادارے کی لائبریری کو تحفتاً دیدیں ۔ اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد ہمارے ایک ادیب دوست سے ملاقات ہوئی تو نہایت غصہ میں تھے کہنے لگے میں نے اپنی جو کتاب تمہیں اتنی عقیدت سے دی تھی وہ تم نے ایک لائبریری کو دیدی ۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ جس طرح تم نے یہ کتاب تحفتاً دی تھی ۔ اسی طرح ہم نے یہ کتاب لائبریری کو تحفتاً دی ہے ۔ اب اس لائبریری کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چھپوایا ہے ۔ پھر اپنی کتاب کے نسخوں کو یوں بیدردی کے ساتھ دوستوں میں کیوں تقسیم کرتے پھرتے ہو"۔
نظریں نیچی کر کے بولے : "کیا کروں ، میرے بال بچوں کو شکایت ہے کہ اس کتاب کے نسخوں کی وجہ سے گھر میں ضروری چیزوں کے رکھنے کی گنجائش نہیں نکل پارہی ہے ۔ اب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ میں اسے غرق دریا کردوں یا نذر آتش کردوں"۔
یہ کہہ کر وہ آگے کو نکل گئے اور ہمیں یہ بتانے کا موقعہ نہ دیا کہ ان کی کتاب کے بارے میں خود ہمارے بال بچوں کی بھی یہی رائے ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس بار ہم اب تک کتابوں کے میلے میں نہیں گئے ۔ ☆

بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات شگوفہ حیدر آباد

(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت : حیدر آباد
پرنٹر و پبلیشر اور ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
قومیت : ہندوستانی
پتہ : 17-6-768 دبیر پورہ، حیدر آباد 23
وقفہ اشاعت : ماہنامہ
ملکیت : قیصر کمال
پتہ : 17-6-768 دبیر پورہ، حیدر آباد 23
قومیت : ہندوستانی

میں سید مصطفیٰ کمال اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں ۔

یکم مارچ ۲۰۰۰ء

باذغ بہاری
کلکتہ

الٹی چھری!

سب جھاڑ پھونک سیکھ گئے شیخ جی سے ہم
مرغی کو ذبح کرتے ہیں الٹی چھری سے ہم

بچپن میں کیا اٹیک کیا تھا تکام نے
پرہیز کر رہے ہیں ابھی تک دہی سے ہم

منہ اپنا ایک بار جلا تھا جو دودھ سے
[illegible] لگے ہیں پھونک کے مٹھا تبھی سے ہم

ہیبٹ کچھ اس طرح ہوئی کھا کھا کے ڈالڈا
جز بز سے ہونے لگتے ہیں خوشبوئے گھی سے ہم

جس شاعری سے شیخ ہیں فاقے میں مبتلا
"روزی کما رہے ہیں اسی شاعری سے ہم"

خوشبوئے مرغ آئی ہے ہر لفظ لفظ سے
کرتے ہیں گفت گو جو کسی مولوی سے ہم

جب سے ہوا ہے منقطع باذغ سے رابطہ
ناگاہ کٹ گئے ہیں سبھا میں سبھی سے ہم

خودکشی

اک مرد جواں ریلوے لائن پہ پڑا تھا
کچھ دور کھڑا خود سے میں دیکھ رہا تھا

سوچا یہ غم و رنج کا مارا تو نہیں ہے
گردش میں بچارے کا ستارہ تو نہیں ہے

میں نے کہا مرنے کا ارادہ ہے بھتیجے
یوں خودکشی کرنے کا ارادہ ہے بھتیجے

بولا کہ چچا جان میں آفت میں گھرا ہوں
صحرائے جنوں خیز میں بے صوت و صدا ہوں

عاجز غم دوراں سے ہوا اس طرح حضرت
جینے کی تمنا ہے نہ دل میں کوئی حسرت

اپنوں سے نہ غیروں سے رہا اب کوئی رشتہ
ہے ساتھ فقط میرے مقدر کا نوشتہ

آلائش دنیا سے میں رنجور ہوا ہوں
تب جاکے پئے خودکشی مجبور ہوا ہوں

سمجھایا اسے میں نے کہ یہ کام غلط ہے
سن لو کہ غلط کام کا انجام غلط ہے

رکھنا یہ سدا یاد بزرگوں کی نصیحت
یوں خودکشی کرنے میں ہے رسوائی و ذلت

تم مر کے اگر جاؤگے اس طرح یہاں سے
پھر کیسے ملاؤگے نظر ربِ جہاں [illegible]

جانا ہی اگر ہے تمہیں دنیا سے بھتیجے
جانے کیلئے اور بہت سے ہیں طر[illegible]

ہو کام کوئی ۔ چاہئے کرنے کا سلیقہ
مرنے کا تو بہتر ہے یہ آسان ط[illegible]

تم خود ملک الموت کو گھر اپنے بلالو
مرنا ہے تو اردو کا اک اخبار نکالو

۱۸

عابد معز
ریاض

پی سی ...!

شام کے وقت جب میں دفتر سے گھر واپس پہنچا تو بیگم منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ میں نے دل میں کہا۔ اللہ خیر کرے! بہر حال جی کڑا کرکے پوچھا:

"خیریت تو ہے۔ آپ کی طبیعت کچھ ناساز محسوس ہوتی ہے؟" بیگم نے جو جواب دیا اس سے فوراً معلوم ہوگیا کہ "ناسازی طبیعت" کی وجہ کیا ہے۔

"آج مہارانی صاحبہ ہمارے گھر تشریف لائی تھیں۔" بیگم نے تڑخ کر اطلاع دی۔

محلہ کی نکڑ کی کوٹھی میں رہنے والی خاتون میری بیگم کو سخت ناپسند ہیں۔ بیگم کے خیال میں وہ مغرور اور نک چڑھی ہیں۔ اپنے آپ کو "بہت کچھ" سمجھتی ہیں جبکہ وہ "کچھ بھی نہیں" ہیں۔ دوسروں کو بشمول اپنے مجازی خدا، خاطر میں نہیں لاتیں سسرال والوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے اور ملازمین کو ناکوں چنے چبواتی ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ اپنوں پر حکم چلاتی ہیں اور غیروں پر مختلف طریقوں سے رعب ڈالنے کی فکر میں اپنے وزن کو قابو میں رکھا ہے۔ یہ اطلاعات کوٹھی میں کام کرنے والوں کی فراہم کردہ تھیں۔ انہی "خوبیوں" کے سبب بیگم نے انہیں "مہارانی" کا خطاب دے رکھا تھا۔

میں نے بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی:

"آپ ان سے خواہ مخواہ ہی بدگمان رہتی ہیں۔ دیکھئے کس سادگی سے وہ یہاں چلی آئیں۔"

جواب ملا: "سادگی کے ساتھ نہیں آئی تھیں۔ اپنے ساتھ ڈسک لائی تھیں۔ پوچھ رہی تھیں کہ کیا ہمارے پاس پی سی ہے؟ بتلا رہی تھیں کہ ان کا سسٹم ڈاؤن ہے۔ صبح سے ان کے گھر زندگی جام ہے۔ فریج، ٹی وی، فون، انٹر کام، اے سی، کولر، ککر، مکسر، مائیکرو ویو اوون، گھڑی، الارم، غرض گھر کی ہر شے "پی سی" سے مربوط ہے۔ ڈسک لے کر آئی تھیں کہ ہمارے پی سی میں ڈال کر مینٹیننس والوں کا نمبر حاصل کرکے فون کر سکیں۔"

"پھر کیا آپ نے ان کی مدد کی؟"

اتنا پوچھنا تھا کہ بیگم پھٹ پڑیں:

"مدد کہاں سے کرتی؟ پی سی ہے کہاں؟ شرمندہ ہونا پڑا۔ شادی کے وقت نگوڑا پی سی عام نہ تھا، ورنہ جہیز میں لے آتی۔ کتنی [illegible] کہا ہے کہ پی سی خریدیں گے لیکن جناب کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مہارانی تعجب کا اظہار کر رہی تھیں کہ آپ لوگ پی [illegible] کیسے جی رہے ہیں۔"

"[illegible] تعجب کی کیا بات ہے۔ افریقہ میں کئی لوگ آج بھی بغیر بجلی کے رہتے ہیں۔ میں نے اظہار خیال کیا۔"

"[illegible] ستی چھوڑ کر دو ایک کپڑوں سے جنگل کی راہ کیوں نہیں لیتے۔ ہر بات میں آپ کے سوچنے کا انداز ہی نرالا ہے"۔

[illegible] پھر بیگم نے فیصلہ سنایا: "ہم پی سی خریدیں گے"

میں نے احتجاج کیا: "دیکھئے پی سی کوئی کھلونا نہیں ہے کہ بغیر سوچے سمجھے خرید لیں گے۔ یہ بتلائیے پی سی ہمارے کس کام آئے گا؟"

"پی سی بہت کام کی چیز ہے۔ مہارانی کے گھر کا حال دیکھئے۔ محسوس ہوتا ہے کہ انؑ کے بجائے سانس بھی پی سی لیتا ہے۔ پی سی کا ہی دل دھڑکتا ہے اور وہ پی سی ہی کی طرح سوچتی ہیں۔"

میں نے بیگم کی بات کاٹی "پی سی خرید کر آپ بھی مہارانی بننا چاہتی ہیں۔"

"جی نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پی سی سے مجھے روزمرہ کے کاموں میں مدد ملے گی۔ گھر کا بجٹ پی سی کی مدد سے تیار کرونگی۔ مینو تیار کرنے اور دستر خوان سجانے میں پی سی معاون ہوگا۔ پی سی میں پکوان کی ترکیبیں اور کام کی باتیں جمع کروں گی۔ پی سی کے ذریعہ گوشت اور ترکاری کے بھاؤ معلوم کرونگی۔"

"گویا پی سی کا استعمال کچن میں ہوتا ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"چلیے مت۔ پی سی آپ اور بچوں کے بھی بہت کام آئے گا۔ اپنی سروس اور آمدنی کا حساب کتاب پی سی میں رکھئے۔ دوستوں کے پتوں اور فون نمبروں کو پی سی میں اکٹھا کیجئے۔ انہیں خطوط لکھئے۔ پی سی کی مدد سے مضامین لکھئے اور شاعری بھی کیجئے۔ جب آپ اپنی تخلیقات پی سی پر لکھ کر رسالوں کو بھیجیں گے تو مدیر آپ سے کبھی یہ نہ کہیں گے کہ براہ کرم مضامین خوش خط لکھا کیجئے۔ استاد بن کر پی سی تخلیقات کی تصحیح بھی کرے گا۔ کتابیں چھپوانے میں پی سی کام آئے گا۔ کاتب اور پرنٹر کے چکر نہیں کاٹنے ہونگے۔ پی سی پر آپ اخبار پڑھ سکتے ہیں۔ خبریں سن اور دیکھ سکتے ہیں۔ پی سی سے موسمی پیش گوئی حاصل کرسکتے ہیں۔ کرکٹ کا اسکور دریافت کرسکتے ہیں۔ مختلف مسائل پر پی۔ سی سے مشورہ کرسکتے ہیں۔ پی۔ سی آپ کا دل بہلائے رکھتا ہے۔ مختلف پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔ موسیقی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ پی۔ سی کے ذریعے نئے دوست بنا سکتے ہیں اور ان سے گھر بیٹھے بات کرسکتے ہیں ..." بیگم سانس لینے کے لیے رکیں تو میں نے موقع غنیمت جان کر کہا "آپ مارکیٹنگ بہت اچھی کرلیتی ہیں۔ چلئے ہم پی۔ سی خرید لیتے ہیں۔" بیگم بولنے کے موڈ میں جب آتی ہیں تو بڑی مشکل سے خاموش ہوتی ہیں "خوش ہوکر کہنے لگیں "آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ بچوں کے لئے پی سی معلومات کا خزانہ ہے۔ بچوں کی تربیت میں پی۔ سی اہم رول ادا کرتا ہے۔ پی۔ سی میں بچوں کے لئے کئی کھیل ہیں۔ بچے شوق سے کھیلتے ہیں۔ جس سے ان کی ذہنی نشو و نما ہوتی ہے پی۔ سی بچوں کو ٹیوشن دیتا ہے۔ ہوم ورک میں مدد کرتا ہے۔ ان کا امتحان لیتا ہے۔"

میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا: "اب بس بھی کیجے۔ ہم اس ماڈرن الہ دین کے چراغ کو خرید ہی رہے ہیں دیکھ لیں گے وہ اپنے آقاؤں کے کتنے احکام بجالاتا ہے۔ فی الحال زور کی بھوک لگی ہے۔ کچھ کیجیے!"

بیگم کچن کا رخ کرتے ہوئے بولیں: "مجھے قوی امید ہے کہ پی۔ سی مایوس نہیں کرے گا۔"

پی۔ سی یعنی پرسنل کمپیوٹر خریدنے مارکیٹ گئے تو پتا چلا کہ پی۔ سی اکیلا خود کچھ نہیں ہے۔ پی۔ سی کنبہ پرور ہے اور اس کا ایک پورا خاندان ہے۔ پی۔ سی خاندان، کی بورڈ، مانیٹر، پروسیسر، پرنٹر، اسپیکر، موڈیم، جوائے اسٹک اور چند دوسری اشیاء پر مشتمل ہے۔ دن بہ دن پی۔ سی فیملی میں اضافہ ہورہا ہے۔ افراد خاندان کے علاوہ پی۔ سی ایک پالتو چوہا (ماؤس) بھی رکھتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہو کہ پی۔ سی کے اپنے دریچے (ونڈوز) بھی ہیں۔ زر کثیر خرچ کرکے ہم پی۔ سی اور اس کے کنبے کو خرید لائے۔

دکاندار نے بتلایا کہ پی۔ سی نازک مزاج واقع ہوا ہے۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے گرمی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ کھلی اور ہوادار جگہ میں اس کو رکھنا چاہیے۔ اگر پی۔ سی کا خاطر خواہ خیال نہ رکھا گیا تو وہ بیمار پڑسکتا ہے۔ اسے وائرس انفیکشن ہوسکتا ہے۔ پی۔ سی کے ساتھ نباہ کرنے کی ہدایتوں کو گرہ میں باندھ کر ہم نے گھر کے ایک وسیع اور کشادہ ہال میں پی۔ سی اور اس کے خاندان کی

آرام وہ رہائش کا انتظام کیا۔ پی۔ سی۔ سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں اس کی زبان سیکھنی پڑی۔ ہم اس جناتی زبان کو سمجھنے کے قابل نہ تھے۔ غلطی کرتے تو پی۔ سی فوراً ٹوکتا: "غلط حکم" (بیڈ کمانڈ) اور صحیح حکم کا منتظر رہتا۔ جب اسے مستقل غلط حکم ملتے تو اکثر وہ خاموشی سے اپنے خول میں بند ہوجاتا۔ کبھی مشورہ دیتا: "اپنا اور میرا وقت نہ برباد کیجیے۔ پروگرام کو سمجھ کر عمل کیجیے گا" پروگرام اگر پلے نہیں پڑرہا ہے تو ماہرین کے نام پتے اور فون نمبر دیتا کہ آپ پہلے ان سے رجوع کریں اور پھر مجھ پر حکم چلائیں۔

ایک عجیب و غریب بات پی۔ سی کے ساتھ یہ نوٹ کی کہ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتا، اسے احکامات اس کی زبان میں دینے پڑتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیں جوابات ہماری اپنی زبان میں دیتا ہے۔ اس مشاہدے کا ذکر میں نے ایک شاعر دوست سے کیا تو انہوں نے رائے دی: "کسی نہ کسی صورت ترسیل کا المیہ ہر جگہ موجود ہے۔"

پی۔ سی کام کرنے کے لیے ہردم تیار رہتا ہے اور اس قدر معاون کہ وہ خود بتلاتا جائے گا کہ اس سے کس طرح کام لیا جائے۔ بعض اوقات محسوس ہوا جیسے پی۔ سی ہمارا محکوم نہیں ہے بلکہ وہ بہت شاطر اور چالاک ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں۔ اس کے سامنے گاؤدی اور بے وقوف بنے بیٹھے ہیں۔ وہ حسب منشا جو چاہے کام ہم سے کروائے جارہا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کرنے کو کہا تو صاف مکر جائے گا کہ "ایسا ممکن نہیں ہے۔" اور آپ چوہے کے ذریعے سسٹم کے ہر بل میں جھانک کر اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے رہیے۔

پروگراموں کو سمجھتے، کتابوں کو پڑھتے، لوگوں سے پوچھتے اور خود پی۔ سی کی رہنمائی میں ہم پی۔ سی استعمال کرنے کے قابل ہوگئے۔ خوب وقت گزرنے لگا۔ الہ دین کے چراغ کو حکم دیا کہ امریکا کی تاریخ بتاؤ۔ انکسار سے پی۔ سی ریڈ انڈین کے آباء واجداد سے شروع ہوگیا۔ کبھی پوچھا کہ اطالوی کاپوچینی کافی کے بارے میں سناؤ اور پھر اسے تیار کرنے کی ترکیب بتاؤ۔ غالب کے کلام کے ساتھ شیکسپیر کے رومیو جولیٹ کی فرمائش کی۔ کرکٹ میں سب سے زیادہ رن بنانے والے کھلاڑی کا نام پوچھا۔ اس کی تاریخ پیدائش دریافت کی۔ ڈالر کی قیمت پوچھی اور سونے کا بھاؤ معلوم کیا۔ جرمن اور سنسکرت سکھانے کے لیے کہا تو بھی پی۔ سی تیار ہے۔

سب کچھ جانتے کے باوجود انکسار اور فرمانبرداری کی انتہا ہے کہ بٹن دبایا اور پی۔ سی خدمت کے لیے حاضر ہے۔ ہم پی۔ سی کے مالک بن کر فخر سے پھولے نہ سمانے لگے۔ بیگم نے کہیں آنا جانا بند کردیا کہ انہیں پی۔ سی پر کام کرنا ہے۔ سہیلیوں کو فون کرکے رعب جھاڑتیں: "ابھی پی۔ سی نے بتلایا کہ دنیا کے اسی فی صد ذرائع صرف بیس فیصد ترقی یافتہ ملکوں کے پاس ہیں جبکہ بقایا اسی فی صد لوگوں کا گزارہ صرف بیس فی صد ذرائع پر ہوتا ہے۔ کبھی تم نے سوچا ایسا کیوں ہے؟" محسوس ہوتا تھا کہ ہم نے پی۔ سی خرید کر اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاری کرلی ہے۔"

یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اکیسویں صدی میں "انسانی تعلقات" کے الفاظ لغت سے نکال دیے جائیں گے۔ اس کا صحیح معنوں میں اندازہ مجھے پہلی بار اس وقت ہوا جب ہمارے ایک عزیز ملاقات کے لیے گھر تشریف لائے۔ سوئے اتفاق سے میں اس وقت پی۔ سی سے "ملاقات" کررہا تھا۔ میں اس قدر منہمک تھا کہ ہمارے عزیز کے "السلام علیکم" کہنے پر میں نے جواب دیا:

"دماغ چل گیا ہے کیا؟؟"

"جی؟!!"

ہمارے عزیز شپٹائے۔ وہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ میں نے پی۔ سی کے دماغ کی خیریت دریافت کی تھی۔ واضح رہے کہ پی سی کو، کی کی بورڈ یا ماؤس کے ذریعہ ہدایات دیتے ہوئے "زبانی احکام" جاری کرنا میری عادت ہے ابھی تک میں اس ملاقات کے دائرہ اثر سے

باہر نہیں آیا تھا، چنانچہ ہمارے عزیز کے "جی؟" کہنے پر میں نے ڈپٹ کر کہا:
"احمق کہیں کے، میں تم سے ڈائرکٹری مانگ رہا ہوں۔" میرا روئے سخن، اب بھی پی۔سی کی طرف تھا۔
"ڈائرکٹری؟ مگر وہ تو میں ساتھ نہیں لایا۔ آپ نے پہلے ہی ٹیلی فون پر کہہ دیا ہوتا۔" ہمارے عزیز نے بوکھلا کر کہا۔
اب میں بھی چونک گیا تھا۔ میں نے اپنے عزیز سے معذرت کی، انہیں صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی مگر وہ جوں ہی بیٹھنے لگے میں چلایا:
"ایگزٹ، ایگزٹ!"
میں تو پی۔سی کو حکم (کمانڈ) دے رہا تھا مگر ہمارے عزیز سمجھے کہ شاید آگ لگ گئی ہے وہ گھبرا کر اٹھے اور کوئی ایسا دروازہ ڈھونڈنے لگے جس پر "ایگزٹ" لکھا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ آگ لگنے کی صورت میں باہر نکلنے کے ہنگامی دروازے پر "ایگزٹ" لکھا ہونا چاہیے۔ لیکن انہیں ایسا کوئی دروازہ نہیں ملا تو وہ گھر کے اندر کھلنے والے دروازے کی طرف لپکے اور (اپنی) جان بچانے کا تیز رفتار مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے بڑے لڑکے سے ٹکرائے جو ان کے لیے چائے لے کر آرہا تھا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے وہ دن دو عدد پیالیوں کا "یوم شہادت" ثابت ہوا اور ہمارے عزیز ناراضگی کے عالم میں یہ شہادت دینے کے لیے اپنے گھر چلے گئے کہ "پی۔سی نے تو ان لوگوں کا خون سفید کر دیا ہے۔"
گھر میں پی۔سی کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ہر صبح پی۔سی سے مشاورت کر کے دن شروع کرنے کا پلان بنایا۔ ایک صبح وقت پوچھا۔ پی۔سی نے بتلایا کہ اس وقت صبح کے نو بج رہے ہیں۔ گرینچ کا معیاری وقت ساڑھے تین صبح ہے ریاض شہر میں چھ بج کر تیس منٹ ہو رہے ہیں۔ جرمنی میں صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، قاہرہ میں صبح کے ساڑھے پانچ، کراچی میں ساڑھے آٹھ اور ڈھاکہ میں ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ جاپان، چین اور فلپائن میں اس وقت دوپہر ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں سہ پہر ہے۔ امریکا اور کینیڈا میں رات کے دس کے بعد کا وقت ہے۔
اس خیال سے کہ مختلف مقامات کا وقت بتلاتے ہوئے کہیں پی۔سی میری اوقات بتانے پر اتر نہ آئے میں نے تاریخ پوچھی۔ پی۔سی تاریخ بتلانے کے ساتھ پچھلے دو سو سال میں اس دن سے وابستہ تاریخ بھی پیش کرنے لگا آج کے دن 1702 میں برطانیہ اور روم نے فرانس پر حملہ کیا تھا آج کے دن 1799ء میں ریاست میسور کے سلطان ٹیپو سلطان کو ہلاک کیا گیا تھا وغیرہ وغیرہ میں نے موسمی پیش گوئی کے لیے کہا تو پی۔سی نے بتلایا "مطلع صاف رہے گا اور دھوپ چمکتی رہے گی درجہ حرارت 39 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ سکتا ہے کار میں ایر کنڈیشنر کی ضرورت محسوس ہوگی پیدل ہیں تو چھتری ساتھ رکھیے سائیکل اور اسکوٹر پر سفر کرنے والوں کو ٹوپی پہننی چاہیے۔" پی۔سی نے ستاروں کی مناسبت سے آج کے لیے قسمت کا حال بھی سنایا:
"رومانس کے لیے آج کا دن مناسب نہیں ہے سر راہ پٹ جانے کا خدشہ ہے آج کے دن بزنس شروع کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا شیرز مارکیٹ میں پیسہ لگانا خوش قسمتی کے دروازے کھول سکتا ہے خوش بختی کے لیے آج کا رنگ نیلا ہے بیوی سے ملے بغیر گھر چھوڑنا اچھا شگون ہے" اور پھر ستاروں کے حال کو ادھورا چھوڑ کر پی۔سی کہنے لگا:
"جناب والا۔ کافی وقت ضائع کر لیا رات کے بچے ہوئے کھانے کا ٹفن اٹھائیے اور دفتر کے لیے چل پڑیے نو تیس کی بس کسی لمحہ آتی ہوگی اس ماہ چھ مرتبہ دیر سے دفتر جا چکے ہیں باس کی ڈانٹ سن چکے ہیں۔ اب کیا میمو لینے کا ارادہ ہے" پی۔سی کا مشورہ سن کر پسینہ چھوٹنے لگا اور میں الیکٹرانک جن کو "کوئٹ" کا حکم دیتے ہوئے بس اسٹاپ کی جانب دوڑ پڑا۔

بیگم نے پی۔ سی کی مدد سے تیار کردہ کھانا کھلانے کے لیے ایک شام دوستوں کو مدعو کیا احباب کے درمیان میں نے بیگم کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

"بیگم پی۔ سی چلانے میں ماہر ہو گئی ہیں اس کی مدد سے گھر کی عنان حکومت بہتر انداز میں چلا رہی ہیں"

ایک دوست نے اپنا خیال ظاہر کیا:

"بیویاں کسی کو بھی چلانے میں ماہر ہوتی ہیں کیسے کیسے اڑیل شوہروں کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلالیتی ہیں پی۔ سی کیا چیز ہے۔!"

پی۔ سی کی مدد سے تیار کردہ پکوان کے خیال سے بھوک کچھ زیادہ ہی چمک گئی تھی کھانے کی میز کو دیکھا تو اس پر ترکاریوں اور میووں کا قبضہ تھا مرغ و ماہی کا دور دور تک پتا نہ تھا رحم طلب نظروں سے بیگم کو دیکھا وہ فرمانے لگیں:

"پی۔ سی کہتا ہے کہ مرغن غذا سے ترکاری اور میوے بہتر ہیں بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں ان میں وٹامنز کی وافر مقدار پائی جاتی ہے پی۔ سی نے بتایا کہ ہر دن ہمیں کم از کم پانچ قسم کی ترکاریاں اور میوے کھانے چاہئیں۔"

پی۔ سی کی شہ پر بنے روکھے سوکھے کھانوں کو حلق سے اتارنے کے لیے پانی مانگا تو میرے برابر بیٹھے دوست نے پانی کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا:

"پی۔ سی کا حکم ہے کہ کھانے کے دوران پانی نہیں پینا چاہیے خاموشی سے پی۔ سی کا تیار کردہ کھانا کھالو۔" پی۔ سی کو دعائیں دیتے ترکاری اور پھل کو زہر مار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مہینے کی پہلی تاریخ پر بیگم نے اخراجات کا تخمینہ اور میں نے تنخواہ اور الاؤنس کو پی۔ سی کے سامنے رکھا حساب کرنے کے بعد پی۔ سی نے بتلایا کہ آمدنی اور اخراجات میں فرق تنخواہ کے تقریباً برابر ہی ہے یعنی ہمیں اخراجات پورے کرنے کے لیے مزید ایک تنخواہ چاہیے پی۔ سی سے مسئلہ کا حل پوچھا گیا پی۔ سی نے تجویزیں پیش کیں۔

پہلا حل تھا کہ خرچہ کم کیا جائے ہم نے پی۔ سی کو بتایا کہ گرانی کے دور میں خرچہ کم ہونا ناممکن ہے کمی کے برخلاف اضافے کی قوی امید ہے دوسرا حل تھا کہ پارٹ ٹائم جاب کیا جائے ہم نے عرض کی کہ موجودہ نوکری کرتے ہوئے بچوں کو پڑھانے اور ان سے بات کرنے کے لیے مشکل سے وقت ملتا ہے پارٹ ٹائم کے لیے وقت کہاں سے لائیں۔ تیسرا حل تھا، مستقل آمدنی کے لیے بڑا ہاتھ مارا جائے ہم نے قیاس کیا کہ پی۔ سی بینک میں ڈاکہ ڈالنے کا پلان پیش کرنے والا ہے پکڑے جانے پر سزا کے متعلق سوچ رہے تھے کہ پی۔ سی نے لاٹری کا ٹکٹ خرید کر قسمت آزمانے کا مشورہ دیا

پی۔ سی نے چند اور پھسپھسے حل بھی پیش کیے جنھیں ہم نے رد کر دیا آخر ہم نے رشوت کے حوالے سے پوچھا۔ پی۔ سی نے رائے دی:

"سکہ رائج الوقت ہے چھوٹے موٹے ملازم سے لے کر سربراہان حکومت بھی اسے قبول کر رہے ہیں آمدنی بڑھانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے" میں نے اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے پی۔ سی سے کہا:

"میں کرتا ہی ہوں"

پتا چلا کہ پی۔ سی کے پاس ایک ایسا پروگرام بھی جو شادی کے امیدواروں کو جیون ساتھی چننے کے لیے مشورے دیتا ہے لڑکے اور لڑکی کے درمیان نباہ ہونے کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے اور متوقع امیدواروں کو ان کی پسلی کا جوڑ بھی فراہم کرتا ہے میں اور بیگم نے سوال نامہ پر کر کے پی۔ سی کے حوالے کیا اور پوچھا:

"کیا ہم میں نباہ ہو سکے گا"۔

کچھ دیر عجیب و غریب آوازوں کے ساتھ پی۔ سی سوچتا رہا اور پھر جواب دیا:

"امیدواروں کی عادات و اطوار اور خیالات قطب شمالی اور قطب جنوبی کی طرح ہیں نباہ ممکن نہیں ہے شادی سے سخت پرہیز کریں اگر بد قسمتی سے شادی ہو بھی جائے تو چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چل سکے گی"۔

میں نے بیگم کی جانب دیکھ کر کہا: "داد دیجیے پچھلے پندرہ برسوں سے نباہ کیے جا رہا ہوں۔"

بیگم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا: "اور میں جو صبر کیے جا رہی ہوں"۔

پی۔ سی کی آمد سے سب سے زیادہ بچے خوش ہوئے گھنٹوں پی سی کے ساتھ گیمس کھیلتے رہتے مختلف سوالات کر کے ہمیں تنگ کرنے کے بجائے پی۔ سی سے پوچھنے لگے مشکل الفاظ کے معنی انھیں جملوں میں استعمال کرنا مختلف موضوعات پر مضامین لکھنا اور حساب کے سوالات حل کرنے سے لے کر کارٹون پروگراموں کے لیے بھی وہ پی۔ سی کی مدد لینے لگے ہر وقت کوئی نہ کوئی پی۔ سی کو مصروف کیے رکھتا اب ہر ایک کے لیے الگ الگ پی۔ سی کی ضرورت محسوس ہونے لگی لیکن ہم ایک سے زیادہ پی۔ سی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اسی ایک بے چارے پی۔ سی پر سب کا گزارہ ہو رہا تھا

ایک صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی سبھی نے پی۔ سی پر یلغار کر دی بیگم پی۔ سی کی مدد سے ناشتہ تیار کرنا چاہتی تھیں میں الیکشن کے تازہ نتائج سننا چاہتا تھا بڑا لڑکا کل رات پی۔ سی کو لکھوائے گئے مضمون کی کاپی چاہتا تھا لڑکی کو گرامر کے سوالات کے جوابات مطلوب تھے اور چھوٹے لڑکے کو پی۔ سی پر بنائی گئی ڈرائنگ حاصل کرنی تھی سبھی آپس میں لڑتے جھگڑتے پی۔ سی کے مختلف بٹن دبانے لگے سب سے تنگ آ کر اور کسی کی نہ سنتے ہوئے پی۔ سی نے احتجاجی پیغام دیا:

"آپ لوگوں کو مزدوروں سے کام لینے کا سلیقہ پہلے آتا تھا اور نہ اب آتا ہے ظلم سہتے سہتے آخر مزدور ختم ہو جاتا ہے" اور پھر پی۔ سی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا

ہم مختلف بٹن دباتے ایک دوسرے کے چہرے تکنے لگے پی۔ سی کے اسکرین پر اندھرا ہی رہا میں نے بیگم کو مشورہ دیا:

"ڈسک لے جا کر مہارانی صاحبہ کے پی۔ سی سے مدد لیجیے ہمارا کام بن جائے گا اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے پاس بھی پی۔ سی آ گیا ہے"۔ ☆

اقبال ہاشمی
فلک نما، حیدرآباد

جب سے ہوئی ہے اپنی اٹاری بھی ہائی ٹیک
ہے ڈگڈگی کے ساتھ مداری بھی ہائی ٹیک
وہ دن گئے کہ بھیک میں سب کچھ قبول تھا
گھر بیٹھے ہورہے کروڑوں کے ہیر پھیر
وہ ہائی ٹیک جنون میں کیا مبتلا ہوا
اک حادثہ میں مرتے ہیں اب بے شمار لوگ
ہوتے ہیں ہائی جیک پرندے فضاؤں میں
نکلے گا ہائی ٹیک میں ہمارا بھی دم ضرور
ہر شخص کے بدن پہ لگاؤ گے زخم تم
تعلیم ہائی ٹیک میں جنھیں دے رہے ہو تم
کرتے ہیں ہائی ٹیک میں کسی کا بھی قتل وہ
اظہار عشق کرتی ہے نٹ پر بلا جھجھک
کٹ کٹ کے گررہے ہیں سڑک پر جوان دل
پڑتے نہیں زمین پہ دونوں کے اب قدم
کیوں تنقسوں سے ہاشمی ہونے لگا گریز

ہم دے رہے ہیں مالگزاری بھی ہائی ٹیک
رکھتے ہیں اب سپیرے پٹاری بھی ہائی ٹیک
اب مانگتے ہیں بھیک ، بھکاری بھی ہائی ٹیک
جوا بھی ہائی ٹیک ہے ، جواری بھی ہائی ٹیک
ہونے لگے ہیں اس کے حواری بھی ہائی ٹیک
ہیں ہائی ٹیک سوار ، سواری بھی ہائی ٹیک
کرتے ہیں اب شکار ، شکاری بھی ہائی ٹیک
ہوجائے گر حیات ہماری بھی ہائی ٹیک
رکھ کر بجٹ کے ہاتھ میں آری بھی ہائی ٹیک
وہ کررہے ہیں چوری چکاری بھی ہائی ٹیک
لیتے ہیں گر ڈان سپاری بھی ہائی ٹیک
نٹ پر پہنچ کے ہوگئی ناری بھی ہائی ٹیک
نینوں کی ہوگئی ہے کٹاری بھی ہائی ٹیک
ملا بھی ہائی ٹیک ہے ، پجاری بھی ہائی ٹیک
کیا ہوگئی ہے طنز نگاری بھی ہائی ٹیک

قطعات

دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا
ہر اپاہج بے سہارا ہوگیا
ایک استاد سخن کیا اٹھ گئے
ہر طفیلی کا خسارہ ہوگیا

ہوگئیں سب سازشیں ہم پر عیاں
آگئیں تھیلے کے باہر بلیاں
ہاشمی گر کھول دوں میں اپنا منہ
خون کی بہنے لگیں گی ندیاں

●☆●

ماہیے

کوثر صدیقی۔ گنوری روڈ۔ بھوپال

منگنی بھی نہ کی مجھ سے
پیار ترا جھوٹا
وعدے بھی ترے جھوٹے
●☆●
کب تک جیوں
غم کھا کر
ساس کے نام اس نے
پھر بھیجا منی آڈر
●☆●
ملتی ہی نہیں مہلت
پیار کی باتوں کی
چولھے سے نہیں فرصت
●☆●
سب رات وہ روتی ہے
عشق بھی کیا شئے ہے
اسکول میں سوتی ہے
●☆●
پازیب کو جھٹکا کے
ہاتھ نہ کچھ آیا
لیتا ہے وہ فراٹے
●☆●
آؤں میں پیا کیسے
کیسی ڈگر تیری
انگارے بچھے جیسے
●☆●
گھوڑے پہ سوار آنا
لے کے برات اپنی
ساجن مرے دوار آنا

لے چل مجھے میلے میں
پیار کی کچھ باتیں
کرنی ہیں اکیلے میں
●☆●
سوکھا ہی گیا ساون
پیار کی رم جھم سے
بھیگا نہیں گھر آنگن
●☆●
پازیب جھنکتی ہے
کیسے بلم آؤں
چوڑی بھی کھنکتی ہے
●☆●
بھٹکوں میں ڈگریا میں
راہ نہیں ملتی
ساجن کی نگریا میں
●☆●
ساجن ہے بڑا قاتل
پتر میں لکھا ہے
آنا ہے بہت مشکل
●☆●
چھٹی ہے نہ پتری ہے
ساس کے لیکن
چھٹی نہیں ملتی ہے
●☆●

بھگوان کے درشن تو
ایک بہانہ ہے
ڈھونڈوں گی میں ساجن کو
●☆●
میں کیسی دوانی ہوں
تیرے پرانے خط
ہر وقت ہی پڑھتی ہوں
●☆●
سوکن نہیں لے آنا
شہر سے گھر واپس
چپ چاپ چلے آنا
●☆●
قسمت کی ہوں میں ہیٹی
گوری نہیں ہوں تو
ہوتی بھی نہیں شادی
●☆●
وہ فوج میں نوکر ہے
پھول سا وہ کومل
میرے لئے پتھر ہے
●☆●
بیٹھے ہوئے گھوڑے پر
ڈولی لئے ساجن
کب آؤگے دوارے پر
●☆●

احمد ندیم قاسمی

ابنِ انشاء کی چند یادیں چند باتیں

ابن انشاء کی نظم و نثر کے حسن و خوبی پر گفتگو کرتے ہوئے نقاد ہی بھلے لگتے ہیں۔ میرے پیش نظر تو انشاء کی بعض یادوں کی باز یافت ہے۔ رخصت ہوجانے والے دوستوں کی یادیں ہی تو محبت اور رفاقت کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان یادوں کی بازیافت، اس سے ہمیشہ کے لئے چھن جانے والے دوست کو عارضی طور پر زندہ کرلینے کی ایک کوشش ہے۔ انشاء کی یادیں تو بے شمار ہیں مگر آپ کو اپنی یادوں میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ جن میں انشاء کا وجود مجسم تبسم بن کر سامنے آتا ہے۔ انشاء کی موت کے پس منظر میں اس کی متبسم شخصیت کی یاد اس کی جدائی کے زخموں کو اور گہرا کرجاتی ہے اور ہم جو اس کی باتوں پر مسکراتے ہیں، اندر ہی اندر روتے ہیں کہ یہ گوہر گراں مایہ ہم سے اتنی جلدی کیوں چھن گیا اور یہ نعمت ہم سے ایکدم کیوں واپس لے لی گئی۔

انشاء سے میری اس وقت سے شناسائی تھی جب وہ شیر محمد قیصر تھا۔ خط و کتابت میں ہماری بات چیت بیشتر شاعری کے بارے میں ہوتی تھی۔ اس لئے مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ شیر محمد قیصر کے پردے میں ایک خوب صورت شاعر کے علاوہ ایک بے مثل مزاح نگار، ایک زندہ دل سفر نامہ نگار، ایک محتاط مترجم، بچوں کا ایک محبوب شاعر، ایک بے بدل مکتوب نگار، ایک وضع دار دوست اور ایک بے مثال انسان بول رہا ہے۔ جب وہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کرکے لاہور آیا تو پشاور ریڈیو سے متعلق تھا۔ پھر جب چند ماہ بعد ہی میں لاہور منتقل ہوگیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجتماعوں میں اس کا قریبی ساتھ رہا۔ انہی دنوں ابراہیم جلیس سقوط حیدر آباد کے بعد لاہور آیا تو انشاء کے ہاں جانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں ایبٹ روڈ پر نشاط سنیما کے سامنے اسے انشاء کے گھر لے گیا۔ یہ چھوٹا سا گھر چینی طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ ویسے بھی انشاء کے نقوش کچھ چینی سے تھے چنانچہ جب انشاء کے گھر سے واپس آیا تو ابراہیم جلیس نے اسے سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا:

"مہاتما کنفوشس، تم تو پگوڈا میں رہنے لگے"۔

اور انشاء بولا: "اے متوکل بھکشو، پگوڈا کے دروازے تمہارے لئے ایک بھائی کی بانہوں کی طرح کھلے ہیں"۔

انشاء سے میری ملاقاتیں بیشتر پرتکلف ماحول میں ہوتی تھیں اس لئے مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ بظاہر اس اداس چہرے کے پیچھے شگفتگی اور زندہ دلی کا ایک سمندر متلاطم تھا۔ اس کی شخصیت کا یہ دل آویز پہلو مجھ پر بتدریج منکشف ہوا جب تکلف کی دیوار گر گئی اور ہمارے درمیان دو ہم سطح اور دو ہم مرتبہ دوستوں کی طرح تبادلہ خیال ہونے لگا۔ ان دنوں ہمارا معمول تھا کہ ہم انجمن کے اجلاس کے بعد میکلوڈ روڈ کے چوک لکشمی کے ایک ریسٹورنٹ میں اکٹھا ہوتے اور چائے پیتے۔ بل ادا کرنے کا وقت آتا تو سب حاضرین اس میں شرکت کرتے مگر ایک روز انشاء نے بڑے مزے کی ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا: "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا بل آتا ہے تو ویٹر کے سامنے ہم ایک ایک آنے کا چندہ جمع کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم ہیں تو فقیر لوگ مگر ریسٹورنٹ کے ویٹروں پر یہ ظاہر کرنا کچھ ایسا ضروری تو نہیں ہے کہ ہم بھی ان کی طرح قلاش ہیں۔"

چنانچہ آئندہ ہفتے جب ہم چائے کا آرڈر دیں تو فوراً سب لوگ چپکے سے ایک ایک آنہ میرے پاس جمع کرادیں۔ جب بل آئے

گا تو اسے یکمشت ادا کردیا جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس طرح دیٹر آئندہ ہمارے سامنے ٹوٹی ہوئی پیالیاں لگانے سے احتراز کریں
اس تجویز کو بہت پسند کیا گیا۔
اگلے ہفتے سب نے ایک ایک آنہ انشاء کے حوالے پیش کیا مگر جب گنتی ہوئی تو اس میں ایک آنہ کم نکلا۔ کسی نے احتجاج کیا
انشاء بولا: "اے مزدوروں کو ان کا منصفانہ معاوضہ ادا کرنے کے علمبر دارو! میں نے تم سب سے ایک ایک آنہ جمع کرنے میں جو جسما
محنت اور اس رقم کی گنتی میں جو دماغی ریاضت صرف کی ہے کیا اس کا معاوضہ ایک آنہ بھی نہیں بنتا؟ چنانچہ اس رقم میں تمہارا ایک
ایک آنہ اور میری محنت شاقہ شامل ہے۔ تم نے اپنے ایک ایک آنے کی خریدی ہوئی چائے پی۔ میں نے اپنی محنت کی چائے پی"۔
پھر ایک روز، انشاء میرے پاس آیا کہنے لگا: "آپ پیرزادے ہیں دعا کیجئے کہ ماؤزے تنگ کی فوجیں سالنامہ "ادب لطیف" شا
ہونے تک شنگھائی پر قبضہ نہ کرسکیں۔"
میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ سالنامہ "ادب لطیف" میں شنگھائی کے عنوان سے میری ایک نظم چھپ رہی ہے جس:
شنگھائی کا مقدر بدلنے کے لئے میں نے ماؤ کی فوجیں بلوائی ہیں۔ اگر ان فوجوں نے نظم کی اشاعت سے پہلے ہی شنگھائی پر قبضہ کرلیا
میری نظم پر زمانہ ماضی کا قبضہ ہوجائے گا۔ ماؤزے تنگ خود بھی شاعر ہے اسے بھی تو چاہئے کہ شنگھائی پر اپنی طوفانی یلغار کرنے
بجائے پاکستان میں ایک نظم کی اشاعت کا تھوڑا سا انتظار کرلے"۔
ایک بار ہمارے ایک عزیز دوست کی غزل شائع ہوئی جس کا ایک مصرعہ یوں تھا، پھولوں پہ انہماک سے شبنم گرائیں گے"۔
ہفتہ وار چائے نوشی کے دوران کسی نے کہا کہ یہ شبنم گرانا اور پھر انہماک سے شبنم گرانا کیا ہوا؟۔
انشاء بڑی معصومیت سے بولا: "لو یہ بھی کوئی الجھن کی بات ہے یوں سمجھو کہ شاعر پھولوں کی ایک کیاری میں بیٹھا ہے۔ اس۔
پاس شبنم سے بھرا ہوا ایک کٹورا ہے، ہاتھ میں ایک ڈراپر ہے وہ اپنی عینک کو ناک کے آخری سرے پر رکھ کر ڈراپر کی مدد
کٹورے میں سے شبنم کا ایک قطرہ اٹھاتا ہے اور پھول پر اس احتیاط سے گراتا ہے کہ کہیں وہ پھول کی پتی پر سے ادھر ادھر لڑھک
جائے۔ اسے کہتے ہیں پھولوں پر انہماک سے شبنم گرانا"۔
ایک اور شاعر دوست نے انشاء کے مزاج پوچھے تو وہ بولا: "ویسے تو ہر طرح خیریت ہے مگر کل سے کھانسی ہورہی ہے"۔
شاعر نے کہا: "کوئی بے احتیاطی کی ہوگی"۔
انشاء بولا: "ہاں بے احتیاطی ہی ہوئی دراصل میں تمہاری وہ غزل با آواز بلند پڑھ بیٹھا جو کل ہی شائع ہوئی ہے"۔
شاعر نے پوچھا: "مگر میری غزل کا کھانسی سے کیا تعلق؟"
انشاء نے جواب دیا: "غزل کے مفہوم کا تو کھانسی سے کوئی تعلق نہیں مگر تمہاری غزل کے قوافی بہت کھانسی آور نکلے"۔
اور اس کے بعد انشاء نے شاعر کو اس کے قوافی سنائے اور ہر قافیے کے ساتھ کھانستا چلا گیا۔ تنعم ہے، ترحم ہے، توہم ہے ...
اسلام آباد میں وزارت تعلیمات کے زیر انتظام ایک اجلاس ہورہا تھا۔ ایک صاحب نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ پنجاب
میں ایم اے اور ایم ایس سی تک ذریعہ تعلیم پنجابی ہونا چاہئے۔ انشاء پنجابی تھا اور اردو کی طرح پنجابی کا بھی رسیا تھا۔ مگر صاف صاف
دیا کہ ایم اے اور ایم ایس سی کو فی الحال رہنے دیجئے اور میٹرک لیشن یا انٹر تک اکتفا فرمایئے۔ وہ صاحب بولے۔ ہم پنجابی زبان کو ا
ترقی دیں گے کہ اس میں ایم اے اور ایم ایس سی کی بھی تعلیم دی جاسکے گی"۔
انشاء نے کہا: "یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے مگر کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم پنجابی کو پنجابی ہی رہنے دیں اور اس میں جو بھی تر

ہو، بتدریج ہو اور پنجابی پنجاب کے مختلف علاقوں کی مخصوص لفظیات اور لہجوں اور محاوروں اور روزمروں اور کہاوتوں کا سرمایہ جمع کرتی ہوئی آگے بڑھے ؟ آپ بہت جلدی میں معلوم ہوتے ہیں اس لئے احتیاط رکھیے گا کہ اس عجلت میں پنجابی اتنی زیادہ ترقی نہ کرجائے کہ اردو بن کر رہ جائے "۔

ایک صاحب علامہ اقبال پر کام کررہے تھے ۔ لیک اجلاس میں ان کی گفتگو سننے کے بعد قدرت اللہ شہاب نے انشاء سے کہا ۔مجھے تو یہ شخص حواس باختہ معلوم ہوتا ہے "۔ انشاء نے فوراً شہاب صاحب کی تصحیح کی۔ بولا " آپ زیادتی کررہے ہیں۔ حواس باختہ تو وہ کسی طرف سے نہیں ہے البتہ اقبال باختہ ضرور ہے "۔

اور یہ آخری دعوت کا واقعہ ہے جب انشاء اپنی بہن کی شادی پر آخری بار لاہور آیا تھا۔ دعوت میں لاہور کی ساری ادبی برادری مدعو تھی ۔ انشاء کو جس نے بھی دیکھا اس کا جی دھک سے رہ گیا کہ وہ بالکل دھان پان ہوا تھا اور اس کا مرض اس کی مسکراہٹوں اور چٹکلوں سے بھی چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔ اس کی شگفتہ طبعی صحت کے اس عالم میں بھی اسی طرح توانا تھی ۔ وہ دوستوں کی مدارت کے سلسلے میں یہاں سے وہاں گھوم رہا تھا ۔ میں کھانا ختم کرچکا تو وہ فیرنی کا ایک " جوٹا " اٹھائے میرے پاس آیا اور بولا : " یہ لیجئے آپ مٹھاس کے بڑے رسیا ہیں نا "۔

میں نے کہا : " انشاء جی ابھی تو ابھی ابھی فیرنی کا ایک جوٹا صاف کرچکا ہوں "۔

انشاء بولا : " دیسے تو میں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ ابھی ابھی آپ نے فیرنی کے چار جوٹوں کی صفائی کی ہے مگر اس پانچویں جوٹے کا بھی صفایا کر دیجئے کہ ..... صفائی عجب چیز دنیا میں ہے "۔

صحت کے اس مخدوش عالم میں بھی انشاء کی خوش مزاجی اور حوصلہ مندی کے دو نہایت عمدہ ثبوت میں نے " فنون " میں درج کئے تھے ۔ ایک تو میرے نام انشاء کا آخری خط تھا اور دوسرا اس کی زندگی کا آخری مضمون ۔ جس میں اس نے ملک الموت کی پسلیوں میں بھی ٹہوکے دئے تھے ۔ یہ تھا روحانی گہما گہمی اور زندہ دلی سے چھلکتا ہوا انشاء جس کی جب بھی برسی منائی جاتی ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود زندگی کی برسی منارہے ہیں ۔

ابن انشاء ان مرنے والوں میں سے ایک ہے جن سے مل کر جن سے باتیں کر کے ، جن کی دوستی کا اعزاز حاصل کر کے ، جن کے لہو البتی اور مچلتی ہوئی زندگی کا مشاہدہ کر کے ہم اعتماد کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ موت ان کے قریب سے بھی گزرتے ہوئے شرمائے گی۔ مرنا تو سبھی کو ہے مگر یہ اتنی جلدی نہیں مریں گے اور زندگی سے ان کا پیار اور زندہ رہنے کے سلسلے میں ان کا عزم انہیں انتہائی سفید براق بڑھاپے تک لے جائے گا۔ مگر پھر یہ لوگ یکایک مرجاتے ہیں اور ہم جنہیں ہمیشہ سے بے ثباتی دنیا کے درس دئے گئے ہیں سوچتے ہیں کہ یہ دنیا محض بے ثبات ہی نہیں ہے ، بے حد سفاک بھی ہے کہ جو زندہ رہنے کے لائق ہوتے ہیں۔ انہیں سمیٹ کر اپنے سینے میں اتار لے جانے کی اسے ہمیشہ بڑی جلدی پڑی رہتی ہے ۔ اور زندگی کا منظر اجڑ جاتا ہے اور اتنے بہت سے انسانوں کے ہجوم میں ہم تنہا رہ جاتے ہیں ۔

ابھی ہم خاصی مدت تک یہ فیصلہ نہیں کرپائیں گے کہ ابن انشاء بہت پیارا شاعر تھا یا بہت پیارا نثر نگار، خاکہ نویس تھا یا بہت پیارا سفر نامہ نگار تھا یا بہت پیارا مترجم تھا یا بہت پیارا انسان تھا ۔ دراصل ہم لوگ شخصیتوں کو خانوں میں بانٹنے کے عادی ہیں کیوں کہ اس طرح اس شخصیت کے خاکے میں اور نتیجتاً اس کی حق تلفی میں سہولت رہتی ہے اور وہ شخصیتیں ہمیں بہت کھلتی ہیں جو ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہوتی ہیں اور جن کی خصوصیات یوں مربوط ہوتی ہیں کہ ایک خصوصیت کو دوسری سے الگ کرو تو ایسی ٹیس سی اٹھے جیسے گوشت سے

ناخن کو جدا کیا گیا ہے ۔ ابن انشاء ایک ایسی ہی مربوط اور ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا ۔ وہ بیک وقت بہت کچھ تھا اور بہت کچھ ہونے کے باوجود اس کی شخصیت کہیں سے بھی کٹی ہوئی اور بٹی ہوئی نہیں تھی ۔ بس اتنا تھا کہ وہ جن انسانوں کا دوست تھا ان کا تو وہ دوست تھا ہی مگر دشمن کسی انسان کا نہیں تھا ۔

البتہ بعض انسانی گروہوں کے ان نظاموں کا غیر مشروط دشمن تھا جو عامتہ الناس کو گھٹیا اور بڑھیا انسانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور جنہیں یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے اور یہ تکلیف انہیں سینکڑوں صدیوں سے ہو رہی ہے کہ عام انسانوں کی آنکھیں بھی ان کی آنکھوں کی طرح تعداد میں دو کیوں ہیں ۔ ایک کیوں نہیں ہے اور اگر دو آنکھوں کے بغیر چارہ نہیں تھا تو ان کی وہ دس کیوں نہیں جو تفریق و امتیاز کے لئے ضروری تھیں اور یہ چوپایوں کی طرح پچھلی دو ٹانگوں کے علاوہ اگلے دو ہاتھوں کو بھی زمین پر ٹیک کر کیوں نہیں چلتے ۔

ابن انشاء صرف اس طرح کی سوچ رکھنے والے "سپر" انسانوں کا دشمن تھا ورنہ اس کی شخصیت میں اتنی نرمی تھی اتنا گداز تھا ، اتنی اپنائیت تھی کہ میں تو اس سے جب بھی ملا ، مجھے مہاتما بدھ یاد آ گئے ۔ ایسے کھرے اور بے ضرر انسان کو ابھی تیس چالیس برس اور زندہ رہنا چاہیے تھا ۔ ابن انشاء کے سے وجود ہی تو انسانی زندگی کو پر مایہ اور تہہ دار بناتے ہیں اور انسانوں کو زندہ رہنا اور سلیقے سے زندگی گذارنا سکھاتے ہیں ۔ مگر وہ جن کی پوری میعاد حیات ، انسانی زندگی کو حسن و خیر اور شگفتگی و بے ساختگی کے ساتھ بسر کرنے کی ایک تبلیغ مجسم ہوتی ہے جب خود مرجاتے ہیں ، چاہے ابن انشاء کی طرح ہنستے کھیلتے مرگئے ہوں اپنے عزیزوں اور دوستوں اور پڑھنے والوں اور یاد کرنے والوں کے لئے زندگی کو ایک کرب مسلسل میں بدل جاتے ہیں اور ہم آس پاس بکھرے ہوئے اندھیروں کو ٹٹولتے رہ جاتے ہیں کہ یہ جو ابھی ایک کوندا سا لپکا تھا ، وہ تاریکی کے اس انبار میں کہاں کھو گیا ۔

ابن انشاء کی شخصیت اور ذہنیت کے تجزیے کئے جائیں کہ وہ جو ہر وقت ہنستا رہتا تھا ، کتنا گھائل تھا اور جس نے شاعری اور نثر میں اپنا ایک الگ اسلوب تراش لیا تھا داخلی طور پر وقتی محرمیوں کا شکار تھا ۔ مجھے ان بزرگان علوم کے برعکس فقط وہ ابن انشاء پیارا تھا جو مجھے عام زندگی میں نظر آتا تھا اور جو محبت اور دوستی کے معاملے میں اتنا وضع دار تھا کہ اس کی نیک نیتی کی قسم کھائی جا سکتی تھی اور جو ہمارے معاصر ادب کا ایک البیلا کردار تھا ۔

کاش ابن انشاء کے سے عزیز وجود کو اس دنیا سے اٹھالے جانے والی اور ہمارے معاشرے اور ہماری تہذیب کو غریب تر کردینے والی موت کے خلاف عدالت الہی میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا ۔ ☆

پروفیسر حفصہ عرب، بھوپال

"جھولا وارڈ"

بھلا سوچئے! خدا خدا کرے ہم پچھلے دنوں زندگانی کی گولڈن جوبلی سے گذر چکے۔ تب بھی اپنا ناطہ زنانہ اسپتال سے ٹوٹا نہیں۔ حالانکہ ہم خود کو ان بیوقوفوں میں شمار کرتے ہیں، جنھوں نے جوانی کے پر بہار دن بھی خزاں رسیدہ کاٹے۔ نہ اعلیٰ اور فیشن کے کپڑوں سے غرض، نہ بناؤ سنگھار اور میک اپ کا دھیان، نہ ناخن درازی اور نیل پالش۔ اوپری ٹیم ٹاموں میں ایک لپ سٹک کو منہ لگانے کا دل کرتا تھا مگر اسے بھی اس مصلحت نے دور رکھا کے یہ گفتگو اور خورد و نوش میں آڑے آتی ہے۔ مکمل لحاظ ملحوظ نہ رکھو تو ہونٹوں کی تمام خوبصورتی پیٹ میں اترتے دیر نہیں لگتی۔ غرض ہم اپنی ہر قسم کی دیکھ بھال "فرض شناسی" کے عوض بیچ چکے تھے اور یہ اشتیاق بڑھتے بڑھتے خود کے لئے حق تلفی کے حدود عبور کر گیا۔ نہ جانے کیوں اس کے بعد بھی ہم تمام عزیزوں، ہمنشینوں اور دوستوں کی دلچسپی اور خوشی کا مرکز بنے رہے۔ سوچتے ہیں یہ خداداد عطیہ کیا کم ہے؟ جسے نہ عمر کی طرح زوال، نہ کوئی چھیننے پر قادر ـــــ

ہاں تو بات زنانہ اسپتال سے شروع ہوئی تھی، عین جوانی میں جب ہم کرم چاری کی اس سرکاری اسپتال سے مڈبھیڑ ہوتی، قسمت سے پرائیویٹ سنگل وارڈ (private single ward) الاٹ ہوجاتا تھا، مگر اس دفعہ الگ قسم کے حالات سے دوچار ہو کر آنا ہوا تو ہاؤس فل ملا۔ سمجھ میں بات آتی نہیں کہ منصوبہ بندی کے افعال زریں کے بعد بھی عالم یہ تھا کہ پورے اسپتال میں صرف "جھولا وارڈ" کا پردے والا پارٹیشن خالی تھا وہی اپنے نام لکھا تھا۔ مجبوری کے رعب سے لاچار ہو کر اس میں داخلہ لے لیا۔ جونہی وارڈ میں قدم رکھا، نو مولود بچوں کی اُآؤں، اُآؤں، اُآؤں کی لوریوں اور جھولوں کی آوازوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ منا سا جھولا اصولاً ہمارے بیڈ (BED) کے ساتھ بھی منسلک تھا۔ ہماری جوان العمر شادی شدہ بیٹی نے بڑے پیار سے ہمیں بیڈ پر دراز کر دیا اور ہم شٹپٹائے ہوئے شرم سارے پڑے پڑے سوچنے لگے ..... واقعی ہم خود کے تئیں کس قدر مخصیص اور غیر ذمے دار واقع ہوئے ہیں .....! ماضی میں جب جب ہمارے کسی اہل خانہ کی صحت نے بغاوت کی تو ہمارے پرس کی خودداری اور رگ حمیت نے کبھی کسی سرکاری شفاء خانے کا احسان مند ہونا گوارہ نہ کیا۔ خدا رکھے ہندوستان میں قدم قدم پر اعلیٰ درجے کے نرسنگ ہومس مریضوں کا شاندار استقبال کر رہے ہیں، ان سے کم پر وہ کبھی راضی نہ ہوا۔ مگر کاڑھے پسینے کی کمائی، ایمانداری اور اس کا کفایتی خرچ وہ صرف ہمارے نصیب میں لکھا کر لایا ہے۔ ویسے بھی ہم گھر بھر میں واحد سرکاری نمک خوار ہیں اور "فرض کفایہ" بن جانے کی سعادت اپنے لئے ہونا بھی چاہیے!۔

سچ یہ ہے کہ خود سے بے رغبتی برتتے میں ہم اس حد تک اوپر اٹھے کہ اسکے بعد کی سیڑھی اپنی پہنچ سے بالاتر تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ سب سے اوپر اٹھانے کا کام "مالک" نے صرف اپنے ہاتھ لیا ہے۔ پھر بھی ہماری زندگی کے اطراف منہ بسورے اور بیزار سے دکھائی دیے تو تفتیش کرنے، پوسٹ مارٹم کرانے چلے گئے۔ جب رپورٹ آئی تو بھید یہ کھلا کہ "اپنی ناقدری کرنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے"۔ مگر اس مدھم رفتار کی سوجھ کی سزا میں وقت دور کھڑا ہمیں منہ چڑا رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا خود کو اسطرح بہلایا پھسلایا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑنے کا غم، حماقت میں اضافہ کرتا ہے اسی طرح خود کے دلاسے اور تسلیوں میں کروٹیں بدلتے بدلتے سویرا ہوا تو اچانک ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل ہی گیا علامہ اقبال کا باوقار چہرہ سامنے تھا اور ان کی شمع سحر ہم سے کہہ رہی تھی "سوز ہی زندگی کا ساز" اور "نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے" بس اس آواز پر لبیک..... اور معالجے نے متعدد اسپتالوں سے ڈسچارج ہونے کی ہمیں سعادت بخش دی یعنی سازوں کے

تناسب سے زندگی کے باجے کئی بار بج چکے ہیں چنانچہ مرتے کھپتے اس زنانہ اسپتال کے داؤ۔ ابکی دفعہ ہم ان حالوں لگے کہ گر مشیت ایزدی نہ ہوتی تو آج ہمارا شمار شہدا میں کیا جارہا ہوتا۔ عالم بالا کا ٹکٹ گویا کٹ چکا تھا مگر ہماری انتقال کی نحوست ان بڑی ڈاکٹر صاحبہ پر ٹوٹی جن کے ہم زیر علاج تھے وہ ہمیں آپریشن کے لائق بنانے کی محنت کے دوران خود دوسرے شہر منتقل ہو گئیں ۔

یہ مرے نصیب کی بات ہے

تھے انتخاب میں ہم نہ تھے

ان کے قائم مقام چھوٹی ڈاکٹران ہمارے ذریعہ اپنے تجربات میں چار چاند لگاتی رہیں ان کا تختہ مشق بن کر اپنا درد نہ صرف منت کش دوا ہوا بلکہ غالب چچا کے تصور کے بر خلاف دواؤں کا حد سے گذرنا درد بن گیا آپ بھی سوچتے ہوں گے "اللہ جانے کون بلا ہے "آخر کار ہمارا دواؤں کی بدہضمی سے چکرا جانا ہمارا زبردست غاز بردار بن گیا۔ ہوا یہ کہ بے تابی اور گھبراہٹ کے عالم میں جونہی ہم بستر (Bed) سے جدا ہوئے ، پورا اسپتال اپنے نام کی مناسبت سے ہمیں ناچتا دکھائی دیا سم کر صبر کا دامن چھوڑ چھاڑ ہم چلا اٹھے " مسٹر (sister) ذرا دیکھئے سب در و دیوار ہل رہے ہیں ، شاید زلزلہ آرہا ہے "۔

مسکرا کر سسٹر نے ہمیں بستر پر لٹایا اور فوراً بڑی ڈاکٹر صاحبہ سے ہمارا معائنہ کروانے کا سوچا اس طرح اگر اپنے ساتھ یہ چکر بازی نہ ہوئی ہوتی تو سارے دردوں سے آج کتنی پا چکے ہوتے نہ رہتا بانس نہ بجتی بانسری۔ مگر کیا کیجئے زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا ۔ کبھی کبھی دل کی بیزاری یہ تلقین بھی کر جاتی ہے ۔ "ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا " ۔ ویسے ایک بچے نے اس مصرعے کا مطلب کسی پر مرمٹنا بتایا۔ جسے غیر مناسب سمجھ کر ہم نے مدلل کاروائی یوں پیش کی تھی کہ ایک سے زیادہ محبوبہ پر مرجانے کی بابت کبھی تحریر میں ذکر نہیں کیا جا سکتا ورنہ اس دنیا میں عاشق اس بری طرح پھنسے گا کہ ایک سے بھی جائے گا ۔

بیماری کی حالت کو طول دینے کی معذرت چاہتے ہوئے آپ کی قوت سماعت پر داد بھی دونگی ۔ آپ نے ناچیز کے احوال بالکل کسی بڑھیا ہومیوپیتھک (Homeopathic) ڈاکٹر کی طرح صبر و شکر سے سنے ، جسکے ہم زیر علاج ہوں حالانکہ عرض حال مختصر ترین بیان کرنے پر بھی خدا کے فضل سے ہم قدرت رکھتے تھے ، وہ اس طرح کہ مکان کے مجھے بنا کے دیکھ ، شادی کے مجھے رچا کے دیکھ " کہاوت میں صرف ایک کی پخنہ لگادیتے اور کہہ دیتے " صحت کے مجھے بگاڑ کے دیکھ " بفضلہ ہم نے یہ تینوں کام بہ نفس نفیس بنا شرکت غیرے نہ صرف کر کے دیکھے ہیں بلکہ تا زندگی دیکھتے رہیں گے ۔۔!

بہت ہم نے دیکھے ہیں پست و بلند

بس اب اس مریض کو ذرا سا وقت علاج کے لئے اور تھوڑا سا تیمار داروں اور غمگساروں کو عنایت کردیں .... تو عرض کرتی ہوں کہ سسٹر صاحبہ کو ہمیں پرکھنے لائیں تو انھوں نے وارڈ کے ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سے کچھ ایسے سوالات کئے کہ ہم خود کو ماضی بعید میں پاکر دل ہی دل میں مسکانے لگے ۔گویا انہوں نے ہمیں خوش فہمی کا پہلا اینٹی ڈوز دیا۔ ہم ان سے مل کر پھولے نہیں سمارہے تھے ۔ جیسے ان کے دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ۔ مگر آخر ہم نے ان کو صحیح علاج کی لالچ میں اصلیت سے آگاہ کر دیا ۔ کچھ گھنٹے بستر درازی کے بعد بجلی " آرام حرام ہے " والی نس پھڑکی اور بیٹی کو اشد ضرورت کے بہانے لیجانے پر مجبور کر دیا ۔ پیوست ڈرپ اپنے ہاتھ میں اوپر کی طرف اٹھا کر وہ جوں ہی وارڈ کے باہر لائی اور نزدیک سے جانی پہچانی نظریں ہم دونوں پر آن پڑی ۔ جہاں قریبی نگاہیں حیران تھی وہاں دور والی مغالطے میں پڑ کر بیٹی کی حیرت اور مبارکباد کے ارادے سے وارڈ میں تشریف لانے لگیں ۔ بیٹی بیچاری تفصیلات میں پڑ گئی ۔ مگر ہمیں قلق اس بات کا ہے دور دور سے آنے والے ہمارے ہمدرد تلقین کو " جھولا وارڈ " کی ہمارے ساتھ منسلک ہونے

کی بے یقینی لئے پاؤں واپس لے گئی۔ اس طرح ہم خیر خواہ احباب کی نہ صرف مزاج پرسی سے محروم رہے بلکہ انکے لائے ہوئے جوس اور فروٹس جیسی نعمتوں سے بھی اپنا نام نشان مٹ گیا۔

اس سلسلے میں ہمیں اس بات پر ناز ہے کہ ہمارا بیٹا من جملہ اپنے احباب کے ہماری آؤ بھگت میں کافی مستعد رہا۔ اتفاق سے اسی اسپتال میں جہاں وہ دنیا دیکھنے آیا تھا ہمیں برابر تھرماس میں دودھ لالاکر پلایا اور اپنے دودھ کا حساب چکتا کر دیا۔ یہ سعادت کیا کم ہے کہ اسے کسی بھی طرح مقروض رہنا پسند نہیں۔ مگر ساری مہربانیوں کے بعد بھی ہمارا رزلٹ "کھایا پیا کچھ نہیں گلاس پھوڑے چھ آنے" جیسا رہا اور اپنا آپریشن حالات کی نظر ہو گیا۔ بیٹا اصرار کرتا رہا کہ "آپریشن کی بات پھیل چکی ہے۔ ہم لوگ جھوٹے پڑجائیں گے۔ منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے"۔

مگر ہم کیا کرتے ؟

ڈاکٹروں نے ہمیں خارجی ٹکٹ تھما دیا اور دواؤں کے رحم و کرم کے ساتھ ایک ماہ بعد آنے کے لئے مدعو بھی کیا.... اور "ہم بد صو خیر سے گھر کو لوٹے"۔ ☆

معاوضہ کے لئے

حسن امام درد، محمد سالم، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر مظفر مہدی، پروفیسر محمد کمال الدین، پروفیسر ایم اے ضیاء، ڈاکٹر امتیاز احمد صبا، مناظر عاشق ہرگانوی اور دیگر حضرات ادب کے بعض پہلو پر باتیں کر رہے تھے۔ جاسوسی ناول نگاری کی بات چلی تو ہرگانوی نے بتایا:

" مشہور جاسوسی ناول نویس اور PERRYMASON کے خالق Erle Stanley Gardener نے جب شروع شروع میں لکھنا شروع کیا تو ہر لفظ پر انہیں تین پینی معاوضہ ملتا تھا۔ مگر ان کے ابتدائی ناولوں میں ہر مجرم چھٹی گولی پر ہلاک ہوتا تھا۔ ایک بار ان کے ناشر نے پوچھا: "جناب، آپ کا مجرم چھٹی گولی ہی پر کیوں ہلاک ہوتا ہے ؟ پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں گولی پر بھی تو ہلاک ہو سکتا ہے"۔

گارڈنر نے جواباً کہا: جناب! اگر میں اپنے مجرم کو پہلی گولی میں ہلاک کر دوں تو پندرہ پینی کا گلا گھونٹنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کے لئے اپنے مجرم کو چھٹی گولی میں ہلاک کرتا ہوں"۔ ☆

(مناظر عاشق ہرگانوی)

محمد علی رفعت، آئی اے ایس
حیدرآباد

ساٹھ سالہ نوجوان کی دعا

یا خدا بگڑی قسمت بنادے
چوتھی شادی بھی میری کرادے

ساٹھ سالہ - مُلی - کا ہوں پٹھا
یا خدا اک پری کی دلا دے

داکنگ اسٹک کا دعدہ تو ہے ہی
چوکڑا بھی جہیز میں دلا دے

حاجی صاحب تو بننا ہے اک دن
حاجی مستان پہلے بنادے

دوستوں کو نہ رہنے دے پیاسا
کنولے جھاڑوں کی سیندھی پلادے

پہلے دنیا میں دے دے بیعانہ
اک عدد حور یاں بھی دلا دے

میرے محبوب کی ہے یہ شادی
کم سے کم مجھ کو قاضی بنادے

طالب خوندمیری سے کہدو
خوبصورت سا نقشہ بنادے

جانِ من میرے دل کی زمین پر
اس کے بعد ایک بنگلہ بنادے

محبوب مانبھوی
بلاسپور (ایم پی)

غزل

کہہ کے وہ بھاگ گئی گھر سے غزالوں کی طرح
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح

جھیل سی آنکھوں کی گہرائی ہمیں کیا معلوم
ہم تو ڈوبے ہی نہیں ڈوبنے والوں کی طرح

دال روٹی پہ گزر کرلوں ۔ مگر یہ تو بتا
دل بھی ملتی ہے بازار میں دالوں کی طرح

میں نے دل دینے کی آفر کی تو غصے سے کہا
پیس ڈالوں گی ترا دل بھی مسالوں کی طرح

تجھ کو سسرال تو مل جائیگا اچھا لیکن
تجھ کو سالے نہ ملیں گے مرے سالوں کی طرح

ویٹ لفٹینگ کی پریکٹس نے بڑا کام کیا
زندگی کٹتی ہے اب اسکی حمالوں کی طرح

پڑھ کے خط پھاڑ دیا اس نے یہ کہہ کر محبوبؔ
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے مقالوں کی طرح

●☆●

ظفر عمر زبیری (پاکستان)

قید حیات

ہم غالب کا وہ مصرعہ نہیں لکھ رہے ہیں جو اس مضمون کا عنوان پڑھ کر آپ کے ذہن میں کلبلانے لگا ہے۔ اس لیے کہ ہمیں بند غم کا تذکرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ ہمارے سامنے تو وہ بند شکر قند ہے جس کو شادی خانہ آبادی کو دو دن سے زیادہ نہیں گزرے ہیں، باچھیں اس کی کھلی ہوئی ہیں، آنکھوں میں خمار ہے (ہلکا سا سرمہ ابھی تک لگا ہوا ہے) دلہن دور بیٹھی نظریں جھکائے مسکرا رہی ہے اور دولہا کی ماں دل ہی دل میں اپنی منصوبہ بندی میں مشغول ہے۔ شکر قند تو آپ نے یقیناً کھائی ہوگی، بہت زیادہ میٹھی نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ پھیکا پن سا لگتا ہے لیکن جب اس کی شکر بنتی ہے تو بقول بعض حیدرآبادی دوستوں کے "ڈبل کا میٹھا" ہوجاتا ہے یہ ہی احوال نئے نویلے دولہا کا بھی ہوتا ہے کہ شادی کے پہلے ہفتے میں اسے ہر طرف کھیر، گلاب جامنیں اور موتی چور کے لڈو ہی دکھائی دیتے ہیں، جنھیں وہ بالائی میں ڈبو ڈبو کر کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عاشقی کا قید شریعت میں آجانا کیسے کیسے جلوے دکھانے والا ہے۔ دولہا میاں کو یہ اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے اگر انھوں نے تھوڑا بہت اکبرالہ آبادی کو پڑھ رکھا ہے ورنہ وہ اپنی قید حیات میں شریک حیات کو پاکر، خوشی سے مرنے جا رہے ہیں کہ وصال یار پر ان کا اعتبار مستحکم سے مستحکم تر ہوچکا ہے۔

قید حیات اور شریک حیات اگرچہ ہم معنی الفاظ نہیں ہیں لیکن جب سفر میں ہم سفر مل جائے تو سفر کا مزہ دوگنا ہوجاتا ہے ابن بطوطہ نے غالباً ہر سفر میں ایک شادی اس لئے کی تھی کہ سفر کے بعد موصوف کو قیام بھی کرنا پڑتا تھا، آج کل کا زمانہ تو تھا نہیں کہ ہوائی جہاز میں بیٹھے اور کراچی سے اڑے تو ہیتھرو ایرپورٹ (لندن) پر ہم سفر کے ساتھ برآمد ہوگئے۔ ابن بطوطہ صاحب کو تو قیام کے ساتھ طعام کا بھی بندوبست کرنا ہوتا تھا، لہٰذا زوج کا ہونا ضروری تھا اور جب نیا سفر شروع کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو مقامی خاتون کو حق مہر کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے تاکہ ان کی دریا دلی پر کوئی حرف زنی نہ کرسکے۔

ہم نے مضمون کا آغاز نو بیاہتا دولہا سے کیا تھا۔ اپنی شادی کے علاوہ ہم نے اور آپ نے جتنی شادیوں میں شرکت کی ہے۔ ان میں تماشا بین ہی رہے ہیں کہ اصل دولہا تو بارات کا دولہا ہی ہوتا ہے جسے دیکھ کر اپنی اپنی باراتیں یاد آجاتی ہیں جن کا کوئی تعلق جوش صاحب کی یادوں کی بارات سے نہیں جوڑا جاسکتا۔ مگر اس پر یاد آیا کہ جوش صاحب کی بیگم نے اپنے ایک انٹرویو میں جوش صاحب کے متعلق کہا تھا کہ "عظیم ہونے سے ہوتا ہی کیا ہے، دنیا مانے عظیم، ہم نہیں مانتے۔ جب ایک آدمی کا پورا کیرکٹر ہمارے سامنے ہے تو ہم عظیم کیسے مان لیں" دیکھا آپ نے شریک حیات کا سرٹیفکٹ لینا ہر مرد کے لیے ضروری ہوجاتا ہے خواہ وہ جوش جیسا شاعر انقلاب و شاعر شباب ہی کیوں نہ ہو۔

قید حیات میں دولہا بھی ہے اور دلہن بھی ہے شادی کا پہلا ہفتہ، پہلا مہینہ اور پہلی سالگرہ تک خیریت ہی خیریت ہے ... خوشیاں ہی خوشیاں ہیں، لیکن اس کے بعد میاں بیوی ہیں اور اسپتالوں اور ڈاکٹروں کے چکر ہیں ... کہ گھر میں نونہالوں کی یلغار شروع ہوچکی ہے۔ آج منا بیمار ہے تو کل منی بیمار تھی، سابق دولہا، موجودہ شوہر کام سے جب شام کو واپس آتا ہے تو اس کے لیے ڈاکٹر کی خدمت میں حاضری کبھی کبھی تو اتنی لازمی ہوجاتی ہے وہ خود ہومیوپیتھک کی کتابیں پڑھ کر ڈاکٹری شروع کردیتا ہے۔ کئی ہومیوپیتھک

ڈاکٹروں نے اسی راستے سے ترقی کے زینے طے کیے ہیں اور آج ان کی فیس مشورہ دو سو روپوں سے کم نہیں ہے ۔ بہت عرصے تک ہومیوپیتھی پر بے اعتقادی کے بعد ہمیں آخر کار اس کا قائل ہونا ہی پڑگیا ۔ جس کا سہرا ہماری شریک حیات کو زیادہ جاتا ہے کہ ان کے گھٹنوں کے درد کو جو تھوڑا بہت فائدہ ہوتا ہے تو وہ ان چھوٹی چھوٹی میٹھی میٹھی گولیوں سے ہی ہوتا ہے جن میں دوا کا ایک ایک قطرہ ٹپکا کر انھیں اکسیر بہ ہدف بنادیا گیا ہے ۔ شریک حیات اگر چاہے تو شوہر کے ایمان کو پختہ یا متزلزل کرسکتی ہے کہ اس میں یہ دونوں صلاحیتیں قدرت کی جانب سے بدرجہ اتم پیدا کردی گئی ہیں ۔

شادی ، خانہ آبادی کے ہم زیادہ قائل ہیں حالانکہ ہم نے اکثر شادیوں کو ناکام بنتے ہوئے بھی دیکھا ہے ہمارے معاشرے میں کامیاب شادیوں کا اوسط اگر کبھی نکالا گیا تو ہمیں یقین ہے کہ ۸۰ فی صد سے کم نہیں ہوگا کیوں کہ یہی اوسط امریکہ اور یورپ میں ناکام شادیوں کا ہے جن کا ہم نے ذاتی طور پر مشاہدہ کر رکھا ہے ۔ ہوا یوں کہ ہم اپنے ہم سفر یعنی شریک حیات کے ہمراہ امریکہ سے لندن جارہے تھے تو ہماری بیگم کے پاس جو خاتون جہاز میں تشریف فرما تھیں ۔ ان کا نام مسز اسٹون تھا اور وہ اپنی بیٹی کی شادی کے ارادوں سے خاصی ناراض تھیں ، جو ایسے مرد رعنا کی بیوی بننے پر بضد تھی جو ایک بیوی کو پہلے ہی طلاق دے چکا تھا ۔ مسز اسٹون نے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی تینتیس دوستوں کی شادیوں میں شرکت کرچکی ہیں جن میں سے تیس کو طلاق ہوچکی ہے ۔ مسز اسٹون چونکہ کوئی بات چھپا نہیں رہی تھیں اس لیے ان کی باتیں ہمارے کانوں میں بھی پڑتی رہی تھیں اور اس طرح لندن تک کا سفر بڑا خوشگوار گزرا تھا ۔ حالانکہ مسز اسٹون کے حساب و کتاب کو کلیہ نہیں بنایا جاسکتا لیکن ناکام شادیوں کا ایک اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے جو ہمارے یہاں کی کامیاب شادیوں کے برابر ہی ہوگا کہ یہ ہمارے لیے قدرت کا بڑا انعام ہے اللہ تعالی جس مرد سے خوش ہوتے ہیں اسے نیک بی بی عطا کردیتے ہیں اس لیے ہمارے یہاں نیک بیویوں اور نیک پردہنوں کی کمی نہیں ہے کہ ہمارے معاشرے کے مرد بھی بڑے صابر و شاکر بنائے گئے ہیں ۔

پاکستانی جس قدر صابر و شاکر ہے اس کا اندازہ ہر پاکستانی کو بخوبی ہے ۔ ریلوے اسٹیشن ہو ، شناختی کارڈ بنانے کا دفتر ہو ، پاسپورٹ آفس ہو ، یا کوئی بڑا ڈاک خانہ ہو ، کیسے صبر و شکر کے ساتھ دفاتر کے عملوں کے ناز و نخرے اٹھاتے رہتے ہیں بابو چائے پی رہے ہے ، کلرک خاتون ٹیلیفون پر اٹھکھیلیاں کررہی ہیں ۔ قطاریں لمبی سے لمبی ہوتی چلی جائیں گی ۔ مجال ہے کہ کوئی بابو کی چائے نوشی میں داخل اندازی کرے یا خاتون کو ٹوکے کہ بی بی بہت ہوگئی فون پر گفتگو ، اب تھوڑا سا کام بھی نبٹا دو ۔ قوم حسرت و یاس کی تصویر بنی اس انتظار میں رہتی ہے کہ کب کام پورا ہو اور کب گھر کی راہ لی جائے اور صبر و شکر کی انتہا تو ہے کہ جب کوئی نیک بی بی اپنے نیک شوہر سے ترنگ میں آکر کہتی ہے کہ " جنت میں بھی ہم آپ ساتھ ہوں گے " تو شوہر بے چارا پہلے تو حیرت سے بیوی کو دیکھتا ہے اور پھر مری ہوئی آواز میں اسے کہنا پڑتا ہے " بیشک ، بیشک ، آپ کے علاوہ اور کون ہمارے ساتھ ہوسکتا ہے " ۔

اکثر یہ وہ شوہر ہوتے ہیں جنھیں نکاح کے وقت قاضی صاحب کلمے پڑھوا کر پہلے مسلمان کرتے ہیں اور بعد میں خطبہ نکاح پڑھایا جاتا ہے ۔

شادی ، سنت بھی ہے ، عمل صالح بھی ہے اور ایک چینی مفکر کے نزدیک روحانی غذا بھی ہے جس کے اس نے سو نمبر مختص کیے تھے ، اس نے انسانی زندگی کی تقسیم مثبت اور منفی نمبروں میں کی ہے جن کے ذریعے کسی بھی شخص کی سماجی قدروں کا تعین بہ آسانی کیا جاسکتا ہے ۔ وہ مثل کہ شادی کرے تو پچھتائے ، اور نہ کرے تو پچھتائے ۔ ہمارے نزدیک بالکل لغو ہے ۔ جو شادی نہیں کرتے وہ سراسر گھاٹے میں رہتے ہیں کہ انھیں ان کے عزیز و اقارب اپنے مختلف کاموں کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں اور وہ دوسروں کی

خدمت کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں اور ان کی فاتحہ کے موقع پر یہی کہا جاتا ہے کہ "بے چارا بڑا نیک انسان تھا، دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتا تھا" خدمت خلق کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو شادی کر کے کرو۔ بیوی بھی اس میں شریک کار ہوسکتی ہے۔ مثالوں سے ملک خالی نہیں ہے۔

قید حیات میں جب شریک حیات بھی شامل ہوجاتی ہے اور گھر میں جب ننھے ننھے پھول کھلنے لگتے ہیں اور ان کی نگہداشت شروع ہوجاتی ہے تو زندگی کی نہج بھی تبدیل ہونے لگتی ہے اور زندگی کے نشیب و فراز نہ صرف کھل کر سامنے آجاتے ہیں بلکہ میاں بیوی کے درمیان ایسی ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے جسے بہ آسانی آسودگی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بچے جوان ہوتے ہیں۔ ان کی شادیاں ہوتی ہیں پھر پوتا پوتی، نواسا نواسی کے اسکولوں میں داخلے کرائے جاتے ہیں۔ دادا صاحب پوتوں کے بستے اٹھائے اسکول جاتے اور پھر واپس آتے دکھائی دیتے ہیں۔ دادی مشین پر بیٹھی پوتیوں کے کپڑے سیتی رہتی ہیں۔ سارا گھر بھرا بھرا رہتا ہے، جس میں شور و غل کا ہونا لازمی امر ہے۔ نواسی نانی سے کہتی ہے کہ میری امی سے گلاس ٹوٹ گیا ہے، انھیں کچھ مت کہنے گا، اس لئے کہ جب اس سے چائے کی پیالی ٹوٹی تھی تو نانا نے بہت گھور کے نواسی کو دیکھا تھا اور وہ رو پڑی تھی اور جب یہ ہنگامہ پرور زندگی اپنے عروج پر پہنچنے لگتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صاحبزادے نے دبئی کا ویزاء حاصل کرلیا ہے اور پھر کوئی دبئی، کوئی جدہ، کوئی لندن، کوئی نیویارک اور کوئی ٹورنٹو اڑا چلا جارہا ہے اور پھر گھر میں ایک بڑے میاں اور ایک بڑی بی رہ گئے۔ اب خطوط کا انتظار ہورہا ہے۔ ٹیلیفون کے نزدیک بیٹھے ہوئے ہیں۔ خود یہاں سے کال ملا رہے ہیں۔ وہاں سے جواب دینے والی مشین کی گھر گھر سنائی دے رہی ہے کہ مسٹر اور مسز فلاں اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ کوئی سندیسہ چھوڑ دیں۔ سندیسہ بھی چھوڑ دیا پھر بھی فون نہیں آیا۔ ساغر انتظار کھینچے چلے جارہے ہیں۔ ماں کہتی ہیں "اب دونوں کو فرصت کہاں ہے۔ بہو نے بھی تو ملازمت کرلی ہے۔ اب ہفتہ کو فون کرنا..." اور اس طرح ہفتے اور مہینے گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں غنیمت ہے کہ اپنا گھر تو ہے۔ صرف انتظار کی ہی تو زحمت ہے۔ باقی تو سب خیریت ہے۔ کچھ نہ کچھ ڈالر تو آہی رہے ہیں اپنے پاس سے تو کچھ نہیں جارہا ہے۔ ایسے تنہا والدین کے لئے ہی ڈش اینٹینا ایجاد کیا گیا تھا مگر اس پر نوجوان نسل نے قبضہ جمالیا ہے تاکہ بگڑنے میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

ایک وقت وہ بھی آتا ہے یا آسکتا ہے جب میاں بیوی اپنے ہی گھر میں ایک دوسرے کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ گھر سے باہر اس لئے نہیں جاسکتا کہ بیوی کے کولہے کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد صحیح طور پر جوڑی نہیں جاسکی ہے اور اسے ہر قدم پر بیگم کو سہارا دینا پڑتا ہے۔ بیوی اس لئے قید ہوکر رہ گئی ہے کہ شوہر صاحب کا سر قابو میں نہیں رہتا۔ انہیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چکر آنے لگتے ہیں۔ دونوں بڈھے، بڑھیا نہ صرف ناتواں ہیں بلکہ کئی کئی امراض میں گھرے ہوئے ہیں۔ جب تک حیات ہے تو یہ قید حیات بھی بھگتنی پڑے گی۔ نہ بیوی میاں کو چھوڑ سکتی ہے اور نہ ہی میاں صاحب بیوی کو چھوڑ کر کسی عزیز کی شادی میں شریک ہوسکتے ہیں کہ شادی کی تقریبات اب بارہ بجے رات سے پہلے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ اس مشترکہ قید میں برسوں بھی گذر سکتے ہیں۔ اسی لئے برے بڑھاپے سے پناہ مانگنے کی دعا بتائی گئی ہے۔ اگر نہیں مانگی ہے تو اب مانگ لو کہ بڑھاپا آنے میں دیر نہیں لگتی۔

جوانی چلی ہے بڑھاپے کی جانب
بڑھاپا چلا ہے فنا کے سفر پر

قید حیات کے ساتھ ساتھ شریک حیات کے یوں تو ہزار پہلو ہیں مگر جب ایک سے زائد شریک حیات کی ضرورت پڑتی ہے تو اکثر پورا گھر جیل خانے میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پہلی بیوی سے پانچ چھے سال تک اولاد نہیں ہوئی۔ مجبوراً (مختلف

وجوہات کی بناء پر) دوسری شادی کرنی پڑگئی ۔ قدرت کا کرشمہ کہ چھوٹی بیگم کا پاؤں بھاری ہونے سے پہلے بڑی بیگم کا پاؤں بھاری ہوگیا۔ اب جو ریل پیل شروع ہوئی تو پانچ سال میں نو بچوں کے باپ بن گئے ۔ اللہ دے،اور بندہ لے ، اسی کو کہتے ہیں ۔ سوکنیں ، سوتیلے بھائی بہن اور ایک حیران و پریشان باپ ، کہ اوڑھے کیا ، بچھائے کیا ، بچے بڑے ہونے شروع ہوئے تو گھر میں مارپیٹ ، بیویوں کے طعنے ، اپنے آپ پر خفت ، پڑوسیوں کے طنز ، غرض کہ تیروں کی بوچھاڑ ہورہی ہے اور ایک " مرد خود آگاہ " سب کچھ برداشت کررہا ہے ۔ پیسے والا ہے تو جھگڑوں کی نوعیت سنگین ہوتی جارہی ہے ۔ غریب ہے تو کولھو کا بیل بن چکا ہے ۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا ہے ، رات کو دس بجے واپس آتا ہے مگر پھر بھی گھر کا قیدی ہے کہ ذہن پر ہر وقت بیویاں اور بچے سوار ہیں ۔ ان کی فکر سے ایک منٹ کو چھٹکارا نہیں مل پاتا۔ جتنی اولاد مانگی تھی اس سے زیادہ مل چکی ہے ۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے ۔

غم حیات سے آگے ہے زندگی کیسے
پلٹ گئی ہے لپٹ کر خوشی خوشی کیسے

منظور الامین
بنجارہ ہلز، حیدرآباد

مرد اور عورت: آؤ ہم بھی فلمی ہیرو ہیروئن بن جائیں
(دونوں مل کر)
مرد : پارک میں جائیں
عورت : ناچیں گائیں
مرد اور عورت : دھوم مچائیں
مرد : اپنی عمر ہم
عورت : اصلی عمر ہم
مرد اور عورت : جگ سے چھپائیں
مرد : کوے بولیں
عورت : کائیں کائیں!
مرد : اک دوجے میں
عورت : کھو نہ پائیں
مرد : اسکے کارن
عورت : اک دوجے کے پیچھے ہم تم
مرد : باغ بغیچوں میں سبزے پر
عورت : گھٹنوں کے بل بھاگیں
مرد : بندر جیسے ڈال پکڑ کر
عورت : پیڑ کے اوپر لٹکیں
مرد : مینڈک جیسے پھدکیں
عورت : گھوڑے جیسے بدکیں
مرد اور عورت: آؤ ہم بھی فلمی ہیرو ہیروئن بن جائیں!!
(دونوں مل کر)
مرد : ڈم ڈم ڈم ڈم ڈمرو باجے
عورت : دھن دھنا دھن ڈھولک

مرد : چھن چھن چھن گھنگرو باجیں
عورت : ٹن ٹنا ٹن کھولک
مرد : یہ کھولک کیا بلا ہے؟
عورت : کھول سے نکلا کھولک
مرد : جیسے ڈھول سے نکلا ڈھولک؟
عورت : ہاں ہاں جیسے ڈھول سے نکلا ڈھولک
ویسے کھول سے نکلا کھولک!
نام کبھی ہوا مرا پھل جھڑی
مرد : نام مرا امولک
عورت : نام کبھی مس پولی (Polly) میرا
مرد : اور میرا مسٹر پولک (Pollock)
مرد اور عورت: آؤ ہم بھی فلمی ہیرو ہیروئن بن جائیں
(دونوں مل کر)
مرد : دکھ کا کوئی اوسر ہو یا
عورت : سکھ کی کوئی بیلا
مرد : گائے چھیل چھبیلا
"میں نے لاکھوں کے بول سہے ستم گر تیرے لئے"
چاہے دس غنڈوں سے لڑوں میں
جیتوں ایک اکیلا
نام ہے میرا
مسٹر پولک، ہاتھی سنگھ، البیلا
آئے اکیلا جائے اکیلا
چار دنوں کا میلہ بابا چار دنوں کا میلہ
عورت : یہ سن کر میں اتنی روؤں اتنی پیٹوں

مرد : ارے بابا مجھے مت پیلنا
عورت : اتی روؤں برکھا سی برساؤں
گلیسرین کے آنسوؤں کے دریا کئی بہاؤں
مرد : مت رو مت رو میک اپ خراب ہو جاتے گا
عورت : ڈھول بکھیروں مٹی پھانکوں
سبھی سروں میں گاؤں
کیسے جاؤں کیسے جاؤں
جمنا کے تیر
ارے من میں نہیں کوئی پیر
مرد : نہ جانہ جاتو جمنا کے تیر
تم ہم بندھے اک زنجیر
نہ جانہ جاتو جمنا کے تیر
مورے من میں تورا سواگت ہے
آؤ چلیں بیکانیر چلیں
جہاں پریم کی بنسی باجت ہے
آؤ چلو آزاد ہیں ہم تم
اب کوئی ٹکٹ نہیں لاگت ہے
عورت : منوا ہورا یہ خوش خبری
سنکر بس یہی گاوت ہے
اکتارہ لے کر ساجن
آئی ہوں جیسلمیر سے
گجرا لگائے گجرا پہنے
راہ تکوں میں دیر سے
مرد اور عورت : آؤ ہم تم فلمی ہیرو ہیروئن بن جائیں
(دونوں مل کر)

●☆●

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

یہ کیا شہروں کی حالت ہو گئی ہے
عمارت ہی عمارت ہو گئی ہے
دغا دینے کی عادت ہو گئی ہے
یہ دنیا بے مروت ہو گئی ہے
دماغی مرض میں وہ مبتلا ہیں
جو کہتے ہیں محبت ہو گئی ہے
وہاں اپنی زباں کو بند رکھیے
جہاں تعریف بدعت ہو گئی ہے
حسیں چہرے نظر آتے ہیں پل پل
مجھے ٹی وی سے رغبت ہو گئی ہے
دوا کو مرتبانوں میں سجادو
یہ شئے اب بے ضرورت ہو گئی ہے
نشے سے آدمی کیسے بچے گا
طلب بڑھ کر ضرورت ہو گئی ہے
ہم اچھی بات تو کرتے نہیں ہیں
شکایت اپنی عادت ہو گئی ہے
خدارا ان کو دیوانہ نہ کہیئے
جنہیں اپنوں سے وحشت ہو گئی ہے
کوئی محراب و منبر پر ہے قابض
کسی کے گھر کی ملت ہو گئی ہے
بڑے شہروں کی سیر آگے نہ کرنا
بہت منہ پھٹ حجامت ہو گئی ہے

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم
103-6-5، محبوب پورا۔ جگتیال، ۵۰۵۳۲۷

میڈان جاپان

جب سے ملک میں دیش بھکتوں کی حکومت قائم ہوئی ہے تب سے ملک ودیشی ہاتھوں کا کھلونا بن گیا ہے سچ کہا جائے تو دیش میں اب کوئی دیشی شئے سوائے وندے ماترم کے باقی نہیں رہی۔ چھوٹے بچوں کے ہوں کہ بڑوں کے کھلونے جیسے AK۔47 بھی خالص بدیسی مل رہے ہیں اور دیش میں ہاتھوں ہاتھ لئے جارہے ہیں۔ گویا ملک میں بدیسی کلچر کو دیش بھکت نہایت احترام و خلوص کے ساتھ پھیلا رہے ہیں اور وندے ماترم گا رہے ہیں۔ مانا کہ ہمارا دیش ہر سطح پر پچھڑا ہوا ہے تبھی تو کسی زمانے میں صرف دوائیں ہی دوسرے ملکوں سے برآمد کی جاتی تھیں۔ لیکن آج کل بیماریاں بھی ہمیں دوسرے ملکوں سے ادھار مانگنی پڑرہی ہیں۔ اس لئے ایڈز جیسے انمول مرض کو ہمارے شہزادوں نے مغربی ملکوں سے بطور قرض حاصل کیا ہے۔

" بخار " ہندوستان کے لئے کوئی نیا نہیں ہے۔ یہاں رنگ برنگے اور انوکھے بخار وافر مقدار میں موجود ہیں۔ بلکہ مختلف قسم کے بخار، بخارات کی شکل میں محو سفر رہتے ہیں۔ بچوں کو اسکول کے بجائے کھیل کود کا بخار ہوتا ہے۔ نوجوانوں کو پکچر اور کرکٹ کا بخار ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

خواتین اکثر فیشن کے بخار میں مبتلا رہتی ہیں۔ جب مختلف بخار یکجا ہوجاتے ہیں تو انہیں بوڑھوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ سیاسی بخار کی کوئی حد نہیں ہے۔ کسی بھی موقع پر کسی بھی قسم کا بخار کا لانا سیاست دانوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گھٹالوں کے بخار کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ لیکن ہم جس بخار کا تذکرہ کرنے جارہے ہیں وہ خالص بدیسی بخار ہے۔ جس کو عام زبان میں "جاپانی بخار" کہا جاتا ہے چوں کہ جاپانی کافی ذہین ہوتے ہیں اس لئے جاپانی بخار کو دماغی بخار بھی کہا جاتا ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ یہ بخار صرف جاپان کی دوکانوں پر دستیاب ہوتا ہے چوں کہ جاپان کا ایک معیار بنا ہوا ہے اور جاپان میں تیار کی گئی ہر شئے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس لئے لوگوں نے بخار کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرنے کے لئے "جاپانی بخار" کا نام دے دیا۔ بچوں کو جاپانی کھلونے بہت پسند ہوتے ہیں۔ اس لئے جاپانی بخار کا نزلہ اکثر بچوں پر ہی گرتا ہے۔ ہمارا تعلق ہائی ٹیک ریاست سے ہے۔ اس تناظر میں جاپانی بخار کا داخلہ ہماری ریاست کے معیار کا غماز ہے۔

جاپانی قوم نہایت محنتی ہوتی ہے۔ ان کا مقصد حیات صرف یہ ہوتا ہے کہ جاپانی چیزیں ساری دنیا میں پھیل جائیں۔ جاپانی بخار اسی محنت، جدوجہد اور خلوص کا نتیجہ ہے۔ جاپانی بخار کا تعلق جاپان سے ہو یا نہ ہو لیکن اس کا تعلق ایک جانور سے ضرور ہے۔ جس کو خنزیر کہتے ہیں اور جیسے لوگ لاڈ و پیار سے "بدجنور" کہتے ہیں۔ یہ جانوروں کی دریا دلی ہے کہ وہ اپنے امراض انسانوں کو بطور تحفہ عطا کرتے ہیں تاکہ روئے زمین پر حیوانوں اور انسانوں کے درمیان باہمی محبت اور اخوت پروان چڑھے۔ اس کے باوجود یہ امر تحقیق طلب ہے کہ آیا خنزیر کو بھی بخار آتا ہے؟ جاپانی بخار کا تبادلہ مچھروں کی دلالی پر انحصار کرتا ہے یہ دلالی بے ایمانی سے پاک ہوتی ہے بوفورس جیسا کوئی اسکنڈل تادم تحریر منظر عام نہیں آیا ہے جس مچھر کی ایمانداری اور فرض شناسی عالم انسانیت کے لئے باعث عبرت ہے۔

خنزیر ہیرے کی طرح سخت جان ہوتا ہے اس پر کسی لاٹھی یا پتھر کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اس سے ٹکر لینے کی کوئی جرات بھی نہیں کرتا۔ اس لئے لوگ گاڑی چلاتے ہوئے اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ خود ٹھیر جاتے ہیں اور خنزیر کو آگے بڑھنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر اس طرح کا لحاظ نہ رکھا جائے تو وہ یقینا خنزیر سے ٹکرائے گا اور سڑک پر مفت تماشے کا ذریعہ بن جائے گا، چوں کہ یہ جانور امراض خبیثہ کا مجموعہ ہوتا ہے اس لئے کوئی اور مرض اس پر حملہ آور نہیں ہوسکتا۔ یہ جسمانی اعتبار سے اس قدر پتھریلا ہوتا ہے کہ بندوق کی سخت گولی یا مچھر کی نازک سونڈ ہی اس کے جسم میں سوراخ ڈال سکتی ہے۔ یہ کام ہر کس و ناکس سے ممکن نہیں۔

یہ اظہر من الشمس ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے اس کا بین ثبوت خنزیر ہے۔ گزشتہ دنوں جاپانی بخار کا چرچا ہوا تو دیکھتے دیکھتے خنزیر شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اکثر سیاسی سورما اخبار کی زینت بننے کے لئے نت نئے کرتب دکھاتے ہیں۔ تب بھی بہت کم افراد اخبار کے صفحہ اول پر جگہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن خنزیر نے کوئی کرتب نہیں دکھایا نہ ہی جان کی بازی لگائی اور نہ ہی کوئی کارنامہ انجام دیا۔ اس کے باوجود مقامی اور قومی اخباروں کے صفحہ اول پر اپنے لئے جگہ پائی۔ اس کی رنگین تصاویر شائع ہوئیں، کئی مضامین لکھے گئے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر خصوصی فیچرز پیش کئے گئے۔ صبح سے شام تک لوگوں کو خنزیر ہی خنزیر نظر آنے لگے۔ اس کی شہرت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو اس جانور سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ حالاں کہ لفظ خنزیر میں کراہیت اور لفظ سور میں گالی پوشیدہ ہے۔

خنزیر بہت بڑا آجر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہائی ٹیک ریاست میں یہ دو لاکھ افراد کو روزگار مہیا کرتا ہے۔ اگر جاپانی بخار کے نام پر خنزیر کا انکاونٹر کیا جائے تو خدشہ ہے کہ دو لاکھ خاندان بے روزگار ہوجائیں گے اور بھوکوں مرنے لگیں گے۔ بلدیہ جو "کھایا پایا چل دیا" کے نام سے مشہور ہے، کا دست راست خنزیر ہے۔ صفائی ستھرائی کا کام بلدیہ تن تنہا انجام نہیں دے سکتا۔ کیوں کہ خنزیر بلامعاوضہ شہروں کو غلاظت سے پاک و صاف کرتا ہے گویا خنزیروں کی ہلاکت بلدیہ والوں کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ جس طرح انسان اپنی اپنی بیماریاں رکھتے ہیں اسی طرح خنزیر کو بھی اپنے امراض کے تحفظ کا بنیادی حق حاصل ہے اگر مچھر جاپانی بخار کو خنزیر سے انسان میں منتقل کرتا ہے تو اس میں اس بے قصور جانور کا کیا قصور؟۔ اس بخار کی تبلیغ و تشہیر تو مچھر کرتے ہیں۔ اس لئے مچھروں کا انکاونٹر واجب ہے۔ لیکن مچھروں کو مارنا ہواؤں سے لڑنا ہے۔ انسان خلاء میں محل تعمیر کرسکتا ہے۔ ساری کائنات کو تباہ و تاراج کرسکتا ہے مگر مچھر کا خاتمہ بالخیر نہیں کرسکتا۔ ☆

سگ لیلیٰ (تیرہویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی (حال مقیم امریکہ)

کوکا کولا کا بھائی پش کولا

ہمیں شرمندہ اور محجوب دیکھ کر، ڈاکٹر ڈی۔ ڈی کتا والا کی سیکس ٹری کو شاید ہم پر ترس آگیا۔ وہ دوبارہ ڈسک کیلنڈر پر درج ملاقاتیوں کی لمبی چوڑی فہرست کا مطالعہ کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ ہمیں تفصیلات بھی بہم پہنچانے لگی: "مسٹر ملی پانی کے ڈاگی جن کے بعد ڈاکٹر صاحب کا اپوائنٹمنٹ چیف منسٹر صاحب کے کتا لوگ سے ہے۔ جو دو الگ الگ کاسٹ کا کتا لوگ سے تیسرا کاسٹ کا کتا لوگ نکالنے کا "ایکسپریمنٹ" (Experiment) کرتا۔ ہے نا ایک دم فنٹاسٹک ایکسپیرینس (FantasticExperience) !!"۔

ہم نے فوراً لقمہ دیا: "ایکسپیرینس مت کہئے محترمہ، سیکسپیرینس کہئے"۔

نیا سیکسپری منٹ (Sexperiment) سیکسپیرینس (Sexperience)۔!!"

EX کو "SEX" میں بدلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیکس ٹری صاحبہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی کی گونج میں "سیکس" (SEX) کی بازگشت صاف سنائی دی۔ وہ اسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔ "تم آدمی بچے میں بہت "انٹرسٹنگ (Intresting) ری یلی آئی لائک یو (Really I like you) میں تم کو پسند کرتی۔!!"

تھینک یو۔ شکریہ۔ ہم نے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے کہا حالانکہ دل یہی کہہ رہا تھا کہ آپ کی محبت کی میان میں ہمارے لئے گنجائش ہی کہاں ہے، اس میں تو آپ کا میوزیکل کتا پہلے ہی سمایا ہوا ہے، اور بزرگوں کا قول ہے، ایک میان میں دو تلواریں کبھی نہیں رہتیں، اس پر اگر میان "زنانہ" ہو تو یہ اور بھی ناممکن ہے'۔

سیکس ٹری صاحبہ نے اچانک چٹکی بجا کر کہا ... "تمہارا چانس لگنے کا ایک چانس ہے، اگر اس ٹائم پی ایم کا ارجنٹ فون، سی ایم کو آجائے تو۔!!؟"

ہم نے حیرت سے کہا: "پی۔ ایم کا فون سی۔ ایم کو... مگر یہ پی ایم کون ہے اور سی ایم کون؟ کہیں یہ پی ایم پھیکو مل اور سی ایم چھجو مل تو نہیں؟"۔

جواب میں محترمہ نے غیر یقینی نظروں سے سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیتے ہوئے کہا: "کیسا آدمی ہے تم! کبھی الفریڈ ہچکاک کا مافک بہت ہشیاری کا بات کرتا تو کبھی پونگا پنڈت کا مافک ایک دم فولش (Foolish) بات کرنے کو لگتا ... "ایک ہی جملے میں ہمارا تجزیہ کرنے کے بعد آگے بولیں: "پی ایم کا مطلب پرائم منسٹر اور سی ایم شارٹ فارم ہے چیف منسٹر کا۔ ابھی بات صفا صفا تمہارا بھیجے کے اندر گھس گیا ہوئیں گا"۔

"بالکل گھس گئی بات، بلکہ نقش ہوگئی، آپ آگے فرمائیے"۔ ہم نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا

"ابھی آگے کا بات یہ ہے اگر دلی سے پی ایم کی فون کال آجائے تو سی ایم ادھر بزی (Busy) ہوجائیں گا۔ اور میں اس کا اپوائنٹمنٹ کینسل کر کے تمہارا اپوائنٹمنٹ فکس (FIX) کر دے گی!!"۔

محترمہ نے ایسے لہجے میں یہ بات کہی جس میں امید کم اور بھروسہ زیادہ تھا اور بھروسے کے معاملے میں بزرگوں کا قول ہے کہ

بھروسے کی گلئے ہمیشہ بگڑا جنتی ہے۔ چنانچہ ہم نے اندیشہ ظاہر کیا ” خدا کرے آپ کا خیال سچ ثابت ہو، لیکن اگر خدا نخواستہ سی ایم کو پی ایم کی فون کال نہیں آئی تو۔؟“

پھٹاک سے بولیں ... ” تو پھر ڈاکٹر سے آج تمارا اپوائنٹمنٹ بہت مشکل ... ہاں ایک چانس اور ہے اگر شہر میں ابھی کدھر لفڑا دنگا مارا ماری ہوگئی تو سی ایم کے آج کے سارے اپوائنٹمنٹ آٹومیٹک کینسل ... !!“

سیکس ٹری صاحبہ کے اس خطرناک شوشے پر ہم نے بڑبڑا کر کہا: ” خدا کے لئے محترمہ ایسی منحوس بات زبان سے مت نکالئے۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ ڈاکٹر صاحب سے دو پانچ منٹ کی مختصر سی ملاقات کی خاطر مجھے شہر میں فساد کروا کے بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہانی پڑیں ....!“

فساد کا جو ہلکا سا نقشہ، لفظوں کے ذریعہ ہم نے کھینچا، اس نے یقیناً محترمہ کے رونگٹے کھڑے کردئے تھے۔ گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولیں: ” خدا کے واسطے ایسا ڈینجرس بات تم اپنا بھیجے کے اندر لانے کا بھی نئیں، تمہارا واسطے میں ہی کوئی چکر چلاتی “ اتنا کہہ کر محترمہ کچھ سوچنے لگیں۔ پھر اچانک بچوں کی طرح خوش ہو کر بولیں: ” آگیا ایک فنٹاسٹک آئیڈیا آگیا “۔ اور پھر اس طرح تالیاں بجانے لگیں جیسے کوئی آئیڈیا ذہن میں نہیں آیا بلکہ کوئی کھوئی ہوئی گیند، اچانک مل گئی ہو، محترمہ کی آنکھوں کی چمک بھی کئی گنا بڑھ گئی پرجوش لہجے میں بولیں ” سی ایم کا پی اے ابھی آتا ہوئیں گا، بس پانچ منٹ تک اسکو الوبنا کے ادھر روک لے گی ویسے بھی وہ گھونٹ، میرے اوپر بہت، ڈاؤن (Down) ہے۔ جبھی آتا میرے اوپر برو ر لائیٹ مارتا ہے سالا۔ ابھی تم فٹافٹ اپنا نام بولو “۔

ہم نے نام بتایا اس نے ڈسک کیلنڈر پر نوٹ کرلیا اور آگے بولی: ” ابھی تم فٹافٹ جاؤ ڈاکٹر کے پاس “

ہم نے ایک بار پھر سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا: ” میں آپ کا بے حد ممنون و شکر گزار ہوں محترمہ آپ کا یہ احسان، ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ سیکس ٹری نے ہمیں ٹوک دیا۔ بس بس بس ابھی جاستی مسکہ نئیں مارنے کا۔ میں آدمی لوگ کو اچھی طرح پہچانتی، کون سالا روڈ سائیڈ رومیو ہے کون دل کا بھلا مانس ہے، تم نے ادھر میرے ساتھ میں رومیو کا مافک چھیڑ چھاڑ نئیں کیا، اس واسطے میں تم کو پسند کرتی، ابھی جاؤ جلدی نئیں تو وہ گھونٹ سالا آجائیں گا، ہمارا اکھا پلان فیل ہوجائیں گا “۔

حکم کی تعمیل میں ہم نے دیر بالکل نہیں لگائی اور کسی رنگروٹ کی طرح وہاں سے کوئیک مارچ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے مخصوص کمرے کا رخ کیا، سیکس ٹری صاحبہ ہمارے پلٹتے ہی انٹرکوم کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب کو ہمارے ارجنٹ اپوائنٹمنٹ کی اطلاع دینے میں مصروف ہوگئی تھیں۔ محترمہ کی سیکسائٹنگ (Sexciting) آواز کافی دور تک ہمارا پیچھا کرتی رہی !!

ڈاکٹر ڈی۔ ڈی کتا والا کا مخصوص کمرہ ڈھونڈنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی، سیڑھیاں عبور کرتے ہی پہلی منزل پر بالکل سامنے ہی دروازہ تھا جس کے اوپر برقی بورڈ لگا تھا جس کا ڈاکٹر از ان (Doctor is in) والا حصہ روشن تھا، دروازہ خود کار تھا، ہاتھ لگاتے ہی اندر کی طرف کھل گیا۔ اندر ایک طرف مریضوں کے ساتھ آنے ہوئے سرپرستوں و مالکوں کے لئے آرام دہ نشستیں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ایک مکمل ساونڈ پروف، قسم کا کیبن تھا جس میں ڈاکٹر موصوف اپنے خونخوار مریضوں کا طبی معائنہ فرماتے ہوں گے۔ ہماری آہٹ پاتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنے خاص کیبن سے باہر نکل آئے پھر ہم سے نظریں چار ہوتے ہی بے تکلف لہجے میں بولے: ” سیکسیلنٹ (Sexcellent) ابھی ابھی تمہارے ہی بارے میں، سیکس ٹری سے بات ہوئی اس نے تمہیں بے حد پسند کیا، بڑی تعریف کررہی تھی تمہاری !

موصوف کی اس اطلاع پر ہم سوائے شرمانے کے اور کیا کرسکتے تھے۔ انھوں نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے

مزید کہا "اس نے آوٹ آف دی دے (out of the way) جاکر تمہیں پانچ منٹ کا وقت دیا ہے۔ اس لئے شارٹ کٹ میں کیفیت بولو۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتاؤ "یورین (Urine) ساتھ لائے ہو؟"

"یورین Urine" ہم صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے اس عجیب و غریب مانگ پر بڑبڑا کر کھڑے ہوگئے۔

"جی ہاں یورین ... " ڈاکٹر صاحب نے ٹھوس لہجے میں کہا ... "وہ کیا کہتے ہیں اسے حکمت کی زبان میں قارورہ"

"قارورہ ... یعنی کہ کیا مطلب"۔ ہماری حیرت کا پارہ کچھ اور اوپر چڑھ گیا۔

"کیا مطلب کے کیا معنی؟۔ مطلب صاف ہے قارورہ یعنی کہ یورین ... پیشاب"۔ موصوف نے مدلل لہجے میں وضاحت کی پھر آگے بولے "اسی قارورے یعنی کہ یورین عرف پیشاب کو اردو کے بلکہ دکنی اردو کے مشہور شاعر سلیمان خطیب مرحوم نے "پش کولا" کا نیا نام دیا ہے اور اس عنوان کے تحت ایک نظم بھی موزوں کی ہے جس کے ابتدائی بول ہیں :

ایک ہوتا ہے بھائی منو بولا
کوکا کولا کا بھائی پش کولا

ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس قسم کی گفتگو کا یہ کون سا محل یا موقع ہے اسی لئے شاید ہمارا منہ طرح طرح کی شکلیں بنا رہا تھا۔ نتیجتاً ڈاکٹر صاحب نے جملہ معترضہ کے طور پر فرمایا:

"پش کولے کا نام سن کر تم اس طرح منہ کیوں بنانے لگے بھائی۔ اگر بیس سال قبل جنتا حکومت میں پھوٹ نہ پڑتی اور آنجہانی مرار جی دیسائی کو اچانک کرسی وزارت عظمیٰ سے اترنا نہ پڑتا تو جانتے ہو پش کولا یقیناً قومی مشروب کا درجہ حاصل کرچکا ہوتا۔ پھر تمہارا اس طرح منہ بنانا قابل تعزیر جرم قرار پاتا!"۔

ہم نے جواباً چوٹ کی: "ہوسکتا ہے اسی پش کولے کی وجہ سے ان سرکار کو خس کم جہاں پاک والا انجام وقت سے پہلے ہی دیکھنا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی نشست سنبھالی اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے : "خیر تم اگر اپنا پش کولا نہیں لائے تو کوئی بات نہیں مریض کا قارورہ تو لائے ہونا؟"

"ڈاکٹر صاحب یہ آپ پش کولے کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔" ہم نے حیرت سے پوچھا

مدلل لہجے میں بولے : "پش کولا چاہے مریض کا ہو یا مریض کے مالک کا دونوں کا کھایا پیا۔ لیا دیا۔ کیا کرایا سب کا کچا چٹھا کھول دیتا ہے۔

ہمیں موصوف کے دعوے پر اعتبار نہیں آرہا تھا لہذا غیر یقینی لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی دلیل ہضم نہیں ہورہی ڈاکٹر صاحب۔ مریض کے مالک کے پش کولے کی جانچ پڑتال اصل مریض کے مرض تک پہنچنے میں کس طرح آپ کی مدد کرتی ہے۔ چلئے مان لیا مریض کے مرد مالکوں کی حد تک آپ کا یہ دعویٰ ٹھیک ہو۔ لیکن جہاں تک مریض کی مالکنوں یعنی کہ زنانیوں کا تعلق ہے۔ ان کا پش کولا کبھی کوئی سنگین مسئلہ نہیں کھڑا کردیتا؟"

"مثلاً کیسا مسئلہ"۔ ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مثلاً یہی کہ پاؤں بھاری ہے مالکن کا۔ اور آپ نے مانع حمل گولیاں تجویز کردیں بے چاری کتیا کیلئے"

ہمارے اس اندیشہ ہائے دور دراز پر موصوف پہلے تو ہمیں یک ٹک گھورتے رہے۔ پھر بولے۔

پچھلے بیس برس کے دوران میں میرے ہاتھوں کئی کتیاؤں کی امیدیں بر آچکی ہیں۔ اس مرحلے میں کبھی وہ غلطی نہیں ہوئی جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے۔"

"تعجب ہے !!!" ہم نے حیرت کا اظہار کیا۔

بولے : "اس میں نہ کوئی تعجب کی بات ہے نہ کسی کمال کا دخل، بلکہ اصلیت یہ ہے جناب عالی جب دن چڑھے ہوں تو مریض کی مالکنیں اصلی مریضہ ہی کا پیش کو لاتی ہیں!"

اتنا کہہ کر موصوف نے اچانک ایک ایسا قہقہہ لگایا جو صد فی صد کتا چھاپ تھا، جسے سن کر ہمارے رونگٹوں میں دبی برقی لہر دوڑ گئی جو کسی کتے کی خونخوار ۔ بھوں کار ۔ سن کر ہمیں سر پر پاؤں رکھ کر جائے وقوع سے چمپت ہونے کا سگنل دیا کرتی ہے ۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے موصوف کے حلق میں کوئی جبری کتا بیٹھا مسلسل بھونکے جارہا ہو ۔ کتے کے بھونکنے سے اس قدر مشابہ قہقہہ ہم نے زندگی میں پہلی بار سنا تھا بخدا اگر ڈاکٹر صاحب پردے کے پیچھے سے اپنا یہ خوفناک قہقہہ بلند فرمائیں تو لوگ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ آپس میں شرطیں باندھ لیں کہ پس پردہ کوئی اصل نسل کا ولایتی کتا بیٹھا بھونک رہا ہے !! ۔ (جاری) ۔ ☆

غزل

محمود شریف محمود
حیدرآباد

پہنے ہوئے لباس تو ہیں دو ہزار کا
ہر زاویہ عیاں ہے بدن کی بہار کا

محمود باپ کو بھی باپ کبھی بولتا نہیں
افسر جو بن گیا ہے یہ بیٹا گنوار کا

آبادی میرے یار کے گھر کی بڑھے گی اور
بیوی جو روز کھاتی ہے لیمو اچار کا

نظروں کے تیر ہوتے ہیں اکثر دلوں کے پار
ابرو کرے ہے کام دلوں پر کٹار کا

محمودؔ میرے ہاتھ میں بنتِ عنب نہیں
ہے کانچ کے گلاس میں بیٹا انار کا

یوسف امتیاز ٹورنٹو (کینیڈا)

اوپر، نیچے، بیچ میں

1999ء رخصت ہوا۔ وہ ہنگامے، خوف، شبہات جو وائی ٹو کے Y2K کے ساتھ تھے ختم ہوگئے۔ ہر چیز منصوبوں اور پلان کے مطابق ہوگئی۔ اب جب 2000 کے استقبال کے بعد جائزہ لیا گیا تو بہت سے مایوس تھے کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں جس کو یاد رکھا جائے۔ ہر سال کی طرح وہی ہوا۔ پرانا سال ختم ہوا اور نیا شروع ہوگیا۔ یہ ہر حال لوٹ کر بدھو گھر کو آئے۔

اس بیسویں صدی نے تیزی کے ساتھ وہ حیرت ناک سائنسی تجربات کئے کہ ہاتھوں کے طوطے اڑگئے۔ اگر ہاتھ میں طوطے ہوں تو۔ فیکس، ای میل، سیل فون، مائیکرو ویو، آٹو میشن Auto Massion، سی ڈی، ڈی وی ڈی، کس کس کا نام لیا جائے، بس یوں سمجھ لو کہ نانی اور دادی ریڈیو کے ساتھ ابھی تک پرورش پا رہی تھیں کہ ٹی وی اور ویڈیو آگئے۔ ابھی ان سے سنبھالا نہیں ملا تھا کہ نئی نسل سی ڈی 3D ٹی وی کی بات کرنے لگی۔ فیکٹریوں اور عام جگہوں پر آئندہ انسانوں کے بجائے روبوٹ سے کام لئے گا جو بڑے بوڑھوں کی خدمت میں چوبیس گھنٹے حاضر رہے گا۔ اس طرح بچوں کو اب منہ چڑا کر بڑے بوڑھوں کی خدمت کرنے اور ثواب حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ گھر کے کام کاج سے روزانہ حیران اور پریشان مائیں بچھونے میں لیٹے لیٹے روبوٹ کو احکام صادر کرتی رہیں گی۔ تھکن اور بے تحاشہ کام کی شکایت بے معنی ہوکر رہ جائے گی۔ غلط کام کرنے پر آنکھیں دکھانے، کوسنے اور خواہ مخواہ جی ہلکان کرنے کے سارے امکانات ختم ہوجائیں گے اور پھر اب تو بچے کے کان بھی نہیں پکڑ سکتے۔

یہ نہ تو کوئی خواب و خیال کی بات ہے اور نہ الف لیلی کی کہانیاں یا جیمس بانڈ 007 کے تسلکہ انگیز معرکے۔ سچ پوچھو تو یہ کوئی نہ فکشن ہے اور نہ کوئی ناول، ہر روز آسمانوں میں مختلف سیارے چھوڑے جارہے ہیں۔ خلاؤں میں سفر کرنے کیلئے ایسٹرو ناٹس تیار ہوکر راکٹ کے نمونے کے ایک شٹل میں زمین سے پرے سفر کرتے اور پھر واپس آجاتے ہیں۔ روسی خلائی اسٹیشن "میر" اب اپنی عمر کو پہنچ رہا ہے ورنہ کئی سالوں سے روسی اس اسٹیشن میں ایسے مقیم ہیں جیسے انکا اپنا کوئی گھر ہو۔ چاند پر تو کمندیں ڈالی جاچکی ہیں۔ مارس پر پہنچنے کے لئے تیزی سے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ بہت جلد ہی اور بھی سیاروں پر انسانی بوجھل قدم اپنے نشانات چھوڑ دیں گے۔ لوگ اب زمین پر سیر و تفریح کے بجائے خلاؤں میں چھٹیاں منائیں گے۔ ہنی مون ہوگا۔ شادیاں انجام پائیں گی۔ مانجا، سانچق، منڈی کے سب ہی ہنگامے ہونگے۔ بریانی، تکہ کباب، مسالہ دوسا، بار بکیو چکن --- اور کیا چاہئے۔

وہ جو میری ان باتوں کو ایک مذاق، ایک طلسم، خیالی پلاؤ سمجھ کر رد کر رہے ہیں اکیسویں صدی میں یہ سب کچھ دیکھیں گے۔ سارے خواب ایک ایک کرکے سچے ہوجائیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیجئے اور یہ سمجھ لیجئے کہ آپ ایک گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ ایک راکٹ گارے کے ایک چبوترے پر اپنی دم پر بیٹھا ہے۔ آپ اپنے دست بند باندھ لیں اور جلد ہی آپ چاند کی طرف اڑنے والے ہیں۔ آپ کا پہلا اسٹاپ ایک فائیو اسٹار گھومنے والی ہوٹل ہے جو زمین کے اطراف صفر گرائیوٹی Zero Gravity پر گھوم رہی ہے۔ اس دوران وہ راکٹ جس میں آپ آئے تھے واپس ہونے والے مسافروں کو زمین پر لوٹانے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ آپ کچھ دن سستانے اور خلائی پاؤں سیدھے کرنے کے لئے اپنا وقت اس ہوٹل میں گذارتے ہیں۔ اودی، بھوری، سفید زمین کا چکا چوند

کردینے والا نظارہ کرسکتے ہیں جو آپ کی نگاہوں کے نیچے گھوم رہی ہے ۔ ہوٹل کے کمروں میں آرام کرنے کے بعد آپ چاند کے سفر کے لئے تیار ہیں ۔ وہی چندا ماما جو بہت دور رہتے تھے ۔اب خود اپنے ہاتھوں سے لڈو کھلائیں گے ۔ پھر ہمیشہ کی طرح خود تو تھالی میں کھائیں گے اور آپ کو پیالی ملے گی ۔ پیالی ٹوٹنے پر اگر وہ ناراض ہوجائیں تو آپ خود بہ نفس نفیس انکو منا سکتے ہیں ۔ پھر آپ کی ملاقات اس بڑھیا سے بھی ہوگی جو برس ہا برس سے چرخہ کات رہی ہے ۔ آپ کو چاند کی سیاحی مبارک ۔ کون جانے ٹورسٹ کا یہ سفر 2001 سے شروع ہوجائے ۔ سنجیدگی کے ساتھ ایک کمپنی سو کمروں کے ایک ہوٹل کی نقشہ بندی کررہی ہے اور 2017 تک خلاؤں میں گھوم رہی ہوگی ۔ یقین کریں نہ کریں ہلٹن ہوٹل نے کہا ہے کہ وہ ان امکانات پر غور کررہی ہے اور کیا ہی اچھا ہو کہ ہلٹن خلاؤں میں پہلی ہوٹل ہوجائے ۔ ایک قیاس ہیکہ 2021 میں تو انسان ۔ اس پر چہل قدمی کریں گے بلکہ ہوسکتا ہے اس سے پہلے اگر ایسا ہوا تو برطانیہ کے پرنس ہنری مارس جائیں گے اور ہلٹن ہوٹل میں قیام کریں گے ۔ نہ جانے اور کتنی ہوٹلیں خلاؤں میں قائم ہوجائیں ۔

انکو کسی کو بلندیوں اور خلاؤں سے خوف ہے اور اس مہم کے حصہ دار ہونے سے منکر ہیں تو بعض کمپنیاں ان کیلئے جو زمین چھوڑ کر فضاؤں میں جانا نہیں چاہتے پانی اور سمندر کے نیچے دنیا آباد کرنے میں مصروف ہیں اور تفریح کا مکمل سامان فراہم کرنے میں کوشاں ہیں ۔ یہ بھی اکیسویں صدی کی سوغات ہے کہ وسیع پیمانے پر ہوٹل کی تیاریاں شروع ہوچکی ہیں ۔ فلوریڈا کے کی لارگو Key Largo میں پانی کے نیچے جولس لاج قائم ہے ۔ تنہا ہوٹل کے مالک ایان کوبلک Ian Koblick کا بیان ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ پناما میں 1200 ہیکٹر پر ایک تھیم پارک کی تیاری میں مصروف ہیں جو پناما کنال کے مغربی حصے میں بنایا جائے گا ۔ جس میں پانی کے نیچے ایک ہوٹل بھی شامل ہے ۔ پناما کی اس خلیج کے مغربی حصے میں لہریں اٹھارہ فیٹ یا چھ میٹر سے اونچی نہیں اٹھتیں ۔ فی الوقت اس پروجیکٹ کا نام aqua 2000 ہے ۔ یہ ہوٹل کوئی سو کمروں پر مشتمل ہوگی اور زمین دوز سرنگ سے ملی ہوگی ۔ اس پانی کے نیچے تعمیر ہونے والی ہوٹل میں ایک رسٹورانٹ ، کاسینو اور منور نجن کیلئے ایک خصوصی جگہ ہوگی ۔ سمندر کے نیچے زندگی کی وہ ساری سہولتیں حاصل ہونگی جو زمین کے اوپر یا دنیا کے کسی اور حصے میں مل جاتی ہیں ۔ بیسویں صدی تو گذر گئی ۔ اکیسویں صدی نے ابھی سے اپنے رنگ دکھلانے شروع کردیئے ہیں ۔ ٹرافک کی مشکلات سے نجات کیلئے اڑنے والی کاریں ، ٹی وی ٹیلی فون ، کاریں لگے ٹی وی ، سمندر کے نیچے اور خلاؤں میں رومانس ، عبادت گاہیں اور پھر شادیاں ، ہمارے ملا ابھی تک چاند کے نظر آنے یا نہ آنے پر متفق نہیں ہیں ۔ اگر انکو خلاؤں میں چھوڑ دیا جائے تو نہ جانے وہ کیا گل کھلائیں گے ۔ انکے آستینوں میں نہ جانے اور کتنے متنازعہ دلیلیں چھپی ہیں جو ایک عام آدمی کو خلاؤں میں معلق چھوڑ دیں گی ۔ پانی کے نیچے وہ چاند کیسے دیکھیں گے ۔ کیا آپ جانتے ہیں ؟ ۔ ☆

شوہر

پروفیسر عبدالواسع ، پروفیسر فاروق صدیقی ، مناظر عاشق ہرگانوی اور دیگر لوگ بیٹھے خوش گپی کررہے تھے ۔
پروفیسر عبدالواسع ایک واقعہ سنانے لگے ۔ وہ رانچی گئے تھے ۔ وہاں کا تجربہ بیان کرنے لگے : " رانچی میں مشاعرہ تھا ۔ اناؤنسر کوئی شاعرہ تھیں ۔ اس مشاعرہ میں شوہر گیاوی کو بھی پڑھنا تھا ۔ جب ان کا نمبر آیا تو اناؤنسر نے انہیں نام سے پکارا ۔ شوہر اسٹیج پر آکر بولے : " اناؤنسر صاحبہ نے مجھے نام سے پکارا ہے جب کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ میں شوہر کہلاتا ہوں " ۔
سامعین میں سے کسی نے کہا : " آپ کی والدہ محترمہ آپ کو کیا کہتی ہیں ؟ " ۔

اسد اللہ حسینی چکر
(کیلفورنیا۔ شمالی امریکہ)

غزل

"انکم" اپنی کم ہے اور خرچے بہت
ہم نے پیدا کرلئے بچے بہت

اس پہ یہ طرفہ تماشا دیکھئے
ساتھ رہتے ہیں مرے چمچے بہت!

دین و مذہب کا لبادہ اوڑھ کر
پھر رہے ہیں ملک میں لچے بہت

رعب سچ کا جم گیا جب ایک بار
جھوٹ کہتے ہی گئے سچے بہت

روز وہ "لیٹ" آرہی ہے "جاب" سے
آرہے ہیں دل میں اندیشے بہت

"پی پی" کا وہ لیتی ہے حساب
اس لئے کرتا ہوں میں دھندے بہت

اب نہیں پر کچھ زمانہ پیشتر
ہم چلاتے ہی رہے چرخے بہت

دھن کے پکے ہیں خسر صاحب مرے
ہیں مگر وہ کان کے کچے بہت

ویسے چکر تو بڑا شاعر نہیں
لیکن اس کے ہوگئے چرچے بہت

●☆●

قطعہ

ہمارے شہر میں یارو اک ایسا بھی تو شاعر ہے
خود اپنے شعر کا مطلب سمجھنے سے وہ قاصر ہے
جو "اورنائٹ" ہی اک صاحبِ دیوان بن جائے
تو اسکی شاعری کا دوستو اللہ ہی ناصر ہے

رؤف رحیم

غزل

صدا یہ دیتا رہا ہوں ہر اک کے در پر میں
خدا کے نام پہ گھر دیجئے ہوں بے گھر میں

نکل گیا تو نہیں آؤں گا پلٹ کر میں
تمہارے عشق کی گوپن کا ہوں وہ پتھر میں

میں آستینوں سے احباب کے چراتا ہوں
کبھی بھی رکھتا نہیں ہوں چھپا کے خنجر میں

ہے خالی بھیجہ مرے سر میں اور وِگ سر پر
اٹھائے پھرتا ہوں اک بوجھ اپنے سر پر میں

یہی تو راز ہے اے دوست برتری کا مری
کہ اپنے آپ کو کہتا نہیں ہوں کمتر میں

نہیں ہے تازہ غزل کیا سناؤں گا سب کو
اسی غزل کو سناتا ہوں یار اکثر میں

دگرنہ سب سے مجھے جھک کے ملنا پڑتا تھا
خدا کا شکر ہے کہ ہوں نہیں قد آور میں

مدد کو آئے گا وہ بے وقوف جو ہوگا
"پکارتا رہا گرتے مکاں کے اندر میں"

نہیں ہے موسم سرما کا کچھ اثر مجھ پر
کہ ڈر سے کانپتا رہتا ہوں ان کے تھر تھر میں

زباں سنبھالنا، قابو میں ہاتھ کو رکھنا
فقط ہوں آپ کا نوکر نہیں ہوں شوہر میں

ہر ایک اس کی طرف گھانس لے کر بڑھنے لگا
عدو کو دیکھتے ہی کہہ اٹھا جو خر خر میں

نچائیے نہ اشاروں پہ اس طرح مجھ کو
حضور آپ مداری ہیں اور نہ بندر میں

بخار عشق کا چڑھ جائے میں جدھر جاؤں
ملیریائے محبت کا ہوں وہ مچھر میں

سفوف اس نے لگایا ہے کالج کوری کا
سمجھ رہا تھا مگر اس کو ایک پاوڈر میں

نہ سرپرست نہ بانی نہ منتظم کوئی
خود اپنی زعم میں ہوں انجمن کا ہٹلر میں

ہم اپنے آپ کو آدم کی کہہ گئے اولاد
پکارتا ہی رہا ڈاروِن ہوں بندر میں

سجا ہوا سا ہے یوں عاشقی کا دسترخواں
سلاد عشق کی مولی ہیں وہ چقندر میں

اب اس کا نام ہی یوم سیاہ رکھنا ہے
رحیم کہتا نہیں اس کو ۹ دسمبر میں

●☆●

جعفر رضا
(ریاض)

فکر کو گریہ بالیں سے ہٹانا ہے مجھے
بانٹنا سب کو ظرافت کا خزانہ ہے مجھے
ہاتھ اس کام میں اکبر کا بٹانا ہے مجھے
جاننا ویسے تو یہ سارا زمانہ ہے مجھے
تیرے بندوں کو جو یہ خندہ بلب کرتا ہے
تجھ سے اس کام میں امداد طلب کرتا ہے

حوصلہ دے مجھے جعفر زٹلی کا یارب
ہو ظریف ایسی ہی میری بھی زمانے میں طلب
میز پر میری بھریں پیٹ ظریفان ادب
شوربا ہو میرے اشعار میں گو ڈھب ڈھبا ڈھب
تیز اس درجہ مگر مرچ مصالحہ ہووے
شعر سن کر جو نہ ہنس دے مرا سالا ہووے

کان اس صنف میں یا رب مری زرخیز رہے
مثلِ شمشیرِ دودم میری زباں تیز رہے
وہ ظرافت ہو کہ کوئی نہ غم انگیز رہے
روتی صورت کو بھی ہنسنے سے نہ پرہیز رہے
مسکراتے ہیں جو وہ مار کے ٹھٹھا ہنس دیں
کہہ کے انسانوں کو حیوان کا پٹھا ہنس دیں

ٹال دے T.J.Clinton کی مصیبت یارب
اسکو پکون دے لنگوٹ کی صورت یارب
دیاگرا کی پڑے اس کو بھی ضرورت یارب
مس لیونسکی کی ہو اس درجہ حجامت یارب
پاولاجونز سے ملنے لگے صورت اس کی
ٹوٹے کم بخت جوانی پہ قیامت اس کی

شعر کہنے کا میرے واسطے حیلہ ہوجائے
سانولا ہو میرا معشوق کہ پیلا ہوجائے
شکل بندر کی مگر نام جمیلہ ہوجائے
اے خدا گر یہ گلا: میرا سریلا ہوجائے
آئے منقر کی طرح مجھ کو بھی یارب گانا
بھردوں میں ظرفِ سماعت میں لبالب گانا

مجھ کو معلوم ہے فردوس میں ملنے کی نہیں حور
تھا جو مذہب سے پرے اور شریعت سے بھی دور
میری بخشش تو کرائیں گے حمایت عاشور
ہوں خطا وار ترا ساری سزائیں منظور
مجھ کو سو بار جہنم میں جلانا یارب
لیکن ہرگز نہ لیونسکی سے ملانا یارب

بابو آر کے
آزاد الیکٹریکلس
اچل پور شہر ۴۴۴۸۰۶

اونٹ قربانی کا

چونکہ عیدِ قرباں قریب تھی اس لئے شہر میں ہر طرف قربانی کے چرچے تھے اور قربانی کے جانوروں کے تذکرے تھے۔ اس دوران اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہم نے بھی قربانی دینے کے لئے جانوروں کے ناموں پر غور و خوص کیا... اس موقع پر بکرے نے سب سے پہلے لبیک کہا۔ مہنگائی اور بکروں کی چڑھی قیمتوں نے ناممکن کہا۔ پھر ممکنات کی تلاش کے مشن نے بیل کا نام سجھایا۔ اس مبارک نام پر ہم اتفاق کرنے ہی والے تھے کہ اس میں سات شیر ہولڈرس کی قباحت ہمیں نظر آئی کیوں کہ ہم نے سن رکھا تھا کہ روز محشر، قربانی کا جانور قربانی دینے والے کو اپنی پیٹھ پر سوار کر کے پل صراط سے بخیر و عافیت گذار دے گا۔ اس روایت کے پس منظر میں ہم نے سوچا کہ ایک سواری سات سوار اور اس پہ سفر پل صراط.... یعنی ایک سواری، سات سواروں کو لئے عین پل صراط پہ ہانپنے کانپنے لگ جائے اور گرا پڑا دے تو اللہ کی پناہ! دوزخ کے ناگ اور جہنم کی آگ سے سامنا ہوگا۔ بس یہ سب سوچ کر خوف پل صراط نے قربانی کے لئے بیل جیسی کمزور سواری کو مسترد کیا اور اونٹ جیسی شہ زور سواری کو منتخب کیا۔ اونٹ کا نام سنتے ہی قربانی دینے والے بقیہ چھ شیر ہولڈرس نے یہ کہکر حیل و حجت کی... کہ اونٹ کی سواری، سواروں کی نشست کے معاملہ میں اطمینان بخش نہیں ہوتی ہے۔ ان کی منطق تھی کہ جب اونٹ کی پیٹھ پر ایک سوار کی گنجائش بڑی مشکل سے نکل سکتی ہو تو پھر سفر پل صراط کے دوران سات سوار اس کی کوہان پہ کہاں اور کیسے بیٹھ پائیں گے؟

بہر حال یہ طے پایا کہ اونٹ ایک لحیم و شحیم طاقتور و توانا جانور ہوتا ہے اس لئے پلک جھپکتے ہی پل صراط کو لمبے لمبے ڈگ بھر کر پار کروا ہی دیگا... تو صاحب، شہ زوری کی بناء پر قربانی کے لئے اونٹ کے نام پر سب نے اتفاق کر لیا گویا قربانی کے لئے جانور کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی گیا۔ پھر جناب گھوم پھر کر ایک راجستھانی شخص سے اونٹ کا سودا طے پایا۔ اونٹ کو ہمارے حوالے کرتے وقت وہ شخص سرگوشی میں بولا۔ دیکھئے اونٹ کی قربانی کا معاملہ ہے اس لئے اس کی تشہیر کم اور احتیاط زیادہ کرنا.... خیر اس شخص کی سنی ان سنی کر کے ہم اونٹ کی نکیل تھامے خوشی خوشی جنگل سے شہر کی طرف لوٹے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی ایک دھوم مچ گئی۔ سڑک پہ بچے جوان بوڑھے، جوق در جوق اونٹ کی جانب لپکے۔ تھوڑی دیر بعد اونٹ کو ساتھ لئے ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ ہم اپنے گھر پہنچے۔ اب ہمارے سامنے مسئلہ اونٹ کو اپنے گھر کے اندر لانے کا تھا۔ کیوں کہ اگر ہم اسے گھر کے باہر ہی باندھ دیتے تو بچوں کی شرارتیں اس کی بچی کچی ایک آدھ سیدھی کل کو ٹیڑھی کر کے رکھ دیتیں۔ بہر کیف اس موقع پر اونٹ کے گھر کے اندر قدم رنجہ فرمانے کے متعلق بحث مباحثے اور صلاح مشورے ہونے لگے۔ بہت جلد یہ معاملہ عدالتی ہو کر اہل محلہ کا مسئلہ اور والیانِ شہر کا قضیہ بن گیا۔ کسی نے دروازہ گرا دینے کی تجویز سجھائی تو کسی نے دیوار شہید کرنے کا مشورہ دیا۔ ایک صاحب تو مجمع کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور خالص افلاطونی انداز میں بولے: "میں تو کہتا ہوں دروازہ گراؤ نہ دیوار ہلاؤ.... بس اونٹ کو دوڑاتے ہوئے لاؤ اور دیوار پر سے چھلانگ لگواؤ۔"

یہ باتیں سن سن کر ہمارے اوسان خطا ہوئے اور ہم سوچنے لگے کہ قربانی کے لئے اونٹ کو منتخب کر کے واقعی ہم نے مصیبت مول لی ہے ۔ ان حالات میں ہم بار بار اس کی بے ترتیب کلوں کو دیکھتے جاتے اور اس کے قد و قامت پہ کڑھتے جاتے ۔ بہر حال مزید تماشہ بننے کے خوف سے ہم نے دروازہ گرا کر دیواریں ہلاکر اسے اپنے گھر کے اندر کر ہی لیا ۔ صحرا کے اس جہاز نے ہمارے گھر کے آنگن کو واقعی بھر دیا ۔ تھوڑے توقف کے بعد ہم نے اپنے در و دیوار کی ہلتی ہوئی چولوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے قربانی کے جملہ حصہ ہولڈرس سے کہا : " اب آپ لوگ بھی ایک ایک دن اس مبارک ہستی کو اپنے گھر میں رکھ کر میزبانی کا شرف حاصل کریں ، یہ سنتے ہی انہوں نے فوراً کہا ... نہیں بھائی نہیں ... ہمیں صرف اونٹ کی قربانی دینی ہے اپنے در و دیوار کی نہیں ۔ اس لئے ہمیں بخشئے اور یہ شرف آپ ہی حاصل کرتے رہئے ۔ الغرض اونٹ کی میزبانی کا شرف حاصل کئے ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ دوسرے دن ایک نئی مصیبت آپڑی ۔ ہمارے دوست خاں صاحب ہانپتے کانپتے ہمارے گھر آئے اور پھٹی پھٹی آنکھیں گھما کر اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ بولے ، غضب ہوگیا پولیس سارے گھروں میں جھانکتی پھر رہی ہے اونٹ چوری کا ہے اب ہم ساتوں بھی گئے کام سے ۔ یہ کہتے ہوئے وہ اونٹ کی جانب آئے اور اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے بولے ، ارے اس کم بخت کو کم از کم نیچے بٹھاؤ تو سہی ... اور پھر وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگے یعنی واقعی وہ اسے بٹھانے کی کوشش کرنے لگے ۔ اونٹ کو بٹھانے کی کوشش میں وہ وظیفے کے ورد کے ساتھ ساتھ اسے چانٹیں بھی مارنے لگے لیکن وہ تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا اور کھڑے کھڑے دیوار کے اوپر سے گلی والوں کو منہ اور گردن دکھانے لگا ۔ جب اونٹ کو نیچے بٹھانے میں ہر طرف سے ناکامی ہاتھ آئی تب وہ بولے ، اچھا اب ایک اور ترکیب آزما کر دیکھتے ہیں ۔

ہم نے کہا جلدی بتاؤ ، ترکیب کیا ہے ؟ بولے ، اس نامراد کو کہیں چھپاتے ہیں ۔ ہم نے چڑ کر کہا ، خاں صاحب آپ نے تو حد کردی ۔ یعنی آپ زمین کو لپیٹنے اور آسمان کو گرانے کی بات کہتے تو ہم مان جاتے لیکن آپ تو بات کر رہے ہیں اونٹ کو چھپانے کی ، ارے یہ اونٹ ہے اونٹ ، کوئی ماچس کی ڈبیہ تھوڑی ہے کہ لیے اور چھپا دیئے ۔

یہ سنکر وہ بولے تو یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ " مسٹر اونٹ کا بڑ " ہمیں جیل بھجوا کر ہی رہیں گے ۔ پھر کچھ دیر بعد قدرے سمجھانے کے انداز میں وہ بولے " میں کہتا ہوں جیل سے بچنے کی آخری کوشش کر کے دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے ؟

دیکھو میری تجویز پہ عمل کرو آنا کانی کرو مت ، میں جو کہتا ہوں وہ کرو ... جلدی سے گھر میں موجود تمام کپڑے لتے آنگن میں جمع کردو ۔ پھر یہ ہوا کہ پلک جھپکتے ہی آنگن میں کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا ۔ اب خاں صاحب نے کھڑے ہوتے اونٹ کے منہ اور دم کی جانب دو دو لمبے بانس آنگن میں گاڑھ دیئے پھر ان بانسوں سے دو متوازی رسیاں تان دیں .... پھر کپڑوں کے ڈھیر میں سے وہ ایک ایک کپڑا اٹھاتے جاتے رسیوں پہ ڈالتے جاتے اور اس طرح اونٹ کو ڈھانپتے جاتے ۔ تھوڑی دیر میں یہ ہوا کہ تمام کپڑے تو ختم ہوگئے لیکن اونٹ پھر بھی بچا کا بچا رہا ۔ بہر حال بچے ہوئے اونٹ کی پردہ پوشی کے لئے انہوں نے کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے بھی نوچ ڈالے تب کہیں جاکر اونٹ کی نقاب پوشی ہو پائی ۔ اس کام کی انجام دہی کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی ۔ خصوصاً اس کارنامے کے بعد خاں صاحب ، تو پولیس کی آمد کے انتظار میں خوشی خوشی چہل قدمی بھی کرنے لگے تھے ۔ بعد ازاں لوگوں کے ہجوم کے ساتھ پولیس انسپکٹر ، واقعی ہمارے آنگن میں چلا آیا اور آتے ہی ڈنڈا لہراتے ہوئے کرخت لہجہ میں بولا ۔ لاؤ نکالو حوالے کرو ، چوری کا اونٹ ۔ یہ سنکر ہم تو خاموش رہے لیکن خاں صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے بول ہی پڑے ... انسپکٹر صاحب ، آپ تو اونٹ کو لانے نکالنے اور حوالے کرنے کا یوں کہہ رہے ہیں جیسے اونٹ ، اونٹ نہ ہوا کوئی کپڑا کوڑہ ہوا ۔ دیکھئے واقعی اگر اونٹ ہمارے پاس ہوتا تو ہم آپ کے حکم کی

تمیل میں اس سے لاتے بھی نکالتے بھی اور آپ کے حوالے کرتے بھی .... لیکن جب سرے سے اونٹ ہمارے پاس ہے ہی نہیں تو پھر لاتے سارے کام ہم کریں تو کیسے ؟

اس دوران انسپکٹر واپس جانے کے لئے پلٹا ہی تھا کہ .... کپڑوں میں ہلچل ہوئی کپڑوں میں ہلچل کو دیکھتے ہوئے انسپکٹر نے دریافت کیا .... یہ کیا ہے ؟ جی کپڑے ہیں .... لاتے سارے کپڑے آنگن میں کر کیا رہے ہیں ؟ .... جی سوکھ رہے ہیں، عید کی تیاری ہے .... تو کیا تمہارے گھر میں بقر عید کے موقعہ پر بجائے قربانی کے کپڑے ہی سوکھتے ہیں ؟

ابھی انسپکٹر مزید کچھ کہنے ہی والا تھا .... کہ اس مرتبہ کپڑوں میں زبردست ہلچل کے ساتھ ساتھ دہاڑ بھی سنائی دی۔ ملارے خوف کے انسپکٹر اچھل کر دور بھاگا .... یعنی ابھی ابھی کپڑے سوکھ رہے تھے اور اب کپڑے چلا بھی رہے ہیں۔ یہ کہکر وہ کپڑوں کو سمیٹنے لگا اور پھر کچھ ہی دیر میں اس نے کپڑوں میں سے صحیح سالم اونٹ کو نکال لیا .... اور اس طرح سفر پل صراط کو ہنستے کھیلتے پار کر جانے کی چاہ میں قربانی کے اونٹ نے ہمیں جلوس کے ساتھ حوالات پہنچادیا۔ ☆
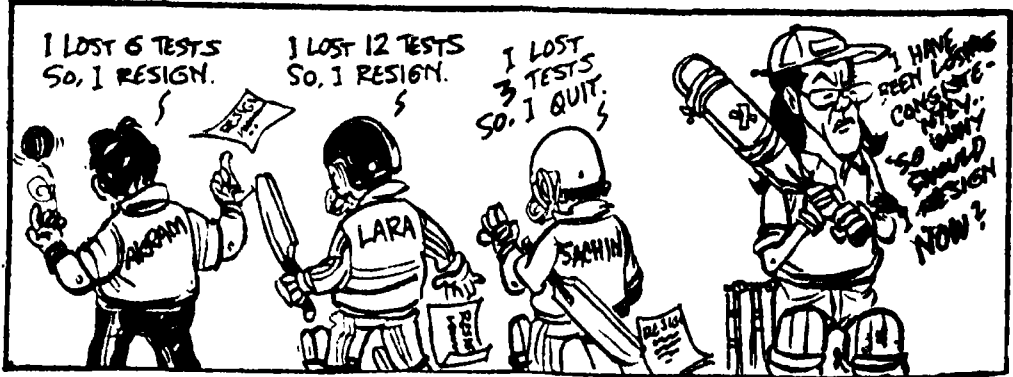
شاہد عدیلی
مغل پورہ، حیدر آباد

غزل

ہے گدھے کے سامنے بیٹھا ہوا
اونٹ کا قد پھر بھی ہے نکلا ہوا

کوئی نہلا تو کوئی دہلا ہوا
میں ہی اک ایسا تھا جو اکا ہوا

شاعروں کا غول ہے گھیرا ہوا
یعنی میں اندھوں میں اک کانا ہوا

ہے ملاوٹ کی غذاؤں کا اثر
دیکھئے جس کو بھی ہے پچکا ہوا

لائے جو تارے فلک سے توڑکر
آج تک ایسا کوئی پیدا ہوا ؟

سچ تو یہ ہے سچ ہمیشہ سچ رہا
جھوٹ کا منھ ہر جگہ کالا ہوا

وہ فقیروں کو خدا کے نام پر
دے رہا ہے رات کا اترا ہوا

یا تو پہنا ہی نہ تھا اس نے لباس
یا مری آنکھوں کو کچھ دھوکا ہوا

دشمنوں نے کام کب اچھے کئے
مر گئے تو مر گئے اچھا ہوا

بھوک اور افلاس میں کرتا بھی کیا
مرگیا فنکار اک اچھا ہوا

ایسی ویسی بات کرتا ہی نہیں
" مستند ہے میرا فرمایا ہوا "

سود کھا کھا کر ہوا شاہدؔ یہ حال
حد سے بڑھ کر پیٹ ہے نکلا ہوا

☆●☆

سردار سلیم، حیدر آباد

شاید کہ اس سے دور ہو کھجلی زبان کی
رکھ دو غزل کی نبض پہ انگلی زبان کی

میں سوچ ہی رہا تھا کہ جلتی ہے کیسے روح
چنگاری مجھ پہ دفعتاً اچھلی زبان کی

لفظوں کی روشنی میں گھلی ہیں سیاہیاں
کالک زدہ ہے آئنہ ، اجلی زبان کی

کیا موٹی موٹی گالیاں رکھتی ہے جیب میں
اور دیکھئے تو ساخت ہے دبلی زبان کی

اپنی سخنوری پہ اسے فخر جب ہوا
میں نے انانیت وہیں کچلی زبان کی

باتیں کبھی ادھر کی ادھر مت کیا کرو
ورنہ بہت رلائے گی چغلی زبان کی

چولہے سے ضد کے علم کی ہانڈی اتار لے
کم بخت دیکھ ! دال پھر ابلی زبان کی

●☆●

نہیں ہے اس میں کہیں بھی جمود مولانا
ہے زندگی بھی مہاجن کا سود مولانا

کسی غریب کا چولہا بجھا رہے تو رہے
جلائے جائیے حجرے میں عود مولانا

ہیں آپ تابع تقدیر ، اور اپنا مزاج
ورائے مسئلہ ہست و بود مولانا

خدا کے نام پہ جو اپنا پیٹ بھرتے ہیں
زمیں پہ بوجھ ہے ان کا وجود مولانا

کچھ اعتدال رکھیں، نفس کا خیال رکھیں
کہ بڑھ رہے ہیں گلے کے غدود مولانا

اگر خلوص ہی شامل نہیں ہے نیت میں
تو ہیں فضول رکوع و سجود مولانا

ہر ایک امر میں ڈھونڈیں رضائے حق کا جواز
بری ہے حسرت نام و نمود مولانا

☆●☆

(ہندی ادب سے)
ہری شنکر شرما
ترجمہ۔ قاسم ندیم، ممبئی۔ ۴۳

لیڈر لیلا

لیڈر ایک خاص قسم کا جاندار ہوتا ہے، جو ہر ملک اور ملت میں پایا جاتا ہے۔ اسے قوم کے سر پر سوار ہونا اور جلسے جلوسوں میں دوڑنا بہت پسند ہے۔ اس کی شکل و صورت حضرت انسان سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ وہ گرمیوں میں اکثر پہاڑوں پر سیر و تفریح کرتا ہے مگر سردیوں میں نیچے اتر آتا ہے۔ دیکھنے میں لیڈر سیدھا سادہ سا دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ ویسا نہیں ہوتا۔ کھانے کی چیزوں میں اسے سیب، سنترہ، انگور، کیلے، انار وغیرہ قیمتی پھل زیادہ پسند ہوتے ہیں۔ دودھ تو اس کی خاص غذا ہے۔ موقعہ پڑنے پر فلے کی پوری، کچوری بھی گلے میں اتار لیتا ہے۔ مگر خوشی خوشی نہیں۔

کہنے کو تو لیڈر جاندار ہے مگر اس میں خودداری کا جذبہ خوب جوش مارتا رہتا ہے۔ وہ اپنے خیال کے خلاف نہ کچھ سن سکتا ہے اور نہ پوزیشن کو کم ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ جس طرح سرکار کو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے "پیس اینڈ آرڈر" کا خیال رہتا ہے اسی طرح لیڈر اپنی تقریر اور تعریف اخباروں میں شائع کرنے کے لئے فکر مند نظر آتا ہے۔ وہ دوسروں کو اپنے پیچھے گھسیٹتا ہے۔ مگر خود کسی کے پیچھے چلنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ جس وقت اس عجیب جاندار کے جگر میں قوم کا درد اٹھتا ہے اس وقت وہ اتنا بے تاب ہوجاتا ہے کہ تار گھر کی اور دوڑتا ہے اور کبھی ڈاک خانے کی جانب۔ زیادہ درد ہونے کی حالت میں اس کی بے چینی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مجمع میں کھڑے ہوکر بے تحاشہ چیختا چنگھاڑتا ہے۔ ٹیبل پر ہاتھ مارتا ہے اور زمین پر پاؤں۔ آنکھیں سرخ کرلیتا ہے اور دانت پیسنے لگتا ہے۔ منہ بناتا اور ہاتھ گھماتا ہے۔ ادھر جھکتا ہے اور ادھر جھومتا ہے۔ اس کی ایسی ہولناک حالت دیکھ کر لوگ اس کے پاس پانی یا دودھ کا پیالہ رکھ دیتے ہیں۔ جسے وہ چسکی لے لے کر پیتا ہے مگر چیخنا چلانا بند نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی اس جاندار کی پریشانی، خونخواری میں تبدیلی ہوجاتی ہے تو اس کے لئے اسے معیاد مقررہ تک لال پھاٹک کے بڑے باڑے میں بند رہنا پڑتا ہے۔ جہاں نہ اسے حسب خواہش دانہ چارہ ملتا ہے اور نہ مزیدار میدان ہی نصیب ہوتا ہے۔ اس دنیا میں آکر پہلے تو لیڈر گرجتا، غراتا ہے مگر کچھ دنوں بعد اس کی حالت پالتو بکری کی طرح ہوجاتی ہے۔

یہ عجیب جاندار اپنے پاؤں پر چلنا بہت کم پسند کرتا ہے۔ ریل کے نرم گدے اور موٹروں کے ملائم تکئے دیکھ کر اس کی طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے۔ ہوائی جہاز کی ہوا کھانے اور اسی میں ادھر ادھر جانے کیلئے یہ بہت بے چین رہتا ہے۔ گھٹیا سواریوں پر سوار ہونا اسے اچھا نہیں لگتا بلکہ وہ ویسا کرنا کسر شان سمجھتا ہے۔

لیڈر میں ایک بڑی خصوصیت ہے۔ اپنے بلاوے کی محکمہ ڈاک کی طرف سے اطلاع پاکر اس کی صحت خراب ہوجاتی ہے اور عدیم الفرصتی سامنے آجاتی ہے۔ مگر جوں ہی ارجنٹ ٹیلیگرام پہنچا، توں ہی وہ تندرست ہوا اور اس نے اپنی روانگی کا تار ارسال کردیا۔ دنیا ادھر سے ادھر ہوجائے مگر وہ تار برابر پہنچ جاتا ہے۔ اگر روانگی کا تار پاکر بھی بہت سے لوگ، پھول مالائے کر، استقبال کیلئے ہوائی اڈے

یا ریلوے اسٹیشن پر نہیں پہنچتے تو لیڈر بری طرح بڑبڑاتا ہے، بدک جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو الٹے پیروں سے لوٹ بھی جاتا ہے۔

یہ جاندار سڑی گلی حویلیوں میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسے فرسٹ کلاس کوٹھی بنا چین نہیں ملتا اور نہ نیند آتی ہے۔ وہ باتیں کرنے کے معاملے میں بڑا کنجوس ہوتا ہے۔ چھوٹے لوگوں کو تو پاس میں پھٹکنے بھی نہیں دیتا۔ ہاں کچھ بڑے آدمیوں سے گھڑی سامنے رکھ کر تھوڑی دیر گفتگو کرنے میں زیادہ حرج نہیں سمجھتا۔

الیکشن: جس وقت اسے ۱۴۴ نمبر کی لال جھنڈی دکھائی جاتی ہے، اس وقت تو اس کی وہی حالت ہوجاتی ہے جو بال چھڑ سونگھنے والی بلی کی ہوتی ہے۔ کبھی وہ جھنڈی کو پکڑنے کے لئے دوڑتا ہے کبھی پیچھے کھسک جاتا ہے اور کبھی اچھلتا ہے، کبھی کودتا ہے اور کبھی دور سے غرا کر رہ جاتا ہے۔

جس طرح بھیڑیا، بھیڑ کو پچکارتا ہے، اسی طرح لیڈر عوام کے پیسے پر پیار کرتا ہے۔ حساب فہمی کا سوال اس کی انسلٹ اور زندگی، موت کا مسئلہ ہے۔ باہری دنیا میں لیڈر لوگوں کو جیسا پرجوش دکھائی دیتا ہے، ویسا وہ اپنی گپھا میں نہیں ہوتا کیونکہ اس کی زندگی دوہری ہوتی ہے۔ اندرونی الگ، بیرونی الگ۔ جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ اکثر دھوکہ کھاجاتے ہیں اور تکلیف اٹھاتے ہیں۔

اس جاندار کے ملنے جلنے کے بھی کئی طریقے ہیں۔ کسی سے وہ کھلکھلا کر ہاتھ ملاتا ہے، کسی کے ساتھ آدھی ہنسی ہنستا ہے۔ کسی کے آگے افسردہ ہوجاتا ہے اور کسی کے روبرو منہ پھلا کر لمبی بھوئیں چڑھا کر اپنی سوچ کا اظہار کرتا ہے۔ جس کی قسمت میں جیسا لکھا ہو ویسا ہی اس کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ عام لوگوں کی شکلوں کو جان بوجھ کر بھول جانا اور ان کے کسی خط، چھٹی کا جواب نہ دینا لیڈرانہ صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہے۔ لیڈر کی پوشاک عجیب ہوتی ہے۔ حالات کو دیکھ کر اسے رنگ بدلنا خوب آتا ہے۔ کبھی بہترین لباس زیب تن کرتا ہے تو کبھی کھادی کی جھول لاد کر ہی خوش ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی پیلے، کالے یا سفید تار کے فریم میں شیشے کے دو گول گول ٹکڑے لگا کر آنکھوں پر رکھ لیتا ہے۔

ایک دو نہیں لیڈر سینکڑوں اسلحوں سے لیس ہوتا ہے۔ کوئی سیاسی میدان میں اچھل کود مچاتا ہے۔ کسی نے مذہبی ہم آہنگی کو توڑ کر فرقہ واریت کا ہتھیار اپنالیا ہے۔ کوئی سماج سیوا کی سڑک پر قلانچے بھرنے میں مست ہے اور کوئی برادری کی بوسیدہ بلڈنگ پر بیٹھ کر "ہیاؤں ہیاؤں" کرتا رہتا ہے۔ ان سب کے ہزاروں بھید ہیں۔ سب کی وضاحت کرنے کے لئے بڑی پوتھی چاہئے۔ اگر موقع ملا اور مجلس جمی تو ان تمام اسلحوں کی تفصیل سے جانکاری دوں گا جو لیڈر موقع دیکھ کر استعمال کرتا ہے۔ اس کے لئے سب لوگ ہوائی قلعے کے لمبے چوڑے میدان میں رات کے ٹھیک پونے تین بجے تشریف لائیں۔ لیڈروں کو ہرگز ساتھ نہ لائیں۔ ان کے لئے ممانعت ہے!۔ ☆

اصل اور کم اصل

آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں شمیم فاروقی، تاج پیامی اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے ایک دوسرے سے لطیفے سن رہے تھے۔

تاج پیامی نے کہا: "میرے دادا اور کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بھانڈ آگیا"۔

لوگوں نے پوچھا: "کون ہو؟"۔

"میں بھانڈ ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔

"یہاں سب بھانڈ ہیں، جاؤ"۔ دادا نے اسے بھگانا چاہا۔

"لیکن حضور اصل اور کم اصل میں فرق ہے"۔ بھانڈ کا جواب تھا۔

ڈاکٹر سید حسین احمد زاہدی
۱/۴۰، مان نگر روڈ، کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۰۱

ضلع جگت

ضلع جگت صنعت مراعات النظر اور تناسب الفاظ کا نام ہے ۔ یہ رعایت لفظی کی ایک قسم ہے ۔ اس میں تک سے تک ملا کر اس طرح بات کی جاتی ہے کہ سامع اور قائل ایک دوسرے کے تعلق سے مناسب اور موزوں الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ اس میں ایک دوسرے پر حملہ اور جوابی حملہ کیا جاتا ہے ۔ ضلع جگت میں ضلع کے معنی مباحثہ اور جگت سے مراد تک سے تک ملانا ہے ۔ جب دو شخص تک سے تک ملا کر بحث کریں تو اسے ضلع جگت کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ اس صنف میں ظرافت کی تخلیق موزوں الفاظ کے ٹکراؤ سے ہوتی ہے ۔ گرچہ یہ مزاح کا گھٹیا طریقہ ہے ، اس لئے اس صنف کو بازاری لوگوں کی صنف قرار دیا گیا ہے لیکن کبھی کبھی خواص بھی اس انداز میں گفتگو کرکے لطف لیتے ہیں ۔ عموماً ضلع جگت میں ظرافت کے بجائے پھکڑ پن زیادہ پایا جاتا ہے ۔ بے مطلب مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے باتوں میں ایک قسم کا عامیانہ پن آجاتا ہے ۔

نیاز فتح پوری رقم طراز ہیں :

> "ہمارے خیال میں ظرافت اس میں کچھ بھی نہیں بلکہ سامع کو جو ایک لطف اور انبساطی کیفیت اس کے سننے کے بعد محسوس ہوتی ہے ۔ وہ صرف طرفین کی حاضر جوابی کے نتیجہ پر مبنی ہوتی ہے ۔"

ضلع جگت میں متناسب الفاظ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے ۔ متناسب الفاظ کے علاوہ رعایت لفظی کے پھول بھی کھلائے جاتے ہیں گرچہ اس طریقے پر رعایت لفظی کا معیار بھی مجروح ہوتا ہے اور کبھی کبھی ذہن پر ناگواریت کے اثرات بھی ثبت ہوتے ہیں ۔

ضلع جگت میں کوشش اس بات کی کی جاتی ہے کہ سامع کو جواب ان لفظوں میں دیا جائے جس سے اس کا تعلق ہو ۔ خصوصاً کسی پیشے سے منسلک شخص کو جواب اس طرح دینا کہ اس کا پیشہ کیا ہے ، سب کو معلوم ہو جائے ۔ مثلاً جب دھوبی کا ذکر آئے تو اس میں استری، گھاٹ، بھٹی وغیرہ کے الفاظ شامل کر دیئے جائیں جیسے تیری استری ردئے گی ۔ گھاٹ سے بات کرو وغیرہ ۔ حجام سے گفتگو ہو تو کہا کہ آپ ہوش کے ناخن لیں ۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے ۔ اسی طرح کسی جولاہے کو اس طرح مخاطب کیا جائے ۔ یہ تانا بانا کسی جولاہے کے سامنے کیجئے ۔ لٹھا سا جواب ملے گا اور ہاتھ مل مل کر رہ جایئے گا ۔"

داڑھی مونچھوں کا سب صفایا ہے
فارغ البالی ان کو کہتے ہیں

یہاں داڑھی مونچھوں کا صفایا اور فارغ البالی کا لفظ سن کر کون نہ سر ہلائے گا ۔

چند چیزوں کا ضلع جگت ملاحظہ ہو :

حقے کا ضلع : میاں تم کندن کئے دیتے ہو بندے کا مکان منال دروازے میں ہے ۔ یہ آدمی ہے یا الٹا توا تمباکو کا پنڈا ۔ بندہ تازہ دم ہے ۔ آپ تو میری باتوں سے سوخت ہوئے جاتے ہیں ۔ واللہ آپ کا سر تو چھلا چھلایا ناریل ہے ۔ چل سٹک ۔

پان کا ضلع: واللہ کیا خوب بنگلہ ہے۔ دساور سے مال آیا ہے۔ بہت چبا چبا کر باتیں نہ کیجئے۔ آج تو میں سرفرو ہا۔ آپ سبز بخت ہیں۔ برگ سبز است تحفہ درویش۔ میرے چونے کا پان خوب چمکتا ہے۔ میں تیرا یار کتھا۔

گانے بجانے کا ضلع: آج طبیعت ناساز ہے۔ کیا بے وقت کی راگنی چھڑی ہے۔ آپ کے گلے میں توڑا ڈال دوں۔ جنگل کی دھن ہے۔ آپ تو بالکل بے سر تال بجے جارہے ہیں۔ اچھا راگ لائے۔ بھئی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔ چلو خوشی کے شادیانے بجاؤ۔ کہیں لونڈے تالیاں نہ بجائیں۔ وہ ناچ نچاؤں گا کہ عمر بھر یاد کرو۔ بے بھاؤ کی پڑنے لگے گی۔ اپنا تو کلیان ہوگیا۔ میرے باپ کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ بس بس تانت باجی اور راگ بوجھا۔ زیادہ بغلیں نہ بجاؤ۔

کھانے کا ضلع: فراغت تو آپ کے خمیر میں ہے۔ تم تو ماش کا آٹا ہوئے جاتے ہو۔ آپ کی دال نہ گلنے کی۔ آپ ناحق اپنے ڈھائی چاول گلاتے ہیں۔ آپ کے منہ میں گھی شکر۔ اچھی کھچڑی پک رہی ہے۔ کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ آج تو پانچوں انگلی گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے۔ اس میں پوری نہ پڑے گی۔ اب منہ کشی کرو۔ پاؤں تو تمہاری بوٹیاں چبا جاؤں۔

ضلع جگت میں رکاکت اور بازاری پن کے علاوہ حیا سوزی اور فواحش بھی شامل کردیئے جاتے ہیں۔ اس کا خاص مقصد اپنے حریف کو اچھی طرح شرمسار کرنا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مزاح کو پڑھے لکھے پسند نہیں کرتے لیکن کم ظرف بے حد خوش ہوتے ہیں۔ اکثر بازاری افراد معنی خیز اور ذو معنی لفظوں کے ذریعہ تک سے تک ملا کر مکالمہ بولتے اور حریف کو شرمندہ کرتے ہیں۔ شطرنج کی طرح اس میں بھی چالیں چلی جاتی ہیں۔

●☆●

ایک شخص نے ایک طوائف سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ جواب دیا کہ مصری۔ اس نے کہا کہ تمہارا نام بالکل غلط رکھا گیا ہے تم تو شیرہ ہو شیرہ۔ طوائف نے جواب دیا کہ اگر آپ اسی میں خوش ہیں تو ہم شیرہ ہی سہی۔

●☆●

کسی نے ایک قاضی کو کہا: "قاز کی مادہ کا قازی نام ہے۔"

●☆●

آرزو بندی کی ہے خالق سے اک دن میری سوت
کھائے پھل تلوار کا اور پھول سونگھے ڈھال کا

(جان صاحب)

اردو شاعری میں بھی ضلع جگت کا استعمال ہوا ہے۔ شعر میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن میں معنوی ربط نہیں ہوتا لیکن تلفظ یا املا کی وجہ سے معنوی ربط کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اس میں ایسے الفاظ کا نام کے لحاظ سے ملانا جس سے پھوہڑ پن پیدا نہ ہو کلام کا بہت بڑا حسن ہے۔ اردو کے بہت سے شعراء کے یہاں ضلع جگت کا استعمال ہوا ہے۔ جدید زمانے میں اس صنف کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے بھلا دیا گیا ہے۔ ایسے شعر جن میں ضلع جگت کا استعمال ہوا ہے بے شمار ہیں۔ یہاں چند شعر مثال کے طور پر پیش ہیں۔

بس کہ روکا میں نے سینے میں اور ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیہ چاک گریباں ہوگئیں

(غالب) — (سینے اور بخیے)

وہ دھوبی کا کم ملتا ہے میل دل ادھر ہے بہت
کوئی کہے اس سے ملنے میں اس کو کیا ہم دھولیں ہیں
(میرؔ) ــــــ (دھوبی، میل، دھولیں)

ڈھانپا کفن نے داغ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا
(غالبؔ)
(برہنگی اور ننگ یعنی ننگے)

پانی کنوئیں میں چھپ گیا سائے کی چاہ سے (انیسؔ)
(کنواں اور چاہ)

شامی کباب ہو کے پسند تھنا ہوئے (میرؔ)
(شامی اور پسندے یہ دونوں کباب کی قسمیں ہیں)

پانی ایسا میٹھا کہ اس کی چاہ میں باولی بھی دیوانی ہو
(چاہ، باولی، دیوانی)

جی میں لہر آوے ہے لیکن رکھتا ہوں من مار اپنا (میرؔ)
(لہر، من، مار)

●☆●

ہندوستانی جمہوریہ

واقعات سے بھرپور 50 برسوں پر محیط داستان

ہمارا عزم

انصاف

آزادی

مساوات

اخوت

نئی الفی میں ایک نئی بصیرت کے ساتھ پر اعتماد ہندوستان کا داخلہ

davp 99/590

دے کے خط (مراسلے)

مکرمی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب
السلام علیکم

اس ماہ کا (فبروری ۲۰۰۰ء) شگوفہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔ اس میں ایک مکتوب کرنل محمد خان مرحوم کی عمر کے بارے میں استفہامیہ محترم محمد اسماعیل صاحب کا نظر سے گزرا۔ جیسا کہ آپ کو اس بات کا بخوبی علم ہے، میں کسی واقعہ یا تاریخ کے متعلق جب کچھ لکھتا ہوں تو ہر طرح چھان پھٹک ہی نوک قلم پر لاتا ہوں اور وہ بات بلا ثبوت و حوالے کے نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر لکھنے سے پہلے خود آپ سے بھی "نثر، قانونی مشورہ یا فتویٰ" کے عنوان سے مشورہ کرلیتا ہوں اور کبھی کبھی آپ ٹیلی فون کھڑکا کر کسی اور مفتی سے مسئلہ زیر دریافت پر فتویٰ حاصل کر کے مجھے عنایت کیا کرتے ہیں۔ تب ہی مجھے ٹھنڈک پڑتی ہے اور خامے کو "چل میرے خامے بسم اللہ" کا حکم دیتا ہوں۔ بغیر تصدیق، حوالے اور دلیل کے کچھ کہنے، یا لکھنے سے میرا مزاج رابا کرتا ہے۔

کرنل صاحب کی رحلت کے المیہ پر ان حالات میں جن کا ذکر میرے قلبی واردات میں مذکور ہے میں نے عمر نوے (۹۰) سال لکھی ہے جو میرے ذاتی علم پر مبنی ہے۔ کئی برس ہوئے ایک خط میں اپنی علالت کا ذکر کرتے ہوئے عمر کے بارے میں کرنل صاحب نے یوں اشارہ دیا تھا، "آپ کا یکم جنوری کا گرامی نامہ ۱۹ جنوری کو راولپنڈی پہنچا۔ بد قسمتی سے ان دنوں میں ایک علالت کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھا۔ آپ کا خط وہیں ملا۔ پڑھا اور موجب ناز ہوا۔ لیکن ہسپتال میں خط لکھنے کا موڈ تھا نہ اس کے لئے اوزار لہٰذا چپ رہا۔

ہسپتال سے لوٹے آج دوسرا دن ہے۔ اس عمر (۸۰ سال تقریباً) میں موڈ کم ہی بحال رہتا ہے۔ تاہم آپ کو جواب دینا لازم ہے۔ آپ نے اتنی دور سے اس قدر پیارا اور تحسین بھرا خط لکھا ہے"۔

کرنل صاحب کے اس خط کا جواب جو میں نے دیا وہ "ہم نے تو دوسرا نی کر بھی لی" کے عنوان سے شگوفہ میں شائع ہوچکا ہے۔ اور متذکرہ واردات قلبی میں "مانا کہ آپ کو ہندسوں سے بڑا پیار تھا" اسی "۸۰" کی طرف اشارہ ہے۔

کرنل صاحب کا ایک انٹرویو جسے ضیاء الحق قاسمی صاحب نے کیا تھا اخبار جنگ میں ان کی وفات کے چند دنوں بعد ہی شائع ہوچکا ہے۔ اس سے بھی خود کرنل صاحب کی زبانی نوے (۹۰) سال کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس انٹرویو سے ایک شذرہ پیش ہے

"۱۹۴۰ء میں میں بھی فوج میں چلا گیا۔ میرا سن پیدائش "۱۹۱۰" ہے اتنی عمر میں فوج میں شامل ہونا مشکل تھا مگر انٹرویو کرنے والے کرنل نے جو انگریز تھا میری شاندار صحت کو مد نظر رکھتے ہوئے ۱۹۱۴ کردی اور ڈاکٹر کو بلوا کر اس کی تصدیق بھی کرادی۔ اس طرح میں فوج میں لفٹننٹ کے طور پر لیا گیا اور ٹریننگ کے لئے منتخب ہوگیا"۔

محترم انور سدید صاحب سے یقیناً سہو ہوا ہے ورنہ بے شک وہ اور مشفق خواجہ صاحب بھی بے حد و نہایت ذمہ دار اہل قلم اور پایہ کے ادیب ہیں۔ ان دونوں قابل احترام شخصیتوں سے شگوفہ کے حوالے سے میرے بھی ذاتی مراسم ہیں۔ اور ایسے سہو کا ارتکاب جو سدید صاحب سے سرزد ہوا کوئی قابل گرفت بات بھی نہیں۔ امید کہ، اس وضاحت کے بعد جناب محمد اسماعیل صاحب کا فکر و تردد یقیناً دور ہوگیا ہوگا۔ والسلام

سید طالب حسین زیدی
۱۱-۵-۴۱۴ ظفر باغ۔ لال ٹیکری، حیدرآباد ۴

●☆●

محب مکرم،

"شگوفہ" پابندی سے مل رہا ہے۔ سالنامہ آپ نے عمدہ نکالا۔ کرنل محمد خاں اور ضمیر جعفری پر ایک ایک شمارے مخصوص ہوں تو کیا کہنا۔ باقاعدہ اعلان کے تحت اور تیاری کے ساتھ نمبر نکالا جائے تو کم ضخامت کے باوجود یہ یادگار ہوسکتا ہے۔

ظفر کمالی سیوان

●☆●

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

ماہنامہ شگوفہ کا سالنامہ ایک ہنگامہ کی طرح نمودار ہوا۔ طبیعت باغ باغ ہوگئی۔

اکیسویں صدی کو خوش آمدید کہتے ہوئے یہ سالنامہ اپنے ایک نئے آب و تاب کے ساتھ طنز و مزاح کی دنیا میں قدم جمایا ہے۔ اللہ سے دعا گو ہوں کہ اس کی پرواز اور بلند ہو۔ نیز آپ کی سعی پیہم کو اللہ اور وسعت بخشے۔ آمین۔

افتخار دمی، بیتیا

●☆●

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب،

شگوفہ کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ بے انتہاء خوشی ہوئی۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ بڑا خوبصورت سالنامہ ہے۔ شکریہ۔

مصطفیٰ علی بیگ صاحب کی غزل سے غزل کہلوائی، بھیج رہا ہوں۔ بیگ صاحب کو اتنی اچھی غزل پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

محبوب راہی، بلاسپور، ایم پی

●☆●

محترمی،

سلام و نیاز

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ستمبر ۱۹۹۹ء کا شگوفہ نظر نواز ہوا۔ انشائیہ خراٹا کی اشاعت پر مسرت ہوئی۔ اس کے لئے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ شگوفہ کے تمام مضامین دلچسپ ہیں۔ یہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا واحد رسالہ ہے۔ دور دور تک اس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ شاید پاکستان میں کوئی ہو تو ہو۔

اسرار جامعی کی غزل پیمائی اور پیام مسرت نے بھی لطف بخشا۔ ایک تازہ انشائیہ حاضر خدمت ہے۔ امید ہے پسند آئے گا۔ آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا۔

متین عمادی، پٹنہ

●☆●

اداریہ

حیدرآباد کے ممتاز ایڈوکیٹ سید عبدالقدوس کا ۲۹ فبروری کو اچانک انتقال ہوگیا۔ قدوس صاحب پیشہ کے اعتبار سے ایڈوکیٹ تھے لیکن ایک ادب دوست، درد مند دل رکھنے والے حق پسند بے باک اور جری انسان کی حیثیت سے وہ مشہور تھے۔ اردو زبان و ادب کی تحریکات سے ان کا تعلق حاصل تھا۔ طنز و مزاح سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ شگوفہ اور زندہ دلان حیدرآباد سے ان کا قریبی ربط اور قلبی لگاؤ تھا۔ شگوفہ کے شعری انتخاب کے وہ مہمان مدیر بھی رہ چکے تھے۔ اپنی صاف گوئی اور کھلے ذہن کے باعث ادبی و سماجی حلقوں میں انہیں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ مشکل سے پچاس سال عمر تھی لیکن وقت مقرر تھا سینکڑوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔

- شاہد عظیم حیدرآباد کے سینیئر صحافی تھے۔ روزنامہ سیاست سے وابستہ تھے۔ ان کے والد عبدالکریم ماہر مرحوم اچھے شاعر تھے۔ شگوفہ میں بھی ان کا کلام شائع ہوچکا ہے۔ شاہد عظیم یوں تو بچوں کے لئے زیادہ لکھتے تھے لیکن ان کے چند انشائیے شگوفہ میں چھپ چکے ہیں۔ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے۔ انجام سے واقف لکھنے پڑھنے میں زیادہ مصروف ہوگئے۔ شگوفہ کے لئے بھی ایک مضمون لکھا۔ بہ ظاہر ادبی دنیا سے دور تھے لیکن سب کی خبر رکھتے اور بہ حیثیت صحافی حق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

- بزرگ شاعر روحی قادری بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ تشہیر سے بے نیاز استاد شاعر روحی قادری کا اپنا منفرد شعری انداز تھا جو قدیم و جدید موضوعات اور اسلوب کے امتزاج سے عبارت ہے۔

ان حضرات کے انتقال پر ہم اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

اشاعت کا ۳۲ واں سال

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۳
شمارہ ۴

اپریل ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد معز

اوورسیز کمیٹی :
حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
مسعود حسنی (آسٹریلیا)
عبدالرحمٰن سلیم (ریاض)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس مشاورت :
زبیر رضوی
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
محمد ظہیر رفعت، آئی اے ایس

مجلس ادارت :
حمایت اللہ
طالب خوندمیری
[illegible]
اقبال ہاشمی

کمپیوٹر کتابت :
SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373

طباعت :
دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے زرِ سالانہ : ۱۵۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064

نامور مزاح نگار کرنل محمد خاں

کو خراج عقیدت

شگوفہ کا ایک شمارہ

کرنل محمد خاں کے نام

مئی ۲۰۰۰ء میں شائع ہو گا۔
کرنل محمد خاں کے فن اور شخصیت کا جائزہ
اور محمد خاں کی منتخب تخلیقات

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیہ)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

قاضی جی دبلے (سفرنامہ)

بال کی کھال (تنقید و تبصرہ)

گوشہ حبیب ضیا

چورن (منظومات)

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفرنامہ	50روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	30روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	60روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	60روپے
طرز تماشہ	مسیح انجم	مضامین	40روپے
آئی ایم سادی	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	80روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	کلام	100روپے
بہ قرض محال	خواہ مخواہ	کلام	75روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	کلام	50روپے
کچوکے	پرویز ید اللہ مہدی	کلام	65روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسین	سفرنامہ	45روپے
درگت	ٹی این راز	کلام	70روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل راز	کلام	50روپے
الف تماشہ	نرسندر لوتھر	کلام	30روپے

مجتبیٰ حسین

با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔ کلنٹن جاچکے ہیں

ایک زمانہ تھا جب بادشاہ سلامت دربار میں آتے تھے تو نقیب پہلے ہی اعلان کرتا تھا۔ "با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔ سلطان ابن سلطان، خاقان ابن خاقان، شہنشاہ ہندوستان تشریف لاتے ہیں" اور لوگ نہ صرف با ادب اور با ملاحظہ ہوجاتے تھے بلکہ ہوشیار بھی ہوجاتے تھے۔ چنانچہ پچھلے دنوں جب دنیا کے سب سے طاقتور اور مقتدر انسان بل کلنٹن، ہندوستان آئے تو ہمارا ارادہ تھا کہ ان کے آنے سے پہلے نقیب بن کر اہل وطن کو با ادب با ملاحظہ اور ہوشیار بنے رہنے کی تلقین کریں لیکن سوچا کہ زمانہ اب بادشاہوں کا نہیں رہا بلکہ سلطانی جمہور کا آگیا ہے جہاں آدمی کو حکمراں کے آنے سے پہلے نہیں بلکہ اس کے جانے کے بعد ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ باہر سے کوئی آتا ہے تو اس کے استقبال کے لئے نہ صرف سرخ قالین بچھاتے ہیں بلکہ اپنا دل اور اپنی نظریں بھی اس کے راستہ میں بچھا دیتے ہیں۔ پچھلے دو تین مہینوں سے کلنٹن کی ہندوستان میں آمد کا وہ چرچا رہا کہ لگتا تھا کلنٹن پانچ دنوں کے لئے نہیں بلکہ مستقلاً یہاں رہنے کے ارادہ سے آرہے ہیں۔ سڑکوں کی صفائی ہوئی، برسوں سے غائب مین ہولس کے ڈھکن پھر سے لگائے گئے۔ بجلی کے جن کھمبوں پر برسوں سے بلب غائب تھے وہ از سر نو لگائے گئے۔ جگہ جگہ ہریالی اگائی گئی۔ بل کلنٹن کو جس شہر میں بھی جانا تھا اسے اس طرح سجایا اور سنوارا گیا جیسے کسی رئیس کا ڈرائنگ روم ہو۔ ہمیں اس طرح کے سجے سجائے ماحول میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔ کسی سڑک پر چلتے ہوئے مین ہول کے ڈھکن کھلے نہ ہوں تو ہمیں زندگی کا سفر طے کرنے میں لطف نہیں آتا۔ وہ سفر ہی کیا جس میں صعوبتوں کی گنجائش نہ ہو۔ اگر ہمیں ایسی ہموار، صاف ستھری اور آرام دہ سڑکوں پر چلنے کی عادت پڑجائے تو ہندوستان میں اپنی بقیہ عمر کس طرح گذاریں گے۔ کلنٹن تو ہندوستان میں کچھ دن گذار کر چلے گئے لیکن ہمیں تو یہیں رہنا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ کلنٹن کے چلے جانے کے بعد سڑکیں پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آجائیں گی۔ عمارتوں کا رنگ روغن پھیکا پڑجائے گا۔ پیڑ پودے مرجھا جائیں گے بجلی کے بلب پھر غائب ہوجائیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم پھر ہندوستانی بن جائیں گے۔ اس لئے تو ہم عوام الناس کو صدق دل سے آگاہ کر رہے ہیں کہ "بھیا با ادب با ملاحظہ ہوشیار ہوجاؤ کیونکہ کلنٹن جاچکے ہیں۔ باہر نکلو تو ہمیشہ کی طرح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلو کہ کہیں کسی مین ہول میں نہ گر جاؤ۔ کہیں تمہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ ہماری دلی خواہش تو یہ ہے کہ ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات اتنے بہتر ہوجائیں کہ صدر امریکہ سال میں کم از کم دو مرتبہ ہندوستان ضرور آیا کریں تاکہ ہماری سڑکیں صاف ہوتی رہیں، عمارتوں کا رنگ روغن چمکتا رہے۔ یہ جو صدر امریکہ بائیس برسوں کے وقفہ کے بعد آتے ہیں تو اس سے ہمارے شہروں کے حالات سدھر نہیں پارہے ہیں۔ انہیں ذرا جلدی جلدی آنا چاہئے۔ امریکہ اور ہندوستان کے تعلقات ٹھیک ہوں یا نہ ہوں ہمارے شہروں کے حالات تو ٹھیک ہوجائیں گے۔

یہ ایک اتفاق ہے کہ کلنٹن جن شہروں میں گئے ان میں سے کم از کم دو شہروں یعنی حیدرآباد اور دہلی میں ہمیں ان کی آمد سے پہلے یا ان کی آمد کے موقعہ پر رہنے کا موقعہ ملا۔ حیدرآباد تو ہم ان کی آمد سے پورے پندرہ دن پہلے گئے تھے۔ بخدا کیا سرگرمیاں تھیں، کیا جوش و خروش تھا۔ کبھی کوئی غلطی سے ہمارے کندھے پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیتا تو لگتا تھا کہ کہیں یہ ہاتھ بل کلنٹن کا تو نہیں ہے۔ بھکاریوں کو پکڑ پکڑ کر شہر سے بھیجا جارہا تھا کہ کہیں اور جاکر بھیک مانگو۔ یہ موقعہ تو ہمارے بھیک مانگنے کا ہے۔ تم کیوں بیچ میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہو

بھکاریوں کو تو چھوڑیئے حیدرآباد میں آوارہ کتوں کو بھی غالباً اس ڈر سے پکڑا جارہا تھا کہ کہیں یہ کلنٹن کے خلاف بھونک نہ دیں ۔ حیدرآبادی ہونے کے ناطے ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس شہر کے آوارہ کتوں کی دلچسپی صرف آوارگی میں ہوتی ہے ۔ انھیں بھونکنے سے کیا مطلب ۔ ہم خود بھی زندگی بھر آوارگی ہی کرتے رہے ۔ احتجاجاً بھونکنے کو کبھی اپنا شیوہ نہ بنایا ۔ کلنٹن تو چار پانچ گھنٹوں کے لئے حیدرآباد آکر چلے گئے لیکن انھیں کیا معلوم کہ ان کے ہاتھوں اس شہر کے بھکاریوں اور آوارہ کتوں پر کیا گزری ۔ ہم حیدرآباد جاتے ہیں تو اپنی عافیت کی خاطر پرانے شہر کے ایک ایسے محلے میں ٹھہرتے ہیں جہاں امریکہ کا صدر تو کجا کسی آفریقی ملک کا سربراہ بھی آنا پسند نہیں کرے گا ۔ مگر اس محلے میں بھی صفائی ستھرائی کا کام کچھ اس زور و شور سے جاری تھا کہ لگتا تھا ابھی کلنٹن یہاں آجائیں گے ۔ حیدرآباد میں یوں بھی فلائی اوور بنانے کی وبا عام ہوگئی ہے ۔ ہمارے ایک حیدرآبادی لکھ پتی دوست تو اپنے گھر میں بھی ایک فلائی اوور بنانا چاہتے ہیں تاکہ اس پر چل کر وہ اپنے ڈرائنگ روم سے باتھ روم تک جاسکیں ۔ بہرحال ہمیں حیدرآباد کے اس قدیم محلہ میں ہونے والی صفائی کو دیکھ کر نہ صرف تعجب ہوا بلکہ دکھ بھی ہوا ۔ اس لئے کہ ہم لوگوں کو اپنے گھر کا پتہ سمجھانے کے لئے کوڑے کرکٹ کے تین ڈھیروں کا حوالہ دیتے ہیں ۔ ہم یہاں آئے تو دیکھا کہ کوڑے کے تینوں ڈھیر غائب تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ خود ہمیں بھی اپنا گھر ڈھونڈنے میں دشواری پیش آئی کیونکہ کوڑے کے ڈھیر اب ہماری شناخت کا حصہ بن گئے ہیں ۔ پورے حیدرآباد میں لوگ کلنٹن کا خیر مقدم کرنے کے لئے اتاولے ہوئے جارہے تھے ۔ اور بے ہنگم اور متضاد باتوں کا آپس میں تعلق پیدا کرتے چلے جارہے تھے ۔ مثلاً ہمارے ایک دوست جن سے ہم نے ماضی بعید میں کبھی پچاس روپیہ ادھار لئے تھے یکلخت بھنائے ہوئے ہمارے پاس آئے کہ بل کلنٹن کی آمد کے پیش نظر ہم انھیں ان کے پچاس روپے لوٹادیں ۔ ہم نے کہا بل کلنٹن کی آمد سے ان پچاس روپیوں کا کیا تعلق ہے ۔ بولے صدر امریکہ کو تم کیا سمجھتے ہو ۔ انھیں چھینک بھی آتی ہے تو دنیا کے بازاروں میں پیاز کے بھاؤ بڑھ جاتے ہیں ۔ یہ تو پورے پچاس روپیوں کا معاملہ ہے اور ہمیں ان کی منطق کی روشنی میں ان کے پچاس روپیے واپس کرنے پڑے ۔

غرض جب ہم حیدرآباد سے چلے تھے تو پورا حیدرآباد بل کلنٹن کے استقبال کے لئے اور ہمیں وداع کرنے کے لئے بالکل تیار تھا ۔ دلی واپس آئے تو کچھ دیر کے لئے یوں لگا جیسے ہمارے استقبال کے لئے پوری دلی کو سجایا اور سنوارا جارہا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ بل کلنٹن جب تک دلی میں رہے ہم گھر سے باہر بالکل نہیں نکلے کہ پتہ نہیں وہ کب اچانک ہمارا راستہ کاٹ دیں اور ہمیں ٹریفک میں رک جانا پڑے ۔

ہمیں یاد ہے کہ تین سال پہلے جب ملکہ الزبتھ دلی آئی تھیں تو جب بھی دلی کو صاف ستھرا بنایا گیا تھا بلکہ ہماری اہلیہ نے احتیاطاً ہمارے باورچی خانہ کی صفائی بھی کردی تھی کہ کیا پتہ ملکہ الزبتھ ہمارے بگھارے بیگن کھانے کے شوق میں ادھر کو نکل آئیں ۔

بہرحال پچھلے دو مہینے کچھ ایسے گذرے جیسے بل کلنٹن کا استقبال کرنے کے سوائے اس ملک میں کوئی قابل ذکر کام رہ گیا ہو ۔ تاہم اس وقت ہمیں بھارتیہ جنتا پارٹی کی قومی عاملہ کے ایک رکن جنے دو باشی کا ایک بیان یاد آرہا ہے جس میں انھوں نے حکومت ہند کو آڑے ہاتھوں لیا تھا کہ وہ بل کلنٹن کو شہنشاہ سمجھ رہی ہے (اب انھیں کون سمجھائے کہ پچھلے زمانے کے شہنشاہ حضرات اپنے اختیارات کے اعتبار سے اتنے طاقتور نہیں ہوا کرتے تھے جتنے کہ آج بل کلنٹن ہیں) پھر بھی جنے دو باشی کی ایک بات سے ہمیں اتفاق ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ بل کلنٹن کی میعاد عہدہ اب صرف چند مہینوں کی رہ گئی ہے ۔ چند مہینوں کے صدر امریکہ کے استقبال کے لئے یہ اہتمام اور انصرام کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا جاتی ہوئی بہار اور گرتی ہوئی دیوار کی فکر کسے ہوتی ہے ۔

ہمیں اس وقت ایک عہدیدار کی یاد آگئی جو اپنے ماتحتین کو اکثر بے مزہ اور گھسے پٹے لطیفے سنایا کرتا تھا جن پر اس کے ماتحتین

بحالت مجبوری فرائض منصبی کے طور پر ہنس دیا کرتے تھے۔ ایک دن عہدیدار حسب معمول لطیفے سنانے لگا۔ سارے ماتحتین ہنس رہے تھے لیکن ایک کلرک جو ہر روز عہدیدار کے لطیفوں پر بے پناہ ہنسا کرتا تھا بالکل خاموش رہا۔ بعد میں اس کلرک کے ایک ساتھی نے اس خاموشی کی وجہ دریافت کی تو بولا: "یار میں تو کل سے ریٹائر ہورہا ہوں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کے بیہودہ لطیفوں پر اپنی ہنسی کو ضائع کروں۔ تم لوگوں کو ابھی نوکری کرنی ہے تم ہنستے رہو۔ میں تو اب اس اذیت ناک ہنسی سے آزاد ہورہا ہوں۔

اس منطق کی بنیاد پر ہمارا ابھی یہی خیال ہے کہ جو رقم اب بل کلنٹن کے استقبال پر خرچ کی گئی ہے اگر وہی رقم امریکہ کے اگلے صدر کے استقبال پر خرچ کی جاتی تو شائد ہم فائدہ میں رہتے۔ ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے اور ہمیں ایسی باتوں کی طرف ضرور دھیان دینا چاہیے۔ ☆

تلافی

جب منٹو کے افسانہ "بو" پر کچھ "با اخلاق" لوگ بدک اٹھے اور معاملہ عدالت تک جا پہنچا تو ایک ادیب نے منٹو سے کہا:

"لاہور کے کچھ سرکردہ بھنگیوں نے ارباب عدالت سے شکایت کی ہے کہ آپ نے ایک افسانہ "بو" لکھا ہے جس کی "بدبو" دور دور تک پھیل گئی ہے"

منٹو نے مسکراتے ہوئے کہا:

"کوئی بات نہیں۔ میں ایک افسانہ "فینائل" لکھ کر ان کی شکایت رفع کردوں گا"۔

●☆●

ظفر کمالی (سیوان)
At. [illegible]. Po. Barharia,
Dist. Siwan (Bihar) [illegible]232

ضمیر کی لوری

سوجا میرے پیارے سوجا • سوجا میرے پیارے — تیری بیداری نے دکھلائے ہیں دن میں تارے
تو ہی کہہ دے سنے راجا کب تک لوری گاؤں — شاید تیری یہ مرضی ہے میں پاگل ہوجاؤں
کیا تجھ کو معلوم نہیں ہے سارا دیس ہے سوتا — کیا جگنے سے بن جائے گا گاندھی جی کا پوتا
کیا جگتے رہنا پیارے ہے تیری نادانی — سوجا تو • تو میں بھی کرلوں کچھ اپنی من مانی
اپنے دیس کے نیتاؤں نے دلکش قصر بنائے — دونوں ہاتھوں دیس کو لوٹا شان وطن کہلائے
ان کے ساتھ نہیں ہوتی ہے تیری ٹوکا ٹاکی — صرف مجھے ہی دکھلاتا ہے تو اپنی بے باکی
موٹر بنگلہ پاس نہیں تو کچھ بھی پاس نہیں ہے — میری بربادی کا تجھ کو کیوں احساس نہیں ہے
جلدی سوجا بھر لوں بورے میں نوٹوں کی گڈی — گوشت تو آئے گھر میں اپنے کتے کھائیں ہڈی
کتنے ہیں خادم جن کو سونے سے پرہیز نہیں ہے — دیکھ کر ان میں کس کی قسمت ہے جو تیز نہیں ہے
نوٹ کرارے ہاتھ میں لے کر دیتے ہیں جب تھپکی — پنڈت ہوں یا ملا آجاتی ہے فوراً جھپکی
جاگتے رہنا پاگل پن ہے سونا ہے ہشیاری — ٹھیک نہیں ہوتی ہے پیارے جگنے کی بیماری
کب جانے گا کب مانے گا ہر ہشیار ہے سوتا — دور نیا آیا ہے بنگلے چوکیدار ہے سوتا
اک تیرے جگنے سے میں نے کتنے پاپڑ بیلے — کیسی کیسی آفت آئی کیا کیا دکھ ہیں جھیلے
گھر والی ہو یا گھر والے اپنا مان نہیں ہے — اور کسی محفل میں اپنا کچھ سمان نہیں ہے
فیض ہے تیرا دفتر میں مشہور ہوا دیوانہ — ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم ہے میرا افسانہ
حاکم مجھ کو ہونا تھا لیکن محکوم بنا ہوں — رہ کر بھی موجود جہاں میں کیوں معدوم بنا ہوں
سونے والوں کے گھر دولت چھپر پھاڑ کے برسے — لیکن میں ایسا بے قسمت جو ٹکیے کو ترسے
تو بیدار رہے گا جب تک میں در در بھٹکوں گا — میں دنیا کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹکوں گا
جگتے رہنا آٹھ پہر کیا تیری ہے مجبوری — اس جگنے کی لی ہے تجھ کو کیا اب تک مزدوری
سوپر پاور ہو کر پیارے امریکہ سوتا ہے — جب کاٹے تو گیہوں کاٹے گرچہ جو بوتا ہے
ڈھول بجاؤ لاکھ مگر وہ لیتا ہے خراٹے — نیند کی پٹڑی پر بھرتا ہے اکثر وہ خراٹے
اپنے اپنے وقت پہ سوتے ہیں روسی جاپانی — انگلستان ہے جو بن بیٹھا ہے بالکل ہی افغانی!!!
وہ چپراسی ہوں یا افسر نیند کے ہیں متوالے — تو بھی ایسے سوجا جیسے سوئے اردو والے
گونج اٹھیں خراٹے ہر سو کر تو بھی [illegible] — میرا ہو کر مجھ سے ہی کیوں کرتا ہے غداری

سب سوتے ہیں تو بھی سوجا کام ظفر کا کرجا
سونے سے پرہیز اگر ہے تو بہتر ہے مرجا

عابد معز
(ریاض)

قریب کی نظر

دفتر میں میرے ایک ساتھی کا پچھلے چند ہفتوں سے یہ معمول بن گیا تھا۔ فائلوں پر لکھے اندراجات کو پڑھنے کے لئے وہ باضابطہ ورزش کرتے۔ فائل کو کبھی آنکھوں کے قریب کرتے تو کبھی دور یا پھر فائل کو ایک مقام پر ساکت رکھ کر خود آگے اور پیچھے ہلتے۔ کوششوں کے بعد کسی ایک مخصوص زاویہ پر وہ اکثر پڑھنے میں کامیاب ہوجاتے۔ جب خاصی مشق کے بعد ناکام ہوتے تو روشنی کم ہونے یا باریک خط کا بہانہ کرکے مجھ سے پڑھنے کی عینک مانگتے۔

اس مرتبہ میں نے اپنی عینک انہیں مستعار دیتے ہوئے کہا:

"جناب والا! اپنی بڑھتی ہوئی عمر کو خوش دلی سے قبول کرلیجئے۔ جوانی کا دور لد گیا۔ اب آپ ادھیڑ عمر میں قدم رکھ چکے ہیں۔ قریب کی نظر کمزور ہوگئی ہے۔ عینک کا مستقل استعمال ضروری ہے" "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے عینک کی ضرورت ہے" موصوف نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"ویسے آپ کی عمر کیا ہے" میں نے سوال کیا:

"عمر سے بینائی کا کیا تعلق ہے۔ چھوٹے بچے بھی عینک لگاتے ہیں" موصوف نے اپنی عمر بتانا نہیں چاہا۔

"یہ صحیح ہے کہ عینک کسی بھی عمر میں آنکھوں پر چڑھ سکتی ہے لیکن عینک کے عدسوں سے عمر کا سراغ ملتا ہے" میں نے میں اپنے تجربے کی بات بتائی۔ "وہ کیسے" موصوف نے استفسار کیا۔

"بچپن اور جوانی میں عموماً دور کی نظر کمزور ہوتی ہے۔ عینک ہی سے آنکھیں بہت دور اور چھوٹی چھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔ ادھیڑ عمر میں قریب کی نظر کمزور ہوتی ہے۔ عینک میں ایسے عدسے لگتے ہیں جن میں سے آنکھیں موٹی اور بڑی دکھائی پڑتی ہیں عمر کے ساتھ عدسوں کی موٹائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے آنکھیں بھی بڑی سے بڑی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ بڑھاپے میں اتنے موٹے عدسے آنکھوں پر چڑھ جاتے ہیں جن کے پیچھے سے انسانی آنکھ گائے یا بھینس کی آنکھ سے مشابہ نظر آتی ہے"

"آپ کو عینک کے اندر سے عمر کا اندازہ کرنے کا فن خوب آتا ہے اب لگے ہاتھوں یہ بتائیے کہ دہرے شیشے والی عینک استعمال کرنے والوں کی عمر کے بارے میں کیا خیال ہے" موصوف نے عجیب انداز سے میری تعریف کرتے ہوئے سوال کیا۔ میں اندازہ نہیں کرسکا کہ آیا وہ میرے تجربے پر طنز کررہے ہیں۔

موصوف کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے جواب دیا "دہرے شیشوں والی عینک منادی کرتی ہے کہ ہماری آدھی عمر گزر چکی ہے اور اب صرف آدھی عمر باقی ہے۔ ہوشیار، خبردار، سنبھل کر زندگی گزارنا"۔

"عینک اور عمر کے رشتہ کو واضح کرنے کا شکریہ۔ میں آپ کی عینک استعمال کرکے ابھی لوٹاتا ہوں" موصوف نے یہ کہہ کر مجھ سے پیچھا چھڑالیا۔

"پہلی فرصت میں اپنے لئے قریب کی عینک بنوالیجئے" میں نے انہیں مشورہ دیا۔

بڑھتی ہوئی عمر کی چغلی جس طرح آنکھیں کرتی ہیں شاید ہی کوئی اور عضو کرتا ہوگا ۔ بڑھتی عمر کے ساتھ بال سفید ہوتے اور گرتے ہیں لیکن کئی نوجوان حضرات نہ صرف سفید بالوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں بلکہ بعض نوجوانوں کے بال بہت جلد داغ مفارقت بھی دے جاتے ہیں اور پھر سفید بالوں کو کالا کیا جاسکتا ہے ۔ بعض بوڑھوں کے بال بہت گھنے بھی ہوتے ہیں ۔ اس لحاظ سے بال گن کر عمر کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ۔ بڑھاپے میں سماعت متاثر ہوسکتی ہے ۔ جوڑوں میں درد ہوسکتا ہے ۔ کمر میں خم پیدا ہوسکتا ہے جلد میں جھریاں نمودار ہوسکتی ہیں ۔ یہ ایسی نشانیاں ہیں جو بوڑھے ہونے کا اعلان کرتی ہیں لیکن آنکھ وہ عضو ہے جو جوانی کے گزرنے کی دردناک خبر دیتی ہے ۔ جوانی کے گزرنے اور ادھیڑ عمر میں قدم رکھنے پر اخبار پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہے ۔ اخبار پڑھنے میں مشکل ہونے کی بات میں نے اس لئے کی ہے کہ اس عمر کو پہنچنے تک کتابیں پڑھنے کا دور گزر جاتا ہے ۔ کالج چھوڑ کر خاصہ وقت ہوچکا ہوتا ہے لیکن اس عمر میں اخبار پڑھنے کی عادت پختہ ہوجاتی ہے ۔ الفاظ برابر پڑھے نہیں جاتے ۔ حروف اور الفاظ ایک دوسرے میں گھسے لائن بناتے چلے جاتے ہیں ۔ تصویریں واضح دکھائی نہیں دیتیں ۔ بالوں کی موجودگی کی اطلاع ملتی ہے لیکن بال سنوارنے کے انداز کا پتہ نہیں چلتا کہ بھنویں اور آنکھیں ملی ہوئی لگتی ہیں ۔ ناک کے حدود مدغم ہوتے ہیں پتہ نہیں چلتا کہ منہ کھلا ہوا ہے یا بند ۔ دانت اصلی ہیں یا نقلی ۔ صاحب تصویر مسکرا رہے ہیں یا افسردہ ہیں ۔ تصویر کی جنس پہچانتا بھی مشکل ہوتا ہے ۔ یوں بھی آج کے فیشن نے جنس کے فرق کو کم سے کم کردیا ہے ۔

قریب کی نظر کمزور ہونے پر لڑکی ، خاتون معلوم ہوتی ہے ۔ گھریلو کام کاج میں مشکل ہوتی ہے ۔ اناج میں سے کنکر اور دیگر اشیاء صاف کرتے ، سوئی میں دھاگہ ڈالتے اور سالن بھونتے وقت تکلیف ہوتی ہے ۔ اکثر خواتین کو یہ حقیقت قبول کرنے اور عینک لگانے میں تکلیف ہوتی ہے ۔ بغیر عینک کام چلائے جاتے ہیں ۔ اگرچہ چاول میں کنکر آنے لگتے ہیں ۔

ادھیڑ عمر میں قریب کی نظر کمزور ہوتی ہے لیکن دور کی نظر متاثر نہیں ہوتی بلکہ بعض لوگوں میں دور کی نظر تیز ہوجاتی ہے ۔ ادھیڑ عمر میں انسان دور بین اور دراز نظر بن جاتا ہے اور اس میں دور اندیشی اور بعید نظری پیدا ہوتی ہے ۔ تیس چالیس سالوں کے تجربے سے اتنا تو ہونا ہی چاہیئے ۔ دور نظری کے ساتھ چونکہ قریب کی نظر متاثر ہوتی ہے ۔ ادھیڑ عمر میں کوتاہ بینی اور تنگ نظر سے چھٹکارا ملتا ہے ۔ عمر میں اضافہ ہونے کا مجھے یہ ایک قدرتی فائدہ نظر آتا ہے ۔

قریب کی نظر کمزور ہونے کے ساتھ چند بیماریاں شاید بینائی کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر قریب آنے لگتی ہیں ۔ بلڈ پریشر میں اضافہ ہوسکتا ہے ۔ شکر کا عارضہ دستک دینے لگتا ہے ۔ دل بھی کمزور ہونے کیلئے تیزی اور بے اعتدالی سے دھڑکنے لگتا ہے ۔ ماہرین چند اور بیماریوں کے لاحق ہونے کے خدشات سے ڈراتے بھی ہیں ۔ عینک لگانے کے ساتھ زندگی کے دیگر شعبوں میں احتیاط برتنے کا مشورہ ملتا ہے ۔ منظم زندگی گزارنے کیلئے کہا جاتا ہے ۔ چہل قدمی کرنے اور دوڑنے کیلئے دھکیلا جاتا ہے ۔ کھانے پینے میں پرہیز در آتا ہے ۔ سفید اشیاء جیسے چکنائی ، نمک اور شکر سے منہ موڑ لینے کی ترغیب دی جاتی ہے ۔ بس ایک نظر کے کمزور ہونے سے کیا کچھ ہوجاتا ہے ۔

قریب کی نظر کمزور ہونے سے عمر کا اندازہ لگتا ہے ۔ اسی لئے اکثر لوگ اس کمزوری کو دور کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں ۔ ویسے اس کمزوری کو دور کرنے کا آسان نسخہ ہے اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں اور اپنی اصلی عمر کا انکشاف کرتے ہوئے موٹے عدسوں والی عینک کو آنکھوں پر چڑھالیں ۔

قریب کی نظر کیلئے مخصوص آدھی عینک ملتی ہے ۔ عینک میں شیشہ پورا نہیں ہوتا بلکہ نصف چاند یا روٹی کی شکل کے شیشہ کا استعمال کیا جاتا ہے ۔ آدھی عینک کو ضرورت کے وقت ہی استعمال کیا جاتا ہے اور بقیہ وقت گلے میں لٹکانا آج کا فیشن ہے ۔

خوبصورت ریشمی ڈوری سے عینک کو گلے میں لٹکایا جاتا ہے ۔ میرے ایک دوست اس ڈوری کو نظر کا لگام کہتے ہیں ۔ نظر کو ادھر ادھر بھٹکنے سے یہ ڈوری روکتی ہے لیکن جب دل و دماغ تک نظر کو قابو میں رکھنے میں ناکام رہتے ہیں تو بھلا یہ ڈوری نظر کو کہاں تک روک سکتی ہے ۔

آدمی عینک آنکھوں پر چڑھنے سے زیادہ ناک پر بیٹھی رہتی ہے ۔ بعض مرتبہ ناک سے پھسل کر ہونٹ کے اوپر تک جا پہنچتی ہے ۔ آدمی عینک لگا کر عجیب و غریب طریقے سے دنیا کا نظارہ کرنا پڑتا ہے ۔ شروع میں مشکل پیش آتی ہے لیکن جلد ہی عادت پڑ جاتی ہے ۔ قریب دیکھنے کے لئے آدمے شیشوں میں سے جھانکنا پڑتا ہے جبکہ دور بینی کے لئے عینک کے اوپر سے نظارہ کرنا پڑتا ہے ۔ عینک میں سے جھانکنے اور عینک کے اوپر سے دیکھتے وقت مضحکہ خیز شکلیں بنتی ہیں جو دیکھنے اور لطف اٹھانے سے تعلق رکھتی ہیں ۔ موقع ملا تو آپ خود اپنی آدمی عینک سے آئینہ دیکھئے یا آس پاس کے آدمی عینک والوں کا جائزہ لیجئے ۔ اسی مشاہدے کے سبب منشی جی کے کردار کو شہرت ملی ہے ۔

قریب کی کمزور نظر رکھنے والے حضرات ایک دوسرے کی عینک بلا جھجک اور بلا تکلف استعمال کر سکتے ہیں ۔ یہ سہولت دور کی کمزور نظر رکھنے والوں کو حاصل نہیں ہے ۔ قلم مستعار لینا ایک مستند روایت ہے ۔ اب لوگوں میں قریب کی عینک مانگ کر کام چلانے کی عادت فروغ پا رہی ہے ۔

اس دوران میرے ساتھی نے میری عینک واپس کر دی ۔ میری سوچ کا سلسلہ منقطع ہوا اور میں قریب کی عینک کو ناک پر بٹھائے کام میں جٹ گیا ۔ ☆

افتخار وصی
بیتیا، مغربی چمپارن، بہار

غزل

کٹ گئی پوری جوانی انتظارِ یار میں
آج تک آیا نہیں بندہ مری سرکار میں

میں بھی شاعر بن گیا ہوں دوستوں کی ہیلپ سے
آرہی ہیں میری غزلیں ان دنوں، اخبار میں

آپ نے جب سے چنا ہے خود کو میرِ کارواں
جھول سا کچھ آگیا ہے آپ کے کردار

زندگی کی رہگذر پر پھونک کر رکھنا قدم
انسیت باقی نہیں ہے اب کے رشتہ دار میں

مسئلہ بیکاری کا یوں حل کیا ہے افتخارؔ
موم بتی بیچتا ہوں حسن کے بازار میں

●☆●

آپ میاں مٹھو

کل شاعروں کی بزم میں گھس آیا اک گدھا
ماتھے پہ جسکے درج تھا شاعر ہوں میں بڑا

موصوف کے گلے میں لٹکتی تھیں تختیاں
چسپاں تھیں جن پہ انگشت توصیفی پرچیاں

ان پرچیوں کو بزم میں پڑھنے لگا گدھا
خوش فہمیوں کے بانس پہ چڑھنے لگا گدھا

اپنے کو داغ دہلوی سے جوڑتا تھا وہ
تک بندیوں کو شاعری سے جوڑتا تھا وہ

کہتا تھا میری شاعری ہے انقلاب
ہوتے ہیں جسکے روبرو ادبا بھی آب آب

اردو سے ڈاکٹر کی سند پاچکا ہوں میں
انگلش سے ماسٹر کی سند پاچکا ہوں میں

ادبی رسالے جتنے بھی ہیں ہند و پاک کے
شہرت کے تاج چومتے ہیں میرے کلام سے

حاصل ہے مجھکو قدر جو بیرونِ شہر میں
تمثیل کوئی ملتی نہیں اس کی دہر میں

لیکن مرے لئے ہے یہ افسوس کا مقام
اپنے ہی لوگ کرتے نہیں میرا احترام

اتنا ہی اس بے چارہ کے منہ سے نکل سکا
پھر اس کا باپ بزم میں اس وقت آگھسا

بیٹے سے ہنس کے کہا، اس نے اے پسر
تجھکو نہ ملتے ہیں یہ شاعر تو غم نہ کر

تو کیا ہے! تیری ذات کا دنیا کو ہے پتہ
یونہی بڑے رسالوں میں چھپتا ہے کوئی کیا؟

قربان تجھ پہ فکرِ سخن کے اجالے سب
اب نام تیرا جانتے ہیں چاہنے والے سب

زندہ مثال میں ہوں تیرے سامنے کھڑا
مجھکو بھی یہ سمجھتے ہیں تیری طرح گدھا

حالانکہ میرے دم سے ادب پر نکھار ہے
دانشورانِ دہر میں میرا شمار ہے

●☆●

یوسف امتیاز ٹورانٹو (کینیڈا)

ایک مسافر سو افسانے

پرانی صدی کے اختتام اور نئی صدی کی شروعات نے سفر کرنے والوں کے لئے قیامت ڈھائی۔ خبروں، خدشوں، خوف، شبہات سے بھرپور اطلاعات نے ہزاروں کی کرسمس اور نئے سال کی روایتی چھٹیاں جیسے چھین لیں۔ بعض ایرلائنز نے اپنی فلائٹ نئے سال کی آمد اور کمپیوٹر مشکلات کو دیکھتے ہوئے کینسل کردی۔ وای ٹو کے (Y2K) کا دیوانہ دیو قامت تھا کہ بہتوں نے اپنی ریزرویشن منسوخ کروادی۔ پرانا سال بخیر و خوبی گزر گیا اور نیا سال ہر سال کی طرح آیا۔ نئی صدی شروع ہو گئی۔

بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے ہر حال میں سفر کیا۔ 1999 میں سفر کرنے والوں کے کچھ دلچسپ حادثات، واقعات اور کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور ناقابل نظر انداز بھی۔

میلان اٹلی کا ایرپورٹ کوئی 15 مہینے پرانا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکو شروع ہوئے پندرہ سو برس ہو چکے ہیں۔ ٹکنیکل مشکلات، سامان گم ہوجانا، معمولی بات ہے۔ ہوائی جہازوں کی پابندی وقت کا یہ عالم ہے جیسے وہ ہندوستان پاکستان سے ایک ریس میں شامل ہے۔ ہوائی جہازوں کی بروقت آمد و رفت پر قابو نہ پاسکنے کی وجہ سے ایرپورٹ کے انتظامیہ نے مسافروں کی تفریح کے لئے انکے پاؤں ٹھنڈا کرنے کی سہولت فراہم کردی ہے۔ ٹرمنل میں ایک اسکیٹنگ رنک SKATING RINK بنایا ہے جہاں اسکیٹس کرائے پر ملنے کے علاوہ ساری ضرورتیں موجود ہیں۔

فلوریڈا کی ایک عورت پر پولس کو شبہ ہوا جو جمیکا سے اورلینڈو جانے والی فلائٹ پر سوار ہوئی تھی جس نے اپنے بالوں کی سجاوٹ کو سر سے بہت اونچا سجایا تھا پولس نے تلاشی لی تو پتہ چلا کہ بالوں کے اندر ایک کیلوگرام کوکین سے بھرا اسٹاکنگ پوشیدہ تھا۔ عورت کی دلیل تھی کہ اس نے یہ پلندہ اپنے بالوں کے لئے علاج کے لئے رکھا تھا مگر جج نے اس عورت کو ایک سال کی سزا سنائی۔ بالوں کے لئے سال منحوس تھا۔

الاسکن ایرلائنز نے غلطی سے سفر کے ریزرویشن سسٹم میں امریکہ کے شمال مغرب سے پام اسپرنگ جانے کی قیمت صفر صفر ڈالر اور صفر صفر سینٹ درج کی۔ کوئی سو مسافرین نے اس کو جان کر اپنی اپنی سیٹ محفوظ کروائی جب ایرپورٹ پر پہنچے تو ایرلائنز نے انکو مجبور کیا کہ وہ مقررہ قیمت پر ٹکٹ خریدیں۔ لیکن خراب تشہیر اور بدنامی کے خوف سے ایرلائن نے مفت ٹکٹ کو قبول کرلیا ورنہ مفت کا یہ سفر کسے ملتا ہے۔

کلاسیکل میوزیشن یویوما کی کہانی اخباروں اور ٹیلی ویژن کی زینت بنی رہی جس نے نیویارک سٹی میں ایک چھوٹے فاصلے کے لئے ٹیکسی پکڑی اور اپنا 266 سال پرانا اور تین ملین سے زیادہ قیمتی چیلو CHELO ٹیکسی کے ٹرنک میں بھول گیا۔

مسٹر ما کی ٹیکسی رسید کو استعمال کرکے پولس نے کوئنز کے گیراج میں ٹیکسی کو ڈھونڈ نکالا جو کانسرٹ شروع ہونے سے کچھ دیر قبل مسٹر ما کو پہنچادی گئی مسٹر ما نے بعد میں کہا کہ میں نے بہت بڑی بے وقوفی کی تھی۔ یہ چیلو میری آواز ہے۔ ما حاضر اور آواز غائب۔

اوہایو OHAIO کے ہنی مون منانے والے ایک جوڑے نے اپنے اخراجات بچانے کے لئے ورجینیا میں دولہا کے آبائی

مکان میں چھٹیاں منائیں۔ وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ مکان ایک کھنڈر اور جھونپڑے کی طرح تھا جسکی دیواروں میں سوراخ تھے سیڑھیوں پر سانپ رینگ رہے تھے۔ گھر کا آدٹ ہاوز منہدم ہوچکا تھا۔ اسکے مالک کے پاس ایک بندوق تھی جس سے وہ گھری مار کر تیرہ ڈنر پیش رتا تھا۔ اس جوڑے کو تفریحی کار ریڈیو نے Honey Moon Disasters کے مقابلہ کا انعام دیا۔ دوسرے نمبر پر آئیڈا ہو IDAHO کا ایک جوڑا تھا جسکی کار نیوادا NAVADA میں ڈرائیور کرتے ہوئے سیلاب کی پانی کی وجہ سے کار الٹ گئی جب دولہا کو ہوش آیا تو اس حادثے کی کوئی بھی بات یاد نہ تھی اور پھر سونے پر سہاگہ وہ اپنی شادی اور دلہن کا نام بھی بھول چکا تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ ارجنٹائن کا ایک ٹرین ڈرائیور حسب معمول ٹرین کے چیک اپ کے لئے جب نیچے اترا تو وہ پلیٹ فارم پر رہ گیا۔ اس ٹرین میں پانچ سو مسافر سفر کر رہے تھے ٹرین کے گارڈ نے یہ جانے بوجھے بغیر کہ ڈرائیور موجود نہیں ہے سارے دروازے بند کر دیئے اور ٹرین چل پڑی ڈرائیور واپس ٹرین پر چڑھنے کے لئے بھاگا مگر ناکام رہا۔ ٹرین بیونس آئرس کے چھ اسٹیشنوں سے گذر گئی۔ مسافروں نے خوف دہشت سے چیخ پکار کی ٹرین میں سفر کرنے والے گارڈ نے ٹرین کو روکا۔ آخری اسٹیشن سے کچھ میٹر پہلے۔ اسے یاد آیا کہ آزاد ہندوستان کے چالیسویں اور پچاسویں دہے میں جگ جیون رام ریلوے منسٹر ہوا کرتے تھے جو کچھ عرصہ نائب وزیر اعظم بھی رہے ان کے دور وزارت میں ریل کے بہت حادثے ہوئے۔ کہا جانے لگا کہ جب لوگ ٹرین میں سفر کرتے ہیں تو وہ "جگ" چھوڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ "جیون" خطرے میں، لبوں پر "رام رام" ہوتا ہے۔

در و دیوار پہ حسرت کی نگاہ کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

گوا ہمالہ سے ہائی کنگ HIKING ٹرپ کے بعد لوٹنے والے اس مسافر کی داستان دلچسپ ہے جو صرف ایک بیک پیکر BACK PACKER کے ساتھ سفر کر رہا تھا جب وہ کینیڈین ایر لائنز کی ایڈمنٹن جانے والی فلائٹ کے لئے ہوائی جہاز پر چڑھا تو اسکو پتہ نہیں تھا کہ پانچ سنٹی میٹر لمبا بدبو سے بھرا ایک بچھو بھی اسکا ہم سفر ہے جب وہ پتلون بدلنے کے لئے واش روم گیا تو اسکے تھیلے سے بچھو باہر نکل پڑا۔ فلائٹ کے اسٹاف نے اسکو پکڑ کے دروازے کے ایک کونے میں روک کے رکھا۔ ایک آدمی اسکی نقل و حرکت پر نظر رکھ رہا تھا کہ وہ اسی کارنر میں رکا رہے۔ قریب بیٹھنے والے مسافرین نے اپنے پاؤں اوپر کرکے سیٹ پر رکھ لئے اور پتلون کے پائنچوں کو اپنے موزوں میں ٹھونس لیا۔ بچھو نے کتنے رنگ بدلے اسکی کوئی اطلاع نہیں ہے۔

اس ایر ٹریفک کنٹرولر کی کہانی بھی دلچسپ ہے جو بورن ماؤتھ انگلینڈ کے ایر پورٹ پر اکیلا ڈیوٹی دے رہا تھا جب وہ چائے بنانے کے لئے اٹھا تو سیڑھیوں سے نیچے گر پڑا۔ اس دوران وہ ہوائی جہاز ایکسو تینتیس (133) مسافروں کے ساتھ ہوا میں چکر لگاتے رہے جب تک کہ ایر ٹریفک کنٹرولر رینگتا اور گھسیٹتا ہوا اوپر آیا اور فائر بریگیڈ کو خبردار کیا۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

جاپان کے منسٹر آف جسٹس شوزا ہورو ناکامورا کی مشکلات بڑی دلچسپ ہیں جس میں انہوں نے آرنلڈ شوارزنیگر کی مدد کی۔ بتایا جاتا ہے کہ اس مشہور اداکار کو اسکا آخر کو یاد آیا کہ وہ اپنا پاسپورٹ بھول گیا ہے۔ ذاتی ہوائی جہاز میں ہوائی اڈے پر اترنے کی اجازت دے کر منسٹر نے ایک اسکینڈل گرم کر لیا۔ اور ساتھ ہی انہوں نے شوارزنیگر کی تحریر کی کاپی بھی ذاتی سووینیر کے طور پر رکھ لی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ فیصلہ خراب تھا مگر تنقید کرنے والوں کا مطالبہ تھا کہ منسٹر اب ایک لمبا سایونارا (خدا حافظ) کہدیں۔ شوارزنیگر بھی فلمی دنیا کے Terminater جو ٹھیرے جنہوں نے منسٹر کو Terminate کر دیا۔

عشق نے توڑی سر پہ قیامت
زور قیامت کیا کہیے

ڈایا ناراس مشہور و معروف گائکہ ہیں اور سپریم گروپ کی ممبر۔ انھوں نے ہیتھرو ایرپورٹ پر ایک سپریم ہنگامہ کھڑا کر دیا جب ایک خاتون سکیورٹی گارڈ انکو پکڑ کر لے گئی۔ ڈایا ناراس نے کافی شور مچایا اور چیخ پکار کی کہ سکیورٹی گارڈ نے انکے سینے کو بھی چھوا۔ پھر ڈایا نانے خود اپنے ہاتھوں سے گارڈ کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جسکا الزام انھوں نے لگایا تھا اور ہوائی جہاز پر سوار ہونے کے لئے آگے بڑھ گئیں۔ انکو نیویارک جانے والی کانکورڈ فلائٹ سے پولیس آفیسر نے سوار ہونے سے روک دیا کوئی چار گھنٹے وہ حراست میں رہیں اور صرف وارننگ کے ساتھ انکو رہا کر دیا گیا:

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

یہ 1999 کے کچھ افسانے ہیں بلکہ سچائیاں ہیں .... الف لیلی کی داستانوں میں سند باد اور حاتم کا سفر شیطان کی ایک آنت ہے اسی طرح بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ سفر جاری ہے تو آئندہ تک بس یار زندہ صحبت باقی .... پھر ملیں گے گر خدا لایا۔ ☆

مجبوری

مجاز اور فراق کے درمیان کافی سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک دم فراق کا لہجہ بدلا اور انھوں نے ہنستے ہوئے پوچھا:

"مجاز! تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیے؟"

"آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہو گیا!"

مجاز نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے فوراً جواب دیا۔

●☆●

اندیشہ باطل

"بھئی میں نے سوچا ہے مجھے اب شادی کر ہی لینی چاہئے"

اردو کے ایک نہایت نامور اور کہنہ مشق شاعر نے پریشان سا ہو کر کہا

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے .... کر لیجئے"

مجاز نے مشورہ دیا۔

"لیکن .... بات یہ ہے کہ میں کسی بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"آپ کسی سے بھی شادی کر لیجئے ...."

مجاز نے نہایت سنجیدگی سے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا:

"بیوہ تو وہ بیچاری ہو ہی جائے گی"۔

محبوب مانجھوی
(بلاسپور، ایم پی)

غزل

کرتا ہوں اب بھی ذکر بتاں اولڈ ایج میں
سینے میں میرے دل ہے جواں اولڈ ایج میں

یہ دوستی ماہ رخاں ، اولڈ ایج میں
کیا ہوگیا ہے ان کو میاں اولڈ ایج میں

آنکھیں جو دیکھتی ہیں تو آتا ہے یہ خیال
ہوجائیں ہم نہ پھر سے جواں اولڈ ایج میں

کس کس سے رسم و راہ تھی عہد شباب میں
اب بھی تھی حالت ہے کہاں اولڈ ایج میں

دنگے فساد کرنے میں ماہر تھے کل بہت
اب ڈھونڈتے ہیں جائے اماں اولڈ ایج میں

معشوق در بغل لئے جام شراب ناب
وہ دن وہ مستیاں ہیں کہاں اولڈ ایج میں

مسجد ادہر ہے اور ادہر میکدہ حضور
ہم سوچتے ہیں جائیں کہاں اولڈ ایج میں

TOPIC تو ہے کے دیکھئے "حوراں خلد کا"
واعظ کا طرز حسن بیاں اولڈ ایج میں

پوتے بھی اب تو کہتے ہیں محبوب بے دریغ
جاتے ہو میکدے کو کہاں اولڈ ایج میں

●☆●

باترخ بہاری
کلکتہ

کھانسی اور شراب

کل مجھ پہ دفعتاً ہوا حملہ زکام کا
بارش میں غسل کرنے کا انعام یہ ملا

میں شدتِ زکام سے یوں کھانستا رہا
چھینکوں پہ چھینک آتی رہی ہانپتا رہا

بکھرا ہوا وجود کا سرکل ہے آج کل
ہر عضو مرے جسم کا کرگل ہے آج کل

کھانسی نے مجھ کو مثل عجوبہ بنادیا
ذہن و شعور کا بھی پرخچہ اڑا دیا

کی عرض ایک مولوی صاحب سے الغرض
خادم کو چند روز سے کھانسی کا ہے مرض

للہ مجھ کو آپ بتائیں کوئی دوا
ہوجائے جس سے پیتے ہی کھانسی کا خاتمہ

کہنے لگے ہیں آپ پریشان بے سبب
اکسیر صدر لیجئے بلوکس وہو رب

نسخے پہ مولوی کے بھی میں نے کیا عمل
لیکن نہ نکلا اس سے کوئی خوشگوار حل

تنگ آکے میں نے ایک شرابی سے یہ کہا
بھائی مجھے بتاؤ تو کھانسی کی کچھ دوا

کہنے لگا کہ آپ پیا کیجئے شراب
کھانسی سے زندگی میں نہ پائیے جناب

سن کر یہ بات ہونے لگا مجھکو اختلاج
میں نے کہا شراب سے کھانسی کا کیا علاج

اک قہقہہ لگا کے وہ کہنے لگا حضور
بندہ نواز آپ کے بھیجے میں ہے فتور

دولت جو میری بھینٹ چڑھی ہے شراب کی
کھانسی نہ ختم ہوگی بھلا کیوں جناب کی

●☆●

مرزا کھونچ
نیاٹولہ، بیتیا (بہار)

"کلرک"

کلرک انگریزی زبان کا لفظ ہے اس کے لئے لفظ کرانی بھی بول چال کی زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن کرانی میں وہ بات کہاں جو لفظ کلرک میں ہے۔ کلرک کہنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات کچھ اہم اور باوزن ہے لیکن کرانی کہنے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات تو کچھ ضرور ہے۔ مگر رعب داب نہیں ہے۔ کرانی کو لوگ دفتر کی رانی بھی کہتے ہیں۔ راجہ کے آگے رانی کی کیا بساط، ہاں، کوئی رانی ایسی بھی پیدا ہوجاتی ہے جس کے آگے بیچارہ راجہ پانی بھرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن ایسی رانیوں کی تعداد بہت کم ہے ٹھیک اسی طرح سو میں ایک دو کرانی ایسے ملتے ہیں جن کا رعب دفتر کے حاکم پر بھی رہتا ہے۔ چونکہ کرانی کے آخر میں چھوٹی "ی" ہے اور قواعد کے مطابق اس لفظ کو مونث ہونا چاہئے۔ اسی لئے کرانی کو کلرک ہی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ویسے بھی انگریزی زبان میں مذکر اور مونث کا جھگڑا نہیں ہے اور یہ اردو، ہندی والے بس اسی تذکیر اور تانیث کے چکر میں ابھی تک الجھے ہوئے ہیں۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنا رعب قائم کرنے کے لئے ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے والا بھی انگریزی بولنے کی کوشش کرتا ہے، بھلے ہی وہ انگریزی لنگڑی ہی کیوں نہ، ٹھیک وہی بات کرانی کے ساتھ ہے۔ کام کرے گا کرانی کا لیکن خود کو کلرک بتائے گا اور کلرک میں جنس کا بھی کوئی جھنجھٹ نہیں ہوتا ہے۔ ایک ہی دفتر میں مذکر اور مونث دونوں کام کرتے ہیں۔ اگر اردو یا ہندی کا چکر چلایا جائے تو کام میں ہلکی سی رکاوٹ پیدا ہوجائے گی۔

آج کے دور میں نوکری پانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس لئے آج کے ہر فرہاد کے لئے شیریں کے والدین کا یہ فرمان ہے کہ پہلے نوکری ڈھونڈیئے پھر ہماری بیٹی سے عشق لڑایئے۔ نہیں حاکم تو کم سے کم کلرک ہی سہی۔ اس سے نیچے نہیں ورنہ ہمارے خاندان میں داغ لگ جائے گا۔ سرکاری کلرک کو اولیت دی جائے گی اور جیسے فرہاد کو نوکری مل جاتی ہے بجائے شیریں کے والدین کی لاٹری نکل آتی ہے۔ شیریں کے والدین خود شیریں کا پیغام لیکر فرہاد کے در پر پہنچنا شروع کردیتے ہیں۔ ایک شیریں کے والد جیسے ہی فرہاد کا در چھوڑتے ہیں دوسری شیریں کے والد اپنا ڈیرہ وہاں ڈال دیتے ہیں۔ جس دن مجھے کلرک کی نوکری ملی اس دن بہت سارے میرے ملنے والے مجھے مبارک باد دینے آئے اور مبارک باد کی قیمت جاتے جاتے بسکٹ کی شکل میں وصول کر کے گئے۔ جن رشتہ داروں کو میں پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا بالکل کاہل اور کام چور ہے۔ دن بھر نوکری ڈھونڈنے کے بہانے آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ انٹرویو میں جانے کے بہانے اپنے باپ سے پیسہ ٹھگ کرلے جاتا ہے اور سگریٹ پان میں اڑا دیتا ہے، کہنے والے آج وہی میری مدح خوانی میں آگے آگے ہیں۔ "ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ اس لڑکے کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہم اس کے لئے برابر دعا کرتے تھے۔ اللہ نے ہماری سن لی۔ اسے اس کی محنت کا پھل مل ہی گیا"۔ کچھ لوگ یہ سراغ لگانے میں لگ گئے کہ "اس نکمو کو کیسے نوکری ملی۔ کتنا پیسہ دینا پڑا۔ کس نے پیروی کی، اسے آتا جاتا تو کچھ نہیں ہے پھر نوکری ملی کیسے"۔

جو خود کو حق اور پرہیز گار گردانتے ہیں۔ وہ اکثر کہتے نظر آتے ہیں کہ "کلرک کے گھر کا کھانا نہیں کھانا چاہئے۔ یہ اپنی تنخواہ کا

پیسہ تو بینک میں جمع کرتے ہیں اور اوپری آمدنی سے سارا کام چلاتے ہیں، پتہ نہیں یہ کھانا کس مصیبت زدہ کے پیسے کا ہو"۔
غرض کہ کلرک کے بارے میں اکثر لوگوں کی رائے غلط فہمی کے بناء پر ہی قائم ہوتی ہے۔ ان کی نظر میں کلرک کی اوپری آمدنی اس کی تنخواہ سے زیادہ ہوتی ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کس دفتر کا کلرک ہے اور اس کے ذمہ باس نے کون کون سے کام سونپے ہیں۔ بس کلرک ہے تو باہری آمدنی ہوگی ہی۔
کلرک دراصل عوام اور حکومت کے بیچ ایک پل کا نام ہے۔ کسی دفتر میں عوام کا غصہ پہلے کلرک کو ہی سنا پڑتا ہے۔ پھر چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب کی باری آتی ہے۔ صاحب تو یہ کہہ کر جان چھڑالیتے ہیں "۔ ہم کیا کریں ہمارے سامنے کلرک نے آپ کا فائل رکھا ہی نہیں"۔ صاحبوں کے سر بدنامی نہ آجائے اس لئے وہ آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ فوراً سسپنڈ کردیتے ہیں۔ یہ عبرت کا مقام ہے کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ حالانکہ صاحب بہادر کلرکوں سے اپنا کمیشن وصول کرنے میں کوئی مروت نہیں فرماتے ہیں۔ لیکن جہاں اپنے سر پر الزام نظر آتا ہے، فوراً اس کا رخ کلرک کی طرف کردیتے ہیں اور لوگ بھی ان کی باتوں کو سچ مان لیتے ہیں کیوں کہ رابطہ تو ڈائرکٹ کلرک سے ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ فوراً مان لیتے ہیں کہ کلرک نے صاحب کو حصہ نہیں دیا ہے، اسی لئے کام نہیں ہوا۔ بیچارہ کلرک زمین کی طرح برابر گردش میں رہتا ہے۔ صاحب کی کرسی سے اپنی کرسی کی طرف دوڑتا رہتا ہے اور جب وہ گھر آتا ہے تو اہلیہ اور بچوں کی فرمائشوں کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ گھر میں بیگم کی جھڑکی اور دفتر میں باس کی جھڑکی سنتا ہے۔
آزاد ملک میں بھی وہ غلامی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی لوگ سب سے پہلے انگلی کلرک کی طرف اٹھاتے ہیں اور بعد میں اس کا رخ صاحب کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ سردی ہو، کھانسی ہو، بخار ہو، لیکن اسے آرام نہیں ہے۔ بس کام ہی کام ہے۔ ایک طرف صاحب ہیں تو دوسری طرف چپراسی ہے۔ پھر بھی پورا مال کھانے کا الزام اس کے ہی سر جاتا ہے۔ اگر صاحب شمشیر آبدار ہیں تو بیچارہ کلرک خالی نیام ہے۔ کلرک کے ساتھ ایک اور بدقسمتی ہے کہ ہزار کوششوں کے باوجود وہ سماج میں وی۔ آئی۔ پی والا مقام نہیں پاسکتا ہے۔ "یہ تو کلرک اور ہم سے الجھ رہا ہے۔ آج ہی اس کے خلاف درخواست لکھ کر سسپنڈ کرواتا ہوں، سارا اکڑپن دور ہو جائے گا"۔
کلرک لاکھ اچھا کھائے، عالی شان مکان بنوائے، بچوں کو مہنگے اسکول میں پڑھائے مگر وہ سماج میں وی آئی پی کی جگہ نہیں پاسکتا۔ کسی بھی پارٹی میں آگے والی کرسی پر صاحب ہی بیٹھیں گے اور کلرک موصوف کی جگہ پیچھے ہوگی۔ کلرک کو سماج میں کسی پل چین نہیں ہے۔ اگر وہ اچھا کھاتا پیتا ہے تو فوراً یہ آواز اٹھنے لگے گی کہ آج کل اوپری آمدنی خوب ہو رہی ہے اگر بیچارہ ہاتھ روک کر خرچ کرتا ہے تو فوراً اس پر کنجوسی کرنے کا الزام لگ جاتا ہے۔
کلرک عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کی خوب چلتی ہے۔ دوسرے خود چلتے ہیں اور تیسرے، نہ ان کی چلتی ہے اور نہ خود چلتے ہی ہیں۔ جہاں ہیں وہیں پڑے ہوئے ہیں جو لوگ ان تینوں کے فرق کو سمجھتے ہیں، ان کا سلوک ان تینوں سے الگ ہوتا ہے۔ لیکن جو اس فرق کو نہیں سمجھ پاتے، وہ تینوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ جس کی خوب چلتی ہے۔ اس کے پاس جانے کے لئے عوام کو پہلے اپنی جیب ٹٹولنی پڑتی ہے۔ جو دستور بنا ہے اسے تو دفتر میں نبھانا ہی پڑے گا۔ جس کلرک کے پاس دستوری کا دستور نہیں ہوتا ایسے کلرک دال میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ ایسے کلرک بھیڑ میں رہ کر بھی اکیلے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے صاحب کے پاس ان کی پوچھ نہیں ہوتی۔ دفتر میں ایسا فائل انہیں دیا جاتا ہے جس کا تعلق عوام سے نا کے برابر ہوتا ہے۔ ایسے کلرک کو چپراسی تک سلام کرنے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں اور جن کے پاس پبلک فائل زیادہ تعداد میں موجود ہوں ان کا وقت دفتر میں کم اور بل

کے چائے خانہ میں زیادہ گزرتا ہے ۔ جب کام چائے خانہ میں ہی نپٹ جائے تو خواہ مخواہ دفتر میں بھیڑ لگانے کی کیا ضرورت ہے ۔ نیم سرکاری دفتر کے کلرک کی بالکل نہیں چلتی، کیوں کہ انکا تعلق عوام سے بہت کم ہوتا ہے ۔ بیچارے وقت پر دفتر جاتے اور آتے ہیں اور سوکھا سوکھی تنخواہ سے اپنا کام چلاتے ہیں ۔ جو غیر سرکاری کلرک ہوتے ہیں وہ بیچارے تو خود چلتے ہیں کبھی آدھی تنخواہ ملتی ہے تو کبھی تنخواہ کے لئے دو دو ماہ اور کبھی تین ماہ تک انتظار کرنا ہوتا ہے ۔ بندھوا مزدور اور غیر سرکاری کلرک میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ۔ ایک طرح سے ایسی نوکری عبرت کا مقام ہے ۔ روز مالک کی جھڑکی سننی پڑتی ہے ۔ کولہو کے بیل کی طرح صبح شام ایک ہی دائرے میں دوڑنا ہوتا ہے ۔ مالک کے بچوں کو ٹیوشن بھی فری میں پڑھانا پڑتا ہے ۔ بازار سے ان کا سامان لانا پڑتا ہے ۔ بس اسی الزام سے وہ بری رہتا ہے کہ کمیں کام نہیں کررہا ہے ۔

توجناب عالی، آپ سے التجا ہے کہ ہر کلرک کو ایک ہی لاٹھی سے مت ہانکئے ۔ پہلے جانچ پڑتال کرلیجئے ، پھر ان پر انگلی اٹھائیے ۔ جو جیسا ہو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیجئے ۔ کسی کو رشک بھری نظروں سے دیکھئے تو کسی کلرک کے لئے دعا بھی کیجئے ۔ کسی کلرک کی بیٹی کی شادی میں بھرپور مدد کیجئے تو کسی کلرک کو چھوٹ بھی دیجئے ۔ جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں اسی طرح سبھی کلرکوں کی جیبیں بھاری نہیں ہوتی ہیں ۔ ☆

یا

ایک دعوت میں اسرار الحق مجاز کی نقل و حرکت کو صاحب خانہ کا کمسن لیکن خاصا صحت مند بیٹا مسلسل کئی منٹوں تک ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کے بعد جب گنگنانے لگا تو کسی نے مجاز سے کہا :

"مجاز صاحب ! یہ بچہ بڑا ہو کر یا تو شاعر بنے گا یا"

"یا سردار جعفری"

مجاز نے کمال متانت سے اسی سانس میں جملہ پورا کردیا ۔

●☆●

خوش قسمتی

جوش نے مجاز سے پوچھا :

"مجاز ! کیا تمہارے والدین تمہاری رندانہ بداعتدالیوں سے پریشان نہیں ہوتے ؟"

"لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے جوش صاحب !"

مجاز نے جواب دیا ۔

"لیکن خوش قسمتی سے میرے والدین بے حد سعادت مند ہیں" ۔

●☆●

ڈاکٹر محبوب راہی

جھوٹ کی ہوتی ہے بہتات سیاست میں سچائی کھاتی ہے مات سیاست میں
دن ہوتا ہے اکثر رات سیاست میں گونگے کرلیتے ہیں بات سیاست میں
اور ہی ہوتے ہیں حالات سیاست میں
جائز ہوتی ہے ہر بات سیاست میں

سبھی اصولوں والے آدرشوں والے جوشیلے اور جذباتی نعروں والے
مردانہ تیور والی مونچھوں والے سچائی کے بڑے بڑے دعووں والے
بک جاتے ہیں راتوں رات سیاست میں
جائز ہوتی ہے ہر بات سیاست میں

دیئے تیل بن جگ مگ جگ مگ جلتے ہیں سوکھے پیڑ بھی بے موسم ہی پھلتے ہیں
کھوٹے سکے کھرے دام میں چلتے ہیں لنگڑے لولے بھی بلیوں اچھلتے ہیں
لمبے ہوجاتے ہیں ہاتھ سیاست میں
جائز ہوتی ہے ہر بات سیاست میں

ووٹوں کے گل جب کرسی پر مہکیں گے نوٹوں کے بلبل ہر جانب چہکیں گے
برف کے تودے انگاروں پر دہکیں گے خالی پیمانے جھومیں گے بہکیں گے
ہوگی بن بادل برسات سیاست میں
جائز ہوتی ہے ہر بات سیاست میں

انساں کہنا پڑتا ہے شیطانوں کو دانا کہنا پڑتا ہے نادانوں کو
خواہشات کو ۔ خوابوں کو ارمانوں کو روکنا پڑتا ہے امڈے طوفانوں کو
کام نہیں آتے جذبات سیاست میں
جائز ہوتی ہے ہر بات سیاست میں

جتنے رہزن ہیں رہبر ہوجاتے ہیں پس منظر سارے منظر ہوجاتے ہیں
پیر ہیں جتنے بھی وہ سر ہوجاتے ہیں بونے سارے قد آور ہوجاتے ہیں
بڑھتے ہیں سب کے درجات سیاست میں
جائز ہوتی ہے ہر بات سیاست میں

جب حالات کی تلخی سے گھبرا جاؤں خوشحالی کی منزل میں بھی پاجاؤں
راہ صداقت سے میں بھی کترا جاؤں جی کرتا ہے راہی میں بھی آجاؤں
ہار کے سچائی کو مات سیاست میں
جائز ہوتی ہے ہر بات سیاست میں

سگ لیلیٰ (چودہویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی
(حال مقیم شکاگو)

رودادِ سگِ جاناں

ڈاکٹر ڈی۔ ڈی کتا والا کا "کتا چھاپ" قہقہہ اگرچہ طویل بحر میں تھا لیکن بحر جاہے بحر طویل ہو یا بحر مختصر، کہیں نہ کہیں ختم ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا طویل قہقہہ ہمارے اعصاب کے ساتھ بالجبر سلوک کرنے کے بعد اپنے آپ تھم گیا اور وہ اچانک گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے: "غیر متعلقہ باتیں بہت ہو چکیں۔ اب ذرا کام کی بات ہو جائے۔ جھٹ پٹ اپنا پرابلم بتاؤ؟"۔

ہم نے جواب میں پہلے تو کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر غیر شعوری طور پر ادھر ادھر محتاط نظروں سے دیکھا ہمارے محتاط رویے سے ڈاکٹر صاحب نے یقیناً اصلیت بھانپ لی تھی چنانچہ ٹھوس لہجے میں بولے: "بے جھجک اپنا مسئلہ بیان کرو۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں ہے مسز فنی مال پانی اپنے ہنی ڈارلنگ کے ساتھ کب کی جا چکی"۔

اس اطلاع نے ظاہر ہے ماحول کو خاصا خوشگوار اور بے تکلف بنا دیا تھا ہم لاشعوری طور پر دراصل ایسی تنہائی چاہتے تھے جس میں نہ کوئی مخل ہو اور نہ ہماری روداد سن کر ہنسی اڑائے۔ رہے۔ ڈاکٹر صاحب تو ان کا درجہ فی الحال ہماری نظر میں وہی تھا جو ایک حاملہ کی نظر میں "دایہ" کا ہوتا ہے۔ پھر وہ کہاوت بھی تو ہے کہ پیٹ سب سے چھپایا جا سکتا ہے لیکن دایہ سے نہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو اپنی طرف پوری طرح متوجہ پاکر ہم نے اصلیت پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا: "ڈاکٹر صاحب زندگی کے سفر میں یوں تو کئی موڑ آئے اور ہر موڑ پر کئی حسین چہرے ٹکرائے لیکن کسی میں وہ بات نظر نہیں آئی کہ دل بے اختیار ہو کر کسی سے ہمسفر بننے کی درخواست کرتا۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پچھلے دنوں ایک سونے سے موڑ پر اچانک ایک حسن کا پیکر پتہ نہیں کدھر سے نمودار ہوا اور نمودار ہوتے ہی مسکرایا، پھر دل کو اس قدر بھایا، ہستی پر اس قدر چھایا کہ دل کو ایک نئے انداز سے دھڑکنا آگیا.... لیکن افسوس محبت کا یہ چاند پوری طرح جگمگا بھی نہ پایا تھا کہ اسے ایک بھونکتے ہوئے گہن نے اپنی لپیٹ میں لے لیا"۔

"بھونکتے ہوئے گہن نے! مطلب؟" ڈاکٹر صاحب نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

ہم نے وضاحت کی: "بھونکتے ہوئے گہن سے میری مراد، محبوبہ کے کتے سے ہے۔ آج آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے میں یقیناً شرم اور خفت کے دلدل میں گلے گلے دھنس رہا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ دراصل بچپن ہی سے کتوں سے میری روح فنا ہوتی ہے۔ ایک حقیر سا کتے کا پلہ تک میری روح بڑی آسانی سے قبض کر لیتا ہے۔ اور میری محبوبہ کا کتا کیا عرض کروں واحد ہو کر "جمع" نظر آتا ہے بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے میری نظر میں یہ کتا پہلا کتا ہے جو اپنی ذات میں انجمن ہے۔ حالانکہ پوری پانچ منزل کی بلندی سے دوربین کے ذریعے اس کی صرف ایک ہی جھلک دیکھی ہے لیکن اس ایک ہی جھلک نے میرا یہ حال کیا کہ عالم نیند ہو یا عالم بیداری ہر دم اسی کا خونخوار سراپا نظر آتا ہے۔ کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب اس وقت میں ایک عجیب دوراہے پر کھڑا ہوں نہ اپنی محبوبہ کی طرف پیش قدمی کر سکتا ہوں نہ "ریورس گیر" میں واپس لوٹ سکتا ہوں"۔

اتنا کہہ کر ہم سانس لینے کے لئے پل بھر کو رکے اور پھر دوبارہ اپنی داستان الم بیان کرنے لگے۔ "کبھی کبھی تو ڈاکٹر صاحب جی

چاہتا ہے اپنے اس رقیب روسیاہ کو گولی سے اڑا دوں، لیکن پھر یہ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں کہ اس طرح میرے محبوب کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب خدارا میری مدد فرمائیں، آپ اگر چاہیں تو محبوبہ کے کتے سے میری دوستی کروا سکتے ہیں، پلیز "۔

مجھے وہ آرٹ سکھلا دیجئے جس کے ذریعے خونخوار اور بھیانک کتے بھی زیر ہو کر انسان کے قدموں میں "لوٹن کبوتر" کی طرح لوٹنے لگ جاتے ہیں!!!"۔

ہماری زبانی روداد سگ جاناں سن کر ڈاکٹر صاحب کو چپ لگ گئی اور کافی دیر تک لگی رہی، ہو سکتا ہے جسے ہم چپ سمجھ رہے ہوں وہ وقفہ غور و فکر ہو یعنی اس وقفہ کے دوران ڈاکٹر صاحب ہمارے اس گمبھیر مسئلہ کا کوئی حل، کوئی توڑ، کوئی تیر بہدف علاج سوچ رہے ہوں۔ اس خیال نے ہماری آس کی قدر کو اور بھی مضبوط کر دیا، ہم پر امید نظروں سے ان کی طرف دیکھتے رہے، موصوف کچھ ہی دیر میں مراقبہ سے بیدار ہوئے اور بڑی ہی گمبھیرتا سے بولے :

"تمہاری روداد، "سکسائٹنگ" **Sexciting** بھی ہے اور پر درد بھی ... آج مجھے بھی یہ اعتراف کر لینے دو کہ پچھلے پچیس برس سے اس پیشے سے وابستہ ہوں، اس میدان میں پراکٹس کر رہا ہوں لیکن آج تک میرے پاس ایسا عجیب و غریب کتا نہیں آیا!!" ہم نے بڑبڑا کر مداخلت کی کتا... یہ آپ کیا فرما رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر صاحب نے فوراً تصحیح کرتے ہوئے کہا: "معاف کرنا تمہاری الم ناک داستان نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ کچھ کا کچھ کہہ گیا" اصل میں، میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ ایسا عجیب و غریب کیس آج تک میرے پاس نہیں آیا!!"۔ بات ختم کرتے کرتے ڈاکٹر صاحب کے لہجے سے ہلکی ہلکی مایوسی جھلکنے لگی تھی گویا امید کی جو کرن بڑی مشکل سے ہمیں نظر آئی تھی وہ بھی ٹمٹمانے لگی تھی بالفاظ دیگر چوپائے اور دو پائے کی ریس میں کتا جیت رہا تھا، انسان ہار رہا تھا، حشرات الارض کا نمائندہ، اشرف المخلوقات کی عزت کو روندتا ہوا، وقار کو کچلتا ہوا آگے بڑھا جا رہا تھا اور اپنی شکست اور ہزیمت کو محسوس کر کے ہمارا دل مایوسی اور ناکامی کے دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا!!"۔

مایوسیوں اور ناکامیوں کے اندھیرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غرق ہونے سے پہلے ہم نے ڈاکٹر ڈی ڈی کتا والا سے رقت آمیز لہجے میں کہا: "اگر مسیحا ہی مایوس ہو جائے تو پھر بیمار کیا کرے؟ کہاں جائے؟ ڈاکٹر صاحب اگر میں آپ کے پاس سے ناکام لوٹ گیا تو پھر سوائے خودکشی کے میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں!!"۔

بات ختم کرتے کرتے ہمارا گلا بھر آیا جس سے ڈاکٹر صاحب یقیناً بے حد متاثر ہوئے تھے چنانچہ ڈھارس بندھانے والے لہجے میں بولے : "نہ تو میں مایوس ہوا ہوں اور نہ تمہیں خودکشی کرنے دوں گا، البتہ تمہارا مسئلہ ذرا سیریس ہے۔ اس لئے کوئی صلاح مشورہ دینے سے قبل تمہاری محبوبہ کے محبوب، میرا مطلب ہے کتے کو ایک نظر دیکھنا ضرور چاہوں گا، تم کسی طرح کسی بہانے اسے یہاں لا سکتے ہو؟"

موصوف کی یہ فرمائش ایسی تھی جسے ہم کیا، ہمارے فرشتے بھی پوری نہیں کر سکتے تھے، لہذا گھگھیاتے ہوئے لہجے میں عرض کیا : "ڈاکٹر صاحب آپ اگر حکم دیں تو میں بغیر تیشے کے پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر آپ کی ڈسپنسری میں بہا لاؤں، دس دفعہ ہمالہ کی بلندی سر کر کے دکھا دوں، لیکن محبوبہ کے کتے کو آپ کی ڈسپنسری تک لانا تو ایک طرف، اس کی مشکیں کسی ہوئی ہوں، اس کے چاروں پیر فولادی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں اور وہ زنجیریں میخوں کے ذریعہ زمین میں کئی گز گہرائی میں گڑی ہوئی ہوں تب بھی میں اس ناہنجار خونخوار کا سامنا نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ زنجیر تمام کر اس آفت کے پرکالے کو آپ کے روبرو پیش کرنا"۔

ہم نے لرزتے ہوئے اپنی کانپتی لڑکھڑاتی زبان سے اپنی تمام کمزوریوں کا اعتراف کر ڈالا۔ خیر! اتنا نروس ہونے کی ضرورت

نہیں"۔ موصوف نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"پھر سوالیہ انداز میں آگے پوچھا: "کم از کم اتنا تو بتاسکتے ہو کہ وہ تمہارا رقیب روسیاہ کتا ہے یا کتیا؟"

ہم نے فوراً کہا: "ڈاکٹر صاحب میں یہ بات عرض کرچکا ہوں کہ اس نابکار کو میں نے کوئی پانچ منزل کی بلندی سے دوربین کے ذریعہ دیکھا تھا وہ بھی چند لمحوں کے لئے اور اس لمحاتی جھلک کی بنیاد پر یہ بتانا کہ وہ کتا ہے یا کتیا میرے لئے ناممکن ہے !!

ہمارے اس مایوس کن جواب پر ڈاکٹر صاحب بڑبڑاتے ہوئے بولے: " نہ تم اس نامعقول کی جنس پر روشنی ڈال سکتے ہو اور نہ ہی اسے یہاں لاسکتے ہو۔ خیر کوئی بات نہیں اگر پیاسا کنویں تک نہیں آسکتا تو کنواں تو پیاسے تک جاسکتا ہے۔ تم مجھے اس نامعقول تک پہنچادو۔"

ہم نے گڑبڑا کر جواب دیا: "میں اس تک پہنچانے کا وعدہ تو نہیں کرتا، ہاں وہ محبوب تک آپ کی رہنمائی ضرور کرسکتا ہوں"

ہمیں مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کا ایک عدد جگنو چمکتا نظر آیا۔

"ٹھیک ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے حتمی لہجے میں کہا۔

"تم اس سلسلے میں میری سیکس ٹری سے یہ معلوم کرو کہ "آؤٹ ڈور وزٹ" پر جانے کے لئے وقت کب کس روز نکل پائے گا؟"

ہم نے سٹپٹا کر کہا: "ڈاکٹر صاحب یہاں میری جان پر بنی ہے اور آپ دنوں ہفتوں کی بات کررہے ہیں۔ اگر آپ آج ہی مجھ پر یہ کرم فرمائیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا، آپ حکم دیں تو میں صبح تک یہیں آپ کے فری ہونے کا انتظار کرلوں گا"

ہماری بات میں یقیناً وزن تھا، نتیجتاً ڈاکٹر صاحب کا پسیجنا یقینی تھا، ستائشی لہجے میں بولے: "تم میں ایک سچے عاشق کی ساری خصوصیات موجود ہیں، بس ایک کتے کے خوف نے تمہاری صلاحیتوں اور خصوصیتوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہے، خیر ایک دن میں تمہارے اس خوف کا قلع قمع کر کے چھوڑوں گا!!"۔

ہماری گفتگو یہیں تک پہنچ پائی تھی کہ انٹر کوم کی گھنٹی بجی، موصوف نے ریسور اٹھا کر غالباً سیکس ٹری سے بات کی، ہم سمجھ گئے، سی ایم کا گنجوٹ پی اے باریابی کا منتظر تھا۔

ڈاکٹر موصوف ریسور واپس رکھ کر گھڑی دیکھتے ہوئے بولے: "تمہارے دلچسپ کیس نے میرے قیمتی پندرہ منٹ زائد لے لئے اب تم فوراً میری سیکس ٹری سے مل کر فیس ادا کرو اور ساتھ ہی آؤٹ ڈور وزٹ کے لئے وقت حاصل کرنے کی کوشش کرو، مجھے یقین ہے تم آج ہی کا کوئی نہ کوئی وقت ضرور حاصل کرلوگے۔ میری سیکس ٹری، تم پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے!!"۔

اب پھر ہمارے شرمانے کی باری تھی۔ اور ہمارے شرمانے پر موصوف نے ایکبار پھر اپنا کتا چھاپ قہقہہ ہماری طرف اچھال دیا اور ہم بدک کر باہر کی طرف اس طرح بھاگے جیسے دم مروڑنے پر بیل بھاگتا ہے۔ اور اس بھاگم بھاگ میں بقول غالب وہ آتا تھا کہ ہم نکلے والا معاملہ پیش آیا یعنی باہر نکلتے ہی سی ایم کے پی اے سے ٹکرا گئے۔ سیکس ٹری نے اسے گنجوٹ کا جو خطاب عطا فرمایا تھا وہ بالکل درست تھا، نہ صرف اس کا سر بلکہ چہرہ بھی انڈے کے چھلکے کی طرف صاف تھا بلکہ اس چکنے پتھر کی طرح چمکتا نظر آیا جیسے تیل میں ڈبو کر نکالا گیا ہو۔ اگرچہ چند ثانیوں کے لئے ہی اس کا ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا لیکن اس مختصر وقفے کے دوران میں اس نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ مانا کہ اس کے وقت میں سے چند منٹ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں ضرور دے دئے تھے اور اس کے لئے اسے ڈاکٹر صاحب سے شکایت کرنی چاہئے تھی لیکن ایک تو سی ایم کا پی اے تھا دوسرے جس سرکاری کرسی پر بیٹھا تھا اس کی بھی گرمی تھی۔ (جاری) ۔۔ ☆

کوثر صدیقی
زیب ولا، کھوری مین روڈ، بھوپال

غزل

آٹا نہیں میسر ، روٹی چلی پکانے
گھر میں نہیں ہیں دانے، اماں چلی بھنانے

اپنا الگ ہے چولھا، ان کی الگ ہے روٹی
کھانا تو مل کے کھالیں، آؤ کسی بہانے

مردہ بنا پڑا ہوں میں اپنی جھونپڑی میں
آتا ہے کون دیکھو ارتھی مری اٹھانے

اک چاند آگے آگے اک چاند پیچھے پیچھے
پونم کی رات گوری گھر سے چلی نہانے

گھر کو جلا کے ان کے نل پر میں دوڑتا ہوں
ہوجائیں ان کے درشن شاید اسی بہانے

اک پیسے کے خوش خوش چل دیتا تھا بھکاری
یاد آرہے ہیں مجھ کو انگریز کے زمانے

تجھ کو ترے خدا نے کیوں لکھ پتی بنایا
مفلس ہی کیوں بنایا مجھ کو مرے خدا نے

دیکھا نہیں جنھوں نے بھٹیار خانہ کوثر
وہ جارہے ہیں دلی کھچڑی الگ پکانے

منہ پھٹ ناگپوری

کھائے روٹی ماش تو کیا کیجئے
قوم ہے قلاش تو کیا کیجئے

ہم نے تو بارش کی مانگی تھی دعا
پھٹ پڑا آکاش تو کیا کیجئے

ہوگیا باوا کے بیسوا لاڈ سے
چھوکرا اوباش تو کیا کیجئے

بوڑھے بوڑھے چوری چوری رات دن
کھیلتے ہیں تاش تو کیا کیجئے

بانٹتا پھرتا ہوا چاروں طرف
حسن ہے گلپاش تو کیا کیجئے

اس کے چہرے سے نحوست ہے عیاں
نام ہے پرکاش تو کیا کیجئے

آج منہ پھٹ بن گیا ہے آدمی
چلتی پھرتی لاش تو کیا کیجئے

●☆●

ڈاکٹر ہادی منزہ، نرمل

ابھی باقی ہے

اختلافات کی بھرمار ابھی باقی ہے
روز اک دوجے پہ پھٹکار ابھی باقی ہے

کل تلک باقی رہے گی یہ نہیں کہہ سکتا
ہر لٹکتی ہوئی سرکار ابھی باقی ہے

مسئلہ حل ہوا کچھ لوگ سمجھتے ہیں مگر
کاویری کا بڑا مجدھار ابھی باقی ہے

کب تلک خیر منائیگی حکومت ان کی
اپنے لوگوں کی ہی یلغار ابھی باقی ہے

سب کی تلواریں سدا میان سے باہر ہونگی
خوں اگلتا ہوا اخبار ابھی باقی ہے

روٹی کے ساتھ یہاں پیاز بھی کھانا مشکل
جو حکومت یہاں بے کار ابھی باقی ہے

انگلیاں شک کی اٹھیں سب پہ منزہ لیکن
حاکمِ وقت کا کردار ابھی باقی ہے

☆●☆

نسیمہ تراب الحسن
حیدرآباد

باتیں ـــــ ہلکی پھلکی

یوں تو عقل جانوروں میں بھی رہتی ہے لیکن بات سنکر اسکا تاثر ظاہر کرنا صرف انسان کے حصے میں آیا ہے۔ چنانچہ خوشی، لطف اندوزی کا اظہار، طنز اور تلخ جذبات کا عکس انسان کے چہرے پر عیاں ہوجاتا ہے اسی لئے چہرے کو دل کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک فطری ردعمل ہوتا ہے اگر کسی کا چہرہ ایسا کرنے سے قاصر ہے تو پریشانی کی بات ہے۔ ایکبار بس میں سفر کرتے ہوئے میری نظر ساتھ بیٹھی عورت پر پڑی جو ایک کتاب انتہائی سنجیدگی سے پڑھ رہی تھی۔ میں نے جب نوٹ کیا کہ وہ کتاب ایک ہزار لطیفوں پر مشتمل ہے تو حیرت سے اسکو تکنے لگی کہ اتنے لطیفے پڑھنے کے باوجود ہنسنا تو چھوڑیئے ہلکی مسکراہٹ بھی اسکے لبوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ ضرور اس میں پٹے لطیف کی کمی ہے۔

ہنسی یا مسکراہٹ کسی کے کہنے سے نہیں خود بخود کسی بات پر دل کی کلی کھلنے سے آجاتی ہے۔ ذرا مسکرائیے کی فرمائش پر جو مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلتی ہے وہ اتفاقا اچھی معلوم ہوتی ہے ورنہ بڑی پھیکی رہتی ہے اسکی مثال ہم فوٹو گرافر کے اسمائیل پلیز کہنے سے دیکھتے ہیں یعنی جور و جبر سے لائی جانے والی مسکراہٹ وہنسی اور بے ساختہ ہنسی یا مسکراہٹ میں زمین آسمان کا فرق رہتا ہے میں آپکو زبردستی ہنسنے پر مجبور نہیں کرسکتی اس لئے کچھ ایسے قصے سناؤں گی جس پر آپ بے اختیار ہنس پڑیں۔ اسمیں کچھ خود مجھ پر گزرے واقعات بھی ہیں، کچھ دوست احباب کی باتیں بھی اور کچھ لطیفے بھی۔

ایک دفعہ میں نے ایک نئی ساڑی پہنی۔ میرے شوہر آفس جاچکے تھے جب میں سڑک پر جارہی تھی تو اتفاق سے شوہر صاحب آفس کی موٹر میں قریب سے گذرے۔ ڈرائیور نے بریک لگایا۔

صاحب نے پوچھا: "کیا ہوا"

وہ بولا: "بیگم صاحب ہیں"

صاحب نے جواب دیا: "نہیں انکے پاس ایسی ساڑی نہیں چلو"۔

شام کو گھر پر مجھے اسی ساڑی میں دیکھ کر کہنے لگے آپ نے کس کی ساڑی پہن لی۔ میں نے آپکو پہچانا ہی نہیں۔

میرے شوہر بے حد معصوم مزاج کے ہیں۔ انھیں ہمیشہ واکنگ ریس میں انعام ملتا رہا اور میں آہستہ خرامی سے چلنے کی عادی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ہم دونوں واک کرتے ہوئے آرہے تھے وہ اپنی رفتار سے آگے نکل گئے کچھ دیر بعد واپس لوٹے اور کہنے لگے آپ نے آج جوتے کھلوادیے تھے۔ میں چلتا ہوا کسی اور صاحبہ کے ساتھ باتیں کرنے لگا اور پھر دیکھا تو آپ غائب۔ کمال ہے آپ اتنا آہستہ چلتی ہیں۔

●☆●

میری بھابی اپنی بہن کے بچوں کی تعریف میں کہنے لگیں: "ایسے اچھے بچے ہیں جہاں بٹھاؤ بیٹھے رہتے ہیں"۔
میرے میرے بھائی نے بے ساختہ کہا: "بچے نہ ہوئے گاؤ تکیے ہوگئے"۔ اور بھابی کچھ جواب نہ دے سکیں۔

●☆●

ہم نے نیا آوَن خریدا ۔ تو دیور ، دیورانی سے کہا آیئے اسکا Inauguration ہے ۔ دیور نے کہا پہلے آپ Inauguration کی Spelling تو کیجئے ۔ میں نے کہا آپ کیا کریں گے انکا جواب تھا " Correction " ۔ ہم سب ہنسنے لگے ۔

●☆●

میری آواز اچھی نہیں لیکن گانے کی خواہش تو ہوتی ہی ہے ۔ ایک بار رات کا وقت تھا تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رہے ہوں گے ۔ گرمی کا زمانہ تھا ۔

میرے بھائی نے کہا : " ذرا پلنگ صحن میں پکڑوا دو ۔ "

میں گنگناتے ہوئے پلنگ اٹھانے لگی ۔ انھوں نے کہا اب گانا رہنے بھی دو سب دھوبی سو چکے ہیں ۔

میں نے کہا : " کیا ہوا بھائی جان گدھے تو جاگ رہے ہیں " ۔ انھوں نے زور دار قہقہہ لگایا ۔

●☆●

کسی ٹیچر نے اپنے شاگرد کی رپوٹ میں لکھا " آپکا لڑکا ذہین تو ہے مگر باتونی بھی بہت ہے " لڑکے کے والد ٹیچر سے ملنے آئے اور کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کی ماں سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی ورنہ آپ اسکے باتونی ہونے کی شکایت کبھی نہ کرتیں ۔

●☆●

میرا بچہ سات آٹھ سال کا ہوگا تب ایک دن کھانا پکاتے ہوئے مجھے کو تمیر کی ضرورت پیش آئی ۔ میں نے بچے سے کہا ذرا اوپر جاکر چاچی کے پاس سے مانگ لاؤ ۔ وہ جاکر لے آیا ۔ کچھ دیر کے بعد خیال آیا کہ سیاہ زیرہ بھی نہیں ۔ میں نے پھر بیٹے سے کہا چاچی سے مانگ لاؤ ۔ بچارا گیا اور بتایا کہ انکے پاس بھی نہیں زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ مجھے پان کی طلب ہوئی ۔ پتہ چلا کہ پان خراب ہوگئے ہیں ۔

ممتا کی محبت بھری آواز سے بچہ سے کہا کہ بیٹا چاچی .... اتنا ہی کہا تھا کہ بیٹے نے کہا : " ممی آپ ہر چیز لمنگنے کے لئے مجھے ہی بھیج رہی ہیں ۔ مجھے مانگنے کی عادت پڑجائے گی ۔ "

دو چار قصے اور سناؤں گی ۔ ایسی باتیں جو روزمرہ ہماری آپکی زندگی میں ہوتی رہتی ہیں اور جنھیں بعد میں بھی یاد کرکے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے ۔ ایک دن ہمارے پوتے نے جسکی عمر ساڑھے تین سال کی ہے ۔ ماں باپ کے ساتھ گھومنے جانے پر ہمارے ساتھ رہنے کو ترجیح دی ۔ دادا ، دادی خوشی سے پھولے نہ سمائے اور اسکو لیکر نکلے ۔ کھلونوں کی دوکان کے پاس پہنچکر دادا نے پوچھا : " تمہیں کیا چاہیئے ؟ "

اس نے کہا : " ایک کار خرید لیں گے " ۔ اندر پہنچے تو انھوں نے ایک کے بجائے دو الگ الگ رنگ کی Van لینے کی فرمائش کی میں نے بہت سمجھایا کہ ایک ہی گاڑی کے بجائے دوسری لو لیکن بال ہٹ کے آگے تو راجہ بھی جھک جاتا ہے ۔

واپسی گھر کے راستے میں وہ کہنے لگا : " میں نے دو ایک طرح کی کاریں کیوں لی ہیں ، دادی تم کو معلوم ؟ چھوٹا بھیا لڑکر میری چھین لیتا ہے تو ایک اسکو دے دونگا ۔ ہم دل میں خوش ہوئے کہ کیا سمجھدار ہے بات ٹھیک تھی ۔

دوسرے دن وہ پھر ماں باپ سے بولا " میں دادا ، دادی کے پاس رہونگا " انھوں نے بہت پھسلایا مگر ناکام اسکو چھوڑ کر چلے گئے ۔ ان کے جانے کے بعد وہ میرے پاس آیا اور انتہائی معصومیت سے کہنے لگا ۔ دادی کل تم جو گاڑی لے لو بولے تھے نا میں نے دوسری لی آج وہ تمھاری پسند کی خرید لیں گے ٹھیک ہے نا !

●☆●

ہمارے جیٹھ کا گھر قریب ہی ہے۔ کبھی کبھی ہم لوگ صبح کی چائے انکے ساتھ پینے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ ایک صبح پہنچے تو دیکھا کہ فضاء کچھ بوجھل ہے۔ بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ میاں کا مذاق بیوی کو برا لگا۔ جیٹھ اپنی اسمارٹ LOOK برقرار رکھنے میں ہلکان رہتے ہیں اور جیٹھانی دن بدن موٹاپے کی منزلیں طے کرتی جارہی ہیں۔ رات کو محبت سے بیوی نے اپنا ہاتھ میاں کی کمر میں ڈالدیا۔ انکی پسلیاں تڑخنے لگیں۔ انھوں نے بیوی سے پوچھا: "یہ بتاؤ کہ سکرات کا عالم اچھا رہتا ہے یا موت۔ تو جواب ملا: "موت"۔ میاں کہہ اٹھے دوسرا ہاتھ بھی مجھ پر رکھ دو۔

●☆●

ایک ڈاکٹر کے پاس میاں بیوی گئے۔ بیوی کی طبیعت ناساز تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ سے بعد دوا لکھ دی۔ یہ دونوں شکریہ ادا کر کے جانے لگے کہ دروازے کے پاس سے وہ صاحبہ پلٹیں اور ڈاکٹر سے پوچھا کہ گولیاں دودھ سے کھاؤں یا پانی سے۔

ڈاکٹر نے کہا: "جیسا دل چاہے"۔

وہ جاتے جاتے پھر مڑیں اور کہا: "ڈاکٹر صاحب میں پراٹھے کھا سکتی ہوں۔

جواب ملا: "ہاں"۔ وہ جانے لگیں کہ کچھ خیال آگیا ڈاکٹر صاحب بیگن کھا سکتی ہوں؟

ڈاکٹر نے کہا: "جی کھا سکتی ہیں" اب وہ دروازہ کھول کر باہر نکلنے والی تھیں کہ ڈاکٹر نے انھیں مخاطب کیا دیکھئے ایک بات سن لیجئے وہ ڈاکٹر کی میز کے قریب آگئیں۔

ڈاکٹر نے کہا: "آپ زردہ کا پان اور شوہر کی جان مت کھائیے"۔

●☆●

سید طالب حسین زیدی
۱۱-۵-۲۱۶، ظفر باغ
لال ٹیکری، حیدرآباد۔ ۴

جانا ہمارا پاکستان، معیت و مساعدت میں جگندر کی

دیوانوں کی باتوں میں بہت لطف ہے ناصح
ایسی ہی سنا تو بھی خرافات جرے کی

اکانا ہتھیلی میں ایک جنگل، زندہ دلانِ پنجاب کا!

لاہور کے سیر سے فارغ ہوکر اہل خاندان کے ساتھ، ۲ نومبر ۹۸ء کو کانٹی جانے کا پروگرام بنا۔ لاہور سے کوئی دو گھنٹے کا سفر ہے۔ "رائے ونڈ" (جہاں ہر سال انہی دنوں میں تبلیغی جماعت کا بین الاقوامی عظیم الشان اجتماع ہوتا ہے) سے گزرنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ایسا محسوس ہوا جیسے ہماری کار جنگل میں داخل ہو گئی ہے۔ سڑک کے دونوں جانب دور دور تک اونچے اونچے جھاڑوں کے گھنے جھنڈ نظر آرہے تھے۔ ہم نے حیرت سے کہا یہ تو کوئی جنگل معلوم ہوتا ہے۔ جواب ملا "جی! یہ جنگل ہی ہے۔" "چھانگا مانگا" اسی نام کے دو مواضعات کو بے چراغ کر کے اپنی "ضرورت" پوری کرنے کے واسطے اسے آباد کیا گیا ہے۔ راستہ نہایت خوش منظر اور فرحت انگیز تھا۔ ہر تھوڑے فاصلہ پر گیسٹ ہاؤس اور رستوران بھی دکھائی دیئے۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ لاہور والے اور "والیوں" کے جھرمٹ جنگل میں منگل منانے کیلئے بڑی تعداد میں یہاں وہاں نظر آرہے تھے۔ ایک رستوران کے قریب گاڑی روکی گئی۔ تازہ صحت بخش ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیں۔ ایک چوکیدار کو گانٹھ کر اپنا گائیڈ بنایا اور پوچھا، یہ چھانگا مانگا تو سینکڑوں میلوں میں پھیلی ہوئی سینکچوری (Sanctuary) ہوگی؟ بولا، جی بس! کہاں کے سینکڑوں؟ اور دو چار کوس اس سڑک پر چلنے کے بعد یہ یوں ختم ہوجائے گی جیسے "سی ما" (سینما) کے پردے پر فلم ختم ہونے کے بعد "The End" آجاتا ہے۔ اور پھر وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ پوچھا پھر اس کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے؟ اتنی ہی جتنی چھانگا مانگا کی تھی۔ کل دس پندرہ میل۔ اس میں کچھ جنگل کے آثار یعنی تالاب اور جھیلیں بھی مہیا کی گئی ہیں۔ ہم نے گائیڈ سے پوچھا، یہاں جانور بھی تو ہونگے؟ بولا بہت جی! کتے، بلیاں، یہ بڑے بڑے رنگ بدلنے والے گرگٹ، باندرے اور کبھی کبھی راتوں میں ادھر ادھر سے لومڑ اور گادڑ بھی آجاتے ہیں۔ ادھر دیکھو، جہاں "زنانیاں" اپنے ناشتے دان کھولے بیٹھی ہیں، وہاں ان کے آس پاس پنجاب کے "بانکوں" کے علاوہ کتے ہی کتے منڈلا رہے ہیں۔ یہاں تو طرح طرح کے جانور بہت ہیں... مگر ہم تو تم سے ریچھوں، چیتوں، لکڑ بھگوں اور شیروں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ جنگل تو انہی جانوروں سے عبارت ہوتا ہے۔ گھبرا کر ہنستے ہوئے بولا۔ سرجی، سائیں کا نام لو، یہ جناور اگر آگئے تو پھر دوسرے ہی دن یہاں کامپلکسوں، مارکٹوں اور بڑے بڑے بنگلوں کا جنگل نہ بنا دیا جائے گا؟...

یوں سمجھئے ۔ان "مومن" زندہ دلان پنجاب کو جب سمنٹ ، کنکریٹ کے جنگلوں سے وحشت ہونے لگی اور دیکھ دیکھ کر آنکھیں دکھنی اور دل پژمردہ ہونے لگے تو انہوں نے چارہ گر سے فریاد کی!

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر
لادے اک جنگل مجھے بازار سے

اور چارہ گر نے گویا کمپیوٹر کا ایک بٹن دبایا کہ پلک جھپکتے میں یہ (کل دس پندرہ میل رقبے کا) جنگل ان کی ہتھیلی میں اگ آیا۔

اللہ اللہ خیر سلاد ... کہاں وہ جنوب میں کیرالا کی وادی خموش (Silence Valley) اور کہاں وہ عادل آباد ، بلہار شاہ ، چاندہ اور اس سے آگے سی پی کے علاقہ کے سینکڑوں میل کہ چار چار پانچ پانچ گھنٹے کار برق رفتاری سے دوڑتی رہے مگر جنگل کا تسلسل ختم ہی ہونے نہ پائے اور اکثر درختوں کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں میں سڑک کے بیچوں بیچ آرام فرما "ہزمیجسٹی" سے بھی ملاقات ہوجاتی ہے ۔ وہ وہاں ان کا قیلولہ فرمانا اور ٹرک یا بس کے بے ہنگم شور سے ڈسٹرب ہوکر اٹھ جانا اور نہایت ناگواری مگر کمال اطمینان اور ایک شان بے نیازی سے انگڑائی لے کر حقارت سے بس کی طرف دیکھنا اور ایک ہلکی سی "بق" (جانتے ہو اپنی اس گستاخی کا نتیجہ) سے ناراضگی کا اظہار کرنا پھر خراماں خراماں سڑک سے نیچے مراجعت فرماجانا اور اس ساری کارروائی کو دم روک کر دیکھنے والے بس کے سارے مسافروں کا "بے خاہ مخا" پیشاب خطا ہوجانا ... اور کہاں یہ طفل تسلی کہ چھانگا مانگا "کہیں جسے !کہ جنگل بیچ بیچ کر بھی اسے دیکھنے کو آنکھیں "ترستیاں" ہیں۔ سو اس "خیال" سے ایک غالب ہی کا دل بہلے تو بہلے۔ پر!

چھانگے مانگے کو اہل نظر جنگل نما کہتے ہیں

قصوری و قصوراں!

گھنٹہ ادھ گھنٹہ چھانگے مانگے کی ہوا کھانے کے بعد ضلع "قصور" پہنچے ۔ "قصور ؟" ۔ بڑا حشر خیز خطہ ہے۔ الاماں الحفیظ! "قصوری" نے تو ایک وزیر اعظم کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا اور قصوراں ؟ ہمارے انور مقصود حیدر آبادی کو اپنی زلف گرہ گیر میں ایسا الجھایا کہ وہ ٹی وی کے اسکرین پر جب بھی نظر آئے اسی "قصوراں" کے نام کی مالا جپتے ہوئے دکھائی دیئے ۔

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

ہم نے قصور کے کوائف سے ذرا سہم کر شاہد سے کہا ، میاں! ذرا جلدی سے گاڑی نکال لے چلو کہ ہر طرف بلاؤں کا نزول دکھائی دے رہا ہے ، خواہ مخواہ کوئی بلا گلے سے نہ لپٹ پڑے ۔ محترم مشتاق احمد یوسفی صاحب کے ایک دوست کراچی سے قصور آئے اور واپسی سے پہلے یہاں کی ساری مشہور سوغاتیں ، میتھی ، حضرت بلھے شاہ کا کلام ، پراندے (چٹلے) خرید لئے ۔ یوسفی صاحب آگے خبر دیتے ہیں "ان دنوں اتفاق سے "میڈم" ملکہ ترنم اپنے وطن قصور میں نہیں تھیں ... "۔●

قصور کو پیچھے چھوڑ کر "پتوں کی" ہوتے ہوئے الہ آباد (سابقہ نام ٹھینگ) پہنچے اور اپنے گاؤں "مولا پور" کے راستے پر ہولئے جہاں ہمارے بڑے بھائی صاحب مرحوم کو ملک کی تقسیم کے بعد "پٹودی" کی زمینوں کے معاوضے میں پانچ مربع (۱۲۵ ایکڑ) الاٹ ہوئے تھے ۔ کچی پکی سڑک کی دونوں جانب سرسوں کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دیکھنے سے آنکھوں میں طراوت آرہی تھی۔ ایسے معلوم ہورہا تھا جیسے سبز ساٹن کے فرش پر صانع قدرت نے طلائی پھولوں سے گلکاری کی ہو۔ امرود کے باغ بھی ملے جہاں انھیں ڈلیوں میں پیک کیا

● لاثانی گلوکارہ "ملکہ پکھراج" آج بھی لاہور میں موجود ہے مگر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔

جارہا تھا۔ ان گدرے گدرے امرودوں کو دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک باغ سے وہ خریدے گئے اور گاؤں پہنچنے سے پہلے کام و دہن کی خوب ضیافت کی گئی۔ پنجاب کی سرزمین اپنی زرخیزی میں بے مثال ہے۔ بل کی نوک سے ذرا گدگداؤ کو کھل کھلا کر سونا اگل دیتی ہے۔ ● قدم قدم پر نہروں کا جال بچھا ہوا ہے اور یہ بھی اس کی زرخیزی کا راز ہے۔ تاحد نظر ہرا ہی ہرا تھا۔ دروغ بر گردن راوی ! کہتے ہیں ایک مرتبہ لاہور کا انگریز کلکٹر بھٹ تیتروں کے فراق میں ادھر نکل آیا۔ دو چار فائیر کئے اور ٹوئیل بور (Twelve Bore) کے بیرل سے کارتوس کے خول نکال کر ایک طرف پھینک دیئے۔ دوسرے سال جب دوبارہ اس کا ادھر آنا ہوا تو دیکھا اور کیا دیکھا۔ اس نے جہاں وہ خول پھینکے تھے وہاں ایک پودا اگ آیا ہے جس کی ہر ڈال پر سرخ سرخ کارتوسوں کے خوشے لٹک رہے ہیں ... ہوسکتا ہے کہ راوی نے "تھوڑے سے "مبالغے سے کام لیا ہو مگر یہ تاریخی واقعہ ہے کہ قحط کے زمانے میں جب انگریزی حکومت فکر و تردد میں مبتلا ہوگئی تھی تو پنجاب کے گورنر نے یہ کہہ کر اسے دلاسا دیا تھا کہ فکر نہ کرو میں اپنے صوبے سے سارے ہندوستان کی روٹی کا بندوبست کردوں گا۔ شام سے کچھ پہلے گاؤں پہنچ گئے۔ شاہد کے ذریعہ مزارعوں کو پہلے ہی سے اطلاع مل گئی تھی کہ دس بارہ سال بعد حیدرآباد دکن والے وڈے شاہ جی (پنجاب اور سندھ میں سیدوں کو احتراماً شاہ جی کہتے ہیں) آرہے ہیں اور وہ گھر کے سامنے کمپاؤنڈ میں جمع ہوگئے تھے۔ دیر تک سب سے دعا سلام اور کس کے مصافحے و معانقے ہوئے۔

رات ہو چلی تھی۔ نومبر کا مہینہ سردی شباب دکھا رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوکر مزارعوں نے کمپاؤنڈ میں آگ کا الاؤ تیار کیا۔ ہم کندھوں پر شال ڈالے الاؤ کے قریب ایک موڑھے پر بیٹھ کر نرم نرم آنچ تاپنے لگے۔ گاؤں والے بھی اس کے اطراف حلقہ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے لکڑی سے آگ کو کرید کرید کر دہکا رہے تھے۔ ایک مزارع ہماری خاطر حقہ تازہ کر لایا اور نے ہمارے ہاتھ میں تھمادی۔ ہم نے بڑے شوق سے منجھے ہوئے حقہ باز کی طرح جونہی پہلا کش لے، آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ سر گھوم گیا، ہر چیز الٹی نظر آنے لگی۔ جڑیں اوپر اور جھاڑ نیچے۔ سارے مزارع الاؤ کے اطراف اکڑوں نشست کی حالت میں سر کے بل گول گول پھر رہے تھے اور ایسی گھمیر آئی جیسی یوسفی صاحب کے شاہ جی ☆ کو پہلی مرتبہ ہوائی جہاز کے سفر میں اس طرح آئی تھی جیسے بچپن میں بیت الخلاء کے سے "گوشہ عافیت" میں بیٹھ کر پہلے سگریٹ کا پہلا کش لینے پر سب ہی کو آئی تھی اور تجربے میں آیا کہ اس کے بعد ہی اطمینان سے وہاں "دیگر احوال" کی نوبت آتی ہے ..."

ہمارا دل مارے کھانسی اور ٹھسکے کے سینے کے اندر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ دوسرا کش لگانے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔ حقہ ان لوگوں کی طرف پھیر دیا۔ معلوم ہوا اس حقہ کا تمباکو کھیت سے نکل کر بغیر کسی پروسس کے سیدھا چلم میں پہنچا تھا۔ ویسے حیدرآباد میں ذکرِ فجر کے وقت ہم ابوالکلامی چاہ کے جرعوں کے "متصلاً" حقہ کے کش بھی لیتے ہیں مگر اس حقہ کا ہر کش کیف و سرور کی ایک سوغات لئے ہوئے ہوتا ہے جس کا تمباکو (گڑاکو) احمد حسین دلدار حسین لکھنؤ والے کے یہاں سے درآمد کیا جاتا ہے۔

لے تمباکو تو پنجاب کا
اس میں ملا مشکی خمیرا
اور خمیرہ بھی ہو لکھنؤ والا
تو پھر دیکھ بہاریں حقے کی

● یہ جملہ کرنل صاحب کی جنگ آمد سے مستعار لیا گیا۔
☆: تفصیل اس اجمال کی جاننے کے لئے "سفر گوشت" کا مطالعہ کیجئے۔

ایک بڈھے مزارع نے شاہد سے پوچھا "نکے شاہ جی! (چھوٹے شاہ جی) یہہ وڈا شاہ جی اودھر نظام حیدرآباد بچ کی کردا اے؟ یہہ شیراں (اسٹاک مارکٹ والے شیئر) دا کاروبار کردا اے۔ شاہد نے جواب دیا۔ اتنا سننا تھا کہ سب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر پوچھا! "اناں دی دیکھ بھال کون کردا اے۔ کی نوکر رکھے ہوئے نے؟ یہ وہ جنگل دا شیر تھی ہیں یہ فائیلاں لچ رین دے نے۔ شاہد نے بتایا۔

(مزارع! یہ بڑے شاہ جی نظام حیدرآباد میں کیا کرتے ہیں؟ شاہد۔ یہ وہاں شیروں کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ مزارع! "ان شیروں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔ کیا اس کیلئے نوکر رکھے ہوئے ہیں؟" شاہد! یہ وہ جنگل والے شیر نہیں ہیں بلکہ انہیں فائلوں میں رکھا جاتا ہے۔)

اس وضاحت کے باوجود ان لوگوں کی تسلی نہیں ہوئی اور دیر تک ہماری طرف استعجاب سے دیکھتے رہے... دوسرے دن صبح کھیتوں میں نکل گئے۔ گنے کی کٹائی ہورہی تھی اور ٹریکٹر کی ٹرالی میں بھر بھر کر یہ گنا شوگر ملوں میں بھیجا جارہا تھا۔ علاقہ کے بیشتر مل "شریف خاندان" کی ملکیت ہیں۔ گنا لے کر پرچیاں ہاتھ میں تھما دی جاتی ہیں اور روپیہ؟ کبھی چھ مہینے اور اکثر سال بعد ہی ملتا ہے۔ شاہد نے تقریباً چار لاکھ کی پرچیوں کو حرزِ جان بنا رکھا ہے۔ کھیتوں میں گنا کھانے اور چوسنے کا مزا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ مزارع ہمیں دیکھ کر دوڑے دوڑے چلے آئے اور شاہد کے کہنے سے رس بھرے گنوں کو چھیل چھیل کر دیتے گئے۔

شام میں شاہد کے ساتھ ایک مزارع کی لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ کھیتوں کے درمیان پچیس تیس جھونپڑیوں پر مشتمل ایک گاؤں تھا۔ شادی کی تقریب میں سارے گاؤں والے حصہ لے رہے تھے۔ "دو کھیت درمیان دوسرے گاؤں سے "برات آنے والی تھی، جہاں سے ڈھول، تاشے، باجے کی آوازیں آرہی تھیں اور لڑکی کے گاؤں والے اس بات پر آزردہ تھے کہ آج ان کی بیٹی بیاہ کر "دوسرے گاؤں" جارہی ہے۔ مغنیہ مسرت نظیر کے گانے کا ریکارڈ زوروں سے بج رہا تھا اور گاؤں کی کڑیاں (لڑکیاں) گانے کے بول پر جھوم جھوم کر ناچ رہی تھیں۔

پچھے پچھے آندا میری چال ویں دا آئیں

چیر والے! آدیخ دا آئیں، میرا لانگ دا واچا۔ نگہ مار دا آئیں دے میرا لانگ واچا...

(او سیدھی مانگ والے! میرے پیچھے پیچھے راہ میں میری ناک کی لونگ تلاش کرتے ہوئے چلا آ۔) مطلب یہ ہے کہ اس بہانے میری قربت حاصل کرلے۔

بارات آئی، نکاح ہوا، اس کے بعد کھانے کا دور چلا۔ پانچ پانچ، چھ چھ مہمانوں کے درمیان طباق رکھ کر اسے پلاؤ سے بھر دیا گیا اور مہمان؟ آستینیں چڑھا کر ٹوٹ پڑے۔ ہم کو بھی ایک طباق پر دوسروں کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ ان پر نظر پڑی تو سخت دہشت ہونے لگی۔ گرد آلود شال دوشالے اوڑھے۔ میل بھرے ہاتھ۔ لمبے لمبے ناخن، پیلے پیلے دانت اور ہر نوالے پر سڑسے ناک چھنک کر ہاتھ سے پوچھنا اور اسی ہاتھ کو پلاؤ پر مارنا۔ سب نے مل کر پلاؤ پر اس طرح بلہ بولا جیسے "اب نہیں تو کبھی نہیں"۔ اس عتر بود سے اپنے آپ کو صاف بچالے جانے کی ایک ترکیب سوجھی۔ طباق میں اپنے پلاؤ کے اطراف پلاؤ ہی سے ایک کمپاؤنڈ وال تعمیر کرلی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر اطمینان سے کھانے لگے۔ یہاں تک تو خیر ہوئی مگر کھانے کے بعد جب بادیہ گردش میں آیا تو جی متلایا اور اپنی باری آنے سے پہلے ایک جھرجھری لے کر تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے ٹوکا، شاہ جی! پانی تو پی لو۔ ہم نے پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا! کھانے کے آدھے گھنٹے بعد ہم پانی پیا کرتے ہیں... پیچھے سے سنائی دیا کوئی کہہ رہا تھا!

"میرے خیال ہے یہ بندہ پہلاں اکاڑی کردا ہوزگا"

(میرے خیال میں یہ بندہ پہلے جگالی کرلیتا ہوگا)

ہم گاؤں والوں کے اس ذوق سلیم کی دل میں بے ساختہ داد دیتے ہوئے ڈیرے پر واپس آگئے۔ دو تین دن گاؤں میں خوب سیر و تفریح کرکے لاہور واپس ہوئے۔

ایک دن اردو بازار انار کلی جانا ہوا۔ ہمارا قیام کرشن نگر میں گلزاری لال نندا (جنہوں نے جواہر لال کے بعد چند دن وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیئے تھے) کی حویلی قریب ہی تھا۔ (سنتے ہیں اس وسیع و عریض حویلی میں سو سے زیادہ کمرے تھے۔ اب یہاں کئی مکانات تعمیر ہوگئے ہیں) کرشن نگر سے بس میں سوار ہوئے اور انار کلی پہنچ کر جب اترنے لگے تو پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی پیچھے سے ایک خدائی خوار نے زور کا دھکا مارا۔ ہمارا توازن بگڑ گیا اور سڑک پر منہ کے بل گرتے گرتے بچے۔ پلٹ کر اپنے مہربان کو دیکھا تو موصوف کے چہرے پر نہ معذرت کے آثار تھے نہ ندامت کے۔ کھردرے اور سپاٹ لہجے میں سوری (Sorry) بولے اور تیزی سے نکل گئے … پچاس اوپر دو برس ہوئے جب سن سینتالیس میں انگریز اپنا بوریا بستر بغل میں دبا کر اپنے جزیرے کو سدھار گئے مگر جاتے جاتے وہ ستم ظریف ہم کو دو تحفے دے گئے۔ ایک کسی کو دھکا مار کر سوری کہنا دوسرا کھڑے کھڑے کسی گھر کی دیوار پر سربازار پیشاب کرنا — اور ان دونوں کو ہم نے بڑے جتن سے اب تک اپنی گانٹھ میں مضبوطی سے باندھ رکھا ہے۔ (جاری) ☆

آئندہ: راولپنڈی: شہر کرنل محمد خاں! وطن واپس

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
صدر شعبہ اردو
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

صفدر حسین اور تمنا کا پہلا قدم

مزاح کے بارے میں کسی نقاد کا قول ہے کہ یہ سیّال عمل ہے۔ یہ بات ایک طرح سے درست بھی ہے کیونکہ اگر مزاح الٹ جائے تو عامل کیلئے جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے لیکن بعض مزاح نگار اس چکرویو سے صحیح سلامت نکل آتے ہیں۔ شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، محمد خاں جیسے دیو قامت مزاح نگار مزاح کی جلالی دیوتی کو اپنے شیشے میں اس طرح اسیر رکھتے ہیں کہ وہ قاری کو گدگدی کرنے کے سوائے کوئی نقصان پہنچا ہی نہیں سکتی۔ لیکن جب صفدر حسین جیسا جن مزاح نگار کی صورت میں ابھرے تو اک گونہ خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے کہ نہ جانے یہ جن کب کس کے تن خاکی کو بے لباس کردے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ صفدر حسین نے مزاح نگاری شروع کردی ہے اور حیدرآباد کے ایک اخبار میں باقاعدہ لکھنے لگے ہیں تو میں نے سوچا کہ ان سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ کون جانے کہ یرقان کی طرح وہ کسی مرض میں مبتلا ہو گئے ہوں۔

یرقان سے چونکئے نہیں۔ آج سے 28 برس پہلے صفدر حسین کو یرقان ہو گیا تھا۔ اس یرقان میں صفدر حسین کو ہر نظم جدید اور ہر شعر تجریدی معلوم ہونے لگا تھا۔ یرقان کے مریض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے ہر چیز پیلی دکھائی دینے لگتی ہے کیونکہ اس کی رگ و پے میں پیلاہٹ سما جاتی ہے۔ صفدر حسین اس زمانے میں جسے دیکھتے وہ جدید شاعر نظر آتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صفدر حسین کی رگ و پے میں سمائی ہوئی اینٹی جدیدیت کا لاوا پھٹ پڑا۔ انہوں نے اردو شاعری کا تابوت بنا ڈالا اور اس تابوت میں نظموں کا ایک ڈھیر رکھ کر کیلیں جڑ دیں۔ ان کے اس شعری مجموعے کا نام ہی "تابوت" تھا اور اسی تابوت میں صفدر حسین سے میری پہلی غائبانہ ملاقات ہوئی۔

صفدر حسین ایک بڑی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ شرارت ان کا مزاج، چھیڑ چھاڑ ان کی فطرت۔ لیکن ایسے سنجیدہ اور معصوم نظر آتے ہیں کہ دیکھنے والا دھوکہ کھا جائے۔ کچھ پرندے ایسے ہوتے ہیں جو ایک خاص موسم میں نقل مقام کرتے ہیں۔ صفدر حسین بھی نقل مقام کے ماہرین میں ہیں۔ ابھی وہ اس جلسے میں اپنی کتاب کی رونمائی میں مصروف ہیں تو ابھی معلوم ہوگا کہ وہ ایرپورٹ پر ہیں اور اسٹیورڈ سے اس بات پر جھگڑا کر رہے ہیں کہ انہیں طیارے کی دم میں کیوں سیٹ دی گئی۔ بیچ بچاؤ کرنے والے متحیر ہو جاتے ہیں۔ جب انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ابھی ایک نیم ادبی محفل سے اٹھ کر آئے ہیں اور سعودی عرب کے ریگستانوں میں نہ جانے کیا کرنے جارہے ہیں۔

خارجاً مسموع ہوا ہے کہ وہ تین مہینے حیدرآباد میں گزارتے ہیں اور تین مہینے سعودی عرب میں۔ گویا ان کا حال ان پرندوں کا سا ہے جو موسم بدلنے کے ساتھ مقام بدلتے رہتے ہیں۔ سعودی عرب کو ایک گرم علاقہ مانا جاتا ہے۔ صفدر حسین وہاں گرمی حاصل کرتے ہیں۔ اپنے مضامین کے لئے مواد جمع کرتے ہیں۔ واپس آکر یہاں مضامین کے انڈے دیتے ہیں اور تین ماہ انہیں سیتے ہیں۔ جب انڈوں سے مضامین برآمد ہوتے ہیں تو انہیں اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی زینت بنا کر قاری کا امتحان لیتے ہیں۔

اب یہی کتاب دیکھئے۔ اس کا نام "تمنا کا پہلا قدم" اتنا معنی خیز ہے پر مجھ جیسا کم سواد قاری اسے شاعری کا کوئی مجموعہ سمجھ بیٹھتا

ہے۔ مگر یہ ہے مزاحیہ کالموں کا مجموعہ اور دس بارہ نہیں پینتیس انڈے میرا مطلب پینتیس مضامین اس کتاب کے اندر چھپے بیٹھے ہیں۔
ٹائٹل ہی سے مصنف کی جدت طرازی ظاہر ہوتی ہے۔ ایک چوزہ جو ابھی انڈا توڑ کر باہر نکلا ہے! سادہ لیکن دل پذیر ٹائٹل اپنے اندر ایک پیام لئے ہوئے ہے۔ چوزے نے انڈے کے باہر پہلا قدم ڈال دیا ہے۔ تمنا کا یہ چوزہ جب توانا ہوگا تو پھر دوسرا قدم ڈالنے کی سوچے گا۔　　غالب نے کہا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

تو غالب کی تمنا کے پہلے قدم نے دشت امکاں کو سمیٹ لیا تھا اور وہ اپنے رب سے ملتمس ہیں کہ دوسرا قدم کہاں رکھا جائے۔
غالب کے اس شعر پر مجھے ہندو دیومالا کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔
ایک بہت بڑا راکھشس راجہ تھا جس کا نام بالی تھا۔ اس نے مسلسل عبادت اور ریاضت کرکے بڑی شکتی حاصل کرلی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ساری کائنات پر حکومت کرے۔ بالی کا گرو شکراچاریہ تھا جو اسے ریاضت کے رموز بتلاتا رہتا تھا۔ اس نے بالی کو مشورہ دیا کہ ایسا یگنیہ کیا جائے کہ تینوں لوک اس کے قبضہ اختیار میں آجائیں۔ شکراچاریہ کی مدد سے یگنیہ شروع ہوا اور قریب تھا کہ یگنیہ پورا ہوجاتا۔ یہ سن کر دیولوک میں کھلبلی مچ گئی کہ اگر بالی نے اپنا یگنیہ پورا کرلیا تو پھر دیوتاؤں کو راکھشسوں کا غلام بننا پڑے گا۔ چنانچہ دیوتا اپنی فریاد لے کر اپنی ماں دیتی کے پاس پہنچے اور اسے سارا معاملہ سمجھا کر مدد مانگی کہ کسی طرح راکھشس کو یگنیہ مکمل کرنے سے روکا جائے۔ دیتی وشنو کے پاس پہنچی اور اس سے مداخلت کی درخواست کی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ دیوتا اور راکھشس اگرچہ دو ماؤں کی اولاد ہیں لیکن باپ تو ایک ہی ہے اس لئے دونوں میں طاقت کا توازن برابر ہونا چاہئے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ دیوتا آسمانوں پر حکومت کریں اور راکھشسوں کو پاتال کا راج دے دیا جائے۔ وشنو نے اس تجویز کو مان لیا اور وامنا کے بھیس میں بالی کے دربار میں آکر بھکشا طلب کی۔ وامنا بونا ہے اور برہما چاری ہے۔ برہمن دیوتا گھر آئے تو کیسے ممکن تھا کہ اسے خالی ہاتھ لوٹایا جاتا۔ بالی نے برہمن سے خواہش پوچھی تو اس نے صرف تین قدم زمین کی فرمائش کی۔ بالی کیلئے یہ تو بڑی معمولی بات تھی لیکن شکراچاریہ وشنو کو پہچان گیا تھا۔ اس نے بالی کو روکا کہ اس طرح کا وعدہ مناسب نہیں لیکن یہ تو بالی کی عزت کا سوال تھا۔ اس کیلئے یہی کیا کم تھا کہ ایک برہمن مانگ رہا ہے اور وہ اسے دے رہا ہے۔ اس نے کہا اگر یہ وشنو ہے تب بھی جیت اسی کی ہے یعنی اس کا ہاتھ اوپر ہے اور وشنو کا ہاتھ نیچے۔ اس طرح میں داتا ہوا اور وشنو بھکاری۔ بالی نے لوٹا منگوایا تاکہ وشنو کے ہاتھ پر پانی گرا کر اپنے وعدہ پر مہر ثبت کردے۔ شکراچاریہ نے بڑی کوشش کی کہ وہ پانی نہ گراسکے اور وعدہ پکا نہ کرسکے۔ آخر کار وہ لوٹے میں گھس کر ٹونٹی میں بیٹھ گیا کہ پانی گر ہی نہ سکے مگر وشنو بھی کم نہ تھا۔ اس نے مقدس گھاس کے تنکے سے اسے نکالنے کی کوشش کی اور اس زور سے مارا کہ وہ تنکا شکراچاریہ کی آنکھ میں جالگا۔ شکراچاریہ پہلے ہی کانا تھا اس چوٹ سے وہ اندھا ہوگیا اور چیختا ہوا باہر نکل آیا اور لوٹے سے پانی وشنو کے ہاتھ پر گرنے لگا۔ گویا وعدہ پکا ہوگیا اور اب بالی اپنے وعدے سے مکر نہیں سکتا تھا تب وشنو کا قد بڑھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے ساری زمین اس کے پیروں تلے آگئی۔ چاند اور سورج اس کے کان کی بالیاں بن گئے۔ پہلے قدم میں وشنو نے ساری زمین حاصل کرلی۔ دوسرا قدم آسمانوں پر ڈال کر اس نے آسمانوں کو بھی اپنے قبضے میں کرلیا۔ اب! اب تیسرے قدم کی باری تھی۔ وشنو نے تیسرے قدم کا مطالبہ کیا۔ اب بے چارا بالی کیا کرتا۔ اس نے اپنا سر جھکا دیا کہ لے میرا سر اور اس پر اپنا تیسرا قدم رکھ! وشنو نے اس کے سر پر اپنا قدم رکھا اور وشنو کے بوجھ سے وہ پاتال میں دھنس گیا اور اس طرح دیوتاؤں کو بالی سے نجات مل سکی۔

یہ تو ایک کہانی تھی لیکن غالب نے بھی اپنے پہلے قدم میں تمام عالم امکاں کو سمیٹ لیا اور دوسرے قدم کیلئے رب سے جگہ مانگی۔ یہاں صفدر حسین نے بھی اپنا پہلا قدم ڈال دیا ہے۔ لیکن یہ کتنا مشکل ہے کہ اس دشت کے قدم کے پیچھے کون سی دنیا آگئی ہے۔ صفدر حسین کی کتاب "تمنا کا پہلا قدم" کے ٹائٹل پر چڑیا جوڑا اپنے گیلے گیلے پروں کے ساتھ ساری دنیا کو ڈھونڈنے کیلئے بے تاب ہے۔ دشت امکاں کو نقش پا بنا کر اگر وہ دوسرے قدم کی طرف متوجہ ہو تو کیا ہوگا۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ اس لئے ہم اس سوال کو Choice میں چھوڑتے ہیں۔

پینتیس انشائیوں یا کالموں یا مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ دیدہ زیب کتاب سادگی میں پرکاری کی اچھی مثال کہی جاسکتی ہے۔ جس میں نہ دیباچہ ہے نہ پیش لفظ اور نہ ہی انتساب۔ شاید صفدر حسین اس بات کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ ان بیساکھیوں کا سہارا لیا جائے۔ یہاں تک کہ اس کتاب کی قیمت تک درج نہیں کی گئی۔

پہلے ہی مضمون میں انہوں نے بے چارے ڈاکٹر کو اپنا نشانہ بنایا ہے جو اپنے مریض کا آپریشن کرتے ہوئے کبھی قینچی بھول جاتا ہے تو اس کو نکالنے کیلئے دوسرے آپریشن کے دوران دستانے چھوڑ دیتا ہے۔ اب مریض کی معصومیت ملاحظہ ہو:

"یہ بار بار چیر پھاڑ کی بجائے آپ میرے پیٹ میں ایک لمبی سی Zip لگا دیجئے۔" (ص ۷)

صفدر حسین ڈاکٹروں کا اچھا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں اور کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹری بلکہ ڈاکٹرنی تو ان کے نکاح میں ہے۔ حالانکہ وہ اپنے مضمون "ایک جورو ہزار نعمت" میں حلفیہ کہتے ہیں کہ اپنی جورو کے غلام نہیں لیکن فوراً ہی مارے خوف کے کہہ اٹھتے ہیں ہم جھوٹی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم جورو کے غلام نہیں ہیں "ایک سچے فرماں بردار شوہر کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ فرماں برداری کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ایک مضمون میں لکھ مارا "ساس کو برا مت کہو" بیگم کو منانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے کہ ساس کی تعریف کی جائے۔ چاہے ساس سے کتنی ہی جان کیوں نہ جلتی ہو۔ اب آپ سے ایک راز کی بات بتائیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ چینی ریستوراں میں ٹماٹو ساس، چلی ساس، سویا ساس وغیرہ کو ہم صرف اس لئے ہاتھ نہیں لگاتے کہ اس میں لفظ "ساس" موجود ہے اور صفدر حسین کے "ساس کو برا مت کہو" والے مضمون میں تحریر کردہ اس گر پر کبھی عمل نہیں کر سکتے جس میں وہ کہتے ہیں "A ساس is never wrong"

"اگر وہ دن کہے تو عید کا دن کہو اور رات کہے تو چاند رات کہو۔"

یہ تو خیر مزاح کی بات تھی۔ آیئے صفدر حسین کے اسلوب کو دیکھا جائے۔ صفدر حسین بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ورجینا ولف اور قرۃ العین حیدر بے چاری خواہ مخواہ Stream of concious ness کے لئے بدنام ہے۔ شعور کی رو کی کارفرمائی صفدر حسین کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ وہ کرکٹ کی بات کرتے کرتے واجپائی کو وکٹ کیپر بنا دیتے ہیں اور اڈوانی کو Slip پر اکڑوں بٹھا دیتے ہیں۔ گھر داماد کا ذکر کرتے کرتے وہ چندرا بابو نائیڈو کیلئے دعا کرنے لگتے ہیں جو اس کنگال شہر کو ہائی ٹیک شہر بنانے کے درپے ہیں۔ مچھروں کی مدح سرائی کرتے کرتے PRO کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں اور اردو کے دیوانوں کے تذکرے میں اختر حسن کی پی ایچ ڈی نوازی کے راز اگل دیتے ہیں۔

صفدر حسین کے مضامین میں جا بجا اشعار نظر آتے ہیں جن میں تحریف کر کے اپنا مطلب پیدا کرنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ یہ تحریف دیکھئے:

ہڈیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
ساری لذت کباب کی سی ہے

اس شعر کا کمال یہ ہے کہ کمیں کی اینٹ کہیں کا روڑا ہونے کے باوجود لطف پوری طرح موجود ہے۔
اور یہ تحریف بھی ملاحظہ کیجئے:

خوبر آں باشد کہ گیرد دستِ زن
در پریشاں حالی و در دید زہ

یا پھر: خیالِ خاطرِ داماد چاہئے ہردم
یہ شعر بھی دیکھئے کہ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
سالوں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کبھی وہ تحریف کے زور میں لستے آگے نکل جاتے ہیں کہ وزن کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صفدر حسین کا مقصد اشعا استعمال کرنے سے صرف اتنا ہے کہ مزاح میں مزید جان پیدا ہوجائے۔ البتہ یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے کلاسیکی سرمایے سے ناواقف نہیں ہیں۔

صفدر حسین کی تحریر میں کبھی کرخت الفاظ، طنز کی کیفیت پیدا کرتے ہیں تو کبھی سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر نشتر زنی کرکے ایسی کسک پیدا کرتے ہیں کہ قاری واہ کے ساتھ آہ پر مجبور ہوجاتا ہے۔ صفدر حسین کے اندر بیٹھا ہوا مزاح نگار ابھی ابھی انڈے سے نکلا ہے اور یہ اس کی تمنا کا پہلا قدم ہے۔ اب خدا ہی جانے کہ اس کا اگلا قدم کب اور کس راکشس کے سر پر پڑنے والا ہے۔ ☆

پی ایچ ڈی کی ڈگری

مالیگاؤں کے ممتاز ادیب جناب الیاس صدیقی کو پونا یونیورسٹی نے اردو ادب میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری عطا کی ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان "مالیگاؤں میں اردو نثر نگاری" ہے۔

یہ مقالہ انھوں نے ڈاکٹر اشفاق انجم صاحب (ہیڈ آف اردو اینڈ پرشین ڈپارٹمنٹ، ایم ایس جی کالج، مالیگاؤں کیمپ) کی رہنمائی میں مکمل کیا۔ ڈاکٹر آدم شیخ صاحب (ریسرچ ڈائرکٹر، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی) اور ڈاکٹر بیگ احساس صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) نے ریفری کے فرائض انجام دیئے۔ ☆

• اردو کے مشہور شاعر و افسانہ نگار جناب مسرت اللہ خاں مسرت اشرفی بدایونی کو ان کے تحقیقی مقالہ "شکیل بدایونی شخصیت اور فن" پر روہیلکھنڈ یونیورسٹی بریلی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر این ایچ خاں نظامی ریڈر بریلی کالج بریلی کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔

●☆●

حبیب ضیا

تاریخ پیدائش : یکم نومبر ۱۹۳۵ء

ایم اے : ۱۹۵۹ء جامعہ عثمانیہ

پی ایچ ڈی : ۱۹۶۶ء جامعہ عثمانیہ

تصانیف:

دکنی زبان کی قواعد : ۱۹۶۳ء

مہاراجہ کشن پرشاد شاد (تنقید) : ۱۹۷۸ء

گویم مشکل (مزاحیہ مضامین) : ۱۹۸۱ء

انیس بیس (مزاحیہ مضامین) : ۱۹۸۸ء

شاد و نیاز (تنقید) : ۱۹۹۱ء

تکیہ کلام (زیر طبع)

ان کتابوں پر آندھرا پردیش اور یوپی کی اردو اکیڈیمیوں نے انعامات سے نوازا۔

پہلی پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس مئی ۱۹۸۹ء مزاحیہ مضمون سنایا۔

بسٹ ٹیچر انعام : اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش ۱۹۹۱ء

اعزاز بہترین مزاح نگار : اندرا گاندھی نیشنل یونٹی ایوارڈ ۱۹۹۵ء

غزل سندری غالب ایوارڈ : ۱۹۹۹ء

وابستگی:

زندہ دلان حیدرآباد، انجمن ترقی اردو، محفلِ خواتین، ادارہ میرا شہر میرے لوگ، انجمن ترقی پسند مصنفین، ادارۂ ادبیات اردو، شعبہ خواتین۔

●☆●

برق آشیانوی

ڈاکٹر حبیب ضیا کی مزاح نگاری

ملک میں خاتون مزاح نگاروں کی کمی ہے ۔ جسکی وجہ سے مرد مزاح نگار سکون و اطمینان کے ساتھ بلا خوف و خطر طنز و مزاح کے میدان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ ویسے چند خواتین جو دیگر اصناف ادب میں اپنے فن کے جوہر دکھا رہی تھیں طنز و مزاح کے میدان میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے کے لئے اتریں لیکن وہ چار قلابازیاں کھانے کے بعد پورے خشوع و خضوع اور حضور قلب کے ساتھ توبہ کر کے اپنے اصلی میدان میں واپس چلی گئیں۔ البتہ شفیقہ فرحت اپنی پوری ہمت زنانہ کے ساتھ ڈٹی ہوئی ہیں۔

اب جو ڈاکٹر حبیب ضیاء طنز و مزاح کے میدان کارزار میں پورے ہتھیاروں سے لیس ہو کر اتری ہیں تو زندہ دلان حیدرآباد کیلئے خطرے کی گھنٹی ہے کہ خبردار اب وہ وقت آگیا ہے کہ اقلیم طنز و مزاح پر خواتین کا قبضہ ہونے والا ہے ۔ اور تم لوگ مجاہدین کی طرح چھاپہ مار جنگیں لڑتے رہ جاؤ گے ۔ (ویسے سیاسی جنگ تو عرصہ ہوا کہ مرد ہار چکے ہیں) موصوفہ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ " گویم مشکل " شائع ہوا ہے جو ادب کی اس صنف میں قابل قدر اضافہ ہے ۔

طنز و مزاح کے بارے میں میرے ذاتی خیالات وہی ہیں جو مغربی مصنفین کے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ غلامانہ ذہنیت ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کے مشہور و معروف مزاح نگاروں نے بھی مغربی انداز فکر سے استفادہ کیا ہے ۔ غرض میرا یہ ایقان ہے کہ چاہے افسانوی ادب ہو یا طنز و مزاح اس کی بنیاد چار خصوصیات پر رکھی جاتی ہے ۔

پہلی خصوصیت " زبان " ہے جو فنکار کا ہتھیار ہے ۔ اس کے بغیر فن کار تنہا میدان میں اتر ہی نہیں سکتا اس خصوص میں ڈاکٹر حبیب ضیاء اردو کی سند رکھتی ہیں۔ جس طرح میڈیکل کالج سے کسی ڈاکٹر کو ایم بی بی ایس کی سند عطا کر کے یہ اجازت دے دی جاتی ہے کہ جاؤ لقمان اب تم جتنے چاہو قتل کر سکتے ہو۔ تم پر کوئی عدالت مقدمہ نہیں چلا سکتی اسی طرح ڈاکٹر حبیب ضیاء کو بھی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کر کے یہ اجازت دے دی ہے کہ جاؤ خاتون اب تم جتنی چاہو زبان کی غلطیاں کر سکتی ہو۔ کوئی برق آشیانوی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن ان کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے کہ اس جائز حق سے پوری کتاب میں انہوں نے کہیں ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔

دوسری خصوصیت " زندگی " یعنی " Life " ہے جو ڈاکٹر ضیاء کے جیتے جاگتے چلتے پھرتے زندہ (بلکہ بعض زندہ درگور) کرداروں میں رچی بسی نظر آتی ہے ۔ کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو زندگی کے حقائق کے بغائر مطالعہ سے عاری ہو۔ جن مضامین میں یہ بات شدت سے نظر آتی ہے وہ ہیں " بچہ باہر گیا ہے " " طلبے " " پانی " اب تک ایسا نہیں تھا " وغیرہ۔

مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو۔ بچپن ۔ جوانی ۔ ادھیڑ پن اور بڑھاپا انسانی زندگی کے یہ چار اسٹیج ہیں۔ ان میں آخری اسٹیج بڑا خطرناک بلکہ عبرتناک ہے ۔ سبھی ضعیف خطرناک نہیں ہوتے ۔ اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر بے ساختہ ان کی درازی عمر کے لئے دل سے دعا نکل جاتی ہے ۔ (مضمون اب تک ایسا نہیں تھا)

تیسری خصوصیت کردار کی Psychological Study یعنی نفسیاتی مطالعہ ہے ۔ معلوم نہیں ۔ انہوں نے میری طرح " نفسیات " بہ حیثیت اختیاری یا لازمی مضمون کے پڑھا ہے یا نہیں لیکن ان کے تمام کرداروں میں نفسیاتی مطالعہ نہایت عمیق نظر آتا

ہے۔ مثلاً ہمارے بھی ہیں امتحان میں طلباء کی نفسیات۔ بدیسی مال میں ماں کی نفسیات اور ساس نے کیرو سین ڈالکر میں ساس کی نفسیات وغیرہ۔ نفسیاتی مطالعہ کے لئے یہ عبارت ملاحظہ ہو:

ہر طرف سے سوالات کی بوچھاریں ہوئی.... کام والی کی عمر کیا تھی؟ صورت شکل کیسی تھی؟ رنگ کالا تھا یا گورا؟ شادی شدہ تھی یا کنواری؟ آپ نے اسے رکھا کیوں تھا؟ ان سوالات کے جوابات مشکل تھے۔ شرافت کی مہر کی وجہ سے ہم نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ بعد میں غور کیا تو ماتھا ٹھنکا۔ (مضمون گویم مشکل)۔

چوتھی خصوصیت Situation سچویشن کا تیز اور گہرا مشاہدہ۔ اس نوع میں بھی ڈاکٹر ضیاء کامیاب ہیں۔ اس کی مثال مضمون "لاڈ" میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ جس میں وہ لکھتی ہیں "اگر کنوارا ہے تو.... ایک بے خودی کے عالم میں نرم ہاتھوں کو اور نرم کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے .... لیلی مجنوں.... ہیر رانجھا.... کونسی چوڑیاں چاہئیں؟"

مصنفہ کی تحریروں کی اہم خصوصیت بے ساختگی ہے۔ وہ الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جملے نہیں بناتیں بلکہ جملے ان کے ذہن سے سکوں کی طرح ڈھل کر نکلتے ہیں لیکن ایک سکہ بھی کھوٹا نہیں ہوتا ایک اور نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مخالف صنف کو طنز و مزاح کا نشانہ نہیں بناتیں۔ جیسا کہ بالعموم صنف عام مزاح نگاروں کا شیوہ ہے۔

ڈاکٹر ضیاء کے تحت الشعور Subconcious mind میں طالب علمی کے زمانے ہی سے حس مزاح Sense of Humour پرورش پاتی رہی ہے۔ عمر اور تعلیم کی منزلوں کو طے کرنے کے دوران یہ حس بھی پروان چڑھتی رہی اور جب انہوں نے کھل کر لکھنا شروع کیا تو ان کے فن میں پختگی آچکی تھی۔ اب صرف مشق ان کو درجہ کمال تک پہنچا سکتی ہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لکھا کریں۔ "بسیار نویسی" کے الزام کی پرواہ نہ کریں کیوں کہ جس تالاب میں زیادہ پانی رہتا ہے وہی کھیتوں کو سیراب کرسکتا ہے۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے ان کے دیباچہ کا یہ جملہ .... "جب گھر سے جانا ہو تو سرخ رنگ کی چادر اوڑھے خاموشی سے چلی جاؤں" ان کی مشرقی تہذیب سے وابستگی اور پاکیزہ خیالات کا آئینہ دار ہے۔ کتاب میں کتابت کی غلطی کو جی ترس گیا۔ البتہ طباعت نے خوش کردیا۔ ملک کی غربت و خستہ حالی کے پیش نظر ۱۰۶ صفحات کی کتاب کی قیمت صرف بارہ روپئے رکھی گئی ہے۔ ☆

ڈاکٹر حبیب ضیاء چور دروازے سے مزاح کے میدان میں آئیں۔ حبیب توفیق کے نام کا برقع اوڑھے۔ جیسے انہیں خوف ہو کہ کسی محقق کا مزاح لکھنا اس کے مرتبے کے منافی ہوگا۔ لیکن جب پردہ ترک کیا اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب میں برسرِ عام مضمون پڑھا تو داد و تحسین کی بارش نے ان کے دل سے اس خیال کو دھودیا اور آج وہ طنز و مزاح کے میدان میں اپنے نام کی طرح مردانہ وار آگے بڑھتی جارہی ہیں۔ رواں، شستہ، شیکھی زبان، گدگداتے مزاح کے ساتھ طنز کی زیریں لہر، موضوعات میں تنوع ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریر کے خاص وصف ہیں۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

●☆●

ڈاکٹر حبیب ضیا

بڑا ڈاکٹر

کسی بھلے چنگے آدمی کو کسی بڑی بیماری میں مبتلا کرنے والے کو "بڑا ڈاکٹر" کہتے ہیں۔ اور اسپیشلسٹ وہ ہے جو ایک صحت
مند آدمی کو کسی اسپیشل بیماری میں مبتلا کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا ہو۔ دل کے اسپیشلسٹ سے رجوع ہونے سے دل کی ہر قسم
کی چھوٹی بڑی بیماریاں انسان میں آجاتی ہیں ۔ دل کے علاوہ دماغ، گردے، پھیپھڑوں وغیرہ کے بھی اسپیشلسٹ اس سرزمین پر پائے
جاتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹروں کے علاج کا طریقہ بھی بہت منظم ہوتا ہے ۔ ایک بڑا ڈاکٹر مریض کو دوسرے کے پاس بھیج کر خون کا امتحان
کرواتا ہے ۔ خون والا پسینے کا امتحان کروا کر دل کے ڈاکٹر پاس بھیجتا ہے ۔ دل والا گردوں کے ماہر کو چٹھی لکھ کر دیتا ہے ۔ گردے والا
ہڈیوں کے ڈاکٹر سے ربط پیدا کرنے کا مشورہ دیتا ہے ۔ بعد ہڈیوں والا مریض کا رشتہ دانت کے ڈاکٹر سے جوڑتا ہے ۔ اس کبھی ختم نہ
ہونے والے چکر میں صرف مریض ہی ختم ہو سکتا ہے ۔

ایک صاحب ہاتھ کے درد کے علاج کے لئے ایک مشہور بہرے جراح کے پاس گئے ۔ جراح نے دس کا نوٹ ڈبے میں رکھتے
ہوئے پوچھا۔

"دانت میں تکلیف ہے ؟" وہ صاحب زور سے بولے "جی نہیں! میرے ہاتھ میں درد ہے "۔

"داڑھ ہل رہا ہے ؟"

انہوں نے غصے سے کہا "جی نہیں! مجھے صرف ہاتھ کا علاج کروانا ہے "۔

جراح نے پھر یوں منہ کھولا۔

"آپ کو اپنے پورے دانت نکلوانے ہوں گے دانتوں میں خرابی کی وجہ سے ہاتھ میں درد ہوتا ہے ڈاکٹر مدلیس کے پاس دانت
نکلوا کر میرے پاس آئیے "۔

یہ سنکر وہ صاحب غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنا چوکھا جراح کے پوپلے منہ میں ٹھونستے ہوئے چلتے بنے۔

اسپیشلسٹ اپنے پیشے میں بالکل آزاد ہوتا ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے ۔ اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ وہ ہلنے والے اور
خراب دانتوں کو ہاتھ نہیں لگاتا بلکہ مضبوط دانتوں پر ہی ہاتھ صاف کرتا ہے ۔ اچھی خاصی آنکھ نکال پھینکتا ہے ۔ اور مریض کی زندگی میں
اندھیرا کردیتا ہے ۔ پتھری نکال کر چمٹا رکھ دیتا ہے ۔ ایک ماہر ڈاکٹر نے ایک مریض کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا ۔ لیکن تین سال بعد
پتہ چلا کہ اس نے مریض کے پیٹ میں چمٹا رکھ دیا تھا ۔ ہمیں ڈاکٹر کی اس حرکت پر یقین نہ آیا۔ ہم نے سوچا کہ اگر مریضوں کے ساتھ
آنے والی خوب صورت لڑکیوں کو تکنے کی سزا میں اس کی بیوی چمٹا گرم کر کے اسے چرکا دیا کرتی تھی تو وہ چمٹے کو کہیں اور بھی چھپا
سکتا تھا۔ ایک مریض کے پیٹ کا ہی انتخاب اس نے کیوں کیا؟

ہم اس ڈاکٹر سے انٹرویو لینے گئے ۔ ہم نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ نے مریض کے پیٹ میں چمٹا رکھ دیا۔ کیا آپ کو کوئی اور
جگہ نہیں ملی؟" ڈاکٹر نے غصے سے جواب دیا "آپ کو اس قسم کے سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔ میں ایک اسپیشلسٹ ہوں۔ میں جو

چاہوں کر سکتا ہوں مریض کے پیٹ میں چمنار کو سکتا ہوں۔ جگر میں پھکنی رکھ سکتا ہوں اور چاہوں تو مریض کے دل میں خود سما جا سکتا ہوں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ـــــ آپ اپنا مشورہ دیجئے۔ فوراً یہاں سے دفع ہو جائیے۔

ایک بڑے ڈاکٹر کی فیس ایک سو روپے اس کے کلینک میں بندھی ہوئی تھی۔ زکام ہو یا کھانسی، جاڑا ہو یا بخار، ڈاکٹر کا چپراسی سو روپے لے کر مریض کو اندر جانے کی اجازت دیتا تھا ـــ ڈاکٹر اچھا تھا لیکن اس کی فیس کو دیکھ کر علاج کروانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ـــ ایک دن ہمت کر کے اسی ڈاکٹر کے پاس گئے اور ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے صرف نزلہ ہے۔ کیا آپ کی فیس ۱۰۰ روپے سے کم نہیں ہو سکتی؟"

اس پر ڈاکٹر نے غصہ سے جواب دیا۔

"جی نہیں! اس میں کچھ کمی نہیں ہو سکتی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ یہ "ڈسکاونٹ ویک" چل رہا ہے ـــــ زکام، کھانسی، سر کا درد جیسے امراض پر ۲۰ فیصد ڈسکاونٹ ہے اور موذی امراض جیسے دق، کینسر ایک ساتھ ہوں تو ایک مرض کا علاج فری ہے۔ ڈسکاونٹ ویک کے دوران کوئی مریض میرے علاج سے مر جائے تو اس کے کفن دفن پر ۵۰ فیصد ڈسکاونٹ ہے"۔

۵۰ فیصد ڈسکاونٹ سن کر ہم نے ڈسکاونٹ ویک میں مرنے کا فیصلہ کیا۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر سے پوچھا "یہ دکان کہاں ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا،

"میرے دواخانے کے پیچھے ہی میرا بھائی میونسپل سالانہ کاروبار کرتا ہے۔ نالائق ہے نا! اس لئے میں نے اس کام سے لگا دیا ہے۔ آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں ہوگی"۔

بڑے ڈاکٹر کی ایک خصوصیت جو اسے دوسرے ڈاکٹروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بڑا ڈاکٹر مریض سے زیادہ دیر تک بات کرتا ہے۔ وہ مختلف قسم کے ضروری اور غیر ضروری سوالات پوچھ کر مریض کو اطمینان دلا دیتا ہے کہ اس نے تشخیص میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔ پچھلی زندگی کے بارے میں وہ پوچھے گا:

"آپ کو بچپن میں ٹائیفائیڈ تو نہیں ہوا تھا؟"

"چیچک تو نہیں نکلی تھی؟"

"میرا خیال ہے آپ کچھ سوچا کرتے ہیں"۔

"آپ پر فکروں کا بوجھ بہت زیادہ ہے"۔

"کیا آپ پر بہت زیادہ ذمہ داریاں ہیں"۔

"آپ کی بیوی آپ کو مارتی تو نہیں"۔

ان سوالات میں سے یقیناً ایک ایسا ضرور ہوگا جس کا جواب مریض اثبات میں دے سکتا ہے ـــ ڈاکٹر کے منہ سے اپنی آپ بیتی سننے کے بعد مریض "فنافی الڈاکٹر" ہو جاتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ڈاکٹر مریض سے من مانی کروا سکتا ہے۔ یعنی مختلف قسم کے چیک اپ کے چکر میں مریض کو گھیرنے میں مکمل طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔ بڑے ڈاکٹر ایک دوسرے کا روزگار فراہم کرتے ہیں۔ اس بات کا علم ہمیں اس وقت تعین آیا جب کہ ہمیں ایک شہرت یافتہ لیڈی ڈاکٹر سے سابقہ پڑا ـــــ ایک دن بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا وقتاً فوقتاً میڈیکل چیک اپ کروانا صحت کے لئے مفید ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ وہ دن ہم

کبھی نہیں بھول سکتے جس دن کہ ہمیں نے دستی شکر کی موذی بیماری میں مبتلا کر دیا گیا تھا ___ کوئی موزوں مرض کا نام سمجھ میں نہیں آیا تو ہم نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمیں کچھ تکان سی محسوس ہوتی ہے ۔ہمارے منہ سے اس جملے کا نکلنا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کی سانس کی نالی سے ایک لمبی سانس نکلی جو خوشی سے بھرپور تھی ___ وہ کہنے لگی: "ہوں! تو کیا پروفیسر بن گئی ہو؟"۔

ہمیں اب تک کسی نے پروفیسر نہیں کہا تھا ___ پروفیسری کے آگے ڈاکٹریٹ ماند پڑتی دکھائی دینے لگی ___ موقع کو غنیمت جان کر ہم نے جھوٹی شان کے ساتھ تنخواہ میں دو سو روپیہ کا اضافہ کرتے ہوئے کہا: "جی ___ جی ہاں ___ مجھے ترقی ہو گئی ہے اور آپ کی دعا سے آپ جو کہہ رہی ہیں میں وہ بن گئی ہوں۔"

ترقی کا لفظ سنکر لیڈی ڈاکٹر فاتحانہ انداز سے مسکراتی ہوتی یوں گویا ہوئی:

"تمہیں شکر آتی ہے ؟"

ہم نے کہا ___ "جی آتی تو ہے لیکن صرف چھ کیلو کیا بتائیں ڈاکٹر! یہ شکر ہر ماہ ناکافی ہوتی ہے ۔ آپ کے پاس زائد ہو تو دے دیا کیجئے"

لیڈی ڈاکٹر نرمی سے بولی: "میں شکر کی بیماری کی بات کر رہی ہوں۔ تم کو شکر کی بیماری ہے کیا؟"

ہم نے کہا: "آپ کے منہ میں پتھر خدا نخواستہ ہمیں کیوں ہونے لگی یہ بیماری۔"

"تمہارے ماں باپ میں سے کسی کو ہے یہ بیماری؟" ___ "جی نہیں۔"

"نانا، نانی؟" ___ "جی نہیں۔"

دادا، دادی ___ ؟" ___ ہم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں۔ میرے دادا کی شوگر فیکٹری تھی۔"

لیڈی ڈاکٹر اچھل پڑی۔ کرسی توڑتے ہوئے بولی: "میرا شبہ صحیح نکلا ___ خاندان میں ایک بھی ایسی بیماریوں کا شکار ہو تو ورثہ میں جانے لونے سی ایک مہلک مرض تو دے جاتا ہے ۔ یہ موروثی مرض ہے ۔ انتہائی خطرناک ہوتا ہے ۔ میں تم کو چٹھی دیتی ہوں ۔ ڈاکٹر باواجی کے پاس مکمل چیک اپ کروا کر آنا ۔ "ہم نے تعجب سے کہا: آپ ڈاکٹر، آپ کے باواجی بھی ڈاکٹر؟!"

لیڈی ڈاکٹر بولی: "بدتمیزی مت کرو۔ باواجی میرے والد نہیں۔ مشہور ڈاکٹر کا نام ہے۔ تم مریضوں کی یہی عادت بری ہوتی ہے کہ جہاں روپیہ خرچ کرنا ہوتا ہے وہاں نہیں کرتے ۔ رہا اس ڈاکٹر سے میری رشتہ داری کا سوال ___! ان معاملات میں مریض کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ___ یہ ڈاکٹروں کا آپس کا معاملہ ہے۔"

اس اثنا میں شکر کی بیماری نے ہمیں گھلانا شروع کر دیا۔ شکر جس طرح چائے میں گھلتی ہے اسی تیز رفتاری سے ہم بھی گھلنے لگے۔ جدھر نظر دوڑاؤ شکر ہی شکر دکھائی دینے لگی۔ ساٹھ روپیہ خرچ کر کے ہم تیسرے دن NIL والی رپورٹ لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے ۔ وہ بہت مصروف تھی۔ اس نے رپورٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ___ اس کی نظریں ان پچاس پچاس کے نئے نوٹوں پر تھیں جو ہمارے پیچھے لائن میں کھڑے تھے ۔ دور ہی سے رپورٹ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر ایک کاغذ کے پرزے پر "آسٹو کیلیم" لکھ کر کاغذ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا ___ اور بولی:

"تم کو کوئی نقص ہے جی! آدھا چمچہ دوا نکو پیو۔"

لیڈی ڈاکٹر کے یہ الفاظ اور اس کا نسخہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔ بیماری کا خیال آتے ہی ہم اس کا نسخہ دیکھ لیتے ہیں ___ ☆

●☆●

ڈاکٹر حبیب ضیا

پانی

پانی اب صرف ایک مائع کا نام نہیں رہا بلکہ ایک موضوع، ایک علامت بن گیا ہے ۔ علامت تو پہلے بھی تھا، لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں اس کی نوعیت بھی بدل گئی ہے ۔ اگر کوئی اپنی جھوٹی شان جتلانے کے لئے روپے کا اسراف کرتا تو کہا کرتے "دیکھو تو ۔ ! روپیہ کیا پانی کی طرح بہارہا ہے "۔ پانی اس وقت ایک فالتو شئے سمجھا جاتا تھا جس کا بہنا اور بہانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا ۔ اس لئے پانی بہانے اور روپیہ جتن سے تجوری میں رکھنے کے لئے کہا جاتا تھا ۔ لیکن اب روپیہ بہانے پر بھی پانی نہیں ملتا ۔ اس لئے تجوری میں بند رکھنے کی چیز ہوگیا ہے ۔

زندگی میں جب کوئی چیز اہمیت اختیار کرلیتی ہے تو ہر کس و ناکس کی زبان پر اسی کا ذکر ہوتا ہے ۔ جن لوگوں کے پاس بات کرنے کے لئے کوئی موضوع نہیں تھا ۔ اب انھیں مستقل موضوع ہاتھ لگ گیا ہے جس پر بولتے ہوئے ان کی زبان خشک نہیں ہوتی ۔

ذکر تیرا تجھ سے بہتر ہے کہ میرے لب پہ ہے

اور ریس، معما، اور جوے کے شائقین کو شرط لگانے جیتنے اور ہارنے کا ایک اور میدان مل گیا ۔ نلوں کے قریب صرف پانی بھرنے والوں کا ہجوم نہیں ہوتا بلکہ ان میں ایسے جواری بھی شامل ہوتے ہیں ۔

ہر زمانے کو کسی خاص نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہمارا زمانہ "پانی کی قلت" کا زمانہ ہے سب کی زبان پر ایک ہی لفظ ہے 'پانی، پانی، پانی ۔ کسی کی مزاج پرسی کو جائیں یا پرسے کے لئے ۔۔ بیمار کی کیفیت مرنے والے کے غم سے زیادہ پانی کا رونا رہتا ہے ۔

مزاج پرسی اس طرح شروع ہوتی ہے :

"آپ کے پاس پانی کا کیا حال ہے ؟"۔

"ارے صاحب کیا بتائیں بہت برا حال ہے "۔

"کب آتا ہے پانی ؟"

"کوئی وقت مقرر نہیں ہے ۔ کبھی صبح آتا ہے ۔ کبھی شام، انتظار میں صبح سے شام ہوجاتی ہے ۔ اگر رات کو آگیا تو کہئے سکون کی نیند سوئے ورنہ بار بار اٹھنا پڑتا ہے کہ شاید آجائے "۔

پوچھنے والے کسی بھی مرض کی کچھ نہ کچھ دوا بتا دیا کرتے ہیں لیکن اس مرض کی دوا کسی کو نہیں معلوم اور سب ہی اس مرض میں مبتلا ہیں ۔ اس مرض کی طرح اور بھی امراض ہیں مثلاً کپڑے کی قلت، اجناس کی قلت، تیل کی قلت وغیرہ لیکن ان تمام پر انسانی ذہن کی ترکیبوں نے کسی نہ کسی طرح قابو پالیا ہے ۔ اجناس کی قلت کو دور کرنے کا عام قاعدہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اس میں ریت ملادی جائے مگر جدید تحقیق لوبیے کے برادے کو ترجیح دیتی ہے کہ اجناس کے سلسلے میں مقدار سے زیادہ وزن کی اہمیت ہوتی ہے ۔ مرچ میں لکڑی کا برادہ مرچیے میں گوبر کا ملائم سفوف اور شکر میں نائیلان ملاوٹ کا سائنٹفک طریقہ ہے جس کی وجہ سے نہ صرف قلت پر قابو حاصل ہوتا ہے بلکہ ضمنی طور پر کچھ اور فائدے بھی حاصل ہورہے ہیں ۔ مثلاً آبادی میں کمی، اپاہجوں کی تعداد میں اضافہ ۔ سماج کی یہ بڑی خدمت ہے جس کی وجہ سے بیروز گاری کا مسئلہ حل ہوتا جارہا ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"۔ جو بانسریاں جاندار ہیں

اور بجنے پر ہی مصر ہیں انھیں، بے صدا بانسریوں کو ٹھکانے لگانے کا دھندا مل گیا ہے۔

پانی کی قلت سے نپٹنے کے لئے ہپیوں نے نہانا ہی چھوڑ دیا۔ پیدا ہوئے تو دایہ نے نہلایا تھا مرنے کے بعد خدا جانے۔ لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوا نہ ہی تمام لوگوں کے بے غسل رہنے سے حل ہوسکتا ہے۔ دنیا کے ذہین تاجروں کو سماج کی خدمت کی خاطر پانی میں ملاوٹ کا کوئی نہ کوئی طریقہ معلوم کرلینا ہی چاہیئے۔

اجارہ داری، قلت اور ملاوٹ دنیا کی ترقی کے اہم ستون ہیں پانی میں ملاوٹ کے بعد نہ تو نل کی ٹوٹی سے قطرہ قطرہ حوادث ٹپکیں گے نہ آسمان سے ندی نالے ابلیں گے۔ پانی پر کنٹرول حاصل کرلیا جائے تو جب اور جہاں جی چاہے بموں کی طرح برسایا جاسکتا ہے اور جہاں چاہا ناکہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ناکہ بندی پہلے بھی ہوتی تھی اور چھوٹے موٹے گروہ حقہ پانی بند کردیا کرتے تھے۔ پانی کی قلت سے کچھ ہی پہلے ایک فرعون بے سرو ساماں نے کڑکتے ہوئے بادلوں کی طرح گرج کر نلکے والوں کو دھمکی دی تھی کہ میں چاہوں تو تم لوگوں کا حقہ پانی بند کرسکتا ہوں۔ کہنے کو کہہ دیا لیکن جب واقعی نلوں کے حلق خشک ہوگئے تو لوگوں نے انھیں سوکھی زبانوں سے صلواتیں سنانی شروع کردیں۔ اب ظالم لاکھ صفائی پیش کرتا ہے کہ میں پانی بند کرنے والا کون؟ یہ تو خدائی قہر ہے۔ لیکن سنتا کون؟ خدا کا قہر لوگوں پر اور لوگوں کا قہر اس پر بے لگام برسنے کا۔ وہ تو خیر ہوئی چند رحم دل لوگوں نے بیچ بچاو کردیا ورنہ اس کے حقے کی گڑگڑاہٹ ختم ہونے میں کچھ کسر نہ تھی۔ جس طرح نلوں میں پانی بالاقساط آتا ہے اسی طرح لوگ قسطوں میں اس کی ایک ایک ہڈی کو پانی پلارہے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا بعض لوگ شرم سے پانی پانی ہوجاتے ہیں۔ لیکن اب ایسے لوگ کہاں، ورنہ پانی کا کال ہی کیوں پڑتا۔ اب تو لوگوں کا پانی مرگیا ہے۔ نہ چہرے پر پانی دکھائی دیتا ہے نہ آنکھوں میں۔ پہلے روتی عورت کو نہیں پتیاتے تھے۔ اب تو وہی قابل اعتماد ٹھیری۔ میاں گھر لوٹے ہیں۔ پیاس سے ہونٹ خشک ہوئے جارہے ہیں اس وقت تو ایسی عورت کی آنکھیں آب حیات کے چشمے سے کم نہیں۔ ورنہ "خالی کٹورے" آپس میں ٹکرا کر شور پیدا کرنے کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔ خالی برتن آئے دن گھروں میں ٹکراتے ہی رہتے ہیں۔ اور نل کی خرخراہٹ سن کر اگر نند بھاوج یا ساس بہو بڑبڑاجائیں اور ان کے برتن آپس میں ٹکرائیں تو اس میں نہ نل کا قصور ہوتا ہے اور نہ برتنوں کا۔ قصور ہمیشہ نند بھاوج اور ساس بہو کا ہی ہوگا۔ بلکہ اکثر صورتوں میں تو ان کا بھی نہیں صرف رشتوں کا ہوتا ہے۔

ایک گھر میں چار برتن ہیں۔ میاں بیوی اور ساس۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو تین ہوئے۔ کبھی کبھی دو اور ایک چار بھی ہوجاتے ہیں۔ یہ حسابی معاملہ ہے۔ کہیں نل بند نہ ہوجائے۔ نل کھلتے ہی بیوی پانی بھرنا شروع کردیتی ہے۔ کیونکہ شادی سے پہلے ساس نے داماد سے خوب پانی بھروایا تھا۔ اور آجکل تو سنتے ہیں کہ پانی بھرنا مہر معجل ٹھیرا ہے۔ بلکہ شادی کے بعد سسرال میں پانی بھرنا فرائض دامادی میں شامل ہوگیا ہے۔ لیکن یہ شادی قحط آب سے پہلے ہوئی تھی اس لئے بیوی ہی پانی بھرتی رہی اور اب کل اور آج میں توازن پیدا کرنے کے لئے میاں بیوی نے سمجھوتہ کرلیا ہے کہ ایک دن میاں پانی بھریں اور ایک دن بیوی۔ مگر یہ سمجھوتہ ساس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ بیوی پانی بھرتی ہو تو میاں کی ساس کی آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔ چلانے لگتی ہے "لے ہے! پانی بھرتے بھرتے میری بیٹی آدھی ہوگئی"۔ بیٹا اپنی باری میں جب پانی بھرتا ہے تو بہو کی ساس اپنی مصیبت کے نو مہینے یاد کرکے رونے لگتی ہے۔

ایک دن ہم وہاں پہنچے پانی کی جنگ زوروں پر چل رہی تھی، پاس پڑوس اور خاندان میں ہمارا بہت بلند مقام ہے۔ جہاں کوئی جھگڑا ہوتا ہے وہاں ہمیں انصاف کے لئے بلالیا جاتا ہے اور جہاں زندگی خاموش ندی کے مانند چلی جاتی ہے۔ ندی میں پتھر ڈالنے کے لئے بھی ہم بخوشی اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ بہرحال ہم نے سارے واقعات غور سے سنے اور فیصلہ سنادیا کہ پانی کوئی نہیں بھرے گا، دونوں

سمدھنیں مل کر بھریں گی یوں بھی ہمیں پانی بھرنے والوں سے دلچسپی سی ہوگئی ہے۔ کسی سے ملنے جاتے ہیں تو باتوں باتوں میں پہلے یہ معلوم کرلیتے ہیں کہ گھر کا پانی کون بھرتا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی گھر میں پانی مرد بھرتا ہے تو ہم اسی کے طرفدار ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ کام تو گھر کی عورت کا ہے ہمارے پاس تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیچارہ مرد دن بھر کا تھکا ماندہ گھر آتا ہے۔ تو اس سے پانی بھروانا کتنی شرم کی بات ہے"۔ جس گھر کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پانی بیوی بھرتی ہے تو ہم بیوی کے طرفدار ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "عورت کی ذات چھوئی موئی، کانچ جیسی نازک، ذراسی بداحتیاطی سے کمر بل کھا سکتی ہے۔ ناف ٹل سکتی ہے۔ وزن اٹھانا عورت کا کام نہیں۔ ہمارے پاس تو ایسا اندھیر نہیں"۔ اسی طرح کی "مخالف پانی" باتیں کرکے ہم نے اچھے اچھوں میں لڑائیاں لگائی ہیں۔

ایک دن ہمارے ایک چچا ملنے آئے۔ "آپ پری" پرہم نے کہا "یہاں تو اللہ کا فضل ہے، پانی کا سسٹم ہی الگ ہے۔ مانجرا سے آتا ہے۔ رات دن نل کھلا رہتا ہے اور اتنا تیز آتا ہے کہ رفتار کم کرنے کے لئے ہم نے درخواست دی ہے۔ لائٹ بھی فیل نہیں ہوتی۔ گرمیوں میں پنکھے کا بڑا آرام رہتا ہے"۔ اتنا سننا تھا کہ چچا کے چہرے کا رنگ فرط مسرت سے گرگٹ کی طرح بدل گیا۔ ہمارے اصرار پر بھی وہ نہ رکے یہ کہہ کر چلے گئے کہ پھر کبھی آئیں گے۔

دوسرے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی میلے کپڑوں کا گٹھڑ تے گھر میں گھسا چلا آرہا ہے۔ پہلے تو ہم نے سمجھا کہ دھوبی ہوگا۔ غور سے دیکھا چچا اپنی پوری ٹیم کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ صرف چچی صاحبہ کی کمی تھی جو کچھ ماہ پہلے "آوٹ" ہوچکی تھیں۔ رسمی علیک سلیک کے بعد پورے کھلاڑی نل پر ٹوٹ پڑے۔ "سرف" کا ڈبہ انھیں سامنے ہی رکھا مل گیا۔ پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصا گھر دھوبی گھاٹ میں تبدیل ہوگیا۔ کپڑے دھلے۔ غسل ہوا شام ہوگئی۔ ہم نے اخلاقاً کہہ دیا کہ اب شام ہوگئی ہے آپ لوگ نہادھوکر تھک گئے ہوں گے۔ رات کی رات رہ جائیے، صبح چلے جانا۔ چچا کہنے لگے "کوئی بات نہیں بیٹا! کئی دنوں سے تم سے ملنے کے لئے جی چاہ رہا تھا۔ کمبخت فرصت ہی نہیں ملتی۔ اب موقع نکل آیا۔ بچوں کے امتحان بھی قریب ہیں۔ یہاں نل لائٹ کا آرام ہے۔ وہاں تو بیچارے پانی بھرنے کے بعد چراغ لے کر بیٹھتے ہیں تو کچھ پڑھ بھی نہیں سکتے۔ بچوں کا بھی کئی دن سے اصرار تھا۔ لیکن نیک بختوں کو کتابیں لانے کا خیال نہ رہا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں صبح جاکر لے آوں گا۔ تم بھی دو حرف بتادینا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ ہم نے زیر لب کہا جی..... بالکل ٹھیک۔

وہ دن اور آج کا دن۔ ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ اب کسی کو نل لائٹ کے بارے میں صحیح بات نہیں بتائیں گے۔ ☆

ڈاکٹر حبیب ضیا

جلسے

جلسے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، با ادب جلسے، بے ادب جلسے، تعزیتی جلسے، تہنیتی جلسے وغیرہ۔ یہ کبھی مقررہ وقت پر شروع نہیں ہوتے۔ سامعین ہر دفعہ دھوکا کھاجاتے ہیں اور وقت پر آکر سیٹ سنبھال لیتے ہیں۔ پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ پون گھنٹہ پھر پورا ایک گھنٹہ۔ اتنی تاخیر کے بعد مختلف لوگ مختلف طریقے سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ سگریٹ پینے والے سگریٹ کے دھوئیں کا رخ اپنے بازو والے کی طرف موڑ دیتے ہیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جو پانچ منٹ قبل بھلا چنگا بیٹھا سیاست پر بحث کرنے کے عارضہ میں مبتلا تھا، اب اسے کھانسی کا عارضہ لاحق ہوجاتا ہے۔

ایک جلسے میں مہمان خصوصی وقت مقررہ پر نہیں آئے۔ سامعین بھی بہت کم تھے دور تک خالی کرسیاں ہی کرسیاں تھیں سامعین کو بہلانے کے لئے کنوینر نے غائبانہ کامنٹری کچھ اس انداز سے دینی شروع کی:

"حاضرین جلسہ اور خالی کرسیو! ابھی کچھ دیر میں مہمان خصوصی آنے والے ہیں حیدرآباد کے پست قد ادیب بلند قامت شاعر، چوٹی کے نقاد، بے چوٹی کے دانشور سب ہی جلسہ گاہ میں آرہے ہیں۔ وہ دیکھئے! سامنے میز پر پانی رکھا ہوا ہے۔ بے حد صفائی سے بھرا گیا ہے، ٹھنڈا بھی ہے۔ رنگ برنگی لباس پہنے شوخ و طرار لڑکیاں اس نادر انداز سے پانی پی رہی ہیں کہ پانی کے بہانے بہت سے معزز سامعین وہاں جمع ہوگئے ہیں۔ مہمان خصوصی کچھ ہی دیر میں آنے والے ہیں وہ دیکھئے گیٹ میں ایک لاری داخل ہوئی ہے جو لوگ کھڑے ہوئے ہیں جلدی سے اپنی نشستیں سنبھال لیں ورنہ لاری سے جو لوگ آئے ہیں ان کے کارن آپ لوگوں کو جگہ نہ ملے گی"۔

اکتاہٹ دور کرنے کے لئے جو حضرات ادھر ادھر ٹہل کر سگریٹ یا پانی پی رہے تھے جلدی سے نشستوں پر بیٹھ گئے۔ لاری قریب آئی تو پتہ چلا کہ مزید خالی کرسیاں آئی ہیں جلسہ گاہ میں جانے کے لئے۔

ادھر کنوینر نے پھر کہنا شروع کیا: "ابھی ابھی ٹیلی فون آیا ہے کہ مہمان خصوصی کچھ منٹ قبل نکل چکے ہیں بس اب آنے ہی والے ہیں۔ کچھ منٹ کچھ گھنٹوں میں تبدیل ہوگئے مہمان خصوصی کا دور تک پتہ نہ تھا سارے مقررین اپنی بھڑاس جو مہمان خصوصی پر نکالنے والے تھے معصوم اور بے قصور سامعین پر نکال کر چلتے بنے۔ مہمان خصوصی تین گھنٹے بعد آئے پتہ چلا کہ وہ دس منٹ قبل نکل تو چکے تھے لیکن حیدرآباد یا سکندرآباد سے نہیں بلکہ نلگنڈہ سے نکلے تھے۔ خفیہ طور سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مصلحتاً آنے میں دیر کی تھی اس جلسے کے تقریباً نصف مقررین ایسے تھے جو مہمان خصوصی سے اپنے مطالبات منوانے پر تل کر آئے تھے مسئلہ اردو کی روٹی کا تھا جسے بعض لوگ بے سوچے سمجھے حرام کی روٹی کہہ دیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ بھی زندگی بھر اسی روٹی پر پلتے ہیں۔ بہر حال ایسے جلسوں میں صدر یا مہمان خصوصی کے دیر سے آنے یا سرے سے نہ آنے میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔

ہر جلسے کے مقرر الگ الگ ہوتے ہیں، ایک صاحب جو عام طور پر محنت کش طبقے کے لوگوں سے مخاطب کیا کرتے تھے پہلی بار ادبی جلسے میں مدعو کئے گئے وہ انتہائی جوش و خروش سے تقریر کر رہے تھے ادبی جلسہ تھا با ادب لوگ بیٹھے ہوئے تھے دوران تقریر

انھوں نے سیدھی جانب بیٹھے ہوئے سامعین کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ مثال کے طور پر یہ رکشے والے! انھیں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتی نہ رہنے کا مناسب ٹھکانا۔ یہ روکھا سوکھا کھا کر رکشہ ہی میں سوجاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی سامنے کی نشستوں سے ایک صاحب جو پھول دار شرٹ پہنے براون کوٹ ہاتھ پر ڈالے بیٹھے تھے، غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "لیے چپ! کون بولتا ہے میں بھکارہ کے رکشے میں سوتوں پہلے چادر گھاٹ کی "نیاگرا" میں کھاکے رکشے میں سوتا تھا۔ اب ایر کنڈیشنڈ "نیاگرا" میں کھاکے فٹ پاتھ پہ سوتوں آٹو میرے باپ کا نہیں ہے۔ اس خیال سے کہ مزید بات نہ بڑھے منتظم جلسہ نے آگے بڑھ کر مقرر کا سیدھا ہاتھ مائیک سے باندھ دیا۔ تقریر میں روانی تھی۔ اسی روانی میں موضوع بھی تیزی سے بدل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے بائیں طرف بیٹھے ہوئے سامعین کی جانب اشارہ کر کے کہا:

"مثال کے طور پر دیکھئے یہ لڑکیاں ان کا لباس ان کی چال ڈھال۔ اتنا سننا تھا کہ ایک برقعہ پوش بے نقاب خاتون جو پورے میک اپ میں تھیں، اٹھ کھڑی ہوئیں۔ غصے سے بولیں "شرم نہیں آتی، میری عمر کا ہے میرے کو دیکھ ...." منتظم جلسہ نے جھٹ سے مقرر کا دوسرا ہاتھ بھی مائیک سے باندھ دیا۔ دور بیٹھنے والے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ جذبات سے بے قابو ہو کر انھوں نے خود کو سنبھالنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے مائیک تھام لیا ہے۔ بعض لوگ جلسے تو منعقد کرتے ہیں انتہائی اہتمام سے لیکن مقررین کی اتنی طویل فہرست بناتے ہیں کہ اکثر شائقین تو اخبار میں فہرست پر نظر ڈالتے ہی گھر بیٹھ جاتے ہیں پندرہ سولہ ناموں کا اعلان کیا جاتا ہے ان میں سے آنے والے صرف چھ سات ہی ہوتے ہیں۔ حسب روایت جلسہ دیر سے شروع ہوتا ہے۔ ہر مقرر چاہتا ہے کہ وہ اپنی ساری علمیت اسی جلسہ میں بانٹ دے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہمان خصوصی کی باری آنے تک منتظمین کا پیمانہ صبر چھلک جاتا ہے ایک ایسے ہی جلسہ کا ذکر ہے ایک خاتون اپنا ایم۔ فل کا مقالہ لے کر آگئی تھیں۔ سامعین کی طرف سے خطرے کی گھنٹیاں بجنے کے باوجود وہ بغیر ڈنڈی مارے پورا مقالہ سنا کر ہی مائیک سے ہٹنا چاہتی تھیں۔ منتظم جلسہ نے ایک مرتبہ اشارتاً ان سے درخواست کی، اس پر انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ دوسری مرتبہ پھر وہ مائیک کے قریب آئے اس دفعہ تو منتظم اور مقرر دونوں کے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ منتظم کے کچھ کہنے سے پیشتر انھوں نے آنکھوں سے ایسے جھڑکی دی گویا کہہ رہی ہوں "ہٹ! یاں کس پر رعب جمارئے" منتظم انتہائی درجہ شریف آدمی تھے بعد میں انھوں نے صرف یہ کہہ کر خود کو سنبھال لیا "سالی عورت تھی۔ نہیں تو ہاتھ پکڑ کے ہٹا دیتا تھا"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرد لوگ سالی اور عورت کا کتنا زبردست احترام کرتے ہیں۔

تعزیتی جلسوں کے مقرر بالکل الگ نوعیت کے ہوتے ہیں مائیک پر آنے کے بعد وہ عمداً بھول جاتے ہیں کہ جلسہ مرحوم سے متعلق ہے۔ ایک بہت بڑے مورخ اور نقاد کا تعزیتی جلسہ تھا، ایک صاحب تقریر کے لئے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا "مرحوم مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تو بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں نے مرحوم سے پڑھا بھی تھا۔ بی۔ اے میں ان کی کلاس میں ایک دن بیٹھا تھا۔ وہ میری علمی صلاحتیوں کا لوہا مانتے تھے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تو ہی وہ واحد انسان ہے جو تمدیح پر کتاب لکھ سکتا ہے"!

یہ صاحب مسلسل "میں میں" کئے جارہے تھے کسی منچلے نے پیچھے سے پکارا "یہ ڈینگیں لکھ کے دے دیو تمہارے جلسے میں میں سناتوں"۔

بعض جلسوں میں تقاریر ختم ہونے کے بعد اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں ایک مقرر کے مائیک سے ہٹتے ہی سامعین میں سے ایک صاحب نمودار ہوئے شیروانی کے کالر پر ڈیڑھ انچ میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ مائیک کی طرف بڑھتے

ہوئے بولے "میں صرف دو منٹ لینا چاہتا ہوں"۔

سامعین ایسے لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں جنھیں کچھ کہنا نہیں ہوتا صرف مائیک پر آنے کا شوق ہوتا ہے۔

ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک شریر لڑکے نے ان کی شیروانی کا دامن پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا "چچا! یہیں سے بولو"۔

اب رہے جلسے کے منتظمین۔ ان کا زیادہ وقت چونکہ اسٹیج پر گزرتا ہے اس لئے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جلسہ شروع ہونے سے دو گھنٹے قبل، دوران جلسہ اور پھر جلسہ ختم ہونے کے بعد تک یہ اسٹیج پر چلتے پھرتے بلکہ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ہر پانچ دس منٹ بعد وہ مہمان خصوصی یا صدر جلسہ کے پاس آکر آہستہ سے کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ایک منتظم اسٹیج پر ضرورت سے زیادہ آکر مہمان خصوصی کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے ہم نے اپنے قلم کو بھیجا کہ جلدی سے بھید لے آئے۔ سنا کہ وہ کہہ رہے تھے:

"میں کچھ نہیں بول رہا۔ آپ زور سے منڈی ہلائیے"۔

تکلیف

حفیظ جالندھری سر کے بالوں کے سلسلہ میں "فارغ البال" ہیں۔

کسی خوش فکر دوست نے پوچھا:

"حفیظ صاحب! سر کے بال نہ ہونے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

"تکلیف کیا ہوتی ہے ۔۔۔؟"

حفیظ نے جواب دیا

"البتہ وضو کرتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ منہ کو کہاں تک دھونا ہے"۔

●☆●

باکمال

محمود جالندھری سے کسی نے ایک پرانے استاد قسم کے شاعر کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"محمود صاحب! ان کی کیا بات ہے۔ ایک دفعہ کہہ رہے تھے یہ آزاد شاعری کیا بکواس ہے۔ کسی آزاد نظم کو میرے سامنے لاؤ میں اسے پابند کر سکتا ہوں"۔

محمود نے فی الفور جواب دیا۔

"واہ یہ بھی کوئی قابلِ تعریف بات ہے میرے سامنے کوئی پابند نظم لاؤ میں اسے آزاد نظم کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہوں"۔

●☆●

ڈاکٹر حبیب ضیاء (حیدرآباد)

ہم نے فلیٹ خریدا

برسوں کھلے اور ہوادار آنگن میں سانس لینے کے بعد ہم نے فلیٹ خریدنے کی ٹھانی۔ فلیٹ کا تصور آتے ہی گلاب، چنبیلی، موتیا کی خوشبو اور پھل دینے والے درختوں سے محرومی کے اندیشے ستانے لگے۔ لیکن فلیٹ بہر حال لینا ہی ٹھہرا۔ دوست احباب اور رشتہ داروں نے دل کھول کر مخالفت کی۔ زمین اپنی نہ آسمان اپنا والا جملہ متعدد بار سننے کو ملا۔ ہم جو فلیٹ لینے والے تھے ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ مالک سے دوران گفتگو ہم نے اپنی پریشانی کا اظہار کر ہی دیا۔ ہم نے کہا سبھی مخالفت کررہے ہیں اور یہ کہہ کر ڈرا رہے ہیں کہ فلیٹ میں اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ انہوں نے ہمیں تسلی دی، پانی پیش کیا۔ کہنے لگیں کون کہتا ہے کہ زمین آسمان اپنے نہیں ہوتے۔ دونوں اپنے ہیں۔ اپنانے کا سلیقہ چاہئے۔ ہم نے پوچھا وہ کیسے؟ جواب ملا میں فلیٹ سے کچرا زمین پر پھینکا کرتی ہوں اور چھت پر جاکر بڑیاں سکھاتی ہوں۔ زمین آسمان میرے ہوئے کہ نہیں؟ اس سے ڈھارس سی بندھی ہم فلیٹ میں آگئے۔

اکثر فلیٹ کے سامنے گراونڈ نہیں ہوتا، جہاں بچے کھیل سکیں تو جہاں جتنی جگہ ملی، وہلے گراونڈ بن گیا۔ ہمیں یہاں آئے چند ماہ ہوئے تھے۔ ملازمت اور گھر کے کام کاج کے بعد دل و دماغ کو سکون دینے کا جوں ہی منصوبہ بناتے، بچوں کی اچھل کود اور کرکٹ کے ماہر کھلاڑیوں کے شور سے کافی حرج ہوتا۔

دروازے پر بڑے چھوٹے ہر قسم کے گولے آکر لگتے۔ چند دن ہم انجان رہے۔ یہ سوچ کر کہ کالجوں میں جس طرح نئے سال پر ریگنگ Ragging کی جاتی ہے اسی طرح نئے پڑوسی کو ستایا جاتا ہوگا۔ جب ہماری غلط فہمی دور ہوگئی تو ہم نے انتہائی انکساری سے کہا "بال کی آواز بہت تکلیف دہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض گھروں میں ضعیف، بیمار، دل کے مریض بھی ہوں"۔ پڑوسن نے بے اعتنائی سے کہا "دوسروں سے آپ کو کیا لینا دینا۔ یہ دنیا آنی جانی ہے۔ بال کی آواز سے مرنا ہے تو وہ اسی طرح سے مرے گا۔ اللہ تعالی نے ہر ایک کی موت کا کوئی نہ کوئی سبب رکھا ہے۔ آپ اپنی خیر منائیے۔"

یہاں رہنے والے کافی مہذب اور شائستہ ہیں۔ ایک دفعہ لفٹ میں ایک صاحب بچے کو لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے لفٹ روک کر دروازہ کھولا۔ ہم نے کہا "ہمیں نیچے جانا ہے"۔ وہ بولے۔ "کوئی بات نہیں، تشریف لایئے۔ میں آپ لوگوں کو چھوڑ آؤں گا۔ دراصل میں اپنے نواسے کو لفٹ میں بہلا رہا ہوں۔ پہلے بہت دیر تک روتا تھا۔ اب لفٹ میں سنبھل جاتا ہے۔ بس پانچ دس منٹ میں سوجائے گا۔"

پانچویں منزل پر ہم نے چار گھروں کے درمیانی حصے میں No Smoking کی تختیاں لگی دیکھیں۔ غالباً کسی نے عاجز آکر یہ اقدام کیا تھا۔ فرش پر نظر پڑی تو جگہ جگہ ادھ جلے سگریٹ پائے گئے۔ اسی اثناء میں ایک گھر کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ ایک عدد کمسن بچہ برآمد ہوا۔ اس سے ہم نے پوچھا: "بیٹے! یہاں سگریٹ کون ڈالتا ہے؟"

بچے نے خوشی خوشی کہا: "جی۔ سگریٹ میرے انکل پیتے ہیں۔ شکاگو سے آئے ہیں۔"

ہم نے کہا: "ماشاء اللہ بڑے مہذب ہیں۔ شکاگو سے آئے ہیں۔" بچے کی خوشی کی انتہا نہ رہی بولا۔ "پرسوں تاور س میں جو

فائر انجن آیا تھا نا۔ وہ انکل کی سگریٹ ہی کی وجہ سے آیا تھا۔"

ایک دن ہم گھر سے نکل کر نیچے اترے ہی تھے کہ بالکنی سے آم کے چھلکے سر پر آگرے۔ ہم نے اوپر آکر مکین کو نرم لہجے میں مشورہ دیا کہ کچرا بالکنی سے نیچے پھینکنے کی بجائے پلاسٹک میں باندھ کر دروازے کے باہر رکھ دیا کریں۔ جمعدارنی تو آتی ہی ہے۔"

انہوں نے اکھڑے لہجہ میں جواب دیا: "یہ چالیں مجھے مت سکھایئے۔ دس سال سے یہاں رہتی ہوں۔ آپ ابھی نئی نئی آئی ہیں۔ کچرا پلاسٹک میں بند کرنا مجھے بھی آتا ہے۔ میں پیاز کے چھلکے بند تھیلی میں رکھتی ہوں۔ میووں کے چھلکے اوپر سے پھینکتی ہوں۔ آخر میرا معیار زندگی بھی تو کچھ معنی رکھتا ہے۔"

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فلیٹ نمبر 816 میں ساس، بہو پر طنز کے تیر برساتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ 912 کی بہو نشانہ بنی۔ 420 میں کوئی شریف آدمی اپنی بیوی کو ننگی گالیاں دیتا ہے تو شبہ کسی غیر شائستہ انسان کی طرف جاتا ہے۔

یہاں سب ایک خاندان کی طرح مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک دن ایک امریکہ ریٹرنڈ خاتون ہمارے پاس آئیں۔ پوترے کی شرارت کا ذکر کرتے ہوئے فخریہ کہنے لگیں۔ پتہ ہے آپ کو؟ ذرا سی بات نہ سننے پر کل میرے سات سالہ پوترے نے مجھ سے توبہ کروائی۔ ہم نے انہیں مبارکباد دی۔ بے فکر رہئے۔ آغاز اچھا ہے۔ انشاء اللہ چند ماہ بعد آپ اٹھ بیٹھ کریں گی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ناشکرے لوگوں کو عبرت دلانے کی خاطر بڑے بڑے ٹاورس کے پہلو میں غریبوں کی ایک بستی ہوتی ہے۔ جس میں ٹی وی کے اینٹنا نصب ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایک ایسی ہی بستی ہے۔ دن بھر کی چہل پہل ختم ہونے کے بعد جب سارے ماحول پر سکوت سا چھا جاتا ہے۔ یہ بستی والے اپنا اصلی روپ دھار لیتے ہیں۔ رات کا کھانا ہضم کرنے کیلئے روزانہ ایک لڑائی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح گالیوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ زنانی اور مردانی ہر قسم، ہر معیار کی گالیاں سادگی، صفائی اور روانی سے دی جاتی ہیں۔ بعض زنانی گالیاں اتنی جان دار اور خطرناک ہوتی ہیں کہ انہیں سن کر وہ حضرات بھی گھروں میں چھپ جاتے ہیں جو اپنی بیوی کو جھگڑا کرنے سے منع کرنے کیلئے باہر آئے تھے۔ تماشائے اہل سلم دیکھنے والے بھی گھر کے دروازے بند کرلیتے ہیں۔ جن کی مادری زبان تلگو ہے وہ بھی نہ صرف لگاتار ایک ایک گھنٹہ اردو میں لڑتے ہیں بلکہ شستگی سے اردو ہی میں گالیاں دیتے ہیں۔ قومی یک جہتی کی اس سے عمدہ مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ ویسے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ ہم اردو والوں کو مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جب تک یہ بستیاں بھی رہیں گی کوئی سالا۔ معاف کرنا، کسی کی بیوی کا بھائی اردو کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ غزل کی خاطر اردو سیکھنے والوں کی طرح گالیوں کے چسکے میں اب کئی حضرات تعلیم بالغان کے مراکز پر دیکھے جا رہے ہیں۔

حالت نشہ میں انسان سچ بات کہہ جاتا ہے۔ آپ نے اکثر پکچرس میں دیکھا ہوگا کہ کسی سے سچ اگلوانا ہو تو ہیرو ویلن کو کسی طوائف کے ہاتھوں شراب پلا دیتا ہے۔ ایک رکشہ والا ہے جو رات دیر گئے حالت نشہ میں بستی میں واپس آتا ہے۔ غالباً ہر روز وہ ایک غلط دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ جب دروازہ نہیں کھلتا تو وہ ماں بہن کی گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے۔ یوں بھی بعض معزز حضرات جب گالیاں دیتے ہیں تو ماں بہن کی صراحت نہیں ہوتی۔ یقیناً وہ اپنوں ہی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ خونی رشتہ داروں کو بغیر کپڑے پہنی ہوئی گالی دینے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

چند ماہ قبل ہم نے ایک فلیٹ کی بالکنی میں ایک طالب علم کو پڑھنے میں منہمک دیکھا۔ رات دیر گئے تک اس کی مصروفیت اور حصول علم کی لگن دیکھ کر ہم نے دل میں سوچا کاش سارے بچے اسی انہماک سے پڑھتے۔ کاغذ قلم کے ساتھ میز پر ٹیپ ریکارڈر دیکھ کر جستجو ہوئی کہ یہ متضاد چیزیں یک جا کیسے ہوگئیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ ایم فل کے لئے مقالہ لکھ رہا ہے۔

مقالے کا عنوان ہے "اردو زبان میں گالیوں کا آغاز و ارتقاء اور سماج میں ان کی افادیت"۔ اس طالب علم کا دستور تھا کہ بستی میں جب بھی لڑائی شروع ہوتی وہ فوراً ٹیپ کرلیتا۔ معلوم ہوا کہ دو چار دن کا وقفہ ہوجاتا اور اس کا ریسرچ پراجکٹ متاثر ہوتا تو وہ مقالے کے نگران کے مشورے پر دو ایک چھوٹے پتھر بالکنی سے مکانوں پر پھینک دیتا۔ ایک پتھر کی برکت سے اس کا پراجکٹ کافی آگے چل نکلتا۔

گذشتہ ہفتے ایک صاحبہ ہم سے ملنے آئیں۔ ہمارے لئے اجنبی تھیں۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد انھوں نے پوچھا۔ فلیٹس میں بچے اور ہم تو نہیں مچاتے ؟"

ہم نے کہا "ارے آپ بھی کیا بات کرتی ہیں۔ یہاں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ بچے بھی رہتے ہیں۔ فیملی پلاننگ کا نعرہ "ہم دو" پر ہی دم توڑتا نظر آتا ہے"۔ ان کے چند اور سوالات تھے۔ "لفٹ میں زیادہ وقت لفٹ کے باہر تو نہیں گزارتے ؟" بچے دیوان خانے کا کام باہر ٹھیری ہوئی اسکوٹر سے تو نہیں لیتے ؟ لوگ گھر کا کچرا باہر تو نہیں پھینکتے ؟ نفی میں جواب سن کر وہ مسکرائیں۔ بولیں۔ میں اسی ٹاور میں رہتی ہوں۔ لوگوں کا بھرم رکھنے کیلئے دو سال تک میں بھی یہی کہتی تھی۔

ہم نے پوچھا: "پھر اب ؟"۔ اب۔ میں نے فلیٹس میں رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے "۔ کیسا ڈھنگ ؟" وہ بولیں۔ اب میں بھی اپنے بچوں کو دوپہر میں باہر نکال کر آرام سے سوتی ہوں۔ گھر کا کچرا پڑوسن کے گھر کی طرف ڈھکیل دیتی ہوں۔ لفٹ مین کی لاپروائی اور غیر حاضری سے جب لفٹ بار بار خراب ہوتا ہے تو ہانپتی کانپتی چھٹی منزل تک سیڑھیوں سے چلی جاتی ہوں پھر بھی میں خوش ہوں اس لئے کہ یہ میرا اپنا گھر ہے اپنا فلیٹ ہے۔ ☆

فنونِ لطیفہ

ایک بار کسی ادیب نے مجاز سے کہا:

"مجاز صاحب! ادھر آپ نے شعروں سے زیادہ لطیفے کہنے شروع کردئے ہیں"

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ؟"

اور وہ ادیب مجاز کی اس بات پر واقعی گھبراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب کسی مشاعرہ میں آپ شعر سنانے کے لئے کھڑے ہوں گے تو لوگ کہیں گے شعر نہیں اپنے لطیفے سنائیے"۔

"تو میں ان سے کہوں گا..." مجاز نے نہایت صفائی اور سادگی سے کہا

"کہ شاعری بھی تو فنونِ لطیفہ میں سے ہے"۔

●☆●

نامور مزاح نگار شفیق الرحمن (پیدائش ۱۹۲۰ء) کا گزشتہ مہینے انتقال ہوگیا۔ ہندوستان میں ان کے انتقال کے کئی دن بعد یہ خبر شائع ہوئی۔ حیدرآباد کی ممتاز ادیب محترمہ عابدہ محبوب کو ان کے ایک رشتہ دار نے پاکستان سے یہ اطلاع دی تھی۔ عابدہ محبوب صاحبہ نے چند سال قبل شفیق الرحمن سے ملاقات کی تھی۔ (ملاقات کی تفصیل شگوفہ میں شائع ہوئی تھی)۔

شفیق الرحمن کے انتقال سے اردو مزاح نگاری کا ایک باب ختم ہوگیا۔ شفیق الرحمن یوں تو طالب علمی کے دور سے ہی لکھتے اور اہم رسائل میں چھپتے رہے ہیں، لیکن ۱۹۴۳ء کے بعد ان کی تحریروں میں نیا موڑ آیا۔ ان کے رومانی افسانوں کی شگفتگی اور طنز و مزاح کی چٹک نے قاری کو ان کا گرویدہ بنادیا تھا۔ آزادی سے کچھ پہلے اور کچھ بعد کا دور صحیح معنی میں شفیق الرحمن کا دور تھا۔ یوں تو یہ ادب کا زرین دور تھا۔ لیکن اعلیٰ درجہ کے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان شفیق الرحمن نے اردو کے قاری کو شوخی اور برجستگی کی ایک ایسی صنعت سے آشنا کیا، جس کا ذائقہ کسی اور کے ہاں ناپید تھا۔ ہلکا پھلکا رومان، سیدھی سادی کہانیاں، شوخی، شرارت، نوجوانوں کی محفلیں، تفریح، سیر سپاٹے، دلچسپ و منفرد کردار، جن کی گفتگو اور حرکتوں میں فقرے بازی، شگفتہ ادبیت اور زندگی سے بھرپور چٹکیاں دگدگدیاں تھیں۔

ان تمام خوبیوں نے شفیق الرحمن کو اپنے عہد کا ایک مقبول ادیب بنادیا تھا۔ بیس پچیس سال کی خاموشی کے بعد شفیق الرحمن کی دو کتابیں دجلہ ۱۹۸۰ء میں اور دریچے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئیں۔ اور پھر شفیق الرحمن نے چپ سادھ لی۔ لیکن پچھلے پچاس سال میں ایسے کئی ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے شفیق الرحمن کے رنگ کو اپنے خاص انداز میں اپنانے کی کوشش کی۔

ماہ مئی کے شمارے کے ذریعہ ہم کرنل محمد خاں کو خراج عقیدت پیش کریں گے اور بہت جلد شفیق الرحمن کے فن و شخصیت پر خصوصی شمارہ شائع کریں گے۔

● زیر نظر شمارے میں ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر حبیب ضیا پر خصوصی گوشہ شریک کیا جارہا ہے وقتاً فوقتاً خصوصی گوشہ کی اشاعت کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور ہم عصر طنز و مزاح نگاروں کے فن و شخصیت کا ان صفحات میں جائزہ لیا جائے گا۔

●☆●☆●

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

اشاعت کا ۳۳ واں سال

شگوفہ

جلد ۳۳

شمارہ ۵

حیدرآباد

ایک شمارہ - کرنل محمد خاں کے نام

مئی ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کمپیوٹر کتابت :

SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373

طباعت :

دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپئے زرسالانہ : ۱۵۰ روپئے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

(فہرست)

تنقید

انتخاب تصانیف محمد خاں

سفر نامہ

By Qaruri (Courtesy: Al-Madinah)

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

جوئے ظرافت

بقول ضمیر جعفری:

"اردو مزاح نگاری میں کئی ایک اسکول قائم ہوچکے ہیں لیکن جن اسکولوں کی باقاعدہ رجسٹریشن ہوچکی ہے ان کی تعداد تین ہے۔ "پطرس بخاری اسکول"، "رشید احمد صدیقی اسکول" اور "آرمی کا انفنٹری اسکول" بلاشبہ کرنل محمد خان "آرمی انفنٹری اسکول" کے ڈپٹی کمانڈنٹ کے طور پر مزاح نگاری کا نشان حیدر حاصل کرچکے ہیں"۔ (ضلیپ۔بہ سلامت روی)

کرنل محمد خان کے بارے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انھوں نے خود میں مصنفانہ جراثیم بہت بعد میں محسوس کئے۔ گویا پینتالیس سال تک انھیں احساس تک نہ ہوسکا کہ وہ کچھ لکھ سکتے ہیں اور پھر ادب میں ان کا آنا ایک حادثے سے کم نہ تھا۔ جس طرح ان کا لکھنا ایک حادثاتی عمل تھا۔ اسی طرح ان کا مصنف بن جانا بھی سب کے لئے حیرت کا باعث تھا۔ طاہر مسعود اپنے ایک انٹرویو میں لکھتے ہیں:

"میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں لکھ سکتا ہوں۔ وہ تو اتفاق سے میں نے لکھنا شروع کیا تو دوست احباب کو میری تحریریں بھاگئیں اور وہ کہنے لگے کہ یار! تم تو بہت اچھا لکھتے ہو۔ لہذا میں لکھتا چلا گیا"۔ (یہ صورت گر۔طاہر مسعود)

میں کس طرح مصنف بنا؟ "بجنگ آمد" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میجر مسعود احمد مدیر "ہلال" نے اپنے اخبار کے ایک خاص شمارے کے لئے ہمیں کچھ لکھنے کو کہا۔ ہم نے جلد بازی میں نہ صرف وعدہ کرلیا بلکہ اپنے علم و فضل کی تیز روشنی میں قارئین "ہلال" کی آنکھیں خیرہ کرنے کے لئے اپنے موضوع کا بھی اعلان کردیا۔ یعنی "تعمیر کردار میں اقتضائے بشریت کی بوقلمونیاں" لیکن بعد میں لکھنے بیٹھے تو عنوان کی تابناکی سے ہماری اپنی آنکھیں چندھیا گئیں اور کچھ نہ لکھ سکے۔ تاریخ وعدہ قریب آتی نظر آئی تو ہمیں حسیب سے ایسا موضوع سوجھا جو ہمارے کام اور شاید نام سے بھی مناسبت رکھتا تھا یعنی یہ کہ "ہم لفٹین کیسے بنے؟"۔ یہ ایک طرح سے ادبی مورچہ کھودنا تھا۔ چنانچہ ہم نے دماغ اور پھٹوں کی مشترکہ مدد سے سوچا اور اپنے زور قلم اور زور بازو کے طفیل ایک مضمون بعنوان "لفٹینی" لکھ ڈالا جو "ہلال" میں شائع ہوگیا۔ یہی مضمون اس کتاب کا پہلا باب ہے۔ چند ماہ بعد "ہلال" کا ایک اور خاص نمبر چھپنے لگا تو مدیر "ہلال" نے پھر یاد فرمایا۔ اب کے ہم نے دیانت داری سے کام لیا اور اقبال کرلیا کہ "ہمارے پاس ایک ہی موضوع تھا جو کام آچکا ہے اور اب ہمارے

اندر مزید مضمون نگاری کا مادہ ختم ہوگیا ہے لیکن جناب مدیر بیس کر کہنے لگے "وہ موضوع ختم ہونے والا نہیں۔ لفٹینی سیکھنے کے بعد اسے استعمال بھی کیا ہوگا۔ بس ترکیب استعمال پوری کچھ لکھ دو "۔ سوچا تو یاد آیا کہ کچھ کیا تو تھا۔ چنانچہ وہی لکھ دیا۔ اس کے بعد تو "بلال" کے خاص شماروں میں کمی آئی اور نہ ہماری لفٹینی کے کارناموں میں۔ حتیٰ کہ جنگ ختم ہوگئی لیکن اب جو دیکھا تو ہمارا اعمال نامہ مرتب ہوچکا تھا۔ فرشتوں سے تو پہلے ہی یہاں چھپا تھا اب انسانوں کی نظروں میں بھی آگیا۔ سوچا کہ اب یہ حکایت عام ہوئی ہے اب پردہ کیسا؟ اسے ایک جگہ جمع کردو آگے چل کر دائیں ہاتھ ملے گا یا بائیں ہاتھ میں، کم از کم وزن کا اندازہ تو ہوجائے گا"۔ (بجنگ آمد)

کرنل محمد خان کی ادب میں آمد جس انداز میں ہوئی اس کا ذکر مذکورہ بالا سطور میں ہوچکا ہے اور پھر کس طرح انھوں نے اقلیم ادب پر اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑے یہ جاننے کے لئے کرنل صاحب کی تحریروں کا کچھ تفصیلی جائزہ لینا ہوگا۔ مگر "بسلامت روی" کے مقدمہ میں اس پیشگی وارننگ کے بعد یقین کریں کوئی "مائی کالال" ہی یہ حوصلہ کرے گا۔ لکھتے ہیں:

"یہ کتاب ہم نے دوستوں کی خاطر لکھی ہے۔ اگر آپ بھی اسے دوستانہ نگاہ سے دیکھیں تو ممکن ہے کچھ محظوظ ہوں۔ لیکن اگر آپ نے اسے ناقدانہ ہی دیکھنا ہے اور آپ کو اس طرح دیکھنے کا پورا حق ہے تو ہمیں خوف ہے کہ شاید محظوظ تو ہوں یا نہ ہوں۔ آپ اپنا تنقیدی طیش ایک غلط کتاب پر ضائع کردیں گے۔ اور بے سبب ضائع کریں گے۔ کیوں کہ اس کتاب کو کسی دانائی یا یکتائی کا دعویٰ نہیں یہ محض حلقہ یاراں میں ایک یار کی داستان طرازی ہے"۔

(بہ سلامت روی)

یہاں اس وارننگ سے متاثر ہو کر اپنے "تنقیدی طیش" سے مجتنب ہو کر صرف کرنل صاحب کی انفرادیت کا کھوج لگانا مقصود ہے کہ آخر اس میں کیا بات ہے کہ وہ آیا اس نے لکھا اور تسلیم کرلیا گیا۔

کرنل محمد خان نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا اگرچہ اسے ہم مزاح نگاری کا سنہری دور تو نہیں کہہ سکتے لیکن محمد خان تک آتے آتے مزاح نگاری کی روایت خاصی مضبوط ہوچکی تھی۔ اردو نثر کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو پطرس بخاری اور شفیق الرحمن کا شمار ایسے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جو قیام پاکستان سے قبل ہی اپنی حیثیت منوا چکے تھے۔ پطرس بخاری نے فکاہی ادب میں انگریزی ادب کے حوالے سے جس نئے اسکول کی بنیاد ڈالی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ شفیق الرحمن نے جس انداز سے اس روایت کو آگے بڑھایا اور پھر بعد میں آنے والوں میں ابراہیم جلیس، ابن انشاء، مشتاق احمد یوسفی، امجد حسین اور ضمیر جعفری نے اسے نقطہ عروج تک پہنچادیا۔ کرنل محمد خان اپنے پیش رو مزاح نگاروں میں سے پطرس بخاری سے براہ راست متاثر ہیں اور ان کے اسلوب کا اثر کسی نہ کسی طور "نو آموز" مزاح نگار کے اسلوب پر پڑا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"صرف ایک مزاح نگار کو میں نے بے تحاشا پڑھا ہے۔ پطرس بخاری جنھیں آج بھی میں اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔ انھیں میں نے ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ اپنے کالج کے زمانے میں پڑھا۔ ان کی کتاب "پطرس کے مضامین" میرے ہاتھ لگی۔ جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھ پر جادو کردیا ہو اور میں سوچنے لگا کہ ایسا کوئی فارمولا دریافت ہو کہ میں بھی ایسا

ہی لکھنے لگوں۔ اسی زمانے میں میں نے اپنے کالج کے رسالے میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن ان کی تعداد صرف چند ایک مضامین تک ہی محدود تھی۔ میں نے لکھتے وقت پطرس کے اسلوب کو اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے پطرس بننا میرے لئے ممکن تو نہیں تھا البتہ یہ ضرور ہوا کہ میرا اپنا ایک الگ اسلوب بن گیا۔ جس نے بعد میں کتاب لکھتے وقت میری کافی مدد کی"۔
(بہ صورت گر)

کرنل صاحب کے اپنے اس بیان سے ہم انہیں پطرس کا مقلد تو نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اپنے اسلوب کی انفرادیت بہرحال اپنی جگہ قائم ہے۔ "آرمی انفنٹری اسکول" کے دوسرے مزاح نگاروں میں سے شفیق الرحمن کے ہاں پایا جانے والا مزاح محمد خان کے مزاح سے بہت مختلف ہے۔ ان کے ہاں زیادہ تر ایک کھلنڈرے لڑکے کی حماقتیں اور ایک رومانٹک نوجوان کی مضحکہ خیزیاں ملتی ہیں ان کے ہاں مزاح واقعہ سے خود بخود پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ شعوری طور پر مزاحیہ کرداروں کی مدد سے ایسے حالات پیدا کردیتے ہیں کہ صورت حال مضحکہ خیز شکل اختیار کرلیتی ہے۔ گویا ان کا مزاح شعوری رنگ رکھتا ہے اور ان کے ہاں رومانٹک رویے مزاح پر غالب ہیں۔ جو مضامین کو افسانے سے قریب تر لے آتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں اور "پرواز" "شگوفے" کے مضامین میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ شفیق الرحمن کے ہاں مزاح ہے۔ شگفتگی ہے اور صورت حال کی تضحیک کر کے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف کرشن چندر کے ہاں رومانوی رویے انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔

ضمیر جعفری خالصتاً مزاح نگار ہیں۔ طنز ملیح سے بھی کبھی کبھار کام لیتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے ہاں کھل کر قہقہہ لگانے کی صلاحیت موجود ہے۔ شفیق الرحمن کا مزاح صرف مسکرانے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہاں قاری قہقہہ لگانے پر مجبور نہیں ہوتا۔ چہرے پر صرف بشاشت آجاتی ہے۔ انسان کھکھلاتا نہیں ہے بلکہ خود کو مسکرانے پر آمادہ کرتا ہے مگر ضمیر جعفری پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ بلکہ انسان کھل کر مسکراتا ہے۔ صدیق سالک کو اگرچہ باقاعدہ مزاح نگاروں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان کے ہاں مزاح کا رنگ غالب ضرور ہے ان کے موضوعات آدمی کے معاملات سے متعلق ہیں ان کی تحریروں کا مابعد تاثر خوشگوار نہیں ہے ان کی تحریروں کے نتیجے کے طور پر قاری رنجیدہ ہوجاتا ہے۔ اس حزنیہ تاثر کا سبب ان کا موضوع ہے اور یہ موضوع چونکہ شکست سے متعلق ہے اسی لئے ان کی تحریروں میں ایک ہلکا سا کسیلا پن بھی پایا جاتا ہے۔ بعینہ جیسے چینی کھانے کے بعد زبان پر ایک ہلکا سا کسیلا ذائقہ آجاتا ہے۔ مزاح نگار یا تو لوگوں پر ہنستا ہے یا سماج پر۔ لیکن صدیق سالک کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ قومی رویوں پر ہنسنے کا رویہ رکھتے ہیں اور یہی ان کے مزاح کی اساس ہے۔

کرنل محمد خان ان سب مزاح لکھنے والوں سے اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ نہ تو شفیق الرحمن کی طرح ان کے ہاں رومانیت ہے نہ ہی ضمیر جعفری کی طرح اپنے ماحول اور معاشرے کی مجموعی صورتحال پر ہنسنے کا رویہ۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک محدود موضوع کو لے کر اسی میں اپنی انفرادیت دکھائی ہے اور اپنی شگفتگی کے پھول کھلائے ہیں۔ بعینہ ایسے جیسے کوئی شخص خام لوہے کو پارس پتھر سے چھو کر کندن بناتا ہے انہوں نے بھی ایک محدود موضوع کو اپنی طبع کے پارس سے چھو کر کندن بنادیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب "بجنگ آمد" خود مصنف کے بقول :

"ایک لفٹین کی جنگ بیتی ہے اس میں تصوف، فقہ یا علم الکلام پر دیدہ دانستہ کوئی بحث نہیں کی گئی۔ اس میں صرف ان باتوں کا ذکر ہے جو سیکنڈ لفٹینوں کو اپنی زندگی خصوصاً جنگی زندگی میں پیش آتی ہیں"۔ (بجنگ آمد)

بظاہر یہ ایک محدود موضوع ہے اور اتنے محدود موضوع کو اتنی خوبصورتی اور شگفتگی سے نبھانا کہ اس میں مزاح کے لئے روشن امکانات پیدا ہوجائیں یہ صرف کرنل محمد خان کا ہی خاصہ ہے۔ ورنہ بے شمار لوگوں نے اپنی فوجی زندگی کو اس انداز سے گزارا اور پھر ان واقعات کو احاطہ تحریر میں بھی لائے، مگر جو رنگ اس بزم میں کرنل محمد خان نے "بجنگ آمد" لکھ کر جمایا ہے کسی اور کے حصے میں نہ آسکا۔ ان کی انفرادیت کا ایک رنگ یہ بھی بنتا ہے کہ وہ اپنی پہلی کتاب کے موضوع کو لے کر آگے نہیں بڑھے بلکہ ان کی بعد میں آنے والی دونوں تحریریں مختلف موضوعات کی حامل ہیں۔ جبکہ صدیق سالک نے (علاوہ ازیں دو ناولوں کے) کم و بیش ایک ہی موضوع (آرمی) کو اپنی آخری کتاب تک موضوع بنائے رکھا اور ضمیر جعفری کے ہاں بھی ہمیں غالب رنگ آرمی کے حوالے سے ہی نظر آتا ہے۔

"بجنگ آمد" جو کرنل محمد خان کی "پہلوٹھی" کی تصنیف ہے۔ اس کی بے ساختگی اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔ "بجنگ آمد" میں کلاسیکل ادب کی روایت بھی موجود ہے۔ کرنل محمد خان کا کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ ہے۔ جو یقیناً لکھنے میں ان کا مددگار ثابت ہوا۔ مثال کے طور پر وہ واقعہ بیان کرنے کے لئے شعر لاتے ہیں۔ شعر کا استعمال واقعہ کے تناظر میں خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔ شعر کی پیروڈی نہیں کرتے بلکہ جس حوالے سے شعر کو لاتے ہیں وہ گفتگو یا تاثر کو دو چند کردیتا ہے گویا وہ اپنی حس مزاح کی نمائش کی خاطر کلاسیکی ادب سے سہارا لیتے ہیں اور کلاسیکی ادب کو مدد کے طور پر لاتے ہیں۔ ان کے ہاں کلاسیکی ادب سے ماخوذ کوئی شعر، جملہ یا پیراگراف ایک نئے تناظر میں اپنے اصل مفہوم سے ہٹ کر ایک نئی مزاحیہ جہت کا نمائندہ بن جاتا ہے جو بعض اوقات شعر کے کلاسیکی مفہوم سے الگ یا بالکل متضاد ہوتا ہے۔ مگر یہ چیز کرنل محمد خان کے مزاح کی چاشنی کو بڑھا دیتی ہے اور ان کی تحریر لطف و انبساط کا باعث بنتی ہے۔ بصرہ میں شاعبہ کیمپ کے قیام کے دوران کا یہ واقعہ ملاحظہ ہو جو مندرجہ بالا دعویٰ کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ دیکھئے یہاں کس طرح ایک خوبصورت مصرعے کو واقعہ کے تناظر میں پیش کرکے مزاح کی چھاپ کو گہرا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "لیکن بصرہ میں باپاپوش خواتین بھی تھیں اور قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بالآخر ہمارے دوست کو پالا پڑا تو ایک ایسی خاتون سے جس کے جوتے کی نوک میں شاید ایٹمی وار ہیڈ نصب تھا۔ ساتھ ہی اس سراپا ناز کو دھول دھپا سے بھی خاص پرہیز نہ تھا۔ چنانچہ ایک روز ہمارے دوست پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ غریب کسی پیش کش کے اس خاتون کے ذونعل حملے کا شکار ہوگئے اور ہفتہ بھر کسی کو منہ بلکہ سر دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جوتے کا جارحانہ استعمال فقط ہندوستانی خواتین کا ہی اجارہ نہیں بلکہ یہ حوا کی بیٹی کا عالمگیر ہتھیار ہے۔ بہر حال محض جوتے کا بپا کردہ حشر ایسی چیز نہ تھا۔ جس سے ہمارے دوست سے جنون عشق کے انداز چھپ جاتے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں آپ کے نہ صرف بال اگ آئے بلکہ اس نادم پشیمان خاتون کے دل میں مہر و محبت کے چشمے بھی ابلنے لگے۔ آج کل جب کبھی یہ میاں بیوی ہمیں پاکستان میں ملتے ہیں تو ہم شرارتاً اسکول کے دنوں کا مصرع گنگناتے ہیں۔
> "الحذر! پاپوش جاناں، سر میرا کھجلائے ہے"۔ (بجنگ آمد)

یہ صرف ایک ہی واقعہ پر موقوف نہیں ہے بلکہ متعدد مثالیں دعوے کی دلیل میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ شعر کے بعد جملے کی مثال دیکھیں:

"پنڈی میں چند دوست ملے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم ہمیشہ کیلئے جا رہے ہیں تو انہوں نے ہمیں اسی حسرت سے دیکھا جس سے .... بن کھلے مرجھانے والے غنچوں کو دیکھا جاتا ہے"۔ (بجنگ آمد)

کرنل محمد خان خود بھی اس بات کے دعوے دار ہیں کہ انہوں نے "بجنگ آمد" کو تحریر کرتے ہوئے اردو اور فارسی روایت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ضمیر جعفری، صدیق سالک اور شفیق الرحمن میں سے کسی نے بھی اپنے مزاح کی تخلیق میں ماضی کی ادبی روایت سے اس طرح فیض حاصل کرنے کی سعی نہیں کی جس طرح کرنل محمد خان نے ...علاوہ یہ چیز کرنل محمد خان کو اپنے ہم عصروں سے منفرد کرتی ہے۔ مرزا ادیب کے بقول:

"یہ شخص اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب سے بخوبی واقف ہے اور "بسلامت روی" پڑھ کر تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اسلوب کی تر و تازگی میں یہ "بجنگ آمد" سے کافی آگے نکل آیا ہے۔ اور یہی ذہنی ارتقاء کا تقاضا ہے"۔ (اذکار و افکار۔ مرزا ادیب)

دوسرے مزاح نگاروں میں صرف مشتاق احمد یوسفی ہی ایسے مزاح نگار ہیں جنہوں نے اپنے ہاں مزاح خلق کرنے کے لئے کلاسیکی اور ہم عصر ادبی روایت سے فائدہ اٹھایا ہے اس طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ کرنل محمد خان کسی نہ کسی طرح ان کے اسلوب سے متاثر ہیں۔ یوسفی کے ہاں شعر کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی مثالیں دیکھیں:

"بشارت اور خان صاحب کے مابین حجت و تکرار صرف دفتری اوقات میں یعنی نو سے پانچ بجے تک ہوتی۔ جو ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر کل تک کیلئے ملتوی ہوجاتی تاکہ تازہ دم ہو کر جھگڑ سکیں۔

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

سنا ہے اگلے وقتوں میں پڑوسنیں اس طرح لڑتی تھیں۔ لڑتے لڑتے گلا بیٹھ جاتا اور شام پڑتے ہی وہ مرد گھر لوٹنے لگتے جو دن بھر معرض دشنام میں آیا کئے تو دونوں مکانوں کی سرحد یعنی مشترکہ دیوار پر ایک ہانڈی الٹی کر کے رکھ دی جاتی تھی جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اندھیرے کے سبب عارضی دشنام بندی ہوگئی ہے کل پھر ہوگی بات یہ ہے کہ جب تک فریق کا چہرہ نظر نہ آئے گالی میں Third Dimension (تیسری جہت) پیدا نہیں ہوگی۔ جس طرح دکان میں ہمہ وقت جھگڑے اور دنگل کا سامان ہو اور باہر ایک فریق کے دس پندرہ مسٹنڈے حمایتی سماوار کے گرد پڑاؤ ڈالے ہوں۔ اس کے گاہک بدلیں نہیں تو اور کیا کریں۔ بقول استاد اول مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے جن کی ریڈر سے ہم نے دفاع اور آداب فرار کا پہلا سبق سیکھا۔

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

(آب گم)

بالکل یہی رنگ کرنل محمد ان کے ہاں ملاحظہ ہو:

"گورے اردلی نے ہم سے پہلی دفعہ بات کی۔ بات کیا تھی، ایک لہراتی سی انگریزی نما آواز ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابل فہم نقش نہ چھوڑا ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات پھر دہرائی۔ لیکن اس دفعہ بھی ہماری سمجھ میں اتنا ہی آیا جتنا ریکارڈنگ ٹیپ کو الٹا چلانے سے آتا ہے۔ گورا اب خاموش کھڑا تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ ہم ہی کچھ کہیں چنانچہ گلا صاف کیا۔ اپنی بہترین انگریزی میں اظہار مدعا کیا۔ گورے اردلی نے ہماری انگریزی گوئی کی داد میں ایک مخلصانہ مسکراہٹ ضرور پیش کی لیکن جہاں تک ہماری انگریزی کے ادراک کا تعلق تھا ظاہر تھا کہ وہ غریب سراسر معصوم ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی انگریزی میں کوئی نقطہ اتصال نہیں۔ اور یہ کہ ہم نے مشق سخن جاری رکھی تو ہماری "انگریزیاں" بالکل متوازی ڈانڈوں پر ایک دوسرے کو چھوئے بغیر چلتی رہیں گی۔ چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دوسرے کو سمجھنے لگے بقول داغ:

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے

(بجنگ آمد)

منصور قیصر نے بھی کرنل محمد خان کے ہاں "اثر یوسفی" کی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"بجنگ آمد کی اشاعت کے بعد کرنل محمد خان کو جو غیر متوقع شہرت ملی۔ اس کا ایک برا اثر یہ ہوا کہ کرنل صاحب کچھ بہت زیادہ کانشس ہوگئے کہ وہ اب جو کچھ بھی لکھیں وہ پہلی تصنیف سے زیادہ معیاری بھی ہو، تاکہ ان کا اپنا بھرم بھی قائم رہے۔ انہوں نے زبان و بیاں کے معاملے میں بھی اپنے پر قدغن عائد کرنے کی کوشش کی۔ جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ان کے بے ساختہ پن پر "کرافٹ مین شپ" نے قبضہ کر لیا۔ مجھے یہ تاثر ان کی دوسری کتاب "بسلامت روی" سے ملا ہے جس میں کھلا ڈھلا ہونے کی بجائے بڑے محتاط ہو کر جملے لکھتے نظر آتے ہیں۔ پھر کچھ یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے اپنے ہم عصر مزاح نگاروں کا بھی بھرپور مطالعہ کیا ہے اور میرے خیال میں وہ مشتاق احمد یوسفی کے سٹائل سے بے حد متاثر ہوئے۔ معلوم نہیں کہ یہ "اثر یوسفی" ابھی تک قائم ہے کہ ہرن ہوگیا"۔ (بسلامت روی)

اب انشاء کے ہاں بھی ہمیں اردو ادب کی کلاسیکی روایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کا سراغ ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کرنل محمد خان اس روایت سے براہ راست متاثر نہ ہوں۔ لیکن یہ بات اس حوالے سے کہی جاسکتی ہے کہ یوسفی نے خود کو مزاح نگار کی حیثیت سے اوائل عمری میں ہی منوانا شروع کر دیا تھا۔ مگر محمد خان کی ادب میں آمد ایک پوری کتاب "بجنگ آمد" کے ساتھ پینتالیس برس کی عمر میں ہوئی۔ اس طرح ان کے بہت سارے ہمعصر مزاح نگار مزاحیہ ادب سے باقاعدہ وابستگی کی بنا پر سینئیر قرار پاتے ہیں۔

کرنل محمد خان چونکہ ایک ہی موضوع لے کر آگے نہیں بڑھے لیکن "بسلامت روی" میں ہمیں "بجنگ آمد" والا "لفٹین" بلکہ "نیم لفٹین" کافی حد تک بلوغ نظر آتا ہے۔ جس کے ہاں بے ساختگی کی بجائے فکر کا عنصر غالب ہے کرنل صاحب نے خود اپنے ایک انٹرویو میں اس بات کی نشاندہی کی ہے:

> "میری رائے میں میری بیچ والی کتاب یعنی "بسلامت روی" میں فکر کا عنصر زیادہ ہے۔ جبکہ پہلی کتاب میں واقعات ہی واقعات ہیں یوں میں کہہ سکتا ہوں کہ "بسلامت روی" میں زبان کو بنا سنوار کر پیش کیا گیا ہے۔ ویسے آپ کوئی بھی مصنف لے لیں، کوئی بڑا مصنف مثلاً سعدی، انہوں نے انیس (۱۹) کتابیں لکھی ہیں لیکن ہم صرف "گلستان" "بوستان" سے واقف ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مصنف سینکڑوں کتابیں لکھتا ہے لیکن ہم اسے صرف ایک کتاب کے حوالے سے پہچانیں گے۔ یہی کتاب اس کی شناخت ہوگی"۔

"بسلامت روی" کو صنف کے اعتبار سے سفر نامہ کہا جاسکتا ہے جس میں مصنف نے انفرادیت یہ پیدا کی ہے کہ چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور چونکا دینے والی ذیلی سرخیاں لگاتا چلا جاتا ہے۔ جو کتاب پڑھتے ہوئے شگفتگی کے احساس کو بڑھا دیتی ہیں۔ یہ عنوانات اپنی جگہ پر بے حد دلچسپ ہیں اور منفرد بھی۔ لیکن تحریر کے تناظر میں اپنی انفرادیت قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن اگر انہیں الگ سے پڑھا جائے تو شگفتگی کا احساس دلاتے ہیں۔ مثلاً چند ایک عنوانات ملاحظہ ہوں۔ "جٹی نہا کے چھپڑ دو چوں نکلی" .... یہاں سوئمنگ پول کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ "ایک پلیٹ تازہ ناول" .... "کیا سالم لڑکی سے شادی کرنا عقل مندی ہے" .... "ایک بزرگانہ ہنہناہٹ" .... "انگریزی ہیر کو بھی کھیڑے لے گئے" .... وغیرہ وغیرہ ان دلچسپ اور تیکھے ذیلی عنوانات کی تخلیق کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے جس کا ذکر منصور قیصر نے کیا ہے:

> "کرنل محمد خان "بسلامت روی" لکھتے وقت بہت زیادہ کانشیس معلوم ہوتے ہیں۔ ہر جملے کی نوک پلک سنوارنے کے لئے اپنے ساتھ میک اپ بکس رکھتے ہیں تاہم ان کی شعوری کوشش نے بڑے دلچسپ ذیلی عنوانات تخلیق کئے ہیں جن سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ایک انگریزی محاورے کے مطابق لفظوں سے کھیلنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے"۔

"بسلامت روی" میں مزاح پیدا کرنے کا بے ساختہ انداز موجود نہیں ہے بلکہ یہاں جملوں کے بے ساختہ پن پر بہت توجہ دی گئی ہے کتاب کے موضوع کو مزاحیہ رنگ دینے کی شعوری کوشش واضح محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ کتاب میں واقعاتی یا کرداری مزاح سے زیادہ جملے کے مزاح پر توجہ دی جاتی ہے۔ بیروت کی دیو قامت عمارات کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ایک جگہ کار سے نکل کر بازار میں چند قدم چلے تو یک لخت احساس ہوا کہ ہمارا قد سکڑ کر بقدر تین فٹ رہ گیا ہے۔ دلیہ سے شکایت کی تو بولے اللہ آپ کی درازی قامت کا نگہبان ہو۔ آپ کا قد نہیں سکڑا۔ صرف دونوں طرف کی عمارات بلند ہوگئی ہیں۔ یہ بائیں ہاتھ والی دس منزلہ ہے، دائیں ہاتھ والی پندرہ منزلہ، سامنے بائیس منزلہ اور ذرا آگے چالیس منزلہ۔ یہ بالشتیے جو آپ کو فٹ پاتھ پر رینگتے نظر آرہے ہیں بالغ مرد و زن ہیں اور وہ رینگ نہیں رہے ہماری طرح پاؤں کے بل چل رہے ہیں"۔ (بسلامت روی)

"بسلامت روی" میں "بجنگ آمد" والے نیم لفٹین کی بجائے معمر کرنل کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے اور شاید یہ کتاب کے مرکزی کردار کے اسی ادھیڑپنے کے باعث ہے۔ یہ کتاب کے مجموعی مزاج پر شگفتگی کی بجائے فکری عنصر کا غلبہ ہے اور یہ فکری بہا جو بذات خود بھی بڑی حد تک ساختہ ہے۔ بے ساختہ نہیں ہے جس نے کرنل محمد خان کی فطری شگفتگی اور بے ساختگی کو بھی مجروح کر ہے۔ لہٰذا کتاب میں وہ روانی، شگفتگی، بے ساختگی اور بے ساختہ مسرت کا فقدان ہے جس نے "بجنگ آمد" کی شکل میں قارئین کے ایک بڑے گروہ کو اپنی انفرادیت کا اسیر کرلیا تھا۔ دنیا بھر کے ادب سے اس طرح کی مثالیں تلاش کی جاسکتی ہیں کہ کسی ادیب کی کوئ کتاب جب اپنی بے ساختہ خوبی کی بنا پر واقعہ کی حیثیت اختیار کرلیتی تو اس ادیب پر اپنی ادبی حیثیت برقرار رکھنے کا خبط سوار ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر الگزینڈر شولزے نسن کا ناول "کینسر وارڈ" روسی معاشرے کے پابند نظام حیات جس کو میخائل گورباچوف کی "پریسٹرائیکا" نے مکمل طور پر عریاں کردیا ہے، کی اولین نشاندہی کی تھی۔ اس کو دنیا بھر میں ایک عظیم کتاب کے طور پر شہرت حاصل ہوئ تھی۔ اور وہ مصنف کے لئے نوبل پرائز کا سبب بھی بنی مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ "کینسر وارڈ" کا مصنف اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے ایک کل وقتی ادیب بننے پر مجبور ہوگیا اور اس کا بعد میں آنے والا کوئی ناول بھی "کینسر وارڈ" کے معیار تک نہ پہنچ سکا۔ گابریل گارشیا مارکیز کا ناول "تنہائی کے سو برس" بھی مصنف کے لئے اسی تکلیف دہ کیفیت کا باعث بنا۔ بعینہ یہ صورت حال محمد خان کے ساتھ بھی ہے کہ انہیں "بجنگ آمد" سے حاصل شدہ شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے "بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" جیسی کتابیں لکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اب ظاہر ہے ایک صاحب اسلوب مصنف کی کوئی کتاب بھی اس کے مزاح کے حوالے سے قائم شدہ ایک عمومی ادبی مزاج سے پست سطح پر نہیں اتر سکتی۔ لیکن کسی مصنف کا اصل کمال اپنے ادبی رویوں کو بہتر بنانے پر ہوتا ہے۔ جبکہ کرنل صاحب اس کوشش میں مکمل طور تو نہیں لیکن کسی حد تک ناکام رہے ہیں۔

کرنل محمد خان کا مزاح ہم عصر مزاح نگاروں سے اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ ضمیر جعفری، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء اور عطا الحق قاسمی کے مزاح کا رنگ اصلاحی ہے۔ ان میں معاشرے کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور ان امراض (جن کا معلوم ہو آدھا علاج ہوتا ہے) کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو معاشرتی طور پر ہمارے تمدن کو چاٹ رہے ہیں۔

لیکن محمد خان کے یہاں ذاتی حوالہ اور آپ بیتی کا رنگ نمایاں ہے۔ پہلی دو کتابیں "بجنگ آمد" اور "بسلامت روی" تو خود نوشت کی حیثیت رکھتی ہیں اگرچہ صدیق سالک کی "ہمہ یاران دوزخ" خود نوشت ہی ہے لیکن باقی سب کا مقصد معاشرے کی ناہموارلیوں کا پردہ چاک کرنا اور ہماری قوم کے بے حسی کو ظاہر کرنا ہے۔ جبکہ محمد خان کی خود نوشت (بجنگ آمد اور بسلامت روی) کا غالب رد اصلاح سے زیادہ تفریحی ہے۔ اگرچہ "بجنگ آمد" میں ضمنی طور پر انگریزی کی اخلاقی پستی "بسلامت روی" میں لبنان، انگلستان اور سوئزرلینڈ کی تمدنی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے لیکن اس سے ان کا مقصد پاکستان معاشرے کی اصلاح کا نہیں ہے بلکہ وہ تہذیبی موازنے کی اہم روایت سے خالصتاً تفریح کا پہلو تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی سے حظ اٹھانے اور واقعات سے حظ کھینچنے کا رد غالب ہے وہ زندگی کو ایک آسودہ حال شخص کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی مضحک کیفیت سے نہ صرف یہ کہ خود لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ قارئین کو بھی اس مسرت میں شریک کرتے ہیں۔

طنز کا پہلو ان کے ہاں غالب نہیں ہے اگرچہ طنز کی ایک زیریں لہر ان کے اسلوب میں رواں دواں رہتی ہے اور یہ اس کا سبب ہے کہ ہم اپنے سماجی اور تاریخی سفر کے ایک طنزیہ عہد میں زندگی بسر کررہے ہیں۔ مگر عطاء الحق قاسمی، مشتاق احمد یوسفی اور ابن انشاء

کے یہاں طنز کی کاٹ نمایاں ہے اور بعض اوقات ان کے اسلوب کی شناخت قرار پاتی ہے ۔ جب کہ محمد خان کی تحریر آدمی کو مسکرانے پر آمادہ کرتے ہوئے حزنیہ کیفیت کا شکار ہونے سے محفوظ رکھتی ہے ۔ یوسفی نے شفیق الرحمان کے بارے میں لکھا ہے ۔
ان کا کاٹا سوتے میں بھی مسکراتا ہے ۔ جبکہ کرنل محمد خاں کی تحریر کاٹنے کے اس عمل سے مبرا ہے اس کا قاری جاگتے میں کھلکھلاتا ہے اور سوتے میں بے ساختہ مسکراتا ہے ۔
کرنل محمد خان بہت خوبصورت طنز کرتے ہیں ۔ مثلاً لکھتے ہیں:

" تھوڑی دیر بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لئے گئے ۔ انگریزی اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اردو بولنے میں ہے جس طرح ایک نو آموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل جاتے ہیں ۔ اسی طرح ہمارا انگریزی " مٹر گوشت " بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا ۔ ادھر ہاتھوں سے کھانا خلاف شان تھا لیکن بہ رضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا ۔ لہذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دیا جائے تو اردو پر ہاتھ یا زبان صاف کرلی جاتی ہے ۔ اسی طرح انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ چلتا تو ہم آنکھ بچا کر انگلیوں سے ہی بوٹی اچک لیتے گویا انگریزی کھانا اردو میں کھالیتے ۔ بعض حضرات ایسے بھی تھے جو لفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اتارتے ہی نہ تھے ان میں کئی ایک کو دیکھا کہ چھری کانٹا لئے پلیٹ میں مٹروں کا تعاقب کررہے ہیں اور مٹر ہیں کہ ادھر ڈوبے ادھر نکلے ، ادھر ڈوبے ادھر نکلے ..... قصہ مختصر بیشتر اس کے کہ ان مومن مٹروں کو کوئی گزند پہنچاتا ۔ بیرے پلیٹیں اٹھا کر چل دیئے اور لفٹین صاحبان اپنا سا منہ اور چھری کانٹا لئے رہ گئے بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ بیرا جو کچھ رکھ گیا ہے ۔ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے چنانچہ کانی آنکھ سے ان انگریزوں کو دیکھتے اور پیچھے ان اماموں کے چمچے اور کانٹے اٹھا کر رکوع و سجود ہوجاتے " ۔ (بجنگ آمد)

دراصل محمد خان کا اسلوب خوبصورت آہنگ ، شگفتگی اور ایسی لذت کا حامل ہے جو دوسرے لکھنے والوں کے ہاں کم کم ہی ملتا ہے ۔ وہ بظاہر عام مروجہ زبان میں بات کہتے ہیں ۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی بات بات سے پھول جھڑتے ہیں ۔ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی لفظوں کے ذریعے اس پر جادو کررہا ہو ۔ ان کے اسلوب کو اگر رنگینی سادگی کا امتزاج کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔
کرنل محمد خان کا مزاح اپنے اندر ایک الگ ذائقہ رکھتا ہے وہ زندگی کا چہرہ بگاڑنے اور مسخ کرنے کی بجائے زندگی کی شگفتگی کو ابھارتے ہیں ۔ " بزم آرائیاں " اسی اسلوب مزاح میں لکھی گئی ہے ۔ " بزم آرائیاں " کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

" اس کتاب کی بیشتر تحریریں تفریحی انداز میں لکھی گئی ہیں ۔ ان سے نہ ہی افراد کی عاقبت سنورنے کا امکان ہے اور نہ امتوں کی تقدیریں بدلنے کا ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان تحریروں سے آپ کے چہرے پر نہ سہی ، آپ کے ذہن میں ایک روشنی کی کرن پھوٹ پڑے ، ایک فرحت کی کرن ، اور یہ ہوجائے تو ہمیں اپنی پیٹھ تھپکانے کا حق ہوگا اور اگر یہ کرن نہ پھوٹے تو پھر آپ اپنی پیٹھ تھپکالیں " ۔ (بزم آرائیاں)

طاہر مسعود

کرنل محمد خان بنیادی طور پر مزاح نگار تھے

۲۴ اکتوبر کی صبح اخبار میں کرنل محمد خان کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے اختیار مجھے ۱۹۸۲ء کی اسی مہینے کی وہ شام یاد آگئی جب میں اپنے دوست عبدالوحید کے ہمراہ راولپنڈی میں ان کے بنگلے پر حاضر ہوا تھا اور ان سے مل کر قدرے حیرت زدہ بھی ہوا تھا کیوں کہ ان میں ادیبوں والی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ دراز قامت، سانولے سے نقوش، ہلکی ہلکی مونچھیں اور چہرے پر طاری سنجیدگی اور کسی قدر بشاشت، سیدھے سادھے اور کھرے آدمی۔ گفتگو میں سادگی بلکہ بڑی حد تک کم گوئی کے عادی دکھائی دیئے۔ وہ قدیم طرز کے بجے سجائے بنگلے میں اکیلے ہی مقیم تھے۔ ساتھ میں ایک خدمت گار تھا ہم ان کے پاس کافی دیر رکے اور انہوں نے نہایت بے تکلفی سے گفتگو کی۔ تاہم میں ان کے تنہا رہنے کا سبب نہ پوچھ سکا۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے شب و روز سے بہت مطمئن تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہر شام ہاتھ میں چھڑی لئے لمبی سیر کو نکلتے ہیں اور اکثر شاموں کو کرنل شفیق الرحمن اور سید ضمیر جعفری جیسے ہم مزاج دوستوں کی پر جوش محفلیں جمتی ہیں اور خوب قہقہے لگتے ہیں ان سے میری یہ ملاقات ایک انٹرویو کے سلسلے میں ہوئی تھی جو بعد میں ایک تنازعے کا سبب بھی بن گیا۔ ہوا یہ کہ میں نے ان سے پوچھا کیا آپ نے بعض خواتین لکھنے والیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں حالانکہ ان کی تحریریں اس پایہ کی نہیں تھیں جتنی آپ نے ان کی تعریف کی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ کوئی مثال دیجئے۔ عرض کیا مثلاً نسیمہ بنت سراج اس پر انہوں نے قہقہہ لگا کر فرمایا کہ ہاں اس میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی کتابوں پر لکھنا پڑتا ہے۔ مصنف یا مصنفہ کا شوہر میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور کہا کہ ہم اس وقت یہاں سے اٹھیں گے جب آپ کتاب پر لکھنے کا وعدہ کریں۔ میں انہیں ٹالنے کے لئے کچھ نہ کچھ لکھ دیتا ہوں۔ ان کی یہ سب کہی ہوئی باتیں اخبار میں شائع ہو گئیں جس کے بعد خامہ بگوش نے اسی انٹرویو پر اپنے مخصوص طنزیہ پیرائے میں ایک دلچسپ کالم باندھا اور ساتھ ہی نسیمہ بنت سراج کی ایک تردیدی وضاحت بھی موصول ہو گئی جس میں انہوں نے واضح کیا کہ کرنل صاحب نے خود ان سے رابطہ کر کے ان کی تحریروں کی تعریف کی تھی اور کتاب پر رائے لکھنے کا واقعہ تو بعد کا ہے۔ بہر کیف، یہ ساری چیزیں اخبار میں شائع ہو گئیں۔ اس کے بعد کرنل صاحب سے میری ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن عبدالوحید نے مجھے بتایا کہ کرنل محمد خان اس تنازعے پر رنجیدہ ہیں لیکن ظاہر ہے کسی تردید یا وضاحت کی گنجائش نہیں تھی اس لئے خاموش رہے۔ یہ سن کر مجھے بھی افسوس ہوا کیوں کہ سچی بات یہ ہے کہ کرنل محمد خان کی تحریروں کا گرویدہ تو میں اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے تھا اور یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ طلبہ یونین کے میگزین "الجامعہ" کی ادارت جب مجھے سونپی گئی تو جہاں اور بہت سے سینئر ادیبوں سے تحریریں لکھوانے کے لئے رابطہ کیا وہیں ایک خط کرنل محمد خان کو بھی لکھ دیا۔ خط کا مضمون کچھ مزاحیہ پیرائے میں تھا اور انہیں لکھنے پر راغب کرنے کے لئے اس قسم کی بات بھی لکھ دی تھی کہ سنا ہے "بجنگ آمد" کے بعد قلم تھک گیا ہے اور قلم اور بندوق رکھے ان دنوں آپ سستا رہے ہیں۔ اگر یہ غلط ہے تو پھر ہمارے لئے کوئی اچھی سی تحریر لکھ کر دکھائیں۔ کچھ ہی دنوں بعد کرنل صاحب کا لفافہ موصول ہوا جس میں ان کا نہایت شگفتہ اور مزیدار مضمون "یہ نہ تھی ہماری قسمت ......" ملفوف تھا۔ اس مضمون کو پاکر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اسے نہایت اہتمام سے "الجامعہ" میں مع اسکیچ شائع کیا۔ طلباء اور اساتذہ دونوں نے مضمون کو بہت پسند کیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سینئر ادیبوں میں کرنل صاحب کے علاوہ کسی ادیب کی تحریر ہمیں

ڈاک سے موصول نہیں ہوئی۔ اس سے دل پر کرنل صاحب کی شرافت طبع، نوجوان طبقے سے ان کے لگاؤ اور احساس ذمہ داری کا نہایت حسین نقش مرتب ہوا۔

کرنل محمد خان سے ملاقات پر یہ نقش اور گہرا ہوگیا۔ انہوں نے نہایت سادگی اور صاف دلی سے باتیں کیں۔ ان کا ہر جواب مختصر اور نپا تلا تھا اور ان سے کچھ کہلوانے کے لئے انہیں خاصا اکسانا پڑا۔ بات یہ تھی کہ ادب سے ان کا تعلق طالب علمانہ نوعیت کا تھا اور ۴۰ سال کی عمر میں اچانک ادیب بننے کے باوجود ان میں احساس برتری جیسی کوئی خوبی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

کرنل محمد خان نے ۵۔ اگست ۱۹۱۰ء کو چکوال کے قصبے بالکسر میں چودھری امیر خان کے گھر میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول چکوال سے حاصل کی۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۳۱ء میں گریجویشن کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے اقتصادیات میں ایم اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ عرصے کے لئے فیروز سنز کے اخبار "ایسٹرن ٹائمز" میں بطور اسپورٹس رائٹر کام کیا۔ بعد ازاں ۱۹۴۵ء میں بطور سکنڈ لیفٹننٹ فوج میں بھرتی ہوگئے جہاں سے جولائی ۱۹۶۹ء میں فل کرنل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔

بظاہر ان کے کوائف میں ادبی مشاغل کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ بچپن میں انہوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں انہیں ڈاکٹر غلام جیلانی برق جیسے استاد میسر آئے جنھوں نے اپنی خصوصی توجہ سے ان میں مطالعے کا ذوق پیدا کردیا تھا۔ انہوں نے کرنل صاحب کو امیر مینائی سے لیکر سارے کلاسیکی شعراء کا کلام پڑھایا۔ بچپن کا وہ مطالعہ آخری عمر تک انہیں مستحضر تھا بتاتے تھے کہ امیر مینائی کے اشعار جو اکثر لوگوں کو یاد بھی نہ ہوں گے انہیں اب تک ازبر ہیں۔

کرنل محمد خان کو ۴۲ سال کی عمر تک یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ ان میں ایک بہت عمدہ، صاحب طرز مزاح نگار پوشیدہ ہے۔ کبھی کبھار دور دراز مقیم دوست ان کے خطوط کو پاکر بہت خوش ہوتے تھے اور مطلع کرتے تھے کہ تم خط بہت اچھے لکھتے ہو لیکن اس سے زیادہ انہیں اپنی انشا پردازی کی صلاحیت کا علم نہ ہوسکا۔ جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب "بجنگ آمد" میں لکھا ہے کہ فوجی رسالہ "الہلال" کے ایڈیٹر ان کے دوست تھے۔ اتفاق سے ایک ملاقات میں ان سے مضمون کی فرمائش کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو لکھ نہیں سکتا۔ لیکن ایڈیٹر کا اصرار جاری رہا۔ اس فرمائش پر کرنل صاحب نے "بجنگ آمد" کا پہلا باب تحریر کیا۔ اسے پڑھ کر ایڈیٹر نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے کہا۔ کرنل صاحب لکھتے رہے، اسی دوران کرنل شفیق الرحمن کی نظر ان تحریروں پر پڑگئی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ مکمل ہونے پر اسے کتابی صورت میں شائع کرادو اور یوں "بجنگ آمد" منظر عام پر آئی اور اس کی ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ بعد میں کرنل محمد خان کی دو اور کتابیں منظر عام پر آئیں۔ "سلامت روی" اور "بزم آرائیاں" لیکن جو مقبولیت "بجنگ آمد" کے حصے میں آئی وہ ان دو کتابوں کو نہ مل سکی۔ "بجنگ آمد" کا کئی لوگوں نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ ان میں ایک ترجمہ تو اشفاق نقوی نے کیا اور ایک این ٹی حسن نے۔ کسی خاتون نے بھی اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان ترجموں میں مزاح عنقا تھا۔ کرنل محمد خان کا خیال تھا کہ انگریزی اور اردو زبان میں محاوروں کے فرق کی وجہ سے مزاح کی ترسیل ناممکن ہوجاتی ہے۔ یہ ترجمے انگلستان بھی بھیجے گئے لیکن وہاں سے بھی کچھ ایسا ہی جواب آیا جس کے بعد کرنل صاحب نے "بجنگ آمد" کے ترجمے کا ارادہ اٹھایا۔

کرنل محمد خان کو اپنی تینوں کتابیں پسند تھیں ان کا خیال تھا کہ سلامت روی میں فکر کا عنصر زیادہ ہے جبکہ "بجنگ آمد" میں واقعات ہی واقعات ہیں۔ اول الذکر کتاب میں زبان کو بنا سنوار کر پیش کیا گیا تھا جب کہ موخرالذکر میں برجستگی تھی۔

کرنل محمد خان بنیادی طور پر مزاح نگار تھے ان کی تحریروں میں طنز کا پہلو نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ ان کی اپنی رائے یہ تھی کہ طنز اگر لطیف ہو تو یہ مزاح سے بڑی چیز ہے لیکن ایسا طنز کرنا نہایت مشکل کام ہے وہ ابن انشا کے بہت قائل تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ان جیسا طنز لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ..... ان کا کہنا تھا کہ اعلیٰ درجے کے طنز کے لئے مخصوص دماغ کی ساخت کی ضرورت ہوتی ہے جو کم از کم میرے پاس ناپید ہے۔ وہ طنز میں اصلاح کے مقصد کو سراہنے کے باوجود مزاح کو مسرت کی فراہمی کا ذریعہ سمجھتے تھے جو ان کے خیال میں بجائے خود ایک بڑی قدر ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

> "کیا انسان کو مسرت بہم پہنچانا ایک مقصد نہیں ہے ؟ آپ کسی کو میٹھا بول بولتے ہیں، کسی کو مسکرانے پر مجبور کردیتے ہیں ان سب کے پس منظر میں ایک مقصد کارفرما ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب کوئی خط آتا ہے کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی اور بے حد مسرور ہوا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں نے ایک خدمت انجام دی ہے"۔

لوگوں میں خوشیاں بانٹنے والا یہ مزاح نگار اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اسے انتقال کے بعد اس کے آبائی گاؤں بالکسر میں سپردخاک کردیا گیا۔ مرحوم کے ایک دوست بریگیڈیر محمد اسماعیل صدیقی نے اپنی کتاب "کرنل محمد خان مزاح کا جنرل رومیل" میں انھیں دنیائے مزاح کا ایک عظیم سپہ سالار قرار دیا۔ ☆

نیم لفٹین پشاور میں

اپریل ۱۹۴۱ کی وہ صبح بھولنے کی نہیں، جب وہ چھوٹی ریل گاڑی ہم نیم لفٹینوں کی بستی کاتی ٹولی کو لئے مہو کے اسٹیشن سے نکلی۔ معاً ہمیں وہ دن یاد آیا جب نو ماہ پیشتر ہم اسی اسٹیشن پر پہلی مرتبہ اترے تھے اور گورے سارجنٹوں نے ہمارے پندار کی گرہ کا روز اول ہی کام تمام کر دیا تھا۔ لیکن وہی گورے آج ہمیں سلیوٹوں سے رخصت کر رہے تھے۔ ہمارا مورال اس بلندی پر کبھی نہ پہنچا تھا۔ اب ہمیں کسی سے گلہ تھا نہ شکوہ۔ دنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی حتیٰ کہ مہو کے وہ مضافات بھی چلتی گاڑی سے دلفریب نظر آ رہے تھے جن سے چند مہلک قسم کی فوجی مشقوں کی یاد وابستہ تھی۔ ہیماپہاڑی تو ہمیں وادی گنگا کی طرح محبت کے اشارے کر رہی تھی۔

درازی سفر میں ہم نے افسرانہ مستقبل کیلئے جو منصوبے بنائے وہ زیادہ تر میس، کلب، برج، سواری اور یونیفارم وغیرہ کے متعلق تھے۔ یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ عین اس وقت ایک عالمگیر جنگ بھی جاری تھی جو ہمارے وطن تک اگرچہ نہیں پہنچتی تھی تاہم ہمارے ہزاروں ہم وطن اس تک پہنچ چکے تھے اور کئی سرحدوں کی پار جا چکے تھے اور یہ کہ خود ہمیں بھی کچھ اسی مقصد کے لئے تیار کیا گیا تھا لیکن فی الحال ہم لڑائی سے مختلف سمت میں جا رہے تھے اور جنگ کا خیال قطعاً بے جا تھا۔ البتہ ہمارے ایک پشاوری ساتھی محاذ جنگ پر نہ بھیجے جانے کی وجہ سے خاصے افسردہ تھے بلکہ ٹریننگ کے دنوں میں بھی جب ایک دن کسی مضمون میں فیل ہونے پر ان سے باز پرس ہوئی تو انھوں نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا:

"ہم فیل دیل کچھ نہیں جانتا۔ ہم بنیا نہیں جو سوال نکالے۔ ہم کو لڑائی میں بھیجو۔ ہم بادشاہ کی خدمت کرنے آیا ہے"۔

دراصل ہمارے دوست کو تکلیف یہ تھی کہ ان کے گھر میں ایک ڈھال، اور ایک تلوار رکھی تھی اور یہ تاریخی اسلحہ ان کی خاندان کی روایات کے مطابق بانی خاندان کے استعمال میں آیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا تعین نہیں ہوسکا تھا کہ یہ واقعہ سکندر کے حملے سے پہلے ظہور میں آیا تھا یا بعد میں لیکن بہر حال یہ اس امر کی صریح علامت تھی کہ آپ ایک مارشل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چنانچہ آبائی سپہ گری کے اس تاریخی پس منظر میں آپ کو یہ کسی صورت گوارا نہ تھا کہ حسن اتفاق سے جنگ جاری ہو۔ (یعنی خدا نے ان کے لئے داد شجاعت دینے کے تمام اسباب مہیا کر رکھے ہوں) اور وہ راولپنڈی جیسے دارالامان کو بھیج دیئے جائیں۔ چنانچہ تمام راستے ان کا مارشل خون کھولتا رہا اور ہم سے الگ غصے میں Warlike Store بنے بیٹھے رہے۔

مہو سے پشاور تک سب ساتھی درمیانی اسٹیشنوں پر اتر گئے اور گاڑی سر شام پشاور پہنچی۔ ہمارے استقبال کیلئے دو افسر موجود تھے۔ دونوں انگریز۔ ان دنوں دیسی افسر ابھی گنتی کے تھے۔ دیسی افسروں کی تھوک بھرتی کسی قدر بعد میں شروع ہوئی۔ جب جاپان نے جنگ میں کود کر آگ سی لگا دی اور وہی لفٹینی جو ہم نے خون جگر سے حاصل کی تھی، سر راہ بٹنے لگی۔ اب استقبال کو تو یہ دو انگریز آگئے تھے لیکن ان کا طرز تپاک کچھ ایسا تھا جیسے دیکھ کر دل جل تو نہ گیا لیکن جھلس ضرور گیا۔ پھیکی سی مزاج پرسی اور بس... پھر کار میں بٹھا کر ہمیں خارج از بحث سمجھ کر گپیں ہانکنے لگے گویا پچھلی سیٹ پر انسان نہیں، بستر رکھا ہے۔

سگنل آفیسرز میس میں پہنچے تو ہمیں اپنا کوارٹر دکھایا گیا۔ ایک امیدوار بیرا شیر باز پہلے ہی سے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آنے والا صاحب بے بیرا ہو تو شامل خدمت ہو جائے۔ ایسا ہی ہوا، وقت کم تھا ہم نے ڈنر کے لئے کپڑے بدلے۔ چونکہ میس میں جانے کیلئے پہلی شب کا معاملہ تھا، اپنی ٹرن آؤٹ کی نوک پلک خاص طور پر سنواری اور اس سلسلہ میں شیر باز کے ماہرانہ مشوروں سے استفادہ کیا

کہ وہ مقامی رسوم سے باخبر تھا اور سالہا سال کی بیرا توپ کے طفیل ان معاملات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔
میس میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بیتابی میں سب سے پہلے آگئے ہیں۔ اینٹی روم کے زیبائشی سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ پاس ریڈیو پڑا تھا۔ ایک سگنل افسر کو کہیں ریڈیو نظر آجائے تو بقول شخصے اسے چھیڑنے کا چسکا ضرور لیتا ہے۔ ہم نے بھی لیا۔ سوئی اتفاقاً لاہور کے اسٹیشن پر جا رکی جہاں سے کوئی غیرت ناہید ڈھولک کا گیت گا رہی تھی "تالی دے تھلے بہہ کے" ہم اس کے شعلے کی لپک میں آگئے اور میس و مافیہا سے غافل ہو کر پاس کے صوفے پر بیٹھ کر سننے لگے تا آنکہ باہر سے بیک وقت دو چار انگریزی آوازیں بلند ہوئیں اور متفقہ طور پر اس گستاخ کے نام اور سر کا مطالبہ کیا جو یہ وحشیانہ موسیقی سننے کا ارتکاب کر رہا تھا۔
یہ چند انگریز افسر تھے جو ابھی میس کے بیرونی دروازے تک ہی پہنچے تھے اور اس انگریز کدے میں دیسی گانا ایک باغیانہ فعل سمجھتے تھے۔ وہ ابھی باہر ہی شور مچا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یونٹ میں پہلا دن ہے۔ اپنے متعلق اولین تاثرات خراب کرنا قرین مصلحت نہیں لہذا ریڈیو بند کرنا چاہئے لیکن کسی اندرونی آواز نے مشورہ دیا کہ ریڈیو بند کرکے تم ان کی خوشنودی تو شاید حاصل کر سکو گے یا نہیں البتہ اپنی بزدلی کا خاصا پختہ ثبوت دو گے۔ چنانچہ ریڈیو کو لگا رہنے دیا لیکن اب سحر موسیقی کی وجہ سے نہیں بلکہ تحفظ ناموس کی خاطر۔
انگریز افسروں کا خیال تھا کہ کسی نوکر نے میس خالی دیکھ کر گانا لگا رکھا ہے لیکن جب اندر داخل ہوئے اور مجھے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھا تو سمجھے کہ ریجمنٹ غدر کی ابتداء ہو رہی ہے۔ ذرا رکے اور پھر ان میں جو ایمپائر کا سب سے بڑا فدائی تھا بڑھا اور مجھ سے کہنے لگا "خبریں نہ سنو گے؟" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر سوئی گھما کر بی بی سی پر کر دی۔ اتفاق سے اس وقت خبریں بھی شروع ہو رہی تھیں۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔
میں اس میس میں نووارد تھا، لیکن کسی نے مجھ سے مصافحہ تک نہ کیا۔ ظاہر تھا کہ نادانستہ سہی، لیکن قصور ہم نے سر کے کا کیا ہے جسے انگریزوں کی آئندہ نسلیں بھی معاف نہ کریں گی۔
بعد میں دوسرے افسر آئے۔ وہ بھی انگریز تھے، لیکن انہیں ہماری بغاوت کا علم نہ تھا۔ ان میں سے ایک جو اسٹیشن سے ہمیں ساتھ لایا تھا اور ایڈجوٹنٹ تھا، ہمارے صوفے پر ہی بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا میں نے میس اور اس کی آرائش کی تعریف کی۔ اتفاق سے سامنے ایک عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ میں نے پوچھا:
"یہ عورت کون ہے؟"
میرا یہ کہنا تھا کہ ایڈجوٹنٹ صاحب کا رنگ بدل گیا اور مجھے حیرت، ایک قہر کے عالم میں گھورتے ہوئے بولے:
"عورت؟ خدا کے بندے یہ محض عورت نہیں، پرنسس رائل ہے! تمہاری سگنل کور کی کرنل کمانڈانٹ، تم واقعی سگنل ہو؟"
اب یہ واقعہ ہے کہ مجھے شہزادی موصوف کے کرنل کمانڈانٹ ہونے کا علم اور فخر ضرور تھا، لیکن یہ کہ سامنے والی تصویر ان ہی کی ہے اس کا مجھے علم نہ تھا۔ ایسے حالات میں انگریزوں میں معذرت کا ایک معروف فقرہ دہرایا جاتا ہے اور سارا گلہ دھل جاتا ہے ہم نے بھی یہی عمل کیا۔ لیکن گلہ دھلنا تو کجا، اس انگریز کے چہرے پر بیم اور تموج کی نوع کی علامات پیدا ہونے لگیں اور ان آثار کے زائل کرنے کا طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ناچار چپ ہو کر بیٹھ گیا۔
ہمارے۔ یہ یونٹ کی ابتدا یقیناً اچھی نہیں ہوئی تھی، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا دل کو سمجھایا کہ دیکھو میاں! اس ملک میں جب تک ہمارا واسطہ انگریزی یونٹ سے ہے، کوہان تو ہو گا۔ باقی رہیں میس کی پہلی رات کی وارداتیں، تو ان سے پریشان ہونا نقشین کی شان

نہیں۔ میس کے باہر بھی بیسیوں کام ہیں۔ ان میں قابلیت کا سکہ بٹھایا جاسکتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل جڑ بھی سکتے ہیں ـــــ ویسے اس شب کھانے کے دوران ان کے جڑنے کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔ بلکہ ایک پلیٹ ہمارے ہاتھ سے ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریڈیو، تصویروں، پلٹنوں غرض ہر چیز نے ہمارے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ فقط ایک شخص بائیں جانب میز پر بیٹھا تھا، ہم سے کسی قدر گرمجوشی سے باتیں کرتا رہا۔ وہ ولایت سے تازہ تازہ آیا تھا اور ایک دیسی کا انگریز کی خاطر لڑنا احسان سمجھتا تھا۔ یہ لفٹننٹ وائٹ تھا۔ جان وائٹ کی ملاقات اس شب کے ناگوار حادثوں کے بعد منہ میں گویا میٹھا ذائقہ چھوڑ گئی۔

دوسرے دن کمان افسر سے ملاقات ہوئی۔ خیال تھا رات کی لغزش کی صفائی طلب کریں گے۔ لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ایڈجوٹنٹ صاحب نے البتہ اعلان جنگ واپس نہیں لیا تھا۔ دانت پیس پیس کر ہمیں اپنے نئے فرائض کے متعلق حکم سنایا اور نتیجتاً ہم ایک ایسے سکشن کے افسر یا فوجی زبان میں او سی (OC) مقرر ہوئے جس کا کام پہاڑی توپ خانے کو مواصلات بہم پہنچاتا تھا۔

اس سکشن میں انسان تھوڑے تھے اور گھوڑے اور خچر زیادہ۔ طبیعت پہلے تو کچھ برہم ہوئی۔ لیکن جب میں اپنے سکشن میں پہنچا اور ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تو ایمان تازہ ہوگیا۔ یہ سکشن تمام تر پنجابی مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یہ سن کر کہ ایک دیسی افسر پہلی دفعہ او سی مقرر ہوا ہے، ان لوگوں نے اس خلوص سے میرا خیر مقدم کیا کہ میں انگریزوں کی رنجش بھول گیا۔ سنتیر عہدیداروں نے نہایت شوق سے مجھے سکشن کا سامان دکھایا اور جوانوں کے علاوہ تمام گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ جی ہاں، ان سب کے اپنے اپنے نام تھے، اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی شخصیتیں، اس پہلی ملاقات پر سکشن کے لوگ جس محبت کا اظہار کر رہے تھے، وہ خود اس سے کہیں زیادہ محبت کیے جانے کے قابل تھے اور میرے دل میں یہ عہد مستحکم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی توقعات کو کبھی تشنہ نہ رہنے دوں گا۔

اس شام جب میں میس میں گیا تو انگریز اگرچہ بدستور کھچے کھچے سے تھے لیکن میرے دل میں ایک ایسا اطمینان تھا جسے انگریزوں کی ناراضگی نہیں چھین سکتی تھی اور ہمارے مقاطعہ ایسا مکمل بھی نہ تھا۔ جان وائٹ ہم سے غیر معمولی تپاک سے بغلگیر ہوئے اور ریڈیو کی طرف اشارہ کرکے بولے: "ذرا اپنے ملک کا گانا تو سناؤ"۔ پھر ہنس کر بتایا کہ آج دن بھر تمہارے پنجابی گانا سننے اور پرنس رائل کی تصویر کو نہ پہچاننے کے متعلق بحث ہوتی رہی۔ سارجنٹ لوگوں نے تو تمہارے خلاف کمان افسر تک شکایت پہنچادی۔ لیکن الٹی ان کو تنبیہ ہوئی۔ میں نے پوچھا: "سارجنٹ لوگ کون؟" تو کہنے لگا: یہی تم سے لڑنے والے افسر۔ یہ سب پہلے سارجنٹ تھے اور اگر لڑائی نہ چھڑتی، تو اس وقت بھی سارجنٹ ہی ہوتے۔" بہرکیف ہم نے کسی قدر فاتحانہ انداز سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ انتقامی جذبے پر قابو پاکر ریڈیو کو تو نہ چھیڑا۔ لیکن جان وائٹ کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر منہ سے ماہیے کی ایک کلی گنگنادی اور جان نے اپنی تحسین کے اظہار کے لیے والہانہ تالی بجادی۔

وائٹ سے اب ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ دوسرے انگریزوں سے بھی ہمیں تو کچھ بیر نہ تھا۔ البتہ وہ ذرا خفا سے تھے اور وائٹ کی حرکتیں اس خفگی میں اور بھی اضافہ کررہی تھیں۔ وائٹ دراصل ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان تھا۔ کیمبرج سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر آیا تھا۔ اسے اپنے تلفظ کا خاص طور پر خیال تھا اور باقی انگریز افسروں سے نہایت اہتمام سے نفرت کا اظہار کرتا تھا، کیونکہ ان کی زبان اور تلفظ گرامر کی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ ان کے پاس فقط دس بارہ فحش مگر چست اور جامع سے الفاظ تھے جن سے وہ اپنا تمام تر مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ یہ الفاظ کسی ڈکشنری میں نہیں ہوتے، صرف سارجنٹ لوگوں کے یہاں سینہ بہ سینہ چلا کرتے ہیں۔ وائٹ کی اپنی زبان بیشک کلچر کی آئینہ دار تھی، لیکن جو چٹخارا سارجنٹوں کی مرصع زبان میں تھا، اس سے بھی انکار مشکل ہے۔

یونٹ میں کوئی پندرہ دن گزرے تھے کہ اچانک ہمارے کمان افسر کا تبادلہ ہوگیا ان کا جانا تھا کہ ہمیں ایڈجوٹنٹ نے طلب کیا اور حکم دیا:

" تم آج اٹھارہ سو بجے (یعنی شام چھ بجے) کی گاڑی سے بنوں جاؤ گے اور وہاں سے آگے ٹوچی کالم میں جاکر شامل ہوگے جو اس وقت فقیر ایپی کے خلاف وزیرستان میں دتاخیل کے مقام پر مصروف جنگ ہے۔ وہاں تم لفٹننٹ ٹام کو فارغ کروگے "

جب دائٹ کو ہمارے تبادلے کا علم ہوا تو بھاگا بھاگا آیا اور بولا:

" یہ ٹام بھی سارجنٹ ہے۔ اس کے نہ ہونے سے ان لوگوں کی برج کی چوکڑی نامکمل تھی۔ صرف کمان افسر کے کہنے پر تمہیں یہاں رکھا گیا تھا ورنہ پہلے ہی دن فقیر ایپی کی خدمت میں بھیج دیے جاتے۔ "

اٹھارہ سو بجے ہم بنوں جانے والی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ قبائلیوں کی لڑائیوں میں بیرا ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے، چنانچہ شیر باز ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنے کئی انگریز صاحبوں کے ساتھ سرحدی معرکوں میں شریک ہوچکا تھا۔ عام لوگوں کو علم نہیں کہ ان سرحدی لڑائیوں میں بھی دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ شیر باز سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کا ایک انگریز صاحب قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دو کان واپس ملے تھے۔ ہمارے اطمینان کے لئے شیر باز نے اتنا اضافہ کیا کہ " تم فکر مت کرو۔ مسلمان کا لاش خراب نہیں کرتے۔ "

ادھر سیٹی بجی اور گاڑی بنوں کو روانہ ہوئی۔

کوہستان جنگ

بیرے شیر باز نے ہمیں انگریزوں کے مقابلے میں رعایت تو کافی دی تھی کہ مرنے کے بعد ہمارے کانوں کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی، لیکن اس اسلامی رواداری کے باوجود ہمیں زندہ رہنا کچھ بہتر ہی معلوم ہوتا تھا۔ یوں بھی ہمیں ایک انگریز کو برج کے لیے فارغ کرنے کو بھیجا جارہا تھا۔ کوئی شہادت کا معاملہ تو تھا نہیں کہ ہم گاڑی میں داخل ہوتے ہی سر بکف ہوجاتے، چنانچہ بالکل عام آدمیوں کی طرح سفر کیا۔ عام آدمیوں کی طرح بھیجنے والوں کو کوسا اور رات کو وہی متوقع خواب دیکھے کہ کان غائب ہیں۔

دوسرے روز بنوں ٹرانزٹ کیمپ میں پہنچے۔ منزل مقصود تو میراں شاہ سے آگے دتاخیل تھی جہاں ہمارا بریگیڈ (ٹوچی کالم) فقیر ایپی سے لڑنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ لیکن بنوں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آگے جانے کے لیے R.O.D یعنی سڑک کھلنے کے دن کا انتظار کرنا پڑے گا جو ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ آتا تھا۔ اس وقفے میں شیر باز کو اتفاقاً علم ہوگیا کہ ہمیں چالاکی سے ٹام کی جگہ بھیجا جارہا ہے۔ شیر باز اس پر بہت برہم ہوا۔ مجھے پشتو نہیں آتی تھی، لیکن ٹام کے حق میں جو خار داری پشتو اس کے منہ سے نکلی ظاہر تھا کہ قصیدے کی قسم کی چیز نہیں۔ البتہ اردو میں شیر باز نے ہمیں اتنا کہا کہ " صاحب آپ کے ساتھ ٹگی (ٹھگی) ہوگیا ہے۔ ہم اس کا علاج کرے گا اور تم کو واپس پشاور بھیجے گا۔ " (پشاور بھیجے گا)۔

یہ تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ شیر باز فوجی احکام میں ترمیم کیسے کرائے گا لیکن شام کے کھانے کے لئے میس کو جانے لگا تو شیر باز ایک تکے کبابوں سے لبریز پلیٹ لے کر آنکلا۔ کسی انگریزی میس کے رستے میں ایک دیسی افسر کیلئے تکے کبابوں سے بہتر کوئی روڈ بلاک نہیں۔ چنانچہ اس رات ہم میس سے غیر حاضر رہے۔ اس کے بعد شیر باز نے ہر کھانے سے پہلے تکے کباب کھلانے کا معمول بنا

لیا۔ اسی طرح ہفتہ گزر گیا اور سڑک کھلنے کا دن آگیا۔ صبح کانوائے جانا تھا۔ رات شیر باز آیا تو میں نے کہا۔

"شیر باز، وہ پشاور کی واپسی کیا ہوئی؟"

شیر باز کسی قدر جھنجھلا کر بولا۔

"ہم نے تم کو اتنا چکا کباب کلایا (کھلایا) خو تم تاجوڑی نہیں ہوتا۔"

شیر باز کی اسکیم کا اندازہ مجھے پہلا چکا کھا کر ہی ہوگیا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی حد تک زبان درازی کی تھی جو باعث فساد نہ ہو۔

اگلے روز علی الصبح ہمارا کانوائے روانہ ہوا اور ہم پر پہلی مرتبہ آر او ڈی کے اسرار فاش ہوئے۔ واقعہ یوں ہے کہ ان دنوں قبائلی علاقے میں سفر کرنے سے پہلے قبائلیوں کے چند اعتراضات رفع کرنا پڑتے تھے۔ بدقسمتی سے یہ لوگ اپنے اعتراضات کے اظہار میں زبانی فصاحت یا بلاغت کے قائل نہ تھے بلکہ سرے سے زبان کا استعمال ہی نہ کرتے تھے۔ مثلاً آپ موٹر میں جارہے ہیں اور اچانک کہیں سے ایک گولی آپ کے ٹائر میں بطور اعتراض آلگتی ہے۔ یا چلتے چلتے آپ رستے سے پل غائب پاتے ہیں اور دو چار ذرا خونخوار قسم کے معترضین آپ کے استقبال کے لئے آوارد ہوتے ہیں جو بلاخلاف آپ کو موٹر سے نکال کر آپ کا روپے پیسے اور کپڑوں کا بوجھ ہلکا کردیتے ہیں۔ آپ میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کرلیتے ہیں اور اس کیلئے آپ سے کلمہ پڑھوانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ پھر اگر آپ ہندو ہیں تو فی الفور آپ کی مکتی اور نروان کا انتظام کردیا جاتا ہے اور اگر مسلمان ہیں تو آپ کو صوم و صلوٰۃ کی مسلسل آسانی بہم پہنچانے کے لئے ایک غار مہیا کیا جاتا ہے۔ جہاں صوم کا ثواب تو زیادہ تر میزبان ہی کو پہنچتا ہے البتہ صلوٰۃ کا اجر آپ کی اپنی چیز ہے۔ اس خیال سے کہ آپ کی عبادت میں خلل واقع نہ ہو، آپ کو شکم پری سے خاص طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے تاآنکہ آپ کے رشتہ دار یا حکومت آپ کو روپیوں میں تول کر واپس لے جاتی ہے یا پھر دبی گوش تراشی کی نوبت آتی ہے۔

آر او ڈی ایسے اعتراضات کا جواب تھا۔ جس روز قبائلی علاقے کی سڑکوں سے کسی رسد کے کانوائے یا فوج کے کالم کو گزرنا ہوتا تھا، سڑک کے دونوں طرف پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوج چوکیاں جمالیتی تھی تاکہ سڑک پر آمد و رفت بغیر اعتراض جاری رہے۔ محافظ دستوں کے لئے چوکیوں پر بیٹھنا کوئی پکنک قسم کی چیز نہ تھی کیونکہ دوسروں کی نسبت یہ لوگ معترضین کی گولیوں اور خنجروں سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والے اگرچہ محفوظ ہوتے تھے تاہم ان کا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے بھی اکا دکا گولی کہیں سے آن ہی نکلتی تھی۔

ہمارا کانوائے روانہ ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف حفاظتی دستے اور بکتر بند گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر اسکاوٹ اور ملیشیا کے لوگ تھے جن کے انگریز افسروں نے مزری کی شلواریں پہن رکھی تھیں اور سر پر کلہ دار پگڑیاں تھیں۔ کیونکہ اس علاقہ میں کسی سر کا انگریزی ہیٹ کے نیچے سلامت رہنا کسی قدر غیر یقینی تھا۔

میران شاہ، جہاں ہمارا بریگیڈ فرد کش تھا، پہنچے تو ٹام پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اونچا، پتلا، لال مونچھوں والا۔ بالکل ٹام! لیکن نہایت خوش مزاج۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"تو ان بدمعاشوں نے تمہیں برج کی خاطر نکال مارا ہے۔ تمہارا اپنا قصور ہے۔ تمہیں برج آنا چاہئے تھی۔"

ٹام کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ تواضع کے بعد اس نے حسب معمول اپنے سیکشن کے جوانوں، گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سرنگ گھوڑے کے متعلق ٹام کے تعارفی الفاظ خاصے لرزہ خیز تھے اور مجھے اس سے ذرا دور سے ہی مزاج پرسی کی ہدایت کی گئی۔ اس گھوڑے کا رجمنٹل نمبر ۲۲ تھا۔

تام دوسرے روز سیکشن ہمارے حوالے کرکے پشاور چل دیا اور ہم اپنے برگیڈ کے ساتھ دتاخیل کو روانہ ہوئے ۔ دتاخیل افغانستان کی سرحد کے قریب واقع ہے اور فقیرایپی کی جائے سکونت گردینت سے قریب ترین برطانوی پوسٹ تھی ۔ فقیرایپی کا قرب حاصل کرنے کیلئے ہمیں پل صراط کی قسم کے مقامات سے گزرنا پڑا ۔ ہرچند کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوجیں پہرہ دے رہی تھیں تاہم سڑک کے بعض حصے ایسے قبائلی نشانہ بازوں کی راہ میں تھے جو خود تو چٹانوں کی اوٹ میں ہماری گولیوں سے محفوظ تھے لیکن ان کی گولیوں اور ہمارے سروں کے درمیان ہوا کے سوا کچھ نہ تھا ۔ اس کا جواب ہمارے پاس ایک ہی تھا کہ کلمہ شریف پڑھیں ۔ سڑک کا وہ حصہ نہایت تیزی سے عبور کریں اور باقی معاملہ خدا کے سپرد کردیں ۔ اس ٹکڑے کو عبور کرتے ہوئے ہم نے اچھے خاصے سنجیدہ بزرگوں میں سنجیدگی کی تمام علامتیں غائب ہوتے دیکھیں ۔۔

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقام شوق میں کھو گیا وہ فرزانہ

البتہ وہ ٹکڑا عبور کرنے کے بعد ان میں تمام تر بزرگانہ تمکنت عود کر آئی ۔

ہم سے پہلے گزرنے والوں میں سے ایک دو آدمیوں کو گولی لگی پھر ہمارے سیکشن کی باری آئی جو پچیس تیس آدمیوں اور لدے ہی جانوروں پر مشتمل تھا ۔ اس ٹکڑے پر قدم رکھنے سے پہلے نائک حیات محمد نے دعاء مانگی کہ "یا اللہ ہم سب کو بچا اور ہم سے قربانی لینا ہی ہے تو ہم گھوڑا نمبر ۲۲ پیش کرتے ہیں کیونکہ اس کا علاج کچھ تیری ذات ہی کرسکتی ہے ۔ "معلوم ہوتا ہے نائیک حیات محمد کی دعاء اللہ تعالیٰ تک خط مستقیم میں جا پہنچی کیونکہ چند منٹ بعد تمام سیکشن بخیر وعافیت پار تھا ۔ سوائے گھوڑا نمبر ۲۲ کے جس نے سینے پر گولی کھا کر اپنی جان جان آفرین کے حوالے کردی اور اپنے این سی او کی لاج رکھ کر فوجی ضبط کی مثال قائم کردی ۔

دتاخیل کی پوسٹ (چھوٹا قلعہ) ایک خاصے کھلے میدان میں واقع ہے جس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں ۔ ہمارے برگیڈ نے پوسٹ کے قریب ایک وسیع دائرے میں ڈیرے ڈالے ۔ دائرے کی مختلف قوسوں میں ایک معروف قاعدے کے مطابق مختلف یونٹوں کو جگہ دی گئی اور دائرے کے ارد گرد جو پستہ قدی حفاظتی دیوار تھی اس کی مرمت کی گئی ۔ اب اگلے روز فقیرایپی کے خلاف جنگ آزما ہونا تھا ۔ ہمارا خیال تھا کہ اب چارو ناچار ایک دو روز میں جان بحق ہوجائیں گے ۔ سرحدی جنگوں کا انداز کچھ نرالا سا ہوتا ہے ۔ ہرروز ایک معرکہ ہوتا ہے ۔ کبھی کسی لشکر کے جمع ہونے کی خبر سنتے تو اس کی گوشمالی کےلئے جاتے ۔ کبھی دشمن کے گاؤں کو گھیرے میں لے کر اس کے مکان اور برج تباہ کرتے ۔ کبھی سڑک بنانے کےلئے جاتے اور کبھی آر ڈی او کےلئے ۔ پہلے دن ایک لشکر کی سرکوبی کے لئے منہ اندھیرے ہمارا کالم کیمپ سے نکلا ۔ پلٹن رسالہ ،توپ خانہ ،سب کے سب خاموش ۔ خوف کا سا عالم ۔ جاں بحق ہونے کا شدید احساس ۔ آخر میدان کارزار میں پہنچے تو اپنے آپ کو چند دوسرے افسروں کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پایا ۔ ہم سے ذرا نیچے ہماری پلٹن اور توپخانے نے مورچے سنبھال رکھے تھے ۔

اس سے نیچے نالہ تھا اور نالے سے پار کی پہاڑی پر دشمن تھا ۔ فضاء بدستور خاموش تھی ۔ ہم اپنی دور بین سے دشمن کی حرکات دیکھنے کی کوشش کررہے تھے ۔ لیکن ایک سناٹا سا چھایا تھا ۔ دفعتہ سکوت ٹوٹا اور آواز آئی ۔

"ٹھک ٹھوں ۔"

یہ گویا قبائلی گولی کی Signature Tune تھی ۔ جونہی دشمن کی کمین گاہوں اور سمت کا اندازہ ہوا ،ہماری طرف سے مشین گنیں دندنانے لگیں ۔ توپیں گولے داغنے لگیں ۔ معلوم ہوتا تھا دشمن صفحہ ہستی سے نابود ہوجائے گا لیکن جونہی ہمارا فائر بند ہوا پھر وہی

ٹھک ٹھوں شروع ہوگئی۔

رہا ہمارے جان بحق ہونے کا سوال تو وہ کچھ پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ اتفاق سے ہم اتنی بلندی اور فاصلہ پر تھے کہ دشمن کی گولیوں کی زد سے باہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چٹانوں پر بغیر اوٹ کے بیٹھے دوربین آنکھوں سے لگائے میدان جنگ بلکہ کوہستان جنگ کا معائنہ کررہے تھے اور سچ پوچھئے تو یہ ہے کہ جہاں تک ہم بالا نشینوں کا تعلق تھا پہلے دن کی جنگ اتنی ہی خطرناک ثابت ہوئی جتنا سینما میں جنگی فلم دیکھنا لیکن ہمارے ساتھی جو دشمن کی گولیوں کی زد میں تھے ایسے خوش قسمت نہ نکلے۔ شام کو پتہ چلا کہ اس دن ہمارے تین جوان مارے گئے۔

قبائلی معرکوں کا سب سے دردناک سین وہ ہوتا تھا جب قبائلیوں کے مکانوں اور برجوں کو گرایا یا جلایا جاتا تھا۔ آیئے یہ منظر دیکھیں۔

ندی کے کنارے سبز اور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو آج کل بالکل خالی ہے۔ سب مرد، عورتیں اور بچے پہاڑوں میں جا بیٹھے ہیں۔ کچے لیکن صاف ستھرے مکانوں میں قفل پڑے ہیں۔ وہ سامنے بڑی محرابوں والا مکان ہے جس کے ساتھ ایک بلند و بالا اور دلکش سا برج ہے۔ یہ غالباً گاؤں کے مالک کا مکان ہے۔ حفاظتی فوج کی آڑ میں چند سپاہی گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ کبھی کسی خاص شریر آدمی کا مکان اور کبھی گاؤں کا گاؤں زمین کے برابر کردیتے ہیں۔ بڑے برج کا گرنا ایک نظارہ ہے جس پر ہر ایک کی آنکھ لگی ہوئی ہے اور جونہی اس کی بنیادوں میں بارود کا دھماکہ ہوتا ہے، چشم زدن میں وہ سرو قامت برج چکنا چور ہوکر ایک بے معنی سا ملبہ بن جاتا ہے۔ لیکن قبائلی اس حرکت پر کچھ بے جا طور پر مشتعل نہ ہوتے۔ وہ اسے بھی جنگ کا ایک حصہ سمجھتے۔ دن کو ان کے مکان مسمار کئے جاتے لیکن رات کو وہ لوگ آتے۔ اپنی فصلوں کو پانی دیتے، ہل چلاتے اور مکانوں کا گرنا گویا ایک موسمی حادثہ سمجھتے اور دوبارہ تعمیر کرلیتے۔

اور بلذار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اگر کسی دن کوئی آپریشن نہ ہوتا، تو قبائلی تفریحاً ہی کچھ ہنگامہ کھڑا کردیتے۔ ایک مرتبہ ہمیں ہفتہ بھر کیمپ سے باہر جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ ایک دن تو قبائلی خاموش رہے لیکن دوسرے روز اس پھیکی زندگی سے تنگ آکر انہوں نے غروب آفتاب کے وقت ہمارے کیمپ پر گولیاں برسانا شروع کردیں اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک گولوں اور گولیوں کی جوابی بارش نہ برسا دی گئی۔ ایسی کمیاب رونق مہیا ہونے سے بظاہر ان کی تشفی ہوگئی کیونکہ پھر وہ آرام سے سوگئے۔

اس کے بعد ہر روز سر شام پہاڑ کے کسی کونے سے مصرع طرح کے طور پر ایک قبائلی گولی آنکلتی اور یہ شعر گوئی اس وقت تک جاری رہتی جب تک جواب میں ایک پوری غزل پیش نہ کردی جاتی۔

ہم میں سے اکثر سامعین کے زمرے میں تھے اور اگرچہ باہر سے آنے والی گولی کا واجبی سا ڈر بھی رہتا تھا تاہم ہر شام کا تماشا کچھ ایسا جزو زندگی بن گیا تھا کہ کسی وجہ سے ناغہ ہوجاتا تو ایسی ہی مایوسی ہوتی جیسے سنیما ہال میں داخل ہوتے پر فلم کی نمائش روک دی جائے۔ اسی تماشے کے دوران ایک شام ہمارا ایک خوش مزاج اور کہنہ مشق مخبر راہی ملک عدم روانہ ہوگیا اور ہمارے سیکشن میں غم کی لہر دوڑ گئی کیونکہ بقول نائیک حیات محمد آنجہانی کا "فیلڈ کرافٹ" کا علم اس قدر پختہ تھا کہ اس کا ایک قبائلی گولی کی زد میں آنا باور نہ آتا تھا۔

لڑائی کے دنوں میں پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے ذریعہ دشمن سے نامہ و پیام بھی رہتا بلکہ کئی روز ایسا ہوتا کہ پانچ سات تنومند سے قبائلی ٹھوڑیوں کے نیچے سے پگڑیاں باندھے اور سفید چادریں تانے کیمپ میں آداخل ہوتے۔ کالم کمانڈر سے بات کرتے اور پھر اسی

طرح سفید پھریرے اڑاتے ہوئے تیز تیز کیمپ سے باہر نکل جاتے۔ بات خفیہ ہوتی مگر ہم تک مع تفسیر لنگر گپ کی شکل میں آ پہنچتی۔ قبائلی چند لاکھ روپے کے عوض صلح پر آمادہ ہیں یا وہ مزید ایک سال کے لئے لڑنے کا چیلنج دے گئے ہیں۔

غرض دو ماہ تک یہی انداز رہا اور جس جنگ سے بچنے کے لئے شیرباز ہمیں تکے کباب کھلا کر بیمار کرنا چاہتا تھا وہ نہایت صحت افزا ثابت ہوئی۔ خود شیرباز کو اس زندگی سے عشق ہونے لگا جس میں اور چیزوں کے علاوہ سفت اور وافر راشن کا حصہ بھی تھا۔

جنگ اگرچہ اب ہفتے عشرے میں ختم ہونے والی تھی تاہم شیرباز اور ہم ایک غیر معین عرصے کے لئے جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ اتنے میں اچانک پشاور سے وائرلیس سے پیغام آیا۔

"پشاور پہنچو، تمہاری جگہ پر ٹام آرہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک اور پیغام آیا۔

"ٹام کا انتظار کئے بغیر چل دو۔ میران شاہ میں ہوائی جہاز تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

حیران تھا کہ یا اللہ ایک خستہ نیم لفٹین کے بغیر کون سے کام بند ہیں جو ہوائی جہاز سے بلایا جارہا ہے۔ بہرحال دتاخیل کو ایک اداس انگریزی الوداع کہی اور پشاور پہنچتے ہی ایڈجوائنٹ صاحب کے حضور پیش ہوا۔ مجھے دیکھ کر بولے۔

"تم آگئے؟ شاباش۔ اب تم سمندر پار جاؤگے۔ تیاری کیلئے تمہیں دو دن دیئے جاتے ہیں۔"

حکم سن کر باہر نکلا تو آگے جان وائٹ کھڑا تھا۔ بولا

"دیکھا۔ یہ ان سارجنٹوں کی سازش ہے۔ سمندر پار ٹام کو جانا چاہئے تھا وزیرستان کی لڑائی تو اب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لئے ٹام کو وہاں بھیج دیا ہے۔ وہ کل پرسوں آجائے گا اور پھر یہ مزے سے برج کھیلیں گے اور تم؟ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ سر کو ذرا جھکا کر رکھنا۔"

یہ سن کر دل کو سخت صدمہ ہوا۔ فوراً شیرباز کو طلب کیا اور تکے کباب کا آرڈر دیا۔ ساتھ ہی برج کی کتاب منگوا کر مطالعہ شروع کردیا۔ (بہ جنگ آمدے) ۔ ☆

محمد خاں

ہائے میں مر گئی...

بجنگ آمد کو شائع ہوئے بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ راولپنڈی کے ایک معروف ادارے نے ہمارے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا۔ اب پنڈی کی گلیوں میں ہم برسوں سے گھوم رہے تھے لیکن عام، گمنام سپاہیوں کی طرح۔ حلقہ یاراں میں ہماری بزم آرائیاں اپنی جگہ لیکن باہر کی دنیا میں اول تو ہمیں کوئی جانتا ہی نہ تھا اور جو دور سے پہچانتے تھے، ہمیں بالکل بیبا بلکہ بے زبان سا آدمی سمجھتے تھے لیکن شاید بجنگ آمد کی رو سے ہماری تاثیر کچھ مختلف تھی۔ ہال میں پہنچ کر حاضرین کی طرف منہ کر کے اسٹیج پر بیٹھا ہی تھا کہ پہلی یا دوسری صف کی ایک خاتون کے منہ سے ایک حیرت کے عالم میں پنجابی آواز نکلی جو میرے سمیت کئی دوستوں نے سنی اور جو آج تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ محترمہ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا:

"ہائے میں مر گئی ایہہ کتاب ایس گھگو نے لکھی اے۔ اتوں کنا بھولا لگدا اے تے وچوں کنا میسنا نکلیا!"

یہ تھا پہلا پتھر! ہم خاموش رہے کہ حملہ آور خاتون تھی اور اسے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔ یہ دوسری بات کہ جب صحبت رہنے لگی تو اس نیک دل خاتون نے اپنا جملہ بکمال ندامت واپس لے لیا اور فرمایا۔ بحمد للہ۔ تم اتنے بھولے نہیں جتنا مجھے شک تھا۔ لیکن اس پرائیویٹ معذرت سے وہ بھری محفل کا گھاؤ تو بھرنے کا نہیں تھا اور آج تک نہیں بھرا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے ....

اس واقعہ سے کچھ ہی عرصہ بعد ایک شام غریب خانے پر ایک پتلے کینڈے، چھدری داڑھی اور حنفی حلیئے کے شیروانی پوش بزرگ تشریف لائے اور ایسے لب و دنداں کے ساتھ جو ایک ہی لحہ پہلے پان سے فارغ ہوئے ہوں، بلکہ ان کی داڑھ مع داڑھی جگالی کی آخری حرکات سے گذر رہی تھی۔ میں باہر صحن چمن میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر استفسار فرمایا:

"کرنل محمد خاں گھر پر ہی ہیں؟"

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ادب سے کرسی پیش کرتے ہوئے بولا:

"تشریف رکھیں۔ میں ہی محمد خاں ہوں۔"

غالباً مجھے کرتے شلوار میں دیکھ کر سکتے میں آگئے اور بیٹھے بغیر بولے

"گویا آپ ہی کرنل محمد خاں ہیں؟"

عرض کیا: "جی ہاں"۔ مگر یوں لگا جیسے کسی جرم کا اقبال کر رہا ہوں۔

بولے: "تو کرنل لوگ فوجی وردی نہیں پہنا کرتے؟"

عرض کیا: "پہنتے ہیں، مگر ایک وقت آتا ہے جب اتار بھی دیتے ہیں۔ مثلاً گھر آکر۔"

بولے۔ "معاف کرنا صاحب۔ آپ کے متعلق میرا تصور ذرا مختلف تھا۔ میرا مطلب ہے ذرا جلال والے انسان کا۔"

اب یہ کتنی ہی خاکساری کروں، ایک بات واضح تھی کہ جلال کی مقدار مجھ میں ہر چند کہ کم تھی، مولانا سے دو چار ماشے زیادہ ہی تھی۔

لیکن سوال میرے انداز کا نہیں، مولانا کی وضع کا تھا جو میری جگہ جلال سے لت پت آدمی دیکھنا چاہتے تھے۔ بہر حال پوچھا۔

"قبلہ، تو کیا مجھ میں جلال کی کمی ہے یا انسانیت کی قلت دکھائی دی ہے؟"

اس سوال کے جواب میں محترم صرف مسکرادیئے اور آپ کی مسکراہٹ صاف کہہ رہی تھی کہ ہر دو کا قحط ہے۔ آپ کی مسکراہٹ کی صاف گوئی نے دل جیت لیا۔ عرض کیا:

"لیجئے بات مولانا۔ آپ کی تعریف؟ اور ہاں چائے یا کافی؟"

بولے: "شربت روح افزا ٹھیک رہے گا اور ہاں خاکسار کو مولانا نہیں، میر نجیب اللہ کہتے ہیں۔ احباب میر نجو پکارتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے سے خاندانی شغف ہے۔ میں بھی کتاب لکھنے کا عزم کر رہا ہوں۔"

مجھے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ میر صاحب کے عالم بالا میں مکمل سکون نہیں مگر اس تھوڑی سی بالائی بدامنی کی وجہ سے وہ زیادہ دلچسپ آدمی نظر آنے لگے۔ مہمان کی تواضع بہرحال لازم تھی۔ چنانچہ میر صاحب کو بازو سے تھام کر کرسی پر بٹھایا۔ ان کے لئے شربت منگایا اور باتیں ہونے لگیں۔ لیکن خدا جانے میری باتوں کے بجے درست نہ تھے یا میرے کرتے شلوار سے ناخواندگی ٹپکتی تھی، میر نجو مجھ سے کچھ متاثر نہیں ہورہے تھے۔ صرف کبھی کبھی سرپرستانہ ہنسی ہنس دیتے۔ بہر حال جب باتوں باتوں میں بے تکلفی کی ایک دو منزلیں طے ہوچکیں تو میر صاحب نے اچانک فرمایا۔

"بندہ پرور، ایک بات پوچھوں؟"

"ارشاد"

"آپ برا تو نہ مانیں گے؟"

"آپ بلاتکلف پوچھیں"

"بجنگ آمد آپ نے خود لکھی ہے؟"

اب اگر یہی سوال کوئی ہوش مند شخص پوچھتا تو ہم نہ صرف برا مانتے بلکہ اسے اس کی ہوش مندی سمیت اٹھا کر قریب کے گڑھے میں پھینک دیتے۔ مگر میر صاحب کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ وہ نہایت دیانت داری سے ہمیں بدھو سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ عرض کیا۔

"میر صاحب۔ آپ نے راز کی بات پوچھ ڈالی ہے۔ کسی کو بتلایئے گا تو نہیں؟"

بولے: "آپ کا راز میرا راز ہے۔"

اور یہ کہہ کر کان میرے منہ کے قریب لے آئے۔ پہلے تو جی چاہا کہ نیچے سے گھاس کا تنکا اٹھا کر ان کے کان میں تیز اور گہری گدگدی کروں لیکن بے تکلفی اس حد تک بھی نہیں بڑھی تھی۔ میں نے ایک مدھم سے سازشی لہجے میں ان کے کان میں کہا۔

"ایک جگہ سے لکھوائی تھی۔"

سرگوشی میں بولے: "کہاں سے؟"

میں نے ذرا زیادہ گہری سرگوشی میں جواب دیا۔

"ادارہ خدمت خلق سے"

میر صاحب ایک لمحے کیلئے سیخ پا سے ہوگئے اور بولے۔

"صاحب، تمسخر کرتے ہیں مجھ سے؟ اس ادارے کا کام تو گمشدہ بچے ڈھونڈنا ہے!"

یا۔ "بے شک۔ یہ لوگ بچے ہی ڈھونڈتے ہیں مگر جب سب بچے مل جائیں تو پھر حاجت مندوں کے لئے کتابیں بھی لکھتے ہیں۔
مخیر لوگ ہیں میر صاحب۔ یہ تمسخر کی بات نہیں۔"
یر صاحب بولے: "چلو، مخیر سہی لیکن کیا بچے ڈھونڈنے والے کتابیں بھی لکھ سکتے ہیں؟"
عرض کیا، "میر صاحب قبلہ، یہ ادارہ فقط وہ کارکن بھرتی کرتا ہے جو نہ صرف خدمت خلق میں یکتا ہوں بلکہ علم و ادب میں بھی
ں۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ راولپنڈی، اسلام آباد کے ادارہ خدمت میں حضرت جوش ملیح آبادی، سید ضمیر جعفری اور جناب
ق جیسے بزرگ شامل ہیں اور یہ بڑے باکمال لوگ ہیں۔ میر صاحب۔ یہ بچے ڈھونڈنے پر آئیں تو آنکھیں بند کرکے اندھیری
سے بچہ نکال لاتے ہیں اور کتابیں لکھنے لگیں، خصوصاً دوسروں کے لئے تو گنڈیریوں کی طرح شاہکار گھڑتے، ڈھیر لگاتے چلے
ں۔ کاش آپ نے میری بات کو مذاق نہ سمجھا ہوتا۔"
یہ جملے ہمارے منہ سے اس قوبی سادگی سے نکلے کہ میر صاحب دام میں آگئے۔ جھٹ بولے۔
"سبحان اللہ، کیا ایثار پیشہ لوگ ہیں یہ تینوں۔ آپ کی کتاب تو سید ضمیر جعفری نے لکھی ہوگی؟"
"اللہ جانے، میر صاحب۔ تین میں سے کسی ایک نے لکھی ہے۔ لکھی کیا ہے، نیکی کرکے دریا میں ڈال دی ہے۔ اللہ انہیں
خیر دے۔"
"ماشاء اللہ۔ اور ہاں، بھلا کیا ہدیہ لیتے ہونگے ایک کتاب لکھنے کا؟"
میر نجو کی بلی نے تھیلے سے پہلی دفعہ جھانکا۔ آپ کا کتاب لکھوانے کا شوق ایک جھٹکے کے ساتھ بیدار ہوا تھا۔ میر صاحب
لکھوانا، شیروانی سلوانا یا حجامت بنوانا ایک جیسا فعل سمجھتے تھے۔ جواباً عرض کیا۔
"میر صاحب، ہدیہ تو کتاب کے سائز پر منحصر ہے۔ ویسے ناداروں، یتیموں اور بیواؤں کو وہ مفت بھی لکھ دیتے ہیں۔"
میر صاحب جھٹ بولے۔ "یہ تو اور اچھا ہوا۔ والد صاحب قبلہ اوائل عمری میں وفات پاگئے تھے۔"
میر صاحب نے صراحت تو نہ کی لیکن ظاہر تھا کہ ان کے والد اپنی عمر کے اوائل میں نہیں بلکہ میر صاحب کی اوائل عمری میں اللہ
ے ہوئے تھے۔ بہرحال وہ اپنی یتامت کے سہارے اپنی Elegibility ثابت کررہے تھے۔
عرض کیا۔ "جی ہاں۔ اگر آپ دادا جان کی رحلت بھی حساب میں لے لیں تو ڈبل یتیم شمار ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس کی ضرورت
سادہ اور مفرد یتامت ہی کافی ہے۔ صرف اس کی تصدیق درخواست کے ساتھ نتھی کرنا ہوگی۔"
میر نجو چہک کر بولے۔ "یہ کوئی پرابلم نہیں۔ کمیٹی کے دفتر میں ایک کلرک میرا واقف ہے۔ معمولی رشوت لیتا ہے۔"
میر صاحب نے یہ کہا اور پھر اس تیزی سے اٹھے گویا لگے چند لمحوں میں درخواست لکھ کر کمیٹی سے پروانہ یتیمی لے کر، ادارے
زہ توڑ کر، جوش صاحب کے ہاتھ میں قلم تھما کر کتاب شروع کرادیں گے ..... بہرحال میر نجو تو اپنی کمزوری کا شکار ہوگئے لیکن
ـنے سے پہلے ہماری کمزوریوں کو بھی بڑی بے رحمی سے بے نقاب کرگئے اور یہ بھی واضح فرماگئے کہ ہم اس کتاب کے مصنف
کے قابل نہ تھے جو خود ہم نے لکھی تھی۔ بلکہ ملاقات کے آخر میں اگر ان کے راہوار وحشت کا رخ جوش صاحب کی طرف نہ موڑ
ذرا اور زیادہ رودند کر ہی رخصت ہوتے ..... یہ تھا دوسرا پتھر!

●☆●

محمد خاں

بازی گاہِ عالم: بیروت

ایر ہوسٹس گھر اجاڑنے میں کیا مدد دے سکتی ہے؟

بالآخر وہ وقت آیا کہ ہم جملہ احباب سے بچھڑ کر اور اعدا سے بچ کر تقریباً صحیح و سالم کراچی ایرپورٹ پر پہنچے جہاں ہمارے انتظار میں پی آئی اے کا بوئنگ ۷۰۷ کھڑا تھا۔ ہم نے زینے پر قدم رکھا اور قدم رکھتے ہی اس خوش آمدید کے مخاطب بنے جس کے لیے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ یعنی ان لبوں سے خیر مقدم کے الفاظ نے جن کی نازکی بیان کرنے کے لیے خدا نے میر کو پیدا کیا تھا۔ یہ لب، یہ گلاب کی پنکھڑیاں، ایک پی اور کھری ائیر ہوسٹس کے تھے جس کی تخلیق میں فطرت سے اور انتخاب میں پی آئی اے سے کوئی ایک غلطی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ پر ہی ہمارے پنڈی سے کراچی تک کے گلے دھل گئے۔ اور دوسری نگاہ پر ہم نے جملہ متعلقان پی آئی اے کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا۔

جہاز کے اندر داخل ہوئے تو ایک دوسری شاخِ نبات ہمارے بورڈنگ کارڈ کا بارِ گراں اٹھائے ہمیں اپنی مخصوص نشست تک لے گئی۔ وہ سراپا تواضع آگے اور ہم سراپا تفاخر پیچھے پیچھے ـــــ جونہی ہماری سیٹ آگئی، اس نے ایک مرصع مسکراہٹ کے ساتھ ہماری نشست کی طرف اشارہ کیا۔ سیٹ پر بیٹھ تو شاید ہم خود بھی جاتے لیکن اتنے پیارے اشارے کا مشار الیہ بننے کے بعد بیٹھنے میں ہمیں ایک توانائی کا احساس ہوا جیسے ٹانک پی لی ہو۔ خدا جانے ایک ایسے ہی موقع پر غالب پر کیوں الٹا اثر ہوا تھا بچا بے چارے نڈھال ہو کر آہیں بھرنے لگے تھے: "طاقت ربا وہ اس کا اشارہ کہ ہائے ہائے۔" چنانچہ ایک آسودگی کے عالم میں ہم اپنی نشست پر فروکش ہوئے لیکن پہلی سنگتری کے بعد جونہی استقبال کے ابتدائی سحر سے سنبھلے اور حساب بیٹھ کر کے تعبیر آئی تو ہم پر کھلا کہ اعلیٰ کوالٹی کے چاولوں کی طرح بڑھیا قسم کی ایر ہوسٹسیں بھی برآمد کے لیے ہی استعمال ہوتی ہیں۔ یعنی وہ جو اندرونی پروازوں میں آسمانی دکھائی دیتی ہیں، دراصل بڑی خاکی ہیں اور یہ کہ سماوات کی سرداری فقط بیرونی جہاز کی پریوں ہی کو زیبا ہے۔

دختران فلک کے قصیدہ کو ہم نے قصداً طول دیا ہے۔ کچھ تو یہ حکایت لذیذ ہے اور لذیذ و دراز ترکیے جانے کے قابل ہے اور کچھ ہم اپنی تلخ گوئی کی تلافی بھی کرنا چاہتے ہیں جو پنڈی کراچی کے سفر میں ہم سے سرزد ہوئی تھی۔ ہمیں توقع ہے کہ نکتہ رس قاری اس بات کی داد دے گا کہ جہاں ہم کج اداؤں کے ساتھ اظہار بیزاری میں بخل نہیں برتتے وہاں زہرہ جبینوں کی دلداری میں اسراف بھی روا رکھتے ہیں۔ بلکہ خاص حالات میں تو گھر بشمول دل بھی لٹا دیتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص تعریف تو کرے مگر قبض کے ساتھ، تحقیق، بخیل ہی نہیں، رذیل بھی ہے۔

اڑنے سے پیشتر ایک رس بھری آواز نے براہ مائیکروفون ہمیں خوشامد کی حد تک خوش آمدید کہا اور خوشامد کا مزا ابھی منہ ہی میں تھا کہ بوئنگ فضا میں بلند ہوا۔ جب بہتر درجے کی بہار آفریں بلندی پر پہنچا تو تواضع کا سلسلہ شروع ہوا: پہلے لکڑ آئے، پھر ناشتہ آیا، پھر سگار آئے اور آخر سوال آئے: "کچھ پیجیے گا؟ کچھ پڑھیے گا؟ سر کے نیچے تکیہ رکھ دوں؟ پاؤں کے نیچے دل بچھا دوں؟ اپنی جان نذر کروں؟ اپنی وفا پیش کروں؟" ـــــ خدا جانے اس توبہ شکن تواضع نے کتنے شوہروں کے مزاج بگاڑے اور گھر اجاڑے ہوں گے لیکن معاف

کیسے یہ سوال ہمیں بعد از وقت سوجھ رہا ہے اس وقت بوئنگ کے مسافروں کو ایسے فاسد سوالوں کا مزاج نہ تھا۔ اگر کوئی پوچھتا تو جواب صاف تھا: مزاج بگڑتا ہے تو بگڑنے دیجیے۔ گھر اجڑتا ہے تو اجڑنے دیجیے۔ ناصحو، اس لو یہ عبث فکر فضول ہے، جب حشر کا دن آئے گا، اس وقت دیکھا جائے گا۔

جب تواضع کا طوفان تھما تو آہستہ آہستہ ہوسٹسوں نے بھی پر سمیٹے اور ایپرن اتار کر اپنے آستانے میں سستانے لگیں اگرچہ پھر بھی گھنٹی کی آواز پر کبھی روتے بچوں کے منہ میں مصنوعی نپل اور کبھی بڑبڑاتے بوڑھوں کے دہن میں اصلی اسپرو ڈالتے نظر آتیں۔ بہر حال ایک مختصر سے بے ہوسٹس وقفے میں ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جہاز میں ہمارے علاوہ اور مسافر بھی ہیں۔ سب سے پہلے ہم نے ہم نشیں پر توجہ دی۔ آپ کے چہرے پر میرپور اور قمیص پر سالن کے آثار تھے۔ خوش قسمتی سے آپ سو رہے تھے، زیادہ گہرے تعارف کی نوبت نہ آئی۔

یہ صحرا یہیں رہتا ہے

کھڑکی سے باہر جھانکا تو معلوم ہوا کہ دیارِ وطن سے کوسوں نکل آئے ہیں۔ وہ خطہ خاک جس پر ہم اڑ رہے تھے، خطہ پاک نہ تھا بلکہ پانچ میل کی بلندی سے بھی اجنبی نظر آتا تھا۔ یہ صحرا تھا اور کوئی صحرا سا صحرا! چپٹا، چٹیل اور چوپٹ۔ ہم نے اپنے حافظے کے جغرافیہ داں حصے سے اس صحرا کا نام پوچھا تو حافظے نے اپنی معصومیت کا اظہار کیا۔ ہمیں الجھن یہ تھی کہ ہمارے علم نقشہ کے مطابق وہاں سمندر ہونا چاہیے تھا یا ساحل سمندر جہاں نقرئی بادبانوں والی خوابگوں کشتیاں رواں ہوں اور سیکساران ساحل روپہلی ریت پر غسل آفتابی میں رونقک لیٹے ہوں تاکہ اوپر سے ہمارا طیارہ گزرے تو ان تنگ پوشوں کو کچھ چھپائے نہ بنے --- ہمیں پورا علم ہے کہ جہاں دیکھنے والوں اور دیکھے جانے والوں کے درمیان پانچ میل کا عمودی فاصلہ حائل ہو وہاں کوئی قابل فہم اعضا و اجزا نظر نہیں آتے۔ تاہم التماس ہے کہ ایسا سوچنے میں کیا حرج ہے؟ رعنائی پر بے شک ہمارا تصرف نہیں لیکن رعنائی خیال تو کسی کی جاگیر نہیں اور یہ ہمارا نہیں غالب دیدہ ور کا نسخہ ہے:

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال

لیکن اس لق ودق صحرا کے نظارے سے ہمارے خیال کا حسن بری طرح ریگ آلود ہو گیا۔ ہاں ایک فائدہ ہوا کہ یہ الجھن ایک تقریب ملاقات کا بہانہ بن گئی اور ہم نے پاس سے گزرتی ہوسٹس کو ٹھہرا کر پوچھا: "یہ صحرا کہاں سے آگیا؟"

بولی: "جہاں تک میرا علم ہے یہ صحرا یہیں رہتا ہے۔ بہر حال یہ ایران ہے۔"

"ایران!" ہمارے منہ سے احتجاجاً نکلا "وہ سعدی و حافظ والا ایران! وہ آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ والا ایران؟ وہ آہوؤں اور غزالوں والا ایران؟ وہ بلبلوں اور قمریوں والا ایران؟ وہ......"

"معاف رکھیے گا۔" ایئر ہوسٹس ایک دلآویز بے صبری سے بولی "ایران کے چرند و پرند کی فہرست تو بہت طویل ہے اور مجھے دوسرے مہمان بھی بلا رہے ہیں۔ کیا میں کوئی فوری خدمت بجا لا سکتی ہوں؟ مثلاً اسپرو......"

ہم اتنے بوڑھے تو نہ تھے کہ صدمہ صحرا سے جانبر ہونے کے لئے ہمیں اسپرو پیش کی جاتی لیکن اتنے بچے بھی نہ تھے کہ ہمارے منہ میں نپل دے دیا جاتا۔ بہر حال اسپرو کی پیشکش ہم نے شکریے کے ساتھ مگر نہایت وثوق سے ٹھکرا دی۔ ہمیں ناخوش دیکھ کر ہوسٹس بولی:

"آپ چند گھنٹے صبر کریں، بیروت میں آپ کو اتنی بلبلیں اور قمریاں ملیں گی کہ چک لالے میں اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوتیں" ۔
اور پھر رواں دواں مسکراتی گنگناتی لہر کی طرح آگے بڑھ گئی اور ساتھ ہی ہمارے جملہ شکوے اور شکایتیں بہالے گئی نیز کچھ روشنی بھی چرالے گئی ۔ روشنی ماند پڑھ گئی تو ہم نے بھی آنکھیں موندلیں کہ پچھلی رات بہت تھے جاگے ، لیٹ گئے آرام کیا ۔ بیروت تک پانچ گھنٹے کا سفر تھا ۔ کہیں بغداد کی نواحی فضا میں لنچ کے لئے جاگے بلکہ جگائے گئے ۔ لنچ تو خیر لذیذ تھا ہی لیکن ہم پر دیرپا اثر نان و گوشت کے ذائقے کا نہ تھا بلکہ تواضع کے مزے جس نے ہمیں اور ہمارے ہم نفسیں کو عارضی مہاراجہ بنادیا ؛ ہمیں ریاست چک لالہ کا اور انھیں ریاست میر پور حال بریڈ فورڈ کا !

پھر دفعتاً بیروت آگیا اور ہماری بین الاقوامی زندگی کی ابتدا ہوئی ۔ اس کی پہلی علامت یہ تھی کہ جونہی ہم جہاز سے اترے ہم سے زیادہ اہمیت ہمارے پاسپورٹ کو دی جانے لگی ۔ گویا پاکستان سے ہم پاسپورٹ لے کر نہیں آئے تھے بلکہ پاسپورٹ ہمیں لیکر آیا تھا اور یہ جاننے کے لئے کہ ہمارا وجود لبنان کے لئے مفید ہے یا مضر ، ہماری نبض سے زیادہ ہمارے پاسپورٹ کی نبض ٹٹولی گئی ۔ جب ہمارے پاسپورٹ کی صحت ٹھیک نکلی تو ہماری تندرستی بھی تسلیم کرلی گئی ۔ گویا ہماری حالت ان داستانی شہزادوں سے مختلف نہ تھی جن کی جان طوطے مینا میں ہوتی تھی ۔ ہماری جان پاسپورٹ میں تھی ۔ چنانچہ ہم نے اسے چوما ، سینے سے لگایا اور جس چیز کو کبھی دراز کی تہ میں پھینک دیتے تھے ، اب دل کی تہ میں جگہ دی ۔ یہ ہوچکا تو بسم اللہ کرکے دونوں ہاتھوں سے سامان اٹھایا اور چل پڑے ۔ ہم مہاراجگی سے بوئنگ سے اترتے ہی معزول ہوگئے تھے اور کسٹم کے راستے کچھ عربی ، کچھ انگریزی ، کچھ سچ ، کچھ جھوٹ بولتے ائیرپورٹ سے باہر نکلے ۔

بیروت میں بھی آپ کی سسرال ہے

بیروت میں ہمارا کوئی واقف آشنا نہ تھا ۔ پاکستان سے روانگی سے پہلے ہمارے ایک مہربان نے اپنے ایک مہربان کو ، جو بیروت میں مقیم تھا ، تار بھیج کر ہمارے استقبال کی تاکید کی تھی ۔ ہم نے ائیرپورٹ سے نکل کر ہر چہرے کو دیکھا کہ کسی زاویے سے پاکستانی نظر آتا ہے یا نہیں اور یہ تو آمدہ استقبال ہے یا نہیں لیکن ناکامی ہوئی ۔ ناچار ہم نے ابن انشا کا ہدایت نامہ نکالا ۔ لکھا تھا :
" بیروت ائیرپورٹ سے ٹیکسی لے کر سیدھے الحمرا ہوٹل پر جائیے اور ساتھ ہی الحمرا پر سرخ دائرے کا نشان تھا ۔ ہم نے تیزی سے الحمرا کے لئے ٹیکسی لی ، منزل مقصود پر پہنچے تو منزل سامنے تھی ۔ مگر مقصود غائب یعنی ہوٹل موجود تھا مگر رہنے کو جگہ نہ تھی ۔ الحمرا کناروں تک مسافروں سے بھرا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا بیروت کے اکثر سیاحوں کے پیران طریقت نے اپنے لال دائرے الحمرا ہی پر ثبت کئے ہیں ۔ بڑی مایوسی ہوئی ۔ ایک بار پھر ابن انشا کے نقشے کی طرف رجوع کیا اور ایک نیلے دائرے والا مقام نظر آیا جو راہ طریقت سے تو ذرا ہٹ کر واقع ہوا تھا لیکن تھا خاصا کارآمد ۔ یہ پی آئی اے کا دفتر تھا اور الحمرا سے دور نہ تھا ۔ دو چار قدم ہی چلے تو سامنے ایک عمارت کی پیشانی پر سبز پاکستانی رنگ کے تین مانوس انگریزی حروف نظر آئے : PIA دفعتاً ساری اجنبیت ، ساری کوفت دور ہوگئی ۔ یہ عجیب بات ہے کہ وطن میں ہم پی آئی اے کے دفتر کے سامنے سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے غیروں کا گھر ہو ۔ لیکن کسی غیر ملک کی گلیوں سے گزرتے ہوئے یہ تین سبز حروف نظر آجائیں تو یوں لگتا ہے جیسے سسرال ہو ۔ اندر داخل ہوئے تو مانوس پاکستانی چہرے دکھائی دیے ۔ اردو میں علیک سلیک ہوئی اور پھر ہم نے اپنے تار فراموش میزبان کو فون کیا ۔ ہمارے ابتدائی سلام کے جواب میں بڑی دوستانہ اردو آواز آئی : " ارشاد ۔ "

"کیا میں فیاض صاحب سے بول رہا ہوں؟"
"بے شک یہ آپ کا خادم فیاض ہے اور آپ کی تعریف"؟
"میری تعریف تو اس تار میں درج ہے جو رحمن صاحب نے آپ کو ایبٹ آباد سے بھیجا تھا۔" "کب بھیجا تھا؟"
"یہی کوئی تین روز ہوئے۔"
"صرف تین؟ خدا نے چاہا ــــ اور خدا کا چاہنا بڑا ضروری ہے ــــ تو ہفتے عشرے تک پہنچ جائے گا۔"
"تو تار یہاں اس رفتار سے پہنچتے ہیں۔"
جی ہاں بشرطیکہ تائید ایزدی بھی شامل حال ہو اور اگر شامل نہ ہو تو ایک ہفتہ اور جمع کرلیں۔ بہرحال حکم؟"
"اگر آپ کو تار مل جاتا تو اس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا کہ اس خاکسار مسمی محمد خان کا ایئرپورٹ پر استقبال کیا جائے۔ اور پھر کسی موزوں سے ہوٹل میں قیام کا بندوبست کر دیا جائے۔"
"آپ ایئرپورٹ سے بول رہے ہیں؟"
"نہیں جناب، وہ منزل طے کر چکا ہوں۔ اس وقت پی آئی اے کے دفتر میں ہوں۔"
"آپ ہمارا قصور دس منٹ تک معاف فرمائیں اور وہیں ٹھہریں۔"

بیروت میں بیوی ضائع ہونے کا خطرہ ہے

پورے دس منٹ کے بعد ایک خوب رو لبنانی نوجوان ہمارا نام پوچھتے پوچھتے پی آئی اے کے دفتر میں داخل ہوا۔ ہمارے سامنے آکر کمر سے جھکا اور تقریباً نیم رکوع کی حالت میں پہنچ کر کہنے لگا:
"خاکسار کو ولید کہتے ہیں۔"
ہم نے دل میں سوچا کہ اگر کہتے ہیں تو کیا حرج ہے۔ ولید نام کے لیے اتنے خادمانہ تعارف کی ضرورت تو نہیں کہ اعتراف گناہ معلوم ہو۔ لیکن جلد ہی پتہ چل گیا کہ خدمت اس کا پیشہ ہے۔ اپنا تعارف جاری رکھتے ہوئے بولا:
"میں فیاض صاحب کا اسسٹنٹ ہوں۔ انہیں آڈیٹروں نے گھیر رکھا ہے اور کئی روز تک گھیرے رکھیں گے۔ بگیتیں ان کی زد سے محفوظ ہوں اور آپ کی خدمت کے لیے وقف کیا گیا ہوں۔"
پھر پورے پانچ منٹ فیاض کی طرف سے اور ایک مدت تک اپنی طرف سے نہایت ہی رقت خیز معذرت پیش کرتا رہا جو ایک لبنانی کی معرب انگریزی میں اور بھی درد انگیز محسوس ہوئی اور پیشتر اس کے کہ اس کی انگریزی اچانک ایک عربی آہ کی شکل اختیار کرلیتی ہم نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا، مضمون تبدیل کرنے کی کوشش کی اور موضوع کو ہوٹل کے انتخاب پر لے آئے۔
ولید ساتھ کار لائے تھے۔ اسی میں بیٹھ کر ہوٹل تلاش کرنا شروع کیا۔ تلاش کرنے سے پہلے ہمیں بتایا گیا کہ ہرچند کہ ہرگز بیروت میں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی کمی نہیں اور ہوٹلوں میں کمروں کا توڑا بھی نہیں، تاہم کمروں میں خالی بستروں کی شدید کمی ہے۔
ہم نے حیرت کا اظہار کیا تو ولید نے ہمیں یاد دلایا کہ بیروت عالمی سیاحوں، سراغرسانوں اور اسمگلروں کی جنت ہے اور موسم گرما میں جنت کا کوئی بستر خالی نہیں رہتا۔ بلکہ اکثر اوقات ایک ایک بستر میں دو دو سوتے ہیں۔

ہمارے منہ سے بلاارادہ نکل گیا: "یہ بندوبست البتہ مناسب ہی معلوم ہوتا ہے۔"
ولید نے ایک لمحے کے لیے ہمیں غور سے دیکھا۔ پھر ادب میں تھوڑی سی شرارت ملا کر بولا:
"سر یہ بندوبست ہر مسافر کے لیے نہیں۔ یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی بیویاں ساتھ لاتے ہیں۔"
اور یہ کہتے ہوئے ظالم نے "بیویں" کے لفظ پر اتنا زور نہ دیا جتنا "اپنی" پر۔ پھر ہماری دلجوئی کے طور پر کہنے لگا:
"اگر آپ کا ہوٹل جنت کے مرکز کے بجائے جنت کے حاشیے پر واقع ہو تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟ وہاں بستر ملنا یقینی ہے۔"
کہا: "اگر مرکزی بستروں میں گنجائش نہیں تو پھر کہیں سہی"

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

چنانچہ ولید ہمیں ایک حاشیائی ہوٹل بنام سیمارا میر میں لے گئے۔ جس پر کسی خانقاہ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے در و دالان کی بیکسی سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے محکمہ اوقاف اور محکمہ آثار قدیمہ کی مشترکہ تحویل میں ہو۔ منیجر سے، معاف فرمائیے مجاور سے بات ہوئی تو بولا:
"کئی کمرے خالی ہیں۔ جو پسند آئے لے لیں۔"
ولید جھٹ بولے: میں نہ کہتا تھا یہاں فقط بستر ہی نہیں، سالم کمرے خالی ملیں گے۔ اس جگہ وہ مرکزی ہوٹلوں والی تنگیاں اور مجبوریاں نہیں۔ یہاں تو میاں بیوی باہم لڑ بھی پڑیں تو علیحدہ علیحدہ کمروں میں سو سکتے ہیں۔"
یہ بات ہمیں بہت موافق نہ آئی۔ آخر ایسی سہولت کی کیا خوشی جس سے بیوی ضائع ہونے کا امکان ہو۔ مسافرت میں ایک جنگجو بیوی کھودینا بھی بڑا زیاں ہے کہ یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے۔ سو ایک سے زیادہ خالی کمرے سراسر مانع حقوق ازدواج ہیں۔ بہر حال ہم کہ تنہا سفر کر رہے تھے، خالی کمروں سے ایسے خائف نہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک کمرہ چن لیا۔ اندر داخل ہوئے تو ہر چند کہ بیشتر سامان ضرورت موجود تھا، تاہم ہر شئے سے عبرت اور بے ثباتی ٹپکتی تھی۔ ہمیں ذرا آزردہ دیکھ کر ولید اپنے انتخاب کی صفائی میں بولے:
"مسٹر خان، چوبیس گھنٹوں میں سے رات کے چند گھنٹے گزارنے کے لیے یہ جگہ بری نہیں۔ بہر حال آپ بیروت میں سونے کے لیے نہیں، سیر کرنے کو آئے ہیں۔ اور سیمارا میر کی رات کے باوجود آپ کی دن کی سیر کا ذائقہ بالکل وہی ہوگا جیسا سینٹ جارجز ہوٹل کے مکینوں کا۔"
اب ہمارا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جس شخص کی راتیں ویران ہوں، اس کے دن شاداب نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ ہم نے سیمارا میر کے باوجود اپنی رات میں ستارے ٹانکنے کا پروگرام بنا رکھا تھا جس سے ولید ابھی بے خبر تھے۔ لہٰذا ہم نے سامان رکھا اور ولید کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:
"وسیہ تہ تب۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔ صرف یہ بتاتے جائیے کہ کسینو لبنان کا ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے۔ ہم رات وہاں گزاریں گے۔"
ولید بولے: "ہمیں آپ کے کسینو کے شوق یا پروگرام کا علم نہ تھا۔ فیاض تو آج شام آپ کی دعوت کرنا چاہتے ہیں۔"
ہم نے کہا: "ہماری اطلاع کے مطابق بیروت میں اہم شئے دال روٹی نہیں کسینو ہے۔ فیاض کو شکریے کے ساتھ یہ پیغام پہنچائیں کہ اگر کھانا ضروری ہو تو کل شب سہی مگر خدارا آج کی رات سازدل نہ چھیڑ کہ ہم سیر گل کا ارادہ رکھتے ہیں۔"
ولید نے ہمارے بہانے کی شوخی اور عزم کے تیور دیکھے تو سر جھکا کر تسلیم بجا لایا اور ٹیلی فون اٹھا کر ہوٹل کے مجاور سے پکی عربی میں بات کرنے لگا۔ پھر ہمیں بتایا کہ آپ کی کسینو کی نشست بک ہوگئی ہے۔ کسینو کی بس آپ کو ہوٹل لے جائے گی اور واپس

بھی لے آئے گی۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور رخصتی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بولے :
"مجھے رخصت کرنے سے پہلے ایک سوال کا جواب دیں کہ اب سے آٹھ بجے شام تک یعنی پورے پانچ گھنٹے تنہا کیا کریں گے اور اگر ان پانچ گھنٹوں میں آپ کو تھوڑا سا بیروت دکھا دیا جائے تو کیا حرج ہے ؟"

جتی نہا کے چھپڑو چوں نکلی

ہمنے دل سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا، کوئی حرج نہیں، چنانچہ ولید کے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔ سیمارا میز سے نکل کر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سینٹ جارجز ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کا کلس نظر آیا اور جونہی ہماری نگاہ بارہویں منزل سے اترتی اترتی سطح زمین کے قریب پہنچی، ہمیں ہوٹل کا نیلگوں سوئمنگ پول ہزار رنگ، چھتریاں اور سرخ و سپید جسم دکھائی دیئے۔

ولید بولے۔ "آیئے آپ کو ذرا اس مرکزی ہوٹل کا ذائقہ بھی چکھاتے جائیں" اور پھر سیدھے اس خالی میز کی طرف بڑھے جو نہانے والوں، نہانے والیوں اور تماشائیوں کے جھرمٹ میں سوئمنگ پول کے کنارے رکھی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور پھر گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف جسم ہی جسم دکھائی دیئے۔

اتنے میں ایک بیرا آیا جس نے ولید کو پہچان کر سلام کیا۔ معلوم ہوا کہ ولید صاحب بھی اس حوض کے پرانے شناور ہیں۔ بیرا کوکا کولا لے آیا۔ ہم ہاتھوں سے آب اور آنکھوں سے شراب پینے لگے۔ ناگاہ ایک برق وش نے رک کر سوئمنگ پول کے نیلگوں پانی سے اپنا براق سینہ بلند کیا۔ اسے دیکھنا تھا کہ ہمیں دو تکیہ سے آواز سنائی دی۔

جتی نہا کے چھپڑو چوں نکلی، سلفے دی لاٹ ورگی

اگلے لمحے میں اس شعلہ رو کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اسی لمحے ہم نے اپنے چہرے پر ٹارچ کی سی روشنی محسوس کی۔ کیا اس کی مسکراہٹ کا رخ ہماری طرف تھا ؟ اجنبیت کے باوجود ہم جواب میں وجد میں آنے کو تھے کہ ولید نے اپنی کرسی سے اٹھ کر نہ صرف جنبش بازو سے جواب دیا بلکہ چلا کر کہا۔ "لیلیٰ"

اور ساتھ ہی ہمیں اطلاع دی کہ "لیلیٰ میری دوست ہے" ہمارا وجد یک لخت تھم گیا کہ لیلیٰ کی مسکراہٹ کے مخاطب ہم نہ تھے۔ ہمارا ہم نشین تھا۔ گویہ بھی کم نہ تھا کہ ولید کی معرفت ایک دور کی نسبت ہمیں بھی تھی۔ لیلیٰ کو غور سے دیکھا تو ظالم جس حد تک پانی سے باہر تھی، اگر بلانہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ ہم ولید کی خوبی قسمت پر رشک کی ابتداء ہی کر رہے تھے کہ لیلیٰ آبی زینے سے چڑھ کر ایک نوخیز غزالہ کی طرح رقصاں رقصاں ہمارے سامنے۔ اور قریب آ کر کھڑی ہوئی۔ لیلیٰ نے ولید کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ۔ نہائیں۔"

ولید بولے۔ "پہلے ان سے ملو۔ مسٹر خان، میرے مہمان۔"

بولی "میرے بھی ہیں۔"

اور پھر ہماری طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی آئیں مسٹر خاں۔"

کہا۔ "شکریہ۔ میرے پاس تو نہانے کے کپڑے نہیں۔"

بولی۔ "یہاں بیدنگ سوٹوں کی کمی نہیں اور مرد کا بیدنگ سوٹ ہوتا بھی کیا ہے ؟ ایک بالشت کپڑا ؟" ۔ اور مسکرا دی۔

ہم نے کہا۔ "جی ہاں، ظلم تو عورتوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ پوری دو بالشت کا سوٹ پہننا پڑتا ہے۔"
بولی۔ "پہننا نہیں کسنا پڑتا ہے۔"
اور پھر بیرے سے بولی۔ "بیرا۔ دو مردانہ کاسٹیوم لے آؤ۔"
ہم نے کہا۔ "مس لیلی، دعوت کا شکریہ۔ مگر میں یہاں نہ نہا سکوں گا۔ ہمارے یہاں غسل پردے کا معاملہ ہے۔"
بولی۔ "مگر ہم کوئی برہنہ تو نہیں نہارہے۔"
کہا۔ "محترمہ یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کی برہنگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے۔"
بولی۔ "آپ کے ہاں کہاں سے شروع ہوتی ہے؟"
عرض کیا۔ "بھئی یہی بات ہے۔ اپنے ہاں تو ٹخنے سے شروع ہوتی ہے اور اکثر اوقات سر سے پار ہوجاتی ہے۔ مگر آج آنکھوں پر بھی رکنے لگی ہے۔"
کہنے لگی۔ "تو اللہ آپ پر رحم کرے۔ آپ تشریف رکھیں۔ مجھے آپ کی پردہ داری منظور نہیں۔ مگر ولید تم؟"
ولید بولے۔ "آج ہم بھی پردہ نشین ہیں۔ خدا حافظ۔"

جہنم میں سکائی سکیر پر تعمیر کئے جائیں گے

ایک جگہ کار سے نکل کر بازار میں چند قدم چلے تو یک لخت احساس ہوا کہ ہمارا قد سکڑ کر بقدر تین فٹ رہ گیا ہے۔ ولید سے شکایت کی تو بولے۔
"اللہ آپ کی درازی قامت کا نگہبان ہو۔ آپ کا قد نہیں سکڑا، صرف دونوں طرف کی عمارات بلند ہوگئی ہیں۔ یہ دائیں ہاتھ وا دس منزلہ ہے۔ بائیں ہاتھ والی پندرہ منزلہ، سامنے بائیس منزلہ اور ذرا آگے چالیس منزلہ۔ یہ بالشتے جو آپ کو فٹ پاتھ پر رینگتے نظر آرہے ہیں، بالغ مرد و زن ہیں اور وہ رینگ نہیں رہے، ہماری طرح پاؤں کے بل چل رہے ہیں۔"
ہم نے چاروں طرف دیکھا تو اس خشت و سنگ کے ملبے میں فقط ایک چیز بے وقعت نظر آئی ... انسان ؛ یعنی ان عمارات کا خالق مگر اپنی تخلیق، اپنے فرینکنسٹائن کا صید زبوں۔
ہم نے ولید سے پوچھا۔ "یہاں کہیں یک منزلہ مکان بھی پایا جاتا ہے۔؟"
بولا۔ "آج سے بیس برس پہلے کہیں کہیں نظر آتا تھا، اب نہیں۔ یک منزلہ مکان رب العالمین کی رحمت ہے اور بیروت اس رحمت سے محروم ہے۔"
اس صورتحال کا آسان لفظوں میں مطلب یہ ہےکہ بیروت کی ایک تہائی آبادی کے قدم تو زمین پر ہیں مگر دوسری تہائی ہوا میں معلق ہے اور تیسری زینوں اور سیڑھیوں پر سے اتر چڑھ رہی ہے اور ہر تہائی کا نصف بچے، بوڑھے اور بیمار ہیں۔ ان چہل منزلہ مکانوں کے مکینوں سے کوئی دل کی پوچھتا تو یقیناً فریاد کر اٹھتے کہ خدارا نکالو ہمیں ان خوبصورت قید خانوں سے۔ ہماری خواہش فقط اتنی ہے کہ دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔ ہم نے ولید کی رائے پوچھی تو بولا۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جہنم میں رہنے کو سکائی سکریپر تعمیر ہوں گے ورنہ عذاب کا منشاء پورا نہ ہوسکے گا۔"

ہم نے یہ سنا تو پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے اور پھر دہیں سے یعنی بیروت کے بازار ہی سے کھڑے کھڑے اہل وطن کو پکارا کہ
ے خاک نشینان پاکستان، مژدہ ہو کہ آپ یا آپ میں سے اکثر ابھی اس صد منزلہ لعنت سے محفوظ ہیں جو اہل بیروت کا مقدر بن چکی
ہے اور اے کوچہ گردان وطن، مبارک ۔ نند کہ خواجہ بلند بام نافرجام ہے اور اس بے توفیق مسخرے پر رحم کھاؤ کہ فراخیٔ زمین سے
ردم اور تنگیٔ بام میں محبوس ہے ۔

وقت گزر رہا تھا ۔ ولید نے کار تیز کی اور بیروت کے بام و در فلمی تصاویر کی طرح جھلک دکھا کر غائب ہونے لگے لیکن ایک گلی
ے دوسری گلی میں مڑتا یوں لگتا تھا جیسے ایک سرنگ سے نکل کر دوسری سرنگ میں داخل ہو رہے ہوں ۔

"یا اللہ" ... دفعتاً منہ سے دعا نکلی "تیری ہموار زمین پر یہ ناہموار عمارات کبھی ختم یا ذرا پست بھی ہوں گی؟"

دعا ابھی لب پر ہی تھی کہ جواب آیا ۔

"مایوس نہ ہو ۔ کھول آنکھ زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضاء دیکھ ۔"

اور کیا دیکھتے ہیں کہ دفعتاً کار ساحل سمندر پر آنکلی ہے ۔ کار سے نکل کر تشکر کا ایک لمبا سانس لیا اور خشت و سنگ کے فلک
س ہمالوں کی طرف پشت کر کے اپنی نگاہوں کا دامن سطح آب پر پھیلا دیا ۔ اس سیال زمردکی دید سے اعصاب کو وہ سکون محسوس ہوا
یا ہر ریشہ بدن پر الزبتھ آرڈن اپنے ہاتھ سے کولڈ کریم مل رہی ہے ۔

کسینو کی دنیا ستاروں سے ذرا آگے ہے

لیکن وقت بدستور گزر رہا تھا ۔ لوٹ کر سیمارا میز میں آئے ۔ ولید رخصت ہوئے ۔ ہم نے غسل کیا، کپڑے بدلے اور لستے میں
پ سے پیغام آیا کہ کیبرے جانے والی بس انتظار کر رہی ہے ۔ بس دیکھی تو یہ بس نہ تھی پری خانہ تھا ۔ ہر چند کہ اس کی ساری
شستیں پریوں سے پر نہ تھیں، کچھ ہم سے ملتے جلتے کالے پیلے آدم زاد بھی بیٹھے تھے ۔ تاہم مجموعی تاثر یہی تھا کہ کوہ قاف کی پریوں کی
ں ہے جو راہ میں چند افرو ایشیائی مسافروں کو لفٹ دیتی ہوئی سیمارا میز کے سامنے آکر رکی ہے ۔ ہمارے حصے میں جو نشست آئی وہ
ب پری کے ساتھ مشترک تھی ۔ بیٹھنے لگے تو ہماری خاطر پری نے نہ صرف اپنا پرس اٹھایا بلکہ ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے اتنا واضح
ہم کیا کہ پوری سیٹ پھولوں سے بھر گئی ۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ التفات حسن پر ناز کریں یا حسن التفات پر قربان ہو جائیں ۔ بہرحال اپنے
پ پر رشک کرتے ہوئے ہم پھولوں کی سیج پر بیٹھ گئے ۔ حالانکہ ہم اس بات کے لئے بھی تیار تھے کہ یہی بدیع الجمال ماتھے پر بل ڈال کر
یں ڈانٹ دے ۔ ☆ (بہ سلامت روی سے)۔

محمد خاں

ریٹائرمنٹ کا ذائقہ

جانشین من، آپ نے پوچھا ہے ریٹائرمنٹ کا ذائقہ کیسا ہے؟ ذائقہ کچھ کھٹ مٹھا سا ہے۔ مٹھاس میں تو کچھ شک نہیں لیکن کھٹاس سے بھی انکار مشکل ہے۔

پہلے کھٹاس کی سنئے۔ ریٹائرمنٹ کا پہلا جھٹکا ہمیں اس وقت لگا جب پتا چلا کہ الہ دین کا چراغ کھو گیا ہے۔ آپ شاید نہ سمجھے ہوں۔ اگر آپ اپنی میز پر بیٹھتے ہیں جس پر میں بیٹھا کرتا تھا تو چراغ اسی میز کے دائیں کونے میں پائیں گے۔ اس چراغ سے کام لینے کے لیے اسے رگڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فقط اس پر انگلی رکھنے سے ہی جن نمودار ہوتا تھا بلکہ ایک نہیں تین چار جن! میرے وقت میں سب سے بڑے جن کا نام گلاب خاں تھا۔ گلاب خاں بھی کیا حاجت روا جن تھا حرف سوال لب تک آیا نہیں اور اس جن نے مراد پوری کردی۔ میں نے کبھی اسے کوہ قاف کی پریوں کی شہزادی لانے کو نہ کہا ورنہ بالیقین یہ اسے بھی درغلا لاتا۔ یہ تجربہ اب آپ کرلیں بہر حال گلاب خاں بجائے خود ایک مضمون ہے اور اس موضوع پر پھر کبھی۔ کہنا یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد، الہ دین کے چراغ کی، جسے کوتاہ اندیش افسر گھنٹی کا بٹن کہتے ہیں، دلخراش کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ گھنٹی اور اس کا بٹن تو خیر، بازار سے دو چار پیسے میں خرید کر گھر کی میز پر بھی لگایا جاسکتا ہے اور اپنی عادت کی تسلی کے لیے اس پر افسرانہ انگلی بھی رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن اس عمل کے بعد کسی جن کے نمودار ہونے کا امکان نہیں۔ شاید بیوی نمودار ہو کر ہراس انگیز لہجے میں کان میں سرگوشی کرے گی: "گھنٹی ہو رہی ہے معلوم ہوتا ہے باہر پھر چندہ لینے والے آئے ہیں۔" اور چندہ لینے والوں کے آگے جن بھی بے اثر ہوتے ہیں۔

ایک اور حسرت، اب ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد جی ٹو اور جی تھری (گریڈ دوم اور سوم افسر) دروازے پر مودبانہ دستک کے بعد شن سے اٹینشن (Attention) کر کے عرض مدعا کرنے نہیں آتے اور عرض بھی ایسی کہ جس میں لاکھ سر کے بعد ایک حرف مدعا ہوتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے دوسرے دن تو ان کا بڑا انتظار کیا لیکن آخر غیب سے ندا آئی کہ "اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا" اور کوئی نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری روح فاقے کرنے لگی کیونکہ ایک تازہ ریٹائرڈ افسر کی روحانی غذا بھی شن اور سلیوٹ ہی ہیں۔ شن اور سلیوٹ سے اچانک محرومی ایسی ہی ہے جیسے کسی معصوم کا یک لخت دودھ چھڑا دیا جائے۔ آپ ذرا کسی متاثرہ معصوم سے انٹرویو کر کے دیکھ لیں۔ بہر حال اب ہماری افسری کا دودھ چھڑایا جا چکا ہے۔ ہم تو اب یہ منظر بھی بے آہ کئے برداشت کر لیتے ہیں کہ ایک ایک پھول والے نیم لفٹین بھی پاس سے گزرتے وقت ہمیں سویلین سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے ہم فقط سویلین ہی نہیں بلکہ ۳۰۳ (ان افسروں کی تعداد جو جنرل یحییٰ کے مارشل لا کے بعد نکالے گئے) سے ایک ہوں۔ پھر چلتے چلتے ہمیں سنا سنا کر کچی انگریزی میں یونٹ گپ بھی مارتے ہیں، وہ ہی گپ جو سالہا سال ہم پکی انگریزی میں مار چکے ہیں اور اب بھی چاہیں تو ان لونڈوں کو دو چار سبق پڑھا دیں مگر ان تمام رموز افسری کو سینے میں چھپائے خاموش رہ جاتے ہیں۔

شن اور سلیوٹ کا کیا ذکر، اب تو سر، سر کی آواز بھی کم سنائی دیتی ہے۔ آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ایک اوسط درجے کا افسر دن میں کتنی مرتبہ سر کرتا ہے۔ اگر آپ کو اندازہ نہیں تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیسو (فوج کا وہ محکمہ جو اعداد و شمار رکھتا ہے) کے

یک معتبر افسر نے خفیہ ریسرچ کے بعد دریافت کیا ہے کہ ایک لفٹین دن میں چار سو بیس مرتبہ سر سر کرتا ہے ایک کپتان تین سو دس
رتبہ اور ایک میجر دو سو پانچ مرتبہ اور قس علی ہذا ۔ آپ ان اعداد کو متعلقہ افسروں کی تعداد سے ضرب دیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ فوج
سلسل سر سراہٹ کے عالم میں ہے ۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ اسی سر سراہٹ پر فوج کی زندگی اور ضبط کا دار و مدار ہے ۔ ریسرچ کی رو
ے اعلیٰ افسر بھی سر سراتے ہیں مگر کم اور جیسا کہ مناسب ہے ، سر کی آواز سے ان کی زبان سے زیادہ کان مانوس ہوتے ہیں ۔ ڈائرکٹ
ف آرمی ایجوکیشن بھی ان برگزیدہ افسروں کی نچلی کڑی میں آتا ہے اور اس کی انا کی بھی سر سری تسکین ہو جاتی ہے مگر افسوس کہ ایک
یٹائرڈ ڈی ای اے ای کو بے تسکین ہی گزارا کرنا پڑتا ہے ۔

اس دفعہ ریٹائرمنٹ کے بعد پہلی عید آئی تو ایک نئی کھٹاس کا تجربہ ہوا یعنی باہر سے آنے والے عید کارڈوں کی تعداد یک لخت
کر آدھی رہ گئی ۔ مجھے یقین ہے کہ اس عید پر جو آپ کی ڈائرکٹری کی پہلی عید ہے ، آپ کے عید کارڈوں میں اتنا ہی اضافہ ہو گیا ہوگا ۔
ادر عزیز یہ دراصل میرا ہی مال ہے ۔ اگر آپ مجھ سے عید کے بعد چارج لیتے تو یہ نامے بھی میرے نام ہی آتے ۔ بہر حال اب خدا
پ کی عمر اور ملازمت دراز کرے ، آپ چھ سات عیدیں تو مزے کریں لیکن اس دن کے لئے تیار رہیں جب ان عید کارڈوں کا بحر
یکراں ایک جوئے کم آب میں بدل جائے گا ۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ ان عید کارڈوں کو دوام نہیں جن کے بھیجنے والے آپ کی
سبت سے زیادہ اے سی آر (سالانہ خفیہ رپورٹ) کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں ۔

فوج سے فارغ ہونے کے بعد دل میں ایک پوشیدہ سی خوشی تھی کہ اب فائلوں نوٹوں اور پی یو سی Paper under
Consideration وغیرہ سے نجات ملے گی اور اب مل بھی گئی ہے لیکن ایک لفظ عرصے تک میرا پیچھا کرتا رہا ؛ یہی ہمارا پرانا
دست Immediate ۔ ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد میں جب یہ لیبل کہیں دیکھ لیتا ، بدک سا جاتا اور کافی دیر بدکا رہتا حتیٰ کہ یاد آتا
یٹائر ہو گیا ہوں ۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ سنبھل گیا ہوں ۔ آج کل ایمی ایٹ کا لفظ سامنے آجائے تو گہرا سانس لے کر اسے
ناسب حقارت سے دیکھتا ہوں اور دل کو سمجھاتا ہوں کہ اختلاج کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اب اس لفظ میں ڈنک باقی نہیں ۔ اگر
ل میں خفیف سا مرمر بھی پیدا ہو تو اسے طعنہ دیتا ہوں کہ تو کوئی جی ون یا ڈی ۔ اے ۔ ای کا دل ہے جو اتنی سی بات پر دھڑک اٹھا ۔ ان
لعنوں کا دل پر خاطر خواہ اثر ہوا ہے چنانچہ اگلے روز ہمارا سامنا Most Immediate سے ہو گیا ۔ آنکھ پھر ذرا جھپکی لیکن دل ؟ ہمارا
ل اسی مستانہ رفتار سے چلتا رہا ۔

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ پہلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

آپ سب گواہ ہیں کہ ہم فقط ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں ، زندگی سے ہی ریٹائر نہیں ہو گئے ۔ لیکن لوگ ہیں کہ تعزیت کو چلے
آرہے ہیں اور بڑے رقت خیز مکالمے کرتے ہیں ۔ آہ بھر کر ابتدائے کلام کرتے ہیں :

"خدا کی مرضی ۔"

میں صبر و رضا کی تصویر بن کر جواب دیتا ہوں :

"خدا کے علاوہ اے آئی پی کی مرضی بھی تھی ویسے صورت احوال یہ ہے کہ زندہ ہوں ۔"

"کیا ممکن نہ تھا کہ آپ کو توسیع مل جاتی ؟"

"پھر بھی ایک دن تو کوچ کرنا تھا ۔"

"ٹھیک ہے مگر ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے ؟"
"عمر؟ یہی برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن " ۔۔ کچھ نہیں سمجھتے ۔
"اور سردار خان کو تین سال کی مل گئی تھی ۔"
"جی ہاں وہ بھی آخر تمام ہو گئی ۔"
"سچ ہے ثبات فقط اللہ کی ذات کو ہے انا للہ وانا الیہ راجعون ۔"

یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس آخری آیۂ کریمہ کا روئے سخن میری طرف ہے یا سردار خان کی طرف ، جو دونوں صورتوں میں ہر چند کہ برحق ہے ذرا قبل از وقت ہے ۔ بہر حال تعزیت ختم ہوتی ہے ۔ اور وہ صاحب اس کام کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کے لئے تشریف لائے تھے یعنی نئے ڈائرکٹر کو سفارش کردہ کہ سارے قاعدے توڑ کر ان کے چشم ملٹری کالج میں داخل کرے اور کالج کا چراغ گل کردے ۔ ریٹائرمنٹ اب پرانی ہونے کو ہے مگر سوچتا ہوں کہ کب تک یہ مہربان بر سر مطلب آنے سے پہلے تعزیتی تمہیدیں باندھتے رہیں گے ۔

کھٹاس کے چند اور پہلو بھی ہیں لیکن اب اس قصے کو مختصر کرتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے میٹھے پہلو کہیں زیادہ قابل ذکر ہیں اور خدا ایک پہلو تو شہد کی طرح شیریں ہے اور وہ ہے صبح کا نہ جاگنا یعنی سوئے رہنا ؛ بلکہ جاگ کر سو جانا ! غالب کا خیال تھا کہ نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں ۔۔ تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں ۔ نئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ غالب کو مغالطہ ہوا تھا ۔ ورنہ نیند ، دماغ اور راتیں اس شخص کی ہیں جو تازہ تازہ ریٹائر ہوا ہو ۔۔ آپ نے غور کیا کہ کم و بیش پچیس برس سے آپ اور میں ایک ایسے وقت پر جاگ رہے ہیں جب پرند ، چرند اور جملہ تہجد گزار بھی سو رہے ہوتے ہیں اور یہ جاگنا خوف خدا یا شوق نماز کے لئے نہیں بلکہ پریڈ سے لیٹ ہونے کے خوف سے ۔ آپ اور میں تو شاید ایسے اسیر زلف نہیں لیکن وہ جن کے بازوؤں پر سچ مچ زلفیں پریشاں ہوتی ہیں ، انہیں بھی صبح چار بجے کے بعد یہ جاں بخش زلفیں ڈسنے لگتی ہیں ۔ ادھر گھڑی نے الارم بجایا اور ادھر یہ زلفوں کا جال توڑ کر بھاگے ۔ اور وہ نیک بخت دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہتی رہ گئی کہ :

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے

لیکن غیر ریٹائرڈ جھٹکے تو خواہ مخواہ ری پرایمانڈ (افسروں کو دی جانے والی سزا) لے لے ! لیکن دوست ، آ تجھ کو بتاؤں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد دامن جھٹکنے کی ضرورت ہے نہ زلفیں سمیٹنے کی بلکہ کوئی دامن گیر میسر ہو تو اسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ، اور پھر اس کے بعد اتنا وافر وقت ہوتا ہے کہ نہایت تسلی سے اپنے قلب و نظر اور ہوش و خرد شکار کرائے جاسکتے ہیں ۔ ذرا دیکھیں ، ہم ریٹائر ہو کر ہوش و خرد کھونے کی برملا پیشکش کر رہے ہیں ۔ اگر آپ ایسا کریں تو دوسرے دن دماغی ڈاکٹر کرنل شعیب کے پاس بھیج دئے جائیں ۔۔۔۔ اب وقت کا دیو ہم پر مسلط نہیں ۔ بلکہ ہم اس پر سوار ہیں ۔ گھڑی پہنتے ہیں لیکن اس سے مشورہ نہیں کرتے ۔ اگلے روز ایک بد تمیز نے ہم سے ایک عجیب سا سوال کیا ۔ بولا "جناب آج کل جی ایچ کیو کے بجے کھلتا ہے ؟" ہم نے کہا ۔ "او ! خدا کے بندے ۔ کوئی ہوش کی بات کر ۔ اگر ہم اب بھی جی ایچ کیو کھلنے کا وقت یاد رکھیں تو ہمارے ریٹائر ہونے کا کیا فائدہ ؟ کل تم ہم سے پوچھنے آؤ گے کہ جی ایچ کیو کا راستہ کون سا ہے ؟"

اور ہاں ، اب ہمارے دل سے ڈاکٹر کا خوف نکل گیا ہے حتیٰ کہ دماغی ڈاکٹر کے سامنے جانے سے بھی ہمیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا نا کہ دیوانہ ہے تو دیوانہ سہی ۔ کیٹیگری (طبی کیٹیگری) ہی گرے گی نا ۔ تو ٹھیک ہے ، فرش پر ہی پڑے رہے گی ۔ باقی رہے غیر دماغی ڈاکٹر تو وہ تو بالکل بے ضرر نظر آتے ہیں ۔ آپ لوگ انہیں اپنی نبض دکھاتے ہوئے بھی کانپتے رہتے

ہیں اور اے سی آر A.C.R (ہر سال ڈاکٹر طبی معائنہ کر کے کیٹیگری کا تعین کرتا ہے) کے موسم میں تو آپ کی نبض ڈاکٹر کو دیکھ کر ہی ڈوبنے لگتی ہے۔ لیکن ہم بے لحاظ موسم دھڑلے سے پوری آستین کھول کر بازو پیش کردیتے ہیں کہ لو کالی پٹی باندھ کر ہمارے دل کا حساب لے لو۔ بنیان اتار کر کھڑے ہوجاتے ہیں کہ لو، ٹونٹی لگا کر ہمارے سینے کے راز پالو۔ اور ہمیشہ جواب ملتا ہے کہ تمہارے اندر ہیروں اور موتیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے منہ سے ڈاکٹر کے حق میں دعا نکلتی ہے کہ جیتے رہو۔ آپ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کبھی کسی ڈاکٹر کو دعا دی ہے؟ یا ریٹائرمنٹ سے پہلے کسی کو دعا دینے کا ارادہ ہے؟ اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو آپ سچ بول رہے ہیں۔

ایک اور ظلم جو مجھ پر ہوتا تھا ـــــ اور اب آپ پر ہو رہا ہوگا ـــــ بندہ اس سے آزاد ہوگیا ہے۔ میری مراد دوپہر کی چائے سے ہے جو جی ون کے کمرے میں پانتی میں بیٹھ کر پی جاتی تھی اور غالباً آج کل بھی وہیں پی جاتی ہے۔ جملہ چائے نوش جمع ہوتے تھے اور زبیری صاحب دست خاص سے ایک گرما گرم پیالی تیار کرکے میر مجلس کو یعنی ہمیں پیش کرتے تھے اور ہم اسے ایک مستی کے عالم میں پی جانے کی نیت سے اٹھاتے ہی تھے کہ ڈائریکٹر کے کمرے میں سفید ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تھی۔ اس خیال سے کہ ایک لمحے کی تاخیر سے ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر مزاج یار برہم نہ ہوجائے۔ ہاتھ میں پھڑ پھڑاتی پیالی لئے، کرسیوں پر سے کودتے، کواڑوں سے ٹکراتے، ٹیلی فون پر جا گرتے تھے۔ لیکن اس اثناء میں ہمارے کرم فرما بیچ زحمت انتظار سے نڈھال ہوکر دست ناز سے رسیور رکھ چکے ہوتے تھے اور ہمارے لبیک کی صدا مائیکرو فون کے حلق سے ٹکرا کر ہمارے اپنے کمرے میں پریشان ہوتی رہتی تھی۔ بلکہ کئی دفعہ لبیک کی نوبت ہی نہ آسکی۔ ٹیلی فون تک پہنچتے پہنچتے کبھی پیالی کے اور کبھی خاکسار ڈائرکٹر کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ مگر اب ریٹائرمنٹ کے بعد یہ حادثے یکسر بند ہوگئے ہیں۔ اب چائے کے دوران گھنٹی بجے تو افراتفری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹیلیفون نے از خود ہی جواب دے دیا ہو کہ صاحب چائے پی رہے ہیں۔ ذرا ٹھہر کر رنگ کیجئے گا۔

اوپر کھٹاس کے ضمن میں عرض کیا تھا کہ الہ دین کا چراغ کھو گیا ہے اور یہ کہ ریٹائرمنٹ کے پہلے ایام میں اس چراغ کے کھو جانے سے بہت رنج ہوا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رنج بے جا تھا کہ قدرت نے اس کی بڑی مثبت تلافی کردی ہے۔ یعنی بے شک اب ہماری گھنٹی پر ہمارے سامنے کوئی جن نمودار نہیں ہوتا لیکن اب ہمیں بھی بیرونی گھنٹی پر کسی کے سامنے جن بن کر نمودار نہیں ہونا پڑتا۔ اب فون اٹھانے سے پہلے یہ وسوسے نہیں ہوتے کہ یہ گھنٹی کسی بڑے الہ دین کی ہے یا درمیانے کی۔ اور نہ خوف طاری ہوتا ہے کہ خدا جانے کون سی مہم سر کرنے کے لئے طلب کیا جارہا ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے بعض اوقات ہمیں بڑی کٹھن مہمیں سر کرنی پڑتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ دو گھنٹے کے اندر ثبوت لاؤ کہ فوج کو تعلیم کی واقعی ضرورت ہے! کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اب اس بات کی بھی تشویش نہیں کہ آج ہمارے "باس" کے جگر میں فتور ہے یا نہیں۔ یا صبح دفتر میں آنے سے پہلے ان کی بیگم کا مزاج معتدل تھا یا سلاطم کہ ان دنوں ان حادثات کا ہماری قسمت پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ اب ہمیں اپنے باس کی نسبت اپنے جگر اور اپنی بیگم کے مزاج کا زیادہ پاس ہے اور بفضل خدا دونوں خیریت سے ہیں۔

سو جانشین من ـــــ مژدہ ہو کہ مجموعی طور پر ریٹائرمنٹ میں شیرینی ہی شیرینی ہے۔ ترشی کی مقدار بس اسی قدر ہے جتنا طعام میں نمک یعنی اس ترشی سے شیرینی کا شیرہ اور گاڑھا ہوگیا ہے لیکن اس شیرینی سے لطف اندوز ہونے کی ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ ریٹائر ہونے سے کچھ روز پہلے لنڈی کوتل جائیں اور دو چار اعلیٰ ولایتی سوٹ، سویٹر، ٹائیاں اور موزے لے آئیں۔ باٹا سے کچھ تابدار جوتوں کے جوڑے خریدیں۔ ولایت میں کوئی دوست ہو تو کرسٹی کی فلٹ ہیٹ اور وان ہیومن کی قمیص منگوائیں اور ریٹائرمنٹ کے دوسرے دن گھر

ے نکلیں تو دولہا بن کر نکلیں یعنی آپ کی ہمسائی دیکھے تو اپنے میاں کے بال نوچ لے۔ مقصد ہمسائی کا گھر برباد کرنا نہیں
ہ اپنی ریٹائرمنٹ کو آباد کرنا ہے۔ ہمسائی کو تو محض لٹمس پیپر کی طرح ٹسٹ کے طور پر استعمال میں لانا ہے۔ وہ میاں بیوی تو ندو یا
یر صلح کر ہی لیں گے۔ اگر آپ دولہا بن گئے تو آپ خوش ہوں گے۔ آپ کا خدا خوش ہو گا اور خلق خدا خوش ہوگی۔ لیکن اگر آپ
ا نخواستہ پھٹیچر نکلے تو نہ ہمسائی ہنسے گی اور نہ خدا۔ اور طعنہ دیں گے بت کہ کرنل کا خدا کوئی نہیں۔ اور معلوم ہے یہ بت کسی انداز سے
منہ دیتے ہیں ؟ یہ کہتے ہیں کہ اگر بس سٹاپ پر کوئی شخص میلی ٹوپی، کچیلی ٹائی، ان دھلی قمیص اور بے استری سوٹ پہنے، دو دن کی شیو
بھائے، بس کے انتظار میں کھڑا مانگ کر اخبار پڑھ رہا ہو تو ضرور کوئی ریٹائرڈ کرنل ہو گا، دیکھا ہماری نصیحت نہ ملنے کا نتیجہ! ریٹائر شدہ
نیلی بڑی چیز ہے لیکن لباس کی محتاج ہے۔ جس نے یہ نکتہ نہ پایا وہ بس اسٹیشن پر پہنچ جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مجسٹریٹ
ماحب سبزی منڈی میں پہنچ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ مجسٹریٹ صاحب نے کرسی عدالت پر بیٹھے ایک سبزی فروش سے کہا کہ گواہ پیش کرو
۔ ملزم تمہاری دکان سے مولیاں لے بھاگا۔ بولا۔ "حضور۔ اس عدالت میں سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے کہ وقوعہ کے وقت عدالت
خود ساتھ کی دکان سے گاجریں خرید رہی تھی۔"

سبق اس کہانی سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ عدالت بے شک گاجریں خریدتی رہے مگر کرنیلی سے مت گاجریں خرید لیئے۔ ☆

(بزم آرائیاں سے)

محمد خاں کا ایک خط

مشفقِ عزیز سید طالب حسین زیدی

اسلام علیکم،

آپ سے کس قدر معافی مانگوں کہ ٹیلی فون پر فوری خط لکھنے کے وعدے کے بعد پورا مہینہ نہ لکھ سکا۔ لیکن میرے عزیز اسے جو کچھ کہہ لیں میری لاپروائی نہ کہیں۔ یہ میری حالت کی بوقلمونیوں کا ایک مظہر ہے۔ ہزار چیزیں کرنا چاہتا ہوں کر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں، صبح سے شام تک بستر پر لیٹا رہتا ہوں۔ ایسی حالت میں کچھ کر لینا تو یوں بھی ناممکن ہے۔ کچھ پڑھ بھی نہیں سکتا کہ آنکھوں کی بینائی اجازت نہیں دیتی۔ صرف ایک آنکھ سے جزوی طور پر کچھ نظر آتا ہے اتنی سی نظر کے ساتھ زندگی گزارنا سزا بھگتنے کے برابر ہے اور پھر کئی عوارض اور بھی ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ آپ کی دعاؤں کا کس قدر محتاج ہوں۔

آپ سے ناراض ہونے کے تعلق تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ جیسی پیاری شخصیت مجھے ہندوستان بھر میں آپ ہی کے روپ میں میسر ہے۔ آپ اپنی آشفتہ سری کی بات نہ کریں۔ آپ کی باتیں میرے دل کو لگتی ہیں۔ آپ کی تحریر کی کشش ہمیشہ محسوس کرتا ہوں شاید اس لئے کہ اس میں کبھی کبھی اپنا رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ میں باوجود خواہش کے آپ کے سٹائل پر صحیح حاشیہ آرائی نہیں کر سکتا۔ مجھے لکھتے ہوئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ شاید دماغی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ بعض اوقات بڑی مشکل سے مافی الضمیر ادا کر پاتا ہوں۔ آپ نے ماشاء اللہ بڑا دلکش سٹائل پیدا کیا ہے اور اپنا ایک مخصوص اسلوب تحریر پیدا کر لینا ہزاروں میں سے ایک کا کام ہے۔ لکھنے کو تو سب لوگ اردو لکھ رہے ہیں لیکن پڑھتے وقت اگر قاری از خود محسوس کرے کہ آیا یہ ٹکرا تو یوں لگتا ہے جیسے اسے طالب حسین زیدی نے لکھا ہو تو آپ بہ صد فخر کہہ سکتے ہیں کہ میں نے ذاتی سٹائل کی بنیاد ڈال دی ہے۔ لازم نہیں کہ آپ کا سٹائل کسی دوسرے لکھاڑ سے مشابہ ہو۔ اتفاقی مشابہت دوسری بات ہے ورنہ سٹائل سراسر اپنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب میں آپ کی تحریر کو آپ کا نام دیکھے بغیر پہچان لیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہی آپ کے باقی قارئین کا حال ہے۔

آپ ایک واقعہ سن کر شاید محظوظ ہوں گے۔ اگلے روز مجلہ رابطہ کراچی کے ایڈیٹر مجھے ملنے آئے۔ میرے کاغذات دیکھتے ہوئے ان کی نظر ایک خط پر پڑی جو ایک عرصہ ہوا میرے مہربان ڈاکٹر پروفیسر سید معین الرحمن ہیڈ اردو ڈپارٹمنٹ کالج لاہور نے مجھے لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ کی مطبوعہ کتاب "رشید احمد صدیقی آثار و اقدار" میں درج شدہ صدیقی صاحب کے ایک خط کا ذکر کیا اور اس کی نقل بھی بھیجی۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے یہ خط ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر اصغر عباس (مسلم یونیورسٹی) کو لکھا تھا کیوں کہ ڈاکٹر صاحب نے رشید احمد صدیقی صاحب کو میری کتابیں مطالعہ کے لئے بھیجی تھیں۔ ڈاکٹر اصغر عباس نے یہ خط آثار و اقدار کے صفحہ ۲۳۶ پر درج کر دیا۔ اس خط میں صدیقی صاحب فرماتے ہیں: "آپ کی بھیجی ہوئی محمد خاں صاحب کی دونوں کتابیں موصول ہوئیں۔ ایک، بجنگ آمد پڑھ چکا تو ہوں۔ دوسری اب پڑھوں گا مصنف کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن اردو انشاء پردازی پر غیر معمولی قدرت ہے۔ موصوف کے ذوق و ذکاوت کی قدم قدم پر داد دینا پڑتی ہے۔ اردو کے اکابر شعراء پر کتنا اچھا عبور ہے جہاں کتنوں کے قدم اکھڑ جائیں، مصنف اور زیادہ لطف و خرام سے گزرا ہے اور ناظرین کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ ایسے موضوع پر اتنی مقبول تصنیف مشکل سے چند ایک ہی ہوں گی"۔ (رشید احمد صدیقی آثار و اقدار صفحہ ۲۳۶)۔

صحت کی کچھ نہ پوچھئے۔ ڈاکٹر بھی حیران ہیں کہ کیسے زندہ ہوں۔ بہر حال زندہ ہوں، ورنہ زندگی کے اس لطف سے محروم ہوں جو خدا نے کئی سال عنایت کئے رکھا۔ بہر حال جس حالت میں بھی ہوں، اللہ کا شکر ہے۔

آپ کے پاؤں کا کیا حال ہے؟ اللہ کرے ٹھیک ہو چکا ہو۔ ☆

خدا حافظ

نیاز مند محمد خاں

(آخری قسط)

سید طالب حسین زیدی

جانا ہمارا پاکستان، معیت و مساعدت میں جگندر کی

ہمسایہ شنید نالہ ام ، گفت
خاقانی را دگر شب آمد
جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل
ابتداء پھر وہی کہانی کی

راولپنڈی، شہر کرنل محمد خان!

،دسمبر ویزے کی مدت ختم ہونے والی تھی اور راولپنڈی بھی جانا ضروری تھا۔ گاؤں سے واپسی کے بعد طے ہوا کہ یکم دسمبر ۹۸ء کو شاہد کے ہمراہ وہاں جائیں گے۔ اس روز فجر کے بعد بس کے اڈے جانے کے لئے لاہور کی مشہور مال روڈ سے گزرے۔ یہ لاہور کا بہت خوبصورت فیشن ایبل بازار ہے۔ گاؤں جانے سے پہلے ایک دن یہاں کی جی بھر کر سیر ہو چکی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے اسے بھی انہی ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے جنھوں نے نئی دہلی کے کناٹ پلیس کو بنایا تھا۔ انگریزوں کا "کالا تو کالا مگر گورا بھی کالا" والی ذہنیت انہیں صرف گالی دینا ہی جانتی ہے مگر ہماری بصیرت کبھی یہ نہیں دیکھتی کہ وہ ملک کو لوٹنے کے باوجود ہمیں کتنا کچھ دے کر بھی گئے ہیں۔ "خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا"۔ ورنہ ہم بھی ان کی طرح سترھویں صدی میں اگر مہم پسند ہوتے تو آج یہ بدمنظری لندن کے باسیوں کا نصیب ہوتی کہ بکنگھم پیالیس اور نمبر دس ڈاؤننگ اسٹریٹ کی بالکونیوں میں رسیوں پر سوکھنے کے لئے دھوتیاں اور لنگیاں لٹک رہی ہیں۔ جیسے ہماری "پوش ایریا" کالونیوں، کے شاندار بنگلوں میں نظر آتا ہے ...

اڈے پر پہونچے، ڈائیو (Daewoo) کی بس کا ٹکٹ لیا اور سوار ہوگئے یہ بس کیا تھی گویا طیارے میں سوار ہو گئے ہیں۔ شہر سے باہر نکلتے ہی بس موٹر وے نمبر ۲ پر اس طرح دوڑنے لگی جیسے پانی پر کشتی تیرتی ہے۔ موٹر وے دو ڈھائی سو فٹ چوڑی تو ضرور ہوگی اور اس قدر نفیس، صاف، شفاف جیسے ہوائی جہاز کا رن وے، میاں محمد نواز شریف کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے اسے کراچی سے حیدر آباد سندھ اور وہاں سے لاہور اور اسلام آباد ہوتے ہوئے وسط ایشیاء کی نو آزاد مملکتوں اور شاہراہ ریشم سے مربوط کرنے کا منصوبہ ہے جس کے باعث ان ملکوں کا تجارتی سامان کراچی اور گوادر (بلوچستان) کی بندرگاہوں تک باآسانی پہنچ پائے گا اور اس ملک کی معیشت اور آمدنی میں اضافہ ہونے کی امید ہے۔ راستہ نہایت نظر افروز تھا، مرغزاروں، کوہساروں، وادیوں اور گھاٹیوں کے درمیان پر کیف نظارے تھے۔ راولپنڈی پہنچنے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بس، سڑک کے ساتھ ساتھ کئی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے بہت ہی شاندار اور خوبصورت ہوٹل پلازا پر آدھ گھنٹہ رکی، جہاں مسافروں نے ناشتہ کیا۔ یہاں کا منظر کچھ ایسا تھا جیسے ہماری عثمانیہ یونیورسٹی کا کیمپس اور ہوٹل کی عمارت گویا آرٹس کالج۔ جب بھی عثمانیہ یونیورسٹی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو تان ہمیشہ آرٹس کالج کے ذکر ہی پر ٹوٹتی ہے۔ اب تک ہمیں اس بات کا ادراک حاصل نہیں ہوا کہ آرٹس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی کی وجہ سے بنا تھا یا عثمانیہ یونیورسٹی آرٹس کالج کے باعث؟ (بروزن چائے غبار خاطر کی وجہ سے مشہور ہوئی یا غبار خاطر چائے کے باعث؟)۔

جس عظیم اور دلنواز ہستی سے ملنے کے لئے ہم جارہے تھے ، بے شک ! اس کے گھر کے راستے کو بھی ایسا ہی شاندار ہونا چاہیئے۔ تین چار گھنٹوں کے سفر کے بعد بس ہمیں راولپنڈی پہنچا کر اسلام آباد کے لئے روانہ ہوگئی جو یہاں سے شاید دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ چک لالہ کے لئے ٹیکسی لی، ہماری منزل بنگلہ نمبر ۱۶۵ گلی نمبر ۳ تھی لیکن اس گلی میں یہاں سے لے کر وہاں تک دونوں جانب دیکھ ڈالا نمبر ۱۶۵ کہیں نظر نہ آیا۔ پہلی بار شاید نظر چوک گئی ہو، دوبارہ دیکھا پھر بھی مایوسی ہوئی۔ یا اللہ ! آخر کہاں گیا یہ بنگلہ ؟۔ اسی نمبر پر تو برسوں سے ہماری خط و کتابت ہورہی ہے، فون نمبر پاس تھا ایک مارکیٹ کے پاس ٹیکسی چھوڑی اور وہاں سے فون کیا۔ کسی سرفراز خان سے بات ہوئی معلوم ہوا کہ قریب ہی وہ فلیٹ ہے جس میں آج کل کرنل صاحب رہتے ہیں۔ پانچ منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ دروازے پر ایک نوجوان کو اپنا منتظر پایا، معلوم ہوا یہی سرفراز ہیں جو کرنل صاحب کے پوتے ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا تشریف لائیے ، ابا بے چینی سے آپ کا انتظار کررہے ہیں، بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے ، دیکھا، درمیان میں پلنگ پر کرنل صاحب لیٹے ہوئے تھے ،ہم کو دیکھا تو اٹھنے کی کوشش کرنے لگے ، مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

" آیئے ، آیئے بڑا خوش گوار سرپرائز دیا آپ نے "۔ مصافحہ کے بعد ہم پلنگ پر پائینتی بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنے پیر سمیٹ لئے۔ فرمایا۔ " سید صاحب، کیوں گنہ گار بناتے ہیں ؟۔ ادھر صوفے پر تشریف رکھئے "۔ ہم وہاں بیٹھ گئے اور مزاج پرسی کی، کہنے لگے ! " دیکھ لیجئے ، اچھا ہوں "۔ ہم نے پوچھا، یہ ہم سے بالا بالا ہی آپ نے رہائش تبدیل کردی، وہاں اسٹریٹ نمبر ۳ میں تلاش کرتے کرتے بے دم ہوگئے اور وقت کا جو زیاں ہوا سو الگ اتنا وقت آپ کے ساتھ ہی گزار لیتے ، کیوں کہ آج ہی ہمیں لاہور واپس لوٹنا ہے ، وضاحت فرمائی " ابھی چند ہی دن ہوئے اسے کرائے پر اٹھا کر میں یہاں آگیا ہوں۔ نیا رنگ روغن ہونے سے شاید نمبر مٹ گیا ورنہ وہاں سے میرا یہ پتہ آپ کو آسانی سے مل جاتا۔ میں آج کل ہی میں آپ کو خط لکھنے والا تھا۔ مگر آپ کو چاہئے تھا کہ کراچی یا لاہور سے اپنی آمد کے بارے میں اطلاع دے دیتے تو اس زحمت سے دوچار نہ ہوئے ہوتے "۔

عرض کیا ! " لیکن ہم جو چاہتے تھے وہ نہ ہوا۔ اچانک ملاقات سے جو مزا آپ کی حیرانگی کو دیکھ کر آتا اس سے محروم ہوگئے "۔ (مسکراتے ہوئے) " زیدی صاحب ! باور کیجئے آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی یہ یقین نہیں آرہا ہے کہ واقعی آپ ہزاروں میل دور سے میری خاطر یہاں آئے ہیں اور اس وقت میرے پاس بیٹھے ہیں۔ اگر صحت بحال ہوتی اور قویٰ ساتھ دیتے تو میں بھی آپ سے ملنے حیدرآباد آتا اور آپ کے ہمراہ اس شہر نگاراں کی سیر کرکے اپنی دیرینہ تمنا پوری کرتا۔ میں آپ کے خطوط ہی سے منت پذیر تھا اب خود آکر آپ نے مجھے بے انتہا ممنون کیا اور اپنا گرویدہ بنالیا "۔

عرض کیا ! ممنون وممنون کچھ نہیں کیا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں " سیدوں " کا ایک کلیہ ہے ، اسے سن لیجئے تاکہ جب بھی کسی " سید " سے پالا پڑے تو چوکنے رہیں۔

" سید کی دشمنی تو بری ہوتی ہی ہے مگر اس کی دوستی بھی کچھ کم بری نہیں ہوتی، جس کے پیچھے ایک بار پڑجاتا ہے ، جان کو آجاتا ہے ، اس کلیہ کے ثبوت میں پہلے تو تاریخ ہند دور وسطی کے اس باب کا مطالعہ کیجئے جس میں سید برادران (سادات بارہہ) کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اور دوسرا ؟ دیکھ لیجئے ، یہ بندہ آپ کے سامنے موجود ہے "....

دیر تک ہنسنے کے بعد فرمایا ! نہیں نہیں، یہ آپ کی محبت اور خلوص کا ثبوت ہے۔ لگے ہاتھوں ایک کلیہ پٹھانوں کا آپ بھی سن لیں ! " کسی سید کو اگر کبھی پٹھان کا مہمان بننے کا اتفاق ہو تو یہ یاد رہے کہ کبھی بھولے سے بھی جانے کا نام نہ لے ، مار کے زمین

میں کاڈکر "درگاہ" بنالیتا ہے۔ کیوں؟ گھر آئی برکت اس آسانی سے ہاتھوں سے نہ نکل پائے اور ہمیشہ کے لئے گھر ہی میں رہے۔
میں نے گھگیا کر پوچھا، کرنل صاحب! "اب میں جاؤں؟"
اکرم "کھک" سے ہنس دیئے۔ نہیں بھئی، سنتے ہیں ایسے پٹھان سرحد کی طرف ہوتے ہیں..... لیکن زیدی صاحب! یہ کیا کہ اتنی دور سے آپ آئے بھی تو چند گھنٹوں ہی کے لئے دو چار دن تو میرے ساتھ گزارے ہوتے۔ نہ میری تشفی ہوئی اور نہ آپ کی ہوگی۔ لیکن معاملہ ویزے وغیرہ کا ہے میں مجبور بھی نہیں کرسکتا۔ آپ آگئے یہی بہت ہوا۔ "اچھا یہ کہئے آپ کی کتاب کب تک آرہی ہے؟ ادھر آپ کے کافی مضامین آچکے ہیں۔ نظر ثانی کر کے انہی کا مجموعہ چھپوالیجئے"۔ کرنل صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ اپنی پیٹھ خود کو نظر نہیں آتی۔ اس معاملہ میں کافی مذبذب ہوں، کراچی میں یہی سوال یوسفی صاحب نے بھی کیا تھا بلکہ یہ کہ وہ اس کے انتظار میں ہیں میں اپنے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں، اردو کے بڑے بڑے مسلمہ لکھنے والوں کی جو درگت بن رہی ہے اسے دیکھ کر ڈرتا ہوں کہ خدا جانے مجھ سے تیسرے درجے کے لکھنے والے کا کیا حشر ہوگا، کوئی گھاس ڈالے گا بھی کہ نہیں؟ ویسے میں نے اپنا یہ دردسر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کو منتقل کردیا ہے اور سید صاحب، استخارہ دیکھ کر کام شروع کرنے کے موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔
"ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ کوئی گھاس ڈالے گا یا نہیں بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے، عرق ریزیاں کر کے جو تخلیقی کام ہم نے کیا ہے وہ محفوظ ہوجائے، ہماری محنت اکارت نہ جائے۔ آپ ارادہ کرلیجئے، آپ کے قلم کے تیکھے انداز کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں انشاء اللہ مایوسی نہ ہوگی"۔

میں نے کہا، حیدرآباد واپسی کے بعد ڈاکٹر صاحب سے پوچھوں گا کہ استخارے کا موڈ کیا کہہ رہا ہے؟..... سرفراز کچھ دیر تو وہاں نظر آئے پھر جو گئے تو دوبارہ دکھائی نہیں دیئے۔ اسی اثناء، خانساماں پرتکلف ناشتے اور چاء کی ٹرالی لے آیا۔ بھوک خوب چمکی ہوئی تھی میں نے اور شاہد نے ڈٹ کر کھایا۔ میں نے تو چائے کے دو دو پیالے بھی حلق سے اتارے بلکہ، نا، نا کرنے کے باوجود پلنگ پر تکیوں کے سہارے بٹھا کر اپنے ہاتھوں سے بنا کر ایک پیالہ کرنل صاحب کو یہ کہتے ہوئے دیا کہ "چائے بھی باجماعت اگر پی جائے تو مزا سوا ملتا ہے"۔ اثنائے چائے نوشی بار بار یہی فرماتے رہے۔ "آپ نے بڑی زحمت کی کہ مجھ سے ملنے یہاں تک چلے آئے۔ آپ کے خطوط اور مضامین پڑھ کر جو تصویر ذہن کے پردے پر بنی تھی ہو بہو آپ کو ویسا ہی پایا۔ پھر موضوع بدل کر ایک سوال کیا، "آپ کس طرح لکھ لیتے ہیں؟

عرض کیا! میں کہاں لکھتا ہوں۔ وہ مجھے آتا ہی کب ہے؟ بس آپ جیسے اہل قلم کی خوشہ چینیاں ہیں۔ یہاں سے تھوڑا وہاں سے تھوڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا والا معاملہ ہے۔ اور "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"۔ "جو کچھ ہے وہ "نوائے سروش ہے"......
کچھ دیر توقف فرما کر گویا ہوئے "آپ کی ووکیبلری (Vocabulary) بڑی طرحدار ہے"۔ اس سے میں بہت متاثر ہوتا ہوں، آپ کی تحریر پڑھ کر مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ بغیر نام دیکھے کے کہہ سکتا ہوں یہ طالب حسین ہیں۔ "میرے بعض احباب کو جنہوں نے آپ کے خطوط اور مضامین پڑھے ہیں، اب انہیں مجھ سے زیادہ "شگوفہ" کا انتظار رہنے لگا ہے۔ آپ ہی کی طرح میں بھی اسے پسند نہیں کرتا کہ اردو کی حلاوت اور شیرینی کو ختم کر کے اسے "پھیکا"، بے رنگ اور سستا بنادیا جائے"۔ اس بارے میں مجھے ابوالکلام کا انداز بہت پسند ہے۔ عرض کیا، "چہ خوب، ملاحظہ ہو، گویا آپ بھی، موصوف کے اپنے لئے "ہم" اور دوسرے کو "تم" کے انداز ہائے رندانہ کی دلاویزیوں کے قائل و قتیل ہیں۔ ہم اس خیال میں تھے کہ ایک ہم ہی "اسیر پنجہ آزاد ہیں" مسکراتے ہوئے فرمایا، بہت خوب، یہ بھی اسی رنگ میں؟..... مجھے معلوم ہے آپ کو اردو سے محبت ہے۔ "مجھے بھی ہے لیکن افسوس مطلب اس محبت کا اظہار اس شوق

اور توانا تو سے نہیں کر سکتا جیسا کبھی کرتا تھا "۔

اس موقع پر جگندر کہنے لگا : اس "معاملہ خاص" میں اپنی چرب زبانی سے تم نے بے چارے کرنل صاحب کو تو پٹا لیا۔ لیکن یہ بتاؤ موہ دلی والے مسلم پرسنل لا بورڈ کے سید امین الحسن صاحب رضوی اور صاحب "شگوفہ" پروفیسر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کو کیوں کر رام کر و گے ؟۔

ہم نے معاملہ بندی کا ایک پائمال سکہ بند شعر سنا کر اس کی تسلی کر دی

آتے آتے آئے گا ان کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

دادے پیر!

ایک مرتبہ یوسفی صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ پطرس بخاری کو پڑھ کر انہیں لکھنے کا شوق ہوا تھا۔ میں نے کرنل صاحب سے پوچھا، آپ کو مزاح نگاری کا اشتعال کسے پڑھ کر آیا تھا ؟ ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"شوکت تھانوی" سے .... جگندر کان سے منہ لگا کر بولا : اس حساب سے "گویا تمہارے دادے پیر ہوئے" باتیں کرتے ہوئے پلنگ کے پہلو میں رکھے ہوئے میز سے ایک کتاب اٹھائی اور فرمایا : "یہ بجنگ آمد کا کمپیوٹر پرنٹ نیا ایڈیشن ہے دو چار دن ہوئے پبلشر کے یہاں سے چند جلدیں آئی ہیں۔ ایک آپ کو دے رہا ہوں "۔

پھر کچھ لکھنے کے لئے قلم کی طرف ہاتھ بڑھایا، میں نے اٹھا کر دے دیا۔ بڑی مشکل سے تکیہ کے سہارے نیم دراز ہو کر گھٹنے پر رکھ کر لکھنے لگے۔ محسوس ہو رہا تھا اس عمل سے انہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ صرف ایک سطر:

"بخدمت مشفقم سید طالب حسین زیدی"

محمد خان۔ یکم دسمبر ۹۸ء

اتنا لکھنے کے لئے تقریباً دو منٹ لگے۔ احساس ہوا خط کے لئے تقاضہ کرنا کرنل صاحب پر ظلم ڈھانا ہوا۔ بات چیت کا تسلسل جاری رکھنے کے لئے میں نے پوچھا، "بجنگ آمد کا ہر سال نیا ایڈیشن چھپتا ہے اس کے لئے پبلشر سے آپ کو رائلٹی تو ملتی ہوگی ؟"

فرمایا : "لاہور کا ایک پبلیشر غالب چودہ پندرہ سال سے دو لاکھ روپے سالانہ دے رہا تھا لیکن اب دو برسوں سے ایک حبہ بھی اس نے ادا نہیں کیا۔ ہاں، چار چھ جلدیں نئے ایڈیشن کی ضرور بھجوا دیتا ہے۔ کیوں ؟ "For Post Facto Sanction" بعض دوستوں نے مشورہ دیا دعوی کر دو۔ مگر میں نے کہا، یہ میرا کام نہیں ہے۔ ہاں، اگر کہیں ملاقات ہو گئی تو "گلہ ضرور کروں گا"۔

ہونہہ ! "گلہ ضرور کروں گا"۔ بات کوئی سو دو سو روپلی کی نہیں جس کی خاطر اکثر سر پھٹول بھی ہو جاتا ہے۔ ایک شقی نے ہر سال دو لاکھ کی خطیر رقم سے محروم کر رکھا ہے اور آپ اس سے صرف "گلہ" کریں گے۔ اچھے فوجی ہیں اور اچھے پٹھان .... مقدمہ دائر کرنے کے بارے میں، ہم احباب کی رائے کی تائید میں منہ کھولنے ہی والے تھے کہ جگندر نے جھپٹ کر ہمیں روکا، اوے چپ کر پتر! ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

پھر "بسلامت روی" کے بارے میں پوچھا : "بارہ چودہ سال ہوئے میں نے سولہ لاکھ میں اس کے حقوق پبلیشر کو دے دئے "۔ (ایک کتاب کی رائلٹی ہر سال دو لاکھ اور دوسری کے حقوق کا معاوضہ سولہ لاکھ۔ ہم اردو کے لکھنے والے اپنے یہاں تو ایسے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے)۔

کراچی سے روانگی کے وقت محترم مشتاق احمد یوسفی صاحب نے کرنل صاحب کے لئے ایک پیام دیا تھا کہ وہ " ایک دن کے لئے راولپنڈی آنے تھے مگر معصروفیت کچھ ایسی رہی کہ ملاقات کے لئے نہ آسکے ۔ جس کے لئے وہ معذرت خواہ ہیں " ۔ جواب میں کرنل صاحب بڑی محبت سے یوسفی صاحب کے اوصاف حمیدہ، اخلاق، خلوص اور دوستی کی دیر تک تعریف کرتے رہے ۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی، کرنل صاحب اپنی عمر جو بتلاتے ہیں چہرے سے لگتے نہیں بلکہ دس پندرہ سال کم ہی دکھائی دیتے ہیں ۔ بینائی کی کمزوری اور گر پڑنے سے ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ نہ آئی ہوتی تو اچھے خاصے ادھیڑ عمر ہی کے نظر آتے ۔ حتیٰ کہ چہرے پر ایک جھری اور بریکٹ تک نہیں بنا تھا ۔ لگتا ہے ان عوارض کی وجہ سے چلنے پھرنے اور نوشت و خواند سے معذور ہوگئے ہیں ۔

چائے کے دوسرے دور کے بعد ہم کو " ہوک " اٹھی جیسے جیب سے نکال کر (تاکہ منع کرنے کا موقع باقی نہ رہے ۔) سگریٹ پینے کی اجازت چاہی، حسب توقع بڑی وسعت قلبی سے فوراً مل گئی (اس میں للچاہٹ اور محرومی کا وہ عنصر نہیں تھا جو ایک مرتبہ اجازت دیتے ہوئے یوسفی صاحب کے چہرے پر نظر آیا تھا ۔) ہم نے سگریٹ سلگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے اک ذرا تفریحاً پوچھا ! آپ سگریٹ نہیں پیتے ؟ فرمایا ! " جی نہیں " ۔ پھر کیا پیتے ہیں ؟ کنائے کو سمجھتے ہوئے ہنس کر جواب دیا ۔ کچھ بھی نہیں سوائے چائے اور " نبو " پانی کے ۔ میں نے کوئی " علت " پالی ہی نہیں ۔

مگر مولانا آزاد، جن کی علمیت کو آپ سمندر سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان کے مداح بھی ہیں، شاید، ان کا مشورہ آپ کی نظر سے نہیں گزرا ۔ وہ فرماتے ہیں ! " زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لئے کسی نہ کسی علت کا پالنا بھی ضروری ہوا " ۔

اور کرنل صاحب ! اس میکدہ ہزار شیوہ و رنگ میں ہزاروں علتیں یہاں وہاں بکھری پڑی ہیں ۔ اب ہاتھ آپ کا ہے مرضی آپ کی ہے اور بڑھ کر مینا کو اٹھا لینا آپ کی ہمت اور حوصلے پر منحصر ہوا ۔ اور ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض " علتیں " اپنے پندار کے صنم کدے کو ویراں کر کر کے خود آ آکر آپ سے پوچھا کرتی تھیں " بتا تیری رضا کیا ہے ؟ " اور آپ ۔ ؟ اپنی شرمیلی طبیعت کے ہاتھوں ہر بار شرما کر رہ گئے ....

گستاخی معاف ! آپ نے نہ کچھ پیا اور نہ کبھی ایک چیونٹی تک کو مارا مگر فوج میں زندگی گزار دی ۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں، آخر کس حکیم نے یہ نسخہ لکھ کر دیا تھا کہ فوج میں بھرتی ہوجاؤ ۔ اس سے تو اچھا تھا ۱۹۴۰ء میں کمیشن حاصل کر کے اس آتش زیرپا چھلاوے یعنی ہٹلر سے پنگا لینے کی بجائے مکتب ہی پڑھا لیتے ۔ " دو اکم دو ۔ دو دونی چار " اور جب کوئی بچہ شرارت کرتا تو اسے بنچ پر کھڑا کردیتے اور دوسرے کو مرغا بنادیتے یا پھر اپنے گاؤں بلکسر کی زمینوں پر ہل چلا کر دو چار بیگہ زمین ہی جوت لیتے اس طرح " محمد خانوں " کی روائیت تو قائم رہتی ۔ میری ساری ہفوات کو بڑے صبر و سکون سے مسکراتے ہوئے سنتے رہے ۔ پھر قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے فرمایا !

" میں بھی اب ایسا ہی سوچتا ہوں لیکن " عمر رفتہ کو آواز دوں بھی تو وہ آنے سے رہی " ۔ اپنے خطوں میں بھی آپ کی ایسی ہی باتیں مجھے خوب مزا دیتی ہیں ۔ میرا نام لئے بغیر آپ نے اپنے مضمون " سگارٹ فوبیا " میں یہ بھی لکھا تھا نا ؟ " عشاء کے وضو سے فجر کی نمازیں پڑھنے والے عابد شب زندہ دار " ۔ میں اور احباب اسے بار بار پڑھ کر لطف لیتے رہے بلکہ ایک صاحب تو مجھے " عابد شب زندہ دار " ہی سے مخاطب کرنے لگے تھے ۔ بڑی معنی خیز اور دلچسپ ہوتی ہیں آپ کی باتیں ....اچھا ! یہ کہئے کبھی آپ نے میری تحریروں اور کتابوں پر کوئی تبصرہ اپنے انداز کا کیا ہے ؟ عرض کیا جی نہیں اس کی جرات میں نہیں کرسکتا ۔ فرمایا ! اگر کہا جائے تو ؟ ۔

میں نے ایک کاغذ لیا اور اس پر یہ دو تین سطریں لکھ کر پرچہ ہاتھ میں دے دیا ۔

"سوتے میں کسی شیر خوار بچے کا مسکرانا۔ کسی کلی کا چٹک کر پھول بن جانا اور کسی نوخیز سمن بر کا مسکراتے ہوئے انگڑائی لینا"

ان بے پناہ من موہنی کیفیتوں کی عکاسی کے لئے اگر لفظ مل سکتے ہیں تو وہی لفظ آپ کی سحر طرازیوں اور نغز گفتاریوں کی تعریف میں کام آئیں گے۔

میگنیفائیر کی مدد سے اسے پڑھا، دیر تک میری طرف دیکھا کئے، بجنگ آمد کا ایک نسخہ اٹھایا اور اس کے صفحوں کے درمیان پر رکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا، تمہارا ☆ انداز خوب ہے"

کچھ دیر بعد چائے کا ایک دور اور چلا کرنل صاحب کی طبیعت میں بشاشت جھلک آئی تھی اور چٹکلے، لطیفے سنا سنا کر خود مزے رہے تھے اور مجھے بھی گدگدا رہے تھے اسی ذیل میں "حیدرآبادی" ہونے کے ناطے وہی سوال جڑ دیا جس سے دہلی اور پاکستان اکثر سابقہ پیش آتا ہے۔ "تم لوگ قاف کو خاف اور قینچی کو خینچی کیوں بولتے ہو؟" میں نے بھی تڑسے جواب دیا، ویسے ہی جیسے آپ لوگ چاقو کو "قاچو" ● اور حقہ کو ہکہ بولتے ہیں.... "ایسا میں تو نہیں بولتا"۔ عرض کیا اور ویسا میں بھی نہیں بولتا۔ ہنسنے لگے خوب ہنستے ہوئے فرمایا! "زیدی صاحب! آپ نے آج ہنسا ہنسا کر مجھے بے حال کر دیا۔ بڑے دنوں بعد آج اتنا ہنسا ہوں"۔ اللہ آپ سدا ہنستا ہی رکھے....

وقت تیزی سے گزر رہا تھا ان تین چار گھنٹوں میں ایک بات میں نے محسوس کی کہ فلیٹ میں کرنل صاحب کے علاوہ سوا خانساماں سراج کے کوئی اور نہیں ہے اس بارے میں کچھ پوچھنا چاہا مگر جگندر نے منع کر دیا!

دل سے دیوانے کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

بے ساختہ غالب یاد آگئے اور دل محسوس کر رہ گیا۔

کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا!

سامنے میز پر ٹی وی، تین چار آرمی افسروں اور خود کرنل صاحب کا لفٹیننی کے زمانے کا فوٹو، رکھے ہوئے تھے۔ پوچھا، آپ وقت کیسے گزرتا ہے؟ جب کہ لکھنا پڑھنا بھی موقوف ہے۔ تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا! "یہ احباب اکثر آجاتے ہیں ان کے ساتھ ہنسی مذاق میں وقت اچھا گزر جاتا ہے"۔

آپ کہیں باہر جاتے آتے بھی ہیں؟ کسی تقریب میں، شادی بیاہ کی دعوتوں اور ادبی قسم کی محفلوں میں؟

مسکراتے ہوئے جواب دیا! "بے شک جاتا آتا ہوں۔ ڈاکٹر کے مطب تک....

رات ہی ہمیں لاہور لوٹ جانا تھا، شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ کرنل صاحب پلنگ پر دراز تھے اور نقاہت و ناتوانی کے باوجود نہایت دلچسپی سے باتیں کر رہے تھے۔ واپسی کی اجازت طلب کی۔ باتیں کرتے کرتے اکدم خاموش ہوگئے چہرے پر غم کے آثار ظاہر ہوئے۔ سراج کے لئے گھنٹی بجائی وہ آیا تو اس سے کہا، سراج، "زیدی صاحب کے لئے ریوڑیاں لے آؤ"۔ وہ طشتری میں چار دانے لگا کر لے آیا، سر اٹھا کر دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے مقدار بتلاتے ہوئے "بھئی اتنی نہیں، بہت ساری، ساتھ

☆ یہ پہلا موقع تھا کہ تکلف کی دیوار ڈھا کر کرنل صاحب نے "تم" سے تخاطب کیا، اس اپنائیت کے اظہار سے مارے فرط انبساط کے اسد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ● پنجاب کے عوام عموماً چاقو کو قاچو بولتے ہیں۔

جانے کے لئے ' اپنے پنڈ چکوال ' کا تحفہ ہے " ۔ کچھ دیر بعد وہ پولی تھن کا ایک تھیلا بھر ریوڑیاں لے آیا اور شاہد کے حوالے کر دیا ۔ دل پر جبر کر کے رخصت کی اجازت لیتے ہوئے میں نے کہا " کرنل صاحب ' یاد رکھئے ' یہ طالب حسین بھلا دینے والی چیز نہیں ہے " ۔ چہرہ نہایت افسردہ اور غمگین نظر آیا ۔ مسکرا رہے تھے لیکن دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آنکھوں سے نمی صاف کر رہی تھیں ۔ ہاتھ اٹھا کر اللہ حافظ کہا ....

ہم فلیٹ سے باہر آئے ۔ ساری فضاء پر گہری اداسی سی چھائی ہوئی تھی ۔ عسکری II چک لالہ کی بلند و بالا کوٹھیاں اور فلیٹ شام کے ملگجی سائے میں دھندلا سے گئے تھے ۔ سراج بھی آگیا اور ساتھ چلنے لگا ۔ میں نے کہا واپس جاؤ ' کرنل صاحب تنہا ہیں ۔ شاید تمہاری ضرورت پڑ جائے ۔ بولا : صاحب جی نے کہا ہے بس کے اڈے تک آپ کے ساتھ جاؤں ۔ میں نے منع کیا اور کہا میری طرف سے شکریہ ادا کرنا اور سلام کہنا ' وہ بادل نخواستہ واپس ہو گیا ۔

دل پر منوں بوجھ لئے بس کے اڈے پر پہنچے ۔ جی نہیں چاہا کہ کرنل صاحب کے چہیتے شہر " پنڈی " کو بھی تھوڑا سا دیکھ لیں جو برقی روشنیوں میں جگمگا رہا تھا ۔ رات آٹھ بجے بس روانہ ہو کر اسی موٹر وے نمبر دو پر دوڑنے لگی کچھ فاصلہ طے ہونے کے بعد شاہد نے ریوڑیوں کا تھیلا کھولا اور ایک مٹھی ریوڑیاں دیتے ہوئے بولا : چچا میاں ! ان سے راستے میں شغل کیجئے وقت اچھا گزرے گا ۔ ہم نے کہا بھئی ' انہیں اپنے بچوں کے لئے گھر لے چلو ۔ بولا : بہت ہیں ایک مٹھی ہی تو دے رہا ہوں ۔ اس کے اصرار سے لے ایک دانہ منہ میں رکھا ۔ باور کیجئے مصری اور شہد سے گندھا ہوا یہ دانہ فوراً گھل گیا اور زبان چٹخارے لے کر " ہل من مزید ' حلوائے خوب ست آقا دیگر بیار " ۔ کی تکرار کرنے لگی ۔ ریوڑیاں ' یوں تو گلاب میں بسی ہوئی ' بچپن میں دہلی اور حیدر آباد میں بہت کھائی ہیں مگر یہ " چیزے دیگر ست " تھیں ۔ کچھ دیر میں مٹھی خالی ہو گئی ۔ ہم نے مانگ کر ایک مٹھی اور لی وہ بھی ختم مگر ' نیت نہیں بھری پھر تو ہم مانگتے گئے وہ دیتا گیا ' لاہور پہنچنے تک دونوں نے مل کر تھیلے کو آدھا کر دیا ....

ہم اب تک اس گمان میں مبتلا تھے کہ " چنا ' مونگ پھلی اور غالب " ۔ یہ تین چیزیں ہی ایسی ہیں جو ایک مرتبہ منہ لگتی ہیں تو چھٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں لیکن ' اب اس فہرست میں چوتھا نام یعنی چکوال کی ریوڑیوں کو بھی شامل کرنا پڑا ۔

۶ دسمبر ۹۸ کی صبح لاہور اسٹیشن پہنچے خاندان کے سارے افراد اور تین چار احباب رخصت کرنے آگئے تھے ۔ سبھوں نے بادیدہ نم اور رندھے ہوئے گلے سے اللہ حافظ کہا ۔ ٹرین واگھا کی سمت روانہ ہوئی جو پاکستان کی سرحد پر واقع ہے ۔ ہزاروں مسافر اور ان کا سامان ٹھسا ٹھس اوپر تلے بھرا ہوا تھا ' " تل رکھنے کو بھی جگہ نہیں " ۔ کا محاورہ عملی شکل میں آنکھوں کے سامنے تھا ۔ اس کا فسٹ کلاس بوگی بھی انتہائی فرسودہ ' جس میں ہمہ قسم کے مسافر سوار ہو گئے تھے ۔ واگھا میں کسٹم ہوا ' کسٹم کیا ؟ جیب ہلکی ہوئی اور یہاں سے " اٹاری " (ہندوستانی سرحد) کے لئے روانہ ہوئے درمیان کے تین میل کے فاصلے میں جو " No Man Land " کہلاتا ہے ' ٹرین جوں کی طرح رینگنے لگی اور اس کے دونوں جانب ہندوستانی گھڑ سوار دستے کے دو فوجی گھوڑے پر سوار گارڈ کے ڈبے سے انجن تک پھر وہاں سے گارڈ کے ڈبے تک بازگشت کرتے ہوئے ٹرین کو اپنے جلو میں لے چلے ۔ یہ منظر بڑا دل فریب ہوتا ہے ۔ پاکستان جاتے ہوئے بھی ایسا ہی انتظام تھا ۔ ہماری جانب ایک سردار گھوڑے پر تھا جو مسافروں کو دیکھ دیکھ کر اس طرح ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے اس کے سگے سنبندھی ہوں ۔ جب وہ ہماری کھڑکی کے نیچے آیا تو جگندر نے بیٹھے بیٹھے پنکالیا اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر ہلاتے ہوئے بولا " پاتشاؤ ! ست سری اکال جی کی گل ہے ؟ ۔ سردار گھوڑے کی پیٹھ پر زور سے اچھل گیا اور جواب میں " جو بولے سو نہال ' شری واہگرو کی فتح " ۔ جگندر ! شری واہگرو کا خالصہ ...

وہ مارے خوشی کے گھوڑے پر بل بل گیا اور اٹاری تک ہمارے ڈبے سے ہی لگا رہا۔ خیر خیریت پوچھی۔ گھر، بچوں اور اپنے کھیت و فصل کی باتیں خوشی خوشی سناتا رہا۔ بولا! بڑے نے کھیت کھلیان ذمہ داری سے سنبھال لیا ہے مگر چھوٹا بڑا "حرامی" نکلا، پڑھائی کے نام سے بھاگتا ہے۔ اسے دادا کے لاڈ پیار نے بگاڑ رکھا ہے ...

دوسری جانب والے کو دیکھا، چہرہ نہایت "کلف دار" اور قبض کی کیفیت میں گرفتار نظر آیا۔ اس کی ہر ادا میکانیکل تھی، منہ کھولنا تو کجا گردن تک نہیں گھوم رہی تھی۔ ہم نے اس پروا سوخت بھی اور سردار جی سے سر گشتیاں کرتے رہے۔ اس کا سلوک اور رویہ بھی تو بالکل انہوں جیسا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہم میں ایک زمانے کی آشنائی ہو۔ آشنائی کجا۔؟ یک جائی، یک دلی بھی تھی مگر چرخ نیلی فام کو ایک آنکھ نہ بھائی، دلوں میں گرہ پڑ گئی۔

اللہ کرے بس میں چنگاری لگانے والے ارباب حل و عقد کے پتھر دل موم ہوں اور بھید بھاؤ کی یہ نامبارک دیواریں مسمار ہو جائیں، راہ میں بچھائے ہوئے خار دار تار کٹ جائیں اور بچھڑے ہوئے بھائی سے اس کا بھائی، راج دلاری بہن سے اس کا للن، باپ سے اس کا بیٹا اور کوکھ جلی ماں کو اس کا لال پھر سے مل جائے ....

جب اٹاری پہنچے تو "کسٹم والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا"۔ میز پر تھیلا اور سوٹ کیس رکھ کر ایک سردار نے پوچھا، کیا لائے ہو؟۔ کچھ نہیں وہی جو ساتھ لے گئے تھے، ہاں! سینے کے اندر جھانک کر اگر دیکھ سکتے ہو تو دیکھو۔ بہت سی یادیں اور بہت سارا پیار ضرور نظر آئے گا .... لاہور سے داتول (دانت صاف کرنے کی چھال) تو ضرور لائے ہوں گے اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دو اور یہ تھیلا پھولا ہوا کیوں ہے؟ میلے کپڑوں اور کتابوں سے، خط ایک بھی نہیں، اب کوئی نہیں لکھتا، کسی زمانے میں بہت آیا کرتے تھے۔ کوئی تصویر بھی نہیں ہے۔ اور کیا پوچھنا ہے؟ بولا! جناب عالی! بڑے زندہ دل معلوم ہوتے ہو، بدام اور چلغوزہ تو ضرور ہوگا، وہی دے دیں۔ ہم نے کہا، یار! کیوں مانگنے والوں کی طرح وقت برباد کر رہے ہو؟ کچھ تو اپنی افسری کی لاج رکھو، ہماری یہ باتیں قریب کھڑی ہوئی ایک "کسٹم افسرنی" بڑے غور سے سن رہی تھی۔ جب ہم نے کہا "مانگنے والوں کی طرح"۔ تو اسے سن کر اس کا پارہ چڑھ گیا اور ہماری طرف گھور کر دیکھنے لگی۔

بھلا جگندر کو ایسے غربیلوں کی برداشت کہاں؟۔ بولا! اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟

پندرہ بیس برس پہلے دیکھتیں کہ پسینہ بھی گلاب تھا ..... اس نے لجا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

یہاں سے فارغ ہوئے دوسرے دن چشم چشم دلی پہنچے اور وہاں دو دن رہ کر پھر اسی دیار دل دار میں آ گئے جس کو بتھر گنٹی نال صاحب ہلی کو بولتیں کتے۔ باؤ ..... ☆

یار زندہ صحبت باقی!

پھر ملیں گے ....

اداریہ

یہ شمارہ ممتاز مزاح نگار کرنل محمد خاں کے فکر و فن کے جائزہ اور ان کی تخلیقات کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ کرنل محمد خاں نے اپنی پہلی کتاب "بہ جنگ آمد" کی اشاعت سے ہی دنیائے ادب کو چونکا دیا تھا۔ برصغیر میں "بہ جنگ آمد" کے بے شمار ایڈیشن شائع ہوئے۔ محمد خاں نے جو اسلوب اختیار کیا تھا، وہ سفر ناموں کے لئے منفرد اسلوب تھا۔ کلاسیکی ادب کے رچاؤ کے ساتھ محمد خاں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ظرافت اور شرارت کے امتزاج کے ساتھ کچھ ایسے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا کہ ایک ہی جست میں انہیں طنز و مزاح نگاروں کی صف اول میں جگہ مل گئی۔

"بہ سلامت روی" ان کے اپنے اسلوب کا دوسرا شاہکار ہے لیکن ان کی کتاب "بزم آرائیاں" شہرت و معیار کے اس گراف کو برقرار نہ رکھ سکی۔ پچھلے کئی سال سے کرنل محمد خاں نے کچھ نہیں لکھا اور طویل عرصہ تک علیل رہے۔ اس شمارہ کے ذریعہ شگوفہ محمد خاں کو ایک منفرد مزاح نگار کی حیثیت سے خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ ☆

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

اشاعت کا ۳۲ واں سال

شگوفہ

جلد ۳۳
شمارہ ۶

حیدرآباد

جون ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کمپیوٹر کتابت:

SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373

طباعت:

دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۴ روپے　زر سالانہ: ۱۵۰ روپے　بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون: (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064

شگوفہ انٹرنیٹ پر: http://www.Shugoofa.CJB.net

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

A car for spinning without turning over
A car for sports fans to use after football matches
A car with a bulletin board on back of it for writing phone numb
A car for those who love to drive the wrong way.
A car with a telescope to be used at traffic lights to get a close look at ladies.
CYBER TOWER
LET'S LAUNCH A WEB SITE WWW.DROUGHT.COM TO ACCESS THE GOVERNMENT!
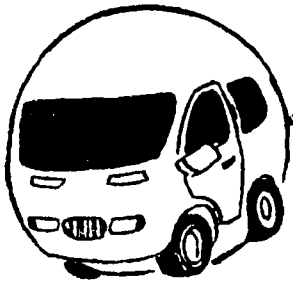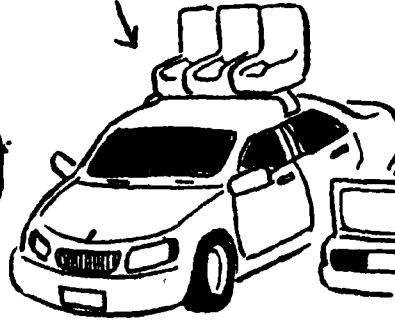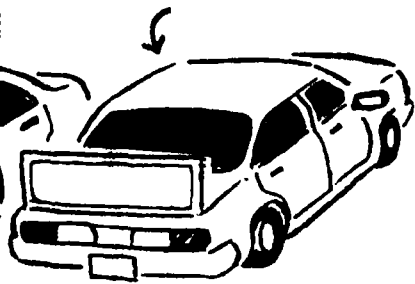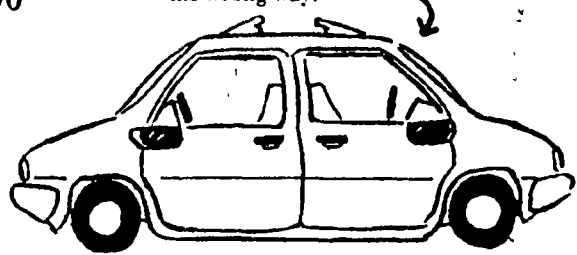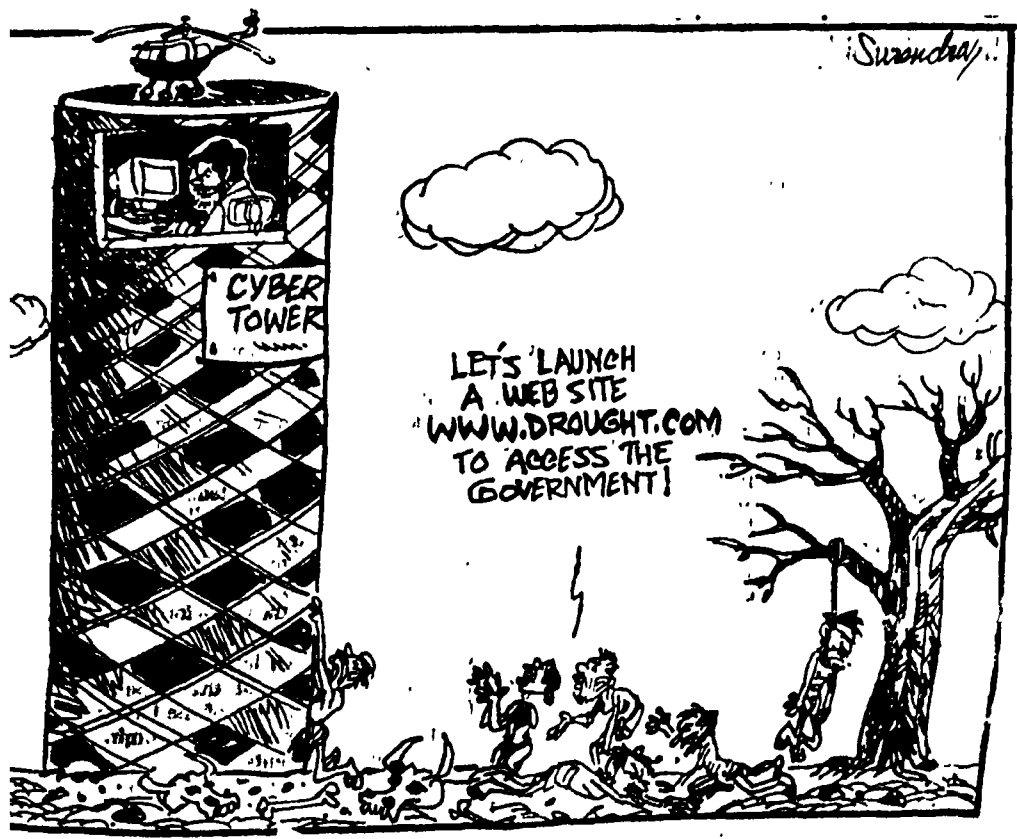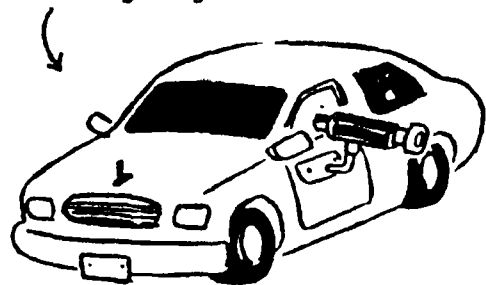
مجتبیٰ حسین

ہم نے ایک ہی دن میں چار مرتبہ بریک فاسٹ کھایا

صاحبو! لگاتار چوبیس گھنٹوں کے طویل ہوائی سفر کے بعد اب ہم کل سے امریکہ میں ہیں اور ابراہام لنکن کے شہر شکاگو کے ایک خوبصورت علاقہ ایلیجن میں اپنے بھتیجے ڈاکٹر مجاہد حسین کے گھر میں بیٹھے یہ چند سطریں لکھ رہے ہیں۔ موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ ننگے درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، سبزہ و گل انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ فضاؤں میں ایک عجیب سی مستی سرخوشی اور والہانہ پن ہے۔ ننگ دھڑنگ درخت جب پتوں کا لباس پہننا شروع کرتے ہیں تو امریکی اپنے لباس اتارنا شروع کردیتے ہیں اور لباس برہنگی زیب تن کرلیتے ہیں۔ امریکی موسم کے حمام میں دو ننگوں کی نہیں ایک ہی ننگے کے رہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ ہم نے بھی خاصی دنیا دیکھ رکھی ہے۔ سولہ برس پہلے خود امریکہ کو بھی اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ چکے ہیں لیکن اس بار کی طرح کا لمبا ہوائی سفر کبھی نہیں کیا اور سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے چوبیس گھنٹوں میں امریکہ پہنچے ہیں۔ پچھلی بار لندن میں رک کر یہاں آئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چوبیس گھنٹوں کے سفر میں ہمیں چار مرتبہ بریک فاسٹ کھانا پڑا۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ہم 24۔ اپریل کو صبح میں سات بجے دہلی سے چلے تو ظاہر ہے کہ بریک فاسٹ کا وقت تھا۔ سو کویت ایرلائینز کی ہوائی حسیناؤں نے ہمیں بریک فاسٹ سے نوازا۔ تین چار گھنٹوں کی پرواز کے بعد کویت پہنچے تو وہاں بھی بریک فاسٹ کا وقت تھا۔ سو پھر ہم ایک اچھے ہوائی مسافر کی طرح بریک فاسٹ کھانے میں مشغول ہوگئے۔ بعد میں جہاز دمشق کے اوپر سے پرواز کررہا تھا تو پتہ چلا کہ وہاں بھی بریک فاسٹ کا وقت چل رہا ہے۔ یہاں پھر ایک بار بریک فاسٹ پر ہاتھ صاف کیا۔ ایمسٹرڈم پر رکے تو سورج تب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ شاید یہاں بھی بریک فاسٹ کا وقت رہا ہوگا۔ ہم نے کھانے کی نوعیت سے اندازہ لگایا۔

بہرحال راستہ بھر بریک فاسٹ کھاتے کھاتے شکاگو پہنچے تو سورج میاں تب بھی چھما چھم چمکے چلے جارہے تھے۔ غرض سورج کو ہم نے خوب تھکایا اور اسے ڈوبنے نہ دیا۔ دوسری طرف ایرلائینز والوں نے بھی ہمیں خوب بریک فاسٹ کھلایا اور ہمارے لئے وقت کو روک دیا۔ شکاگو ایرپورٹ سے باہر آئے تو تب ہماری گھڑی میں ہندوستان کے 25۔ اپریل کی صبح کے سات بج رہے تھے اور ہم چوبیس گھنٹے گذارنے کے بعد بھی اپریل کی 24 تاریخ کے ہی مزے لوٹ رہے تھے۔ اس طرح ہماری حیات مختصر میں ایک اور فاضل دن کا اضافہ ہوگیا ہے۔

ہمارے ہاں جب رات ہوتی ہے تو یہاں پر دن، نتیجہ میں یہاں امریکی دن دھاڑے وہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ہم عموماً رات کو انجام دیتے ہیں۔ ویسے امریکہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ یہاں دن رات کی تخصیص ابھی نہیں معلوم ہوتی۔ ایسی تخصیص تو ہم جیسے پسماندہ ممالک کے باشندوں کے لئے ہوتی ہے۔

ہم ایمگریشن سے باہر آئے تو یوں لگا جیسے ہم شکاگو کے ایرپورٹ پر نہیں بلکہ بیگم پیٹ کے ہوائی اڈہ پر ہیں۔ ایک طرف دوستوں کی بھیڑ تھی اور دوسری طرف رشتہ داروں کا جمگھٹا تھا۔ سب سے پہلے ہمارے دوست حسن چشتی نے ہمیں ایک گلدستہ پیش کیا اور بغلگیر ہوئے۔ ان سے پورے دس برس بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ حسن چشتی کو ہم ان کی مستعدی، تیزی، پھرتی، عجلت اور لپک جھپک کی وجہ سے حسن چستی کہتے ہیں۔ ستر برس کے ہوجانے کے باوجود ان کی چستی نوجوانوں کو بھی شرمسار کردیتی ہے۔ ان کے علاوہ ملک سعیدی،

نعمت اللہ حسینی، شاہد اسحاقی، خلیل الزماں، بیگم خلیل الزماں، عباس علی خان، پرویز یداللہ مہدی، ناظم الدین سلیم، زین العابدین، احمد خان، غوثیہ سلطانہ اور ہمارے بچپن کے دوست ڈاکٹر خورشید خضر وغیرہ موجود تھے۔ کتنے ہی برسوں بعد ان بچھڑے ہوئے دوستوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا موقعہ ملا۔

یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

شکاگو کی تنظیم دی عثمانین کے خلیل الزماں اور قیسی بھائی (عزیز قیسی مرحوم) کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ خلیل الزماں نے یہاں ایک تنظیم دی عثمانین کے نام سے قائم کر رکھی ہے جس کے تحت عثمانیہ یونیورسٹی کے قدیم طلبہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جاتا ہے۔ ان اصحاب کو ایوارڈ بھی دیئے جاتے ہیں جنھیں غلطی سے کبھی عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ جنھیں بڑی مشکل سے عثمانیہ یونیورسٹی کی ڈگری ملی تھی انھیں بڑی آسانی سے ایوارڈ دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں بھی ایک بار اس تنظیم کے غائبانہ ایوارڈ سے نواز چکے ہیں۔ جب غائبانہ نماز جنازہ ہوسکتی ہے تو غائبانہ ایوارڈ کیوں نہ ملے۔ ہم نے اخبار میں اس ایوارڈ کے ملنے کی خبر پڑھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس ایوارڈ سے متعلق شیلڈ ہمیں پورے تین برسوں بعد ملی تھی۔ ظاہر ہے کہ شکاگو سے دہلی کا فاصلہ بھی تو بائیس تیئیس ہزار کیلومیٹر کا ہے۔ خلیل الزماں بڑی محبت سے ملے۔ ہم نے سوچا تھا کہ وہ بار پہنانے کے بعد لگے ہاتھوں ہمیں ایوارڈ بھی دیں گے بلکہ ہم تو ایوارڈ کے انتظار میں کچھ دیر رک بھی گئے تھے۔ نہیں ملا تو ہم نے ایوارڈ کے بارے میں پوچھ لیا بولے پہلے شکاگو میں کچھ کر دکھائیے۔ ایوارڈ کے اہل بنیں تو ضرور دیں گے۔ یہ ایوارڈ ہے الیکشن کا ٹکٹ نہیں کہ جسے جی چاہا دیدیا۔

ہم پورے سولہ برس بعد شکاگو آئے ہیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو یہاں اردو کی محفلوں کا چلن اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ اردو بولنے والے بھی کم تھے اور حیدرآبادی بھی کم تھے۔ ماشاء اللہ اب تو یہاں اردو کا ماحول اتنا پھیل چکا ہے کہ کھلے عام ایک دوسرے کی غیبت کی جانے لگی ہے۔ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچی جاتی ہیں۔ ادب میں مقام کے تعین کی خاطر ادیبوں اور شاعروں کو لگاتار ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ بعض تو جگہ کے انتظار میں برسوں سے کھڑے ہیں۔ غرض معاصرانہ چشمکیں عروج پر ہیں، ہمیں یہاں آئے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں بیتے ہیں لیکن بلا مبالغہ پچاس سے زیادہ دوستوں سے ایک دوسرے کی برائیاں سن چکے ہیں۔ بہت مزہ آرہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم امریکہ میں نہیں بلکہ ابھی تک ہندوستان ہی میں ہیں۔ وطن سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی اپنی روایات کی پاسداری کرنا کوئی ہم ہندوستانیوں سے سیکھے۔

ایر پورٹ پر ایک طرف ہمارے بیسیوں رشتہ دار کھڑے تھے اور دوسری طرف ہمارے احباب موجود تھے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کدھر جائیں۔ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے والا معاملہ تھا۔ لیکن ہم عادت سے مجبور پہلے دوستوں کے جھرمٹ میں ہی گئے۔ کیوں نہ جاتے۔ آخر کو ان ہی لوگوں نے لے لینا دوپٹہ میرا۔ ہمارے بھائی حامد حسین اور عارف حسین اپنے سارے امریکن بچوں اور ان بچوں کے بچوں کے ساتھ موجود تھے۔ بعض کے تو نام بھی ہمیں یاد نہ تھے۔ کتنی ہی شکلیں اب بدل چکی ہیں۔ البتہ ہمارا ایک بھتیجہ (مبین) فلمی اداکار شاہ رخ خان سے بالکل مشابہہ ہے۔ اس مشابہت کو دیکھ کر ہمیں اس کا نام یاد نہ رہا اور جب ہم نے بے خیالی میں اسے شاہ رخ خان کہہ کر بلایا تو اس کی باچھیں بھی بالکل شاہ رخ خان کی طرح ہی کھل اٹھیں۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے وہ ہر ایک کے آگے ہماری "مردم شناسی" کی تعریف کئے چلا جارہا ہے اور ہماری خدمت کچھ اس طرح کررہا ہے کہ اصلی شاہ رخ خان بھی کیا خدمت انجام دے گا۔ اسے کیا پتہ کہ اسی "مردم شناسی" میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔

ہم نے ابھی اچھی طرح آرام بھی نہیں کیا ہے کیونکہ امریکہ کے مختلف شہروں سے ہمارے احباب کے بیسیوں فون آتے چلے

جارہے ہیں۔ چشتی صاحب نے ہماری آمد کی خبر جو یہاں کے اخباروں میں چھپوادی تھی۔ لیکن ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد ہمارے لئے جو سب سے پہلا فون آیا وہ منی سوٹا سے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی صاحب کا تھا۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی جو شکاگو سے ایک ہزار میل کی دوری پر رہتے ہیں۔ ہمارے ان اولین کرم فرماؤں میں سے ہیں جنھوں نے 1962 میں ہماری ابتدائی مزاحیہ تحریروں کو نہ صرف پسند فرمایا تھا بلکہ اپنے جونیئر ڈاکٹروں کو بھی پابند فرماتے تھے کہ وہ ہماری تحریروں کو پسند فرمائیں۔ ایسے بے لوث کرم فرما آج کے زمانے میں کیسے ملتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں دوبار ان کے طویل فون آچکے ہیں۔ عابد علی خان اور محبوب حسین جگر کا جب ذکر کرنے لگے تو ہمیں یہ احساس بھی ہوا کہ فون کی دوسری طرف شاید ان کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان کا حال کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر عبدالمنان کا چھ مہینے پرانا حال کچھ اس طرح بیان کیا جیسے یہ ابھی پچھلے ہفتہ کا حال ہو۔ لیکن وہ پھر بھی اتنے حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہم خود حیران ہیں کہ قدرت بعض انسانوں کو محبت اور خلوص کی اتنی وافر دولت کس طرح عطا کردیتی ہے۔

صاحبو! جیٹ لیگ (Jet Leg) سے ہمارا برا حال ہے۔ پھر بھی یہ چند سطریں محض اس خوشی فہمی میں لکھ دی ہیں کہ شاید آپ ہمارا حال جاننے کے لئے بے چین ہوں۔ ☆

افتخار وصی
محلہ گنج دوئم۔ بیتیا

غزلیں

سر بام آکے مجھ سے ترا آنکھیں چار کرنا
کہیں لے نہ ڈوبے اک دن مجھے تیرا پیار کرنا

ہے غضب فقیہہ و ملا کریں چار چار شادی
کہیں عورتوں کو لیکن فقط ایک بار کرنا

میں نے کہہ دیا ہے اس سے کہ رقیب جب بھی ٹوکے
تو مرمت اس کی بڑھ کے ذرا زور دار کرنا

اسے نمبری تھما کر یہ کہا بصد خوشامد
میرا کیس فائل اپ ابھی پیشکار کرنا

یہی سیکھتے ہیں کالج میں ہمارے نور چشماں
کبھی پارٹیاں بنانا کبھی خلفشار کرنا

میں کہاں سے کوسمیٹکس ترے واسطے خریدوں
مجھے مار ہی نہ ڈالے ترا یوں سنگار کرنا

یہ کہاں کی ہے سیاست ذرا افتخار پوچھو
وہی بن گئے ہیں رہزن جنہیں تھا سدھار کرنا

اپنی زباں سے ہم اپنی پہچان کی غزلیں پڑھتے ہیں
سولہ آنہ سچ ہے ابو جان کی غزلیں پڑھتے ہیں

ہم پر ہی موقوف نہیں ہے گھر کی روایت ہے کہنہ
دانستہ ابو بھی امی جان کی غزلیں پڑھتے ہیں

محفل میں شاعر کی جب سے آئے ہیں متشاعر لوگ
ایک غزل میں الگ الگ ارکان کی غزلیں پڑھتے ہیں

شہر میں اپنے کچھ ایسے خود ساختہ شاعر ہیں زندہ
جو ڈھائی سو سال پرانے دیوان کی غزلیں پڑھتے ہیں

نومشقی کے بھوت کو فیور اک سوچار ہوا یہ سنکر
غزلوں کے مہا پنڈت بھی جگجان کی غزلیں پڑھتے ہیں

مشاقی پر ان کی کیسے کوئی اٹھائے گا انگلی
جو داغ کی محبوبہ منی جان کی غزلیں پڑھتے ہیں

اچھے اچھے شاعر کا بھی اڑا دیتے ہیں فیوز وہ
جو دیدہ و دانستہ قلمستان کی غزلیں پڑھتے ہیں

اہل بھارت کیوں نہ کریں گے ہم پر ناز وصی صاحب
رہکر ہندوستان میں پاکستان کی غزلیں پڑھتے ہیں

عابد معز (ریاض)

وہ آئے گھر میں ہمارے

گھر پر بچوں کے ساتھ بقرعید منانے کا ارادہ کیا اور عید سے چار دن قبل ،میں وطن مالوف حیدرآباد پہنچا ۔ سرزمین وطن پر قدم رکھنے کے ساتھ خوشگوار تبدیلیوں کا احساس ہوا ۔ ایرپورٹ غیر معمولی صاف ستھرا نظر آیا ۔ دور دور تک کچرے کا نشان نہ تھا ۔ دیواروں اور فرش پر پیک کے دھبے بھی غائب تھے ۔ درو دیوار پر نیا رنگ و روغن تھا ۔ تازہ پینٹ کی مخصوص بو آرہی تھی ۔ برقی بلب اور ٹیوب پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھے ۔ کوئی بلب ٹوٹا ہوا اور نہ ہی کوئی ٹیوب پھوٹا ہوا تھا ۔ سبھی پنکھے دوڑ رہے تھے ۔ کوئی تھک کر رکا ہوا نہ تھا ۔ کارکن مستعدی سے کام میں جٹے ہوئے تھے اور حیرت کی بات تھی کہ وہ مسافرین سے مسکرا کر بات کر رہے تھے ۔

مسافروں کا سامان جلد حوالے کردیا گیا اور رسمی کاروائیاں بھی تیزی سے انجام پاگئیں ۔ چند ہی لمحوں میں سامان کی ٹرالی لئے میں حیرت زدہ ایرپورٹ کے باہر کھڑا تھا ۔ کچھ سوچنے کا موقع ملا ہی تھا کہ دو تین کارندوں نے ادب و احترام کے ساتھ میری پذیرائی کی ۔ میرے لئے سواری کا بندوبست کیا ۔ سامان لادنے میں مدد کی ۔ ڈرائیور کو شرافت سے پیش آنے کی ہدایت کی اور مجھے وداع کیا ۔ حسب عادت میرا ہاتھ جیب میں چلا گیا ۔ میں چھوٹی مالیت کا نوٹ تلاش کرنے لگا ۔ ایک کارندے نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کہا : "نو ٹپ پلیز"

میں مزید حیران بلکہ پریشان ہوگیا ۔

ایرپورٹ کے باہر اور اطراف و اکناف کا علاقہ بھی صاف ستھرا تھا ۔ ایسی صفائی اور مستعدی کے بارے میں ،میں نے صرف پڑھا اور سنا تھا ۔ مغربی ممالک اور امریکہ کی سڑکیں اور ایرپورٹ ایسے ہوتے ہیں اور یوں ہوتے ہیں ۔ فرش آئینہ کی طرح صاف ہوتا ہے ۔ اپنی شکل تک نظر آجاتی ہے ۔ اہلکار باادب اور بااخلاق ہوتے ہیں ۔ سامان خود بخود مسافروں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے ۔ سامان ڈھونے کی مصیبت نہیں ہوتی اور یہ بھی کہ وہاں ہم نہیں چلتے راستہ چلتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اب اپنے یہاں یہی معیار دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا ۔

بہت دیر تک مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہ آیا کہ میں وطن میں ہوں ۔ ایرپورٹ کے باہر مجھے ان دبلے پتلے ،میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ان بچوں اور بڑوں کی یاد آئی جو کسی کو سامان کے ساتھ نکلتے ہی گھیر لیتے ہیں ۔ ہر کوئی سامان کو ہاتھ لگا کر سواری تک پہنچاتا ہے اور اپنے ہاتھ لگانے کی اجرت وصول کرتا ہے ۔ جب مسافر انکار کرتا ہے تو التجاء کرتے ہیں ۔ " بال بچوں کے نام پر کچھ دے دیجئے ۔ ایک وقت کا کھانا کھالوں گا " ۔

سامان کو ہاتھ لگانے اور ہاتھ پھیلانے والوں کو میں ادھر ادھر تلاش کرتا رہا لیکن وہ دور دور تک نظر نہ آئے ۔ معلوم نہیں وہ لوگ کہاں چلے گئے تھے ۔ میں نے قیاس کیا کہ مستقبل بہتر بنانے کی خاطر وہ بھی باہر گئے ہوں گے اور مستقبل میں وہ بھی سامان سے لدے پھندے کسی فلائیٹ سے اسی ایرپورٹ پر اتریں گے ۔

ایرپورٹ سے گھر کے لئے وطن کی مشہور و معروف تین پہیوں والی سواری جسے ہم آٹو رکشہ کہتے ہیں میں سفر کا آغاز ہوا ۔ آٹو رکشہ کو دیکھتے ہی ہاتھ دعا کے لئے اٹھ جاتے ہیں کہ مولا ! تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری نیکیوں کے عوض ہماری حفاظت

فرما۔ آٹو رکشہ میں سفر کو بیان کرنے سے میں اس لئے قاصر ہوں کہ شہر حیدرآباد کے نامور ادیبوں نے اس تعلق سے ادبی شہ پارے تخلیق کئے ہیں اور پھر اس وقت میرا موضوع سخن یہ سواری نہیں ہے۔ قصہ مختصر، خلاف توقع آٹو رکشہ کی سواری نہایت آرام دہ ثابت ہورہی تھی۔ نہ کوئی جھٹکا لگ رہا تھا اور نہ ہی کوئی دھکا۔ ایسے محسوس ہورہا تھا جیسے آٹو رکشہ سڑک پر تیرتے جارہا ہے۔ سڑک پر نظر دوڑائی تو میں پھر حیرت زدہ ہوگیا۔ صاف وشفاف سڑک۔ نہ کہیں گڈھا اور نہ ہی کہیں ابھار۔ دل نے چاہا کہ میں جھک کر شہر کی سڑک پر اپنا عکس دیکھوں لیکن عقل نے منع کردیا کہ میاں کتنی بھی سڑک صاف ہو مگر ہے تو سڑک ہی۔

سڑک کے کنارے سلیقے سے فٹ پاتھ جڑے ہوئے تھے۔ فٹ پاتھ پر پودے اگ رہے تھے اور حیرت انگیز طور پر پیدل چلنے والوں کے لئے راستہ صاف تھا۔ فٹ پاتھ پر بے تحاشہ گاڑیاں ٹھہری ہوئی نہیں تھیں۔ بنڈیاں اور ٹھیلے بھی نہیں تھے۔ وطن میں آدھے سے زیادہ کاروبار انہیں بنڈیوں اور ٹھیلوں پر ہوتا ہے۔ چلتی پھرتی دکانیں نظر نہ آنے سے مجھے تشویش بھی ہونے لگی۔

چند برس پہلے تک میرے شہر میں سڑکوں کو تقسیم کرنے کا رواج نہ تھا۔ ایک ہی راستہ ہوتا تھا جس پر آنے اور جانے والی ٹریفک آپس میں ٹکراتے ہوئے چلتی تھی۔ اب مجھے ہر سڑک سلیقہ سے تقسیم کی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ سڑک کو فولادی جنگلے کی مدد سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ٹریفک صحیح سمت رواں دواں تھی۔ سڑکوں پر مختلف اقسام کے کھمبے (کرنٹ، ٹیلی فون، کیبل وغیرہ) ایک ترتیب سے لگے نظر آئے۔ ان کھمبوں پر تازہ رنگ ہوا تھا۔

راستوں پر بلدیہ اور دیگر محکموں کے کارکن سڑکوں اور فٹ پاتھوں کو بنانے، سنوارنے اور سجانے میں مصروف نظر آئے۔ یہ منظر بھی میں نے شاید اپنے شہر میں صرف چند بار ہی دیکھا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس شہر کا رکھوالا تو بس اوپر والا ہے۔ سڑکوں پر کام کرنے والے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے تھے۔

دیار غیر میں رہتے ہوئے میں سنتا رہتا تھا کہ وطن کی خوبصورتی میں نکھار آتا جارہا ہے۔ ارباب اقتدار شہر میں سڑکیں بنوا کر، راستے صاف کرکے فلائی اوور تعمیر کرکے اور جھاڑ پودے لگا کر اپنا دور حکومت بڑھاتے آرہے ہیں۔ صرف اتنے معمولی کام کے عوض سادہ لوح عوام انہیں ووٹ دے دیتے ہیں۔ اندازہ ہوا کہ آج سیاستدانوں سے عوام کتنی کم توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ راستوں میں بہتری کے ساتھ منگائی میں بہت زیادہ اضافہ ہورہا ہے۔ زندہ رہنا منگا اور بہت منگا پڑرہا ہے۔ صرف چند برس پہلے کی بات ہے۔ اسی پارٹی کی حکومت میں چاول دو روپیہ کیلو ملتا تھا جو اب بیس روپیے کیلو ملتا ہے۔ بڑھتی ہوئی منگائی کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتا۔ سب خوش ہیں کہ شہر خوبصورت بنتا جارہا ہے۔

آٹو رکشہ کے ساتھ میرے خیالات بھی سبک رفتاری سے چلے جارہے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑے راستے کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اجنبی نئے شہر کو دیکھتا ہے۔ اپنے ہی شہر میں اجنبی ہونے کا احساس بھی مجھے پہلی مرتبہ ہوا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ میرا شہر اتنا خوبصورت بن سکتا ہے۔ خیال آیا کہ کہیں یہ خوبصورتی کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے تو نہیں ہے؟ کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے میں نے آٹو ڈرائیور سے پوچھا: "میاں، یہ شہر میں کیا ہورہا ہے؟"

آٹو ڈرائیور نے حیرت سے جواب دیا۔ "آپ کو تیں مالوم (نہیں معلوم)۔ حیدرآباد میں امریکہ کے صدر ساب (صاحب) آرئیں (آرہے ہیں)۔"

تب مجھے یاد آیا کہ امریکہ کے عزت ماب صدر کے دورۂ ہندوستان میں میرا وطن بھی شامل ہے۔ مجھے صدر کے دورے کے تعلق سے آئے پچھلے دس پندرہ دنوں کے اعلانات اور بیانات ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ صدر امریکہ کوئی بائیس سال بعد

ہندوستان کے دورے پر آرہے ہیں۔ ان کے دورے میں حیدرآباد بھی شامل ہے جو اس شہر کے لئے ایک اعزاز ہے۔ صدر امریکہ کا شایان شان استقبال کیا جاتے گا۔ صدر کے استقبال کے ساتھ سکوریٹی کے بھی سخت انتظامات کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

میں ان مختلف بیانات میں الجھا ہوا تھا کہ آٹو رکشہ کو ایک زور دار جھٹکا لگا۔ میرا سر اچھل کر چھت سے ٹکرایا۔ قصور میرا ہی تھا۔ مجھے آٹو رکشہ میں لگے ڈنڈے کو پکڑ کر بیٹھنا چاہئے تھا لیکن میں صدر کے استقبال میں بجھی سڑک کو دیکھ کر سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سے سر سہلاتے اور دوسرے ہاتھ سے ڈنڈے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے میں نے باہر سڑک کا نظارہ کیا تو منظر یکلخت بدلا ہوا تھا۔

وہی میرا اپنا شہر تھا۔ وہی پرانی سڑک کہیں گڑھا تو کہیں ابھار۔ قدم قدم پر اسپیڈ بریکر، سواری اور سوار کی کمر توڑنے کے لئے بنے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کا اژدھام تھا۔ وہی گہما گہمی جو میرے وطن کا خاصہ ہے۔ سڑک کے دونوں جانب بنڈیاں اور ٹھیلے والے کاروبار کررہے تھے۔ بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا۔ یہاں ہاتھ پھیلانے والے بھی موجود تھے۔

مجھے اطمینان ہوا کہ میں وطن پہنچ گیا ہوں۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر آٹو ڈرائیور سے ایک عجیب بے معنی سوال کیا۔ "میاں۔ یہ کیا ہے؟"

یہ ایچ (یہی) اپنا شہر ہے ساب (صاحب)۔ اور (ادھر) کلنٹن ساب (صاحب) نہیں آرئیں نا (نہیں آرہے ہیں)۔" آٹو ڈرائیور نے مجھے سمجھایا۔

پرانے راستوں سے گذر کر میں اپنے گھر پہنچا۔ آٹو رکشہ کا کرایہ پوچھا تو ڈرائیور نے گزارش کی۔ "کچھ بھی سمجھ کر دے دیئو (دیجئے)۔ اب اپنے شہر میں امریکہ کا صدر بھی آرائے (آرہا ہے)۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"کیا ساب (صاحب) کتا (کتنا) بڑا شہر ہے اپنا۔ آپ بڑے لوگاں (لوگ) ہم پر عنایت نہیں کریں گے کیا۔" آٹو ڈرائیور نے سوال کیا۔

میں نے کرایہ کے علاوہ کچھ پیسے زیادہ دیئے تو آٹو ڈرائیور آداب بجاتا چلا گیا۔ ☆

برصغیر کے عالمی شہرت یافتہ شاعر قتیل شفائی علیل

عالمی شہرت یافتہ شاعر اور مشہور فلمی نغمہ نگار قتیل شفائی دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر مورخہ ۲۵ اپریل سے لاہور کے ایک ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ قتیل صاحب کے تمام چاہنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ قتیل صاحب کے لئے دعائے صحت فرمائیں۔

نارنگ ساقی

ظفر کمالی، سیوان، بہار ۔

خفیہ ایجنڈا

تخت رواں پہ بیٹھے ہیں سلطاں نئے نئے   " آئین تازہ تازہ ہیں فرماں نئے نئے "
جنت وہی ہے آئے ہیں رضواں نئے نئے   پوشیدہ جن کے دل میں ہیں طوفاں نئے نئے

مہرو وفا کے بول زباں بولنے لگی
شربت میں زہر چپکے سے وہ گھولنے لگی

سادہ مزاج کہتے ہیں عادت بدل گئی   جنبش نہ کی جبل نے جبلت بدل گئی
نیت بدل گئی ہے جو صحبت بدل گئی   بچھو نہ ڈنک مارے گا فطرت بدل گئی

تھا جو فساد خون میں کب کا ہوا ہوا
" الو کے گھر میں دیکھئے پیدا ہما ہوا "

لہرایا ہے جو ذہنوں میں جھنڈا ہی اور ہے   جھنڈے میں جو لگا ہے وہ ڈنڈا ہی اور ہے
جنتر یہ دوسرا ہے یہ گنڈا ہی اور ہے   مرغی ہے ان کی اور تو انڈا ہی اور ہے

پوشیدہ راز دل کے کبھی کھولتے نہیں
" پر جھاڑتے ہیں مرغ سحر بولتے نہیں "

قسمت تھی مہرباں تو بے شان و بے گماں   بلی کے بھاگوں چھینکا جو ٹوٹا ملی کماں
طائر جو پر کٹے تھے لگے بھرنے وہ اڑان   بہنے لگا خیالوں کا زوروں پہ نابدان

دنیا کے دیکھنے کو نظارا تھا دوسرا
کرنا ہے کون کام اشارا تھا دوسرا

بازی لگی ہے ہاتھ تو اس کو بھنائیے   سارے کلیدی عہدوں پہ قبضہ جمائیے
مہرہ ہٹائیے کہیں پہرہ لگائیے   کتے بھی چپ رہیں گے جو ہڈی کھلائیے

چاہے کسی کا قفل ہو اپنی لگے کلید
" ہر شب شب برات ہو ہر روز روز عید "

تازہ منسٹری میں ملائی ہمیں ملے   ملنا ہے جب کسی کو تو بھائی ہمیں ملے
قیدِ غم و الم سے رہائی ہمیں ملے   اوروں کو بندگی تو خدائی ہمیں ملے

ہر شعبہ حیات میں ایسے دخیل ہوں
کوئی مقدمہ ہو ہم اس کے وکیل ہوں

کرنا ہو رقص بھی تو الگ ہی کیا کریں　　پینا ہو تلخ گھونٹ تو ہنس کر پیا کریں
منفی سیاستوں کو بڑھاوا دیا کریں　　مرتے رہیں اسی پہ اسی پر جیا کریں
ہے میڈیا تو پہلے ہی اپنی گرفت میں
اب منزل غرض بھی ہو طے ایک جست میں

موقع کوئی ہو ہونٹوں پہ باپو کا نام ہو　　لیکن قلم سے جب بھی ہو ناتھو کا کام ہو
اپنے جو ہم خیال ہوں ان پر سلام ہو　　جو ہوں خلاف ان کے لئے ہر سو دام ہو
بندوق داغنی ہو تو کاندھا ہو غیر کا
پوشیدہ اس میں پہلو ہے راحت کا خیر کا

دو کشتیوں میں ہونا ہے اک وقت ہی سوار　　ان کو اسی میں کھینا ہے بھاٹا ہو یا جوار
اک تیر سے ہی کرنا ہے دو دو ہمیں شکار　　مرجائے سانپ لاٹھی بھی ٹوٹے نہ زینہار
اعلان جب کریں گے تو "ساجھا نصاب" کا
لیکن سبق پڑھیں گے ہم اپنی کتاب کا

بگلا بھگت کے نقش قدم پر چلیں اگر　　تسلیم راہزن بھی کریں ہم کو راہبر
اپنی بھی حیثیت ہو زمانے میں معتبر　　ہے مصلحت اسی میں کہ بن جائیں سیکولر
کھائی جو کھود رکھی ہے یاروں نے، پاٹ دیں
بھٹی ہے گرم لوہے کو لوہے سے کاٹ دیں

طاقت ہے جن کے پاس ہو ان سے دعا سلام　　جو سر پھرے ہیں ان کا ہو ظاہر میں احترام
رکھیں ہمیشہ ہاتھوں میں رہوار کی لگام　　احباب مقتدی ہی رہیں ہم رہیں امام
حکمت یہی ہے پیار محبت کی بات ہو
باہر سے ہو خلوص تو اندر سے گھات ہو

ماتھے پہ یہ لکھا ہو کہ روشن خیال ہیں　　سمجھے نہ کوئی یہ کہ قیامت کی چال ہیں
ہم تو بدیس میں بھی سدیشی دلال ہیں　　بانی ہے رسٹ ایسی تجارت کا مال ہیں
قیمت اگر لے تو ہمارا ہنر کھلے
رکھ دیں قدم جہاں وہیں فتنے کا در کھلے

پانو میں اتحاد کا بندھن ضرور ہے　　لیکن ہمارے ساتھ سر پر غرور ہے
برپا ہے شور حشر یہ کس کا قصور ہے　　دارالسرور کیوں ہو جو "دارالشرور" ہے
"تحریک دوستاں" کو سبوتاژ ہم کریں
آنکھوں میں دھول جھونک دیں ناکوں میں دم کریں

پہلے تو ہم حریفوں کی صف میں نقب لگائیں　　پچھڑوں کو منتشر کریں آپس میں ہی لڑائیں
"ٹھگوا پلیٹ فارم" یہ سب کو بلا کے لائیں　　کوے جو سیکولر ہیں کریں گے ہی کائیں کائیں

جاری رہے یہ کھیل سدا شہ کا مات کا
حربہ بھی آزماتے ہیں نفسیات کا

تاریخ کو بدلنے کا ایسا ہو انتظام　　کوئی سمجھ سکے نہ حقیقت کا اتہام
آقا بنادیں اب انہیں جو تھے کبھی غلام　　جو تھے لٹیرے بخش دیں اعلا انہیں مقام

ہیرو کو زیرو کردیں شرارت کے زور سے
تھوکیں گے چاند پر تو حماقت کے زور سے

ہم "آر ایس ایس" کو دیس کا ریفارمر کہیں　　"بجرنگ دل" کو امن کا پیغامبر کہیں
خنجر جو مارے دل میں اسے چارہ گر کہیں　　مسجد جو ڈھائیں ان کو بھی ہم سیکولر کہیں

ہوتا ہے دل کسی کا تو ہوتا رہے کباب
جلاد کو بھی بخش دیں ہمدرد کا خطاب

بھڑکائیں ہوشیاری سے یوں مذہبی جنون　　ہو رفتہ رفتہ اہل وطن کا سفید خون
ڈھونڈے سے مل سکے نہ کہیں امن اور سکون　　فسطائیت کا ایسے ہی مضبوط ہو ستون

چہرے پہ ہو نقاب مگر اعتدال کی
بہرد پے بھی داد دیں ایسے کمال کی

جرمن کے نازیوں کی خباثت کو مات دیں　　ہم نسلی برتری میں شرافت کو مات دیں
چنگیز اور ہلاکو کی شہرت کو مات دیں　　فتنہ گری میں بڑھ کے قیامت کو مات دیں

ساری اقلیت کو پھنسنا ہے جال میں
ان کو نہ یہ خبر ہو کہ کالا ہے دال میں

پکوان لاکھ پھیکا ہو اونچی دکان ہو　　کتھا ڈلی بلا سے نہ ہو پاندان ہو
ہر ہر قدم پہ ہوتا ہے تو امتحان ہو　　اسپین کے نمونہ پہ ہندوستان ہو

کرتے رہیں پریڈ سدا جنگ کے لئے
جس میں نشہ ہو خون کا اس بھنگ کے لئے

ہموار رفتہ رفتہ غلامی کی راہ ہو　　جائیں بدیس بھی تو وہاں واہ واہ ہو
موقع پرست یاروں سے ایسے نباہ ہو　　ان کو کسی پالن کی ملتی نہ تھاہ ہو

رنگ اپنا دھیرے دھیرے ہم ان پر چڑھائیں گے
قربانیوں کا بکرا بھی ان کو بنائیں گے

سننا ہے اتحادی اگر دیتے ہیں سجھاؤ　　بہتر ہے ان کے راگ میں ہاں ہاں کا سر ملاؤ
مشرق کی سمت رخ ہو تو مغرب کی ہو جھکاؤ　　موقع ملے تو چپکے سے لیوں مارنا ہے داؤ

آنکھیں کھلیں جو یاروں کی جب ختم کھیل ہو
اپنی بلا سے ان کو ہو پھانسی کہ جیل ہو !!

(خاکہ)

خالد سعید
6-2-7/2 قلعہ روڈ
منیار تعلیم بیدر 585401

دھوپ اور گھنی چھاؤں

میری پہلی ملاقات محترمہ لئیق صلاح صاحبہ سے کب ہوئی تھی؟ یاد کرتا ہوں تو یاد آتا ہے۔ ۱۹۸۵ میں میرا پہلا شعری مجموعہ "شب رنگ نمو" شائع ہوا تھا۔ شائع ہوکر بھی آدھ ایک سال ہوچکا تھا۔ چوں کہ میں رسم اجرا وغیرہ کا قائل نہیں تھا اس لئے اس طرح کا کوئی جلسہ نہیں ہوا تھا۔ مگر میرے دوستوں، خصوصاً امجد جاوید نے زور دے کر کہا تھا: رسم اجرا نہ سہی، تمہاری کتاب پر ایک بے تکلف اور غیر روایاتی informal نشست ہونی چاہیے تاکہ کتاب پر غیر مصلحت آمیز تحریر لکھنے کی روایت پڑے۔ تجویز پسند آئی۔ میں تیار ہوگیا کہ "ادھر آ ستمگر ہنر آزمائیں / تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں۔ لہذا جہاں شرفاء کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی وہیں ایک سے ایک بے باک بلکہ "منہ پھٹوں" کو بھی جمع کیا گیا۔ مسئلہ جلسے کی صدارت کا تھا۔ گلبرگہ کے ادبی حلقے کے کئی جغادری نام پیش ہوئے۔ میری فطرت میں ایک عجب ٹیڑھ ہے کہ میں مقتدر حضرات کی بجائے غیر مقتدر، نامور کی بجائے کم نام اور مستند کی بجائے نئی صلاحیتوں کو ترجیح دیتا آیا ہوں۔ انھی دنوں گلبرگہ کی ادبی فضا میں ایک نام ستار کے تار کی طرح جھنجنارہا تھا، وہ تھا لئیق صلاح۔ حالانکہ میں ان سے نہ شخصی طور پر واقف تھا اور نہ تحریری طور پر۔ پھر بھی میں نے صدارت کے لیے اسی نام کو ترجیح دی، طے پایا کہ صدارت کے لیے ان کی منظوری لی جائے۔

لئیق صاحبہ نئی نئی حیدرآباد سے گلبرگہ آئی ہوئی تھیں۔ پہلے پہل بی بی رضا ڈگری کالج میں بطور لکچرر کام کرتی رہیں، بعد میں گلبرگہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوگیا تھا۔ وہ نور الاسلام کمپونڈ میں رہتی تھیں۔ میں اور امجد رضامندی حاصل کرنے ان کے گھر گئے۔ ہمیں دیوان خانے میں بٹھایا گیا۔ چھوٹے سے کرائے کے گھر کا تنگ سا دیوان خانہ کچھ بے ترتیب سا۔ اس بے ترتیبی کو دیکھ میرے تصور و حواس بھی کچھ الجھ سے گئے، مزید کچھ محسوس کرتا کہ وہ آئیں۔ کالے گھنگھریالے چمکدار ڈاٹ بال، آنکھیں متانت سے بھرپور اور ان میں وحشت کی ایک ہلکی سی لکیر پڑی ہوئی، جس کی جگہ اب اطمینانی نے لے لی۔ رو کھا رو کھا بیضوی چہرہ جواب شاداب تر ہے اور بھرا بھرا۔ کھلتا ہوا رنگ، ناٹا قد، اکہرا بدن جواب دہرا گیا ہے۔ عام سی چھوٹی سی پیالیوں میں چائے اور بسکٹ سے ہماری تواضع کی گئی۔ یہ سب کچھ تصور کے خلاف تھا۔ جانے کیوں مجھے مکان اور مکین میں مماثلت سی محسوس ہوئی۔ یہ تھا میرا پہلا تاثر۔

ہم نے اپنا تعارف کروایا۔ وہ ہمارے نام اور کام سے واقف نکلیں۔ وہ بہت محتاط روی اور نرم لہجے میں گفتگو کررہی تھیں۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے صدارت کے لیے حامی بھرلی۔ غرض معلنہ دن وہ آئیں اور جلسے کی صدارت کی۔ تو یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔

پھر لئیق صاحبہ سے ایک عرصے تک ملاقات نہ ہوسکی۔ لیکن گلبرگہ کے ادبی حلقوں میں ان کا نام گونجتا رہا۔ چوں کہ میں بیدر میں تھا، اس لیے صرف اخباروں یا لوگوں کی زبانی ان کی مصروفیات کا علم ہوتا رہا۔ شائد انھوں نے حیدرآباد کرناٹک اردو فرنٹ جوائن کیا تھا اور اس تنظیم کے تحت یا پھر آزادانہ طور پر خواتین کے لیے ادبی نشستوں کا اہتمام کررہی تھیں، مجھے یاد نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ

نسرین ستارا کے ساتھ مل کر گلبرگہ کے ادبی حلقوں میں صرف خواتین کے لیے علاحدہ سے ادبی نشستیں منعقد کررہی تھیں جو گلبرگہ کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ گلبرگہ کی ادبی تاریخ لکھنے والے ریسرچ اسکالروں نے میڈم کی ان کوششوں کو کن نظروں سے دیکھا اور اپنی تھیسس میں ان کا ذکر کیا بھی ہے کہ نہیں۔ چند دن بعد ہی یہ سننے میں آیا کہ وہ کرناٹک اردو اکیڈیمی کی صدارت کے لیے نامزد کی گئی ہیں۔ انھوں نے اپنے دور صدارت میں بہت کچھ کیا۔ بلکہ توقع سے بڑھ کر کیا۔ ایک تو یہ کہ ریاست کے مختلف اضلاع پر سمینار، مشاعرے اور مذاکرے منعقد کرائے۔ اس بہانے ریاستی فن کاروں کے ساتھ، کل ہند سطح کے فن کاروں کو مدعو کیا۔ نتیجے میں وہ بڑی ادبی ہستیاں ریاست کے مقامات کے علاوہ ریاستی فن کاروں سے واقف ہوئیں تو کرناٹک کے فن کار بھی ان ہستیوں سے متعارف ہوئے اور عوام کو انھیں دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ میڈم کی ان کوششوں کو یاروں نے حکومت کی خواہشات کی تکمیل سے تعبیر کیا۔ ان سرگرمیوں کے دوران میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کسی بھی سمینار یا ادبی نشست میں، میں بھی مدعو کیا جاؤں اور یہ خواہش کچھ بے جا بھی نہیں تھی، کہ جب ٹام اور جگ بلائے جارہے ہیں تو میں کیوں نہیں۔ اور پھر میں نے تو ۔۔ لیکن میری قسمت میں اکیڈیمی کا آب و دانہ نہیں تھا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میں مدعو نہیں کیا گیا۔ ورنہ یہ سوداگری ہوجاتی۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میڈم مصلحت تو اختیار کرسکتی ہیں، لیکن سوداگری نہیں۔

اکیڈیمی کے ان جگمگاتے، شور مچاتے کاموں کے علاوہ، انھوں نے کچھ ایسے خاموش کام بھی کیے، جن پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ جیسے اکیڈیمی اپنی ایک اسکیم کے تحت، اردو طلبہ کی ہمت افزائی اور اردو کے فروغ کے لیے ساٹھ فی صد سے زائد نمبرات لینے والے اردو طلبہ کے لیے وظائف جاری کرتی ہے۔ لیکن ایسے طلبہ جنھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم غیر اردو میڈیم سے مکمل کی ہے، اور کالج میں آکر ایک مضمون اردو اختیار کرتے ہیں تو ایسے طلبہ کا، اردو طلبہ کے ساتھ 60فی صد نمبرات لینا یقیناً محال ہے، ان کے لیے اکیڈیمی کی کوئی اسکیم نہیں تھی۔ میرے خیال میں ایسے طلبہ کے لیے ایک علاحدہ شرائط کے ساتھ اسکیم بنانا چاہیے تاکہ ہماری وہ نسل جو انگلش یا کنڑا میڈیم سے پڑھ کر آرہی ہے، انھیں کالج میں ایک مضمون اردو کے لیے راغب کیا جاسکے۔

جب ۱۹۹۰ء میں بیدر میں اکیڈیمی کے زیر اہتمام ایک سمینار منعقد ہوا اور لئیق صاحبہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے دو شاگردوں مسعود احمد اور محمود احمد کو ان کے آگے پیش کیا، جنھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم تو غیر اردو میڈیم سے حاصل کی تھی، لیکن کالج میں میری ایما پر، اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ اس کیس کو سن کر لئیق صاحبہ نے مجبوری ظاہر کی کہ اکیڈیمی کے دستور میں اس بات کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جب میں نے کیس کے سارے پہلوؤں پر کھل کر گفتگو کی، تو انھوں نے کوئی تیقن تو نہیں دیا، البتہ بڑے اعتماد کے ساتھ اس تعلق سے درخواست بھجوانے کے لیے کہا۔ اور میں نے حسب فرمائش درخواست بھیج دی۔ یہ بات میرے علم میں آئی کہ جناب وہاب عندلیب اور میجر خلیل الرحمان صاحب پر مشتمل کمیٹی بنواکر، اس مسئلہ کو کمیٹی میں رکھ کر اکیڈیمی کے دستور میں تبدیلی کرائی گئی اور اس تجویز کو منظور فرمایا گیا۔ جس کے سبب سے میسور اور بنگلور کے بعض طلباء کالج میں اردو مضمون اختیار کررہے ہیں اور اس اسکیم سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر مقتدر حضرات معقول سے معقول تجویز پر بھی غور نہیں فرماتے اور دیے گئے دستور ہی کو حرف آخر مانتے ہیں۔ ایسے میں لئیق صاحبہ جیسی شخصیتوں کا دم غنیمت ہے کہ وہ فراہم کی گئی تحریروں کو حرف آخر نہیں مانتیں، آج لئیق صاحبہ اکیڈیمی کی صدارت پر نہیں ہیں لیکن ان کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی میں طلبہ فائدہ اٹھارہے ہیں۔

ایک بار لئیق صاحبہ کو کسی ادبی نشست کی صدارت کی دعوت دینے کے لیے، میں اور امجد جاوید یونیورسٹی پہنچے۔ اتفاق سے اس

دن شعبہ کا ہفتہ واری سمینار منعقد ہونے والا تھا۔ اور عزیزی ساجدہ سلطانہ، جواب بی۔ جی سنڑ بیدر پر گیسٹ لکچرر ہیں، سر سید اور علی گڑھ تحریک پر مضمون پیش کرنے والی تھیں۔ پروفیسر قیوم صادق صاحب نے، ہماری اچانک آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں سمنیار کا مہمان خصوصی بنادیا۔ عزیزی ساجدہ نے علی گڑھ تحریک پر اچھا سا مضمون پڑھا۔ میں نے اظہار خیال کے دوران میں علی گڑھ تحریک کے اساسی عناصر کی طرف نشاندہی کی اور انھیں ایک فامولے 3R + N کی شکل میں پیش کیا اور تشریح کی۔ لئیق صاحبہ نے میری ہمت افزائی کی خاطر میری فی البدیہہ تقریر کی بڑی تعریف کی اور اسے ایک اچھا خاصہ ایکسٹنشن لکچر Extenssion Lectur قرار دیا۔ لیکن ساتھ ہی بڑے سلیقے سے، بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے میرے فارمولے میں ایک اور " N " کا اضافہ کردیا۔ یعنی 3R+2N اور اس تئے این کی تشریح کی۔ میں یہ بتادوں کہ وہ اضافہ بلیک بورڈ پر نہیں، میرے دماغ پر کیا گیا تھا۔ اب میں اپنے طلبہ کو علی گڑھ تحریک کی ہئیت ترکیبی کو سمجھانے کے لیے 3R + 2N کا فارمولا پیش کرتا ہوں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے طلبہ کے ذہنوں کی سلیٹ پر بھی اسی نرم روی کے ساتھ نقش بناتی ہوں گی، جو مٹائے نہ مٹتے ہوں گے۔

لئیق صاحبہ سے زیادہ ملاقاتیں ان دنوں ہوئیں جب انھوں نے مجھے بورڈ آف اسٹڈیز کا رکن بنایا۔ یعنی ۹۵ء تا ۹۸ء کے دوران۔ اس بار ان کی شخصیت کے ایک اور پہلو سے واقف ہوا۔ اور ان کے کام کرنے اور کام لینے کے انداز سے بھی۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز میسور کے مختلف پراجکٹس میں کام کرنے کی وجہ سے میں تعلیم اور زبان کے نئے تصورات سے واقف ہوا تھا۔ جب نصابی کمیٹی کا رکن بننے اور تس پر لئیق میڈم کی نگرانی میں کام کرنے کا موقع ملا تو دل جوش سے اور دماغ تصورات سے بھر گیا۔ سوچا کہ سب مل کر موجودہ نصاب و تدریس کے طور طریق میں بہت سی تبدیلیاں لائیں گے۔ سو نصابی کمیٹی نے یہ چند کام اپنے ہاتھ میں لیے :

(۱) کسی ایک جماعت کے لیے نصابی کتاب کی ترتیب۔ (۲) امتحانی پرچوں کی ترتیب میں ترمیم و تبدیلی تاکہ نوٹس کلچر کا خاتمہ ہو۔ (۳) نصاب کی تدوین میں ترمیم تاکہ ہمارا نصاب عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہو اور طالب علم زبان و ادب کے علم کے ساتھ خود روز گار کا اہل بھی ہوجائے جیسے میرا خیال تھا کہ ڈگری کی جماعتوں میں ایک پرچہ Mass comunication کا شامل کیا جائے۔ برادرم جلیل تنویر صاحب کی تجویز تھی کہ محض پرچہ شامل کرنے پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ مارکس میمو میں بھی اس مضمون کا اندراج عمل میں لایا جائے تاکہ طلبہ کو فائدہ پہنچے۔

غرض ان امور پر ذاتی ملاقاتوں میں بحثیں ہوتیں، خطوط میں نکات زیر بحث لائے جاتے اور اتفاق و کثرت سے فیصلے لیے جاتے۔ میڈم نے ہمیں پوری آزادی دے رکھی تھی۔ وہ ہماری باتوں کو غور سے سنتیں۔ کہیں سے بھی یہ احساس نہ ہونے دیتیں کہ وہ صدر شعبہ ہیں، جہاں دیدہ ہیں۔ کبھی مسکرا کر کبھی آنکھوں میں چمک پیدا کر کے ہمیں شہ دیتیں۔ بلکہ ایک آدھ جملہ فقرہ ایسا کہتیں کہ وہ مصرع طرح کا کام کرتا۔ آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ گرم جوشی کی جگہ لئیق صاحبہ کی سرد مہری لے رہی ہے۔ اور بڑھتی جارہی ہے۔ ہمارا سارا کام صرف دو ایک نکات تک ہی سمٹ کر رہ گیا تھا یعنی نصابی کتاب کی ترتیب اور پرچوں کی تدوین میں تبدیلی تک ہی میرے زور دینے پر وہ نظیر مانگتیں کہ کیا ہماری یونیورسٹی میں پہلے کبھی ہوچکا ہے۔ میں جواب دیتا جو چیز پہلی بار متعارف کرائی جارہی ہے اس کی نظیر ماضی سے کہاں سے لائیں۔

ان کے ان تقاضوں سے زچ ہوکر ایک ملاقات میں میں نے کہا، میڈم! آپ نے ایم اے کے نصاب میں، صحافت کے پرچے کی شمولیت کے لیے، بغیر کسی سابقہ نظیر کے، تبدیلی لائی۔ لیکن ڈگری کے نصاب کے لیے جو بھی تجویز پیش کی جاتی ہے تو آپ نظیر مانگتی ہیں۔ یہ رویہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اتنا سننا تھا کہ میڈم کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ چہرے پر درد کا غبار بکھر گیا۔ بات یہ ہے کہ

مجھے بات کرنے کا سلیقہ آج تک نہیں آیا۔ میں اتنی سی بات نہیں جانتا کہ کون سی بات کب، کہاں کتنی اور کیسے کہنی چاہیے۔ اس سے میرا ہی نقصان ہوتا رہا اور میں اسے اپنی نادانی کی سبب حق گوئی سمجھتا رہا ہوں۔

کوئی کیا جانتا کیا چیز کس پر بوجھ ہے بانی
ذرا سی اوس یوں تو سینۂ پتھر پہ رکھی تھی

یہ صورت حال دیکھ میں سٹپٹا گیا۔ پھر انھوں نے درد کو پیتے ہوئے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا:

"خالد صاحب! خدا کرے کہ آپ کو کبھی اختیارات کا موقع نصیب ہو پوری آزادی کی ساتھ آپ کو اپنے طور پر کام کرنے کا موقع ملے۔ میں نے اردو زبان کی بہتری اور شعبے کی نیک نامی کے لئے جو میرے بس میں تھا، کیا اور بس ـــــ" وہ نمناک آنکھیں لیے مسکرا رہی تھیں۔ جیسے بارش میں دھوپ کھل اٹھی ہو۔ میں نادم سا اس برسات میں بھیگتا رہا۔ مجھے بھنک پڑی تھی کہ روایتی ذہنوں نے ہماری تجاویز کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ بات اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ لئیق صاحبہ کو محتاط ہو جانا پڑا۔ اس مخالفت میں کچھ بھڑکنے والے تھے تو کچھ اکسانے والے بھی۔ اور ہم نے رفع شر کی خاطر بہت سی اسکیموں سے دست برداری اختیار کرلی۔ ادھر میں دل ہی دل میں نادم کہ کیا میڈم کے آنسوؤں کی تلافی ممکن ہے۔ لیکن لئیق صاحبہ نہ پھر کبھی یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا لئے اتنی محبتوں سے پیش آیا کرتی ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ مجھے ہی نہیں میرے خاندان والوں کو بھی اپنے ہاں بلاکر دعوتیں دیا کرتی ہیں۔ میری اہلیہ اور میری بچی کے لیے ہمیشہ دعائیں بھیجتی ہیں اور تحائف بھی۔

لئیق صلاح صاحبہ نورالاسلام کمپونڈ کے مکان سے اٹھ کر یونیورسٹی کے فلیٹ میں چلی آئی تھیں۔ یہ فلیٹ بھی مختصر تھا لیکن اس تنگ اور بے ترتیب مکان کے مقابل نہایت صاف ستھرا اور نک سک سے درست تھا۔ ہر شئے سے نفاست جھلکتی ہوئی۔ جانے کیوں مجھے اس بار بھی مکان اور مکین میں مماثلت محسوس ہوئی۔ اگر چہ اس فلیٹ کی (sitting) بیٹھک نہایت مختصر، لیکن شاندان کے دل کی کشادگی اس میں حلول کر گئی کہ تنگی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ یہاں انھوں نے ہماری دعوتیں کیں۔ ویسے بھی لئیق صاحبہ کی مہمان نوازی کافی مشہور ہے۔ یہ تبدیلی صرف مکان ہی میں نہیں، مکین میں بھی چلی آئی تھی ـــــ بالوں میں روکھے پن کی جگہ چمک، آنکھوں میں وحشت کی جگہ اعتماد نے لے لی تھی۔ اور وہ سلیقہ جو ان کے درو دیوار سے ٹپکتا تھا، ان کے حسن انتظام میں چلا آیا تھا۔ اسی لیے یونیورسٹی کے ارباب اقتدار انھیں مختلف ذمے داریاں سونپتے رہے، اور وہ انھیں بخوبی نبھاتی رہیں۔ چاہے وہ یونیورسٹی گرلز ہاسٹل کی وارڈن شپ ہو یا یوتھ فسٹیول میں شریک خواتین کی میزبانی۔ وہ اپنی سلیقہ مندی، تنظیمی منصوبہ بندی، محتاط روی اور کم گوئی کے سبب کامیاب رہیں۔

بہت سوں نے کہا کہ اکیڈیمک کونسل کی میٹنگوں میں، اردو کے مسائل پر بھی وہ خاموش رہ جاتی ہیں۔ ممکن ہے خاموش رہ جاتی ہوں۔ لیکن انھوں نے اپنی خاموشی سے، اپنی ذات کے لیے نہیں، اردو کے کاز کے لیے ایسے ایسے کام نکالے ہیں کہ لوگوں کی بلند گوئی اور دیدہ دلیری کو ان کی خاموشی اور محتاط روی پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ادیب کامل کی سند کو بی اے کے مماثل قرار دلوا کر، ایم اے میں داخلے کے لیے اہل ٹھہرانا، ایم اے کے نصاب میں صحافت اور کمپوٹر کورس کی شمولیت، اور شعبہ اردو کے لیے اپنی مساعی سے اردو کمپوٹر کا حصول وغیرہ۔ دراصل محتاط روی کم سخنی اور نرم گوئی، ان کی شخصیت کی شناخت ہی نہیں ان کے مضبوط ہتھیار بھی ہیں اور ان ہتھیاروں سے نہ صرف وہ اپنا بلکہ اردو کے کاز کا بھی ممکنہ حد تک تحفظ کرتی ہیں۔

میرے ساتھی محمد افتخار الدین، صدر شعبہ اردو، ڈگری کالج ہمنا باد، اکثر مجھے بنانے کے لیے کہتے ہیں کہ اردو کاز کے لیے دیوانگی

اور اردو کے لیے جیب کا پیسہ خرچ کرتے ہوئے دو کو دیکھا ہے ۔ ایک لئیق صلاح اور دوسرے خالد سعید کو، میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ حقیقت کیا ہے، خوش ہوجاتا ہوں۔ زندگی گزارنے کے لیے تھوڑی سی خود فریبی بھی تو ضروری ہے ۔ تو خیر ـــ افتخار کی آدھی بات سے اتفاق کرتا ہوں اور ایک واقعہ عرض کرتا ہوں ـــــ کہ لئیق صاحبہ نے شعبہ اردو کی صدارت کے اپنے آخری دور میں، جامعہ گلبرگہ میں ایک مزاحیہ کانفرنس منعقد کی تھی، جس میں حیدرآباد سے بہت سے مزاح نگار بلائے گئے تھے ۔ اتفاق سے میں بھی ان دنوں گلبرگہ میں موجود تھا۔ مجھے اور امجد کو میڈم نے مدعو کیا ۔ وہ ایک عمدہ کانفرنس تھی۔ عمدہ آرائش، عمدہ حسن انتظام، عمدہ جلسہ، عمدہ طعام، پہلی تین چیزیں تو میری دیدہ ہیں۔ البتہ عمدہ طعام کی تصدیق افتخار نے بعد میں کی، کیوں کہ میں اور امجد چلے آئے تھے ۔ طعام کے معاملے میں افتخار بے حد حساس اور مشتاق واقع ہوئے ہیں اس لیے یقین کیے ہی بنتی ہے ۔

غرض وہ ہر لحاظ سے ایک کامیاب عمدہ کانفرنس تھی ـــ اور بعد میں دوسرے ذرائع سے پتہ چلا کہ یہ ساری عمدگی، میڈم کے عمدہ پرس کے بدولت تھی۔ ورنہ اکثر دیکھا گیا کہ اس طرح کے کانفرنسس اور تقریبات کا بار اکثر طلبہ و طالبات کو اٹھانا پڑتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ ہم نے ہزاروں کو اردو کے نام پر لاکھوں کماتے دیکھا ہے ۔ لیکن اردو کے لیے لٹاتے اور لٹا کر خاموشی اختیار کرتے ہوئے صرف لئیق صلاح کو دیکھا ہے ۔

ہم میں سے اکثر جاہ و منصب کے مشتاق رہتے ہیں، حالانکہ جاہ و منصب کی دیوی بھینٹ مانگتی ہے اور اکثروں نے اپنی خودی یا اجتماعی مقاصد causes کی قربانی دے کر، مقتدر اعلا کی خوشنودی حاصل کرکے، اپنے مفادات کی تکمیل کی ہے اور مزے میں رہے ۔ لئیق صاحبہ کو جاہ و مناصب بھی ملے اور شہرت بھی ۔ لیکن انھوں نے اپنی بھینٹ نہیں چڑھائی ۔ بلکہ اپنی حکمت، اپنی اطاعت، اپنے خلوص، اپنی نرم روی اور اپنی کمائی کے مسترول سے جاہ و منصب کی دیوی کو قابو میں رکھا اور خود کو بھی متوازن بنائے رکھا ۔ اس لیے عہدے سے اترنے کے باوجود بھی، ان کی تعظیم و تحریم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ۔ ورنہ ہم نے ایسوں کو بھی دیکھا ہے کہ جب تک عہدے پر رہے تو لاکھ کے تھے اور عہدے سے اترتے ہی خاک کے ہوئے ۔

میڈم کے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یونیورسٹی نے ان کی ملازمت میں توسیع کی تھی ۔ لہذا وہ شعبہ میں بحیثیت لکچرر برسرکار رہیں ۔ ایک مقتدر کے لیے عہدے سے ہٹ کر، محض ملازم رہنا، بڑا جانکاہ ہوتا ہے ۔ چوں کہ لئیق صاحبہ نے ابتدا ہی سے خود کو متوازن بنائے رکھا تھا، اس لیے وہ کسی Complex کی شکار نہیں ہوئیں ۔ یہ دنیا بڑی دلچسپ ہے ۔ ابھی دنوں شعبہ اردو میں ایک سمینار ہوا ۔ جس میں مجھے بھی خصوصی طور سے مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا، سامعین کی اگلی نشستوں میں لئیق صاحبہ تنہا اور سکون سے بیٹھی ہوئی ہیں۔ مقتدر وقت کی خوشنودی کی خاطر، کچھ حضرات میڈم سے کنی کاٹے پھرا کررہے تھے اور پھرا کرتے تھے ۔

آج وہی ان سے مراسم بڑھانے پر اتاولے ہوئے جارہے ہیں۔ دنیا بڑی دلچسپ ہے اور دنیا والے اس سے بھی زیادہ دلچسپ، سمینار جاری تھا۔ میڈم بڑے انہماک سے ایک ایک کو سن رہی تھیں۔ میں نے خود کو پیاس محسوس کرائی ۔ ڈائس سے اٹھا اور پانی پینے کے لیے باہر چلا آیا۔ لوٹ کر میڈم کی بازو والی نشست پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی ۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اخلاقاً میرا استقبال کیا اور مقالے سننے میں منہمک ہو گئیں۔ میں رہ رہ کر کنکھیوں سے انھیں دیکھتا رہا ۔ وہ سکون سے مضامین سن رہی تھیں۔ اور وہ سکون ہرگز تصنع آمیز نہیں تھا ۔ تب یکایک مجھے برگد کی گھنی چھاؤں کا احساس ہوا ۔ غرض یہ دنیا بڑی دلچسپ ہے اور بڑی دلکش بھی۔ نیرنگیوں کی تیز دھوپ میں برگد کی چھاؤں والے بھی کتنے ہیں۔ کیا یہ دولت کم نہیں ؟ ۔ ☆

●☆●

غزل

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ، بیتیا، بہار

ٹھرّہ پینے سے ہوئی جو کم حرارت خون کی
اوڑھی مرزا کھونچ نے گرمی میں چادر اون کی

یوں نہ اترائیں سسر کے بینک بیلنس پر جناب
آسکی نہ کام جب دولت میاں قارون کی

اب محبت میں نہیں ہے نامہ بر کا کوئی کام
ہے ضرورت عشق میں تو صرف ٹیلی فون کی

جانور کا مارنا بھی جرم ہے قانون میں
اور قیمت کچھ نہیں ہے آدمی کے خون کی

بیٹے کے سسرال سے لو آگئی اے سی مشین
اب ستائیگی مجھے کیا خاک گرمی جون کی

ساس نے میرے لئے سلوایا تھا مرزا کبھی
یاد آتی ہے بڑھاپے میں بھی اس اچکن کی

●☆●

دیش بھگتی گیت

اے وطن اے وطن تجھکو تیری قسم ، اپنی تقدیر تجھ پہ لٹا جاؤں گا
جان دینا تو بس میں نہیں ہے مگر ، تو کہے تو پسینہ بہا جاؤں گا

یہ غریبی ، غریبوں کا رونا سدا ، دیش کے واسطے بدنما داغ ہے
کل جو سونے کی چڑیا سے مشہور تھا ، آج بھی کم نہیں ہے اگر زاغ ہے
یہ غریبی کا دھبہ مٹے نہ مٹے ، میں غریبوں کی ہستی مٹا جاؤں گا
اے وطن اے وطن ....!

یہ کمیشن کا بازار چلتا رہے ، مال کھا کھا کے یہ جی بہلتا رہے
میری کرسی سلامت رہے دوستو ، پینترا لاکھ کوئی بدلتا رہے
یہ کمیشن تو تحفہ ہے رشوت نہیں ، ایسی پٹی میں سب کو پڑھا جاؤں گا
اے وطن اے وطن ....!

یہ حوالہ کہیں اور گھوٹالہ کہیں ، چھوٹی باتیں ہیں ان کی حقیقت نہیں
جو مجھے پیار کرنا نہیں جانتا سمجھو اس کو وطن سے محبت نہیں
پانچ سالوں کا پھر سے جو موقع ملے بیچ کر ساری املاک کھا جاؤں گا
اے وطن اے وطن ....!

مجھ پہ الزام کوئی لگانا نہیں ، جیل کی راہ مجھکو دکھانا نہیں
دیش میرا ہے جو چاہے سو میں کروں دال اپنی یہاں تم گلانا نہیں
ورنہ میں دشمنوں کو سبھی قیمتی راز چپکے سے مرزا بتا جاؤں گا
اے وطن اے وطن ....!

یوسف امتیاز
ٹورانٹو (کینیڈا)

نو پرابلم

یہ نارتھ امریکہ کی روزآنہ بات چیت میں اتنا استعمال ہوتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے لفظ "نو پرابلم" نے غور و فکر کے لئے دروازے کھول دئے ہیں کہ دماغ سن ہونے لگتا ہے اور پھر دماغ کے کسی کونے سے آواز آتی ہے ۔" اس میں پریشان ہونے اور دوران خون کو تیز کرنے سے کیا حاصل ہے ۔ پھر دل جواب دیتا ہے نو پرابلم ۔

نو پرابلم روزانہ بول چال میں اسقدر داخل ہوگیا ہے کہ سوچنا پڑتا ہے اس کے بجائے شکریہ کہنے میں کیا قباحت اور کیا برائی تھی ۔ بلکہ اب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شکریہ کہتا ہے تو دل و دماغ ایک لمحے کے لئے چونک جاتے ہیں ۔ دس میں سے نو بار نو پرابلم ہی سننے کو ملتا ہے ۔ اگر آپ نے بیس ڈالر کا بل کسی کو ریزگاری کے لئے دیا تو پیسے واپس کرنے پر شکریہ کہو تو دوسری طرف سے آواز آتی ہے نو پرابلم ۔ ٹکٹ خریدنے جاؤ تو ٹکٹ دینے والا یا دینے والی شکریہ کا جواب نو پرابلم سے دیتی ہے ۔ ذرا سوچئے تو اگر کسی سے ریزگاری مانگی یا ٹکٹ خریدا تو کیا میں نے زبردستی اس پر کوئی ستم کیا ہے یا اس کو کوئی تکلیف دکھ درد پہنچا ہے جو یہ جواب سننے کو ملتا ہے ۔ اس نو پرابلم کے جواب پر آسانی سے ہر جواب کے لئے ایک محفوظ جوا کھیلا جاسکتا ہے آپ ہر ایسے موقع پر ایک ڈالر کی شرط لگا سکتے ہیں اور آپ کی جیب سے ایک پیسے کا بھی نقصان نہیں ہوگا ۔ اس سے بہتر جوا اور کیا کھیلا جاسکتا ہے اگر کوئی اس تجویز سے متفق نہیں ہے تو آزمائیں اور پھر مجھے بتلائیں کہ میں کہاں تک غلط ہوں ۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ اس کا تجربہ تیس سال سے کم عمر والوں کے ساتھ کریں تو آپ کی کامیابی کا فیصد اور زیادہ بڑھ جائے گا ۔

لیکن آخر اس نو پرابلم کا مطلب کیا ہے ۔ یہ کہاں سے آیا اور ایسا آیا کہ ہماری زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے ۔ کیوں لوگ یو آر ویل کم You Are We!come کہنے سے گریز کرتے ہیں ۔ آخر اس طریقے میں کیا قباحت ہے ۔ ہزار کوشش اور درگزر کرنے کی کوشش کے باوجود یہ سوال بار بار دماغ میں آتا ہے ۔ دل اور دماغ ایک نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان وہی کہتا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو دوسرے پر لاد رہا تھا جس سے دوسرے کو خلل ہوا یا تکلیف پہنچی تب ہی تو انسان کہتا ہے کہ ہزار خلل اور تکلیف کے باوجود آپ کی دخل اندازی نو پرابلم تھی ورنہ وہ ضرور کہتا شکریہ یا یو آر ویلکم ۔ اگر اسکو دوسری طرح دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ... پھر ایکبار تکلیف دے سکتے ہیں مگر اس کے باوجود آپکی حرکت اس کے لئے لائق خیر مقدم آپ پھر ایسا کر سکتے ہیں ۔ نو پرابلم اور یو آر ویل کم بولنے والوں میں فرق ہے ۔ یو آر ویلکم بولنے والے پورے اعتماد اور خوشی کے ساتھ پوچھنے والوں کی پرواہ کرتے ہیں اور انکو پوچھنے والے کا بھرپور پاس ہے اور انہیں تسلی بخش جواب دے کر نہ صرف مسرت ہوئی بلکہ ایک طرح کا اعزاز ملا ۔ یہ ایک باہمی سمجھ بوجھ کا ایک حصہ ہے اور پھر اس کا مطلب یہ بھی ہے یہ آیا کسی کی دخل اندازی ان کے لئے مسئلہ تھی یا نہیں اس کے باوجود انہیں مدد کر کے خوشی ہوئی چاہے اس کے لئے انہیں اپنے راستے سے ہٹ کر کتنے ہی دور کیوں نہ جانا پڑے اور وہ جو نو پرابلم کہتے ہیں ان کے نزدیک تعلقات کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے اور نہ اس کے لئے راستہ ہموار بنے ۔ ان کے لئے باہمی

تعلقات جیسے کوئی چیز ہی نہیں ہے ۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کسی نے کسی کو دعوت میں بلایا اور وہ کسی کے لئے تو نہ صرف باعث اعزاز ہے بلکہ وہ اس کی ساری توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے دوسری طرف کسی کو دعوت میں بلا کر جب جانے والا ساری ہمت، کوششوں کو سراہتے ہوئے شکریہ کہتا ہے تو جواب ملتا ہے نو پرابلم۔ کیا واقعی مہمان میزبان کے لئے پرابلم تھا یا پھر اس کی موجودگی سے کسی قسم کے پرابلم پیدا ہوئے جیسے میزبان مہمان سے کہہ رہا ہے۔ آپ کی موجودگی سے مجھے ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا یہ ایسا ہی جیسے بطخ اپنی پیٹھ سے پانی کو جھٹک دیتی ہے آپ اس کی فکر نہ کریں۔

مگر مہمان کیوں اس پر سوچ کر اپنا وقت ضائع کرے ۔ اس کو فکر کی ضرورت ہی کیا ہے میزبان آپ کو مہمان ہی کیوں بناتا اگر اس کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا۔ نو پرابلم بولنے والا آخر کہنا کیا چاہتا ہے ۔ یہی نا کہ ہم دو الگ الگ شخص ہیں جن کا کوئی بھی باہمی ناطہ یا تعلق نہیں ہے ۔ آپ کے اپنے ذاتی مسئلے ہیں جن کا باہمی اعتماد اور بھروسے سے کوئی تعلق ہے نہ میرے ذاتی مسئلوں سے آپ کا ۔ لیکن ان سب کے جواب میں جب میں اظہار تشکر کے لئے کہتا ہوں شکریہ تو دوسری جانب سے جواب آتا ہے نو پرابلم۔ میرے دماغ میں پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ میں نے تو صرف اظہار تشکر کیا ہے کیا واقعی میں دوسرے کے لئے کوئی مسئلہ تھا۔ اگر تھا تو وہ کیا تھا ؟ ۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آخر اس نو پرابلم کی اتنی شاندار کامیابی کی وجہ کیا ہے ۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے یہ باہمی امداد، دوستی، رابطے کی وہ دیواریں جو قدیم زمانے میں بے حد مضبوط تھیں برلن وال کی طرح ٹوٹ گئی ہیں اور موجودہ دور میں اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ۔ ☆

محمد برہان حسین
100 عرفان ریزیڈنسی
ریڈہلز نارتھ ، حیدرآباد ۴

دوسری عورت کی خوبصورتی

"راموجی راؤ فلم سٹی" میں "گرانیسم مسٹر انڈیا" کا مقابلہ ہوا یہ ایک انوکھا شو تھا ۔ یہ فلم سٹی شہر حیدرآباد کی ٹوپی میں ایک سرخاب کا پر ہے ۔ ان دنوں حیدرآباد، چندرا بابو کے کارناموں اور راموجی راؤ کے سلیقے کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہو رہا ہے ۔
کبھی رستم ہند کے مقابلے ہوتے تھے جن میں گوشت کے پہاڑ قسم کے مرد حصہ لیتے تھے ۔ جن کو لڑا کر خطاب دیا جاتا تھا ۔ یہ مقابلہ خوبصورت مردوں کا تھا ۔ حیرت تو اس بات پر تھی کہ مس انڈیا کے مقابلوں کی طرح اس مقابلہ کو دیکھنے بھی معززین شہر کا ہجوم رہتا تھا ۔ جو آجکل سیٹھ لوگوں اور صنعت کاروں پر مشتمل ہوتا ہے ۔
اس بات کا یقین تھا کہ مردوں کی اکثریت اپنی بیویوں سے اجازت لے کر آئی ہوئی تھی ۔ یوں تو مرد "مس انڈیا" کے مقابلوں کو دیکھنے بیوی کی اجازت کے بغیر جاتے ہیں لیکن "مسٹر انڈیا مقابلہ میں تو مردوں کو دیکھنا تھا اور یہی تو وقت ہوتا ہے بیوی کو چنے کے درخت پر چڑھانے کا ۔ تاکہ وہ اپنی سہلیوں سے کہہ سکے "انون نے میرے سے پوچھ کرہی کھیں جاتے ہیں"
حالانکہ مرد عورتوں سے ایسے ہی "وشواس گھات" کرتے ہیں جیسے عورتیں کرتی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ شکسپیر کا قول ایک طرفہ تھا اور اس نے کہا "عورت تیرا نام بے وفائی ہے"
بے وفا مردوں اور بے وفا عورتوں کا کردار اس مشہور لطیفے سے واضح ہوتا ہے "ایک دن میاں بیوی دوپہر میں بستر پر لیٹے باتیں کر رہے تھے کہ کار کا ہارن ہوا ۔ بیوی نے کہا ارے میرے شوہر آگئے "اور میاں دوڑ کر کھڑکی سے باہر کود گئے "۔
ایک کمپنی نے بہترین بزنس کیا تو بورڈ نے فیصلہ کیا کہ شیرز ہولڈرس جوڑے کو بطور تحفہ کسی بھی "ہل اسٹیشن" کی تفریح کا ایک مکمل ٹور دیا جائے ۔
چنانچہ جب ٹور کر کے شیرز ہولڈرس جوڑے لوٹ آئے تو کمپنی نے مزید خوش کرنے کے لئے ہر شیرز ہولڈر کی بیوی کو خط لکھے کہ ان کا ٹور کیسا رہا ہے ۔
اس کے جواب میں کمپنی کو زیادہ تعداد میں وہ خطوط ملے جن میں بیویوں نے پوچھا تھا "کیسا ٹور؟ ..... "بعض بیویوں نے پوچھا" آپ کو میرے ٹور کا کیسے پتہ چلا "بعض نے پوچھا "میرے بوائے فرینڈ نے تو نہیں بتایا"۔
لیکن چونکہ "گرانیسم مقابلہ" میں ایسی کوئی بات نہ تھی بلکہ شراب و کباب تک ممنوع تھا اس لئے مرزا صاحب کے لڑکے یعنی مرزا جونیر نے اپنا دعوت نامہ والدین اور بیوی کو دیدیا ۔
فلم سٹی رنگ و نور کا "رنگ" رہا تھا ۔ بڑے بڑے سیٹھ لوگ لمبی لمبی اور نئے ماڈل اور مرزا جیسے لوگ، پرانی ماڈل کی گاڑیوں میں آئے تھے ۔ لیکن راموجی راؤ نے "محمود و ایاز" کو ایک ہی بس میں سوار کرا دیا تھا جو مدعوئین کو سٹی کے اندر لے جاتی تھی ۔ "ایک ہی

بس میں سوار ہوگئے محمود و ایاز"

حیدرآباد کے رہنے والے اندھیری عمارتوں اور اندھیری سڑکوں کے عادی ہیں ان کو "گرا سیم مقابلہ" کی چکاچوند کرنے والی روشنی پریشان کردیتی ہے اور وہ آزادی سے پہلے کی روشنی کو دیکھ کر کہتے ہیں "پرانے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے"

مرزا اپنے دوست سیٹھ چمن داس کے ساتھ گئے تھے اس لئے آگے کی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ سر گھٹاتے ہی اولے پڑے ـــ یعنی ان کے بیٹھتے ہی ایک حسینہ نہایت قابل اعتراض کٹ کے کپڑے پہنے ہوئے چمن داس کے بازو آبیٹھی اور چمن داس کو "بلو پارک" سے مخاطب کیا اور مرزا کی طرف پلٹ کر کہا "ہلو! میں سمن خان ہوں پاپ سنگر"

چمن داس نے مرزا کا تعارف کرایا "یہ مرزا ہیں میرے لنگوٹیا یار ـــ اب تم ان کو "انڈر دیر" یار مت کہنا یہ عورتوں سے پردہ کرتے ہیں۔ مرزا اپنی جگہ سے اٹھے اور دور جا بیٹھے۔ سمن خان نے چمن داس سے پوچھا "شاید بیوی سے بہت ڈرتا ہے"

چمن داس نے کہا "کہ کر آیا۔ لیکن ویڈیو کیمرہ سے ڈرتا ہے ـــــ"

دراصل مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کے کندھوں پر دو فرشتے اسکے اعمال لکھ رہے ہیں اسی طرح یہ ویڈیو گرافر اپنے کندھوں پر کیمرہ رکھے ہمارے اعمال ریکارڈ کرتے ہیں۔ اب یہ پروگرام کئی بار ٹی وی پر دکھایا جائے گا اس سے وہ پریشان ہے۔

ہم لوگ چھپ کر گناہ کرنے میں مزہ لیتے ہیں۔ ویسے بھی ویڈیو گرافروں نے شرفاء کو ہر جگہ پریشان کر رکھا ہے دعوتوں میں جاؤ تو کسی شریف آدمی کی پوری مرغی کو پلٹ میں گھسیٹ لینے کے عمل کو فوٹوگراف کرلیتے ہیں۔ بریانی کا گوشت سمیٹ لو تو اسکا ویڈیو۔ امریکہ اور سعودی عرب تک پہنچ جاتا ہے"۔

سمن خان نے کہا "ارے تم نے سچ کہا۔ میرا ویڈیو گراف دیکھ کر میرا شوہر حیران ہوکر کہتا ہے۔ ارے تم میں یہ بھی ہے"۔

مرزا نے آہ بھر کر کہا "پکڑے جاتے ہیں ویڈیو گرافی سے ناحق"

سمن خان کو ڈانس پر بلالیا گیا تو مرزا پھر چمن داس کے پاس آبیٹھے اور کہا "اُفوہ اس عورت کے میک اپ اور خوشبو کا اثر ابھی تک ہے"

چمن داس نے کہا "اسی لئے تو فلم صاحب بی بی غلام" میں بی بی۔ نواب کو طوائف کے مقابلہ میں متاثر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ ان کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے مرزا"۔

پتہ نہیں سمن خان کدھر سے آئی اور مرزا پر جھک کر کہا "مرزا صاحب! اصل ویڈیو کیمرہ تو ادھر ڈانس کے پاس لگا ہے جو سب کچھ LIVE (راست) ٹی وی پر دکھارہا ہے۔ اب آپ کا میرا یہ پوز آپ کے گھر والے دیکھ رہے ہونگے"۔

اچھا۔ خدا حافظ۔ بلکہ اب آپ کا خدا ہی حافظ ہے" اور دیکھئے ویڈیو کیمرہ سے پرے رنگ چمن، جوش بہار"۔

منشی فیاض علی۔ نے مشہور رومانی ناول "انور" میں لکھا تھا دنیا میں بہت سے برے کام بڑی اچھی نیت سے کئے جاتے ہیں اور کئی اچھے کام برے لوگ کرجاتے ہیں۔ بعض مرد اوباش ہوتے ہوئے اپنی بیویوں کو اپنی معصومیت سے متاثر کرلیتے ہیں اسی لئے تو شاعر نے کہا ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

●☆●

سگ لیلیٰ (پندرہویں قسط)

پرویز ید اللہ مہدی

لیلیٰ بھی "مس ورلڈ" تھی

جس وقت ہم دوبارہ سیکس ٹری صاحبہ کے ہاں پہنچے، تب وہ ٹیپ ریکارڈر پر اپنے پیارے پیارے کتے کی خونخوار چیخ و پکار سے محظوظ ہو رہی تھیں، ہمیں دیکھتے ہی ریکارڈر کا سوئچ آف کر دیا اور مسکرا کر پوچھا: تمہارا کام بن گیا ؟ ۔

"بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے" ہم نے چاپلوسانہ لہجے میں کہا ۔۔ اگر آپ کی تھوڑی سی مہربانی اور ہو جائے تو پھر میرا بیڑہ پوری طرح پار سمجھیے ۔۔!! "

مسکرا کر بولیں: "بولو فٹافٹ، میں تمہارے لیے اور کیا کر سکتی ۔ ؟"

"آج رات ڈھلنے سے پہلے پہلے میں ڈاکٹر صاحب کو آؤٹ ڈور وزٹ پر لے جانا چاہتا ہوں ۔۔" ہماری اس گزارش پر محترمہ نے اپنی مہربان نظریں ہمارے چہرے کی طرف سے ہٹا کر ڈسک کیلنڈر پر مرکوز کر دیں پھر کچھ توقف کے بعد چٹکی بجا کر بولیں ۔۔ تم دنیا کا سب سے لکی (lucky) آدمی ہے آج اوپر والا تمہارے اوپر بہت مہربان لگتا ۔ ابھی تھوڑا دیر میں ڈاکٹر پولیس کمشنر کے کتے کو تپاسنے (دیکھنے) کے واسطے اسکے گھر کو جانے والا ہے تم ڈاکٹر کا ساتھ میں نکل لینے کا اور راستے میں اپنا کام پٹا لینے کا ۔! " سکیس ٹری صاحبہ کی اس مہربانی کے جواب میں ظاہر ہے ہم نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا اور ڈاکٹر صاحب کی فیس بھی ادا کی اور چلتے چلتے محترمہ سے آخری ٹپ، کے طور پر پوچھا: آپ کے خیال سے ڈاکٹر صاحب کے نکلنے کا انتظار کہاں کرنا مناسب ہو گا ۔ یہاں یا باہر گیٹ کے پاس ۔۔ ؟

جواب ملا ۔ "ڈاکٹر صاحب کی جیپ باہر گارڈن کے باجو میں پارک ہے ۔ تم ادھر میں گارڈن میں بیٹھ کے ان کا ویٹ کرو کلٹے کو بولے گا تو ڈاکٹر تھوڑا Absent Minded بھلکڑ تم کو چھوڑ کے نکل گیا تو تمہارا کام کھوٹی ہو جائے گا نا ۔"

"بہت بہت شکریہ ۔ بڑی بڑی نوازش یہ کہتے ہوئے ہم جانے کے لیے پلٹے ہی تھے کہ محترمہ نے اچانک سوال کیا ۔ ایک منٹ تم نے اپنا ڈاگی (Doggy) کے بارے میں ہم کو کچھ نہیں بتایا وہ کیسا ہے ۔ اس کا کاسٹ کیا ہے کلر کیسا ہے انگلش ہے کہ جرمن، اٹالین ہے کہ امریکن، افریقین ہے کہ رشین ۔۔ " محترمہ کا یہ اچانک سوال بڑا بھیانک تھا بنا سوچے سمجھے جواب دینے سے ہماری پول کھل سکتی تھی، ہماری بنی بنائی ساکھ ان کی نظروں میں گر سکتی تھی لہذا بڑی ہشیاری کی ضرورت تھی ڈپلومیٹک، قسم کا جواب ہی ہماری ساکھ اور لاج دونوں کو بچا سکتا تھا، چنانچہ ہم نے کسی سیاسی اور ابن الوقت لیڈر کی طرح بولنا شروع کیا ۔ کتوں کے تعلق سے میرا جو نظریہ ہے اسے سمجھنے کے لیے لیلیٰ مجنوں کی محبت کو سمجھنا ضروری ہے جیسا کہ آپ کو علم ہو گا لیلیٰ اسم بامسمیٰ تھی ۔ "

محترمہ نے فوراً ہماری بات کاٹتے ہوئے حیرت سے پوچھا: "کیا ۔۔ ؟ کیا بولا: کس کی مس اماں تھی ۔ ؟

ہم نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی: " نہ اماں نہ مس اماں مسمیٰ' ، اسم بامسمیٰ یعنی کہ جیسا نام ویسی شکل صورت ویسا ہی رنگ روپ، عربی زبان میں لیل کہتے ہیں رات کو اور رات کالی اور سیاہ ہوتی ہے اور لیلیٰ سچ مچ رات کی طرح کالی یعنی ڈارک (Dark) تھی لیکن مجنوں کی نظر میں وہ دنیا کی حسین ترین عورت تھی بیوٹی کوئین تھی ۔ مس ورلڈ تھی مس یونیورس تھی کیونکہ مجنوں لیلیٰ کو ہمیشہ

محبت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا اور محبت کی نظر میں وہ تاثیر ہوتی ہے جو رنگ، نسل مذہب زبان امیری غریبی ہر فرق کو مٹا دیتی ہے، محبت کی نظروں میں محبوب صرف محبوب ہوتا ہے یہی حال میرا بھی ہے انسان ہو یا کتا میں کسی کو ذات پات کے خانے میں نہیں بانٹتا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں ــــ ہماری اس بھاشن بازی کے دوران سیکس ٹری صاحبہ تصویر حیرت بنی مبہوت نظروں سے ہماری طرف دیکھتی رہیں اور جیسے ہی ہمارا بھاشن ختم ہوا۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاکر بولیں ــ واہ واہ واہ کتا لوگ کا واسطے تمہارا دل کے اندر اتنا اچھا اچھا خیال، اتنا اچھا بات ہوئیں گا میرے کو معلوم نئیں تھا، تم بھی میرا مافک سٹی ڈاگ لورز سوسائٹی City Dog Lovers Society کا ضرور ممبر ہوئیں گا؟ ــ

جواب میں ہم نے انکار میں سرہلایا تو بولیں: "کوئی بات نئیں، میں تم کو ممبر بنائے گی بلکہ سٹی ڈاگ لورز سوسائٹی کا پریسڈنٹ بھی بنائے گی ایک دن" ــ

اتنا کہہ کر محترمہ نے اپنے میز کی دراز سے کاغذات کا پلندہ نکالا اور اسے ہمارے حوالے کرتے ہوئے بولیں: "یہ ڈاگ لورز سوسائٹی کا ممبر شپ فارم ہے اور اس کا ساتھ میں یہ بک لیٹ (Booklet) "اس میں سوسائٹی کا لٹریچر بھی ہے اور کتا لوگ کا بارے میں ان شارٹ (In Short) بہت کام کا ٹپس (Tips) بھی ہے اسکو پڑھے گا تو کتا لوگ کا بارے میں تمہارا جنرل نالج ایک دم بڑھے گا" ــ

محترمہ کی لفاظی صاف اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ یہ سوسائٹی بھی ان نام نہاد سوسائٹیوں میں سے ایک تھی جو بڑے لوگ یتیموں، بیواؤں، محتاجوں، چرندوں، پرندوں درندوں کی فلاح و بہبود کے نام پر چلاتے، چندے جمع کرتے اور خود مع اہل و عیال کے عیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے اس اندیشے کے ازالے کے لئے محترمہ سے سوسائٹی ہذا کی ممبر شپ کے بارے میں پوچھا تو بولیں: ہماری سوسائٹی کی کوئی ممبر شپ فیس نئیں ہے، جس کو جو دینے کا "ڈونیشن" میں دے سکتا" ــ

ہمیں تو بچنے کا بہانہ چاہیئے تھا فوراً معروضہ پیش کیا میں ضرور ایسے نیک کام میں حصہ لوں گا، ممبر شپ کے فارم کے ساتھ ہی چیک بھی سوسائٹی کے پتے پر پوسٹ کر دوں گا۔ اچھا تو اجازت بائی بائی" ۔ یہ کہتے ہوئے ہم وہاں سے رخصت ہوگئے ــ

سوسائٹی کا ممبر شپ فارم اور بک لیٹ عرف کتابچہ لے کر ڈسپنسری کے بغیچے میں پہنچ کر ہم نے ایک ایسی سنگ مرمر کی بنچ منتخب کر کے اس پر اپنی نشست جمالی جس کے روبرو ڈاکٹر ڈی ڈی کتا والا کی جیپ کار کھڑی تھی۔ ممبر شپ فارم ویسا ہی تھا جیسے کہ اس قسم کے فارم ہوا کرتے ہیں چنانچہ ہم نے سوسائٹی کے کتابچے کا بہ نظر غائر مطالعہ فرمانا شروع کیا، تھوڑے سے مطالعہ ہی سے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ اس میں سوائے کتوں کی قصیدہ خوانی کے کچھ نہیں ہے اور جس طرح محاورۃ "کوزے میں سمندر کو سمویا جاتا ہے" اسی طرح مذکورہ کتابچے میں ذات ذات اور بھانت بھانت کے کتوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس حوالے سے بالخصوص جو لب لباب ہمارے ہاتھ لگا وہ یہ تھا کہ کتوں کی صحبت کا بنی نوع انسان پر اور انسان کی سنگت کا کتوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ ہر دو میں ایک دوسرے کی خصلتیں اور عادتیں غیر محسوس طور پر منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ جو بات ہمیں اس کتابچے میں سب سے زیادہ دلچسپ لگی وہ انسانوں کی طرح کتوں میں بھی پائی جانے والی طبقاتی درجہ بندی کی تفصیل تھی جسے مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی مثلاً:

* مزدور کے گھر کا کتا، مزدور ہی کی طرح ننگا بھوکا پریشان حال، مریل اور بیمار ہوتا ہے ــ
* سرمایہ دار کا کتا بھی سرمایہ دار ہی کی طرح فربہ، صحت مند، خونخوار، خود غرض استحصال پسند اور اذیت کوش ہوتا ہے ــ

* سیاسی شخصیتوں کے کتے جھوٹے دروغ گو، مکار، مطلب پرست، مکرو فریب میں ماہر ہوتے ہیں۔ اور اپنے مطلب پرست آقاؤں عرف نیتاؤں کی طرح، تین سال یا پانچ سال میں صرف چند دنوں کے لئے علاقے کے عوام کو اپنی صورت دکھاتے اور پھر روپوش ہوجاتے ہیں۔

* فلمی ہستیوں کے کتے بھی فلمی ہوتے ہیں یعنی ایکٹنگ کرنے میں ایکسپرٹ ہوتے ہیں۔

* شاعر کے گھر کا کتا "بحر" میں روتا اور وزن میں بھونکتا ہے۔ جس طرح شاعر بے چارہ روٹی نہ ملے تو صرف "داد" پر گزارہ کرلیتا ہے اسی طرح شاعر کا کتا بھی ہڈی نہ ملے تو "پچکار" پر گزارہ کرلیتا ہے۔

* سیٹھ ساہوکار کے گھر کا کتا گزارہ اڑدس پڑوس کے گھروں کے بچے کچے پر کرتا ہے لیکن نگرانی مالک کے گھر کی کرتا ہے۔

ہم مذکورہ کتابچے کے مطالعے میں مشغول تھے کہ اچانک ڈسپنسری ہذا کے فلمی طوطے عرف وارڈ بوائے کی آواز ہماری سماعت سے ٹکرائی اس وقت اس کے لبوں پر یہ گانا تھا:

کوئی جب راہ نہ پائے میرے سنگ آئے
کہ پگ پگ دیپ جلائے، میری دوستی، میرا پیار

میری دوستی، میرا پیار

ہم نے نظر اٹھاکر دیکھا تو وہ فلمی طوطا جس طرح پہلی بار اچانک ملا تھا پھر اچانک غائب ہوا تھا اسی طرح پھر اچانک پورٹیکو سے ہوتا ہوا ہماری طرف چلا آرہا تھا جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا ہم نے پوچھا: "میاں تم آدمی ہو یا چھلاوہ، کبھی حاضر، کبھی غائب، یہ کیا چکر ہے ؟"

مسکرا کر بولا: "اپنی ڈیوٹی ہی ایسی ہے، آدمیوں پہ جنوروں پہ سب پہ نظر رکھنا پڑتا"۔

ہم نے اسے تعریف کے جھاڑ پہ چڑھانے کے لئے کہا: "بڑی سخت ڈیوٹی ہے میاں تمہاری"

بے پروا لہجے میں بولا: "اپن شروع سے سخت ڈیوٹی کرنے کے عادی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی نوکری پکڑنے سے پہلے میں بلدیہ کے کتے پکڑنے والے "اسکوائیڈ" میں ملازم تھا"۔

ہم نے فوراً لقمہ دیا: "مطلب آپ شروع سے کتا کشی میں مبتلا ہیں"۔

ہماری چوٹ کو نظر انداز کر کے ہمارے ہاتھ میں تھمے کتابچے کی طرف اشارہ کر کے اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا آپ کو بھی یہ "کتُا بچہ" پکڑا دی سوزی !!"۔

ہم نے فوراً تصحیح کی: "کتُا بچہ" نہیں میاں یہ کتابچہ ہے... کتابچہ...."

اس نے فی الفور جواب دیا "میرے کو معلوم ہے حضت! تھوڑا بہت پڑھا لکھا میں بھی ہوں، کتابچہ بولے تو "بک لٹ"۔ مگر اس کو کتُا بچہ اس واسطے بول رؤں اس میں فقط کتوں کے بارے میں لکھا ہے۔ خیر یہ آپ کے ہاتھ میں پکڑا کے اُنے سوزی توڑی کتے کی کری ؟"

ہم نے سچائی اگل دی.... "فی الحال تو فری میں ملا ہے۔ یہ فارما بک لیٹ...."

اس نے بھٹاک سے لقمہ دیا: "مطلب فی الحال دانہ ڈالی ہے انے، وقت آنے پہ کاٹیں گی آپ کو اور یہ بھی تیں پوچھیں گی:

مار دیا کہ چھوڑ دیا جائے
بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے

جیسے ہی گانے کا ٹکڑا پورا ہوا اس نے تحت اللفظ میں بات آگے بڑھائی ۔ "ویسے آپس کی بات ہے آپ کو ہشیار کردینا میرا فرض ہے ،یہ سوسائٹی کا شوشہ آپ کو معلوم کس کے دماغ کی اپج ہے "
"کس کے دماغ کی اپج ہے ؟" ہم نے متحیر لہجے میں پوچھا۔
رازدارانہ لہجے میں بولا: "سوزی کے شرپسند دماغ کا فتنہ ہے یہ! اور اس کتا چھاپ سوسائٹی کا کرتا دھرتا کون ہے آپ کو معلوم" ۔
ہم نے جواباً نفی میں گردن ہلائی تو بولا۔
سوزی کا باپ: باپ سوسائٹی چلاتا اور بیٹی گراکوں کو پھنساتی ،فیملی ،بزنس، سمجھو آپ ۔
ہم نے حیرت سے کہا: صورت سے اتنی بھولی اور اندر سے اتنی گہری" ۔
فلمی طوطا فوراً بولا: "بالکل اوپر سے کچھ اندر سے کچھ یعنی کہ:

یہ دنیا گول ہے اوپر سے خول ہے
اندر جو دیکھو پیارے سب کچھ پولم پول ہے

●☆●

کوثر صدیقی
(بھوپال)

غزل

عاشقوں کی یونین سے تم کو ڈرنا چاہیے
کم سے کم موڑ سے نیچے تو اترنا چاہیے

اک میلا سنگھٹن نے کی یہ ہے یہ تجویز پاس
پیٹ کر بیلن سے تھالی شور کرنا چاہیے

مل گیا داماد پھوکٹ میں تو اترانے لگا
ایک ٹی وی کی سسر سے مانگ کرنا چاہیے

مفت میں دیتا نہیں ہے ووٹ کوئی آج کل
کچھ کو ادھار کچھ کو پوا پیش کرنا چاہیے

آج جب اردو زباں کا ماسٹر کوئی نہیں
شاعری چارا سمجھ کر خوب چرنا چاہیے

ہندی مزاح

رویندر پانڈے
ترجمہ: سید شہروز قمر
سعادت پور، دہلی

ایمانداری وہی بھلی

میں اپنا ایمان بیچنا چاہتا ہوں۔ لیکن کوئی خریدار نہیں ملتا۔ ایمان کیا، غریب کی عزت بھی بکے تو واجب دام نہیں ملتا۔ عالم کہتے ہیں، غریبوں کا نہ کوئی ایمان ہوتا ہے، نہ عزت۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ غریب کی عزت کے خریدار نہیں ہوتے۔ جو ہوتے ہیں، کوڑے کے بھاؤ خریدتے ہیں۔ میں جس شہر میں رہتا ہوں، وہاں پانچ روپیئے کے دو سموسے بھی نہیں ملتے پر پانچ روپیئے میں غریب کی عزت مل جاتی ہے۔ پھر غریب کو یہ بھی سننے کو ملتا ہے "پیسہ، طوائف بھی کماتی ہے"۔ یہ بات کچھ ایسے کہی جاتی ہے جیسے طوائف سوز بینک میں کھاتہ کھلوالیتی ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ پیسہ تو نیتا بھی کماتے ہیں یا تشدد پسند بھی کماتے ہیں یا سیٹھ بھی کماتے ہیں۔

تو برادر! میرا ایمان بھی نہیں بک رہا ہے۔ کئی بار تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، میرے پاس ایمان ہے ہی نہیں۔ جانے کتنے لوگ ایمان بیچ کر کیا سے کیا بن گئے! مگر میں؟ کیسے کہوں کہ میں ایماندار ہوں۔ میرا ایمان کسی کام کا نہیں۔ ایمان وہی اچھا جو اونچی قیمتوں پر بک سکے۔ پولیس کمشنر کا ایمان ایک حوالدار کے ایمان سے سو۔۰۰ گنا بہتر ہوتا ہے۔

مجھے لگتا ہے، کوئی آدمی جنم سے ایماندار نہیں ہوتا۔ ایمان بھی کمانا پڑتا ہے۔ لوگ مختلف طریقوں سے ایمان کماتے ہیں۔ سبھی کے اپنے طریقے ہیں۔ پھر اسے بیچ کر روپیہ کماتے ہیں۔ روپیہ ایمان سے بڑی چیز ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سنا کہ فلاں رکشہ والا بہت ایماندار ہے۔ یہ اکثر سنتا ہوں کہ فلاں افسر بڑا ایماندار ہے۔ رکشہ والے ایمان بھی نہیں کما پائے۔ افسر کمالیتے ہیں۔

گو میرا ایمان نہیں بک پاتا لیکن ایمان بیچنے میں کامیاب اور عقلمند لوگوں کے لئے میرے دل میں عزت و احترام کا جذبہ موجود ہے۔ ایسے کامیاب ایمان فروش سچ سچ مجھ جیسے ایماندار سے بہتر ہیں۔ پھر مجھ جیسے ایماندار کی دال۔ روٹی بھی ان ہی بے ایمانوں کے بھروسے پہ چلتی ہے۔ مجھے بے ایمانی کا موقع نہیں ملتا، تو اپنی ایماندار قسم کی بے ایمانی سے بے ایمانوں کا مذاق اڑانے لگتا ہوں۔ میں دھندا کرتا ہوں مذاق اڑانے کا۔ بڑے بڑے بے ایمانوں کا مذاق اڑاتا رہتا ہوں۔ نشتر طنز چھوڑتا رہتا ہوں ان پر ایسا میں ایمانداری یا قومیت جیسی کسی چیز کی وجہ سے نہیں کرتا۔ اپنی عادت کے سبب کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، میرے نشترِ طنز سے بے ایمانوں کا کچھ نہیں بگڑے گا، میرا ضرور کچھ بن جائے گا۔ میں جتنے بے ایمانوں کو کوسوں گا، اتنا ہی ایمان میرے کھاتہ میں جمع ہوگا۔ میں زیادہ سے زیادہ ایمان بٹورنے کے فراق میں ہوں۔

ایمان بیچنے کے لیے اپنی روح کو ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک روح زندہ رہے گی، ایمان کو بکنے نہیں دے گی۔ اندر سے کہتی رہے گی، "بے ایمانی کروگے تو مرنے کے بعد جہنم میں جاؤگے"۔ ذی ہوش روح کی نہیں وقت کی آواز سنتے ہیں۔ وقت کی پکار ہے، بے ایمان تو مرنے کے بعد جہنم میں جاتے ہیں، ایمان والے جیتے جی جہنم بھوگتے رہتے ہیں۔ ایمان بیچنے والے وقت کی پکار سنتے ہیں اور اپنی روح کو سپرد خاک کر ڈالتے ہیں۔ ویسے روح کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے "روح کو نہ اسلحے کاٹ سکتے ہیں، نہ آتش جلا سکتی ہے، نہ پانی ڈبو سکتا ہے، نہ ہوا سکھا سکتی ہے"۔ لیکن یہ کتابی قول آج کی روحوں پر عائد نہیں ہوتے۔ ایسی روحیں مہابھارت کے

زمانے میں ہوتی ہوں گی۔ آج کی روحوں کو بڑے مزے سے ، کاغذ کے جوتے (چاندی کے جوتے کی ضرورت نہیں ہے) سے ختم کیا جاسکتا ہے۔

آج کا سمجھدار انسان اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جسم میں روح سب سے فالتو چیز ہے۔ یہ روح ہمیشہ انسان کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے۔ اس لیے ہر سمجھدار انسان اپنی روح کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ لیکن چاہ کر بھی سبھی اپنی روح کو نہیں مار پاتے جیسے میں۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ اپنی روح کا گلا گھونٹ دوں۔ مگر مجھے موقع نہیں ملتا۔ یہاں میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجبوری کا نام مہاتما گاندھی ہے۔ لیکن میں ایسا بھی نہیں کہونگا، کیونکہ مہاتما گاندھی مجبور نہیں تھے۔ میں تو سچ مچ مجبور ہوں اور موقع کی تلاش میں ہوں۔ موقع ملتے ہی میں اپنی روح کو بھی ماردوں گا اور ایمان کو بھی بیچ ڈالوں گا۔ ☆

غزل

شاہد عدیلی

خاص بولی ہے کیا یہ کوئی آپ کی
کیا لگائی ہے رٹ آپ کی آپ کی

قرض کا بوجھ کچھ اس قدر بڑھ گیا
کھل رہی ہے یہ چھپا کلی آپ کی

آپ رکھیں گے گر افسروں پر نظر
چھوٹ جائے گی یہ نوکری آپ کی

دونوں کندھوں پہ دو پوترے ہیں سوار
رنگ لائی ہے دادا گری آپ کی

ہاں میں ہاں ہر کسی کے ملاتے ہیں آپ
ہے یہ عادت بہت ہی بری آپ کی

چند بستی کے گھر تو جلیں گے ضرور
چل پڑے گی مگر لیڈری آپ کی

میری بیوی نے دی گڑگڑا کے دعا
شاعری چھوٹ جائے سڑی آپ کی

بات کرتے نہیں سیدھے منہ سے کبھی
ہے طبیعت ہی کیا چڑچڑی آپ کی

نثر میں نظم کہنے کا ہے یہ صلہ
شاعری ہوگئی کھوکھلی آپ کی

ان فرشتوں کو شاہد دعا دیجئے
جو اٹھائے رہے پوٹلی آپ کی

مختار احسن انصاری
۳۰۳/بی-۱۳-الحطیم-
ملت نگر-ممبئی ۴۰۰۰۵۳

غالب چچا ۔۔۔ موبائیل پر

اللہ ہی جانے ذہن کس کے خیال میں گم تھا۔ شعر کہنے کا موڈ تھا یا کسی کیس کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ بے خیالی میں آخری کے پانچ نمبر دوبارہ ڈائل کر دیئے اور موبائیل کان سے لگالیا۔ دس کی بجائے پندرہ نمبر ڈائل کرنے کے باجود ادھر بیل بجنے لگی اور پھر چند ہی لمحوں میں "ہلو" کی آواز سنائی دی۔ ہمیں پندرہ نمبر گھمانے کا احساس ہوچکا تھا اسی لئے تعجب ہوا کہ زائد نمبر گھمانے کے باوجود یہ کس کا نمبر لگ گیا۔ ہم نے پوچھا: "جناب آپ کون صاحب بول رہے ہیں"۔

باوقار آواز میں جواب ملا: "ہم مرزا اسد اللہ خان غالب ہیں۔ آپ کون صاحب ہیں کہاں سے بول رہے ہیں"۔
سوال سن کر ہم نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ عروس البلاد ممبئی کے ملت نگر سے بول رہے ہیں۔ لیکن غالب صاحب آپ اس وقت کہاں ہیں؟"

جواب ..... ملا ..... جناب فی الحال ہم عالم بالا میں تشریف فرما ہیں۔ ذرا یہ بتایئے آپ کو ہمارا موبائیل نمبر کہاں سے مل گیا؟
ہم نے واقعہ بیان کیا تو چچا غالب خوب ہنسے اور کہا: "عجیب اتفاق ہے۔ دراصل آپ کا سیٹیلائیٹ عالم بالا سے قریب ہے شاید یہی وجہ ہے جو پندرہ آنکڑوں نے آپ کو ہم سے ملادیا۔"

ہم نے نہایت ادب سے دریافت کیا: "چچا جان! یہ موبائیل آپ کے پاس کہاں سے آگیا؟"۔
غالب صاحب نے انکشاف کیا: "میاں، دنیا کے سارے سائنس داں، قیامت کی آمد تک جو جو چیزیں ایجاد کریں گے وہ سب یہاں عالم بالا میں بکھری پڑی ہیں۔ جانتے ہو ہماری شیروانی اور کرتے کا ہر بٹن موبائیل ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر کا کام کرتا ہے۔ جس کسی سے ملاقات کرنی ہو۔ بس ذرا گردن گھمائی دیکھ لی ۔۔۔"

ہم نے پوچھا: "چچا جان! نئے اشعار یاد رکھنے کے لئے کیا اب بھی شلوار کے ناڑے میں گانٹھ لگانی پڑتی ہے؟
ہنستے ہوئے جواب دیا: "ارے نہیں میاں! اب تو ہمارا ناڑا ٹیپ کا کام کرتا ہے، ہم نے شعر گنگنایا اور ٹیپ ہوگیا ۔۔۔"
پھر غالب چچا نے تشویشناک انداز میں دریافت کیا: "اچھا یہ تو بتاؤ ہمارا دیوان محفوظ ہے یا نہیں؟ اور لوگ ہمارے اشعار کا مفہوم سمجھنے لگے ہیں ۔۔۔ یا اشعار کی تشریح و تفسیر کے لئے ہمیں عالم بالا سے دنیا میں واپس آنا ہوگا ۔۔۔"
ہم نے کہا: "چچا جان مبارک ہو، آپ کے کلام کو تقریباً الہام کا سا درجہ حاصل ہوچکا ہے۔ ہندوستان میں دو کتابیں الہامی گردانی جانے لگی ہیں۔ ایک تو وید دوسری کلام غالب یعنی آپ کا دیوان۔ پوتر وید کی تشریح اور تفسیر تو ممکن ہوچکی ہے البتہ آپ کے کلام پر شب و روز تحقیقی کام ہورہا ہے۔ ہر شعر کے کئی کئی مفہوم نکالے جارہے ہیں "غالبیات" کے نام سے ادب میں ایک نئی صنف وجود میں آچکی ہے۔ آپ کے شعروں کو سمجھنے کے لئے کئی "فرہنگ غالب" اور "لغات غالب" شائع ہوچکے ہیں۔ نقادان فن کے لئے

غالب شناسی باعث فخر قرار دی جاتی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ناشناسانِ فن بھی غالب شناس ہونے کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور " ماہر غالبیات " کا خطاب حاصل کرلینا " سر " " لارڈ " اور " پدم بھوشن " کے خطاب سے کم نہیں سمجھا جاتا ۔ "

قطع کلامی کی معافی چاہتے ہوئے غالب چچا نے کہا : " ہاں بھائی ، گذشتہ دنوں اتفاق سے امتیاز علی عرشی ، قاضی عبدالودود ، فرمان فتح پوری ، مالک رام وغیرہ یہاں عالم بالا میں ہم سے ٹکرا گئے ۔ اور دست بوسی کے بعد ہمیں بتایا کہ ہماری بدولت یہ حضرات بھی ادب میں ایک خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔۔۔ " پھر پوچھا ۔۔۔ " ذرا یہ تو بتایئے کہ ماہر غالبیات ہونے کی سعادت اور کن کن صاحبان کو حاصل ہوئی ہے ۔۔۔ ؟

ہم نے کہا ۔۔۔ " شاید ہی کوئی نقاد ہو جو اپنے آپ کو ماہر غالبیات نہ سمجھتا ہو ، لیکن شہرت جنہیں حاصل ہوئی ہے ان میں کالی داس گپتا رضا ، رشید حسن خان ، ڈاکٹر سلیم اختر ، خلیق انجم ، ڈاکٹر قدرت نقوی وغیرہ ہیں ۔

غالب چچا کو جیسے اچانک کچھ یاد آگیا ۔ ہم سے پوچھا : " میاں ذرا یہ بتاؤ ہمارے مکان کا کیا حال ہے ؟

ہم نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا : " خدا کا شکر ہے ، مرکزی حکومت نے ابھی حال ہی میں آپ کی حویلی کو قومی یادگار قرار دیا ہے ۔ برسوں پہلے آپ کے نام سے غالب اکیڈیمی قائم ہوچکی ہے جس کے زیر اہتمام سال میں دو چار مرتبہ سمینار ، جلسے اور مشاعرے ہوتے رہے ہیں اور عہدہ داران اکیڈیمی اپنے دوستوں ، رشتہ داروں اور واقف کاروں کو مقالے اور مشاعرے پڑھنے کے لئے بلواتے ہیں تاکہ غالب اکیڈیمی کا فنڈ " حق بہ حقدار رسید " ہوسکے ۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ملک میں ایک غالب یونیورسٹی قائم کی جائے تاکہ پڑھے لکھے احباب کو باوقار پروفیسری حاصل ہوسکے ۔ اور چچا جان یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ امریکی اور ہندوستانی سائنس دانوں اور محققوں کی مدد سے آپ کی حویلی میں سائنسی آلات کے ذریعے آپ کی آواز تلاش کرکے ریکارڈ کی جائے ، تاکہ آپ کا وہ کلام بھی اکٹھا کیا جاسکے جو آپ نے گنگنایا ضرور تھا لیکن صفحۂ قرطاس پر لانا پسند نہیں کیا تھا ۔ آپ کی اوریجنل آواز سننے کے لئے بھی اس دور کے بہت سارے افراد بے چین و بے قرار ہیں ۔۔۔ "

" لیکن اس سے تو ہماری بہت ساری نجی و ذاتی باتیں جو محرم راز رہی ہیں ، نمایاں ہوجائیں گی " ۔ غالب چچا نے کہا :

ہم نے کہا : " آپ نے ہی تو کہا ہے " قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا ۔ " پھر تشویش کی کیا بات ہے ۔ اور ہاں اگر ریکارڈ میں کوئی نامناسب بات ہوگی تو ہم اردو والوں کی جانب سے یقین دلاتے ہیں کہ احتجاج اور ہڑتال کے ذریعے اسے حذف کروادیں گے ۔ "

چچا غالب نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا : " بھائی ، زندگی بھر ہم معاشی اور اقتصادی پریشانیاں جھیلتے رہے ، قرض کی مے پی ، بنیوں کی جھڑکیاں سنیں ۔ نوابوں اور جاگیرداروں کے احسانات تلے دبے رہے ۔ لیکن جب تک جیتے رہے ہماری جانب توجہ نہیں دی گئی اور اب لوگ ہمارے ایک ایک لفظ کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں ۔۔۔ "

ہم نے کہا : " بے شک آپ زندگی بھر پریشان حال رہے ۔۔ لیکن چچا جان آپ نے تو اردو ادیبوں ، نقادوں ، شاعروں ، گویّوں ، گائکوں ، قوالوں فلم پروڈیوسروں ، ٹی وی فلم میکروں ، ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن والوں ، آڈیو ویڈیو کیسیٹ بنانے والی کمپنیوں وغیرہ پر وہ احسان کیا ہے جو شاید انگریزی کے شاعر وادیب ڈرامہ نگار شیکسپیر کے علاوہ دنیا کے کسی اور فنکار نے نہیں کیا ہے ۔ آپ کے کلام کی بدولت سینکڑوں بلکہ ہزاروں خاندانوں کی روزی روٹی کا انتظام ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے ۔ چچا جان آپ مفلس اور تنگ دست رہے تو کیا ہوا ۔ آپ کا ہر مصرعہ اور ہر شعر سونے کی کان بن چکا ہے ۔ آپ نے جو کلام مہمل جان کر پھاڑ دیا تھا اسے بھی پرزہ پرزہ جوڑ

ٹا کیا جارہا ہے۔ اور نت نئے انداز سے کلام غالب اور دیوان غالب کی اشاعت ہورہی ہے۔ دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمے اور
میں شائع کی جارہی ہیں جن کی بدولت دنیا بھر میں جانے کتنے اشاعتی ادارے اپنے خاندان والوں کا پیٹ پال رہے ہیں۔ جانے کتنے
عروں اور متشاعروں کے خیالات آپ کے اعلیٰ وارفع خیالات سے ٹکرا رہے ہیں۔
بقول فراق: "سائکل ہوائی جہاز سے ٹکرانے لگی ہے"۔ صرف خیالات ہی نہیں، پورے پورے مصرعے اور کچھ شاعر تو پوری
غزلیں اپنے نام سے مشاعروں میں پیش کرکے آپ کے کلام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں یہ اور بات ہے داد کے ساتھ دام اور دان
صول کررہے ہیں۔ چچاجان آپ تو بنیوں مہاجنوں سے پریشان رہے لیکن آپ کے کلام کی بدولت آج جانے کتنے ہی قوال اور
ں زردیاب ہورہے ہیں۔ آج بھی بجو بھائی کی باڑی، کانگریس ہاؤس جے بی روڈ ہیرا منڈی، انار کلی، بمبئی بازار، مہندی گلی وغیرہ
ں میں طبلوں کی تھاپ پر رقص کرتے ہوئے آپ کی غزلوں کی بدولت روپیہ بٹور رہے ہیں۔ شب بیداری کرتی ہوئی مغنیاؤں اور
دل کے کوٹھوں پر آپ کی بدولت آج بھی روپیوں کی بارش ہوتی ہے۔
آپ کے کلام ہی کی برکت کے طفیل ہند و پاک کے بیشتر فلم اور غزل سنگروں، کو کاریں اور بنگلے خریدنے کا اعزاز حاصل ہوا
۔ آپ ہی کے کلام کی بدولت جانے کتنی ہی آڈیو وڈیو کمپنیاں، فلم پروڈیوسر، ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی سنٹر نوٹ چھاپنے کے
نے بن چکے ہیں۔ چچاجان! آپ کی بدولت جانے کتنے ہی ادیبوں، شاعروں نقادوں کو اللہ میاں رزق دے رہے ہیں۔ بے شک اللہ
ہے لیکن آپ ذریعۂ رزق بلکہ مخزن رزق بنے ہوئے ہیں۔
الحمدللہ کہتے ہوئے غالب نے کہا: خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کلام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سینکڑوں کو رزق پہنچا رہا ہے لیکن لکھ پتی
پتی بن جانے والوں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے نام سے کسی غریب شاعر کو دو چار پیگ پلادیں یا کسی مفلس ادیب کو آم کی
پیٹیاں ہی دلادیں یا پھر ہماری مغفرت کے لئے قرآن خوانی ہی کروا دیا کریں۔
ہم نے کہا: "چچاجان! گذشتہ دنوں دل میں خیال گزرا تھا کہ آپ کا سالانہ عرس منانا شروع کردیں لیکن آپ کا یہ مقطعہ
ے آگیا۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

چچا غالب نے قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا: "لگتا ہے بھتیجے تم ہم سے بہت پیار کرتے ہو۔"
ہم نے کہا: "یقیناً چچا۔ جبھی تو اپنے مجموعہ کلام "دل کا موسم" کا انتساب آپ کے مبارک نام"۔
ابھی ہم جملہ مکمل بھی نہ کرپائے تھے کہ ملت نگر پر سے گھر گھر گھر گھر کرتے غراتا ہوا ایک ہوائی جہاز گذرا اور ہم ہلو چچا غالب ہلو چچا
کرتے ہی رہ گئے۔ سلسلہ منقطع ہوچکا تھا۔ شاید ہمارے یا چچا غالب کے موبائیل کا ایس کارڈ ختم ہوچکا تھا یا پھر بیٹری ڈاؤن ہوچکی
۔ لاچار ہوکر ..... "عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے ..... " گنگناتے ہوئے ہم اپنے موبائیل کو دیکھتے رہ گئے۔

●☆●☆●

(نوٹ:۔ چچا غالب کا موبائیل نمبر ہم سے حاصل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ آپ کو ہمارا لقوہ
زدہ ٹیلیفون نمبر یا مرحوم موبائیل نمبر معلوم ہو)۔

●☆●☆●

علیم خاں فلکی
(جدہ)

. کام (ڈاٹ کام) غزل
. Com Ghazal

Search کرنے چلے تھے خوشی . کام
صرف Virus ہوئی زندگی . کام

سب جماعت سے پڑھتے ہیں چھوٹے بڑے
سونی اسٹار ایم ہو کہ زی . کام

Chat پر غنفر و جبرئیل و اقبال ہیں
تم بھی چاہو تو جاؤ خودی . کام

دین بیچو یا ایماں خرید یہاں
ہے نفع بخش چمچہ گری . کام

جو گیا وہ سلامت نہ لوٹا کبھی
کھوجنا مت کبھی عاشقی . کام

میر و غالب نے دیکھا تو کہنے لگے
کیا سے کیا ہوگئی شاعری . کام

کل جو پڑھتا تھا رشتوں کے کالم علیم
ڈھونڈھتا ہے وہ اب خود کشی . کام

●☆●

بیحس الہ آبادی
بذریعہ مسٹر نسیم احمد E117/1 جی ٹی بی نگر، کریلی الہ آباد ۱۶

غزل

کسی محفل میں ان کی بات تک مانی نہیں جاتی
کہ جن کے ذہن سے بوئے ہمہ دانی نہیں جاتی

کہیں جائیں، کہیں کھائیں مگر وہ حیدرآبادی
ہمارے ذہن سے خوشبوئے بریانی نہیں جاتی

کبھی فرصت میں تم نے سر پہ رکھکر ہاتھ سوچا ہے
ہمارے دفتروں سے کیوں بدعنوانی نہیں جاتی

دل اپنا ہم کسی کی انجمن میں بھول آئے ہیں
بڑھاپا آگیا ہے پھر بھی نادانی نہیں جاتی

یقیناً یہ کسی منحوس قدموں کا کرشمہ ہے
مرے گھر سے مصائب کی فراوانی نہیں جاتی

ہزاروں مسئلے پیش نظر ہیں گھر گرہستی کے
ہمارے ذہن و دل سے پھر بھی ویرانی نہیں جاتی

سکھاتا ہوں اسے میں فاعلاتن، فاعلن پھر بھی
لبوں سے اس کے سارے۔ گاما، پادھانی نہیں جاتی

کبھی ٹانکے ادھڑتے ہیں، کبھی بوتام گرتے ہیں
ہماری شیروانی کی پریشانی نہیں جاتی

کوئی فیشن کی دلدادہ حسیناؤں سے یہ کہدے
بدن پر کپڑوں کے ہونے سے عریانی نہیں جاتی

فدا ان پر نہ کیوں تلی، پچونی، چپھر کردیں
کہ ہمدم رائیگاں کوئی بھی قربانی نہیں جاتی

جھلکتا ہے جوانی میں بھی اسکے بچپنا بیحس
جوانی پھٹ پڑی ہے پھر بھی شیطانی نہیں جاتی

دلشاد رضوی
حیدرآباد دکن

گدھوں کے نام .... ایک کھلا خط

میرے پیارے گدھو! بہت بہت دعائیں جی بھر کے پیار۔ ایک وقت تھا کہ تم بالکل گدھوں کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے ہمارا قافیہ تنگ کیا کرتے تھے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمہارے دیدار کو ہماری آنکھیں ترسنے لگیں آخر بتاؤ کہ تم نے کیوں انسانی معشوق کی طرح بے وفائی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے یوں او جھل ہوگئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ! قسم لے لو اگر گذشتہ رات تمہاری یاد میں ہم نے کوئی کسر چھوڑی ہو۔ اگر جھوٹ بولیں تو جو سزا تمہارے پیچھے ٹھیرنے والے کی وہی ہماری۔ لیکن تم تو نرے گدھے ٹھیرے ارے تمہیں کیسے سمجھائیں کہ بچے گذشتہ رات امتحان کی تیاری کر رہے تھے اور انہیں ماسٹر نے Dont you زبانی سنانے کو کہا تھا۔ اس لئے جب وہ مسلسل Dont you، Dont you رٹ رہے تھے تب ہمیں یوں لگا جیسے وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کہہ رہے ہوں۔ بس پھر کیا تھا۔ تمہاری پیاری پیاری صورتیں ساری رات ہماری آنکھوں میں گھومتی رہیں۔ اجی چاندی جیسی رنگت لئے بڑی بڑی سرمئی آنکھوں سے جب تم گھاس کو گھورا کرتے تھے تب ہمیں یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی سڑک چھاپ عاشق حسرت و یاس سے اپنی محبوبہ کو ٹکٹکی باندھے تک رہا ہو۔ اس پر تمہارا بوٹا سا قد، جس کے پیچھے کسی نوخیز دوشیزہ کی چوٹی جیسی دم، ہائے ہمیں ابھی تک یاد ہے کہ بچپن میں ایک دن جب ہم نے پیار سے اسے چھونے کی کوشش کی تھی تب تم نے بھی شاید پیار ہی سے ہمیں ایسی دولتیاں رسید کی تھیں کہ "وہ جب ہم یاد کرتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے" لیکن ہم ان میں سے نہ تھے جو آسانی سے ہار مان جاتے ہیں، چنانچہ ایک دن ہم نے تمہیں بہلا پھسلا کر منا ہی لیا۔ پھر تمہاری چوٹی نما دم میں ٹین کا ڈبہ باندھ کر اس میں چند کنکریاں ڈال دیں۔ پھر جب تم نے چہل قدمی کرنی چاہی تو پیچھے جیسے بینڈ بجنے لگے۔ ویسے ہم انسان تو صوتی آلودگی کے عادی ہیں ہی لیکن تم کہاں بھلا یہ بیہودگی برداشت کرتے چنانچہ تم نے گھبرا کر دوڑنا شروع کر دیا۔ اب جیسے جیسے تم دوڑتے ویسے ویسے شور میں زور پیدا ہوتا اور تمہیں دیکھ کر لوگ یوں ہنستے چلے جارہے تھے جیسے تم اور تمہاری دم میں ٹین کا ڈبہ نہ ہو بلکہ کسی اونٹ کی ریس میں اونٹ کی پیٹھ سے کوئی انسانی بچہ بلک رہا ہو۔ پھر تم تھک ہار کر یوں ہانپنے لگے۔ جیسے ہمارے ہاں کوئی ضعیف سیکل رکشا راں دھوپ کی تمازت میں ہانپتا ہے۔

اب ہم تمہاری اور کیا تعریف بیان کریں۔ ارے ہم تو ہم ہمارے نامور ناول نگار کرشن چندر جی نے بھی تمہاری تعریف میں منہ سکھایا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب ہمارے دھوبی نے تمہیں گھر کا رکھا تھا نہ گھاٹ کا، تمہاری نازک پیٹھ پر منوں وزن لادے وہ تمہیں ہانکتا اور تم اپنی سعادت مندی کی بدولت ایسے اس کے اشاروں پر چلتے جیسے گذشتہ دور میں ہمارے لڑکے لڑکیاں ماں باپ کا کہا مانا کرتے تھے۔ لیکن افسوس کہ جب سے دھوبی نے اسکوٹر پر کپڑے لادنے شروع کر دیئے تم نے ان کی بے وفائی محسوس کی اور عنقا ہوگئے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے نئی زمانہ چڑیاں عنقا ہوگئیں اور اب تو صرف تمہاری یاد ہے کہ دل میں بسی ہوئی ہے شہر کی معروف شاہراہوں پر تمہارا لوٹنا اب خواب سا لگنے لگا۔ لیکن ہمیں آج بھی یاد ہے کہ تمہیں یوں لوٹتا دیکھکر لوگ تب تو خاموش ہوجاتے لیکن موقع کی تاک میں رہتے کہ کب کوئی بچہ زمین پر بیسیوں ضد کر کے لوٹے اور وہ یوں منہ کھولیں کہ۔ دیکھو دیکھو نا معقول گدھے کی

طرح زمین پر لوٹ رہا ہے "۔ پیارو! جب سے شہر کی سڑکیں کشادہ ہوگئیں تب ہی سے شاید تم روٹھ کر کہیں چلے گئے ۔ لیکن پیارے گدھو! ہم تمہاری عقل کی داد دیتے ہیں کہ جب تم نے محسوس کیا کہ اب ٹریفک حادثات میں جہاں انسانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو رہی ہوں وہاں تمہیں کون بخشے گا۔ لیکن دوستو! تم تو یہاں بھی چوک گئے ، اور گدھے کے گدھے ہی ٹھیرے ۔ ارے نادانو! کبھی تو ٹی وی دیکھ لیا کرو، کچھ تو خبریں سنا کرو، یہ بھی نہ کر سکو تو تمہارے لمبے لمبے کان آخر کس کام کے ، لو ہم سنائے دیتے ہیں ۔ ارے تم نے کبھی سنا کہ جب بھی کسی ٹرین کو حادثہ پیش آیا تو اس میں تاسوے ہاتھی مارے گئے ۔ یا جب دو بسیں ٹکرائیں تب اٹھارہ بیل جاں بحق ہوگئے ۔ ارے گدھو! آخر تم سمجھتے کیوں نہیں ، اگر سڑکوں پر ٹریفک بڑھ گئی ہے تو کیا ہم انسان مرگئے ہیں جو تمہاری باری آئیگی ؟ یہ حادثات تو صرف ہمارے لئے ہوتے ہیں ۔ تم آؤ اور دیکھو کہ کس طرح بھینسیں ہماری سڑکوں پر مٹرگشت کر رہی ہیں ، بھوں بھوں کرنے والے کتے کسطرح انسانی بچوں کو چیر پھاڑ رہے ہیں ۔ کس کی مجال ہیکہ انہیں ٹوکے ۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا معمولی ٹہنی سے بھی لمبی لمبی سینگوں والی بھینس کو پیار سے چھوئے تو اسکا مالک کسی پولیس والے کی طرح یوں گرجتا ہے " ابے! میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا اور ایسی نامعقول حرکت کرنے والا شرمندہ خاطر ہو کر فوراً ہی لوگوں سے منہ چھپاتا پھرنے لگتا ہے کیونکہ اسکا منہ تمہاری طرح ایک جیسا نہیں ہوتا جو بھیڑ میں پہچانا نہ جائے ۔ ویسے تمہارے اوصاف تو ہم گنوانے سے رہے ۔ گدھے بھائی ، دو چار ہوں تو کوئی حساب کرکے بتلا بھی دے ۔ بس چلتے چلتے کہتے چلیں کہ ہمیں تو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ تم اپنی پیاری گدھی سے کتنا پیار کرتے ہو ۔

ارے انہیں زندہ جلانا تو بڑی بات ہے ہم نے کبھی یہ بھی نہیں سنا کہ تم میں سے کسی نے اپنی دلاری کو ہراساں ہی کیا ہو تف ہے ہم انسانوں پر کہ تم جیسی اعلیٰ اوصاف رکھنے والی مخلوق کا نام ہم نے حقارت سے گدھا رکھدیا ۔ اب ہماری مانو اور مذکورہ حالات و واقعات کی روشنی میں ہمارا سارا بولا چالا معاف کرکے فوراً لوٹ آؤ یقین جانو کہ انسان بھلے دوسرے انسان کی جان لے لے لیکن جس کی چاہے قسم لے لو ، وہ تمہیں کوئی ایذا نہیں دے گا کیونکہ یہ بات ہماری انسانیت کے خلاف ہے ۔ یاد رکھو کہ انسان انسانوں پر نہ سہی لیکن معصوم بے زبان جانوروں پر ضرور رحم کرتا ہے ۔ تم کیا جانو کہ ہم نے انسداد بے رحمی جانوران کا قانون صرف تم جیسے احباب ہی کے لئے نافذ کر رکھا ہے ۔ پس آؤ اور بے خطر آؤ اب ہماری زبان پر یہی فلمی گیت ہے :۔

کہاں ہو تم ذرا آواز دو ہم یاد کرتے ہیں

فقط

تمہارا چاہنے والا

ایک عام انسان

مشتاق رضا
پربھو آلی بھیونڈی (تھانے)
مہاراشٹرا

"قصہ روزہ داری کا"

قاضی صاحب بے حد دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ گندمی رنگ، کتابی چہرہ، پیشانی کسی زمانے میں کشادہ رہی ہوگی مگر اب پیشانی کا تعین صرف نشان سجدہ سے کیا جاسکتا تھا۔ پیشانی اور سر کے درمیان کوئی خط فاصل نہیں رہا تھا یا تو صرف سر ہی سر تھا یا پیشانی ہی پیشانی۔

آنکھوں میں ہر وقت سرمے کی تحریر ہوا کرتی تھی۔ چہرے پر سفید براق داڑھی کے اضافے نے انھیں بڑی حد تک بزرگ نما بنا دیا تھا۔ کافی سنجیدہ اور خدا رسیدہ دکھائی دیتے تھے حالانکہ وہ نہ سنجیدہ تھے اور نہ ہی خدا رسیدہ۔ البتہ ستم رسیدہ ضرور تھے۔ ان کی نصف بہتر جو انھیں زندگی کے کسی مرحلے پر بہتر نہیں لگیں کافی ستم ایجاد واقع ہوئی تھیں اس لئے ہر قدم پھونک کر رکھنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی اب یہ اور بات ہے کہ باوجود کمال احتیاط کے ان سے کوئی نہ کوئی حماقت سرزد ہو جاتی اور سارا نزلہ ان پر آن گرتا۔ آدمی شریف تھے اس لئے طرح دے جاتے۔ گالیاں دینے کی عادت ترک کر چکے تھے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ گالیاں انھیں یاد نہیں تھیں۔ لڑکپن میں جمع کیا ہوا ذخیرہ بڑی فراخدلی بلکہ بے دردی کے ساتھ عالم شباب تک خرچ کرتے رہے تھے لیکن اب بخل سے کام لینے لگے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بحالت غصہ منہ سے گالی نکل گئی اور وضو جاتا رہا۔ اگر کوئی ہلکی قسم کی گالی روانی میں منہ سے نکل بھی جاتی تو اس پر بطلان وضو کا فتویٰ صادر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہ ہر طور قاضی صاحب ان باریش مولوی ملاؤں سے بدر جہا بہتر تھے جو قول سے زیادہ فعل میں یقین رکھتے ہیں اور اسی فعل کے طفیل راندہ مسجد یا مدرسہ کئے جاتے ہیں۔ عمر عزیز ایک کم ستر برس ہونے کو آئی تھی۔ اچھی صحت کے پیش نظر مزید بڑھنے کے امکانات روشن تھے لیکن بچپن کی جانب مراجعت کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ مزاج پر 'بال ہٹ' کا عنصر غالب آنے لگا تھا وہ تو اچھا تھا کہ نکیل بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں تھیں اس لیے شتر غمزے دکھانے سے قاصر تھے۔ نماز باجماعت کے پابند تھے۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا شاذ و نادر ہی کوئی نماز قضا ہوئی ہو مگر روزے تو قصداً قضا کرتے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ روزے کے ذکر ہی سے انھیں ہول آنے لگتا تھا۔ روزے کا نام سن کر وہ ایسے بدکتے تھے جیسے کوئی بد خو اور اڑیل گھوڑا اپنے سائے سے بدکتا ہو۔ لڑکپن میں والد بزرگوار کی سختی کی وجہ سے ایک روزہ رکھا تھا جسے ظہر ہوتے ہوتے ہوئے چپ چپاتے توڑ ڈالا تھا کسی کو کانوں کان خبر ہونے نہ دی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن نہ انھوں نے کبھی روزہ رکھا اور نہ روزہ توڑا۔ جب تک والد صاحب کا سایہ سر پر رہا بوقت سحری جاگنے اور افطاری پر بڑھ چڑھ کر ہاتھ صاف کرنے کا اہتمام کرتے رہے۔ بعدازاں یہ سلسلہ موقوف ہوگیا جاری اس وقت ہوا جب نیند نے ساتھ چھوڑ دیا۔

بیڑی سگریٹ کی لت تھی نہیں، حقے کا شوق کبھی رہا ہو تو رہا ہو اب صرف چائے نوشی اور پان کا چسکا رہ گیا تھا۔ لیکن کیا مجال کہ رمضان کے مہینے میں ہونٹوں پر پان کی سرخی کا شائبہ تک نظر آئے۔ ہمہ وقت لعلِ بدخشاں کی طرح سرخ دکھائی دینے والے ہونٹ

کسی بیوہ کی رنگ پر یدہ دامنی کا سماں پیش کرتے تھے ۔ رمضان بھر چہرہ ایسے لٹکائے رہتے جیسے شعبان ہی سے مسلسل روزے رکھتے آئے ہوں ۔ ہاں ایک بات ضرور تھی ان کے ہوتے گھر کے کسی فرد کا روزہ قضا نہیں ہوتا تھا ۔ سحری کے وقت وہ نہ صرف اپنے گھر کے افراد کو بیدار کرتے بلکہ محلے بھر کو جگاتے پھرتے تھے ۔ رمضان کے مہینے میں ان کا زیادہ تر وقت مسجد ہی میں گزرتا تھا ۔ عصر کی نماز کے بعد اپنی مخصوص زنبیل لے کر افطاری کا سامان بٹورنے نکل پڑتے ۔ طرح طرح کے پھل، سموسے، کباب، پکوڑے، مسالے دار آلو، فالودہ اور نہ جانے کیا کیا خرید کر اذان سے آدھ گھنٹہ قبل بڑی فاتحانہ شان سے گھر میں داخل ہوتے یہ ان کا معمول ہوتا ۔ روزہ داروں کے افطار کے اہتمام میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا ۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ روزہ داروں کے ساتھ افطار میں شریک ہونے کو وہ کار ثواب سمجھتے تھے ۔

گھر کے سبھی افراد کو معلوم تھا کہ قاضی صاحب روزہ نہیں رکھتے ہیں لیکن اس تعلق سے کچھ کہنے کا کسی کو یارا نہ تھا ۔ صرف بیگم صاحبہ ہی اپنے مجازی خدا کو کچھ کہنے کی مجاز تھیں ۔ اس لیے اکثر انھیں غیرت دلاتیں کہ کچھ تو شرم کیجیے ننھے ننھے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تک روزے سے ہوتی ہیں اور ایک آپ ہیں جو ــــــ " مگر قاضی صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگتی اور کبھی رینگتی بھی تو وہ کان دبائے کمرے سے نکل جاتے ایسے وقت بیگم صاحبہ کا پارہ ایک دم چڑھ جاتا اور وہ وہ سب کہہ گزرتیں جس کا کہنا نہ انھیں زیب دیتا اور نہ قاضی صاحب کو سننا ــــ مگر قاضی صاحب سننے کے لیے وہاں رکتے ہی کب تھے ۔ یوں بھی وہ خاموش رہ کر ہزار فتنوں کو ٹالنے والی پالیسی پر عمل کیا کرتے تھے ۔ وہ کان کے کچے نہیں تھے لیکن بیگم صاحبہ دھن کی پکی تھیں ۔

آخر ایک دن انھوں نے ٹھان لی کہ اب کے قاضی صاحب کو روزہ رکھوا کے ہی دم لیں گی ۔ انھوں نے اپنے پوتے پوتیوں کو اکسایا کہ وہ دادا جان سے روزہ رکھنے کا اصرار کریں اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑیں جب تک وہ روزہ رکھنے پر راضی نہ ہوجائیں ۔ بس پھر کیا تھا چاند رات ہی سے بچے قاضی صاحب کے سر ہوگئے ۔ اس ناگہانی مصیبت پر قاضی صاحب قدرے بوکھلا گئے لیکن تھے گرگ باراں دیدہ، پینترے بدلنا شروع کیے ۔ آج کو کل پر کل کو پرسوں پر ٹالتے رہے ۔

بچے بھی دھن کے ایسے پکے تھے کہ انھوں نے دادا جان کا پنڈ نہ چھوڑا ۔ ہوتے ہوتے سترھواں روزہ آگیا ۔ گڈو نے منی، رانی اور بلو کو ساتھ لیا اور دادا جان کے کمرے پر دھاوا بول دیا ۔ ظہر میں ابھی کچھ وقت باقی تھا ۔ باہر دھوپ تیز تھی قاضی صاحب اپنے کمرے میں آرام فرما رہے تھے ۔ " دادا جان السلام علیکم " سبھوں نے ایک ساتھ ایک آواز میں کہا ۔ ناوقت فوجِ طفلاں کی آمد پر قاضی صاحب ہڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھے ۔

" وعلیکم السلام.... جیتے رہو، جگ جگ جیو " سلام کا جواب دے کر انھوں نے بچوں کو دعائیں دیں ۔

" دادا جان، کل سترھواں روزہ ہوگا " گڈو نے شروعات کی ۔

" اچھا، اتنی جلد سولہ روزے گزر بھی گئے کچھ پتہ ہی نہیں چلا " ۔ قاضی صاحب نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا ۔

" دادا جان کہتے ہیں سترھواں روزہ ہرن کے بچے نے بھی رکھا تھا " ۔ منی نے بات بڑھائی ۔

" رکھا ہوگا بھئی.... ہمیں اس سے کیا ؟ " قاضی صاحب نے روزے کے ذکر کو ٹالنا چاہا ۔

" تو آپ کیوں نہیں رکھتے ؟ " رانی بول پڑی ۔

" بھئی ہم ہرن کے بچے تھوڑے ہی ہیں "

" اُفوہ، دادا جان، دادی اماں کہتی ہیں کہ اس روزے کا بڑا ثواب ملتا ہے " ۔ بلو نے کہا ۔

قاضی صاحب ایک دم ہنس پڑے اور بولے "بھئی! تمہاری دادی اماں کو اس ثواب کی ضرورت ہے"

"دادی اماں تو یہ بھی کہتی ہیں کہ اس روزے کے رکھنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت میں اعلیٰ مقام عطاء کرے گا"

"دیکھو بچو! ہم ٹھہرے فقیر آدمی، جنت میں اعلیٰ مقام نہ سہی کوئی کونہ کھدرا بھی مل جائے تو ہم رہ لیں گے ...." "لیکن اکیلے۔

"ٹھیک ہے آپ ہم سے اتنے ہی تنگ آچکے ہیں تو اکیلے رہ لیجئے" گڈو جو دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار تھا روہانسہ ہو کر بولا۔ قاضی صاحب کو لگا نشانہ چوک گیا ہے۔ سٹپٹا کر بولے۔

"ارے نہیں میں آپ لوگوں کی بات نہیں کر رہا تھا میں تو ..."

"نہیں آپ اگر ہمارا ساتھ نہیں چاہتے ہیں نہ سہی مگر دادی جان کو تو ساتھ لیجئے" رانی نے تنک کر کہا۔

"بیٹی جس جگہ تمہاری دادی جان ہوں گی بھلا وہ جگہ جنت کیوں کر ہو سکتی ہے؟" ان کے لہجے کے کرب کو بچے بھلا کیا سمجھتے۔

"یہ سب تو ہوتا رہے گا پہلے آپ کل کا روزہ تو رکھ لیجئے"۔ منی نے ایک بار پھر روزے کا ذکر چھیڑا۔

"ٹھیک ہے .... مگر کل نہیں پرسوں رکھ لیں گے پرسوں جمعہ کا مبارک دن بھی ہے"۔

بچوں کو دال گلتی نظر نہ آئی تو انہوں نے آخری حربہ استعمال کیا۔

"ٹھیک ہے دادا جان اگر آپ نے کل کا روزہ نہیں رکھا تو ہم میں سے کوئی بھی آپ سے بولے گا نہیں ہماری آپ کی کٹی" رانی نے بڑے پیارے انداز میں کہا اور منہ پھلالیا۔ قاضی صاحب لمحہ بھر کے لئے چکرا گئے۔ بچوں سے کٹی کا تصور ان کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ یہ بچے ہی تو ان کے لئے جیتے جاگتے کھلونے تھے جن سے وہ دن بھر دل بہلایا کرتے تھے۔ انہیں یاد آیا ایک بار کسی بات پر ناراض ہو کر انہوں نے ان سے بات چیت بند کردی تھی پھر انہیں منانے کے لئے سو جتن کرنے پڑے تھے۔ آخر انہوں نے بال ہٹ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

"ٹھیک ہے بھائی ہم کل روزہ رکھیں گے"۔ انہوں نے اعلان کردیا

"وعدہ؟" سب ایک ساتھ بول پڑے۔

"پکا وعدہ" قاضی صاحب نے گلے کو چٹکی سے پکڑتے ہوئے پوپلے منہ ہڈی چبانے کا چیلنج قبول کیا۔

.... پھر کیا تھا سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، عید سے پہلے گھر میں عید ہو گئی اس روز بیگم صاحبہ کی نگرانی میں بہوؤں نے بطور خاص سحری کا اہتمام کیا۔ قاضی صاحب کو کم خوابی کا مرض تو لاحق تھا ہی لیکن وہ رات بے خواب گزری۔ باورچی خانے میں برتن کھنکنے لگے تو بستر چھوڑا۔

دسترخوان پر بچے شگوفے کھلاتے رہے مگر قاضی صاحب آنے والے کل کی فکر میں غلطاں بصد خاموشی سحری تناول فرماتے رہے ایک دو بار مخاطب کئے جانے پر بادل نخواستہ تبسم فرمایا لیکن ایسا کہ جس پر بسورنے کا گمان ہو۔ جب رانی نے بڑی معصومیت سے کہا کہ "دادا جان ہم آپ کی تصویر معصوم روزہ داروں کے ساتھ اخبار میں شائع کروائیں گے"۔ تو دادی جان مسکرا کر رہ گئیں لیکن باقی لوگوں نے زبردست قہقہہ لگایا۔ چار و ناچار قاضی صاحب بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو گئے لیکن ان کی ہنسی کھوکھلی تھی اور پوپلی بھی۔

فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر مسجد ہی میں بیٹھے مصروف تلاوت رہے پھر گھر آکر لیٹ گئے۔ بیدار ہوئے تو ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ زوال کا وقت شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر باقی تھی لیکن قاضی صاحب کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ منہ کا مزہ بگڑا ہوا تھا۔ ظہر کی اذان کو سوا گھنٹہ باقی تھا۔ اذان ہونے تک تھوک تھوک کر ہلکان ہوتے رہے۔ طبیعت کی بے چینی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔ زندگی کا

پہلا باقاعدہ روزہ تھا اس لئے اس کے مسائل پہلوٹھی کی زچگی کے مسئلوں سے کسی صورت کم نہ تھے ۔ طبیعت مالش کر رہی تھی ابکائیاں آرہی تھیں لیکن منہ بھر کرتے کرنے سے ڈرتے تھے ۔ قاضی صاحب بھلے ہی روزہ نہ رکھتے رہے ہوں لیکن مکروہات روزہ اور بطلان روزہ کے مسئلوں سے کماحقہ واقف تھے انہیں بہ ہر صورت وقت افطار تک روزے کو سنبھالنا تھا ۔ ظہر پڑھ کر چار پائی پر آپڑے ۔ نیند کیا خاک آتی بس آنکھیں موندے خواب اور بیداری کے مابین سارا وقت پڑے اینڈتے رہے ۔ تصور انہیں بے سر پیر کے خواب دکھاتا رہا ۔ یوں بھی سر پیر کے خواب دیکھنے کی عمر نہیں رہی تھی ۔ خواب کیا تھے بس یوں سمجھ لیجئے ڈی ڈی ون پر پیش کئے جانے والے سیریلس کے اشتہارات تھے جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں تھا ۔ اچانک گلی میں بچوں کا شور بلند ہوا نیند اچٹ گئی ۔ غیر ارادی طور پر پوپلا منہ چلایا تو محسوس ہوا منہ میں سوکھے چمڑے کا ٹکڑا رکھا ہے ۔ طبیعت پر جبر کر کے بستر چھوڑا اور طاق میں رکھی ہوئی مسواک اٹھائی پھر عصر کی اذان ہونے تک مسواک سے شغل کرتے رہے ۔ کبھی بے دانت سخت مسوڑھوں سے کچلتے تو کبھی چوستے ۔ افطاری کی ذمہ داری آج بیٹوں نے اپنے سر لے لی تھی ۔ اس لئے عصر کے بعد بے فکری سے دوبارہ بستر پر آلیٹے ۔ قویٰ تو مضمحل ہو ہی چکے تھے لیکن عناصر میں اعتدال باقی تھا سو آج وہ بھی متزلزل ہوتا محسوس ہو رہا تھا ۔ سر چکراتا محسوس ہوا تو آنکھیں بند کر لیں اور تسبیح پڑھنے لگے ۔ باہر موسم اچانک بدل گیا تھا ۔ بے موسم بادل گھر آئے تھے ۔ مغرب سے پہلے ہی مغرب کا سماں بندھ گیا تھا ۔ اتنے میں نان والے نے آواز لگائی ۔ قاضی صاحب کو گمان گزرا کہ اذان ہو رہی ہے ۔ انہوں نے تسبیح پھیرنا بند کر دیا اور بہو کو آواز دینے لگے ۔

"بہو ! اذان ہو رہی ہے ۔ افطاری کی قابیں دستر خوان پر چنی گئیں یا نہیں "

"بہو نے ہنستے ہوئے کہا ..... "اباجی ابھی اذان نہیں ہوئی ہے ۔ کافی وقت باقی ہے ۔"

بیگم صاحبہ نے سنا تو باورچی خانے ہی سے جل بھن کر کہا "اجی کیوں بچے کی طرح اتاولے ہو رہے ہیں ..... ابھی کچھ دیر باقی ہے "

بے چارے قاضی صاحب کیا کہتے چپ ہو رہے ۔ ابھی کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ فالودے والا آواز لگانے لگا ۔ پھر قاضی صاحب کو گمان گزرا کہ اذان ہو رہی ہے ۔ اس طرح اذان ہونے تک ان کے کان بجتے رہے اور ہر اونچی آواز پر انہیں اذان کا گمان ہوتا رہا ۔ بار بار گھڑی دیکھتے اور بڑبڑاتے جاتے ۔

"کم بخت آج بانگی کو کیا ہوا ہے ... کہیں ایسا تو نہیں کہ مسجد کی گھڑی سست چل رہی ہے "۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ خود ان کی گھڑ بیس منٹ تیز چل رہی ہے ۔ آخر خدا خدا کر کے اذان ہوئی لیکن انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا ۔ وہ پیکر صبر و استقامت بنے رہے جب بچوں نے ان کے کمرے میں گھس کر شور مچایا کہ چلئے دادا جان اذان ہو رہی ہے تو وہ اٹھے اور بچوں میں گھرے ہوئے دستر خوان پر آبیٹھے ۔ سب نے مل کر روزہ افطار کیا ۔ قاضی صاحب نے ایک کھجور منہ میں رکھی اور پانی کا جگ منہ سے لگالیا ۔ وہ اتنا پانی پی گئے کہ مسجد تک جانا ان کے لئے دشوار ہو گیا ۔ اس دن انہوں نے پہلی بار نماز مغرب گھر پر ادا کی ۔ سب بے حد خوش تھے ۔ دادی جان سب سے زیادہ خوش تھیں مگر رانی اس فکر میں غلطاں تھی کہ اگر اخبار والا دادا جان کی تصویر معصوم روزہ داروں کے ساتھ چھاپنے سے انکار کر دے تو؟

.... لیکن قاضی ان تمام باتوں سے بے نیاز اللہ کے حضور سر بسجود زار و قطار رو رہے تھے ۔ ☆

●☆●☆●☆●

☆●☆●☆

منظور الامین
بنجارہ ہلز، حیدرآباد

ایک یادگار شعری نشست

یہ غالباً ۱۹۵۲ء کے حیدرآباد کی بات ہے جب اٹھارہ برس کے بن باس کے بعد مشہور شاعر جوش ملیح آبادی حیدرآباد آئے تھے اسٹینلی گرلز اسکول کے مشاعرے میں شرکت کے لئے۔ جس میں انھوں نے یہ نظم پڑھی تھی "اف ری جوانی ہائے زمانے" جب اس نظم کے شاعر پر اس زمانے کے بزرگوں کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں اس وقت راقم دکن ریڈیو حیدرآباد پر بحیثیت ٹاکس پروڈیوسر مامور تھا اور اس مشاعرے میں بحیثیت سامع شریک تھا۔

ذاتی زندگی میں جوش توازن اور اعتدال کے قائل تھے وہ بادہ نوش ضرور تھے لیکن ان معنوں میں بلانوش نہیں تھے جن معنوں میں مجاز اور اختر شیرانی تھے وہ اپنے سامنے گھڑی رکھ کر پیتے تھے (جب کہ بقول مجاز، مجاز اپنے آگے گھڑا رکھ کر پیا کرتے تھے) پھر بھی مے کے ذریعے وہ یک گونہ بیخودی کے قائل تھے۔

اسی مشاعرے میں شرکت کے لئے جگر مرادآبادی بھی مدعو تھے اور تشریف لائے تھے شاعری سے قطع نظر جہاں تک مے نوشی کا تعلق ہے جوش اپنے ہوش کو قائم رکھ کر پیتے تھے لیکن جگر — بقول جوش:

یاد ہے جب جگر چڑھاتے تھے
کیا الف ہو کے ہنہناتے تھے
میری گردن میں بھر کے کچھ آہیں
پاؤں سے ڈالتے تھے وہ باہیں

وہ موسم سرما کا ماہتاب ہو کہ موسم گل کا شباب گرما میں لو کا طومار ہو کہ برسات میں باڑھ کی یلغار جگر پیتے ہی رہتے تھے۔ اپنی زیست کو انھوں نے شراب کے حوالے کر دیا تھا:

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں

جوش ایک خوش گفتار شاعر تھے، وہ سرور و شور کے اور جوش و خروش کے شاعر تھے ان کے شعر میں جہاں ایک طرف نعرہ جنگ ہیں اور توپ و تفنگ ہیں تو دوسری طرف نغمہ و رقص کے آہنگ ہیں اور تنگ قبا حسینان شوخ و شنگ ہیں۔ جوش ایک چلتی پھرتی لغات تھے الفاظ ان کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے تھے ندرت تخیل کے ساتھ ان کے شعر میں شوکت الفاظ کی فراوانی ہوتی تھی۔

جگر ایک اعلی حسیت کے مخمور تھے، دوش صبا پر سوار جب کبھی نکہت گل ان کے قریب سے گزرتی تو وہ اس شکست رنگ کی جھنکار کو سن پاتے تھے، جگر اپنے شعر میں عشق کی اعلی ترین منزل کو چھو لیتے ہیں وہ تخیل کے نہیں بلکہ جذبہ کے شاعر ہیں ان کے اشعار میں جہاں رندی و سرمستی کے مضامین ہیں وہاں علم و حکمت اور معرفت کے ایسے ایسے نکتے ہیں کہ ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے۔

حیدرآباد میں آمد پر جوش کا قیام سکندرآباد کلب میں تھا اور جگر معظم جاہی مارکٹ میں اپنے دوست کے دولت خانے پر قیام پذیر

تھے ان دو بڑے شاعروں کے حیدرآباد میں آنے پر راقم نے سوچا کیوں نہ دکن ریڈیو حیدرآباد پر ایک مختصر سی شعری نشست کا بندوبست کرلیا جائے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو کی نشریات مقبول عام تھیں اور ریڈیو گھر گھر میں سنا جاتا تھا ابھی ٹیلی ویژن ہمارے ملک میں پہنچا نہیں تھا ۔

خوش قسمتی سے اس زمانے میں ملک کے ایک اور اہم شاعر حیدرآباد میں رہتے تھے جن کا نام ہے امجد حیدرآبادی ۔ امجد صاحب نہ صرف ایک صوفی اور اہل باطن دیدہ ور تھے بلکہ ایک اعلیٰ رباعی گو بھی ۔ اس خاکسار پر حضرت امجد بہت مہربان تھے میں اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا اور ان کے علم و دانش سے فیضیاب ہوتا تھا ، وہ مجھے ہمیشہ دعائیں دیتے جس کی وجہ سے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی ۔

میں نے سوچا ان تین اہم شاعروں کو ایک ساتھ ریڈیو پر ایک شعری نشست میں پیش کردوں چنانچہ میں نے ان تینوں سے بات کی اور میری اور ریڈیو کے اس دور کے سامعین کی خوش بختی سے وہ تینوں راضی بھی ہوگئے ۔ اب میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی ۔

ابھی ہمارے نشری اداروں میں ٹیپ ریکارڈنگ کا چلن نہیں ہوا تھا ۔ البتہ دائر ریکارڈنگ ہوا کرتی تھی ۔ یہ ریکارڈنگ ایک چھوٹی سی سیاہ رنگ مشین پر کی جاتی تھی جسے اس زمانے میں ہم لوگ بلیک باکس (Black Box) کہا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ ریکارڈنگ کی جاتی تھی سولہ یا نوانچ کے الیومینیم ڈسک پر جس میں ریکارڈنگ کے دوران ہیرے کی ایک نیڈیل needle آہستہ آہستہ groores کٹ کرتی تھی ۔ پھر تھرٹی تھری آر پی ایم (33RPM) کی اسپیڈ والے عام کمرشیل ریکارڈ بھی رائج تھے ، عام طور پر نشریات لائیو (Live) ہوا کرتی تھی ۔

اس سے قبل دکن ریڈیو حیدرآباد نے مدعو سامعین کے سامنے کئی بڑے مشاعرے منعقد کئے تھے لیکن جس شعری نشست کا ذکر کیا جارہا ہے اسکی نوعیت ہی مختلف تھی وہ ایک طرح سے نشرگاہ حیدرآباد کی ایک " پرائیویٹ " سی محفل تھی ۔ جس میں ہندوستان کے تین عظیم اور معتبر شاعروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی ۔ سامعین کو نشرگاہ کے صحن میں مدعو نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس شام وہ سارے ہی سامعین مدعو تھے جو اپنے اپنے ریڈیو سیٹ پر 30 ۔ 9 بجے نشرگاہ حیدرآباد سے براڈ کاسٹ ہونے والے اس پروگرام میں موجود تھے ۔ میرا خیال ہے کسی بھی ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں کبھی ایک جگہ ایک ساتھ ہندوستان کے یہ تین نامور شعراء اکٹھے نہیں ہوئے ہوں گے ۔ مطلب اس محفل کی درخشاں شمعیں تھیں ، حضرت امجد حیدرآبادی ، حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت جگر مراد آبادی اس نشست میں حیدرآباد کے ہیروں کی دمک تھی ۔ ملیح آباد کے دسہری آموں کی خوشبو اور مراد آباد کی کاریگری کا فسوں ۔

اس محفل شعر کی نشر کا وقت رات 30 ۔ 9 بجے مقرر کیا گیا اور تاریخ نشر اور ساعت نشر کو شعراء کے ناموں کے ساتھ ریڈیو پروگراموں میں اناونس کردیا گیا ۔

طے یہ پایا کہ ریڈیو کی کار پہلے حضرت جگر مراد آبادی کو اور پھر حضرت امجد حیدرآبادی کو لے کر تاریخ نشر پر رات سوا نو بجے نشرگاہ پہنچ جائے گی ۔ جوش صاحب سکندرآباد کلب میں مقیم تھے ان کی ہم عنانی کے لئے میں سکندرآباد کلب پہنچا ، جوش صاحب کلب کے باہر کے لان پر بیٹھے مئے نوشی کا شغل فرمارہے تھے میں نے انھیں آداب کیا انھوں نے اپنے معمولات اور معقولات میں دخل دینے والے نوجوان سے بے اعتنائی دکھائی اور رکھائی بھی ۔ اور اس خادم کو پہچاننے سے صاف انکار کردیا ، پھر فرمایا ۔ دیکھو بھئی میں نے لوگوں کو آ[illegible] گراف و آٹوگراف دینا بالکل بند کردیا ہے ۔ میں نے ایک بار پھر اپنا تعارف کرایا اور انھیں نشرگاہ حیدرآباد کی شعری نشست کی یاد دلائی ۔ وہ چونکے ا[illegible] ذہن میں ایک [illegible] سی [illegible] انھوں نے ایک نظر مجھ پر [illegible] اور فرمایا ۔ خوب یاد دلایا برخوردار ، ابھی

چلتے ہیں مگر پہلے ایک شعر سن لو، یہ کہہ کر انہوں نے جام ہونٹوں سے لگایا اور بولے :

جب مہر میں غروب ہوجاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں

میں نے شعر سن کر داد دی، وقت نشر قریب آرہا تھا اور ہم لوگ خیریت آباد میں (جہاں حیدرآباد کی نشرگاہ اس وقت واقع تھی) آٹھ میل دور سکندرآباد میں بیٹھے تھے ادھر خاکسار کے بال و پر میں لرزش خفی شروع ہوگئی تھی اور ادھر جوش صاحب چین اور اطمینان کا پیکر بنے بادہ نوشی اور شاعری کے موڈ میں بیٹھے تھے میں نے عرض کیا "قبلہ اگر آپ اسی طرح پیمانہ بکف طلوع ہوتے رہے تو یہ طے ہے کہ اس خاکسار کی ملازمت کا سورج غروب ہو کر رہے گا۔ رات کے نو بجنے والے ہیں، ریڈیو پر نشر ہونے والی مجلس کا اہتمام ہوچکا ہے اور اعلان بھی، امجد صاحب اور جگر صاحب نشر گاہ پہنچ چکے ہونگے، بس اب جناب کے وہاں پہنچنے کی دیر ہے "۔

راقم الحروف کے ستارے اچھے تھے کہ جوش صاحب کو ہوش آگیا۔ وہ اٹھے کمرے میں گئے ۔ شیروانی خود پر لٹکالی چھوٹی سی بوتل شیروانی کی جیب میں رکھی کار میں آ بیٹھے مگر تھوڑی تھوڑی پیتے رہے ۔ یہ گنگناتے ہوئے "بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باداست" بالآخر ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن پہنچے نشر کے وقت سے صرف پانچ منٹ پہلے، باوصف بادہ نوشی جوش، حضرت امجد سے نہایت ادب سے ملے، مگر جگر کے لئے ان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ ٹھیک 30۔9 بجے شعری نشست کا اعلان ہوا۔ جوش صاحب نے اسٹوڈیو کی سرخ روشنی پر ایک نظر ڈالی اور چوکس اور مستعد ہوگئے ۔ امجد صاحب سے اجازت لے کر اپنی نظم کے یہ اشعار انہوں نے پیش کئے یہ کہہ کر:

حضرت امجد دکن کے ہیرے ہیں، یہ نظم ملاحظہ فرمائیں عنوان ہے "چراغ عظمت" اس نظم کے دو اشعار:

تھا سکوں جب کار فرما عالم اسباب میں
میں نے دیکھا ہم نشیں پچھلے پہر یہ خواب میں

●☆●

رہگزر میں باد صرصر کی بصد شانِ فراغ
جل رہا ہے طاقِ زر میں ایک ہیرے کا چراغ

امجد صاحب اور جگر صاحب انہیں توجہ سے سنتے رہے اور داد بھی دیتے رہے ، اب جگر صاحب کی باری تھی انہوں نے اپنی یہ غزل سنائی (چند شعر) اپنے مخصوص ترنم میں:

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ
ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ
یہ ترا جمال کامل یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت دل دوستاں نشانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہیں کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

آخر میں حضرت امجد حیدر آبادی نے چند رباعیاں پیش کیں کچھ اس طرح سے :

ادعونی استجب لکم (تم دعا کرو میں قبول کرتا ہوں)

قرآن حکیم کے ان الفاظ کی تفسیر ہے یہ رباعی

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے
اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہے کھٹکھٹائے جاؤ
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

اس محفل شعر کو اس زمانے کے حیدر آباد کے باذوق سامعین نے بے حد پسند کیا تھا اس کے بارے میں انتظامیہ کے پاس بہت سے مخطوط آئے تھے ہم نے اس پروگرام کو الیومینیم ڈسک پر ریکارڈ بھی کرلیا تھا یہ 45 سال ادھر کی بات ہے ۔ پتہ نہیں ریڈیو حیدر آباد کے آرکائیوز (Archives) میں اب یہ ریکارڈ محفوظ ہے یا نہیں ۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا ۔ ☆

سید اسد اللہ حسینی چکر
(امریکہ)

غزل

پڑے پتھر ہماری عقل پر سمجھے تو کیا سمجھے
ہیں نمبر ایک آوارہ جنہیں ہم پارسا سمجھے

وہ ہم کو باوفا سمجھے نہ ہم کو بے وفا سمجھے
کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ان سے خدا سمجھے

جھڑکتے جارہے تھے وہ، مناتا جارہا تھا میں
پھر اس پر یہ قیامت ہے مجھے وہ بے حیا سمجھے

وہی نسوانی آزادی وہی نسوانیت سوزی
ہوئے واپس وطن اپنے تو اسکو امریکہ سمجھے

پرائے دیس میں ہم اجنبی کس سے گلہ کرتے
ہمارے آشنا ہی جب ہمیں نا آشنا سمجھے

انہیں کالج کی ساری ڈگریاں تو مل گئیں لیکن
وہ لفظ آرزو سمجھے نہ لفظ مدعا سمجھے

میں سب کے ساتھ ہی مکہ گیا اور حج بھی کر آیا
مگر یہ مولوی مجھ ہی کو عیسیٰ کا گدھا سمجھے

چھپاکر آستیں میں بوتلیں ہر روز لاتے ہو
غلط فہمی میں چکر ہم تمہیں بھی ناصحا سمجھے

●☆●

ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیا عظیم آبادی
دارالنشاط۔ دریاپور۔ پٹنہ۔

غزل
(ضرورت کیا تھی)

بیتے دن یاد دلانے کی ضرورت کیا تھی — سوئے فتنوں کو جگانے کی ضرورت کیا تھی
کون کیسا ہے بتانے کی ضرورت کیا تھی — آئینہ سب کو دکھانے کی ضرورت کیا تھی
تیر مژگاں پہ بھروسہ نہ رہا کیا ان کو — تیغ ہاتھوں میں اٹھانے کی ضرورت کیا تھی
شعر کا عیب ترنم میں چھپایا ہم نے — ساری محفل کو بتانے کی ضرورت کیا تھی
چند اشعار ہی سرقہ تو کئے تھے ہم نے — اس کا طومار بنانے کی ضرورت کیا تھی
چند سکے ہی چرائے تھے خزانہ تو نہیں — آسماں سر پہ اٹھانے کی ضرورت کیا تھی
چلتے پھرتے یوں ہی مل لینا بہت تھا پیارے — راستہ گھر کا دکھانے کی ضرورت کیا تھی
لڑگئی آنکھ چلو مانا مگر پھر ان سے — پینگ الفت کی بڑھانے کی ضرورت کیا تھی
دل لگا بیٹھے بڑھاپے میں تو دل میں رکھتے — سب کو ہمراز بنانے کی ضرورت کیا تھی
پٹ رہے ہو تو یہ خود اپنے کئے کا پھل ہے — سب کو اوقات بتانے کی ضرورت کیا تھی
تم نے چھیڑا ہے بھگتنا بھی تمہیں کو ہوگا — ورنہ یوں بات بڑھانے کی ضرورت کیا تھی
یہ تن و توش ہی کیا کم تھا اڑانے کو حواس — چال پھر اپنی دکھانے کی ضرورت کیا تھی
کام جب ان کی خوشامد سے نکل سکتا تھا — ہیکڑی ان کو دکھانے کی ضرورت کیا تھی
روشنی دل میں کرو من میں اجالا رکھو — تن کو گلزار بنانے کی ضرورت کیا تھی

ناز برداری بیگم بھی ضرورت ہے ضیا
یوں اکڑ ان کو دکھانے کی ضرورت کیا تھی

●☆●

ڈاکٹر سید حسین احمد زاہدی
۳۰/۱ جان نگر روڈ، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۷

رعایت لفظی

رعایت لفظی وہ شگفتہ مزاح ہے جس میں الفاظ یا جملے کی ذو معنویت سے ظرافت پیدا کی جاتی ہے۔ اس صنعت میں طنز کے بجائے مزاح کو اہمیت دی جاتی ہے۔ طنز کا وجود عموماً نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ صرف خاص خاص موقعوں پر طنز کا اظہار ہوتا ہے لیکن وہ بھی بہت لطیف ہوتا ہے۔ جس سے کسی کی دل آزاری کا خدشہ نہیں رہتا۔ اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ مخاطب بجائے گرانی محسوس کرنے کے لطف لے۔ اس میں پیش کردہ مزاح بھی بے حد لطیف ہوتا ہے جس میں دیوار قہقہہ کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی تو تبسم زیرلب بھی پیدا نہیں ہوتا صرف دل میں شگفتگی کے پھول کھلتے ہیں جس سے دماغ معطر ہوجاتا ہے۔

رعایت لفظی کا شمار اعلیٰ درجہ کے مزاح میں ہوتا ہے اس میں جملے کو اس طرح سے ادا کرتے ہیں کہ بات میں ابہام پیدا ہوجاتا ہے۔ مخاطب جو بات کہتا ہے سامع اس کو دوسرے زاویئے سے لیتا ہے جس سے ایک قسم کی غلط فہمی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس صنعت کا خاص مقصد ہی یہ ہے کہ بات اس قدر مبہم انداز میں کی جائے کہ مطلب اچھی طرح واضح نہ ہوسکے۔ اس صنعت میں اصل چیز ابہام ہی ہے جس سے شگفتگی کے پھول کھلتے ہیں۔

رمضان شریف ختم ہونے کے بعد ایک مرتبہ مرزا غالب قلعہ گئے تو بادشاہ نے دریافت کیا: "مرزا آپ نے کتنے روزے رکھے۔"

مرزا نے جواب دیا "پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔"

مرزا غالب نے ایک روزہ بھی نہیں رکھا تھا لیکن رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے جو جواب دیا ہے اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ صرف ایک روزہ نہیں رکھا۔

رعایت لفظی میں بظاہر ظرافت کی کوئی بات نہیں ہوتی لیکن برمحل و برجستہ جواب کے ذریعہ ذو معنویت پیدا کرنے کے عمل سے سامعین پر ایک انبساطی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ابہام کی وجہ سے بات میں جو معنوی فرق پیدا ہوتا ہے وہی مزاح کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔

اردو نظم و نثر دونوں میں رعایت لفظی کے اچھے نمونے ملتے ہیں مرزا غالب کے یہاں رعایت لفظی کا فن بدرجہ اتم موجود ہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ظرافت کی تمام اعلیٰ اصناف کے بہتر نمونے ہمیں غالب کی شاعری خطوط اور گفتگو میں ملتے ہیں غالب نے اکثر و بیشتر رعایت لفظی سے کام لیکر ہنسی کے مواقع فراہم کئے ہیں۔

ایک دن مرزا غالب پڑے ہوئے پلنگ پر دراز تھے اتنے میں میر مہدی مجروح آپہنچے اور مرزا کے پاؤں دابنے لگے مرزا نے کہا کہ ارے بھئی تو سید زادہ ہوکر پاؤں دباتا ہے کیوں مجھے گنہگار کرتا ہے۔ مجروح نہ مانے اور برابر پاؤں دباتے رہے جب مرزا نے بہت اصرار کیا تو بولے قبلہ آپ گھبراتے کیوں ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہ اجرت دے دیجئے گا۔ مرزا نے کہا تب تو خیر کوئی مضائقہ نہیں ہے جب مجروح پاؤں دبا چکے تو بولے کہ لائیے حضرت اجرت۔ مرزا بولے "اماں کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہاری

اجرت دابی، حساب برابر ہوگیا "۔

●☆●

رمضان کا مہینہ تھا مرزا غالب نواب حسین مرزا کے یہاں بیٹھے تھے پانی منگا کر پیا ایک صاحب جو چہرے سے بہت متقی اور پرہیز گار لگ رہے تھے متعجب ہو کر پوچھ بیٹھے کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے غالب مسکرا کر بولے "شیطان غالب ہے "۔

●☆●

ایک دن مرزا غالب فتح الملک بہادر سے ملنے گئے جب غلام گردش میں پہنچے تو خدمت گار نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ صاحب آرہے ہیں وہ کسی کام میں مشغول تھے اس لئے وہ فوراً بلا نہ سکے ۔ مرزا غالب غلام گردش میں ہی ٹہلنے لگے کچھ دیر کے بعد صاحب عالم نے غلام سے دریافت کیا "ارے دیکھو مرزا صاحب کہاں ہیں " مرزا غالب نے وہیں سے جواب دیا "غلام گردش میں ہے "۔

●☆●

رعایت لفظی میں کبھی کبھی مزاح سے زیادہ طنز سے کام لیا جاتا ہے یعنی مزاح پر طنز کو فوقیت دی جاتی ہے اس میں مخالف کو طنز کا اس طور پر نشانہ بنایا جاتا ہے کہ وہ لاجواب ہوکر رہ جاتا ہے اس صنف میں کوئی لفظ بظاہر معمولی طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن اس لفظ کے دوسرے معنی طنز سے بھرپور ہوتے ہیں اس میں زبان و بیان پر مہارت ہونا بہت ضروری ہے تاکہ ادبی شان برقرار رہے اور متکلم اور سامع دونوں کے مزاج کو ناگوار خاطر نہ لگے ۔

کسی صحبت شعر و سخن میں مرزا غالب میر تقی میر کے انداز کلام کی تعریف کر رہے تھے اور استاد ذوق سودا کے طرز بیان کی ۔ مرزا نے کہا: "استاد ہم تو تم کو میری سمجھتے تھے مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں "۔

●☆●

بعض ضروری خطوط کے ضائع ہونے پر مرزا کو بڑا صدمہ ہوتا تھا اسی بنا پر خواجہ غلام غوث کو لکھتے ہیں : "آپ کار پردازانِ ڈاک ڈاکو نہ بن جائیں اور میرے ان دونوں خطوں اور پارسلوں کو با احتیاط پہنچائیں "۔

●☆●

رعایت لفظی ایک ایسا فن ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور جو اس فن کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں ان کے یہاں بھی خاص خاص موقعوں پر ہی اس کا اظہار ہوتا ہے ۔ ایک لفظ کو دو مختلف معنوں میں استعمال کرنا بے حد مشکل کام ہے ۔ اس میں طبعی ظریف ہونا ضروری ہے جبھی ایک لفظ کے اصل اور دوسرے مرادی معنی مل کر مزاح کی تخلیق کرتے ہیں ۔ کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عام آدمی کے منھ سے بھی ایسے الفاظ یا جملے بے ساختگی میں نکل جاتے ہیں جو ایک ہی وقت میں دو مختلف معنوں میں ظاہر ہوکر ہنسی کا ماحول پیدا کردیتے ہیں ۔

رعایت لفظی میں کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو اس لئے اس میں طنز کے بجائے مزاح پر توجہ مبذول کی جاتی ہے ۔ رعایت لفظی کے لئے ہر دو شخص کا صاحب علم ہونا ضروری ہے تاکہ علمی لطافت کی جھلک نظر آئے ۔ اس میں لفظوں کے وسیع تر مفہوم و معانی سے آگاہی بھی ضروری ہے ورنہ گفتگو میں وہ شان پیدا نہیں ہوگی جس سے لطف کا پہلو نمایاں ہو ۔ بعض بعض موقعوں پر اپنی مہارت زبان دکھانے کے لئے ادبا و شعراء نے رعایت لفظی سے کام لیا ہے ۔

رعایت لفظی کا فن اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایک شخص کس حد تک اپنی زبان پر قادر ہے ۔ رعایت لفظی زباندانی کی کسوٹی ہے ۔ اس میں الفاظ میں برجستگی و بر محل استعمال کو دخل ہے جس سے متکلم کی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

تحفہ شب برات میں کیا دوں
مری جان تم تو خود پٹاخہ ہو

(اکبر الہ آبادی)

کتنی معراج ترقی پہ ہے کالا بازار
رخ لیلائے گرانی پہ ہے کس درجہ نکھار

●☆●

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

●☆●

رعایت لفظی کی ایک قسم تناسب لفظی کہلاتی ہے ۔ اس میں ایک لفظ کے تناسب سے دوسرا لفظ لاتے ہیں جس میں کبھی معنوی مناسبت ہوتی ہے اور کبھی تضاد ۔ رعایت لفظی کے دائرے میں ایہام ، ایہام تضاد ، ایہام تناسب ، تضاد مراۃ النظیر ، ذو معنویت وغیرہ آتی ہیں ۔ اس صنف کو نباہنا بہت مشکل ہے ۔ رعایت لفظی کے چکر میں پڑکر بہت سے شعراء نے ادبی ٹھوکر کھائی ہے ۔ رعایت لفظی نے اکثر شاعروں کے یہاں مضمون شعر کو تباہ کیا ہے ۔ صرف چند ایک شعراء اس صنعت میں کامیاب رہے ہیں ۔ لفظی بازیگری کے چکر میں پڑکر فن جذبے سے الگ ہوکر ایک بے جان شکل اختیار کرلیتا ہے ۔

شاعری کے ابتدائی دور میں رعایت لفظی پر شعراء زیادہ زور دیتے تھے ۔ ان کی کوشش تناسب لفظی دکھانے تک محدود تھی ۔ یہ فن دور قدیم اور دور متوسط میں بہت رائج تھا لیکن مجموعی طور پر پرانے دور کے اچھے شعراء اس کو برا فن جانتے تھے اور ہر ممکن حد تک اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے ۔ موجودہ دور میں یہ ایک غیر پسندیدہ فن ہے ۔

کہاں چاہ والے ہیں یوسف عزیز
اری باؤلی چاہ میں کر تمیز

(میر حسن)

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے مری توقیر آدمی رہ گئی

نزع تک قلقل سے رکھی یاد اللہ اس لئے
پڑھ کر قل بخشے گی ہم کو قلقل مینا ثواب

(ریاض)

شریک شکار لب جو تھا ناصح
مجھے قاز اسے روغن قاز دینا

(ریاض)

"گلزار نسیم" میں تناسب لفظی کا بہت استعمال ہوا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ گلزار نسیم کی بنیاد تناسب لفظی پر قائم ہے۔ دیا شنکر نسیم نے تناسب لفظی کا اپنی شاعری میں بر محل استعمال کیا ہے جس سے لطف شاعری بڑھ گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں
غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

●☆●

ثابت کچھ اثر ستارے کا ہے
چاند کو را گہن لگا ہے

●☆●

صناعِ طلسم کار تھے وہ
گلشن کے لئے بہار تھے وہ

●☆●

پاؤں اس کے چھوئے تو یخ سے پائے
آنسو چھوڑے، گہر اٹھائے

●☆●

نریش کمار شاد

انتظام

راجندر سنگھ بیدی ریڈیو اسٹیشن میں ڈرامہ سیکشن کے انچارج تھے اور راجہ مہدی علی خاں ان کے ماتحت کام کررہے تھے
راجہ ان دنوں ایک ہندو اور بھگت قسم کے بزرگ سے جو ریڈیو ہی میں ملازم تھا غیر معمولی طور پر بلکہ تکلیف دہ حد تک بے تکلف تھا
دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہر روز گوشت کی ایک ہڈی اس کی پانی کی صراحی میں ڈال کر صراحی کو اس کے لئے بیکار کردیا کرتا تھا۔ بہ
سے جب اس بیچارے نے شکایت کی تو بیدی نے راجہ کو بلا کر کہا: "تم نے کسی زمانے میں کوئی فحش کہانی بھی لکھی ہے؟"۔
راجہ نے ذہن پر زور ڈالنے کے بعد بتایا: "جی ہاں، غالباً وہ لاہور کے کسی ماہنامہ میں شائع بھی ہوئی تھی"۔
بیدی نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا: "وہ پرچہ ہیڈ آفس والوں کے ہاتھ لگ گیا ہے اور انہوں نے یہاں لکھا ہے کہ وہ اس ا
میں ایک فحش نگار کو ملازم رکھنے کے حق میں نہیں ہیں"۔
راجہ نے گھبراتے ہوئے کہا: "تو اب کیا ہوگا بیدی صاحب! کیا میری نوکری ختم ہوجائے گی؟"
بیدی نے جواب دیا: "ہاں بھائی! صورت تو ایسی ہی ہے لیکن اگر تم رشوت کے طور پر کچھ روپے دے سکو تو یہ بلا ٹل سکتی ہے"۔
راجہ مبلغ ستر روپے کی رقم بطور رشوت دینے پر رضامند ہوگیا تو بیدی نے وہ رقم لے کر اس ہندو بھگت کو بلایا اور وہ رقم اس
حوالہ کرتے ہوئے کہا:
"شرمان جی! تم ان روپیوں کی صراحیاں خرید لو۔ جب اپنی عادت سے مجبور ہوکر راجہ ان تمام کو ضائع کردے گا تو پھر
منگوانے کا انتظام بھی کیا جائے گا"۔ ☆

توارد

وہ ڈرامہ نویس کم اور ریڈیو اسٹیشن کا افسر زیادہ تھا۔
شاید یہی لئے اس ریڈیو اسٹیشن میں کام کرنے والے کچھ ادیب غیر معمولی توجہ اور تکلف سے اس کا لکھا ہوا نیا ڈرامہ سن رہے تھے
جب وہ تمام مسودہ پڑھ چکا تو فکر تونسوی اپنے اوپر قابو نہ رکھتے ہوئے چیخ اٹھا: "یہ ڈرامہ آپ نے کب لکھا ہے؟"۔
"رات، پچھلی رات۔ بس ایک ہی نشست میں پورے کا پورا لکھ ڈالا ہے؟"
ڈرامہ نگار افسر نے داد طلب نگاہوں سے فکر تونسوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں آج سے پانچ سال پہلے ممتاز مف
ایک کہانی پڑھ چکا ہوں اور میرے ناقص خیال میں آپ نے اسی کہانی کے تمام کرداروں اور مرکزی خیال کو اپنے ڈرامہ میں اپنالیا ہے"
"ممتاز مفتی کی کہانی...... پانچ سال پہلے......؟"
اس نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی کچھ مجوب سا ہوکر بولا:
"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ممتاز مفتی نے بھی میک ڈوگل کا وہ کیس پڑھ کر کہانی لکھی تھی جسے میں نے اپنے ڈرامہ میں پیش
چاہا ہے"۔ ☆

مرے کے خط (مراسلے)

جناب ایڈیٹر صاحب
اسلام علیکم
اپریل ۲۰۰۰ء کے شمارے میں آپ نے گوشہ حبیب ضیا شامل کر کے میری جو حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کا دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کی زندگی ہی میں اس کی ادبی خدمات کا کچھ صلہ مل جائے، اعتراف خدمات کے سلسلے میں تہنیت پیش کی جائے تو مصنف کے حوصلے بڑھتے ہیں۔
ماہ مئی کے پرچے میں نامور طنز و مزاح نگار کرنل محمد خاں کی طنز و مزاح نگاری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس خصوصی شمارے کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ امید کہ بقید حیات اور مرحوم ادیبوں کی ادبی خدمات کے لئے آپ اسی طرح شگوفہ میں گوشہ مخصوص کریں گے۔
مخلص
(ڈاکٹر) حبیب ضیاء، حیدرآباد

●☆●

مکرمی،
واقعی آپ کی ہمت کی داد دینی چاہئے۔ چاہے سورج مشرق کے بجائے مغرب سے کیوں نہ نکلے لیکن شگوفہ کی اشاعت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مزاح کی روایت کو برقرار رکھنا آپ کے مزاج کی خوبی ہے۔ ہماری یہ دعا ہے کہ اردو میں مزاح نگاری اور آپ کا مزاج دونوں توانا رہیں۔
آج کل شگوفہ کی مہک میں اضافہ ہورہا ہے۔ سید طالب حسین زیدی کا رپورتاژ پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ گوشہ مسیح انجم، حاتق شاہ اور ضمیر جعفری اور شمارہ کرنل محمد خان آپ کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ ہر ماہ پابندی سے کم از کم نیا یا پرانا ایک تنقیدی مضمون ضرور شائع کیجئے۔ جس سے شگوفہ کے حسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔
زندہ دل بھائیوں کی خدمت میں حفظ مراتب سلام و دعا۔
خیر خواہ
علیمہ فردوس
۲۲۵ کرشنا بلاک، نیشنل گیمس باؤزنگ کامپلکس، بنگلور

●☆●

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب
اعتراف ہے۔ بلکہ اپنی کوتاہی اور غلط فہمی کے اخلاقی جرم کا تہہ دل سے اقبال کرتا ہوں۔ گزشتہ بیس پچیس برسوں میں کئی بار ماہنامہ شگوفہ کے سرورق پر نظر پڑی ہوگی لیکن سرورق دیکھ کر اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ "شگوفہ" بچوں کا رسالہ ہوگا اور اسی غلط فہمی نے رسالہ کو چھو کرنے سے روک رکھا تھا۔ سبکدوش ہونے کے بعد گزشتہ دنوں بھنڈی بازار کوارٹرس سے ملت نگر میں شفٹ ہوا تو اپنے پرانے یار غار رفیق جعفر سے ملاقات ہوئی۔ ماہنامہ شگوفہ کے ساتھ آپ کی ادبی خدمات کا بھی ذکر نکلا اور جنوری ۲۰۰۰ء کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ دیکھا تو محسوس ہوا جس شراب کی برسوں سے تلاش تھی وہ تو شگوفہ میں بھری ہوئی ہے۔ ادھر ادھر سے کئی پرانے رسالے حاصل کئے اور نشہ جاری رہا۔ فٹ پاتھوں پر پرانے رسالے اور کتابیں فروخت کرنے والے کئی ایک کو ٹٹولا، پتہ چلا، زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ شگوفہ، تنہا رسالہ ہے جسے خریدنے والے Re-Sale نہیں کرتے اور نہ ہی ردی میں فروخت کرتے ہیں۔ یہ اعزاز شاید ہی کسی اور رسالہ یا ماہنامہ کو حاصل ہو۔ مبارک ہو۔
طالب خلوص و محبت
مختار احسن انصاری، ممبئی
سابق اسسٹنٹ کمشنر پولیس ممبئی

●☆●

محترمی،
سالنامہ میں مرزا مصطفیٰ علی بیگ، افتخار وصی، رفیعہ منظور الامین، سلیل کمار تنگ، ڈاکٹر محبوب راہی، افضل جاوید اور ظفر کمالی کی تخلیقات نے کافی متاثر کیا۔
مارچ ۲۰۰۰ء کے شمارے میں بازغ بہاری، عابد معز، محبوب مانبھوی، اسد اللہ حسینی چکر، رؤف رحیم وغیرہ کی تخلیقات خوب ہیں۔
شگوفہ ایک شگوفہ ہی نہیں اپنے اندر ایک چمن سمیٹے ہے، جس میں کتنی ہی مسکراتی ہوئی کلیاں، ہنسی کے پھول اور قہقہہ لگاتی ہوئی پھولوں کی کیاریاں ہیں جہاں پہنچ کر سنجیدہ سے سنجیدہ انسان پر مزاح ہوجاتا ہے اور سنجیدگی کا لبادہ اتار کر عام انسانوں میں شامل ہوجاتا ہے۔ اس کے دل میں بھی مسکراہٹ کی کلی کھلنے لگتی ہیں۔ ہنسی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ قہقہوں کے فوارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ میں بھی اسی کا شکار ہوا ہوں۔ اب تک سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رہا کرتا تھا۔ نہ معلوم کیا ہوا۔ اپنی روش سے ہٹ کر دل کھول کر ہنسنے کو دل چاہا۔
نیاز کیش
ضیاء عظیم آبادی، پٹنہ

اداریہ

مقبول ترین ترقی پسند شاعر اور بے مثال غزل گو مجروح سلطان پوری کا انتقال ہوگیا۔ ان کی رحلت سے دو نسلوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ادب اور فلم کی رفاقت کو سخت دھکا لگا اور اس کلاسیکی غزل کا بانکپن ختم ہوگیا۔ مجروح نے غزل کو کھویا ہوا وقار عطا کیا تھا۔ ایک ایسے دور میں جب کہ اس صنف کو سنگسار کیا جارہا تھا، مجروح نے زندگی کی تمام تر رعنائیوں اور حقیقتوں کے ساتھ غزل کو اس طرح پیش کیا کہ یہ رگ جاں سے قریب تر نظر آنے لگی۔ غزل کے پاؤں میں پڑی زنجیر کا خیال کیے بغیر انہوں نے اس سے وہ کام لیا جو نظم نگاروں سے بھی ممکن نہ تھا۔ وہ ایک مہذب، شائستہ اور پر خلوص انسان تھے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں کسی قدر تیزی پیدا ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے کبھی مشاعروں میں اور کبھی سیاسی یا سماجی جلسوں میں ان کا ردیہ بحث کا موضوع اور کبھی نزاع کی بنیاد بنتا رہا۔ لیکن ان باتوں سے مجروح کے ادبی قد میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اکثر انہوں نے بڑے بے باکانہ انداز میں اپنے نقطہ نظر کو منوایا۔

● حیدرآباد کے منفرد شاعر جناب سعید شہیدی کا چند دن قبل معمولی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ سعید بھائی حیدرآباد کے باوقار، معتبر اور بزرگ شاعر تھے۔ چھوٹی مترنم بحروں میں خوبصورت شعر کہتے تھے۔ نہایت سادہ و شیریں انداز میں روایتی موضوعات کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے کہ ان کی ہر بات میں دلکش نیا پن پیدا ہوجاتا۔ سادگی و پرکاری کے ساتھ تقریباً ہر غزل میں وہ برق و آشیاں کے موضوع پر شعر شامل رکھتے تھے۔ حیدرآباد کے کل ہند مشاعروں میں بھی وہ بے حد پسند کئے جاتے تھے۔ سعید بھائی محبت، خلوص، انکساری، سادگی اور قدیم حیدرآبادی تہذیب کا پیکر تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد اور شگوفہ سے انہیں خاص انس تھا۔

● ربع صدی سے زائد عرصہ تک مشاعروں کو اپنی پر لطف نظامت کے سہارے کامیابی سے ہم کنار کرنے والے ثقلین حیدر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ ثقلین حیدر کو قدرت نے بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ مشاعروں کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ناظم مشاعرہ، شاعر کے کلام سنانے کے ساتھ ہی اس کے اشعار خود دہرائے۔ ثقلین حیدر کا حافظہ بھی کمپیوٹر کی "میموری" کی طرح تھا۔ سنائے گئے اشعار کے موضوعات پر وہ بروقت و برجستہ دوسرے شعراء کے شعر بھی سنایا کرتے اور برموقع لطیفوں سے سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیا کرتے۔ جناب ثقلین حیدر کی خواہش تھی زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعرہ کی نظامت انہیں سونپی جائے چنانچہ چار سال قبل انہیں مزاحیہ مشاعرہ کی نظامت کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ ثقلین حیدر کی پرلطف نظامت نے اس مشاعرہ کو یادگار بنادیا۔

ادارہ شگوفہ مجروح صاحب، سعید بھائی اور ثقلین حیدر کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ مرحومین کو اپنی رحمتوں کی اعلیٰ منازل سے نوازے۔ ☆

زیر نظر شمارے سے شگوفہ کے عام شمارے کی قیمت 14 روپئے ہوگی۔

شگوفہ

جلد ۳۳
شمارہ ۷

حیدرآباد

جولائی ۲۰۰۰ء

قیمت فی پرچہ ۱۴ روپئے   زرسالانہ : ۱۵۰ روپئے   بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064
شگوفہ انٹرنٹ پر : http://www.shugoofa.cjb.net
ای میل : shugoofa @ india.com

Admission-2000/01

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

(پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ء میں قائم مرکزی یونیورسٹی)

نظامت فاصلاتی تعلیم

اُردو ذریعہ تعلیم اور فاصلاتی طریقے سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں:

اعلانِ داخلہ
2000-2001

1 بی اے / بی کام / بی ایس سی سال اول میں داخلہ بذریعہ اہلیتی امتحان۔ رسمی تعلیمی قابلیت نہ رکھنے والے امیدواروں کو بی اے / بی کام / بی ایس سی میں داخلے کے لئے اہلیتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ یہ امتحان ملک کے منتخب مقامات پر 22 اکتوبر 2000 بروز اتوار منعقد ہوگا۔ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2001 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ اہلیتی امتحان کے لئے خانہ پری کی ہوئی درخواست مع رجسٹریشن فیس 100 روپے وصول ہونے کی آخری تاریخ 8 ستمبر 2000 ہے۔ تاخیر فیس 50 روپے (جملہ 150 روپے) کے ساتھ یہ فارم 19 ستمبر 2000 تک جمع کیے جاسکتے ہیں۔

2 بی اے / بی کام / بی ایس سی میں راست داخلہ

3 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے کمپیوٹنگ

کورس نمبر 2 اور 3 کے لیے ایسے امیدوار درخواست دینے کے اہل ہیں جنھوں نے کسی مسلمہ بورڈ/ادارے/یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ یا 2+10 یا ان کے مساوی امتحان میں کسی بھی ذریعہ تعلیم سے کامیابی حاصل کی ہو۔ انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیئے گئے کورسوں کی فہرست پراسپکٹس میں شائع کی گئی ہے۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 دسمبر 2000 ہے۔

نوٹ۔ بی ایس سی پروگرام صرف حیدرآباد، نظام آباد، بنگلور، گلبرگہ اور ممبئی میں اور کمپیوٹنگ پروگرام صرف حیدرآباد، کرنول، بنگلور، بھیونڈی اور ممبئی میں دستیاب ہے۔

4 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اُردو بذریعہ انگریزی
5 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اُردو بذریعہ ہندی
6 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے غذا اور تغذیہ

کورس نمبر 4، 5 اور 6 میں داخلہ کے لئے کسی رسمی تعلیمی قابلیت یا اہلیتی امتحان میں کامیابی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2001 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 دسمبر 2000 ہے۔

یونیورسٹی اور اس کے پروگراموں سے متعلق تفصیلی معلومات پراسپکٹس میں فراہم کی گئی ہیں۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر یا بذریعہ ڈاک نیچے دیئے گئے پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حسب ذیل علاقائی مراکز اور اسٹڈی سنٹروں پر پراسپکٹس مع داخلہ فارم نقد رقم ادا کرنے پر دستیاب ہے۔

ریجنل سنٹر

1۔ **دھلی ریجنل سنٹر** D-277 نئی مارکٹ ایار خمسس، اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی 110 025
2۔ **پٹنہ ریجنل سنٹر** فلیٹ نفیس حیدر، علی نگر، انیس آباد، پٹنہ 800 002 (بہار)
3۔ **بنگلور ریجنل سنٹر** الامین آرٹس سائنس اینڈ کامرس کالج، ہسور روڈ، قریب لال باغ گیٹ، بنگلور۔ 027 560 (کرناٹک)

اسٹڈی سنٹر

☆ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول، سیکنڈ لانسر، گولکنڈہ، حیدرآباد 008 500 (آندھراپردیش) ☆ پی جی کالج، سر ارپنیل روڈ، سکندرآباد 003 500 (آندھراپردیش) ☆ پرنس شکر کالج، پرانی حویلی، حیدرآباد 002 500 (آندھراپردیش) ☆ ستار کالج، مٹ پیٹ، حیدرآباد 500036 (آندھراپردیش) ☆ آرٹس اینڈ سائنس کالج، صوبیدار، ہنمکنڈہ، ورنگل 506010 (آندھراپردیش) ☆ گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول، قلعہ روڈ، نظام آباد 001 503 (آندھراپردیش) ☆ المدینہ کالج آف ایجوکیشن، سالم نگر، محبوب نگر 001 509 (آندھراپردیش) ☆ عثمانیہ کالج، کرنول 001 518 (آندھراپردیش) ☆ شاہ ذکری کالج، راجیشورم، پروداتور 360 516 (آندھراپردیش) ☆ آندھرا مسلم کالج، پور روڈ، گنٹور 003 522 (آندھراپردیش) ☆ شاہین اردو ہائی اسکول، شاہین ایجوکیشنل سنٹر، گاواں چوک، بیدر 401 581 (کرناٹک) ☆ بی بی رضا ڈگری کالج فار ویمن، روضہ، ورٹ گلبرگہ 104 585 (کرناٹک) ☆ انجمن نچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، تخت کری، ہبلی 020 580 (کرناٹک) ☆ انجمن اسلام کالج، 92 ڈی این روڈ، چھترپتی شیواجی ٹرمنس، ممبئی 001 400 (مہاراشٹر) ☆ مدینۃ العلوم ہائر سکنڈری اسکول، بھگیوں، اسلام روڈ، ناندیڑ 604 431 (کرناٹک) ☆ مولانا آزاد کالج، روضہ باغ، پوسٹ بکس 27، اورنگ آباد 001 431 (مہاراشٹر) ☆ شفیق میموریل اسکول، بازہ ہندو راؤ، دہلی 006 110 ☆ مسلم انسٹی ٹیوٹ، 21۔ اے حاجی محمد محسن اسکوائر، کلکتہ 016 700 (مغربی بنگال) ☆ شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ، سٹی اعظم گڑھ 001 276 (اترپردیش) ☆ مرٹھواڑہ انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈی اینڈ ریسرچ، ڈاکٹر اقبال نگر، پربھنی 431401 (مہاراشٹر) ☆ الامین سکنڈری اینڈ ہائر سکنڈری اسکول، اودگیر، ضلع لاتور 517 413 (مہاراشٹر) ☆ اسلامیہ کالج، وانم باڑی، ویلور ڈسٹرکٹ 635752 (تمل ناڈو) ☆ مولانا ابوالکلام آزاد مسلم ہائر سکنڈری اسکول، جودھپور 342009 (راجستھان) ☆ شمسی گرلز ہائر سکنڈری اسکول، نو محلہ روڈ، رامپور 001 244 (اترپردیش) ☆ اے۔ آئی۔ بی۔ ایم کالج، بجنور، بجنور 188 224 (اترپردیش) ☆ بشری اسلامیہ اسکول، بہادر پورہ، حنک روڈ، میم چیدا، نلگنڈہ 001 508 (آندھراپردیش) ☆ اردو تعلیمی مجلس اسکول، احسن منزل، بیدگاہ روڈ، بلاسپور 495001 (مدھیہ پردیش) ☆ الکوثر پبلک ٹرسٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج، رام سوہرا، یاد گیر، مشتوگہ 577202 (کرناٹک) ☆ صمدیہ ہائی اسکول، 349 صمد نگر، کیری، بھیونڈی 302 421 (مہاراشٹر)

بی اے / بی کام / بی ایس سی کورسوں کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت شخصی طور پر حاصل کرنے کی صورت میں 35 روپے اور بذریعہ ڈاک 40 روپے ہے۔ کسی بھی سرٹیفکیٹ کورس کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت نقد 10 روپے اور بذریعہ ڈاک 15 روپے ہے۔ (بذریعہ ڈاک پراسپکٹس منگوانے کے لئے مطلوبہ رقم کا بینک ڈرافٹ **مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی** کے نام اور حیدرآباد میں قابل ادا ہونا چاہئے۔ ڈاک سے داخلہ فارم منگوانے کے لیے ڈرافٹ صرف نیچے دیئے گئے پتے پر ہی ارسال کریں۔)

ڈائرکٹر ڈسٹنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، ہاؤسنگ اکاڈمی، نوبی پلی، حیدرآباد 008 500 (آندھراپردیش)

پروفیسر محمد سلیمان صدیقی، رجسٹرار

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مجتبیٰ حسین

مشتاق احمد یوسفی سے تجدید ملاقات

ہم اکثر اس بات پر سنجیدگی سے غور کرتے رہتے ہیں کہ اردو کے بیشتر سرکردہ مزاح نگار اور طنز نگار جو اپنی تحریروں میں نہایت چوکس، زیرک، مستعد، چالاک، ہوشیار، باخبر بلکہ سفاک تک نظر آتے ہیں وہ اپنی عملی زندگی میں اتنے ہی سادہ لوح، بے لوث، شریف، نیک، مخلص، بے نیاز، بے ریا بلکہ معصوم تک کیوں کر دکھائی دیتے ہیں۔ کرشن چندر، کنہیا لال کپور، ضمیر جعفری، فکر تونسوی اور یوسف ناظم وغیرہ سب کو نہ صرف دیکھ چکے ہیں بلکہ انہیں برت بھی چکے ہیں۔ سب کے سب نہایت سادہ دل اور مخلص بندے نظر آئے۔ رشید احمد صدیقی، ابن انشاء، شفیق الرحمن، کرنل محمد خاں وغیرہ کے بارے میں بھی لوگوں سے سنا کہ عملی زندگی میں یونہی سے انسان تھے۔ اس تضاد پر بہت غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ طنز نگار جن برائیوں یا جن بے اعتدالیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے ان سے وہ اپنی عملی زندگی میں بھی اجتناب کرتا ہے اور اپنے فعل کو خود اپنے قول کے مطابق رکھتا ہے اور لوگ تو اپنا ضمیر تک بیچ دیتے ہیں یہ اپنا "مافی الضمیر" تک بیچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر ہمیں اپنا ہی ایک جملہ اکثر یاد آتا ہے کہ ظرافت نگاری کے لئے آدمی کا ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔

یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ پچھلے ہفتہ پورے سولہ برس بعد اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی سے واشنگٹن میں ہماری ملاقات ہوگئی۔ واشنگٹن امریکہ کا صدر مقام تو ہے ہی۔ ہمارا بھی صدر مقام ہے۔ امریکہ میں کہیں بھی جاتے ہیں تو پھر لوٹ کر یہیں آجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں ہمارا کوئی "وہائٹ ہاؤز" ہے بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں ہمارے چھوٹے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین رہتے ہیں۔ یوسفی جلسوں، محفلوں اور بھیڑ بھڑکوں سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ نہایت کم آمیز، کم گو، اپنے آپ میں بند چھوئی موئی سی شخصیت ہیں۔ ایک مہینہ پہلے جب ہمیں پتہ چلا تھا کہ یوسفی واشنگٹن کی تین تنظیموں آواز ٹیلی ویژن، بزم ادب اور کراچی المنائی اسوسی ایشن کی دعوت پر واشنگٹن آنے والے ہیں تو خود ہمیں بھی اس معجزے پر حیرت ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکہ میں ان کی ایک صاحبزادی بھی رہتی ہیں۔ یوسفی برطانیہ میں، جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے گیارہ برس گزارے ہیں اور جہاں ان کی ایک اور صاحبزادی رہتی ہیں، کچھ دن قیام کے بعد اپنی اہلیہ کے ہمراہ امریکہ آئے ہیں۔ لندن میں ہی ہمارے احباب نے انہیں بتادیا تھا کہ ہم ان دنوں امریکہ میں ہیں۔ واشنگٹن میں ہم ایک عام تماشائی اور ان کے ایک ادنیٰ پرستار کے طور پر ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔ تقریب سے ایک دن پہلے وائس آف امریکہ کے ڈاکٹر معظم صدیقی سے تقریب کی داعی فیروزہ صلاح الدین کا فون نمبر حاصل کرکے مشتاق احمد یوسفی کی آمد کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں "یوسفی صاحب آچکے ہیں اور آپ کے بارے میں دریافت کررہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں"۔ افسوس کہ اس رات ہمیں چند گھنٹوں کے لئے رچمنڈ جانا تھا۔ غرض یوسفی صاحب سے سولہ برس بعد فون پر بات ہوئی۔ کہنے لگے "اگر آپ کل تقریب سے کچھ دیر پہلے ہی آجائیں تو وہاں بھی ملاقات ہوسکتی ہے"۔ اتفاق سے اس وقت ہمارے دو عزیز دوست افتخار عارف اور امجد اسلام امجد بھی فیروزہ صلاح الدین کے ہاں موجود تھے جو اسی وقت پاکستان سے امریکہ پہنچے تھے۔ دونوں سے بھی فون پر باتیں ہوئیں۔ افتخار عارف جو مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے چیرمین ہیں اب اکادمی ادبیات پاکستان کے چیرمین بھی بن گئے ہیں۔

امجد اسلام امجدؔ نے کہا "یار تم اس وقت کیوں نہیں آجاتے "۔ اس پر ہم نے امجد سے کہا "یعنی! تم تو کئی بار امریکہ آچکے ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ باہر سے جو کوئی بھی یہاں آتا ہے تو وہ "میت" میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ باہر سے آنے والے کی حالت بالکل میت جیسی ہوجاتی ہے کیوں کہ جب تک میت کو اٹھایا نہ جائے وہ کہیں جا نہیں سکتی"۔ امجد نے اس بات پر زور دار قہقہہ لگایا۔ پھر کہا "یہاں چار کندھوں کی بجائے موٹر کے چار پہیوں کی حاجت تو ضرور پیش آتی ہے"۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے دن علی گڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن کے ڈاکٹر عبداللہ حسین اور ڈاکٹر اصغر حسین کو لے کر پہلے آواز ٹیلی وژن کے سربراہ ندیم خاں کے گھر جائیں گے جہاں افتخار عارف اور امجد اسلام امجد مقیم ہیں۔ پھر وہیں سے جلسہ گاہ کی طرف جائیں گے۔ یوسفی صاحب کا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔

۱۷جون کو ہم وقت سے پہلے جلسہ گاہ میں پہنچے تو منتظمین نے کہا کہ یوسفی صاحب کب کے آچکے ہیں اور آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ سولہ برس بعد یوسفی صاحب سے مل کر انہیں دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی اس کا حال ہم کیسے بیان کریں۔ لندن میں ان کے ساتھ گزارے ہوئے سارے لمحے یاد آئے۔ اتنے طویل عرصہ بعد یوسفی ہمیں تو بالکل صحیح سالم نظر آئے۔ اگرچہ کچھ دبلے ہوگئے ہیں۔ بال بھی کچھ زیادہ کالے ہوگئے ہیں البتہ چہرہ پر وہی تازگی اور بشاشت برقرار ہے۔ یوسفی اپنی تحریروں میں اپنی کمزور صحت اور اپنی علالتوں کا بڑی محبت کے ساتھ اکثر ذکر کرتے رہے ہیں خیال آیا کہ ایسی صحت مند بیماریاں سب کو نصیب ہوں تو کیا کہنے۔ یوسفی بہت محبت سے ملے اور ہمیں گلے سے لگایا۔ یوسفی اس بات سے بہت رنجیدہ تھے کہ پچھلے سال اردو طنز و مزاح کے حق میں بہت برا ثابت ہوا کیوں کہ ضمیر جعفری، کرنل محمد خاں اور شفیق الرحمن دیکھتے ہی دیکھتے چل بسے۔ شفیق الرحمن کے بارے میں یہ انکشاف بھی کیا کہ نوجوانی میں میری عین تمنا یہ تھی کہ کاش میں بھی شفیق الرحمن کی طرح تحریر لکھ سکوں۔ بہت کوشش کی لیکن ان کی طرح لکھ نہیں پایا۔ نتیجہ میں چھ سات برس تک کوئی تحریر نہیں لکھی، طنز و مزاح کی موجودہ عالمی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے جارج میکش کا قول دہرایا کہ مغرب میں مزاح مرچکا ہے۔ اس پر ہم نے کہا "لیکن مشرق میں تو آپ نے اسے اب تک زندہ رکھا ہوا ہے"۔ حسب معمول مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ پھر خود ہی ہمارے بارے میں فرمانے لگے:

"حضرت! آپ کی تحریریں نظر سے گزرتی رہتی ہیں، آپ میں تین خوبیاں ہیں۔ اول تو یہ کہ آپ قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے ہاں تکرار کا عمل نہیں ہے اور تیسرے یہ کہ آپ کی تحریروں میں تر و تازگی برقرار ہے"۔

ہم شرم سے پانی پانی ہونے لگے تو بولے: "میری ایک بات مانیئے۔ اپنی تحریروں کا ایک ضخیم گمر کڑا انتخاب شائع کیجئے"۔ (یہ ایک اتفاق ہے کہ ابھی پچھلے ہفتہ ہمارے دوست حسن چشتی نے ہماری تحریروں کا ایک انتخاب شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے)۔ یوسفی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ لہٰذا علی گڑھ کا حال پوچھا۔ اپنے ہم جماعت مظفر حسین برنی، سابق گورنر ہریانہ کی خیریت بطور خاص پوچھی۔ یوسفی نے اب تک اردو ادب کو چار کتابیں دی ہیں۔ ان کی لازوال کتاب "آب گم" کو چھپے ہوئے دس برس بیت چکے ہیں۔ یوسفی نے بتایا کہ ان دنوں وہ ایک ناول لکھنے میں مصروف ہیں۔ یہ کب مکمل ہوگا اس کے بارے میں ہم نے کچھ نہیں پوچھا کیوں کہ یوسفی جس اہتمام کے ساتھ لکھتے ہیں اس کے لئے بڑا حوصلہ چاہیے۔ ایک ایک لفظ نپا تلا، ہر جملہ سجا سجایا، ہر پیراگراف کسا کسایا۔ ان جیسا انشاء پرداز اب اردو میں کوئی اور نہیں ہے۔ یوسفی اپنی ہر کتاب کے بیچ کم از کم دس برس کا وقفہ ضرور دیتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ سے مخلص ہیں بلکہ اپنے فن سے بھی مخلص ہیں اور اس کے بعد اپنے معاشرہ اور ساری عالمی برادری سے بھی مخلص ہیں۔ کراچی المنائی اسوسی ایشن کی یہ تقریب نہایت پر شکوہ تھی۔ جس میں امریکہ میں پاکستان کی سفیر محترمہ ملیحہ لودھی کے علاوہ امریکہ میں مقیم پاکستان کی کئی قد آور ہستیاں بھی موجود تھیں۔

اس تقریب میں یوسفی نے ہم جیسے ادنیٰ مزاح نگار کی ہمت افزائی یوں فرمائی کہ جب حاضرین کو مخاطب کرنے کے لئے آئے تو سب سے پہلے اس کمترین کا نام لیا۔ کیسے بتائیں کہ یوسفی کی اس بڑائی نے بےحد متاثر کیا۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت تھا۔ یوسفی نے سوا گھنٹہ تک اپنی تحریروں کا جادو جگایا اور اپنے مختلف مضامین کے اقتباسات سنائے۔ سامعین نے ان کے ہر جملہ پر اس طرح داد دی جیسے شعر پر دیتے ہیں۔ امریکہ کے اردو داں حضرات جو آئے دن کے مشاعروں میں شاعروں کے برسوں پرانے کلام کو سن سن کر اوب چکے ہیں سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ اب نثری محفلوں کے انعقاد کا اہتمام کیا جائے۔ یوسفی ان انشاء پردازوں میں سے ہیں جو اپنی زندگی میں ہی ایک "لیجنڈ" (Legend) بن چکے ہیں۔ فراق گورکھپوری کی ایک غزل کا مقطع ہے:

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی اے ہم عصرو
ان کو جب معلوم یہ ہوگا کہ تم نے فراق کو دیکھا تھا

یوسفی کو ہم نے دیکھا، ان سے باتیں کیں یہ ہمارے لئے ایک اعزاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ☆

جناب مشفق خواجہ کا خط بنام جناب طالب حسین زیدی

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون،

آپ کا گرامی نامہ بلا تاریخ آج ہی موصول ہوا۔ بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے صرف مجھے نہیں، میرے کام کو بھی یاد رکھا، یاد ہی نہیں رکھا، بلکہ بڑی حد تک میری مشکل کو آسان بھی کر دیا۔ نواب ولی الدولہ بہادر اور شمشیر یار جنگ کی تاریخ ہائے وفات کے لئے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کے حوالہ سے متعلقہ جگہ پر ان کا اندراج ہوگا۔

حیرت ہے کہ آج حیدر آباد میں بشیر یار جنگ کا جاننے والا کوئی نہیں۔ یہ تو وہاں کے مشاہیر میں سے تھے۔ بستان آصفیہ، حصہ ہفتم میں صفحہ ۳۴۱ - ۳۴۲ پر ان کے حالات موجود ہیں۔ یہ نذیر جنگ بہادر کے بیٹے تھے۔ انسپکٹر جنرل رجسٹریشن و اسٹامپ تھے۔ مجھے ان کی تاریخ وفات کی ضرورت ہے۔

آپ کے سفر نامے کا تراشہ مل گیا تھا اور اب شگوفہ کے تازہ شمارے میں کرنل محمد خاں پر بھی آپ کا مضمون پڑھ لیا ہے۔ سبحان اللہ کیسا شگفتہ انداز بیان ہے آپ کا۔ البتہ کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ چاہیں تو ایسے مضامین فارسی میں بھی لکھ سکتے ہیں۔

آپ سے ملاقاتوں کی یادیں ہنوز ذہن میں تازہ ہیں۔ بس اس کا افسوس ہے کہ آپ میرے لئے بہت کم وقت نکال سکے۔ اب کے آپ آئیں تو میرے لئے کچھ زیادہ وقت لے کر آئیے گا۔ آپ جب تشریف لائے تھے تو میں بیمار تھا۔ لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ بہتر ہوں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب سے میرا سلام کہئے۔ ان کا شگوفہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ

قطعات

ظفر کمالی
رانی پور، سیوان، بہار

ملک کا اغوا

وہ ریڈیو ہو کہ ٹی وی اسی کا چرچا ہے
ہوا جہاز جو اغوا گیا وہ کابل میں
لگا ہے ڈر کہ کہیں ملک بھی نہ ہو اغوا
کوئی اسے بھی نہ لے جائے چاہِ بابل میں

●☆●

جدید شادی

جدید دور کی شادی جدید رسمیں تھیں
فریق دونوں ظفرؔ یوں خوشی میں پھول گئے
دلھن بھی ہوگئی گھر سے ہنسی خوشی رخصت
خیال بعد میں آیا نکاح بھول گئے

●☆●

محلے کی سیاست

ظفر کامیابی قدم چوم لے گی
جو تھی دور پہلے وہ پاس آگئی ہے
لگے چونا ہلدی نہ کیوں روز ان کو
سیاست محلے کی راس آگئی ہے

●☆●

بندر اور وزارت

دل بدلنا تھا دل بدلتے ہیں
کر کے جنگ وجدل بدلتے ہیں
اب تو لے کر وزارتیں بندر
ہاتھ کا ناریل بدلتے ہیں

باسلیقہ رہبر

ہمارے رہبرانِ قوم اتنے با سلیقہ ہیں
بنانے پر جو آئیں زاغ کو بلبل بناتے ہیں
جو اٹھتا ہے کبھی دردِ ترقی پیٹ میں ان کے
جہاں دریا نہیں ہوتا وہاں بھی پل بناتے ہیں

●☆●

حق خدمت

جیتے چناؤ وہ تو وزارت بھی مل گئی
قسمت نے یاوری کی تھی جنتا بھی ساتھ میں
موقع ملا تو کردیا خدمت کا حق ادا
لاکر کٹورا رکھ دیا پبلک کے ہاتھ میں

●☆●

چار دن کی چاندنی

پھر چناؤ آگیا بٹنے لگی سوغات ہے
خوش نما وعدوں کی ہر سو ہورہی برسات ہے
سبز قدموں نے دکھائے ووٹروں کو سبز باغ
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

●☆●

رباعی

اے رنگ سخن وری جمانے والو
پھل غیر کے پیڑوں کا اڑانے والو
تحصیل تو روشنی کی ناممکن ہے
پاقی سے چراغوں کو جلانے والو

یوسف ناظم

قیصر تمکین کے ایک اشاریئے کے جواب میں ایک اظہاریہ

صہبا لکھنوی کے پچپن سالہ قدیم جریدے "ماہ نامہ "افکار" کے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں مہمان مدیر قیصر تمکین کا اشاریہ پڑھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ (دم بخود رہ جانا میری پرانی عادت ہے۔ پرانی سے مراد یہی کوئی ۵۵ سالہ)۔ پہلے تو شبہ ہوا کہ قیصر تمکین کا نام شاید غلطی سے چھپ گیا ہو۔ اس اشتباہ کی وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ جس نوع (یا نوعیت) کا اشاریہ ان کے نام سے شائع ہوا ہے وہ ایک ہوش مند، تعلیم یافتہ (اور وہ بھی اتنا شدید تعلیم یافتہ جو اندھیرے میں دوسروں کو راستہ دکھانے کے لئے آگے مشعل لے کر چلنے کا کام برسوں سے کر رہا ہو) اور دانشور ہونے کی حد تک روشن خیال شخص کے قلم سے برآمد نہیں ہو سکتا۔ فاضل مہمان مدیر نے اپنے اس اشاریئے میں طنز و مزاح جیسی لطف و انبساط پیدا کرنے والی ادبی طرز نگارش کو اپنے طعن و تشنیع کا سزاوار ٹھہرا کر خود کو (نادانستہ طور پر) تنقید و تحسین کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ انھوں نے اچھا نہیں کیا۔ زحمت تو انھیں ہوگی جو انھیں پڑھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بستر پر نہ سہی آرام کرسی پر بیٹھ کر آرام کرنے کے دن آگئے ہیں۔ مطالعے کے چونکہ وہ عادی رہے ہیں اس لئے وہ اس مشغلے کو تو جاری رکھ سکتے ہیں لیکن مطالعے کے شوقین لوگوں کو عام طور پر مشورہ یہ دیا جاتا ہے کہ مطالعے کے لئے صرف نگاہ کافی نہیں ہے اس کے لئے زاویہ نگاہ ضروری قرار دیا گیا ہے اور خاص طور پر طنز و مزاح کے معاملے میں تو بڑی احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ احتیاط طنز و مزاح کے صارفین کو بھی پیش نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اور قارئین کو بھی۔ صرف سطور لکھنے یا پڑھنے سے تحریر اور زاویہ نگاہ میں فطور در آتا ہے۔ میں ڈر رہا ہوں کہ میری "تمہید" حشو و زوائد کا مجموعہ نہ بن جائے اور میں ایک پیشہ ور مقرر کی طرح اپنے موضوع سے کوسوں دور نہ نکل جاؤں۔ اس لئے کوشش کروں گا کہ جو کچھ عرض کرنا چاہ رہا ہوں وہ طول نہ اختیار کرلے۔

فاضل اشاریہ نگار نے اپنے مقالے میں (میں تو اسے مقالہ ہی کہوں گا کیوں کہ غلطیاں مقالوں ہی میں زیادہ ہوتی ہیں) ایک اعلیٰ درجے کی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے کتاب کا نام ہے "رہنمائے مسرت" (Guide to Happiness By Alain De Botton) کتاب کا حوالہ دیا ہے تو ظاہر ہے پڑھی بھی ہوگی لیکن پتہ نہیں موصوف کی حِس مزاح میں خلل کیسے واقع ہوگیا۔ (وہ مزاح نگار نہ ہوں کوئی حرج نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ان کا مزاح نگار نہ ہونا ادب پر احسان ہے) لیکن حِس مزاح تو ان میں ہونی ہی چاہئے (کم و بیش کی بات الگ ہے)۔ لکھتے ہیں:

"اہل اختیار کے حاشیہ بردار ادیب و شاعر بھی پوری شدت کے ساتھ اپنی قابل نفریں صلاحیتوں کو کام میں لاکر مذاق، طنز اور ہجو نگاری کے دفتر لگادیتے ہیں۔ اردو ہی نہیں دنیا کے کسی بھی ادب میں دیکھ لیجئے۔ طنز و مزاح کو زیادہ تر ترقی پسند قوتوں کا راستہ روکنے اور آگے بڑھنے والے عناصر کی راہ کھوٹی کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے"۔

اچھا ہوا کہ فاضل اشاریہ نگار نے اپنی اس انشاپردازی پر نظر ثانی نہیں کی۔ نظر ثانی کرتے تو خبر لیجئے دہن بگڑا کی صورت پیدا ہوجاتی۔ اسی مقالے میں موصوف کے اشہب قلم سے تیز رفتاری کے ساتھ طرارے بھرنے کے دوران ایک طرارہ یہ بھی خارج ہوا ہے "ان ترقی پسند حلقوں کے بھی اکھاڑے یا دبستان ہوتے ہیں"۔ اب اس طرارے کو مزاح کے خانے میں ڈالا جائے یا طنز کے۔ وہ ایک جگہ ترقی پسندوں کی قوت، کا اعتراف کرتے ہیں اور ایک جگہ ان کے دبستان پر اکھاڑہ نام کی تختی لگادیتے ہیں۔ (لیکن میں اس لحاظ سے

ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ اکھاڑے کے بغیر قوت کا تصور ممکن نہیں ہے) ۔

فاضل مہمان مدیر نے "اپنے دلایل کو مدلل اور مستک بنانے کے لئے لکھا ہے ۔

" جس طرح زمینداروں کے کارندے ، سامراجیوں کی فوج اور رجعت پسندوں کے " بندھک " اور دُلّ ہوتے ہیں اسی طرح علم و فن کی دنیا میں مزاح نگار ہوتے ہیں جو ہر نئی تحریک کا مذاق اڑاتے ہیں " ۔ ویسے یہ جملہ مجھے بے حد پسند آیا اس لئے کہ موصوف نے مزاح نگاروں کو علم و فن کی دنیا کا باشندہ تو تسلیم کیا ۔ اسے شاعری میں شاید صنعت تضاد کہتے ہیں ۔

جب مزاح نگاروں کا ذکر آگیا تو انہیں دو مزاح نگار (بری طرح) یاد آگئے ۔ ایک شوکت تھانوی اور دوسرے اکبر الہ آبادی ۔ میں نے یہاں تحقیق کی تو کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ ان دونوں سے فاضل مہمان مدیر کے خاندانی تعلقات بہت خراب تھے ۔ حالانکہ دونوں میں تعلقات تھے ہی نہیں ۔ دونوں میں کامل ایک یا دو نسلوں کا بعد تھا اور یہی تعلقات کی خرابی کی وجہ بنا ۔ اسے ہمارے معاشرے میں قبائیلی طور طریق کہا جاتا ہے ۔ زیر بحث مقالے میں اس رنجش اور کشیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے لیکن الفاظ پڑھنے سے پہلے کہئے واہ واہ ! " غیر منقسم ہندوستان میں جب سوراج اور معاشی آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی تو شوکت تھانوی نے سودیشی ریل لکھ کر ملک کی تحریک کا خوب مذاق اڑایا " ۔ (جو بھی مقالے کے اس جز کو پڑھے گا یہی کہے گا مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا یعنی کہ مزاح نگاری اور ظرافت نگاروں کا خود ساختہ اور خود کار پنکھا رہا ہوں " ۔

بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ شوکت تھانوی کا یہ مضمون محکمہ ریلوے کے کارکنوں کی بند آنکھیں کھولنے کا کارنامہ انجام دے چکا ہے ۔ کیوں کہ یہ طرز نگارش بجائے خود دوائے دل ہے اور وہ شوکت تھانوی ہوں یا رشید احمد صدیقی ، بطرس ہوں یا فرحت اللہ بیگ ، عظیم بیگ چغتائی ہوں یا کوئی اور ۔ سب کے سب اسی دوائے دل کی دکانیں لگائے بیٹھے تھے ، لیکن یہ نسخہ سب کی سمجھ میں نہیں آسکتا ۔ زیر نظر مقالے میں اکبر الہ آبادی کا بھی ذکر خیر ہے وہ یوں کہ " اکبر نے بھی یہی کام کرتے ہوئے (یعنی مذاق اڑاتے ہوئے) مسلمانوں کی شعوری پیش قدمی کو روک دیا " ۔

ادب میں فتوے دینے اور کسی ادیب کو خارج از ادب کرنے کا رواج نہیں ہے لیکن " در تو بہ " پر تو تالے نہیں لگے ہوئے ہیں ۔ مقالہ نگار نے اپنی اس تہمت تراشی ، کو اگر جراءت مندانہ تنقید سمجھا ہے تو تخلیقی ادب پیدا کرنے والے سوائے اس کے کہ بس اپنا سر پیٹ لینے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں ۔ ایسی ہی " تنقیدیں ، صنف تنقید سے لوگوں کو بدظن اور برگشتہ کرانے کا کار خیر انجام دیتی ہیں اور انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہیں کہ تنقید نگار خود تو اپنا مکان تعمیر نہیں کر سکتے کرائے کے مکان میں رہ کر تعمیراتی نقائص ڈھونڈتے رہتے ہیں ۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ اس رائے کی تائید کی جائے لیکن ادب بجائے خود ایک قرینہ ہے خواہ وہ لٹریچر ہو یا تمیز و آداب ۔ اکبر الہ آبادی نے جب یہ کہا تھا کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی تو یہ دانش گاہوں کی مخالفت میں نہیں کہا تھا بلکہ نظام تعلیم نصاب اور ماحول کا قصیدہ تھا ۔

سرسید نے یہ شعر پڑھا اور ایک یونیورسٹی قائم کی ورنہ ان کا اس وقت ملک میں اتنا رسوخ تھا کہ وہ سارے کالج بند کروا سکتے تھے ۔ حالی کا ایک شعر ، جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار ، اس لحاظ سے انقلابی شعر تھا کہ اس شعر کے منظر عام پر آنے کے بعد دلی کی جامع مسجد میں جوتوں کی چوری کا سلسلہ بند ہوگیا ۔ (جب کہ ادب میں اور خاص طور پر تنقید میں سرقے کا سسٹم جاری رہا ۔) صرف میں نہیں بلکہ اس شعر کی تخلیق کے بعد بعض بیروزگاروں کے لئے رزق کا دروازہ بھی کھل گیا ۔ آج مسجدوں میں اور اس کے گرد و نواح میں جوتوں کی حفاظت باضابطہ ایک ذریعہ معاش ہے ۔ مزاح نگاری کا یہ مثبت پہلو پیش نظر رکھنا چاہئے ۔ اکبر

الہ آبادی نے جب کہا تھا کہ اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے لیکن پسپا ہوگئے بیگم کی فوج سے تو اس شعر کی وجہ سے معاشرے میں شادی کا سسٹم فی الفور منقطع ہوجاتا لیکن ایسا نہیں ہوا اور زن و شو کے ازدواجی تعلقات میں بہتری پیدا ہوئی۔

فاضل اشاریہ نگار میرے اس نقطہ نظر اور تجزیہ سے متفق نہ ہوں تو یہ ان کا شخصی معاملہ ہوگا۔ ہر کسی کے حالات زندگی الگ الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ پیری مریدی میں "زن مریدی" کو سب پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا سہرا کسی نہ کسی بیگم کے سر ہے۔ میں اپنی "دریدہ قلمی" کا سلسلہ زیادہ دیر برقرار نہیں رکھنا چاہتا لیکن تمت بالخیر کہنے سے پہلے فاضل اشاریہ نگار کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے کم سے کم اقبال کے مزاحیہ کلام کا کوئی حوالہ نہیں دیا ورنہ اقبال بھی نئی تہذیب کے انڈوں کو گندا کہہ چکے ہیں۔ نئی تہذیب سے کوئی بھی متنفس اپنے آپ کو بے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اتنا تو کرہی سکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی کا فرزند بن کر سیلاب عشرت میں نہ بہہ جائے۔ یہ کہنے کی بات نہیں ہے کہ نئی تہذیب سے کیا حاصل کرنا ہے اور اس کا کون سا متبرک حصہ رد کرنا ہے یہ آدمی کے صوابدید پر منحصر ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے اور چونکہ اقبال فارسی شعر بھی کہتے تھے اس لئے کسی رمز کے بغیر انہوں نے فارسی میں کہا تھا کہ:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دختران بے حجاب

اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ:

قوتِ افرنگ از علم و فن ست

نئی تہذیب کے گندے انڈوں کا آملیٹ صرف ان لوگوں کے دسترخوان پر ہے جو زمیتن برائے خوردن قائل ہیں۔ میں اگر اسی نہج پر سوچ سکتا جس نہج کی فاضل اشاریہ نگار نے ترغیب دلائی ہے تو یہی کہتا کہ رشوت ستانی کو بام عروج پر پہنچانے کی ذمہ داری حضرت جوش پر ہے کیوں کہ انہوں نے کہا تھا کہ رشوت لے کر پکڑا گیا ہے تو رشوت دے کر چھوٹ جا۔ (کیا اس شعر سے مسلمانوں کی شعوری پیش قدمی کو روکنے کا نصف سہرا، اکبر الہ آبادی کے ساتھ جوش کے سر پر بھی باندھا جاسکتا ہے ـــ)

میرے ممدوح یقیناً مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور انہوں نے انگریزی ادب کا بکثرت مطالعہ کیا ہے۔ ہم نے جب یہ ادب پڑھا تھا تو اس میں یہی بتایا گیا تھا کہ سوئفٹ کی مزاح نگاری نے فرانسیسی اور انگریز خواتین کے "سرپوشی" کے فیشن کو یکسر بدل دیا تھا۔ (سرپوشی سے مراد ان کے پیٹ ہیں)۔ سوئفٹ سے لے کر آج تک کے مزاح نگار جن میں مارک ٹوین اور لی کاک شامل ہیں سارے کے سارے محب وطن ہیں اور ساتھ ساتھ ترقی پسند بھی ہیں۔ اناطول فرانس نے جب کہا تھا کہ "دولت دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے" تو کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کارل مارکس کو اپنا سارا فلسفہ اس حملے کے بدلے میں پیش کردینا چاہیئے تھا لیکن اسے غالب کا حوصلہ نہیں ملا تھا۔ جس نے مومن کے ایک شعر پر اپنا دیوان (صرف اردو دیوان) پیش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ خاکسار کا خیال ہے اردو ادب اور خاص طور پر اردو ظرافت کا مطالعہ کچھ لوگوں کو از سر نو کرنا چاہیئے ـــ☆

●☆●

اقبال شانہ
حقل، سعودی عرب

غزلیں

اظہار محبت کو سمجھتے بھی نہیں ہیں
لگتے وہ نا سمجھ ہیں پر اتنے بھی نہیں ہیں

یارو ابھی سے جسم کا لرزاں ہے روم روم
وہ بن سنور کے سامنے آئے بھی نہیں ہیں

دیکھا جو ان کو ہوگئے ہوش و حواس گم
چکرا کے ہم دھڑام سے گرتے بھی نہیں ہیں

ٹکرا گئے ہیں آپ سے ہم جان بوجھ کر
آنکھیں نہیں ہیں سر پہ ہم اندھے بھی نہیں ہیں

" می ٹیل یو مائی ڈارلنگ ، می لو یو باوڈو "
انگلش ہماری آپ سمجھتے بھی نہیں ہیں

الو کی طرح جاگتے رہتے ہیں رات دن
ہم یار کے فراق میں سوتے بھی نہیں ہیں

ہم سے زیادہ لوگ ہمیں جاننے لگے
ہم اپنے آپ کو ابھی سمجھے بھی نہیں ہیں

یہ اور بات ہے کہ ہوئے مضمحل قوی
کچھ کر نہیں سکتے ہیں ، ہم ایسے بھی نہیں ہیں

جانے ہماری ذات پہ کیوں شک ہے آپ کو
ایسے جو ہم نہیں ہیں تو ویسے بھی نہیں ہیں

یہ زندگی بھی جانے کہاں مر گئی ہے آج
وہ آخری دیدار کو آئے بھی نہیں ہیں

اپنی زباں سے ان کی میں تعریف کیا کروں
اتنے برے نہیں تو اچھے بھی نہیں ہیں

شانہ سمجھ میں آنہ سکی تیری شاعری
اشعار سن کے لوگ اچھلتے بھی نہیں ہیں

●☆●

جگر کی چوٹ کا دل پر اثر کچھ اور ہوتا ہے
مگر یارو علاج ڈاکٹر کچھ اور ہوتا ہے

اثر دونوں پہ یارو عشق کے وائرس کا ہوتا ہے
ادھر کچھ اور ہوتا ہے ادھر کچھ اور ہوتا ہے

لپٹ جاتے ہیں تم سے ڈر کے ہم جنگلی درندوں سے
تمہارے ساتھ جنگل کا سفر کچھ اور ہوتا ہے

ترے بن ہلکاہلکا درد ہوتا ہے مرے سر میں
تری موجودگی سے درد سر کچھ اور ہوتا ہے

تمہاری گفتگو شاید سمجھ سے ہے مری باہر
" اگر " کچھ اور ہوتا ہے " مگر " اور ہوتا ہے

نہ اٹھ سکتے ہیں بستر سے نہ چل سکتے ہیں پیروں پر
مری جانِ جگر دردِ کمر کچھ اور ہوتا ہے

ہمیں شیطان اکثر نیند میں لوری سناتا ہے
ہمارا موڈ بھی وقتِ سحر کچھ اور ہوتا ہے

کئی رنگین چہرے میں نے دیکھے ہیں میاں شانہ
ترے چہرے کا میری جاں کلر کچھ اور ہوتا ہے

●☆●

عابد معز
(ریاض)

دان شور

بہت دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں اپنے ایک سب ایڈیٹر دوست کے ساتھ اخبار کے دفتر میں بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ ایک صاحب غصہ میں بپھرے تشریف لائے۔ صورت سے پڑھے لکھے معلوم ہو رہے تھے۔ چہرے سے شرافت اور ذہانت ٹپک رہی تھی۔ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں پائپ تو دوسرے ہاتھ میں ایک خوبصورت بریف کیس تھا جو غالباً کتابوں اور کاغذوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک عینک آنکھوں پر لگی تھی تو دوسری عینک گلے میں لٹک رہی تھی۔ موصوف میرے دوست سے مخاطب ہوئے۔ "آپ نے آج کے اخبار میں میرا مکمل بیان شائع نہیں کیا ہے"۔

سب ایڈیٹر نے عذر پیش کیا۔ "جناب جگہ کی تنگی کے باعث آپ کا بیان مکمل شائع نہ ہوسکا ہوگا"۔

"جگہ کی تنگی دوسروں کے لئے ہوسکتی ہے میرے لئے نہیں"۔ موصوف نے اسی غصہ میں کہا۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ جناب والا کی تعریف" میرے دوست نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"آپ مجھے نہیں جانتے!" موصوف نے حیرت کا اظہار کیا اور سینہ پھلاکر فخر سے کہا: "میں اس شہر کا ایک بہت بڑا دان شور ہوں"۔

"دان شور" ہم دونوں نے ایک ساتھ دہرایا۔

"جی میں دان شور ہوں۔ کسی مسئلہ پر اور کسی بھی اہم واقعہ پر میری رائے لی جاتی ہے۔ میرے بیانات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ موصوف نے ہمیں سمجھایا۔

موصوف کے سمجھانے کے باوجود ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ دان شور ہے کیا بلا۔ میں نے اپنی کم علمی کا اظہار کیا۔ "معاف فرمائیے۔ دان شور اب بھی ہماری سمجھ سے باہر ہے"۔

موصوف نے حقارت سے ہمیں دیکھا اور سب ایڈیٹر سے گویا ہوئے "معلوم نہیں کس نے تمہیں اس کرسی پر بٹھایا ہے۔ دان شور کے معنی نہیں جانتے اور سب ایڈیٹر بنے بیٹھے ہو۔ دان شور کو انگریزی میں Intellectual کہتے ہیں۔"

"دان شور"۔ یعنی آپ کی مراد دانشور سے ہے" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں! وہی وہی آپ دانشور کہتے، میں اسے دان شور کہتا ہوں" موصوف نے وضاحت کی۔

سب ایڈیٹر اور دان شور صاحب ایک دوسرے سے الجھ گئے اور میں موصوف کے دیے گئے لفظ دانشور کے نئے تلفظ اور معنی پر غور کرنے لگا۔ دان شور صاحب نے دور حاضر کے ایک بہت بڑے المیہ کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ آج علم و دانش اور فہم و فراست کی باتیں کرنے والے جنھیں دانشور کہتے ہیں دکھائی نہیں دیتے۔ دان شوروں کا دور دورہ ہے۔ دان شور جو شور دان کرتا ہے۔ دان شور کی آسان تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ دان شور وہ ماہر شخص ہے جو اپنی موجودگی، باتوں یا حرکات سے اپنے اطراف اور سماج میں شور پیدا کرتا ہے۔

خال خال کوئی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہے جس پر دانشور ہونے کا گمان گزرتا ہے ۔وہ گمنام ہوتا ہے ۔اس کی باتیں دل کو موہ لیتی ہیں ۔ اس کی ذہانت پر رشک ہوتا ہے لیکن آج کوئی ان کی باتیں سننے کے لئے تیار نہیں ہے ۔جب ایسے لوگوں کی باتیں ہی نہیں سنی جاتیں تو پھر انہیں زہر کا پیالہ دینے یا سولی پر چڑھانے کا سوال کہاں اٹھتا ہے ۔زیادہ سے زیادہ بچے تالیاں بجاتے ان کے پیچھے پڑتے ہیں ۔اس لحاظ سے دور حاضر دانشوروں کے لئے بہت محفوظ ہے ۔وہ کتنی ہی عقل و فراست کی باتیں کریں ۔کوئی انہیں پوچھتا نہیں اور کوئی ان کی ستاتا بھی نہیں ۔ بعض مرتبہ انہیں اپنی ہی باتیں عجیب و غریب نظر آتی ہیں ۔جب کوئی دانشور اس قسم کی صورتحال سے دوچار ہوتا ہے تو وہ بھی شور دان کرنے لگتا ہے ۔

حقیقی دانشوروں کی غیر موجودگی کے سبب کئی خود ساختہ دانشور حضرات وجود میں آگئے ہیں ۔ہر میدان میں اور ہر محاذ پر ایسے خود ساختہ دانشور ملتے ہیں ۔ خود ساختہ دانشور حضرات دراصل دان شور کے زمرے ہی میں آتے ہیں ۔وہ اس بات کو نہیں ملتے ۔ سینہ ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہم دانشور ہیں ۔خود ساختہ دانشوروں کی پہچان بہت آسان ہے اپنی بات کو پیش کرنے کا ان کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے ۔ گفتار کے وہ غازی ہوتے ہیں اور ان کے کردار کے بارے میں علم نہیں ہوتا ۔چند جملے ان کا تکیہ کلام ہوتے ہیں جیسے میری ناقص رائے میں ....آپ حضرات کے سامنے مجھ جیسے جاہل شخص کا لب کشائی کرنا کہیں گستاخی قرار نہ پائے ....میں طفل مکتب ہوں .....آپ حضرات کی محبت اور سرپرستی نے مجھ جیسے ذرہ کو آفتاب بنادیا ۔ اب کوئی دان شوروں سے پوچھے بھائی صاحب ۔جب آپ اتنے کمتر ،حقیر اور فقیر ہیں تو خاموشی سے کسی کونے میں بیٹھ کیوں نہیں جاتے اور اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا اظہار کیا ضروری ہے ؟۔

دان شور حضرات کی ایک اور پہچان ہے ۔کسی واقعہ کے بعد اظہار افسوس یا اظہار مسرت سے پہلے یہ ضرور کہیں گے کہ مجھے اس کا پہلے سے علم تھا ۔میں جانتا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے یا میں نے پہلے ہی کہدیا تھا ۔گویا انہیں ہونے والی سبھی باتوں کا علم ہوتا ہے ۔میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ وہ سب کچھ ہوجانے کے بعد ایسا کیوں کہتے ہیں ۔اگر انہیں نتیجہ کا اندازہ رہتا ہے تو پھر پہلے ہی کیوں نہیں بتادیتے ۔ اس سوال کا جواب میرے ایک دوست نے دیا ۔کسی کو بھی غیب کا علم نہیں شور دان کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے "۔

سیاست دان ،لیڈر اور قائد پیدائشی دان شور ہوتے ہیں ۔ انہیں شور شرابہ غل غپاڑہ اور دھوم دھڑکا بپا کرنے کا فن خوب آتا ہے ۔سیاست دان بہت اچھے فن کار ہوتے ہیں لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ سیاست سے اداکاری کے میدان میں قدم رکھنے کا رواج نہیں ہے جبکہ فن کار کے لئے اداکاری سے سیاست میں داخل ہونا آسان ہے ۔سیاست اور اداکاری دونوں پیشے ہی میڈیا کی پہلی ترجیح ہوتے ہیں ۔وہ کچھ بھی کریں اور کہیں بھی جائیں کیمرے کی آنکھ اور صحافیوں کے قلم کی گرفت میں رہتے ہیں دور حاضر میں سیاست اور اداکاری ایسے گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ سیاست میں اداکاری ہورہی ہے یا اداکاری میں سیاست ۔دونوں صورتوں میں بھگتنا عوام کو پڑتا ہے ۔میں شاید موضوع سے بھٹک گیا ہوں ۔ یہ دو پیشے ایسے ہیں اچھے اچھوں کو بھٹکادیتے ہیں ۔ بھلا میں کس کھیت کی مولی ہوں ۔

میں زور دے کر کہنا چاہتا تھا کہ سیاسی قائدین اور اداکار بہت بڑے دان شور ہوتے ہیں ۔ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ سیاسی قائدین اپنے بیانات اور فن کار اپنی حرکات سے شور بپا کرتے ہیں ۔آپ نے سیاسی قائدین کے ایسے کئی بیانات دیکھے ،سنے اور پڑھے ہوں گے بلکہ ان کی عام باتیں تک اسی مقصد کی غماز ہوتی ہیں ۔عام انسانوں کی طرح وہ بات کم ہی کرتے ہیں ۔ کہیں گے میں نے

وارننگ دے دی ہے ..... دو گھنٹوں کے اندر ہم حکومت گرادیں گے ..... ہم نے کال دے دی ہے ...... ہم مارچ کریں گے ..... ہم ہڑتال کریں گے ...... ہم پتھراؤ کریں گے ...... ہم گھیراؤ ڈالیں گے ...... ہم سبق سکھائیں گے ..... اب آپ ہی اندازہ لگائیں۔ اس طرح کی گفتگو میں دانشوری کہاں ہے۔ ان سے شور بپا ہونا تو معمولی بات ہے۔ طوفان بھی اٹھ سکتا ہے بلکہ اکثر اٹھتا ہی ہے۔

اداکار اور فن کار اپنی عجیب و غریب حرکات کے سبب شور دان کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ ہنگامہ کرنے کے لئے کب کیا حرکت کر بیٹھیں گے۔ خود انہیں بھی اس کا اندازہ نہیں رہتا۔ کبھی کسی کو چوم لیا تو کبھی کسی سے شادی کرلی۔ کبھی کسی سے لڑائی کرلی تو کبھی کسی سے دوستی۔

دولت آنے سے دان شوری بھی آتی ہے۔ دولت مند لوگوں کے شور دان کرنے کے ٹھاٹ نرالے ہوتے ہیں۔ جہاں چند سکوں سے کام چل سکتا ہے وہاں بے دریغ دولت لٹا کر شور بپا کرتے ہیں اور جہاں پیسے چاہیں وہاں ہاتھ کھینچ کر دھوم مچادیتے ہیں۔

لوگ دان شوروں کو پسند کرتے ہیں۔ انہیں اپنا آئیڈیل جانتے ہیں انہیں اپنا قائد تسلیم کرتے ہیں۔ لوگ ان کے فین بنتے ہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں کچھ ہنگامہ ہو اور کچھ دھوم مچے۔ دان شور حضرات نباض ہوتے ہیں۔ وہ یہ بات خوب جانتے ہیں کہ عوام میں کس قسم کی باتوں اور حرکات سے شور اٹھتا ہے۔ وہ کرتے وہی ہیں جس سے ان کی دھوم ہوتی ہے ان کو شہرت ملتی ہے اور پہلے سے ہوئی شہرت کو چار چاند لگتے ہیں وہ دانشوروں کی طرح علم و فراست کی باتیں کر کے عوام سے دور نہیں ہوتے۔ بعض مرتبہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دانشوری کا دور لد گیا ہے اور اب شور شرابہ اور موج مستی کرنے کا دور ہے۔ یعنی دان شوروں کا زمانہ ہے۔ ☆

ظہیر قدسی
86۔ منگل واروارڈ، نزد نورانی مسجد، مالیگاؤں۔

شام زندگی کا سفر

(سرکار کی طرف سے ۶۰ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کو آدھے پر سفر کی رعایت ہے)

جن کے لئے بچا نہیں دنیا میں کوئی کام گھر میں بھی جن کی ہو گئی ڈھیلی ذرا لگام
سرکار کی طرف سے ہوا ان کا انتظام آدھے کرایہ پر یہ سفر اب کریں مدام
ہر اک سفر میں دیش کے گن گاتے جائیے
جو لیڈروں سے بچ گیا وہ آپ کھائیے

یہ سچ ہے کرنا چاہئے بوڑھوں کا احترام ان کا ہے اختتام پہ اب سارا تام جھام
ان پر کرم کریں تو بڑھے گا وطن کا نام سرکاری آفسوں کا بھی تھوڑا بڑھے گا کام
آئی کارڈ جس کلرک کے میبل پر جائے گا
وہ چار سو میں بچے کو بوڑھا بنائے گا

یہ صرف دیکھنے کے یا سننے کے بس کا ہے یہ حال ایک دو کا نہیں آدھ دس کا ہے
بوڑھا ہر ایک طوطا سیاسی قفس کا ہے ہر پارٹی کا صدر بھی ستر برس کا ہے
شاید اسی لئے تو ہے بھارت جھمیلے میں
اس کے وزیر و صدر ہیں اسی کے ریلے میں

بوڑھوں کو آج وقت گزاری کے واسطے تنہائیوں کی گوٹا کناری کے واسطے
اک جسم دیتے اوڑھنی، ساری کے واسطے دیتے کھلونا ایک مداری کے واسطے
پیکر حسیں یہ پاتے اگر ہاف ریٹ میں
بے وقت درد اٹھتا جوانوں کے پیٹ میں

دیجئے سفر کے ساتھ ہی دیگر رعایتیں دن رات سنئے ماضی کی ان سے حکایتیں
شاعر اگر ہو دیجئے اس کو صدارتیں ان پر ذرا زیادہ ہی کیجئے عنایتیں
دیں ان کو ہاف ریٹ میں اب ٹیری کاٹ تک
پہنچائیں ہاف ریٹ میں شمشان گھاٹ تک

ہم سب یہ مانتے ہیں کہ تم ہو سخن شناس کیا بات، کیا سبب ہے کہ ہو اس قدر اداس
اچھی سی نظم کہہ کے بھی کیوں تم ہو محو یاس کیا اس لئے کہ ہو اسی منزل کے آس پاس
ایسا کرو جب آہی گئی زندگی کی شام
آدھے معاوضے میں سنایا کرو کلام

منظور الامین
حیدرآباد

محاورے باز

ہماری زندگی کلر بائی ٹیکنی کلر ہے۔ صبح سے شام تک اور رات سے تا صبح زندگی کے رنگ نظر آتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ ہلکے، کچھ گہرے، کچھ پھیکے، کچھ تیکھے، یہ رنگا رنگی کچھ تو عجیب و غریب واقعات اور سانحات کی شکل میں ملتی ہے۔ کچھ تو قدرت کے جلوؤں کی شکل میں اور کچھ جانوروں، اور چرند پرند کی صورت میں، انسان بھی رنگا رنگ ہوتے ہیں۔

ہمیں اور آپ کو زندگی میں ایک اس باز کے علاوہ جسے شہباز کہتے ہیں کئی اور طرح کے باز بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہانے باز، چالباز، جوئے باز، دغا باز، دھوکے باز، بلڑ باز، بز باز (یعنی بکرے اور بندر نچانے والا)۔ عاشق جانباز وغیرہ۔ ان بازوں میں ایک اور باز جوڑ لیجئے۔ محاورہ باز۔

زبان کے ساتھ ہمیں محاورے بھی آبا و اجداد اور پرکھوں سے ملتے ہیں جن کی بنیاد میں انسانی زندگی کے تجربے اور بیتی ہوئی باتیں ہوتی ہیں۔ ہم جو آج کے دور میں جی رہے ہیں، کچھ ایک محاورے روزمرہ کی زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر گڑھتے اور تراشتے رہتے ہیں جو ہماری زبان کے ایک اہم خلا کو پر کرتے ہیں، زبان میں نئے نئے محاورے آتے رہتے ہیں۔ پرانے تو ساتھ دیتے ہی ہیں۔

فارسی زبان میں لفظ "محاورہ"، "مکالمہ" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس بات میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں کہ کسی بھی زبان کے محاوروں میں اس ملک کے رسم و رواج، Ethos تہذیب، تمدن صدیوں کی سوچ اور Wisdom گھلی ہوتی ہے۔

ہم اپنے ایک دوست کو جانتے ہیں جن کا محاورہ بازی میں کوئی جواب نہیں، یہ صاحب بات، بے بات، موسم، بے موسم محاورے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے پاس اتنے سارے محاوروں کا اسٹاک کہاں سے آیا۔ مزے کی بات یہ کہ محاورہ استعمال کرتے انہیں دیر نہیں لگتی وقت آتے ہی وہ اپنی کمپیوٹری میموری کا وہ اہم بٹن Punch کرتے ہیں جس کے دباتے ہی محاوروں کے باہر آنے کی یلغار شروع ہو جاتی ہے۔ بہر حال ان کی اسی طرز گفتگو کی وجہ سے یاروں نے ان کا نام "محاورے باز" رکھ چھوڑا ہے بلکہ لوگ ان کو ان کے اصلی نام سے نہیں پکارتے بلکہ کچھ اس طرح سے ان کے بارے میں آپس میں گفتگو کرتے ہیں: وہ دیکھو محاورے باز جارہا ہے، ادھر دیکھو محاورے باز پیڑ سے الٹا لٹک کر یوگا کر رہا ہے، وہ دیکھو محاورے باز کا سالا آرہا ہے۔ ملاحظہ ہو محاورے باز مولی کھا رہا ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ سو پشت سے ان کے بزرگ دادا، پردادا، سپہ گری کرتے آئے ہیں ہمارے یہ دوست بھی کہتے ہیں کہ سو پشت سے وہ اور ان کے باپ دادا محاورہ بازی کرتے آئے ہیں اور اس مقابلے میں ان سے بازی لے جانا ممکن نہیں۔ یہ صاحب اس صفائی، چابک دستی اور تیزی سے محاورے استعمال کر لیتے ہیں کہ انہیں دیکھتے بلکہ سنتے ہی بنتی ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے ہمارے یہ دوست سڑک پر بگٹٹ چلے جارہے تھے کہ ہم نے ان کا دامن پکڑ کر کھینچا اور بولے "یار ایسی بھی کیا جلدی ہے، رک جاؤ، آؤ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے"۔

بولے: "یار اس وقت شارٹ ہینڈ میں بات ہو تو ٹھیک ہوگا"۔
ہم نے کہا: "ہم چاہتے ہیں کہ آج تم سے جانوروں، پرندوں، کیڑوں، مکوڑوں، درندوں سے متعلق محاوروں کی بات ہو"۔
فرمایا: "بھیا میں ذرا جلدی میں ہوں تم جانتے ہو میں آدھا تیتر آدھا بیڑ والی فلاسفی میں یقین نہیں رکھتا۔ لگتا ہے کولھو کا بیل بن گیا ہوں۔ اس لئے میرے اور تمہارے درمیان محاورہ فی الحال ملتوی" ۔
ہم نے کہا: "خیر پھر سہی"
بولے: "یار ویسے ایسی جلدی بھی نہیں وہ جو کہا ہے نا کہ آدمی کتا بن جائے لیکن چھوٹا بھائی نہ بنے سو ٹھیک ہی ہے۔ ان دنوں بڑے بھیا کے کاموں ہی میں لگا رہتا ہوں۔ تم یہیں سامنے پارک میں بیٹھو بس میں گیا اور آیا"۔
ہم نے پوچھا: "آنے میں کہیں گھنٹہ تو نہیں لگ جائے گا؟"
"نہیں" انہوں نے کہا: "ویسے ایک گھنٹے کا ہے ہی کیا پانچ منٹ میں تو گزر جاتا ہے"۔
خیر پانچ تو نہیں وہ پورے پینتالیس منٹ میں لوٹے۔ اب چہرے پر مسکراہٹ تھی، ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا اور آنکھوں میں اطمینان، آتے ہی فرمایا "اب ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ آبیل مجھے مار"۔
ہم نے کہا: "بھئی کئی دنوں سے ایک بات تم سے پوچھنا چاہتے تھے لیکن پوچھ نہ پائے، یار یہ تو بتاؤ کیا الو ہچ مچ ٹیڑھا ہوتا ہے؟"
بولے "ارے بھیا، وہ بھی کیا کتے کی دم ہے جسے لاکھ سیدھی کرو ٹیڑھی ہی بنی رہتی ہے۔ ہاں یہ تو بتاؤ یار کہ تم نے کہیں ہمیں کاٹھ کا الو تو نہیں سمجھ رکھا ہے؟ سچ کہیں ہم تو اس وقت اپنا الو سیدھا کرنے گئے ہوئے تھے"۔
"کہاں؟" ہم نے پوچھا۔
"ارے وہیں کالے خاں ولد لال خاں کے گھر اس کے گاؤں پھول پور میں، پاس ہی تو ہے یہ گاؤں۔ سچ کہوں یار کالے خاں صرف نام ہی کا نہیں دل کا بھی کالا ہے۔ دراصل اڑتی چڑیا کے پر پہچانتا ہے"۔ مگر ہے بڑا خناس۔
"ہاں ہاں وہ تو ہے ہی مگر دودھ دینے والی گائے کے سینگ سنا کوئی اس سے سیکھے۔ ہمارا کام بن گیا، کہہ رہا تھا اس کا ارادہ اب شہر میں کاروبار کرنے کا ہے"۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھو کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے"۔
ہم نے کہا: "مگر سنو یار بات تو ہم الو کی کر رہے تھے"۔
فرمایا: "دوست ہمیں اس وقت الو کے بارے میں ایک اچھا شعر یاد آیا، تم بھی سن لو:

برباد گلستاں کرنے کو بس ایک ہی الو کافی ہے
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا

اور ہاں ٹیڑھے الو کی بات جب چل ہی نکلی ہے تو ذرا وہ دیکھو سامنے ٹیڑھا کون جا رہا ہے؟"۔
ہم نے فوراً جواب دیا "منو خاں، سود خوار"
بولے: "ارے نہیں ٹیڑھا وہ ضرور ہے مگر جگالی کہاں کرتا ہے۔ ہوں..... کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ..... جب ملتا ہے مگرمچھ کے آنسو بہاتا ہے..... اور ادھر دیکھو اس لحیم شحیم ہستی کو..... وہ سامنے جو جا رہا ہے..... ارے وہ صحرا کا جہاز اونٹ جس کے بارے میں کہتے ہیں دیکھنا ہے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"۔
ہم نے پوچھا: "یار یہ کروٹ بیٹھنا جانے کیوں کہا گیا، کروٹ تو لیٹا جاتا ہے؟

بولے : "شاید اونٹ ہی ایک ایسا جانور ہے جو کروٹ بیٹھتا ہے ۔خیر تو ہم تمہیں یہ بتلانا چاہ رہے تھے کہ ایسی حلیم شخصیت کی شان میں لوگ ذرا بے ادبی کرتے ہیں جب اونٹ ہی سے یہ پوچھا جاتا ہے ۔

"اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی"

بھئی یہ تو ۔تیری ،رے جیسے الفاظ اونٹ کے لئے زیب نہیں دیتے ۔ہم شہری تمدن کے نام لیوا کچھ تو تہذیب سے بات کرنا سیکھیں "

ہم گویا ہوئے "ٹھیک کہتے ہو دوست ،مگر شاعروں نے اسے "آہوئے تاتار" جیسے الفاظ سے بھی تو نوازا ہے "۔

"ہاں یہ بات تو ہے ،ویسے صحرا میں اس کی چال دیکھنے کے قابل ہوتی ہے ۔پھر بھی وہ جو کہتے ہیں نا کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا ،ہمیں ٹھیک ہی لگتا ہے "۔

"اور اونٹ کے ہم پلہ جانور ہاتھی کے بارے میں کیا خیال ہے ؟"

بھئی ہمیں تو وہ بات بالکل ٹھیک لگتی ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور ....یہ بات ہمارے آج تک سماج پر پوری طرح لاگو ہوتی ہے "۔

ہم نے کہا : "مگر ہاتھی دانت پھر بھی ہاتھی دانت ہوتے ہیں ان کا لاکھوں کا کاروبار جو ہوتا ہے "۔

بولے "یار تم بھی ایک صدی پہلے کی بات کرتے ہو ۔آج کل کاروبار لاکھوں میں کہاں گنے جاتے ہیں نیتاؤں کی تو بات ہی اور ہے ،اب تو ہمارے تمہارے جیسا عام آدمی بھی سوئس بینک میں کروڑوں کے اکاونٹ کھولنے لگا ہے "۔

فرمایا: "صحیح ہے لیکن ہاتھی مرے بھی تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے "۔ویسے نیتاؤں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں "۔

ہم بولے : "بندہ خدا ،یہ تو بتاؤ چاہے ہمارے کان میں ہی سہی کہ آخر سوئس بینک میں اکاونٹ کھولا کیسے جاتا ہے ؟"

بولے "سنو ہم ایک ایماندار آدمی ہیں Non - Corrupt لیکن چاہتے ضرور ہیں کہ وہاں اکاونٹ کھولیں ۔اس کے لئے کبھی تو ڈربی کے گھوڑ دوڑ کی ٹکٹیں خریدتے ہیں اور کبھی اپنے یہاں کی لاٹریوں کی "۔

"بھیا قسمت کی بات ہے یہ تو "ہم نے کہا

"ہاں ،پتہ ہے ایک دن ہم نے لاٹری کا ریزلٹ اخبار میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہماری ٹکٹ کا نمبر نکل آیا ہے ،بہت خوش ہوئے کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ،مگر جب آگے پڑھا تو معلوم ہوا کہ دو سو لوگ اور تھے ہمیں کل ملا کر پانچ روپئے دس پیسے ملے ،ایسا لگتا ہے بلی ہمارا راستہ کاٹ گئی "۔

ہم نے کہا : "کیا بکواس کرتے ہو بلی کا راستہ کاٹنا جاہلوں کی سی بات ہے "۔

بولے : "میرے ہمدم ان دنوں یہی کچھ ہو رہا ہے حال ہی میں ہمارے ایک کلرک نے جس کا تقرر ہم نے خود کیا تھا ہمارے خلاف اخباروں میں لکھوانا شروع کر دیا ہے یعنی ہماری بلی ہم سے ہی میاؤں "۔

"زمانہ خراب آگیا ہے "ہم نے شوشہ دیا۔

بولے :"یہاں یعنی چیونٹی کے بھی پر نکل آئے "۔

"کہیں تم پریشان تو نہیں ہوگئے "۔

بولے : "ہم ایسی بندر بھپکیوں سے ڈرنے والے کہاں ہیں ۔ اگر ہم اسے مزہ چکھانے پر اتر آئیں تو دیکھنا وہ ایسے غائب ہو گا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ویسے ہم نے بلا کر اسے زبردست ڈانٹ پلائی "۔

"پھر کیا ہوا ؟"

"ہونا کیا ..... وہی کھسیانی بلی کھمبا نوچے ..... اور یار جب بلی کا اس قدر ذکر خیر ہو رہا ہے تو ہم کہنا چاہتے ہیں کہ آج بھی ہمیں اس بلی کی بے حد تلاش ہے جو نو سو چوہے کھا کر حج کو چلی گئی تھی "۔

"زمانہ خراب آگیا ہے "ہم نے ٹیپ کا مصرع پھر دہرایا۔

بولے : "ہاں ، آج کل آستین کے سانپ زیادہ ہی ہوگئے ہیں ۔ موقع ملا نہیں اور انہوں نے ڈسا نہیں "۔

"سچ ہے کلجگ جو ہے "۔

بولے : "بالکل اور پھر آج کا انسان دھوبی کا کتا بن گیا ہے ۔ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا "۔

ہم نے کہا : "مگر تم جیسے ہوش مند انسانوں کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہئے "۔

فرمایا : "ارے میاں ، بھینس کے آگے بین بجانے سے فائدہ ہی کیا ، ویسے نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے ویسے طوطی تو طوطی ہے سچ پوچھو تو اب طوطا چشمی کا زمانہ آگیا ہے "۔

"یہ تو تم نے ٹھیک کہا "۔

"بس یہ سمجھو کہ کوالٹی آف لائف گرتی جارہی ہے ، وہ جو کہا ہے نا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔ وہ ٹھیک ہے ..... ہاں تو یار تم نے جانوروں کا ذکر چھیڑا ہیں تو انسانی سانپوں سے ڈرتا ہوں۔

ہم نشیں ہر راہ میں ان اژدھوں سے دور بھاگ
اپنے ہم جنسوں کو ڈس جاتا ہے آدم زاد ناگ

ہم اس شعر میں کھو سے گئے اس لئے کچھ کہہ نہ پائے ۔ محاورہ باز دوست نے اچانک اپنا ہاتھ ہماری آنکھوں کے آگے لہرا کر کہا "کیوں دوست ، گھوڑے بیچ کر سو تو نہیں گئے ؟"۔ ☆

علیم خاں فلکی
(جدہ)

اخبار لوں نہ کل سے کوئی

یہ سوچتا ہوں کہ اخبار لوں نہ کل سے کوئی
عذابِ دیدۂ بیدار لوں نہ کل سے کوئی
کوئی خبر ہی نہیں ہے بری خبر کے سوا
کوئی نظر ہی نہیں دیدہ ہائے تر کے سوا
ورق ورق ھوا " اعلان گمشدہ " جس کا
وہ قوم جس کا مقدر نہ تھا امر کے سوا
علاقہ رکھتا نہیں مسئلے کا حل کوئی
یہ سوچتا ہوں کہ اخبار لوں نہ کل سے کوئی
یہ وقت کانٹا مرے دل میں ہی چبھوتا ہے
ہر اک کے غم میں مرا قلب خون روتا ہے
وہ چیچنیا ہو کشمیر ہو کہ کوسوفو
کسی پہ گولی چلے قتل میرا ہوتا ہے
امید خاک رکھے پنجۂ اجل سے کوئی
یہ سوچتا ہوں کہ اخبار لوں نہ کل سے کوئی
ہلاک و زخمی گرفتار ہوگئے کتنے
اور اپنی زیست سے بیزار ہوگئے کتنے
ستم سے جبر سے آزار سے تشدد سے
گواہی دینے کو تیار ہوگئے کتنے
پتہ چلائے ذرا افرادِ دل بدل سے کوئی
یہ سوچتا ہوں کہ اخبار لوں نہ کل سے کوئی
کبھی نہ بخشیں گے ظلمت کے تاج داروں کو
سزائیں دیں گے لیڈروں گناہ گاروں کو
ہر اک تعصب دوراں کو ختم کردیں گے
سہارا دیں گے غریبوں کو بے سہاروں کو
پر ایسی باتوں کو نسبت نہیں عمل سے کوئی
یہ سوچتا ہوں کہ اخبار لوں نہ کل سے کوئی

کہیں لکھا ہے یہ ہے "صرف بالغوں کیلئے"
صفحہ ہے وقف کہیں خوب عالموں کے لئے
کہیں ہے سرخی "برائے علاج مردانہ"
کہیں ہے دعوتِ نظارہ عاشقوں کے لئے
سجائے بزم کو طبلے سے اور گجل سے کوئی
یہ سوچتا ہوں کہ اخبار لوں نہ کل سے کوئی

یہ سوچتا ہوں کہ خود ہی نکال لوں اخبار
کہ جس کی ساری خبر سچی اور اچھی ہو
نہ ظلم و جبر ہو نہ اس کا تذکرہ کوئی
جدھر بھی آنکھ اٹھے فاختہ ہی بیٹھی ہو
یہ کارِ دیدہ وری کب ہوا کنول سے کوئی
یہ سوچتا ہوں کہ اخبار لوں نہ کل سے کوئی

اسلم مرزا
اورنگ آباد (دکن)

غزل

صدمات ڈھا رہے ہو عبث اپنی جان پر
کیوں ہجو لکھ رہے ہو ہر اک این و آن پر
احسان ایک ہوگا یہ اردو زبان پر
تحقیق آپ کیجئے اب خاصدان پر
سب ساہوکار اپنا سامنہ لیکے رہ گئے
غنڈے بٹھائے رکھے ہیں اس نے مکان پر
رنگین ہورہی ہے بہت میری شاعری
نوکر ہوا ہوں جب سے کلر کی دکان پر
کل شب مکان میں ہوئی گھس پیٹ کے لئے
چوہوں سے باز پرس ہے وہم و گمان پر
اسلم زمین تلوؤں کے نیچے سے ہٹ گئی
لیکن مزاج اپنا رہا آسمان پر

پروفیسر آفاق احمد

نیویارک کے اردو اخبارات کا مزاج بھی برصغیر کے اخبارات سے مختلف نہیں

ویسے تو یہ ہمارا امریکہ کا پانچواں پھیرا اور نیویارک کا تیسرا چکر تھا۔ لیکن اس سے پہلے اس شہر سے اس طرح تعارف حاصل نہیں ہوا تھا، جیسے اس بار ہوا۔ وجہ ظاہر ہے کہ پہلے دو چکر کچھ اس قسم کے تھے کہ آئے، دل شاد کیا اور چل دئے۔ مگر اس بار جم کر رہے۔ حالانکہ ہم جب یہاں آئے تو پتہ چلا کہ آدھے سے زیادہ امریکہ کو مجتبیٰ حسین صاحب فتح کر چکے ہیں۔ البتہ ابھی نیویارک ان کی فاتحانہ پیش قدمی سے محروم ہے۔

ٹورانٹو (کینیڈا) ہم اتنی بار، پچھلے دس سال میں، آئے گئے تھے کہ بالکل گھر آنگن بلکہ آگرہ دہلی ہوگیا تھا۔ جہاں جانا چاہیں تو بغیر کسی رہنما کے آجا سکتے ہیں۔ مگر یہ شہر اس معاملے میں بالکل اجنبی، ایک ہفتہ یوں ہی "مکمل آرام" میں گزرا کہ اس میں ڈاکٹروں کی ہدایت کے ساتھ کچھ قسمت کا عمل دخل زیادہ تھا۔

ہوا یوں کہ جب ہم بھوپال سے چلے تھے تو صرف ایک ہفتہ پہلے فوری نگہداشت کے یونٹ سے گلو خلاصی ہوئی تھی۔ دراصل وہ دل جسے ہم ایک مدت سے اپنے قابو میں کئے ہوئے تھے۔ ایک دم خودسری پر آمادہ ہوا۔ ہم تو خدا کا شکر ادا کیا کرتے تھے اگر اس نے دل کو دھڑکنے کی ادائیں سکھائی ہیں تو ہمیں بھی اسے قابو میں رکھنے کے سب گر بتا دئے ہیں۔ لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔ وہ کچھ اس حد تک خودسری پر آمادہ ہوا کہ بڑی مشکل سے ڈاکٹر اسے قابو میں لائے۔ 5 دن تک ICU یعنی انٹینسو کیر یونٹ میں قید رہے۔ اور پھر اس شرط پر گلوخلاصی ہوئی کہ دو ہفتے تک مکمل آرام کریں۔ ہم نے سوچا کہ اب اگر آرام ہی کرنا ہے یا کچھ ہونا ہی ہے تو اپنی بیٹیوں کے درمیان ہو جو ایک نیویارک میں مقیم ہیں تو دوسری نے ٹورانٹو کو اپنا مسکن بنایا ہوا ہے۔ چناں چہ بیوی کو ساتھ لیا اور پہلے نیویارک پہنچے کہ وہاں بیٹی ڈاکٹر ہے۔ مگر ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایک قید خانے سے چھوٹ کر اس سے بڑے قید خانے میں جارہے ہیں۔ بیٹی نے پوری ڈاکٹری ہم پر آزمانا شروع کردی کہ یہ کرو، وہ نہ کرو، زیادہ لکھو پڑھو نہیں۔ بس آرام کرو۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ ایک ہی تو عیش بچا ہے کہ جس کا نام لکھنا پڑھنا ہے۔ اب اگر وہ بھی نہ کرو تو پھر کیا کرو۔ اس کے سامنے تو دم بخود رہتے۔ لیکن ادھر وہ ہاسپٹل گئی ادھر اپنے پیاروں کے نام خط لکھنا شروع کردئے کہ اس طرح ہی ان کے درمیان چند لمحے رہ سکیں۔ پھر اردو اخبارات سے بھی دل بہلایا جانے لگا اور آج پہلی بڑی "بدپرہیزی" یہ کررہا ہوں کہ "شگوفہ" کے لئے شگوفہ آرائیاں کررہا ہوں۔

ایک دن خیال آیا کہ لاؤ عارف افضال عثمانی سے بات کی جائے۔ ایک اخبار کے دفتر سے ان کا ٹیلی فون نمبر لیا۔ وہ شکاگو گئے ہوئے تھے۔ دو دن بعد ان کا ٹیلی فون آیا تو پہلی بار گھر سے نکلے۔ انہوں نے کہا "حلقہ ارباب ذوق" کا جلسہ ہو رہا ہے اس میں چلنا ہے۔ ہم نے ہامی بھرلی۔ عثمانی نیوجرسی میں رہتے ہیں۔

یہاں 8 اردو کے ہفت روزہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان سے یہ پتہ چل چکا تھا کہ ماشاء اللہ دینی جماعتوں کے معاملے میں نیویارک بڑا زرخیز ہے۔ اردو مرکز ہے، حلقہ ارباب ذوق ہے، کاروان فکر و فن ہے، اور بھی چھوٹی بڑی کئی انجمنیں ہیں۔ ان کے

علاوہ یہاں کے ہفت روزہ اخبارات جن کی مجموعی اشاعت نصف لاکھ کے قریب ہے خود میں ایک انجمن ہیں ۔ نیویارک عوام، اردو ٹائمز، پاکستان نیوز، پاکستان پوسٹ، عوام وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام اخبارات میں ادبی صفحات بھی ہیں اور طنز و مزاح کے کالم بھی اور یہ دیکھ کر بڑی طمانیت ہوئی کہ ان اخبارات کا مزاج برصغیر کے ہفت روزہ اخبارات سے زیادہ مختلف نہیں ۔ ان میں بھی ایک دوسرے سے طنزیہ اور معاصرانہ چپقلش کا حامل مکالمہ ہوتا رہتا ہے ۔ اور چھیڑ خوباں سے چلتی رہنے کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے ۔ خاص طور سے طنز و مزاح کے کالموں میں یہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے ۔

اخبار " نیویارک عوام " میں ہر ہفتہ ادبی صفحات پر " حسابِ دوستاں " کے عنوان سے اشرف میاں ایک کالم لکھتے ہیں ۔ جن دنوں ہم نیویارک میں تھے ، دو شاعرات کے مجموعہ کلام منظر عام پر آئے ۔ رخسانہ سحر کا " ہدف " اور ریحانہ قمر کا " ہم پھر نہ ملیں شاید " اس سلسلے میں اشرف میاں نے حساب دوستاں کو دل میں نہیں رکھتے ہوئے دونوں شاعرات کے حوالے سے رئیس وارثی سے اپنا حساب کتاب یوں برابر کیا ۔

انہوں نے لکھا کہ رخسانہ سحر کے منہ بولے بڑے بھائی رئیس وارثی نے شاعرہ کی کامیابی پر انہیں مبارک باد دی ہے ۔ اور پھر رخسانہ سحر کے حوالے سے لکھا کہ وہ بھائی رئیس وارثی کو مشورہ دیتی ہیں کہ کبھی کبھی کچھ پڑھ لکھ لیا کریں ۔ پھر اگلے شمارے میں ریحانہ قمر نے اپنے مجموعہ کی رونمائی کے موقع پر یہ شعر پڑھا :

مجھے اپنا بنانا چاہتا ہے
وہ بونا قد بڑھانا چاہتا ہے

اشرف میاں لکھتے ہیں : " ہال میں سب ہنس رہے تھے ۔ صوبہ سرحد کے معروف شاعر ڈاکٹر شفیق ساتھ بیٹھے کسی شخص سے کہہ رہے تھے اس شعر میں رئیس وارثی کی طرف تو اشارہ نہیں ہے " ۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ نیویارک عوام کے ایک بعد کے شمارے میں ڈاکٹر شفیق نے اس کی تردید کی کہ انہوں نے ایسا کوئی بیان دیا تھا ۔ دراصل اس لفظ (یعنی بونا) کا اشارہ اشرف میاں کا اختراع کیا ہوا ہے ۔ اشرف میاں نے کاروانِ فکر و فن کے روح رواں وکیل انصاری (جن کے اہتمام میں " ہم پھر نہ ملیں شاید " کی رونمائی ہوئی تھی) ۔ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ریحانہ قمر ان کی آئیڈیل ہیں اور پھر اشرف میاں رقمطراز ہیں : " وکیل انصاری کی بیوی فرح انصاری نے جل کر کہا کہ وکیل انصاری کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے " ۔

جوہر میر ، نیویارک کے ایک معتبر دانشور ، صحافی ، ادیب ، شاعر اور کالم نگار ہیں ۔ ان ہی دنوں ان کا ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں منیر نیازی کی قتیل شفائی ، احمد ندیم قاسمی ، احمد فراز ، افتخار عارف اور امجد اسلام امجد پر غیر ستائشی جنبش لب پر جارحانہ انداز میں ان کی خبر لی ہے اور انہیں برخود غلط فرد قرار دیتے ہوئے ان کی مثال ہیرا منڈی کی ایک مرحومہ سے دی ہے جو بے توجہی کے دنوں میں اپنے کوٹھے کے سامنے گلی میں بہت سا پانی کا چھڑکاؤ کرا دیا کرتی تھی جب کوئی پھسل کر گرتا تو قہقہے لگاتی تھی اور جب گرنے والا گالیاں دیتا تھا تو باغ باغ ہوجاتی تھی ۔ لیکن منیر نیازی کو اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ اس پر گالیاں ضائع کی جائیں ۔

اسی طرح ایک اور اخبار میں سیدنا حنیف اخگر جو امریکہ کے بزرگ شاعر ہیں اور اپنی نعتیہ شاعری کے لئے ممتاز ہیں ۔ انہوں نے ریحانہ قمر کی شاعری میں عشق حقیقی کی اساس کے بارے میں جو اظہار خیال کیا تھا کہ عشق و محبت تو خدائے بزرگ و برتر کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں ۔ اگر انسان بھی ان معاملات میں الجھا ہوا ہے تو کوئی معیوب بات نہیں ۔ اس کا اخبارات کے کالموں میں کافی چرچا رہا ۔

بہر حال یہاں کے اخبارات کی اپنی ایک دنیا ہے ۔ البتہ یہ احساس ستاتا رہا کہ آخر یہاں ہندوستان کے جو اردو والے بسے ہوئے

ہیں ان کا کوئی اخبار کیوں نہیں ہے ؟ آخر ہم دیار غیر میں جاتے ہیں تو اردو سے لئے بے تعلق کیوں ہوجاتے ہیں ۔ البتہ "حلقہ ارباب ذوق" کے جلسے میں دو سردار صاحبان کی شرکت سے بڑی تقویت ہوئی ۔ پاکستان کے مشہور صحافی اسد اللہ غالب نے صدارت کی جبکہ یہ ناچیز اور پاکستان کے حقوق انسانی کمیشن کے رہنما افراسیاب خٹک مہمان خصوصی تھے ۔ دہاں سیاسی اور صحافتی گفتگو زیادہ رہی اور ادبی کم ۔ یہ دیکھکر ہمارے یہاں کی جن وادی لیکھک سنگھ یعنی انجمن جمہوریت پسند مصنفین بڑی یاد آئی کہ اب اس میں بھی زیادہ تر یہی ہوتا ہے ! (راز کی بات یہ ہے کہ ہم اس انجمن کے صوبائی صدر ہیں) ۔

عارف افضال عثمانی کے ذکر سے بات شروع ہوئی تھی ۔ اچھا ہے کہ اسی نوجوان کے ذکر پر اس بات کو ختم کروں ۔ بارہ تیرہ سال پہلے اس جوان رعنا سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی اور اس نے اپنی کتاب "پاکستان اور ہاکی اولمپکس" کی پہلی جلد پیش کر کے محبت کا ثبوت دیا تھا ۔ اب وہ گیارہ سال سے یہاں ہے لیکن اس کا کاروبار شوق جاری ہے ۔ "ورلڈ کپ کرکٹ ۹۹ء" پر اس نے کتاب دی تو جی خوش ہوا ۔ حالانکہ وہ شاعری بھی کرتا ہے ۔ لیکن اس کا خاص میدان اسپورٹس جگت ہے ۔ اسے دیکھکر حیرت ہوئی کہ بارہ برس پہلے والا عثمانی اگرچہ دیار غیر کے ہنگاموں میں کافی بدل گیا ہے لیکن اس کی شگفتہ مزاجی یہاں کی مشینی دنیا میں بھی قائم ہے اور مشرقی آداب کی پاسداری اب بھی باقی ہے ۔ خدا کرے مشینوں کا یہ شہر اس کی شگفتہ مزاجی کو یوں ہی باقی رہنے دے ۔ ویسے اس شہر میں آزادی کی دیوی کا مجسمہ بھی تو ہے ! ؟ شاید اسی کا اثر ہو ؟ بہر حال UNO کا بالکل نہیں ! ۔☆

●☆●☆●☆●

سراپا غزل

جوش ملیح آبادی، کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی کے ہاں ملاقات کے لئے آئے تو کنور صاحب بٹیر بازوں میں گھرے ہوئے تھے ۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بٹیروں کی لڑائی بند ہوئی تو ایک اور ملاقاتی آگیا اور اس نے شہر میں جلد ہی ہونے والے ایک دنگل کے سلسلہ میں کنور صاحب سے کچھ ضروری مشورے کئے ۔ اس کے بعد کنور صاحب ایک قوال سے مصروف گفتگو ہوگئے ۔ اور دیر تک فن موسیقی کے بارے میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا اور کنور صاحب قوال کی قوالیوں سے محظوظ ہوتے رہے ۔ لتے میں کچھ اور لوگ آگئے اور اپنے سرکاری کاموں کے سلسلہ میں کنور صاحب سے سفارشیں کرنے کے لئے منت و سماجت کرنے لگے ۔ اس دوران میں کنور صاحب ٹیلی فون کے ذریعہ اپنے دفتر کے ہیڈ کلرک کو دفتری کاموں کے سلسلہ میں ضروری ہدایات بھی دیتے رہے ۔ جب ان کے ہجوم سے فارغ ہو کر کنور صاحب نے جوش صاحب سے رجوع کیا اور ان سے کوئی نئی نظم سنانے کی فرمائش کی تو جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

"کنور صاحب آپ نظم سن کر کیا کریں گے ۔ آپ کی زندگی تو غزل کے مزاج کی طرح ہے جس کے ایک شعر کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے" ۔☆

●☆●

محبوب مانھوی
(بلاسپور۔ ایم پی)

غزل

(روح فیض مرحوم سے معذرت کے ساتھ)

باہر سے بڑا لگتا دل آویز بہت ہے
اندر سے وہ فتنہ ہے، شر انگیز بہت ہے

دنگوں میں بہا خوں اثر انگیز بہت ہے
ملیا نہ کی مٹی ہوئی زرخیز بہت ہے

چھپ چھپ کے پیا کرتے ہیں یہ واعظ ناداں
پینا ہو کھلے عام تو پرہیز بہت ہے

جھٹکے سے کہیں بند نہ ہوجائے کسی دن
یہ دل کے دھڑکنے کی صدا تیز بہت ہے

اے شیخ حرم کہیئے بھی اب کیا ہیں ارادے
برسات کا موسم تو جنوں خیز بہت ہے

کھانے کو تو گڑ شوق سے کھالیتے ہیں محبوب
ہاں، گلگلوں سے آپ کو پرہیز بہت ہے

●☆●

رؤف رحیم
حیدرآباد

غزل

تو ناقدین کو پہلے تو آس پاس نہ رکھ
اگر رکھے بھی تو ان سے کوئی براس نہ رکھ

اقارب اپنے عقارب بھی بن کے ڈستے ہیں
سوائے اپنے کسی سے تو کوئی آس نہ رکھ

یہ لوگ گنا سمجھ کر تجھے چبالیں گے
تو اپنی باتوں میں ہلکی سی بھی مٹھاس نہ رکھ

یہی ہے آج کا کلچر جو آگے بڑھنا ہو
گرادے سب کو کسی کا لحاظ و پاس نہ رکھ

جو ناشناس ہے تو اس کو شاعری نہ سنا
یہ زعفران ہے اس کو گدھے کے پاس نہ رکھ

نیا ہے دور تو رکھنا ہے تجھ کو ان ہیلر
ہنسی اڑائیں گے لوگ اپنے پاس ناس نہ رکھ

انا کو ٹھیس پہنچتی ہے ایسے لفظوں سے
کلام میں بھی کبھی لفظ التماس نہ رکھ

سہارا جب بھی ملے ان حسین بانہوں کا
رکھ اپنا ہوش تو قائم مگر حواس نہ رکھ

ہوئے ہیں شعر تو ہر حال میں سناتے ہیں
نکال دے اسے دل میں کوئی بھڑاس نہ رکھ

یہ مانا تو ہے کلنٹن، مگر خدا کے لئے
تو پادلہ یا لیونسکی کو اپنے پاس نہ رکھ

نظر ہے چیل سی اس کی جھپٹ کے لے لے گی
تو اس کے آگے کبھی اپنے دل کا ماس نہ رکھ

وہ سیدھے راہ پہ آئے گی کیسے ممکن ہے
تو ایک اہلی سے کہتا ہے کہ کھٹاس نہ رکھ

ہمارے دور کا فیشن یہ کہہ رہا ہے رحیم
برائے نام بھی تن پر کوئی لباس نہ رکھ

●☆●

نریش کمار شاد

فردوسیِ اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری سے انٹرویو

حفیظ صاحب کے متعلق میرا کچھ کہنا چھوٹا منھ اور بڑی بات ہے۔ خود حفیظ صاحب ہی کی زبان سے سنئے :

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

نریش کمار شاد

●☆●

شاد: قبلہ حفیظ صاحب! سب سے پہلے میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں کہ زندگی میں پہلی مرتبہ آپ سے کچھ دیر تک پنجابی کی بجائے اردو میں بات چیت کروں گا۔ حالانکہ سعادت حسن منٹو کے بقول میرا ایمان بھی یہی ہے کہ پنجابی جب اردو بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے۔

حفیظ: واہ! بڑی پتے کی بات کہی ہے ظالم نے۔ لیکن اس میں گستاخی کی کیا بات ہے۔ ہم اردو میں بھی بات چیت کر سکتے ہیں۔ میری تو اس زبان کی کاکلوں کو سلجھاتے سلجھاتے عمر گزر گئی۔ اور تم خود بھی اردو کے ایسے نوجوان شاعر ہو جس کی شاعری کے متعلق میری رائے بہت اچھی ہے۔ خواہ تمہارے نظریات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

شاد: میری شاعری اور میرے نظریات کی بات چھوڑئیے۔ میں اس وقت تو صرف آپ کی شاعری اور آپ کے نظریات کی بات چھیڑنا چاہتا ہوں۔

حفیظ: تو بسم اللہ میرے بھتیجے!

شاد: آپ کی شاعری کی ابتداء کب اور کن حالات میں ہوئی؟

حفیظ: جب میں سات سال کا تھا اور دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ محض مٹھائی وغیرہ کھانے کی غرض سے جالندھر کے اکثر مولود شریف سننے جایا کرتا تھا۔ انہیں سنتے سنتے مجھے بھی شعر لکھنے کا شوق چرایا اور میں نے ایک طویل نظم لکھ ڈالی۔

شاد: اس نظم کے کچھ شعر یاد ہوں تو فرمائیے؟

حفیظ: اس وقت صرف ایک ابتدائی شعر یاد ہے

محمد کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

شاد: آپ نے اپنی ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی؟

حفیظ: بالکل ابتدائی شاعری پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ البتہ جب میں نے ۱۹۱۱ء میں باقاعدہ طور پر شعر کہنے شروع کئے تو ملک

الشعراء غلام قادر گرامی کو اپنا کلام دکھایا۔

شاد: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ شاعری میں استادی شاگردی کے قائل ہیں ؟

حفیظ: بے شک۔ لیکن میں شاعری میں استادی شاگردی کا پیری، مریدی کی حد تک قائل نہیں۔ اگرچہ استاد محترم فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے لیکن میں نے اردو میں شعر کہتے ہوئے بھی ان سے استفادہ کیا۔ ان کا طریقہ اصلاح عام استادوں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کا فرمان تھا کہ اپنے قلب کو چیر کر دیکھو۔ اس میں تمہارا رہنما موجود ہے۔ وہ صرف شعر کے کمزور اور نامناسب الفاظ کی طرف اشارہ کردیتے تھے اور مجھے صحیح اور مناسب الفاظ ڈھونڈنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

شاد: آپ نے بھی اپنے استادِ محترم کے طریقہ اصلاح کو اپناتے ہوئے کسی کو اپنا شاگرد بننے کی سعادت بخشی؟

حفیظ: ہاں، کئی شاعروں کو اسی انداز سے اپنا شاگرد بنایا جس انداز سے حضرتِ گرامی نے مجھے شاگرد بنایا تھا۔ ان میں پنڈت ہریچند اختر مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاد: آپ نے اسکول میں کہاں تک تعلیم حاصل کی؟

حفیظ: ساتویں جماعت تک،

شاد: آپ اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں کن کن شاعروں کے کلام سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ؟

حفیظ: داغ دہلوی کی غزلوں سے بہت زیادہ۔ امیر مینائی کے شعروں سے ذرا کم۔ اور مذہبی طور پر حالی کی مسدس سے۔

شاد: آپ کے نزدیک اچھے شعر کی کیا تعریف ہے ؟

حفیظ: میرے نزدیک اچھا شعر وہ ہے جس کے الفاظ کا تاثر جو شاعر کا مقصود ہے، قاری کے ذہن کو بھی متاثر کردے۔

شاد: آپ شاعری میں اسلوب کو مقدم سمجھتے ہیں یا خیال کو ؟

حفیظ: ظاہر ہے کہ اچھا خیال اپنے اظہار کے لئے اچھا اسلوب چاہتا ہے۔ اس لئے تقدیم و تاخیر کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

شاد: آپ کو اپنے ہم عصر شاعروں میں کون کون سے شاعر پسند ہیں ؟

حفیظ: بہت سے پسند ہیں۔

شاد: مثلاً ؟

حفیظ: مثلاً فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی۔

شاد: اور آج کل کے نوجوان شاعروں میں ؟

حفیظ: ابن انشاء، کیوں کہ وہ کسی سے متاثر نہیں۔ ہمیشہ اپنی بات اپنے ڈھنگ سے کہتا ہے۔ راولپنڈی کے ایک شاعر صدیقی جن کا تخلص اس وقت یاد نہیں آرہا۔ ان کی بعض غزلیں بھی بہت اچھی ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی دو چار نظمیں بھی بہت پسند آئیں۔ ندیم قاسمی کی چند تخلیقات قابل ستائش ہیں لیکن جب وہ کسی خاص پارٹی سے وابستہ رہنے کی وجہ سے اپنے تاثرات کو پوری انسانیت سے الگ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنی تخلیقی کوشش میں ناکامیاب نظر آتے ہیں اور اگر یہ مقصود ہو کہ لباس جو اظہار فکر کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ قدیم طرز کا ہو اور خیالات نئے ہوں تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فیض کے بعض اشعار میں یہ بات بڑی شدت سے پائی جاتی ہے لیکن جب ہم اس صناعی پر غور کرتے ہیں جس سے شعر اگر ہمیشہ نہیں تو مدتوں زندہ رہنے کے لئے وجود میں آتا ہے تو مجھے فیض کی

کامیابی مشکوک نظر آتی ہے ۔ ویسے اگر آپ مغرور نہ ہوجائیں تو میں یہ بھی کہوں گا کہ آپ کی بعض نظمیں بھی مجھے بہت اچھی
معلوم ہوئیں ۔

شاد: آپ کسے اس صدی کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں ۔

حفیظ: ظاہر ہے کہ زندہ شاعروں میں خود اپنے آپ کو ۔ اس مقام پر میرا ایک شعر بھی سن لو:

سخنوران وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

ارے بھئی خود ہی سوچو ، ایسا کون شاعر ہے جو اپنے آپ کو سب سے بڑا نہ سمجھے ۔ ہر ماں اپنے بچے کو دوسروں کے بچوں سے زیادہ پیار
رتی ہے ۔ لیکن اب پھر مجھے اپنا ایک شعر یاد آرہا ہے :

اہل زباں تو ہیں بہت کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

شاد: آپ شعر کیوں کر کہتے ہیں ؟

حفیظ: جس طرح ماں بچہ جنتی ہے اور مجھے اپنا بچہ جننے کے بعد ایک شفیق ماں کی طرح ہفتوں تک اس کا رنگ ، روپ سنوارنا اور
کھارنا پڑتا ہے ۔

شاد: آپ کے خیال میں آپ کی شاعری کی بھرپور نمائندگی آپ کی غزلیں کرتی ہیں یا نظمیں یا گیت ؟

حفیظ: میں گیت کو غزل سمجھتا ہوں اور غزل کو گیت ۔ چونکہ ابھی ذہن ہم آہنگی اختیار نہیں کرسکے ۔ اس لئے یہ فیصلہ میرا نہیں ان
دگوں کا ہوگا جن میں میرے یہ بچے جنہیں گیت ، نظم ، یا غزل کہا جاتا ہے ۔ باقی رہیں گے ۔ ان میں جو باقی رہ گیا وہی اہم اور میرا نمائندہ ۔
ور اگر میں نے کوئی کمزور بچہ جس کے تن بدن میں توانائی نہیں ۔ اس بھیڑ کے اندر مستقبل کے اس میلے یا گھمسان کی اس لڑائی میں
بھیج دیا اور وہ بے چارہ دوسروں کے پیروں تلے کچل گیا تو میں قصوروار بلکہ گناہ گار ۔

شاد: آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو ۔

حفیظ: ایسے متعدد واقعات ہیں ۔ بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی اہم واقعہ پیش آیا ۔ شاہنامہ اسلام لکھنے کا تہیہ کرنا بھی ایسے ہی
حالات کا نتیجہ ہے ۔ میں زندگی کے ایک ایسے موڑ پر تھا جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں بہت سے لوگ سرگرمِ کار تھے ۔ میں بھی
تلک فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے لالہ لاجپت رائے کے ساتھ شہر شہر پھرتا تھا اور ایک ایسی قوم کی مردم شماری میں بھی شامل تھا جو نہ صرف
سوئی ہوئی بلکہ سونے پر اصرار کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی ۔ جاگتی تھی تو روتی تھی اور مرثیہ اس کا معمول ہوگیا تھا ۔ شاہنامہ اسلام
س مرثیہ کا رد ہے ۔ میں نے شاہنامہ اسلام کے علاوہ اسی دور میں کرشن کی بانسریاں اور پریت کے گیت اس لئے لکھے تاکہ ہم ان
بدمعاشوں سے نجات پاجائیں جو ہماری ہر اس خوبی کو جو ہمیں بزرگوں سے ملی تھی اور ہماری عظیم الشان مشترکہ تہذیب کی دین تھی تباہ
برباد کرنا چاہتے تھے ۔ میں نے ہندی نہیں ، اردو نہیں ، ہندوستانی نہیں ، پیار کی زبان اختیار کی ۔ اردو میں گیت نہیں تھے لیکن میرے
ندر گیت امڈ رہے تھے ۔ میں نے جب انہیں لکھنا شروع کیا تو یہ دلوں کی قوتوں کے اشتراک کا باعث بنے ۔ میں نہیں کہتا کہ میں نے
وئی تیر مارا اور وہ ضرور نشانے پر لگا ۔ لیکن میں ان لاکھوں میں سے ایک ضرور تھا جسے اپنے آپ کو سب کا ایک تندرست اور صحت مند
عصر بنانے کا شوق تھا ۔ پھر زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس کا مجھ پر بہت بڑا اثر پڑا ۔ یہ میری زندگی کا اہم ترین موڑ ہے ۔ یہ موڑ اس وقت

آیا جب ہندوستان کو بھارت اور پاکستان دو ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہم سب نے اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے وہ سلوک کیا جس سے ہمیشہ کے لئے میرے شہد میں تلخی گھل گئی اور میری نشاطِ طبع کی شاعری ختم ہو کر رہ گئی۔

شاد: ابوالاثر اور فردوسیٔ اسلام کے خطابات آپ کو کہاں سے ملے ؟

حفیظ: کئی سالوں کی بات ہے کہ میں نے کپور تھلہ کے ایک مشاعرے میں گرامی صاحب کو دکھائے بغیر اپنی دو غزلیں پڑھیں۔ حالانکہ گرامی صاحب کی ہدایت تھی کہ انہیں دکھائے بغیر کوئی شعر کہیں نہ پڑھا کروں۔ میری ان دونوں غزلوں سے گرامی صاحب بہت متاثر ہوئے۔ خاص طور پر ایک غزل کا یہ شعر سن کر:

رزاقِ دو جہاں کے خزانے کو کیا ہوا
ملتا ہے درد وہ بھی کسی کا دیا ہوا

وہ اپنے آنسو نہ روک سکے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے " حفیظ، تو ابوالاثر ہے " اور فردوسیٔ اسلام کا خطاب شاہنامہ اسلام کی تصنیف کے بعد اسلامی دنیا نے عطا کیا۔ اور میرے عزیز! اگر تم اسے خود سرائی پر محمول نہ کرو تو میں یہ کہوں گا کہ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ سید سجاد حیدر یلدرم نے جنہیں میں اردو کا ایک خاص الخاص صاحبِ طرز ادیب خیال کرتا ہوں۔ علی گڑھ میں میرا کلام سن کر مجھے دو خطابات سے سرفراز کیا۔ " اردو کا بنسی بجیا " اور " اسلام کا شہنائی نواز " اور ۱۹۱۵ میں شملہ کے پہلے آل انڈیا مشاعرہ جس میں مشہور شعراء کے علاوہ سیاست دانوں میں مولانا محمد علی اور سروجنی نائیڈو بھی موجود تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حفیظ اس دنیا میں اردو کا دولھا ہے اور شہرت سے آج اس کا نکاح ہو گیا ہے۔

شاد: بلاشبہ گزشتہ کئی سالوں سے شہرت آپ کی اہلیہ بلکہ خانہ زاد ہے۔ یہ فرمائیے کہ کیا ادب واقعی ادیب کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔

حفیظ: یقیناً اگر ادیب مکمل ہے تو لازماً ہوتا ہے۔

شاد: اور کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے ؟

حفیظ: بہت مشکل سوال ہے لیکن اس کا فیصلہ کر چکا ہوں کہ جو اچھا انسان نہیں وہ اچھا آرٹسٹ نہیں ہو سکتا۔

شاد: آپ کو شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری کونسی اصناف سے دلچسپی ہے ؟

حفیظ: افسانہ اور ناول کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔ لیکن پیشہ ور نقادوں کی تنقید نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا۔ میرے خیال میں سب سے بڑا ناقد خود ادیب یا شاعر ہوتا ہے۔ جیسا کہ میرے استاد نے مجھے بتایا ہے کہ لکھنے کے بعد اپنی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت جاننے کے لئے اس پر اس طرح غور کرو جیسے وہ تمہاری نہیں کسی اور کی ہے۔

شاد: آپ شاعری میں افادیت اور مقصدیت کے کس حد تک قائل ہیں ؟

حفیظ: بہت بڑی حد تک۔ بلکہ میں تو قائل ہی افادیت اور مقصدیت کا ہوں۔

شاد: اگر یہ بات ہے تو یہ بتائیے کہ آپ کا سیاسی اور سماجی نظریہ کیا ہے ؟

حفیظ: وہی جو قرآن کا ہے !

شاد: قرآن کا نظریہ کیا ہے ؟

حفیظ: انسان دوستی اور انسانیت نوازی۔ اور یہی میرا ایمان ہے۔ اگر میرے ایمان میں کبھی لغزش آجائے اور اپنے نظریئے سے ذرا

بھی منحرف ہوجاؤں تو گردن زدنی!

شاد:　اور آپ کے ذہن میں اسلامی ادب کا کیا تصور ہے ؟

حفیظ:　ہر وہ ادب میرے نزدیک اسلامی ہے جو انسان کی بہبودی کے لئے ہے ۔

شاد:　اور اگر کوئی کہے کہ ایسا ادب جو انسان کی بہبودی ہے وہ ہندو ادب، سکھ ادب یا عیسائی ادب ہے تو ..... ؟

حفیظ:　تو میں اس نظریے کو بھی بخوشی تسلیم کرلوں گا۔

شاد:　پھر آپ ایسے ادب کو اسلامی ادب کی بجائے انسانی ادب کیوں نہیں کہتے ؟۔

حفیظ:　اسلام سے بھی میری مراد انسان کی جسمانی اور روحانی سلامتی ہے ۔

شاد:　آپ کی یہ باتیں سن کر یہ پوچھنے کی جراءت نہیں ہوتی کہ آپ نے زندگی میں کبھی شراب پی ہے یا نہیں ؟

حفیظ:　نہیں کبھی نہیں پی ۔ البتہ ایک مرتبہ حیدر آباد میں جب میری طبیعت بہت اداس تھی ایک بے تکلف دوست نے مجھے جنجر پلائی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جنجر میں جن ملی ہوئی تھی ۔

شاد:　ظاہر ہے کہ آپ شاعری اور شراب کو لازم و ملزوم نہیں سمجھتے ہوں گے ۔

حفیظ. قطعاً نہیں ۔ میں تو شعر کو شعور سے متعلق کرتا ہوں ۔

شاد:　کیا موجودہ اردو ادب، جمود کا شکار ہے ؟

حفیظ:　ہرگز نہیں ، بلکہ اس میں اتنی زیادہ حرکت ہے کہ اس پر جمود کا دھوکا ہوتا ہے ۔ جمود کی شکایت کاغذ کے پھول بنانے والے ان جتھے بندوں کو ہے جو تحسینِ باہمی یا تفضحیکِ باہمی کو ادب کی معراج سمجھتے ہیں ۔

شاد:　حفیظ صاحب ، آپ میرے سوالات سنتے سنتے اور جوابات دیتے دیتے اکتا گئے ہوں گے اور سوچتے ہوں گے کہ کس سر پھرے سے واسطہ پڑ گیا ۔

حفیظ:　نہیں میرے عزیز! تمہارے تمام سوالات نہایت اہم ہیں اور یہ انٹرویو اس اعتبار سے بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ میں نے ان میں صداقت کی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر لاتے ہوئے جو کچھ کہا ہے وہی کچھ میں ہوں ۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ۔ مجھ میں سینکڑوں عیب ہیں ۔ مگر نزیش! یقین کرو میرا سب سے بڑا عیب صاف گوئی ہے ۔ اسی لئے اکثر لوگ مجھے برا کہتے ہیں ۔ لیکن میں ہنستے ہنستے بھی سچ کہتا ہوں ۔

شاد:　بالکل اسی طرح جیسے منٹو نے پنجابیوں کے اردو بولنے کے بارے میں سچی بات کہی ہے ۔ خیر آئیے اب پنجابی میں کچھ سیدھی سادی غیر ادبی باتیں کریں تاکہ ہم واقعی راست گو معلوم بھی ہوں ۔ ☆

ضیاء کرناٹکی، بنگلور

....کون تمہیں اب روکے گا؟

(ہلال عید کے مسئلہ پر اختلافات سے متاثر ہو کر)

جب بھی چاہو عید منالو کون تمہیں اب روکے گا
رات گئے تم سب کو جگا دو کون تمہیں اب روکے گا

اپنی عظمت آپ گھٹالو کون تمہیں اب روکے گا
دنیا کو تم خود پہ ہنسالو کون تمہیں اب روکے گا

دید قمر کی کرنے والو کوئی نہیں ہے وقت مقرر
شام کو دیکھو رات کو دیکھو کون تمہیں اب روکے گا

ایسا کھلونا پھر نہ ملے گا آنے والے سالوں میں
مائک لگا کے دھوم مچالو کون تمہیں اب روکے گا

گمراہی ہے ساتھ تمہارے کیسا رستہ کیسی منزل
ہر رہبر کے پیچھے بھاگو کون تمہیں اب روکے گا

ہم نے تمہاری پگڑی بچالی رکھا تمہارا سر بھی سلامت
اپنی پگڑی خود ہی اچھالو کون تمہیں اب روکے گا

آڑے وقتوں عزت رکھی ہم نے تمہاری دیسے تو
اپنی عزت آپ گنوالو کون تمہیں اب روکے گا

کیسی کمیٹی کیسے ممبر اپنی جگہ تم فتویٰ دے کر
رویت کا اعلان کرادو کون تمہیں اب روکے گا

کٹھ پتلی ہیں لوگ ہمارے ڈور تمہارے ہاتھوں میں
ان کو مِتیا تم خوب نچالو کون تمہیں اب روکے گا

محمد علی رفعت
(حیدرآباد)

سب غلط

سوکھے سے بھوکے مر گئے امداد اب تک کچھ نہیں
سی ایم غلط ، پی ایم غلط ، سوکھا غلط ، مرنا غلط

وعدہ تھا ان سے وصل کا پیچش سے میری ٹل گیا
کھانسی غلط ، دمہ غلط ، پیچش غلط ، جاڑا غلط

سیندھی تو پیتے تھے مگر جوے کی لت میں کھپ گئے
سیندھی غلط ، ٹھرا غلط ، گھوڑا غلط ، جوا غلط

لک لک ہے باڈی آپ کی اوپر سے چوتھا عقد ہے
باڈی غلط ، بلتا غلط ، شادی غلط ، نوشہ غلط

سستا گڑمبہ پی لیئے ، پی کو سڑک پر گر گئے
سستا غلط ، مہنگا غلط ، پینا غلط ، گرنا غلط

●☆●

شیخ سلیم
صدر شعبہ اردو انوار العلوم کالج

پٹرول نوشی

عنوان پڑھ کر چونکیے نہیں کیوں کہ آج کے دور میں چونکا دینے والے لتے بے حساب واقعات اور حادثات ہونے لگے ہیں جن کا ذکر کرنے لگیں تو ایک دفتر کھل جائے گا۔ اور تو اور آج کل تو کوئی بڑے سے بڑے اسکنڈل سے بھی نہیں چونکتا، اور نہ ہی اسکنڈل میں مبتلا ہونے سے چوکتا ہے اسی لئے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

شیخ خلافِ شرع تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

دعدہ عبرت سے کائنات کا مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ خالق کائنات نے انسانوں کے فائدے کے لئے ہر قسم کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ کسی کو پانی (بہ شکل دریا) کی دولت سے مالا مال کیا ہے تو کسی کو پٹرول کی دولت سے، مگر ہماری قسمت دیکھئے کہ ہم اسی پٹرول کے ستائے ہوئے ہیں بلکہ یوں کہیں تو بے جانہ ہوگا کہ پٹرول گزیدہ ہیں۔ ماجرا یہ ہے کہ ہماری اسکوٹر کو پٹرول نوشی کی ایسی بری لت پڑ گئی کہ اس سے اب خدا ہی بچائے، اس بری عادت سے چھٹکارا پانے کی جب بھی کوشش کرتے ہیں تو کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ گاڑی کو راہ راست پر لاتے لاتے ہم رینگنے لگ جائیں گے ۔ خدا جانے ہماری گاڑی کو یہ بری لت کیسے لگی کہ چھوٹتی ہی نہیں۔ اس موقع پر استاد ذوق کا یہ مصرعہ بڑی شدت سے یاد آرہا ہے ۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

یہ کڑوی حقیقت ہے کہ ہماری گاڑی امیروں کی بڑی بڑی گاڑیوں کی صحبت میں رہ کر خراب ہوگئی ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اب ہماری گاڑی ان کی برابری کرنا چاہتی ہے ۔ ہم نے لاکھ سمجھایا کہ دیکھو کویت اور عراق کے درمیان جنگ کبھی کی ختم ہوگئی ہو مگر حکومت کی طرف سے لگائے ہوئے "گلف سرچارج" کو ابھی تک ختم نہیں کیا گیا۔ ایک گلف سرچارج کا ذکر کیا یہاں اشیاء کے دام ایک بار بڑھے ہیں تو پھر کبھی نہیں اترے۔ اچھے اچھے اس دنیا سے بڑھ گئے اور بڑے بڑے نیچے اتر گئے ۔ اس لئے یہ ظاہری شان و شوکت چھوڑو، تم کوئی ظاہر دار بیگ کی سواری تو ہو نہیں۔ جب بھی ہم سمجھانے کی کوشش کرتے تو ہماری گاڑی اور چیخنے اور چلانے لگتی ہے اور اکثر خرابی صحت کا بہانہ بنا کر ہم سے مزید روپیہ خرچ کروا دیتی ہے ۔ ایک مرتبہ ہمیں اپنی گاڑی کا علاج کرانے کے لئے ایک میکانک کے پاس اسے لے جانا پڑا۔ میکانک بظاہر بڑا شریف نظر آتا تھا، جب شراب کے نشے میں دھت وہ ہماری کار کا معائنہ کرنے لگا تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کر رہا ہو۔ خیر یہ سب نازیبا حرکتیں ہم برداشت کر لیتے مگر ہمیں غصہ اس وقت آیا جب میکانک نے کچھ پرزے ہماری گاڑی کے پٹرول ہی سے دھونے شروع کئے، ہم نے سوچا یہاں بھی پٹرول ہمارا دل جلا رہا ہے، اس سے پہلے کہ ہمارا وجود جل کر بھسم ہو جاتا ہم نے اپنا روئے سخن اپنی گاڑی کی طرف کرتے ہوئے نہایت بے بسی سے کہا اے خوش رو پری جمال شیطانی چمکدار تم پٹرول پی رہی ہو۔ یا ہمارا خون پی رہی ہو، ہم کوئی سیاسی لیڈر یا رہنما نہیں کہ اپنے آخری قطرہ خون کو تیرے لئے بہادیں، اب

صرف دوسروں کا خون بہایا جاتا ہے ۔ اپنا نہیں ۔ میکانک بڑی دیر سے اور بڑے غور سے ہماری یہ باتیں سن رہا تھا، کہنے لگا ارے صاحب آپ بھی بڑے عجیب و غریب آدمی ہیں ۔ بہت سارے ممالک میں تو لوگ پٹرول سے ہاتھ دھوتے ہیں، پٹرول کی اتنی بہتات ہے کہ آپ کے ہمارے یہاں پانی بھی اتنی مقدار میں نہیں ملتا، ہم نے کہا جب ہی تو اپنے ممالک میں لوگ اخلاق اور مذہبی فرائض سے بھی ہاتھ دھوتے جارہے ہیں ۔ ایک دن اپنے مقصد اور وجود سے بھی ہاتھ دھولیں گے، شاید اس وقت انہیں خیال آئے گا ۔

ہمارا جی چاہتا ہے کہ اپنی گاڑی کو سمجھائیں کہ دیکھو پٹرول نوشی کوئی اچھی اور قابل تعریف عادت نہیں ہے ۔ یہ تو شراب نوشی کی سی لت ہے اور پٹرول کے زیادہ استعمال سے ماحولیات کی آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ اس لئے تمہیں بڑا محتاط ہو کر پٹرول کا استعمال کرنا ہوگا ۔ لیکن ہماری اسکوٹر کو بھی یہ کہنے کا حق ہے میں تو نہایت حقیر فقیر اسکوٹر ہوں، میری حیثیت ہی کتنی ہے جب کہ دنیا میں کتنی بڑی اور چھوٹی گاڑیاں چلتی ہیں اور بے تحاشا پٹرول نوشی کے بعد کثیف دھواں خارج کرتی ہیں ، انہیں کوئی نہیں روکتا، خود ہمارے حیدرآباد میں روزانہ تقریباً 80 ہزار گاڑیاں چلتی ہیں، تو تم ہی اندازہ لگاؤ کہ ہمارے ماحول کا حلیہ کتنا بگڑتا ہوگا "۔

حال ہی کی بات ہے کہ ٹریفک پولیس کی جانب سے چیکنگ ہورہی تھی ۔ میں نے بھی اپنی گاڑی میں سے پولیوشن سرٹی فیکیٹ کی کاپی پیش کردی ۔ مگر ایک ذمہ دار شہری کا احساس کرتے ہوئے آفیسر سے کہا کہ یہ سرٹی فیکیٹ غلط ہے ۔ میری گاڑی سے بے تحاشا دھواں نکل رہا ہے اور یہ قصور میری گاڑی کا بھی نہیں، کیوں کہ پٹرول شاید خالص ہے اور ہماری گاڑیوں کو ملاوٹ شدہ پٹرول استعمال کرنے کی عادت ہوگئی ہے ۔ ہاں کہیں کہیں پٹرول میں معلوم نہیں کیا کیا ملایا جاتا ہے ۔ اس وقت ہماری گاڑی بھی بے تحاشہ کھانسنے لگتی ہے اور اپنا دلی غبار بہ شکل دھواں چھوڑتی ہے تو سانس لینے والے دوسرے مفت میں ہی کھانسنے اور آنکھیں ملنے لگتے ہیں ۔ اس وقت ہم سوچتے ہیں کہ وہ کتنے اچھے ممالک ہوں گے جہاں گاڑیوں کو پٹرول نوشی کی اس قدر بری عادتوں سے بچانے کے لئے گاڑیاں ہی کم چلائی جاتی ہیں ۔ اس کے برعکس سائیکل زیادہ استعمال کی جاتی ہے ۔ ایک تو پیسے کی بچت، دوسرے ماحولیات کا تحفظ اس کے علاوہ کولیسٹرول کے کم ہوجانے سے صحت برقرار رہتی ہے لیکن یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں ۔ ہمیں تو پٹرول نوشی نے ایسا مارا ہے کہ اب کسی بھی قسم کی "نوشی" کی ہمت باقی نہیں رہی ۔ ☆

●☆●☆●☆●

بے فائدہ

راجہ محمود آباد نے بہت پیار سے مجاز سے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مجاز اگر تم مان لو، تو ایک بات کہوں "۔

مجاز سراپا انکسار بنتے ہوئے بولا: آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر ۔ فرمایئے راجہ صاحب کیا ارشاد ہے ؟ "

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے دو سو روپئے ماہوار وظیفہ مقرر کردوں "۔

"بڑا کرم ہے حضور کا" مجاز نے پھر اسی منکسرانہ لہجہ میں کہا:

"لیکن ...." راجہ صاحب قدرے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولے ۔ "لیکن تم خدا کے لئے شراب پینا چھوڑ دو "۔

"شراب پینا چھوڑ دوں ؟" ۔ مجاز نے نہایت حیرانی اور بیچارگی سے راجہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"پھر آپ کے دو سو روپئے ہر ماہ میرے کس کام آیا کریں گے ؟" ۔ ☆

فضل جاوید
1862 ایم آئی جی کالونی
بی ایچ ای ایل، آر سی پورم
حیدرآباد

بات سے بات نکلنا

متوسط طبقہ پر مشتمل تین ہزار مکانوں کی ہماری ایک صاف ستھری کالونی ہے۔ کچھ حکومت کی شجرکاری کی پالیسی اور کچھ مکینوں کا ہرا بھرا ذوق کہ سبزہ زار مقام ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہر آنے والے کو ایک پرسکون ماحول میں لئے چلتا ہے۔ متوسط طبقہ ایک مظلوم قسم کا طبقہ ہوتا ہے۔ اسے غریبی سے نفرت ہوتی ہے اور امیروں کی برابری کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اول الذکر کو یہ منہ نہیں لگاتا اور آخر الذکر اسے قبول نہیں کرتا۔ اس لئے امیر اور غریب دونوں طبقوں کہ درمیان وہ ہمیشہ معلق رہتا ہے۔ خیر یہ طبقاتی کشمکش ایک گمبیر سماجی مسئلہ ہے۔ اس سے ہمیں کیا لینا دینا دراصل ہم بھی اسی مظلوم طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کبھی کبھی ذہن کچھ اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہتا ہے۔ روز بروز ہماری زندگی کا معیار اتنا بلند ہوتا جارہا ہے کہ ماضی کی بہت سی قدریں اب چھوٹی لگنے لگی ہیں۔ دو تین دہے قبل اگر کسی کے پاس کار اور ریفریجریٹر ہوتے تو یقیناً اس کا تعلق کسی اعلیٰ طبقہ سے ہوتا تھا لیکن اب یہی چیزیں مثلاً ٹی۔ وی، ائرکنڈیشنر، ٹیلیفون، کمپیوٹر وغیرہ متوسط طبقے کے ہر گھر کی ضرورت بن گئی ہیں۔

کلومیاں نے شاید موجودہ حالات کی نبض پہچان لی تھی ایک ائرکنڈیشنر فٹ کر کے انہوں نے اپنی طرز کا ایک اصلاح خانہ کھول دیا تھا جو شاندار عصری فرنیچر سے مزین تھا۔ ریاست کے ایک وزیر نے اس اصلاح خانہ کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا "کون کہتا ہے ہمارا دیش ایک پچھڑا ہوا دیش ہے۔ کلومیاں نے یہ اصلاح خانہ کھول کر نہ صرف اپنے دیش کا نام اونچا کیا ہے بلکہ پورے سماج کو یہ بتلا دیا ہے کہ غریبی کی سطح سے اونچا اٹھنا ہے تو اپنی محنت، لگن اور ایمانداری سے روٹی کپڑا اور مکان حاصل کرنا ہوگا۔ وزیر موصوف اپنی تقریر میں کلومیاں کے اصلاح خانہ کو غریبی ہٹاؤ کا ایک پلیٹ فارم بنا رہے تھے۔ نہ جانے اس افتتاحی تقریب میں انہوں نے ملک کے اور کون کونسے مسائل پر اظہار خیال فرمایا ہوگا اس کا ہمیں علم نہیں کیونکہ وہاں سے اٹھ کر ہم کلومیاں کے اصلاح خانہ اور ملک کی معشیت کے درمیان قدر مشترک تلاش کرتے کرتے گھر پہنچ چکے تھے۔

مئی کی چلچلاتی دھوپ تھی۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ کچھ وقت کلومیاں کے ائرکنڈیشن اصلاح خانہ میں ٹھنڈک کے مزے لوٹیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اندر داخل ہوئے تو ٹھیک مہک ریز ہوا کا جھونکا ہم سے ٹکرایا۔ انتہائی شاندار فرنیچر سے آراستہ اس ہال نما اصلاح خانے کے تمام نائی سفید یونیفارم میں ملبوس تھے۔ ہمیں دیکھ کر کلومیاں نے بہ نفس نفیس آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں ایک آرام دہ کرسی پر بٹھا کر وہ بولے ـــــ "حضور! ناچیز کو کلو کہتے ہیں۔ آپ کا نام نامی؟ ہم نے کہا "اقبال" وہ فوراً بولے "آپ کا بلند ہو آپ نے ہمارے اصلاح خانہ میں قدم رنجہ فرمایا"۔

ہم نے حیرت سے کلومیاں کو دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟" "تعلیم"؟ انہوں نے برقی برش سے ہمارے زوال آمادہ بالوں کو سلجھاتے ہوئے دہرایا ـــ "والد محترم سالار جنگ مرحوم کے بال بناتے تھے۔ جو فیض انہوں نے سالار

جنگ کی صحبت میں حاصل کیا دہی ورثہ میں ہمیں ملا۔ آجکل کی پڑھائی بھی کوئی پڑھائی ہے میاں، بچے مکتب میں جا کر پڑھتے کم ہیں اور جوڈو اور کراٹے کی تعلیم زیادہ حاصل کرتے ہیں اور اس کی مشق یا تو گھر کے بزرگوں پر ہوتی ہے یا پھر محلے والوں پر۔ تعلیم تو میاں، حضور نظام کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ مجال ہے کوئی فارسی کی گردان میں ذرا سی بھی غلطی کر جائے۔ اردو کے قواعد تو زندگی کو باقاعدہ بنا دیتے تھے۔ کلو میاں نے ہماری گردن ایک طرف موڑ کے کنگے سے قلم بناتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ "اقبال میاں، آپ نے وہ زمانہ دیکھا نہیں جب حضور نظام کی سواری شام پانچ بجے روزانہ عزاء خانہ زہرہ تک آتی تھی۔ میاں کیا شان ہوتی تھی۔ ایک سیٹی بجتی اور ٹرافک کانسٹبل اپنے چبوترے سے اتر کر احتراماً کھڑا ہوجاتا تھا۔ راہ گیر چلتے چلتے رک جاتے۔ جب تک کہ حضور نظام کی سب موٹر کاریں گزر نہ جاتیں ۔۔۔"

ہم نے قطع کلامی کی معافی چاہتے ہوئے دریافت کیا "آپ کہاں سے یہ نظارہ کرتے تھے ؟

"میاں، دیوان دیوڑھی میں والد مرحوم کا اصلاح خانہ تھا۔ وہیں بیٹھ کر اس شہر کے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ وہ اخلاق دیکھا ہے لوگوں میں ملنساری دیکھی ہے جو آج ناپید ہے ۔۔۔"

ہماری گردن دوسری طرف موڑتے ہوئے کلو میاں نے گیئر بدلا۔

"اقبال میاں، یہ آپ کی سائنس کبھی قدرت سے ٹکر لے سکتی ہے۔ یہ بڑی طاقتیں بھی بے پر کی اڑاتی رہتی ہیں۔ کہیں امریکہ والے چاند پر قدم رکھ دیتے ہیں کہیں آسمانوں میں انسان کے بنائے ہوئے سیارے گردش کرنے لگتے ہیں۔ کیا یہ سب ممکن ہے ؟ یہ بالکل ناممکن ہے۔"

کلو میاں کے تیور دیکھ کر ہم منہ کھولنا نہیں چاہ رہے تھے لیکن رہا نہ گیا اور بولے۔ کلو میاں، ساری دنیا پر یہ راز آشکار ہوچکا ہے شک کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں رہی۔ آپ کے اصلاح خانے کا ٹیلی وژن بھی انہی سیاروں کی دین ہے "۔

کلو میاں نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے استرے سے زیر قلم ایک نشتر سا لگا یا اور بولے۔ "میاں آپ بھی کس کی باتوں پر اعتبار کررہے ہیں۔ V.T بھی تو انہی لوگوں نے بنایا ہے۔ جو چاہے دکھالیں اس میں ۔۔۔"

ہمیں چپ رہنے ہی میں عافیت نظر آئی کیونکہ کلو میاں کے ہاتھ میں استرا تھا اور ہمیں اسپتال نہیں گھر پہنچنا تھا۔ لیکن کلو میاں کو چپ رہنے کی عادت نہیں تھی۔

"میاں ! بھوت پریت پر آپ کو یقین ہے۔ ؟ ہم نے اثبات میں سر ہلادیا اس ڈر سے کہ کہیں وہ نفی میں جواب سن کر اس میدان میں اپنی ریسرچ شروع نہ کردیں۔ لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔

"میاں ہمارے علاقے میں کسی بھوت کی کیا مجال کہ قدم بھی رکھ سکے۔ مولانا عامل پہلوان نے ایسی بندش کر رکھی ہے کہ بھوت پر بھی نہیں مار سکتا۔ ہمارے گھر کے قریب پیپل کا ایک بہت بڑا درخت ہے۔ ہر ساتویں دن رات کے بارہ بجے ایک بیس فیٹ لمبا کالا ناگ اس درخت کے نیچے آتا تھا۔ اس کے پھن پر ایک ہیرا جڑا ہوتا تھا جسکی روشنی اندھیری رات کو دن کی طرح روشن کردیتی تھی۔ کئی لوگوں نے نیت خراب کی لیکن ہیرے کی لالچ میں اپنی جان گنوا بیٹھے۔ میرے ایک دوست جعفر علی نے ایک دن مولانا عامل پہلوان کی خوب منت سماجت کی اور اس ناگ کو بس میں کرنے کی ترکیب پوچھی۔ عامل صاحب نے اس سے کہا کہ دیکھو اگر ناگ کو بس میں کر بھی لو گے اور ہیرا تمہارے ہاتھ لگ بھی جائے تو یہ ضروری تو نہیں کہ وہ تمہیں راس بھی آئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اس ہیرے کی بدولت حیدرآباد کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہونے لگو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم مکمل طور پر برباد ہوجاؤ۔ جعفر علی اپنی ضد پر اڑا رہا۔

عامل صاحب نے اسے ایک تعویذ دی اور کہا کہ اسے پہن لو اور ناگ پر بھر مارسے فائر کر دو۔ ناگ مرجائے گا تم ہیرا حاصل کر لو۔ جعفر علی نے اس طرح کیا۔ سانپ مر گیا۔ جعفر علی نے ہیرا لے لیا۔ لیکن اسکے بعد اس کا کیا حشر ہوا آج تک کسی کو نہیں معلوم۔"

دل میں آیا کہدیں کہ جعفر علی اس ہیرے کو لے کر امریکہ، انگلستان یا سوئیزر لینڈ چلا گیا اور زندگی کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔ لیکن ڈر تھا کہ کلو میاں اس قصہ کو پھر طول نہ دیں۔ اب شیو کا مرحلہ آگیا تھا۔ چہرے پر برش سے جھاگ پھیلاتے ہوئے وہ بولے۔

"ایک بات اچھی طرح یاد رکھئے اقبال میاں۔ مغرب کے وقت کبھی بھی بچوں کو اپنے نام سے نہ بلائیے گا۔ ایک بڑی چڑی ہوتی ہے۔ عجیب شیطانی مخلوق ہے۔ اگر کسی بچے کا نام سن لے گی تو اس کا نام لے لے کر اس وقت تک پکارے گی جب تک کہ وہ بچہ مر نہیں جاتا۔ ہمارے پڑوس میں رمضانی رہتا تھا۔ مغرب کے وقت اس نے اپنے لڑکے بلال کو پکارا۔ بڑی چڑی نے سن لیا۔ اب اس کی رٹ شروع ہوگئی۔ "بلال چاہئے۔ بلال چاہئے" گھر کے سب لوگ پریشان ہوگئے۔ بلال دن بہ دن سوکھ کر کانٹا ہوا جا رہا تھا۔ آخر لوگوں نے ایک ترکیب سوچی۔ ایک بڑے لمبے کدو کو کفن پہنا کر اس گھر سے قبرستان کی طرف لے گئے اور کہنے لگے کہ "بلال مر گیا۔ بلال مر گیا" دوسری شام بڑی چڑی پھر گھر کے اوپر منڈلائی "مجھے بلال چاہئے کدو مرا تھا۔ مجھے بلال چاہئے کدو مرا تھا" دوسرے دن سچ مچ بلال کی موت واقع ہوگئی۔ ہاں تو اقبال میاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ مغرب کے وقت بچوں کو اپنے نام سے نہ بلائیں۔"

کلو میاں کی ان باتوں کا شاید کچھ اثر ہم پر ہونے لگا تھا کیونکہ ریڑھ کی ہڈی سے ایک ٹھنڈی لہر اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اقبال میاں آج گاہک کم ہیں ورنہ آپ سے اتنی باتیں ہو نہیں پاتیں۔ ہمارے اصلاح خانے میں آپ جیسی تعلیم یافتہ اور وضع دار شخصیتیں ہی اپنی حجامت کروانے آتی ہیں۔ میاں حجامت سے یاد آیا۔ آج کل ہمارے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں بہت سے سیدھے سادے عوام و خواص کئی بدنیت فینانس کمپنیوں کی دھوکہ دہی کا شکار ہو چکے ہیں۔ حیدرآباد میں ہماری قوم کی معیشت اس قدر تباہ ہو چکی ہے کہ کل تک جو مفلسوں اور ناداروں کے لئے اپنا دست سخاوت وا کئے ہوئے تھے آج وہی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں ان دھوکہ بازوں نے بڑے بڑے مذہبی رہنماؤں اور مفتیوں کے فتوے فریم میں جڑوا کر اپنی دکانوں میں آویزاں کئے ہوئے تھے ہم سادہ لوح انسان حلال منافع کے لالچ میں حلال کر دیئے گئے۔ ان کی اتنی مکمل حجامت کر دی گئی کہ اب مزید کسی ڈریسینگ کی انہیں ضرورت نہیں پڑے گی۔ ان دھوکے بازوں نے کروڑوں کا گھپلا کر کے غیر ملکی بینکوں میں سرمایہ محفوظ کر لیا کچھ فرار ہو گئے کچھ روپوش ہوگئے۔ چند ایک گرفتار ہو کر ضمانت پر رہا ہوگئے۔ قانون اور پولیس ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ ان کی پشت پناہی بڑے بڑے نامی چارٹرڈ اکاونٹنس، پولیس اور سیاست دان کرتے ہیں۔ ان کے کرایہ کے غنڈے سرمایہ کاروں کو دھمکا بھی رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے ۳۵ تا ۴۰ لاکھ فی کس جمع کئے تھے ان کو دھمکی دی جارہی ہے کہ اگر زیادہ واویلا مچاؤ گے تو انکم ٹیکس والوں کو نام بتادیں گے۔"

ہم بڑے انہماک سے کلو میاں کی باتیں سننے لگے تھے کیونکہ برباد ہونے والوں میں ایک ہم بھی تھے۔ اپنا سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے۔ انھوں نے رازدارانہ لہجہ میں ہم سے پوچھا۔ "اقبال میاں! کہیں آپ بھی حلال منافع کے جال میں تو نہیں پھنسے؟ آپ کے چہرے سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ کیا کریں میاں! جسکی لاٹھی اس کی بھینس ہے۔ آپ جیسے شرفاء کی جانوں کے بچے کچے خون کے قطرے حیدرآباد کے دنگل اور کراٹوں کے ادارے چوس رہے ہیں۔ انہیں سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں کہ ان کمپنیوں کے روپوش دھوکے باز روزانہ ان کے دنگل اور اداروں میں آکر حاضری دیتے ہیں۔ اپنا کمیشن لے کر سرمایہ کاروں کو ان کی رقومات واپس دلوانے کا تیقن بھی دیتے ہیں۔ اقبال میاں! ان میں سے کچھ پہلوان معتبر بھی ہیں۔ واقعی آپ کی رقم ڈوبی ہوئی ہے تو بتائیے۔ فلنوش کراٹے ماسٹر اپنے ہی آدمی ہیں بڑے بڑے وزیر اپنی کاریں بھیج کر انہیں بلاتے ہیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ آپ ہمیں سارے صداقت ناموں کی

زیرا کس دے دیں اور اطمینان سے گھر بیٹھ جائیں انشاء اللہ آپ کی رقم گھر پہنچ جائے گی۔ ویسے آپ کا سرمایہ ہے کتنا؟

ہم نے اٹکتے اٹکتے کہا۔ "یہی کوئی ڈھائی تین لاکھ۔"

"خیر یہ تو معمولی رقم ہے۔ ایک صاحب کے اکیس لاکھ ابھی دلوائے ہیں۔ ابھی تو آپ سفر خرچ وغیرہ کے لئے دو ہزار ایڈوانس دیجئے باقی حساب تو بعد میں ہوتا رہے گا"۔

ڈھائی تین لاکھ کو ہم اتار دچکے تھے کہ ان دو ہزار کے لئے تھوڑے آنسو بھی نہیں بچے۔

کلو میاں ملتجیانہ نظروں سے ہماری جیب کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن جب ہاتھ میں دس دس کے دو نوٹ اور پانچ کا ایک دیکھا تو بہت مایوس ہوئے۔ سر کی مالش یکلخت ختم کر کے ایک لوشن چہرے پر ملے۔ پرفیوم چھڑکا اور بولے "لیجئے صاحب! آپ کا تمام ہوا۔ خدا حافظ!"

ہم کرسی سے اتر کر آئینہ میں اپنا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ دوسرے گاہک کو کرسی پر بٹھا کر اپنے نئے شکار سے مہابھارت اور سلطان پر اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ درمیان میں ہم نے جب ٹیپو سلطان پر کلو میاں کے خیالات کی تصحیح کی کوشش کی تو کی غصہ بھری آنکھیں ہمیں گھورنے لگیں گویا کہہ رہی ہوں۔ دو ہزار کا نقصان کر دیا اب کیا لینے کھڑے ہو دفع ہو جاؤ۔ ☆

●☆●☆●☆●☆●

پیش بندی

قتیل شفائی نے ایم۔ اسلم سے اپنی اولین ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے کہا "کتنی عجیب بات ہے کہ میں اسلم صاحب کی کوٹھی میں ان سے ملنے گیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا تازہ افسانہ سننے سے بال بال بچ گیا"۔

"یہ ناممکن ہے!"

احباب میں سے ایک نے بات کاٹتے ہوئے فوراً تردید کر دی۔

"سنئے تو"

قتیل نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"ہوا یوں کہ انتہائی خاطر مدارات کے بعد جب اسلم صاحب اپنا نیا افسانہ سنانے کی موڈ میں آنے لگے تو انہوں نے کہا: قتیل صاحب! آپ کی کچھ نظمیں ادھر میری نظر سے گزری ہیں۔ آپ تو خاصے معقول شاعر ہیں مگر نہ جانے عام لوگ ہر ترقی پسند شاعر کے بارے میں کیوں بدگمانی کا شکار ہیں۔ اور اسلم صاحب کی اس بات کے جواب میں نہایت انکسار سے کام لیتے ہوئے میں نے کہا:

"جی ہاں واقعی عام لوگ بہت غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ دیکھئے نا اب آپ کے بارے میں بھی یوں تو یہی بات مشہور ہے کہ آپ ہر نووارد مہمان کی تواضع کرنے کے بعد اپنا کوئی نیا افسانہ ضرور سناتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے"۔ ☆

سگِ لیلیٰ (سولہویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی
(شکاگو)

سائرن میں بھی کتا بیٹھا ہے

سٹی ڈاگ لورز سوسائٹی کے حوالے سے سیکس ٹری کے بارے میں فلمی طوطے عرف وارڈ بوائے کی زبانی جو انکشاف ہوا تھا اس کے "شاک" نے ہمیں کچھ دیر کے لئے گم صم ضرور کردیا تھا، لیکن ہم جلد ہی دوبارہ اپنے حواسوں میں لوٹ آئے۔ فلمی طوطا ہنوز ہمارے سامنے کھڑا تھا اور ہمیں واپس حواسوں میں دیکھ کر سوالیہ لہجے میں بولا۔ ویسے آپ یاں

ایک چنبیلی کے منڈوے تل
کس خوشی میں ہیں بیٹھے ہوئے ... ؟

ہم نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا... "ڈاکٹر صاحب کے دکان بند کرنے کا انتظار کر رہا ہوں"۔

ہمارے طنز پر بجائے بھڑکنے کے محظوظ ہوتا ہوا بولا: "بالکل صحی بولے، یہ ڈسپنسری کاں ہے۔ دکان ہے اور ڈاکٹری، دکانداری"۔ مگر اس کے بند ہونے میں ابھی بہت وقت ہے۔ آپ کو بہت لمبا انتظار کا "چلہ" کھینچا پڑیں گا۔ یعنی کہ

یہ کلی جب تلک پھول بن کر کھلے
انتظار انتظار انتظار کرو، انتظار کرو ... !!

کم بخت نے گانے کا ٹکڑا مکمل کر کے آنکھ مارتے ہوئے کہا: "اگر آپ چاہے تو ڈاکٹر صاب کی دکان وقت سے پہلے بھی بند ہو سکتی"۔

اس کی باتوں میں چھپا ہوا اشارہ ہم سمجھ گئے تھے پھر بھی انجان بنتے ہوئے کہا: "چاہتا تو میں یہی ہوں۔ لیکن اس کے لئے مجھے کیا کرنا پڑے گا؟"۔

جواب میں اس کے دل کی بات فوراً زبان پر آگئی بولا: "تھوڑا خرچہ کرنا پڑیں گا اور کیا؟"

ہم نے پھٹاک سے جواب دیا: "ٹھیک ہے خرچہ میں کرلوں گا۔ تم کیا کروگے؟"

ہنس کر بولا: "میں کیا کروں گا پوچھ رئیں؟" آپ جانتے نئیں میں کون ہوں! ذرا غور سے سنو

جانے والو ذرا ہوشیار یہاں کے ہم ہیں راج کمار
آگے پیچھے ہماری سرکار یہاں کے ہم ہیں راج کمار،

گانا گانے کے بعد تحت میں آگے بولا: "ڈاکٹر صاب کی یہ دکان میرے حکم پہ کھلتی میرے حکم پہ بند ہوتی۔ میں آرڈر دیا تلک الوں ڈسپنسر سے باہر نئیں آسکتے"۔

ہم نے طنزیہ لہجے میں وار کیا: "تو گویا تم یہاں خدائی فوجدار لگے ہوئے ہو!"

اس نے پھٹاک سے جواب دیا: "میں یاں کیا لگا ہوا ہوں یہ معلوم کرنا ہے آپ کو تو ہاتھ ڈالو جیب میں پھر دیکھو ڈاکٹر صاب

کتے کے ویسا جیب لٹکا کے کیسا باہر آتیں" ۔

اس سے مزید بحث کرنا فضول تھا لہذا دس کا ایک نوٹ اس کی نذر کر کے اس کا کمال دیکھنے کی درخواست کی۔ نوٹ جیب میں رکھ کر اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور گانے لگا:

ہم جب چلیں تو یہ جہان جھومے
آرزو ہماری آسماں کو چومے ..... ،
ہم جب چلیں تو ....

وہ ہمیں اپنے پیچھے چلاتا ہوا پورٹیکو تک لے گیا پھر پورٹیکو کے ایک ستون کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ پھر ہماری طرف پلٹ کر اپنی کلمے کی انگلی ہماری آنکھوں کے سامنے لہراتا ہوا سوالیہ لہجے میں بولا: "یہ کیا ہے ؟" اس بچکانہ سوال پر ہم نے تمسخرانہ لہجے میں جواب دیا "انگلی ہے اور کیا ہے ؟"

پھٹاک سے بولا: " بالکل صحی بولے آپ، انگلی ہے! اتی سرکی، تین انگل کی۔ مگر اس کا کمال اللہ اللہ اللہ۔ بڑے بڑوں کو اپنے اشارے کے اوپر پھرکی کے ویسا نچاتی یعنی کہ:

ناچ میری جان فتا فات فت
بات میری مان فتا فات فت "

ہم نے بور ہو کر اسے ٹوکا "لفاظی بہت ہو چکی، اب ذرا اپنی انگلی کا کمال دکھاؤ" ۔

جواب میں ستون میں لگے ایک سوئچ کی طرف اپنی مذکورہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "کمال دیکھنا چاہتیں آپ تو دیکھو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھو، میری یہ انگلی جیسے ہی اس سوئچ کو "ٹچ" (Touch) کریں گی ادھر سے پٹ کر کے ڈاکٹر صاحب میری انگلی کے اشارے پہ فلم راج کمار، کے شمی کپور کے ویسا اچھلتے کودتے، یہ گانا گاتے ہوئے آکے آپ کے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گے ۔

تم نے پکارا اور ہم چلے آئے
دل ہتھیلی پہ لے آئے اے ... اے ... اے "

فلمی طوطے کی انگلی نے جیسے ہی بجلی کے سوئچ کو چھوا ہماری سماعت پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ چاروں طرف سے کتے بھونکنے لگے، ہم نے بڑبڑا کر چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظریں گھمائیں، لیکن کتے کہیں نظر نہیں آئے، بس آوازیں ہی آوازیں تھیں، ایسا لگتا تھا جیسے پورٹیکو کی چھت کو سہارا دینے والے چاروں ستونوں میں کتے چنوائے ہوئے ہیں، جو سوئچ کو چھوتے ہی زندہ ہو کر بھونکنے لگے ۔
ہم نے فلمی طوطے سے اشاروں ہی اشاروں میں پوچھا کہ بھئی یہ ماجرا کیا ہے ؟ تو جواب میں اس مسخرے نے کہا "یہ چھٹی کا سائرن ہے حضت!! "

ہم نے بڑبڑا کر کہا: "سائرن! مطلب ؟"

وہ بولا "سائرن تمیں معلوم آپ کو۔ وہ جو ملوں کارخانوں میں ڈیوٹی شروع ہوتے وقت پھر ختم ہوتے وقت دونوں وقت بجتا دیکھو۔"

ہم نے متحیر لہجے میں کہا: "مگر یہ کیسا سائرن ہے جس میں سے کتوں کی چیخ و پکار نشر ہو رہی ہے ؟"

اس نے پھٹاک سے جواب دیا: "آپ وہ کہاوت تمیں سنے کیا؟ جیسی روح ویسے فرشتے بول کے، ویسا ہی جیسا کام ویسے سائرن بھی ہوتے۔ ملوں اور کارخانوں کے سائرن "پوں" بول کے بجتے اور یہ کتوں کی ڈسپنسری ہے اس واسطے بول کے یاں سائرن

میں بھی کتے ہی بھونکتے !! " اس کی بات کے ختم ہوتے ہوتے ڈسپنسری میں سے ڈاکٹر صاحب، پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ فلمی طوطے نے واقعی ٹھیک کہا تھا کہ اس کی انگلی کا اشارہ ڈاکٹر کو باہر کھینچ لائے گا۔ ہم اس کی باکمال انگلی کو چومنے کی نیت سے اس کی طرف پلٹے لیکن تب تک وہ اپنی انگلی سمیت پھر غائب ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر ڈی ڈی کتا والا جیسے ہی باہر نکل کر اپنی جیپ کی طرف بڑھے، ہم بھی کسی دم چھلے کی طرح ان کے ساتھ ہو لئے۔ موصوف نے ہمیں اپنے ساتھ والی نشست پر بٹھایا اور خود ڈرائیور والی سیٹ پر بیٹھ کر جیپ کو اسٹارٹ کیا۔ جیپ جیسے ہی بیرونی پھاٹک سے باہر نکل کر پکی سڑک پر پہنچی۔ جناب نے پہلے تو اپنا کتا چھاپ قہقہہ بلند کیا پھر وہی مخصوص فقرہ ارشاد فرمایا جسے سن کر اب سے پہلے دو مرتبہ ہم شرمانے کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس مرتبہ البتہ اس فقرہ مخصوص میں کچھ نئے اضافے ضرور تھے، فرمایا

"سوزی پچھلے پانچ برس سے میری سیکس ٹری ہے لیکن اس عرصے میں تم پہلے نوجوان ہو جس پر اس نے عنایتوں کی مسلسل باڑھ لگا دی ورنہ اس سے پہلے کسی پر عنایت تو دور اس نے کسی قسم کی رو رعایت بھی نہیں کی۔ ضرور تم میں کوئی سیکسٹرا آر ڈی نری (Sextraordinary) کشش ہے، کوئی موہنی ہے، اوروں کی بات جانے دو، میری سیکس ٹری ہو کر اس نے کبھی مجھے نگاہ غلط انداز سے دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور تم پر ایک دم لٹو ہو گئی۔ مجھے بھی ذرا یہ گر سکھا دو !!! "

موصوف کا ایک ایک لفظ رشک میں ڈوبا ہوا تھا نتیجتاً ہم بھی گلے گلے شرم میں ڈوب گئے۔ بمشکل تمام ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے جواب دیا۔ " مجھ میں کوئی موہنی سوہنی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، اگر ہوتی تو ایک کتے کے لئے مجھے اتنے پاپڑ نہ بیلنے پڑتے ! "

" گویا تمہارا یہ خیال ہے کہ ایک کتے کو زیر کرنا کسی خوبصورت لڑکی کو رام کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے ؟ "۔ ڈاکٹر صاحب نے متحیر لہجے میں کہا۔

ہم نے جواباً حتمی لہجے میں کہا: " یقیناً! اور اس اعتبار سے آپ مجھ سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہیں! "

" ٹھیک ہے: " دل کے بہلانے کو سودا یہ خیال اچھا ہے " موصوف نے کسی کا مصرع کسی کے کھاتے میں ڈال دیا۔ لہٰذا ہم نے فوراً تصحیح کر ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب میرے خیال میں یہ مشہور مصرع سودا کا نہیں غالب کا ہے اور یوں ہے:

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

" کسی کا بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے " موصوف نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ " پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا مجھے سودا تخلص زیادہ پسند ہے۔ ذرا غور کرو کس قدر روزمرہ کی اصطلاح کو شاعر نے تخلص کے طور پر اپنایا ہے۔ سودا جس کے بغیر کسی گھر میں ہانڈی چولہے نہیں چڑھتی۔ موصوف اپنی اس انوکھی دلیل پر خود ہی ہنسنے لگے، وہ مخصوص ہنسی جس کے اب ہم تھوڑے تھوڑے عادی ہو چکے تھے البتہ موصوف کی انوکھی دلیل نے ہماری اس رگ کو چھیڑ دیا جو شعر و ادب کے اس "راگ" سے پر تھی جسے چھیڑنے پر بقول غالب:

ایک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

والی بات صادق آتی ہے۔ چنانچہ عرض کیا " ڈاکٹر صاحب حضرت سودا کے معاملے میں آپ سے ذرا سی چوک ہو گئی۔ یہ سودا وہ نہیں جس کا لاحقہ ہے " سلف " اور یہ دونوں مل کر بنتے ہیں سودا سلف اور یہ تھیلیوں جھولیوں میں لایا جاتا ہے، جبکہ تخلص والا سودا تھیلیوں اور جھولیوں میں نہیں سر میں سماتا ہے گویا یہ سودا سلف والے حضرت سودا نہیں، البتہ اس سودے کے تعلق سے مرزا رفیع الدین سودا کے بجائے علامہ توفیق حیدر آبادی کا شعر سنئے:

اس نے کہا کیا دل میں ہے ، میں نے کہا الفت تیری
اس نے کہا کیا سر میں ہے ، میں نے کہا سودا تیرا !!

"واہ۔ واہ تمہیں تو شعر و ادب میں بھی خاصا دخل ہے بلکہ دخل در معقولات ہے ،"
موصوف نے بے ساختہ داد دیتے ہوئے کہا پھر آگے فرمایا : "تم میں ایک اچھے اور کامیاب عاشق کے پورے پورے اوصاف موجود ہیں "۔

"بس ایک کتے کو دوست بنانے کا وصف نہیں ہے " ہم نے حسرت سے ٹکڑا لگایا۔ "مایوس نہ ہو میرے بھائی میں تم میں یہ وصف بھی پیدا کردوں گا "۔ موصوف نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

باتوں باتوں میں ہم شہری حدود میں داخل ہو چکے تھے ۔ موصوف نے پوچھا
"تم نے اپنی محبوبہ کے دولت کدے کا پتہ تو بتایا ہی نہیں ؟"
ہم نے فوراً پتہ بتادیا "آغا پورہ چار قندیل"
موصوف نے برجستہ فرمایا : "بہت خوب ، عشق کرنے کے لئے تم نے میرے ہی محلے کو تا کا "۔
"اچھا ۔ آپ کا دولت خانہ بھی وہیں ہے ۔ "۔ ہمارے لہجے میں حیرت اور خوشی کا ملا جلا تاثر تھا۔
موصوف نے جواب میں حسرت آمیز لہجے میں کہا : - ہے تو سہی ، مگر اب تو ڈسپنسری ہی میرا گھر بن گئی ہے ۔ دنوں گھر جانے کا موقع نہیں ملتا "۔

اگلے موڑ پر پہنچتے ہی ، بلدیہ کے وارڈ آفس کی وہی عمارت نظر آنے لگی جہاں چار روز قبل ہمیں ایک عدد قیامت صغریٰ سے گزرنا پڑا تھا۔ جیپ جیسے ہی اس عمارت کی گلی والے موڑ پر پہنچی ہم نے موصوف کو اسی گلی میں جیپ موڑنے کو کہا ، گلی پار کرتے ہی داہنی طرف نیلا بنگلہ عرف درِ محبوب واقع تھا ، چنانچہ جیسے ہی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچے درِ محبوب تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نظر کے سامنے تھا "۔ (جاری) ☆

●☆●☆●☆●☆●

آنکھوں دیکھی

"ابی چھوڑیئے اوپندر ناتھ اشک کی بات۔ آپ بھی کس دوزخی کا ذکر لے بیٹھے۔ بے حد بخیل ہے بنیا.... سنئے خوب یاد آیا"۔
اس تمہید کے بعد مٹو نے نہایت لذیذ انداز میں بتانا شروع کیا۔
"کمبخت نے ایک بلی پال رکھی ہے ۔ جی ہاں بلی۔ صبح سویرے ہی اسے اڑوس پڑوس کے گھروں میں بھیج دیتے ہیں اور وہ شطونگڑی بھی کہیں نہ کہیں سے آنکھ بچا کر دودھ پی کر جب واپس آتی ہے ، تو اشک صاحب اسے الٹا لٹکا کر اس کے پیٹ سے سب دودھ باہر نکال لیتے ہیں اور پھر اسی دودھ سے چائے بنا کر پیتے ہیں ۔ جی ہاں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں ۔ رتی بھر مبالغہ نہیں۔ نہیں صاحب سنی سنائی نہیں۔ آنکھوں دیکھی بات ہے ۔ میں خود ان کے ہاں اس دودھ کی چائے پی چکا ہوں " ۔ ☆

م۔ ش۔ غوری
جدہ

"بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے"

بات کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ بات سے بات نکالتی گئیں اور بات کو بڑھاتی گئیں۔ کچھ کہنے سننے، سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا موقعہ دیے بغیر بے تکان بولتی رہیں۔ غصہ کی شدت، زبان کی تیزی اور بے ربط جملے، خدا گواہ ہے جو ایک لفظ ہماری سمجھ میں آیا ہو۔ اور نہ ہی یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ اس شعلہ زن و شعلہ خو پر کسی طرح قابو پائیں۔ آخر ہم نے اپنے اندر کی آگ بجھانے والے صلاحیتوں کو جھنجھوڑا۔ چرب زبانی کے پائپ میں عاجزی اور خوشامد کا پانی بھر کر اس کا رخ بیگم کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

خدا کے لیے بیگم اب چپ بھی ہوجاؤ اس چیخ و پکار کے سبب آپ کے گلے کی نقرئی گھنٹیوں کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ اور سنا ہے غصہ کی زیادتی سے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑجاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن اور خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ بدن میں رعشہ پیدا ہونے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ چہرے کی شادابی اور جوانی کا بانکپن جاتا رہتا ہے۔ ایک غصہ ہزار بیماریوں کو دعوت دیتا ہے۔ لہذا ہم نہیں چاہتے کہ اپنی پیاری اور چہیتی بیوی کے چاند سے چہرے پر اس کم عمری میں بزرگی کے آثار نمایاں ہوں۔ بلڈ پریشر اور دیگر بیماریوں کے سبب آپ کی حسین و جمیل سیاہ زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں گلاب، چنبیلی اور موتیا کے بجائے چاندنی چھٹکنے لگے۔ اور اس کم سنی میں آپ ایک سن رسیدہ خاتون نظر آنے لگیں ......"

ہماری بات کو کاٹتے ہوئے وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولیں:

"بھاڑ میں جاؤ تم اور چولہے میں جائے تمہاری یہ چاپلوسی ......"

یہ کہہ کر انھوں نے بیڈروم کا دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ عمارات کے ساتھ ساتھ ہم بھی لرز گئے۔

"پہلے ہی چنے کی طرح بھنے جارہے ہیں۔ اب مزید کیا بھاڑ میں جائیں گے۔" بڑبڑاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ وہ بیڈروم میں قید اور ہم ڈرائنگ روم میں آزاد۔ وہ بستر پر لیٹی یقیناً ہمارے بارے میں جھوٹ سچ، اچھا برا جو کچھ ان کے دل و دماغ میں آتا ہو گا سوچ رہی ہوں گی۔ اور ہم اس وجہ کے بارے میں سوچ رہے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمارے بارے میں ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔

آج صبح تک ہمارا گھر امن و سکون کا گہوارہ تھا۔ جنت تھی ہمارے پیار کی۔ پھر اچانک اس میں نفرت اور بد اعتمادی کے شعلے کیسے بھڑک اٹھے؟۔

کس نے آگ لگادی ہماری اس جنت میں؟ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔

جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے آناً فاناً کلاشنکوف کی طرح گولیاں برسا کر چلی گئیں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کیسے پتہ چلے کہ جس زباں سے آج صبح تک پھول جھڑا کرتے تھے وہی زبان یک بہ یک شعلے کیوں اگلنے لگی۔ جھیل سی خوبصورت آنکھیں جن میں ہر وقت پیار و محبت کے دیئے جلا کرتے تھے ان آنکھوں میں اچانک نفرت کا آتش فشاں کیسے دہک اٹھا۔ آج صبح تک جو صلح جو و صلح کل تھیں اچانک شمشیر برہنہ کیوں کر ہو گئیں۔

اس گتھی کو جتنا سلجھانے کی کوشش کرتے اتنا ہی یہ الجھتی جاتی تھی۔ ہماری شادی کو تقریباً 5 سال ہو چکے تھے۔ ان 5 سالوں میں

ایسا وقت کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود کہ ہماری کوئی اولاد نہ تھی، زندگی بڑی مطمئن اور پرسکون بسر ہورہی تھی۔ ایک دوسرے سے کسی کو کوئی شکایت تھی نہ گلا۔ اسی سوچ و بچار میں کافی وقت گزر گیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو نو بج رہے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھے، سوچا کہ ٹی۔ وی۔ کھول لیں۔ پھر یہ سوچ کر ہاتھ روک لیا کہ ان حالات میں جب کہ ہماری بیگم پر ان دیکھے اور ان جانے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ہمارا ٹی۔ وی۔ دیکھنا مناسب اقدام نہیں ہے۔ اس سے حالات کے مزید بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ پیٹ کی طرف دیکھا تو وہاں چوہوں کی ہرڈل ریس جاری تھی۔ کچن کا رخ کیا تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ سنک میں گوشت رکھا ہوا تھا۔ ایک برتن میں سبزی کٹی ہوئی تھی۔ ایک جانب پیاز، ٹماٹر اور ہرا مسالہ رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ آفت اس وقت ٹوٹ پڑی جب بیگم صاحبہ پکوان کی تیاری کررہی تھیں۔ فریج کھول کر دیکھا تو وہاں بیتے دنوں کی کچھ باقیات رکھی تھیں۔ دل نا چاہا کہ بیگم کو اس حال میں چھوڑ کر ہم اپنا پیٹ بھریں۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فریج بند کردیا۔

بیگم کو کمرے میں بند ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ سوچا کہ چلو چل کر منالیتے ہیں۔ ہمیں اس روٹھنے اور منانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ سنا یہی تھا کہ بیوی روٹھ جائے تو عموماً شوہر ہی منایا کرتے ہیں۔

بیڈ روم کے دروازہ کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ شکر ہے کہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ لائیٹ کے آن ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے کروٹ بدل لی اور اپنا رخ دوسری جانب کرلیا۔ چہرے پر رنج و ملال کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اپنی سب سے عزیز اور محبوب ہستی کو اس حال میں دیکھ کر ہم اپنا دل تھام کر رہ گئے۔ بے اختیار آگے بڑھے اور کہا۔

"للہ! کچھ تو بتلائیے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔؟ اپنی ناراضگی کی وجہ اور ہمارا قصور تو بتائیے ۔۔"

ہماری بات کو کاٹتے ہوئے غصہ اور نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیسے معصوم بن کر پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا! اب مزید بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی پناہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ سچ کہا ہے کسی نے مرد کی ذات اور گرگٹ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب چاہا اور جیسا چاہا رنگ بدل لیا۔ طوطا چشم اور موقع پرست، فطرت میں ایک جیسے ہوتے ہیں یہ سارے مرد۔ بہ ظاہر شریف نظر آنے والے ان شریف زادوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ ذات شریف کس لمحے، کس گھڑی، کس آن، اپنی شرافت کا چولا اتار پھینکیں گے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ فریبی، مکار اور جھوٹے ۔۔۔۔"

جو کچھ ان کے منہ میں آیا وہ بولتی رہیں۔ ہم پلنگ کے پائنتی ہاتھ باندھے چپ چاپ ایک غلام زادے کی طرح سر جھکائے سب کچھ سنتے رہے۔

نہ روکا نہ ٹوکا۔ ہم چاہتے تھے کہ ان کے دل و دماغ میں جو کچھ ہے وہ باہر آجائے۔ جب وہ چپ ہوئیں تو ہم نے انتہائی پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "دیکھیے! لگتا ہے صبح سے آپ نے کچھ نہیں کھایا اور ہم بھی بھوکے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہیں باہر جاکر پہلے کچھ کھا پی لیتے ہیں۔ پھر ۔۔۔۔"

"جی نہیں!" وہ ہماری پیار بھری اس پیش کش کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے بولیں۔ "یہاں جان پر بنی ہے اور جناب کو روٹیاں توڑنے کی سوجھ رہی ہے"۔

"نا میرے سرتاج نا! اب ہمیں کھانا ہے اور نہ کھلانا۔ جناب نے جس کو نظروں سے اپنے دل میں اتارا ہے اسی سے کہیئے کہ وہ حلق سے بھی آپ کے دل میں اترے۔" ایک لمحے کو سانس لینے رکیں اور پھر کہا۔

"ہم نے آپ کے چچا حضور کو بلوایا ہے ان کے آنے کے بعد ہم اپنے سر سے آپ کا یہ تاج اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔۔۔ سمجھے آپ!"

لہجہ انتہائی تلخ اور ناگوار تھا۔

بیگم کے اس طرح کے برتاؤ سے ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ ناکام و نامراد واپس ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ لیکن ایک امید اس اونٹنی کے کسی کروٹ بیٹھنے کی چچا حضور کی آمد سے بندھی ہوئی تھی۔ بیگم کا ایک جملہ بار بار ہمارے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

"جس کو نظروں سے دل میں اتارا ہے اسی سے کھو کر حلق سے بھی دل میں اترے "۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ معاملہ کچھ بدگمانی اور جلاپے کا ہے۔ مردوں کی طرف سے مشکوک ہوجانا یا رہنا صنف نازک کی صنعتی خرابی ہے جس کو دنیا کا کوئی مرد دور نہیں کرسکتا۔ یقیناً ہمارا تعلق کسی ان دیکھی حسینہ سے جوڑا جارہا ہے۔ ہم سوچنے لگے کون ہوسکتی ہے۔؟ کنواری؟ یا شادی شدہ؟ مطلقہ یا بیوہ؟ عزیز رشتہ داروں میں یا پاس پڑوس کی۔ ہمارے قریبی رشتہ داروں میں سے کچھ ملک سے باہر اور کچھ ملک کے اندر مختلف علاقوں میں آباد تھے۔ لے دے کر اس شہر میں ایک چچا اور ایک پھوپی رہتی تھیں۔ ہماری تمام پھوپی زاد نہ صرف اوور ایج (OVER AGE) تھیں بلکہ شادی شدہ اور صاحب اولاد بھی۔ اور چچا کے ہاں سب کے سب انڈر ایج (UNDER AGE) پرائمری اور کنڈر گارڈن لیول کے۔ پاس پڑوس میں نظریں دوڑائیں تو چند ایک چہروں پر نظریں ٹھہری گئیں۔ مگر ہم نے کبھی کسی کو ان نظروں سے نہیں دیکھا جن نظروں سے ہماری بیگم ہمارے لیے دیکھ رہی تھیں۔ جب ہر طرف سے ہماری نظریں مایوس ہوکر لوٹ آئیں تو ہم نے بیگم کی سہیلیوں کی جانب دیکھنا شروع کیا۔ ان میں کسی سے ہماری اتنی بے تکلفی نہ تھی کہ مشکوک ہوجاتے۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے ہمارا شفاف اور پاکیزہ کردار بیگم کی نظروں میں آلودہ ہوگیا تھا۔

اپنے ذہن کو تھکانا چھوڑ کر ہم امن کے پیامبر اپنے چچا کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کی گھنٹی بجی۔ حسب توقع چچا ہی تھے۔ دروازہ کھلتے ہی انھوں نے سلام دعا کو طاق پر رکھا اور لگے گرجنے اور برسنے۔ ہم نے کہا۔ "اے بدبختی آج کی شام تیرے نام۔ یوں لگتا ہے بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ آج ہمارا یوم ملامت منایا جارہا ہو۔ چچا حضور فی الحال ہماری حیثیت ایک ایسے مجرم کی ہے جس نے کوئی جرم ہی نہ کیا ہو۔ اگر آپ یا آپ کی موکلہ یہ سمجھتی ہیں کہ واقعی ہم سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے تو ہمیں بتایا جائے۔ بنا بتائے سزا دینا تو بڑی ناانصافی اور ظلم ہے۔"

"بس۔ بس۔ بس!" چچا نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "زیادہ مظلوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا کہ کون مظلوم ہے اور کون ظالم۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ اور تھوڑی دیر بعد بیگم کو لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔

"ہائے! ہائے! کیا قدر کی ہے اس ناقدرے نے۔ رو رو کر آنکھیں انگیٹھیاں ہوئی ہیں کم نصیب کی۔ پھول سا چہرہ کمھلا کر رہ گیا ہے معصوم کا۔ کیسا ظلم ڈھایا ہے اس ظالم نے کہ ایک دن میں برسوں کی بیمار لگ رہی ہے۔ ہماری بیٹی۔" چچا نے بیگم کو پچکارتے ہوئے اور ہمیں خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہاں! تو بیٹی بتاؤ اس ناعاقبت اندیش نے کیا کیا ہے! بے خوف ہوکر بتاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے موتی موتی ٹپکتے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے روہانسی آواز میں بولنا شروع کیا۔

"آج صبح کی بات ہے۔ میں دوپہر کا کھانا بنانے کی تیاری کررہی تھی۔ چولھا جلانے کے لیے لائٹر جلایا تو وہ چل نہیں رہا تھا۔ ماچس کی تلاش میں پورا کچن چھان مارا، گھر کا کونا کونا دیکھ ڈالا۔ ماچس نہ ملی۔ تھک ہار کر سوچا کہ چلو پڑوس سے مانگ لاتی ہوں۔ پھر خیال آیا کہ ان حضرت کی الماری میں شاید کوئی ماچس یا لائٹر رکھا ہو۔ الماری کے سارے خانے اور درازیں دیکھ ڈالیں۔ وہاں بھی مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ نہ جانے کیوں اور کیسے میرا ہاتھ ہینگر میں لٹکتے ایک کوٹ کی اندرونی جیب میں چلا گیا وہاں ماچس تو نہ ملی البتہ یہ لفافہ

یرے ہاتھ لگا ۔۔۔" جیسے ہی لفافے پر ہماری نظر پڑی بے اختیار ہماری زبان سے نکلا ۔ "یہ لفافہ کیوں نکالا آپ نے ۔۔۔؟ ہماری آواز
ں غصہ یا حیرانی کے بجائے ملال تھا ۔
"دیکھا چچا! چوری پکڑی جانے پر کیسے تلملا رہے ہیں ۔ " ۔ "چوری! کیسی چوری!" ہم نے حیرانی سے پوچھا ۔
"زیادہ انجان بننے کی ضرورت نہیں ۔ زندگی تباہ کر دی آپ نے ۔ پانچ سال بھی نباہ نہ کر سکے اور دوسری کی تلاش شروع کر دی ۔
رے ہم ماں نہ بن سکے ، لیکن آپ کو باپ بننے سے کبھی روکا ہے اور نہ کبھی روکیں گے ۔"
بیگم نے دوبارہ زور زور سے رونا اور ہچکیاں لینا شروع کر دیا ۔ اور ہم ان کے اس بیان پر ہکا بکا ہو کر رہ گئے ۔ ادھر بیاں جاری تھا ۔
"ہم سے پوچھا ہوتا تو ہم منع نہیں کرتے ۔ چپکے چپکے لڑکی پسند کی جا رہی ہے ۔ شادی کی تیاری ہو رہی ہے ۔۔۔"
اس دوران چچا نے لفافہ کھول کر دیکھا ۔ لفافہ میں سے ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کی ایک رنگین تصویر اور ایک پرچہ برآمد ہوا ۔
پرچہ پر لکھا تھا ۔ "لڑکی پسند آنے کی صورت میں اس کے ہاتھ پر کوئی تحفہ یا نقد رقم رکھ دیجیے تاکہ افرادِ خانہ کو اطمینان ہو ۔"
"بھئی یہ کیا معاملہ ہے!" چچا نے ہمیں حیران اور متعجب نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا ۔
سارا معاملہ اب ہماری سمجھ میں آ گیا تھا ۔ ہمارے منہ سے قہقہے پھوٹ پڑے ۔ ہنستے ہنستے محاورتاً نہیں حقیقتاً ہمارے پیٹ میں
ل پڑ گئے ۔ ہماری ہنسی تھی کہ روکے نہ رکتی تھی ۔ چچا اور بیگم دونوں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہمیں گھورے جا رہے تھے ۔
"دیکھیے! دیکھیے!" وہ چچا کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں ۔
"یہاں جان پر بنی ہے اور میاں جی کی خوشی ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی ہے ۔" بیگم نے جلے بھنے لہجے میں کہا ۔
"بے وقوف عورت!" ہم نے پیار بھرے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا ۔ یہ سب کرنے سے پہلے ہم سے پوچھا تو ہوتا کہ یہ تصویر
س کی ہے ۔ اور ہمارے پاس کہاں سے آئی ۔؟ بجائے اس کے تصویر دیکھی اور ایک داستان غم مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی طرز پر
رتب کی ۔ خود ہی لکھا ۔ خود ہی پڑھا اور لگیں غم کے پہاڑ ڈھونے ۔"
"یار! یہ سب کیا ہے ۔۔؟ کیا قصہ ہے بتاتے کیوں نہیں ۔" چچا نے کچھ غصہ اور کچھ تجسس بھرے لہجے میں پوچھا ۔
"یہ تصویر جس کو دیکھ کر ہماری نصف بہتر کی حالت ابتر ہو گئی وہ تصویر ہمارے آفس کی سپر وائزر صاحب کی بیٹی کی ہے کسی
ضرورت سے وہ ایک مرتبہ آفس آئی تھی ۔ ہمیں نہ صرف صورت شکل کی بلکہ عادات و اطوار کی بھی بھلی لگی تو ہم نے اپنی ساری خدائی
یک طرف جسے عرفِ عام میں سالار جنگ بھی کہا جاتا ہے کے لیے بات چلائی ۔ کافی رد و کد کے بعد موصوفہ کے والد اس رشتہ پر رضامند
وئے ۔ یہ کل ہی کی بات ہے کہ انہوں نے یہ لفافہ میرے حوالے کیا تھا ۔ ارادہ تھا کہ آج آفس سے لوٹنے کے بعد بیگم صاحبہ کے ساتھ
ن کے گھر جا کر یہ تصویر ان کے بھیا اور والدین کو دکھا کر رائے معلوم کریں گے ۔
یہ ہے ساری حقیقت اس تصویر کی جس کو دیکھ کر بیگم صاحبہ نے ہماری ہونے والی سالی کو اپنی ہونے والی سوت سمجھ بیٹھیں ۔"
تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کے بعد یوں لگتا تھا جیسے بیگم کے جسم میں کاٹو تو لہو نہ ہو ۔ شرمندگی اور ندامت کے مارے وہ بے
اری کچھ کہہ نہیں پا رہی تھیں ۔ سر جھکائے بہ مشکل تمام اتنا کہہ سکیں کہ ۔
"اگر آپ نے یہ بات کل ہی بتا دی ہوتی تو یہ بدگمانی تو نہ ہوتی ۔"
"اسی لیے تو بزرگوں نے کہا ہے کہ مرد کی جیب میں عورت کو بلا اجازت ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے ۔ اس سے کئی بدگمانیاں جنم لیتی
ں ۔" ہم نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ ☆

تسلیم غوری بدایونی

آہ گلفام

بدایوں کی مردم خیز دھرتی پر جہاں فانی و شکیل نے جنم لے کر خود کو لافانی بنالیا وہیں شہنشاہ طنز و ظرافت دلاور فگار نے بھی اپنے فن کا لوہا منوایا۔ اسی سرزمین پر ۲۲/ جنوری ۱۹۳۷ء کو جناب نثار احمد نور باف کے گھر ایک ایسے بچے نے جنم لیا جو طنز و مزاح کی تاریخ میں گلفام بدایونی کے نام سے ہمیشہ یاد رکھے جائینگے۔ گلفام کا اصل نام اصغر حسین تھا مگر افسوس ۲۷/ اپریل ۱۹۹۹ء کو گلفام بدایونی کا چراغ ہستی زندگی کی ۶۲ بہاریں دیکھنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

غالب اکبرآبادی، ثم دہلوی کو حالی پانی پتی ایسا ہونہار شاگرد نصیب ہوا جس نے غالب کو اردو ادب پر غالب کر دیا وہیں ذوق دہلوی کو محمد حسین آزاد کی شکل میں جبلی فطرت کا ایسا شاگرد ملا جس نے ذوق کو گمنام ہونے سے بچالیا مگر گلفام کے ساتھ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ ان کو دلاور فگار ایسا استاد ملا جس نے گلفام کو گلفام بنا کر ہی چھوڑا۔

گلفام کے آبا و اجداد نور بافی کے پیشے سے وابستہ تھے ان کے گھر میں تعلیم کا بول بالا نہیں تھا اور پھر اس عہد میں تعلیم عام بھی نہ تھی اس لئے گلفام تعلیم سے بہرہ ور نہ ہوسکے مگر قدرت نے ان کو ایسا ذہن عطا کیا تھا جس نے ان کی ترقی میں بہت مدد دی۔ جس عہد میں گلفام نے ہوش سنبھالا اس زمانے میں بدایوں کا چپہ چپہ شعر و شاعری سے شرابور تھا۔ بھلا ایسے ماحول سے اصغر حسین کیسے بچ سکتے تھے اور ہوا بھی یہ ہی انھوں نے اپنے محلے کے بزرگ اور بدایوں کے استاد شاعر ظفریاب حسین جام نوائی کے سامنے زانوئے ادب خم کر ہی دیئے۔ مولانا نے گلفام تخلص تجویز کیا جس نے بہت جلد شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔ اپنی شاگردی کا اظہار گلفام نے ایک قطعہ میں کیا خوب کیا ہے۔

مشرب مرا تفریح ہے خوش کام ہوں میں
آئینۂ فیض سخن جام ہوں میں
پریاں مجھے آنکھوں میں جگہ دیتی ہیں
صورت کہے دیتی ہے کہ گلفام ہوں میں

اس زمانے میں دلاور فگار بھی مولانا جام نوائی کے حلقہ تلامذہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے استاد کے کراچی ہجرت کرنے کے بعد گلفام نے اپنے استاد بھائی دلاور فگار کو اپنا استاد بنایا جس نے ان کو بام عروج بخشا۔ دلاور فگار جب تک بدایوں میں رہے گلفام مشاعروں پر چھائے رہے مگر استاد کے پاکستان ہجرت کرنے کی وجہ سے انھوں نے شاعری کو ہی خیرباد کہہ دیا اور گوشہ نشیں ہوگئے۔

اردو شاعری کی اصناف میں طنز و ظرافت بہت مشکل صنف ہے مگر جتنی یہ مشکل ہے اتنی ہی قلیل العمر بھی۔ غزل کی طرح پائیدار نہیں کیونکہ طنز و ظرافت کا شاعر کسی واقعے سے متاثر ہو کر شاعری کرتا ہے اس لئے یہ واقعاتی شاعری بن کر رہ جاتی ہے اور جیسے جیسے زمانہ، ماحول اور وقت گزرتا جاتا ہے طنز و ظرافت کے تیر بھی ہلکے پڑتے جاتے ہیں کیونکہ جس حادثے یا واقعے سے متاثر ہو کر کوئی بات کہی جاتی ہے وہ ایک عرصے بعد اپنا اثر و رسوخ قائم نہیں رکھ پاتی قاری کو لطف لینے کے لئے اس کی بیک گراونڈ میں جانا پڑے گا جس سے اثر انداز ہو کر کچھ کہا گیا ہو۔

مگر گلفام نے طنز و ظرافت کے میدان میں وہ گل بوٹے کھلائے جن کی خوشبو اور مہک سے آج بھی دل و دماغ معطر ہیں اس زمانہ میں کشمیر کے مسئلہ پر گلفام کا ایک قطعہ دیکھئے جو آج بھی اتنی ہی تازگی رکھتا ہے جتنی آج سے ۳۰ سال ۳۵ سال قبل تھی کہتے ہیں

جب دل کے مسئلے کا کیا کوئی حل تلاش
کچھ اتفاق باعث تاخیر ہو گیا
اب تک یہ فیصلہ ہی نہیں کس کا ہے یہ دل
گویا کہ دل بھی وادیٔ کشمیر ہو گیا

گلفام کا رنگ و روپ سیاہ فام تھا اس کی مناسبت نے اصغر حسین کا تخلص گلفام تجویز کیا گیا تھا۔ اسی نسبت سے انھوں نے جو شعر کہے تھے وہ بھی دیکھیئے۔

کچھ ان کی زلف و کاکل و ابرو میں پیل دی
کچھ شام ہجر میں شب غم میں ڈھکیل دی
بعد اس کے کچھ بچی جو سیاہی دوات میں
سب منشی ازل نے مجھی پر انڈیل دی
آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے
رنگ سے رنگ ملایا تو برا مان گئے
کہہ رہے ہیں کہ مرے کون ہو تم گلفام
میں نے داماد بتایا تو برا مان گئے

مزاح کا پہلو لئے ہوئے گلفام کا قطعہ ملاحظہ کیجیئے۔

چھپا تری کمر بھی لچکتی ضرور ہے
تو ناچتی نہیں ہے مٹکتی ضرور ہے
نو مشق ہو صنم تو جھجکتا ہے فطرتاً
بدھیا ہو گر نئی تو بدکتی ضرور ہے

گلفام کے کلام میں ہندی اور انگریزی الفاظ کا استعمال بھی بہت خوبی سے کیا گیا نظر آتا ہے۔ کسی لفظ سے غیریت کا اندازہ بالکل نہیں ہوتا۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ پر موتی کی طرح جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انسان کو بنلیجئے انسان ونس مور
ڈر ہے کہ بن نہ جائے یہ حیوان ونس مور
کل پھر وہ بزم خواب میں تشریف لائے تھے
ہم کو ہوئی تھی زیارت شیطان ونس مور
مجھ کو اگر خدا نے دوبارہ جنم دیا
دے دونگا تم پہ جان میری جان ونس مور
گلفام کے کلام سے واقف نہیں ہیں لوگ
پیدا ہوا ہے ورلڈ میں لقمان ونس مور

گلفام نے طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی غزلیں بھی کہی ہیں اور خوب کہی ہیں جس میں نہ تو عریانیت ہے اور نہ سوقیانہ جذبات کی ترجمانی ۔ ایک ایک مصرعہ طنز و ظرافت کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ہے جن کو پڑھنے سے دماغ کی چولیں ہل جاتی ہیں ایک غزل ملاحظہ کیجیئے ۔

کبھی بوتل کبھی ادھا کبھی پوا بھی پیتے ہیں
اگر پھوکٹ کی مل جائے تو فل مٹکا بھی پیتے ہیں
ہماری کیا ہے ہم بڑھیا بھی اور گھٹیا بھی پیتے ہیں
ڈرائی جن بھی پی لیتے ہیں اور ٹھرا بھی پیتے ہیں
مجھی کو لے گئے تھانے پکڑ کر کل پولس والے
میں کہتا رہ گیا بھیا مرے باوا بھی پیتے ہیں
سنا ہے شیخ جی کو پھر سے سوجھی ہے جوانی کی
اسی باعث تو وہ ہمدرد کا نسخہ بھی پیتے ہیں
برا کہتے تھے مئے کو وہ غلامی کا زمانہ تھا
یہ آزادی کے دن ہیں آج کل نیتا بھی پیتے ہیں
شراب معرفت ہو آب زمزم ہو کہ لیمن ہو
کوئی شئے رات کو ٹھہر میں مولینا بھی پیتے ہیں
خدا کے فضل سے گلفام رند خاندانی ہے
میرے بھیا ، میرے چچا ، میرے توا بھی پیتے ہیں

گلفام نے متعدد بیرونی مشاعروں میں بھی بدایوں کی نمائندگی کی اور خوب داد حاصل کی ایک مشاعرہ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان فلمی کمپنی کے جانے مانے مزاحیہ ہیرو جناب جانی واکر اپنے دولت کدے واقع بمبئی میں منعقد کیا تھا جس میں ہندوستان کے مشہور و معروف طنز و مزاح کے شعراء نے شرکت کی تھی ۔ گلفام ، جناب شکیل بدایونی کی معرفت اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے جس میں ان کو خوب نوازا گیا ۔ بعد مشاعرہ جانی واکر نے اکیلے میں گلفام کو خوب سنا اور

نوازا۔ اس مشاعرے میں گلفام نے دو غزلیں بطور خاص پڑھی تھیں۔ ایک طویل بحر کی غزل تھی جسے گلفام اپنے منفرد انداز میں خوب پڑھتے تھے۔ دوسری غزل جو گلفام نے خاص طور پر مذکورہ بالا مشاعرے میں پڑھی تھی نذر قارئین کرتا ہوں۔ اس غزل کو پڑھیئے، سر دھنیے داد دیجیئے اور گلفام مرحوم کی مغفرت کے لیے دعائیں کرتے ہوئے مجھ کو اجازت دیجیئے۔

نگاہ کرم سے یوں ہوگیا ہے دل خراب آدھا
کہ جیسے سیخ پر چڑھتے ہی جل جائے کباب آدھا
سنا ہے نصف بہتر بھی کہا جاتا ہے بیگم کو
تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شوہر ہے خراب آدھا
محبت کی پریکٹس میں بھی سپلیمنٹری آئی
ہوا یوں امتحان عشق میں میں کامیاب آدھا
جناب جانی واکر سے مجھے یوں بھی عقیدت ہے
مرے معشوق سے ملتا ہے حضرت کا خطاب آدھا
بہ ایں امید ہم ایام حج میں بمبئی آئے
کہ مل جائے قیامت میں ہمیں حج کا ثواب آدھا
مجھے دنیا میں صرف آدھی وفاؤں کا صلہ دے کر
وہ کہتے ہیں چکا دونگا قیامت میں حساب آدھا
وطن تقسیم کرڈالا اس آزادی کو کیا کہیئے
ادھر بھی انقلاب آدھا ادھر بھی انقلاب آدھا
دلیپ و راج ، اور نوشاد ، جانی واکر و مینا
بغیر ان کے ہوا کرتا ہے پکچر کامیاب آدھا
میرا سر گیٹ کے اندر تھا ٹانگیں گیٹ کے باہر
ہوا یوں بارگاہ ناز میں میں کامیاب آدھا
مجھے یہ وہم ہے شاید مرا معشوق کانا ہے
کہ وہ جب بھی الٹتا ہے نقاب آدھا
رخ گلفام کی کالک ابھی کچھ اور نکھرے گی
ابھی اس پیکر رعنا پہ آیا ہے شباب آدھا

چائے

احمد اللہ قادری
(حال مقیم امریکہ)

چائے ہے یہ یا کہ سرخیِ لب و رخسار ہے
دودھ ہے یہ یا تجلی جمالِ یار ہے
قند ہے یا لذت شیرینیِ گفتار ہے
اور حرارت کا سبب کیا گرمیِ گفتار ہے
اس مرکب کو شرابِ مغیلاں کہتا ہوں میں
کیا غلط کہتا ہوں گر جانِ جہاں کہتا ہوں میں

بھوک کے عالم میں ہے سرمایہ آبِ حیات
پیاس کی شدت میں لذت بخش صد جامِ نبات
رنج میں ہر گھونٹ اس کا وجہِ تسکین و نجات
اور خوشی میں ہے سرور و کیف کی اک کائنات
یہ وہ نعمت ہے کہ جس کا ربط ہر عالم سے ہے
اعتبار کوثر و تسنیم اس کے دم سے ہے

آگئے دنیا میں آدم چھوڑ کر باغِ جناں
سادگی پر ان کی اب تک ہے زمانہ بدگماں
سب نے گندم کو اچھالا بہرِ زیبِ داستاں
فی الحقیقت چائے کا پودا تھا جنت میں کہاں
آنے والی نسل کی عادت سے واقف کار تھے
چھوڑ دی جنت کو دور اندیش تھے ہشیار تھے

راہ سے جس طرح رہرو کو ہے منزل کا یقین
یا نظر کو چاندنی سے بدرِ کامل کا یقین
اس طرح بڑھتا رہا ہے چائے سے دل کا یقین
چائے سی نعمت جو اس دنیا میں دے ڈالی ہمیں
اس جہاں میں در سے کیا پلٹائے گا خالی ہمیں

جنت الفردوس میں مانا کہ آرائش بھی ہے
دودھ کی نہریں بھی ہیں محلوں میں زیبائش بھی ہے
یوں تو حاصل قادری کو ساری آسائش بھی ہے
حضرت رضوان سے لیکن ایک فرمائش بھی ہے
خواہ میٹھی دیجئے یا کڑوی دیجئے
ہر گھڑی فدوی کو اک چائے کی پیالی دیجئے

دیے گئے خط (مراسلے)

ڈاکٹر کمال مصطفیٰ صاحب

سلام مسنون!

آپ کی کرم نوازی سے مجھے شگوفہ کا پرچہ کبھی کبھی مل جاتا ہے۔ جو پرچے نہیں ملتے، وہ ضرور ڈاک کی نذر ہوجاتے ہونگے۔ گزشتہ دنوں آپ کے ایک رفیق لاہور تشریف لائے اور ان سے تادیر آپ کا تذکرہ رہا۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

پاکستان میں طنز و مزاح پر برا وقت آگیا ہے۔ ضمیر جعفری اور کرنل محمد خاں کے بعد اب شفیق الرحمان بھی رحلت فرماگئے۔ ان پر تعزیتی مضمون ارسال خدمت کررہا ہوں۔ شگوفہ کے قارئین تک پہنچادیجئے۔

مخلص

انور سدید، لاہور

●☆●

مکرمی!

سلام مسنون

شگوفہ پابندی سے مل رہا ہے۔ شفیق الرحمان صاحب کے انتقال کی خبر سے دھچکا لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دلاور فگار، ضمیر جعفری، کرنل محمد خاں اور اب شفیق الرحمان اللہ کو پیارے ہوئے۔ خدا ہمارے مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم کو سلامت رکھے کہ اب انہیں حضرات کے دم سے نثری ظرافت کا بھرم قائم ہے۔

میری آپ سے ملاقات نہیں رہی تو یہ ہے کہ حیدرآباد کے کسی ظرافت نگار سے میں نہیں ملا۔ گوشہ نشین جو ٹھہرا۔ لیکن شگوفہ کے ذریعے آپ سب سے کافی قربت محسوس ہوتی ہے۔

نیاز مند

ظفر کمال، سیوان

●☆●

ڈاکٹر محترم مصطفیٰ کمال

اسلام علیکم

شگوفہ نوازی کا شکریہ۔ کرنل محمد خاں کے نام۔ یہ خصوصی شمارہ اپنے دامن میں بہت کچھ لئے ہوئے ہے۔ ایسے شمارے طنز و مزاحیہ ادب کے اہم دستاویزات ہیں۔

زندہ دلان کو میرا سلام آپ کا اپنا

فضل جاوید، راجمندرا پورم، حیدرآباد

افرح کمال اور نعمان عاطف کی شادی

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ کی دختر افرح کمال کی شادی محمد نعمان عاطف (بی ای، ایم سی ایس ای) فرزند جناب خواجہ عبداللطیف انجینئر کے ساتھ جمعرات ۱۵ جون مطابق ۱۲ ربیع الاول کو بنجارہ فنکشن ہال، بنجارہ ہلز پر انجام پائی۔ محفل عقد میں جناب سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر علی گڑھ و جامعہ عثمانیہ، پروفیسر شمیم جیراجپوری وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ڈاکٹر افضل محمد وائس چانسلر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، جناب نریندر لوتھر سابق چیف سکریٹری، پروفیسر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب ممتاز احمد خاں ایم ایل اے، جناب سید ولی قادری آرکیٹکٹ، پروفیسر سلیمان صدیقی رجسٹرار اردو یونیورسٹی، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر انور معظم، محترمہ رفیعہ منظور الامین کے علاوہ جامعات کے اساتذہ، ادیب، شاعر، صحافی اور معزز رشتہ داروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ جناب سید عبدالقادر، ڈاکٹر ابراہیم احمد، جناب الیاس محی الدینؒ اور جناب اشفاق الرحمن کے علاوہ نوشہ کے والد جناب خواجہ عبداللطیف نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ☆

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ

اشاعت کا ۳۲ واں سال

شگوفہ

جلد ۳۳
شمارہ ۸

حیدرآباد

اگست ۲۰۰۰ء

کمپیوٹر کتابت :
SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373

ویب ڈیزائن :
غوث ارسلان

طباعت :
دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۴ روپے　زر سالانہ : ۱۵۰ روپے　بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064

شگوفہ انٹرنٹ پر : http://www.shugoofa.cjb.net

ای میل : shugoofa @ india.com

Admission-2000/01

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

(پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ء میں قائم مرکزی یونیورسٹی)

نظامت فاصلاتی تعلیم

اعلان داخلہ
2000-2001

اردو ذریعۂ تعلیم اور فاصلاتی طریقے سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں:

1 بی اے / بی کام / بی ایس سی سال اول میں داخلہ بذریعہ اہلیتی امتحان۔ رسمی تعلیمی قابلیت نہ رکھنے والے امیدواروں کو بی اے / بی کام / بی ایس سی میں داخلے کے لئے اہلیتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ یہ امتحان ملک کے منتخب مقامات پر 22 اکتوبر 2000 بروز اتوار منعقد ہوگا۔ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2001 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ اہلیتی امتحان کے لیے خانہ پری کی ہوئی درخواست مع رجسٹریشن فیس 100 روپے وصول ہونے کی آخری تاریخ 8 ستمبر 2000 ہے۔ تاخیر فیس 50 روپے (جملہ 150 روپے) کے ساتھ یہ فارم 19 ستمبر 2000 تک جمع کیے جاسکتے ہیں۔

2 بی اے / بی کام / بی ایس سی میں راست داخلہ

3 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے کمپیوٹنگ

کورس نمبر 2 اور 3 کے لیے ایسے امیدوار درخواست دینے کے اہل ہیں جنھوں نے کسی مسلمہ بورڈ / ادارے / یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ یا 10+2 یا اس کے مساوی امتحان میں کسی بھی ذریعۂ تعلیم سے کامیابی حاصل کی ہو۔ انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیے گئے کورسوں کی فہرست پراسپکٹس میں شائع کی گئی ہے۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 دسمبر 2000 ہے۔

نوٹ:۔ بی ایس سی پروگرام صرف حیدرآباد، نظام آباد، بنگلور، گلبرگہ، اور ممبئی میں اور کمپیوٹنگ پروگرام صرف حیدرآباد، کرنول، بنگلور، بھیونڈی اور ممبئی میں دستیاب ہے۔

4 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اردو بذریعہ انگریزی　　5 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اردو بذریعہ ہندی

6 چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے غذا اور تغذیہ

کورس نمبر 4، 5 اور 6 میں داخلہ کے لئے کسی رسمی تعلیمی قابلیت یا اہلیتی امتحان میں کامیابی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2001 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 دسمبر 2000 ہے۔

یونیورسٹی اور اس کے پروگراموں سے متعلق تفصیلی معلومات پراسپکٹس میں فراہم کی گئی ہیں۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر یا بذریعہ ڈاک نیچے دیئے گئے پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حسب ذیل علاقائی مراکز اور اسٹڈی سنٹروں پر پراسپکٹس مع داخلہ فارم نقد رقم ادا کرنے پر دستیاب ہے۔

ریجنل سنٹر

1۔ **دھلی ریجنل سنٹر** D-277، نئی مارکیٹ اپارٹمنٹس، اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی 110 025

2۔ **پٹنہ ریجنل سنٹر** فلیٹ نفیس حیدر، علی نگر، انیس آباد، پٹنہ 800 002 (بہار)

3۔ **منگلور ریجنل سنٹر** الامین آرٹس سائنس اینڈ کامرس کالج، ہوسور روڈ، قریب لال باغ گیٹ، بنگلور۔ 560 027 (کرناٹک)

اسٹڈی سنٹر

☆ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول، سیکنڈ لانسر، گولکنڈہ، حیدرآباد 500 008 (آندھرا پردیش) ☆ پی جی کالج، سردار پٹیل روڈ، سکندرآباد 500 003 (آندھرا پردیش) ☆ پریس شکار کالج، پرانی حویلی، حیدرآباد 500 002 (آندھرا پردیش) ☆ ممتاز کالج، ملک پیٹ، حیدرآباد 500036 (آندھرا پردیش) ☆ آرٹس اینڈ سائنس کالج، سبیداری، ہنمکنڈہ، ورنگل 506010 (آندھرا پردیش) ☆ گولڈن جوبلی ہائی اسکول، قلعہ روڈ، نظام آباد 503 001 (آندھرا پردیش) ☆ اسدیہ کالج آف ایجوکیشن، سائم نگر، محبوب نگر 509 001 (آندھرا پردیش) ☆ [illegible] کالج، کرنول 518 001 (آندھرا پردیش) ☆ شاہ ڈگری کالج، راجشورم، پرودتور 516 360 (آندھرا پردیش) ☆ آندھرا اسلم کالج، پور روڈ، نیلور 522 003 (آندھرا پردیش) ☆ شاہین اردو ہائی اسکول، شاہین ایجوکیشنل سنٹر، گاواں چوک، بیدر 581 401 (کرناٹک) ☆ [illegible] کالج [illegible] 535 104 (کرناٹک) ☆ انجمن [illegible] 580 020 (کرناٹک) ☆ انجمن اسلام کالج، 92 ڈاکٹر ڈی این روڈ [illegible] 400 001 (مہاراشٹر) ☆ [illegible] 431 604 (مہاراشٹر) ☆ مولانا آزاد کالج [illegible] پوسٹ بکس 27، اورنگ آباد 431 001 (مہاراشٹر) ☆ شفیق میموریل اسکول [illegible] دہلی 110 006 ☆ [illegible] 21 [illegible] کلکتہ 700 016 (مغربی بنگال) ☆ شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ [illegible] اعظم گڑھ 276 001 (اتر پردیش) ☆ [illegible] 431401 (مہاراشٹر) ☆ [illegible] 413 517 (مہاراشٹر) ☆ اسلامیہ کالج، وانم باڑی [illegible] 635752 (تمل ناڈو) ☆ [illegible] جودھپور 342009 (راجستھان) ☆ [illegible] رامپور 244 901 (اتر پردیش) ☆ [illegible] 224 188 (اتر پردیش) ☆ [illegible] 508 001 (آندھرا پردیش) ☆ اردو تعلیمی [illegible] اسکول [illegible] 495001 (مدھیہ پردیش) ☆ [illegible] 577202 (کرناٹک) ☆ [illegible] 421 302 (مہاراشٹر)

بی اے / بی کام / بی ایس سی کورسوں کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت شخصی طور پر حاصل کرنے کی صورت میں 35 روپے اور بذریعہ ڈاک 40 روپے ہے۔ کسی بھی سرٹیفکیٹ کورس کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت نقد 10 روپے اور بذریعہ ڈاک 15 روپے ہے۔ (بذریعہ ڈاک پراسپکٹس منگوانے کے لئے مطلوبہ رقم کا بینک ڈرافٹ **مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی** کے نام اور حیدرآباد میں قابل ادا ہونا چاہئے۔ ڈاک سے داخلہ فارم منگوانے کے لیے ڈرافٹ صرف نیچے دیے گئے پتے پر ہی ارسال کریں۔)

ڈائرکٹر، ڈسٹنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، بسکٹ کاؤنٹی، کوٹھی، حیدرآباد 500 008 (آندھرا پردیش)

پروفیسر محمد سلیمان صدیقی، رجسٹرار

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مجتبیٰ حسین شکاگو میں

مال مفت (انشائیے)

یاد ماضی

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

حق تو یہ ہے (ترجمہ)

چورن (منظومات)

خاکہ نگار کا خاکہ

پرویز ید اللہ مہدی
(حال مقیم شکاگو)

برادرم مجتبیٰ حسین کی شکاگو آمد کی خوشی میں

عموماً دو طرح کے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، فنکاروں، نیتاؤں اور ابھینیتاؤں کے جشن منائے جاتے ہیں، ایک وہ جو جشن کا سارا صرفہ خرچہ خود اٹھاتے ہیں بلکہ منتظمین جشن کو مالی فائدہ بھی پہنچاتے ہیں۔ دوسرے ایسی شخصیات کی خدمات کا اعتراف جشن کے بہانے کیا جاتا ہے، جو یا تو مزید کسی "خدمت" کے قابل نہیں رہتے یا پھر جن کی ادبی سیاسی اور سماجی خدمات سے سماج یا معاشرے کو فیض پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچنے کا خدشہ رہتا ہے۔ چنانچہ کھلے عام جشن مناکر ایسے حضرات سے درپردہ یہ گزارش کی جاتی ہے کہ معاشرے کو جناب والا کی خدمات کی قطعی ضرورت نہیں بلکہ اگر آپ سوسائٹی کی واقعی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں تو خدا را اپنی خدمات کو لگام دیجئے کیوں کہ آپ کا خدمت نہ کرنا ہی معاشرے کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ لہذا بس ہو چکی نماز مصلا اٹھائیے بلکہ مصلے کے ساتھ خود بھی اٹھ جائیے۔

اس سے پہلے کہ پیراگراف معترضہ کی روشنی میں ہمارے ممدوح مجتبیٰ حسین کی شخصیت آپ کی نظروں میں مشتبہ ہوجائے۔ وضاحت کرتا چلوں کہ مجتبیٰ حسین کا شمار مذکورہ شخصیات میں ہرگز نہیں ہوتا کیوں کہ یہ جشن کا صرفہ خرچہ اٹھانے کی جگہ خود منتظمین سے صرفہ خرچہ بلکہ حرجہ تک وصول کرتے ہیں۔ دوسرے ان کی ادبی خدمات و فتوحات کا سلسلہ ابھی تھما نہیں ہنوز جاری ہے اور اس کا ثبوت ہے ان کی سولہ عدد کتابیں جو منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس کے علاوہ مزید سولہ عدد کتابیں ایسی ہیں جو منظر عام پر آنے کی منتظر ہیں۔ اس کے ساتھ یہاں اس بات کی بھی وضاحت کردوں کہ تازہ تازہ جشن ان کا کوئی پہلا پہلا جشن نہیں ہے۔ آج کی تاریخ تک صاحب موصوف کے اعزاز میں اتنے جشن منائے جاچکے ہیں کہ یہ اور ان کا قلم دونوں ہی "جشن پروف" ہوچکے ہیں۔ نتیجتاً مجتبیٰ حسین جشن منوانے کے اس قدر عادی ہوچکے ہیں کہ خدا نخواستہ اگر کچھ عرصہ بغیر جشن کے ہنگامے کے ساتھ گزر جائے تو یہ بے چین و بے قرار ہو کر جشن منانے والے افراد و انجمنوں کی تلاش میں خود ہی نکل پڑتے ہیں کہ ہے کوئی اس جشن کے مارے کا جشن منانے والا، جو منائے اس کا بھی بھلا جو نہ منائے اس کا بھی بھلا۔

عام خیال یہ ہے کہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد نوکری پیشہ آدمی ہر طرح سے ریٹائر ہوجاتا ہے۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے اپنی تحریروں اور ادبی تحریکوں کے ذریعہ اس خیال کی کلیتاً نفی کر کے دنیا کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا کہ شیر، بندر اور مزاح نگار کبھی بوڑھا یا ریٹائر نہیں ہوتا، مثال کے طور پر ان کی کالم نگاری ہی کو لیجئے، جب تک یہ برسر کار تھے، مہینے دو مہینے کے وقفے سے روزنامہ سیاست کے لئے کالم لکھا کرتے تھے جب کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ہر ہفتہ پابندی کے ساتھ کالم قلم بند کرنے لگے ہیں جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ تقریباً اڑتیس برس پہلے جو قلم انہوں نے اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر مرحوم جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست کے حکم پر بطور فرمانبرداری اور سعادت مندی کے اٹھایا تھا آج تک اسی طرح سعادت مندی و فرمانبرداری کے ساتھ طنز و مزاح کے سنگلاخ مورچے پر ڈٹا ہوا ہے۔

تاہم پچھلے اڑتیس برسوں میں اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب نے زیادہ ترقی کی یا مجتبیٰ حسین نے اس بات کا فیصلہ صرف نقاد

حضرات ہی کر سکتے ہیں۔البتہ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں پورے وثوق کے ساتھ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان اڑتیس برسوں میں مجتبیٰ حسین اور طنز و مزاح ایک دوسرے کے لئے اس قدر لازم و ملزوم ہوگئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ویسی ہی حماقت آمیز کوشش ہوگی جیسی کہ صدر کلنٹن کے نام کے ساتھ لگے مونیکا لیونسکی کے اسکینڈل کو الگ کرنا۔

یوں تو برصغیر کے ہر گوشے کے اردو داں عوام مجتبیٰ کے مضامین سننے کے لئے گوش بر آواز رہتے ہیں لیکن حیدرآباد حیدرآباد سے آباد حیدرآبادیوں کی مجتبیٰ سے محبت یقیناً سب سے جداگانہ ہے کیوں کہ بیشتر حیدرآبادی خاندانوں میں فیملی ڈاکٹر، فیملی دھوبی، فیملی باربر کی طرح مجتبیٰ حسین کو فیملی مزاح نگار کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ جس ادبی اجلاس، جس ادبی محفل میں مجتبیٰ ہوتے ہیں ان کے مداح انہیں سننے کے لئے مع اہل و عیال تشریف لاتے ہیں۔اگر آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ میں نے اپنی چشم گنہ گار سے بعض ادب نواز حیدرآبادیوں کو اس قدر شوق اور اہتمام کے ساتھ مع فیملی یا تو چوتھی ولیمہ کی دعوتوں میں جاتے دیکھا ہے یا پھر مجتبیٰ حسین کو سننے کے لئے ادبی محفلوں میں آتے دیکھا ہے۔ ظرافت کو چوتھی ولیمے کی پر تکلف ضیافت کا نعم البدل بنا دینا بہ خدا ظرافت نہیں کرامت ہے اور اس کرامت کا کریڈٹ بلا شرکت غیرے مجتبیٰ کی ظرافت کو جاتا ہے دراصل پچھلے اڑتیس برسوں میں مجتبیٰ نے اردو والوں میں اس قدر قہقہے بانٹے ہیں کہ اب ان کی ظرافت قہقہوں کی ضمانت بن گئی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے پر مزاح مضامین پڑھنے میں تو خیر مزا آتا ہی ہے خود ان کی زبانی سن کر مزا دو آتشہ ہوجاتا ہے۔اپنے پر لطف خاکوں اور مضامین سے یہ ایک سماں باندھ دیتے ہیں محفلوں کو گرما دیتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ ان کے ایک حیدرآبادی مداح نے علی الاعلان یہ فرمایا کہ مجتبیٰ حسین ایک ایسا مزاح نگار ہے جو جہاں جاتا ہے انگار لگا دیتا ہے۔اسے بھی ایک اتفاق کہیے کہ حالیہ دورہ امریکہ کے سلسلے میں جیسے ہی یہ شکاگو پہنچے اس کے لگے ہی روز دیوان کے مرکزی بازار کی ایک بلڈنگ میں آگ لگ گئی جس سے ان کے مداحوں کو یہ علم ہوگیا کہ مجتبیٰ حسین شکاگو پہنچ چکے ہیں۔اتفاق سے اس روز وہ دیوان تشریف لانے والے تھے لیکن نہیں آئے۔ ان کا فون آگیا پہلے تو اپنے نہ آنے کی معذرت چاہی پھر اس کی وجہ اس آگ کو قرار دیا جو دیوان کی بلڈنگ میں لگی تھی۔میں نے پوچھا .... آگ سے تمہارا کیا تعلق؟ کیا وہ بلڈنگ تمہارے کسی دوست یا رشتہ دار کی ہے؟۔بولے ... یار تم دیوان میں رہتے ہو اور تمہیں یہ پتہ نہیں کہ وہ بلڈنگ کس کی ہے۔؟ میں نے حیرت سے پوچھا... کس کی ہے؟۔بولے، وہ بلڈنگ روزنامہ منصف کے مالک و خان لطیف خان کی ہے۔" ذرا سوچو پہلے ہی منصف اور سیاست میں رقابت ہے ایسے میں میں اگر دیوان آجاتا تو یار لوگ خواہ مخواہ نہیں اڑا دیتے کہ روزنامہ منصف کے مالک کی بلڈنگ میں جو آگ لگی ہے اس میں روزنامہ سیاست کا ہاتھ ہے"۔

اب جب کہ روزنامہ سیاست کا ذکر چل نکلا ہے تو یہ بتاتا چلوں کہ مجتبیٰ کی بے پناہ مقبولیت اور شہرت میں ان کی منفرد ظرافت کے علاوہ روزنامہ سیاست کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔اسی اخبار نے انہیں بحیثیت کالم نگار پہلا "بریک" دیا جس کا مجتبیٰ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیدرآباد کے ادبی ماحول میں اخبار سیاست کی طرح ہاتھوں ہاتھ لئے جانے لگے، بلکہ بعض معتبر راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں خود مجتبیٰ حسین کا سرکیولیشن "روزنامہ سیاست" کے سرکیولیشن سے آگے بڑھ گیا۔یعنی اطراف بلدہ راجدھانی دلی تک پہنچ گیا بلکہ سرکیولیشن کے پیچھے خود مجتبیٰ شخصی طور پر دلی پہنچ گئے۔ابتداء میں مجتبیٰ حسین کی دلی منتقلی پر یار لوگوں نے کافی نکتہ چینیاں کیں کیوں کہ اس سلسلے میں عام خیال یہ تھا کہ محض عہدے میں ترقی اور تنخواہ میں تھوڑے سے اضافے کے لئے ہی مجتبیٰ نے برسوں کے یارانے کی پرواہ کئے بغیر دکن اور یاران دکن کو خیر باد کہا ہے۔ لیکن جلد ہی ان کے بہی خواہوں کی زبانی اصل عقدہ کھل گیا کہ مجتبیٰ اس لئے دلی منتقل ہوئے ہیں کہ وہ ذرا پھیلنا چاہتے تھے۔ مجتبیٰ کے دلی شفٹ ہونے کی وجہ اگر واقعی

ہے تو پھر وہ بیداد کے نہیں داد کے مستحق ہیں کیوں کہ پھیلنے کے لئے دلی سے بہتر کوئی جگہ نہیں ۔ آدمی دلی میں بیٹھ کر سارے " بھارت ورش " میں متعدی وباء کی طرح پھیل سکتا ہے ۔ مجتبیٰ چونکہ " پھیلنے " کے آرٹ سے کماحقہ واقف ہیں اس لئے چند ہی برسوں میں انہیں اپنے پھیلاؤ کے آگے دلی بھی سکڑتی ہوئی نظر آنے لگی ۔ بلکہ ملکی حدود بھی تنگ نظر آنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غیر ملکوں کو اپنے پھیلاؤ میں سمیٹنے لگے ۔ چنانچہ جاپان ، یورپ ، امریکہ ، مشرق وسطیٰ اور سابق سوویت یونین کے مختلف اوقات میں جو دورے مجتبیٰ حسین نے کئے وہ ان کے بین الاقوامی " پھیلاؤ " کا کھلا ثبوت ہیں ۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ مجتبیٰ حسین کے دورہ سوویت یونین کے بعد ہی وہاں وہ تاریخی انقلاب آیا جس کے نتیجے میں بیشتر مسلم مملکتوں کو روس کے بے جا تسلط سے نجات ملی ۔ صدیوں کی غلامی اور جبر کے بعد وہاں آزادی کا سورج طلوع ہوا ۔ اور یوں نہ سوویت دیس رہا نہ اس کی یونین بلکہ حدود مملکتِ شاہ عالم از دلی تا پالم کے مصداق روس صرف ماسکو تک محدود ہو گیا ۔ سچ ہے قدرت کو اگر منظور ہو تو ایک ادیب کا قلم ہی نہیں اس کے قدم بھی انقلاب برپا کر سکتے ہیں ۔

سوویت یونین کے صفحۂ ہستی سے مٹتے ہی برصغیر کے ان تمام ترقی پسندوں کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی جو سوویت یونین کو اپنا قبلہ اول و آخر ماننے کی وجہ سے سماج میں لادین تصور کئے جاتے تھے ۔ اتفاق سے مجتبیٰ حسین اسی دور کی پیداوار ہیں جب ادب پر ترقی پسند چھائے ہوئے تھے ۔ اس لئے ترقی پسندی کی طرف ان کا جھکاؤ فطری امر ہے تاہم یہ چونکہ ترقی پسندی کے صرف نظریاتی حد تک قائل ہیں اس لئے ایک طرف اگر یہ وارفتگی اور شوق کے ساتھ سابق سوویت یونین کے دورے پر گئے تو دوسری طرف انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ سعودی عرب کا دورہ بھی کیا اور یوں یہ ثابت کیا کہ وہ کٹر ترقی پسندوں کی طرح لادین نہیں بلکہ بن لادین ہیں چنانچہ حکومت ہند کی طرف سے حج پر بھیجے گئے ۔ سرکاری وفد میں شریک ہونے کے باوجود یہ وہاں سے حج کی سعادت سے مشرف ہو کر لوٹے " ۔ ☆☆

مرزا کھونچ
(نیا ٹولہ، بیتیا، بہار)

اپنے گھر میں بوریت کا مستقل سامان ہے
کل تلک ڈیڈی تھا جو وہ آج ابا جان ہے

فرقہ وارانہ فسادوں کے ہی بل پر دیش میں
بڑھتی آبادی کو کم کرنا بہت آسان ہے

جو وفا کی راہ پہ چلتا ہے بے خوف و خطر
آج کل وہ آدمی کم عقل ہے ناداں ہے

نوکروں پر کیا بھروسہ کیجئے اس دور میں
ٹھیک ہے الیشن ہی حسن کا دربان ہے

یہ سیاسی زلزلوں کے خوب جھٹکے سہہ چکا
لگ رہا ہے دل ہمارا میڈان جاپان ہے

آج پھر آئی ہیں میرے گھر میں ان کی امی جان
آج گھر میں پھر بغاوت کا بہت امکان ہے

ہوگئے رخصت یہاں سے چائے پانی کے بغیر
یہ تو مرزا کھونچ کا یارو بڑا احسان ہے

●☆●

ڈاکٹر محبوب راہی

میر و غالب کے ہمسر

ہمارے ایک شاعر ہیں جو لفظوں سے الجھتے ہیں
غزل میں دسترس ہے نظم میں انکو مہارت ہے
فعولن فعل کے چکر میں رہتے ہیں پڑے اکثر
مگر سچ پوچھئے تو کچھ نہیں ادراک فن ان کو
نہ ان کو کچھ مذاق قوت تخلیق حاصل ہے
نہیں ادراک کچھ جن کو محاسن یا معائب کا
وزن یا بحر کی جو پوچھئے کورے ہیں وہ یکسر
ہنر گر یہ ہے کیا تعقید لفظی کس کو کہتے ہیں
جہاں تشبیہ کسے استعارہ اس کو کہتے ہیں
بنالیتے ہیں اکثر شعر جو لفظوں کی اشکل سے
مگر اک خوبی جس کے بل پہ یہ کھاتے کماتے ہیں
سریلا ہے گلا ان کا اداکاری میں ماہر ہیں
جہاں بھی دیکھتے ہیں مرغ و ماہی ٹوٹ پڑتے ہیں
گلے کے بل پہ سارے ملک میں شہرت کمائی ہے
کباڑا کردیا لیکن تمدن کا ثقافت کا

جو خود کو میر اور غالب کا ہم پلہ سمجھتے
پجاری شعر کے ہیں شاعری جن کی عبادت
برائے شعر اپنے گھر میں رہتے ہیں پڑے ا
دکھاوے کا ہے سب جو کچھ بھی ہے ذوق سخن ا
نہ کچھ سننے سمجھنے کی انہیں توفیق حاصل
مگر ہمسر سمجھتے ہیں وہ خود کو میر و غالب
دماغی طور پر بھوسے کے اک بورے ہیں وہ
وہ کیا جانیں کہ نکتہ آفرینی کس کو کہتے
اگر شعلہ کہیں تو وہ شرارہ اس کو کہتے
ملادیتے ہیں اکثر قافیہ قاتل کا مقتل
غزل ہو، گیت ہو، سرتال میں گاکر سناتے
نمائش میں خوشامد میں ریاکاری میں ماہر
کہ جیسے اپنے دشمن پر سپاہی ٹوٹ پڑتے
سمندر پار ہو آئے بہت دولت کمائی۔
ادب اور شعر کی دیرینہ تہذیبی روایت

●☆●

مجتبیٰ حسین

ذکر شکاگو شریف کا

صاحبو! شکاگو سے ہندوستان آئے ہوئے ہمیں دس دن بیت چکے ہیں۔ تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے یہاں آتے ہی ہم بیمار پڑگئے بلکہ اب تک پڑے ہوئے ہیں مگر اس عرصہ میں شکاگو اور شکاگو کے احباب بے پناہ اور ہر دم یاد آتے رہے۔ امریکہ کے سارے شہروں کے مقابلہ میں سماجی اور ثقافتی اعتبار سے شکاگو ہمیں بہت پسند ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں اردو بولنے والوں کی جتنی بہتات ہے اس سے کہیں زیادہ بہتات حیدرآبادیوں کی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ میں قیام کے دوران میں ہمیں یہ شہر جتنا پسند آتا رہا اتنا ہی اس سے خوفزدہ اور خائف بھی رہے۔ جہاں اتنے سارے اردو بولنے والے اور اتنے سارے حیدرآبادی آباد ہوں وہاں ہم جیسے کم سواد کا اپنی عزت اور ناموس کو بچاکر صحیح و سالم واپس چلے آنا ایسا ہی ہے جیسے چراغ لے کر ہوا کے سامنے چلنا۔ ہمارے امریکہ پہنچنے سے پہلے ہی ہمدم دیرینہ حسن چشتی نے دی عثمانین کے تعاون سے ہمارے جشن کے انعقاد کا اعلان کردیا تھا جس کی رودادیں اخباروں میں چھپ چکی ہیں۔

پطرس بخاری نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ دوستی جب بہت پرانی ہوجاتی ہے تو دو دوستوں کے بیچ تبادلہ خیال کی کوئی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔ حسن چشتی سے ہماری دوستی کی عمر بھی اب نصف صدی کا قصہ بنتی جارہی ہے ایسے دوستوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں۔ آپ جشن کی بات کرتے ہیں تو ہم ایسے دوستوں کے کہنے پر آتش نمرود میں بھی کود پڑنے کو تیار رہتے ہیں۔ بہرحال حسن چشتی اور ان کے رفقا نے ایک کامیاب محفل منعقد کی اور ہمارے بکھرے ہوئے سیکڑوں احباب کو جمع کیا لیکن ہمیں یہ احساس ہر دم ستاتا رہا کہ حسن چشتی ہماری خاطر بلاوجہ ایک کھڑاک میں پھنس گئے ہیں۔ ہم تو دوستوں کی محبتوں کو سمیٹنے کے لئے گئے تھے لیکن وہاں جاتے ہی ہمیں شکاگو کے حیدرآبادیوں اور اردو بولنے والوں کی آپسی رنجشوں کو سمیٹنے کا کام انجام دینا پڑا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر کوئی اپنی محبت ہم پر نچھاور کرنے کو بیتاب تھا۔ ایک بار تو حد ہوگئی کہ بعض احباب ایک ایوارڈ لے کر ہمارے گھر پر آگئے کہ صاحب آپ کی سہولت کے پیش نظر ہم کسی خاص تقریب میں ایوارڈ دینے کی بجائے آپ کو آپ کے گھر میں ہی ایوارڈ سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم نے بھی سوچا اور جائز طور پر سوچا کہ بہرحال ایوارڈ محفل میں دیا جاتا ہے اسے آخر کار ڈھو کر گھر تو لانا ہی پڑتا ہے۔ کیوں نہ ایوارڈ کو قبول کرلیا جائے تاکہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے لیکن افسوس کہ اس دن ہمارے بھائی کے گھر میں پہلے ہی سے کوئی خوشگوار تقریب منعقد ہورہی تھی۔ چنانچہ ہمارے بھائی نے برملا معذرت کی کہ وہ ایک خوشگوار تقریب میں ایک ناخوشگوار تقریب کی ملاوٹ کرنا نہیں چاہتے۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔ ہم کیا کرسکتے ہیں۔ بہرحال ہمارا ایک ایوارڈ شکاگو میں اب بھی رکھا ہوا ہے کبھی جانا ہوا تو ساتھ لیتے آئیں گے۔ تاہم حسن چشتی کے بارے میں ہم اتنا ہی عرض کرتے چلیں گے کہ پچھلی نصف صدی میں ہم نے جب بھی حسن چشتی کو دیکھا نہ صرف دوست احباب اور رشتہ داروں بلکہ اجنبیوں تک کے کاموں میں سرگرداں اور غلطاں پایا۔ قدرت نے خدمت خلق کا جو جذبہ انھیں ودیعت کیا ہے وہ بہت کم کو نصیب ہوتا ہے۔ ہم جیسے تو دوستوں کے سکھوں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لیکن حسن چشتی اکیلے دوست ایسے ہیں جو دوستوں کے دکھوں میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی شریک رہا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوستوں کے دکھوں میں تو کمی واقع ہوجاتی ہے لیکن خود

حسن چشتی کے دکھوں میں ضرور اضافہ ہوجاتا ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اخباروں میں ان کی تصویریں زیادہ چھپتی رہتی ہیں لیکن ہمارا استدلال یہ ہے کہ آخر کو شاہ رخ خان، سلمان خان، گووندا، ہرتیک روشن وغیرہ کی تصویریں تو حسن چشتی کی تصویروں سے بھی کہیں زیادہ چھپتی رہتی ہیں ۔ ان سے تو کوئی کچھ نہیں پوچھتا ۔ بھئی صاف سی بات ہے کہ جس کی شکل اچھی ہوگی اس کی تصویروں کا چھپنا تو ایک خوشگوار اور مستحسن بات ہے پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حسن چشتی تو واقعی کام بھی کرتے ہیں صرف اداکاری نہیں کرتے ۔ شکاگو میں قیام کے آخری دنوں میں ہمارے پرانے دوست مصلح الدین سعدی بھی حیدرآباد سے وہاں آگئے تھے ۔ ان سے چونکہ حیدرآباد میں ہماری ملاقات نہیں ہوپاتی اس لئے سوچا کہ کیوں نہ شکاگو میں ان سے مل لیا جائے ۔ حسن چشتی کا ذکر آیا تو انھوں نے ایک بہت اچھی بات کی جو وہ اکثر کرتے رہتے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ حسن چشتی نے اپنی زندگی میں جو کارنامے انجام دئے ہیں ان کا صرف بیس فیصد احاطہ ہی ان کی شائع شدہ تصویروں میں ہوسکا ہے ۔ ان کے اسی فیصد کارنامے ایسے ہیں جن کا تحریری طور پر ذکر ہونا اب بھی باقی ہے ۔

بہر حال شکاگو میں مختلف اوقات میں ہمیں کئی دن رہنے کا موقعہ ملا ۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ شکاگو میں ہمارے لئے الگ سے کوئی محفل منعقد ہو ۔ لیکن بھلا ہو عزیزی غوثیہ سلطانہ کا کہ انھوں نے بالآخر زندہ دلان شکاگو کے حوالے سے ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا انھوں نے کہا کہ شکاگو میں آپ کا جشن تو ہوچکا ہے ۔ اب آپ کی روسٹنگ (Roasting) بھی ہونی چاہئے ۔ روسٹنگ انگریزی اصطلاح ہے جس کے لغوی معنی بھنائی اور کھنچائی وغیرہ کے ہوتے ہیں ۔ خیر اس محفل میں ہماری روسٹنگ تو نہیں ہوئی البتہ حسب معمول BOOSTING ضرور ہوئی ۔ ہم نے اور ہمارے دوست جلیل قادری نے تجویز رکھی تھی کہ زندہ دلان شکاگو کی اس محفل میں ہماری کھنچائی کے علاوہ سلیمان خطیب مرحوم کو بھی یاد کیا جائے ۔ ضمیر جعفری مرحوم نے غوثیہ سلطانہ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ اردو ادب کی چاند بی بی سلطانہ ہیں ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ چاند بی بی سلطانہ کو اگر آج کے حالات میں شکاگو میں کسی ادبی محفل کے انعقاد کے لئے کہا جاتا تو وہ یقیناً ناکام ہوجاتی اس محفل کے انعقاد کا سہرا غوثیہ سلطانہ کے حسن انتظام کے علاوہ ہمارے دوست جلیل قادری کی انتھک دوڑ دھوپ اور شکاگو کی ممتاز سماجی شخصیت راشد علی خاں کی عملی دلچسپی کے سر جاتا ہے ۔ برسوں پہلے ہمارے دوست محمود الحسن خاں صوفی کی معرفت راشد علی خاں سے حیدرآباد میں ہماری ملاقات ہوئی تھی ۔ راشد علی خاں نے زندہ دلان شکاگو کی خاطر ڈیون پر واقع اپنا وسیع اور شاندار آڈیٹوریم مفت میں دیدیا تھا ۔ راشد علی خاں کا شمار شکاگو کی ذی حیثیت ہستیوں میں ہوتا ہے اور ایسے کاموں کی آئے دن سرپرستی کرتے رہتے ہیں ۔ ہم سے جب بھی ملے بڑی محبت اور گرمجوشی سے ملے اس محفل میں نیاز گلبرگوی، حسن چشتی، ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی، مصلح الدین سعدی، پرویز ید اللہ مہدی، شاہد اسحاقی، راجہ ندیم، خورشید خضر، احسن قریشی اور کئی احباب نے اظہار خیال کیا ۔

ہمیں شخصی طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ اس محفل میں سلیمان خطیب مرحوم کو یاد کیا گیا ۔ خطیب مرحوم ہمیں بے حد عزیز رکھتے تھے اور ان کے بچوں نے بھی اس تعلق خاطر کو برقرار رکھا ہے ۔ امریکہ پہنچتے ہی ان کے فرزند شاہین خطیب اور بیگم سلیمان خطیب سے ہماری بات ہوگئی تھی بلکہ تقریباً روزہی بات ہوتی رہی نیویارک جانے سے پہلے ہم بطور خاص فلے ڈلفیا سے نیوجرسی گئے جہاں سلیمان خطیب کے پانچوں بیٹوں سے ہماری ملاقات ہوگئی ۔ وہ اتوار کا دن تھا ۔ سلیمان خطیب کے بڑے فرزند شاہین خطیب کے گھر ان کے باقی چاروں بیٹے یامین خطیب، تمکین خطیب، متین خطیب، اور تحسین خطیب، اپنے اہل و عیال کے ساتھ جمع تھے ۔ ہم مذاق میں خطیب بھائی سے کہا کرتے تھے کہ انھوں نے چھٹا بیٹا محض اس ڈر سے پیدا نہیں کیا کہ کہیں اس کا نام نمکین خطیب نہ رکھ پڑجائے ۔ تاہم وہ مساوات کے قائل تھے ۔ پانچ بیٹے پیدا کئے تو پانچ بیٹیاں بھی پیدا کیں ۔ ان بچوں کی خوشحال زندگی کو دیکھ کر کتنی خوشی

ہوئی اس کا حال ہم کیسے بیان کریں خیال آیا کہ کاش سلیمان خطیب آج زندہ ہوتے اور اپنے بچوں کی خوشیوں کو دیکھ پاتے۔ ان کی اولاد میں ڈاکٹر شمیم ثریا اور تحسین خطیب کو ادب سے گہرا شغف رہا ہے۔ تحسین خطیب تو ایک زمانہ میں لکھا بھی کرتے تھے۔ اس بار بھی تحسین خطیب نے باتوں باتوں میں ایک دلچسپ بات کہی۔ کہنے لگے کرکٹ میں "میچ فکسنگ" تو اب شروع ہوئی ہے لیکن ہمارے اردو ادب میں تو ہمارے نام نہاد نقادوں کے ہاتھوں اس طرح کی "فکسنگ" پرانی بات ہے۔ جسے جی چاہا منصب عطا کر دیا اور کسی کو ان کے خلاف کچھ کہنے کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تحسین خطیب اس موضوع پر کچھ لکھیں۔

سلیمان خطیب [illegible] جس طرح بیگم خطیب کی نگہبانی اور خدمت کرتے ہیں وہ نئی نسل کے لئے ایک قابل تقلید بات ہے۔ ☆

واجد ندیم (شکاگو)

نذر مجتبیٰ حسین

(شکاگو میں منعقدہ جلسہ میں پڑھی گئی)

اردو ادب کے پیر جواں مجتبیٰ حسین
جانِ جہانِ زندہ دلاں مجتبیٰ حسین

چہرے کو ان کے دیکھ کے دھوکہ نہ کھائیے
ہیں ساٹھ کے بھی ہو کے جواں مجتبیٰ حسین

بوڑھا انہیں نہ ہونے دیا ان کا فکر و فن
بچپن سے آج تک ہیں جواں مجتبیٰ حسین

طنز و مزاح کے ہیں یہ بے تاج بادشاہ
تحریر سے ہے ان کی عیاں مجتبیٰ حسین

زندہ دلی فدا ہے یہ زندہ دلوں کے ہیں
زندہ دلوں کے روحِ رواں مجتبیٰ حسین

پہلو ہر ایک طنز کے ان پر ہیں کھل گئے
اردو زباں کے سرِّ عیاں مجتبیٰ حسین

میٹھا سا درد دیتا ہے ان کا ہر ایک تیر
رکھتے ہیں ایسی نرم کماں مجتبیٰ حسین

آنکھوں میں تیرنے لگیں آنسو کبھی کبھی
کچھ باندھتے ہیں ایسا سماں مجتبیٰ حسین

سمجھے نہیں اگر تو کوئی ہنس کے ٹال دے
سمجھے تو ایک کوہِ گراں مجتبیٰ حسین

رکھتے ہیں اپنی نثر میں اندازِ شاعری
ان کا ہے ایسا طرزِ بیاں مجتبیٰ حسین

چینی بغیر گھول کے اس کو پلائیے
لکھتے ہیں ایسی میٹھی زباں مجتبیٰ حسین

مئے تو پلا رہے ہیں ظرافت کی اور بھی
اس میکدہ کے پیرِ مغاں مجتبیٰ حسین

یوں تو جہاں میں اور بھی اچھے ادیب ہیں
لیکن ہیں سب کے وردِ زباں مجتبیٰ حسین

ہر کوئی چاہتا ہے کہ ان پر لٹائے جاں
شعلہ رخوں کے جانِ جہاں مجتبیٰ حسین

ہم بھی تو شہ سوار ہیں طنز و مزاح کے
لیکن کہاں ندیم کہاں مجتبیٰ حسین

اوروں کا درد بانٹ کے ہنستے ہیں وہ ندیم
کرتے نہیں ہیں آہ و فغاں مجتبیٰ حسین

ثلاثی

کوثر صدیقی
زیب ولا، گنوری روڈ، بھوپال

کھر سے ناخن نکل نہیں سکتا
شیر کی کھال اوڑھ کر کچھ
خصلت اپنی بدل نہیں سکتا

●☆●

شکر ہر حال میں خدا کا ہے
روکھی روٹی بھی اچھی ہے لیکن
دال بھی ہو تو اور اچھا ہے

●☆●

کتنی پیاری حرام دولت ہے
بابو افسر ہی پہلے تھے راشی
اب کھلاڑی بھی کھاتا رشوت ہے

●☆●

جھوٹ بھی کام آہی جاتا ہے
دے کے جھوٹی تسلی بیٹے کو
روز آٹا ادھار آتا ہے

●☆●

شاعری ہم بھی خوب کرتے ہیں
میر کا کھیت ہو کہ غالب کا
خچروں کی ادا سے چرتے ہیں

●☆●

مانگیے مت طلاق ، لکھا ہے
عمر بھر روٹی میں۔ پکاؤں گا
آپ کو صرف کھاتے رہنا ہے

●☆●

اتنے پیسے کہاں سے لاتے ہیں
ان کی تنخواہ مجھ سے بھی کم ہے
پھر بھی نیتا پلاؤ کھاتے ہیں

●☆●

آزمانے میں کیا برائی ہے
دوڑ میں کرسی کی نہ ہو شامل
سب سے آرام دہ چٹائی ہے

●☆●

پیار ہوتا نہیں ہے بھوکے پیٹ
جذبہ عشق گرم رکھنے کو
پیٹ کو کیجئے دال روٹی بھینٹ

●☆●

ہے "ٹو۔ان۔ون" بھی خوب یہ کو
لائی ہے جو جہیز میں بیو
دن میں ساڑی ہے رات میں چا

●☆●

لاٹھی کاندھوں پہ میں نے رکھ لی۔
جب سے یہ راز ہوگیا اف
جس کی لاٹھی ہو بھینس اس کی۔

●☆●

روٹی کھانے کو پانی پینے
مل رہا ہے یہی غنیمت ۔
اور کیا چاہتا ہے جینے

●☆●

کتنی جرأت ہے کتنی ہمت ۔
گھر میں بیوی کے ساتھ جینے
میرے سسرال کو بھی حیرت۔

●☆●

مت بڑھا ہاتھ اس طرح ڈر ۔
پرس میں کچھ پرانی غزلیں ہ
کاٹ لے میرا جیب جی بھر۔

●☆●☆●

عابد معز (ریاض)

تلاش گمشدہ

بہت عرصہ سے مجھے اپنی ذاتی اشیاء میں ایک چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی وہ شئے کہیں گم ہو گئی ہے وہ ایک معمولی شئے ہے اور اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے بہت ارزاں ہے ایک چھٹی کے دم میں اپنی اسی گمشدہ چیز کو تلاش کرنے لگا کپڑوں کی الماری دیکھ ڈالی الماری کا ہر کونہ اور خانہ چھان مارا لیکن اس کا سراغ نہ ملا کوٹ کے جیب ٹٹولے پتلون اور شیروانی کی جیبوں میں بھی پتہ نہ چلا آخر تھک ہار کر اپنی اس چیز کو یاد کرنے کرسی پر نیم دراز ہو گیا آنکھیں بند کیں تو آنکھوں میں وہ شئے لہرانے لگی گہری سانس لی تو اس کی خوشبو یاد آئی اور ہاتھوں نے اس کا لمس محسوس کیا۔

اس دوران بیگم کمرے میں آئیں کمرے کی بے ترتیبی اور میری حالت کو دیکھا کچھ پریشان ہوئیں اور پوچھا کیا کھو گیا کس چیز کی تلاش ہے ؟

میں نے اپنی گمشدہ شئے کا نام بتایا "رومال تلاش کر رہا ہوں"۔

بیگم نے حیرت سے دوہرایا "رومال" پھر انہوں نے کہا "رومال تو اب استعمال میں رہا نہیں ٹشو کا زمانہ ہے آپ کے سیدھے ہاتھ کے پاس ٹشو کا ڈبہ پڑا ہے آنکھیں پونچھ لیجئے اور ہاں استعمال شدہ ٹشو کو کچرے کے ڈبے میں ڈالنا نہ بھولئے"۔

مجھے پتہ ہے آج ٹشو کا زمانہ ہے لیکن رومال کو غائب ہوئے اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا کہ ہم رومال کی خدمات کو یکسر فراموش کردیں اور بیگم تمہارا تعلق رومال سے بہت گہرا رہا ہے تم تو رومال کو بھول نہیں سکتیں میں نے بیگم کو ماضی یاد دلائی۔

"جی مجھے اپنا وہ رومال آج بھی اچھی طرح یاد ہے میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں اسی نے مجھ سے دغا کیا تھا" بیگم نے جواب دیا۔

"بیگم رومال کا شکریہ ادا کرو اس نے تمہاری زندگی بنادی" میں نے طنز کیا۔

اب چھوڑیئے بھی بیتی ہوئی باتوں کو!" بیگم نے رومال اور مجھ سے جان چھڑانی چاہی۔

بیگم کو میں بھیا کی شادی میں دیکھا اور دل دے بیٹھا تھا اس وقت کا ماحول ایسا تھا کہ میں نہ اظہار محبت کر سکتا تھا اور نہ ہی اعلان کر سکتا تھا کہ اس خاتون سے جو اس وقت بھابی کی کزن تھیں شادی کرنا چاہتا ہوں مجھے ایک ترکیب سوجھی بہت مشکل اور دھڑکتے دل سے بھابی کی کزن کا رومال چرالایا اس کو بھابی کے سامنے جیب سے گرایا اور چوری پکڑے جانے کے ڈر سے گھبرانے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

بھابی نے معنی خیز مسکراہٹ بکھیر کر پوچھا "تمہیں یہ رومال پسند ہے"۔

اگر گھر والوں کو بھی پسند ہے تو" میں بس اتنا کہا بقیہ کام بھابی نے سنبھال لیا اور اپنی کزن کو میری بیگم بنلائیں میں نے منہ دکھائی کی رسم میں وہ جادوئی رومال پیش کیا بیگم نے اس رومال کو ایک عرصہ تک سنبھال کر رکھا پھر معلوم نہیں وہ رومال کہاں غائب ہو گیا۔

رومال کی یہ ایک ادنی سی کرامت تھی۔

آج کے بچے شاید رومال دیکھے بھی نہ ہوں گے وہ یہ جانتے بھی نہ ہوں گے کہ رومال کیا اور کیسا ہوتا ہے میں نے اپنے لڑکے

سے پوچھا بیٹا بتاؤ رومال کیا ہے ۔

لڑکے نے اشارہ مانگا "رومال کھانے کی چیز ہے یا دیکھنے کی"

میں نے جواب دیا "استعمال کرنے کی"

لڑکے نے ہار مان لی تو میں نے اسے بتایا رومال کپڑے کا ایک مربع ٹکڑا ہے جسے لوگ مختلف اغراض کے لئے اپنے پاس رکھتے ہیں بلکہ رکھتے تھے رومال کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ رومال کپڑے کا وہ ٹکڑا ہے جو آڑے وقتوں میں کام آتا ہے ۔

میرے ایک دوست نے رومال کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اپنے ڈرائنگ روم میں رومال کو سجاوٹ کی شئے کے طور پر رکھا ہے ۔

رومال کا اہم رول ہاتھ منہ صاف کرنا بلکہ ہاتھ منہ پونچھنا تھا بعض مرتبہ میں نے رومال کو تولیہ کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتے دیکھا ہے آنسو پونچھنے اور ناک صاف کرنے کے لئے بھی رومال کا استعمال ہوتا تھا آج ٹشو پیپر نے رومال کی جگہ لے لی ہے ٹشو پیپر سے ہاتھ اور منہ صاف ہوتے ہیں لیکن آج بھی کھانے کے وقت گلے میں لٹکانے کے لئے رومال ہی استعمال ہوتا ہے ابھی پیپر کو گلے لگانے کا رواج نہیں ہوا ہے ۔

ٹشو پیپر نے رومال کو غائب کردیا ہے لیکن رومال کے کئی فائدے تھے جب سر ڈھانکنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو سر کو ٹشو پیپر سے نہیں ڈھانکا جاسکتا جبکہ رومال کو ٹوپی کی طرح پہن کر سر ڈھانکا جا سکتا ہے ۔ رومال کو اوڑھ کر بڑوں کا ادب اور لحاظ رکھا جاتا تھا ۔ اب سر ہی کم ڈھانکا جاتا ہے آج کھلے سر، بالوں سے بھی کھلے، کچھ زیادہ ہی نظر آتے ہیں ۔ سر پر سایہ کرنے کے لئے بھی رومال کو سائبان کی طرح تان لیا جاتا تھا ۔

ماضی میں بازار جاتے اور ساتھ میں تھیلی نہ ہوتی تھی تو اشیاء کو رومال میں باندھ کر لاتے تھے ۔ جب ہمیں کہیں بیٹھنا ہوتا تو رومال کو بچھا دیا جاتا تھا ۔ رومال کو نشست پر رکھ کر جگہ محفوظ کی جاتی تھی ۔ بس اور سینما ہال میں لوگ رومال کو دور سے سیٹ پر پھینک کر اپنی نشست کا انتخاب کرتے تھے ۔

رومال کو چوہے یا کسی اور شکل میں ڈھال کر بچوں کا دل بہلاتے تھے ۔ رومال کی مدد سے بچے کئی کھیل کھیلتے تھے ۔ رومال کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر اندھا پاشا کھیل ہوتا تھا ۔ دو ایک اور کھیلوں میں بھی رومال کا استعمال ہوتا تھا جو اب یاد نہیں رہے ۔ کتنا اچھا تھا جب بچے کپڑے کے ایک چھوٹے ٹکڑے سے دل بہلایا کرتے تھے ۔ اب بچوں کا دل کمپیوٹر سے کم کسی چیز سے بہلتا نہیں ۔

لڑائی کے دوران رومال ہتھیار کے طور پر کام آتا تھا ۔ رومال میں پتھر باندھ کر مخالف پر حملہ کرنے کی سہولت حاصل تھی ۔ جب زخمی ہوتے تو اسی رومال سے پٹی بھی باندھی جاسکتی تھی ۔

رومال جادوگر کے آج بھی بہت کام آتا ہے وہ رومال کو کبھی کبوتر تو کبھی کیلے میں بدل دیتا ہے رومال کا رنگ تبدیل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ معلوم نہیں کسی جادوگر نے اتنی کام کی چیز کو ہماری زندگی سے غائب کردیا ہے ۔

رومال کو جیب میں چھپا کر رکھا جاتا تھا ۔ ضرورت پڑنے پر یہ جیب سے نکل کر ہاتھ میں آتا تھا ۔ استعمال کے دوران ہاتھ ہی میں رہتا تھا اور استعمال ہونے کے بعد سے واپس جیب میں رکھا جاتا تھا ۔ ہاتھ سے رومال کی اس قربت کے سبب رومال کو بعض مقامات پر دستی بھی کہا جاتا ہے ۔ رومال اور دستی کچھ پرانے اور دقیانوسی نام معلوم ہوتے تو نوجوان رومال کو "بینکی" بھی کہنے لگے ۔ چاہے آپ کپڑے کے اس ٹکڑے کو رومال، دستی یا بینکی کہیں، یہ ہے بڑے کام کی چیز جب رومال ساتھ نہ ہوتا تو خود اعتمادی متزلزل ہوتی تھی عجیب و غریب بچکانی حرکت سرزد ہوتی تھیں ناک آستین سے صاف ہوتی اور منہ دامن سے پونچھا جاتا تھا ۔

رومال کو سلیقے اور طریقے سے تہہ کر کے جیب میں رکھا جاتا تھا جیب سے رومال کا جھانکنا یا جیب میں بغیر تہہ کئے رومال کو رکھنا شرفا کا شیوا نہ تھا۔ایک منفرد طریقہ سے تہہ کئے ہوئے رومال کو کوٹ کے اوپری جیب میں رکھنے کا چلن آج بھی ہے۔گلے میں رومال ڈالنا غنڈہ گردی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔

رومال مختلف کپڑوں اور مختلف رنگوں میں ملتے تھے رومال کی دکانیں ہوا کرتی تھی یہاں ہر قسم کے رومال سجا کر رکھے جاتے تھے۔ حسب ضرورت ایک سے زائد رومال بھی رکھتے تھے ہاتھ منہ پونچھنے کے لئے سوتی کپڑے کا رومال استعمال کیا جاتا تھا۔سجاوٹ کے لئے ریشمی رومال جیب سے جھانکتے نظر آتے تھے۔

مردانہ اور زنانہ رومال الگ الگ ہوتے تھے۔زنانہ رومال چھوٹے ملائم اور نازک ہوتے تھے۔لڑکیاں رومال کو دوپٹہ کی طرح بھی استعمال کرتی تھی۔اپنے چہرے کو رومال کی اوٹ میں چھپا لیتی تھیں۔لڑکیاں رومال پر اپنے ہاتھ سے کشیدہ کاری کرتی تھیں چاؤ سے پھول پتیاں بناتی یا نام کا پہلا حرف کاڑھا کرتی تھیں۔محبت کرنے والوں کے درمیان رومال کا تبادلہ عمل میں آتا تھا۔میرے ایک دوست کے پاس جدائی سے قبل ان کی محبوبہ کا دیا ہوا رومال آج بھی محفوظ ہے تنہائی میں گھنٹوں بیٹھے وہ رومال کو تکا کرتے ہیں۔رومال پیام رسائی کے کام بھی آتا تھا۔رومال لہرا کر اشارے بھی کئے جاتے تھے۔

زمانے کی ترقی نے کم سے کم کپڑوں کو رواج دیا ہے ضروری کپڑے تک غائب ہو رہے ہیں۔بھلا رومال جیسے زائد کپڑے کو ترقی کرتا ہوا انسان کب تک برداشت کرتا۔ترقی یافتہ انسان سے رومال چھوٹ گیا لیکن اب بھی بعض لوگ بے شمار فائدوں کی خاطر رومال استعمال کرتے ہیں۔☆

ناموں کا گورکھ دھندہ

نظر برنی، نئی دہلی

آج کل دنیا میں ناموں کی ہوئی مٹی پلید
آئیے کچھ اک مثالیں سامنے رکھتے چلیں
نام ہے دھن راج لیکن نردھنوں کے ہیں امام
آنکھ کے اندھے کو دنیا نور کیوں کہنے لگی
نام ہے رن بیر لیکن رن کبھی جھانکا نہیں
نام تو ہے دیو لیکن چھپکلی کا جسم ہے
گندگی اس کا مقدر نام جس کا ہے نفیس
نام ہے کپتان سنگھ جھاڑو لگاتے دیکھئے
نام ہے مختار ان کا جو ہیں جورو کے غلام
نام ہے تارا وتی، مکھڑے پہ کالی رات ہے
صورت کالج نہ دیکھی نام لکھتے ہیں علیم
جو ہیں دادا شہر کے ان کا شرافت نام ہے
نام ہے مشتاق لیکن سب سے وہ بیزار ہیں
جن کا پیشہ ہے کلرکی ان کو کہتے ہیں عظیم
سر سے پا تک وہ ہیں بھونڈے نام جن کا ہے جمیل
نام روشن ہے مگر آنکھوں کی بینائی نہیں
نام رحمت ہے مگر زحمت میں وہ مشہور ہیں
نام جابر ہے تو پھر کیا، دیکھنے میں ہیں شریف
نام ہے اس کا شگفتہ رونا دھونا کام ہے
نام ہے الطاف لیکن لطف سے بیزار ہیں
نام تو سلطان ہے قرضے پہ کرتے ہیں گزر

نام اور کردار میں ہونے لگا فرق شدید
ان کو پرکھیں اور کھنگالیں سامنے رکھتے چلیں
نام زاہد ہے مگر پیتے ہیں وہ ہر صبح و شام
جو توے سے بھی ہے کالی حور کیوں کہنے لگی
شیر سنگھ کہتے ہیں جس کو شیر تک دیکھا نہیں
زور آور سنگھ کو دیکھو مینڈکی کی قسم ہے
قرض لے کر جو مکر جائے وہ کہلایا رئیس
ہے گھمنڈی نام لیکن سر جھکاتے دیکھئے
نام عاشق ہے مگر پھرتے ہیں بے نیل و مرام
جس نے کاشی ہی نہ دیکھی ہو وہ کاشی نات ہے
عقل سے پیدل ہیں تو کیا نام ہے ان کا فہیم
نام ہے فیاض ان کا بخل جن کا کام ہے
جو سدا روتے رہیں بس وہ ہی اب گلزار ہیں
نبض سے نا آشنا کہلائے جاتے ہیں حکیم
جن کی صورت ریچھ جیسی وہ ہی کہلائے شکیل
سیٹھ لکھپت کی گرہ میں ایک بھی پائی نہیں
شکر یہ کیوں کر ادا کرتے کہ وہ مشکور ہیں
اب ربیع کی فصل میں گھسنے لگی فصل خریف
ایک کوڑی جو نہ چھوڑے اس کا حاتم نام ہے
نام مظہر ہے مگر وہ شخص پر اسرار ہیں
چاند بی بی اتنی بھونڈی جیسے نالی کا گٹر

نام سنگل ہے مگر گانے سے نفرت ہے انہیں
دھرم کے وہ داس ہیں رشوت سے الفت ہے انہیں

کالے کرتوتوں کا کیا ہے نام تو ہے سنت لال
لاکھ ہوں سر پہ بلائیں نام تو ہے مست لال

ایسے جوشی دیکھئے جو جوش سے محروم ہیں
جو فقط خادم لکھیں سمجھو وہی مخدوم ہیں

لاکھ ان کا نام ہو آتا نہیں ان کو جلال
نام رکھ کر وہ کمالی بن گئے اہل کمال

نام جیوتی ہے مگر آنکھوں پہ چشمہ دیکھئے
آسماں والے کا یارو یہ کرشمہ دیکھئے

جو ہیں گونگے اور بہرے وہ ہی کہلائے کلیم
غنڈہ گردی میں بہت مشہور ہیں بھائی سلیم

نام گنگا ہے مگر پاکیزگی سے دور ہیں
نام درگا ہے مگر حالات سے مجبور ہیں

ہم کہاں تک نام کی اور کام کی چرچا کریں
یہ تو صدیوں کا چلن ہے اس کو کیا رویا کریں

آیئے اس قول پہ کردیجئے قصہ تمام
" با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام "

مہ لقا ملکہ (دہلی)

"فادری زبان"

دفتر کے باس کی
مادری زبان
ہندی ہے
لیکن آجکل وہ
طیش میں آنے کے بعد
جوش میں اسٹیم بن جاتا ہے جب
بات اور بے بات پر
بابوؤں کو ڈانٹتا ہے وہ
اور کہتا ہے یہی
"ایڈیٹ"
"گوٹو ہیل"
"شٹ اپ"
"اسٹوپڈ"
"یو سی"
"ڈونٹ ٹاک، ایٹ سٹیرا، ایٹ سٹیرا"
اس لئے کہتی ہوں میں
صاحب کی مادری زبان ہندی سہی
پر، فادری زبان تو انگریزی ہے

●☆●

ڈاکٹر حبیب ضیاء (حیدر آباد)

حیدر آباد کے فقیر

حیدر آباد کئی چیزوں کے لئے عالمگیر شہرت رکھتا ہے ۔ قلعہ گولکنڈہ ، چارمینار ، جامعہ عثمانیہ ، سالار جنگ میوزیم وغیرہ ۔ جاندار عجوبوں میں لیڈر ، چور ، پولیس اور فقیر اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔ سرزمین دکن پر انواع و اقسام کے فقیر پائے جاتے ہیں ۔ ان کے رنگ ڈھنگ ، مانگنے کے طور طریقے بالکل نرالے ہیں ۔ ان کی کئی قسمیں ہیں اڈے کے فقیر ، گھومنے والے فقیر ، خاندانی فقیر ، سحری کے فقیر دولت مند فقیر اور سیاسی فقیر ۔ جلالی اور جمالی بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں ۔ اڈے کے فقیروں کے لئے وقت اور مقام کی بڑی اہمیت ہے ۔ یہ صبح اٹھ کر منہ ہاتھ دھوتے ہیں قریبی ہوٹل میں اڈلی دوشہ کھا کر اپنے اڈے پر چلے جاتے ہیں کیا مجال جو نیا فقیر انچ برابر ان کی جگہ لے لے ۔ اڈے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب کسی بھیک منگے کی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو داماد کو جوڑے کی رقم کی بجائے بھیک کا اڈہ دیا جاتا ہے ۔ اس طرح اچھا خاصا شریف مگر غریب آدمی دیکھتے دیکھتے خوشحال فقیر بن جاتا ہے ۔

ہر فقیر کے مانگنے کا اپنا منفرد انداز ہوتا ہے ۔ ایک شاپنگ سنٹر پر فقیر نے ہاتھ پھیلایا اس وقت تک ہم آگے بڑھ چکے تھے ۔ اتفاق سے قریب ہی کسی اور دکان پر کام تھا ۔ بظاہر کمزور ، بوڑھا فقیر تیز تیز قدم بڑھاتے وہاں پہنچ گیا ۔ اس کے گھگھیانے پر ترس کھا کر ہم نے پرس میں سے کچھ چلر دینا چاہا ۔ دو تین روپے ہوں گے فقیر نے وہ پیسے نہیں لئے ۔ کہنے لگا گھر میں چاول نہیں ہیں چاول خریدوں گا ۔ چا مٹھی میں دبائے ہم نے دس روپیہ کا نوٹ اسے دے دیا ۔ نوٹ لے کر دوبارہ اس نے ہاتھ بڑھایا لاؤ وہ چلر بھی دے دو مرچ نمک خریدلوں گا ۔ اطراف کے دکاندار یہ تماشہ دیکھ رہے تھے ۔ لین دین میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ فقیر ہمیں دے رہا ہے یا ہم فقیر کو دے رہے ہیں اس کے چلر پن سے بچنے کے لئے ہم نے وہ چلر بھی دے دیا اور دوسرے فقیروں سے نظریں بچائے وہاں سے نکل گئے ۔

آجکل مسجد ، مندر اور درگاہ کے علاوہ بنکس بھی فقیروں کے اڈے بنے ہوئے ہیں ۔ بنک کے سامنے ایک فقیرنی کو ہم نے ایک روپے کا سکہ دیا ۔ سکہ لے کر وہ ہمیں عجیب اور سکے کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی ۔ کچھ دیر الٹ پلٹ کرتی رہی ۔ پھر کچھ سو کر اس نے یہ کہتے ہوئے سکہ ہماری ہتیلی پر رکھ دیا دس پیسے کی طرح اس کا چلن بھی اب ختم کرنے والے ہیں پانچ کا چھوٹا سکہ ہمارے لئے ہی تو بنا ہے ہماری بے اعتنائی پر وہ طنز آمیز آنکھوں سے ہمیں گھورنے لگی گویا کہہ رہی ہو " آخری عمر میں خیر خیرات کام آئے گی " ۔

اکثر گھرانوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ مستقبل کی پروا کئے بغیر صدر خاندان فخریہ دس بارہ بچوں کے باپ بن جاتے ہیں ۔ تعداد اس سے زیادہ ہو تو بچوں کے نام بھی بھول جاتے ہیں ۔ مردم شماری کے لئے متعلقہ لوگ آئیں تو بچوں کو لائن میں کھڑا کر کے کہتے : ذرا اپنا اپنا نام بتا دو ۔ بہر حال ان کلیوں کے پھول بننے تک باپ صحیح راستے سے ہٹ جاتے ہیں ۔ نہ ان کی پڑھائی کی فکر پر توجہ دیتے نہ مستقبل سنوارنے کی کوشش ۔ تیم کو اللہ کے بھروسے چھوڑ کر عیاشی اور رنگ رلیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں ۔ ان غیر تعلیم یافتہ غیر مہذب بچوں کے لئے ایک ہی راستہ کھلا ہوتا ہے وہ ہے خاندان کے کسی خوشحال فرد سے مستقل مانگنا ۔ ایسے لوگ خاندانی فقیروں کی فہرست میں آتے ہیں ۔ عاجز آکر لوگ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں ۔ معقول نامعقول وجوہات بتا کر وظیفے میں اضافہ کروالینا ان ۔

بائیں ہاتھ کا کھیل بن جاتا ہے سحری والوں کے بارے میں بس اتنا ہی کہنا ہے کہ یہ سونے سے پہلے جگادیتے ہیں۔

شادی بیاہ کے موقع پر جوڑے کی رقم اور جہیز مانگنے والوں کو ہم دولت مند فقیر کہتے ہیں سماج سے ان فقیروں کا خاتمہ خواتین ہی کر سکتی ہیں۔ کیونکہ مانگنے والی بھی یہی ہیں اور دینے والی بھی یہی۔

سیاسی فقیر برسات کے مینڈکوں کی طرح اچانک منظر عام پر آکر اخباروں کی سرخی بنتے ہیں۔ تصویریں دیکھئے۔ اکثروں پر ڈاکو کا شبہ ہوتا ہے۔ ویسے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دراصل ان میں بعض چور، اچکے بھی ہوتے ہیں۔ بعض تو جیل میں رہ کر ووٹ کی بھیک مانگ کر الیکشن جیستے ہیں۔ یہ بڑے موقع پرست ہیں ووٹ کی خاطر کسی کے پاؤں چھوتے ہیں تو کسی دوسرے مذہب کی عبادت گاہ پر ماتھا ٹیکتے ہیں۔ اپنی کرسی کو یقینی بنانے کے لئے فرقہ وارانہ فساد کروانا ان کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

جو جلالی ہوتے ہیں کسی درگاہ کی سیڑھیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ معصوم اور پریشان حال افراد زیادہ تر ان کا نشانہ بنتے ہیں۔ مطلوبہ رقم نہ ملنے پر ایک فلک شگاف نعرہ بلند کر کے کوسا دینے کا حربہ استعمال کرتے ہیں یا پھر ایسی خوفناک پیشن گوئی جس کے نتائج سے بچنے کے لئے درگاہ پر منت مراد مانگنے والا شخص انھیں منہ مانگی خیرات دے دیتا ہے۔ جمالی فقیروں کا روحانیت سے دور کا بھی تعلق نہیں ان کی رذالت سے بہت کم لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو انتہائی پارسا، نیک ظاہر کرنے کے لئے چہرے پر جمال داڑھی اگائے، سفید کرتا، سفید پاجامہ، کروشیا کی سفید ٹوپی اور کاندھے پر رومال ڈالے، مختلف گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں غور سے دیکھئے۔ آنکھوں میں سرمہ، منہ میں پان، اور چبھتے ہوئے عطر میں بسے ہوئے ہوں تو یقین کر لیجئے، کہ یہ پیشہ ور چالباز ہیں۔ خود کو کبھی کسی مسجد کا پیش امام ظاہر کرتے ہیں تو کبھی اجتماعی شادیاں کروانے والا درگاہ کا مجاور۔ ان کی شائستہ گفتگو سے متاثر ہو کر لوگ زکوٰۃ خیرات کے دروازے ان پر کھول دیتے ہیں۔ ہر گھر سے سو پچاس روپے لے کر رفو چکر ہوجاتے ہیں۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے مذہب کے نام پر مانگنے والے سے بھیک منگوں کو ایسا سبق سکھائیں کہ وہ سرمہ لگانا بھول جائیں۔

ہمارے بچپن میں فقیر گھر پر آتے تو یوں آواز لگاتے۔ جمعرات بھری مراد، پیاروں کی بڑی حیات۔ اللہ کے نام پہ ایک پیسہ خیرات کروں، روٹی کھا کر دعا دوں گا۔ پیسے کا دور، عرصہ ہوا گزر گیا۔ چونی، اٹھنی، روپیہ بھی اب کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ ایک چہرہ شناس فقیر باہر سے آئے ہوئے ایک صاحب سے یوں خیرات مانگ رہا تھا۔ " اللہ کے نام پہ ایک ڈالر دیو بابا۔ بال بچوں کا صدقہ۔ کمپیوٹر خرید کے دعا دوں گا"۔

گداگروں کو سڑکوں سے ہٹانے کی مہم شروع کی گئی کیونکہ پولیس کے لئے یہ ایک چیلنج ہے کہ کون کس کو ہٹاتا ہے۔ پولیس میں شریفوں کے ساتھ ساتھ زانی، چور، لٹیرے اور بھیک منگے سبھی بھرتی ہوتے ہیں۔ آج یہ گداگروں کو سڑکوں سے ہٹائیں گے کل ان ہی سے معمول لے کر سڑکوں پر دوبارہ بٹھادیں گے۔ گداگروں کو ہٹانے کا مطلب، کئی پولیس والوں سے ان کے یونیفارم واپس لینے ہوں گے۔ کیونکہ مانگنا، ان کا پیشہ آبائی ہے خون سے کسی چیز کو الگ کرنا، ظاہر ہے ناممکن سی بات ہے۔

کسی سے کہئے مت۔ ہم بھی ایک فقیر ہیں۔ ان فقیروں سے بالکل مختلف۔ ہم اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ شہر کے لئے امن، عورت کے لئے انصاف اور غریب کے لئے دو وقت کی روٹی۔ ☆

●☆●☆●☆●

●☆●☆●

افتخار وصی
(گنجد دئم۔ بتیا)

ہو کے بڑے بے آبرو ۔۔۔۔۔!

شاعر کی فہرست میں پڑھکر اپنا نام
خط لکھا استاد کو فوراً چپکے سے
دھن کے خالق اسکی بنے اسلم قوال
محفل میں سارے بچے موجود ملے
کر کے اشارہ سب کو بلایا ایک طرف
سو کا پتہ دیکے کہا کچھ کھا لینا
لیکن شرط ہے جاگتے رہنا آخر تک
گونجی اتنے میں ہر سو ناظم کی صدا
ایک سے بڑھکر ایک تھے شاعر ڈائس پر
ہم ان کی آواز کو سن کر بھول گئے
جاکر ٹوئیلٹ میں سر دھویا گھنٹوں تک
رکشہ پکڑے اور پہونچے قوال کے گھر
دھن اسکی دوبارہ ہمیں بتلا دیجے
فرمایا موصوف نے ۔ اتنی رات گئے
ہم نے کہا طبلہ پہ ہمیں بٹھلا دیجے
بیسیچارے نے رکھ لی فوراً بات کی لاج
گاتے بجاتے رات سرک گئی پہلو سے
بچوں نے اصرار کیا چاچا پڑھیے

بچوں میں تقسیم کیا ہم نے بادام
منگوالی انگوری غزل کلکتے سے
کر کے ریہرسل دوڑ کے پہونچے ہم پنڈال
دیکھ کے ہم کو چاچا چاچا بول اٹھے
پہلی صف میں ان کو بٹھایا ایک طرف
چائے بسکٹ یا کوکا کولا لینا
ہم جو پڑھیں تو خوب گرجنا آخر تک
لو ! اب بزم شعری کا آغاز ہوا
الو ۔ کوئل ۔ آہو ۔ طائر ڈائس پر
ہائے توبہ ، خود اپنی دھن بھول گئے
کافر دھن لوٹی نہ ہماری گھنٹوں تک
عرض کیا موصوف سے ہم نے رو رو کر
بہر خدا گانے کا ہنر سکھلا دیجے
کیسے آپائیں گے میرے ساتھ ندے
آپ بجاکر باجا دھن سکھلا دیجے
لیکن ہم رکھ پائے نہ ہرگز رات کی لاج
صدر کھڑے تھے مائیک پر جب ہم پہونچے
ناظم مائیک پر چلایا چپ رہیے

ختم ہوئی محفل بلا ہنگام نہیں
بچو میری لسٹ میں ان کا نام نہیں

قطعات

لاکھ نسبندی کا ہو پرچار بھارت ورش میں
اس کے بہکاوے میں ہم فی الحال آسکتے نہیں
بڑھتی آبادی ہماری ارتقاء کی جان ہے
بڑھتی آبادی کو ہم ہرگز گھٹا سکتے نہیں

●☆●

اک ارب سے بھی زیادہ ہوگئے ہم ان دنوں
زندہ بچ سکتا نہیں دشمن ہمیں للکار کر
اتنی طاقت آگئی ہے اب ہمارے ہاتھ میں
توپ کا رخ موڑ سکتے ہیں طمانچہ مار کر

●☆●

نریش کمار شاد

نامور مزاحیہ شاعر راجہ مہدی علیخاں سے انٹرویو

راجہ صاحب سے جو اپنے کو راجہ محمود آباد اور راجہ رام موہن رائے کا مرکب سمجھتے ہیں، سنجیدگی کی توقع تو محال ہے لیکن ان کی بعض غیر سنجیدہ باتوں پر شاید متانت کو بھی نثار کیا جاسکتا ہے۔ ☆☆☆ (ن ک ش)

ارے او ملک الشعراء، طاؤس گلستان ہند نریش کمار شاد، کورنش بجالانے کے بعد میں پوچھتا ہوں، یہ کیا مذاق ہے کہ تو نئی دلی سے بمبئی میں میرا انٹرویو لینے چلا آیا۔ کیا تو بہت بڑا بے شرم ہے؟ اگر ہے تو تو کیوں ہے، میں کیوں نہیں؟ بھلے آدمی! یہ تو سوچ کہ میرا انٹرویو لینے سے قوم، میرا مطلب، ہے شاعروں کی قوم پر تیرا کیا امپریشن پڑے گا؟ مزاح نگاروں کی کتنی دل آزاری ہوگی۔ اے نا عاقبت اندیش کمار! اگر تو مسلمان ہوگیا تو کبھی نہیں بخشا جائے گا۔

خیر پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ کیا کہا، میری زندگی یعنی راجہ مہدی علی خاں بھائیہ کی زندگی میں ایسا کون سا واقعہ پیش آیا جس نے اسے مزاح نگاری کی طرف مائل کیا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ میرے مزاح کا انڈا آنسوؤں کی مرغی نے دیا ہے اور تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ہزاروں سال پہلے میں اور میرا پھوپی زاد بھائی راجہ فاروق علی خاں جو پچھلے دنوں لاہور ریڈیو اسٹیشن میں بچوں اور عورتوں کے پروگرام کا انچارج تھا اور اب شاید کالے پانی چلا گیا ہے، مشن ہائی اسکول وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ کے ماسٹروں سے پٹ پٹا کر اور پونے دو میل پیدل چل کر اپنے گاؤں میں واپس آرہے تھے کہ گاؤں کی قریبی سڑک پر میری پھوپی زاد بہن دوڑتی ہانپتی کانپتی آئی اور کہنے لگی۔ "آج آپ لوگوں کی خیر نہیں۔ دونوں ماموں جان چھڑیاں لے کر آپ کے خیر مقدم کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔" میں نے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیوں ہم سے کیا خطا سرزد ہو گئی؟" وہ بولی۔ "کل آپ ایک ایک چاقو لے کر بھائی میراں بخش کے کھیت میں جا گھسے تھے نا؟ آپ کو پکے ہوئے تربوزوں کی تلاش تھی۔ اس تلاش میں آپ نے کوئی دو سو تربوزوں کا پوسٹ مارٹم کر ڈالا۔ سب کچے نکلے۔ آپ لوگوں نے کچھ پھینکے اور کچھ کھائے۔ بھائی میراں بخش چھپ کر آپ کی یہ حرکت دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے آج صبح آپ کی رپورٹ کردی ہے اور بزرگوں کا دماغ اس وقت ساتویں آسمان پر ہے۔ وہ ٹک ٹک کرتی ہوئی دو گھڑیاں سامنے رکھے آپ کے انتظار میں بہت بیتابی سے گھڑیاں گن رہے ہیں۔" ہم لوگ دھک دھک کرتے دلوں کو تھام کر "جل تو جلال تو، قدرت کمال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرتے ہوئے بستے بغل میں دبائے اور سروں کو ندامت سے جھکائے گھر کے وسیع و عریض آنگن میں پہنچ گئے۔ لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آگے بڑھے، تو دو گرج دار آوازیں ایک ساتھ گونجیں "ٹھہر جاؤ!"۔

اور ہم لوگ وہیں پتھر ہوگئے۔ پھر ان بزرگوں نے ہم پر بجلی کی طرح اس زور سے کڑکنا شروع کیا کہ پہلے تو پکی دیواروں کا پلستر اڑ کر زمین پر گر گیا اس کے بعد سانپ، بچھو اور چھپکلیاں ڈر کر بھاگ گئے۔ پرندے شاخوں سے اڑ گئے اور چیونٹیاں بے ہوش ہو گئیں یا مر گئیں۔

"بستے میز پر رکھ دو!"

دوسرا حکم سنایا گیا۔
اور جب ہم نے بستے میز پر رکھ دیئے تو ٹرائل کے طور پر ہمیں پانچ پانچ تھپڑ رسید کئے گئے۔ یہ گرجدار آواز سن کر گاؤں کے بچے او عورتیں تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے۔ خدا کا شکر ہے کہ گاؤں کے مرد اس وقت کھیتوں میں تھے۔ ان لوگوں یعنی عورتوں اور بچوں دیکھ کر ہماری روح فنا ہوگئی۔ بچے بند کمروں میں پٹنے کا صدمہ تو برداشت کر سکتے ہیں لیکن بر سرعام پیٹے جانے کی انسلٹ گوارا نہیں کر سکتے۔ میں دل میں سوچا، راجہ مہدی علی خاں آج تو پٹ گیا تیری عزت کا دیوالہ!
میاں نریش کمار شاد! اگر تو پورے طور پر بور نہیں ہوا تو آگے سن۔ گھر کے وسیع و عریض آنگن کے ایک کونے میں درختوں کے بڑے بڑے خشک ٹہنے پتوں سمیت ایک ڈھیر کی صورت میں رکھے تھے۔ انھیں کلہاڑیوں سے کاٹ کاٹ کر چولھے میں ایندھن کے طور پر جلایا جاتا تھا۔ ان ستم ظریف بزرگوں نے درختوں کے وہ چار چار پانچ پانچ ٹہنے رسیوں کی مدد سے ہماری کمر کے ساتھ باندھ کر ہمیں ہندوستان کا نمائندہ پرندہ یعنی مور بنایا۔ اور حکم دیا کہ دوڑ دوڑ کر آنگن کے گیارہ راؤنڈ لگاؤ۔ جب ہم نے عورتوں اور بچوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر ذرا پس و پیش کی تو لاتوں، مکوں اور گالیوں سے ہماری تواضع شروع ہوگئی اور مجبوراً ہمیں حکم کی تعمیل کرنی پڑی عورتیں اور بچے یہ دلچسپ منظر دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ اور ہم مارے شرم کے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ فاروق علی خاں دل کے ذرا کمزور اور نسبتاً شریف آدمی تھے۔ عمر میں بھی مجھ سے ایک دو سال چھوٹے تھے۔ وہ مور بن کر دوڑ تو رہے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ چیخیں مار مار کر روتے بھی جاتے تھے۔ لیکن میں نے سوچا، راجہ مہدی علی خاں، اپنی خفت مٹانے اور بے عزتی کا اثر دور کرنے کے لئے یہ مناسب ہے کہ ہر چوٹ اور بے عزتی پر صبر کرو۔ آنسو نوش فرما جاؤ۔ ہر کئے پر یا چھڑی کے ہر وار پر فاروق علی خاں کی طرح "ہائے میں مرا" کہنے کی بجائے ناچو اور قہقہے لگاؤ۔ چنانچہ میں نے خوب قہقہے لگائے اور "آنگن میں مور ناچیں، آنگن میں چور ناچیں" گاتا رہا۔ حالانکہ دل آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ اس مقام پر تجھے یہ خیال رہے کہ اس عمر میں بھی میں نے مور اور چور کے قوافی کی پابندی سے اپنے فطری شاعر ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ گو میں اپنی اس ڈھٹائی پر فاروق علی خاں کی نسبت بہت زیادہ پٹ گیا۔ لیکن آخر میں میرے اس مسخرے پن پر خود بزرگوں کو ہنسی آگئی اور ہم بخش دیئے گئے۔
کیا؟ میری یعنی پنڈت راجہ مہدی علی خاں کی سب سے پہلی نظم؟ ہاں سب سے پہلی نظم بھی اسی مزے دار حادثے کی دین ہے جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت میری عمر تیرہ یا چودہ برس کی ہوگی۔ اس حادثے سے متاثر ہو کر اپنے بزرگوں سے خطاب کرتے ہوئے فوراً ایک نظم لکھنے کی ٹھان لی۔ اور اپنا یہ شاہکار مکمل کرنے کے بعد میں بزرگوں کو تو نہ سنا سکا البتہ اپنی پھوپی زاد بہن کو ضرور سنایا۔ اس نظم کا عنوان تھا "بزرگوں کے مظالم" اور یہ کچھ اس طرح شروع ہوتی تھی۔

بچوں پہ ظلم کرلو قیامت قریب ہے
اب حد سے تم گزر لو قیامت قریب ہے
اک دن فرشتے تم کو بھی پیٹیں گے گرز سے
یہ بات یاد کرلو قیامت قریب ہے
ہم کو لگے گی بھوک تو تربوز کھائیں گے
تم جاؤ بھوکوں مرلو قیامت قریب ہے

اور اسی نظم کے آخر میں میں میری شاعری قدرے آزاد ہوگئی تھی۔ اور اسے میں نے کچھ اس طرح ختم کیا تھا۔

یوں پیٹ پیٹ ہم کو بنایا ہے تم نے مور
یوں آسماں کے نیچے مچایا ہے تم نے شور
دنیا کے سامنے کہا ہم کو حرام خور
تربوز کھائیں گے ابھی ہم تو نہیں ہیں چور
پیروں پہ سر کو دھر لو قیامت قریب ہے

میں نے اپنے لئے کوئی تخلص کیوں نہیں تجویز کیا؟ کون کہتا ہے نہیں کیا۔ بچپن میں رسوا کیا تھا۔ لیکن بزرگ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو غنڈا ہے۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ فقروں سے جب میرا دل زخمی ہونے لگا تو میں نے گھائل تخلص رکھ لیا۔ والد صاحب جو خود بھی بغیر تخلص کے شاعر تھے یہ کہہ کر میرے اس نئے تخلص کی کھلی اڑانے لگے۔ "راجہ جی گھائل ہوگئے ہیں انھیں ہسپتال پہنچانا چاہئے!"

میں نے تنگ آکر ایک دن مسرور تخلص رکھ لیا۔ لیکن اسی دن ایک بزرگ نے مجھے پیٹ ڈالا۔ اور میں نے غصہ میں آکر اپنا تخلص غمگین رکھ لیا۔ دو مہینے تک میرا تخلص غمگین ہی رہا۔ ایک دن دوستوں نے مذاق اڑایا کہ جس شاعر کا تخلص ہی غمگین ہو وہ مزاحیہ نظمیں کیسے لکھ سکتا ہے۔ غصہ میں آکر میں نے قسم کھالی کہ اب کوئی تخلص نہیں رکھوں گا۔ جب سے بے تخلص ہی چلا آرہا ہوں۔ اب سوچ رہا ہوں کہ اپنا نام بدل کر نریش کمار رکھ لوں بنا بنایا تخلص شاد مفت میں ہاتھ آجائے گا۔ اور لوگ سمجھیں گے کہ نریش کمار شاد کے تمام اشعار میرے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ تیری دل شکنی ہوگی۔ اس لئے:

جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

واہ حافظ قرآن مسٹر نریش کمار شاد ملیح آبادی کتنا شرمناک سوال کیا ہے تو نے کہ اگر میں مزاح نگار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ..... میرے خیال میں مداری ہوتا۔ کیا کہا، وہ تو میں اب بھی ہوں۔ کہاں یار! یہ تو محض تیری ذرہ نوازی ہے ورنہ یہ بے زبان و ناتواں راجہ مہدی علی خاں ملہوترہ کس قابل ہے۔

میں کن کن ملکی اور غیر ملکی مزاح نگاروں سے شعوری طور پر متاثر ہوا؟ یہ راز کی بات سننا ہی چاہتا ہے تو سن۔ غیر ملکی مزاح نگاروں میں فیض احمد فیض ن۔ م راشد۔ تصدق حسین خالد۔ قرۃالعین حیدر وغیرہ سے اور ملکی مزاح نگاروں میں ان غیر ملکیوں سے جنھیں پڑھ پڑھ کر ہمارے ادیب غیر ملکی بن گئے:

ہائے کیا کیا بستیاں وہ تھیں کہ ویراں ہوگئیں!

نہیں میری جان! تجھے مغالطہ ہوگیا ہے۔ میں انتہائی سنجیدگی سے تیرے ہر سوال کا جواب سچ سچ دے رہا ہوں۔ اپنے ہم عصر مزاح نگاروں میں مجھے کون کون سے مزاح نگار پسند ہیں؟ بہت سے پسند ہیں، مثلاً مردوں میں کنھیالال کپور اور کنھیالال کپور اور کنھیالال کپور۔ عورتوں میں صفیہ سلیمان اریب اور صفیہ سلیمان اریب۔ البتہ شاعروں میں نسبتاً کم لوگ پسند ہیں جیسے جعفری واہی اور دلدار فگار۔

میری بہترین مزاحیہ تخلیق کون سی ہے اور اس کی تخلیق کن حالات میں ہوئی۔ اب تو پھر کہے گا کہ میں غیر سنجیدہ ہوگیا ہوں۔ اور مذاق کررہا ہوں۔ حالانکہ خدا کی قسم حقیقت یہ ہے کہ میری بہترین مزاحیہ تخلیق ابھی کوئی نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے میری بہترین مزاحیہ تخلیق میرے مرنے کے بعد جنم لے۔ مثلاً میرے مرنے کے بعد جب منکر نکیر میرے گناہوں کا اکاؤنٹ پوچھنے میری قبر کے اندر

تشریف لائیں تو میری ان سے کچھ ایسی تو تو، میں میں، ہو جائے کہ وہ ہنستے ہنستے یا روتے روتے ادب عالیہ سمجھ کر اسے نوٹ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ یا بہت ممکن ہے بروز حشر اللہ میاں کے دربار میں کچھ فی البدیہہ اشعار کہہ ڈالوں جن کا درجہ مزاح بہت بلند ہو۔ یا میں جا کر دوزخیوں کے حقوق مانگنے کے سلسلے میں کوئی بے نظیر مزاحیہ نظم لکھ ڈالوں۔ ابھی تک تو مجھے اپنی تمام مزاحیہ نظمیں بکو معلوم ہو رہی ہیں۔

بڑا خطرناک آدمی ہے تو میرے یار! جو مجھ سے ایسا خوفناک سوال پوچھ رہا ہے کہ میرے سیاسی نظریات کیا ہیں۔ کیا تو مجھے کرا کے میری جائداد پر خود قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر میں اگر یہ کہوں کہ کمیونسٹ ہوں تو کانگریسی حضرات تھو تھو کریں گے۔ اور کی پبلک مجھے پیٹ ڈالے گی۔ اور اگر کہوں کہ کانگریسی ہوں تو خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی ا اور راجگوپال آچاریہ میرا حقہ پانی بند کر دیں گے۔ رہا سوشلزم، تو وہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک موچی سے پوچھا تو اس بتانے سے انکار کر دیا۔

تیرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا اردو کی مزاحیہ شاعری اس قابل ہے کہ اسے متمدن ممالک کی مزاحیہ شاعری کے مقا میں پیش کیا جا سکے؟ مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر کچھ عرصہ انتظار کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

عجیب بوگس آدمی ہے تو بھی میرے یار! مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان اور اردو شاعری کا مستقبل کیا۔ مستقبل کا حال بھلا خدا کے سوا کسی کو معلوم ہو سکتا ہے؟ خود میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں ہندوستان کے نامور جوتشیو رائیں طلب کی تھیں، سب غلط ثابت ہوئیں۔ ایک نامی گرامی جوتشی نے کہا تھا کہ فلاں سن کے فلاں مہینے میں آپ کے بینک اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ روپے ہوں گے۔ لیکن جب فلاں سال کا فلاں مہینہ آیا تو میرے بنک میں صرف پندرہ روپے تھے۔ میں ا زبان کے بارے میں کوئی پیش گوئی کیونکر کر سکتا ہوں جبکہ میں معمولی جوتشی بھی نہیں۔ تاہم جوتش کی زبان میں مجھے اردو ستارے بیک وقت بلندی اور پستی میں دکھائی دے رہے ہیں میرا خیال ہے کہ آئندہ نسلوں کی زبان پر اردو ہوگی لیکن وہ اردو الخط سے نا آشنا ہوگی۔

یہ کیا سوال ہوا کہ ہمارا نظریہ ادب کیا ہونا چاہئے۔ اے بندہ خدا! گولی مار نظریہ ادب کو اور مجھ سے یہ پوچھ کہ نظریہ ادیباں کہ چاہئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ادیب حضرات زندگی کے بارے میں اپنے نظریات فوراً تبدیل کر لیں۔ ہمارے یہاں اد کوئی وقعت نہیں۔ ان کی تحریروں کی کوئی قیمت نہیں۔ قدرت کا نظریہ یہ ہے کہ شاہکاروں کی تخلیق کرتے جاؤ اور بھوکے مرو۔ کہتا ہوں کہ للہ ادبا اور شعرا لکھنا بند کر دو اور اپنے اور اپنے بال بچوں کے گزارے کی کوئی صورت نکالو۔ اس سلسلے میں تجاویز بھی ہیں۔ مثلاً کیوں نہ جوش ملیح آبادی گنڈیریاں بیچیں۔ شاہد احمد صدیقی ایڈیٹر رسالہ ساقی نان کباب کی دکان کھول لیں بجا دانش تعلیمی بالغاں کا کام کریں۔ نذیر کا صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی موچی بن جائیں۔ مولانا صلاح الدین ایڈیٹر ادبی دنیا [illegible] بن جائیں۔ [illegible] کھول لیں۔ عصمت چغتائی گھر میں بیڑیاں بنا کر بیچیں۔ واجدہ تبسم [illegible] کا کام کریں۔ کرشن چندر، بندر نچائیں۔ مندر ناتھ [illegible] سے جوتیاں چوری کریں اور [illegible]

شاعروں سے انٹرویو لینے کی بجائے بوٹ پالش کیا کرے ۔میں نے پچھلے دنوں اپنا مجموعہ کلام بیچنے کی کوشش کی، نہ بکا تو تنگ آ کر فیصلہ کرلیا کہ کتوں کا کاروبار کروں۔ چنانچہ آج کل کتے بیچتا ہوں اور خوشحال ہوں۔

ایک سوال اور ، تو کیا ان سوالوں کے جوابات سے تیری طبیعت صاف نہیں ہوئی ؟ خیر کوئی حسرت تیرے دل میں نہ رہ جائے۔ پوچھ لے اور بھی جو پوچھنا ہے پوچھ لے ۔کیا برا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے ؟اس سلسلے میں میرا تجربہ کیا ہے ؟میرا تجربہ تو کچھ خوشگوار نہیں میرے دوست میں نے بہت سے اچھے ادیبوں کو اپنی طرح خطرناک حد تک سنگدل، گمراہ اور دروغ گو پایا ہے ۔ عموماً ملاؤں، حاجیوں اور پنڈتوں کی طرح اچھے ادیبوں کے بھی کھانے کے دانت اور ہوتے ہیں، دکھانے کے اور! ☆☆

قومی محاذ کا خصوصی شمارہ

- ادب، صحافت میں آزادی فکر و خیال کا ترجمان۔
- جس کے اداریے گزشتہ 33 برسوں میں معتبر و باوقار اردو اخبارات میں نقل اور ہندی، مرہٹی و انگریزی اخبارات و رسائل میں ترجمہ ہوتے رہے ہیں۔
- حق گوئی و بیباکی کی ایک دیرینہ روایت۔
- قومی محاذ اورنگ آباد کا خصوصی شمارہ شائع ہوچکا ہے ۔
- رسم اجراء بدست جناب زاہد علی خاں مدیر سیاست۔ حیدر آباد
- خصوصی شمارے کے چند اہم اہل قلم:
- کالی داس رضا گپتا، شردن کمار ورما، اقبال متین، وسیم عباس اور سکینہ وسیم عباس بوسٹن (امریکہ) رشید الدین، محسن علی، ابراہیم اشک، محمد اسلم، سنیل کماہرا، سید ظفر ہاشمی، خواجہ سمیع اللہ، سید اختر الاسلام، اوشا بھدوریہ، زہرہ جمالی، ڈاکٹر صغرا عالم، علیم صبا نویدی، قاسم ندیم، ڈاکٹر مرتضی راہی، شمیم حنفی، اندر سروپ سریواستو، صلاح الدین نیر، محسن جلگانوی، خواجہ شوق، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، ڈی مادھوی، کویتا کرن، جگناتھ آزاد، یوسف ناظم، ساحل احمد، شاغل ادیب، بیکل اتساہی، ناظم الدین صدیقی، ڈاکٹر دلداری قریشی اور عنوان چشتی۔
- مذہبیات اور سیاسیات کے تحت تازہ ترین حالات کا جائزہ۔
- قیمت خصوصی شمارہ (دو سو روپے)۔ڈھائی سو صفحات، رنگین سرورق
- قیمت سالانہ: تین سو روپے

ترسیل زر کا پتہ: ۳ بی ۔ایس بی ایچ کالونی، حمایت باغ، اورنگ آباد ۔۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹرا)۔

خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ باکس نمبر ۱۵ ۔اورنگ آباد (مہاراشٹرا)۔

م۔ آصف آردی
محلہ۔ برہ تبرا۔ آرہ۔ بہار

"ہیر ٹانک"

لکھ پتی بننے کا نسخہ آج کل آسان ہے
وہ کہاں بن پائے گا کم عقل جو انسان ہے
ناقص و مہمل بھی شئے بکتی ہے اب پرچار سے
خوب جم کر کیجئے ٹی وی سے اور اخبار سے
راکھ اور گوبر ملا کر کیجئے اسکو مہین
کامیابی کیلئے بس شرط ہے ہونا ذہین
باسیئے خوشبو سے اسکو ہو مگر وہ دل پسند
ہوگیا تیار سودا کیجئے ڈبے میں بند
نام ایسا رکھئے جو بھانڈا نہ پھوڑے جال کا
جس کا مطلب ہو یہی ہمدرد ہے یہ بال کا
اس کی شہرت کیلئے اب رہ گیا ہے ایک کام
یہ اگر ہوجائے تو اپنا بنالیں خواص و عام
یعنی شہرت یافتہ تھیٹر کی ہیروئن اگر
کہہ دے وہ اپنی زباں سے ایک جملہ مختصر
آپکا ڈبہ وہ لے کر ہاتھ میں اتنا کہے
بال میرے اتنے لمبے اور گھنے پہلے نہ تھے
اس "ہیر ٹانک" کی میں جس دن سے گردیدہ ہوئی
خوبصورت زلف میری دیدہ در دیدہ ہوئی
آپ میرے مشورہ پر کیجئے آصف یہ کام
چند برسوں میں کرینگے لوگ جھک جھک کر سلام

●☆●

"خواہ مخواہ"

چھیڑ خانی کا صلہ پا ہی گئے عاشق مزاج
بن گئی سینڈل سے رستے میں حجامت خواہ مخواہ
سوئے تھے اہل سیاست ہورہا تھا جب فساد
زخم دل کی آئے اب کرنے عیادت خواہ مخواہ
دیکھ کر خوراک میری میزباں نے یہ کہا
پھنس گئے ہیں آپ کو ہم دے کے دعوت خواہ مخواہ
لوگ اس سے بھی کریں گے تنگ کل پوشاک کو
آج کے فیشن پہ کرتے ہیں ملامت خواہ مخواہ
یہ تو مانا نوکری اک خواب ہے میرے پسر
علم کی تحصیل پھر بھی تم کہو مت خواہ مخواہ
کیجئے برداشت بس سارے محکموں کا ستم
کرنی ہے اسکی حکومت سے شکایت خواہ مخواہ
پڑھ کے کیا بخشوگے بیٹے دین سے رشتہ نہ جب
پوچھتے ہو ہے کہاں دادا کی تربت خواہ مخواہ
ہے جبیں سجدے میں لیکن دل مرا دنیا پرست
مختصر آصف کہ ہے ایسی عبادت خواہ مخواہ

●☆●

غزل

فرید سحرؔ (نرسا پور)

ہر کوئی مجھ سے یہاں پر ان دنوں بیزار ہے — پا کے شہرت زندہ رہنا کس قدر دشو
میر و غالب سے تو بڑھکر ہو نہیں سکتا کوئی — اپنی عظمت سے بھی ہم کو کب کہاں انز
اونٹ جیسا قد ہے ان کا اور میں ہوں ایں قدر — ایک گنبد ہوں اگر ہیں وہ قطب
آنکھ سے آنسو تو ان کی اس طرح بہنے لگے — گویا ان کی چشم تر بھی جھیل شالیما
آگے آگے بیوی ہے اور پیچھے میری محبوبہ — کھائی پیچھے ہے مرے تو سامنے منجدھ
اب دہی لیڈر یہاں پر معرفد ہے اے سحرؔ — جو جہاں میں ہر طرح سے چالو اور مکا

یوسف امتیاز ٹورانٹو (کینیڈا)

جانے کہاں گئے وہ دن

کسی بھی بزنس اور کاروبار کا چاہے وہ کچھ بھی ہو اہم ستون سروس ہے ۔ اگر سروس اچھی نہ ہو تو پروڈکٹ چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو کامیابی کی منزلیں طے نہیں کر سکتا ۔ مغربی دنیا اپنی سروس کے لئے مشہور ہے ۔ گاہک کو موہ لینے کے لئے آنکھیں بچھا دینا سنتے آئے ہیں ۔ قدیم زمانے میں ایسا اگر ہوتا تھا تو ہوگا مگر موجودہ سائنسی ترقیات ، ٹیلی کمیونکشن اور آٹو مشین کی آئے دن یلغار کمپنیوں اور کاروبار کی تنظیم نو RESTRUCTURING کے نام پر نام نہاد تیز اور بہتر سروس جو بھی گاہکوں کو مل رہی ہے وہ ایک شدید درد سر ہے ۔ خون کا دباؤ تیز کر دیتی ہے ۔ اچھے بھلے خاموش صابر انسان سے نہ صرف اس کے صبر کا امتحان لیتی ہے بلکہ بعض اوقات تو خون کے آنسو رلا دیتی ہے ۔ آج انٹرنیٹ ہے کل روبات ہم سفر ہونگے ۔

دور جانے کی ضرورت نہیں ہے اپنے ہی گھر میں آئے دن جو بن بلائی ناگہانی بلائیں نازل ہوتی ہیں اور ایک ہی لمحے میں زندگی کا جمع کیا ہوا سرمایہ ایک ہی جھلک میں ختم کر وا دیتی ہیں ان ہی کو لے لیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شئے سروس جسکا نام ہے کدھر گئی ۔ ہندوستان پاکستان میں قدیم زمانے میں اتا کی دوکان پر اکثر یہ نعرہ لکھا ہوتا تھا ۔ "آپ کی تسلی ہماری کامیابی ہے "۔ دوسری دوکانوں پر مختلف نعروں کی دلچسپ تختیاں پڑھنے اور مسکرانے کو ملتی تھیں "آپ کا اطمینان ہماری ضمانت ہے ۔ تسلی نہ ہونے پر دام واپس "۔ بہترین سروس واجبی دام ۔ گاہک ایک نعمت ہے غیر نہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اب ایسی تختیاں اور نعرے دوکانوں سے ہٹا دیئے گئے ہیں نہ کسی پروڈکٹ پر پڑھنے کو جھوٹ موٹ کوئی تحریر ملتی نہیں ہے ۔ اگر گھر کا ڈش داشر خراب ہوگیا اور ڈرائر تھک گیا ہو ۔ کریڈٹ کمپنی کے حساب کتاب میں Over Billing ۔ پانی اور بجلی کی کمپنی نے آپ کا چیک گم کر دیا گھر کی چھت برف باری اور طوفانی بارش سے ٹپکنے لگے یا نئی چھت کی ضرورت ہو ۔ ابھی ان سے چھٹکارا پایا ہی نہیں تھا کہ گھر کے پائپ پھٹ گئے اور سارا گھر سیلاب زادہ ہو جائے گھر کا دیوان خانہ چھوٹی موٹی جھیل کا نمونہ بن جائے ۔ ایرکنڈیشن عین گرمیوں میں کام کرنا بند کر دے ۔ سردیوں میں گھر کا ہیٹر Heater ساتھ چھوڑ دے ۔ یہ مسائل آئے دن آپ کے آگے کھڑے ہیں ۔ صحت خراب ہوگئی ۔ فلو اور کھانسی تنگ کرنے لگے ۔ بچوں کو چوٹ آگئی ۔ بیوی سیڑھیوں سے گر پڑی ۔ ان ساری مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بے بسی میں خواہ مخواہ گاہکوں کو سروس کا خیال آجاتا ہے ۔ کسٹمرز سروس صرف نام ہے جو کبھی تھا ۔ اس اہم نعرے پر خوب زور دار تقریر مباحثے ، مضامین ، نعرے لگائے گئے ۔ گاہک پہلے Customer First ۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ نعرہ جیسے منہ چڑائے اور ناک پر انگوٹھا رکھ کر نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ منہ چڑاتا نظر آتا ہے ۔

وہ رات جب واشنگ مشین کا ہوز Hose ٹوٹ گیا اور گھر کا تہہ خانہ Basement پانی سے لبریز ہوگیا تو فطری ردعمل یہی ہے کہ پلمبر plumber کو کال کیا جائے ۔ چونکہ اب رات کا ایک بج چکا ہے اس لئے بات صبح پر ٹھیری لیکن اگر ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے ٹیلی فون کی کتاب کے زرد صفحات Yellow Pages کی انگلیوں سے چہل قدمی کی جائے تو اطمینان ہوتا ہے کہ کتاب کے کئی صفحات ایسے اشتہارات سے بھرے پڑے ہیں جو " چوبیس گھنٹے سروس اور ہم ایمرجنسی میں مہارت رکھتے ہیں " کے

جلی حروف سے بھرے پڑے ہیں جب نمبر ڈائیل کرنے کی باری آئی تو پتہ چلا کہ کئی ٹیلی فون کوئی اٹھاتا ہی نہیں۔ جو بھی ٹیلی فون پر جواب دیتا ہے تو نہایت غصیلی، نیند سے بھرپور آواز میں جواب دیتا ہے کہ یہ سروس صرف کمرشیل اداروں کے لئے ہے۔ ہم آپ کے شہر کے اس حصے میں سروس نہیں کرتے۔ بعض کے پاس جواب دینے والی آواز Answering Service کی اور جواب ملا کہ کوئی آپ کو جلد ہی کال کریگا۔ ایسی کال کا انتظار ہی انتظار ہے وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوجائے۔ جواب نہ دارد۔ اگر کا ڈش واشر نیا ہے جس پر گارنٹی اور وارنٹی کے شاندار کاغذات موجود ہیں تو اس کمپنی کو فون کیا جسکی سروس نیشنل ہے۔ مس پیش کیا کہ ڈش واشنگ مشین سے پانی بہہ رہا ہے اور گھر کے رسوئی گھر کا فرش خراب ہورہا ہے تو اس نیشنل کمپنی نے کئی د کا ڈش کے بعد ڈش واشر لگانے والی کمپنی کے ایک کاریگر کو بھیجا۔ مگر اس کاریگر کی آمد آمد تک پتہ چلا کہ آپ نے ملک کے تقر حصہ اس کمپنی کو فون کیا تھا۔ گھنٹوں دنوں ضائع ہوئے اور ایک ڈپارٹمنٹ سے دوسرے ڈپارٹمنٹ کو یا شہر کے مختلف حصوں لائن کو کنکٹ connect کرنے کے بعد کئی بیہودہ، بدتمیز، بداخلاق آدمیوں سے نشان ملامت بنے الٹی سیدھی ہدایتیں تقریریں زہے نصیب کہ اس نیشنل کمپنی نے ایک کارندے کو آخر کار معاینے کے لئے بھیجا جو خرانٹ ثابت ہوا۔ اوپر سے دیکھا نیچے سے پھر ایک ماہرانہ اعلان کیا کہ میں تو ایک ٹیکنیشین Technician ہوں اور مشین کا مسلہ انسولیشن Insulation کا ہے میدان نہیں ہے۔ یہ انکشاف وہی ہے جو ہزاروں ٹیلی فون کالوں میں پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ سونے پر سہاگہ اس ماہر فن نے اپنی تش آوری کا ایک بل بھی پیش کر دیا۔ یہ آخری کیل تھی آخر کار خود ہی قریبی پلمبر کو دعوت معاینہ دی اور پیسے بھی خود ادا کردئے گ درستگی اور مزدوری میں وہ شکایات اور ماہرانہ باتیں بھی سننے کو ملیں کہ سابقہ کام انتہائی بچکانہ، غیر ماہرانہ اور تیسرے چوتھے د کا نمونہ تھا۔

اب واٹر بل کی کہانی بھی سن لیجے جو اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ اس بل کی کہانی ہے جو کبھی کا ادا کیا جاچکا تھا مگر کمپنی وا کہنا تھا کہ ادا نہیں کیا گیا۔ جب فون کیا گیا تو کمپنی نے بنک اسٹیٹمنٹ Bank Statement مانگا جس میں ادائیگی کا اندراج بھیج دیا گیا مگر آئندہ آنے والے بل میں بقایا پھر بھی برقرار تھا فون کیا تو جواب ملا کہ بنک کا اسٹیٹمنٹ ہی بھیج دینا کافی نہیں کینسل چیک بھیجو۔ بنک کو کال کیا کینسل چیک آیا پھر واٹر کمپنی کو کال کیا سارا غصہ ہم پر اترا کہ ہم نے کینسل چیک کی کاپی نہیں رکھی پھر پتہ چلا کہ پیسے ادا کئے گئے تھے مگر کمپنی کو ایک چیک کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہم کو کریڈٹ کر سکے۔ دوسرے دن آتی ہے کہ گھر کا پانی کٹ کر دیا جائے گا اب ہم اس جگہ پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ دنیا گول ہے۔

پھر اس کریڈیٹ کارڈ کمپنی کی بلنگ کا کیا کہنا جسے ایک رسٹورانٹ میں کھانے کی دو بار بلنگ کی تھی۔ گیس کمپنی نے ریڈنگ کو کہیں گم کر دیا۔ پھر ٹیلی فون کا چکر چل پڑا۔ گھر کی مارٹگیج کمپنی کی اکاؤنٹنگ کا کیا ذکر جس نے ٹیکس کا بل ادا کر۔ قلابازی کھائی اور ادا کرنا بھول گئی۔ شکر خدا کا کہ آخر کار کمپنی نے ٹیکس ادا کیا۔ سمجھا جان بچی لاکھوں پائے مگر ٹیکس ڈپارٹمنٹ تلاش کر رہا ہے۔ نہ جانے کہاں کھو گیا۔ چلئے اگر چیک مل بھی گیا تو ٹیکس ڈپارٹمنٹ کا مسئلہ یہ ہے کہ مارٹگیج کمپنی نے ادائیگی تو کی کہ انہوں نے زمین کی قیمت کا ٹیکس فراموش کر دیا۔

مفت کی ہراسانی، پریشانی، درد سر ہر قدم پر ہے کیونکہ تسلی اطمینان جیسی کوئی چیز اب باقی ہی نہیں رہی دراصل نعرہ تو چاہیے کہ "کسٹمر ہمیشہ غلط ہے اور ہم ہمیشہ صحیح" یہی موجودہ کاروبار کی پالیسی اور ردکردہ اصول تھا جسکو اب اسکی اصل جگہ پر ہے۔ آج کل ٹیلی فون اور ٹیلی کمیونیکشن کی بدولت اس سروس کی جتنی بھی تعریف ہو کم ہے۔

جو ۸۰۰ ۔ اکی ڈائیلنگ ہے ۔ اس بات کی پوری ضمانت ہے کہ دیر گئے تک آپ ٹیلی فون کان سے لگائے بیٹھے رہیں گے پھر پتہ چلے گا یہ سروس نمبر ملک سے باہر یا شہر یا صوبے سے باہر ہے ۔ یہ سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں کہ آپ کی کال ہمارے لئے بہت اہم ہے ۔ ہمارے آپریٹرز مصروف ہیں ۔ آپ کے صبر کا شکریہ ۔ بلاشرط یہ طے ہے کہ آپ کی کال ایک خرانٹ سے دوسرے خرانٹ کو ٹرانسفر کردی جائیگی پھر آپ ہر دم نہ ختم ہونے والے اس سلسلے کو سنیں گے جس میں کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز کے لئے آپ ایک پریس کریں ۔ دو یا تین ۔ اپنا بلنگ نمبر بتلائیں اپنے نام کے پہلے چار حرف ۔ سوشیل سیکورٹی نمبر ۔ تنگ آکر کئی گھنٹے ضائع کرنے کے بعد نتیجہ صفر رہا تو آپریٹر سے منت کی کہ وہ باس Boss سے بات کروائے ۔ کیا باس تک آپ کی رسائی اور بات ہوئی یہ ایک الگ سوالیہ نشان ہے ۔ آپ کے پاس کتنا وقت ہے ۔ کتنا صبر ہے ۔ آپ کے پاس وقت کی کتنی قیمت ہے ۔ کتنی دیر تک آپ انصاف کی تلاش میں اپنے کو تار تار کرنے کے لئے راضی ہیں ۔

موجودہ سائنسی ترقیات ، آٹومیشن اور ری اسٹرکچرنگ Restructuring کی اس دنیا میں اس سروس اکانومی Service Economy کو برداشت کرسکتے ہیں ؟ کب تک حیات رہ سکتے ہیں کب تک سانس باقی ہے ۔ اس کا جواب کسی لقمان کے پاس نہیں ہے صرف آپ کے پاس ہے ۔ باقی صرف ایک سرد آہ ہے اور یہ کہ جانے کہاں گئے وہ دن ! ۔ ☆

شجاع عاطف
(آسٹریلیا)

"دھی بڑے"

ایک ٹھیلے کے بازو کھڑے
کھایا کرتے تھے ہم شوق سے دھی بڑے
ہم نے کھایا انہیں دن میں اور رات میں
گھر میں فٹ پاتھ میں
مفلسوں نے ، غریبوں نے کھایا انہیں
کچھ رئیسوں ، نوابوں نے کھایا انہیں
خوب کھایا انہیں ، خوب بھایا انہیں
ایک ٹھیلے کے بازو کھڑے
کھایا کرتے تھے ہم شوق سے دھی بڑے
یہ بتا چارہ گر ، تیری زنبیل میں
ضبطِ تحویل میں ، جوشِ ترسیل میں
دھی بڑوں کے بنانے کا نسخہ بھی ہے
ان کو کھانے ترے پاس پیسہ بھی ہے
ایک ٹھیلے کے بازو کھڑے .....
یہ بتا دھی بڑے ، اپنی تقدیر میں
گھر کی کفگیر میں
دھی بڑوں سے ہماری ضیافت بھی ہے ؟
مرچیوں سے ہماری وہ دعوت بھی ہے ؟
ایک ٹھیلے کے بازو کھڑے
کھایا کرتے تھے ہم شوق سے دھی بڑے

●☆●

غزلیں

فائیر سروس بجھانہ پائی ہے — آگ جو آپ نے لگائی
لگ رہے ہیں پرندِ بے پر آپ — یہ حجامت کہاں بنائی
وہ جسے کہہ رہے تھے تم نوکر — وہ حقیقت میں گھر جنوائی
وہ کہے گا اسے فسانہ پر — ہم نے سچی کتھا سنائی
وہ ملنسار ہے مگر عاطف — اب تمہاری نہیں برائی

●☆●☆●☆●

ہزاروں جتھیاں ایسی کہ ہر جھٹی پہ دم نکلے
کبھی گالی ، کبھی دھمکی ، کبھی کاغذ کے بم نکلے

سنا تھا جیل جاکر مضمحل ہوجاتے ہیں قیدی
وہاں سے بھی مگر ، لیڈر ہمارے تازہ دم نکلے

سیاست میں نہیں ہے فرق ملنے یا بچھڑنے کا
اسی جتھے سے کولیشن بناؤ جس سے ہم نکلے

غنیمت جان کر ہم نے خریدی جائیداد اک دن
مگر اس میں وراثت کے ہزاروں پیچ و خم نکلے

جسے حزب مخالف کی شرارت ہم سمجھتے تھے
حقیقت میں وہ اپنوں ہی کے سب رحم و کرم نکلے

کسی نے کوئی رشوت لی ، نہ کی بخشش طلب عاطف
بہت بے آبرو ہو کر ، ترے دفتر سے ہم نکلے

●☆●

شکیل شاہ جہاں
کامٹی (ناگپور)

میں کیوں لکھتا ہوں؟

مرزا کمرے میں داخل ہوئے اور ہم کو لکھتے ہوئے دیکھ کر جل ہی تو گئے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ ہم پر برس پڑے .... اماں، یہ کیا، ہر وقت لکھتے ہی رہتے ہو۔ آخر لکھنے سے ملتا کیا ہے اور اگر لکھتے ہو تو کوئی پڑھتا بھی ہے کہ بس سفید کاغذ کو سیاہ کرتے ہو۔

"مرزا... لکھنے سے دل کو سکون ملتا ہے"۔ ہم نے جواب دیا

"اماں! کیا خاک سکون ملتا ہے۔ دل کی بھڑاس کاغذ پر نکالتے ہو اور یہ امید کرتے ہو کہ لوگ تمہاری تحریر کو پڑھیں گے۔ اماں، اپنے سکون کے لئے سفید کاغذ کو سیاہ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اتنا کچھ ابھی تک تم نے لکھا ہے۔ تم کو کتنا سکون ملا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اتنا لکھنے کے بعد تم کو بستی کا سب سے پرسکون شخص ہونا تھا۔ مگر اس کا الٹ ہے۔ تم تو بستی کی سب سے زیادہ بے چین شخصیت ہو"۔

"بے چین اس لئے ہوں مرزا .... جب تک میرا لکھا لوگ سمجھ نہ لیں۔ سماج کے فرسودہ رسم و رواج، کھوکھلی سیاست، یہ چاروں طرف پھیلا ہوا جھوٹ، یہ فریب یہ عیاری، یہ لوٹ مار، یہ ظلم، یہ استحصال، یہ نا انصافی، یہ سازشیں ختم نہیں ہوجاتیں۔ میں بے چین رہوں گا۔ میں لکھتا رہوں گا"۔

"اماں! وہ دن لد گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اماں، یہ انقلاب کی باتیں، یہ زمانے کو بدلنے کی باتیں۔ یہ جھوٹ فریب اور نا انصافی کے خلاف تم لکھتے رہ جاؤ گے کچھ ہونے ادنے والا نہیں۔ اماں، بس اتنی ہی غنیمت سمجھو کہ لوگ، تمہاری تحریر کو پڑھ لیتے ہیں ورنہ کس کو اتنی فرصت ہے کہ وہ سوچتا پھرے، تمہاری تحریروں سے متاثر ہو کر انقلاب کا نعرہ بلند کرے۔ یہ کوئی فرانس، اٹلی، جرمنی یا روس نہیں ہے۔ ہندوستان ہے۔ اب تو فرانس، اٹلی، جرمنی اور روس میں بھی یہ قلم انقلاب نہیں لاسکتا۔ اب انقلاب لانے کے لئے بندوق چاہئے، ٹینک چاہئے، میزائل چاہئے"۔

"مرزا یہ مت بھولو کہ قلم میں بہت طاقت ہوتی ہے"۔

"اماں! ہمارا تو تجربہ یہ کہتا ہے کہ آج جو سب سے کمزور چیز ہے۔ وہ قلم ہے، اب وہ قلمکار کہاں جو اپنے لکھے کو پتھر کی لکیر بنادیتے تھے۔ اب تو قلم بکتا ہے، قلم ناچتا ہے، قلم چمچہ گری کرتا ہے، جھوٹ اگلتا ہے، کھرے کو کھوٹا اور کھوٹے کو کھرا بنا کر پیش کرتا ہے۔ چند قلمکاروں کو چھوڑ دو جو سچ لکھتے ہیں سزا کاٹتے ہیں۔ مگر زیادہ تر ایسے قلمکار ہیں جو جھوٹ لکھتے ہیں مزہ مارتے ہیں۔ اور پھر یہ قلمکار جو کچھ لکھتے ہیں۔ کیا اپنی زندگی میں ویسے ہوتے ہیں۔ ہم نے کتنے قلمکار ایسے دیکھے ہیں جو اپنی تحریروں میں سچ بولنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ ظلم اور نا انصافی کے خلاف آواز اٹھانے کی بات کرتے ہیں اور بڑے بڑے نعرے اور اقوال سے صفحوں کے صفحے بھردیتے ہیں۔ مگر ان کی ذاتی زندگی میں وہ قدم قدم پر سمجھوتہ کرتے ہیں۔ کبھی ان کی نصیحتوں کا ذکر کرو تو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ وہ ایک موڈ تھا جب میں نے لکھا"۔

"مرزا.... اگر میں نہ لکھوں تو کیا کروں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہارے بچے بنیریٹن کے میلے کچیلے شرٹ پہنے بستی میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے شرٹ کا بٹن ٹاکو ان کی صاف صفائی اور پڑھائی لکھائی کا خیال رکھو۔ تمہارا مکان برسات میں ٹپکتا ہے ایک آدھ بار چڑھ کر اسے درست کردو۔ پھر یہ شکوہ نہیں رہے گا"۔

چھت مہینوں تک ٹپکتی رہ گئی

تمہاری بیوی بازار سبزی لانے جاتی ہے۔ تم خود چلے جاؤ۔ تمہارے اپنے بال بڑے اور کپڑے میلے ہوتے ہیں تم اس کو صاف کرلو۔ مکان کے ایک گوشے میں بیٹھے رہنے کے بجائے باہر نکلو اور لوگوں سے ملو اور ان کے دکھ درد کو بانٹو۔

"مرزا .... میں اپنی تحریروں کے ذریعے ہی تو لوگوں کے دکھ درد کو بانٹنا چاہتا ہوں"۔

"تحریروں کے ذریعے دکھ درد بانٹنا تو لفظوں کا گورکھ دھندا ہے۔ یاد رکھو لفظ ہر جگہ کام نہیں آتے۔ ایک بھوکے کو روٹی کے بجائے الفاظ پروسیں گے تو کیا اس کا پیٹ بھر جائے گا۔ صرف لفظوں سے تم دکھ درد نہیں بانٹ سکتے۔ اگر دکھ درد بانٹنا ہے تو اپنے لفظوں کے حصار سے باہر نکلو اور دیکھو کہ سماج میں کون کون دکھی ہے۔ ان کے دکھ اور متعلقہ ادارے کی دوری کو پاٹ دو۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ کتنے ایسے ان پڑھ اور گنوار لوگ ہیں جو کورٹ کچہری، دواخانے، پوسٹ آفس اور دوسرے سرکاری اداروں کے ارد گرد کاغذ اور فارم لئے بھٹکتے رہتے ہیں۔ اپنی قلمکاری ان کے کاغذ اور فارم پر دکھاؤ۔ انھیں پر کرو۔ راستہ دکھاؤ تاکہ ان کے کام آسان ہو جائیں۔ اس طرح دکھ بانٹ کر تم مسیحا بن سکتے ہو۔ سفید کاغذ سیاہ کرنے سے تم صرف قلمکار ہوگے۔ مصنف کہلاؤ گے، شاعر کہلاؤ گے، مسیحا نہیں"۔

"مرزا .... کیا کروں۔ لکھنا میری بابی ہے اور پھر مرزا .... لکھنے سے نام ہوتا ہے اور آج کل شہرت کون نہیں چاہتا"۔

"بجا فرمایا تم نے ... لکھنے سے نام ہوتا ہے اور شہرت ہر کوئی چاہتا ہے۔ مگر شہرت حاصل کرنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ یہ کیا کہ آدمی اپنے گھر میں اور اپنے شہر میں بدنام ہو اور سارا ملک اس کو داد دے اور اگر اسی کا نام شہرت ہے تو ایسی شہرت سے گمنامی بھلی۔

نظر نے کیا خوب کہا ہے:

وہیں کے لوگ مجھ سے بدگماں ہیں
نظر جس شہر میں مشہور ہوں میں

(نظر رشیدی کامٹوی)

آخر یہ شہرت کس کام کی۔ کیا اس سے تم کو پیسہ ملتا ہے۔ اماں! لتے بڑے بڑے اخبارات و رسائل میں لکھتے ہو۔ کیا تم کو معاوضہ ملتا ہے۔ ویسے بھی تم اس غریب زبان کے قلمکار ہو کہ اگر کبھی کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر سے معاوضہ طلب کرلو تو سزا کے مرتکب .... یعنی تمہاری تحریر اس اخبار یا رسالے میں چھپنا بند .... ہمیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنا وقت صرف کر کے لکھتے ہو۔ کاغذ قلم اور ڈاک خرچ الگ پھر بھی کوئی معاوضہ نہیں۔ بس نام ہوگیا اور تم خوش .... اور لوگوں کو بتاتے پھرو کہ دیکھو میری تحریر چھپ گئی۔ اس بتانے اور دکھانے کے چکر میں کتنے ہی لوگوں کو چائے پلانی پڑتی ہے۔ پان کھلانا پڑتا ہے۔ ہم نے یہی ایک پیشہ ایسا دیکھا ہے کہ جس میں وقت، محنت اور پیسہ لگانے کے باوجود کوئی ٹھوس چیز حاصل نہیں ہوتی۔ پھر بھی اگر تم لکھنا چاہو تو بھلا میں کون ہوں تمہارے ہاتھ کو پکڑنے والا۔ تمہارے قلم کو روکنے والا، تمہارے نظریات کو کچلنے والا" آخری جملہ مرزا نے قدرے غصے میں اور بلند آواز میں کہا .... اور تنتنا کر باہر چلے گئے .... اور میں سوچتا رہ گیا کہ آخر میں کس لئے لکھتا ہوں؟ ☆

جہاں قدر چغتائی
بھوپال

تو بھرو نہ اپنی ہی جھولیاں

کہتے ہیں محبت شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی۔اس طرح شعر بھی شعلہ ہوسکتا ہے اور شبنم بھی۔یہ ہنساتا بھی ہے۔یہ رلاتا بھی ہے۔
یک دفعہ کا ذکر ہے جب ہماری عمر پچیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ہم پہلی بار ممبئی گئے تھے۔ صبح کے کوئی چھ بجے ہونگے۔
سات کا موسم تھا۔گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔دھیمی دھیمی بارش بھی ہورہی تھی۔ہم لوکل فاسٹ ٹرین میں سفر کر رہے تھے گاڑی
دا سے باتیں کرتی چلی جارہی تھی۔اس وقت ٹرینوں میں شاید اتنی بھیڑ نہ ہوتی ہوگی۔ہم گاڑی کے جس ڈبے میں بیٹھے تھے اس میں
مارے سوا کوئی دوسرا مسافر نہ تھا۔ہم اکیلے اس وقت کے موسم سے لطف اندوز ہورہے تھے ٹرین راستے میں کہاں کہاں رکی ہمیں
میں معلوم ہوسکا۔لیکن یہ کیا!ہمارے ڈبے کے دوسرے سرے سے ایک نہایت سریلی آواز ہمارے کانوں میں آنے لگی۔ہمارا چہرہ
ں وقت کھڑکی سے باہر تھا۔اس آواز کو سن کر ہم نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کان کھول دیئے۔وہ میٹھی آواز کسی گویئے کی تھی جو
میر دیں میں بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر گا رہا تھا۔

ہے ترے سوا یہ کسے مجال کہ بھرے غریب کی جھولیاں
جو کبھی غریب رہا نہ ہو وہ کسی غریب کو دے گا کیا

دھیرے دھیرے یہ آواز ہمارے نزدیک آنے لگی۔اللہ کے نام پر کوئی ہو تو اس اندھے فقیر کو ایک پیسہ دیدے۔اس صدا نے
ماری آنکھیں کھول دیں۔ڈبے کے اس دوسرے مسافر کی آواز نے جو ستم تھوڑی دیر کے لئے ہم پر ڈھایا وہ بیان سے باہر ہے۔
ماری آنکھیں بھیگ گئیں۔ہمیں محسوس ہوا کہ شعر شعلہ بھی ہے شبنم بھی ہے۔جب تک وہ آواز آتی رہی ہماری آنکھیں بھیگی رہیں ہم
ں بھر کے لئے ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے جس کو ہم اگر اپنی بنائی جنت کہدیں اور لوگ ہمیں شداد کا خطاب دے دیں تو ہم اسے اپنی
نت ہی کہیں گے۔بہت پہلے:

ایک حادثہ تھا دل پہ گزرنا گزر گیا

چالیس سال اور گزر گئے۔اس عرصہ میں ہمارا یہ آب و گل کا جہاں اتنا بدلا کہ کچھ سے کچھ ہوگیا۔کچھ غریب زیادہ ہوئے کچھ
رادروں میں بھی اضافہ ہوا۔غریب لوگ اپنا وطن چھوڑ کر ریگزاروں کے سفر پر نکل گئے۔وہاں سے اربوں کی دولت بغل میں دبا کر اپنے
ن لوٹے۔چنانچہ ایک محفل میں ملک کے غریبوں سے متعلق گفتگو ہورہی تھی جس میں ہم بھی شریک تھے۔اس محفل میں ایک
رگ نے پھر بہادر شاہ ظفر کا وہی مشہور شعر پڑھا۔

ہے ترے سوا یہ کسے مجال کہ بھرے غریب کی جھولیاں
جو کبھی غریب رہا نہ ہو وہ کسی غریب کو دے گا کیا

ہم نے دیکھا کہ جو غریب عربوں کی دی ہوئی دولت سے مالدار بنے ان میں سے اکثر کی کم ظرفی کی کہانیاں لوگوں میں مشہور ہوئیں

اور ہمیں جھانسی کا ایک غریب شاعر یاد آیا جو ہندوستان بھر کے مشاعروں میں یہ الفاظ سنا کر تالیاں بجوا چکا تھا۔

اگر مجھے اختیار دیدو غریب لوگوں کی عید کردوں

ایک طرف ایک شہنشاہ یہ دعویٰ پیش کرتا ہوا کہ جو کبھی غریب رہا نہ ہو وہ کسی غریب کو دے گا کیا۔ ہم سوچنے لگے بہادر شاہ رنگون کے جیل خانے میں بھی بادشاہ ہی تو تھے۔ ہاں۔ ان کو اپنی بدنصیبی کا احساس شدید تھا۔ چنانچہ بدنصیب ہونا ایک بات۔ غریب ہونا ایک الگ بات۔ فرماتے ہیں:

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بدنصیب تو ہنری فورڈ بھی تھا جو دنیا کا مالدار ترین انسان ہوتے ہوئے پیٹ کے السر کی وجہ سے اپنی پسندیدہ غذا نہیں کھا سکتا تھا۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کے شعر سے ایک بات تو صاف ہو گئی وہ یہ کہ ایک بادشاہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ غریب کو تو وہی دے سکتا ہے جو غریب رہا ہو۔ بہادر شاہ ظفر نے یہ فتویٰ کس بنیاد پر دیا جبکہ وہ غریب رہا ہی نہیں تھا ہنوز غور طلب ہے۔ وہ غریب جو ڈالر کما کر لاتے اور رئیس ہوئے ان کا کیا موقف ہے؟ سوچنا پڑتا ہے کہ غریب کو دینے والا تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔

لہٰذا اے ملک کے غریبو! بہادر شاہ ظفر کے اس مصرع پر ہی اکتفا کر کے بیٹھ رہو۔

ہے ترے سوا یہ کسے مجال کہ بھرے غریب کی جھولیاں

ایک راستہ اور بھی ہے اور وہ راستہ بھی ان غریبوں نے بتایا ہے جو غریبوں کے لیڈر بن گئے اور انہوں نے لوٹو مارو کھاؤ کسی کے مت آؤ کا فارمولا اپنایا۔ لہٰذا نہ بہادر شاہ ظفر کی سنو نہ جھانسی والے ایاز کی۔ لیڈر بننا سیکھو خود بخود تمہاری جھولیاں بھر جائیں گی ـــــ تو بھر دو نہ اپنی ہی جھولیاں ☆

محمد طارق
قصاب پورہ، چاندور بازار
ضلع امراوتی (مہاراشٹرا)

تالیوں کا تماشہ

منتری جی کو ملک کے حالات پر بامقصد کا بھاشن دینا تھا جلسہ عام میں بھاشن دینا ہو تو کوئی بات نہیں تھی۔ جو منہ میں آیا منتری جی کہہ ڈالتے تھے۔ کرائے کے لوگ اور پالتو آدمی اتنی تالیاں بجاتے کہ جتنا منتری جی کی جئے جئے کار کرنے لگ جاتی، مگر منتری جی کو بھاشن جلسہ عام میں نہیں بلکہ جلسہ خاص میں دینا تھا۔ شہر کے مشہور پبلک ہال میں ملک کے دانش مندوں اور اخبار کے رپورٹروں کے درمیان بامقصد بھاشن ..... جس کا ہر لفظ تپا تلا ہو۔

منتری جی زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، تعلیم کے دوران آوارہ لڑکوں کی سرداری کیا کرتے تھے۔ اس لیے میٹرک کے امتحان میں دو تین غوطے کھانے کے بعد بھی میٹرک پاس نہ ہو سکے تھے۔ وہ تو آوارہ اور لوفر لڑکوں کی سرداری کا ہنر کام آیا تھا لیڈری کرتے کرتے الیکشن میں کھڑے ہو گئے اور چن کر بھی آ گئے۔ چونکہ "رولنگ پارٹی" سے چن کر آئے تھے اس لیے پارٹی نے انہیں منتری بنا دیا۔

ویسے لیڈری کے لیے..... الیکشن میں کھڑا رہنا اور منتری بننے کے لیے تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ منتری جی کے کام سنبھالنے کے لیے سکریٹری ہوتا ہے، ذہین ... عقلمند، تعلیم یافتہ سکریٹری۔

درحقیقت منتری جی کا سکریٹری منتری جی کے لیے ایک روبوٹ کی طرح ہوتا ہے، وہ منتری جی کے حکم کے مطابق سب کام کرتا ہے، بھاشن بھی لکھ کر دیتا ہے جس کے عوض اس کے گھر "راشن" آتا ہے۔ "راشن" سے منتری جی کے سکریٹری کے گھر کا چولھا جلتا ہے... منتری جی کے بھاشن سے کیا جلتا ہے... ؟! خیر۔

منتری جی کو ملک کے دانش مندوں اور اخبار کے رپورٹروں کے درمیان بامقصد بھاشن دینا تھا۔ انہوں نے بھاشن لکھنے کے لیے سکریٹری کو بلایا .. منتری جی نے اسے اپنی بھاشا میں بھاشن کس طرح لکھنا ہے یہ سمجھایا . سکریٹری نے روبوٹ کی طرح سر ہلایا اور پھر فوراً سے پیشتر جیب سے مخصوص چابی نکال کر کھولی۔ الماری کے خانے بدیسی شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ منتری جی روز ایک بوتل دیش کی غریب جنتا کے غم میں نوش فرمایا کرتے تھے سکریٹری نے بھی ملک کے حالات پر بامقصد بھاشن لکھنے کے لیے الماری سے ایک بوتل نکالی۔ جام میں شراب انڈیلی اور ایک ہی سانس میں جام خالی کر کے آفس میں آیا۔ آرام دہ چیئر پر بیٹھ کر ملک کے بگڑے ہوئے حالات کو ذہن میں سجا کر ایسا بھاشن لکھا جیسے وہ آج کے ایک منتری کا بھاشن نہیں کسی دیش بھگت کے دل کی پکار ہو۔

سکریٹری نے بھاشن تیار کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی اسے خود اپنی تحریر پر تعجب ہوا۔ یہ دیش بھگتی کیسے اس کے اندر سما گئی تھی۔ کہاں سے آ گئے اس کے اندر ایسے حب الوطنی کے جذبات . . . . کہیں یہ بدیشی شراب میں دیش بھگتی کے نشے کی ملاوٹ تو نہیں کی جا رہی ہے!

سکریٹری اپنے ذہن میں آئے ہوئے آوارہ خیال پر خود ہی مسکرا دیا اور پھر بھاشن کے کاغذات لے کر منتری جی کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا تحریر کردہ بھاشن منتری جی کو سنایا۔

منتری جی نے بھاشن بغور سنا۔ ایک بار نہیں، دوبار، سہ بار اور پھر "ٹھیک ہے" کی سند دے کر بھاشن کے کاغذات سکریٹری سے لے کر اپنے پاس رکھ لیے۔ بھاشن یاد کرنے کے لیے۔

دوسرے دن منتری جی "جنتا کے سیوک" طے شدہ پروگرام کے مطابق "پوری سیکوریٹی" کے ساتھ پبلک ہال میں پہنچے پھولوں کے ہاروں سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور انہیں جلسے کا صدر بنایا گیا۔

ہال ملک کے دانش مندوں اور اخبار کے رپورٹروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ کس نے کیا کہا منتری جی نے اس پر کوئی توجہ نہیں تھی۔ وہ تو اس بھاشن کو ذہن میں دہرا رہے تھے۔ جو ان کے سکریٹری نے لکھ کر دیا تھا۔

جیسے ہی منتری جی کو خیالات کے اظہار کی دعوت دی گئی وہ چونکے اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر یہ کیا؟! ان کے ذہن کی تختی تو پوری طرح صاف تھی۔ بروقت و برجستہ بولنا تو انہیں آتا ہی نہیں تھا...... زبان کھولی تو وہی بولے جو انہیں بولنا آتا تھا۔ سکریٹری کی لکھی ہوئی تقریر کا ایک جملہ بھی ان کی زبان سے ادا نہ ہو سکا۔ منتری جی کی تقریر ختم ہوئی اور لوگوں نے اسی طرح تالیاں بجائیں جیسے جلسہ عام میں ان کی تقریر سن کر عام لوگ تالیاں بجایا کرتے تھے۔

منتری جی پھولے نہیں سما رہے تھے۔ دانش مندوں کی تالیوں کی گونج سن کر انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ سکریٹری سے بھاشن لکھوانے کا کام نہیں کروائیں گے۔

منتری جی کا سکریٹری......! اسے منتری جی کے ذہن کے سمندر میں اپنی حیثیت کی ناؤ ڈوبتی نظر آرہی تھی۔ اسے کوفت بھی ہو رہی تھی اس بات پر کہ اس نے جن لوگوں کو دانش مند سمجھ کر منتری جی کے لیے تقریر لکھنے میں مغزماری کی وہ بھی عام لوگوں کی طرح ہی نکلے...... تالیاں بجانے والے۔

حمید انور (مالک 'بک امپوزیم' پٹنہ) نہیں رہے

اردو زبان و ادب خصوصاً اردو کتب و رسائل سے وابستہ افراد کے لئے یہ خبر انتہائی المناک ہے کہ میرے والد محترم جناب حمید انور (مالک بک امپوریم 'سبزی باغ' پٹنہ۔ ۴) ۱۵ جون ۲۰۰۰ء کو ۱۱:۳۰ بجے شب میں دارِ فانی سے دارِ بقا کو کوچ کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی۔ وہ گزشتہ کئی ماہ سے علیل تھے۔ پسماندگان میں بیوہ' چار بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں ان کے علاوہ بہت سے عزیز و اقارب اور احباب شامل ہیں۔

مرحوم جناب حمید انور انتہائی خلیق' نیک دل اور خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے اردو کتب و رسائل کے فروغ و توسیع کے لئے کافی جد و جہد کی اور بک امپوریم کو اردو دنیا کے مشہور ادارہ کے طور پر قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنے اس کاروبار میں اردو کتب کی ترقی و فروغ کو ہمیشہ مقدم جانا اور اردو ادباء و شعراء کے لئے ایک تہذیبی مرکز کے طور پر بک امپوریم جانا جانے لگا۔ مرحوم سماجی و ادبی تحریکوں میں بھی سرگرم حصہ لیتے تھے۔ ممتاز سماجی و ادبی ہستیوں سے ان کے براہ راست اور تحریری رابطے تھے اور وہ پابندی سے روزنامچہ لکھتے تھے۔ قارئین سے مرحوم کی مغفرت اور ہم پسماندگان کے صبرِ جمیل کے لئے دعاء کی درخواست ہے۔

ڈاکٹر ممتاز فرخ   اردو شعبہ' بہار قانون ساز کاؤنسل پٹنہ ۸۰۰۰۱۵ (بہا

بابو آر کے اچن پورستی

منشائیہ ...... بنامِ انشائیہ

اللہ رب العزت نے بھلے ہی پٹھانوں کو، پیری پیغمبری کے تعلق سے کوئی اہمیت نہ دی ہو۔ لیکن فنونِ لطیفہ کے توسط سے اس نے پٹھانوں کو اتنا کچھ دے دیا ہے کہ جس کے باعث وہ اپنی پیغمبرانہ محرومی کو بالکل ہی بھلا بیٹھے ہیں۔ اگر آپ فلموں کے فنکاروں کی بات کریں تو یہاں بھی آپ پٹھان فنکاروں کو سب سے آگے پائیں گے۔ پھر چاہے وہ یوسف خاں عرف دلیپ کمار ہوں شاہ رخ خاں ہوں، عامر خاں ہوں یا سلمان خاں .... اسی طرح فنِ موسیقی میں بھی پٹھانوں کا ہی بول بالا دکھائی دے گا۔ استاد جھنڈے خاں سے لیکر بسم اللہ خاں تک اور چھوٹے بڑے سارے کے سارے غلام علی خانوں نے موسیقی کے میدان میں پٹھانی جھنڈے گاڑھ رکھے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ صنفِ شاعری میں بھی سیدوں اور شیخوں کا کام بس برائے نام ہی ملے گا جب کہ یہاں بھی پٹھانوں کی پٹھانی اپنا رنگ دکھائے گی .... یعنی یہاں بھی غالب اسد اللہ خاں ملیں گے۔ مومن بھی حکیم مومن خاں ملیں گے اور خانِ خاناں بھی عبدالرحیم خاں ہی ملیں گے۔ الغرض فنونِ لطیفہ کی تمام تر اصناف میں پٹھان سکہ ہی چلتا نظر آئے گا۔

فی الوقت ہم، جس سچے پٹھان شاعر کا ذکر کر رہے ہیں .... وہ ہیں ہمارے علاقے کے مشہور شاعر جناب منشاء الرحمن خاں منشاء، یوں تو منشاء صاحب کسی گاؤں یا شہر میں پیدا ہوئے ہوتے تو .... وہ جگہ ان کے توسط سے چہار دانگ عالم میں مشہور ہونے ہی والی تھی پھر چاہے وہ تپل گاؤں راجہ ہو تپل گاؤں پرجا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ منشاء صاحب نے تپل گاؤں راجہ کو اپنا وطن بنا کر واقعی اسے راجاؤں جیسا وقار عطا کر دیا ہے۔ خیر تپل گاؤں راجہ یا پرجا سے قطع نظر آئیے اب ذرا منشاء صاحب کو دیکھتے ہیں ... تو صاحب، منشاء صاحب کا نام لیتے ہی وضعداری کا جیتا جاگتا پیکر نظروں میں گھومنے لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وضعداری ان کے یہاں ایڑی سے چل کر چوٹی تک جاتی ہے۔ یعنی پیر کی جوتی سے لیکر سر کی ٹوپی تک وضعداری کے سوتے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ چوڑی دار پاجامہ ہو یا شیروانی کا جامہ، وضعداری ان کے ہر انداز میں رچتی بستی ہے۔ جس طرح نوشیروان عادل نے عدل کو باوقار بنا دیا تھا ٹھیک اسی طرح منشاء صاحب نے شیروانی کو پروقار بنا دیا ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ شیروانی کا شغف رکھنے والے صبر و تحمل کے پیکر ہوا کرتے ہیں کیوں کہ بغیر صبر و استقلال کے شیروانی کی جامہ زیبی محال ہوا کرتی ہے۔ ذرا سوچئیے .... جب ہم جیسے کاہلوں سے شرٹ کے تین چار بٹن ہی لگائے نہیں لگتے تو پھر شیروانی کے اتنے سارے بٹن اللہ کی پناہ! وہ تو ہمارے منشاء صاحب کا دل گردہ ہے جو، وہ دن میں کتنی ہی مرتبہ شیروانی کے اتنے سارے بٹن ایک ساتھ لگاتے اور نکالتے ہیں۔ پتہ نہیں شیروانی کو لوگ اور کیا کہتے ہیں جب کہ ہم تو اسے شاعرانہ یونیفارم بھی کہہ لیتے ہیں۔

یوں تو ہمارے اکثر شعراء نے شیروانی زیب تن کی ہے لیکن موجودہ دور میں صحیح معنی میں اسے وقار منشاء صاحب ہی نے بخشا ہے۔ اسی لئے تو ہمارے آج کل کے وہ مشاعرے جن میں منشاء صاحب مع شیروانی مدعو نہیں ہوتے .... تو یہ واقعہ ہے کہ وہ مشاعرے، کوی سمیلن جیسے لگتے ہیں اور جن کوی سمیلن میں منشاء صاحب اپنی شیروانی کے ساتھ شریک رہتے ہیں تو وہ کوی سمیلن، مشاعرے بن جایا کرتے ہیں۔ الغرض کوی سمیلن کا مشاعرہ بن جانا اور مشاعرے کا کوی سمیلن میں بدل جانا یہ سب منشاء صاحب اور ان

کی شیروانی کی موجودگی اور عدم موجودگی پر منحصر رہتا ہے۔

خیر، تو آئیے اب ہم شیروانی میں سمائے اس سراپے کا جائزہ لیتے ہیں۔ جب ہم حضرت منشاء کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ حلیمی و ہمدردی کے پیکر بھی ہیں۔ غمگساری و دلجوئی کے خوگر بھی ہیں۔ آپ یار غار بھی ہیں وفا شعار بھی ہیں اور علم و ادب کے بحر ذخار بھی ہیں۔ ان کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مد مقابل ادیب اور شاعر کو.... پھر چاہے وہ عمر میں ان سے چھوٹا ہو یا فن میں کتنا ہی بونا کیوں نہ ہو، اپنے حسنِ اخلاق سے، ایسا Treat کرتے ہیں.... کہ آن واحد میں وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان سے چند ہی ملاقاتوں کے بعد ہم بھی غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں کیوں کہ فنی اعتبار سے ہم جانتے ہیں کہ..... ہم گل محمد ہیں لیکن پھر بھی ہم اپنے آپ کو عوج بن عنق سمجھنے لگے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ منشاء صاحب نے اپنے کلام سحر انگیز اور لہجہ دل آویز سے ہمارے مشاعروں کو مقبول خاص و عام بنایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس مشاعرے میں منشاء مدعو ہوں تو پھر مشاعرے میں بڑے سے بڑے لٹیرے شاعر کی دال نہیں گلے گی اور موصوف دیکھتے ہی دیکھتے مشاعرہ لوٹ لے جائیں گے۔ اس تعلق سے یہ بات بھی ہم کہیں گے..... کہ جتنا مزہ منشاء کو مشاعرہ لوٹنے میں آتا ہے اس سے زیادہ لطف تو خود مشاعروں کو منشاء کے ہاتھوں لٹنے میں آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ہر مشاعرہ کو منشاء اپنی منشاء سے استعمال کرلیتے ہیں۔ مشاعرے کے اسٹیج پہ سوائے ان کے کسی کا جادو چل ہی نہیں پاتا۔ داد پانے اور بے داد ہونے سے بچنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ مشاعروں کے اسٹیج پہ کتنے ہی شعراء کو ہم نے سامعین سے خوف کھاتے دیکھا ہے لیکن منشاء کا یہ کمال ہے کہ وہ خود بیک وقت سامعین کو چھیڑتے بھی ہیں اور اسٹیج پہ بیٹھے شعراء کو للکارتے بھی ہیں یعنی وہ ایک ساتھ دو دو محاذ کھول کر مشاعرہ کا معرکہ سر کر جاتے ہیں۔ مشاعروں کی محفلوں میں ہوٹ کرنے والے کتنے ہی جیالوں کو ہم جانتے ہیں لیکن منشاء کے مائیک پہ آتے ہی انہیں ہم نے ہونٹ سیئے بیٹھے دیکھا ہے۔ مشاعروں میں منشاء صاحب کی منشاء گری یعنی کہ داداگری پہ جب ہم غور کرتے ہیں تو عقدہ یہ کھلتا ہے کہ ..... نہ تو یہ کہیں کے دادا ہیں اور نہ ہی انڈر ورلڈ کے دلدادہ ہیں لیکن ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ صرف وضع قطع سے ہی شاعر نہیں ہیں بلکہ اپنے منفرد لب و لہجہ، اپنے کلام کی رنگینی، شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی کے باعث ایک کامیاب شاعر ہیں۔ ہم اپنی بات کی توثیق کے لئے ان کے چند متفرق اشعار پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

- اتنی رنگین بساط مہ و انجم تو نہیں
صاف کہہ دو کہ پس پردہ کہیں تم تو نہیں
- ہم اپنا دل ہی جلاکر اجالا کریں گے
ادھار مانگے ہوئے آفتاب مت دیجئے
- یہ زخم زخم جگر یہ لہو لہو آنکھیں
تمہاری بزم سے ہم لیکے اک بہار چلے
- کچھ تو مرنے کا حوصلہ دکھلاؤ
صرف جینے کو زندگی نہ کہو
- آگ کیا جلتے گھروں کی وہ بجھا پائیں گے
جن کی اک عمر فقط آگ لگانے میں کٹی

جگر کو چاک کہ دل کو ، لہو لہو کیجئے
حیات کو کسی عنوان سرخ رو کیجئے

مذکورہ بالا اتنے خوبصورت اشعار کی روشنی میں آپ ہی کہئیے ....کہ مشاعروں کی محفلوں میں ایک وضعدار شاعر شیروانی پہن کر شیر کی دانی (آواز) میں دھاڑتا ہوا ایسے دل پذیر اشعار سنائے تو پھر سامعین کی کیا مجال ....کہ وہ داد نہ دیں اور واہ واہ کے نعرہ ہائے تحسین بلند نہ کریں ۔ مزید برآں منشاء صاحب کو ہم صرف ادیب ، شاعر ، محقق اور استاد ہی نہیں مانتے بلکہ ہم تو انھیں ایک کامیاب صنعت کار بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ برسوں سے آپ نے اردو ادب کے ڈاکٹروں کی فیکٹری کھول رکھی ہے ۔ منشاء صاحب کی اس ڈاکٹر ساز فیکٹری سے تیار ہو کر نکلے ہوئے کتنے ہی ادب کے ڈاکٹروں نے اردو زبان و ادب کو صحت مند اور تندرست و توانا رکھنے میں مدد کی ہے ۔ عہدوں کی دستیابی کے تعلق سے بھی آپ بجا طور پر یوسف ثابت ہوتے آئے ہیں ۔ یعنی عہدے زلیخا بن کر آپ کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور انعام و اکرام کا ایک اژدہام ہے جو آپ کے یہاں دکھائی دیتا ہے ۔ ان گوناگوں خوبیوں کے علاوہ Fitness کے معاملہ میں بھی یہ اپنی مثال آپ ہیں ۔ اس ضمن میں بھارتیہ کرکٹ ٹیم کو ہمارا مشورہ ہے کہ اگر وہ دوبارہ ورلڈ چمپئن بننا چاہتی ہے تو اسے منشاء صاحب سے مل کر Fitness کے گر سیکھے ۔ عمر کے ۷۰ ویں پڑاؤ پہ آج بھی موصوف کا عالم یہ ہے کہ ہر گزرے ہوئے دن کے ساتھ آپ چاق و چوبند اور تیز و طرار ہوئے چلے جا رہے ہیں ۔ ادبی نشستوں میں تو آپ کی چستی پھرتی شوخی و بذلہ سنجی بس دیکھتے ہی بنتی ہے ۔ یہ واقعہ ہے کہ مشاعروں کی محفلوں کی حیثیت آپ کے نزدیک ، بچے کے گھروندے جیسی ہی ہوا کرتی ہے ۔ جس طرح ایک بچہ گھروندے کے اندر اپنے کھلونوں سے کھیلتا ہے ٹھیک اسی طرح منشاء صاحب ، مشاعروں کی محفلوں میں سامعین اور شعراء حضرات سے کھیلتے ہیں ۔ ہم اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہیں کہ وہ منشاء صاحب کی ذات کے گوشے میں چھپے اس شریر بچے کو اسی طرح ہنستا کھیلتا اور مسکراتا ہوا رکھے آمین ۔ ☆

وشنوناگر ترجمہ: ایف ایم سلیم

میں وزیر اعظم نہیں بنوں گا

ویسے تو بڑے بڑے گھامڑ اور چیمٹر لائن میں لگے ہیں، ہم نے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں، پھر بھی سنسکرت زبان میں کہا گیا ہے کہ عورت کی سیرت اور مرد کی قسمت کا کچھ پتہ نہیں چلتا، چونکہ میں مرد ہوں اس لئے ابھی سے اس بات کی توثیق کر دینا چاہتا ہوں کہ چاہے زمین ادھر سے ادھر کیوں نہ ہو جائے، چاہے آسمان پھٹ جائے مگر میں وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔ عین موقع پر ملک کے عوام مایوس نہ ہوں اور دیش کے نیتا ہلکان نہ ہوں۔ اس لئے بتائے دیتا ہوں کہ مرتے مرجاؤں گا۔ سولی پر چڑھ جاؤں گا۔ مگر ملک کا وزیر اعظم نہیں بنوں گا اور نہیں بنوں گا۔

موقع آنے پر چونکہ مجھ سے ضرور پوچھا جائے گا کہ میں وزیر اعظم کیوں بننا نہیں چاہتا اور یہ سوال پوچھ پوچھ کر مجھے تنگ کر دیا جائے گا۔ اس لئے میں ابھی سے بتائے دیتا ہوں۔ ویسے تو مالِ مفت کسے برا لگتا ہے ..... ڈھیروں ہار گلے میں بے وجہ پڑے رہیں اور اپنے لئے زندہ باد کے نعروں سے آسمان ہر موسم میں گونجتا رہے اور آپ مسکراتے رہیں، تو خدا قسم اچھا ہی لگتا ہے۔ بار بار کیمرے کے سامنے آنا۔ جاپان سے غیر ملکی مہمانوں سے ہاتھ ملانا، ہر گھنٹے بعد ایک جوشیلی تقریر کرنا، وقت بے وقت قوم کو اپنے پیغام سے پریشان کرنا غیر ممالک کے سفر پر جانا، ڈھیروں مفت خوروں کو ساتھ لے جانا، بیٹے بیٹیوں، پوتے پوتیوں اور چاچا تایاؤں کو زندگی بھر ٹھیکوں سے نوازنا بھلا کس انسان کو برا لگتا ہے۔ مگر پھر بھی میں کہے دیتا ہوں کہ میں ملک کا وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔ نہیں بنوں گا۔ نہیں بنوں گا۔ کیوں کہ بنا تو اپوزیشن کہے گا کہ میں بے ایمان ہوں، فرقہ پرست ہوں، میں نے ملک کو امریکہ کے پاس گروی رکھ دیا ہے اور یہ بات اس وقت سو (۱۰۰) فیصدی سچ ہوگی۔ پھر بھی سننے میں بری لگے گی۔ چہرہ لال ہو جائے گا اور ماتھا گرم۔ اس لئے میں وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔

چوں کہ میں آٹھ برس کی عمر سے ہی طوفان زدہ علاقوں کا ہوائی سروے کرنے والے وزیر اعظموں، وزیروں کے شوق کا مذاق اڑاتا رہا ہوں۔ اگر میں وزیر اعظم بنا تو یہی سب کروں گا، اس لئے میں وزیر اعظم یا وزیر نہیں بننا چاہتا۔

چوں کہ برابری اور انصاف کا میں شروع سے ہی حامی رہا ہوں، میں نے اس کی حمایت میں جم کر نعرے لگائے ہیں۔ خوب لکھا ہے۔ خوب تقریریں کی ہیں اور وزیر اعظم بنا تو، میں بھی یہی وعدہ سب سے پہلے عوام سے کروں گا۔ مگر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خدمت میں اپنا پورا وقت صرف کروں گا۔ معاشی فراخدلانہ پالیسی کے لئے پہلے دن سے آخری دن تک قدم بڑھاتا رہوں گا۔ اس لئے میں اپنے ملک کے عوام تو کیا، کسی اور ملک کی تجویز پر بھی وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔

میں وزیر اعظم بنوں گا تو میں جس راستے سے جاؤں گا وہ راستہ عوام کے لئے بند کر دیا جائے گا اور جو گستاخی کرے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ پولیس والے چپے چپے پر مجھے گالی دیتے ہوئے مگر مستعدی سے کھڑے رہیں گے۔ بلیک کیٹ کمانڈوز عوام کے سینے پر پستول تانے میری حفاظت میں گھومیں گے۔ مجھے ان سب باتوں سے آج بھلے ہی نفرت ہو، وزیر اعظم بنا تو یہ اچھا لگے گا۔ اور ان سب کی کمی سے مجھے ایسا لگے گا کہ میں وزیر اعظم ہو کر بھی وزیر اعظم نہیں ہوں۔ اس لئے میں وزیر اعظم نہ بنوں تو اپنے ملک کے

پیارے عوام تم اس کا برا مت ماننا۔ تم بن جانا مگر مجھے حیران نہ کرنا۔

میں اس لئے بھی وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔ کیوں کہ رات میں تو میں دو بجے تک بھی جاگ سکتا ہوں، مگر صبح چھ بجے اٹھ کر تیار نہیں ہوسکتا اور اٹھنے کے بعد کا وقت مجھے اپنے طریقے سے بتانا اچھا لگتا ہے۔ افراتفری ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔ اگر خدا نخواستہ میں وزیر اعظم بن گیا تو جلدی اٹھنا بھی پڑے گا اور صبح بھی میری نہیں ہوگی۔ اور نہ جانے کن کن بے وقوفوں، چاپلوسوں، سفید پوش غنڈوں کو ناشتے اور کھانے پر روز بلانا ہوگا۔ ناشتے اور کھانے میں، چھری کانٹے کا استعمال کرنا ہوگا۔ عشائیے پر تقریر کرنی اور سننی پڑے گی اور یہ سب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اس لئے میں وزیر اعظم نہیں بننا چاہتا۔

اگر میں وزیر اعظم بنتا ہوں تو گھر میں بھگوان بدھ کی مورتی اور مہاتما گاندھی کا فوٹو ضرور لگانا پڑے گا۔ اور ان کے سامنے مسلسل جھوٹ بولنا اور جھوٹ کے سوا کچھ نہ بولنا ہوگا، جس سے میرے جبڑوں میں درد ہونے لگے گا۔ اس لئے میں ملک کا وزیر اعظم نہیں بننا چاہتا۔ اس وقت میں نہ ملک کا وزیر اعظم ہوں اور نہ میرے وزیر اعظم بننے کے دور دور تک کوئی آثار ہیں اس لئے میرا کوئی نیا چچا، تایا، بھیا، بھانجا، بھتیجا پیدا نہیں ہوا ہے، نہ ہوگا۔

لیکن مان لو میں غلطی سے وزیر اعظم بن گیا تو ملک اور ملک سے باہر کونے کونے میں میرے رشتے دار پیدا ہوجائیں گے۔ اور سب اپنا اپنا مطلب حاصل کرنے میں لگ جائیں گے۔ نہ جانے کہاں سے نجومیوں کی قطار میرے گھر پر لگ جائے گی اور میری جنم کنڈلی میں نہ جانے کیا کیا نقص بتلانے لگ جائیں گے۔ نہ جانے کتنے عقیدے مجھے تعویز پہنانے کے لئے بے چین رہیں گے۔ اس لئے سب بنوں گا، مگر ملک کا وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔ چوں کہ میرے نام سے ہر دن سینکڑوں مبارک بادیاں اور سینکڑوں تعزیتی پیام جاری ہوں گے جن کے بارے میں مجھے بھی کچھ پتہ نہیں ہوگا۔ چوں کہ ہندوستان اور دنیا کے ہر مسئلہ پر مجھے اظہار خیال کرنا ہوگا۔ یہ خیال میرا نہ ہوگا بلکہ سرکاری افسروں اور میری تقریر لکھنے والوں کا ہوگا۔ اس لئے مجھے معاف کرنا دوستو میں وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔

چونکہ میں اسی وقت اداس لگتا ہوں، جب میں اداس ہوتا ہوں اور تبھی خوش ہوتا ہوں۔ میں گھنٹوں بے مطلب بکواس کرنے کے بجائے چپ رہنا پسند کرتا ہوں اور چکاچوند روشنی کے بجائے گھپ اندھیرے میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ بھیڑ سے زیادہ تنہائی دس چمچوں کے بجائے چار دوستوں کے درمیان رہنا مجھے پسند ہے۔ سیاسی چال چل کر کسی کی ٹوپی اچھالنے سے زیادہ مجھے کتابیں پڑھنا پسند ہے۔ کاروں کے قافلے سے گھرے رہنے کے بجائے پیدل چلنا مجھے بہت پسند ہے۔ اسی لئے بھائیو میں وزیر اعظم بن کر بھی کیا کروں گا؟۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھ میں کئی ایسی کمزوریاں ہیں جو میرے وزیر اعظم بننے میں رکاوٹ مانع ہیں۔ اس لئے کوئی خواب میں بھی نہیں کہے گا کہ اس شخص کو وزیر اعظم بنایا جائے۔ تبھی ہمارا ملک بچے گا۔ پھر بھی ملک کا ایک شہری ہوں اور ہر شہری کی طرح مجھے بھی اس ملک کا وزیر اعظم بننے کا حق حاصل ہے۔ جیسے تمام گھامڑوں، اٹھائی گیروں اور دلالوں نے ہتھیا رکھا ہے۔ اس لئے اپنی حالت میں نے پہلے سے ہی ظاہر کردی ہے تاکہ کل کوئی یہ نہ کہے کہ میں ذمہ داری سے بچ رہا ہوں۔ ویسے اگر ذمہ داری ڈال ہی دی جائے تو میں بے چارہ کیا کر پاؤں گا۔ جمہوریت میں تو عوام ہی بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر ملک کی بھلائی کے آگے شخصی بھلائی دیکھنا تو ہندوستانی روایت ہے۔ ☆

●☆●☆●

بن پٹا بھی رامن

انگریزی سے ترجمہ:
ڈاکٹر میر گوہر علی خاں

ایک پجاری۔ امریکہ میں

جب مجھے اطلاع ملی کہ میرا دوست رام پٹوردھن اس دنیا سے چل بسا تو مجھے بڑی تشویش ہوئی کہ اس کا انتم سنسکار کس نے اور کس طرح انجام دیا گیا ہوگا ؟ چونکہ پٹوردھن ہی ایک ایسا واحد شخص تھا جو امریکہ میں مقیم ہندو بلکہ غیر ہندوؤں کے آخری رسومات بھی بہ حسن خوبی انجام دیا کرتا تھا ۔

پٹوردھن پنڈھرپور کا برہمن تھا ۔ جو ۱۹۴۷ء میں بمبئی یونیورسٹی سے بی ۔ اے کرنے کے بعد نیویارک منتقل ہوا تھا ۔ یہ ایک بالکل اتفاق تھا کہ اس کو ایک دن پجاری بننا پڑا ۔ میں اور وہ نیویارک کے قونصل جنرل کے دفتر میں ملازم تھے ۔ یہ ملازمت صرف ان نوجوانوں کو ملا کرتی تھی جو امریکہ میں اپنی تعلیم مزید جاری رکھنا چاہتے ہوں ۔ ان دنوں ہم ایک عجیب واقعہ سے دوچار ہوئے ۔ ایک سندھی لڑکی جس کو ہم دونوں جانتے تھے ایک دن ہمارے دفتر آئی ۔ اور ہم سے کہا کہ نیویارک کا کوئی ٹی ۔ وی چینل اس کی شادی کو ٹیلی کاسٹ کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ یہ ہندو رسم و رواج کے مطابق انجام دی جائے اس سے قبل وہ اور اس کے ہونے والے شوہر کورٹ میں سی جج یا رجسٹرار کے سامنے شادی کرنے کی سونچ رہے تھے ۔ مگر لڑکی نے پٹوردھن سے استدعا کی تھی کہ آیا وہ برہمن رسم و رواج کے طریقہ پر اس کی شادی انجام دینے کے لئے راضی ہوسکتے ہیں ؟ پٹوردھن نے حامی بھرلی ۔ اور شادی کے سارے رسومات دھوم دھام اور خوبصورت طریقے پر ٹیلی کاسٹ ہوگئے ۔

دو دن بعد اے ۔ پی ۔ وینکٹیشورن جو نیویارک میں قونصل تھے بعد میں انھیں فارن سکریٹری کے عہدہ پر ترقی ملی تھی ۔ میرے دفتر آئے اور مجھ سے کہا کہ رام پٹوردھن گرفتار کرلیا گیا ہے ۔ چونکہ اس نے غیر قانونی طریقہ سے پجاری کے فرائض انجام دیئے ہیں ۔ امریکہ کے ہر اسٹیٹ میں یہ قانون لاگو ہے کسی بھی شادی کو چاہے ہندو طریقہ یا کرسچین طریقہ سے انجام دینا ہو تو ایسے شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ اسٹیٹ سے اس قسم کا لائسنس حاصل کرے ۔ بغیر لائسنس شدہ پجاریوں سے شادی کرانے پر اس شادی کو قانونی حیثیت نہیں دی جاسکتی اور ایسے پجاریوں کو گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے ۔

پٹوردھن اس قانون سے ناواقف تھا ۔ اور لگتا تھا کہ دولہا دولہن کو بھی اس کی واقفیت نہیں تھی ۔ تب ہی تو دولہن نے کورٹ میں شادی رچانے کے بجائے ہندو رسم و رواج کو ترجیح دیتے ہوئے پٹوردھن برہمن سے اس طرح کی استدعا کی تھی ۔ کچھ بھی ہو ۔ بیچارے پٹوردھن کی گرفتاری ہمارے لئے ایک بڑا مسئلہ بن گئی تھی ۔ کچھ دیر تک غور و خوص کے بعد وینکٹیشورن نے پولیس آفسر سے جاکر کہا کہ پٹوردھن برہمن جاتی کا ہے اور اس لحاظ سے اس کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ کسی بھی ہندو جوڑے کی شادی کرواسکتا ہے ۔ پولس افسر نے جواب دیا کہ امریکہ میں یہ سب نہیں چلتا ۔ جب تک پٹوردھن میاں کا اجازت نامہ کہ وہ پجاری کی خدمت انجام دے سکتا ہے ۔ حاصل نہ کرے اس کی رہائی ممکن نہیں ہے ۔ بہت خوشامد کے بعد پولس افسر نے کہا وہ اس مرتبہ اس کو رہا کر رہا ہے مگر جلد از جلد اس کو پجاری

بنے کا لائسنس حاصل کرنا ہوگا۔ پٹوردھن کی خوش قسمتی دیکھیئے کہ بہت جلد اس کو اس قسم کا صداقت نامہ مل گیا۔

اب پٹوردھن کی شہرت نیویارک کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ اور وہ دھڑا دھڑ ہندو جوڑوں کی شادی کروانے لگا۔ اس کا دھندا اتنا وسیع ہوا کہ اس نے مہاراشٹر سے پجاری کا باقاعدہ لباس اور دوسری چیزیں منگوالیں۔ شادی کے اشلوک فر فر پڑھنے لگا۔ اور ساتھ ہی اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرنے لگا۔ جب پٹوردھن کا یہ کاروبار خوب بڑھا تو اس نے کونسل کی ملازمت ترک کردی اور تن من دھن سے اس دھندے میں جٹ گیا اور دونوں ہاتھوں سے دھن لوٹنے لگا۔

برہمن پجاری کو کیا صرف شادی بیاہ ہی سے واسطہ پڑتا ہے ؟ اب جو لوگ سورگ باش ہونے لگے تو ان کے کریا کرم کے وقت بھی اس کو بلاوا آنے لگا۔ اور یہاں پر بھی انھوں نے اپنی صلاحیت کی ڈھاک بٹھا دی۔ مگر جب پٹوردھن خود سورگ باش ہوگئے تو آخر کس پجاری نے ان کی آخری رسومات انجام دی ہونگی ؟ یہاں سات سمندر پار بیٹھے یہ سوچتے ہوئے میرا سر چکرا جاتا ہے۔ ☆

●☆●☆●☆●☆●

شرمیلا

یہ اس حاجی لق لق کی بات ہے جس کے پسینہ سے بھی شراب کی بو آتی تھی۔ شام کے وقت لق لق اپنے روزانہ اخبار کے دفتر سے فارغ ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک ہم مشرب اور بے تکلف دوست ملنے کے لئے آگیا۔

"کتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں ؟"

لق لق نے ان الفاظ سے اس کا خیر مقدم کیا۔

اس نے اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے بتایا:

"ڈیڑھ روپئے کے لگ بھگ..."

لق لق کی باچھیں کھل گئیں۔

"تو حل ہوگیا مسئلہ... ایک روپیہ میرے پاس بھی ہے"۔

"لیکن اس سے کیا ہوگا ؟"

"ٹھرے کا ایک پوا لے کر پئیں گے"۔

"ایک پوے سے دو آدمی... ؟"

"ارے میاں ! اتنا نشہ تو ہوجائے گا کہ فلاں رسالہ کے مالک سے پینے کے لئے دوبارہ پیشگی مانگتے ہوئے شرم محسوس نہ ہوگی"۔

●☆●☆●

●☆●

لالی چودھری
لاس اینجلس

اور قہقہوں کا رود بیکراں بہتا رہا

یادش بخیر میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ لاس اینجلس کی شامیں بہت سہانی اور دلنواز ہو گئی ہیں اور یہاں کی فضا اردو ادب کے مخصوص تہذیب و تمدن کی وارث بن گئی ہے ۔ روایت کو جنم لیتے اور پروان چڑھتے برسوں گزر جاتے ہیں ۔ اس کی پرورش کرنے اور اسے سنوارنے اور نکھارنے میں بڑے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ بے شمار لمحے روایت کی جوانی اور جولانی کی نذر کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر فضا میں وہ دلکشی وہ اپنائیت اور والہانہ پن پیدا ہوتا ہے کہ ہم ذوق لوگ اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھتے ہیں اور اپنی ادبی اور ثقافتی محفلوں کا انعقاد کرتے ہیں ۔

ایسی ہی ایک خوبصورت اور منفرد محفل محبان اردو کی جانب سے بروز جمعہ ۲ جون ۲۰۰۰ ء کی شام شاھنواز ریسٹورنٹ لیک وڈ کے بنکویٹ ھال میں منعقد ہوئی اور اہل ذوق کی تسکین طبع کے لئے اردو ادب کے مایہ ناز اور شہرہ آفاق مزاح نگار مجتبی حسین صاحب اپنے دوست عبدالرحمن صدیقی مدیر اردو لنک ،ڈاکٹر سمیع احمد ،ڈاکٹر ریاض الدین راقم الحروف (لالی چودھری) اور حسن چشتی کی دعوت پر انڈیا سے امریکہ تشریف لائے ۔ لاس اینجلس کی ادبی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ نثری محفل کے لئے اتنی بڑی تعداد میں سامعین جمع ہوئے ۔ گو کہ پروگرام کے لئے آٹھ بجے کا ٹائم دیا گیا تھا لیکن ہم چونکہ روایت پرست لوگ ہیں اس لئے دل و جان سے اس روایت کی پاسداری کرتے ہیں کہ کوئی پروگرام طے شدہ وقت پر شروع نہ ہونے پائے اور جہاں ہزاروں سال سے نرگس اپنی بے نوری پر روتی رہی ہے دو ڈھائی گھنٹے اور رو لے ۔

لذت کام و دھن کا سلسلہ تقریباً دس بجے ختم ہوا تو مدیر لنک جناب عبدالرحمن صدیقی نے سامعین کا خیر مقدم کیا ۔ نامور مزاح نگار مجتبی حسین اور living legend موسیقار اعظم جناب نوشاد علی صاحب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا ۔ شمع محفل جناب مجتبی حسین ، مہمان خصوصی ممتاز محقق اور ناقد گیان چند جین ،شکاگو کی نمایاں ادبی اور سماجی شخصیت حسن چشتی اور بے ایریا سے آنے والی پاکستان کی نامور شاعرہ نوشی گیلانی کو اسٹیج پر بلاتے ہوئے ایری زونا سے آئی ہوئی مہمان شاعر شمناز امتیاز ، لاس اینجلس میں غزل گائیکی کی خوش الحان اور خوبصورت گلوکارہ مونی دیپا شرما ، گلوکار حبیب ولی محمد اور پروفیسر شکلا کا خیر مقدم کیا اور ڈاکٹر سمیع احمد سے درخواست کی کہ وہ مجتبی حسین صاحب کے بارے میں اظہار خیال فرمائیں ۔

ڈاکٹر سمیع احمد نے حیدرآباد کے اس ممتاز اور صاحب طرز مزاح نگار کی کالم نگاری ، خاکہ نگاری اور مزاح نگاری پر جامع گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مجتبیٰ حسین کی شخصیت کا تعلق ہے تو وہ ان دو مصرعوں میں سموئی ہوئی ہے ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اور جہاں تک ان کی ادبی زندگی کا تعلق اس کے لئے ذرا سے ھیر پھیر کے ساتھ میر کا یہ شعر پیش ہے ۔

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے مجتبیٰ نکلتے ہیں

مجتبیٰ حسین صاحب تالیوں کی گونج میں مائیک پر آئے اور اپنے میزبان دوستوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگے کہ موسیقار اعظم نوشاد کی صدارت میرے لئے بہت اعزاز کی بات ہے ۔ بچپن میں موسیقی کے حوالے سے جب ہم یہ سنتے تھے کہ فلاں گلوکار کی آواز میں بہت سوز اور درد ہے تو خیال آتا تھا کہ یہ صاحب اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے ۔ بڑے ہونے پر جب ان کے گیت نوشاد صاحب کے سروں میں سنائی دیئے تو پتا چلا کہ درد کسے کہتے ہیں ۔ جب ہم اس پروگرام کے لئے بینکویٹ ہال میں آرہے تھے تو راستے میں للی چودھری اور نوشی گیلانی باتیں کر رہی تھیں للی اپنی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ مجھے توافسوس کرنے اور رونے کی بھی فرصت نہیں ملتی ۔

نوشی گیلانی کہنے لگیں تم رونے کی بات کرتی ہو مجھے تو دکھی ہونے کی بھی فرصت نہیں ملتی تو اس پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا کہ ہندوستان میں ایک دن میں نے اپنے دوست کو لطیفہ سنایا تو اس نے فوراً گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اس وقت میرے پاس ہنسنے کا وقت نہیں گھر جا کر ہنسوں گا تو پھر تمہیں ٹیلیفون کروں گا ۔

اور اب کوئی اور آرٹیکل سنانے سے پہلے میں اپنا نیم سنجیدہ اور نیم مزاحیہ مضمون " قصہ ہمارے امریکہ آنے کا " سنانا چاہتا ہوں ۔ یہ کالم لاس اینجلس کے حوالے سے ہے :

" صاحبو اگر ہم لاس اینجلس میں نہ آتے تو آپ کو پتا ہی نہ چلتا کہ ہم زندگی کا ہر کام الٹا کرنے کے عادی ہیں ۔ ہم آغاز سے انجام کی طرف نہیں آتے بلکہ انجام سے آغاز کی طرف آتے ہیں کہ شاعروں کے مجموعوں کو آخر سے شروع تک پڑھتے ہیں جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعروں کے کلام کی بے معنویت اور بدمزگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوجاتا ہے " ۔

وہ اپنے لاس اینجلس آنے کا قصہ بڑی شرارت آمیز معصومیت اور معصومیت آمیز شرارت سے سنا رہے تھے اور وہ محفل جس پہ کچھ دیر پہلے جاں نثار اختر کے اس شعر کا گمان ہو رہا تھا ۔

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

ان کے مزاح کی شوخی اور شگفتگی سے زعفران زار بنی ہوئی تھی ۔

امریکہ آنے کا قصہ سنانے کے بعد مجتبیٰ حسین نے " ریلوے منتری مسافر بن گئے " سنایا ، چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے :

" اور ایک دن ریل منتری نے اچانک اپنے سکریٹری کو بلا کر کہا دیکھو جی ہم کل بھیس بدل کر ایک عام مسافر کی طرح کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا چاہتے ہیں ۔ تمہیں بھی بھیس بدل کر ہمارے ساتھ چلنا ہوگا سیکرٹری نے پلکیں جھپکا کر منتری کو دیکھا ۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر اسے بھیس بدلنے کی کیا ضرورت ہے بھیس بدلنا تو صرف منتریوں کا کام ہوتا ہے ...
شام تک بھیس بدلتے بدلتے وہ اپنی اصلی حالت پہ آگئے " ۔

" سکریٹری نے کہا حضور یہ الیکشن کا ٹکٹ نہیں ریل کا ٹکٹ ہے یہ اتنی آسانی سے نہیں

ملے گا اس کے لئے باضابطہ فری سٹائل کشتی لڑنی پڑتی ہے "اور کیو میں آگے بڑھنے کے لئے جب سکریٹری نے کسی کو رشوت دی"تو مستری جی بہت خوش ہوئے اور بولے واہ یہ تو بڑا اچھا انتظام ہے ۔ ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ریلوے ایڈمنسٹریشن نے عوام کی سہولت کے لئے یہ بندوبست بھی کر رکھا ہے"۔

اور کھڑکی کے ذریعہ ڈبے میں داخل ہونے پر مستری پس و پیش کرتا ہے تو سکریٹری کہتا ہے "حضور یہ کاریگری ہے ۔ قدیم زمانے میں ہمارے کاریگر ململ کا پورا تھان ایک انگوٹھی سے گزار دیا کرتے تھے تو کیا اب ہم ایک مستری کو ایک کھڑکی سے نہیں گزار سکتے ۔ آپ چنتا نہ کریں ریل کی کھڑکی بہت کشادہ ہوتی ہے ۔ میرا دعویٰ ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں ساری ریل گاڑی کو انجن سمیت اس ڈبہ کی کھڑکی میں سے گزار سکتا ہوں"۔

ریل میں سوار ہونے کا مرحلہ اور ڈبے کے اندر مسافروں کا حشر وہ سلیس اور سادہ زبان میں بیان کر رہے تھے اور ہر فقرے پہ حاصل غزل شعر جیسی داد کھنکتے ہوئے قہقہوں کی صورت میں وصول کر رہے تھے ۔

مجتبیٰ حسین سامعین کو ہنسانا ہی نہیں رلانا بھی جانتے ہیں ۔ لیکن چونکہ وہ مسکراہٹیں بے دریغ بانٹتے ہیں لہذا خود اس اچھوتی کسک سے روشناس کرانے کے فوراً بعد وہ حاضرین محفل کو پھر سے قہقہوں کی نگری میں لے گئے ۔

"صاحب باتھ روم میں ہیں "اقتباس ملاحظہ کیجئے :

"ایک دن میں نے اپنے علاقہ کے نیتا بدری نرائن جی سے بات کرنے کے لئے فون کیا تو ان کے پرائیوٹ سکریٹری نے کہا صاحب باتھ روم میں ہیں تھوڑی دیر بعد فون کریں ـــــ میں نے پھر فون ملایا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا صاحب باتھ روم سے کب تک باہر آئیں گے ؟ سکریٹری بولا ۔ عجیب آدمی ہیں آپ بھی موت اور آدمی کے باتھ روم سے نکلنے کا بھی کوئی وقت مقرر ہوتا ہے کبھی نہ کبھی نکل آئیں گے "اور ایک دن بیوی کہتی ہے "تم جب بھی کسی بڑے آدمی کو فون ملاتے ہو تو وہ ہمیشہ باتھ روم میں ہوتا ہے اور تم ہو کہ سارا دن ڈرائینگ روم میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہو ۔ آخر میں بھی تو بڑے آدمی کی بیوی بننا چاہتی ہوں آج سے تم بھی باتھ روم میں رہنے کی کوشش کرو ۔ اگر نہیں رہتے تو میں وہاں رہنے لگ جاؤں گی"۔

تالیوں کی زبردست گونج میں وہ اپنی سیٹ پہ گئے تو شکاگو کی مصروف ادبی ثقافتی ، سماجی اور حیدرآبادی شخصیت حسن چشتی نے مجتبیٰ حسین کے بارے میں مختصر اور جامع مضمون پڑھتے ہوئے علامہ فرقت کاکوروی کے حوالے سے کہا کہ "مجتبیٰ حسین کو محبتوں کا سوداگر کہا جاتا ہے لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں کیونکہ سوداگر تو سود و زیاں کے چکر میں رہتا ہے اور مجتبیٰ کو سود و زیاں سے کوئی واسطہ نہیں وہ تو مسکراہٹیں اور قہقہے بانٹتے ہیں"۔ مجھے فخر ہے کہ سترہ کتابوں کے اس عظیم مصنف کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس سے باتیں کی ہیں ۔ میری بس یہ دعا ہے کہ :

"تندرستی کے ساتھ صدیوں تک
تم کو رکھے خدا سلامت بھی"

اور جاتے جاتے مزاحیہ انداز میں یہ چٹکلا بھی سامعین کے گوش گزار کر گئے کہ مجتبیٰ حسین نے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں اور

دانشوروں پر مضامین اور خاکے لکھے ہیں۔ جس میں میں بھی شامل ہوں۔

نوشاد صاحب نے مجتبیٰ حسین کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر غمزدہ لہجے میں کہنے لگے کہ آپ سب کو شاید علم ہو کہ میرے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے۔ شکیل گئے، خمار صاحب گئے، اور اب مجروح سلطان پوری داغ مفارقت دے گئے۔ میں گزارش کروں گا کہ آپ سب ایک منٹ کے لئے کھڑے ہو کر ان کے لئے دعائے خیر کیجئے۔

بعد ازاں انہوں نے لکھنو کے حضرت پارک کے حوالے سے جہاں وہ بچپن میں تفریح کے لئے جایا کرتے تھے یہ قطعہ سنایا:

مطرب کی صدا خاموش ہوئی شاعر کا قلم بھی ٹوٹ گیا
راہبر ہے نہ کوئی راہی ہے ہر سنگی ساتھی چھوٹ گیا
جس باغ میں پنچھی گاتے تھے ہر شاخ پہ جھولے پڑتے تھے
کیوں ہنستے ہوئے اس گلشن کو بے رحم زمانہ لوٹ گیا

اور پھر دو غزلیں سامعین کی نذر کرتے ہوئے کہنے لگے میں حال ہی میں لکھنؤ گیا تھا تو کسی نے ہمارا پرانا گھر دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے کہا میرے بچپن میں وہ گھر دادا نے کسی کو دے دیا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ چونے سے اسے لیپا پوتا جاتا تھا۔ میرے دادا باہر چبوترے پر اپنے پنڈت اور پادری دوست کے ساتھ حقہ پیتے اور تینوں ایک تھالی میں کھاتے اور ایک ہی گلاس میں پانی پیتے تھے۔ میں گورنر صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ لتا منگیشکر بھی ساتھ تھیں۔ گورنر صاحب نے اس گھر کا پتہ لگوایا جب ہم وہاں گئے تو وہ مکان آئل پینٹ کیا ہوا تھا۔ لتا کہنے لگیں یہ تو بڑا اچھا رنگ و روغن کیا ہوا ہے۔ پرانے بچے کچے لوگ اپنے دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے کہ لکھنؤ کا کوئی پرانا رہنے والا آیا ہے۔ گلی کی مسجد خستہ حالت میں تھی۔ آنگن میں جو ایک درخت تھا وہ بھی اداس باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل بہت اداس ہوا اور میں رات بھر نہ سو سکا۔ اسی حالت میں یہ چند شعر ہوئے تھے صبح لتا کو سنائے تو وہ بھی رو پڑیں۔ حاصل غزل شعر ملاحظہ فرمائیے:

رند جہاں سب ایک جام سے پیتے تھے
آج نہ وہ مے خوار نہ وہ میخانہ ہے

نوشاد صاحب اپنی شفقتیں نچھاور کرتے ہوئے رخصت ہوئے تو ایک بار پھر مجتبیٰ حسین صاحب کو دعوت سخن دی گئی۔ انہوں نے سفر نامے کے حوالے سے "حیدر آباد کا جو ذکر کیا" پڑھنا شروع کیا تو ایسے بات سے بات پیدا کی اپنے الفاظ کا ایسا جادو جگایا کہ ہال فلک شگاف قہقہوں سے گونجتا رہا۔

لندن کی آکسفورڈ سٹریٹ میں ایک پرانا دوست ملتا ہے تو کہتا ہے: "ایک دن میرے گھر چلو خالص حیدر آبادی کھانا کھلاؤں گا۔ ہم نے کہا لندن میں آئے بیس دن ہوگئے ہیں ان بیس دنوں میں اتنے حیدر آبادی کھانے کھائے کہ خود حیدر آباد میں پچھلے تیرہ برسوں میں نہ کھائے ہوں گے۔ میں تو انگریزی کھانا کھانے کو ترس گیا ہوں۔ دوست بولا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دو حیدر آبادی پردیس میں ملیں اور بگھارے بینگن بیچ میں نہ آئیں"۔

لندن میں حیدر آبادی شادی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "انگریزوں کو بتایا گیا کہ عقد کے بعد جب چھوہارے اچھالے جائیں تو انہیں لوٹا جائے انگریزوں کی نو آبادیات جب سے ختم ہوئی ہیں وہ لوٹ مار کے عادی نہیں رہے مگر چھوہاروں کی لوٹ مار میں ان کی فطری صلاحیتیں کام کر گئیں"۔

جب مجتبیٰ حسین نے یونیسکو کی چھتری " سنانا شروع کیا تو واہ واہ اور سبحان اللہ کی صداؤں کے ساتھ بے ساختہ قہقہوں کی کھنک بھی شامل تھی۔ یہ کہانی لکھتے وقت ان کے قلم سے ظرافت کے دریا بہے تھے اور سناتے وقت ان کے ہونٹوں سے لطافت کے جھرنے پھوٹ رہے تھے۔ اپنے نپے تلے لہجے میں وہ کہانی یوں بیاں کر رہے تھے جیسے خوش گو شاعر اپنی خوبصورت غزل کو بڑے سحر انگیز ترنم سے لہک لہک کر پڑھ رہا ہو۔

"وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا وہ ہمیں آج ملی ہے دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اس کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں اسی کے سائے میں رہنا ہے آٹھ دن بعد ہم اپنے ہوٹل میں گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی فون اٹھایا تو دوسری طرف سے بیوی کی آواز آئی ہم نے بے ساختہ پوچھا ہیلو کیسی ہو خیریت سے تو ہو نا؟ ہماری بیوی نے کہا میری خیریت جائے بھاڑ میں پہلے یہ بتاؤ اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی ساتھ ہے ؟

اور ۰ ہم تو کہتے ہیں اس چھتری نے جاپان میں ہمیں اپنی بیوی کی عدم موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اب یہ چھتری نہیں سچ مچ ہماری بیوی بن گئی ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ ہم نے اسے کتنا کم استعمال کیا ہے 53 دن میں صرف ایک بار " ۔

اپنے مزاج کی دلکشی، محاوروں کی برجستگی طبیعت کی شگفتگی، زبان کی شیرینی اور انداز بیاں کے حسن سے ایسا punch کشید کیا جس کی روح پرور لذت سے سامعین پہ ایک کیف آگیں سرشاری چھائی رہی۔ اور قصہ کوتاہ یہ کہ افتتاح سے اختتام تک مجتبیٰ حسین نے محفل کو اس طرح لوٹا کہ ان کی اس نثری لوٹ مار کا چرچا لاس اینجلس کی دنیائے اردو ادب میں بڑے زور و شور سے ہوتا رہے گا۔

پروگرام کا دوسرا حصہ شعری نشست کا تھا جس کی نظامت معروف شاعرہ نوشی گیلانی اور صدارت جناب حسن چشتی نے کی۔

اس شعری نشست میں جناب حسن چشتی، محترمہ شہناز امتیاز (ایری زونا) محترمہ آصفہ نشاط، جناب طبا طبائی، جناب فضل الضیا سحر، جناب فرحت شہزاد، جناب مجید اختر، جناب خالد خواجہ، جناب عبدالرحمن صدیقی، جناب ارشاد احمد صدیقی، جناب عرفان مرتضیٰ، جناب ساحر اکبر آبادی نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔

اس رات مجتبیٰ حسین کے مزاح کی اتنی کلیاں چٹکیں، لطافت کے اتنے رنگ بکھرے۔ شگفتگی کے اتنے پھول کھلے کہ ان کی خوشبو سے ساری فضاء مہک اٹھی۔ ☆

واجد ندیم
(شکاگو)

جشن مجتبیٰ حسین ....شکاگو میں

۲۸ مئی ۲۰۰۰ء اتوار کی موسم بہار کی ایک خوشگوار شام شکاگو والوں کو ایک عرصہ تک یاد رہے گی اور اس کے تصور کے ساتھ ہی ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگے گی۔ کیوں کہ اس شام عالمی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کا جشن "مسجد یہ اسلامک سنٹر" میں بڑے ہی اہتمام اور انتظام کے ساتھ منایا گیا۔ موسم صبح ہی سے بڑا خوشگوار اور ہلکی ہلکی گلابی جاڑوں والی کیفیت تھی اور صبح ہی سے اس جشن کے محرک اور روح رواں جناب حسن چشتی اور راقم الحروف اس جشن کی تیاریوں اور انتظامات میں لگے رہے جو دی عثمانین کے جھنڈے تلے منایا جارہا تھا۔

دراصل یہ ادبی محفل جو ایک بڑے پیمانے پر منعقد کی جارہی تھی نثری نوعیت کی تھی اور یہ خدشہ ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا تھا کہ "ایک نثری محفل" کی کس حد تک پذیرائی ہوتی ہے۔ شعری محفلوں اور بین الاقوامی مشاعروں کا چسکا تو شکاگو والوں کو لگ چکا ہے جب کہ یہ ایک نثری محفل تھی جس کے آخر میں مشاعرہ کا بھی لالچ دیا گیا تھا۔ بہرحال وقت مقررہ پر لوگ آنا شروع ہوگئے اور تاخیر کے ساتھ، حسب روایت اس جلسہ کا آغاز ہوا۔

تلاوت کلام پاک سے جو ایک ۸ سالہ لڑکی (دختر عبدالباسط) نے کی اس جلسہ کا آغاز ہوا۔ پھر دی عثمانین کے صدر خلیل الزماں نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے صاحب جشن جناب مجتبیٰ حسین اور ان کے بڑے بھائی جناب یوسف حسین، صدر جلسہ جناب عابد اللہ غازی، محترمہ رضیہ فصیح احمد اور جناب حسن چشتی کو شہ نشین پر جلوہ افروز ہونے کی گزارش کی اور مائک ناظم جلسہ عبدالحکیم کے حوالے کیا۔

سب سے پہلے پرویز ید اللہ مہدی مائک پر تشریف لائے اور "خاکہ نگار کا خاکہ" کے عنوان سے ایک بہت ہی دلچسپ اور قہقہوں سے بھرپور خاکہ سنایا۔ ان کے بعد واجد ندیم نے اپنا خاکہ بعنوان "خبردار ہوشیار، اپنی اپنی ٹوپیوں سے مجتبیٰ حسین آگئے ہیں" سنایا اور محفل کو زعفران زار بنادیا۔ ایک اخبار کی سرخی "خبردار ہوشیار مجتبیٰ حسین آگئے ہیں" کے حوالے سے کہا کہ اس میں خبردار ہوشیار ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ مجتبیٰ حسین نہ ہوئے پھولن دیوی ہوگئے۔ پھر اپنے عنوان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مجتبیٰ کی شخصیت اتنی قد آور ہے کہ اس کو دیکھنے کے لئے کوئی اپنا سر اونچا کرے تو اس کے سر سے اس کی ٹوپی گرجائے گی۔ پھر مجتبیٰ کی شخصیت کے حوالے سے کہا کہ ان کی مشغولیات گھر کے بارے میں ان کی کسی کتاب کے گردپوش پر لکھا ہے "صبح سویرے گھر پہنچنا اور علی الصبح گھر سے نکل جانا"۔

زیڈ حسن جو ابن بطوطہ ثانی کے نام سے سفرنامے بھی لکھتے ہیں اپنے خاکے میں مجتبیٰ حسین اور ابن بطوطہ ثانی کے درمیان ہونے والے ایک خیالی مکالمے کو بڑی ہی خوبی سے پیش کیا اور داد تحسین حاصل کی۔

حسن چشتی نے کہا کہ ان کی ایک دیرینہ آرزو آج پوری ہوئی جب کہ وہ مجتبیٰ حسین جیسی عالمگیر شخصیت کے ساتھ شانہ بہ شانہ

بیٹھے ہیں اور انہوں نے سامعین کا شکریہ بھی ادا کیا کہ انہوں نے ان کی توقعات سے زیادہ پذیرائی کی۔
خورشید خضر نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ عبدالحکیم نے جو نظامت بھی کر رہے تھے گا ہے ما ہے مجتبیٰ کی تعریف و توصیف میں اپنے قطعات پیش کئے۔ جناب ہاشم علی اختر کا مضمون جو اتفاق سے نیویارک گئے ہوئے تھے عبدالحکیم نے پڑھ کر سنایا۔ خواجہ ریاض الدین عطش جو ایک کہنہ مشق شاعر ہیں منظوم خراج تحسین و عقیدت پیش کیا۔

اے کہ فرزند دکن سیف قلم کے سورما

مرحباء اے نامدار شوخیٔ حرف و صدا

صاحب جشن مجتبیٰ حسین مسلسل ایک گھنٹہ تک سامعین کے اصرار پر اپنی تخلیقات سے مختلف اقتباسات مسلسل قہقہوں کے درمیان پیش کرتے رہے اور اپنی مزاح نگاری اور انداز پیش کش سے ایک سماں باندھ دیا۔ تالیوں کی مسلسل گونج اور واہ واہ اور سبحان اللہ پر اس نثری محفل پر کسی شعری محفل کا گمان ہونے لگا۔
تھوڑے سے وقفہ کے بعد شعری نشست کا آغاز ہوا۔ جب کہ رات بھیگ چکی تھی پھر بھی شائقین شعر اپنی اپنی نشستوں پر ڈٹے رہے اور واجد ندیم کے مزاحیہ اور سنجیدہ اور رشید شیخ زیڈ حسن، عبدالحکیم توفیق انصاری، حیدرآباد سے آئی ہوئی مہمان شاعرہ محترمہ اقبال جہاں قدیر اور خلیل الزماں کے کلام پر بھرپور داد تحسین دی۔ صدر محفل عابد اللہ غازی نے بھی اپنی دلچسپ تقریر اور پھر اپنے سنجیدہ و مزاحیہ کلام سے بے حد محظوظ کیا۔ آخر میں صدر مشاعرہ جناب حسن چشتی نے اپنے کلام بلاغت نظام سے محفل کو گرما دیا۔ اس محفل کا صبح تین بجے اختتام ہوا۔ ☆

ڈاکٹر اسلم پرویز

شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے پر لطف واقعات

۱) ۔ سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اقتصادیات اور تعلیم کے ماہر ہونے کے علاوہ اردو کے ادیب بھی تھے ۔ یورپ کے کسی شہر کی سڑک کی پٹری پر وہ کسی خیال میں مستغرق گردن جھکائے چلے جارہے تھے کہ سامنے سے آتے ہوئے کسی سفید فام سے ان کی اچانک ٹکر ہوگئی ۔ اس سفید فام نے جھلا کر کہا "ڈیم فول" ذاکر صاحب نے اسی پھرتی سے جواب دیا : "ذاکر حسین" یعنی آپ نے اپنا تعارف دیا ۔ میں اپنا دے رہا ہوں ۔

۲) ۔ مجاز اور سلام مچھلی شہری محو گفتگو تھے ۔ دوران گفتگو مجاز نے کہا : "یار سلام تم شاعر تو اچھے ہو مگر اردو والوں نے تمہاری قدر نہیں کی ۔ لاؤ ایسا کریں کہ تمہارے کلام کا انگریزی میں ترجمہ کردیتے ہیں" ۔ سلام نے کہا یہ تو ٹھیک ہے لیکن انگریزی میں بھی کسی نے نہ پوچھا تو" ۔ مجاز نے بے ساختہ کہا : "ہم پھر واپس اس کا اردو میں ترجمہ کردیں گے" ۔

۳) ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر تھے ۔ ڈاکٹر محمد عزیز شعبے کے انتہائی سنجیدہ استاد تھے ۔ ان کے زیر نگرانی ایک محترمہ پی ایچ ڈی کررہی تھیں ۔ اسی دوران ان کی شادی ہوگئی اور کچھ دن بعد بال بچہ ہونے کی نوبت آگئی ۔ انہوں نے صدر شعبہ کے نام درخواست لکھ کر اپنی مجبوری بیان کی اور پی ایچ ڈی کے کام سے کچھ دن کی رخصت چاہی ۔ ڈاکٹر عزیز نے یہ درخواست اپنے سفارشی نوٹ کے ساتھ رشید صاحب کے سامنے پیش کردی ۔ رشید صاحب نے درخواست کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی سنجیدہ لب و لہجے میں عزیز صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا مگر عزیز صاحب آپ سے تو سپروائز کرنے کو کہا گیا تھا ۔

۴) ۔ جب نئی دلی میں آل انڈیا ریڈیو نیا نیا قائم ہوا تھا ۔ بخاری صاحب اس کے ڈائرکٹر تھے ۔ اس زمانے میں پروگرام ریکارڈ کرنے کا سسٹم شروع نہیں ہوا تھا ۔ اس لئے پروگرام ساتھ ہی براڈ کاسٹ ہوتے تھے ۔ اسٹوڈیو میں قوال غالب کی یہ غزل گارہا تھا :

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

جب قوال "قید حیات و بند غم والے شعر پر پہنچا تو اس نے مصرع یوں اٹھایا :

قید و حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں

ڈیوٹی روم میں ڈیوٹی آفیسر (بھی کانوں سے) ایر فون لگائے پروگرام سن رہا تھا ۔ وہ مصرع سن کر کھٹکا تو سہی لیکن شاید اس میں اتنی خود اعتمادی نہیں تھی کہ قوال کو ٹوک سکتا لہذا اس نے فورا ڈیوٹی روم سے بخاری صاحب کو فون گھمایا اور کہا سر ذرا ریڈیو پر سنئے قوال غالب کا یہ شعر صحیح پڑھ رہا ہے کیا ۔ قوال جھوم جھوم کر مصرع دہرانے میں مصروف تھا ۔ "قید و حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں" ۔ بخاری صاحب نے سنا تو انہیں قوال کی عقل پر تو رونا آیا ہی لیکن ڈیوٹی آفیسر پر بھی یہ سوچ کر غصہ آیا کہ کم بخت اتنی سی غلطی ٹھیک نہیں کراسکتا ۔ چنانچہ انہوں نے طیش میں آکر ڈیوٹی آفیسر سے کہا ۔ اس سے کہنا "اصل میں چاروں ایک ہیں" چنانچہ ڈیوٹی آفیسر نے فورا قوال کو کیو دیا اور قوال اب غالب کا مصرع یوں گارہا تھا "قید و حیات و بند و غم اصل میں چاروں ایک ہیں" اور بخاری صاحب اپنے گھر پر بیٹھے اسے سن کر اپنا سر دھن رہے تھے" ۔ ☆

اداریہ

نامور شاعر، نقاد، ادیب، مفکر اور دانشور علی سردار جعفری کا طویل علالت کے بعد ۸۶ سال کی عمر میں یکم اگسٹ کو انتقال ہوگیا۔ ان کا شمار اردو کے ان دو چار ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا تھا جنھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ ان کے انتقال کے بعد اردو میں اس درجہ اور اس پایہ کا کوئی ادیب یا شاعر حیات نہیں رہا ۔ سردار جعفری کی یہ عظمت یہ شہرت ان کی ۶۵ سال سے زیادہ عرصہ پر محیط فعال ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ بلکہ صحیح معنی میں اپنی ذات سے ایک انجمن، ایک تحریک تھے ۔ ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے وہ سرخیل تھے ۔ اس تحریک کا ان سے بہتر کوئی مبلغ، کوئی وکیل پیدا نہیں ہوسکا ۔ انہوں نے خود کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا اور صحت مند تنقیدوں کا وہ ہمیشہ اثر قبول کرتے رہے ۔ وہ ایک بے مثال مقرر بھی تھے ۔ بلا کا حافظہ پایا تھا ۔ اردو فارسی کے علاوہ وہ ہندی، سنسکرت اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے ۔ وہ بے تکان بولتے اور یوں بولتے کہ تقریر پر مرصع تحریر کا گمان ہوتا تھا ۔ انہوں نے جس موضوع پر توجہ کی اس کے ماہر کہلائے ۔ اقبال ان کا مرغوب موضوع تھا ۔

علی سردار جعفری اپنی ذات میں بند نہیں تھے ۔ ان کا سماج سے رشتہ اٹوٹ تھا ۔ انہوں نے آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا اور مزدور و غریب طبقات کی بہبود کے لئے بھی اپنا قلم استعمال کیا ۔ اردو زبان کی بقاء و ترویج کے لئے علی سردار جعفری نے مختلف سطحوں پر خود کو مشغول رکھا ۔ ہندوستان کے تمام اہم اردو اداروں اور ادیبوں و شاعروں سے ان کا شخصی ربط قائم تھا ۔ ملک کا سب سے اہم گیان پیٹھ ایوارڈ انہیں عطا ہوا تھا اس کے علاوہ ہر ریاست کے ادبی اداروں نے ان کو کسی نہ کسی طرح کے اعزاز سے نوازا تھا ۔

علی سردار جعفری کے انتقال پر ادارہ شگوفہ اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے ۔ ☆

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ
اشاعت کا ۳۳ واں سال

شگوفہ

جلد ۳۳
شمارہ ۹
حیدرآباد

ستمبر ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ: ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064
شگوفہ انٹرنٹ پر : http://www.shugoofa.cjb.net
ای میل : shugoofa @ india.com

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

قومی اقلیتی، ترقیاتی و مالیاتی کارپوریشن

قاری محمد میاں مظہری
(چیرمین: قومی اقلیتی ترقیاتی مالیاتی کارپوریشن)

حکومت ہند کی جانب سے قومی اقلیتی ترقیاتی اور مالیاتی کارپوریشن کا قیام تسلیم شدہ اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کو بڑھاوا دینے کے لئے کیا گیا ہے جس میں مسلمان، عیسائی، سکھ، بودھ اور پارسی شامل ہیں۔ یہ کارپوریشن سرکاری ادارہ ہے۔ اسے 30 ستمبر 1994ء کو کمپنی ایکٹ کی دفعہ 25 کے تحت ایک غیر منافع بخش کمپنی کے طور پر کارپوریشن بنایا گیا۔ کارپوریشن کے مقاصد اور نشانے مندرجہ ذیل ہیں:

٭ اس کا اہم مقصد پسماندہ طبقے کے اقلیتی طبقوں کی بھلائی کے لئے اقتصادی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو ترغیب دینا ہے جس میں تجارت پیشہ گروپ کی عورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

٭ وقتاً فوقتاً حکومت کی جانب سے مقررہ آمدنی اور اقتصادی کسوٹیوں کی بنیاد پر اقلیتی طبقے کے افراد یا افراد کے گروپ کو مالی اور اقتصادی اسکیموں اور منصوبوں کے لئے قرض اور ایڈوانس دیا جاتا ہے

٭ اقلیتوں کے فائدے کے لئے خود روزگاری اور دیگر کاموں کو بڑھاوا دینا۔

٭ وقتاً فوقتاً حکومت ہند یا ریزرو بینک کی جانب سے مقررہ حکم یا منصوبے کے تحت طے شدہ شرح سود پر قرض یا پیشگی دینا۔

٭ اقلیتی فرقہ کے اہل افراد کو [illegible] روزگاری تکنیک، پروفیشن اور اعلیٰ تعلیم کیلئے قرض اور پیشگی رقم مہیا کرائی جاتی ہے۔

٭ پیداواری یونٹوں کے عمل اور بہتر انتظام کیلئے اقلیتوں کی تکنیکی اور صنعتی مہارت کو فروغ دینے کے لئے امداد دینا

٭ اقلیتوں کی ترقی کے لئے کام کرنے والی ریاستی سطح کی تنظیموں کو مالی امداد یا اکوئٹی فراہم کرانا۔ [illegible] میں اور دوبارہ مالیہ کے توسط سے [illegible] کے حصول میں امداد دینا [illegible] کے طور پر کام کرتے ہوئے ریاستی حکومت [illegible] زیر انتظام حکومت کی جانب سے [illegible]

تمام کارپوریشنوں، سرکل اور دیگر تنظیموں سے اشتراک اور جانچ مانیٹرنگ کرنا۔

٭ اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کے لئے تعاون کی ذمہ داری دینا اور

٭ اقلیتوں کی ترقی کیلئے سرکاری پالیسیوں اور پروگراموں کو بڑھانے میں مدد دینا۔

2-اجتماعی نشانہ

این ایم ڈی ایف سی کے اجتماعی ہدف میں سیدھا فائدہ ان اشخاص کو ملے گا جو اقلیتی فرقے اور خط افلاس سے بھی نیچے درجہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ موجودہ حالات میں قومی اقلیتی کمیشن کے قانون 1992ء کے مطابق یہ طبقے ہیں۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، بودھ اور پارسی۔ ایسے خاندان جن کی آمدنی گاؤں میں ہر سال 32 ہزار روپے سے اور شہر میں 42 ہزار روپیہ سے کم ہو اور جسے خط افلاس سے نیچے درجہ بند کیا گیا ہو۔

3-این ایم ڈی ایف سی کی مالی تقسیم

کارپوریشن کے اختیار میں شیئر رقم پانچ سو کروڑ روپے ہے۔ حکومت ہند کا مالی حصہ 60 فیصدی تین سو کروڑ روپے ہے جبکہ مرکزی سرکار کے زیر انتظام صوبے کی حکومتوں سے مالی حصہ

26 فیصد یعنی [illegible] کروڑ روپے سے [illegible] 14 فیصد 70 کروڑ روپے مالی حصہ [illegible]

4-مالی امدادی منصوبہ

این ایم ڈی ایف سی کے پاس اپنے آخری ضرورت مندوں تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ ایک ہے ریاستی چینالائزنگ ایجنسی کے توسط سے (ایس سی اے) جنہیں متعلقہ ریاست مرکز کے زیر انتظام حکومت کے ذریعہ نامزد کیا گیا ہو۔ اور دوسرا غیر سرکاری اداروں (این جی او) کے ذریعے سے۔

کامیابی

(الف) 31-03-2000 تک ایس سی اے پروگراموں کے تحت این ایم ڈی ایف سی کے ذریعہ 21 ریاستوں میں پہلے 66891 افراد کو فائدہ اور ایک مرکز کے زیر انتظام ریاست کو 224 34 کروڑ روپے کی مالی امداد دی گئی۔

(ب) این ایم ڈی ایف سی کے ذریعہ سال 1998-99 سے این جی او کے پروگراموں کو عمل میں لایا جا رہا ہے اور مارچ 99 تک پہلے سال کے دوران نو این جی او کے 1948 افراد کو قلیل مالی امداد کے لئے 38.37 لاکھ روپے دئے گئے۔ اس کے علاوہ 7 این جی او کو خود امدادی [illegible] کے فروغ اور مستحکم کرنے کے لئے 4.90 لاکھ روپے کا بلا سودی قرض دیا گیا۔

1999-2000 کے دوران 1000 ضرورت مندوں کے لئے 19 این جی او کو 38.56 لاکھ روپے دئے گئے اس کے علاوہ 21 این جی او کو خود امدادی گروپوں کے فروغ اور مستحکم کرنے کے لئے 25 14 لاکھ روپے کا بلا سودی قرض دیا گیا۔

□□□

یوسف ناظم

داستان پاپوش کی

اس خطہ ارض پر جوتے کی پیدائش کب عمل میں آئی اس کے بارے میں کوئی مستند کتاب یا مخطوطہ دنیا کی کسی بھی اورینٹل لائبریری میں موجود نہیں ہے لیکن جب سے یہ نمودار ہوا ہے دنیا میں کونے کونے میں چلا خوب اور آئندہ بھی اسی رفتار اور طاقت سے چلتا رہے گا۔ یہ مقولہ تو آپ کو یاد ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جوتا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور انسان کے کڑے وقت میں یہی کام بھی آتا ہے۔ جوتا ہے تو پاؤں میں پہننے کی چیز لیکن انسان کی زندگی میں ایسے کئی نشیب و فراز آتے ہیں، جب اسے جوتا ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔ جوتا، اصل میں انسانوں یعنی تنگے پاؤں چلنے والے راہروں کی مشکلات حل کرنے کے لیے ایجاد کیا گیا تھا اور اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ جوتے کی ایجاد کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور آج دنیا کی ہر بڑی طاقت، دوسری بڑی طاقت کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ یہ بڑی طاقتیں، مجلس اقوام متحدہ (لفظ متحدہ پر زیر لب مسکرانے کی ضرورت نہیں ہے) میں جب بھی آمنے سامنے بیٹھتی ہیں سارے جہاں کا درد ان کے نمائندوں کے دل میں سمٹ کر آجاتا ہے اور جب بھی وہ کسی جنگ کو امن میں تبدیل کرنے کے لیے غور و خوض کرتی ہیں، پہلے "سیز فائر" کا حکم نامہ جاری کرتی ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ یہ حکم نامہ اندرونی طور پر کسی نہ کسی پہلو سے کسی نہ کسی بڑی طاقت ہی کے خلاف جاری ہوتا ہے اور اس سیز فائر کی تجویز خود اسی ملک کے نمائندے کی طرف سے پیش ہوتی ہے) اس وقت ہم شاعری کے موڈ میں نہیں ہیں ورنہ اپنے محترم شاعر اقبال کی ایک نظم کی نظم آپ کو فرفر سنا دیتے۔ یعنی طاقتیں جو بظاہر درجۂ دوم یا درجہ سوم کی طاقتیں ہوتی ہیں اس حکم کی پرواہ نہیں کرتیں۔ وجہ آپ کو معلوم ہے۔ عوام نے بھی اب جنگوں کو جوتم پیزار کا نام دے رکھا ہے اور ان کا خیال ہے کہ اس جوتم پیزار کا سلسلہ تو اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب دنیا کے اولین دو سگے بھائی کسی معمولی سی بات پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ یہ لڑائی نہایت محدود پیمانے پر لڑی گئی۔ کیوں کہ اس وقت دنیا کی آبادی تھی ہی کتنی۔ ایک عام اندازے کے مطابق پوری دنیا کی آبادی اس لڑائی کے موقعے پر پانچ یا چھ نفوس پر مشتمل ہوگی۔ (اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی)۔ اس لڑائی میں سیز فائر کا حکم نہیں دیا جاسکا کیوں کہ اس وقت نمائشی کام شروع نہیں ہوئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سگے بھائی کی وفات واقع ہو گئی۔ لوگ اس سانحے کو بھی جوتم پیزار کا نام دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے یعنی لغوی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ یوں بھی لوگوں کو لغت سے کیا لینا دینا ہے۔ وہ کہتے ہیں عمل اور محاوروں میں صدیوں کا فاصلہ تو ہوتا ہی ہے محاوروں کے انتظار میں ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔

اس وقت عام طور پر مشہور یہ ہے کہ جوتا سب سے زیادہ ہندوستان میں چل رہا ہے۔ چلنا ہی چاہیے۔ بڑا ملک ہے اور فطرتاً غریب ہے کوئی نہ کوئی مشغلہ بہر حال چاہیے۔ مانا کہ چین رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ہم سے بڑا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہاں لوگوں کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ بہر حال پاپوش شناسی کے ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ کم سے کم اس معاملے میں چین، ہمارے مقابلے میں پسماندہ ملک ہے — لیکن جانے دیجیے۔ اس قسم کے مقابلے اور موازنے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ مقابلے وہ اچھے معلوم ہوتے ہیں جن میں بالائی آمدنی، مقررہ آمدنی سے دو جوتے آگے ہو۔ (ویسے دو جوتے تو کم ہی ہوتے ہیں لیکن ...

ان کی نوک، تکنیکی تشکیل اور انی کی طرح کار آمد ہو تو بات اور ہے) عام لوگوں کا خیال ہے کہ جوتے کی نوک کے مقابلے میں (پھر مقابلہ ... بے اثر ہوتی جارہی ہے ۔ ان کا دو ٹوک فیصلہ یہ ہے کہ قلم بھی ان دنوں بے ضمیر ہوتا جارہا ہے ۔ حد ہو گئی اب قلم میں ضمیر تلاش کیا جانے لگا ہے ۔ ایسا شبہ ہونے لگا ہے کہ عوام کے فیصلے سرکار کے فیصلوں سے بہتر ثابت ہورہے ہیں ۔ یہ قلم وہی ہے جو کسی زمانے میں کاغذ پر چلتا تو پس منظر میں " نوائے سروش " سرود اور ستار کی موسیقی کا ماحول پیدا کردیتی تھی ۔ " نوائے سروش " ۲۴ رکنی آرکسٹرا کے نقار خانے میں گم ہوکر رہ گئی ہے ۔ ٹھہریے ۔ یاد آیا ہم جوتوں کا ذکر کررہے تھے ۔ بیچ میں خوا مخواہ دال بٹنے لگی ۔ ہوتا ہے جوتوں کا ذکر ہوگا تو توجہ ادھر ادھر ہوہی جاتی ہے حتیٰ کہ مسجد میں نماز پڑھتے وقت بھی دھیان اپنے جوتوں کی ہی طرف لگا رہتا ہے اور اسی بدنیتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی قیام کے وقت سجدے میں گر پڑتا ہے اور بس اسی وقت اس کے جوتے ، داغ مفارقت دے جاتے ہیں ۔ اسی لیے کچھ لوگ تو اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ جانماز کا کونا الٹ کر اپنے جوتے اس کے نیچے رکھ کر جانماز ہی سے ڈھانک دیتے ہیں ۔ پڑوس میں کھڑے رہنے والے نمازی کی جان پر بن جاتی ہے اسے بھی جوتوں ہی کو سجدہ کرنا پڑتا ہے ۔ وہ شکایت اس لیے نہیں کرسکتا کہ مسجد میں فتنہ کھڑا کرنا منع ہے (مزید فتنوں کے لیے وہاں وقت ہی کہاں ہے) ۔

جوتے کی ابتدائی شکل و صورت کے بارے میں آپ سے کیا عرض کیا جائے ۔ آج کل جو جوتے پہنے جارہے ہیں ان کی حالت پر افسوس اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ اتنی حسین و جمیل چیزیں پاؤں میں پہنی جاتی ہے اور ان کی خوبصورتی دیکھنے کے لیے آدمی کو دہرا ہوکر جھکنا پڑتا ہے ۔ یہ بعض صورتوں میں اتنے نرم اور گدیلے ہوتے ہیں کہ بستر پر تکیے کا کام دے سکتے ہیں ۔ کچھ شاعروں کو ہم نے واقعی انہی تکیوں پر آرام کرنے اور شعر کہتے دیکھا ہے ۔ یہ ان کا تکیہ کلام ہوتا ہے ۔ بعض شاعر ، جو تقریباً شب بیدار ہوتے ہیں ، یعنی رات گئے اس وقت گھر واپس پہنچتے ہیں جب گھر کے دروازے ان پر بند ہوجاتے ہیں اس لیے انھیں مجبوراً گھر کے قریب کسی بزرگ کے مزار پر پناہ لینی پڑتی ہے ۔ یہ مقام بھی تکیہ کہلاتا ہے ۔ اور یہاں بھی شاعر جو کلام تخلیق کرتا ہے وہ بھی تکیہ کلام ہوتا ہے ۔ دیکھیے ۔ اس جملہ معترضہ کی وجہ سے جوتے کا ذکر خیر پھر التوا میں پڑگیا ۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جوتا اپنی ابتدائی شکل و صورت میں، جوتا تھا ہی نہیں ۔ عوامی زبان میں اسے کھڑاویں کہا جاتا تھا اور اسے عام طور پر نجار بنایا کرتے تھے کیوں کہ اس کی تعمیر و تشکیل میں جو خام مال استعمال کیا جاتا تھا وہ چوبی ہوتا تھا ۔ جنگل سے لکڑی کاٹ کر لائی جاتی اور (ہمارے خیال سے) نجار کے سپرد کردی جاتی کہ لو اور اس کی کھڑاویں بنادو ۔ اس میں تسمے وغیرہ نہیں ہوتے تھے جو بھی کھڑاویں پہن کر چلتا کوئی تسمہ لگا کر نہیں رکھتا ۔ اس کی دوسری جانب نواڑ کے ٹکڑے چڑھا دیے جاتے تھے ۔ یوں سمجھیے آدمی پنجوں کے بل چلتا تھا ۔ لیکن تھی یہ بہت کام کی چیز ۔ آدمی کے چلنے کی رفتار سست ہوجاتی تھی لیکن تلوے محفوظ رہتے تھے ۔ کھڑاویں کبھی بھی پالش کی محتاج نہیں رہتیں ۔ پانی سے دھل جاتی تھیں ۔ ان کے گھروں میں جن میں پختہ فرش ہوتے تھے ان کھڑاوں کی پرشور موسیقی دور دور تک سنائی دیتی تھی بچے سوتے سے چونک کر جاگ پڑتے تھے ۔ اس زمانے میں معاشرہ خاصا صحت مند تھا اس لیے کسی کو کبھی دبے پاؤں چلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی ۔ جسے بھی کوٹھے پر جانا ہوتا تنگے پاؤں جاتا اور اپنا کام کر آتا ۔ اس زمانے میں کھڑاوں کی عزت بھی بہت تھی ۔ اصل میں یہ احترام ، قابل احترام لوگوں کے لیے تھا اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی کھڑاویں بھی اسی احترام کی مستحق سمجھی جاتی تھیں ۔ کفش برداری آج بھی ہوتی ہے لیکن اس کے اغراض و مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں ۔ (اس موضوع پر ہم کسی مناسب ، موقعے پر اپنے خیالات منصہ ، شہود پر لائیں گے اس وقت تو صرف جوتا ہمارے پیش نظر ہے ۔) ۔

کھڑاوں کے پیدا ہونے کے کچھ عرصہ بعد دنیا نے ترقی کے مدارج طے کرنے شروع کیے اور ایک وقت ایسا آیا کہ خوبصورت

نائلس، سنگ مرمر اور گرینائٹ کے فرش کے ساتھ اونچی اونچی عمارتیں سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں تو سوچا گیا کہ کم سے کم آواز کی آلودگی کم کرنے کی خاطر، کھڑاویں جیسی جنگلاتی پاپوش کو بلدیاتی حدود سے "دربدر" کر دیا جائے۔ اسے پیر کی جوتی سمجھنے اور قرار دینے والوں کو ٹرام، ٹرک اور ریلوں کی گڑگڑاہٹ ہی زیادہ بھائی۔ گھروں میں سوتے ہوئے بچے اب موٹر سائیکلوں سے خارج ہونے والی آواز سن کر اٹھتے ہیں اور اس سواری کا نام ہی انھوں نے پھٹ پھٹی رکھ چھوڑا ہے اسے جوتے پہننے کے بعد لات مار کر اسٹارٹ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر یہ راستے پر نہیں آتی۔ بادی النظر میں تو لات ہی دکھائی دیتی ہے لیکن اصل میں یہ کمال جوتے کا ہوتا ہے۔ کیا آپ نے کسی شخص کو ننگے پاؤں ہو، موٹر سائیکل چلاتے دیکھا ہے۔ بعض موٹر سائیکلوں کو تو ٹیڑھا کر کے سیدھا کرنے پڑتا ہے۔ کھڑاؤں کا ذکر کرتے وقت ہم یہ بتانا بھول گئے کہ شروع شروع ایک عرصے تک کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ یہ پاپوش، فرنیچر کی دکان پر ملتی ہے غنیمت ہے کہ فرنیچر فروخت کرنے والوں کو ان لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے صرف زبان ہلانی پڑی۔ بات آگے بڑھ جاتی تو ان لوگوں کو جوتے سمیت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا۔

یہ ماننا پڑے گا کہ جب جوتا سازی صنعت کاروں کی توجہ کا مرکز بنی اس کا سارا جمود دور ہو گیا۔ صنعت کاروں نے اس پر اپنی ساری توجہ اور محنت نچھاور کر دی اور جوتوں سے ان کے والہانہ عشق کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان کی ذہانت اور محنت کے نتائج کو دکانوں میں قرینے سے سجایا گیا تو یہ دکانیں آرٹ گیلری کو شرمانے لگیں تازہ واردان بساط جوتے مہنگے ضرور پڑ رہے ہیں لیکن آج کل ارزاں قیمت کی کوئی چیز دنیا کے کسی بھی بازار میں ہے نہیں۔ خود مردانہ جوتے اتنے دلکش اور دیدہ زیب بن رہے ہیں کہ راستہ چلنے والے مصروف اور تیز گام لوگ جوتوں کے شوروم کے آگے چند منٹ کھڑے رہ کر باہر ہی سے اپنی آنکھیں سینکنے میں فرحت محسوس کرنے لگے ہیں۔ وہ تو کچھ دیر اور رک کر اس منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں لیکن اچانک انھیں یاد آتا ہے کہ انھیں تو ملازمت کی تلاش میں آج بھی جوتے چٹخانے ہیں تو وہ ایک آہ سرد بھر کر نو ویکینسی کے سائن بورڈ پڑھنے چل پڑتے ہیں اور جہاں تک طبقہ اناث کے جوتوں اور جوتیوں کی نفاست اور نزاکت کا تعلق ہے ان کا جادو تو بلا ناغہ سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔

آدمی کی ضرورتیں بھی اب گونا گوں ہو گئی ہیں۔ ہر مصروفیت کے لئے ایک علیحدہ جوتا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی پر خوری کے باعث صبح سویرے منہ اندھیرے چہل قدمی کے لیے سنسان راستوں پر نکل جانے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو اپنے نازیبا اور غیر متناسب پیٹ کو قابو میں واپس لانے اور اپنی ناگفتہ بہ پھیلی ہوئی کمر کو منضبط کرنے کی غرض سے جاگنگ نام کی ورزش بھی کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ کام روزمرہ کے استعمال کے جوتوں کے سہارے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے مخصوص جوتے استعمال کرنے ہوتے ہیں، جن کے فیتے باندھنے اور کھولنے میں کم سے کم دس منٹ تو خرچ ہوتے ہی ہیں۔ یہ جوتے چلتے ضرور ہیں لیکن ان کی عمر کا پیمانہ جلد خالی ہو جاتا ہے۔ اور یہ چند ہی مہینوں میں بولیوزدہ ہو جاتے ہیں یہی صورت حال لمبی لمبی اور تادیر دوڑ میں بھاگنے والوں کے ساتھ پیش آتی ہے۔ فٹ بال کے کھلاڑیوں کے جوتے تو نیچے کی طرف سے یعنی پوشیدہ طور پر تقریباً مسلح ہوتے ہیں اور غنیم ٹیم کے کھلاڑیوں کو کافی گزند پہنچاتے ہیں۔ ستے بیش قیمت جوتوں سے نوازے جانے کے باوجود اگر یہ کھلاڑی مقابلہ میں ہٹ کر ور یہ سوچ کر کہ مقابلہ تو دل نوجواں نے خوب کیا، میدان سے واپس آئیں تو اسٹیڈیم میں گولی چل جاتی ہے۔ تدوق کی یہ گولی، غلل : کرنے کا مواخذہ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو ریفری کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑتا ہے اسے غلط موقعے پر سیٹی بجانے کا محاسبہ کہا جاتا ہے۔ پولیس مجمع کو روکنے کے لیے سیٹی بجاتی رہ جاتی ہے لیکن یہ سیٹی سنتا کوئی نہیں ہے مجمع جوتے چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ (جوتے تعداد میں بہت ہوتے ہیں لیکن بے فائدہ۔ ایک نمونے اور سائز کے دو جوتے کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔)

کاشت کار جس طرح موسمی پھلوں کی پیدائش کا خیال رکھتے ہیں اسی طرح پاپوش ساز کارخانے بھی موسمی جوتوں کی افزائش کا ذمہ اپنے سر لیتے اور سرخرو ہوتے ہیں۔ موسم باراں کے تو مخصوص جوتے بارش کا پہلا قطرہ سر پر پڑنے سے پہلے وارد ہوجاتے ہیں۔ موسمی جوتوں کی نسل میں ہوائی چپلیں بھی شامل ہیں۔ ان کی خوبی کہیے یا افادیت، یہ سال کے ۱۲ مہینے موقع بے موقع استعمال کی جاسکتی ہیں۔ ہر گھر میں غسل خانے کے دروازے پر یہی چپل " میں ہوں آپ کے پاؤں کی جوتی " کہتی نظر آتی ہے۔ خواتین کے لیے اونچی ایڑی کی سینڈل تخلیق کرنے میں صنعت کاروں کا دل بہت لگتا ہے ہوشیار اور سمجھ دار مائیں جب اپنے راہ گم کردہ بیٹوں کے لیے دلہن کی تلاش میں نکلتی ہیں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتی ہیں کہ اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے ہوئے لڑکی کی صرف صورت دیکھ کر غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ اس معاملے میں اگر کسی سے بھول چوک ہوجائے تو شادی کے دوسرے دن دلہن افسوسناک حد تک چھوٹے قد کی برآمد ہوتی ہے۔ شادی کی بات پر یاد آیا کہ اس خوشی کے موقعے پر جس دولھے کے جوتے اس کی سالیاں (خواہ وہ نام نہاد ہی کیوں نہ ہوں) نہیں چھپاتی ہیں تو نوشہ کا دل بجھ جاتا ہے۔ شادی سے پہلے یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو اس کی قسمت میں ہوتی ہیں۔ ان سے بھی محرومی؟ اونچی ایڑی کے سینڈل پہننے والی لڑکیوں کو بعض صورتوں میں ڈانس بھی کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر گھر کے کسی فرد یا مرد کی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر۔ رقص کے دوران، ناشائستہ غیر تربیت یافتہ لڑکی کا سینڈل میں ملفوف پاؤں اس کے ہم رقص کے پاؤں پر جب پڑتا ہے تو وہ غریب سسکی بھر کر رہ جاتا ہے۔ اس طریقہ رقص کو ادبی زبان میں قدم رنجہ فرمانا کہتے ہیں۔ یہ قدم صحیح معنوں میں رنج پہنچاتا ہے۔ لڑکی کے مزید اقدام کا سد باب ضروری ہے۔ پاپوش کی اس کہانی کا اسی منزل پر ختم ہوجانا مناسب ہے۔ آگے خطرہ ہے۔ ☆

عابد معز
ریاض

نقاد اور تنقید

میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ آنکھیں مل کر پھر دیکھا ایک شاعر کو چند لوگ نرغے میں لیے کلام سنانے کے لیے اصرار کر رہے تھے اور وہ مسلسل انکار کیے جارہا تھا ہے ناقابلِ یقین نہ آنے والا منظر!
شاعر کو گھیرے میں لیے لوگوں کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے مداح نہیں ہوں گے اس لیے کہ مداح گھیراؤ نہیں کرتے پیسچھا کرتے ہیں وہ لوگ معزز سامعین ضرور تھے جنہیں شاعر نے بصد اصرار بارہا اپنا کلام سنایا تھا۔ اس مرتبہ معاملہ الٹا تھا سامعین اصرار کر رہے تھے اور شاعر مختلف عذر پیش کر کے دامن بچا رہا تھا۔ اس نے بہانہ بنایا کہ آج طبیعت کچھ بوجھل سی ہے تو ایک سامع نے کوئی غمگین غزل یا نظم سنانے کی فرمائش کردی۔ شاعر نے بتایا کہ گلے میں خراش ہے تو ترنم کے بجائے تحت میں سنانے کی گزارش کی گئی اور جب شاعر نے انکشاف کیا کہ بیاض گھر پر رہ گئی ہے تو کسی نے فقرہ کسا "حافظہ تو ساتھ ہے نا"۔
سامعین کے مسلسل اصرار پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اصرار کی وجہ دریافت کی تو ایک سامع نے بتایا کہ "ہم سامعین اپنا حق منوانا چاہتے ہیں ہم شاعروں کو من مانی نہیں کرنے دیں گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جب شاعر کا جی چاہتا ہے ہمیں پکڑ کر اپنا کلام سنا دیتا ہے اور جب سامعین کلام سماعت کرنا چاہتے ہیں تو شاعر انکار کر رہا ہے۔"
"یہ تو یقیناً زیادتی ہے۔ آپ کو اپنا کلام سنانا ہی پڑے گا"۔ مطالبہ کرنے والوں میں شامل ہوتے ہوئے میں نے شاعر سے کہا۔
شاعر نے بے چارگی اور بے بسی سے ایک صاحب کی جانب ایسے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں ان صاحب کی وجہ سے اپنا کلام پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ صاحب نفیس سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ پیروں میں چمکتا کالا جوتا پہن رکھا تھا تو آنکھوں پر بھی کالا چشمہ چڑھا رکھا تھا اور ہاتھ میں پائپ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اطمینان سے ایک جانب کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی جانب متوجہ ہوا۔
"آپ کی تعریف"۔
"میں نقاد ہوں"۔ موصوف نے گمبھیر لہجہ میں بتایا۔
اصرار کے باوجود شاعر کے کلام عرض نہ کرنے کی وجہ اب میری سمجھ میں آئی۔ شاعر نقاد سے ڈرا اور سہما ہوا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں نقاد فی البدیہہ تنقید نہ کردے۔ میں نقاد کو ستائشی نظر سے دیکھنے لگا کہ کوئی تو ہے جو شتر بے مہار کو قابو میں کر سکتا ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ حقیقت میرے ایک دوست بیان کرتے ہیں کہ ادب میں نقاد کی حیثیت ناکام کوالٹی کنٹرولر جیسی ہے۔ نقاد کا کام اپنی تحریروں سے ادب میں معیار کا تعین کرنا اور اسے برقرار رکھنے کی جستجو کرنا ہے۔ یہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے جو نقاد کے بس کا نہیں ہے نقاد کی ناکامی کا نتیجہ اس صورت میں عیاں ہے کہ ادب میں نہ ہی کوالٹی پر کنٹرول ہے اور نہ ہی کوانٹیٹی پر!
اس خیال سے قطع نظر عام تاثر یہ ہے کہ جو شخص شاعری نہیں کر سکتا وہ نثری ادب تخلیق کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جب نثر میں بھی ناکام رہتا ہے تو وہ جھلا کر تنقید کرنے لگ جاتا ہے اور نقاد کہلانے لگتا ہے تخلیق کار نہ بننے کی ناکامی کا مداوا وہ تخلیقات میں صرف معائب گنوا کر کرتا ہے۔

نقاد یوں تو ادب کے سبھی اصناف پر تنقید کرتا ہے لیکن شاعری اسے بہت مرغوب ہوتی ہے۔ شاعری اور شاعر کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اس کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ وہ دور بہت دور کی کوڑی لانے کی سعی کرتا ہے شاعر کی زندگی کے حالات اور ان عوامل کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے جن کے زیر اثر شاعر، شاعری کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کے یہاں آمد ہے یا آورد۔ پتہ لگایا جاتا ہے کہ شاعر نے اپنی زمین پر شاعری کی فصل اگائی ہے یا کسی دوسرے شاعر کی زمین استعمال کی ہے۔ تفتیش کی جاتی ہے کہ شاعر نے سرقہ یا چوری تو نہیں کی۔ شعر میں الفاظ کو پرکھا جاتا ہے، ان کی قیمت لگائی جاتی ہے اور ان کا وزن کیا جاتا ہے۔ لفظوں کے اصلی اور مسلمہ ہونے کی سند طلب کی جاتی ہے لفظوں کی تراکیب کے لئے ثبوت مانگا جاتا ہے شعر میں مفہوم بھی تلاش کیا جاتا ہے شعر کے معنی پر بحث کی جاتی ہے غرض یہ کہ مختلف حیلے اور حوالوں سے شاعر اور اس کی شاعری کو پرکھا اور جانچا جاتا ہے۔

نقاد اپنی تحقیق کے نتیجے کو مخصوص انداز اور منفرد ڈکشن میں پیش کرتا ہے۔ چند جملے جو ذہن میں منقش ہوگئے ہیں، پیش خدمت ہیں۔ "شاعر نے صرف قافیہ پیمائی کی ہے، اسے شاعری کا ادراک نہیں ہے۔" "فلاں شاعر کے یہاں شعریت اور مفہوم دونوں عنقا ہیں وہ شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ بحور کیا ہیں۔ اسے بس الفاظ شماری آتی ہے فلاں شعر میں ردیف کا حق ادا نہیں ہوا۔ مطلع غنیمت ہے۔ دوسرے شعر میں ردیف کو رسوا کیا گیا ہے اور قافیہ کی عزت لوٹی گئی ہے۔ اشعار ناموزوں اور بحر سے خارج ہیں۔ شعر کے دو مصرعے الگ الگ بحروں میں ہے۔ مقطع آشفتہ بیانی کی مثال ہے" "نظم میں مفہوم الفاظ کی ناپ تول کی بھینٹ چڑھ گیا ہے کئی اشعار بلکہ موصوف کی مکمل شاعری مہمل ہے۔ ایسے لگتا ہے شاعر محنت کر کے اشعار برآمد کر رہا ہے۔ شعر میں عیب شتر گربہ پایا جاتا ہے۔" قصہ مختصر، تنقید کی اپنی زبان ہوتی ہے اور نقاد اس زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ اس زبان کو جناتی زبان تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ادب کا عام قاری اس زبان کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اکثر اوقات تخلیق کار کے بھی پلے نہیں پڑتا کہ نقاد اس کے فن کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔

منہ کا مزا بدلنے کے لئے نقاد نثر پر بھی تنقید کرتا ہے۔ افسانہ اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ افسانے کی تیکنیک، پلاٹ، سچوایشن، کردار، واقعات جیسے الفاظ کا سہارا لیکر وہ یہاں بھی اپنی منفرد تنقیدی زبان میں رائے زنی کرتا ہے۔ ایک عام قاری کے پلے آج کا افسانہ مشکل سے پڑتا ہے، اس پر کی گئی تنقید تو وہ پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے افسانہ نگار نقاد سے پریشان نہیں رہتا۔

فکاہیہ یا طنز و مزاحیہ کو نقاد قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس صنف پر تنقید کرنا تو دور، فکاہیہ ادب کو دوسرے اور تیسرے درجے کا ادب کہہ کر وہ اسے پڑھنا بھی نہیں چاہتا۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کر جاتا ہے کہ فکاہیہ ادب دو دھاری تلوار یا سفلی عمل کے مانند ہے جو تخلیق کار کو بھی متاثر کرسکتا ہے۔ مجھے نقاد کے اس رویہ پر حیرت ہوتی ہے خود نقاد اپنی تحریروں میں طنز کا خاصہ استعمال کرتا ہے اور بعض نقادوں کی تحریریں مزاحیہ لگتی ہیں۔ طنز و مزاحیہ ادب سے نقاد کی دوری کے بارے میں میرے ایک شاعر دوست کہتے ہیں "تم بڑے منہ زور ہو۔ کون تمہیں چھیڑے۔ نجات کا راستہ یہی ہے کہ تمہیں اور تمہارے ادب کو دوسرے اور تیسرے درجہ میں رکھا جائے۔"

میں نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو شاعر دوست نے مجھے روک دیا "مستند ہے نقاد کا فرمایا ہوا۔ بس آپ خاموش رہیئے۔"

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے۔ اردو میں تنقید نگاری انگریزی تنقید کے زیر اثر ہے۔ تنقید کا فلسفہ اور اس کے اصول انگریزی سے مستعار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نقاد انگریزی ادب کا دلدادہ ہوتا ہے وہ حوالے بھی انگریزی ادب سے دیتا ہے۔ انگریزی وضع کے کپڑے پہنتا ہے اور انگریزی رہن سہن اختیار کرتا ہے۔ میں نے نقادوں کی اکثریت کو سوٹ بوٹ پہنے اور انگریزی بود و باش اپناتے دیکھا ہے

بہت کم نقاد مشرقی لبادہ اوڑھے ہوتے ہیں۔ نقادوں کے برخلاف بے چارے تخلیق کار مشرقی لبادہ میں ملبوس سوٹ بوٹ کا [illegible] رہتے رہتے ہیں۔ جب اس مشاہدے کو میں نے ایک نقاد کے گوش گزار کیا تو انھوں نے فرمایا "عجب بے تکی تنقید ہے بھلا کپڑوں کا دب سے کیا تعلق؟"۔

میں نے جواب دیا۔ "یہ تعلق ایسے ہی ہے جیسے آپ نقاد حضرات تخلیقات کا ناتہ تخلیق کار کے ماحول، اس کی تعلیم و تربیت، اس کی ازدواجی زندگی، اسکے چال و چلن وغیرہ سے جوڑتے ہیں۔"

بنیادی طور پر نقاد ایک قاری ہوتا ہے۔ تخلیقات پڑھ کر ہی تو نقاد اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ بعض نقاد عام قاری جیسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ تخلیقات اور تخلیق کاروں کی صرف تعریف و توصیف کرتے ہیں ایسے نقاد کسی شاعر کو صرف چند گنے چنے اشعار کی بدولت میر و غالب کی صف میں شمار کرتے ہیں تو کسی ادیب کی مدح سرائی میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ اس قسم کے نرم نقادوں سے تخلیق کار بہت خوش رہتے ہیں اور ان سے دوستی بھی کرتے ہیں لیکن روایتی سخت گیر نقاد انہیں سرے سے نقاد ہی نہیں مانتے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں تبصرہ نگار یا تعارف نگار قرار دیتے ہیں۔

تنقید کیلئے، عام قاری کی سطح سے اوپر اٹھ کر تخلیق کی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ ضروری ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ بعض نقاد پڑھے بغیر ہی تنقید کرتے ہیں۔ ایسے نقاد پیدائشی ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح پیدائشی شاعر ہوتے ہیں۔ انہیں تخلیقات پڑھنے کی فرصت اور ضرورت نہیں رہی، بس جا بے جا تنقید کئے جاتے ہیں۔

نقاد ایسا باشعور اور قابل قاری ہے جو سمجھتا زیادہ ہے، جانتا زیادہ ہے اور بوجھتا بھی زیادہ ہے۔ اسی لئے وہ تخلیقات کی تشریح اور توضیح بھی کرتا ہے۔ وہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان رابطہ بنتا ہے۔ وہ قاری کو تخلیق کی خوبیوں سے ہمکنار کرواتا ہے اور اسے تخلیق کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ نقاد اپنے انداز، اپنی فکر اور اپنی سوجھ بوجھ کے سہارے تخلیق کی تشریح کرتا ہے۔ جو تخلیق کار کی وجہ تخلیق سے مختلف اور الگ ہوتی ہے کسی تخلیق پر جتنے زیادہ نقاد طبع آزمائی کریں گے اس کی اتنی زیادہ تشریحات سامنے آتی ہیں۔ اشعار کی تہ داری دراصل نقادوں کی کرم فرمائی ہے۔ بعض مرتبہ نقاد ایسی تشریح کرتا ہے جو تخلیق کار کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ اپنی تشریح سے وہ تخلیق کار کو حیران اور پریشان بلکہ کبھی پشیمان بھی کر دیتا ہے۔ شاید سی لئے ہوشیار اور جہاندیدہ تخلیق کار اپنی تخلیقات کو سمجھاتے نہیں ہیں۔ وہ یہ کار خیر نقاد پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک شاعر دوست سے جب میں نے کلام کی تشریح کی گزارش کی تو انھوں نے فرمایا۔ "ہمارا کام شعر کہنا ہے سو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ اب یہ سامعین کی صوابدید اور نقادوں کی فنکاری پر ہے، وہ جو چاہیں سمجھیں اور تشریح کریں۔"

ادب میں تنقید کی بہت اہمیت ہے اور نقاد اپنی اہمیت کا دعویٰ بھی کرتا ہے کہ وہ ادب کا معیار اور صحیح سمت معین کرتا ہے لیکن کیا کیجئے گا کہ تنقید بھی تنقید کی زد میں ہے۔ کوئی تنقید کے غیر معیاری ہونے کا شاکی ہے تو کوئی تنقید میں ذاتی بغض اور عناد کی موجودگی کا گلہ کرتا ہے کسی کو تنقید میں نفرت کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے تو کسی کو تنقید میں تضحیک دکھائی دیتی ہے۔ ادب برائے ادب کی طرح تنقید بھی برائے تنقید ہوتی ہے۔ پھر ایسی تنقید اور نقادوں سے تخلیق کاروں کا گھبرانا کیسا؟ میں نے شاعر کی ہمت بندھائی "جناب والا۔ آپ تنقید کی پرواہ نہ کریں۔ اپنا تخلیقی کام جاری رکھیں۔ اصل کسوٹی تو قارئین اور سامعین ہیں۔ وہ دور بھاگ رہے ہیں۔ انہیں قریب کرنے کی کوشش کیجئے۔"

شاعر نے اپنا کلام سننا شروع کیا۔ نقاد پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے غائب ہوگئے اور یقین نہ آنے والا منظر، عام منظر میں بدل گیا۔ شاعر لوگوں کو زبردستی اپنا کلام سنا رہا تھا۔ ☆☆

غزلیں

اقبال شانہؔ۔ حقل۔ تبوک سعودی عرب

پھنس کر تمہارے عشق کی دلدل میں رہ گئے
جنات جیسے جادوئی بوتل میں رہ گئے

وہ اڑ گئے ہواؤں میں شیخ عرب کے ساتھ
ہم دیکھتے ہوئے انہیں بادل میں رہ گئے

میں شیر کی دھاڑ پہ دوڑا کچھ اس طرح
ہوش و حواس چھوٹ کے جنگل میں رہ گئے

رستم کو بھی پچھاڑ کے ہم آگئے مگر
اعضا ہمارے ٹوٹ کے دنگل میں رہ گئے

آنے کی ان کے دھوم مچی تھی گلی گلی
ہم آمد بہار کی ہلچل میں رہ گئے

وعدہ کیا تھا آئے گا وہ کل ہمارے گھر
ہم انتظار یار کے کل ۔ کل میں رہ گئے

وہ سو گئے ہیں اوڑھ کے چادر شبِ وصال
ہم ساری رات جاگتے کمبل میں رہ گئے

تیری نوازشوں کا بھلا کیا کریں شمار
ریشے مرے دماغ کے ٹوٹل میں رہ گئے

سب رندمئے کدے سے گئے اپنے اپنے گھر
پر شیخ جی شراب کی بوتل میں رہ گئے

کیوں رات ہوگئی ہے یہ جاناں سیاہ تر
یہ سوچتے ہوئے تیرے کاجل میں رہ گئے

برسی ہے دھوپ اب کے برس آسمان سے
جو پانیوں کے خواب تھے بادل میں رہ گئے

" ہم کوالی فائی " ہوگئے شانہؔ بروزِ حشر
ناصح مگر گناہ کی دلدل میں رہ گئے

پتلون کس رہے ہیں وہ شلوار کی طرح
آثار لگ رہے ہیں مجھے " وار " کی طرح

برباد ہوگئی ہے میرے دل کی سلطنت
کافر ادائیں آپ کی یلغار کی طرح

سارے بدن میں درد کی اٹھتی ہے اک لہر
ترچھی نظر لگے ہے مجھے مار کی طرح

اک شخص بے پناہ مجھے چاہنے لگا
ہے ناسمجھ غریب مرے یار کی طرح

بیٹھیں بچھا کے خاک تیرے در کے سامنے
ملتی نہیں ہے شئے کوئی اخبار کی طرح

لوہے کی اک عجیب سی پیارے مشین ہے
وہ چیز لگ رہی ہے تیری کار کی طرح

چرچے سنے تھے جن کی مسیحائی کے بہت
در پر کھڑے ہیں یار کے بیمار کی طرح

کیا خاک ہم غریب سمجھ پائیں گے انہیں
انکار کی ادا بھی ہے اقرار کی طرح

شعروں پہ میرے داد مسلسل ہے دے رہا
لگتا ہے بے وقوف سمجھدار کی طرح

اللہ میاں کے سامنے شانہؔ بروزِ حشر
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گناہگار کی طرح

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ، بیتیا، بہار

کچھ آپ بھی بولیے

بولیے کہ بولنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ سوچ سمجھ کر بولیے، بلا سوچے بولیے، جتنا چاہیں بولیے اور جب تک چاہیں بولیے۔ بولیے، کیونکہ منہ آپ کا ہے، زبان آپکی ہے، گلا آپ کا ہے، الفاظ آپکے ہیں اور وقت آپکا ہے۔ اتنا بولیے کہ مخالف کی بولتی بند ہوجائے۔ گلا پھلا پھلا کر بولیے، پانی پی پی کر بولیے جلدی جلدی بولیے، رک رک کر بولیے، آہستہ آہستہ بولیے، چلا چلا کر بولیے، ہکلا کر بولیے، ایک جگہ کھڑا ہو کر بولیے، پہلو بدل بدل کر بولیے، بامقصد بولیے، بے مقصد بولیے، موضوع پر بولیے، بلا موضوع بولیے، جہاں بولنا موزوں نہ ہو وہاں بولیے، لیکن بولیے ضرور۔ اور اس وقت تک بولتے رہیے جب تک آپکا بولنا بند نہ ہوجائے۔ کیونکہ زندہ رہنے کے لئے بولنا ضروری ہے۔ اگر آپ نہیں بولیے گا تو لوگ بولتے بولتے آپکو مار ڈالینگے۔ بولنے کو تو سبھی بولتے ہیں اور اپنی اپنی بولی میں بولتے ہیں لیکن کسی کا بولنا اچھا لگتا ہے اور کسی کا بولنا بہت خراب لگتا ہے۔ کوئی سیدھی بات کو گھما پھرا کر بولتا ہے تو کوئی ٹیڑھی بات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ جو شخص بات فروش ہوتا ہے اس کی دکانداری خوب چلتی ہے۔ جو وکیل بولنے میں ماہر ہوتا ہے اسکے پاس موکلوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ جو لیڈر جتنا زیادہ بولتا اور جھوٹ بولتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا لیڈر کہلاتا ہے۔ جو میٹھا میٹھا بولتا ہے، وہ اپنا مشکل سے مشکل کام آسانی سے نکال لیتا ہے۔ جو میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے وہ اپنی باتوں میں الجھا کر اپنی نگاہوں سے کتنوں کے دل گھائل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس لئے بولتے ہیں کہ انکے سامنے کوئی بول رہا ہے کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ انہیں بولنا نہیں آتا ہے۔ اس بات پہ مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ ایک چوک پر شام کے وقت کچھ کتے بھوک رہے تھے، ایک سپاہی نے ان سے بے وقت بھونکنے کی وجہ جاننی چاہی تو وہ بولے "چونکہ آگے چوک پر کچھ کتے بھونک رہے ہیں اس لئے ہم لوگ بھی بھوک رہے ہیں"۔ اگلے چوک پر سپاہی جی کو وہی جواب ملا اسطرح پوچھتے پوچھتے وہ سپاہی پھر پہلے والے چوک پر آیا، دیکھا کہ وہ کتے اب تک بھونک رہے ہیں۔ جب سپاہی جی نے اپنی روداد سنائی اور پھر بھونکنے کی وجہ دریافت کی تو کتوں نے کہا "سپاہی جی آپ نہیں سمجھئے گا، یہ برادری کا معاملہ ہے"۔

جہاں تک بولنے کا سوال ہے تو انسانوں کے ساتھ چرند، پرند اور درند سبھی اپنی اپنی بولیاں منفرد انداز میں بولتے ہیں۔ گو کہ بولنے کو سبھی چڑیاں اپنی اپنی بولی بولتی ہیں، مگر کوئل، الو، کوا اور پپیہا کی بولی کے آگے دوسروں کے بولنے کی اہمیت کچھ کم ہے۔ حالانکہ طوطا مینا کو انکی بولیاں سننے کے لیے پالا جاتا ہے۔ مرغ کی بولی شیخ صاحب کو مسرور کر دیتی ہے۔ مرغیاں جب انڈے دے لیتی ہیں تو فوراً بول کر اپنی مالکن کو آگاہ کر دیتی ہیں کہ آؤ انڈا اٹھالو، ورنہ پڑوس کا چھوکرا تاک لگائے بیٹھا ہے۔ کوا جب مہینہ کے پہلے ہفتہ میں صبح صبح گھر کی منڈیر پر آکر بولتا ہے تو سجنی کا دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اسکے ساجن کے یہاں سے آج منی آرڈر آنے والا ہے۔ عام دنوں میں کوے جب گھر کی منڈیر پر بولتے ہیں تو دل دھک سے رہ جاتا ہے کہ کہیں کوئی مہمان تو نہیں آرہا ہے۔ وہ کوا جب سر پر بولتا ہے تو اسے منحوس سمجھا جاتا ہے، اس آواز پر فوراً لاحول پڑھا جاتا ہے۔ الو جب چھت پر رات میں بانگ لگاتا ہے تو ایک انجانے سے خطرے کا احساس ہونے لگتا ہے، اپنے بیمار جسم پر بار بار نظریں گھومنے لگتی ہیں۔ بار بار نبض پر انگلی رکھی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے

کہ دل کی دھڑکن بڑھتی جارہی ہے کھڑکی پر ملک الموت کا سایہ نظر آنے لگتا ہے اس وقت کوئل کی میٹھی کوک بھی کڑوی لگتی ہے ۔ پپیہا جب پی کہاں پی کہاں کی رٹ لگاتا ہے تو اسے سن کر کسی سے بچھڑنے کا غم ستانے لگتا ہے ۔ سبھی چڑیاں کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی ہیں ۔ وہ کیا بولتی ہیں اسکا علم اللہ کو ہی ہوتا ہے ۔ وہ چڑیا ہونے پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں یا ہمارے انسان ہونے پر طنز کرتی ہیں، یہ سب اوپر والے کو معلوم ہے ۔

شیر کی بولی سے اچھے اچھے بہادر گھبرا جاتے ہیں جب بولنے کی آزادی ہے تو صرف شیر ہی کیوں بولے ۔ اس جمہوری حکومت میں گیدڑ کیوں نہیں بولے ۔ اس لئے گیدڑ بھی بولتے ہیں اور جم کر بولتے ہیں ۔ اکیلے نہیں بلکہ ایک ساتھ سبھی بولتے ہیں اور ایک زبان ہو کر بولتے ہیں ۔ گیدڑ اور لیڈر کے بولنے کے متعلق ایک شاعر نے یوں فرمایا ہے کہ:

دونوں میں تعلق ہے مگر ربط نہیں ہے

گیدڑ کی زباں اور ہے لیڈر کی زباں اور

یعنی بولی دونوں ایک جیسی بولتے ہیں صرف ان میں زبان کا فرق رہتا ہے ۔ ایک قدرتی بولی بولتا ہے تو دوسرا اپنی بولی بدل کر بولتا ہے ۔ گیدڑ اگر شیر کی کھال بھی اوڑھ لیتا ہے تو اسکی بولی نہیں بدلتی ۔ وہ جب بولتا ہے تو اپنی ہی بولی بولتا ہے ۔ لیڈر، شیر کی کھال اوڑھ کر شیر کی ہی آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہے، اور ہوتا یہ ہے کہ نہ وہ شیر ہی رہ پاتا ہے اور نہ اسکی لیڈری ہی بچتی ہے ۔ ایک گیدڑ بولتا ہے تو اگل بغل کے سبھی گیدڑ بولتے ہیں، اسکی آواز میں آواز ملاتے ہیں ۔ ایک لیڈر کی آواز کے ساتھ سبھی لیڈر آواز لگاتے ہیں، مگر انکا لہجہ الگ الگ ہوتا ہے، انکی بولی الگ الگ ہوتی ہے ۔ کتا جب بھی بولتا ہے ڈر لگتا ہے ۔ دن کو جب دروازے پر بولتا ہے تو طبیعت سہم جاتی ہے کہ کوئی مہمان تو نہیں آیا اور رات کو بولتا ہے تو چور کا ڈر ستانے لگتا ہے ۔ لیکن بولتا ہوا کتا کاٹنے والے کتے سے بہتر ہے ۔ گدھا جب بولتا ہے تو زور لگا کر بولتا ہے اور اس طرح وہ اپنے ہونے کا احساس دور دور تک کرا دیتا ہے ۔ اسکی آواز میں بلا کی کرختگی ہوتی ہے، لیکن وہ بالکل سیدھا سادہ جانور ہے ۔ لکے اسی سیدھے پن کی وجہ سے دھوبی اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ کڑا بولنے والا شخص بھی دل کا صاف اور سیدھا سادہ ہوتا ہے ۔ ایک اور جانور ہے جو نہ چرند ہے نہ پرند ہے اور نہ درندہ ہے، بس وہ کسی طرح زندہ ہے ۔ اس جانور کو مینڈک کہا جاتا ہے ۔ آپ سب کی بولتی بند کر سکتے ہیں مگر مینڈک کی بولتی کبھی نہیں بند کر سکتے ہیں ۔ وہ جب بولتا ہے تو بولتا ہی چلا جاتا ہے ۔ اسے کب بولنا ہے یہ اسے معلوم ہے ۔ وہ انسانوں کی طرح ہر موسم میں نہیں بولتا ہے، وہ صرف برسات کے موسم میں بولتا ہے اور باقی موسموں کا خسارہ بھی اسی موسم میں پورا کرلیتا ہے ۔ بولنے پر آتا ہے تو نہ دن دیکھتا ہے نہ رات، نہ صبح دیکھتا ہے نہ شام ۔ جب بادلوں کو دیکھتا ہے، بولنا شروع کر دیتا ہے اسے بھی آواز میں آواز لگانے کی عادت ہے ۔ بولنے کے معاملے میں اسکی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ایک دوسرے سے بازی لے جائے ۔ سانس لے لے کر بولتا ہے، گال اور گلا پھلا پھلا کر بولتا ہے ۔ برسات کے بعد وہ گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے، مراقبہ میں جا کر یاد الٰہی میں مشغول ہوجاتا ہے ۔ یا آئندہ سال بولنے کی تیاری میں مصروف ہوجاتا ہے ۔ یا اس کے جسم کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ برسات کے علاوہ موسموں میں بولنے سے اس کے گلے میں خراش ہوجاتی ہے ۔

جہاں تک بولنے کا سوال ہے تو بھلا انسان اس میں کیوں پیچھے رہے ۔ اصل بولنے کی آزادی تو انسانوں کو ہی ملی ہوئی ہے ۔ وہ جسکے خلاف جتنا چاہیں بول سکتے ہیں ۔ کوئی جانور بولنے میں حد سے تجاوز نہیں کرتا ہے لیکن انسان حد سے کوسوں دور نکل جاتا ہے ۔ بولنے کی دھن میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا بول رہا ہے ۔ بولتے بولتے وہ اپنے خالق اور رزاق کے خلاف بھی بولنا شروع کر دیتا ہے ۔ جو

احتیاط کے ساتھ بولتے ہیں انکی ہر جگہ پوچھ ہوتی ہے چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لئے دوسرے جانور اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے جہاں دوسرے جانور صرف اپنی ہی بولی بول کر چپ ہو جاتے ہیں۔ وہاں یہ انسان بہ یک وقت کئی بولیاں بولتا ہے۔ بہت لوگ اپنی بولی کی روٹی کھاتے ہیں۔ ایک مداری اپنی بولی کے بل بوتے پر ڈبوں میں دنیا کے خطرناک سانپوں کو بند رکھتا ہے۔ تماشہ دیکھنے والوں کو آخری وقت تک یہی محسوس ہوتا ہے کہ اب ڈبہ کھلے گا اور سانپ باہر آئے گا۔ لیکن تماشہ ختم ہو جاتا ہے نہ ڈبہ کھلتا ہے اور نہ سانپ باہر آتا ہے۔ بس وہ اپنی بولی سے آپکو ایسا الجھائے رہتا ہے کہ آپ اس سے سانپ نکالنے کی ضد نہیں کر سکتے۔ یہی بات ہمارے یہاں رہنماؤں کے ساتھ بھی ہے۔ آپ لاکھ ان سے بگڑے ہوئے رہیں، لیکن وہ اپنی باتوں میں آپکو پھنسا کے آپ سے ووٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ مذہب کے ٹھیکے دار بھی بولنے میں ماہر ہوتے ہیں وہ بھی اپنی بولی میں پھنسا کر اپنے حلوے مانڈے کا انتظام کر لیتے ہیں۔

بولنے والوں سے، نہیں بولنے والے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ بولنے والے تو بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ لیکن جو نہیں بولتے وہ کسی اور طریقے سے اپنے دل کی آرزو پوری کرتے ہیں۔ بولنے سے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ بولنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے اپنا آدھا کام کر لیا ہے۔ جنکی بیویاں زیادہ بولنے والی ہوتی ہیں، وہ یہی صفائی پیش کرتے ہیں کہ "بھلے وہ بولتی زیادہ ہے مگر دل کی صاف ہے۔ ساس سسر کی خدمت میں ایک پیر پر کھڑی رہتی ہے بس اسے بولنے کی بیماری ہے اس لئے امی سے ذرا نہیں پٹتی ہے" عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ عورتیں مردوں سے زیادہ بولتی ہیں۔ بولنے کے لئے انکے پاس بھلے ہی موضوعات کی کمی ہو لیکن ایک ہی نقطہ پر کئی بار زبان چلا کر اسے دھار دار بنا دیتی ہیں۔ مردوں کے پاس یہ تکنیک نہیں کے برابر ہے۔ ہاں کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں جو بولنے کے معاملے میں عورتوں سے کہیں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن انکی تعداد بہت کم ہے ویسے ہر کسی کی زبان مادری زبان کہی جاتی ہے، پدری زبان کہیں بھی سننے کو نہیں ملیگی۔

تو جناب اس دنیا میں سبھی بولنے کے لئے آئے ہیں۔ اپنی اپنی بولیاں بول کر سبھی چلے جائیں گے۔ جنکی بولی میں زیادہ دم خم ہے ان کی بولی محفوظ کر لی جاتی ہے۔ وہ بولی مشعل راہ ہوتی ہے۔ آپ بھی خاموش مت رہئے کچھ بولیے، نہیں بولیے گا تو گھمنڈی کہلائیے گا۔ بولیے لیکن محتاط ہو کر بولیے ورنہ زیادہ بول کر لوگ اپنا پول آپ کھول دیتے ہیں۔ ☆

غزلیں

شبنم کارواری

ہم ہیں کسی رسالہ و اخبار کی طرح
سرخی ہر اک خبر کی ہے انگار کی طرح

بیوی کے سامنے کسی مجرم کی طرح ہیں
رہتے ہیں دوستوں میں حولدار کی طرح

وہ سو، سنار کی طرح کٹ کٹ کرے سدا
ہم جڑ کے ایک دیتے ہیں لوہار کی طرح

تن ہے درخت پاؤں جڑیں، ہاتھ ٹہنیاں
ان کی کمر ہے شاخ لچکدار کی طرح

●☆●☆●☆●

جھاپڑ ناگپوری

اب وطن میں یہ کام کرنا ہے
سب کی خوشیاں حرام کرنا ہے

بیٹے ظالم ہیں پھر بھی یہ جاگیر
اپنے بیٹوں کے نام کرنا ہے

میں ہوں لیڈر مجھے سیاست سے
ساری جنتا کو رام کرنا ہے

بی اے، ایم اے کی ڈگریاں پاکر
مجھکو جاہل سا کام کرنا ہے

سید اسد اللہ حسینی چکر،
بالی ووڈ، امریکہ

پاس و لحاظ کا بھی جنازہ نکل گیا
ان کی زباں چلی تو مرا ہاتھ چل گیا

پاکر وہ اپنی سوت کے مرنے کی اطلاع
کہتے ہیں - "آج آنکھ کا کانٹا نکل گیا"

آیا تھا شیخ پند و نصیحت کے واسطے
دو گھونٹ پی لیا تو ارادہ بدل گیا

ان کے ستم کی تاب کہاں تجھ میں اے رقیب
تیرا تو ایک - پیچ - میں نقشہ بدل گیا

عمر دراز پاکے بھی محسوس یوں ہوا
آیا ادھر سے اور ادھر سے نکل گیا

چکر ہمارے ہوش اڑے، نیند اڑ گئی
آہ و فغاں سے تیری کلیجہ دہل گیا

سراج نزلی

فرمائشوں سے انکی پریشان سے رہے
برہم ہمیشہ اس لئے مہمان سے رہے

فکر طعام اور نہ خیال قیام تھا
اہل جنوں جہاں بھی رہے شان سے رہے

لے کر وہ قرض وقت پہ لوٹا نہیں سکے
اس واسطے وہ خوفزدہ خان سے رہے

مہمان بن کے آئے ہیں وہ تھرڈ ویک میں
ہم جان کر بھی اس لئے انجان سے رہے

ہیں با حیات مفت میں مارے نہیں گئے
جو بھی قریب فوج کے کپتان سے رہے

غصے میں آکے وائف نے کاٹے ہیں تاک سے
محروم اب وہ ناک سے اور کان سے رہے

مہماں نواز کیسے کہیں آپ کو سراج
بیزار ہی ہمیشہ جو مہمان سے رہے

●☆●

سمیرہ ہاشم سید
ریاض، سعودی عرب

دنیا بھر کے کھانوں کی "چکھا چکھی"

کہا جاتا ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات میں روٹی، کپڑا، اور مکان شامل ہیں۔ اس فہرست میں روٹی، یعنی غذا، سر فہرست ہے۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے قارئین کی بھی یہی پہلی ضرورت ہے، تو کیوں نہ انھیں دنیا بھر کے کھانوں کا مزہ چکھا ہی دیا جائے۔ چلیے بسم اللہ، کرتے ہیں:

چائینیز کھانے

وہ کھانا جو ادھ پکا ہو، اسے چائینیز کھانا کہا جاتا ہے۔ ان کھانوں کی بہت دھوم مچی ہوئی ہے۔ چاہے پسند ہو یا ناپسند، مگر یہ کہنا کہ ہم نے چائینیز ڈیش کھائیں، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کھانوں کے معاملہ میں اعلیٰ ذوق کے حامل اور جدید فیشن کے دلدادہ ہیں۔ چائینیز کھانے مصالحوں کے بغیر پکائے جاتے ہیں، لہذا، ہم روکھا پھیکا کھانے والوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ صرف یہی کھانے خوب کھایا کریں۔ بے مزہ چیزوں سے انھیں اتنا انس ہے کہ وہ پانی بھی ابال کر گرما گرم ہی پیتے ہیں۔ اس طرح پانی کے میٹھے اور مزیدار کیڑے مرحوم ہو کر بے مزہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چائے بھی سبز، بلاشیرینی دھڑا دھڑ معدے میں انڈیل ڈالتے ہیں۔ ان کی کئی ڈشیں اتنی حیران کن ہیں کہ آپ سمجھیں گے کہ ہم مذاق کر رہے ہیں، مگر یقین کیجیے کہ یہ لوگ ہر قسم کے کیڑے مکوڑے، مینڈک، سانپ، وغیرہ ہی نہیں، بلکہ زندہ بندروں کے دماغ تک اس کے سر میں شگاف کر کے مزے لے لے کر کھا جاتے ہیں۔ اوب ۔۔۔ کیا آپ کو بھی ہماری طرح الٹی محسوس ہونے لگی۔ اور جناب چینیوں کو اپنے کھانوں سے اتنا شغف ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ باقی دنیا بھی ان کھانوں سے زیادہ مستفید ہو، اسی لیے وہ ان کھانوں کو معدہ کی نظر کرنے کے لیے پلیٹیں صاف کرتے ہوئے جھاڑوں کے تنکوں کو استعمال کرتے ہیں، اور بجائے تنکوں کے انھیں "چاپ اسٹکس" کا نام دیتے ہیں۔ چلیے، اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے ہی، کم از کم ہم لوگ ان کے ملک سے انواع و اقسام کی درآمدات کے بدلے میں انھیں اپنی جھاڑوں ہی برآمد کر دیا کریں۔

جاپانی خوان

ہر وہ چیز جو کچی کھائی جاسکتی ہو، جاپانی کے زمرے میں آجاتی ہے۔ یا پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابھی آپ کے سامنے صرف کچی ہی تو کیا، یہ عین ممکن ہے کہ زندہ تڑپتی ہوئی مچھلی پیش کی جاے گی۔ جو جاپانی باورچی جتنی زیادہ حد تک زندہ، ادھ پکی، تڑپتی مچھلی پیش کر سکتا ہے، وہ اتنا ہی ماہر گردانا جاتا ہے۔ مگر ایسا نہیں کہ مچھلی پکڑی، اور آپ کے سامنے ڈال دی۔ بھئی جاپانی کھانوں کے بھی بہتر آداب ہوتے ہیں۔ جاپانی غذا خوروں کی یہ شرط بھی ہے کہ مچھلی کے قتلے کٹے ہوئے ہوں۔ سبحان اللہ۔ جاپانیوں کی یہ عادات تو جاپانی ہی جانیں۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ کھانے اس قدر خوبصورتی سے پیش کیے جاتے ہیں کہ انہیں غڑپ غڑپ کھانے کا دل چاہتا ہے اور اگر ہم آپ غلطی سے بھی اس جال میں پھنس جائیں، اور ایک لقمہ بھی منہ میں رکھ لیں تو یہ عین ممکن ہے کہ بدمزگی کی وجہ سے زمین دورے پر (یقیناً جاپان کے) نہ نکل جائے۔ چائے کے یہ اتنے شوقین ہیں کہ اس کے لیے طرح طرح کے دل چسپ، اور کسی حد

تک پر اسرار، در سم و رواج بنا رکھے ہیں۔ جاپانی اس رسم کو عبادت کا درجہ دے کر فرشی بیٹھک کے ماحول میں چائے پی جانے کو ہی باعث نجات سمجھتے ہیں۔

اطالوی (اٹالین) کھانے

کہا جاتا ہے کہ اطالوی قوم کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہے۔ یہ قوم بہت ضدی ہٹ دھرم اور اسپگیٹی جیسی ہی الجھی مگر دل کش ہے۔ یہ ابھی بھی اپنی قدیم روایات اور رسم و رواج کو بڑی ہی احتیاط سے تھامے ہوئے ہے۔ اگر کوئی انھیں سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ خود بھی اسپگیٹی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس قوم نے اسپگیٹی۔ سویوں جیسی، الجھی ہوئی شے ایجاد کی، جسے کھاتے ہوئے کھانے والا سلجھاتے سلجھاتے تھک جاتا ہے۔ اس کھانے کو حلق سے اتارنے کے لیے بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ کسی نووارد کو اسپگیٹی کھاتے دیکھنا بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہے، جس پر اطالویوں کو دیکھنے کے لیے ٹکٹ لگا دینا چاہیے۔ قیلولہ کی نشہ کی طرح عادی، اطالوی قوم بہت سست سمجھی جاتی ہے۔ جس کا ایک ثبوت ان کا قومی کھانا "پیزا" ہے، جو ایک بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت اختیار کر چکا ہے۔ اب آپ یہ پوچھیں گے کہ بھلا اس کا سستی اور کاہلی سے کیا تعلق؟ بھئی اطالویوں نے آخری مرتبہ غور و فکر (محنت سے بچنے کی) کے بعد یہ سوچا کہ بلا وجہ روٹی سے قیمہ، پنیر، اور دیگر سبزیاں کھانے کی کیا ضرورت ہے، اور اس سے کئی برتن بھی سن جاتے ہیں، کیوں نہ ان تمام اشیاء کو ایک ساتھ ہی پکا کر کھا لیا جائے! تو جناب اس طرح کاہلوں کی غور و فکر سے بھی ایک لذیذ ایجاد وجود میں آگئی۔ آگیا نہ آپ کے بھی منہ میں پانی؟ جی ہاں، آپ درست سمجھے، دیگر یورپی اقوام کی طرح یہ بھی "پینے" کو کھانے پر ترجیح دیتے ہیں، تاہم، اطالویوں کے نزدیک بس پینا ہی "جینا" ہے۔

ایرانی دسترخوان

ایرانی بھی خوب ہیں برصغیر سے اتنے قریب رہ کر بھی اپنی زبان کی شناخت، بولنے اور کھانوں کی لذت جیسے دونوں اہم امور میں، علیحدہ ہی برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔ چاول کو روٹی سے کھا جاتے ہیں۔ اور ہر چیز کو بھون کر اسے کباب کا نام دے دیتے ہیں۔ جیسے کہ: ماہی کباب، چلو کباب۔ مرغ کباب، وغیرہ۔ مگر مرغیوں سے خاصی محبت کرتے ہیں، چنانچہ عام طور پر ناشتہ میں انڈے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے تمام ایران میں فاسٹ فوڈ، خصوصاً بروسٹ چکن (بقول پاکستانی مزاح نگار و اداکار عمر شریف، "پکوڑہ چکن") کا نام و نشان نہیں۔ ہاں، بڑی بڑی مشینی روٹیوں کے ساتھ پنیر، دودھ، دہی خوب کھاتے ہیں۔ مرچوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ خوب گاڑھی اور کالی چائے بغیر چینی ملائے پی جاتے ہیں۔ ٹھیریے تو، ہم نے کہا کہ "چینی ملائے بغیر، مگر چینی کے بغیر تو نہیں" آپ حیران نہ ہوں، ہمارے ایرانی بھائی شکر کے مربع ٹکڑے پہلے اپنے دانتوں میں دبا لیتے ہیں، اور پھر گرما گرم کالی چائے کے فنجان سے چسکیاں لگائے جاتے ہیں۔ یقیناً وہاں دانتوں کے ڈاکٹروں کی بڑی چاندی ہوگی، کیونکہ انسان کے جسم میں ہڈیوں کے ڈھانچے کے سوا سب سے زیادہ تعداد میں یہی اعضاء ہوتے ہیں، باقی ہر کار آمد اعضائے انسانی اللہ تعالیٰ نے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو عدد ہی عطا فرمائے ہیں۔ سنا ہے کہ پاکستان کے صوبہ سرحد میں بھی اکثر مقامات پر چائے پینے کا یہی پسندیدہ طریقہ ہے۔

عربی طعام

عرب ممالک میں روایتی کھانوں کا رواج تیل کی پیداوار جاری ہونے کے بعد کم زور پڑ چکا ہے۔ اب یہاں بھی فاسٹ فوڈ، اور انواع و اقسام کے دالتے، مع مرچ مصالحہ، پسند کیے جانے لگے ہیں۔ تاہم چند برس پہلے، میاں گوہ (بڑی چھپکلی نما صحرائی، حلال، جانور) کا گوشت بھی ذوق و شوق سے کھایا جاتا تھا۔ اب مرغی، دنبوں، بکروں، اور گائے کے گوشت کے ساتھ پکے ہوئے خوب چکنے چاولوں کو

بہت بڑی مقدار میں کھایا جاتا ہے۔ ادھ پکی مرغی کو تازہ روٹی میں لپیٹ کر "شاورما" کے نام پر نذر معدہ کرلیتے ہیں، اور ساتھ ہی ایک عدد کولاڈرنک حلق سے اتارنے میں معاون ہوتا ہے۔ ایک روایتی ڈش دنبہ اور دودھ میں پکے ہوئے چاول ہیں، جسے "سلیج" کہتے ہیں۔ مہمان خصوصی کے سامنے دنبہ یا بکرے کی سری رکھی جاتی ہے، جس میں سے اس کی آنکھیں بے بسی سے جھانکتی ہوئی اپنے مہمان کو دعوت طعام دے رہی ہوتی ہیں۔ شہد، کھجور، زیتون، پنیر، انواع و اقسام کی شہد سے زیادہ میٹھی مٹھائیاں، اور کالی مگر خوب میٹھی چائے، بھی بہت مقبول ہے۔

پاکستانی اور بھارتی ذائقے (انھیں "کھانے" کہنا بے ادبی ہوگی)

ان کھانوں کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔ یہ امر تو حتمی ہے کہ یہ قومیں بہت حد تک کھانے کی شوقین اور چٹوری ہیں۔ دنیا بھر کے کھانوں کو قومیا کر ان کو نمک مرچ لگادیتی ہیں۔ اگر ان کھانوں کے اصل ممالک کے باشندے ان کی صورت سے دھوکا کھاتے ہوئے غلطی سے چکھ بھی لیں تو ان کھانوں کی سیرت کی بدولت وہ ہسپتال پہنچ جائیں۔ بیشتر پاکستانی اور بھارتی کھانوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کھانے انواع و اقسام کے مصالحوں میں دم پخت ہوتے ہیں۔ ان کھانوں میں مصالحہ جات اس تناسب سے استعمال کیے جاتے ہیں کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہاں کے باشندے متوازن غذا کے بجائے مختلف قسم کے مرچ مصالحے ہی کھاتے ہیں۔ مگر اس بات سے بھی مفر نہیں کہ ان کھانوں کی غذائی اہمیت بے شک نہ ہو، مگر یہ خوشبوؤں اور ذائقے سے بھرپور ہوتے ہیں۔ انھیں کھایا ہی نہیں۔ بطور خوشبویات بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ امریکہ، کنیڈا، میں ان کھانوں کی خوشبوؤں سے ہمسائے تنگ آکر پولیس کو تک طلب کرلیتے ہیں، کیونکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید پڑوسی اکیلا اکیلا ہی حشیش و ہیروئن وغیرہ بھون کر چٹ کر رہا ہے۔ مگر اپنے اپنے دیسوں میں ان کھانوں کی مقبولیت کا اندازہ پاکستانی اور بھارتی مردوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی توندوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر پاکستانی قوم ہر قسم کی حلال اشیا کھا جاتی ہے، عموی طور پر جانوروں کی کھال، اور سبزیوں کے چھلکے ہی پاکستانیوں کو مرغوب نہیں، چنانچہ اگر کبھی پاکستان میں غذائی اشیا کا کال پڑجائے تو کسی کو بھی حیرت نہ ہوگی۔

افریقی کھانے

براعظم افریقہ میں کئی اقسام کے کھانوں کا رواج رہا ہے۔ ان میں عربی، سواحلی اور یورپی کھانے بھی شامل ہیں۔ تاہم ان کے سب سے مشہور، مگر اب متروک، کھانوں کا بنیادی جزو "انسان" ہوا کرتا تھا۔ یہ آدم خوری اب اس صورت میں تو باقی نہیں رہی، مگر دیگر ترقی یافتہ ممالک نے باقی دنیا کو اس کا مزا چکھانے کے لیے معاشی (جسے "بدمعاشی" کہنا بہتر ہوگا) آدم خوری جاری کر رکھی ہے۔ افریقہ کے کھانوں کے بارے میں آپ نے یہ لطیفہ شاید نہ سنا ہو۔ ایک عیسائی تبلیغی جماعت جب ایک دور دراز گاؤں میں پہنچی تو وہاں کے ایک معزز قبیلے کے سردار نے کہا: "ہمارے قبیلے کی رگوں میں بھی گوری یورپی اقوام کا خون دوڑ رہا ہے۔" تبلیغی جماعت کے ارکان نے جب اس پر حیرت ظاہر کی تو اس سردار نے خوشی سے دانت نکالتے اور رال ٹپکاتے ہوئے یہ وضاحت کی کہ کچھ عرصہ قبل آنے والی مشنری جماعت کو وہ لوگ بھون کر اور تل کر کھاچکے ہیں۔

امریکی کھانے

یوں معلوم ہوتا ہے کہ امریکیوں کو اچھی صحت، خوش و خرم زندگی، اور لمبی عمر سے قطعاً کوئی دل چسپی نہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو خود ہی ان کی خورد و نوش کی عادات ملاحظہ کرلیجیے۔ یہ کھانے پر ہی نہیں، "پینے" پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔ ویسے تو امریکی بلڈ پریشر اور کولیسٹرول جیسے امراض کے خلاف بڑھ چڑھ کر مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں، مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بلڈ پریشر اور کولیسٹرول

بڑھانے والے عوامل خود امریکیوں ہی کی ایجاد ہیں۔ انکل سام نے ہی فاسٹ فوڈ کی اصطلاح متعارف کرائی۔ اس اصطلاح کا ایک سبب یہ نظر آتا ہے کہ یہ برق رفتار کھانے اپنے دیوانوں کو، دل کے دوروں کی صورت میں، تیزی کے ساتھ عرش بریں پر جنت کے میووں وغیرہ کے مزے لوٹنے کے لیے لے جاتے ہیں۔ اب ان فاسٹ فوڈز کے مضر اثرات سے کون واقف نہیں۔ ہائی بلڈ پریشر، کولیسٹرول، ٹرائی گلائیسرائیڈز، یوریا، شکر / ذیابطیس، موٹاپا، اور کچھ اقسام کے قاتل کینسر، ان سب امراض کے اسباب میں یہ فوڈ اپنی تیز رفتاری کے سبب آگے ہی آگے ہیں۔ مگر عمومی طور پر بچے، بڑے اور بوڑھے، سب ہی ان لذیذ اور سہل آمیز کھانوں کے دلدادہ ہیں۔ اس سلسلہ میں امریکیوں نے یہ پالیسی اپنائی ہوئی ہے کہ وہ اکیلے ہی کیوں مریں، کیوں نہ باقی سب کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں۔ چنانچہ آج دنیا کا کوئی بھی خطہ ایسا نہیں جہاں فاسٹ فوڈ ریستوران موجود نہ ہوں۔ اور ہاں، جنوبی امریکہ کے چند ممالک میں یہ بھی رواج ہے کہ وہ ساحل سمندر سے تازہ اور زندہ مچھلی پکڑ کر، بلا کسی تاخیر، اسے دہیں کچا چبا جاتے ہیں۔

لیجیے جناب، آپ سے باتیں کرتے کرتے ہم بھی "میکڈونالڈز" آپہنچے۔ ہمیں چند لمحوں کے لیے معاف کیجیے گا۔ "سنیئے جی، ذرا دو عدد سپر برگرز، فرنچ فرائیز، مائینیز، کوکا کولا، اور ان کھانوں کو خریدنے پر مجبور کرنے والا "مفتیا گفٹ" تو دیں۔ ذرا جلدی، پلیز۔ ہمیں "کینٹکی فرائڈ چکن" اور ان کا تحفہ لینے بھی جانا ہے"۔ ☆

تعاون

اردو ادیبوں کی ایک دعوت طعام میں مولانا عبدالحق کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب کھانا کھاتے کھاتے اپنی انگلیاں چاٹنے لگے۔ جب چٹخارے لے لے کر اپنی انگلیاں چاٹ چکے تو مولانا نے اپنا دستِ تعاون بڑھایا۔ یعنی اپنی انگلیاں ان کے منہ کے قریب لا کر کہنے لگے:

"لیجئے حضرت اب انہیں بھی صاف کر دیجئے"۔

●☆●☆●☆●

حاضر جوابی

سوہن لال ساحر ایک بار ممبئی گئے تو مینا شوری نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔

دعوت میں ساحر صاحب نے مینا کو چھیڑتے ہوئے کہا:

"مینا، جب تم لاہور میں ملی تھیں تو تمہارے ساتھ الناصر تھا وہ کہاں چلا گیا؟"

مینا نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے نہایت متانت سے ساحر صاحب سے الٹا یہ سوال کر دیا:

"اور لاہور میں جب آپ ملے تھے آپ نے جو کوٹ پہنا ہوا تھا اس کا کیا ہوا؟"

"کوٹ؟" ساحر صاحب نے پریشان سا ہو کر کہا "وہ پرانا کوٹ، میرا مطلب ہے ناکارہ ہو گیا"۔

"تو اپنے سوال کا جواب بھی انہیں الفاظ میں تلاش کر لیجئے"۔ مینا بدستور سنجیدگی سے کہنے لگی۔

اور سنا ہے کہ اب روپ کے شوری کا بھی کوٹ اتار کر مینا مستقل طور پر پاکستان میں آباد ہو گئی ہے۔

دلشاد رضوی
حیدرآباد

بھاڑ میں جائے ایسا ملازم

ابھی ہم سن بلوغ کو پہنچ ہی رہے تھے بلکہ یوں سمجھئے کہ پہنچ ہی گئے تھے (یہ وثوق اور یہ یقین اس لیے ہیکہ تب ہمیں ہمعصر لڑکیاں اچھی معلوم ہونے لگی تھیں) کہ عین اسی وقت ہمارے اچھے بھلے ملک کا بیٹھے بٹھائے بٹوارہ ہوگیا۔ پھر کیا تھا ہراج خانے والوں کے وارے نیارے ہوگئے کیونکہ اچھے برے، معقول اور نامعقول ہر طرح کے لوگ اپنی بیش بہا قیمتی اشیاء کوڑیوں کے مول بیچ بچاکر پردیس کو اپنا دیس بنانے جانے لگے۔ ان جانے والوں میں ہمارے ایک چچازاد بھائی اور ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ ان کے اسطرح اچانک چلے جانے کا رنج بلکہ غم ہمیں اس لیے بھی زیادہ رہا کہ یہاں ان کی ایک عدد چاکلیٹ کی فیکٹری تھی وہ اگر چلتی نہیں تو رینگتی ضرور تھی۔ بچپن ہی سے جب ہم ان سے ملنے جاتے وہ ہمیں دونوں جیبوں بھر چاکلیٹوں سے نواز دیتے۔ اور ان چاکلیٹوں کا مزا آج بھی ہماری زبان کی نوک پر ہے کہتے ہیں کہ جانے والے لوٹ کر نہیں آتے لیکن خدا نہ کرے ان کا جانا ویسے تھوڑا ہی تھا وہ تو لکشمن ریکھا جیسی لکیر کی دین ہے کہ ادھر کا آدمی ادھر اور ادھر کا آدمی ادھر دم سادھے زندگی گزار رہا ہے الغرض ان کو گئے ابھی چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ انہیں اپنے آبائی وطن کی یاد تڑپا گئی۔ اور وہ چند دن گزارنے اپنے آبائی وطن آدھمکے۔ عرصہ دراز کی جدائی کے بعد پر خلوص رشتہ داروں سے ملنے پر عام انسانوں کا جو کیفیت ہوتی ہے وہی ہو بہو ہماری بھی تھی۔ چار سال کی طویل مدت اگر راکٹ میں گزاری جائے تو شاید آدمی کرہ ارض سے نکل کر مریخ جیسے دور دراز سیارہ میں کود پڑے۔ چنانچہ ہم میں آپس میں ڈھیر ساری باتیں ہوئیں اور تبھی دیور بھابی کی نوک جھونک بھی تازہ دم ہوگئی۔ ان کے بھاری بھر کم تن و توش کو دیکھکر ہم نے بھابی سے محبت بھرے لہجے میں پوچھا "بھابی آپ کچھ کمزور سی لگتی ہیں یہ تو بتلائیے کہ گھریلو کام کاج کے لیے کوئی ملازم بھی رکھا ہے یا آپ خود ہی سارا کام نمٹالیتی ہیں"۔

ہمارے اس سوال پر پہلے تو وہ خاصی جھینپ سی گئیں پھر جب بولنا شروع کیا تو ایک دم سے یوں پھٹ پڑیں "ارے میاں کیا پوچھتے ہو ابتداء میں تو بڑی مصیبت میں جان رہی جھاڑو برتن سے لے کر پکوان تک کرتے کرتے جب میں تھک گئی تو ایک دن تنگ آکر تمہارے بھائی سے بولی کہ صاحب میں کام کرتے کرتے تھک کر چور ہوئی جاتی ہوں کیوں نہ ہم ایک ملازم رکھ لیں سو کچھ تو ہاتھ بٹائے گا۔ میرا بپھرا لہجہ دیکھکر انہوں نے مجھے محبت سے دم دلاسہ دیا اور دوسرے ہی دن اپنے پٹھان آفس بوائے سے ملازم کے بارے میں بات کی۔ پٹھان بولا "واللہ ہمارا ایک بارہ برس کا لڑکا ہے۔ ہم کل اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کرے گا"۔

مجھے جب یہ خوشخبری ملی تب میں خوشی سے پھولی نہیں سمائی لیکن ـــ لیکن دوسرے دن جب اسکا میرا آمنا سامنا ہوا تب میں بڑی دیر تک حیرت سے اسے تکتی رہی کیونکہ صورت تو اسکی بلاشبہ معصوم ہی تھی لیکن پٹھانی شلوار میں ملبوس اپنے سینے پر واسکوٹ ڈاٹے سر پر بارہ انچ کا طرہ بٹھائے وہ اپنی عمر سے کم از کم پانچ برس بڑا نوجوان لگ رہا تھا۔ پہلے تو اسے دیکھکر میں نے ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن ملازم کی شدید ضرورت کی یاد نے جب سر اٹھایا تب ہمت کرکے اسے اندر بلالیا۔ اور وہ اپنے پٹھانی سینڈل سمیت رپ رپ کرتا ہوا گھر میں داخل ہوگیا۔ اب جب میں نے اسکا نام پوچھا تو وہ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔ پھر جب کام کاج کے بارے میں سمجھانے کی

کوشش کی تب بھی وہ لمبا تڑنگا نوجوان قطب مینار کی طرح ساکت ہی رہا اب تو میں نے اس سے خوف سا محسوس کیا اور جلدی سے اسے رخصت کرکے جھٹ سے دروازہ کی کواڑ لگالی۔

دن بھر تو جلی بھنی بیٹھی رہی اور شام میں جب تمہارے بھائی گھر آئے تو سارا دن بھر کا غصہ ان پر نکال دیا۔ بولی "صاحب یہ کسی بلا کا نوکر ہے۔ نگوڑا کچھ سمجھتا ہی نہیں کام کیا خاک کرے گا"۔

وہ بولے "فکر نہ کرو رفتہ رفتہ ہماری بات سمجھنے لگے گا اور دوسرے دن تمہارے بھائی نے جب اسکے خان والد سے ذکر کیا تو اس خان نے پشتو زبان میں اپنے لڑکے کو کچھ اس انداز سے سمجھایا کہ میں سمجھی کہ وہ اسے آڑے ہاتھوں لے رہا ہے پھر ہم سے یوں مخاطب ہوا۔ "ادلے برادر ہم اس کو بتلا دیا ہے اب آپ جیسا بولے گا وہ ویسا ہی کرے گا۔" یہ سنکر میں بہت خوشی ہوئی اور پھر۔۔۔۔

اور پھر دوسرے دن میں نے اس سے شفقت بھرے لہجہ میں کہا "ذرا سامنے والی پلیٹ دینا" اس نے بھی ویسے ہی شفقت بھرے لہجہ میں میرا جملہ یوں دھرایا "ذرا سامنے والی پلیٹ دینا" میں نے جھلاکر کہا "وہ سامنے والی پلیٹ لا" وہ میرے ہی لہجہ میں بولا "وہ سامنے والی پلیٹ لا" میں نے بگڑ کر کہا "ابے کیا بکتا ہے" وہ بگڑا اور بولا "ابے کیا بکتا ہے" مجھے اسی کی ان بے تکی باتوں پر بڑا غصہ آیا بولی "دیوانہ، سڑا کہیں کا" اس نے شاید میری ہی طرح منہ بنایا بولا "دیوانہ سڑا کہیں کا" اب تو میں غصہ میں آپے سے باہر ہو گئی اور سامنے رکھی پلیٹ اٹھاکر اس پر دے ماری۔ اس نے بڑی پھرتی سے وہ پلیٹ اٹھائی اور تاک کر مجھے نشانہ بنایا وہ تو خیر ہوئی کہ میں ایک طرف جنبش کر گئی ورنہ شاید میرا سر ہی کھل جاتا میں نے اس مردود سے جھنکارہ پانے کی ٹھانی اور جل کو بولی "کمبخت نکل یہاں سے" اسنے تیور چڑھائے اور بولا "کمبخت نکل یہاں سے" اگر چہ کہ دیر ہی سے سہی لیکن اب میں سمجھ گئی کہ بڑے خان نے اپنے لاڈلے کو کیا سمجھایا ہوگا۔ لیکن اس ساری دھینگا مشتی کے بعد میں نے دل میں کہا "بھاڑ میں جائے ایسا ملازم" اور دوسرے ہی دن اسے نکال باہر کرکے گھر کا کام کاج دوبارہ سنبھال لیا۔"

بھابی تو اتنا سناکر چپ چاپ بیٹھ گئیں لیکن ہم ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئے پر یہ سوچ ضرور رہی کہ بھائی بھابی جیسے مہاجرین کو جانے اور کن کن مشکلات کا سامنا رہتا ہوگا۔ ☆

نریش کمار شاد

مشہور طنز نگار فکر تونسوی سے انٹرویو

"فکر صاحب! اگر آپ سے انٹرویو کا آغاز میں اس سوال سے کروں کہ آپ طنز نگار نہ ہوتے تو کیا ہوتے تو آپ کیا کہیں گے؟"۔
فکر صاحب کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ان کی شوخ و شریر ذہانت ناچنے لگی۔
"تو میں جواباً عرض کروں گا کہ اگر پانی پانی نہ ہوتا تو جم کر برف بن جاتا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولے کی طرح گنجے سروں پر وار کیا کرتا۔"

"مزاح تو خیر طنز کے بغیر ممکن ہے۔" میں نے فکر صاحب کے جواب سے محظوظ ہونے کے بعد استفسار کیا۔ "لیکن کیا طنز بھی مزاح کے بغیر ممکن ہے؟"

"جی ہاں! بالکل ممکن ہے اور اس کی سب سے بڑی مثال سوئفٹ ہے!"

فکر صاحب کے سامنے بکھرے ہوئے متعدد روز ناموں پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"صحافت اور ادب میں آپ کے نزدیک کیا فرق ہے؟"

"اگر دونوں کا خالق ایک ہو تو فرق کم ہوجاتا ہے۔"

"جیسے آپ ....." میں نے فکر صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"البتہ اگر دونوں کے خالق الگ الگ ہوں تو فرق قائم رہتا ہے۔"

فکر صاحب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ایک لمحہ کے سکوت کے بعد کچھ سوچ کر کہنے لگے۔ "فرق کم ہوسکتا بھی نہیں۔ کم ہونا چاہئے بھی نہیں۔"

"اچھا اب یہ فرمایئے آپ کی زندگی میں ایسا کون سا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کو طنز نگاری کی طرف مائل کیا؟"

میرے اس سوال کے جواب میں فکر صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لگاتے ہوئے کہا "تقسیم ہند کے تاریخی بلکہ جغرافیائی واقعے نے میرے اندر سوئے ہوئے طنز نگار کو ایک دم بیدار کردیا۔ کیوں کہ میں نے محسوس کیا، سیاست داں مکار ہوتے ہیں اور عوام سادہ لوح اور بے بس۔ مکاری اور بے بسی میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں ہوتا۔ تقسیم ہند پر یہ ضابطہ ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا۔ اور یہ دھماکا مجھے ایک استہزائیہ قہقہہ معلوم ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد ہر مصنوعی رشتے پر قہقہہ لگانا میرا آدرش ہوگیا۔"

"خوب ....." میں نے فکر صاحب کے سنجیدہ چہرے پر جو اس وقت سنجیدگی کا کارٹون معلوم ہورہا تھا اپنی مسکراتی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ کے نزدیک ایک اچھے طنز نگار کی خصوصیات کیا ہیں؟"

"خصوصیات؟" سنجیدگی کا کارٹون، طنز کی واضح تصویر میں منتقل ہوگیا۔ "خصوصیات نہیں، بلکہ صرف ایک خصوصیت ہی کافی ہے کہ وہ محلِ طنز کو بھانپ سکتا ہو۔ بھانپنے کے لئے نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے طنز نگار اقبال کے مرد مومن کا

سا رتبہ رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نگاہ کے بعد موثر اظہار کی منزل آتی ہے۔ جو ایک آرٹسٹ کے لئے فطرت کی دین ہوتی ہے۔ شاید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آرٹسٹ ہونا ہی طنزنگار کی خصوصیت ہے۔ فطری آرٹسٹ ہونا۔ اس اعتبار سے اسے دوسرے آرٹسٹوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔"

فکر صاحب کی زبان سے اقبال کا نام سن کر بے اختیار میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔

"آپ کی ادبی زندگی کا آغاز تو میں جانتا ہوں شاعری سے ہوا اور فکر تخلص بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ لیکن آپ نے شعر کہنا ترک کیوں کردیا؟"

"اگر میں سنجیدگی سے جواب دینا چاہوں تو عرض کروں گا۔" فکر صاحب سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "بقول غالب مجھے اظہار و بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہیئے تھی۔ محسوسات کے اعتبار سے میں اپنے ملک کے پس افتادہ عوام کے زیادہ قریب تھا۔ اور ان کے ساتھ ڈائرکٹ اپنا ادبی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اور نثر بالخصوص طنز نے مجھے یہ رشتہ قائم کرنے میں مدد دی۔ لہذا شاعری تنگ آکر مجھے چھوڑ گئی۔ اگر چہ اب بھی وہ میرے طنزیہ ادب میں چوری چھپے در آتی ہے اور میں اپنی پرانی آشنا کو دیکھ کر مسکرا اٹھتا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ میری یہ پرانی آشنا میری طنزیہ تخلیقات کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ لہذا مان لینا چاہئے کہ مجھ سے ترک شعر نہیں ہوسکا۔"

"طنز اور شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف مثلاً تنقید اور ڈرامہ سے آپ کو کس حد تک دل چسپی ہے؟"

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں ـــــ" فکر صاحب سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگے۔ "میری ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ لہذا شاعری سے میری دل چسپی کو آپ میرے مزاج کی افتاد کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اور اگر اسے خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے تو میرا خیال ہے کہ میں نے دو چار نظمیں ایسی بھی لکھی تھیں جو اعلیٰ شاعری کو چھوتے چھوتے رہ گئیں۔ مجھے تنقید سے کسی زمانے میں دلچسپی ضرور تھی۔ لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ اب ہماری تنقید میں اور یجینیلٹی کم اور تقلید و اعادہ کے عناصر زیادہ ہوتے جارہے ہیں تو تنقید سے جی بھر گیا۔ ڈرامہ نہ پڑھ سکتا ہوں نہ دیکھ سکتا ہوں۔ اور یہ شاید میری بدنصیبی ہے۔"

"آپ کے خیال میں ابھی تک آپ کا بہترین طنزیہ کون سا ہے؟
اور وہ کن حالات میں لکھا گیا؟"

"بہترین طنزیہ؟" فکر صاحب اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ لیکن چند لمحوں تک آہستہ آہستہ بہترین طنزیہ کے الفاظ دہرا کر کہنے لگے۔ "لوگ کہتے ہیں کہ "گمشدہ کی تلاش" میرا بہترین طنزیہ ہے لیکن ذاتی طور پر مجھے "فٹ پاتھ کا روپیہ" پسند ہے۔ یہ کن حالات میں لکھا گیا مجھے یاد نہیں۔ اگر چہ میرا عقیدہ ہے کہ حالات کا طویل تسلسل ہی کسی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ کوئی ایک سچویشن اس کی تنہا ذمہ دار نہیں ہوتی۔"

"ویسے آپ طنزیہ مضامین لکھتے کیوں کر ہیں؟"

اور میرے اس سوال پر فکر صاحب نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کچھ پریشان سا ہوکر کہا "ٹالنے کی نیت سے نہیں بلکہ سچ کہتا ہوں کہ میں بھی دوسری اصناف کے ادیبوں سے الگ نہیں ہوں۔ جیسے وہ لکھتے ہیں ویسے ہی میں بھی لکھتا ہوں۔" اتنا کہنے کے بعد وہ ذرا سی دیر کے لئے رکے اور ان کی پریشانی ہلکی ہلکی اداسی میں ڈھل گئی۔ "وہ بھی میری طرح کچھ چیزیں "آرڈر پر" اور کچھ اپنے تخلیقی مزاج کے تقاضے پر لکھتے ہیں۔ ہمارے ملک کی معاشی پستی میں معاشی طور پر پس افتادہ ادیب کے لئے آرڈر سے مفر ممکن نہیں اور اپنے تخلیقی

مزاج کے تقاضے سے بچنا تو خیر قطعاً محال ہے۔"۔

"کن کن ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں سے آپ خاص طور پر متاثر ہوئے ؟"

"ہمارے ملک میں طنز نگاری ابھی "لے پالک" کی حیثیت رکھتی ہے۔" فکر صاحب کے استخوانی چہرے پر پھر ان کی نام نہاد سنجیدگی نے اپنے پنکھ پھیلا دیئے۔ "البتہ مزاح نگاری کی روایات میں کچھ اور بجینئلی ہے۔ اس اعتبار سے عظیم بیگ چغتائی کے پاس سماجی بنیاد موجود ہے۔ اس لئے اس کی تحریروں کا مجھ پر گہرا اثر پڑا ہے۔ یوں مجھے کپور، پطرس اور رشید احمد صدیقی کی جدیدیت نے بھی کافی حد تک متاثر کیا۔ غیر ملکی طنز نگاروں میں سوئفٹ تو خیر بڑا خطرناک رہنما ہے۔ اگر چہ وہ خالص اور سو فیصدی طنز نگار ہے مگر اس سے ڈر بہت لگتا ہے۔ دوسرے درجے پر خالص طنز کا ماسٹر مارک ٹوئن ہے۔ اور میرے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ لی کاک میں مزاح اور طنز کا بڑا فنکارانہ امتزاج ہے۔ البتہ وڈہاؤس مجھے پسند نہیں۔ وہ سطحیت اور زود نگاری کا شکار ہے۔"

"آپ کے بقول ہمارے ملک میں طنز نگاری کی حیثیت "لے پالک" کی سی ہی۔" میں نے پوچھا۔ "تاہم آپ کے خیال میں اس وقت اردو کا سب سے بڑا طنز نگار کون ہے ؟"

فکر صاحب نے بھرپور اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "بڑے طنز نگار ابھی پیدا ہونے ہیں۔ درمیانے اور چھوٹے موٹے طنز نگار چل رہے ہیں۔ جن میں ایک میری گناہ گار ذات بھی شامل کر لیجئے۔"

"اور اس گناہ ذات کے خیال میں ..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اردو کی جدید ترین نسل میں بھی کوئی قابل ذکر طنز نگار ہے کہا؟"

فکر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جدید ترین نسل میں مشتاق احمد یوسفی قابل ذکر تو نہیں۔ البتہ قابل غور طنز نگار ضرور ہے۔ بشرطیکہ تھک ہار کر نہ بیٹھ جائے۔ کیونکہ اس خار زار میں آگے چل کر کچھ سخت مقام آتے ہیں۔"

"اچھا یہ فرمایئے جس وقت آپ نے طنز نگاری کا آغاز کیا تھا، اس وقت طنز نگاری کا کیا مقصد آپ کے پیش نظر تھا ؟"

"آپ شاید ___" فکر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "مقصدی ادب کی بات نئے سرے سے چھیڑنا چاہتے ہیں جس پر ہم برسوں ادب برائے ادب والے "معززین" سے لڑائیاں لڑتے رہے ہیں اور اب تو تھک ہار کر یہ بے چارے "معززین" بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ میں "مقصدی ٹولے" والا ہوں۔ باقی رہا طنزیہ ادب کا پیش منظر تو پہلے یہ تسلیم کیجئے کہ طنز بھی ادب کی ذیل میں آتا ہے۔ تاکہ اس کے بعد آپ کو یہ تسلیم کرنے میں آسانی ہو جائے کہ میرے طنزیہ ادب کا بھی وہی مقصد ہے جو ادب برائے زندگی والے ٹولے کا ہے۔ شاد صاحب! کیا میں اپنی بات کو واضح کر سکا ہوں ؟"

"اگر نہیں کر سکے تو اب کر دیں گے۔" میں نے بھی ان کی طرف گھورتے کہا۔ "یہ بتایئے کہ آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں ؟"

فکر صاحب نے کسی قدر جھلاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "دائی سے پیٹ نہیں چھپایا جا سکتا۔ میری تحریریں میرے مارکسی نظریات کو نہیں چھپا سکیں۔ ہوم منسٹری کی خفیہ پولیس اس کی معتبر گواہ ہے۔"

"ہندوستان میں اردو زبان کا آپ کے نزدیک کیا مستقبل ہے ؟"

فکر صاحب دل شکستہ ہو کر کہنے لگے۔

"ہندوستان میں اردو زبان فرقہ پرستی کا شکار ہو چکی ہے اور ٹریجڈی یہ ہے کہ اس میں دیانت دار لوگوں کی طرف سے جان ڈالنے کی جو کوشش ہو رہی ہے اس میں بھی فرقہ پرستانہ نقطہ نگاہ نمایاں ہے۔" اور غیر ارادی طور پر فکر صاحب کے انداز گفتگو میں ان کا

مخصوص کٹیلا پن سمٹ آیا۔" حالانکہ اب تک مرحومہ کے کچھ بہادرانہ کارنامے زندہ ہیں۔ جنھیں لوٹ کے مال کی طرح مختلف لوگ آپس میں بانٹ کر لے جارہے ہیں۔ مال کا ایک بڑا حصہ ہندی کی نشوونما کے لئے بھی استعمال کیا جارہا ہے اور جونہی لوٹ کا یہ مال پوری طرح تقسیم ہوگیا مرحومہ کی لاش کو بڑے اطمینان کے ساتھ دفنا دیا جائے گا۔"

اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آخری جملہ کہتے ہوئے فکر صاحب کی آواز بھرّا گئی ہے۔ اچانک مجھے مجنوں گور کھپوری کا ایک فقرہ یاد آگیا جو انھوں نے میر تقی میر کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے میں نے فکر صاحب کے سامنے اسی کو دہرایا۔

"کیا یہ حقیقت ہے کہ طنزنگار سنجیدہ آدمیوں سے زیادہ یاس پرست ہوتا ہے۔ اسے زندگی میں کوئی روشن اور حسین پہلو نظر نہیں آتا۔ ورنہ وہ اپنے طنز کے لئے مواد ہی نہ پائے۔"

فکر صاحب نے فی الفور اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں طنز تو حرکت اور حرارت کا نام ہے۔ اس میں یاسیت کیسی۔ طنزنگار کو روشن اور خوب صورت پہلوؤں سے محبت نہ ہوتی تو وہ بھونڈے پن اور تاریک پہلوؤں کے خلاف کبھی قدم نہ اٹھاتا۔ اور یاد رکھئے کبھی کوئی یاس پرست ہتھیار نہیں اٹھاتا۔"

اس کے بعد میں نے جب احتشام حسین کے کسی مضمون کا ایک اقتباس دہراتے ہوئے فکر صاحب سے دریافت کیا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ طنز کا پودا معاشرتی ہیجان اور سیاسی کشمکش میں پنپتا ہے۔"

تو فکر صاحب نے محض اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کردی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ بولتے بولتے تھک گئے ہیں۔ چنانچہ محض انھیں چھیڑنے اور بولنے پر مجبور کرنے کی نیت سے میں نے آخری سوال کیا۔

"کیا اس حقیقت کا آپ کو احساس ہے کہ اپنے طنزیہ مضامین میں آپ زبان و بیان کی نسبت مواد پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔" اور پھر خود ہی سوال کی تلخی کو کم کرنے کے لئے شعوری طور اپنی بات میں ہلکا سا مزاح پیدا کرتے ہوئے کہا "یعنی زبان کی صحت کا اپنی صحت سے بھی کم خیال رکھتے ہیں۔"

فکر صاحب نے کھلکھلاتے ہوئے اور تازہ دم ہوکر جواب دیا۔ "مجھے زودنگاری بلکہ بسیارنگاری کا مرض لاحق ہے۔ جس میں نہ صرف زبان بلکہ کئی بار خیال کی صحت بھی دگرگوں ہوجاتی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی بہتر EXCUSE نہیں ہے۔ کیونکہ زبان اور خیال کی ہم آہنگی سے میں کبھی منکر نہیں ہوا۔ میں نے اپنے ایک شعر میں کہا تھا کہ:

دم لینے دے زمانہ تو ہم بھی کریں گے عام
تیرے بدن کا ذکر ترے پیرہن کی بات

شاد صاحب، فرض کیجئے اگر زمانے نے دم نہ لینے دیا تو میری صحت اور میری زبان، کیا دونوں بدستور مجھ سے شکوہ سنج نہ رہیں گے؟" (دسمبر ۱۹۶۲ء) ...

●☆●☆●

☆●☆

سگ لیلیٰ (سترہویں قسط)

پرویز ید اللہ مہدی
(حال مقیم امریکہ)

دخترِ بداختر

درِ محبوب جیسے ہی سامنے نظر آیا، نظروں نے عقیدتاً اسے چوما، ہم نے ڈاکٹر صاحب سے فوراً جیپ روکنے کو کہا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ گلی ایک دم سنسان تھی۔ ڈاکٹر صاحب جیپ سے باہر آتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولے: "واہ جناب والا، تم نے نہ صرف ہمارا محلہ تاکا گلی بھی ہماری ہی ڈھونڈھی، ان شاندار بنگلوں کے قطار در قطار سلسلے میں کس کے آگے تم نے اپنے عشق کا پڑاؤ ڈالا ہے؟"۔

ہم نے جواباً نیلے بنگلے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ رہا وہ سنگِ آستاں جس کے آگے ایک خونخوار درباں، کا خوف مجھے سر جھکانے نہیں دیتا!!"

"یہ نیلا بنگلہ۔؟" موصوف نے حیرت سے کہا: "تمہیں کوئی دھوکہ تو نہیں ہوا، ذرا غور سے دیکھو کیا یہی وہ بنگلہ ہے؟"۔

ہم نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا... کیا بات کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب آپ! ایک عاشق ہر بات میں دھوکہ کھا سکتا ہے لیکن محبوب کے سنگِ آستاں کے سلسلے میں ہرگز ہرگز دھوکہ نہیں کھاتا، یہی وہ عشرت کدہ ہے جہاں میری محبوبہ اپنے کتے کے ذریعہ میری نیند حرام کر کے خود چین کی نیند سوتی ہے!!"

"بند کرو اپنی بکواس"۔ ڈاکٹر صاحب اچانک غصہ سے کسی بم کی طرح پھٹ پڑے"۔ میں مزید اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا"۔ موصوف پر اچانک غصہ کا دورہ پڑ گیا تھا کسی خونخوار بلڈاگ کی طرح ان کے بھاری بھر کم نتھنے پھولنے پچکنے لگے تھے۔ ہونٹوں سے کف، صابن کے جھاگ، کی طرح اڑاڑ کر داڑھی کے بے ترتیب بالوں میں پناہ لینے لگا تھا وہ مٹھیاں بھینچ کر ایک بار پھر دہاڑے۔

"میرے ہی گھر پر ڈاکہ ڈال کر تم مجھے ہی اپنے عشق کی روداد سنانے چلے آئے"۔

"آپ کا۔ گھ۔ گھ۔ گھر۔ گھر.... مارے ہیبت کے ہم ہکلانے لگے۔

"ہاں یہ نیلا بنگلہ میرا ہی ہے!"۔ موصوف کے لہجے کی دہاڑ نے ہمارا وہی حال کر دیا جو کسی خونخوار جبری کتے کے روبرو پہنچ کر ہو سکتا تھا۔ بات پوری طرح کھل چکی تھی ہماری محبوبہ یقیناً موصوف ہی کی دخترِ نیک اختر تھی، اور اس کا کتا بھی کوئی غیر نہیں موصوف ہی کا پالتو کتا تھا۔ آج پھنسے تھے بری طرح، سانپ کے منھ کی چھچھوندر سے بری حالت تھی ہماری۔ ادھر موصوف کا غیض و غضب بھی اس بات کا شاہد تھا کہ وہ ہمیں سزا دیئے بغیر بخشیں گے نہیں اور سزا بھی ایسی ویسی۔ یقیناً سگ محبوب کو ہم پر کھلا چھوڑ دیں گے کہ ان کی دخترِ نیک اختر سے عشق کرنے کی پاداش میں ہماری تکہ بوٹی کر ڈالے تاکہ نہ باسی بچے نہ کوئی اور کتا کھائے یعنی نہ ہم زندہ بچیں نہ پھر کسی اور کی دخترِ نیک اختر سے عشق کر کے کسی باپ کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کر سکیں۔

ہم اس طرح موصوف کے آگے سر جھکائے کھڑے تھے جیسے مجرم ہوں اور زبان حال سے کہہ رہے ہوں:

تیر کیا توپ چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سر یہ کس کا ہے میری جان جگر کس کا ہے

اس سے پہلے کہ موصوف ہمارے ساتھ واقعی کوئی بالجبر قسم کا سلوک کرتے ہم نے اپنی تمامتر بچی کچی ہمت یکجا کرکے آخری بار اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی۔ " یہ سچ ہے جناب عالی کہ مجھ سے جو غ۔ غلطی ہوئی ہے وہ ہرگز ہرگز قابل معافی نہیں بلکہ قابل گردن زدنی ہے، لیکن سچ کہتا ہوں اگر مجھے بخدا یہ پتہ ہوتا کہ یہ نیلا بنگلہ آپ کی ملکیت ہے تو اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی بھی جسا۔ جسا۔ جسارت نہیں کرتا، چہ جائیکہ، آپ کی دختر نیک اختر سے عشق، میرا مطلب ہے اظہار عشق....!! "

ہم نے اتنا ہی کہا تھا کہ موصوف پھر گلا پھاڑ کر دہاڑے ..... " میری دختر نیک اختر.... یعنی کہ میری اپنی.... مطلب خود میری اپنی دختر نیک اختر.... "

ہم نے فوراً لقمہ دیا..... " جی۔ آپ کے دولت خانے میں رہتی ہے تو آپ ہی کی دختر نیک اختر ہوئی نا! "

ہمارے اس تازہ لقمے نے انہیں اور بدہضمی میں مبتلا کردیا۔ مٹھیاں بھینچ کر چلائے۔ تمہاری یہ جرات کہ مجھ پہ جھوٹا الزام لگاؤ، بہتان طرازی کرو۔ ایک باون سالہ مستند مجرد باکرہ کنوارے پاک دامن پر کیچڑ اچھالتے شرم نہیں آتی تمہیں.... دنیا کی نظروں میں ایک حرامی باپ ثابت کرکے کس بات کا بدلہ لینا چاہتے ہو تم مجھ سے ... بتاؤ... بولو... اف میرے خدایا.... "

موصوف نے سر پکڑ کر جیپ کے بونٹ کے سہارے اپنی پشت ٹکائی اور آنکھیں موندلیں۔ موصوف کی اس دورنگی، دوغلی، گفتگو نے ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ ایک طرف تو وہ ہم پر اس لئے قہر برسا رہے تھے کہ ہم نے ان کی دختر نیک اختر سے عشق کیوں جھاڑا۔ دوسری طرف اس بات کو لے کر جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہے تھے کہ ان کی کوئی دختر نیک اختر ہے ہی نہیں.... اچانک ہمیں ان کی سیکس ٹری سوزی کی بات یاد آئی، اس نے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب Absent Minded عرف بھلکڑ بھی ہیں جیسا کہ اکثر ذہین اور بہت زیادہ پڑھے لکھے عالم فاضل اصحاب ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کے یاد آتے ہی ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ڈاکٹر صاحب کے ایک عدد دختر نیک اختر ہے ضرور، لیکن یہ اپنے بھلکڑ پن کی وجہ سے اس کے جیتے جاگتے وجود کی نفی کر رہے ہیں۔ یعنی ایک طرف ان سے یہ بات برداشت نہیں ہو رہی ہے کہ کوئی ان کی دختر نیک اختر سے عشق کرے، دوسری طرف ان کا دماغ انہیں یہ کہہ کر بھٹکا رہا ہے کہ ان کی کوئی دختر نیک اختر ہے ہی نہیں، گویا بقول غالب صورتحال کچھ یوں تھی: ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے "

کچھ دیر موصوف پر یہ کیفیت طاری رہی، پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل گئیں، اور وہ سوالیہ انداز میں ہم سے مخاطب ہوئے: " آخر تم کس بنا پر یہ کہہ رہے ہو کہ میری ایک دختر نیک اختر بھی ہے ؟ "

اس بار موصوف کا لہجہ کم پھاڑ کھانے والا تھا، نتیجتاً ہم بھی کم گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے " محبوبہ کے ذکر پر آپ نے جس شدید رد عمل کا مظاہرہ کیا، اس سے مجھے یوں لگا میری محبوبہ اصل میں آپ کی دختر نیک اختر ہے "۔

" تم دختر نیک اختر کی بات کرتے ہو، میری تو کوئی دختر بد اختر بھی نہیں، کیوں کہ اس کے لئے پہلے مجھے خود کسی کی دختر نیک اختر سے عشق فرمانا پڑے گا، پھر اس عشق پر نکاح کی مہر تصدیق ثبت کروانی ہوگی پھر شب وصل منانی ہوگی۔ الغرض کئی قانونی اور شرعی کارروائیوں سے درجہ بدرجہ گزرنا پڑے گا جن سے گزر کر ہی ایک مرد کسی دختر نیک اختر یا فرزند دلبند کا باپ کہلاتا ہے "

موصوف کی زبانی ان کے باپ نہ بننے کی معقول وجوہات سن کر ہم نے اس طرح چین کا سانس لیا جیسے کافی دیر تک موت کے

کنویں میں بن بریک موٹر سائیکل چلا کر زندہ اور سلامت لوٹ آئے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب پوری طرح نارمل ہوچکے تھے۔ اس لئے ہم نے ان سے پوچھا: "آپ کے گھر میں آپ کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے ؟"

بولے ... میرے علاوہ میرے گھر میں صرف میں ہی میں ہوں"۔ جواب کیا تھا ایک معمہ تھا جسے انہی کی زبانی حل کروانے کے لئے ہم نے بے ساختہ کہا "کیا مطلب ؟"۔

"مطلب یہ کہ میرے علاوہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں میں صرف مجرد ہی نہیں مفرد بھی ہوں!"۔

موصوف کے اس انکشاف پر ہمیں احساس ہوا کہ پتے کے معاملے میں ضرور ہم ہی سے کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ مزید تصدیق کے لئے پوچھا .... "جیسا کہ کچھ دیر پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اکثر ڈسپنسری میں رہتے ہیں تو پھر گھر پر کون رہتا ہے ؟"

"ایک عدد چوکیدار اور میرا شیرو"۔

"شیرو ؟ یعنی؟" "میرا پیارا، میرا راج دلارا کتا .... !!"

"کتا .... تو پھر ضرور اس روز دور بین کے ذریعے جس کتے کی جھلک میں نے دیکھی تھی وہ آپ کا شیرو ہی تھا ... "ہم نے فورا کڑیوں سے کڑیاں ملاتے ہوئے کہا .... "اب مجھے مکمل یقین ہوگیا ہے کہ پتے کے سلسلے میں یقیناً مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے"

"ہوسکتا ہے ...." موصوف نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا، پھر آگے پوچھا ... "ویسے تمہیں اچھی طرح یاد ہے پتے میں چار قندیل، آغا پورہ ہی بتلایا گیا ہے ؟"

"ہاں اچھی طرح یاد ہے، کم از کم آغا پورہ تو بالکل پکا یاد ہے۔ البتہ ایک بات بتائیے۔ یہاں بنگلوں کی تعداد کے حساب سے قندیلوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی تو نہیں ؟"۔

"بالکل گھٹتی بڑھتی ہے، ان بنگلوں کے پچھواڑے والی گلی میں جو بنگلے ہیں اس طرف والا چوراہا سات قندیل کہلاتا ہے۔ موصوف کی اس اطلاع پر ہم نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا "میرا دل گواہی دے رہا ہے ڈاکٹر صاحب، میری محبوبہ کا نیلا بنگلہ یقیناً اسی طرف ہے"۔

"تو پھر چلو اس طرف بھی دیکھ لیتے ہیں ایک نظر"۔ اتنا کہہ کر موصوف ایک بار پھر اپنی نشست پر بیٹھ گئے ہم نے بھی لپک کر اپنی نشست سنبھال لی۔ جیپ دوبارہ اسٹارٹ ہوئی، ہماری خوشی کا کہنا ہی کیا۔ خوشی بھی اکیلی نہیں دہری تھی۔ مایوسیوں کے گھپ اندھیرے میں کھوئے ہوئے در محبوب کے پھر سے نظر آنے کی موہوم سی امید ہماری اچانک خوشی کا ایک سبب تھی تو دوسرا سبب جس نے ہمارے دل کو بلیوں اچھلنے پر مجبور کردیا یہ تصور تھا کہ ہوسکتا ہے ہماری محبوبہ کتا پالنے کی علت میں سرے سے مبتلا ہی نہ ہو اور جس وقت ہم در جاناں کے روبرو پہنچیں تو بجائے کسی خونخوار کتے کے خود ہماری محبوبہ بہ نفس نفیس ہمارے استقبال کو موجود ہو۔ اس خوش آئند تصور کے نتیجے میں سات قندیل والے چوراہے تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہمارے ذہن و دل میں سات بلکہ چودہ قندیلیں روشن ہوگئیں۔

اگلے سات منٹ میں ہم سات قندیل والے چوراہے تک پہنچ چکے تھے پھر گلی میں داخل ہو کر ڈاکٹر صاحب نے جیپ ایک محفوظ جگہ روک دی اور نیچے اتر کر اچانک خوشی سے چلائے۔ "وہ رہا نیلا بنگلہ۔ تمہارا سنگ آستاں، در محبوب" "ہم نے اس سمت دل تھام کر دیکھا جس سمت کی جانب موصوف کا داہنا ہاتھ ابھی تک ہماری رہنمائی کررہا تھا۔ واقعی ایک عدد شاندار بنگلہ موجود تھا۔ رات کی اتھاہ خاموشی اور سرکاری کھمبوں کے مرکیوری قمقموں کی روشنی میں نہایا ہوا، آس پاس کے تمام بنگلوں میں سب سے نمایاں، سب سے بلند و بالا، سب سے پروقار نظر آرہا تھا۔ (جاری) ☆

بیکس الہ آبادی
(کریلی، الہ آباد)

غزلیں

ان سے ملنے کا کہاں امکان ہے
مستقل دروازے پر دربان ہے

ذہن و دل میں اس لیے ہیجان ہے
روز ان کے گھر کوئی مہمان ہے

ان کے ہاتھوں میں جو ورقی پان ہے
شکل میں دل کی مرا ارمان ہے

انقلابات زمانہ دیکھیے
ٹیلی وژن · آج کنیا دان ہے

بھائی کا دشمن لگا بھائی ہوا
آدمی اس دور کا حیوان ہے

آدمی جلتے ہیں لکڑی کے عوض
ہر گلی کوچے میں اک شمشان ہے

اک معزز شخص کل کہنے لگا
میری عورت گاؤں کی پردھان ہے

شاعر خوش فکر ہے بیکس وہی
جو بھی تک بند · صاحبِ دیوان ہے

عجیب چیز ہے یہ جوانی کا سن بھی
گلے ملتے ہیں جس میں رات اور دن

بلاؤ نہ ملنے کو بارہ دری میں
کہ خالی مکانوں میں ہوتے ہیں جن

اسے کہتے ہیں اک ٹکٹ · اور مزے دو
ہیں پڑھنے کے دن بھی کمانے کے دن

وہاں آنے جانے کی حسرت ہے ہم کو
جہاں تک نہ پہنچی کبھی ایک پن

نہیں آتیں ملنے وہ مجھ سے اکیلے
چلا آتا ہے ساتھ ان کے کزن

جوانی میں ملتے ہیں لوگوں کو اکثر
کمانے کے دن بھی لٹانے کے دن

جدا ہو کے ان سے نہ رہ پائیں گے ہم
کبھی ایک پل بھی کبھی ایک چھن

مذاقاً کبھی کہہ دیا ہوگا میں نے
غلط ہے کہ جی پاؤں لگا تیرے بن

خدا جانے میکے میں کیا دلکشی ہے
نہیں رہتیں سسرال میں چار دن

ہمیشہ سفر کرتی ہیں بیوک ہی میں
کھڑی رہتی ہے ان کے گھر آسٹن

ہمیں گھول کر وہ کہیں پی نہ جائیں
ملا کر جو پیتی ہیں سوڈے میں جن

سنا ہے کہ وہ ہول سیلر ہیں گھی کی
مگر مجھ کو بھیجا نہ دو ایک ٹن

عجب امتحاں ہے محبت کا بیکس
یہاں فیل ہوجاتا ہے ممتحن

●☆●

ڈاکٹر سید حسین احمد زاہدی
۱/۴۵، جان نگر روڈ کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۱۷

تعریض

اردو ادب کی مزاحیہ اصناف میں سے بہت کم اصناف ایسی ہیں جن پر تفصیل سے مضامین لکھے گئے ہوں ۔ زیادہ تر صنفیں تفصیلی تعارف کی محتاج ہیں ۔ ان میں ایک صنف تعریض ہے ۔

تعریض بڑی کمیاب و نایاب صنف ہے ۔ اردو ادب میں اس کے خال خال نمونے ملتے ہیں ۔ اسے سنجیدہ اور مہذب طنز کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں کسی پر راست حملہ کے بجائے بات بڑے مہذب پیرائے میں کی جاتی ہے ۔

تعریض کنایے کی ایک قسم ہے ۔ جب کنایے میں طنز کا پہلو نمایاں ہو تو اسے تعریض کہتے ہیں ۔ اس میں موصوف کے لیے جو کلمات استعمال کیے جاتے ہیں ان میں بظاہر تعریف و توصیف کا پہلو ہوتا ہے لیکن بات بالکل برعکس ہوتی ہے ۔ اس میں کسی شخص کے عیب کو ہنر بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس سے طنز کا پہلو نکلتا ہے ۔ اس میں جاہل کو عالم کہکر اور بخیل کو دریا دل قرار دیکر طنز کیا جاتا ہے ۔ یہ کسی شخص پر طنز کرنے کا بڑا مہذب طریقہ ہے اور جس پر طنز کیا جاتا ہے اسے زیادہ ناگوار بھی محسوس نہیں ہوتا ۔

تعریض میں تہذیب، شائستگی اور آداب کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ بات بڑی سنجیدگی سے کی جاتی ہے ۔ اس میں کسی کا نام لیے بغیر کسی امر مسلمہ کا اظہار جملہ میں اس طرح کرتے ہیں کہ اس شخص کو تنبیہہ ہوجاتی ہے ۔ چونکہ اس میں طنز براہ راست نہیں ہوتا اس لیے سامع کو ناگوار نہیں لگتا اور بات بھی اس کے دل کی گہرائی تک اتر جاتی ہے ۔ اس میں اشاروں، کنایوں میں چوٹ کی جاتی ہے ۔ تعریض ایک قسم کا بالواسطہ طنز ہے جس میں کسی قدر پیچ و خم رکھا جاتا ہے :

حسن بت دیر میں کھینچے لیے جاتا ہے انھیں
کیا نتیجہ ہے برہمن سے کھنچے رہنے کا

(اس شعر میں ان ہندوستانیوں پر طنز کیا گیا ہے جو فرنگی حکومت سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں لیکن خود کو فرنگی تہذیب میں رنگنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں) ۔

غرض اس سے نہیں مجھکو غنی ہے یہ زمیں کیونکر
یہ فرمائیں میسر آئے گی نان جویں کیونکر
(اکبر)

(اس میں انگریزی تعلیم پر طنز کیا گیا ہے ۔)

تعریض خوش مزاجی سے عاری صنف ہے ۔ اس میں ظرافت کے بجائے طنز کی گہری کاٹ ہوتی ہے ۔ لیکن اس میں موجود

طنز بڑا مہذب اور شائستہ ہوتا ہے۔ تعریض میں طنز کا نشانہ عموماً خود طنز نگار ہوتا ہے لیکن اس کی چبھن کوئی اور محسوس کرتا ہے۔ گویا اس صنف میں دکھاوے کے طور پر خود پر چوٹ کی جاتی ہے لیکن اس کا شکار کوئی اور ہوتا ہے۔ اس میں طنز بڑا موثر اور بھرپور ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

شرماؤ ریاض مئے کشی سے
لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی
(ریاض)

بڑے نیک طینت، بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں
(ریاض)

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو
(اکبر)

پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجئے
صاحب میرے ایمان کی قیمت یہ ہے
(اکبر)

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں
میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں
(اکبر)

جناب جوش تو مشہور تھے ارباب دانش میں
بڑے آشفتہ دل نکلے بڑے شوریدہ سر نکلے
(جوش)

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا
(اقبال)

تعریض کی سب سے اچھی مثال ہمیں غالب کے یہاں ملتی ہے۔ اول تو ان کے یہاں طنز کے استعمال میں بڑا سلیقہ ملتا ہے۔ دوسرے وہ کسی پر براہ راست طنز کرنے کے بجائے اشاروں کنایوں میں بات کرتے ہیں۔ وہ اشاروں اشاروں میں اپنے مخالف پر اس طرح وار کرتے ہیں کہ شروع میں اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس پر طنز کیا گیا ہے لیکن جب اسے احساس ہوتا ہے تو اس وقت تک

طنز اپنا کام کرچکا ہوتا ہے ۔ غالب نے طنز کرنے میں بصارت اور بصیرت سے کام لیا ہے ۔ غالب کا طنز بڑا خوشگوار موثر دیرپا ثابت ہوتا ہے ۔ ان کے لب و لہجہ میں کسی طرح کی زہرناکی یا تلخی نہیں پائی جاتی وہ سخت سے سخت بات تعریض کے دلچسپ پیرائے میں بیان کر جاتے ہیں ۔ غالب نے اکثر و بیشتر اپنے ہمعصر شاعر ذوق کو تعریض کا نشانہ بنایا ہے لیکن لتے لطیف انداز میں کہ ان پر براہ راست انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی ۔

بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
دگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

(اس شعر میں ذوق کے سیاہ فام ہونے پر چوٹ ہے)

غالب کے یہاں نثر میں بھی تعریض کے نمونے ملتے ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔ ایک مرتبہ غالب ایک معاملے میں قید ہوگئے جب قید سے رہا ہو کر آئے تو کالے صاحب ایک رئیس کے یہاں فروکش ہوئے ۔ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی ۔ کہنے لگے "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں ۔"

●☆●

ایک پر لطف شعر و سخن کی محفل میں غالب بیٹھے ہوئے میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے شیخ ابراہیم ذوق نے کہا "میرے خیال میں تو سودا کو میر پر ترجیح ہے ۔ اس پر غالب نے کہا ۔ واہ شیخ صاحب میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا ۔ آج معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں ۔

●☆●

تعریض ایک ایسی صنف مزاح ہے جس میں بڑا لطف اور تازگی ملتی ہے ۔ یہ ایک کامیاب ، مہذب اور شائستہ طنز ہے ۔ طنز و مزاح کی جتنی اصناف ہیں ان میں طناز اپنے طنز کا نشانہ [illegible] دوسروں کو بناتا ہے لیکن یہ واحد صنف ہے جس میں طنز نگار اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بناتا ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اصل نشانہ کون ہے ۔ غالب کے علاوہ تعریض کے چند عمدہ نمونے ذوق ، اکبر ، ریاض ، اقبال وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں ۔ غالب کا تتبع کرتے ہوئے ذوق نے تعریض کے پردے میں غالب کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے ۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

●☆●

ہم ترک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لئے آبلہ پا ہم کو
(ذوق)

(یہاں شاہ نصیر کی پیرانہ سالی کی طرف اشارہ ہے)۔

ملا کرتے تھے جو مضمون مجھکو ذکر گاندھی سے
خدا جانے کدھر وہ اڑ گئے شملہ کی آندھی سے
(اکبر)

(۱۹۲۱ء میں گاندھی نے شملہ جاکر وائسرائے سے ملاقات کی تھی اس پر تعریض ہے)۔

چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

●☆●

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں
(غالب)

بدمستیاں میری ہی تو آنکھوں سے عیاں ہیں
میرے ہی تو ہونٹوں پہ یہ دانتوں کے نشاں ہیں
(مومن)

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے ، بھلا صاحب
(مومن)

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
(مومن)

غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی تعریض کا استعمال ہوا ہے۔ مرثیہ کے اس بند میں تعریض کا استعمال ہے۔

کہنے لگی یہ زوجہ عباس خوش صفات
بی بی ! بھلا یہ کون سے وسواس کی ہے بات
مشکیزہ لے کے گر یہ نہ جائیں سوئے فرات
پھر ننھے ننھے بچوں کی ہو کس طرح حیات

ہر وقت کبریا سے طلب گار خیر ہوں
آگے جو کچھ سبھوں کی رضا، میں تو غیر ہوں
(یہ فقرہ "میں تو غیر ہوں" تعریض ہے کہ میری بات نہ ماننا گویا مجھ کو غیر سمجھنا ہے)۔

●☆●

سرسید کی ایک نثری تعریض ملاحظہ فرمائیے:

جب سرسید احمد خاں نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک شروع کی اور جدید تقاضوں کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر لکھی تو ان کے خلاف سخت طوفان برپا ہوا۔ انھیں کافر، ملحد، بے دین کے خطاب دیے گئے۔ ایک بزرگ مولوی علی بخش نے محض سرسید کے خلاف علمائے دین سے فتویٰ لانے کے لئے سفرحج کا قصد فرمایا۔ جب فتویٰ لیکر واپس آئے تو سرسید نے ان کے متعلق لکھا: "مولوی علی بخش ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے چنانچہ ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا۔ سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی، کسی کو پاجی۔ کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے۔ ☆

●☆●☆●☆●

●☆●☆●

ثمر ماچوی۔ جمشید پوری
پوسٹ ایگریکو
جمشید پور

غزل

اخبار کی ہے تازہ خبر تم بھی دیکھ لو
اب ڈانسر بنا ہے پسر تم بھی دیکھ لو

تم نے بنایا تھا جسے لچا لفنگا چور
لے ڈر ہے آج کل وہ بشر تم بھی دیکھ لو

جس کو شراب گانجا، چرس کا بھی ذوق ہے
نیلام کر رہا ہے وہ گھر تم بھی دیکھ لو

جو عید بقر عید کی پڑھتا ہے بس نماز
وہ آگیا ہے میری ڈگر تم بھی دیکھ لو

اکیسویں صدی کا یہ اللہ رے جمال
وہ ہیں میکدے میں باپ پسر تم بھی دیکھ لو

کپڑوں سے جھانکتا ہے حسینوں کا گلبدن
کلجگ میں آنکھ سے اے ثمر تم بھی دیکھ لو

☆●☆

جمیل صدیقی بدایونی
محلہ سوتھا۔ بدایوں

(پیروڈی)

مینڈکوں کا قومی ترانہ

سارے کنوؤں سے اچھا اندھا کنواں ہمارا
ہم نغمہ خواں ہیں اس کے یہ نغمہ خواں ہمارا

ٹوٹی منڈیر اس کی اعلان کر رہی ہے
رب ستری ہمارا رب پاسباں ہمار

گودوں میں اس کی اتنی کائی جمی ہوئی ہے
لگتا ہے سبز مخمل آب نہاں ہمارا

اے آب چاہ کہنہ وہ دن ہیں یاد تجھ کو
کود اتری سطح پر جب کارواں ہمار

سارے کنوئیں پرانے ناپید ہو چکے ہیں
باقی ہے اب جہاں میں تنہا کنواں ہمارا

تالاب یا تلیا سب کچھ ہیں ہے پیارے
کہتا ہے ٹرٹرا کر ہر نغمہ خواں ہمارا

رکھتے ہیں بیر دل میں رہتے ہیں ساتھ پھر بھی
مینڈک میں ہم وطن ہے اندھا کنواں ہمارا

مختار احسن انصاری
اندھیری (مغرب) ممبئی

غزل

کل شام دھکا بکی میں پاکٹ نکل گیا
جھنڈی بزار تیرا ہنر ہم پہ چل گیا

منہگائی کینسر کی طرح پھیلتی رہی
اور مفلسی کا اژدہا ہم کو نگل گیا

لے کر گیا تھا قرض جو کل ہاتھ جوڑ کر
کم ظرف آج دیکھ کے رستہ بدل گیا

ایم ایف بولے ادھوری دکشت کو دیکھ کر
دل کا برش حسین سے چہرے پہ چل گیا

بل ڈاکٹر کا دیکھ کے دل نے یہی کہا
لکھ مرثیہ کہ آج سے دورِ غزل گیا

پڑھ کر مرا کلام کہا ناگنوں نے کل
وہ ناگ تھا جو ناگ منی کو اگل گیا

☆●☆

●☆●

الحاج مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ ۱۵؍ستمبر ۱۹۰۷ء کو حیدرآباد کے ایک ممتاز مغل خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا غفور بیگ تحصیلدار کے عہدہ پر فائز تھے۔ مرزا شکور بیگ نے جامعہ عثمانیہ سے بی اے کے بعد ۱۹۳۵ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ورنگل میں کوئی تیس سال تک وکالت کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک حسن پرتی اور شہر ورنگل کے حلقوں سے منتخب ہوئے اور قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ مرزا شکور بیگ کا دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ طبیعت میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

زمانہ طالب علمی میں ہاسٹل میں قیام کے دوران جناب شکور بیگ کو شاعری کا چسکا لگ گیا۔ شرارت ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ اسی شرارت نے ظریفانہ شاعری کی طرف راغب کردیا۔ ہاسٹل کے واقعات پر مزاح انداز میں نظم کرنے لگے۔ تقریری مقابلوں میں بھی وہ حصہ لیتے تھے اور ان کی تقریروں میں بھی مزاح کا عنصر غالب تھا۔ مزاحیہ شعرگوئی کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ مرزا شکور بیگ نے کئی مضامین بھی لکھے۔ طبیعت کی شگفتگی ان مضامین پر بھی اثر انداز ہوئی۔ مختلف شخصیتوں اور مختلف النوع موضوعات پر انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں مضامین لکھے۔ نامور شخصیتوں پر لکھے گئے مضامین دلچسپ ہونے کے علاوہ ماضی کے حیدرآباد کی خوبصورت تصویریں ہیں۔

مرزا شکور بیگ نے مزاحیہ شاعری سے ادبی سفر کا آغاز کیا اور پھر نعتیہ شاعری پر اس سفر کا اختتام ہوا۔ ۲۲؍اگست کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

مرزا کو موت آئے تو یوں آئے یا کریم
کلمہ ہو لب پہ سامنے صورت حضور کی

● حیدرآباد کے بزرگ مزاحیہ شاعر مرزا شکور بیگ کے انتقال پر ادارہ شگوفہ انہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد سے وہ ابتداء ہی سے وابستہ تھے اولین مشاعروں میں وہ شریک ہوچکے تھے۔ شگوفہ کے زیر نظر شمارہ میں محترم شکور بیگ صاحب کی نثری و شعری تخلیقات کا انتخاب پیش ہے۔ (ادارہ) ☆

مطبوعات مرزا شکور بیگ

مطبوعہ

۔	سدا بہار	مزاحیہ کلام	۱۹۸۵ء
۲۔	منتخب مضامین		۱۹۸۹ء
۳۔	ترانے	مزاحیہ کلام	
۴۔	مزاحیہ تقاریر و مضامین		۱۹۸۹ء
۵۔	خوشبوئے درد	(نعتیہ کلام)	۱۹۹۳ء
۶۔	لذت گریہ	(نعتیہ کلام)	۱۹۹۶ء

بیتے دنوں کی یاد

اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کی طرف سے اگر آپ آل سینٹس اسکول کی گلی میں داخل ہوں تو اس گلی کے ختم پر بالکل سیدھ میں جو عمارت نظر آتی ہے وہ ہماری جامعہ کی دینیات منزل کہلاتی تھی مگر اس میں انگریزی کی بھی کلاسس ہوا کرتی تھیں۔ اس عمارت سے لے کر باغ عام اور فتح میدان کی درمیانی سڑک پر جو پٹرول پمپ ہے وہاں جامعہ کی آخری عمارت تھی۔ ان دونوں کے درمیان بعض بڑی بڑی کشادہ اور دو منزلہ عمارتیں بھی جامعہ کے زیر استعمال تھیں۔ مثلاً موجودہ اسٹیٹ بنک کی جگہ پر اور اس کی عقبی عمارت لیاقت منزل کہلاتی تھی۔ وہیں عبدالرحمن خاں صاحب پرنسپل کا اجلاس اور دفتر تھا۔ اسٹیٹ بنک کے مقابل والی عمارت میں اب آلوین کا شوروم وغیرہ ہے۔ معشیات، تاریخ، اردو، فارسی، عربی، مرہٹی، تلنگی وغیرہ کی کلاسس ہوا کرتی تھیں۔ اس عمارت میں جس میں عثمان شاہی ملز کا دفتر ہے ایل ایل بی کی کلاسس ہوتی تھیں۔ اسٹیٹ بنک والی عمارت کی جگہ جو عمارت بنی ہوئی تھی وہیں سائینس کی لیبارٹری اور سائینس و حساب وغیرہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اگر اس وقت کے چاروں اقامت خانوں کو ملالیا جائے تو یہ فاصلہ اور بڑھ جاتا تھا۔ کیونکہ فرحت منزل "کنگ کوٹھی کے پیچھے عدن باغ والی سڑک پر واقع تھی۔ کنگ کوٹھی کی سڑک پر نظامت منزل تھی جس میں عموماً گریجویٹ مقیم تھے آل سینٹس والی گلی کے دوسرے کونے پر ہندو ہاسٹل کی عمارت تھی البتہ اقامت خانہ مسرت منزل کی عمارت چراغ علی گلی کے کونے پر لب سڑک واقع تھی۔ دو عمارتیں تھیں پہلی کرٹن منزل اور دوسری مسرت منزل مگر دونوں عمارتوں کو اقامت خانہ مسرت منزل کہتے تھے۔ ان ہی کرایہ کی عمارتوں میں ہندوستان کی ایک مسلمہ زبان یعنی اردو میں اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا جارہا تھا اور جو تجربہ کی منزل سے گزر کر دیگر جامعات کے لیے قابل تقلید نمونہ بن گیا تھا اور ان سب کو دعوت عمل دے رہا تھا۔

میں جب جامعہ کی برادری میں داخل ہوا تو اساتذہ میں ایک سے بڑھ کر ایک قابل اور اپنے اپنے متعلقہ مضامین کے ماہر تھے۔ شاید ہی اتنے قابل اساتذہ کسی اور یونیورسٹی میں جمع ہوئے ہوں۔ اردو اور فارسی میں وحید الدین سلیم، معشیات میں حضرت الیاس برنی اور حبیب الرحمن، تاریخ میں ابن حسن اور عبدالمجید صدیقی سیاسیات میں ہارون خاں شروانی، انگلش کے لئے ای ای اسپٹ، رحیم الدین، حسین علی خاں، ڈاکٹر عبداللطیف، سائنس اور حساب میں مظفر الدین قریشی، ڈاکٹر سید حسن، قاضی محمد حسین، کشن چند، عربی میں ڈاکٹر عبدالحق، دینیات میں مولانا عبدالقدیر، مولانا عبدالواسع، مولانا مناظر احسن گیلانی، فلسفہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور مولانا عبدالباری، قانون میں پروفیسر حسین علی مرزا، اکبر علی موسوی، طوالت کے خیال سے میں نے بہت سے نام چھوڑ دیئے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو جس جگہ تھا لاجواب تھا۔

طلباء کی برادری میں معین الدین قریشی، سید محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری ایم۔ اے میں تعلیم پارہے تھے۔ شعر و شاعری وغیرہ میں عبدالقیوم خاں باقی، جلال الدین اشک، ابوالکلام، بدرالدین بدر، اکبر وفاقانی اور بدرالدین شکیب کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر موضوع پر سنجیدہ اور جذباتی دونوں قسم کی بحث میں عبدالرحمن رئیس کا جواب نہ تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کے کھیلوں کے میدان میں عبداللہ کاظمی، بشیر، قادر محی الدین، عنایت خاں، علی محمد خاں (فرنواز جنگ) عبدالرحیم اور حبیب اللہ حسینی وغیرہ قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ انگریزی مقرر کی حیثیت سے عبدالجلیل کی دھاک قائم تھی۔ ٹینس میں قادر علی خاں (قادر جنگ) اور سید احمد قادری سکہ جمائے ہوئے تھے۔ موسیقی اور راگ رنگ میں عبدالرؤف، معز الدین، چندر کانت گوڑے شبیر علی خاں، منصور شاہ خاں اور صمدانی پیش

پیش تھے ۔ البتہ مزاحیہ شاعری، اداکاری اور لطیفہ گوئی کا میدان خالی تھا ۔ صرف ابن علی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھے تھے ۔ خود ستائی نہ سمجھی جائے تو کہوں کہ یہ میدان گویا میرا منتظر تھا ۔ میں نے بہت جلد اس خلا کو پر کر دیا ۔ بقول کسے اب ٹھیٹی ٹھاٹھا کا میدان آباد ہو گیا کیونکہ ہاتھ بٹانے والے اس میں آتے گئے ۔

مجھے اقامت خانہ مسرت منزل میں جگہ ملی ۔ سائنس کے ایک خوش اخلاق پروفیسر وہاں کے مودب مقیم وارڈن تھے ۔ بہار کے رہنے والے تھے ۔ ان کے دم سے بڑی رونق تھی ۔ وہ بیسیچارے اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ۔ ان کے متعلق اب زیادہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اقامت خانہ کی زندہ دلی ان سے قائم تھی ۔ ان کی اردو کمزور تھی ۔ اور یار لوگوں نے غلط الفاظ ان کی زبان پر چڑھا دیئے تھے ۔ دو تین مقیمین نے یہ خفیہ سمجھوتہ کر لیا تھا کہ غلط الفاظ ان کی زبان پر جاری کردیں گے ۔ مثلاً ایک صاحب ان کے ہاں جاتے اور باتوں باتوں میں "حسب دستور" کا استعمال کرتے ۔ کچھ دیر بعد دوسرے صاحب ان سے ملتے اور موقع نکال کر "حسب بدستور" کہہ دیتے پھر تیسرے صاحب بھی جب انھیں "حسب دستور" سنا دیتے تو بیسیچارے یہ سمجھ جاتے کہ میں جو حسب دستور کہتا ہوں وہ غلط ہے ۔ حسب بدستور ہونا چاہئیے ۔ بس، اس کے بعد جو نوٹس ان کے قلم و دستخط سے جاری ہوتی تو اس میں لکھا ہوتا کہ کل سے طعام خانہ کے اوقات حسب بدستور رہیں گے "۔ اسی طرح تعمیر کو "تعمیرات" پردے کی ڈوری کو "پردے کا کمر بند" تخت کو "چوپایہ" گدھے کو "جنور" قوی کی جگہ "مقوی"۔ چانول کے تھیلیوں کو "چانول کے لفافے"۔ یہ اور اسی طرح کے اور الفاظ ان کی یاد کو تازہ کر دیتے ہیں ۔ اللہ بخشے ان کا دل بہت صاف تھا ۔ ہم جب انہیں بہت دق کرتے تو غصہ میں بہت سخت و سست کہہ دیتے ۔ مگر اپنی روایتی شفقت اور مہربانی کو قائم رکھتے ۔ ایک رات جب ہم لوگ سیر سپاٹے کے بعد مسرت منزل کے دروازے کے پاس پہنچے تو وہاں ایک گدھا کھڑا نظر آیا ۔ ایک صاحب نے تحریک کی کہ اسے صاحب کے بنگلہ پر لے چلنا چاہیے ۔ بس پھر کیا تھا اسے ہانک کر گھر پر لے گئے اور آن کی آن میں اسے اٹھا کر چھت پر پہنچا دیا لیجاتے وقت تو گدھا سہما ہوا تھا مگر جب چھت پر چھوڑ دیا اور اسے ٹھنڈی ہوا لگی، پہلے تو اس نے دولتیاں جھاڑیں پھر ڈھینچوں ڈھینچوں کا نعرہ شروع کیا ۔ مودب مقیم صاحب جنھیں سب "صاحیب" کہا کرتے تھے، پہلے تو سمجھے کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں پھر جب سنبھل کر اٹھے اور کمرے سے باہر آئے تو گدھے کو پایا ۔ سب بلب روشن کر دیئے ۔ ملازمین کو بلالیا اور ان سے کہا کہ اسے نیچے اتارو ۔ سب ہانکتے ہوئے اسے سیڑھیوں تک لے جاتے ۔ سیڑھیوں کو دیکھتے ہی وہ بدکتا اور پھر پچھلی ٹانگیں اچھال کر دوسری طرف بھاگ نکلتا ۔ قاعدہ ہے کہ گدھا جب اوپر پہنچ جاتا ہے تو آسانی سے نیچے نہیں اترتا اسے اتارنا ہوتا ہے ۔ یہی ملازمین نے کیا ۔ اسے پکڑا اس کے پاؤں باندھے اور اٹھا کر نیچے لائے ۔ رات کا باقی حصہ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے کٹا اور صبح صاحیب نے ناشتہ کے بعد چند سرغنوں کو ایک کے بعد ایک کو بلایا اور پوچھا کہ رات کے واقعہ کی کچھ خبر ہے ۔ یہ تو سب پہلے تصفیہ کر چکے تھے کہ لاعلمی کا اظہار کریں گے ۔ وہ کہتے کہ رات کو جنور بنگلہ پر لایا گیا تھا تو ہر ایک اس کی تردید کرتا کہ صاحب بنگلہ پر گدھا کیسے آسکتا ہے ۔ صاحب کو اور غصہ آتا اور فرماتے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ۔ چھت پر جا کر اس کی غلاظت کے نشان دیکھئے ۔ صاحب بہت غصے میں تھے کہنے لگے "خاطی اگر میرے سامنے معافی نہ مانگیں تو میں یہ معاملہ پرنسپل صاحب کے پاس پیش کروں گا اور انہیں جامعہ سے نکلوا دوں گا۔" بہرحال صاحب، پرنسپل صاحب کے پاس پہونچے اور رپورٹ کی کہ رات کو بنگلہ پر جنور لایا گیا تھا ۔ ہمدردی یا غصہ کے بجائے وہ ہنسنے لگے اور فرمایا یہ کیسے ہوا؟ بہرحال دوسرے دن سب کی زبان پر یہ واقعہ تھا اور ہر ایک تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا ۔ ادھر شاعر کی رگ شاعری پھڑکی اور اس نے اس تاریخی واقعہ کو نظم کر دیا ۔

عجب ناگفتنی گو واقعہ ہے
مگر کیا کیجئے کہنا پڑا ہے
میں اک شب چین سے جب سو رہا تھا
تو خراٹوں سے ایک محشر* بپا تھا
میں گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں اکثر
عیاں ہے یہ حقیقت ہر کسی پر
مگر اس شب کا کچھ پوچھو نہ احوال
عجب منحوس تھا وہ دن مہ و سال
سنی آواز جب جنور کی پیہم
یکایک اٹھ گیا گھبرا کے اس دم
کبھی دل میں خیالِ بھوت آتا
تو سر سے پاؤں تک میں کانپ جاتا
مجھے آخر کو جونہی ہوش آیا
عجب قسمت نے میری گل کھلایا
مری جنت میں ایک جنور کھڑا تھا
خوشی سے باہر آپے سے ہوا تھا
اڑاتا شوق میں پیہم تھا تانیں
"مسرت" میں تھیں رقصاں اسکی ٹانگیں
صبح کو ہر طرف چرچا تھا اس کا
مری تضحیک کا اک مشغلہ تھا
ہنسی ہے، مضحکہ ہے دل لگی ہے
مری تو جان پر اب آبنی ہے

ہر اقامت خانہ کی طرح مسرت منزل میں بھی دونوں وقت دال ملا کرتی تھی بعض ساتھی اس روز روز کی دال سے تنگ آگئے تھے۔ وہ تبدیلی کے لئے کوشاں ہوئے ٹیوٹر صاحب نے کہا دال کے موازنہ میں اضافہ تو نہیں ہو سکتا انہیں پیسوں میں دوسری چیز پکے تو پکائی جائے۔ ان ساتھیوں نے چاول کی کڑھی کی فرمائش کی۔ دوسرے اس کی مخالفت کے لئے کھڑے ہوگئے۔ دو پارٹیاں بن گئیں۔ کینویسنگ کا بازار گرم ہوا۔ اس وقت دال کی تائید میں ایک مسدس لکھا گیا جس کا ایک بند یہ تھا۔

کالج میں ہوں یا بیٹھے ہوں آرام سے گھر میں
یا جاتے ہوئے ہوں کسی تفریحی سفر میں

بریانی اڑاتے ہوں یا ماہانہ ڈنر میں
ہے دال کا ہونٹوں پہ مزہ شکل نظر میں
ہم اور کسی شئے کا اجارہ نہیں کرتے
پر دال کی فرقت کو گوارا نہیں کرتے

اب بورڈنگ کی چاردیواری سے نکل کر اس شاعری کی شہرت جامعہ میں پھیل چکی تھی بورڈنگ میں جو انجمن مباحثہ تھی اس میں ہر مباحثہ میں ہم حصہ لیتے اور مزاحیہ تقریر کر ڈالتے۔ ایک دفعہ سالانہ مباحثہ ہو رہا تھا۔ مقررین کو علحدہ کمرہ میں دور بٹھا دیا گیا تھا۔ ایک کو باری باری سے بلایا جاتا۔ ججس میں خلیفہ عبدالحکیم اور وحید الدین سلیم تھے۔ جب ہماری باری آئی تو چٹھی ہمارے سامنے رکھ دی گئی۔ اس پر لکھا تھا دنیا کی بہترین صنعت کون سی ہے ہم نے نہایت سنجیدگی سے اپنی تقریر "ہنڈی" پر شروع کر دی اس کی ساخت اس کی چال ایسی تفصیل سے بیان کی کہ ہال بار بار تالیوں سے گونجتا رہا۔ ہم اس سلسلہ کے آخری مقرر تھے خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے وحیدالدین صاحب کو اظہار خیال کے لئے کہا۔ ہر مقرر پر اظہار خیال کرتے ہوئے جب وہ ہمارے نمبر تک پہونچے تو فرمایا۔ مرزا صاحب یقیناً انعام اول کے مستحق ہوتے اگر وہ اپنی حرکت سے بھی یہ ظاہر کر دیتے کہ وہ ہنڈی کو دنیا کی بہترین صنعت نہیں سمجھتے بلکہ بطور مزاح ایسی تقریر کر رہے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی مزاحیہ تقریر میں چہرہ بشرہ پر ایسی سنجیدگی طاری رکھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقعی ہنڈی کو دنیا کی بہترین صنعت سمجھتے ہیں۔ اب اگر حکیم بھی ان کو انعام اول کا مستحق قرار دے تو گویا وہ بھی ان کی رائے سے متفق خیال کئے جاتے۔ اس لیے ان کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے ہم نے انہیں انعام اول کا مستحق قرار نہ دے سکے جس کا مجھے افسوس ہے۔ پھر اس طرح کی مجلس ہر چھٹے مہینے ایک آدھ ضرور ہو جاتی۔ ورنہ مباحثہ کے دوسرے جلسے ہر آٹھ دس دن بعد چلتے رہتے۔ دوسرے اقامت خانوں سے بھی جلسوں کے بلاوے آتے تھے ہر حال یہ مصروفیت بھی اس وقت کی خاص مصروفیت ہوا کرتی تھی۔

اورنگ آباد سے مولانا عبدالحق حیدر آباد آئے۔ مسرت منزل کے مقیمین نے انھیں کونڈوں کی دعوت دی۔ رجب کا مہینہ تھا۔ بورڈنگ میں "کونڈے" بڑے اہتمام سے ہوتے تھے۔ وہ دعوت میں شریک رہے اور سب رسموں کی پابندی کرتے رہے کہ ہاتھ فلاں جگہ دھوئے جائیں اور فلاں مقام پر ہی جا کر کھانا چاہیے وہاں سے وہ منتقل نہیں ہوسکتے وغیرہ۔ یہ سب وہ دیکھتے اور سنتے رہے اور شام کو جب گرامر اسکول کے ہال میں ان کی تقریر ہوئی تو ان کونڈوں کی رسموں کا انہوں نے مذاق اڑایا۔ تقریر ختم ہوئی تو ایک صاحب ہاتھ ملانے ان کے قریب پہونچے اور کہا مولانا آپ نے کھانے تک کھایا پھر ہاتھ دیا۔ مولانا مسکرانے لگے۔ دوسرے دن مولانا کی آمد کے سلسلہ میں لیاقت منزل کے عقب میں انجمن اتحاد کے دفتر کے سامنے والے میدان میں شاندار مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی معتمدی کے فرائض نبی الحسن شمیم نے انجام دیئے۔ مصرعہ طرح شاید یہ تھا۔

ہزار بار سنی ہے وہی نہیں میں نے

اب تو ہم بورڈنگ کے مشاعروں اور خاص محفلوں میں اپنے اشعار سنایا کرتے تھے ایسے بڑے مشاعرے میں کلام سنانے کا پہلا موقع تھا۔ معتمد صاحب کی خواہش تھی کہ ہمارا نمبر نہ آئے مگر سامعین بار بار ان کے ہاں چٹھیاں بھیج رہے تھے کہ مرزا صاحب کو بلوایئے۔ آخر میر مشاعرہ سے اس معاملہ میں مداخلت کی درخواست کی گئی۔ نام کا اعلان ہونا تھا کہ تالیاں بجنے لگیں۔ مطلع بہت سنجیدگی سے شروع ہوا پھر ایک شعر پیش کیا۔

بلا سے چولھے میں ڈالیں کہ بھاڑ میں جھونکیں
حوالے کر دیا ان کے دل حزیں میں نے

اب ذرا نوجوان سامعین میں ہنسی کی لہر دوڑنے لگی۔ پھر یہ شعر عرض کیا

ہر ایک چڑیل سے دعوی ہمسری ہے انہیں
خفا ہیں اس پہ کہا ان کو نازنیں میں نے

اور اس شعر پر تو گویا مشاعرہ لوٹ پوٹ ہو گیا کہ

دراز دستیٔ دست جنوں سے تنگ آکر
ہزار گز کی بنائی ہے آستیں میں نے

میر مشاعرہ اور وحید الدین صاحب سلیم نے بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس طرح ہماری شاعری کی دھاک قائم ہو گئی۔ ابن علی کو بھی طنز و ظرافت میں اچھا ملکہ تھا۔ ہماری ان سے پینگیں بڑھیں اور خوب نوک جھونک چلنے لگی۔

تعطیلات سے قبل ہر اقامت خانہ میں وداعی ڈنر ہوتا تھا۔ اس کے بعد تقریروں کا سلسلہ چلتا تھا ایک اقامت خانہ کے مودب مقیم صاحب نے ایسے موقع پر جو تقریر فرمائی تو اقامت خانہ کے مقیمین کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "آپ مختلف قسم کی چڑیاں ہیں۔ یہ چڑیا خانہ ہے اور میں صیاد ہوں۔" بہر حال اپنے آپ کو جو انھوں نے صیاد کہہ دیا تو اس کی خبر دوسرے دن پھیلی اور وہاں کے احباب نے کہا کہ بھائی جان اس پر کچھ ہو جائے۔

ہم نے کہا بھئی ایک مشاعرہ کر ڈالو۔ بولے طرح مصرعہ کیا ہو۔ ہم نے کہا وہ ہم دیتے ہیں۔ ع

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

بڑے اہتمام سے مشاعرہ کا انتظام ہوا۔ ان ہی مودب مقیم صاحب کو میر مشاعرہ بنایا گیا۔ اس مشاعرہ کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

روک تھام عشق میں جب نالہ و فریاد کی ہے
یہ سمجھ لو کہ سرن پھر دلِ ناشاد کی ہے
وائے تقدیر کہ ہے ایک وہ چڑیا خانہ
ہم سمجھتے تھے کہ جنت یہی شداد کی ہے
نادری حکم کا چرچا ہے مگر حکم تھا وہ
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

جامعہ کے ایک طالب علم مسٹر صمدانی جو بیدر کے رہنے والے تھے۔ ناچ خوب جانتے تھے۔ کبھی ناچ و گانے کی محفل جمتی کبھی انجمن مباحثہ کے مقابلے ہوتے، کبھی مشاعرے تو کبھی سوشیل گیدرنگ۔ ہم سب رہتے تھے دور مگر آپس میں وہ بھائی چارہ تھا کہ یہاں سے باہر معلوم ہوتا تھا کہ سب ایک ہی خاندان کے ممبر ہیں۔ خلوص و یگانگت کے جو مناظر اس وقت دیکھنے میں آتے تھے بعد میں آنکھیں ان کے لیے ترسنے لگیں۔ انجمن اتحاد کے انتخابات کے دنوں میں خوب گھما گھمی رہتی تھی۔ معین الدین قریشی یونین کے صدر تھے۔ نئے انتخابات کے دن آئے تو عبدالرؤف اور خواجہ محمد احمد صدارت کے امیدوار تھے۔ خواجہ صاحب اس وقت بھی صوم و صلوٰۃ

کے پابند تھے ۔ ان کے چہرہ پر داڑھی تھی اور عینک لگاتے تھے ۔ ان کو تحریر و تقریر میں کئی انعامات مل چکے تھے انہوں نے اس کی تفصیل شائع کی تھی اور اس پر یہ بھی درج تھا کہ وہ شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) کی بھی سند رکھتے ہیں ۔ عبدالرؤف صاحب کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا ۔ بلکہ انہیں اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ خطبۂ صدارت بھی لکھنا شروع کردیا تھا ۔ ان کی تائید کرنے والے شاعر نے خواجہ صاحب کے خلاف جو اشعار لکھے ان میں سے دو ایک یاد رہ گئے ہیں ۔

سند ملی ہے مجھے مختصر نویسی کی
میں انجمن ہی کے قصہ کو مختصر کردوں
دو آئینے وہ لگے ہیں مری نگاہوں پہ
سحر کو شام کروں شام کو سحر کردوں

عین انتخابات کے سامنے ایک صاحب رؤف صاحب کی تائید کے جوش میں ایسے اشعار کہہ بیٹھے کہ جس میں نہ صرف ذاتیات پر حملہ تھا بلکہ ان کی داڑھی کا بھی مذاق اڑایا گیا تھا ۔ یہ نادان دوستی رنگ لائی ۔ خواجہ صاحب کے کام کرنے والوں نے ان ہی قابل اعتراض ریمارک سے فائدہ اٹھایا اور پانسہ پلٹ دیا ۔ نتیجہ جو نکلا تو خواجہ صاحب کامیاب ہوئے عبدالرؤف صاحب کو شکست ہوئی ۔ جلسہ کرسی نشینی منعقد ہوا ۔ سابق صدر کی حیثیت سے قریشی صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا ۔ نئے صدر اپنا خطبہ سنانے والے تھے ۔ قریشی صاحب نے اپنا خطبہ ختم کرتے ہوئے کہا کہ جن امور کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اگر ان پر عمل کیا گیا تو مجھے امید ہے کہ خواجہ صاحب کے مقدس سایہ میں انجمن پھلے پھولے گی ۔ خواجہ صاحب وضع قطع سے زاہد خشک معلوم ہوتے تھے مگر تھے بڑے قابل اور حاضر جواب انھوں نے اپنا خطبۂ صدارت ختم کرتے ہوئے کہا کہ میرے پیشرو قریشی صاحب نے جو وصیت فرمائی ہے ان میں جو باتیں لائق عمل ہیں ان پر ضرور عمل کیا جائے گا ۔

بہر حال اس قسم کی نوک جھونک اور فقرہ بازی اس دور کی شرارتیں تھیں ۔ مزاحیہ مشاعرے ہوتے تھے ۔ ان میں جو طرح مصرع دیئے جاتے تھے وہ خود بھی بہت دلچسپ ہوتے تھے ۔

پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ انگلش کے پروفیسر ای ای اسپیٹ تھے ۔ ایک طرح مصرعہ دیا گیا ۔ ع
اسپیٹ بھی یاں آئے ہیں اس پیٹ کی خاطر

ایک اور طرح مصرع تھا ۔

اکڑوں بیٹھے ہیں انھیں پیار کروں یا نہ کروں

غرض جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے جامعہ کی عمارتیں تو چھوٹی چھوٹی تھیں مگر ان میں پڑھنے والوں کے دل بڑے ہوئے تھے ۔ ہر طرف خلوص و محبت کا دور دورہ تھا دل و زبان میں یگانگت تھی جس کے اثرات عملی زندگی میں بھی برابر قائم رہے ۔ یہی جامعہ کی وہ برادری تھی جس کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے اور جسے ہماری آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں ۔

(روزنامہ "سیاست" (حیدرآباد) شنبہ ۔ ۵ ۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

●☆●☆●☆●

●☆●

مرزا شکور بیگ

پیلے دوشالے سے سرخ سویرے تک

دبلا پتلا، سانولا سلونا۔ پرسنالٹی غائب یعنی پیٹ چپکا ہوا، آنکھیں روشن جن میں ذہانت کے ساتھ ساتھ شرارت بھی ظاہر۔ نہ اونچا نہ ٹھگنا، ہنس مکھ چہرہ، آواز لوچ دار جس میں بلا کی کشش۔ کالے رنگ میں حسن دیکھنا ہو تو مخدوم کو دیکھ لو۔

دن بدن اس کی شہرت بڑھ رہی تھی۔ اس کے خلوص میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی لیڈری چمک رہی تھی۔ اس کی مقبولیت پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کی شاعری کا رنگ اور گہرا ہو رہا تھا۔ غرض ہر چیز میں ترقی تھی۔ اضافہ تھا۔ بلندی تھی۔ مگر ٹھہراؤ تھا تو صرف اس کی عمر میں، اس کی عمر جیسے ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کے شاگرد پہلے اس کے ہم جماعت نظر آئے۔ چند سال بعد وہ اس کے جونیر دکھائی دینے لگے۔ مگر مخدوم میں سدا بہار مخدوم میں وہی پرانی لٹک بلکہ مٹک قائم تھی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بھرے مجمع میں میں نے نہایت سنجیدگی سے تحریک پیش کی تھی کہ "حضرات! میں اس جلسہ کو کامیاب سمجھوں گا اگر بانیان جلسہ خود مخدوم سے اس کے صحیح سال پیدائش کا اعلان کروالیں۔ اس کی ضرورت یوں ہے کہ میرے ہاں ایک رسالہ ہے اور وہ چھپا ہوا بھی ہے۔ اس میں مخدوم کے کچھ ابتدائی حالات کے ساتھ اس کا سنہ ولادت ۱۹۰۷ء بتایا گیا ہے۔ اس کے دو تین سال بعد مخدوم کے ایک قدیم اسکول کے ساتھی نے مخدوم کے حالات طبع کئے جس میں اس کا سن پیدائش ۱۹۰۸ء بتایا گیا۔ اس کے چند سال بعد مخدوم کا دوسرا مجموعہ کلام "گل تر" طبع ہوا جس میں مخدوم کا سنہ پیدائش ۱۹۱۰ء درج ہوا ہے اور اب تو گل تر کو بھی شائع ہو کر تین چار سال ہو چکے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ سنہ پیدائش ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء تک پہنچ گیا ہو گا۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ہماری اور آپ کی عمر بڑھ رہی ہے اور مخدوم کا سنہ پیدائش بڑھ رہا ہے۔ اس سلسلہ کو روکنا ضروری اور بہت ضروری ہے اور آج سے بہتر ہمیں اور کوئی موقع نہیں مل سکتا کہ اس بھرے جلسہ میں خود مخدوم سے سال پیدائش معلوم کرلیا جائے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ اگر ایسے جلسہ میں جس میں خواتین بھی موجود ہیں مخدوم اپنا صحیح سنہ پیدائش ظاہر کرنا خلاف مصلحت سمجھے تو وہ کم از کم سرینواس لاہوٹی کے کان میں چپکے سے بیان کردے۔ ہم سب کو بلکہ پورے شہر کو خبر ہو جائے گی اس لئے کہ یہ لاہوٹی ہماری متحرک یا چلتی پھرتی نشر گاہ ہے۔"

مجھے مخدوم کا یونیورسٹی میں داخلہ کا زمانہ یاد ہے۔ اس کے آتے ہی زندہ دلی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ یونیورسٹی کا محبوب طالب علم بن گیا۔ حاضر جوابی، لطیفہ گوئی اور اداکاری میں جان پڑ گئی۔ ہر ایک مخدوم سے ملنا اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی گذر بسر کیسے ہوا کرتی تھی؟ مخدوم کی خود داری اور کردار نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔

یہ تقریباً چالیس سال پرانی بات ہے یعنی اس وقت کی بات ہے جبکہ آج کل کے جوانوں کی پیدائش زیر غور [illegible] حیدرآباد کی سڑکوں پر کہیں کہیں دو رنگ کے پوسٹ بکس نظر آتے تھے۔ ایک پیلے رنگ کا، دوسرا سرخ رنگ کا۔ [illegible] اندر کہیں خط پہنچنے ہوں تو انہیں پیلے رنگ کے ڈبے میں ڈالنا ہوتا تھا اور ریاست کے باہر جانے والے خطوط لال رنگ کے ڈبہ میں ڈالے جاتے تھے۔ اسی طرح ڈاک خانے بھی تھے۔ ایک مقامی ڈاک خانہ کہلاتا تھا دوسرا انگریزی۔ سکہ بھی الگ الگ تھا۔ ریاست کے اندر جس سکہ کا چلن تھا وہ حالی کہلاتا تھا اور برطانوی ہند کے سکے کو کلدار کہتے تھے۔ ڈاک تقسیم کرنے والوں کے لباس سے بھی یہ امتیاز ظاہر

تھا۔ مغلائی ڈاکیہ کے سر پر پیلے رنگ کا شملہ اور انگریزی ڈاکیہ کے سر پر سرخ رنگ کا شملہ ہوا کرتا تھا۔ ریاست اور والیٔ دکن کا جھنڈا بھی الگ تھا جس کا رنگ پیلا تھا۔ ان کے سر پر جو دستار ہوتی تھی وہ بھی پیلے رنگ کی تھی۔ اس پر سنہری رنگ کا طرہ ہوا کرتا تھا۔

عجیب اتفاق کی بات ہے اس دور میں مخدوم نے جو پہلی نظم کہی اس کا نام بھی "پیلا دوشالہ" تھا۔ باہر سے امتحان دینے جو طالب علم آکر بورڈنگ میں ٹھہرا کرتے تھے ان میں کھل مل جانے کی فیس ادا کرنی ہوتی تھی۔ اس رقم سے مٹھائی منگوائی جاتی اور سب مل کر کھاتے تھے۔ ایک صاحب ایسے چکٹ قسم کے آئے کہ وہ یہ فیس ادا کرنے پر مائل نہ ہوئے تو موقع پاکر یار لوگوں نے ان کا پیلا دوشالہ غائب کردیا۔ وہ بیچارے عشق کے مارے اس پیلے دوشالہ کو ہر جگہ ڈھونڈ رہے تھے اور اس کا اتہ پتہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اسی تڑپ نے مخدوم کے جذبۂ شعر کو ابھارا اور اس نے وہ مشہور نظم کہی جس کا آخری شعر یہ تھا۔

اوگرم کن پہلوئے من باز بیائی۔ گریم زجدائی

آں روز بیاد آرا کہ من زیر تو بالا۔ او پیلا دوشالہ

یہ نظم جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شائد اسی نظم کی مقبولیت نے مخدوم سے شعر کہلوانا شروع کیا۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے مخدوم کی شاعری نے رنگ بدلا۔ شاعری رومانٹک تھی مگر اس کا رنگ گلابی ہورہا تھا۔ میری تعلیم کرایہ کی عمارتوں میں مکمل ہوگئی۔ مخدوم جامعہ کی ذاتی عمارتوں میں بھی منتقل ہوا۔ وہاں اس نے ایم اے پاس کیا اور پھر وہ مدرس بن گیا۔ مگر اس کی شاعری کا رنگ گلابی سے سرخ ہونے لگا۔ یہی شاعری "سرخ سویرے" کے روپ میں ہندوستان میں پھیل گئی۔ پیلے دوشالہ سے سرخ سویرے تک مخدوم کو کن کن مجادلوں سے گذرنا پڑا اس کی داستان سنانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے تو مخدوم ہمیشہ مسکراتا، ہنستا ہنساتا آتا ہے۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں

مخدوم کو لطیفہ کہنے میں بھی کمال تھا۔ کتنا ہی پھس پھسا لطیفہ اسے دے دیجئے وہ اپنے حسن بیان سے اس میں جان ڈال دیتا تھا۔ وہ لطیفے سناتا ہی نہیں گھڑتا بھی تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے خاص انداز میں یہ لطیفہ سنایا

چھوٹے بھائی بیمار ہوئے تو بڑے بھائی انہیں حکیم صاحب کے پاس لے گئے اور انہیں وہاں بٹھا کر باہر سگریٹ پینے چلے گئے۔ چھوٹے بھائی اپنی باری کا انتظار کررہے تھے کہ ایک شخص حکیم صاحب کے پاس ایک کوا لایا۔ سب اسے دیکھنے لگے۔ چھوٹے بھائی نے حکیم صاحب سے پوچھا "قبلہ یہ کیا ہے؟" انہوں نے کہا کوا ہے۔ اس پر چھوٹے بھائی نے کہا اس کا ایک پر عنایت فرمایئے۔ حاضرین ہنسنے لگے۔ اتنے میں بڑے بھائی پہنچ گئے۔ پوچھا کیا ہوا؟ حکیم صاحب نے کہا تمہارے میاں کوے کا پر مانگ رہے ہیں۔ بڑے بھائی نے کہا حکیم صاحب بچہ نادان ہے۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ یہ خرگوش ہے۔

تحریر میں وہ لطف کہاں سے لاؤں جو مخدوم کے بیان میں تھا۔ نہ معلوم یہ لطیفہ مخدوم نے کہیں پڑھا تھا یا کسی سے سنا تھا مگر اس کے بعد ایک لطیفہ اسی قبیل کا مخدوم نے گھڑلیا۔ کہنے لگا چھوٹے بھائی کی شادی ہورہی تھی۔ بڑے بھائی انتظام میں مصروف تھے۔ قاضی صاحب نے تکمیل سیاہے کے وقت دولہے میاں سے نام اور ولدیت پوچھ کر کہا آپ کی سکونت؟ تو چھوٹے بھائی نے جواب دیا جی اکیس سال۔ قاضی صاحب اور حاضرین مجلس ہنس پڑے۔ بڑے بھائی یہ ہنسی سن کر پہنچ گئے۔ وجہ پوچھی۔ قاضی صاحب نے کہا میں نے میاں سے سکونت پوچھی تو وہ کہنے لگے اکیس سال اس پر لوگ ہنس رہے ہیں۔ تو بڑے بھائی نے فرمایا "قاضی صاحب قبلہ، وہ ابھی

نادان ہے۔ میں بتاتا ہوں لکھئے دو سو روپئے ماہوار۔"

یہ تو میں بتانا بھول گیا کہ مخدوم کالج میں مجھ سے دو تین سال جونیر تھا۔ اس لئے وہ مجھے بھائی جان کہا کرتا تھا۔ اس کا دیکھا دیکھی اکثر ملنے والے مجھے بھائی جان کہنے لگے تھے۔ اب بھائی جان کہنے والا ایک سلیمان اریب ہے جو اس کی بڑی پابندی کرتا ہے اور کبھی کبھی میر حسن بھی اس کا شوق فرمالیتے ہیں۔ دوسرے بھائی جان کہنے والے ظفر الحسن اور یحییٰ صدیقی وغیرہ تو زندگی ہی میں بچھڑ گئے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بڑے بھائی کے ان لطیفوں کا اہتمام مخدوم نے اپنے بھائی جان کی عزت افزائی کیلئے کیا تھا۔ ☆

خدا مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔

●☆●☆●☆●☆●☆●

تین بڑے

کافی رات گزر چکی تھی جب دہلی کے ہند و پاک مشاعرہ میں حفیظ جالندھری کلام سنانے کے لیے اسٹیج پر آئے۔ غزل سنا چکے تو سامعین کی طرف سے نظم کی فرمائش کی گئی۔ فیض احمد فیض جو دوسرے مہمان شاعروں کی طرح کافی تھک چکے تھے، حفیظ صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"حفیظ صاحب! نظم تو ضرور سنائیے، لیکن کوئی چھوٹی سی نظم"۔

حفیظ صاحب یہ سن کر ایک دم پھٹ پڑے۔

"فیض صاحب! میں آپ کی طرح چھوٹی چھوٹی نظمیں نہیں لکھتا"۔

فراق گورکھپوری نے فی الفور یہ جملہ چست کردیا۔

"خان بہادر! یہ بات تو بہت چھوٹی کی ہے آپ نے"۔

●☆●☆●

استدلال

مجاز جب رانچی کے دماغی شفاخانہ سے کچھ ماہ بعد لوٹا تو کسی نے پوچھا۔

"مجاز صاحب! کیا واقعی آپ کی عقل زائل ہو گئی تھی؟"

مجاز نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"برادر: عقل تھی ہی کہاں جو زائل ہوتی۔ عقل ہوتی تو اس ملک میں شاعری کرتے؟"۔

●☆●

مرزا شکور بیگ

ابن الوقت

ابن الوقت ظاہر ہے کہ عربی لفظ ہے۔ انگریزی میں اسے ٹائم سرور (Time server) کہتے ہیں مگر مجھے تلاش تھی کہ آخر اردو میں اس کے لئے کیا لفظ ہے۔ کسی نے کہا "مطلبی۔ دوسرے نے کہا "غرض کا بندہ" تیسرے نے کہا "ہوا پرست" مگر مجھے جو لفظ بھلا معلوم ہوا وہ "ہری چگ" ہے یعنی جدھر ہرا نظر آیا چگنے پہونچ گئے ادھر کا رنگ اڑا کہ دوسری طرف چل پڑے۔ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو یہ خیال ہے کہ ابن الوقتی انسان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بڑا ہو کر کوئی اس کی مشق چھوڑ دے ورنہ بچوں کو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ غرض اٹکے تو گلے میں باہیں بھی ڈالی جارہی ہیں۔ سلام پر سلام بھی ہو رہا ہے۔ پیار پر پیار بھی دیا جارہا ہے۔ اور جہاں وہ کھلونا ہاتھ آگیا پھر یہ جا وہ جا۔ کہاں کے ابا اور کہاں کی امی۔ ہمارے بچپن میں ہم اور ہماری عمر والے تو بڑے بھولے بھالے ہوا کرتے تھے۔ مگر آج کل اسی عمر کے بچے پکے پیسے ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں کی بات ہے کہ ہمارے چھوٹے نواسے صاحب کھیل رہے تھے۔ ان کی زبان بھی ابھی صاف نہیں ہوئی تھی ہمیں باہر جاتا دیکھ کر پوچھا "نانا تان" چلے۔ ہم نے جواب دیا اللہ اللہ پڑھنے۔ یہ سنتے ہی وہیں سے اپنی امی کو آواز دی کہ امی امی نانا ۔اتے بڑے ہوگئے۔ ان کو "نماج" بولنا نہیں آتا۔ اللہ اللہ کہتے ہیں۔ نانا کے ہاتھ میں کوئی پتنگ ہو تو اس وقت بھی نواسے صاحب حکم کے غلام بن جاتے ہیں۔ اس وقت ان سے جو چاہے کروالو۔ ہر بات کی تعمیل فوراً ہو جاتی ہے۔ مگر جب وہ پتنگ ہمارے ہاتھ سے ان کے ہاتھ میں پہنچ جائے پھر ایسا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے کہ آشنا تھا کہ نہ تھا۔ یہ ابن الوقتی کی ابتدائی شکل ہے۔ نہ معلوم آپ نے یہ ضرب المثل سنی ہے کہ نہیں کہ وقت پڑا بانکا تو گدھے کو بولے کاکا کام اٹکے تو تعریفوں کے وہ پل باندھ دیئے کہ بیان سے باہر اور جہاں وہ کام نکل گیا تو پھر راستہ میں بھی ہوں کترا کے نکل جاتے ہیں۔ جیسے جانتے ہی نہیں۔

ایک زمانہ ایسا تھا کہ ابن الوقتی برائی سمجھی جاتی تھی۔ ایسے شخص کو احسان فراموش کا لقب ملتا تھا۔ سوسائٹی میں اس کی عزت نہ تھی۔ اب تو ابن الوقتی ایک ہنر ہے ایک آرٹ ہے۔ کیوں نہ ہو ترقی کے دور میں برائیوں کو بھی ترقی نصیب ہو جاتی ہے۔ پہلے ایمانداری جزایمان تھی۔ لوگ سب کھونے تیار تھے مگر ایمان داری پر آنچ نہ آنے دیتے تھے۔ اب بے ایمانی پالیسی ہو کر رہ گئی ہے۔ پڑھایا بھی تو یہی گیا ہے کہ ہانسٹی از دی بیسٹ پالیسی یعنی ایمانداری بہترین پالیسی ہے۔ اور پالیسی جیسا کہ آپ جانتے ہیں اسی کو کہتے ہیں جو لچک دار ہو۔ وقت اور حالات کے لحاظ سے بدلتی جائے ایسے دور میں جبکہ ایمان داری بھی موقع محل کے لحاظ سے چولا بدلتی رہتی ہے۔ ابن الوقتی کا جتنا زور ہو کم ہے۔ پہلے نمک میں تاثیر تھی تو احسان مندی پھولتی پھلتی تھی۔ اب یہ تاثیر ہی غائب ہو گئی تو احسان ماننے اور ممنون ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے احسان کا بدلہ شکریہ (تھینک یو) کہہ دینے سے ادا ہو جاتا ہے اور تھینک یو میں بھی صرف زبان ہلتی ہے اس میں دل شریک نہیں ہوتا۔ اور پھر اس تھینک یو کا جیب پر بھی کچھ بار نہیں پڑتا اسی طرح بڑے سے بڑے نقصان کی تلافی اور بڑی سے بڑی گستاخی کا کفارہ (ساری) سے ادا ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری مگر رنگ نکھرا کا نکھرا رہتا ہے۔ اس کو تو سب ہی مانتے ہیں کہ مشق سے مہارت پیدا ہوتی ہے اور یہی مہارت کمال تک پہنچا دیتی ہے۔ کار آموز ابن الوقت ابتداء میں قابل شکایت اور قابل گرفت حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں مگر جب اس کام میں منجھ جاتے ہیں تو پھر بہت خوب صورتی سے سبز باغ دکھاتے ہیں۔ میں نے تو یہی دیکھا بھی ہے۔ ایک صاحب دور سے آتے دکھائی دیئے۔ ان کو دیکھ کر

صاحبِ خانہ نے چپکے سے کہا الٰہی خیر! یہ ہمیشہ آتے ہیں اور چکنی چپڑی باتوں سے کچھ وصول کرلیتے ہیں مگر اب کے تو انہیں پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گا۔ اسی اثنا میں وہ قریب آپہونچے بہت ادب سے فرشی سلام کیا۔ اجازت لے کر بیٹھے۔ سب کی خیریت دریافت کی اور پھر خاموش ہوگئے۔ صاحب خانہ نے پوچھا۔ کہیے کیسے آنا ہوا۔ بولے سرکار! اس ہولناک گرانی اور بے روزگاری سے تنگ آکر ایک قبرستان کا رکھوالی ہوگیا ہوں۔ وہیں ایک جھونپڑی بنالی ہے۔ جب کوئی میت وہاں آتی ہے تو مجھے چار پانچ روپے مل جاتے ہیں۔ کبھی کوئی کفن کی چادر بھی دے دیتا ہے۔ سرکار کے اقبال سے پہلے ہر مہینے میں تین چار میتیں آجاتی تھیں۔ بیس پچیس روپے خادم کو مل جاتے تھے۔ تنگی ترشی سے گذران ہوجاتی تھی مگر مالک اب تو یہ حال ہے کہ دو دو مہینے گذر جاتے ہیں کوئی میت نہیں آتی۔ اس پر ہم کو ہنسی آگئی تو وہ چپ ہوگئے اور پھر یوں گویا ہوئے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ سرکار کے اس خادم پر اتنے احسان ہیں کہ بیان سے باہر۔ سچ تو یہ ہے کہ خادم کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ آپ ہی کے نمک کا صدقہ ہے۔ جانتا ہوں کہ ہاتھ پھیلانا برا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل سرکار کی بھی پہلی سی آمدنی نہیں رہی۔ مگر پھر بھی سرکار ہم تو آپ ہی کے در کے پلے ہیں۔ آپ کے پاس نہ آئیں تو جائیں کہاں؟ یہ سب کچھ اس شخص نے اس انداز سے بیان کیا کہ صاحب خانہ کا دل پسیج گیا۔ انھوں نے کچھ روپئے دیئے اور وہ سلام کرکے دعا دیتے چل دیئے۔ میں نے صاحب خانہ سے کہا کہ حضرت آپ نے تو پھوٹی کوڑی بھی نہ دینے کا تصفیہ کرلیا تھا۔ بولے کیا کروں اس کی گفتگو ایسی لچھے دار ہوتی ہے کہ انکار بن نہیں پڑا۔ وہ تو مجھے "بیشک" کے موقف میں ڈال دیتا ہے۔ میں نے کہا یہ بیشک کا موقف کیا بلا ہے۔ فرمایا نہیں معلوم۔ لو سن لو۔ ایک حاجت مند کسی نواب صاحب کے دربار میں پہنچے اور بیان کیا کہ میں صاحب کمال ہوں۔ سائل نہیں ہوں۔ میں ہر شخص کے دل کی بات بتاتا ہوں اور ایسی کہ سوائے بے شک کے کوئی دوسرا لفظ کہہ ہی نہیں سکتا۔ نواب صاحب نے کہا اچھا یہ بات ہے تو پھر کہو ہمارے دل میں کیا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ حضور آپ کے دل میں یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ نواب صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ بے شک بے شک اور اسے کچھ انعام دے دیا۔ نواب کے ایک مصاحب کو اس حرکت پر غصہ آگیا کہ ایک شخص آیا اور الو بنا کر روپئے لے گیا۔ انہوں نے ٹھان لی کہ اس شخص کو محفل میں ذلیل تو کرنا چاہئے۔ اس نے نواب صاحب سے عرض کیا کہ مجھے بھی ان کو آزمانے کا موقع عطا ہو۔ ادھر اپنے دل میں یہ تصفیہ کرلیا کہ چاہے وہ کچھ کہے میں بے شک تو ہرگز نہ کہوں گا۔ نواب نے اس شخص سے پوچھا کیا پھر امتحان کیلئے راضی ہو۔ مگر وہی بات نہ کہہ دینا۔ اس نے کہا حضور برابر راضی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ کامیابی پر ان صاحب کو بھی وہی انعام دینا ہوگا جو سرکار نے عطا فرمایا ہے۔ وہ مصاحب تو بے شک نہ کہنے کا تہیہ کر بیٹھے تھے۔ فوراً اس شرط پر راضی ہوگئے۔ اب نواب صاحب نے کہا اچھا کہو ہمارے مصاحب کے دل میں کیا ہے۔ صاحب کمال نے جواب دیا کہ ان کے دل میں یہ ہے کہ سرکار کی عمر دراز ہو۔ یہ سن کر بے چارے مصاحب بڑی مشکل میں پڑگئے۔ بیشک کہتے ہیں تو شرط ہار جاتے ہیں۔ بے شک نہیں کہتے تو مصاحبی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ دبی زبان سے ہی سہی مگر کہنا پڑا کہ "بیشک" اور انعام کا جرمانہ پڑا سو الگ۔ یہ سنا کر صاحب خانہ نے کہا بھائی صاحب یہ قبرستان والا بھی جب آتا ہے مجھے بیشک کے موقف میں ڈال دیتا ہے اور بے شک کہتے ہی بنتی ہے۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ تقریر کے عنوان سے میل نہیں کھاتا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ ابن الوقتی نہ سہی دفع الوقتی ضرور ہے۔ مگر اس میں میرا قصور ہی کیا ہے۔ ابن الوقت سننے سنانے کی چیز نہیں بننے کی چیز ہے۔ پڑھنے لکھنے کی بات نہیں برتنے کی بات ہے۔ مگر یہ نہ بھولیئے کہ ابن الوقتی جب عام ہوجاتی ہے تو اصول پرستی کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو تلّوں کے کلب میں کپڑوں کیساتھ داخل ہونا جرم ہے۔ ابن الوقت میں کوئی خوبی ہو یا نہ ہو مگر اسے معلوم ہونا چاہئے کہ کون سے وقت کیا

بات کہی جائے ۔ چکنی چپڑی باتوں پر جب تک عبور نہ ہو یہ دھندا پنپتا نہیں ۔ دراصل ابن الوقتی صرف زبان کا کھیل ہے ۔ نہ صرف یہ ضروری ہے کہ کون سی بات کہی جائے بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ کس طرح کہی جائے ۔ اس کی مہارت ضروری ہے اور پھر وہ بات بھی اس طرح کہی جائے کہ سننے والا خوشامدی نہ سمجھے ۔ ورنہ اس کی وقعت باقی نہ رہے گی ۔ ابن الوقت تو بڑے رکھ رکھاؤ سے اپنا کام نکالتا ہے ۔ بعض دفعہ تو اس کے تیور ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خدمت کا موقع دے کر گویا احسان کر رہا ہے ۔ یہ ابن الوقتی کی گریجویٹ شکل ہے ۔ اس مقام پر پہنچ کر ابن الوقتی آرٹ بن جاتی ہے اور آرٹ تو آپ جانتے ہیں کہ جب بارٹ میں سماجاتا ہے تو پھر اس سے پارٹ ہونا محال ہے ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابن الوقت کا پانسہ الٹا پڑجاتا ہے نوسکھ تو ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں مگر منجھے ہوئے استاد اس وقت بھی ہار نہیں مانتے بلکہ اپنا لوہا منوا کے رہتے ہیں ۔ ایک نواب زادہ کا جب انتقال ہوا تو بادشاہ وقت ان کی میت دیکھنے آئے اور مرحوم کی بسیار خوری کا ذکر کرنے لگے کہ خوب کھاتا تھا ۔ ابن الوقت نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی اور عرض کیا سرکار چالیس چالیس انڈے کھا جایا کرتے تھے ۔ ابن الوقت نے یہ سمجھا تھا کہ بادشاہ بھی ان کے خیال کی تائید اور تعریف کریں گے مگر بادشاہ نے کہا کیا کہتے ہو چالیس انڈوں کی اس کے آگے کیا حقیقت تھی ۔ دوسرا ہوتا تو نادم ہوجاتا ۔ سٹ پٹا جاتا مگر ابن الوقت نے فوراً بات بنادی اور کہا حضور پیٹ بھر کھانا کھانے کے بعد عرض کر رہا ہوں ۔ یعنی پیٹ بھر کھانا کھانے کے بعد مرحوم چالیس انڈے کھاجایا کرتے تھے ۔ یہ سنتے ہی بادشاہ کا لہجہ بدل گیا اور ارشاد ہوا ہاں یہ بول ۔ یہ بول ٹھیک ہے ۔ بالکل ٹھیک ہے ۔ ظاہر ہے کہ بات کا اس طرح پلٹ دینا اسی وقت ہوسکتا ہے کہ دماغ بھی تیز ہو اور اوسان بھی ٹھکانے ہوں ۔ یہ اس میدان میں کامیابی کے گر ہیں ۔ ابن الوقت دوسروں کو الو بناتا ہے اور اپنا الو سیدھا کرتا ہے ۔ جو دوسروں کو الو بنانے کی کوشش میں خود الو بن جائے وہ ہرگز ابن الوقت نہیں ہوسکتا ۔ اسے آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں ۔ بہر حال ابن الوقت ہونا چاہے برا ہو مگر ابن الوقت پر تقریر کرنا یا تقریر سننا ہرگز برا نہیں ۔☆

مرزا شکور بیگ

غزلیں

انھیں در پیش جب کوئی بہت دشوار کام آیا
بلاوے کا ہمارے نام لاسلکی پیام آیا

سفارش اور رشوت چل رہی ہے بزم ساقی میں
ترستے رہ گئے مخلص، نہ ان تک دور جام آیا

بالآخر پیٹ سے مجبور ہو کر نوکری کرلی
بہت صیاد کو دم دے کے طائر زیر دام آیا

ملی فرصت نہ اپنے عقد کی بیچارے قاضی کو
مگر یہ کام کیا کم ہے کہ وہ اوروں کے کام آیا

ہمیں بھی انقلاب دہر کا ہونا پڑا قائل
جسے زیر زمیں سمجھے تھے وہ بالائے بام آیا

وہ فوٹو ہم کو بھیجا جس میں چہرہ ہی ندارد ہے
غضب ہے جھوٹ نوٹ آیا تو ماہ ناتمام آیا

وکالت کر کے گمنامی کی حالت میں رہے مرزا
پلیڈر سے بنے لیڈر تو اخباروں میں نام آیا

●☆●

اک نیا شعبدہ دکھاتے ہیں گرم پانی سے گھر جلاتے ہیں
سر چھپاکر پرائے سائے میں وہ ہوائی قلعے بناتے ہیں
نام انصاف تو زباں پہ ہے ظلم کے بیج بوئے جاتے ہیں
عارضی اقتدار کے بل پر خوب بے پر کی وہ اڑاتے ہیں
جائے استاد اب بھی خالی ہے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں
کاغذی پھول ، بیل بوٹوں سے اپنی محفل کو وہ سجاتے ہیں

مرزا صاحب یہ بات لکھ رکھو
دبنے والے کو سب دباتے ہیں

●☆●☆●☆●

دولت اور حکومت کھوکر غیرت بھی جو کھوتے ہیں
دنیا میں اللہ کے بندے ، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں

غیر بجھائیں ان کو پڑی کیا وہ تو تماشہ دیکھیں گے
آگ لگی ہے جن کے گھر میں، کیوں ہوٹل میں سوتے ہیں

قابلیت تو ایک طرف اب غور اسی پر ہوتا ہے
آپ فلاں کے صاحبزادے ، آپ فلاں کے پوتے ہیں

اغیار کو اپنی پیٹھ پہ لے کر تیرتے ہیں تیراتے ہیں
دستور نرالا ہے ان کا احباب کے حق میں غوطے ہیں

مرزا نے بہت ہی سوکھے منہ سے کیسے مزے کی بات کہی
اس دیس کے چڑیا خانے میں بھی سب سے زیادہ توتے ہیں

●☆●☆●

مرزا شکور بیگ

پلان

جس وقت ابتداء ہوئی پہلے پلان کی
خوشحال زندگی تھی مرے خاندان کی

مجھ کو بہت دکھائے گئے تھے سنہرے خواب
فرمایئے کہ کیسے نہ لیتا میں شان کی

جب دوسرا پلان نمودار ہوگیا
کم اور قیمتیں بڑھیں گندم کی دھان کی

معیار زندگی تو گھٹا خرچ بڑھ گیا
قرضوں نے آکے لاج رکھی آن بان کی

اور تیسرے پلان میں یہ حال ہوگیا
گھڑیاں عذاب جان ہوئیں امتحان کی

سامان بیچ بیچ کے گزران کی مگر
ڈگری میں قرقی ہوگئی میرے مکان کی

چوتھا پلان سنتے ہیں تیار ہوگیا
لکھ لیجئے کہ خیر نہیں اب تو جان کی

جب پانچویں پلان کے درشن کرینگے آپ
تیار ہوگی کھاد مرے استخوان کی

مصنوعی

رنگ مصنوعی چال مصنوعی دانت مصنوعی بال مصنوعی
ہر نشیب و فراز نقلی ہے ہر ادائے جمال مصنوعی
دعویٰ عاشقی زبانی ہے ہجر نقلی ، وصال مصنوعی
جو نہ ہونا تھا خوب ہوتا ہے جب سے ہے دیکھ بھال مصنوعی
زندگی بن گئی اداکاری اس کا ہے بال بال مصنوعی
کوئی اندازہ ٹھیک کیسے ہو جب کہ ہے اعتدال مصنوعی
بال کی کھال کس طرح نکلے کھال غائب ہے بال مصنوعی

اس دکھاوے کی آنچ پر مرزا
خوب گلتی ہے دال مصنوعی

قطعات

ہے سب کے ہاتھ میں گو ایک ہی ساز
مگر ہے مختلف ہر اک کی آواز
برائے نام کی آزادی پہ خوش ہیں
قفس میں ہورہی ہے مشق پرواز

●☆●☆●

ہم مفلسوں کے غم میں مر مر کے جی رہے ہیں
نوک زباں سے دل کے زخموں کو سی رہے ہیں
صحت نے ساتھ چھوڑا پینا مگر نہ چھوٹا
بستر پہ لیٹے لیٹے چمچے سے پی رہے ہیں

قطعات

مرزا شکور بیگ •

یہ تو ممکن ہی نہ تھا ترک وفا کیا کرتے
شرط انصاف ہے ہم اس کے سوا کیا کرتے
جب کسی طرح سے ملنے پہ وہ راضی نہ ہوئے
بھوک ہڑتال نہ کرتے تو بھلا کیا کرتے

●☆●

دنیا میں صداقت کا اب نام نہیں ہے
گٹھلی نظر آتی ہے پر آم نہیں ہے
تحقیق سے ثابت ہے بندر تھا بشر پہلے
آغاز تو ملتا ہے انجام نہیں ہے

●☆●

اک نہ اک عہدے کی جب تک آس ہے
قوم کے دکھ درد کا احساس ہے
جان حاضر ہے وطن کے واسطے
اب رہا چندہ تو کس کے پاس ہے

●☆●

بندھی ہوئی ہے ابھی آس ان کے آنے کی
مگر شباب کو جلدی پڑی ہے جانے کی
کٹی جو عمر کسی جگمگاتے ہوٹل میں
خراب ہوگئی حالت غریب خانے کی

●☆●

عقل پر پردہ ہے اور فکر و نظر بیمار ہے
اب بھلائی کی کوئی امید ہی بیکار ہے
اس نے اردو میں وہ صلواتیں سنائیں الاماں
جب کہا میں نے کہ ہاں اردو سے مجھ کو پیار ہے

●☆●

رقیبوں کی مدد اور عاشقوں کو ٹیز کرتے ہیں
کوئی ٹوکے تو پھر اس سے ریلیشن سیز کرتے ہیں
جو پوچھا • ناچتے ہو کس لیے ان کے اشاروں پر
دبی آواز سے بولے نمک کو چیز کرتے ہیں

●☆●

لب پہ ہے ایمانداری دل کی مکاری کے ساتھ
دشمنی گھل مل گئی ہے ان دنوں یاری کے ساتھ
دید کے قابل ہے مرزا یہ تضادِ قول و فعل
امن کا پرچار بھی چالو ہے بمباری کے ساتھ

●☆●

فضاؤں میں یہ گونج لہرا رہی ہے
چمن میں نئی فصل گل آرہی ہے
مبارک سلامت کی ہے دھوم لیکن
ری پبلک میں پبلک مری جارہی ہے

●☆●

ریاکاری ہے یا ڈپلومیسی ہے
دلوں میں زہر ہونٹوں پر ہنسی ہے
وہ چمپت ہوگئے لے کر منی پرس
سمجھتے ہی رہے ہم دل لگی ہے

●☆●

ہر مسافر یہی کہہ رہا ہے
خطرہ درپیش طوفان کا ہے
اس پہ طرفہ یہ ہے کہ مرزا صاحب
ناخدا جو ہے ناکتخدا ہے

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ
اشاعت کا ۳۲ واں سال

شگوفہ

جلد ۳۳
شمارہ ۱۰

حیدرآباد

اکٹوبر ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کمپیوٹر کتابت :
SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373

ویب ڈیزائن :
غوث ارسلان

طباعت :
دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۴ روپئے   زرِ سالانہ : ۱۵۰ روپئے   بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ چملز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064
شگوفہ انٹرنیٹ پر : http://www.shugoofa.cjb.net
ای میل : shugoofa @ india.com

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

حق تو یہ ہے ..... (ترجمہ)

ادبی لطائف

چورن (منظومات)

کارٹون:

مجتبیٰ حسین

تالا لگا دیا جائے

ہمارے ایک پرانے دوست ہیں رام اوتار جوشی، بہت محبت کرنے والے اور بہت اچھی باتیں کرنے والے۔ جو لوگ عموماً بہت محبت کرتے ہیں وہ اچھی باتیں نہیں کرتے اور جو بہت اچھی باتیں کرتے ہیں وہ محبت نہیں کرتے۔ مگر ہمارے رام اوتار جوشی اس معاملہ میں مستثنیات میں سے ہیں، اپنے گھر ہمیں مدعو کرکے انھیں اور ان کی اہلیہ پربھا جوشی کو جو خوشی ہوتی ہے وہ قابل دید ہوتی ہے۔ دیگر احباب تو خیر ہمیں دعوت فکر اور دعوت کلام پر ٹرخا دیتے ہیں لیکن یہ سچ مچ کھانے کی دعوت کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ ان کا کا فون آیا کہ "یار، پانچ مہینوں سے تم ہمارے گھر نہیں آئے۔ مانا کہ مصروف رہتے ہو لیکن ایسی بھی کیا مصروفیت کہ اپنے چاہنے والوں کے پاس بھی نہ آؤ، بولو کب آرہے ہو ہمارے گھر کھانے پر؟"

ہم نے کہا "جوشی جی، ایسی بات ہے تو ہم کل ہی شام میں آٹھ بجے آجاتے ہیں"۔

پوچھا "شور۔ (SURE)؟"

ہم نے کہا "شور"

پوچھا "کانفیڈنٹ (CONFIDENT)؟"

ہم نے کہا "کانفیڈنٹ"

پوچھا "تو تالا لگا دیا جائے"

ہم نے کہا "بالکل لگا دیا جائے"

اس پر انھوں نے فون کا ریسیور ہاتھ میں پکڑے پکڑے وہیں سے اپنی اہلیہ کو بہ آواز بلند مطلع کیا "مجتبیٰ کل شام آٹھ بجے آنے کا پکا وعدہ کر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ تالا لگا دیا جائے۔ تو لگا دیا جائے تالا؟"۔

بات پکی ہوگئی دوسرے دن ہم حسب وعدہ رام اوتار جوشی کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ گھر پر سچ مچ علی گڈھ کا بہت بڑا تالا لگا ہوا ہے۔ ہمیں رام اوتار جوشی کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا، وہ تو اچھا ہے کہ رام اوتار ہمارے ہم محلہ ہیں۔ کچھ دیر بعد ہم بے نیل و مرام اپنے گھر واپس ہوئے تو دیکھا کہ میاں بیوی دونوں ہمارے گھر میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم نے غصہ سے کہا۔ جوشی جی، یہ کیا بات ہوئی ہمیں تو گھر آنے کی دعوت دی اور آپ اپنے گھر پر تالا لگا کر غائب ہوگئے "ہنس کر بولے "تم ہی نے تو کہا تھا کہ تالا لگا دیا جائے۔ سو ہم نے تالا لگا دیا۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تو تمھیں بتانا چاہتا تھا کہ ہمارے ہاں زبان کے کیسے عجیب و غریب تجربے ہو رہے ہیں۔ تالا لگانا اب یقین، پکے وعدے اور وثوق کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے حالانکہ پرانے زمانے میں بے یقینی اور ناقابل بھروسہ حالات میں تالے کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جب سے "کون بنے گا کروڑ پتی" کا پروگرام مقبول ہوا ہے تالا لگانے کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ پہلے کسی تجوری کو تالا لگا دیا جاتا تھا تو اس میں سے رقم کو نکالنا مشکل ہوجاتا تھا مگر اب بسا اوقات تالا لگ جانے کے

باوجود اس میں سے رقم نکل آتی ہے ۔ یا تو اب تالے ہی خراب بننے لگے ہیں یا ہماری زبان خراب ہونے لگی ہے ۔ آخر کیا مطلب ہے تالا لگا دیا جائے ۔ پچھلے دنوں پلاسٹک کی چیزیں بنانے والے ایک کار خانہ میں مزدوروں نے گڑبڑ کردی تو کارخانے کے مالک نے کارخانے پر تالا لگادیا ۔ بعد میں مزدوروں کی انجمن اور کار خانہ کے مالک کے درمیان سمجھوتہ ہوا تو مالک نے کہا "کیا میں یہ سمجھوں کہ سمجھوتہ پکا ہوگیا ۔ پھر تالا لگا دیا جائے ؟" ۔ اس پر مزدوروں نے پریشان ہوکر کہا "حضور ! سمجھوتہ کو تو ضرور تالا لگا دیجئے لیکن کار خانہ کا تالا کھول دیجئے " دیکھا جائے تو تالا لگا دینے کا تیا محاورہ اب تالا کھول دینے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے ۔ خرد کا نام جنوں پڑگیا جنوں کا خرد ۔ آپ زبان داں ہیں ۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ ہماری زبان میں کیسے کیسے محاورے رائج ہونے لگے ہیں " ۔

ایک حقیقت ہے کہ تالا لگا دینے والا محاورہ اب اتنا عام ہوگیا ہے کہ پرسوں ہم نے ایک رکشا والے سے کہیں چلنے کے لئے کہا تو اس نے کرایہ کے لئے بھاؤ تاؤ کرنا شروع کردیا ۔ جب بیس روپئے میں کرایہ طے ہوگیا تو امیتابھ بچن والے انداز میں ہم سے پوچھنے لگا " تو پھر تالا لگا دیا جائے ؟" ہم نے کہا " بھیا ! تالا لگانے سے پہلے ہم لائف لائن کا استعمال کرنا چاہتے ہیں ۔ فون ہے تمھارے پاس ؟"

ہنس کر بولا " اچھا تو آپ بھی " کون بنے گا کروڑ پتی " والا پروگرام دیکھتے ہیں حالانکہ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں " ۔

تالا لگا دینے اور تالا کھولنے کی ایسی ہی کچھ بات کئی سو برس پہلے ترکی کے ملا نصیر الدین بھی کیا کرتے تھے جو مذاق مذاق میں علم و دانش کی باتیں کرنے کے عادی تھے ۔ ان کی عادت تھی کہ جب بھی گھر سے باہر کہیں جاتے تھے تو گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور جب گھر میں واپس آجاتے تھے تو گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں کو نہ صرف اچھی طرح بند کرلیتے تھے بلکہ اندر سے تالا بھی لگا لیتے تھے ۔ کسی نے کہا " ملا صاحب ، آپ بھی عجیب آدمی ہیں ۔ طریقہ تو یہ ہے کہ جب آدمی گھر سے باہر جائے تو گھر کو تالا لگا دیا جائے مگر آپ تو جاتے ہوئے اسے کھلا چھوڑ کر جاتے ہیں اور واپس آکر تالا لگا دیتے ہیں ، یہ کیا بات ہوئی ؟"

اس پر ملا نصیر الدین نے کہا " بھیا ، اس گھر میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں سے زیادہ قیمتی چیز تو میں ہی ہوں اسی لے اسکی حفاظت کرتا ہوں ۔ باقی کی ساری چیزیں تو مکروہات زندگی ہیں ۔ انکی کیا حفاظت کروں ۔"

دیکھا جائے تو ملا نصیر الدین اپنے زمانے کے حساب سے صحیح کام کرتے تھے کیونکہ اس زمانے میں انسان واقعی قیمتی ہوا کرتا تھا ۔ اب انسان سستا ہوگیا ہے اور چیزیں مہنگی ہوگئی ہیں ۔ لہذا تالا لگانے اور کھولنے کے طریقے بھی بدل گئے ہیں یہ ایک اتفاق ہے کہ پچھلے دنوں جب ہم امریکہ میں تھے تو وہاں " کون بنے گا کروڑ پتی " والے پروگرام کے باوا آدم "WHO WILL BE MILLIONAIRE" کو بڑی پابندی سے دیکھا کرتے تھے اور بخدا پروگرام کو دیکھتے دیکھتے بسا اوقات پانچ چھ لاکھ ڈالر تک جیتتے ہوئے چلے جاتے تھے ۔ کچھ لوگوں نے مخلصانہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ہم رسمی طور پر اس پروگرام میں حصہ لیں اور اپنے لئے نہ سہی اپنے ملک کے لئے زر مبادلہ وغیرہ کمائیں ۔ لیکن کیا کریں ہم بھی ملا نصیر الدین کی طرح اول جلول آدمی ہیں ۔ ہندوستان واپس آکر دیکھا کہ یہاں بھی اس پروگرام کی نقل کے پیچھے ہر آدمی پاگل ہوا جارہا ہے ۔

کل ایک صاحب بتا رہے تھے کہ جب سے " کون بنے گا کروڑ پتی " والا پروگرام شروع ہوا ہے تب سے میری بیوی روزانہ یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ میں بھی کروڑ پتی بن گیا ہوں ۔ اس پر ہم نے انھیں سمجھایا کہ بھیا تم تو پھر بھی بڑے خوش قسمت ہو کیونکہ تمھاری بیوی تو خواب میں ہی یہ سمجھتی ہے کہ تم کروڑ پتی بن گئے ہو جب کہ ہماری بیوی کا یہ عالم ہے کہ وہ جاگتے میں اٹھتے بیٹھتے ، چلتے پھرتے مجھ جیسے کنگال آدمی کو بھی کروڑ پتی سمجھنے لگی ہے ۔ یوں بھی ان دنوں پتی کی اتنی اہمیت نہیں رہی جتنی کہ کروڑ پتی کی ہوگئی ہے ۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ ہم بھی امیتابھ بچن کا یہ پروگرام بڑی پابندی سے دیکھتے ہیں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ان کے سوالوں کے صحیح صحیح

جواب دیتے دیتے ایک بار تو پچاس لاکھ روپے تک جاچکے ہیں ۔ بعض دوستوں کا مشورہ ہے کہ ہم بھی ایک بار اس پروگرام میں چلے جائیں اور کروڑ پتی نہ سہی تو کم از کم لکھ پتی وغیرہ ہی بن جائیں ۔ لیکن ہمیں ان محیر العقول کرسیوں کو دیکھ کر خوف آتا ہے جن پر امیتابھ بچن اور سوالوں کے جواب دینے والا دونوں آمنے سامنے بیٹھتے ہیں ۔ ایسی کرسی پر بیٹھنے سے بہتر تو یہی ہے کہ آدمی جاہل ہی رہ جائے ۔ مانا کہ ہماری عام معلومات بہت اچھی ہیں لیکن ہمیں تو غریبی میں نام پیدا کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے ۔ پیسے سے آدمی کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور ایک بار نفس موٹا ہو جائے تو پھر آدمی خود بخود چھوٹا ہو جاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی اونچی کرسی پر جاکر کیوں نہ بیٹھ جائے ۔ پھر ہم نے بڑی ریاضیت کے بعد یہ جو علم حاصل کیا ہے وہ پیسہ کمانے کے لئے نہیں کیا ہے خود اپنے آپ کو بے دریغ خرچ کرنے کے لئے کیا ہے ۔ اس پروگرام کے نتیجہ میں اب عام آدمی اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے سو سو جتن کر رہا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ایسی معلومات سے اس کی عام سوجھ بوجھ اور فہم و ادراک میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا ۔ معلومات اکٹھا کرنے کی اس دوڑ میں ایک آدمی تو بتا سکتا ہے کہ ہیروشیما پر کس تاریخ کو ایٹم بم گرایا گیا تھا لیکن وہ ان عوامل اور محرکات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا جو ہیروشیما پر بم گرانے کا سبب بنے تھے ۔ ابھی حال ہی میں اس سوال کا صحیح جواب دے کر ایک صاحب بارہ لاکھ روپے سے بھی زیادہ کی رقم لے کر گئے تھے ۔ اس پر ایک صاحب نے کہا تھا "ہیروشیما پر ایٹم بم کے گرنے سے ہونے والے نقصانات کے بارے میں تو بہت کچھ پڑھا تھا لیکن اب نصف صدی بعد معلوم ہو رہا ہے کہ ایٹم بم کے گرنے کے بہت فائدے بھی ہوتے ہیں جو اب ظاہر ہو رہے ہیں " ۔ معلومات کا مطلب اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ مختلف تاریخی واقعات کے سن یاد رکھو اور یہ جاننے کی کوشش نہ کرو کہ یہ واقعات کیوں ظہور پذیر ہوئے تھے ۔ عام آدمی بھلے ہی یہ جانتا ہو کہ قطرہ بالآخر گہر بن جاتا ہے لیکن قطرے سے گہر بننے تک قطرے پر کیا کچھ بیتی ہے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ۔ ظاہر ہے کہ جو آدمی پیسہ کمانے کے لئے معلومات کو اکٹھا کرے گا اس کی سوجھ بوجھ تو ایسی ہی ہو گئی اور آدمی اسی طرح تو کروڑ پتی بنتا ہے ورنہ سارے علم و فضل کے باوجود ہماری ہی طرح کنگال اور مفلس رہ جاتا ہے ۔ ☆

اردو بے چاری

کوثر صدیقی۔بھوپال

فارسی اردو میں رکھا کیا ہے
اردو پڑھ کے جو بیچیں تیل
ایسے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے

●☆●

ہندی کا جھنڈا چڑھنے والا ہے
چھاپیئے ہندی میں کلام مجید
کون اردو میں پڑھنے والا ہے

●☆●

نسل ہندی کی آنے والی ہے
پہلے اسکولوں سے گئی اردو
اب مدارس سے جانے والی ہے

●☆●

پیڑ پودوں میں کچھ نہیں ہے جان
مستقل ژالہ باری ہونے سے
اردو کے کھیت ہوگئے ویران

●☆●

فادری لینگویج اردو ہے
بیٹھکی ہے مادری زبان مگر
ہم اردو زبان میں پڑھو ہے

اردو ہے بستر علالت پر
دلی جاؤں کہ لکھنو جاؤں
اب عیادت کے واسطے کوثر

●☆●

نامہ شوق لکھیے ہندی میں
اس کو اردو میں خط اگر لکھوں
کس سے پڑھوائے گی وہ بستی میں

●☆●

اہل اردو بتائیں گے مفہوم
حاجی صاحب کو بھی نہیں معلوم

●☆●

ہندی اسکول میں ہم اچھے ہیں
اردو اسکول میں اگر پڑھیئے
لوگ فرقہ پرست کہتے ہیں

●☆●

اردو بے چاری کب پرائی ہے
ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی
تھوڑا پڑھ لیں تو کیا برائی ہے

●☆●

صحت اردو کی ہو نہ ہو بہتر
کھل گیا اردو کا شفاخانہ
حیدرآباد شہر میں کوثر

●☆●

آں جہانی زباں کا چہلم ہے
میر و غالب کی جنم بھومی میں
ہر جگہ مجلس محرم ہے

●☆●

میری گنتی ہے اہل دانش میں
ماں کے "تیجے" پہ "پیزا" منگوا کر
فاتحہ پڑھ رہا ہوں انگلش میں

●☆●

اب نہیں چلتا زور اردو کا
ہندی انگلش کے غل غپاڑے میں
دب گیا سارا شور اردو کا

●☆●

ڈاکٹر حبیب ضیاء
(حیدر آباد)

شادی خانہ آبادی

شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کے علاوہ دو گواہ بھی بے حد ضروری ہیں۔ یہ دو دلوں ہی کا میل نہیں دو خاندانوں کا بھی میل ہے۔ لاڈ پیار میں پلی لڑکی زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر مائکے سے سسرال جاتی ہے تو اپنی شرافت اور حسنِ سیرت سے گھر کے تمام افراد کے دل میں جگہ بنالیتی ہے۔ اب یہی اس کا گھر ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ شادی خانہ آبادی ہے لیکن اسے خانہ بربادی بنانے میں لڑکے کی ماں اور بہنوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ گھر میں کنواری بہن نہ ہو تو یہ نیک کام شادی شدہ بہنیں انجام دیتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً ماں باپ سے ملنے کے بہانے آکر گھر میں فساد پھیلاتی ہیں۔

گزشتہ زمانے میں لڑکی کو دیکھنے، اسے پسند کرنے کے طریقے بالکل الگ تھے۔ چند خواتین لڑکی کے گھر جاتیں۔ کچھ دیر بعد لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لایا جاتا اور سامنے بٹھادیا جاتا۔ ایک شاطر خاتون جو عموماً لڑکے کی ماں ہوتی، سر سے پلو ہٹاکر چوٹی ناپتی اس بات کا بھی یقین کرلیتی کہ اصلی ہے یا نقلی۔ گردن کا جائزہ لیتی کہ ہے یا نہیں۔ تاکہ اگر ہے تو جڑادی لچھے کی فرمائش کی جاسکے ورنہ چندن ہار پر بات طے ہوجائے۔ دو جملے اس کی زبانی سننے ضروری ہوتے کہیں گونگی تو نہیں۔ بعض محتاط خواتین دوچار قدم چلاکر کارروائی کو مکمل جانتیں۔ اب ان خرافات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لڑکی خود چل کر آتی ہے۔ چال، بال، زبان اور گردن اپنا حال خود ہی بتادیتی ہیں۔ ویسے بھی اب لڑکی کو دیکھنے، پرکھنے کے طور طریقے بالکل بدل گئے ہیں۔

بعض گھرانوں میں لڑکے کا باپ یا بڑا بھائی بھی خواتین کے ساتھ لڑکی کو دیکھنے جاتا ہے۔ ایک صاحب فخریہ کہہ رہے تھے۔ بہو پسند کرنے میں بھی گیا تھا۔ مجھ سے کیا پردہ؟ کبھی ایسا بھی ہوا کہ بڑے بھائی کو لڑکی ضرورت سے زیادہ پسند آگئی، نیت بدلی اور گھر آکر عقد ثانی کرنے کا ارادہ ظاہر کردیا۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ لڑکی کی سیرت، تعلیم، خاندان کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اہمیت نقد رقم، جہیز کی فہرست اور فلیٹ یا بنگلے کی ہوگئی ہے۔ نقد رقم بھی ایسی ویسی نہیں۔ اوسط سے کم درجے سے تعلق رکھنے والے والدین مقروض ہوکر مجبوراً جہیز کے علاوہ ایک بڑی رقم نقد، جوڑے کے نام پر دینے کے لئے تیار ہورہے ہیں۔ ایک لڑکی کو لڑکے والوں نے پچاس ہزار نقد کی شرط پر پسند کرلیا۔ ایک عرصے تک خاموشی رہی۔ دریافت کرنے پر جواب آیا لڑکی بہت کالی ہے کچھ تو بھی پیسے بڑھاؤ۔ 50 ہزار کی بجائے 75 ہزار روپئے کی مانگ پر لڑکی ماں باپ کے گھر رہ کر ملازمت کرکے زندگی گزارنے کو ترجیح دے رہی ہے۔ [illegible] میں جواب دینے کے اور بھی حربے ہیں۔ لڑکی بہت چھوٹی ہے۔ ہمیں 24 سال کی چاہئے۔ یا لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔ ہمارا لڑکا صرف 25 [illegible]ل کا ہے۔

لڑکی والوں کو بھی یہ کام خوب آتا ہے۔ ملازمت پیشہ لڑکی کی کمائی کھانے والی بعض مائیں یا بیروزگار بھائی جو گھر میں پڑے رہتے [illegible] سکتے ہیں۔ دس بہن بھائیوں میں بڑا بھائی ہے۔ گھر کی ذمہ داری اسی پر ہوگی۔ داڑھی والا ہے یا تالوچٹ ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ بر

دکھاوے کے لیے لڑکے کو بلایا گیا۔ خاصا کماؤ تھا۔ مگر طشتری میں چائے ڈال کر سڑپ سڑپ پینے پر ناکام ہوگیا۔ حالانکہ بعد میں چائے پینے کا سلیقہ اسے سکھایا جاسکتا ہے۔ لڑکے والوں کی طرف سے اخبار میں اشتہار ہو اور اگر اس میں لکھا ہو شادی میں عجلت ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔

شادی بیاہ کے ذکر کے ساتھ ایک اہم اور دلچسپ بات کا ذکر ضروری ہے بعض گھرانوں میں رسم کر کے لڑکی کو لڑکے کے نام پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک رسم کی تفصیل سنیئے۔ جوڑے کی رقم کے تعین اور جہیز کی فہرست پر دستخط لے لینے کے بعد ایک گھرانے میں لڑکے والوں نے لڑکی کو پسند کرلیا۔ انکار کے باوجود رسم کرنے کی آرزو ظاہر کی۔ بسترِ مرگ پر پڑی رہنے والی لڑکے کی نانی کے یہ الفاظ دہرائے "پتہ نہیں شادی تک میں زندہ رہوں یا نہ رہوں"۔ اس حوالے سے دھوم سے رسم کر کے پچاس ہزار روپے کا ڈنر بھی بغیر ڈکار لئے ہضم کرلیا۔ رسم ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہوگیا نہ لڑکے کی نانی مری نہ ان لوگوں نے شادی کی تاریخ دی۔ عیدین کے موقعوں پر لڑکا قیمتی سوٹ اور عیدی وصول کرلیتا ہے۔ ویزا لینے، ویزا بدلنے کے بہانے کثیر رقم بٹورتا ہے۔ لڑکی کے والدین کی ایک ہی رٹ ہے کہ اب تک اس پر ڈیڑھ لاکھ خرچ کرچکے ہیں۔ اتنی آسانی سے کیسے چھوڑ دیں۔ لڑکی کے ہمدرد کہتے ہیں۔ ان پانچ سالوں میں جو ملاقاتیں ہوئیں، ٹیلی فون پر پیار محبت کی باتیں ہوئیں انہیں کس حساب میں ڈالیں گے۔ لڑکی دل دے بیٹھی ہوگی، بیچاری کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ مزید پانچ سال انتظار کرلیا جائے۔ لڑکا یعنی آدمی کا بچہ.... ہوسکتا ہے کہ راہ راست پر آجائے۔

شادی بیاہ کے موقع پر بعض لوگ بے جا رسومات کر کے غلطی کا اعتراف کرنے کی بجائے سارا الزام مخالف پارٹی کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو سانچق، مہندی، جوڑے کی رقم، جہیز کی فہرست اور دیگر اس قسم کی باتوں کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں خود اپنی لڑکی کی شادی کے وقت ان کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ خفت مٹانے کے لیے جوڑے کی رقم چھپا کر، راز میں دی۔ لڑکے کی لالچی ماں نے جتنا جہیز مانگا اس سے کچھ بڑھ کر ہی دے دیا۔ شادی سے چار دن قبل رسومات شروع ہوگئیں۔ ہمیں فون کیا کل شام 5 بجے ہمارے گھر آئیے ہم نے پوچھا مانجے ہیں کیا؟ انہوں نے کھسیانے ہو کر کہا۔ جی، مانجے تو نہیں۔ میری بیوی کی آرزو تھی کہ پچاس ساٹھ لوگوں کو بلالیا جائے۔ کچھ رسومات نہیں ہوں گی۔ لڑکیاں زرد رنگ کے کپڑے پہن لیں گی۔ لڑکی کی گلپوشی کرنے والے ہم میاں بیوی کو بھی پھول پہنا کر کپڑوں کے جوڑے لانا چاہتے ہیں۔ بس انہیں کی خوشی کی خاطر کر رہا ہوں یہ سب۔ get to gether سمجھ لیجئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور دن کے لیے اس لفظ کا استعمال کیا۔ ہم نے انہیں سمجھایا۔ یہ اپنے آپ کو، اپنے ضمیر کو دھوکہ دینا ہے صاف کہہ دیجئے۔ مانجے، سانچق مہندی کی رسومات ہیں ہم آپ پر طنز نہیں کریں گے۔

آج کل کی شادیوں میں قریبی رشتہ داروں کے علاوہ دولہا کے دوست بھی اہم رول انجام دیتے ہیں۔ ان کی شرکت، ہلڑ بازی کے بغیر شادی بے رونق ثابت ہوتی ہے۔ بعض شادی خانوں میں ہم نے دیکھا کہ اچھے خاصے شریفانہ مہذب انداز میں تقریب چلتی رہتی ہے۔ اچانک دس پندرہ لڑکے ایک موٹر یا جیپ کے ساتھ گیٹ میں داخل ہو کر سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ تاشے کی آواز اتنی زور دار ہوتی ہے کہ اکثر لوگ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ ایسی ہی کسی محفل میں ایک صاحبہ تفکر آمیز لہجے میں ہم سے کہہ رہی تھیں "میرے شوہر دل کے مریض ہیں ان کے لیے یہ شور نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے"۔ ہم نے انہیں اطمینان دلایا فکر مت کیجئے۔ اب یہ تاشے کا شور ہی دل کے مریضوں کو دائمی سکون بخشے گا۔

بہر حال.... جیپ کا ذکر چل رہا تھا، اس شادی خانے میں بھی ایک جیپ آئی جس پر پودینے کو تمیر سے بنا وزنی ہار سجا ہوا تھا۔ اور یہ دوستوں کے چندے سے خریدا گیا تھا۔ معلومات میں اضافے کے لیے بتانا چاہتی ہوں کہ ہار جتنا وزنی اور تکلیف دہ ہوگا دوستی

اتنی ہی قدیم اور پائیدار ہوگی۔ دوست کی شادی کی خوشی میں پٹاخوں کا دھواں پھیلانا اور شور کرنا انہیں دوستوں کے ذمے ہوتا ہے اور وہ اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی زنجیری پٹاخوں کی دہشت ناک آوازوں سے شادی خانے میں کچھ دیر کے لیے سنسنی پھیل جاتی ہے۔ کبھی محلے والے سکون کی تلاش میں پولیس کی مدد طلب کرتے ہیں اس چیز کو مکمل طور پر ختم کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے کہ سارا معاشرہ اس لعنت میں گرفتار ہے۔۔

گزشتہ زمانے میں دولھے سہرا باندھے صبح گھر سے نکلتے۔ شادی خانوں کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے دن بھر دلہن کے گھر پڑاؤ ڈالے کپڑوں کا حشر۔ بگا "کر کے رخصتی کی گھڑیاں گنتے تھے۔ آج کل کے دولھے شام کو دیر سے گھر سے نکلتے ہیں۔ رات کا بڑا حصہ سڑک پر ہی گزار دیتے ہیں۔ دلہن کو لے کر جب برات واپس جاتی ہے تو دولھا کے دوست حرکت میں آجاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک برات کا ذکر ہے۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ پٹاخوں کی ناگوار آوازوں کے ساتھ آرکسٹرا پر ایک فلمی گانے کی دھن سنائی دی۔ "مار دیا جائے کہ چھوڑ دیا جائے بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے "۔ ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اس لیے کہ خوشی کے موقع پر گانے کے یہ بول بالکل بے موقع تھے۔ جب یقین ہوگیا کہ وہی دھن ہے تو ہم سے رہا نہ گیا۔ دریافت کروانے پر پتہ چلا کہ کار میں دولھا دولھن کے ساتھ دولھے کی ماں بھی بیٹھی ہیں۔ فہرست کے مطابق جہیز میں کنگال کی کمی رہ گئی تھی اس لئے کنگال ماں کے کہنے پر دولھا اپنی نوبیاہتا سے پوچھ رہا ہے کہ بول، تیرے ساتھ کیا سلوک کروں۔ ہمیں ان لڑکوں کی سوچ، ان کی فکر پر تعجب ہوتا ہے بلکہ ترس آتا ہے جو شادی کر کے اپنا گھر آباد کرنے کی عمر تک بھی فسادی کرداروں کی انگلی پکڑ کر چلتے ہیں ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

ایک صاحبہ نے اپنے لڑکے کی شادی کا رقعہ اپنی دوست کو بھیجا۔ جس پر لکھا تھا "شادی خانہ آبادی" اس کم پڑھی لکھی خاتون نے پوچھا یہ خانہ آبادی کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: آپ اتنا بھی نہیں جانتیں۔ گھر کا سامان میری طرح پرانا ہوچکا ہے۔ میں نے جہیز کے نام پر گھر کے لیے بہو سے شاندار قیمتی سامان منگوایا ہے۔ اس سامان سے میرا گھر آباد ہورہا ہے۔ یہی میرے لیے خانہ آبادی ہے۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مہمان کھانے کے ساتھ گانے بھی سنتے رہے۔ چند دن بعد کسی نے پوچھا بڑی بہو سے آپ نے اتنا سارا سامان لیا اب چھوٹے لڑکے کے لیے بھی اسی طرح فہرست دے کر جہیز مانگیں گی تو رکھیں گی کہاں؟ انہوں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں۔ چھوٹی بہو سے چار لاکھ کی موٹر لوں گی۔ ان منصوبوں پر چھوٹے بیٹے نے پانی پھیر دیا۔ لڑکی پسند کرلینے کے بعد جب بات چیت کا وقت آیا اس نے ماں کو کمرے میں بند کردیا۔ جوڑے کی رقم، جہیز کے مطالبہ کی سختی سے مخالفت کر کے شادی کی تاریخ پکی کردی!۔☆

مولانا محمد علی جوہر کے کلام پر ایک تضمین

ہوا دیکھ

نظر برنی
دہلی

کرسی ہے تو پھر بنک کا بیلنس بڑھا دیکھ
ہاں چھوٹے بڑے یونہی پتیوں کو کھڑا دیکھ
غربت کا جو پردہ تھا پڑا اسکو ہٹا دیکھ
"ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ"

ہم دونوں کی یاری میں نظر آیا دھندلکا
سورج جو محبت کا تھا وہ آپ ہی ڈھلکا
میں اپنی جگہ بھاری مگر تو تو ہے ہلکا
"خو تیری دو روزہ مرا پیماں ہے ازل کا
پابندِ جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ"

جو دل کی تمنا تھی تری ہو گئی حاصل
پیسہ ترا مقصد تھا تو عہدہ تری منزل
اٹھ عیش اڑا جاگ بھی جا کاہے کی مشکل
"سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگ فلک پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ"

انکوائری اگر ہوتی ہے تو ہوجائے تو کیا ہے
رشوت ہی جو الزام مٹائے تو بجا ہے
افسر کو کسی طور پٹانا بھی کلا ہے
"اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ"

"گاندھی وادی"

گاندھی وادی اب کہاں ہیں، ڈھونڈتے رہ جاؤ گے
نام لیواؤں کی پیڑھی رفتہ رفتہ چھٹ گئی

پانچ سو روپئے تھی پہلے رہ گئی ہے دس روپئے
گاندھی جی کی گھٹتے گھٹتے اتنی قیمت گھٹ گئی

●☆●☆●

عابد معز
ریاض

غریبی ہٹاؤ

غریبی ہٹاؤ عنوان سے ذہن میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ مضمون غریبی ہٹانے کے لئے کسی ماہر اقتصادیات کا نسخہ ہے جسے پیش کر کے ماہر اقتصادیات نوبل پرائز کا حقدار بن جائے گا یا کسی پلاننگ کمیشن کا پنچ سالہ منصوبہ ہے جس پر عمل کرنے سے غربت دور ہوگی۔ یہ بھی گماں ہوسکتا ہے کہ مضمون کسی سیاسی جماعت کا انتخابی منشور ہے جو اس پارٹی کو برسر اقتدار لے آئے گا۔ معاف کیجئے مضمون میں ایسی کوئی مسحور کن تخیل پردازی نہیں ہے۔ مضمون دراصل ایک عام شخص کے احساسات اور خیالات کی ترجمانی ہے جو اس نعرہ کو بھگتنے سے ابھرے ہیں۔

غریبی ہٹاؤ ایک انتخابی نعرہ ہے جسے ہر سیاسی جماعت استعمال کرتی ہے اور جو سیاسی قائدین کا تکیہ کلام بھی ہے۔ سیاسی جماعتوں کے نظریات کسی محاذ پر ملتے نہ ہوں گے اور ان کا طریقہ کار بھی مختلف ہوگا لیکن ہر جماعت غریبی ہٹاؤ کا نعرہ ضرور بلند کرتی ہے۔ اسی طرح ہر لیڈر خواہ وہ برسر اقتدار یا مخالف جماعت سے تعلق رکھتا یا آزاد امیدوار ہے۔ اس نعرہ کا اتنا ورد کرتا رہتا ہے کہ غریبی ہٹاؤ اس کا تکیہ کلام بن جاتا ہے۔ اس نعرہ میں غریبوں کے لئے مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ غریب عوام سیاسی جماعتوں اور قائدین کی باتوں پر ریجھ جاتے ہیں۔ ان کا دل بہل جاتا ہے امید بھی بندھ جاتی ہے لیکن انتخابات کے بعد غریب اور غریبی ویسے ہی رہتی ہے لیکن غریبی ہٹاؤ نعرہ لگانے والے غائب ہوجاتے ہیں۔

غریبی ہٹاؤ، غریب، غربت اور غریبی جیسے الفاظ کی بھنک جب بھی کانوں میں پڑتی ہے تو مجھے الیکشن کی آمد کا یقین ہوجاتا ہے۔ اسی نعرہ کی بدولت الیکشن کے دوران غریبوں کی بن آتی ہے۔ جب کوئی سوچتا ہے کہ غریب لوگ بھی اس زمین پر بستے ہیں اور جب ان کی فریاد سنی جاتی ہے۔ سیاسی قائدین ہاتھ جوڑ کر غریب کے آگے اس کی غربت کی دہائی دیتے ہیں یہ عجیب و غریب واقعہ ہوتا ہے۔ یقین نہیں آتا کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے سامنے اس کی حالت میں سدھار کے لئے التجاء اور گزارش کرے، لیکن ایسا ہوتا ہے کہ وجہ بعد میں سمجھ آتی ہے۔

غریبی ہٹاؤ نعرہ کے بغیر کوئی الیکشن نہیں ہوتا۔ کوئی انتخابی منشور مکمل نہیں ہوتا اور کسی امیدوار کی تقریر میں جان نہیں پڑتی۔ حد تو یہ ہے کہ اس نعرہ کے بغیر رائے دہندوں کو نہ خوش فہمی ہوتی ہے اور نہ ہی وہ الیکشن میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک لیڈر نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ انتخاب جیت کر سائنس اور ٹیکنالوجی میں انقلاب لے آئیں گے، تعلیم عام کریں گے۔ گاؤں کو شہروں سے جوڑیں گے۔ رائے دہندوں نے اس امیدوار کو مسترد کردیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس امیدوار کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے ہمارا بنیادی مسئلہ غربت ہے وہ غریبی ہٹانے کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مدرسوں میں سائنس پڑھانے کو اہمیت دیتا تھا اگر یہ بات تھی تو وہ مدرس بن جاتا الیکشن میں کیوں کھڑا ہوا۔

غریبی ہٹاؤ نعرہ لگانے کا فائدہ لیڈر کو الیکشن میں جیت کی شکل میں ملتا ہے ۔ لیڈر کے برخلاف غریبی ہٹاؤ کا فائدہ ان لوگوں کو بالکل نہیں ہوتا جن کے لئے یہ نعرہ لگایا جاتا ہے ۔ نصف صدی سے زائد عرصہ تک فضا میں غریبی ہٹاؤ کی گونج کے باوجود غریبوں کے حالات میں کوئی سدھار نہیں ہوا بجز اس کے کہ چند غریبوں کی زندگی میں الیکشن کے کچھ دنوں کے لئے غریبی وقتی طور پر ہٹ جاتی ہے ۔ الیکشن کے دوران امیدوار کے لئے کام کرنے والوں کے کھانے پینے رہنے سہنے اور کپڑے لتے کا انتظام ہوجاتا ہے ۔

مختلف لوگوں کے پاس غریبی ہٹاؤ بلکہ غریبی ہی کے معنی مختلف ہیں ۔ ضروری نہیں کہ جس حالت کو میں غریبی سمجھ رہا ہوں دوسرے کے پاس بھی وہی حالت غربت ہو ۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اسے امارات کا درجہ دے یہ بات میرے پلے اس وقت پڑی جب ایک لیڈر نے مجھے سمجھایا ۔ غریبی کا دارومدار آپ کی سوچ پر ہے اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ غریب ہیں تو آپ غریب ہیں میری مثال اور ہے میں اپنے آپ کو غریب سمجھتا ہوں ۔

مجھے ان کے انکشاف پر حیرت ہوئی جس شخص کے پاس شاندار کوٹھی ، تین کاریں ، چند فلیٹ اور چلتا ہوا کاروبار ہو وہ کیوں کر غریب ہوسکتا ہے ۔ میں نے تعجب سے پوچھا وہ کیسے ۔

اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرے پاس اپنا ہوائی جہاز نہیں ہے ۔ میرا کوئی عالیشان ہوٹل نہیں ہے ۔ ویسے تم بھی غریب ہو ۔ انہوں نے مجھے بھی غریب بنا دیا ۔

" نہیں میں غریب نہیں ہوں " میں نے اپنی غربت کی تردید کی ۔

" تم غریب ہو " انہوں نے زور دے کر کہا " تمہارے پاس کار نہیں ہے ۔ کار کی ضرورت تم میرے یہاں سے کار مستعار لے پوری کرتے ہو ۔ ہوائی جہاز میں سفر کرنے کی سکت نہیں رکھتے ۔ ریل گاڑی میں پھرتے ہو ۔

شکر ہے اللہ کا میں پیٹ بھر کھا سکتا ہوں ۔ میں نے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی امارت کا دفاع کیا ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ایسی غربت اللہ ہر کسی کو دے لیکن کیا تمہیں سڑکوں پر بھیک مانگتے لوگ نظر نہیں آتے ۔ اگر میں غریب ہوں تو وہ کیا ہیں ۔

وہ بھی غریب ہیں ان کی حالت کو دیکھ کر تم جیسے پڑھے لکھے لوگ دھوکہ کھا جاتے اور غریبی کا داویلا مچانے لگتے ہیں ۔ اگر وہ مانگتے ہیں تو یہ بھی دیکھو کہ کوئی انہیں دیتا ہے ۔ ہم نے دینے والوں کی حالت بہتر بنائی ہے ۔ اسی طرح ہم نے اپنے ملک سے غریبی ہٹائی ہے ۔

اس قماش کے بعض لیڈر غریبی ہٹانے کے معاملے میں کچھ زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ غریبی ہٹانے کی کوششوں میں غریبوں کو ہی ہٹانے لگ جاتے ہیں لیکن ایسے لیڈروں کو جلد یا بدیر غریب انہیں ان کے منصب سے ہٹادیتے ہیں تاکہ غریب اور غریبی اپنی جگہ باقی برقرار رہے ۔

ماضی میں غریبی ہٹاؤ نعرہ بہت لگایا جاتا تھا اب زیادہ سنائی نہیں دے رہا ہے ۔ شاید اس نعرہ میں اب وہ جادو باقی نہیں رہا جو پہلے تھا یا سیاسی قائدین غریبی ہٹانے میں ناکامی کے اعتراف کے طور پر یہ نعرہ نہیں لگا رہے ہیں ۔ میں نے ایک لیڈر پر الزام لگایا ۔ آپ غریبی ہٹاؤ نعرہ لگا کر ہر الیکشن کامیاب ہوتے آرہے ہیں لیکن اب تک آپ غریبی نہیں ہٹاسکے آپ ایک ناکام سیاستدان ہیں ۔

موصوف نے صفائی پیش کی کون کہتا ہے کہ میں نے غریبی نہیں ہٹائی اور میں ایک ناکام لیڈر ہوں ۔ مخالف امیدوار کا الزام لگتا ہے میں ایک کامیاب لیڈر ہوں ۔ انتخابات میں مسلسل منتخب ہو کر میں نے اپنی غریبی دور کرلی ہے اپنی غربت دور کرنے کے بعد میں نے اپنے رشتہ داروں اور حواریوں کی حالت بہتر بنانے پر توجہ دی ہے ۔ آپ میرا ریکارڈ دیکھیں ۔ اس میں بھی میں کامیاب ہوں ۔ اب کہیں جاکر عوام کی غریبی دور کرنے کی باری آئی ہے اگر عوام اسی طرح منتخب کرتے رہے تو میں عوام کی غریبی بھی دور کر کے دم لوں گا ۔

آپ میرے مخالفوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ اپنا ووٹ مجھے ہی دیں میرا انتخابی نشان کرگس ہے۔

غریبی ہٹاؤ نعرہ لگا کر ہر سطح پر ہر قسم کا لیڈر غریبی دور کرنے میں مصروف ہے لیکن غربت میں معلوم نہیں کیا بات ہے۔ نہ دور ہوتی ہے اور نہ ہی کم۔ اپنی جگہ سے سرکتی تک نظر نہیں آتی۔ یہ غریبی بہت ہٹیلی ہے روزِ اول جہاں تھی سو اب بھی وہیں ہے بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

جب میں نے مایوسی کا اظہار کیا تو میرے ایک فلسفی دوست نے اپنی رائے ظاہر کی غریبی کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ خود غریب بھی نہیں۔ ہمارے جیسے غریب ملکوں کی بات چھوڑیئے۔ غربت ہماری شناخت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اور امریکہ کی مثال لیتے ہیں۔ لوگ ان ممالک کی مثال دیتے نہیں تھکتے۔ ان ملکوں میں بھی غریبی ہے۔ غریب لوگ فٹ پاتھ پر زندگی گزارتے ہیں۔ سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ یا پھر اپنی غریبی دور کرنے کے لئے تشدد پر اتر آتے ہیں۔ بندوق دکھا کر کھانے اور ڈرنک کے لئے پیسے وصول کرتے ہیں۔ غریبی ہٹانے میں حکومت تک ناکام ہے۔ اپنا بھرم رکھنے اور غریبی پر پردہ ڈالنے کے لئے بیروزگاری الاونس دیتی ہے۔ روس کو دیکھو غریبی دور کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ پھر بھی ناکام ہے شاید دنیا کے موجودہ رائج نظام میں کسی کے پاس بھی غریبی ہٹانے کا نسخہ نہیں ہے اور ہم نے غریبی ہٹانے کا نعرہ لگا کر اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا ہے۔ ☆

کاہل بھارتی
غنی چوک، بدایوں

غزل

کبھی قصداً ، کبھی سہواً ، کبھی جبراً ، کبھی قہراً
یہ شوہر مانتے ہیں بیویوں کی بات مجبوراً

ہمیں اپنی سی کرنے ہی نہیں دیتے یہ مولانا
ہمیشہ روک دیتے ہیں ، کبھی شرعاً ، کبھی جبراً

خدا کا شکر ہے بیگم کہ راشن لے کے لوٹا ہوں
تم اتنا بھی نہیں کرتیں کہ کہہ دو "اھلاً و سھلاً"

سنا ہے میتھ میں تم امتیازی شان رکھتے ہو
بتاؤ تو ذرا بس ، بحر کی لمبائی تخمیناً

اسیرِ زلفِ گندم کیوں نہ ہوں آخر میاں کاہل
ہر انساں کررہا ہے سنتِ آدم ادا رسماً

●☆●☆●

رؤف رحیمؔ
(شکر گنج، حیدرآباد)

غزل

میں بچ سکا نہ اب بھی مقدر کی مار سے
جاتا ہوں ریس کو جو میں نکلا ہوں ہار سے

اک ایکٹر کے واسطے توڑے گئے اصول
ڈاکو تمام چھوٹیں گے قیدِ حصار سے؟

اک ویرپن کے آگے جو ہتھیار ڈالدیں
ایسوں کو ہٹنا چاہئے اب اقتدار سے

اب مر رہے ہیں آندھرا والے جناب من
برقی کی مار سے کبھی پانی کی مار سے

بجلی کے چارجس میں اضافہ جو ہوگیا
کرنی ہے خودکشی ہمیں برقی کے تار سے

لیڈر بنا تو کار ملی بار بھی ملا
اس طرح لگ گیا ہوں میں اب کاروبار سے

اتنا غلو بھی ٹھیک نہیں ہے میاں رحیمؔ
خود کو ملا رہے ہو دلاور فگار سے؟

●☆●

اسرار جامعی
(۱) جامعہ نگر، دہلی ۲۵

مکالمہ مابین علامہ اقبال اور اسرار جامعی

علامہ مشرق جو اک روز ملے مجھ سے
پوچھا کہ بتائیں تو کیسے ہیں وہاں آخر
بولے کہ اسی غم میں، دن رات میں روتا ہوں
بدلے گا بھلا کیسے یہ نظم جہاں آخر
بالائے ستم دیکھو، جو میرے محباں ہیں
لے آئے کہاں سے وہ مجھکو بھی کہاں آخر
جو میرے مبصر ہیں ان سے تو خدا سمجھے
چھنوائیں گے مجھ سے بھی یہ شہرِ جناں آخر
بکتے ہیں عقیدت میں جو دل میں سماتا ہے
گو کچھ بھی نہیں سر میں ہے منہ میں زباں آخر
اسرار میاں! اب تو کچھ اور کرو باتیں
دیکھوں تو تمہارا ہے کیا طرزِ بیاں آخر
اچھا! یہ بتاؤ تو احوالِ امم کیا ہیں
دنیا کا مرے پیچھے کیسا ہے سماں آخر
میں نے یہ کہا حضرت! سننا ہے تو سن لیجئے
اب قوم کو خود اپنی ہے فکر کہاں آخر
سچ میں ہی بتاتا ہوں احوالِ امم یہ ہیں
طاؤس و ربابِ اول، شمشیر و سناں آخر

بائی جیک

اک ہوائی کمپنی نے یہ دیا ہے اشتہار
کاٹھمنڈو جو کوئی پکنک منانے جائے گا
ٹور کر کے دوبئی، لاہور اور قندھار سے
بچ گیا تو چند دن تک، سیر کر آئے گا

ڈاکٹر سید محی الدین قادری ہادی ۔ریڈر عربی
دار الھدیٰ سبزی منڈی
مکان نمبر : ۴۸۶-۴-۱۳
پوسٹ کاروان ۔ حیدر آباد ۔ ۵۰۰۰۰۶

اعضا کے افعال

اوپر والے نے ہمیں مختلف اعضا کا معجون مرکب بنا کر انسان نام رکھ دیا ۔ اعضا کا ہم نے تعارف اور تشریح جدید انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اعضا کی تقسیم تین طرح پر کی گئی ہے (۱) ۔ بلحاظ اہمیت (۲) بلحاظ تعداد اور (۳) بلحاظ کام ۔

(۱) بلحاظ اہمیت : جن اعضا کو اللہ نے بہت اہم سمجھا ان کو جسم کے اندرونی حصے میں محفوظ کر دیا جو نظر نہیں آتے ۔ اگر کوئی اپنے اندرونی اعضا اور ہڈیوں کو دیکھنے کا خواہش مند ہو تو اسے چاہیے کہ ایکس رے نکالے اور سی ٹی اسکان نکالے جن اعضا کو اللہ نے کم اہم سمجھا انھیں باہر رکھا جو اچھی طرح نظر آتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ باہر رہتے ہوئے بھی بعض اعضا خود کو نظر نہیں آتے جیسے گردن اور پیٹھ وغیرہ ۔ ان کو آئینے کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے ۔ جن اعضا کو غیر اہم سمجھا اللہ نے انسان کو نہیں عطا کیا جیسے سینگ ، دم ، کھر ، اور سم وغیرہ ۔

(۲) بلحاظ تعداد یہ تقسیم حساب کے قاعدے کے مطابق ہے یعنی بعض اعضا صرف ایک ایک ہیں جیسے ناک ، زبان ، دل ، دماغ ، جگر اور معدہ وغیرہ ۔ اللہ کی مصلحت ہی تھی کہ ان اعضا کو صرف ایک ایک ہی بنایا ۔ اگر ایک سے زائد ہوتے تو نہ جانے کیا کیا گل کھلاتے ۔ خصوصاً دل اور زبان ۔ بعض اعضا جوڑے جوڑے ہیں باہر بھی ، اندر بھی جیسے آنکھیں ، کان ، ہونٹ ، ہاتھ ، پیر بیرونی اور گردے اور پھیپھڑے وغیرہ ۔ ان کو جوڑے جوڑے بنانے کی مصلحت بنانے والا ہی جانے ۔ تین عضو جسم میں کوئی نہیں ہے سوائے اس کے کہ دماغ اور جگر کے تین حصے ہوتے ہیں اور بس ۔ ہر ہاتھ اور ہر پیر میں چار چار انگلیاں ہوتی ہیں ۔ لوگ پانچ انگلیاں کہتے ہیں جو سراسر غلط ہے ۔ پانچواں عضو انگوٹھا ہے جس کی بناوٹ اللہ نے انگلیوں سے الگ بنائی اور استعمال میں بھی الگ ہے ۔ قواعد اردو کے لحاظ سے انگوٹھا مذکر اور انگلی مونث ہے ۔ اس مضبوط دلیل کے پیش نظر یہ کہاوت " پانچوں انگلیاں برابر نہیں " غلط ہے اور چاروں انگلیاں برابر نہیں صحیح ہے ۔ ہر ہاتھ میں ایک اور ہر پیر میں ایک ایک انگوٹھا ہے اس طرح چار انگوٹھے ہوئے ۔ دل تو ایک ہے مگر اس میں چار خانے ہوتے ہیں ۔ دو چھوٹے اور دو بڑے ۔ دل اگر سیدھا چلتا رہے تو جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر ٹیڑھی چال چلے یعنی بگڑ جائے تو انسان کو چاروں خانے چت کر دیتا ہے ۔

انسان کے جسم میں پانچ عدد کا کوئی عضو نہیں ہے ۔ لوگ پانچ انگلیاں کہتے ہیں کہ لیں ۔ ہم نہیں کہیں گے ۔ چھ آنتیں ہوتی ہیں ۔ ویسے تو آنتوں کی دو بڑی قسمیں ہیں ۔ چھوٹی آنت اور بڑی آنت ۔ مگر ہر آنت تین تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے اور جملہ چھ الگ ناموں سے موسوم ہے ۔ یہاں ان تمام کے نام لکھ کر ہم آپ کو " علم تشریح الاعضا " کا سبق نہیں پڑھائیں گے ۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ ان

پہ آنتوں کا چاکنہ لوگ بہت مزے لے کر کھاتے ہیں ۔ سات عدد کا بھی کوئی عضو نہیں ہے ۔ آٹھ انگلیاں دونوں ہاتھوں میں اور آٹھ دونوں پیروں میں ہوتی ہیں ۔ دونوں ملالیں تو سولہ کا ہندسہ بنتا ہے ۔ اس سے بڑھ تعداد میں کوئی عضو نہیں ہے ۔ البتہ پسلیاں چوبیس (۲۴) اور ریڑھ کی ہڈیاں تینتیس (۳۳) ہوتی ہیں مگر چونکہ یہ عضو نہیں کہلاتی ہیں اس لئے ان کی مزید تشریح نہیں کی جاتی ۔

(۳) بلحاظ کام: یہی تقسیم سب سے اہم ہے ۔ اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہر عضو کا ایک ایک ہی کام ہے جیسے آنکھ کا کام دیکھنا، ناک کا کام سونگھنا اور دل کا کام دھڑکنا وغیرہ۔ مگر بنظر غور دیکھیں تو ایک عضو کئی کئی کام انجام دیتا ہے ۔ چنانچہ یہی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے اس امید اور یقین کے ساتھ کہ مختلف اعضا کے کاموں کی تفصیل پڑھنے کے بعد قاری کے دماغ کے چودہ (۱۴) نہیں اٹھائیس (۲۸) طبق روشن ہوجائیں گے ۔ تمہید ختم ہوئی اصل مضمون اب شروع ہوتا ہے ۔

آنکھ

جس طرح دروازے کے دو پٹ ہوتے ہیں اسی طرح ہر انسان کی دو آنکھیں ہوتی ہیں ۔ اللہ میاں نے ہم کو آنکھیں اس لئے دو عطا کی ہیں کہ ہم اچھی طرح دیکھ سکیں مگر اس کے باوجود بعض کو اچھا دکھائی نہیں دیتا اور بعض اچھا دیکھتے ہوئے بھی ایسے انجان بن جاتے ہیں جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں ۔ بقول شاعر:

پرانی ہے پہچان مگر وہ ہیں انجان

آنکھوں کے کئی کام ہیں ۔ مختلف لوگ ان سے مختلف کام لیتے ہیں ۔ جیسے کاہل سونے کا، عاشق جاگنے کا، عورتیں رونے کا، سڑک چھاپ فرہاد گھورنے کا، ماڈرن لڑکیاں ترچھا دیکھنے کا، کاتب لکھنے کا اور عالم پڑھنے کا وغیرہ۔

ایک شاعر کے خیال میں اس کی محبوبہ اپنی آنکھوں سے بہ یک وقت چار چار کام لیتی ہے ۔ وہ نظریں اٹھاتی ہے تو دعا بن جاتی ہے، نظریں جھکاتی ہے تو حیا بن جاتی ہے، نظریں ترچھی کرتی ہے تو ادا ہوجاتی ہے اور نظریں پھیر لیتی ہے تو قضا آجاتی ہے گویا شاعر کا انتقال ہوجاتا ہے اور اس کے بعد مزید کچھ کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

بعض دروازوں کا ایک ہی پٹ ہوتا ہے ۔ ایسے ہی بعض انسانوں کی آنکھ کا ایک گیٹ مستقل طور پر بند رہتا ہے ۔ ایسے یک چشم لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں ۔ سب کو ایک آنکھ سے (ایک نظر سے) دیکھتے ہیں ۔ دونگاہی دوئی یا دو نظری ان میں نہیں ہوتی ۔ کاش ہمارے تمام لیڈروں اور نیتاؤں کو بھی خدا اس نعمت خاصہ سے نوازتا تو وہ ہر ایک سے یکساں سلوک کرتے ۔

خواتین آنکھوں سے زیادہ تر رونے کا کام لیتی ہیں ۔ اب تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ عورتوں کا بہت کار آمد ہتھیار ہے مگر جدید تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ رونے سے آنکھیں خوب صورت ہوتی ہیں شائد اسی لئے عورتوں کی آنکھیں مردوں کی بہ نسبت بہت خوب صورت ہوتی ہیں ۔ ہمارا مشورہ ہے کہ کوئی عورت یا مرد اپنی آنکھیں خوبصورت ترین بنانا چاہے تو روزانہ صبح ایک گھنٹہ اور شام ایک گھنٹہ پابندی سے رویا کرے ۔ ایسا کرنے سے اگر منہ بگڑ جائے تو ہم ذمہ دار نہیں ۔

بعض افراد کی بشمول خواتین ایک آنکھ یا دونوں آنکھیں ترچھی ہوتی ہیں ۔ ایسے افراد "ایک پنتھ دو کاج" کی کہاوت پر عمل کرتے ہیں ۔ بیک وقت دو افراد سے مخاطب ہوتے ہیں ۔ جس کی طرف دیکھتے ہیں وہ یہ سمجھتا ہے کہ مخاطب مجھ سے ہے مگر وہ کسی اور کو بھی دیکھتا ہے ۔ شاعر نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا "کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ" ۔

"آنکھ مارنا" محاورہ ہے ۔ واقعی آنکھ ماری جاتی ہے ۔ ایک آنکھ بند کئے بغیر دوسری آنکھ کو بند کرکے فوراً کھول دینا آنکھ مارنا کہلاتا ہے ۔ سڑک چھاپ اور دل پھینک لوگوں کا یہ کار آمد کاروبار ہے ۔ آپ کو بھول کر بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے ورنہ خواہ مخواہ

مصیبت گلے پڑ جائے گی۔

آنکھوں کی کہاوتیں اور محاورے دو سو سے زائد ہیں۔ تفصیل درکار ہو تو کسی بھی اردو کی لغت سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام کہاوتوں اور محاوروں کو یہاں لکھ کر ہم آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ صرف ظفر کا شعر لکھ کر آنکھوں کے کاموں کا سلسلہ بند کرتے ہیں۔

ظفر آنکھوں ہی آنکھوں میں ہیں باتیں ان سے ہو جاتی
کبھی ظاہر میں کچھ باہم نہ کہتے ہیں نہ سنتے ہیں

دیگر اعضا کے کاموں کی تفصیل پھر کبھی۔ یار زندہ صحبت باقی ۔۔ اعضا کے ہیں کام باقی ۔۔☆

●☆●☆●☆●☆●☆●☆●

رائتہ

مشاعرے سے پہلے کھانے کی دعوت تھی۔ زیادہ تر شعراء کھانے سے فارغ ہو کر مشاعرے کے پنڈال میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن مجاز اور جذبی ابھی مصروف خورد و نوش تھے۔ دفعتہً منتظمین میں سے چند لوگوں نے جذبی کے پاس آکر درخواست کی کہ حاضرینِ مشاعرہ نہایت بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

جذبی نے کہا: "بھیا! ابھی چلتا ہوں ذرا سا رائتہ کھالوں" اور مجاز اتنی سی بات سنتے ہی ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

"جذبی، اس رائتہ کے مضمون کو اقبال اپنے ہاں نظم کرتا تو کچھ ایسے کرتا: حیف شاہیں رائتہ پینے لگا

اور اختر شیرانی کا مصرع ہوتا:

رائتہ جو رخِ سلمے پہ بکھر جاتا ہے

اور جوش یوں کہتے:

رائتہ کھا کر وہ شاہِ کج کلا ہاں آگیا

اور فراق یہ انداز اختیار کرتے:

ٹپک رہا ہے دھندلکوں سے رائتہ کم کم

اور فیض احمد فیض لکھتا:

تیری انگشتِ حنائی میں اگر رائتہ آئے
ان گنت ذائقے یلغار کریں مثلِ رقیب

اور میں خود یوں نظم کرتا:

بنتِ شب دیگِ جنوں رائتہ کی جائی ہو
میری مغموم جوانی کی توانائی ہو

اور تمہیں تو واقعی یہی کہنا چاہیے تھا:

"ابھی چلتا ہوں ذرا رائتہ کھالوں تو چلو"

قطعہ کلامیاں

انور سدید (لاہور)
۱۶۷۔ شبلی بلاک، اقبال ٹاؤن
لاہور ۵۴۵۷۰۔ پاکستان

پیکنگ

بازار میں اک شخص صدا تھا یہ لگاتا
اوصاف کو دیکھو، مری ایکٹنگ کو نہ دیکھو
جو بیچ رہا ہوں، وہ کوئی چیز ہے میری
تم مال کو دیکھو، مری پیکنگ کو نہ دیکھو

شکوہ نصیب کا

کیا حال ہم سے پوچھ رہے ہو عوام کا
جھٹکے لگا رہا ہے، زمانہ غریب کو
ہے پاس ان کے بازوئے قوت شکن مگر
ہر وقت رو رہے ہیں یہ اپنے نصیب کو

ادیبوں کی لڑائی

لڑتے دیکھا جو ادیبوں کو تو احساس ہوا
اب قلم کاروں میں الفت نہیں پیدا ہوتی
دور ہوں گر، تو قلم ان کا ہے تلوار سے تیز
پاس آئیں تو محبت نہیں پیدا ہوتی

سیاست کے اناڑی

بازیچۂ اطفال ہے میدان سیاست
ہر روز تماشا نیا کرتے ہیں کھلاڑی
کردیتے ہیں اس ملک کی قسمت کو دگرگوں
منظر پہ ابھر آتے ہیں ہر روز اناڑی

●☆●

کسی کو اپنے آگے سر اٹھانے ہم نہیں دیتے
جو دیکھے بدنظر سے، اس کی آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں
اگر غصہ کبھی تخریب کاری پر ہو آمادہ
تو اپنے گھر کی دیواروں کو خود ہی توڑ دیتے ہیں

ہاں میں ہاں

حریف خوش ہیں، رقیب رقصاں ہیں اور بغلیں بجا رہے ہیں
کہ فاصلے کر رہی ہے پیدا، ہمارے مابین "ناں" تمہاری
نہیں ہے رنجش کا کوئی باعث تو کیوں گلے دونوں مل نہ جائیں
مزا تو تب ہے ہماری "ہاں" سے خود آکے مل جائے "ہاں" تمہاری

ناصاف پانی

ایک بدرو کو ہوا عشق مرے نلکے سے
اب کہاں صاف رہا ہے، مرے گھر کا پانی
بو سی آتی ہے مجھے آبِ رواں سے کیوں کہ
مل رہا ہے مرے نلکے سے گٹر کا پانی

امیری میں نام

جہانِ کہنہ کا دستور بھول کر انورؔ
تو اپنے واسطے اپنا نظام پیدا کر
بدل دے جتنے ہیں معنی پرانے لفظوں کے
خودی کو بیچ، امیری میں نام پیدا کر

●☆●

ڈاکٹر محمد مجیب الدین
چسٹر۔ ورجینا۔ یو ایس اے

مانگ کر پڑھئے

آخر کار ایک دن ہم نے مسٹر جونس سے پوچھ ہی لیا۔ میرے سوال پر ان کا پارہ آسمان کی طرف چڑھنے لگا اور میں شرم کا مارا زمین میں گڑھنے لگا۔ ہمارے مطب میں جہاں ہمارے بیشتر مریض ہر بار ایک نیا اور تازہ دم ساتھی اپنی بغل میں دبا کر لاتے ہیں اسی طرح مسٹر جونس ہر وقت اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین کی خاطر ایک عدد نئی اور تازہ کتاب اپنی بغل میں دبا لاتے اور محو مطالعہ رہتے ہیں جب تک کہ ان کی باری نہیں آجاتی۔ بسا اوقات ہمیں ایسا لگتا کہ ہمارے دیگر مریضوں اور مسٹر جونس کے درمیان مقابلہ اس بات پر تھا کہ کون کتنی تیزی سے حسب ذوق اپنی اپنی نئی تصنیف ساتھ لاتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ بعض اوقات یہ تصنیف یا تالیف محدود نہیں ہوا کرتی۔ ہم نے ایک دفعہ مسٹر جونس اور دوسرے مریضوں سے ان کے تکمیل ذوق میں ان کے استقلال استقامت اور مستقل مزاجی کی داد دیتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ آپ لوگ بار بار اور اتنی جلد کس طرح اپنا سامان ذوق در بغل فراہم کرلیتے ہیں تو دونوں نے بھی جو جواب انگریزی میں لمبا چوڑا دیا ہے وہ ایک جیسا ہی تھا اور اس کے ترجمہ کا سارا نچوڑ اگر ایک جملہ میں بند کردوں تو بات علامہ اقبال کے کے اس مصرعہ پر ختم ہوتی ہے۔

"گر ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں"

ویسے ہمارا خیال ہے کہ اب بھی امریکہ میں کتابوں کی بہتات ہے۔ لیکن بہ نسبت دوسرے ذوق کے یہ ذرا مہنگا ہے اس لئے لوگ زندہ کتابوں کو تیزی سے بدلنے کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ حسین چہرہ بھی ایک بہترین کتاب ہے اور اس میں صفحہ پلٹنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرنی پڑتی۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کتنی جلدی بعد تکمیل مطالعہ حسب ذوق ایک نئے تسکین ذوق کا اہتمام کریں گے۔

"تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کتابیں دوسروں سے مانگ کر پڑھتا ہوں۔" مسٹر جونس نے کہا۔ مزید کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب یہ میرا ذوق مطالعہ ہے کہ آپ ابھی تک بچے ہوئے ہیں ورنہ آپ اپنے مطب میں جو انتظار کرواتے ہیں اور میں اگر اپنے ساتھ ایک عدد کتاب نہ رکھ لیتا اور میں اس انتظار کے دوران اس عمارت کی ایک ایک اینٹ نکالنا شروع کردیتا تو آپ کبھی کے سڑک پر آچکے ہوتے۔"

دراصل ہم نے مسٹر جونس سے جو ایک بے تکلف مریض تھے سادگی سے یہ پوچھ لیا تھا کہ وہ کتابیں کس سے مانگ کر پڑھتے ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ وہ ویلفر کی قلیل آمدنی میں گذارا کرتے ہیں اور ان کا یہ شوق واقعی ان کے لئے گراں تھا۔

اب ہماری طبی اور اخلاقی ذمہ داری ہو چکی تھی کہ ان کا بلڈ پریشر کسطرح سطح زمین پر لایا جائے۔ ہماری شرمساری کو ہم نے معذرت خواہی میں تبدیل کرتے ہوئے کہا مسٹر جونس بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا تعلق مادری زبانوں میں اس زبان سے ہے جس کا نام اردو ہے اور اس کے جاننے والوں کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ اس زبان میں چاہے جو کچھ بھی لکھا جائے وہ صرف مانگ کر ہی

پڑھا جائے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر اردو پڑھنے کا مزا ہی نہیں اور خرید کر پڑھنے میں اس کی وہ چاشنی باقی نہیں رہتی جو مانگ کر پڑھنے میں ہوتی ہے "۔

میں نے ان کی خفگی دور کرنے کے لئے بات جاری رکھتے ہوئے کہا " یہ اردو ایک جواں اور حسین بیوہ کی طرح ہے جس سے ہر کوئی مفت میں ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور اس سے دل لگی اور اٹھکھیلیاں کھیلنے کی بھی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی بیوگی کا کلنک کسی کو بھی اپنانے نہیں دیتا "۔

مسٹر جونس کو اب میں کچھ رنجیدہ ہوتے دیکھ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ بلڈ پریشر سے مالیخولیا کے مریض بن جائیں میں نے ان کو بہلانے کے لئے اپنی پرانی یادوں کی باتیں سنانی شروع کردیں کہ کس طرح ہمارے وطن عزیز میں ہمارے گھر پر صبح کا اخبار آنے سے پہلے ہی ہمارے گھر پر ہمسایوں کا تانتا بندھ جاتا تھا اور ایک قطار لگ جاتی تھی۔

اور جب ہم ان حضرات اور خواتین سے کہتے کہ ابھی اخبار تو آیا ہی نہیں اور جب آئے گا تو پہلے ہم اور ہمارے دیگر افراد خاندان پڑھنے کے بعد بخوشی آپ لے جاسکتے ہیں۔ یہ سنکر وہ کہتے کہ جناب آدھا اخبار آپ رکھ لیں آدھا ہمیں دیدیں یہ آپ کی خوشی کہ آپ کونسا آدھا حصہ رکھنا چاہیں گے۔ کوئی کہتا کہ اس آدھے اخبار کو درمیان سے پھاڑ کر ایک ورق آپ رکھ لیں اور ایک ورق ہمیں دیدیں اور کچھ دیر میں پھر صفحات ایک دوسرے سے تبدیل کرلیں گے۔ کوئی نوجوان کہتا کہ حضرت آپ کو تو فلموں سے دلچسپی نہیں وہ فلمی حصہ ہمیں دے دیجئے۔ کبھی کبھی ہمیں غصہ آجاتا تو جیسے ہی اخبار آتا ہم اسے مجمع کے آگے لٹادیتے اور اخبار کے لٹنے کا منظر دیکھتے اور ایسا لگتا کہ ہمارے نکاح کے چھوہارے لٹارہے ہیں اور ایک گونا گوں مسرت کا احساس بھی ہوتا کہ ہمارے اعزاز میں مصری بادام لٹتے دیکھنے کا ایک اور موقع آنے سے رہا۔

لہذا اسی سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اس احساس کو بیان کرنے کے لئے ہمیں مسٹر جونس کو رسم نکاح کے نکات سمجھانے پڑے اور وہ بہ ضد ہوگئے کہ کبھی ہم ان کا بھی نکاح پڑھوادیں اب یہ کچھ ذرا مسکرانے لگے۔ میں نے انھیں ایک اور واقعہ سنایا کہ کسطرح میرے ایک لکھنوی دوست جاوید غالب کا کلام مجھ سے مانگ کر لے گئے اور جب تین ماہ تک اسے واپس نہ کیا تو ہم نے پہلے اشارتاً پھر اخلاقاً اور پھر شرارتاً ان کو یاد دلایا لیکن حالانکہ ان کے کان پر جونک تک رینگ گئی پھر بھی واپسی کا نام نہ لیا۔ پھر میں نے حیدرآبادانہ شرافت کو پرے ہٹاکر تاہم اس طرح کہ ان کی طبع نازک پر بات گراں نہ گذرے کہا " جاوید۔ کل رات مرزا غالب دہلوی مرے خواب میں آئے اور کہا کہ میں جاوید کے ہاں کافی عرصہ مہمان رہ چکا ہوں اب مجھے تمہارے یہاں واپس آجانا چاہئے آپ آکر مجھے اپنے ساتھ لے جائیے۔ یہ سن کر جاوید نے زور دار قہقہ مارا پھر اس سے بھی زور دار ہاتھ مرے شانے پر مارا اور کہا قسم خدا کی چچا غالب کل رات میرے خواب میں بھی آئے تھے اور کہا کہ میاں جاوید تم لکھنو والے ہو اور ہمارے ہمسائے ٹھہرے میں بجائے اس کے کہ حیدرآبادی کے ہاں رہوں یہ تمہارا حق بنتا ہے کہ میں تمہارا ہی مہمان بن کر رہوں اور جاوید نے کہا کہ اب چچا آپ کے ہاں آنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میں اس کے جواب پر تلملایا تو ضرور لیکن اب چچا غالب کے اغوا کا منصوبہ بنانے لگا۔

میں نے ایک اور دوست سے جو کتابیں مانگ کر پڑھنے کے عادی تھے پوچھا کہ آپ آخر کتابیں مانگ کر کیوں پڑھتے ہیں وہ ہنس کر کہنے لگے تم ٹھہرے ڈاکٹر بھلا تمہیں معاشیات سے کیا سروکار جناب جب کوئی چیز زیادہ مانگی جاتی ہے تو مارکٹ میں اس کی مانگ بڑھتی جاتی ہے بلکہ مصنف بھی اگر کبھی اپنی کتاب پڑھنا چاہے اور مانگ کر پڑھے تو یہ بات سونے پر سہاگہ ہوگی۔

اس موضوع پر ایک اور واقعہ موزوں ہے وہ یہ ہے کہ ایک مصنف نے اپنے دوست سے غلطی سے یہ ذکر کردیا کہ عنقریب ان

کی کتاب شائع ہوکر آرہی ہے تو ان کے دوست نے فوری طور پر کہا یار اس کتاب کی پہلی جلد مجھے دے دینا میں تجھے صرف ایک مہینے کے اندر اندر واپس کردونگا اور یہ کہ اس کتاب پر میرا نام لکھکر نیچے اپنے دستخط کرنا نہ بھولنا۔ تاکہ میں یہ نہ بھول جاؤں کہ کتاب تمھیں واپس کرنا ہے۔

بہرحال ہم نے بھی مانگنے والوں سے تنگ آکر ایک ترکیب سوچی جب ایک صاحب کتاب مانگنے کے لئے آئے تو میں نے انھیں پانچ چھ کتابیں جو ابھی سن بوسیدگی کو پہنچنے والی تھیں انھیں دیں اور کہا کہ پڑھنے کے بعد اسے واپس کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اپنے پاس ہی رکھیں جناب والا غصہ میں آگئے اور کتابیں لینے سے صاف انکار کردیا۔

اور کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو یہ کتابیں اچھی نہیں ہیں کہ قابل مطالعہ ہوں یا تم نے اپنی دیمک زدہ کتابوں کو نکالنے کا ادبی طریقہ ایجاد کیا ہے اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتابیں لیکر میں نے بڑی محنت سے جو دوسری کتابیں جمع کی ہیں اسے بھی دیمک کے نذر کردوں گا۔ کتابیں مانگنے کا بھی میرا ایک اصول ہے صرف وہی کتابیں مانگتا ہوں جو اصولاً اس کی اسی طبعی حالت میں واپس کی جاسکتی ہوں جس حالت میں میں نے لی تھیں۔ مجھے پتہ ہے کہ امریکہ میں غیر ضروری کتابیں اور رسالے نکلوانا کتنا دشوار کام ہے لیکن آپ نے تو حد کردی۔ بخدا ہم انھیں کچھ نادر اور قدیم کتابیں دینے جارہے تھے۔

ہم نے ارادہ کر رکھا تھا کہ مسٹر جونس جب تک قہقہہ نہ مار دیں ہم انھیں کچھ نہ کچھ سناتے رہیں گے ہم نے انھیں بتایا کہ ہم بھی کتابیں منگواتے ہیں مگر مانگتے نہیں لیکن اسمیں ہمیشہ ہمیں محرومی سے دوچار ہونا پڑتا ہے جیسے کہ کئی احباب ہندوستان یا پاکستان جاتے وقت ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ واپسی پر وہاں سے ہمارے لئے کچھ لے آئیں ؟ میں کہتا اگر یاد رہ جائے تو بس ایک عدد اردو کی کتاب لادیں یہ سنکر جواب ملتا یار تیرے لئے تو ایک کتاب کیا سارا کتب خانہ ہی اٹھا کر لے آدونگا اور کہو تو میرے شہر کے آسمان سے تارے تک توڑ لاؤں گا دوسرے شہر کے آسمان سے یہ کام کرنا میرے لئے غیر اخلاقی بات ہوگی ۔ واپسی پر جب ان صاحب سے ملاقات ہوتی ہے تو ہمیں ایسا نظر انداز کرتے ہیں جیسے ہمیں جانتے ہی نہیں۔ پھر ہم اپنے تکلف کو عاق کرکے بلکہ بالائے طاق رکھکر کتاب کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہتے ہیں ارے یار میں تو تجھے بتانا ہی بھول گیا میں نے ایک بہترین کتاب تیرے لئے پسند کی تھی اور خریدنے والا ہی تھا کہ مجھے پتہ چلا کہ کتاب کے مصنف کافی بیمار بلکہ بستر مرگ پر ہیں اور میں نے سوچا کہ کچھ دنوں کے لئے کتاب خریدنا ملتوی کردوں لیکن مصنف اتفاقاً صحت یاب ہوگئے ۔ میں نے کہا مصنف کی بیماری سے کتاب کے خریدنے کا کیا تعلق ؟ کہنے لگے یار تو نے یہیں مار کھائی ہے۔

اگر اس کتاب کے مصنف اس جہان فانی سے گذر جاتے تو وہ کتاب لافانی ہوجاتی۔ افسوس کہ مصنف اپنی لاکھ غربت کے باوجود اپنی تربت میں نہ جاسکے تو میں دکان کے مالک سے کہکر آیا ہوں کہ جیسے مصنف صاحب اس قید زندگی سے آزاد ہوں۔ آپ اس کتاب کو آزاد کرکے ہمارے پتہ پر روانہ کردیجئے ۔ میں نے تاکید کی ہے کہ ڈاک کے ٹکٹ ٹھیک طریقے سے لگائیں اور پتہ صحیح لکھیں تاکہ چیز صحیح طریقہ سے صحیح جگہ صحیح وقت پر پہنچ جائے ۔ اور کہدیا کہ قیمت جب ہم دوبارہ ہندوستان آئیں تو ضرور ادا کردیں گے ۔ بشرطیکہ وہ بھی مصنف کے غم میں ان کا ساتھ نہ دیدیں اور اس دار فانی سے کوچ کرجائیں۔ پھر بھی کتاب پر موصوف کے کتاب گھر کا ٹھپہ ان کی ہمیشہ یاد دلاتا رہیگا۔ اس سے بڑھکر ایک اردو کتاب فروش کی اردو والوں کے لئے کیا خدمت ہوسکتی ہے۔

پھر میں نے انھیں آسمان سے تارے توڑلانے والی بات یاد دلائی تو کہنے لگے یار تم یقین کرو یا نہ کرو میں جب تک وہاں تھا موسم اتنا ابر آلود تھا کہ ایک تارہ تک بھی نظر نہیں آیا بلکہ ایک رات میں اس غرض سے باہر نکلا اور جیسے ہی نظر اٹھاکر دیکھا تو اچانک ساتوں

طبق روشن ہوگئے ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے ناک کان اور حلق سے ستاروں کے فوارے پھوٹ رہے ہیں اور نہ صرف نظام شمسی بلکہ ساری کائنات کے ستارے اور وہ ستارے جو ابھی تک دریافت نہیں ہوئے ہم نے دیکھ لیے وہ بھی قریب سے لیکن ہاتھ اتنے شل ہوچکے تھے کہ ان تک لے جایا بھی نہ جاسکا جب ہمیں ہوش آیا اور گرد جھاڑ کر اٹھنے لگے تو ہمیں وہ شئے نظر آئی جو ہمارے سر سے ٹکرائی تھی اور یہ دراصل میرے خیال میں شہاب ثاقب ہے جسکو میں آپ کے لئے لے آیا ہوں ۔ہم نہ سہی ہماری جستجو نے تو تارہ توڑ ہی لیا آپ کے لئے شہاب ثاقب بھی تو ایک ٹوٹا تارا ہی تو ہے ۔ لیکن میں دوسروں کے اس مفروضہ سے قطعی اتفاق نہیں کرتا کہ یہ ایک ناریل ہے جو کہ پڑوس کے درخت سے ہمارے سر پر گرا ہے چونکہ ہم نے محکمہ موسمیات کو فون کرکے پتہ کرلیا کہ اس وقت ہوا کا رخ بالکل مخالف سمت تھا اور یہ بات ناممکن تھی کہ اسے گرنے کے لئے ہمارے ہی سر کی ضرورت تھی ۔

مسٹر جونس کا غصہ اب ٹھنڈا ہوکر برف ہونے جارہا تھا ۔وہ پوچھنے لگے کہ آجکل ہندوستان اور پاکستان میں نوجوان طبقہ اردو پڑھتا بولتا یا سیکھتا ہے ۔میں نے کہا ہاں ہاں کیوں نہیں جو نہیں جانتے اس لئے سیکھ رہے ۔اور جو جانتے ہیں اس لئے بھولنا نہیں چاہتے کہ وہ بات انگریزی میں کریں اور گالی اردو میں دیں چونکہ گالی کا مزا مادری زبان میں دینے میں جو آتا ہے وہ کسی اور دوسری زبان میں نہیں ۔

اردو جس نے ایک تہذیب کو جنم دیا تھا جس پر ساری دنیا فخر کیا کرتی تھی اب انھیں کے ہاتھوں ایک گالی بن کر رہ گئی ہے ۔

میری بات سن کر مسٹر جونس کے چہرے پر ایک بے اطمینانی کی کیفیت ابھر آئی اور کہا کہ یہ تو اب "اردو" کے ساتھ بہت ظلم ہورہا ہے ۔میں ابھی اپنے وکیل سے بات کرکے اسے Adopt کرکے یہاں لے آونگا میں نے کہا جناب "اردو" کوئی یتیم بچہ نہیں بلکہ حسین اور جوان بیوہ ہے شاید امیگریشن اس کی اجازت نہیں دے گا ۔ پھر انھوں نے اپنی بغل سے کتاب نکال کر میرے ہاتھ میں تھمادی اور اس کا نام تھا ABDUCTION ۔

وہ مسکراتے ہوئے معائنہ کے کمرے سے نکل گئے ۔میں نے چلاتے ہوئے ان سے کہا مسٹر جونس اپنی فیس دینا نہ بھولئے ۔

اظہر احسن صدیقی
کراچی

صاحب میٹنگ میں ہیں

"ہیلو! ہیلو، کون صاحب بات کریں گے ___ کہاں سے؟ ___ دیکھیے صاحب میٹنگ میں ہیں آپ ایسا کریں اپنا نمبر لکھوادیں جیسے ہی "صاحب خالی ہوں گے بات کرادی جائے گی"۔ اگر آپ نے دنیا تیاگ نہیں دی ہے اور گلشن کے کاروبار میں مصروف ہیں اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی رکھتے ہیں تو اس قسم کی گفتگو سے آپ کا روزانہ دن میں حسب ضرورت کم از کم چار پانچ مرتبہ واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ اب اگر کہیں آپ کے ساتھ یہ واقعہ پہلی مرتبہ ہوا ہے تو آپ سچ مچ اس بات کے انتظار میں رہیں گے کہ "صاحب" جونہی خالی ہوں گے یا جیسے ہی انہیں فرصت ملے گی وہ فوراً آپ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے فون کریں گے۔ گھبرایئے نہیں آپ کی یہ خوش فہمی یا غلط فہمی جلد ہی دور ہوجائے گی۔ "صاحب" آپ کو کبھی فون نہیں کریں گے۔

"صاحب" ہونے کے لئے سرکاری یا نیم سرکاری ملازم ہونا شرط نہیں ہے۔ ہر وہ آدمی خواہ وہ ملازم پیشہ ہو۔ تجارت پیشہ ہو۔ وکیل ہو۔ ڈاکٹر ہو یا جو شخص بھی معاشرے میں ذرا سی اہم جگہ پر پہنچ گیا ہو یا جس سے بھی کسی دوسرے آدمی کا کام پڑ سکتا ہو وہ ہمارے اور آپ کے لئے صاحب ہوسکتا ہے اور وہ ایسے وقت میں جب اس کے لئے وقتی طور پر کوئی بیکار آدمی فون کرے تو وہ ہمیشہ میٹنگ میں ہوتا ہے۔ یہ میٹنگ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اور نہ صاحب کبھی خالی ہوتا ہے۔ اور نہ اسے آپ سے بات کرنے کی فرصت ہوتی ہے الا یہ کہ آپ کی خوش قسمتی یا یوں کہیئے کہ صاحب کی بد قسمتی سے انہیں آپ سے کوئی کام ہو۔ پھر دیکھیئے کہ صاحب کو فرصت ہی فرصت ہوگی اور ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ صاحب بغیر پی اے اور سیکرٹری کے آپ کو نہ صرف خود فون کریں گے بلکہ آپ کے گھر کا پتہ بھی دریافت کرلیں گے اور وہاں ملنے پہنچ بھی جائیں گے اور اگر اشد ضرورت ہے تو آپ کو اپنا پرائیوٹ نمبر بھی لکھادیں گے۔

اگر آپ اس بات کی فوراً تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ صاحب موجود ہوتے ہوئے بھی کیوں نہیں ہیں۔ یعنی کہ ہرچند کہ ہیں نہیں ہیں۔ تو ہم اپنے ساتھ ہونے والے دو واقعات آپ کو سنائے دیتے ہیں۔ آپ یہ نسخہ استعمال کیجئے انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ صاحب سے آپ کی فوراً بات ہو جائے گی۔ بس ذرا اس بات کا خیال رکھئے گا۔ کہ اگر آپ کو صاحب سے کوئی کام ہے تو اس سے ہاتھ دھولیجئے اور پھر صاحب کی عمر بھر کی خفگی علیحدہ رہی۔ پہلا قصہ یوں ہے کہ ہمارے جاننے والوں میں ایک صاحب کی ایک دم سے ترقی ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑے آدمی بن گئے اور اس طرح انھوں نے شہ کا مصاحب بننے کے بعد پرانے دوست احباب اور چھوٹے لوگوں سے ملنا قطعی ترک کر دیا۔ جب فون کیا جاتا یا ملنے کی کوشش کی جاتی وہی گھسا پٹا جواب ملتا۔ صاحب دفتر میں نہیں ہیں یا میٹنگ میں ہیں۔ فون نمبر دے دیجئے۔ بعد میں بات کرادی جائے گی۔ ہمارے اور ان کے ایک مشترکہ دوست کو ان صاحب کی بہت تلاش تھی کہ کسی طرح ان سے گفتگو ہوجائے۔ ہم سے بھی انھوں نے ایک دن ذکر کیا کہ فلاں صاحب اتنے بڑے آدمی ہوگئے ہیں کہ ان سے بات

کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے ۔ ہم نے کہا کہ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے ۔ فون ہم لگوائے دیتے ہیں ۔ بقیہ نتائج تم خود بھگتنا ۔ اتفاق
ہمارے دوست کا نام اس وقت کے نہایت معروف اور اہم وزیر با تدبیر سے ملتا جلتا تھا ۔ چنانچہ ہم نے انہیں فون کیا اور جب پی
نے نام پوچھا تو وہی نام بتادیا ۔ فوراً موصوف فون پر آگئے اور فرمایا "یس سر" لیکن جب ہماری آواز پہچانی تو بہت برہم ہو کر گالیاں
لگے ۔ ہم نے عرض کیا ۔ "بتائیے کیا غلط نام لیا ہے ۔ ہم نے تو صحیح نام بتایا تھا جناب اگر آپ کے اعصاب پر وزیر صاحب سوار
اس میں ہمارا کیا قصور ہے ۔ یہ خطا البتہ ہوئی کہ یہ معلوم ہوگیا کہ آپ نہ میٹنگ میں ہیں اور نہ مصروف ہیں " ۔ ویسے بھی ہم نے
تک کوئی ایسی میٹنگ نہیں دیکھی جو کبھی ختم نہ ہوا جس کے بعد انسان فون نہ کر سکے ۔

دوسرا واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے ۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک دوست کو کسی صاحب سے کوئی کام پڑگیا اور ہماری یہ بد نصیب
انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ صاحب موصوف سے ہماری بھی یاد اللہ ہے ۔ بس جناب ہمارے پیچھے پڑگئے کہ ہماری ملاقات ک
حسب دستور ہم جب بھی فون کرتے کہ ان کے پاس وقت لے کر جائیں یہ معلوم ہوتا کہ صاحب یا تو میٹنگ میں ہیں یا دفتر کے باہ
ہوئے ہیں ۔ جب ہمیں صاحب کار نے بہت ہی مجبور کیا تو آخر ہم نے صاحب سے بات کرنے کا طریقہ بھی ڈھونڈ ہی لیا ۔ ؟
صاحب کو ان کے بڑے صاحب کے نام سے فون کیا اور حسب توقع صاحب فوراً فون پر آگئے ۔ مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ آج تک ان
تعلقات دوبارہ خوش گوار نہیں ہوسکے ہیں ۔

اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ ہمیں یاد آرہا ہے جو بظاہر معمولی نوعیت کا ہے مگر اس قسم کے معاملات میں نہایت اہم
ہے ۔ یہ قصہ ہمیں ہمارے ایک دوست نے خود سنایا جو ایک بہت اہم عہدہ پر فائز تھے ۔ کوئی ضرورت مند آدمی ان سے ملنے
دن سے کوشش کر رہا تھا مگر حسب دستور صاحب کا پی اے اسے وہی رٹا رٹایا جواب "صاحب بہت مصروف ہیں یا میٹنگ میں
والا جملہ سنا کر ٹرخا دیتا تھا ۔ آخر روز روز یہ جملہ سنتے سنتے وہ بیچارہ عاجز آگیا اور پی اے سے زور سے یہ کہتا ہوا جانے لگا " اپنے ص
سے کہنا کہ ہم بھی جب ہی تک ملنے آرہے ہیں جب تک وہ مصروف ہیں ۔ جب وہ مصروف نہیں ہوں گے تو ملنے بھی کوئی نہیں
گا " اتفاق سے یہ گفتگو ہمارے دوست نے بھی سن لی اور وہ اس کی اس بات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اس کو بلالیا اور ا
بات نہ صرف سن لی بلکہ اس سلسلے میں جو ضروری کاروائی ہونی تھی وہ بھی کر ڈالی ۔

"صاحب میٹنگ میں ہیں یا مصروف ہیں " فقرے سنتے سنتے عاجز آنے والوں نے صاحب سے گفتگو کرنے یا ملنے کے لئے
کے علاوہ بھی ذرائع دریافت کرنے شروع کر دیے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔ جو تندہ یابندہ ۔ حاجت بری بلا ہوتی ہے ۔ حاجت مند کو اپنا کام
کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں ۔ اس سلسلے میں "صاحب" کے منہ چڑھے ملازموں کی تلاش شروع
ہے ۔ پھر ان کے قریبی دوستوں ، عزیزوں اور رشتہ داروں کی فہرست تلاش کی جاتی ہے ۔ اور آخر میں سب سے اہم ذریعہ یعنی بیگم
تک پہنچنے کی کوشش ہوتی ہے ۔

جو لوگ صاحب کی میٹنگ کا شکار ہوتے ہیں وہ اپنے کام نکلنے کے لئے اور صاحب تک رسائی حاصل کرنے کے
ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے مقولہ پر عمل کرتے ہوئے طرح طرح کے طریقے دریافت کرتے ہیں ۔ پھر یہ ہتھکنڈے یا طور طر
ملک کے رواج کے مطابق ہوتے ہیں ۔ کہیں پر ذاتی معالج کا نام لینے سے اور کہیں پر انشورنس کمپنی یا وکیل کے نام سے کام چا
ہے ۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک میں پولیس کے محکمہ یا کسی اور اہم محکمہ کے نام سے فون کرنے سے بھی اکثر صاحب سے
چیت ہونے کے امکانات کافی روشن ہوجاتے ہیں ۔ ہمارے ملک میں صاحب سے ملنے اور قرب حاصل کرنے اور پھر کام نکلنے

بھی بہت سے مروجہ قاعدے اور طریقے ہیں۔ اب آپ ان میں سے کونسا آزماتے اور اپناتے ہیں یہ صاحب اور ضرورت مند کی عادات، اطوار اور خاص طور پر وسائل پر منحصر ہے۔ بعض صاحب لوگ جلسہ یا تقریب کی صدارت سے قابو میں آجاتے ہیں۔ جبکہ بعض حضرات کو مہمان خصوصی بننا زیادہ پسند ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تقریر کرکے خوش ہوتے ہیں۔ کسی کو کھیلوں کی تقریب زیادہ بھاتی ہے۔ شعر و شاعری اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے صاحب ایسی تقاریب کی صدارت کو بہت پسند کرتے ہیں۔ پھر کچھ حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں قوالی یا راگ رنگ کی محفلیں زیادہ مرعوب ہوتی ہیں۔ ویسے یہ طریقۂ واردات ضرورت مند کو کافی منگا پڑتا ہے۔ مگر کہتے ہیں مرتا کیا نہ کرتا۔ حاجت روائی کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ سے کیا پردہ۔ ہم نے تو بعض ایسے ضرورت مندوں کو جنہیں دیسے زندگی میں کبھی روزہ نماز کے قریب بھی پھٹکتے نہیں دیکھا۔ صاحب کے قرب کے چکر میں عمرہ اور حج کرتے دیکھا ہے اور بڑے بڑے دور افتادہ مزارات تک کے چکر لگاتے دیکھا ہے۔

اس سلسلے میں ہونے والا ایک دلچسپ واقعہ بھی آپ کو سنادیں۔ جس کے شاہد ہم خود ہیں۔ ہمارے ایک تجارت پیشہ دوست کو کسی صاحب سے بہت ضروری کام تھا اور وہ ان سے ملنے کے لئے بہت بے چین تھے۔ مگر ان صاحب سے کسی طرح ملاقات نہیں ہورہی تھی۔ بیچ میں پی اے اور سیکرٹری ظالم سماج کی طرح حائل تھے۔ اتفاقاً ایک شادی میں جہاں ہم دونوں موجود تھے وہ صاحب بھی آگئے کیونکہ اس وقت اور کوئی چمچے موجود نہیں تھے۔ انہوں نے سوچا کہ ہم سے ہی گزارا کیا جائے۔ بڑے مربیانہ انداز میں ہماری خیرو عافیت دریافت کی۔ ہمارے دوست نے جو یہ منظر دیکھا تو بس ان کے دل کو لگ گئی۔ سخت اصرار کہ ہم سے ملاقات کرادیں۔ چنانچہ ہم اپنے دوست کو ان کی طرف لے کر بڑھے اور یہ کہہ کر "سر یہ ہمارے بہت عزیز دوست ہیں" ان سے ملاقات کرادی، اس واقعہ کو ہم قطعی بھول چکے تھے کہ کچھ عرصہ بعد ایک شادی میں ہماری ملاقات ہمارے انہی عزیز دوست سے ہوگئی۔ وہ بھی ہوٹل میں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے باس جو اکثر ملک سے باہر رہتے تھے آئے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں بہت یاد کررہے تھے۔ ساتھ ہی انہوں نے ہمیں اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دی جو اس ہوٹل میں ان کے مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے محفوظ رہتا تھا۔ ان کے اصرار پر ہم ان کے ساتھ ہولئے اور جب کمرے میں پہنچے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب ہم نے ان صاحب کو وہاں پایا جن سے ہمارے دوست اور ان کے باس نہایت بے تکلف ماحول میں گفتگو کررہے تھے۔ یہی نہیں مزید حیرت اس بات پر ہوئی جب ہمارے دوست نے ہمارا تعارف صاحب سے اسی طرح کرایا جس طرح ہم نے چند روز پہلے ہی ان کا صاحب سے کرایا تھا تو صاحب یہ قطعی بھول چکے تھے کہ ہم ہی ان کا تعارف کراچکے ہیں۔

جس زمانے میں تمام "صاحب لوگ" فرسٹ کلاس سے ہوائی سفر کیا کرتے تھے تو ضرورت مند حضرات ایسے لوگوں کا قرب حاصل کرنے کے لئے پگڑی دے کر ہوائی جہاز میں فرسٹ کلاس کی نشستیں حاصل کرتے تھے۔ اس خوشگوار ماحول میں صاحب سے گفت و شنید بالمشافہ ہوتی تھی۔ کیونکہ ایسے موقعہ پر نہ سیکرٹری ہوتا تھا۔ نہ پی اے ہوتا تھا نہ فون ہوتا تھا اور نہ صاحب میٹنگ میں ہوتے تھے۔ ☆

صاف صاف

منّہ پھٹ ناگپوری

نب آپ ہم جواں تھے، دس بیس سال پہلے
یا تیر، کیا کماں تھے، دس بیس سال پہلے

اب گھر میں بیٹھے بیٹھے بس ٹی وی دیکھتے ہیں
ہر سو رواں دواں تھے دس بیس سال پہلے

ج ان کے مقبرے کا شاید نشاں نہ پاؤ
د لوگ آسماں تھے، دس بیس سال پہلے

بیٹھے ہوئے ہیں تھک کے پتلی سی اک گلی میں
یہ میرِ کارواں تھے، دس بیس سال پہلے

شوت، فراڈ، گھپلے، گھوٹالے، چھینا جھپٹی
یہ سب مرض کہاں تھے دس بیس سال پہلے

آج ان کے تھوبڑے کا نقشہ بدل گیا ہے
کیا یار۔ جانِ جاں تھے دس بیس سال پہلے

شوار ہوگیا ہے اب راستے پہ چلنا
د چار کارواں تھے، دس بیس سال پہلے

منّہ پھٹ ملی ہے جن کو نگری میں چودھراہٹ
وہ کون تھے؟ کہاں تھے؟ دس بیس سال پہلے

●☆●

دوستانے میں جہالت نہیں اچھی لگتی
یعنی ہر بات پہ حجت نہیں اچھی لگتی

پان کھاتے ہو تو دیوار پہ تھوکا نہ کرو
آپ لوگوں کی یہ عادت نہیں اچھی لگتی

مجھ سے شکوہ ہے تو آکر مری داڑھی نوچو
ایوں غیروں سے شکایت نہیں اچھی لگتی

تم میں آخر یہ طوائف کی ادا کیوں آئی
یہ زر و مال کی علت نہیں اچھی لگتی

اب یہ جینا کوئی جینا ہے اپاہج ہوکر
زندگی تیری طوالت نہیں اچھی لگتی

ایسے لوگوں سے نہ رشتہ نہ تعلق منّہ پھٹ
وہ جنہیں اپنی صداقت نہیں اچھی لگتی

فصلوں میں کم سے کم کا امکان ہوگیا ہے
پانی سے کھیتیوں کو نقصان ہوگیا ہے

افضل رہا نہ اشرف، عالم ہوا نہ بہتر
حیوان سے بھی بدتر انسان ہوگیا ہے

دھندا پلاٹ والا، ہے کیسا کاٹ والا
چھوٹو میاں کا لڑکا دھنوان ہوگیا ہے

منّہ پھٹ ملادو ہم کو اک اچھے پبلشر سے
اپنا تو اب مکمل دیوان ہوگیا ہے

کھارہے ہیں دال سوکھی روٹیاں
ملکیت تھی جنکی دس دس کوٹھیاں

مستری کیا بن نہ پائے سنتری
ہم جاتے تو رہے ہیں گوٹیاں

عورتوں نے باب کٹ اپنایا
کٹ گئیں اس دورِ نو میں چوٹیاں

ہو اگر حالت بنانی شیر سی
کھا نہاری نلی، تکا بوٹیاں

بن گئیں آل انڈیا بیوٹی کوئین
آج کل فیشن کی ماری موٹیاں

آپ بس منّہ پھٹ شرافت جھاڑیے
چھاپتے ہیں لوگ جعلی نوٹ یاں

●☆●

علیم خان فلکی
جدہ

مجھے مشوروں سے بچاؤ

بہ خدا ہم ملک الموت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا مشوروں سے ڈرتے ہیں ہمارا تو جی چاہتا ہے کہ جس طرح بعض لوگ فضائی آلودگی سے بچنے کے لیے ناک پر کپڑا باندھتے ہیں اسی طرح ہم بھی مشوروں کی آلودگی سے بچنے کے لئے کانوں میں کپڑے ٹھونس کر چلیں۔ قیس کے بارے میں ہمارا یہ گمان ہے کہ وہ لیلی کی یاد میں پاگل ہوکر نہیں بلکہ مشوروں کی وجہ سے پاگل ہوکر شہر سے بھاگ نکلا اور صحرا میں پناہ لی بے چارا مشوروں سے پاگل ہوگیا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ لیلیٰ کالی ہے اس سے تیری اولاد بھی کالی پیدا ہوگی۔ پھر کالی بیٹیوں کو اٹھانے تو جوڑا اور جہیز کہاں سے لائے گا۔ جب کہ وہ نیک نیت نہ صرف شادی کے لئے تیار تھا بلکہ گھر داماد بننے بھی تیار تھا۔

دولت مند ملکوں میں مشوروں کی قیمت ہوتی ہے کیونکہ وہاں بچے کم پیدا ہوتے ہیں اور بوڑھے مصروف رہتے ہیں۔ نہ گلی کے نکڑ پر چبوترے ہوتے ہیں نہ سرکاری نل۔ نہ پان کی دوکانیں نہ عبادت خانوں میں مشاورت کی فرصت اس لیے وہاں مشیروں کی پیداوار بہت کم ہے چنانچہ لوگ مشورہ کرنے کے لئے متعلقہ کونسلر یا کنسلٹنٹ سے رجوع ہوتے ہیں اور باضابطہ فیس ادا کرتے ہیں اگر ہم اپنے ملکوں سے ان تمام چبوتروں پر بیٹھنے والوں اور دو کانوں کے باہر کھڑے ہوئے تیار جاسوس حضرات کو جو ہر آنے جانے والے کے شجرہ نسب ظاہر و باطن کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے ہیں امریکہ یا یورپ بھیج دیں تو نہ صرف ان کی بیکاری دور ہوجائے بلکہ ان ملکوں کا نقشہ ہی بدل جائے گا وہاں کے سارے برسرروزگار کنسلٹنٹ چند مہینوں میں بے روزگار ہوجائیں گے۔ مشوروں کی قلت کا یہ عالم ہے کہ ہر قسم کی معمولی بات کے لئے مشورہ دینے والا الگ اور اسکی فیس بھی الگ۔ شادی کے لئے مشورہ طلاق کے لئے مشورہ بچوں کی تربیت کے لئے مشورہ۔ یہی نہیں بچے پیدا کرنے کے لئے بھی مشورہ سر درد ہو کہ پیٹ کا درد کینسر ہو کہ ایڈز غرض یہ کہ ہر معاملے کے لئے ایک مخصوص مشورہ دینے والا ہو گا۔

یہ لوگ وہاں کھڑے کھڑے مشورہ دینے سے بدکتے ہیں۔ اس لئے جب تک ایک آفس یا مطلب کرایہ پر نہ لے لیں مشورے بھی نہیں دیتے اور الحمد للہ ایک ہماری سوسائٹی ہے ہر شخص نام و نمود سے بے نیاز نکڑ پر ہو کہ دیوان خانے میں دوکان پر ہو کہ مسجد میں ہر جگہ اپنی زنبیل میں مشوروں کا انبار لئے پھرتا ہے۔ اور ماشاءاللہ ہمارے لوگ اتنے ذہین ہیں کہ ہر معاملے میں مشوروں سے آپ کو مالا مال کرسکتے ہیں۔ قلندرانہ صفات کے حامل اتنے غنی و سخی ہوتے ہیں کہ مانگنے والے کو اور نہ مانگنے والے سبھی کو مشورے عطا کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو جہاں دوچار افراد جمع ہوں وہاں ذرا سر پکڑ کر بیٹھ جایئے یا ذرا سا چھینک کر یا کھانس کر دیکھئے۔ نہ صرف وہاں موجود حضرات بلکہ کوئی راستے سے گزر رہا ہو تو وہ بھی رک کر ایک آدھ مشورے سے ضرور نوازے گا اور آپ کو یقین ہوجا ئیگا کہ آپ واقعی بیمار ہیں کیا کوئی صحتمند ان مشوروں کی تاب لاسکتا ہے ؟

ایک صاحب کہیں گے :۔ آپ کی طبیعت خراب لگتی ہے کوئی گولی فوری لے لیجئے صبح تک آرام ہوجائے گا۔

دوسرے صاحب: گولیوں سے ری ایکشن کا خطرہ رہتا ہے جوشاندہ لیجئے دیر سے سہی لیکن دیر پا آرام ہوجائے گا۔

تیسرے صاحب: دو دن سے میری بھی طبیعت خراب تھی ہومیو پیتھی سب سے بہترین ہے دیکھئے میں کیسا ٹھیک ٹھاک ہوں۔

چوتھے صاحب: اصل وجہ پان اور سگریٹ ہے آپ جب تک یہ ترک نہیں کرینگے علاج ممکن نہیں ہے۔

پانچویں صاحب: کسی بیماری کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے میرا تو اصول ہے فوری ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہوں اور ٹسٹ کرواتا ہوں۔
ابھی پچھلے ہفتے ہمارے سالے کے سسر کے بہنوئی کو معمولی کھانسی ہوئی تھی انہوں نے بھی ایسے ہی لوگوں سے سن کر گھر بیٹھے علاج کرلیا نتیجہ جانتے ہیں کیا ہوا (آنکھیں نکال کر تاباناں سرہلاتے ہوئے مغموم لہجے میں) دراصل ٹی بی تھا۔ پتہ چلا اور بے چارے دنیا سے چلے گئے۔

مشوروں کی یہ پانچویں قسم سب سے زیادہ کارگر ہوتی ہے کیونکہ مشورہ دینے والے نے احتیاطی تدابیر کے طور پر مشورہ نہ ماننے کے دردناک انجام سے بھی باخبر کردیا۔

آپ کے کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کا خدشہ ہو اور کوئی مشورہ دے تو پھر بھی قابل برداشت ہے لیکن جو مشورے بعد از وقت دیئے جاتے ہیں وہ آپ کو جیتے جی درگور کر ڈالتے ہیں آپ مجرم کیطرح سر جھکائے غلطی کا اعتراف کرنے اور پچھتاوے کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے۔ واقعہ ہوجانے کے بعد کونے کونے سے جھینگروں کے طرح مشورے امڈامڈ کر آتے ہیں۔

ایک صاحب: ارے حضت آپ نے پہلے ہم سے مشورہ کیوں نہیں کیا۔

دوسرے صاحب: ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ نے ہماری بات مان لی ہوتی تو ـــــ (حالانکہ نہ انہوں نے پہلے کچھ کہا تھا نہ آپ نے سنا تھا)۔

تیسرے صاحب: آپ کو ویسا کرنے کے بجائے ایسا کرنا چاہئے تھا ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے تو ایسا نہ ہوتا۔

چوتھے صاحب: اب جو ہونا تھا سو ہوگیا سب اللہ کی طرف سے ہے (تقدیر پر ایک عدد تقریر کے بعد) جو ہوگیا اسے بھول جائیے آگے کا سوچئے مگر اب کے ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیے (گویا اب تک آپ بغیر سوچے سمجھے زندگی گزار رہے تھے)۔

مشوروں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت انسان میں یہ عادت مبارکہ فرشتوں سے چلی آئی ہے مشورہ حضرت آدم سے پہلے ہوچکا تھا۔ جیسے ہی اللہ تعالی نے آدم کی تخلیق کا ارادہ فرمایا فرشتوں نے مشورہ پیدا کردیا۔ (ظاہر ہے یہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوا ہوگا) تخلیق کائنات کے Process میں سب سے پہلے مشورہ پیدا ہوا پھر آدم پھر زمین و آسمان۔ اب غور کیجئے تو پتہ چلے کہ پوری کائنات مشوروں پر گھوم رہی ہے ہمیں یہ بھی یقین ہوگیا ہے کہ جس چیز کو محورارض کہا جاتا ہے وہ بھی دراصل مشورہ ہی ہے۔ پہلا مشورہ یہی تھا کہ اس آدم خاکی کو خلیفہ کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ یہ تو زمین میں خون و فساد مچادے گا۔ (یہ مشوروں کی پانچویں قسم تھی جسکا ذکر ہوچکا ہے) اللہ تعالیٰ نے فوری ڈانٹ پلادی ورنہ پتہ نہیں اور کتنے مشورے آجاتے۔ حضرت انسان نے فرشتوں کے چیلنج کو تو اہمیت نہ دی البتہ مشورے کو Serious لے لیا اور فوری مشورہ دینا سیکھ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے کچھ اور عہد لینا چاہا لیکن عہد اس نے یہ کیا کہ وہ مشورے دے گا مگر لے گا نہیں اور یہی عمل دورازل سے پوری استقامت کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ انسان اولاد کو حکما مشورے دیتا ہے لیکن اپنے باپ کے مشورے کو نظر انداز کردیتا ہے۔ علماء قائدین کو اتحاد کے مشورے دیتا ہے لیکن خود اپنے خاندان میں اتحاد سے رہنے کا مشورہ دینے والے پر پل پڑتا ہے۔ خاموش رہنے کے فائدوں کا مشورہ دیتے ہوئے وہ گھنٹوں بول سکتا ہے بلکہ اس کے لئے بحث و تکرار ہی نہیں ہاتھا پائی کی نوبت آئے تو وہ بھی کرسکتا ہے شاید اسی لئے مشوروں کو تنظیمی شکل دے دی جاتی ہے۔

تا کہ کسی بھی کام کو منظم طریقے پر رد کیا جاسکے ۔ شوریٰ یا مشاورت اسی کم بخت مشورے کی ٹھوس سرپرستی کرنے والی شکلیں ہیں مشیر اس کو کہتے ہیں جسکو مشورہ دینے کا قانونی تحفظ حاصل ہو۔

بات چلی تھی فرشتوں کے مشوروں سے ۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت ماننی پڑتی ہے کہ اس نے پہلے مرد کو پیدا کر دیا ورنہ اگر عورت پہلے پیدا ہوجاتی تو مرد سے پہلے نہ جانے کتنے مشورے پیدا ہوجاتے بقول یونس بٹ، اللہ تعالیٰ یہ کام کسی مشورے کے بغیر کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے پہلے مرد کو پیدا کیا۔

چونکہ مشورہ بھی حضرت آدم کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا اس لئے تقسیم کار یہ عمل میں آئی کہ مرد دنیا میں اللہ کا خلیفہ بنے پایا اور عورت مشیر ۔ وہ جب تک مرد کے پاس ہے سانسوں کی رفتار سے مشورے دیتی رہے گی۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مرد اپنی حکومت کے فرائض منصبی کو تو بھلا چکا لیکن عورت اپنے فرض منصبی سے کبھی سبکدوش نہیں ہوئی وہ برابر اپنا فرض نبھاتی رہتی ہے اور مرد کی ناک میں دم کرتی رہتی ہے بعض عورتیں تو ناک ہی میں نہیں سر آنکھ منہ پیٹ وغیرہ کئی جگہ دم کرتی رہتی ہیں۔ عورت دنیا کی ہر ہستی کو مشورہ دے سکتی ہے لیکن کسی کا مشورہ سن نہیں سکتی سوائے ایک ہستی کے اور وہ ہے اسکی والدہ محترمہ ۔ وہ اپنی والدہ محترمہ کے مشورے کے بغیر نہ خود چلتی ہے نہ مرد کو چلنے دیتی ہے ۔ دنیا میں بڑے بڑے تیس مار خاں گزرے ہیں حتیٰ کہ مغل اعظم شاہجہاں بھی۔ جنکے پیچھے چلمن کی اوٹ سے ایک نہ ایک انار کلی کندھے پر ہاتھ ٹکائے رکھتی تھی۔ جہاں انہوں نے محترمہ کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ صادر فرمایا فوری محترمہ نے پیچھے سے کہنی ماری۔ شاید اسی لئے عمر شریف نے سارے شادی شدہ مردوں کو "کہنی برادری" کے لقب سے نوازا ہے ۔

ہم مشوروں سے نجات پانے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن شہر تو شہر ہے جنگل بھی نہ جنگل نکلا ۔ ہم جہاں جہاں گئے مشورے وہاں وہاں ہمارا پیچھا کرتے ہوئے پہنچ گئے ۔ ہم بیمار رہتے ہیں تو علاج در علاج کے مشورے ۔ ہم صحت مند ہوتے ہیں تو مزید صحتمند رہنے کے لئے نئے نئے مشورے ۔ بے کار تھے تو کام کرنے کے مشورے اور اب محنت سے کام کرتے ہیں تو ورزش و آرام کے مشورے ۔ ان مشوروں سے تنگ آکر سوچا تھا کہ خودکشی کرلیں لیکن خودکشی کے طریقوں پر جو مشورے در آئیں گے ان سے ڈر کر ہم زندہ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم نے علامہ اقبال کی یہ دعا اپنے لئے مانگی تھی۔

یا رب وہ درد جسکی کسک لازوال ہو
کانٹا وہ دے کہ جسکی چبھک لازوال ہو

شاید اللہ تعالیٰ نے ہماری سن لی اور لوگوں کے مستقل مشوروں کی شکل میں وہ کانٹا ہمیں عطا ہوگیا ہم صبح و شام اس سے زخمی ہوتے رہتے ہیں اور علامہ اقبال کو دعائیں دیتے رہتے ہیں ۔ ☆

مرزا کھونچ
نیاٹولہ، بیتیا
۸۴۵۴۳۸

غزل

ڈاکٹر بیوی سے لڑکر جب کلینک آئے گا
اے مریضو آپکا پھر کیا سے کیا ہوجائے گا

بن گیا ہے باپ اپنے باپ کا ام اے کے بعد
کیا کرے گا جب وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لائیگا

مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس مہنگائی میں
جو بھی سو کا نوٹ دیگا وہ دعا لے جائے گا

جب سسر کی پیروی سے ہی ملی ہے نوکری
کیا ہمارا مرتبہ سسرال میں بڑھ پائے گا

بن گیا ہے ناقدِ فن چھوڑ کر وہ شاعری
کھا رہا تھا پہلے بھیجا، اب کلیجہ کھائے گا

کب تلک میں کام کرتا جاؤں گا تنخواہ پر
یا خدا، رشوت کا جلوہ کب مجھے دکھلائے گا

☆●☆

ہادی منزہ
نرمل

ٹھیک ہے

کرہا جو بد زبانی ٹھیک ہے
ایک حد تک بے ایمانی ٹھیک ہے

کام وہ آتی نہیں ہے آج کل
گو شرافت خاندانی ٹھیک ہے

پورے ستر سال تک پہنا اسے
شادی کی وہ شیروانی ٹھیک ہے

میں نے تو چھٹا لیا اسکو گلے
پڑگئی جو ناگہانی ٹھیک ہے

ساتھ تیرے رہنے سے جانِ جگر
گھپ اندھیری شب سہانی ٹھیک ہے

رانی جب تک تھی وہاں سب ٹھیک تھا
اب کہاں وہ راج دھانی ٹھیک ہے

میں نہ جاؤں گا کبھی اس طور پر
آنکھ کی ہی سرمہ دانی ٹھیک ہے

●☆●

فرید سحر
نرساپور

غزل

ہر کوئی بے زباں نہیں ہوتا
اور کوئی راز داں نہیں ہوتا

اونچے محلوں کی بات کرتے ہیں
جن کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

ہم سے دفتر میں آکے لڑتی ہیں
ان کا لڑنا کہاں نہیں ہوتا

سر منڈھاتے ہی اولے گرتے ہیں
اور کہیں سائیاں نہیں ہوتا

لے کے رشوت جو کام کرتے ہیں
ان کا جینا گراں نہیں ہوتا

دل تو جلتا ہے ان کی باتوں سے
پر کہیں بھی دھواں نہیں ہوتا

نوٹ تم بھی سحر یہ کرلینا
ہر کوئی پاسباں نہیں ہوتا

☆●☆

جمیل صدیقی بدایونی

کلرک

دفتر میں آفیسر اور چپراسی کے بیچ کی کڑی بابو یعنی کلرک ہوتا ہے۔ بلکہ کلرک ہی دفتر ہوتا ہے۔ افسر کے بغیر آفس ہوسکتا ہے لیکن کلرک کے بغیر آفس کا تصور ہی محال ہے۔ اس شخص کو افسر تسلیم کرنا مشکل ہے جس کے تحت ایک کلرک نہ ہوں۔ کہتے ہیں کہ انگریز نے اس مخلوق کو جنم دیا ہے۔ مگر یہ نظریہ سراسر لاعلمی پر مبنی ہے۔ انگریز کی ذہانت میں کوئی شبہ نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نے اپنے دور حکومت میں انتظامیہ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی تھی۔ بادشاہی عہد کے عہدہ داروں اور اہلکاروں کے نام اور کام میں معمولی سا ہیر پھیر کرکے اپنا کام چلایا تھا۔ صوبہ دار کو گورنر۔ فوجدار کو کمشنر۔ کوتوال کو ایس پی۔ قاضی کو جج اور تحصیلدار کو کلکٹر کردیا۔ داروغہ، تھانیدار اور چوکیدار تو اب تک بجنسہٖ دبی ہے۔ اس دور میں کلرک کو محرر کہا جاتا تھا۔

سب سے پہلے کائستھوں نے فارسی پڑھ کر تیل بیچنے کی بجائے دفتروں میں محرری کا معزز پیشہ اختیار کیا۔ اور اب وہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ "سو پشت سے ہے پیشہ آبا محرری" یہی وجہ تھی کہ بعض دفتر ان کی موروثی جائیداد معلوم ہوتے تھے۔ انگریز نے اس پیکر دانش بینش پر خصوصی توجہ دی اور کلرک کو ایک منفرد شخصیت میں ڈھال دیا۔ اگرچہ محرر بھی باقی رہے لیکن وہ وکیلوں کے دفتروں اور چنگی کی چوکیوں تک سمٹ کر رہ گئے۔

کلرک کا لفظی ترجمہ محرر ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کی معنویت کا احاطہ لفظ محرر سے ممکن نہیں۔ اسی لئے اردو میں اس لفظ کو من وعن اختیار کرلیا گیا ہے۔ عام بول چال میں کلرک کو بابو بھی کہتے ہیں۔ میرے خیال میں بابو اسکے تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر کہا گیا ہے۔ ویسے پرانی فلموں میں کسی گاؤں کی گوری کو کسی شہری بابو سے عشق کرتا دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکی حیثیت داستان حیات میں کسی ہیرو سے کم نہیں۔ دفتر میں وہی ہیرو ہوتا ہے۔ اسکے عناصر ترکیبی میں ماتحتی سے زیادہ افسری کا عنصر پایا جاتا ہے اس کا ناز و انداز، نشست و برخاست سبھی سے افسرانہ شان ٹپکتی ہے۔ سمجھ دار افسر ہمیشہ بابو کو راضی رکھتے ہیں۔ لیکن بہت سے ناسمجھ اور نوآموز اس سے الجھ پڑتے ہیں جس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ کسی دن بابو ان صاحب بہادر سے ان کے استعفیٰ پر دستخط کرا کے اعلیٰ افسران کے پاس بھیج دے اور پھر وہ ایک ایسے جھمیلے میں پھنس جائیں جس سے گلو خلاصی میں دانتوں پسینے آجائے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ افسر کے عتاب سے بابو بچ سکتا ہے لیکن بابو کے وار سے افسر نہیں بچ سکتا۔

ایک زمانے میں کلرک کو بڑی قابل رحم ہستی تصور کیا جاتا تھا۔ سردی ہو یا گرمی، بہار ہو یا خزاں کلرک ہر وقت فائلوں کے انبار میں گھرا رہتا تھا قلیل تنخواہ میں بال بچوں کا گزارا کرتا تھا۔ ترقی پسند ادب کے دور میں ایسی بہت سی دردناک نظمیں اور کہانیاں لکھی گئیں۔ جس میں اسکی بیچارگی اور غربت کی مبالغہ آمیز تصویر کشی کی گئی تھی۔ اور جسے پڑھ کر قارئین کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ لیکن اب وہ دن گئے کہ کلرک قلم گھسا کرتا تھا۔ اب تو دفتر میں آفسر فائلوں سے مغززنی کرتا نظر آتا ہے اور کلرک کسی قریبی ریسٹورنٹ میں لنچ لے رہا ہوتا ہے۔ ایک پرانے کلرک سے اس مسئلہ پر بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا "اجی صاحب کام تو مزدور کرتے

ہیں۔ ہم کوئی مزدور ہیں جو کام کریں"۔

ان ہی بابو جی کا ایک اور انداز بھی دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے پاس افسر کے دستخط ہوکر ڈھیروں کاغذات روزانہ آتے تھے۔ جسے وہ بڑی بے نیازی سے ایک ٹرے میں ڈالتے رہتے تھے۔ میں نے پوچھا بھائی صاحب ان میں کچھ ضروری کاغذات بھی ہوتے ہونگے جن پر فوری کاروائی کی ضرورت ہوگی اور آپ ہیں کہ بغیر پڑھے انھیں اس ٹرے میں ڈال دیتے ہیں" میرا سوال سن کر وہ بڑے پراسرار انداز میں مسکرائے اور بولے۔

"میاں ضروری کاغذ تو چاہے کتنا ہی نیچے دبا ہوا اپنے آپ اوپر آجاتا ہے"

"وہ کیسے"

"وہ ایسے کہ میرے پاس ڈاک کا ایک ڈھیر لگا رہتا ہے۔ اگر میں اس کو پڑھنے بیٹھ جاؤں تو سارا ٹائم اس میں گذر جائے گا۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے ہر کاغذ ارجنٹ لگنے لگے۔ اس لئے انھیں یونہی پڑا رہنے دیتا ہوں۔ جو بھی ارجنٹ کاغذ ہوگا۔ اسے افسر خود ہی مانگے گا۔ یا پھر ادھر ادھر سے کوئی سفارش آئے گی۔ بس اس ڈھیر میں سے اسے نکال کر ضروری کاروائی کر دونگا اللہ اللہ خیر سلا"۔

میں نے بڑی فراخ دلی سے ان کی دانشمندی کی داد دی کہ واقعی بابو ہو تو ایسا۔ لوگ کہتے ہیں کلرک، رشوت اور چائے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر یہ پچاس فیصد ہی درست ہے۔ بہت سے کلرک رشوت لیتے ہیں۔ مگر چائے نہیں پیتے بہت سے چائے بھی پیتے ہیں اور رشوت بھی لیتے ہیں۔ چائے بھی خالی خولی نہیں پی جاتی اسکے ساتھ کم از کم سموسوں اور رس گلوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان وازمات کے بغیر اگر آپ نے چائے پلائی تو آپ خوامخواہ اسکی عداوت مول لے لیں گے۔ ممکن ہے کہ اس کا قلم آپ کے کیس پر یسی گولی داغ دے کہ قصہ ہی تمام ہوجائے۔ شاید اسی سے متاثر ہوکر کسی دل جلے نے کہا ہے کہ بابو کا پیٹ صندوق اور قلم بندوق ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنا ہے کہ چائے صرف بابو کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پلائی جاتی ہے۔ رشوت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن بہت سے نا تجربہ کار لوگ چائے پانی کے اشارے کو صحیح طرح سمجھ نہیں پاتے اور رشوت کی رقم میں عایت طلب کرنے لگتے ہیں جسکی وجہ سے بلاوجہ کی بدمزگی پیدا ہوجاتی ہے۔ غالباً اسی لئے بابو صاحب اپنے شکار کو خود اپنی جیب خاص سے پہلے ہی چائے پلادیتے ہیں تاکہ مطلوبہ رقم میں کسی رعایت کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ دوسری طرف ان کا شکار بھی چائے پی کر اتنا زیر بار ہوجاتا ہے کہ رقم دیتے وقت کان تک نہیں ہلاتا۔

کلرک خدا کی وہ مخلوق ہے۔ جس کے دم سے کاروبار حکومت و تجارت بغیر کسی روک ٹوک کے نہایت خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ اب اسکی نسل معدوم ہونے والی ہے۔ کمپیوٹر کے روز افزوں چلن نے اسکی اہمیت کو بری طرح نقصان پہنچایا ہے۔ پہلے جو کام کلرکوں کی پوری ایک فوج انجام دیتی تھی اسکو کمپیوٹر کچھ گھنٹوں میں انجام دے دیتا ہے۔ اور اس طرح ان کی بقا کو سخت خطرہ لاحق ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کو بھی سرکاری تحفظ فراہم کیا جائے جس طرح بعض درندوں پرندوں کو فراہم کیا جاچکا ہے ورنہ اس نسل کا وجود ہی دفتروں سے مٹ جائے گا۔ ☆

مشتاق رضا
۱۰۳، پر بھوآلی بھیونڈی (تھانے)

ہم سایوں کے سائے

کہتے ہیں کہ نصف شب کوئی آفت ناگہانی خواہ آسمانی ہو یا سلطانی، نازل ہو تو اعزہ و اقربا، خیر خیریت لینے اس وقت پہنچتے ہیں جب سانپ نکل چکا ہوتا ہے۔ بے چارے آتے ہیں اور رشتہ داری کا بھرم رکھنے کے لیے لکیر پیٹتے ہیں۔ آنکھیں چار ہونے پر دل میں پیار امڈ آنے کے معاملے سے قطع نظر خون کے رشتے کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ کم از کم دو موقعوں پر دریائے محبت میں طغیانی آہی جاتی ہے۔ اگر کسی رشتہ دار کو دار فانی سے عالم جاودانی کا سفر درپیش ہو تب یا جائیداد کی تقسیم کا معاملہ طے ہونا ہو تب۔ کونے کھدرے سے محبت، اپنائیت اور قرابت داری کا دم بھرتے ہوئے کچے دھاگے سے بندھے کھنچے چلے آتے ہیں ورنہ عام حالات میں دن کے اجالے میں بھی پہچاننے سے کتراتے ہیں۔ ــــــ لیکن فرض شناس پڑوسی بھنک پڑتے ہی دافع بلا بن کر، فوج نصرت لیے آدھمکتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ شخص سب سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جسے مخلص، ہمدرد و فعال اور سرگرم پڑوسی میسر ہوں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اپنے آپ کو خوش نصیبوں میں لکھوائیں یا محرماں نصیبوں میں گنوائیں کیوں کہ ہم تو اکثر اپنے سرگرم پڑوسیوں کے ہاتھوں ان کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی سرگرمیوں کا نشانہ بنتے آئے ہیں۔ للہ، آپ ہماری بات کو کذب و افترا پر محمول نہ کریں یا اسے محض الزام تراشی اور بہتان کا نام نہ دیں۔ آخر میں ہمیں بھی خدا کو منہ دکھانا ہے۔ ہم اپنی بات کے جواز میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے پڑوسیوں کی مہربانیوں کی فہرست جو شیطان کی آنت کی طرح طویل اور ہمارے دعوے کی دلیل ہے بے کم و کاست پیش کر سکتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے غریب خانے کی کھڑکیوں کے شیشوں کی شکستگی جو غالب کے دل کی شکستگی کی طرح دیدنی ہے، سال خوردگی کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ اپنے مہربان پڑوسیوں کے لاڈلوں کی مشق نشانہ بازی اور فن بلہ بازی کے کمالات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ کبھی آپ نے غریب خانے کی چھت کہاں دیکھی ہے۔ پڑدادا مرحوم نے اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے درجات بلند کرے، آنگن میں جامن کا پیڑ لگوایا تھا تاکہ آنے والی نسلیں میٹھی میٹھی رسیلی جامنیں کھا کر ان کے حق میں دعائے مغفرت کریں مگر ہمارے کرم فرما پڑوسی مولوی صاحب کے جگر پاروں نے غلیل کے ذریعہ حصول جامن کی خاطر اس درخت پر اس کثرت سے سنگباری کی کہ جمرات کے مقام پر شیطان پر مارے گئے کنکر یاد آگئے۔ جامنوں سے ہماری موجودہ نسل محروم رہی، سو رہی لیکن باپ دادا کے وقتوں کی محو خواب چھت کی آنکھیں کھل گئیں اور نہ صرف کھلیں بلکہ کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کچھ مولوی صاحب کے جگر پاروں کی بیہ دلیری پر کچھ ہماری حد سے بڑھی ہوئی مصلحت کوشی پر جس نے ہمیں انتہائی بزدل اور ڈرپوک بنا دیا ہے۔ بہر طور جب پر خلوص نماز استسقا اور عاجزانہ دعاؤں کے طفیل روٹھے ہوئے موسم برشگال نے آنکھیں دکھائیں تو وہ آنکھیں زار و قطار رو پڑیں اور ہم اپنے اہل و عیال اور مال و منال کے ساتھ ان آنسوؤں میں گلے گلے نہ سہی کمر کمر ڈوب گئے۔ یہاں مال و منال کا تذکرہ اتنا ہی غیر ضروری ہے جتنا ہندوستان کی معیشت پر تبصرہ۔ وہ آنکھیں آج بھی کھلی ہیں اور اپنی قسمت کو روتی ہیں۔ اندھے کے آگے روئیے اور اپنے نین کھوئیے

کے مصداق ہم نے انتہائی خاکسارانہ شکایتی لہجے میں مولوی صاحب کی توجہ ان کے صاحبزادوں کی چاند ماری کی جانب مبذول کرانے کی دشش کی تو پہلے مولوی صاحب نے تبسم فرمایا جسے ہم کوئی معنی نہ پہنا سکے پھر بڑے ناصحانہ انداز میں گویا ہوئے : " عقل مند وہ ہوتا ہے جو برسات سے پہلے چھت کی مرمت کروالیتا ہے ۔" اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہماری پچھلی سات پشتوں میں کوئی عقلمند پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ ہی آنے والی سات پشتوں میں اس کے امکانات ہیں ۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے ۔ قدرے توقف کے بعد واعظانہ نداز تخاطب اختیار کرتے ہوئے فرمانے لگے : " حضور ! ابھی بچے ہیں ، نادان ہیں ۔ درگزر سے کام لینا چاہئے ۔ کیا نہیں جانتے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بچوں کو خدا کے باغ کے پھول کہا ہے ۔" ہم سمجھ گئے کہ : مدعا عنقا ہے اپنی عالم تقریر کا ....

ہمیں ان کے پند و نصائح سے بھلا کیا سروکار تھا ۔ قہر درویش ، بر جان درویش ۔ دامِ شنیدن کو سمیٹ لینے ہی میں عافیت سمجھی ۔

ہمارے ایک اور کرم فرما ہیں جن کے دولت کدے کا فاصلہ ناچیز کے غریب خانے سے تین فٹ کا اور باورچی خانے سے ڈھائی فٹ کا ہے ۔ جب کبھی ان کے گھر کدو یا گاجر کا حلوہ پکایا جاتا ہے وہ صاحب ہم سے کدو کش مستعار لے جاتے ہیں کبھی حد سے لزر کر شکر اور گھی کا بھی مطالبہ کر بیٹھتے ہیں اور جب حلوہ پک رہا ہوتا ہے اپنے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ تازہ تازہ گرما گرم حلوے سے اٹھنے والی اشتہا آور خوشبو ہمارے صبر کا امتحان لے اور لذت کام و دہن سے آشنا ہمارا دلِ ناداں آس لگائے بیٹھے کہ حلوہ بطور سوغات اب آیا تب آیا مگر ہماری حسرتوں پر اوس اس وقت پڑتی ہے جب ان کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہو جاتے ہیں اور برتنوں کے کھنکنے کی صدائیں ہمارے کانوں میں گونجنے لگتی ہیں ۔ یہ وقت ان کے پروسنے اور کھانے کا ہوتا ہے اور ہمارا خونِ جگر پینے کا ۔ سارا حلوہ ڈکار لینے کے بعد جب کبھی آنکھیں چار ہوتی ہیں تو بڑی لجاجت سے گویا ہوتے ہیں آپ کو حلوہ بھجوانا تھا مگر کیا کریں آپ کی پھوہڑ بھابھی صاحبہ کے ہاتھوں بگڑ گیا ۔ فقرہ " بگڑ گیا " کی ادائیگی وہ کافی منہ بگاڑ کر کرتے ہیں پھر ہمارا شانہ دبا کر امیر خسرو کے دوہے کا خون کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ حلوہ پکایا جتن سے چرخا دیا چلا ۔ آنچ ہو گئی تیز جل گیا جلوہ لا پانی پلا ۔ اتنا کہہ کر فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے تالی مارنے کے لئے ہاتھ بلند کرتے ہیں اور ہم ارادی طور پر اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھاتے ہیں کیوں کہ تب تک ہمارے اندر کی آگ دہک چکی ہوتی ہے ۔ قدرے کھردرے لہجے میں کہتے ہیں ۔ " آپ اپنے اسٹوو کا برنر بدلوا کیوں نہیں لیتے ؟ " وہ بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں " نہیں برنر میں کوئی خرابی نہیں ہے البتہ ناب کچھ ڈھیلی ہو گئی ہے " ۔

بغل کے مکان میں ایک صاحب رہتے ہیں جن کا شمار ہمارے مہربان پڑوسیوں میں ہوتا ہے ۔ ہمارے مکان کی ہماری بغلی گلی پر ان کا قبضہ و تصرف ہے ۔ مجال کیا جو ہم اپنی کھڑکی سے ایک تنکا بھی ادھر گرادیں ۔ شکوہ و شکایت کے پٹارے کھل جاتے ہیں ۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ انہوں نے بڑے بابرکت پیشے کو اپنا رکھا ہے ۔ درجن بھر سے زائد بکریاں پال رکھی ہیں ۔ جن میں ہر سال پانچ چھ بکریوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ بہ الفاظ دیگر ہماری گلی کو انہوں نے اچھا خاصہ بکریوں کا میٹرنیٹی ہوم بنا رکھا ہے ۔ صاحب بکریاں پالی تو انہوں نے ہیں ، لیکن ان کی پرورش و پرداخت پاس پڑوس کے لوگوں کی مہربانیوں کی مرہونِ منت ہے جو باسی بھات ، پھپھوند لگی روٹیوں ، ترکاریوں اور پھلوں کے چھلکوں سے ہر آئے دن ان کی ضیافت کرتے ہیں اور وہ صاحب بکریوں کی کفالت سے بے نیاز فقط ان کا دودھ دوہنے اور دودھ پر جمی ہوئی بالائی اڑانے کو ہی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں ۔ ایک کمرے پر مشتمل اپنے چھوٹے سے کھولی نما مکان میں اپنے نصف درجن بچوں کے ساتھ رہنا بجائے خود ایک مسئلہ ہے ۔ اس پر بے شمار بکریاں ۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا ہے کہ ان بکریوں کو وہ گلی ہی میں رکھتے ہیں اور ان کے گلوں کی رسیاں یا تو ہماری کھڑکی کی سلاخوں سے باندھتے ہیں یا گلی سے گزرنے والے ہمارے پانی کے پائپ سے ۔ مینگنیوں اور پیشاب کی بدبو اور دن رات کی میں میں یا پھر بکریوں کی بو سونگھتے ہوئے آنے والے آوارہ بکرے کی

صدائے بدتمیزی ہمارا مقدر بن چکی ہے ۔ بکریوں کی خرمستیاں جب رنگ لاتی ہیں تو اکثر ہمارے پانی کے پائپ کے جوڑ کھل جاتے ہیں اور پانی کا فوارہ سارے گلیارے کو جل تھل کردیتا ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم پر بے توجہی اور لاپرواہی کا الزام تھوپ کر آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے اپنی بکریوں کی تکلیف کے پیش نظر پائپ کی مرمت کی ہمیں تلقین کی جاتی ہے اور چار و ناچار ہمیں اپنے روزمرہ کی مدوں میں سے کسی نہ کسی طرح کٹوتی کر کے مرمت کے غیر ضروری اور غیر متوقع اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں ۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ کسی روز رات کے اندھیرے میں چپکے سے ساری بکریوں کے رسے کاٹ کر انہیں ہانک دیں مگر دوسرے دن چھڑنے والی مہا بھارت کے لئے ہمت کہاں سے جٹائیں اس لئے صرف رامائن ہی پر اکتفا کرتے ہیں ۔ اللہ تعالی نے ہمیں اتنا صبر جمیل تو عطا کیا ہی ہے کہ صرف مینگنیوں کی بدبو اور پائپ کی مرمت کے اخراجات برداشت کرنے کی حد تک معاملہ ہوتا تو ہم حرف شکایت زبان پر نہ لاتے مگر وہ شریر بکریاں ہمارے دروازے پر پڑے پردے تک چبا ڈالتی ہیں ۔ ارے صاحب ایک دن تو ایک سرکش بکری نے ہماری نصف بہتر جو ہمیشہ نصف ہی بہتر ثابت ہوئی ہیں ان کی نئی ساڑی کا ایسا بگٹا بھرا کہ ایک کونہ ہی ندارد کر دیا ۔ ان صاحب کا ایک کرم اور گنوا دیں تاکہ ان کی کرم فرمائیوں کی فہرست مکمل نہ سہی قدرے طویل ہوجائے ۔ انہوں نے ہمارے مکان کی کثیر المقاصد و کثیر المصارف گلی والی دیوار کو بھی نہیں بخشا ہے ۔ بالخصوص قربانی کا گوشت سکھانے اور بالعموم کپڑے سکھانے کے لئے کیلیں ٹھونک کر رسیاں تان رکھی ہیں ۔ ان کیلوں پر کبھی کبھی مرغیاں ڈھانکنے کی ٹوکریاں بھی لٹکائی جاتی ہیں اور ہم اس تزئین کاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہیں ۔۔

دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

دائیں جانب ایک اور صاحب رہتے ہیں جن کے جینس کلچر کے جینس زدہ بچے انگریزی دھنوں کے رسیا ہیں وہ اکثر ٹیپ ریکارڈر پر اونچی لے پر کم سپٹمبر کی دھنیں سنا کرتے ہیں اور ہم اپنی بے بسی پر سر پیٹتے ہیں کیوں کہ رعشہ کے باعث ہمارے لرزتے جسم اور بے تال قدموں پر تھرکنے کا گمان ہوتا ہے اور دیکھنے والے ہمارے بارے میں مزید غلط رائے قائم کرتے ہیں مزید غلط اس لئے کہ صحیح رائے آج تک کسی نے قائم ہی نہیں کی ہے ۔ ایک دن تو غضب ہی ہوگیا ۔ خوش الحان موذن کی صدائے اللہ اکبر کانوں میں گونجی ہمیں لگا شاید بانگی بدل گیا ہے ۔ کیوں ہماری مسجد کا بانگی کافی بے سرا ہے ۔ ان دنوں ہم خرابی صحت کا شکار تھے اس لئے نماز کی ادائیگی گھر ہی پر کرلیا کرتے تھے ۔ ہم نے گرم پانی سے وضو کیا اور مصلیٰ بچھا کر کھڑے ہوگئے ۔ مشکل سے دو رکعتیں ہوئی تھیں کہ "اماں دیکھ تیرا منڈا بگڑا جائے" کی مسلسل تکرار حس سماعت سے ٹکرائی حالت نماز میں غیر ارادی طور پر زبان سے نکل گیا "لاحول و لاقوت ...." نماز جاتی رہی اور پھر ارادی طور پر ناشائستہ کلمات بحالت غیض نکل گئے آواز بلند تھی اس لئے گھر کے افراد چونک پڑے ۔ پھر پتا چلا کہ وہ اذان تو پڑوس میں پاکستان ٹی وی پر ہورہی تھی پھر شاید چینل بدل گیا تھا ۔ ہم نے گھڑی پر نظر ڈالی زوال کا وقت ہو چلا تھا ۔

ایک مرتبہ تو ماہ رمضان میں ٹی وی کی اذان پر ہم نے افطار کرلیا تھا ۔ پتہ نہیں یہ گناہ کس کے سر جائے گا لیکن اس دن سے ہم نے ٹھان لی ہے کہ پاس پڑوس کی آوازوں پر بالکل کان نہیں دھریں گے خواہ وہ کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہوں اور بنا تصدیق کیے کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے ۔ ہمارے غریب خانے کی مشرقی گلی سے جو ہماری گزر گاہ ہے ۔ متصل ایک دو منزلہ مکان ہے دوسرے منزلے پر جو صاحب رہتے ہیں وہ ہمارے ہوائی پڑوسی ہیں وہ ذرا شوقین قسم کے آدمی ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کا شوق گلی سے گزرنے والوں کے جی کا روگ ہے ۔ انہوں نے گلی کی سمت کھلنے والی کھڑکیوں میں بیل بوٹوں اور پھول پودوں کی نرسری آراستہ کر رکھی ہے وہ وقت بے وقت جب ان کا جی چاہتا ہے پودوں کی آبیاری کرتے رہتے ہیں اور ہمیں بن بادل برسات کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک دو بار ہم نے ان سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا تو انہوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے پانی پاک ہوتا

ہے"۔ پانی کی پاکی سے ہمیں بھی انکار نہیں ہے مگر ان کے ارادے کی ناپاکی تو ہمارے صبر و تحمل پر کاری وار ہے۔ اب ہم ہر موسم میں گلی سے گزرتے ہوئے بادلِ نخواستہ سر پہ چھتری تان لیتے ہیں۔

گراونڈ فلور پر رہنے والے ہمارے زمینی پڑوسی ذرا سوجھ بوجھ والے اور شاید پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لئے خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کا ثبوت ہر دوسرے تیسرے روز پیش کرتے رہتے ہیں یہ اور بات ہے مگر گلی کوچوں اور بسا اوقات سڑکوں پر بکھرے ہوئے ان گنت ثبوتوں کے باوجود ہمارے ملک میں آبادی کا تناسب ہے کہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہورہا ہو کہ ہمارے ملک کی اس سائیکلوجی کوانٹی ٹی کو کوالیٹی پر ترجیح دیتی ہو یا پھر یہ کہ اس سے ہٹ کر یا اس سے بڑھ کر ان کے نزدیک کوئی اور تفریح نہ ہو۔ یہ ہر حال کئی بار ہم نے سوچا کہ اس بھلے آدمی کو اس غیر شریفانہ بلکہ سوقیانہ حرکت کے ارتکاب سے باز رکھیں لیکن افسوس کہ ہماری سوچ ان کے عمل سے کہیں زیادہ عریاں ثابت ہوئی کیوں کہ ہم اسے کبھی عملی جامہ پہنا نہ سکے اور یہ شعر ہماری ذہنی کیفیت کا آئینہ دار بن گیا۔

حال دل ان کو کہہ کے جب لوٹے
ان کو کہنے کی بات یاد آئی

ہمارے جملہ پڑوسیوں کی ایک اجتماعی مہربانی یہ ہے کہ وہ اپنے نصف ایمان کی سلامتی کے لئے گھر کا سارا کوڑا کرکٹ بشمول گوشت کے چیتھڑے، مچھلیوں کے پیٹ سے برآمد ہونے والی آلائش، مرے ہوئے یا مارے ہوئے چوہے، سبزی ترکاریوں اور پھلوں کے چھلکے ناچیز کے غریب خانے کے سامنے ڈھیر کردیتے ہیں۔ جسے بطخیں، مرغیاں، بلیاں اور کتے کرید کرید کر اس قدر پھیلادیتے ہیں کہ ہمارا تو ہمارا باہر آنے جانے والے کا ناطقہ بند ہوجاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ نا اہل بلدیہ کے ناکارہ ڈرینج چیمبر سے ابلتا ہوا بدبودار پانی اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ الاماں الاماں..... ایک مرتبہ ہمارے دفتر کے ایک صاحب بصد اشتیاق ہمارے مہمان ہوئے جب انہیں ناک پر رومال رکھ کر اور قدم پھونک پھونک کر اس پل صراط سے گزرنا پڑا تو ان کی طبع نازک منغص ہوگئی۔ کہنے لگے یار میں تو سمجھتا تھا کہ تم کسی پوش کالونی میں رہتے ہوگے مجھے کیا پتہ تھا کہ تم کسی مسلم محلے میں رہتے ہو! ہم بے چارگی سے مسکرادیے۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمارے سیکولر نظام میں انقطاعت ہوتے ہوئے بھی کسی پوش کالونی میں رہنے کا بھگتان کیا ہوسکتا ہے۔ ہاں ہمارے پڑوسیوں کی اس تحریک تحفظ نصف ایمان سے ایک فائدہ ہمیں ضرور ہوا ہے کہ ہماری شناخت قائم ہوگئی ہے اب ہمیں اپنے دروازے پر نام کی تختی لگانے کی ضرورت نہیں رہی ہے کیوں کہ یار لوگ غلاظت کے ڈھیر ہی سے اندازہ لگالیتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ ناچیز کی رہائش گاہ ہے۔

ہم اپنے نامہ اعمال میں گناہ اور پڑوسیوں کے نامہ اعمال میں ثواب کے اضافے کے اندیشے سے اپنے دامن اور بند قبا کو ملحوظ رکھتے ہوئے پاکئ داماں کی حکایت کو مختصر کیے دیتے ہیں لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ دو عدد پیاز، ایک عدد آلو، تھوڑا سا ہرا دھنیا، کٹوری بھر تیل، مٹھی بھر چاول، ڈبہ بھر آٹا، چند جوئے لسن وغیرہ مستعار لینا اور لے کر بھول جانا تو پڑوسیوں کا روزمرہ کا معمول ہوتا ہے۔ ان تقاضوں کی تکمیل سے ہم گھبراتے بھی نہیں ہیں لیکن جب نیا کیمرہ، شادی منگنی یا کسی تقریب میں جانے کے لیے بیگم صاحبہ کی نئی ساڑی، منے کی جوتی، بے بی کا فراک، یا اسکوٹر کی چابی دینے میں ہم ذرا سی آنا کانی کریں یا دو قدم بڑھ کر قیل و قال کریں تو قرآن و حدیث کے حوالے سے ہمیں پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی کی تلقین کی جاتی ہے اور ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ امت مرحومہ میں شمولیت کے لیے یہ سب کچھ ناگزیر ہے اور پھر فہمائش کی جاتی ہے کہ بصورت دیگر ہمیں خارج از امت بلکہ خارج از اسلام سمجھا جاسکتا ہے۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ دنیا میں اگر سبھی اپنے فرائض کی تکمیل سے چشم پوشی کر کے اپنے حقوق ہی کا تقاضہ کریں تو کیا فرائض کی تکمیل کے لیے ایک ہم ہی رہ گئے ہیں؟ ☆

جہاں قدر چغتائی
بھوپال

سیاست ہم کہاں سمجھے

سنو صاحب! ہم ٹھہرے کمزور قلمی آدمی۔ اگر جاندار ہوتے تو تلوار کا دھنی بن کر دکھا دیتے۔ پہلے دن جو ٹیڑھے کا قلم ہاتھ میں اٹھایا تو پھر وہ ہاتھ سے نہ جاسکا۔ قلم چلاتے ہیں، آدھی روٹی کھاتے ہیں، تو ہم کو ملک کی سیاست سے لینا دینا کیا۔ ہم تو میر کی طرح رات کو رو رو کر صبح اور صبح کو جوں توں شام کرتے رہے لہٰذا ہم کو ملک کے سیاہ و سفید سے کام رہا نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارا ملک ہم پر سیاست کرتا رہا ہے۔ پاس پڑوس کے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں، پکڑ پکڑ کر لے جاتے ہیں اور ہمارے نام کا پرچہ ایک ڈبے میں پچاس سال سے برابر ڈلواتے آتے ہیں۔ ہم پر نصف صدی سے یہ سیاست ہو رہی ہے مگر ہم کو سیاست کرنا پھر بھی نہیں آیا۔ دو چیزیں عمر بھر ہماری سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔ ایک تو بیوی، دوسرے ملک کی سیاست۔ بیوی جس کے ساتھ عمر بھر رہے دوسری سیاست جس کے درمیان بھی اتنے ہی عرصے رہے جبکہ ہمیں چاند کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ بھی ہماری زمین کی طرح مٹی کا ڈھیر ہے جس کی اوبڑ کھابڑ سطح پر برف سی جمی رہتی ہے جو کانچ کی طرح چمکتی ہے اسی طرح مریخ سیارے کی زمین پر جب گلاب کھلتے ہیں تو اس کی روشنی ہم کو سرخ نظر آتی ہے اور جب نیلوفر کے پھول کھلتے ہیں تو ہم کو مریخ آسمانی رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ ہم کو اس بات کا علم ہے کہ یہ جھلسا دینے والا سورج ایک ٹمٹماتا ستارہ ہے جو نہ چلتا ہے نہ پھرتا ہے۔ نہ ڈوبتا ہے نہ نکلتا ہے۔ وہ تو ہم ہیں جو زمین پر ہونے کی وجہ سے صبح کو نکلتے اور شام کو ڈوبتے رہتے ہیں۔ یہ سب باتیں تو ہم جانتے ہیں مگر نہیں جانتے وہ دو باتیں جن کو ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ ہمارے نزدیک ذہین ترین آدمی صرف وہ ہی ہوگا جو کچھ بھی نہ جانتا ہو مگر ان دو باتوں کی پوری پوری واقفیت رکھتا ہو۔ ورنہ ہم سب احمق۔ بھائی! بھائی، نہ کوئی ہندو، نہ عیسائی۔ آدمی کو قدرت نے ایک ایسی صلاحیت بھی دے رکھی ہے جس کی مدد سے وہ غلطیاں کرکے خود بخود درست ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم بھی سمجھدار بن جانے کی کوشش میں احمقانہ کام کرتے رہے ہیں۔

آج کا ہندوستان ایک عجیب و غریب قسم کی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ ایسا برا وقت دنیا میں شاید کسی ملک پر کبھی آیا ہو کہ سیاستداں سیاست بھول گئے ہوں۔ محبت اور سیاست میں اس حد تک یکسانیت ہے کہ ان دونوں میں ہر بات جائز ہوتی ہے دنیا کی تاریخ میں صرف ایک مثال ملتی ہے جب لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے۔ اس بات کا ثبوت فارسی شاعر کے اس شعر میں موجود ہے۔ شہر دمشق میں ایک بار ایسا قحط پڑا تھا کہ لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

دمشق کے بعد دوسرا سیاسی قحط ہندوستان میں پڑا ہے شاید کہ۔ فراموش کردند یاراں سیاست۔ یہاں تین بڑے واقف اور عاقل سیاست داں نادانی کرکے میدان سیاست چھوڑ گئے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ایک عاقل خان نام کے ملازم بادشاہ کی ملازمت چھوڑ

گئے تھے ۔ زیب النساء بنت اورنگ زیب کی ملازمہ نے یہ خبر زیب النساء کو دی ۔ اس نے کہا ۔

شنیدم ترک خدمت کرد عاقل خاں بنادانی

زیب النساء ان الفاظ میں افسوس کرکے چپ ہورہی ۔

چرا کار کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

دنیا میں آٹھ بڑے تھے (G.8) ۔ ہندوستان میں تین بڑے (G.3) بن گئے یہ بات کہ گر

نہیں ہو جو یہاں پیدا ہمارا رہنما کیوں ہو

اور یہ بات ملک میں اکثر لوگوں کو بڑی ناگوار گزری ہے ۔ مگر ناگوار کیوں گزری ۔ سو سال جس ملک کے انگریز کی غلامی میں گزرے ہوں ان لوگوں کو یورپ والوں سے یوں ناخوش نہیں ہوجانا چاہیئے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ ۔۔ زمین اپنی ہے سب ان کا ۔ ارے بھئی جب ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ہم دعوت دے کر بلا رہے ہیں اور ان کو ملک کے سبز باغ دکھا رہے ہیں تو ایک ہمدرد خاتون برداشت کرنا کیوں گراں گزرے جس خاتون نے ہیموگلوبن کم ہوجانے پر پارٹی کو اپنا خون عطیئے کے طور پر دیا ہو ۔ سمجھنا تو بہت چاہا سیاست پر نہیں سمجھے ! ۔☆

☆●☆●☆●☆●☆●☆●

غیر ملکی

نوح ناروی کسی مشاعرہ میں جب غزل پڑھ کر خوب داد حاصل کر چکے تو ایک مشہور حاکم جو مشاعرہ کے صدر بھی تھے ان سے کہنے لگے ۔

"حیرت ہے نوح صاحب! آپ غیر ملکی ہو کر اردو زبان میں ایسے اچھے شعر کہہ لیتے ہیں ؟"

"غیر ملکی ..... ؟

نوح صاحب پریشان ہو کر ان کا منھ دیکھنے لگے ۔

"جی ہاں ..... نوح ناروی ہیں نا آپ ؟ ناروی یعنی ناروے کے رہنے والے " ۔

کھلاڑی

کسی مشاعرہ میں ایک نوجوان شاعر غزل پڑھ رہے تھے ، جس کی زمین تھی ۔

نظاروں سے کھیلا ●☆● بہاروں سے کھیلا

غزل سننے کے بعد مجاز نے کہا :

"ویل پلیڈ (Well played) مسٹر !"

سگِ لیلیٰ (اٹھارویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی

مایوسیوں کے کتے

درِ محبوب کے اصلی "اڈیشن" کی ظاہری آن بان اور شان کو دیکھ کر ہم اسی طرح وقتی طور پر بت بن گئے تھے جس طرح قصے کہانیوں والے بھولے بھٹکے شہزادے طلسماتی نگری، میں قدم رکھتے ہی پتھر کے بت بن جایا کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے درِ محبوب کی شان میں کچھ یوں قصیدہ پڑھا۔ دیگر بنگلوں کے بیچ یہ نیلا بنگلہ یوں سب سے الگ سب سے مختلف سب سے نمایاں نظر آرہا ہے جیسے مریل، خارش زدہ کستری، کتوں کے بیچ کوئی تندرست و توانا ولائتی کتا ۔۔" تعریف و توصیف کے باب میں بھی موصوف اپنے چہیتے موضوع، کو لے آئے ۔۔

اس وقت رات کے کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا لیکن جس رہائشی علاقے میں محبوبۂ دلنواز کا دولت خانہ واقع تھا وہاں وقت سے پہلے نیند کا غلبہ طاری ہوجاتا ہے یا کم سے کم لوگ نرم گرم بستروں میں لمبے لمبے لیٹ ضرور جاتے ہیں اور جنھیں لیٹنے کے باوجود نیند نہیں آتی وہ اپنے کالے دھن کو سفید اور سفید دھن کو کالا کرنے اور انکم ٹیکس و ویلتھ ٹیکس کو بچانے کے طریقے اور ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کے متوسط اور نچلے طبقے کے رہائشی علاقوں میں رات کا اگر پہلا پہر ہو تو امرا اور رؤساء کے علاقے میں خاموشی اور سناٹے کا یہ عالم ہوتا ہے جیسے رات کا پچھلا پہر ہو ۔۔ چنانچہ آغاپورہ سات قندیل والا علاقہ اسوقت ایک دم سنسان تھا دور دور تک ایک بھی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا سوائے ہم دونوں دو پایوں کے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود درِ جاناں کے پھاٹک کی طرف بڑھ گئے ۔

پھاٹک غالباً اندر سے بند تھا اور کمپاؤنڈ کی دیواریں کم از کم اتنی اونچی ضرور تھیں کہ ہم اپنے اونچے قد کے باوجود پنجوں پر بھی کھڑے ہوجاتے تب بھی اندرونی کوائف، کی خبر نہیں لاسکتے تھے ہم نے مایوس کن لہجے میں کہا ۔ پھاٹک اندر سے بند ہے چار دیواری بھی کافی اونچی ہے ' اب یہ پتہ چلے تو کیسے کہ اندر سگ لیلیٰ موجود ہے یا نہیں ۔؟"

گھبراؤ مت نوجوان ۔۔ ' موصوف نے ہمیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا ۔۔ 'اسوقت تم کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کیساتھ نہیں ڈاکٹر ڈی ۔ ڈی کتا والا کے ساتھ ہو جس سے کتوں کی نانی بھی پانی مانگتی ہے ' میں فضا میں سونگھ کر کتوں کی موجودگی کے بارے میں حتمی طور پر بتا سکتا ہوں ۔۔!"

ہم نے فوراً چاپلوسی کے مکھن میں ڈبو کر لقمہ دیا ۔۔ 'اسی لیے تو میں نے اس روئے زمین پر آپ کو ہی امید کی آخری کرن مانا ہے ۔ فی الحال آپ کی قوت شامہ کیا کہتی ہے ؟ اندر از قسم کتا کوئی چیز پائی جاتی ہے ؟ ۔۔ "ہمارے استفسار پر موصوف نے اپنی ناک کے نتھنے پھلا کر ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی پھر بڑے ہی تیقن آمیز لہجے میں بولے ۔ 'اندر یقیناً ایک عدد کتا موجود ہے ' البتہ اس کی جنس کے بارے میں فوراً کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ '' اتنا کہہ کر موصوف کسی سوچ میں پڑ گئے پھر کچھ ہی لمحوں میں شاید خود بخود کسی نتیجے پر بھی پہنچ گئے چنانچہ ارشاد فرمایا ۔ 'اسکی جنس کے بارے میں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے ' تم ذرا آس پاس نظر رکھو ۔۔ ''

ہمارے ذمہ چوکیداری کے فرائض تفویض کرکے موصوف پھر بند پھاٹک کی طرف متوجہ ہوگئے ۔

ہم پوری مستعدی سے سناٹے میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگے ۔ کچھ توقف کے بعد اچانک کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بلند ہوئی ۔ پہلے ہمیں یہ گمان ہوا کہ یہ طرحی مصرعہ اندر سے سگ محبوب نے عرض کیا ہے لیکن جب ڈاکٹر صاحب پر نظر پڑی تو یہ گمان خود بخود غلط ثابت ہوگیا ۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب منہ بنا کر مصرعہ ثانی عرض کرکے شعر مکمل فرمارہے تھے ۔ ہم نے گڑبڑا کر کہا ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں ۔۔۔ ؟"

بولے : مشق سخن فرمارہا ہوں ۔۔ !"

ہڑبڑا کر کہا : اتنی رات کو ۔۔ ؟ وہ بھی اس طرح کتے کی آواز میں ۔۔ ؟

بولے : ڈاکٹر میں ہوں یا تم ۔۔ ؟

عرض کیا : ڈاکٹر تو آپ ہی ہیں مگر ۔۔۔ "

ہماری بات کاٹ کر بولے : مگر وگر کچھ نہیں میں جو کچھ کر رہا ہوں چپ چاپ دیکھتے جاؤ میرے عرض کیے ہوئے طرحی مصرعوں میں سے کسی ایک پر ادھر سے گرہ ضرور لگنی چاہیئے ۔۔ !!! اتنا کہہ کر موصوف پھر سے بھونکنے لگے ۔ البتہ اس بار ان کی پکار میں کچھ زیادہ ہی نخرہ تھا کچھ زیادہ ہی تڑپ تھی ۔ اور ابھی اس تڑپتی ہوئی نخریلی پکار کی بازگشت پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ادھر سے یعنی پھاٹک کے اس طرف سے جواب میں بڑی ہی کرخت اور پختہ آواز بلند ہوئی جسکی گھن گرج میں یہ موازنہ کرنا مشکل تھا کہ آواز میں گھن زیادہ ہے یا گرج ۔ بالفاظ دیگر ڈاکٹر صاحب نے جس قدر مہین اور سریلی بھونک ارشاد فرمائی تھی جواب میں اتنی ہی گلا پھاڑ ، بھونک سنائی دی جس نے ہمارے کان کے پردوں کے ساتھ بڑا ہی چیر پھاڑ والا سلوک کیا ۔ گویا یوں لگا جیسے مصور غم میر تقی میر کی پر درد غزل ، کے جواب میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنی کوئی پر جوش نظم پڑھنا شروع کردی ۔۔ اس سے ہماری اس وقتی خوش فہمی " کا قلع قمع ہوگیا جسکے ماتحت ہم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ ہماری محبوبہ آج کی نوے فیصد ماڈرن حسیناؤں سے کم از کم ان معنوں میں الگ ہے جو عاشقوں سے زیادہ کتے پالتی ہیں ۔۔۔ ہماری محبوبہ دلنواز تو ان ماڈرن حسیناؤں سے بھی دو جوتے آگے نکلی کہ اس کا چہیتا کتا اندر گھر کی چار دیواری میں مزے کر رہا تھا اور چاہنے والا باہر فٹ پاتھ پر خوار ہو رہا تھا ۔۔۔ !!

ڈاکٹر ڈی ۔ ڈی کتا والا کتے کی آواز نکال کر سگ محبوب کو جو کہ اصلاً نسلاً کتا تھا چکمہ دینے میں کامیاب ہوچکے تھے ۔ چنانچہ موصوف کے طرحی مصرعہ پر ادھر سے جیسے ہی گرہ لگی آنجناب مارے خوشی کے چہکنے لگے ۔۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ کتا ہی ہوگا میرا تجربہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا ۔ اوپر والے نے ہر جنس میں جوڑے اسی لیے بنائے ہیں کہ نر مادہ کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاتے ۔ تم نے بھی نوٹس کیا ہوگا کہ میری پہلی اور دوسری پکار کی طرف تمہاری محبوبہ کے کتے نے کوئی دھیان نہیں دیا لیکن تیسری پکار کا فوراً یعنی کہ ایکسپریس ڈیلیوری ، جواب دے ڈالا ۔ جانتے ہو کیوں ۔۔ ؟" موصوف کے سوال پر ہم مجسم حیرت بن گئے ۔ چنانچہ موصوف نے خود ہی جواب دے ڈالا ۔۔ پہلی اور دوسری پکار کے معاملے میں میں نے نر کتوں کی نقل اتاری جس کا ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا کیونکہ اندر والا کتا یقیناً ایک شکاری قسم کا امپورٹیڈ کتا ہے جو سڑک چھاپ کتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا ، بالکل ان جغادری شاعروں کی طرح جو کسی چھوٹے موٹے مقامی شاعر کے مصرعے پر گرہ لگانا کسر شان سمجھتے ہیں لیکن جب تیسری بار میں نے کتیا کی اس آواز کی نقل اتاری جسے سن کر نر کتوں کے جسم میں برقی ترنگیں دوڑنے لگتی ہیں ۔ چنانچہ تم نے بھی سنا کہ اس پکار کا فوراً جواب دیا گیا ۔۔ !! موصوف اپنے تجزیئے پر خود جھومنے لگے اور ہماری حیرتوں میں اضافہ ہوتا رہا ۔ آگے بولے ۔۔۔ جب پہلی بار تم نے اپنی محبوبہ کے کتے کے بارے میں

مجھے بتایا تب ہی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ نر ہی ہوگا تم نے بھی اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ معاملہ چاہے محبوب کے انتخاب کا ہو، شوہر کے انتخاب کا یا کتے کے انتخاب کا صنف نازک ہمیشہ مخالف جنس میں دلچسپی لیتی ہے۔ ہاہاہا۔ ہاؤ ہاؤ ہاؤ۔۔۔!!! بڑی دیر بعد موصوف نے اپنا کتا چھاپ قہقہہ لگایا تھا اس لیے ہم نے کوئی مداخلت نہیں کی، انہیں جی بھر کر ہنسنے کا موقع دیا پھر جیسے ہی ان کی ہنسی تھمی، ہم دوبارہ اپنے مقصد کی طرف آگئے۔۔ ڈاکٹر صاحب اب تو در جاناں میں کتے کی موجودگی کا بھی علم ہوگیا اسکی اس کی جنس کا بھی تعین ہوگیا۔ میرے خیال میں اب آپ کے ذہن میں میرے گمبھیر مسئلے کا مطلع بھی بالکل صاف ہوگیا ہوگا۔۔"

جناب من اتنی عجلت پسندی اچھی نہیں۔۔" موصوف نے جواباً نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور مزید بولے۔۔ یہ سچ ہے کہ کتے کی جنس کا تعین ہوگیا لیکن جب تک میں اسے بہ نفس نفیس دیکھ نہیں لوں گا تب تک اس سلسلے میں کوئی مشورہ دے کر کسی بھی قسم کی رسک (risk) لینا نہیں چاہتا۔ کیونکہ تمہارا کیس بہت گنجلک اور پیچیدہ ہے کتوں سے تمہیں جو خوف ہے وہ کرانک (Chronic) میرا مطلب ہے کہنہ ہو چکا ہے، تمہارے تحت الشعور میں جڑ پکڑ چکا ہے۔۔ موصوف کے تجزیئے کا رد عمل یہ ہوا کہ پھر ہم پر مایوسی کے کتے چھا گئے ۔۔۔ محاورۃً بادل چھانا چاہئے تھا لیکن کیا کیا جائے دہشت و خوف کی نمبری عینک ہمیں بادلوں میں بھی کتے ہی دکھاتی ہے یعنی بادل بھی ایسی شکلیں بدلتے نظر آتے ہیں جیسے کئی کتے ایک ساتھ مختلف حالتوں میں موجود ہوں، کوئی کھڑا ہے کوئی بیٹھا ہے، کوئی لیٹا ہے، کوئی چھلانگ لگانے سے پہلے پنجے تول رہا ہے کوئی کوئی ہماری طرف پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔'

ڈاکٹر صاحب ہم پر مایوسیوں کے کتے چھوڑ کر خود کسی دور کی کوڑی کی تلاش میں سوچوں کے جزیرے میں گم ہوگئے تھے اور بڑی دیر تک گم رہنے کے بعد جب دوبارہ واپس لوٹے تو ایک ترکیب لے آئے تھے بولے اب اس عمر میں دیوار پھاندنے سے تو رہا میں ۔۔۔ تمہیں سہارا دیکر دیوار پر چڑھا سکتا ہوں تم اندر کود کر چپکے سے پھاٹک کھول دو ابھی یہ مسئلہ حل ہوا جاتا ہے۔۔'

ہم نے ہڑبڑا کر کہا۔۔ ڈاکٹر صاحب آپ مجھے کسی اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کو کہتے میں اندھا دھند لگادوں گا۔ لیکن اندر جہاں ایک خونخوار کتا زنجیر سلاسل کی قید سے مادر پدر آزاد موجود ہے وہاں میں تو کیا میرے فرشتے بھی نہیں جاسکتے۔۔۔''

تو پھر یہ مسئلہ حل کس طرح ہوگا۔۔؟ یہ کہتے ہوئے موصوف پھر کسی سوچ میں غرق ہوگئے اور جب ابھرے تو چٹکی بجا کر بولے۔ صرف ایک راستہ ہے، ایک چانس اس اتوار کو جو آل انڈیا ڈاگ شو" ہونے والا ہے۔ اس میں تمہاری محبوبہ اپنے چہیتے کتے کیساتھ ضرور شریک ہوگی پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کتے کے دیدار سے روک نہیں سکتی۔۔'

ہم نے فوراً اندیشہ ظاہر کیا ۔۔ فرض کیجئے اس شو میں شریک ہونے کا اس کا ارادہ نہ ہو تو ۔۔؟ موصوف نے فوراً ہمارے اندیشے کی ازالہ کردیا بولے ۔۔ ہم اسے شریک ہونے پر مجبور کردیں گے، میں کل ہی اس شو کا ایک خصوصی دعوت نامہ اسے بھجوائے دیتا ہوں ۔۔ موصوف کی اس کرم فرمائی نے ہمیں جیسے بے دام خرید لیا اب یہاں مزید ٹھہرنا فضول تھا اور پھر یہیں سے ہماری سمتیں بھی الگ الگ تھیں موصوف کو پولس کمشنر کے کتے کی مزاج پرسی کے لیے جانا تھا اس لیے وہ فوراً اپنی اس مہم پر روانہ ہوگئے۔۔''

(جاری)

●☆●☆●☆●

●☆●☆●

انگریزی: جارج ین نٹو
ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علی خاں

تھنگیا ۔۔ ایک ڈاکو

صندل کی لکڑی کے خطرناک اسمگلر ویراپن کے بارے میں پڑھتے پڑھتے مجھے تھنگیا یاد آگیا۔ جس نے منار کے پہاڑی علاقے میں زبردست دہشت پھیلا رکھی تھی۔ یہ سن ۱۹۵۰ کے آخری دہے کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ تھنگیا کا تقابل ویراپن وحشی سے تو نہیں کیا جاسکتا۔ مگر لوٹ مار اس کا بھی مشغلہ تھا۔ یہ کسی بھی شخص کو جان سے تو نہیں مارتا تھا۔ البتہ دن دھاڑے بندوق کی نالی کی نوک پر ان سے ان کی رقم۔ زیورات اور دیگر قیمتی اشیاء زبردستی چھین لیا کرتا تھا۔ رابن ہڈ کے نقش قدم پر چلنا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ یہ سب لوٹ مار وہ تنہا اپنی ذاتی منفعت کے لئے کرتا تھا۔ منار کے علاقے کے اطراف چائے کے باغات کے مالکین کو وہ خوب جی بھر کر لوٹ رہا تھا اور وہ سب لوگ اس سے بہت خائف تھے۔

جو لوگ اس کی بندوق سے ڈر کر اپنا زر، زیور چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ان کو وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ البتہ ایسے جیوٹ لوگ جن کو جان سے زیادہ مال پیارا تھا اس سے بحث کرنے لگتے تو اس کے ہونٹوں سے گالیوں کا ایک فوارہ ابل پڑتا۔ اور ساتھ ساتھ ان کو جان سے مارنے کی دھمکی کی خاطر وہ اپنی بندوق ان کے سینوں پر تان دیتا۔ ایسا ہی ایک دلچسپ واقعہ اس سلسلے میں زبان زد خواص و عوام تھا۔ ایک دن دو مسافروں سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ جو اپنا روپیہ پیسہ آسانی سے اس کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ پہلے تو تھنگیا نے انھیں جی بھر کر گالیاں دیں۔ پھر اپنی بندوق سے ڈرایا۔ اس پر بھی وہ جب ٹس سے مس نہیں ہوئے تو اس نے اپنی بندوق سے ہوائی فائر کر ڈالا۔ اس فائرنگ میں بندوق سے دھواں اس قدر خارج ہوا کہ وہ سب سر سے پیر تک اس غبار میں ڈوب گئے۔ دھویں کے چھٹنے کے بعد تھنگیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ دونوں مسافر اس اثناء میں بھاگ چکے ہیں!۔

اس کی شہرت اتنی پھیل چکی تھی کہ منار اور اس کے قریب و جوار کے لوگ تنہا سفر کرنے ڈرتے تھے۔ صرف ٹولیاں بنا کر ہی نکلتے۔ عورتیں بغیر زیور ہی کے سفر کرنے کو ترجیح دیتیں۔ اور جب کبھی چائے کے باغات کے عہدیدار بنک سے روپیہ نکالے واپس لوٹتے تو دو چار پولیس والے ہتھیاروں سے لیس ان کے ساتھ ہو لیتے۔

منار سے کسی چائے کے باغ کو جاتے ہوئے مجھے بھی ایسے ہی ایک سفر سے سابقہ پڑا تھا۔ باغ کے مالک کے ایک محاسب نوٹوں سے بھرا ایک چرمی بیگ اپنے سینے سے لگائے ڈرے سہمے چھوٹی سی مورس MORRIS کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ تو اگلی سیٹ پر میں ایک موٹی توند والے ڈرائیور اور ایک لحیم شحیم خطرناک قسم کے پولس کانسٹبل کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا۔ مگر اس خطرناک ماحول میں بھی میرا دل یہی چاہ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جنگل کے اس خطرناک راستے میں تھنگیا سے پالا پڑ جائے تاکہ میں اپنے بورڈنگ اسکول کے ساتھیوں کو یہ کہانی مزے لے لے کر سنا سکوں۔

ایک اندھیری رات میں ہماری بورڈنگ اسکول کے قریب رہنے والے کچھ لوگ ہانپتے کانپتے اندر گھس آئے۔ بے حد

پریشان سے لگ رہے تھے۔ کہنے لگے کہ انھوں نے ٹھنگیا کو بندوق لئے گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ بس پھر کیا تھا؟ اس علاقہ کی پولیس چوکی کو یہ اطلاع دی گئی۔ رات بھر ان پولیس والوں نے اس کی تلاش میں بتا دی۔ مگر اس کا پتہ نہ چلنا تھا اور نہ چلا۔ اس واقعہ کو لوگ ایک دوسرے کو لطیفہ کے طور پر سناتے۔ "لوگو۔ سنو۔ ہم سب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اس جنگل میں بھانت بھانت کے جنگلی جانور رہتے ہیں۔ اب ان جنگلی جانوروں میں ایک اور جانور کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ اور وہ ہے شری ٹھنگیا ڈاکو۔"

ہم سب بچوں کی بھی اس نام ہی سے سٹی گم ہو جاتی تھی۔ مگر اسکول کی جانب سے منائے جانے والی outing اور خاص کر camp fire نے ہمیں للچا ہی دیا۔ اور ہم نے اپنے آپ کو دلاسا دے لیا کہ چلو ٹھنگیا ہم بچوں کو تو نہیں ڈرائے گا۔ اور اگر اس سے مقابلہ کرنا ہی پڑا تو ہم اپنے ساتھ درجن بھر غلیل اور قلم چھیلنے کے چاقو لئے چلیں گے۔ یا بہت ہوا اپنے جیب خرچ کی رقم اس کے حوالے کر کے اس کو منالیں گے۔ یہ سوچ کر ہم اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر پک نک کو نکل پڑے۔ ایک شام ہم سب camp fire کے اطراف بیٹھے سخت سردی سے بچنے کے لئے آگ تاپ رہے تھے۔ جوں ہی رات کی سیاہی ذرا گہری ہوئی کہیں اندھیرے میں سے دو آدمی جن کی لانبی لانبی مونچھیں خوفناک لگ رہی تھیں ہمارے سامنے آنکلے۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں چمکتا ہوا ایک بڑا سا چاقو تھا۔ اس شخص نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "ٹھنگیا بھیا۔ چلو کچھ دیر کے لئے یہاں بیٹھ کر آگ تاپ لیتے ہیں"۔ اس فقرہ کا ہمارے کانوں میں پڑنا ہی تھا کہ ہم سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ اب غور سے ان کو جو دیکھتے ہیں تو ان کے کرخت اور کھردرے چہرے اور خونی آنکھوں نے تو ہمیں اس قدر بد حواس کیا کہ ہم سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

جب یہ رپورٹ ہمارے استادوں نے سنی تو کیمپ میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کئی باوردی پولیس والے آن کی آن میں کیمپ کے جنگل میں ٹھنگیا کی تلاش میں نکل پڑے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں اطلاع ملی کہ ٹھنگیا پکڑ لیا گیا ہے۔ بغیر شور شرابے اور دھینگا مشتی کے ۔۔۔۔۔ مگر یہ ٹھنگیا وہ ڈاکو ٹھنگیا نہیں تھا بلکہ بھولا بھالا سادہ سا دیہاتی جو قریبی کسی چائے کے باغ کا ایک مزدور تھا۔ ☆

پروفیسر عابد اللہ غازی
ایم۔اے (علیگ)

گل بوٹے

اردو کا وطن اور مذہب:

انڈو پاکستان کلچرل کانفرنس کے زیر اہتمام اردو سیکشن کے مباحثے کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر تاراچند نے فرمایا۔

"اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی یہیں پروان چڑھی پاکستان والے اسے اغوا کر کے وہاں لے گئے ہیں"۔

ان کے بعد پاکستان کے وفد کی طرف سے شوکت تھانوی اسٹیج پر تشریف لائے۔ اور انھوں نے ڈاکٹر تاراچند کے الزام کی تائید میں فرمایا۔

"میں ڈاکٹر صاحب کے اس الزام کی تائید کرتا ہوں کہ اردو کو ہم پاکستان میں اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ لیکن میں اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے پاکستان لے جا کر اسے مشرف بہ اسلام نہیں کیا اور آپ کی امانت میں کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ آپ پاکستان تشریف لا کر دیکھ سکتے ہیں کہ اردو بغیر تبدیلی مذہب کے نہ صرف پاکستان میں زندہ ہے بلکہ پروان بھی چڑھ رہی ہے۔

دو مثالیں:

شوکت تھانوی نے اردو کو مشرف بہ اسلام نہ کرنے کے سلسلے میں دو مثالیں بھی دیں۔

"مثلاً ہم گھر میں بیوی کو "اے مری شمع شبستان حرم" کہہ کر نہیں پکارتے بلکہ بیگم ہی کہتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ پیر میں بچھو کاٹ لے تو ہم قبلہ والد صاحب قبلہ والد صاحب!! نہیں کہتے۔ بلکہ باپ رے باپ ہی کہہ کر دہائی دیتے ہیں"۔

حسن سلوک:

شوکت تھانوی یورپ جانے والے تھے۔ ان کے ایک دوست نے گھر پر آکر ان سے پوچھا۔

"روانگی کا کیا پروگرام ہے؟"

شوکت صاحب نے کہا۔

"میاں کیا بتاؤں تمھاری بھاوج نے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ کہتی ہیں تم ولایت سے میم ضرور لے کر آؤ گے۔ حالانکہ میں انھیں لاکھ قسمیں کھا کر یقین دلا چکا کہ اگر اپنے لئے میم لایا تو تمھارے لئے ایک صاحب بھی لیتا آؤں گا!"

زحمت:

علی گڑھ میں جامعہ اردو کے کنووکیشن کے بعد رشید احمد صدیقی لنچ سے بچ کر اور رکشا میں بیٹھ کر خاموشی سے اپنے گھر روانہ ہوگئے۔ سید ظہیر الدین علوی رجسٹرار جامعہ اردو نے دیکھا تو مجھے رکشا کے پیچھے دوڑایا۔ رشید صاحب رکشا لے کر واپس لوٹے، اپنے

خاص انداز میں علوی صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا۔

"ارے معاف کیجئے علوی صاحب! اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ رکشا کے پیسے میں ہی دے دیتا۔"

اخلاقی مجبوری:

۱۹۵۲ء میں دلی کالج کی بزم ادب کے زیر اہتمام خواجہ احمد فاروقی نے ایک آل انڈیا ڈیبیٹ اور سمپوزیم منعقد کیا۔ علی گڑھ کے شعبہ اردو کے طلباء کے لئے باہر جانے کی تقریب اتفاق ہی سے نکل سکتی تھی۔ انھوں نے رشید احمد صدیقی صاحب سے اصرار کیا کہ انھیں سمپوزیم میں شرکت کا موقع دیا جائے۔ دس طلباء کا وفد ظہیر احمد صدیقی سکریٹری اردوئے معلیٰ حال ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی سرکردگی میں دہلی روانہ ہوا اس کے ساتھ رشید احمد صدیقی صاحب کا پرنسپل بیگ صاحب کے نام ایک خط تھا۔ جس کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے۔

"علی گڑھ کے طلباء کا قافلہ سمپوزیم میں شرکت کے لئے آرہا ہے قیام کا انتظام آپ فرمادیجئے۔ طعام کا یہ خود کرلیں گے۔ بشرطیکہ آپ خود ہی اپنی طبعی شرافت کا شکار ہو کر اخلاق پر نہ اتر آئیں۔"

اس خط کا اثر کیا ہوا ہوگا، آپ خود ہی سمجھ لیجئے۔

غمزۂ غماز:

سیدہ اختر حیدر آبادی علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھ رہی تھیں۔ فراق گورکھپوری کسی اور شاعر سے محوِ گفتگو تھے۔ سیدہ اختر نے فراق کو مخاطب کر کے کہا۔

"فراق صاحب! ذرا ادھر بھی توجہ کیجئے۔"

فراق نے جواب دیا۔

"جی بالکل آپ کی طرف متوجہ ہوں۔"

رئیس المتغزلین:

ایک بار مدینہ منزل بجنور میں جگر صاحب قیام پذیر تھے۔ وہاں میرے والد صاحب حامد الانصاری غازی اور ماہر القادری صاحب نے ان سے پوچھا۔

"اگر کوئی کل ہند مشاعرہ ہو جس میں ہندوستان کے تمام شعراء شرکت کریں تو آپ کرسی صدارت کے لئے کس کا نام تجویز کریں گے؟"

"حسرت موہانی کا!"

"اگر وہ چلے جائیں تب؟"

"تب میں خود کرسی صدارت پر بیٹھ جاؤں گا۔"

میخانہ خالی رہ گیا:

۱۹۵۰ء میں جگر صاحب سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو یہ واقعہ یاد دلا کر میں نے پوچھا:

"اگر آپ کو کسی کام سے کرسی صدارت سے اٹھ کر جانا پڑے تو آپ کسے اپنی جگہ کرسی صدارت پر بٹھانا پسند فرمائیں گے؟"

میں نے یہ سوال تین بار دہرایا اور تینوں بار جگر صاحب فکر میں ڈوبے رہے اور پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکرادیئے۔

عیادت:

ایک بار والد صاحب بیمار تھے ۔ مصطفیٰ فقیہہ صاحب جو اس وقت وزیر زراعت حکومت ممبئی تھے مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے ۔ میرے چھوٹے بھائی سلمان منصور (عمر پانچ سال) نے دروازے پر ان کا نام پوچھا تو انھوں نے کہا:

"کہو کہ فقیہہ آیا ہے"

سلمان نے گھر میں آکر کہا۔

"فقیر آیا ہے"۔

امی جان نے کہا۔

"جاکر کہدو، بابا معاف کرو اور دروازہ بند کرلو"

ہمدم دیرینہ:

علامہ انور صابری تقسیم ہند کے بعد پہلی بار ایک مشاعرے میں لاہور تشریف لے گئے تو احرار تحریک کے قائد اور ان کے دوست سید عطاء اللہ شاہ بخاری علالت کے باوجود مشاعرے میں تشریف لائے ۔ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے صابری صاحب سے ملنے میں بعض سیاسی پیچیدگیاں تھیں اس لئے مولانا بخاری ایک کرسی پر پنڈال کے آخری کونے میں بیٹھکر مشاعرہ سننے لگے ۔ علامہ انور صابری غزل پڑھ رہے تھے کہ ان کی نظر اپنے قدیم رفیق پر پڑی تو بے اختیار غزل پڑھتے پڑھتے فی البدیہہ یہ مطلع ہوگیا اور علامہ نے وہیں سنادیا:

تم اسے شکوہ سمجھ کر کس لئے شرما گئے
مدتوں کے بعد دیکھا تھا تو آنسو آگئے

آم:

مولانا سید سلیمان ندوی سے افغانستان کے ایک سفر کے دوران ایک افغانی نے پوچھا۔

"آپ کے ہندوستان میں ہمارے سیب جیسا مفرح کوئی پھل ہوتا ہے؟"

مولانا نے جواب دیا:

"ضرور ہوتا ہے اور اسے آم کہتے ہیں"۔

پھر اس افغان نے کہا۔

"اور ہمارے انگور جیسا شیریں پھل بھی ہے آپ کے یہاں؟"

"ضرور ہے ۔ اور وہ آم ہے"۔

"اور ہمارے سردے جیسا کوئی لذیذ پھل بھی ہے آپ کے یہاں؟"

"جی ہاں، آم ہے"۔

اس افغان نے عاجز آکر کہا۔

"بابا! اس کے علاوہ بھی تمہارے ہاں کوئی پھل ہوتا ہے؟"

مولانا نے فرمایا۔

۔ابھی آم کی سب قسمیں تو ختم ہو جائیں۔ پھر کسی اور پھل کا نام لوں گا"۔

عشق حقیقی:

ڈاکٹر عبدالعلیم نے اردو شاعری پر تقریر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا۔ "یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے یہاں عشق حقیقی کو عشق مجازی کہا جاتا ہے اور مجازی کو حقیقی۔"

سسرال:

یاد آیا ہے، جب ہندی چینی بھائی بھائی تھے تو سر سی۔ پی راما سوامی ایر کی سرکردگی میں ہندوستانی طلباء، اور اساتذہ کا ایک وفد چین گیا تھا۔ جس کا پرتپاک استقبال ہوا اور چینی حکومت اور عوام نے خاطر تواضع اور مہماں نوازی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔

روانگی کے وقت اپنی رخصتی تقریر میں سر سی۔ پی نے کہا۔

"یہ غلط ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں اپنے گھر کا سا آرام ملا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں یہاں سسرال جیسا آرام ملا"۔

دیوانہ ہشیار:

روش صاحب "مدینہ منزل" بجنور میں اپنی مشہور نظم "بہت دور" کی تکمیل کر رہے تھے اور بہت دیر سے ایک مصرع میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس ہی بجنور کے ایک مجذوب شاعر اکرام بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ روش صاحب نے ان کے سامنے وہ مصرع گنگنایا:

راستہ چھوڑ، کہ جانا ہے بہت دور مجھے

اسی لمحے اکرام صاحب نے دوسرا مصرع لگادیا:

نہ پھنسا زلفِ گرہ گیر میں اے حور مجھے

قبول عام:

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے، جگر مراد آبادی بمبئی کے ایک کل ہند مشاعرے میں شرکت فرمانے کے بعد دوسرے روز میرے ساتھ کچھ خریداری کے لئے کرافورڈ مارکٹ میں ٹہل رہے تھے، کہ ایک گجراتی دکان دار نے آواز دی۔ "او سیٹھ، ادھر آؤ۔"

جگر صاحب جو کچھ آگے بڑھ چکے تھے اس کی دکان پر واپس آئے "تم شاعری گاتا ہے۔ اپن رات مشاعرے میں گیا تھا۔ تمہارا گانا ایک دم دل کو لگتا ہے۔ ایسا مافق کوئی سالا شاعری نہیں کرتا"۔

جگر صاحب اس نذر عقیدت پر کچھ بے چین تھے۔ لیکن اس کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

"اپن بیس سال سے تم کو سنتا ہے۔ کل تین روپئے والا ٹیکس (ٹکٹ) نکالا تھا۔ پیسہ بروبر وصول ہوا۔ بیٹھو بیٹھو سیٹھ، چائے پیو۔"

جگر صاحب جو شاعری کے معاملے میں بہت نازک طبع تھے اس گجراتی عقیدت مند کے پر خلوص خراج عقیدت کو قبول کئے بغیر نہ رہ سکے۔

اہم مقام:

پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان کی شمالی سرحد کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لوک سبھا میں کہا:

"اگرچہ یہ پہاڑ غیر آباد ہیں اور وہاں کوئی درخت نہیں اگتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس علاقے کی کوئی اہمیت نہیں"۔
یہ سن کر مسٹر مہابیر تیاگی ایم پی اٹھے اور انہوں نے کہا:
"اگرچہ میرے سر پر بال نہیں اگتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے سر کی کوئی اہمیت نہیں ہے"۔

پروفیسر:

مشہور مورخ پروفیسر محمد حبیب (سابق صدر شعبہ سیاسیات علی گڑھ) کو ان کے ایک ملازم نے ایک نیا سگریٹ بہت قیمتی بتا کر پیش کیا۔ حبیب صاحب کو وہ سگریٹ بہت پسند آیا۔ اور وہ اسے مستقل طور پر پینے لگے۔ ایک دن انہوں نے وہ سگریٹ اپنے ایک مہمان کو پیش کر کے اس کی بہت تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ یہ بہت قیمتی ہے اور ہر جگہ نہیں ملتا۔ ان کا ملازم کہیں سے تلاش کر کے خاص ان کے لئے لاتا ہے۔

مہمان نے کہا "یہ تو عام سگریٹ ہے اور اس کا پیکٹ پانچ آنے میں آتا ہے"
مگر حبیب صاحب نے اصرار کیا۔

"آپ جسے کہہ رہے ہیں وہ کوئی دوسرا سگریٹ ہوگا۔ یہ تو بہت اعلیٰ قسم ہے" جب تھوڑی دیر کے بعد حبیب صاحب کار میں اپنے مہمان کے ساتھ باہر نکلے تو مہمان نے ایک دکان پر کار رکوا کر وہی سگریٹ خرید کر حبیب صاحب کو پیش کر دیا۔ پروفیسر حبیب نے ڈبیہ کو چاروں طرف سے دیکھ کر کہا۔

"ہمارا ملازم بہت سیدھا ہے۔ کوئی دکان دار اسے لوٹ رہا ہے"۔

دونوں یا چاروں:

ریڈیو پاکستان کراچی سے غالب کی مشہور غزل کو گانے والا اس طرح پڑھ رہا تھا: "قید حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں"
پطرس بخاری نے زیڈ اے بخاری (ڈائرکٹر پاکستان ریڈیو) کو فوراً ٹیلی فون کر کے کہا:
"گانے والے سے کہو اصل میں دونوں ہی نہیں، اصل میں چاروں ایک ہیں"۔ ☆

BIHA
POKHRAN
ZZZ
CATEGORY
PAGEANT FACTORY
MADE IN INDIA

By Al-Wehaibi (Al-Riyadh)

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ
اشاعت کا ۳۲ واں سال

جلد ۳۳
شمارہ ۱۱

شگوفہ

حیدرآباد

نومبر ۲۰۰۰ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کمپیوٹر کتابت : SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373

ویب ڈیزائن : غوث ارسلان

طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۴ روپے ۔ زر سالانہ : ۱۵۰ روپے ۔ بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064

شگوفہ انٹرنٹ پر : http://www.shugoofa.cjb.net

ای میل :: shugoofa @ india.com

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

گوشہ محمد یونس بٹ

لطیفے

بال کی کھال (تبصرہ)

چورن (منظومات)

Open the garage door boy!

Preparations for Ramadan

Muhammad Al-Khinaifer / Al-Jaze

By Al-Wehaibi (Al-Riyadh)

مجتبیٰ حسین
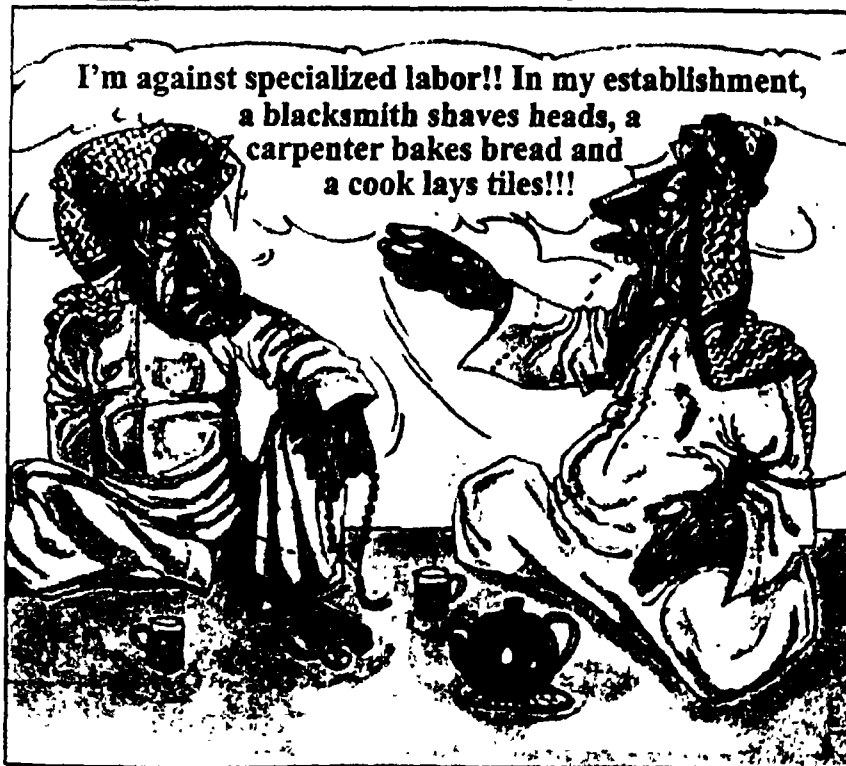
ویرپن! کبھی ہمیں بھی اغوا کرو

ویرپن جی! ہم آپ کو یہ خط "نکیرن" کے ایڈیٹر آر آر گوپال کی معرفت ہی بھیجنا چاہتے تھے، کیونکہ وہی آپ کے اکیلے ڈاکیہ ہیں، لیکن چوں کہ وہ فلم اسٹار راج کمار کو آپ کے چنگل سے آزاد کرانے کے سلسلے میں لگاتار جنگل میں منگل مناتے چلے آرہے ہیں اس لئے انھیں زحمت نہ دے کر اس خط کو اخبار میں شائع کرارہے ہیں۔ ہمیں پتہ نہیں کہ یہ خط آپ کو ملے گا بھی یا نہیں، کیونکہ ہم یہ خط اردو میں لکھ رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ جب اردو والے ہی اردو نہیں پڑھتے تو آپ کیا پڑھیں گے۔ "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا" (ویرپن کے سوائے) پھر بھی آس بڑی چیز ہوتی ہے، کیا عجب کہ اردو کا کوئی غیرت مند قاری آپ کو یہ خط پہنچا ہی دے۔ ویسے ہم یہ خط جان بوجھ کر اردو میں لکھ رہے ہیں، کیونکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اب اردو کی بھی تھوڑی سی خدمت انجام دیں۔ راجکمار کی رہائی کے سلسلے میں آپ نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ کرناٹک کے اسکولوں میں نہ صرف تامل زبان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے، بلکہ اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی دیا جائے۔ آپ کے اس مطالبہ کو کرناٹک کی حکومت نے اصولاً مان بھی لیا ہے۔ جب آپ راجکمار کو رہا کردیں تو کرناٹک میں جگہ جگہ تامل کا بول بالا ہو۔ مثال کو سامنے رکھ کر ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ پہلے تو ہمارا اغوا کریں اور پھر ہندی بولنے والی ریاستوں سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا بندوبست کریں اور اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیں۔ اس کے دو فائدے ہیں، ایک فائدہ تو یہ کہ ہمارے اغوا کے بعد ہمیں پتہ چل سکے گا کہ ہمارے اغوا کے خلاف کہاں کہاں احتجاجی مظاہرے ہوتے ہیں اور کہاں کہاں صف ماتم بچھتی ہے، بسیں کتنی جلتی ہیں، توڑ پھوڑ کے کتنے واقعات پیش آتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ اس طرح اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے مطالبہ میں شدت پیدا ہوجائے گی۔ یہ بات ہم اس لئے لکھ رہے ہیں کہ اب اس زبان کی کچھ خدمت کرنے والا ہمیں تو کوئی نظر نہیں آتا پہلے آپ کسی کا اغوا کرتے تھے تو اس کی رہائی کے لئے بھاری رقم کا مطالبہ بھی کرتے تھے لیکن اب آپ نے یہ روش ترک کردی ہے اور رہائی کی شرط کو زبان اور کلچر وغیرہ سے جوڑ دیا ہے۔ ماشاء اللہ اب آپ میں بڑی خوش آئند تبدیلیاں رونما ہوتی جارہی ہیں، جس کے لئے ہماری دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

ویرپن جی! حالات کے ہاتھوں بے حد بے بس اور مجبور ہونے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو "مغویہ" بننے کی پیشکش کر رہے ہیں، ورنہ آج کے زمانے میں کون اپنے آپ کو اغوا کے لئے پیش کرتا ہے۔ پھر آپ تو لوگوں کو دو دو تین تین مہینوں تک یرغمال بنا کر رکھنے لگے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب اردو کا کوئی سرپرست اور پرسان حال نہیں رہا۔ ہمارے پاس بڑی بڑی انجمنیں ہیں، لیکن اردو کی ترقی کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہیں۔ اردو کے جو استاد ہیں وہ کسی اور کام کے ہی استاد ہیں، اپنے بچوں کو تو اردو نہیں پڑھاتے، البتہ جو معصوم نوجوان ان کے پاس اردو پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان سے شخصی اور گھریلو کام لیتے ہیں۔ ان استادوں کا زیادہ تر وقت جوڑ توڑ میں گزرتا ہے، وہ اردو کے نہیں بلکہ اپنی روٹی پر دال کھینچنے کے استاد بن گئے ہیں۔ اردو اکیڈمیاں اپنوں میں ریوڑیاں بانٹ رہی ہیں۔ ان اکیڈمیوں کی حیثیت اب اردو کی ناقابل اشاعت کتابوں کے پبلشروں کی ہوگئی ہے۔ شعراء حضرات صرف مشاعرے پڑھتے

ہیں کتابیں بالکل نہیں پڑھتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان حالات میں اگر آپ تامل کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمت کا بیڑہ اٹھالیں تو یقین مانیے چار دانگ عالم میں آپ کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگے گا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اردو والے بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر آپ ان کا کوئی معمولی سا کام بھی کریں تو وہ آپ کے گردیدہ ہوجائیں گے اور فرط مسرت اور وفور جذبات میں آپ کو "محسن اردو، مسیحائے اردو، فخر اردو اور "اسمگلر اردو" جیسے خطابات سے نوازنے کے علاوہ آپ کو "شمس العلماء ویرپن، لسان العصر ویرپن" اور "ملک الشعراء ویرپن" وغیرہ جیسے القاب سے مخاطب کرنے لگ جائیں گے۔ آپ کے اعزاز میں جگہ جگہ تہنیتی تقاریب منعقد ہوں گی، مشاعروں کی صدارت بھی آپ سے کرائی جائے گی۔ یہ نہ سمجھئے کہ مشاعروں کی صدارت کرنے کے لئے آدمی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بلکہ مشاعرہ کا صدر جتنا جاہل ہوگا مشاعرہ اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ کیونکہ یہاں سوچ سمجھ کر داد دینے کی پابندی نہیں ہوتی۔ صدر کے ساتھ اگر شعراء بھی جاہل ہوں تو کیا کہنے، سونے پر سہاگہ ہوجائے گا۔ یہ تو ہم ان معمولات کی بات کر رہے ہیں جو ان دنوں اردو معاشرہ میں رائج ہیں۔ مشاعروں اور آپ کے اعزاز میں ہونے والی تقاریب کے علاوہ ہمیں یقین ہے کہ یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں آپ پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالے لکھے جائیں گے (ویرپن جی! آپ حیرت کریں گے کہ ہم جیسے کم سواد آدمی کے بارے میں بھی دو یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے لئے اور چار یونیورسٹیوں میں ایم فل کے لئے مقالے لکھے جا چکے ہیں یا لکھے جارہے ہیں)۔ آپ سوچیں گے کہ آپ کے کونسے پہلو پر ریسرچ کی جاسکتی ہے۔ آپ فکر نہ کریں، اردو والے مقالوں کے ایسے ایسے عنوانات ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چند موضوعات آپ کی شخصیت کے پس منظر میں ہم ہی تجویز کئے دیتے ہیں "ویرپن۔ بن اور سیت"۔ "جدلیاتی اسمگلنگ، کی تخلیقی اساس"۔ اردو ادب میں مغرب سے ساختیات کی اسمگلنگ، ویرپن کی نظر میں"۔ اردو میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اغوا کا سماجی پس منظر"۔ "اردو ادب میں سرقہ اور ڈکیتی کی وارداتیں ویرپن سے پہلے اور ویرپن کے بعد"۔ اردو کی رومانی شاعری پر صندل کی خوشبو کے اثرات"۔ اردو ادب میں جنگل راج۔ تہذیبی اور سماجی پس منظر"۔ اردو ادب میں مابعد الطبیعاتی اسمگلنگ کی اخلاقی اساس"۔ "ہاتھی کے دانت اور ویرپن کے دانت۔ ایک تقابلی مطالعہ" وغیرہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اردو کی خدمت کرنے کا بیڑہ اٹھائیں تو تب آپ کو پتہ چلے گا کہ اس میں آپ کی شہرت کے کتنے امکانات پوشیدہ ہیں۔

غرض یہ چند فائدے ہیں جو ہمیں اغوا کرنے کی صورت میں آپ کو حاصل ہوسکتے ہیں۔ تاہم آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ بھلا تم کونسے ایسے اہم آدمی ہو کہ ہم تمھیں اغوا کریں۔ آپ کا سوال اپنی جگہ نہایت معقول ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں کونسی ایسی معقول بات ہے جس پر عمل کیا جارہا ہو۔ ہمیں بھی اندازہ ہے کہ ہم اہم آدمی نہیں ہیں "من آنم کہ من دانم" جگہ جگہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ (ع)

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

لیکن اگر آپ ہمارا اغوا کریں تو اس بہانے آپ کی شہرت کے سہارے ہماری شہرت میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آج تک کسی نے ہمارا اغوا نہیں کیا بڑی پرانی آرزو ہے کہ کوئی ہمارا بھی اغواء کرے نوجوانی کے دنوں میں ہماری دلی تمنا یہ تھی کہ کوئی لڑکی ہمیں اغوا کر کے لے جائے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ بزدلی اور شرافت دونوں ہم معنی لفظ ہوتے ہیں۔ یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو والدین نے ہمیں اپنی موجودہ بیوی کا "بندھک" بنا دیا۔ آپ اغوا کرنے کا اتنا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں ہم اغوا ہوں گے تو اخباروں میں ہمارا چرچا ہوگا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بچپن میں ہم نے سرسری طور پر جنگل وغیرہ دیکھے تھے۔ اس کے بعد سے سمنٹ کے جنگلوں میں رہنے کی عادت ڈال لی ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ جنگل کیسا ہوتا ہے۔ آپ جس جنگل میں رہتے ہیں اس کا بڑا شہرہ ہے۔ ایک طویل عرصہ سے تین تین سرکاروں کی پولیس آپ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن آپ

پھر بھی ہاتھ نہیں آتے ۔ہم شہروں میں رہتے رہتے عاجز آچکے ہیں ۔ دہلی میں بجلی اب اکثر غائب رہتی ہے ، پانی بھی اب نلوں کے بجائے خود اپنی آنکھوں میں نظر آنے لگا ہے ۔ سڑکوں کا عالم یہ ہے کہ ہم سڑک پر چلتے کم ہیں اور ٹھوکریں زیادہ کھاتے ہیں ۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ آدمی آپ کیساتھ جنگل میں رہے ۔ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ناگپا کی طرح آپ کے چنگل سے آزاد ہو کر جنگل سے بھاگ کر نہیں آئیں گے ۔ آپ ہماری وفاداری تو دیکھیں ہوسکتا ہے کہ آپ خود ہمیں آزاد کرکے بھاگ جائیں ۔ عمر کے آخری حصہ میں ہم ذرا اطمینان قلب کیساتھ گیان دھیان میں مصروف رہنا چاہتے ہیں ۔ شہر کی زندگی نے ہمارا چین چھین لیا ہے ۔ آپ کیساتھ کچھ دن جنگل میں رہیں گے تو قدرت سے قریب رہنے کا موقع بھی ملے گا ۔ یوں بھی ہمیں جلد ہی قدرت کا حصہ بن کر لالہ و گل میں تبدیل ہونا ہے ۔ آپ کو ہمیں اغواء کرنے کیلئے دہلی نہیں آنا پڑیگا جس طرح آپ "نکیرن" کے ایڈیٹر آر آر گوپال کو جنگل میں آنے کا وقت بتا دیتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی بتادیں ہم خود بہ نفس نفیس اغواء ہونے کیلئے مقررہ وقت پر جنگل کے کنارے پہنچ جائیں گے ۔ آپ ہمیں وہاں سے اٹھالیں ۔ ایک بات اور سن لیں کہ ہمارے اغواء کے سلسلہ میں آپ "نکیرن" کے ایڈیٹر کو بیچ میں نہ ڈالیں ۔ ہمیں تو ان کی مونچھیں آپ کی مونچھوں سے زیادہ خطرناک نظر آتی ہیں ۔ یوں بھی نکیرن کے ایڈیٹر کو ہم اپنے ساتھ کیوں رکھیں جب کہ ہمارے ساتھ خود ہمارے "منکر نکیر" ہوتے ہیں ۔ امید کہ آپ حسب دستور جنگل میں منگل منا رہے ہوں گے ۔☆

ظفرؔ سالی
(سیوان)

غزل

فن کے ابجد سے اگرچہ ابھی انجان ہوں میں
فیض استاد کا ہے صاحبِ دیوان ہوں میں

کام شیطان کا کرتا ہوں تو حیرت کیا ہے
ناک نقشے سے تو لگتا ہے کہ انسان ہوں میں

باپ دادا نے پڑھی ہوتی تو میں پڑھتا نماز
گوشت کھاتا ہوں کھلاتا ہوں مسلمان ہوں میں

میں تو پابندی سے رشوت کی بھی دیتا ہوں زکات
صاحبِ دین ہوں میں صاحبِ ایمان ہوں میں

طالبِ دل ہے کوئی، کوئی جگر کا طالب
ایسا لگتا ہے کہ قصاب کی ددکان ہوں میں

جو سنایا نہ گیا ہے وہ فسانہ میرا
جو لڑایا نہ گیا تم سے وہ رومان ہوں میں

بات کیا خوب منسٹر سے کہی پی۔اے نے
تو ہے فرعون مرا اور ترا ہامان ہوں میں

لوگ یوں ہنس کے مجھے ٹال دیا کرتے ہیں
جیسے سرکار کا بھیجا ہوا فرمان ہوں میں

حال ہے میرا وہی حال جو اردو کا ہے
چائے کے کوزے میں اٹھتا ہوا طوفان ہوں میں

گھر کے اندر مری حالت کو نہ پوچھو یارو
گھر کے باہر ہی مجھے دیکھو شریمان ہوں میں

ڈینگ ہانکوں گا شکاگو سے بلاوا آیا
بل کلنٹن نے بتایا جسے مہمان ہوں میں

مسخرہ قصرِ ظرافت میں گھسے گا کیسے
اس سے کہہ دو کہ اسی قصر کا دربان ہوں میں

خاکساری ہے مری سر کو جھکائے رکھنا
سر اٹھا دوں جو کبھی جنگ کا اعلان ہوں میں

میرے استادِ سخن ثاقب و کوثر ہیں ظفر
فیض• پاشا ہے ظرافت کی اگر کان ہوں میں

•☆•

•احمد جمال پاشاہ

منّہ پھٹ ناگپوری
(ناگپور)

صاف صاف

باس اگر پٹ جائیں ہنستے بولتے
اپنے دن کٹ جائیں ہنستے بولتے

نامور ہوتا ہے اس سے خاندان
گھر اگر بٹ جائیں ہنستے بولتے

دو قدم پھر دس قدم پھر سو قدم
دوریاں کٹ جائیں ہنستے بولتے

چاہتی ہے یہ ہماری گورنمنٹ
لوگ مر گھٹ جائیں ہنستے بولتے

آگے پولیس فورس لٹھ کے ساتھ ہے
بھیڑ سے چھٹ جائیں ہنستے بولتے

حج کو جب نکلے ہیں تو ہر ایک سے
مل کے منّہ پھٹ جائیں ہنستے بولتے

•☆•

عابد معز
(ریاض)

"میں بنوں گا کروڑ پتی"

چھٹی منظور ہونے، ٹکٹ خریدنے اور ہوائی جہاز میں سیٹ محفوظ کروانے کے بعد میں نے اپنی آمد کی خوش خبری سنانے کے لئے گھر فون لگایا۔ بیٹی نے فون اٹھایا۔ دعا سلام کے بعد میں نے بتایا۔ "میں چوبیس کی صبح گھر پہنچ رہا ہوں۔"

بیٹی نے استفسار کیا۔ "SURE"

"ہاں بیٹا۔ صد فیصد۔ سیٹ کنفرم ہے۔"

"CONFIDENT" ادھر سے دریافت کیا گیا۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ بیٹی اس طرح سے کیوں پوچھ رہی ہے۔ وجہ پوچھ کر فون پر وقت گنوانے اور پیسہ ضائع کرنے کے بجائے میں نے جواب دیا۔ "ہاں بیٹا۔ میرا آنا یقینی ہے۔ چھٹی مل چکی ہے۔ بس تھوڑی سی پیکنگ باقی ہے۔ میں انشاء اللہ چوبیس کا ناشتہ تمہارے ساتھ کروں گا۔"

"اچھا تو پھر تالا لگا دیا جائے" بیٹی نے پوچھا۔

"کیا کہہ رہی ہو بیٹا۔ اگر تم تالا لگا دوگی تو میں کہاں جاؤں گا؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جواب کو FINAL مان لیا جائے" بیٹی نے وضاحت کی۔

"ہاں" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اگر آپ کا جواب غلط ہوا تو ـــــ"

میں نے بیٹی کو جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔ آواز اونچی کرکے پوچھا۔

"بیٹی آج تم عجیب و غریب باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے"۔

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ اگر آپ مقررہ دن نہیں آئے تو آپ کو جرمانہ دینا ہوگا۔"

سو، دو سو روپے جرمانہ کا قیاس کرتے ہوئے، میں نے دریافت کیا۔ "کتنا جرمانہ دینا ہوگا؟"

"ایک کروڑ" بیٹی نے جواب دیا۔

جواب سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ایک کروڑ کے ہندسہ سے میرا سابقہ حساب کے مضمون کی حد تک تھا۔ عملی زندگی میں کبھی ایک کروڑ سے پالا نہیں پڑا تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "بیٹا تم جانتی ہو، ایک کروڑ کتنی رقم ہوتی ہے؟"

"جی ہاں۔ ایک کروڑ بہت معمولی رقم ہے۔ یہاں ہر روز انعام میں ملتی ہے۔"

بیٹی نے بتایا۔

میں شش وپنج میں پڑگیا۔ ایک کروڑ جیسی خطیر بلکہ خطرناک رقم کو بیٹی معمولی بتارہی ہے۔ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ بیٹی سے مزید گفتگو میں نے مناسب نہیں جانا۔ گھر پہنچ کر معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کا ارادہ کیا اور یہ کہہ کر فون بند کردیا کہ "میں آنے کے بعد تم سے ایک کروڑ پر بات کروں گا۔"

وطن مالوف پہنچا تو عجیب و غریب صورتحال کا سامنا ہوا۔ میں نے ہر کسی کو "کروڑ کے پھیر" میں مبتلا پایا۔ "ننانوے کا پھیر" مشہور و معروف ہے جس میں انسان دولت جمع کرنے کی چکر میں پڑتا ہے جبکہ "کروڑ کا پھیر" میں انسان اچانک مالا مال ہونے کے خواب دیکھنے لگتا ہے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ وبا "کون بنے گا کروڑ پتی" نامی ٹی وی پروگرام نے پھیلائی ہے جس کا مخفف کے بی سی (KBC) ہے۔

کے بی سی پروگرام میں صرف پندرہ آسان سوالوں کے بدلے کوئی بھی شخص کروڑ پتی بن سکتا ہے۔ سوالات بہت آسان ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ انسانی جسم میں کتنی ہڈیاں ہیں ؟ وکیٹس کس کھیل میں استعمال کی جاتی ہیں ؟ وغیرہ وغیرہ۔ سوالات کو دیکھ کر ایک طرف ایسے لگتا ہے جیسے پروگرام کرنے والے لوگوں کو واقعی کروڑ پتی بنانا چاہتے ہیں جبکہ دوسری جانب ہر شخص اپنے آپ کو پروگرام میں حصہ لینے کا اہل پاتا ہے اور پروگرام میں حصہ لینے کی تیاری کرنے لگتا ہے۔ بازار میں عام معلومات کی کتابیں "کون بنے گا کروڑ پتی" کے نام سے ہاتھوں ہاتھ بِک جارہی ہیں۔ ان کتابوں میں اب تک پوچھے گئے سوالات بھی دیئے جاتے ہیں۔ اخبارات میں کروڑ پتی گائیڈ کے عنوان سے ہر دن مختلف سوالات کرکے قارئین کو کروڑ پتی بننے میں مدد بھی کی جارہی ہے۔ اب جسے دیکھیئے وہ اپنی قابلیت بڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ عام معلومات حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ میں نے بیگم کو گھر کا کام کاج چھوڑ کر عام معلومات کی کتابوں میں منہمک پایا تو میں نے انھیں ان کے فرائض یاد دلانا چاہا۔ "بیگم آپ نے گھر کی حالت دیکھی ہے ـــ"

بیگم نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ "گھر کی حالت بہتر کرنے ہی کی کوشش میں لگی ہوئی ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ شاہ جہاں کا اصلی نام کیا ہے ؟

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں خوابوں کی دنیا میں وقت ضائع نہیں کرتا۔" میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

بیگم، کتاب بند کرتے ہوئے مجھے سمجھانے لگیں۔ "وقت کہاں ضائع ہورہا ہے۔ میں اپنی معلومات میں اضافہ کررہی ہوں اور پھر موقع ملا اور میں خوش قسمت ثابت ہوئی تو صرف آسان پندرہ سوالوں کے جوابات دے کر ایک کروڑ کا انعام لے لوں گی۔ تب آپ کو ہم سب سے دور باہر اکیلے رہ کر کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ایک کروڑ ملتے ہی آپ واپس آجایئے گا۔"

میں اپنا سامنہ لے کر گھر کے کام کرنے میں جٹ گیا۔

کون بنے گا کروڑ پتی پروگرام میں قسمت آزمانا بہت آسان ہے۔

کوئی داخلہ فیس ہے اور نہ ہی کوئی کاغذی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔

بس پروگرام کرنے والوں کو ایک فون گھمانا پڑتا ہے۔ فون پر بھی ایک آسان سوال کیا جاتا ہے۔ اگر جواب صحیح ہوا تو مزید سوالوں کے ذریعہ کروڑ پتی بننے کے لئے چن لئے جاتے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ ہر دن دولاکھ سے زیادہ لوگوں کو کروڑ پتی بننے کے لئے فون کی گھنٹی بجانے کا موقع ملتا ہے۔ کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فون اژدھام کے باعث نہیں لگتا۔ کروڑ پتی بننے والے خواہش مند لوگوں کی تعداد کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن میرے ایک ماہر معاشیات دوست کا خیال ہے کہ یہ تعداد غیر معمولی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں اوسط سالانہ آمدنی چار سو پینسٹھ ڈالر ہے۔ اس حساب سے ایک عام ہندوستانی کو ایک کروڑ روپے کمانے کے لئے

ساڑھے چار سو سال سے زیادہ کا عرصہ درکار ہوگا۔ کون جیتا ہے زلف کے سر ہونے تک والی بات ہے۔ جب چند سوالوں کے عوض ایک کروڑ روپے مل رہے ہوں تو کون کروڑ پتی بننا نہیں چاہے گا؟ اب ہر کوئی کے بی سی پروگرام کے طفیل "میں بنوں گا کروڑ پتی" کا ارمان رکھتا ہے۔

لوگوں کو کروڑ پتی بننے میں اتنی دلچسپی ہے کہ ہر کوئی کے بی سی پروگرام دیکھنا چاہتا ہے۔ پروگرام کے وقت سڑکیں سنسان ہوجاتی ہیں لوگ کام چھوڑ کر ٹی وی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرکے بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹی وی پر ڈرامہ تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن ٹی وی کے باہر بھی دلچسپ پروگرام جاری رہتا ہے۔ سوال ہوتے ہی دیکھنے والے بھی اے ، بی ، سی یا ڈی میں جواب دیتے ہیں۔ جواب صحیح ثابت ہونے پر ٹی وی کے باہر فرضی انعام بھی دیا جاتا ہے۔ چلئے آپ کو بیس ہزار مل گئے۔ آپ نے تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے جیت لئے۔ ٹی وی پر امیدوار کو ٹپ دینے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ بھائی "سی" کہہ دیجئے۔ اسے نہیں بی صحیح جواب ہے۔ کبھی امیدوار سے ہمدردی کی جاتی ہے۔ "اتنا آسان سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ بے چارہ پریشان ہوگیا ہے۔" کبھی امیدوار پر غصہ بھی آتا ہے۔ "صورت سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے لیکن اسے اتنی عام بات کا علم ہی نہیں ہے۔ بعض لوگ پروگرام کے تمام سوالات کے صحیح جوابات دیتے ہیں اور ٹی وی کے باہر لاکھوں روپیوں کے انعام کے حقدار قرار پاتے ہیں۔ ایک ماں نے اپنے لڑکے کا تعارف اور تعریف یوں کی۔ "میرا بیٹا ایک کروڑ کا ہے۔ وہ کون بنے گا کروڑ پتی کے ہر سوال کا جواب چٹکی بجاتے دیتا ہے۔"

کون بنے گا کروڑ پتی پروگرام نے صرف چند ہفتوں میں مقبولیت کا ایک حیرت انگیز ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ایسی پذیرائی اب تک کسی دوسرے پروگرام کے نصیب میں نہیں آئی۔ آج ٹی وی کا یہ سب سے مقبول پروگرام ہے۔ کے بی سی کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ اس پروگرام کے میزبان امیتابھ بچن بھی ہے۔ فلمی دنیا کی کرشماتی شخصیت سے ملنا اور ان کے ساتھ ہزاروں اور لاکھوں کا کھیل کھیلنا از خود کئی لوگوں کے پاس کروڑ پتی بننے کے مترادف ہے خود کروڑ بلکہ ارب پتی بننے کے بعد اب جبکہ وہ صرف پتی رہ گئے ہیں، امیتابھ دوسروں کو امیر بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ اطمینان کے ساتھ لطف اٹھاتے اور اپنے انداز سے کروڑ پتی بننے کا گُر کھلاتے ہیں۔ غلط جواب دینے پر وہ لائف لائن استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ایک لائف لائن میں امیدوار کو دوست احباب سے مشورہ کرنے کے لئے فون کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ فون پر امیتابھ ہی ہائے ہیلو کرتے ہیں۔ فون پر امیتابھ کی آواز میں اپنا نام سن کر اور ان سے بات کرکے لوگ خاصے خوش ہوتے ہیں۔ اب لوگ امیتابھ کے فون کا انتظار بھی کرنے لگے ہیں۔ میں نے ایک دوست کے گھر میں فون استعمال کرنے کی اجازت مانگی تو جواب ملا۔ "ہاں۔ ضرور فون کیجئے۔ لیکن مختصر معلوم نہیں کب امیتابھ کا فون آجائے"

فلم کی شہرت اور مقبولیت کی انتہا ہوتی ہے کہ اس کے ڈائیلاگ زبان زد عام ہوجاتے ہیں اور لوگ روزمرہ کی بول چال میں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ یہی مقبولیت کے بی سی پروگرام کو حاصل ہوئی ہے۔ لوگ امیتابھ کی بولی بول رہے ہیں۔ کسی جواب کے جواب میں SURE، CONFIDENT یا تالا لگا دیا جائے کہنا عام بات ہے۔ بعض لوگ اپنی پسند کا جواب سن کر رائے زنی کرتے ہیں۔ "یہ صحیح جواب ہے۔ اسی ہزار روپے آپ جیت گئے۔" میں اپنے ایک بزرگوار سے کسی سنجیدہ مسئلہ پر گفتگو کررہا تھا۔ مجھے تذبذب میں مبتلا پاکر انھوں نے کہا۔ تم لائف لائن کیوں نہیں استعمال کرتے! اس مسئلہ پر فون کرکے بیگم سے مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا تمھاری بیگم کو فون لگاؤں۔"

ایک کروڑ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ اس میں ایک سو لاکھ ہوتے ہیں۔ لوگ اتنی دولت کا کیا کریں گے۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ یہ سوال کے بی سی پروگرام میں حصہ لینے والوں سے بھی کیا جاتا ہے۔ ایک نوجوان نے بتایا۔ "میں امیتابھ کو لے کر فلم بناؤں گا۔

ں ہیرو بنوں گا اور امیتابھ میرے پتاجی کا رول کریں گے ۔ کسی نے کہا۔ " میں ایک شاندار گھر بناؤں گا ۔ " میں اپنے بچوں کو خوب
ڑھاؤں گی ۔ " ایک خاتون کا ارمان تھا ۔ " میں اپنی لڑکیوں کی شادیاں کروں گا ۔ " ایک باپ کی خواہش تھی ۔ ایک جہاندیدہ صاحب نے
اتھ ملتے ہوئے کہا ۔ " انکم ٹیکس دینے کے بعد جو رقم بچے گی اس سے میں کرنٹ، ٹیلیفون اور پانی کے بل اور گھر کا ٹیکس ادا کروں گا " ۔

کے بی سی پروگرام کی مقبولیت سے متاثر ہو کر اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ٹی وی کے دوسرے چینلوں نے بھی انعامی
قابلے شروع کئے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ انعامی رقم ایک کروڑ سے زیادہ ہی ہونی چاہئیے ۔ اب سوال دس کروڑ کا ہے ۔ کروڑوں کی دوڑ سے
یسے محسوس ہوتا ہے کہ ارب بلکہ اربوں کی باری جلد آنے والی ہے ۔

کے بی سی پروگرام نے ٹی وی کو تفریح کے ساتھ آمدنی کا ذریعہ بھی بنادیا ہے ۔

لوگ اب ہردم ٹی وی سے چپکے مختلف سوالات کے جوابات دینے میں مصروف نظر آتے ہیں بچوں کو ٹی وی سے مستقل
ِپکے رہتا دیکھ کر میں نے انھیں سمجھایا ۔ " بیٹا اتنا زیادہ ٹی وی مت دیکھا کرو ۔ پڑھائی متاثر ہوتی ہے ۔ تفریحاً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹی وی
یکھنا کافی ہے ۔۔ "

میرے بیٹے نے مجھے روک دیا ۔ " ڈیڈی پلیز ۔ آپ ہمیں ٹی وی دیکھنے سے منع مت کیجئے ۔ پہلے ہی آپ کھیلنے پر پابندی لگا کر
مارا مستقبل خراب کر چکے ہیں ۔ لوگ کھیل کود کر بہت کچھ کما لیتے ہیں ۔ پڑھ لکھ کر صرف کلرک ہی بن سکتے ہیں ۔ اب ٹی وی کے ذریعہ
روڑ پتی بننے کا موقع ملا ہے تو آپ یہاں بھی روڑے اٹکا رہے ہیں ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے ۔۔ " ☆

ڈاکٹر سید محی الدین قادری بادی
صدر شعبہ عربی انوار العلوم کالج، ملے پلی، حیدر آباد

اعضاء کے افعال (دوسری قسط)

پہلی قسط میں اعضاء کی تقسیم بلحاظ اہمیت، بلحاظ تعداد اور بلحاظ کام بطور تمہید پیش کرتے ہوئے صرف آنکھ کے مختلف افعال بیان کئے گئے تھے۔ اس دوسری قسط میں چہرے کے دیگر اعضاء ناک، کان اور گالوں کے افعال ملاحظہ کیجئے۔

(۲) ناک

ناک انسان کے چہرے کا اہم ترین عضو ہے جس کا استعمال واحد ہی ہوتا ہے مگر غور کریں تو بیک وقت واحد اور جمع دونوں بھی ہے۔ کیونکہ ہر ناک دو نتھنے رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پاجامہ بیک وقت واحد بھی کہلاتا ہے اور جمع بھی۔ یعنی ناک کی طرح اوپر سے واحد اور نیچے سے جمع ۔۔ ناک کا سب سے بڑا کام سانس لینا اور سانس چھوڑنا ہے۔

اگر ناک نہ ہوتی تو حضرت انسان کا زندہ رہنا مشکل تھا ۔۔ ناک کا دوسرا بڑا کام سونگھنا ہے۔ خوشبو پھولوں کی، عطر کی اور سینٹ کی۔ بدبو بلدیہ کی کھلی موریوں کی، میونسپلٹی کے ڈریج کی۔ اس کے علاوہ تیز بو، ہلکی بو اور دال کی بگھار کی بو وغیرہ۔

ناک کی ایک بیماری بہت مشہور ہے۔ اور وہ ہے زکام (نزلے کا ناک سے کوئی تعلق نہیں)۔ اگر کسی کو زکام ہو جائے تو ناک کے کام میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بیچاری تکلیف اٹھاتی ہے کیونکہ اس میں مقامی بسوں کی آمد و رفت بہت بڑھ جاتی ہے۔ بعض لوگ بار بار سڑ سڑ کرتے ہیں اور دماغ کے فضلات کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں مگر جب خطرے کے حدود سے آگے بڑھتے ہیں تو نکال پھینکتے ہیں۔ برسوں پہلے ایک پہیلی ہم نے سنی تھی "غریب پھینک دیتا۔ امیر اٹھا کے رکھتا"۔۔ سن کر بہت تعجب ہوا اور یقین نہیں آیا۔ شائد کہنے والے نے الٹا کہہ دیا ہو مگر جب اس کا حل معلوم ہوا تو حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں مگر ناک بدستور اپنی اصلی حالت میں قائم رہی۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ناک واقعی کبھی بند بھی ہو جاتی ہے اور بہت تکلیف پہنچاتی ہے اور اس کو کھولنے کے لئے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ورنہ یہ حقیقت میں کھلی مگر بند ناک راتوں کی نیند اور دن کا چین برباد کر دیتی ہے ۔۔ ناک بند ہونا محاورہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے لیکن ہم نے آج تک کسی کی ناک کو بند نہیں دیکھا۔ دونوں نتھنے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ کبھی بھی بند نہیں ہوتے۔ اگر بند ہو جائیں یا بند کر دئے جائیں تو آدمی کی زندگی کی کتاب ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ ناک کھلی رہنے کے باوجود بند ہونے والی بات پر ہمیں ایک بات یاد آگئی کہ بعض افراد ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ ہوتے ہیں بظاہر شریف نظر آتے ہیں مگر بباطن بہت شر پسند ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کا کیا۔

جن کا ظاہر الگ ہے باطن سے ●☆● ان سے دوری میں عین راحت ہے (بادی)

ناک کے محاورے پچاس سے زیادہ ہیں۔ یہاں صرف تین محاوروں کا ذکر کیا جاتا ہے ایک ہے "ناک کٹنا" جو شرمندہ ہونے

یا سبکی اٹھانے کے معنوں میں مستعمل ہے مگر حقیقتاً ناک کٹتی نہیں ہے۔ اسی لئے بعض بے غیرت قسم کے لوگ محفل میں اپنی کسی کارستانی کی وجہ سے ہتک اٹھانے کے باوجود اپنی ناک پھلائے پھرتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔۔ بعض کی ناک واقعی کٹی ہوئی ہوتی ہے مگر ایسے نکٹوں کے سامنے اپنی ناک کھجانا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر آپ اپنی ہڈیوں کو سلامت رکھنا چاہتے ہیں تو ایسا کبھی مت کیجیے ۔۔ دوسرا محاورہ ہے " ناک رگڑنا " جسے فارسی میں بینی برزمین مالیدن کہا جاتا ہے ۔ بے غیرت، بے ضمیر اور خوشامدی لوگ یہ کام بآسانی انجام دیتے ہیں ۔۔ تیسرا محاورہ ہے " ناک کا بال ہونا " نہایت قریبی دوست یا رشتہ دار یا مصاحب خاص کو کہتے ہیں۔ مگر ہم نے دیکھا کہ بعض افراد کا محبوب مشغلہ ناک کے اندر انگوٹھا اور انگلی ڈال کر بار بار ناک کے بالوں کو کھینچنا اور نکال پھینکنا ہے۔ شائد بعض نہایت قریبی دوست اور رشتہ دار اسی سلوک کے مستحق ہوتے ہیں ۔

(۳) کان

اللہ نے دو کان اسی لئے دیئے ہیں کہ ایک کان سے سنیں اور دوسرے کان سے تمام باتوں کو نکال دیں۔ اس پالیسی پر عام آدمی کم اور تمام محکموں کے عہدہ دار زیادہ اور پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ ان کا ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اگر عوام کی ہر بات سن کر ٹال نہ دیں تو ان کی کرسی چھن جانے کا خطرہ رہتا ہے

کانوں کا ایک ہی کام ہے سننا اور صرف سننا ۔ اچھی باتیں، خراب باتیں، کڑوی باتیں، میٹھی باتیں، نیک باتیں، بری باتیں، دل خراش باتیں غرض ہر قسم کی باتیں کان سنتے رہتے ہیں۔ جن باتوں پر دل عمل کرنا چاہے ان کو دل میں اتار لیتے ہیں اور جن پر دل عمل نہ کرنا چاہے ان کو نکال پھینکتے ہیں۔ اسی طرح دونوں کان ہر قسم کی آوازیں سنتے رہتے ہیں۔ آہستہ آواز، زور دار آواز، ڈراونی آواز، فون کی آواز، پٹاخے کی آواز، لاری کی گڑگڑاہٹ اور کانا پوسی کی سرسراہٹ وغیرہ وغیرہ۔

بعض لوگ اونچا سنتے ہیں حالانکہ نیچے بیٹھتے ہیں۔ عموماً ایسا ضعیفی میں ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن سے بڑھاپے تک ہر قسم کی آوازیں سنتے سنتے کانوں کے پردے گھس جاتے ہیں۔ مگر ہمارا تجربہ ہے کہ بعض جوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی اونچا سنتے ہیں۔ ایسے لوگ اونچی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اس لئے اونچا ہی سنتے ہیں بلکہ کرسی جتنی اونچی ہوتی ہے اتنا زیادہ اونچا سنتے ہیں۔ اگر اونچا نہ سنیں تو اونچائی سے نیچے آنے کا ہردم خدشہ رہتا ہے ۔

کان کے ایک سو سے زائد محاوروں میں کان کھڑے کرنے کا محاورہ خر اور خرگوش کے لئے تو بہت مناسب ہے مگر انسانوں کے لئے بالکل ناموزوں ہے کیونکہ ہر انسان کے دونوں کان ہمیشہ کھڑے ہی رہتے ہیں۔ بیٹھے نہیں رہتے ۔

محاورہ " کان کے پردے پھٹنا " اس وقت کہتے ہیں جب بے ہنگم آوازوں اور شور پکار کی زیادتی ہو۔ وزیر نے کہا۔

پھٹے ہیں کان کے پردے، دم آیا ہونٹوں پر ۔۔ وبال گوش ہے نالہ، بلائے جان فریاد

ایک اور محاورہ " کان کھانا " کثرت سے مستعمل ہے مگر ہم نے آج تک نہ کسی کے کان کھائے نہ کان کترے ورنہ یہ ضرور بتاتے کہ اس کا مزہ کیسا ہوتا ہے ؟۔ یہ محاورہ شعراء کے لئے زیادہ استعمال ہوتا ہے کیوں کہ کان کھانے کی صفت شاعروں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے ۔ وقت بے وقت اپنے آزاد اور مقید اشعار سنا کر لوگوں کے کان کھانا ان کا محبوب مشغلہ ہے ۔ یہاں ایک ضروری بات لکھ دوں کہ " ہماری اس تحریر کو بھی اگر آپ کان کھانے پر محمول کریں تو فوراً کتاب بند کر کے لیٹ جایئے "۔

(۴) گال ۔

ناک اور کان کا درمیانی میدان گال کہلاتا ہے جو دونوں جانب ہوتا ہے ۔ گال اپنی عرفیت گلے سے مشہور ہیں۔ گالوں کا اہم

کام ہے پھلانا۔ جس کا محاورہ "گال پھلانا" بنایا گیا۔ زیادہ تر اس پر مشقی باجے والے عمل کرتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کو خواہ مخواہ گال پھلانے کی عادت ہوتی ہے حالانکہ ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی۔۔ مسکرانے، ہنسنے اور قہقہہ لگانے میں بھی دونوں گال نمایاں کام کام انجام دیتے ہیں۔ مگر ہم نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو ہنستے ہیں و معلوم ہوتا ہے کہ رو رہے ہیں

شاعروں کو اپنی محبوبہ کے گالوں سے زیادہ گالوں پر کا چھوٹا سا تل بے حد پسند ہے۔ وہ اس تل کی خاطر اپنی جان تک دینے تیار ہوجاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جان دینے کا کام صرف زبانی خرچ تک ہی رہتا ہے عملاً کچھ نہیں ہوتا۔ اکثر حکومتیں بھی شاعروں کی طرح عوام سے زبانی وعدے کرتی ہیں عملی میدان میں کچھ نہیں کرتیں۔

بعض شعراء کا خیال ہے کہ ان کی محبوبہ کے گال کا تل دراصل ان کا اپنا دل ہے۔ گویا وہ انسان کا دل نہ ہوا بلکہ ٹڈے کا دل ہوا۔۔ اس کے برخلاف ایک شاعر کا دل اتنا بڑا تھا کہ اس نے ایک دل کے ہزار ٹکڑے کئے اور یہاں وہاں گراتا رہا۔ گویا انسان کا دل نہ ہوا ڈینوسار کا دل ہوا۔

گالوں پر دوسرے اعضاء بھی کام کرتے ہیں جیسے ہونٹ اور ہاتھ۔۔ ہونٹ جب گالوں سے ملتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں مگر ہاتھوں سے تھر تھر کانپتے ہیں کیونکہ ہاتھ انھیں تھپڑ کے ذریعے درد بھی پہنچاتے ہیں اور لال بھی کردیتے ہیں۔۔ وہ زمانہ تو لد گیا جب کوئی کسی کے ایک گال پر تھپڑ مارتا تھا تو وہ پوری سعادت مندی کے ساتھ اپنا دوسرا گال بھی پیش کردیتا تھا کہ بھئی اس پر بھی ایک تھپڑ جادو۔ پورا انصاف ہوگا۔ تم کو تھپڑ مارنے کی خواہش ہے توہم کو بھی تھپڑ کھانے کی تمنا ہے۔۔ آج کے دور میں اگر کوئی کسی کے گال پر ایک تھپڑ مارتا ہے تو وہ مارنے والے کے دونوں گالوں پر تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے پیٹھ پر ایک عدد زوردار گھونسہ بھی رسید کردیتا ہے تاکہ وہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرسکے۔۔ ☆

یار زندہ صحبت باقی ●☆● اعضاء کے ہیں کام باقی

اقبال شانہ
(حقل، سعودی عرب)

غزل

میں نگاہیں ترے ڈیڈی سے ملاؤں کیسے
ماتے ہی نہیں موصوف مناؤں کیسے

بیٹھنے کی ہے مری پیٹھ پہ خواہش ان کی
ایک ٹن بوجھ میں اللہ اٹھاؤں کیسے

سامنے بیٹھے ہیں بکھرائے گھنیری زلفیں
ان کے چہرے سے گھٹاؤں کو ہٹاؤں کیسے

خیریت پوچھتے رہتے ہیں وہ "انٹرنٹ" پر
حالِ دل اپنا مشینوں پہ بتاؤں کیسے

گیت سننے کی مرے یار کی فرمائش ہے
میں پریشان ہوں اشعار کو گاؤں کیسے

سوگئے ہیں مجھے اشعار سناکر اپنے
میں انہیں تازہ غزل اپنی سناؤں کیسے

وہ زلیخا ہی سہی میں تو نہیں ہوں یوسف
اپنا دامن مرے اللہ بچاؤں کیسے

خاک آمد پہ کروں جشنِ چراغاں تیری
گھر میں ماچس ہی نہیں شمع جلاؤں کیسے

بن سنور کر وہ چلے آتے مری میت پر
میں کفن پھاڑ کے باہر نکل آؤں کیسے

تیرے کمپونڈ کی دیوار بہت اونچی ہے
میں یہ دیوار مری جان گراؤں کیسے

واپسی کی مری امید نہ رکھنا شانہ
گھر سے نکلا ہی نہیں لوٹ کے آؤں کیسے

●☆●

اسد اللہ حسینی چکر
بالی ووڈ

غزل

چرا کر کسی کی جو لائی غزل
وہی اس نے ہم کو سنائی غزل

سمجھتے رہے جس کو اس کا کلام
وہ دیوانِ سودا میں پائی غزل

ہوئی اس کی تعریف بے حد مگر
تخلص تھا میرا پرائی غزل

کچھ ایسے ترنم سے وہ پڑھ گیا
کہ میری سمجھ میں نہ آئی غزل

پڑھا میں نے مطلع تو کہنے لگے
"سناؤ نئی کوئی بھائی غزل"

تھا مقصد کہ شاگرد مشہور ہو
لکھی میں نے اس سے پڑھائی غزل

سنی غور سے تو لگے پوچھنے
میاں تم نے کس کی چرائی غزل؟

جو بے وزن اشعار لکھتا رہے
تو دیتی ہے اسکو دہائی غزل

ہے چکر کا انداز سب سے جدا
نظر ہم کو ایسی نہ آئی غزل

●☆●

فضل جاوید، ایم اے
1862 MIG Colony
BHEL,R.C.Puram,HYd. 32

نریش کمار شاد، حالی اور میر کے ساتھ

نریش کمار شاد نے جب مشہور ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو لینا شروع کیا تو بہت سوں نے ان کے حق میں بددعائیں کیں اور کہا کہ کمبخت مرکیوں نہیں جاتا! ہمیں سربازار رسوا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ لیکن شاد مسکرا کر کہتے رہے کہ جتنی بددعائیں ہیں وہ صرف شاد کر دو لیکن ان بددعاؤں کے اثر کرنے تک شاد نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو لے لئے۔ پتہ نہیں وہ کون خوش قسمت ادیب یا شاعر تھا جس کا انٹرویو شاد نے لیا اور جس کے دل سے نکلی ہوئی بددعا بارگاہ رب العزت میں قبولیت کا شرف حاصل کر سکی۔ اس طرح بہت سے ادیب و شاعر اپنے آپ کو رسوائی سے بچانے میں کامیاب ہوئے اور خود شاد جو اس دنیائے فانی میں ہمیشہ ناشاد رہے اپنے آپ کو عالم برزخ میں دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ یہاں چین ہی چین تھا۔ دخت رزبہ افراط موجود۔ آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور سب مہیا۔ غم روزگار کا احساس تک نہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب انسان کو سکون ہی سکون میسر ہو تو وہ ہنگاموں کا متلاشی ہوتا ہے۔ عالم برزخ میں شاد کا یہی حال ہوا۔ یکسانیت سے طبیعت اکتائی۔ کچھ لکھنے کو طبیعت چاہی۔ سامنے حوروں کو دیکھ کر شاعری میں محو ہوئے لیکن جب اپنا لکھا آپ پڑھا تو انہیں احساس ہوا کہ شاعری حوروں سے وجود میں نہیں آتی۔ کتنے پھیکے پھیکے مگر صاف ستھرے شعر ہوئے! لوح و قلم ایک طرف پھینک کر افسردہ نظروں سے حوروں کو تکنے لگے۔ ہر حور مجسم نور تھی۔ حسین و دلکش، تقدس کا نمونہ لیکن وہ دل لبھانے والی ادائیں تھیں نہ وہ جھیل سی آنکھیں جن میں ڈوب ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ جن کی ایک ادائے دلبری کتنی ہی نظموں کی تخلیق بن کر فیاض مدیروں کی وساطت سے ان کی شکم پری کرتی تھی۔ ان حوروں میں حسن و جمال تو تھا لیکن وہ بات نہ تھی جس سے دوئی مٹ جاتی ہے۔ فاصلے کم ہو جاتے ہیں۔ شاد کو ان حوروں سے ہمدردی سی ہو گئی اور وہ سوچنے لگے۔ کاش! یہ حوریں کسی طرح بمبئی پہنچ جائیں۔ ان کے نور و تقدس اور حسن و جمال کو مناسب طریقوں سے تراش کر انہیں کہاں سے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے۔ پھر اچانک ان کی رگ شرارت پھڑکی۔ اپنے آپ سے کہا: "چلو میاں شاد! آج مرحومین سے انٹرویو لیا جائے۔ کچھ دور پر ایک شخص کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمکیں۔ مفلر گلے میں ڈالے وہ ٹہل رہا تھا۔ شاد نے قریب پہنچ کر کہا۔

شاد: "معاف کیجئے! آپ کے شغل میں مخل ہوا۔ آپ کی تعریف جاننے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

وہ شخص: "کیوں نہیں برخوردار! میں الطاف حسین حالی ہوں اور اب تم اپنا تعارف کرادو۔"

شاد: آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مجھے نریش کمار شاد کے نام سے ادبی دنیا جانتی ہے۔"

حالی: "اس دنیا میں ابھی نووارد معلوم ہوتے ہو۔"

شاد: جی، بجا فرمایا۔
حالی: آنے کا مدعا کہو؟
شاد: یہاں کے ماحول سے اکتا گیا ہوں۔ سوچا جی بہلانے کو آپ سے کیوں نہ انٹرویو لوں۔
حالی: پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟
شاد: دنیا والوں نے آپ کو اچھی طرح نہیں پہچانا۔ آپ کی صحیح قدر نہیں کی۔ بچے بڑے بوڑھے سب آپ کو مسدس اور مدوجزر اسلام کی وجہ سے جانتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں آپ کا نام غزل کیساتھ آنا چاہئے تھا۔ یہ آپ کیساتھ ناانصافی ہوئی کہ ناقدوں نے آپ کی غزل کو زیادہ نہیں سراہا۔
حالی: میاں! ناقدوں کو چھوڑو۔ میں خود ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ میں کیا تھا اور کیا ہوں!
شاد: معاف کیجئے۔ آپ کے خیالات میں کچھ انحطاط سا محسوس کر رہا ہوں۔ اچھا یہی بتایئے کہ آپ کو غالب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا لیکن اصلاح سخن ہمیشہ شیفتہ ہی سے کیوں لیتے رہے؟ آپ نے ایک جگہ خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔
حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا
حالی: میاں کیوں ان دنوں کی یاد دلاتے ہو... راست گوئی میں ہے رسوائی بہت!
شاد: پھر بھی کچھ تو فرمایئے؟
حالی: لیکن یہ سب باتیں اپنے ہی تک رکھنا
شاد: آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔
حالی: غالب کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ بینائی معدوم ہو چکی تھی۔ ہمیشہ لیٹے رہتے تھے۔ میں انہیں اپنا تازہ کلام سنایا کرتا تھا۔ وہ تعریف کرتے جاتے اور فوراً ہی ان اشعار کو فارسی میں موزوں کرنے لگتے اور ہر آنے جانے والے کو اس طرح سناتے کہ جیسے وہ اشعار انھیں کے ہوں۔ اس طرح میرے بہت سے اردو کے شعر ان کی فارسی دانی کی نذر ہو کر ان ہی کے نام سے موسوم ہو گئے۔ حد تو یہ ہے کہ میرے سامنے ہی وہ دوسروں کو شعر سناتے اور خود مجھ سے پوچھتے کہو میاں حالی! کیسا مضمون باندھا ہے؟ تب سے غالب کو اپنا استاد مان لیا ہے۔
شاد: بہت خوب! گویا غالب اس فن کے بھی استاد تھے! آپ نے پھر شیفتہ کو اصلاح سخن کیلئے کیوں چنا؟
حالی: ایک دن مصطفےٰ خاں شیفتہ بضد ہو گئے کہ اپنا کلام انہیں سناؤں۔ تغزل میں ہم دونوں کا رنگ ایک سا تھا۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے کی غزلیں بدل لیا کرتے تھے۔ شیفتہ دوسروں کے کلام پر اصلاح کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھ۔ نواب تھے اس لئے ہم بے چوں و چرا ان کی اصلاح پر واہ واہ کرنے پر مجبور تھے۔ اس فرمانبرداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب شیفتہ نے خوش ہو کر مجھے اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کیا اور ایک اچھی تنخواہ مقرر کر دی۔
شاد: اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا کلام خود آپ کا نہ ہوتا تھا جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی فرمایا کہ رنگ تغزل کی یکسانیت کی وجہ سے آپ غزلیں بدل بھی لیا کرتے تھے۔
حالی: نہیں یہ بات نہیں۔ یہ تو ہمارا آپس کا معاملہ تھا۔ نواب شیفتہ کو خوش کرنے کیلئے میں ان کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا لیکن ان

کی جو بھی غزل مجھے بدلے میں ملتی اسے فوراً نذر آتش کر دیتا تھا۔ہاں میری بعض ایسی غزلیں ضرور میرے دیوان میں ہیں جو ان کی اصلاح شدہ ہیں جسے تبرک کے طور پر رکھ چھوڑا ہے۔

شاد: کیا آپ ان غزلوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟

حالی: (ناراض ہوتے ہوئے) اب تم میرے نجی معاملات میں بہت زیادہ دخیل ہوتے جا رہے ہو۔

شاد: میں نے محسوس کیا ہے کہ اس عالم میں پہنچ کر ہماری تخلیقی اپج رفتہ رفتہ ختم ہوجاتی ہے۔شاید یہاں کی آب و ہوا کا اثر ہو۔ ویسے یہاں کی شراب میں بھی وہ نشہ نہیں جو دنیا کے دیسی ٹھرے میں ہوتا ہے جسے نوش کر کے ہم شاعر و ادیب زمانے کی ناانصافیوں کو بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حالی: ناخلف! یہ کیا شراب اور نشہ کی بات لے بیٹھا۔چل دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے!

شاد: حضرت! آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہیں۔میں نے کیا غلط کہا ہے۔کیا شراب یہاں نہیں ملتی۔کیا اسے آپ نہیں پیتے۔

حالی: یہ شراب عرفان کی شراب ہے۔تیرے دیسی ٹھرے والی نہیں سمجھا۔

نریش کمار شاد حالی کو اپنے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ایک بزرگ آسمان پر نظریں گاڑے کچھ بڑبڑا رہے تھے۔شاد ان کے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں ایک مصرعہ پڑھتے ہیں۔

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے

وہ شخص: کون ہے تو اے نامراد شخص! کیوں میری تنہائی میں مخل ہوا؟

شاد: آپ کو آسمان میں چاند تلاش کرتے دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ آپ دہی میر ہیں۔ویسے آپ کی قلمی فوٹو بھی دیکھ چکا ہوں۔سوچا آپ سے انٹرویو لوں۔

میر: کیا کہا؟ میرا انٹرویو اور تو لے گا؟

شاد: خدائے سخن! زبان سنبھالئے۔آپ حد ادب سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

میر: کبھو کسو کے پاس ادب سیکھا بھی ہے تو نے؟ کسی کی تنہائی میں مخل ہونا کتنی بے ادبی ہے اس کا علم ہے تجھے؟

شاد: میں معافی کا خواستگار ہوں میر صاحب!

میر: خیر جاؤ معاف کیا۔پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ ویسے اپنی تعریف تو بیان کرو۔

شاد: مجھے نریش کمار شاد کہتے ہیں۔ہر صنف سخن پر آزمائش کر چکا ہوں۔نثر پر بھی قدرت حاصل ہے۔ادب میرا [illegible]

میر: ادب کی تعریف کر سکتے ہو؟

شاد: عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!

میر: شعر کا مفہوم سمجھتے ہو؟

شاد: میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ میں شاعر ہوں۔

میر: شعر گوئی اور شعر فہمی دونوں الگ الگ صفات ہیں۔ایک اچھا شاعر اپنے خیالات کو اپنے ایک خاص انداز سے پیش کرتا ہے۔ان خیالات کو سمجھنے کے لئے شاعر ہونا ضروری نہیں۔شعر کے مفہوم تک پہنچنا ایک آرٹ ہے۔تو کہو؟ شعر کے معنی و مفہوم سمجھتے ہو؟

شاد: شاعری اور شعر فہمی ان دونوں صلاحیتوں کو خدا نے ایک ہی ذہن میں مدغم کر کے اس کا نام نریش کمار شاد رکھا ہے۔

میر: تو بتاؤ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟

شاد: ارشاد

میر:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

شاد: "آپ اپنے محبوب سے فرماتے ہیں کہ جب بھی....."

میر: "رہنے دو میاں! تم بھی وہی کہنے والے ہو جو آج تک دوسرے کہتے آئے ہیں۔ شاعر کے دل کی بات صرف وہی جان سکتا ہے۔ مجھ سے سنو اس کا مطلب عہد جوانی کا ایک رنگین زمانہ تھا۔ آس پاس حسینوں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ میں جس کمرے میں رہتا تھا اس کے عین نیچے ایک بڑا تہہ خانہ تھا جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ میں خوبصورت مہ جبینوں کے ساتھ تہہ خانے میں گھنٹوں پڑا رہتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک حسینہ کو دل دے بیٹھا۔ میں ہمیشہ اسے تنہا ہی ملتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ خوش گپیوں کے بعد سب قاتلان دل و جان رخصت ہوتے اور وہ آدھمکتی۔ میری رنگین مزاجی کا علم اسے نہ تھا۔ خیر سے وہ شاعرہ بھی تھی۔ ادبی ذوق نکھرا ہوا تھا۔ ایک دن وہ بہت ترنگ میں تھی۔ ہونٹوں سے بار بار ایک مصرعہ ادا ہوتا تھا:

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

آخر جب مصرعہ اولیٰ سمجھ میں نہ آیا تو مجھے گرہ لگانے کو کہا
میں نے حسب حال یہ مصرعہ لگا دیا:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

اس مصرعہ سے وہ اتنا خوش ہوئی کہ اپنا وہ مصرعہ میرے پیوند کے ساتھ مجھے ہی سونپ دیا۔

شاد: کتنی عجیب بات ہے، آج تک محققوں اور ناقدوں کی نظر اس حقیقت تک نہ پہنچ سکی۔

میر: اچھا کچھ اور پوچھو۔

شاد: آپ شعر کس طرح کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے شعر کہتے وقت کس طرح کی کیفیت اپنے پر طاری رکھتے ہیں؟

میر: یہ بہت نامعقول سوال ہے۔ کوئی دوسرا سوال پوچھو۔

شاد: میر صاحب، آپ کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند مانا گیا ہے۔ کیا آپ اپنی زبان سے اس اسکینڈل پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ جو آپ کے اور چاند کے تعلق سے ہے۔ سنا ہے آپ پاگل ہو کر چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتے تھے۔

میر: یہ دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہے میاں، بعض شرپسندوں نے بد نصیب میر کو مرکز مان کر اس کے گرد تہمتوں کا دائرہ کھینچ لیا۔ اب یہی دیکھو چند تذکرہ نویسوں کے علاوہ محمد حسین آزاد نے بھی مجھے پاگل اور سودائی بنا ڈالا۔ سنا ہے ایک شاطر کنھیالال کپور بھی ہے جس نے مجھے مالیخولیا کا مریض بنا دیا ہے۔

شاد: جی ہاں کنھیالال کپور نے آپ کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے اور آپ ہی کے اشعار کی روشنی میں مدلل انداز میں آپ کو مالیخولیا کا مریض ثابت کر دیا ہے۔

[illegible] کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے کا تعلق ہے وہ میرا اپنا نجی معاملہ

ہے۔ چاند میں جو بوڑھی عورت بیٹھی چرخہ کات رہی ہے اس پر میں ریسرچ کر رہا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی ورنہ میں اس عورت کو دنیا سے متعارف کراتا۔

شاد: یعنی لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنادیا۔ ایک آخری سوال اور ہے۔

میر: پوچھو!

شاد: ہماری اس کالونی میں کسی عورت کا وجود نظر نہیں آتا۔ جو عالم فانی سے یہاں آئی ہو۔ کیا ان کی کوئی الگ کالونی ہے؟۔

میر: بہت معصوم ہو میاں! یہ جو سامنے حوروں کو دیکھ رہے ہو یہی تو وہ عورتیں ہیں جو دہر فانی سے یہاں پر آتی ہیں۔

شاد: لیکن ان میں وہ گلیمر نہیں ہے جو عورتوں میں ہوا کرتا ہے۔

میر: یہ سب مصلحت خداوندی ہے۔ اگر ان میں گلیمر ہوتا تو میر سے کتنے دواوین منظر عام پر آچکے ہوتے۔

شاد: بجا فرمایا خدائے سخن جس دنیا نے آپ کو ہر طرح سے ستایا۔ خون کے آنسو رلائے اسی زمانے نے آپ کے فن کو سراہا ہے۔ مومن اور غالب تک نے آپ کا لوہا مانا ہے نہیں نہیں میر صاحب! اس طرح نہ مسکرایئے میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔

میر: مجھے صرف تمہاری نادانی پر ہنسی آتی ہے میاں شاد، میں نے اشارۃً تم سے کہا نا کہ میں وہ نہیں جو میری شاعری ہے۔ میری شخصیت اور شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرنگیوں کے پیدا کئے ہوئے اصول ہوں گے جن میں شخصیت کو ادب اور شاعری سے جوڑا جاتا ہے۔ میری زندگی بہت خوشحال گزری۔ رنج و الم کا سایہ بھی مجھ پر نہیں پڑا۔ شاہرانہ طبیعت تھی۔ اپنے ہم عصروں سے اپنے آپ کو جدا کرنے کا ایک دن خیال پیدا ہوا اور میں نے اپنی شاعری میں مظلومیت کے جذبہ کو ابھار کر پیش کیا جو میرے ہم عصروں میں مفقود تھا اور یہ فارمولا مجھے بقائے دوام کے دربار میں پہنچانے میں کامیاب رہا۔

شاد: لیکن جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تو آپ آسمان پر ٹکٹکی باندھے کسے دیکھ رہے تھے؟۔ اب تو چاند بھی دکھائی نہیں دیتا کہ آپ اس بڑھیا کو تلاش کر رہے ہوں جو چرخہ کات رہی ہے۔

میر: دیکھا نا۔ تم بھی دھوکا کھا گئے! میں انگور کے ان خوشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس بیل کے انگور بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ کسی وقت فرصت میں آنا تو اپنے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ ابھی تو مجھے انگور کے ان خوشوں سے نمٹنے دو۔

شاد: بہت بہت شکریہ میر صاحب! میرا انٹرویو تیار ہوگیا۔ ایک مدیر کے احسانوں کو چکانے کے لئے یہ انٹرویو بہت کار آمد ثابت ہوگا۔

میر: کیا کہا؟

شاد: جی کچھ نہیں۔ آداب عرض۔ ☆

پاگل عادل آبادی

غزل

پینے کا شوق ہے نہ پلانے کا شوق ہے
انکو تو خالی شیشے چرانے کا شوق ہے

رجب کی پوریوں پہ بلاتا نہیں کوئی
حلوائی کی دوکان پہ جانے کا شوق ہے

کچھ اور تو نہیں ہے انہیں شوق دوسرا
چوبیس گھنٹے پان چبانے کا شوق ہے

دمڑی نہیں ہے جیب میں پرواہ رے بھانجے
ماموں کی بکریوں کو چرانے کا شوق ہے

یوں تو ہیں باتھ روم کئی گھر میں دوستو
جاکر ندی میں انکو نہانے کا شوق ہے

لفڑا ہو عالمی یا کہ جھگڑا ہو داخلی
کچھ مسخروں کو ٹانگ اڑانے کا شوق ہے

خواہش نہیں ہے داد کی پاگل کو ہوٹرو!
اشعار اس کے سن لو سنانے کا شوق ہے

☆●☆

رؤف رحیم
حیدر آباد

غزل

حالاتِ حاضرہ پہ غزل لکھ رہا ہوں میں
اب جھونپڑی کو تاج محل لکھ رہا ہوں میں

ارزاں ہوئی گرانی ۔ ہوا کھائیے جناب
بس بھوک کا ہے ایک بدل لکھ رہا ہوں میں

پانی نے پانی مجھ کو پلایا ہے اس طرح
افسوس ہے کہ جل کو اجل لکھ رہا ہوں میں

اندھوں میں کانا راجہ بنا ہوں میں آج کل
بحرِ رجز کو بحرِ رمل لکھ رہا ہوں میں

کل میری کوئی سیدھی نہیں اونٹ کی طرح
کل کل وہ کہہ رہی ہیں تو کل لکھ رہا ہوں میں

مجبور ہوگیا ہوں دباؤ میں آگیا
گوبھی کے پھول کو بھی کنول لکھ رہا ہوں میں

اک بوند بھی نہیں ہے میسر مگر رحیم
افسوس ایسی چیز کو نل لکھ رہا ہوں میں

●☆●

مرزا کھونچ ۔ بیتیا

آہ بھرتے

جو واعظ کے بیاں پر کان دھرتے
یقیناً کھونچ بھی بے موت مرتے

انہیں مدت لگی بنتے سنورتے
ادھر ہم رہ گئے بس آہ بھرتے

کہیں لگ جائے نہ بجلی کا جھٹکا
چھوا ہے ان کو لیکن ڈرتے ڈرتے

جو برتا ہے مرے اپنوں نے مرزا
کوئی دشمن سے بھی ایسا نہ برتے

☆●☆

غلام شبیر رانا

تاڑنا

تاڑنا درحقیقت آسمان میں ٹکٹکی لگا کر اپنی عقابی نگاہوں کے جھنڈے گاڑنا ہی تو ہے۔ تاڑنا ایک ایسا فعل ہے، جس کے پس پردہ متعدد لاشعوری عوامل کار فرما ہیں۔ اس کے لیے اقدار و روایات کو اکھاڑنا لازم ہے۔ تاڑنا اگر کامیابی سے ہم کنار ہوجائے تو پوبارہ ورنہ دولتی جھاڑنا معمول بن جاتا ہے۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں جب رگیدنا، اور لتاڑنا لوگوں کا وطیرہ بنتا جارہا ہے، تاڑنا اس منفی سوچ کا توڑ قرار پاتا ہے۔ تاڑنا ایک کثیر المقاصد فعالیت ہے، جس کے ہمہ گیر اثرات سے چشم پوشی بے بصری اور کورمغزی کی دلیل ہے کسی ستم ظریف نے کہا تھا۔

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

بادی النظر میں یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ تاڑنا ایک مفرح، مرغوب اور محبوب فعل ہے۔ اب یہ اپنی اپنی سوچ، اور رویے پر منحصر ہے۔ تاڑنا ایک ایسی جبلت ہے جس سے مفر نہیں، کون ہے جو تاڑنے کا دلدادہ، گردیدہ اور شیدا نہیں، ہر شخص اس کا اسیر اور نخچیر ہے

تاڑنا ایک دو طرفہ عمل ہے۔ میرے خیال میں یہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ لین دین کا ایسا انداز ہے جس کا تعلق نگاہ اور نگاہ واپسیں سے ہے۔ تاک جھانک اسی جذباتی عمل کی مظہر ہے۔ فکر و نظر کے فاصلوں کی طنابیں کھینچ کر موقع کو تاڑتے ہوئے ہر قسم کے مغائر کو بیخ و بن سے اکھاڑنا آج سکہ رائج الوقت ہے۔ جدھر نظر دوڑائیں ہر طرف تاڑنے کا عمل اپنی فتنہ سامانیوں کے ساتھ جاری ہے۔ ہر شخص کا مطمع نظر تاڑنا ہی تو ہے۔ مثال کے طور پر بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو، صیاد صید کو استحصالی عناصر مزید دولت کے مواقع کو، مزدور بہتر شرائط کار کو، حسن، پرستاروں کو، پروانے، شمع کو، مجنوں، لیلیٰ کو، مکان، مکیں کو، حاکم، محکوم کو، لاٹھی والا بھینس کو، مرتشی غرض مند کو، اسمگلر محافظ کو اور عوام ہر قسم کے ردیوں کو مسلسل تاڑنے میں مصروف ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاڑنا اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تاڑنا ایک ایسی سائٹ ہے جس کا احساس و ادراک نہ کرکے ہم ایک مہلک غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تاڑنا ایک ایسا عمل ہے جس کا رد عمل بھی تاڑنا ہی ہے۔ جب ہم کسی کو تاڑنے میں مصروف ہوتے ہیں تو ہمیں تاریخ قضا و قدر کے اس عمل کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عین اسی وقت کوئی نہ کوئی قوت ہمیں بھی تاڑ رہی ہوتی ہے۔ اگر یہ مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے میں ہمیں کامیابی حاصل ہوجائے تو کئی قباحتیں، معاشرتی برائیاں اور سماجی عیوب کا خاتمہ ہوجائے۔

تاڑنا اگر خلوص و مروت کا مظہر ہو تو اس کے اعجاز سے دلوں کو مرکز مہر و وفا کیا جاسکتا ہے، لیکن کرگسوں کے انداز میں تاڑنے والے ہلاکت آفرینیوں کی نحوست ساتھ لاتے ہیں۔ موجودہ دور میں گداگران سخن نے جو اندھیر مچا رکھا ہے اس کے باعث شکوہ قلم کا احساس عنقا ہونے لگا ہے۔ دزدِ نیم شب یہی تاڑنے میں محو رہتے ہیں کہ عہد جنوں کیش کے سرکشیدہ آبلہ اکیسے ٹھکانے لگائے جاسکتے

ہیں۔ فاتح اور جنگجو جرنیل رزم گاہ جستجو میں حالات کو تاڑ لیتے ہیں اور اپنی اسی صلاحیت کو بروئے کار لاکر تاریخ کے اوراق کو مزید فخر سے مزین کردیتے ہیں۔ میرے خیال میں تاڑنا کوئی اضطراری فعل نہیں بلکہ اس کے لیے زبردست قوت ارادی درکار ہے۔ میرے ریزہ ریزہ خوابوں کو نگار بہاراں عطا کر کے جوئبار وفا کی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی موجوں کے سنگ سوئے منزل لے کر چلنا تاڑنے کا رہین منت ہے۔ دامان نظر میں اسی کی بدولت گلاب سے جسم رچ بس جاتے ہیں۔

طائران بے پروا بھی تاڑنے سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ میرے دل میں یہ احساس قوی تر ہوتا جارہا ہے کہ زندگی کی تمام تر رعنائیاں تاڑنے کے دم قدم سے ہیں۔ یہ نیرنگ خیال اور نیرنگ نظر کا ایسا منبع ہے جو رجز بے اثر کو بھی نئی تقویم کی بانگ درا میں منقلب کرنے کی صلاحیت سے متمتع ہے۔ یہ ہمیں ہوس کی چیرہ دستیوں سے نجات دلاتا ہے۔ سوگوار مہ و سال میں راحت کی نوید سناتا ہے اور خوف خمیازہ سے آزاد رکھتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ابن الوقت عناصر کے سامنے خجل اور نگوں سر ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

اس عہد جنوں کیش میں تاڑنا ہی ہماری درماں طلبی کا ثمر ہے۔ شفق کدہ حیات میں تاڑنا ہی طائران خوش نوا کو نتے ولولے عطا کرتا ہے۔ اداسی کے لمحوں میں یہ حرکت و عمل پر آمادہ کرتا ہے اور اس کے دم سے ہی مشعل یقین تابندہ ہے۔ میرے خیالوں کے آئینے اسی کے اعجاز سے مرحلہ شوق کا سراغ دیتے ہیں۔ تاڑنا اگر قابل تعزیر قرار دیا جائے تو ہر طرف ہو کا عالم ہوگا۔ وحشت، سناٹا، بے بسی اور بے عملی کا عفریت سروں پر منڈلانے لگے گا۔

تاڑنا اظہار نارسائی کے مہیب شعلوں کو گلزار بنادیتا ہے۔ یہ کرب ضبط کی متلاطم موجوں کے سامنے امید وصل کا بند باندھ دیتا ہے۔ اس کے ایک ایک حرف سے حکایت دل منسوب ہے۔ افکار کے گرداب میں بھی یہ اظہار سیماب جلو میں رکھتا ہے۔ تاڑنا اصول فطرت بھی ہے اور تقاضائے مشیت بھی۔ جب بھی کوئی چشم فتنہ طراز تاڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو میں اپنے دامن دل میں جھانکتا ہوں جہاں ایک قوی تر قوت مجھے تاڑ رہی ہوتی ہے۔ یہی قوت ہر زندہ انسان کو ودیعت ہوئی ہے اس کا نام ضمیر ہے۔ اس کی نظر میں فرد اپنا خود احتساب کرسکتا ہے۔ اس سے بھی بالاتر قوت جو ہر لحہ ہر آن پورے نظام کائنات اور اس کی مخلوق کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس دائمی اور ابد آشنا قوت کی بے نیازی سے کون آگاہ نہیں۔ اس کی نظر میں ہمارا ہر کام ہے، ہر سوچ سے اسے آگاہی مگر اس کی قدرت کے بارے میں ہمارا علم محدود اور عقل عاجز ہے۔

تیس مار خاں ہو یا ملا نصیر الدین، شیخ چلی ہو یا چرچل، ہر فاضل نے تاڑنے کی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ شہزادہ سلیم تاڑنے میں اس قدر تاک تھا کہ اس نے شادی شدہ نور جہاں کو تاڑ لیا اور پھر ایسا تاڑا کہ اسے آنکھ کا تارا ہی نہیں شریک حیات اور دل کا سہارا بنالیا۔ تاڑنا حسینوں کا امتیازی وصف ہے اس میں ڈیانا یا سوہنی کی کوئی تخصیص نہیں۔ حسن جہاں ہوگا اور جس حال میں بھی ہوگا وہ تاک جھانک سے بے نیاز رہ ہی نہیں سکتا۔

زاغوں نے جب سے عقابوں کے نشیمن ہتھیا لیے ہیں اقدار و روایات کی زبوں حالی دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ لفظ کی حرمت سے ناآشنا الفاظ حشرات سخن نے کنگرو کی نرح ادھم مچار کھا ہے۔ یہ مرغ بادنما کی طرح منقلب کیفیات کو تاڑ لیتے ہیں۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے ہر وقت تاک میں رہتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ انھیں تاڑنے میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تاڑنے کا عمل مزید مقبول ہوگا اور تاڑنے کے رسیا اپنے راستے کی ہر دیوار ہٹا کر تاڑتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ تاڑنے کے اسی جنون کے ہاتھوں اپنا گریبان تار تار کر کے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہیں گے۔ جنھیں دیکھ کر لوگ انھیں تاڑ جائیں گے اور پکار اٹھیں گے۔ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں" ☆

سگ لیلیٰ (انیسویں قسط) پرویز یداللہ مہدی

تفتیش کے تیتر بٹیر

کوچہ جاناں سے رونگی ڈالنے سے قبل ایک بار اور درِ جاناں کو نگاہوں سے جی بھر کر چوما اور قدم بڑھاتے ہی تھے کہ ایک جیپ مخالف سمت سے آتی ہوئی دکھائی دی جس کی چھت پر جلتی ہوئی سرخ بتی صاف بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق محکمہ پولیس سے ہے۔ جیپ ہمارے قریب پہنچ کر رک گئی اور اس میں سے ایک عدد انسپکٹر اور دو عدد حولدار برآمد ہوئے۔ جیپ کی آہٹ پر درِ جاناں کے روبرو والے بنگلے کی اوپری منزل روشنی میں نہا گئی۔ پھر بالکنی میں ایک ہیولیٰ نمودار ہوا اور چلا کر بولا: "یہی مجرم ہے انسپکٹر صاحب! گرفتار کرلیجئے۔ آپ نے آنے میں دیر کردی۔ اس کا دوسرا ساتھی جیپ میں بیٹھ کر بھاگ گیا۔ یقیناً چوری کی جیپ ہوگی۔!!!"

اس نئی صورتحال نے ہمیں اس قدر بوکھلا دیا کہ ہماری زبان سے چاہتے ہوئے بھی ایک لفظ نہیں نکل سکا۔ انسپکٹر نے بالکنی والے شخص سے اونچی آواز میں پوچھا: "غالباً آپ ہی نے تھانے فون کیا تھا؟"

"جی ہاں! میں نے ہی فون کیا تھا۔" جواب ملا اور آگے اس نے یہ تفصیل بھی ہم پہنچائی۔ "تھانے فون کرنے کے بعد سے میں ان اچکوں کی ایک ایک حرکت چھپ کر نوٹ کرتا رہا۔ میرا خیال ہے یہ لوگ بدمعاشوں کے کسی بہت بڑے گینگ سے تعلق رکھتے ہیں کتے کی طرح بھونک کر کسی کو "کوڈ ورڈس" (Code-Words) میں خفیہ پیغام بھی دے رہے تھے۔" بالکنی والا شخص تو پولیس کا مخبر نکلا۔ اس کی مفصل رپورٹنگ پر ہماری حیثیت جو پہلے ہی انسپکٹر کی نظر میں ناقابل بھروسہ تھی اور بھی مشکوک ہوگئی۔ انسپکٹر نے فوراً اپنے دونوں حولداروں کو ہمارا گھیراؤ کرنے کا سگنل دیا تاکہ ہم بھاگ نہ سکیں۔ پھر وہ دوبارہ بالکنی والے مخبر سے مخاطب ہوکر بولا: "براتے مہربانی آپ نیچے تشریف لائیے۔"

"وہ کس لئے؟" مخبر نے اوپر ہی سے پوچھا۔

آپ کو ہمارے ساتھ گواہی کیلئے تھانے چلنا پڑیگا!" انسپکٹر کی زبانی تھانے کا ذکر سن کر مخبر نے اپنی پٹیاں تڑاتے ہوئے جواب دیا: "میں نے تھانے فون کرکے وقوعہ کی اطلاع دے کر ایک ذمہ دار شہری کا فرض ادا کردیا۔ آپ مجرم کو تھانے لے جایئے اور پولیس ڈپارٹمنٹ کی مشہور ڈگریاں اس پر آزما کر اصلیت اگلوایئے۔ میری نیند مت خراب کیجئے۔ گڈ نائٹ، شب بخیر، شبھ راتری!!" یہ کہہ کر پہلے وہ بالکنی سے گل ہوا پھر روشنی گل ہوگئی۔ انسپکٹر نے پہلے تو کچھ لمحوں تک غصے سے بالکنی کی طرف دیکھا پھر ایک موٹی سی گالی بالکنی کی طرف اچھالی۔ پھر اس نے غصیلے لہجہ میں حولداروں کو آرڈر دیا: "بٹھاؤ اس کو جیپ میں!" حولداروں نے حکم کی تعمیل میں ہمیں جبراً جیپ میں بٹھایا حالانکہ ہم نے کسی قسم کی مزاحمت یا احتجاج کا مظاہرہ بالکل نہیں کیا۔ اس کے باوجود حولدار ہمیں پیچھے سے برابر ٹھونسے اور دھکے لگاتے رہے کہ عادت سے مجبور تھے۔ یوں بھی خاکی وردی کی یہ خوبی ہے کہ اسے پہنتے ہی آدمی کا دل سخت اور بھیجہ گرم ہوجاتا ہے۔ حولداروں کے جبر کے باوجود ہم چپ رہے اور ہماری اس چپ میں یقیناً مصلحت تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ درِ محبوب کے روبرو کسی قسم کا تماشا ہو جس سے ہمارے محبوب اور اس کے محبوب یعنی سگِ محبوب کی نیند میں خلل پڑے۔

جیپ کے تھانے پہنچنے تک نہ تو انسپکٹر نے کچھ کہا نہ حولداروں نے کوئی بات کی۔ البتہ تھانے پہنچتے ہی انسپکٹر نے اپنے

انچارج کے روبرو ہمیں اس الزام کیساتھ پیش کردیا۔ "جناب عالی یہ شخص مشتبہ حالت میں آغا پورہ سات قندیل کے پاس پایا گیا۔ پوچھ گچھ کے دوران یہ چونکہ آپے سے باہر ہوگیا تھا اس لئے گرفتار کرکے یہاں لایا گیا ہے کیوں دو سو دو (202) ؟" انسپکٹر نے حولدار نمبر دو سو دو سے اپنی اس غلط بیانی کی تائید چاہی جو اسے فوراً مل گئی۔ حولدار دو سو دو بولا: " بالکل بڑے جناب عالی پوچھ تاچھ کے دوران میں اگر میں نے اسے دھوبی پچھاڑ نہ لگائی ہوتی تو یہ فرار ہوچکا ہوتا!" اس جھوٹی اطلاع پر انچارج نے اپنی سرخ آلو بخارا جیسی آنکھوں سے سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیا۔ پھر ٹھیٹھ پولیس والوں کی زبان میں کلام کیا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ بد کلامی کی۔ بولا: " کیوں چور قندیل، سون (7) قندیل کے پاس اتنی نائیٹ (Night) گئے کیا کر رہے تھے" اس طرز تخاطب پر ہم خون کے گھونٹ پینے کے علاوہ اور کیا کرسکتے تھے۔ ظالم کے بدن پر بھی خاکی وردی تھی۔ وہی خاکی وردی جو کسی بھی شریف شہری کی عزت کو خاک میں ملانے کا لائسنس ہوا کرتی ہے۔ دوسرے جناب عالی نے جس طرح انگریزی کے لفظ اپنے اردو کے جملے میں ملائے تھے اس سے ان کی غلامانہ ذہنیت کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ گویا موصوف ابھی تک انگریز کے دور میں جی رہے تھے۔ ہم نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے نہایت مودب لہجے میں جواب دیا۔ " جناب عالی میں وہاں چوری چکاری، لوٹ مار یا ڈکیتی کی نیت سے ہرگز نہیں گیا تھا!"

" تو پھر کس پرپز (purpose) سے یو وینٹ دیئر (you went there) ؟" انچارج نے اپنی خود ساختہ انگریزی اور اردو کھچڑی زبان میں پوچھا۔ عرض کیا: " دراصل میں وہاں کسی کی تلاش میں گیا تھا۔"

انچارج دانت پیستے ہوئے بولا: " تلاش؟ مطلب سرچ (search) ؟ کس کی سرچ میں گئے تھے وہاں، کسی تگڑے کسٹمر (customer) کی، کسی موٹی سیف (safe) کی ... سیدھی طرح اصلیت اگل دو ورنہ فنگر (finger) حلق میں ڈال کر اصلیت وامٹ (vomit) کروانا بھی آتا ہے مجھے۔ انڈر اسٹانڈ ...!!"

تھانے انچارج جن کی آنکھیں آلو بخارا جیسی اور چہرہ کدو کی طرح لمبوترا تھا، دھمکیوں کے زور پر ہم سے اس جرم کا اقبال کروانا چاہتے تھے جو ہم نے کیا ہی نہیں۔ سو ہم نے اپنی تمام تر ہمت یکجا کرکے ڈٹ کر کہا: " آپ چاہے انگلی تیڑھی کیجئے یا اپنا پورا پنجہ۔ ایک شریف شہری کو سازش کے جال میں پھانس نہیں سکتے۔ پوچھئے آپ کے انسپکٹر صاحب سے کوئی ثبوت ہے ان کے پاس میرے خلاف؟ کوئی وارنٹ ہے میرے نام؟ کوئی جرم کرتے ہوئے پکڑا ہے انھوں نے مجھے؟ کوئی چشم دید گواہ ہے ان کے پاس؟ ہمارے ان پے بہ پے قانونی اعتراضات کا ردعمل یہ ہوا کہ انچارج مہاشے نے اپنے لہجے کی خباثت کے ڈونگرے ہم پر برسانے کے بجائے غصیلی نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر گڑبڑا کر اپنی صفائی میں بولا: " تھوڑی دیر پہلے جناب عالی سات قندیل سے ایک فون کال آئی تھی کہ دو مشتبہ آدمی ایک بنگلہ میں تاک جھانک کی کوشش کررہے ہیں لیکن جب میں دو سو دو (202) اور چار سو چار (404) کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچا تو یہ شخص اکیلا تھا اور اس کا ساتھی رفوچکر ہوچکا تھا! کیوں چار سو چار (404) میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

" جی جناب، آپ پورے سولہ آنے یعنی کہ آج کے پورے سو پیسے ٹھیک فرما رہے ہیں۔" حولدار چار سو چار کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح بول اٹھا۔

انچارج نے جھنجھلا کر پوچھا: " اوئے! وہ شخص از وھیر (is where) ۔ کدھر ہے وہ جس نے تمہیں ان لوگوں کے بارے میں انفارم کیا تھا۔ اوئے کمپلینٹ (complaint) درج کروانے وہ تمہارے ساتھ ناٹ کم؟ انچارج موصوف نے پہلی بار قاعدے کی بات کی تھی۔ اگرچہ گفتگو بے قاعدہ تھی یعنی کھچڑی زبان میں تھی۔ انسپکٹر نے خالص دفتری زبان میں جواب دیا۔ " اصل میں جناب عالی شکایت کنندہ اپنی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔" اس نے من و عن مخبر شخص کے الفاظ دہرا دیئے اور آگے رازدارانہ لہجے میں بولا:

البتہ جناب عالی شکایت کنندہ نے اس مشتبہ شخص اور اس کے مفرور ساتھی کے بارے میں ایک ایسا انکشاف کیا جس کی وجہ سے اس مشکوک شخص کو ہیں تھانے لانے پر مجبور ہوگیا!" "دہاٹ! (what) انکشاف اوئے ؟ " انچارج موصوف دہاڑے ۔ جواباً انسپکٹر ہاتھ جوڑ کر بولا ۔ "وہ یہ جناب عالی کہ شکایت کنندہ نے بتایا کہ یہ اور اس کا ساتھی دونوں کتوں کی طرح بھونک کر کوڈ ورڈز میں کسی کو خفیہ پیغام دے رہے تھے ۔"

"دہاٹ! (what) " انچارج کی آلو بخارا جیسی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل کر طوطا پری آم جتنی ہوگئیں ۔ "کوڈ ورڈز میں سیکرٹ پیغام ۔ اوئے ، پھر تو یہ definately انڈر ورلڈ کا دو نمبری پٹھا ہے ۔ ہاہاہا ... "

ایک وحشی قسم کا قہقہہ انچارج کے حلق سے آزاد ہوا ۔ پھر باچھیں کھل گئیں جیسے غیر متوقع طور پر کسی ناقابل حل گتھی کا کوئی سرا اچانک ہاتھ لگ گیا ہو ۔ ایک بار پھر ٹٹولنے والی نظروں سے ہمارے سراپا کا جائزہ لیا اور اپنے آپ سے خود کلامی والے لہجے میں بولے ۔ "برسوں بعد آفٹر اے لانگ لانگ ٹائم ، انڈر ورلڈ کا کوئی بندہ "ہینڈ" میں آیا ہے ۔ اب انڈر ورلڈ کے ایک ایک بدمعاش کو گراونڈ کھود کر باہر نکالوں گا اور پھر ہاہاہاہا "

کھلم کھلا اپنے منصوبوں کے گرجتے اعلان کے بعد راست ہم کو مخاطب کر کے پوچھا : " انڈر ورلڈ میں ہو از یور باس اوئے ؟ کون ہے تمہارا باس ؟ "

"جناب والا مجھ سے کچھ پوچھنے سے پہلے ذرا اس کی وضاحت کر دیجئے کہ یہ انڈر ورلڈ ہے کیا ؟ " ہم نے بدستور ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے کہنا شروع کیا ۔ " جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے ، میرے حساب سے انڈر ورلڈ آسان زبان میں قبرستان کو کہتے ہیں ۔ "

جھنجھلا کر بولے : " اوئے ! اگر تم نے انڈر ورلڈ کے بارے میں اپنی ٹنگ (tongue) نہیں کھولی تو پھر silently تمہیں راتوں رات اسی انڈر ورلڈ میں دفنا دونگا جسے تمہاری ٹنگ میں قبرستان کہتے ہیں !! " یہ کہتے ہوئے موصوف نے سگار کا ڈبہ کھول کر ایک سگار منتخب کیا اور پھر اسے ہونٹوں میں دبانے کے بجائے اچانک کچھ سوچنے لگے ۔ غالباً اچانک کوئی منصوبہ انہیں سوجھا ہوگا ۔ سگار کا ڈبہ ہماری طرف کھسکاتے ہوئے بولے : " لو ۔ سگار پیو اوئے ۔ ارے تم ابھی تک اسٹانڈنگ پا ہجر کی طرح کھڑے ہو ۔ بیٹھ جاؤ ۔ پلیز سٹ ڈاون ۔ ڈونٹ اسٹانڈ اپ اوئے !! " ہم سمجھ گئے تھے اس اچانک مہربانی کا سبب ہمیں رام کرنا تھا ۔ موصوف نے انسپکٹر کو بھی وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا ۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی ۔ اس کے روانہ ہوتے ہی انہوں نے پھر ہم سے بیٹھ جانے کا اصرار کیا ۔ بیٹھنے کے بعد سگار کا اصرار شروع کر دیا ۔ اس سلسلہ میں جب ہم نے بھرپور معذرت چاہی تو تعجب خیز لہجے میں بولے " سرپرائزنگ ، انڈر ورلڈ کے آدمی ہوکر نو اسموکنگ اوئے ؟ شائد تم ایل ایس ڈی ، گرد ، ہیروئن وغیرہ کے عادی ہو ۔ "

"جناب عالی ! میں آپ سے ایک بار پھر دست بستہ عرض کرتا ہوں ۔ بخدا میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں ۔ " ہماری دست بستہ عرض بجائے اس کے کہ انہیں قائل معقول کرتی ۔ وہ پھر غیض و غضب کے گھوڑے پر سوار ہوگئے ۔ غالباً موصوف ان لوگوں میں سے تھے جن کی ناک پر مستقل غصہ دھرا ہوتا ہے ۔ ہمیں تو ان کی ناک پر اتنا زیادہ غصہ نظر آیا کہ اس کے نیچے دب کر ان کی ناک تقریباً ناپید ہوگئی تھی ۔ تب ہی تو ان کی نمبری عینک ناک کی جگہ پیشانی پر ٹکی ہوئی تھی اور عینک کے صحیح جگہ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ہر چیز دھندلی اور دہری یعنی کہ ڈبل نظر آرہی تھی ۔ حتیٰ کہ ہم بھی ایک نمبر کے بجائے دو نمبر کے آدمی دکھائی دے رہے تھے ۔ ☆

(جاری)

مزاحیے

کوثر صدیقی، گنوری روڈ، بھوپال

چل مست فضاؤں میں
کھیت ہیں سرسوں کے
مہکے ہوئے گاؤں میں

●☆●

کب تک میں سہوں دوری
ساتھ مجھے لے چل
کرلوں گی میں مزدوری

●☆●

دروازہ لگادوں گی
آج وہ آیا تو
بجلی بھی بجھا دوں گی

●☆●

پھر آم ہیں بورائے
باغ مہک اٹھا
ساجن نہ مگر آئے

●☆●

میں ہوں نری دیہاتی
شہری لپ اسٹک کی
تہذیب نہیں آتی

●☆●

اب کیسے ملن ہووے
سانجھ کو لیٹے تو
بھنسارے تلک سووے

گندا ہوا جمنا جل
گھر کا کنواں اچھا
دلی سے مجھے لے چل

●☆●

ہے شکر کہ لوٹ آئے
شہر سے تم لیکن
میرے لئے کیا لائے

●☆●

مضبوط پکڑلوں گی
پیار سے میں اس کو
بانہوں میں جکڑ لوں گی

●☆●

لڑنا ہے تو لڑلینا
پہلے گلے تو مل
پھر خوب جھگڑلینا

●☆●

کب تک یوں رلاؤ گے
کھیلنے تم ہولی
کب شہر سے آؤ گے

●☆●

ساون کی گھٹا چھائی
رات کٹی ساجن
لیتے ہوئے انگڑائی

تو گوپی ہے میں رادھا
ناچ دکھاؤں گی
آجا او مرے راجا

●☆●

جیسے ہی بجھی بجلی
بھیڑ سے بچ کر میں
جھٹ اس کے گلے لگ لی

●☆●

امرائی چلے جانا
آم کی کچھ کیری
میرے لیے بن لانا

●☆●

چنری نہ بھگوا لیسے
شام ہوئی ساجن
جاؤں گی گھر کیسے

●☆●

ابٹن سے نہا کر چل
ہاتھ میں ساجن کی
مہندی بھی رچا کے چل

●☆●

رشید انصاری
(جدہ سعودی عرب)

ڈاکٹر محمد یونس بٹ سے ملاقات

مشتاق احمد یوسفی نے کہیں "مطالعہ" کو عیاشی قرار دیا ہے اگر مطالعہ واقعی عیاشی ہی ہے تو ڈاکٹر محمد یونس بٹ نے گذشتہ صدی کے آخری دہے میں یہ عیاشی خوب کروائی ہے طنز و مزاح کے شائقین نے گذشتہ دس سالوں میں یونس بٹ کو غالباً سب سے زیادہ پڑھا ہے ہمارے اس دعوے کی اساس اس دلیل پر ہے کہ اس عرصہ میں سب سے زیادہ لکھا بھی یونس بٹ نے ہے 23 کتابیں ان کی شائع ہوئی ہیں اس کے علاوہ مختلف پاکستانی اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے ان کے کالم بھی بصد شوق پڑھے جاتے ہیں ایسے ہی اخبارات میں سے ایک جدہ سے شائع ہونے والا روز نامہ "اردو نیوز" بھی ہے جس میں ان کا کالم اردو نیوز کی اشاعت کے آغاز سے مستقلاً شائع ہوتا ہے خلیجی ممالک خاص طور پر سعودی عرب میں یونس بٹ کا کالم ہندوستانیوں میں بھی بے حد مقبول ہے ۔

عمرے و زیارت مسجد نبویؐ کی برکتوں سے فیض یاب ہو کر یونس بٹ نے ڈیڑھ دن جدہ میں گذارا اس مختصر سی مدت میں بٹ صاحب سے تفصیلی ملاقات تو ممکن نہ تھی تاہم راقم الحروف نے ان سے اتنی باتیں اقساط میں سہی کر ہی لیں کہ اسے انٹرویو کہا جاسکتا ہے ۔

ڈاکٹر یونس بٹ سے ہمارا پہلا سوال یہ تھا کہ "آپ جو اس قدر زیادہ لکھتے ہیں خاص طور پر کالم تو آپ بے تحاشہ لکھتے ہیں تو کیا اس زود نویسی سے آپ کا فن و معیار متاثر نہیں ہورہا ہے ؟ فی الحال نہ سہی مستقبل میں یہ خدشہ تو بہرحال رہے گا ۔"

"ہرگز نہیں" یونس بٹ نے بلا کسی جھجک یا ہچکچاہٹ کے ہمیں جواب دیا اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا کہ میں اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ لکھنے اور خاص طور پر کالم لکھنے کی وجہ سے تو میرے فن پر نکھار آرہا ہے کالم نویسی کے دوران نت نئے موضوعات پر طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے اصل اہمیت تو معیار کی ہوتی ہے اور معیار کی برقراری کیلئے کم یا زیادہ کی کوئی شرط نہیں ہے معیار برقرار رکھتے ہوئے بھی زیادہ سے زیادہ لکھا جاسکتا ہے جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کم لکھتے ہوئے بھی معیار برقرار نہ رہ پائے کم سے کم لکھنے والے بھی اکثر معیار کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے ہیں ۔ میں مطمئن ہوں کہ میری تحریروں پر زود نویسی کا اثر نہیں پڑتا ہے اور اگر پڑتا بھی ہے تو بہت کم اسے کوئی محسوس بھی نہیں کرتا ہے ۔

سوال: کیا آپ اپنے فن سے مطمئن ہیں اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اپنی بہترین تخلیق آپ پیش کر چکے ہیں ؟

جواب: میں خود اپنے فن سے قطعی مطمئن نہیں ہوں خوب سے خوب کی جستجو جاری ہے ہر تخلیق کے بعد گمان ہوتا ہے کہ میں اور بہتر لکھ سکتا ہوں مجھے اس سے بھی بہتر لکھنا چاہئیے

سوال: طنز و مزاح کے میدان میں نئے آنے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟ نئے لکھنے والے زیادہ آگے نہیں بڑھ پارہے ہیں اس کی کیا وجہ ہے ؟ TALENTS توقعات کے مطابق کیوں نہیں ابھر پارہے ہیں اہم ادیبوں مثلاً شفیق الرحمن، ضمیر جعفری، کرنل محمد خاں کی وفات سے پیدا ہوا خلاء پر کرنے والا سامنے نہیں آرہا ہے ؟

واب: ہمارے طویل سوال کا جواب بھی بٹ صاحب نے طویل ہی دیا بٹ صاحب کا کہنا ہے کہ صلاحیت کی بلاشبہ کوئی کمی نہیں ہے ان کے آگے نہ بڑھ پانے کی کئی وجوہات ہیں جن میں دو اہم ہیں ایک تو نئے لکھنے والوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو صلاحیت ہونے کے باوجود محنت سے جی چراتے ہیں تساہل پسندی کا شکار ہیں، کندن بننے کیلئے محنت، مشق و تجربات کی بھٹی میں پنے کا جذبہ کم رہ گیا ہے دولت و شہرت کے حصول کیلئے محنت و مشقت کا طویل و صبر آزما سفر کرنے کیلئے کوئی تیار نہیں ہے۔ دوسری طرف ذرائع ابلاغ کی ترقی و فروغ کی وجہ سے کام آسانی سے مل جاتا ہے جو مقام حاصل کرنے کیلئے ہم نے بے شمار صبر آزما راحل طے کئے تھے وہ مقام اب بڑی آسانی سے مل رہا ہے ایک وقت تھا کہ کالم نویس بننا آسان نہ تھا اب یہ آسان ہوگیا ہے دوسری طرف پیسہ پہلے کے مقابلے میں نہ صرف بہت زیادہ بلکہ بڑی آسانی سے مل رہا ہے ساتھ ہی ساتھ ستائش اور تحسین بھی بہت زیادہ اور جلد ہی حاصل ہورہی ہے اب نہ نقادوں کے کڑے تیور ہیں اور نہ ہی قارئین کی نکتہ چینی سے سابقہ ہے بے جا ستائش و توصیف پذیرائی سے بھی خاصہ نقصان ہورہا ہے ان تمام باتوں سے نفسیاتی طور پر بندے میں بڑے پن کا احساس پیدا ہوتا ہے اور جسے بغیر کچھ کئے " بڑا " مان لیا گیا ہو تو وہ بھلا محنت کیوں کرے۔ مجھے خود کالم نویس بننے کے لئے سخت محنت کرنا پڑی تھی لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ ذرائع ابلاغ کو متوازن و معتدل رویہ اپنانا چاہیئے نقادوں کو بھی اپنا رویہ بدلنا چاہیئے تاکہ نئے لکھنے والے نقادوں سے داد و ستائش پانا آسان نہ سمجھ لیں۔

اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر یونس بٹ نے بتایا کہ مزاحیہ نثر سے مزاحیہ شاعری کیونکہ آسان سمجھی جاتی ہے شعر فن کی کسوٹی پر اترے نہ اترے اگر سامعین کو شاعر ہنسانے میں کامیاب ہے تو وہ کامیاب مزاحیہ شاعر ہے اس لئے شاعری کے مقابلے میں لوگ نثر لکھنے کی جانب مائل کم ہورہے ہیں۔

سوال: کیا پاکستانی خواتین مزاحیہ یا طنزیہ نثر نگاری کی جانب مائل ہیں نیز اگر ایسا ہے تو ان کا معیار اور صلاحیتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب: خواتین عام طور پر طنز و مزاح لکھنے سے گریز کرتی ہیں ماضی میں بھی خواتین کا رجحان اس جانب کم ہی رہا ہے ہاں خواتین طنز و مزاح پڑھتی بہت شوق سے ہیں

سوال: آپ نے مزاح نگاری کی جانب کیسے رخ کیا ؟ کیا شروع سے ہی مزاح نگاری کا شوق تھا ؟

جواب: میری مزاح نگاری بلا ارادہ شروع ہوئی میں نے کوشش کی تھی کہ درد پر ایک انشائیہ لکھوں لیکن میرے لکھے ہوئے انشائیے میں مزاح زیادہ تھا جب مجھے بتایا گیا کہ تم میں مزاح لکھنے کی صلاحیت ہے تو میں نے خود بھی محسوس کیا کہ میرا فطری رجحان و میلان مزاح کا ہے تو میں نے مزاح لکھنا شروع کردیا

سوال: اپنے ادبی سفر کے بارے میں کچھ بتائیے ؟

جواب: میں نے زمانہ طالب علمی میں ہی لکھنے کی کوشش شروع کردی تھی ایم بی بی ایس تو میں نے 90۔1989 میں مکمل کرلیا لیکن 85-1984ء سے ہی میری تحریریں شائع ہونے لگیں تھیں نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن اور روز نامہ پاکستان سے کالم نگاری شروع کی بعد ازیں دیگر رسالوں اور جرائد میں بھی لکھنے لگا۔ اب تک 23 کتابوں کی اشاعت عمل میں آچکی ہے اور ایک کتاب زیر طبع ہے۔

سوال: ہندوستان کے مزاح نگاروں کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے ؟

جواب: ہندوستان میں بھی طنز و مزاح کا معیار خاصہ بلند ہے فکر تونسوی اور کنہیالال کپور کا طنز مجھ کو شروع ہی سے پسند ہے

یوسف ناظم کو بھی میں نے پڑھا ہے مجتبیٰ حسین بہت پسند ہیں پاکستان میں میرا ان سے تقابل کیا جاتا ہے ایک خیال یہ ہے کہ میرا طرز تحریر ان سے ملتا جلتا ہے مجتبیٰ صاحب سے ملاقات بھی نہیں ہوی ہے۔ رسائل و جرائید اور کتابوں کے دونوں ملکوں کے درمیان ترسیل و تبادلے کی صورت نہ ہونے کی وجہ سے بھی سرحد پار کے تازہ رجحانات اور میلانات اور تخلیقات کا پتہ آسانی سے نہیں چلتا اب دیکھیں کہ ان دنوں نوخیز گل نامی ایک باصلاحیت نوجوان تیزی سے ابھر رہا ہے لیکن بے شمار ہندوستانیوں کو اس بارے میں کوئی پتہ نہ ہوگا۔ ہندوستانی مزاحیہ شاعر خاصے مقبول ہیں میں نے مزاحیہ شاعری کم پڑھی ہے اس وقت نام بھی یاد نہیں آرہے ہیں اس لئے میں کچھ کہہ نہیں پاؤں گا۔

سوال: پاکستانی مزاح نگاروں میں آپ کس سے متاثر ہوے اور آپ کو کون زیادہ پسند ہیں؟

جواب: مشتاق احمد یوسفی سے میں بے حد متاثر تھا ان سے مجھ کو ترغیب و تحریک اور INSPIRATION ملا متاثر ہونے کی وجہ سے میں نے ابتداء میں ان کی تقلید بھی کی بعد میں بیشک اپنی راہ جدا کرلی میرے لئے وہ محترم ہیں اس کے علاوہ ابن انشاء مرحوم اور عطا الحق قاسمی بھی پسند ہیں۔

سوال: ہندوستان و پاکستان کے عوام کو ایک دوسرے سے قریب لانے کیلئے ادیبوں اور خاص طور پر مزاح نگاروں کے رول کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ بنیادی طور پر دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے سے قریب ہیں ایک دوسرے کے لئے دلوں میں خاصی محبت ہے نہ صرف ادیب و شاعر بلکہ دوسرے فن کار بھی ایک دوسرے کے ملک میں پسند کئے جاتے ہیں اور خاصے مقبول ہیں خیر سگالی کے دوروں اور وفود کے تبادلے بھی اس سلسلے میں خاصی افادیت کے حامل ہیں لیکن اصل وجہ دوری کی دونوں ممالک کی حکومتوں کے درمیان سیاسی مسائل کا حل ہونا ہے تنازعات ختم ہونے چاہئیں تب ہی قربتیں بڑھیں گی اور ادیب شاعر و فن کار زیادہ مؤثر اور متاثر کن رول ادا کرسکتے ہیں۔

سوال: خلیجی ممالک کے کئی شہروں خاص طور پر جدہ میں اردو زبان و ادب کیلئے جو کام ہورہا ہے اس کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب: جدہ ریاض دوحہ دبئی اور کئی خلیجی شہروں میں زبان و ادب کے فروغ کا کام متاثر کن ہے پاکستانی و ہندوستانی اردو کے فروغ اور ترقی کیلئے سنجیدگی اور خلوص سے کوشاں ہیں یہ شہر اردو کے نئے بین الاقوامی مراکز ہیں خاص طور پر جدہ لائق ستائش ہے یہاں سے اردو کا اخبار اور ایک رسالہ بھی شائع ہورہا ہے یہاں اچھا اور معیاری ادب تخلیق ہورہا ہے

میں نہ صرف جدہ بلکہ بیرونی ممالک میں مقیم تمام ادیبوں اور شاعروں سے درخواست کروں گا کہ یہاں جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ ہم تک بھی پہونچنا چاہئیے اس پر آپ کے ہم وطنوں اور ہر ملک کے اردو والوں کا حق ہے اسے صرف اپنی حد تک محدود نہ رکھیں اسے ہندوستان و پاکستان بھجوانے کے لئے باقاعدہ ایک نظام ہونا چاہیے ہر تخلیق اس کے خالق کے پاس اس کے قاری کی امانت ہوتی ہے اسے قاری تک پہونچانا ایک فرض ہے جس سے کوتاہی نہیں کرنی چاہیے یہاں جو تخلیقی کام ہورہے ہیں اسے ضائع ہونے سے بچانا ضروری ہے کسی صلاحیت TALENT کا ضائع ہونا ایک المیہ ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔

سوال: ہمارے شہر حیدرآباد دکن میں مزاح نگاروں کی ایک بے حد فعال تنظیم "زندہ دلان حیدرآباد" قایم ہے جو گزشتہ چالیس سال سے سرگرم عمل ہے۔ "شگوفہ" نامی رسالہ 30 سال سے زیادہ مدت سے پابندی اور تسلسل سے شائع ہورہا ہے کیا اس قسم کی کوئی

تنظیم فورم یا ادارہ پاکستان میں بھی ہے ؟ اسی طرح صرف مزاح کا کوئی رسالہ پاکستان سے شائع ہو رہا ہے ؟

جواب: جہاں تک میرا خیال ہے مزاح نگاروں یا مزاح سے دلچسپی رکھنے والوں کی کوئی مخصوص اور بڑی تنظیم ہمارے یہاں نہیں ہے مزاح پر رسالے شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کی اشاعت میں تواتر و تسلسل نہیں ہے ضمیر جعفری مرحوم نے "اردو پنچ" کے نام سے ایسا رسالہ نکالا تھا جو زیادہ چل نہیں پایا اور بھی رسالے ہیں مگر ان میں علاوہ طنز و مزاح کے دیگر موضوعات بھی ہوتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی صاحب ذاتی طور پر مزاح سے متعلق تقاریب کا انعقاد کرتے ہیں ادبی محافل میں بھی طنز و مزاح نثر و نظم کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر راقم الحروف نے ڈاکٹر محمد یونس بٹ کو "زندہ دلان حیدرآباد" کی سرگرمیوں اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی اس سلسلے میں کی گئی مساعی کا کسی حد تک تفصیل سے ذکر کیا۔ زندہ دلان کے جشن، عالمی کانفرنسوں، سیمینار و مشاعروں اور محافل لطیفہ گوئی کے بارے میں تفصیلات جان کر یونس بٹ صاحب نے اظہار ستائش کیا اور کہا کہ یہ سب کچھ نہ صرف جاری رہنا چاہیئے بلکہ قابل تقلید ہے

ساتھ ہی "شگوفہ" کی باقاعدہ اشاعت اور اس کے خاص نمبروں اور دیگر دلچسپیوں کے احوال سے بھی موصوف کو راقم الحروف نے آگاہ کیا جس سے یونس بٹ صاحب بہت متاثر ہوئے اور رسالے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

آخر میں آپ کو ہم مزید بتا دیں کہ طب کے پیشہ جراحی اور نسخہ نویسی سے ڈاکٹر یونس بٹ ریٹائر ہوگئے ہیں یہ ریٹائرمنٹ عمر کی وجہ سے نہیں ہے ان کی تو سنہ پیدائش 1962 ہے مضمون نویسی اور کالم نگاری کے علاوہ ان کی مصروفیات کا محور اب ٹی وی ہے ان کی تحریر کردہ سیریلیں خاص طور پر "فیملی فرنٹ" بے حد مقبول ہیں۔

ڈاکٹر یونس بٹ کا پتہ

ڈاکٹر محمد یونس بٹ A-164 جوہر ٹاؤن لاہور

●☆●

علیم خان فلکی
جدہ

طنز و مزاح کی ایک نئی آواز .... یونس بٹ

(ڈاکٹر یونس بٹ کی موجودگی میں یہ مضمون پیش کرنا میرے لئے ایک اعزاز ہے اور اس سے بڑا اعزاز یہ کہ پاکستان رائٹرز فورم نے مجھے یہ موقع دے کر اس احساس کو پختہ کیا کہ محبان اردو ادب کی شناخت ملک یا قوم سے نہیں ہوتی۔
یونس بٹ کو اتنا پڑھا کہ ان سے پہلی بار ملکر کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اس لئے میں بے جا تکلفات القابات خطابات تعریفات اور جتنے بھی " آت " اس ضمن میں ہوسکتے ہیں ان تمام کو نظر انداز کرتے ہوئے بٹ صاحب اور ان کے مضامین پر ایک مختصر سا جائزہ پیش کروں گا۔)

اردو نیوز کی اردو ادب کے لئے اہم خدمات میں یہ ایک اہم کارنامہ ہے کہ اس نے اپنی اجارہ داری کا مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے یونس بٹ کو ہر گھر میں پڑھا جانے والا ادیب بنادیا ورنہ پاکستان کے بے شمار اخبارات و رسائل میں چھپے یونس بٹ منظر عام پر آتے آتے مشتاق یوسفی کی عمر کو پہنچ جاتے ۔

پہلے پہل جب یونس بٹ کو شگوفہ (حیدرآباد دکن) میں پڑھا تو ان کا نام پڑھ کر اچنبھا ہوا۔ پی ٹی وی کے ڈراموں میں اکثر بٹ صاحبان اور چودھری صاحبان کو ڈنڈے یا کلاشنکوف بردار دیکھا ہے۔ ان کے بارے میں ہمارے ذہن میں کچھ اور ہی امیج تھا۔ یونس بٹ کو پڑھ کر ہمارے ذہن میں بیٹھے ہوئے بٹوں کے امیج کو دھکا لگا۔ دراصل مختلف امیج جو ذہن میں ایک عرصے تک رہتے ہیں ان سے وابستگی سی ہوجاتی ہے۔ آدمی کے خیالات و افکار کی عمارت انہی امیجس کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ اس لئے اس امیج کو باقی رکھنے کے لئے مجبوراً یونس بٹ کو پڑھا تحریر میں اتنی شوخی اور گہرائی تھی کہ پڑھتے ہی گئے اور ان کی بیشتر کتابوں کو پڑھنے کے بعد نہ صرف یونس بٹ سے بلکہ دنیا کے سارے بٹوں سے ایک انسیت سی ہوگئی ہر بٹ سے Sense of humour کی بو آنے لگی۔

بٹ صاحب خوش نصیب ہیں کہ ان کی زندگی میں ہی لوگ ان کو پڑھتے ہیں۔ زندہ رہتے ہوئے انھوں نے (۲۲) کتابیں شائع کرلیں اور پھر شادی کرلی۔ شادی کے بعد بھی اگر کوئی کتاب شائع ہوئی ہو تو ہمیں اس کا علم نہیں۔ بقول ضمیر جعفری۔ یہ تھے تو کنوارے لیکن فقرے بڑے حاملہ لکھتے تھے " ۔

ہم نے چھوٹے قد کے بڑے بڑے وزیر اور چھوٹے قد کے جج کے بڑے بڑے فیصلے دیکھے اس کے بعد سمجھ میں آیا کہ قد آور شخصیت کسے کہتے ہیں ورنہ ہم یہی سمجھتے رہتے کہ بڑی شخصیت بننے کے لئے قد کا لمبا ہونا ضروری ہے اور اس کوشش میں ہم نے لوگوں کے مشورے پر لٹکنا بھی شروع کردیا تھا۔ یونس بٹ بھی قد میں ایسے ہیں جیسے خود کہتے ہیں کہ انہیں دیکھنے والا خود کو لمبا محسوس کرتا ہے لیکن ان کا قلم اتنا بڑا ہے کہ بڑے بڑے قلمکار اب چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح میں ان کی شخصیت یقیناً قد آور بن چکی ہے۔ اپنی

اونچائی کو قائم رکھنے کے لئے ہم انہیں یہ مشورہ دینا چاہیں گے کہ انتخاب مضامین پر خود تبصرہ کریں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ بلندی پر پہنچنا کمال نہیں کمال یہ ہے کہ جس بلندی تک بھی پہنچیں وہاں ٹھہرے رہیں۔ اردو نیوز یا کسی اخبار و رسالہ میں شائع ہوجانا سند نہیں ہوتی۔ اخبار والے کسی کوچنے کے جھاڑ پر بٹھانا بھی جانتے ہیں اور ناریل کے درخت سے گرانا بھی جانتے ہیں۔ یقیناً ہر مضمون میں دو چار فقرے ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مضمون کو کتاب میں شامل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی وجہ سے مجموعی تاثر پر اثر پڑتا ہے۔ موتیوں کے ڈھیر میں بعض اوقات ہیرے دب جاتے ہیں۔ اس لئے ہیروں کی صحیح قیمت وصول کرنے کے لئے موتیوں کو کم کرنا لازمی ہے۔ ہر مضمون کو کتابی شکل دے کر قاری پر انتخاب کی ذمہ داری ڈال دینے سے مجھے ڈر ہے کہ آپ کے اصلی فن کی قدر دانی میں کمی ہوجائے گی۔ ویسے بھی آج کا قاری مشتاق یوسفی کی اس بات کو ذہن میں رکھ کر پڑھتا ہے کہ ہر مصنف تین کتابوں کے بعد اپنے آپ کو دوہرانے لگتا ہے۔ چونکہ آپ نے اپنے فن کو تاکید کی ہے کہ اپنے احساسات سے آگاہ رکھے۔ اس لئے عرض کررہا ہوں کہ آپ کی تحریروں میں پاکستانی ماحول غالب ہے۔ آپ کے زیادہ تر قاری تارکین وطن ہیں۔

ایسے بے شمار بٹ اور چودھری آپ کو یہاں ملیں گے جو وہاں تو ذرا سی مزاج کے خلاف بات ہو تو ٹھوک کے حساب سے بندے کو مار دیتے ہیں لیکن یہاں بڑی سے بڑی ناانصافی اور حقوق انسانی کے استحصال کو دیکھ کر بھی دم دبائے خاموش رہتے ہیں۔

یونس بٹ مختلف شخصیات کے کراماً کاتبین کا کام آسان کرتے رہتے ہیں اب ان کے نامہ اعمال کا جائزہ لینا اپنے منکیر نکیر کے پوشیدہ رجسٹروں کو کھلوانے کا موقع دینا ہے ویسے یونس بٹ کے قلم کا شکار ہونے کے لئے مجھے نواز شریف یا امجد اسلام امجد کے مقام تک پہنچنا لازمی ہے جو کہ ناممکن ہے کیوں کہ میرے سر اور تالو پر ابھی پورے بال موجود ہیں۔

لفظوں اور جملوں کی کرتب بازی یونس بٹ کی انفرادیت ہے بعض اوقات تو جملوں سے کھیل کر وہ الٹ پھیر کر دیتے ہیں کہ بندہ ہکا بکا رہ جائے اور قاری قہقہہ لگانے پر مجبور ہوجائے جیسے:

* ۔احمد ندیم قاسمی کو انگلش پر بہت عبور ہے بولتے ہیں تو لگتا ہے واقعی عبور کیا ہے۔
* ۔SO۔CIA۔LIST اس میں سوشلیسٹ کی حقیقی تعریف موجود ہے جس پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔
* بے نظیر اپنے والد کے "نقشِ قدم" پر چل رہی ہیں۔
* عورتوں نے بڑی "نند و جہد" سے اپنا مقام بنایا ہے۔
* عبدالستار نیازی ہم خیال جماعتوں سے اتحاد کرتے ہیں یعنی جوان کے "ہم" کا "خیال" رکھ سکیں۔

یونس بٹ نے اپنے پیشے سے خوب فائدہ اٹھایا ہے وہ سائیکالوجی کے ڈاکٹر ہیں ان کے طنز و مزاح کا اصل عنصر وہ نفسیات انسانی کا تجزیہ ہے جو قاری محسوس تو کرسکتا ہے لیکن بیان نہیں کرسکتا۔ گویا یہ نفسیات سے کھیلتے ہیں۔ انسانی مزاجوں کے نفسیاتی مطالعہ کے ذریعے کسی بھی مزاج کے حال ماضی اور مستقبل کے بارے میں آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس لئے عجب نہیں کہ لوگ یونس بٹ کو ولی سمجھنے لگیں۔ سائیکالوجی اگرچہ فلسفے ہی کا ایک ذیلی مضمون ہے لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو ایک خواب اور ایک حقیقت میں ہوتا ہے۔ فلسفی اندازے لگاتا رہ جاتا ہے اور سائیکاٹرسٹ حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور اگر وہ یونس بٹ ہو تو صرف ایک دو فقروں میں بڑی بڑی گتھیاں سلجھا دیتا ہے۔ بڑے بڑے رازوں سے پردے اٹھا دیتا ہے یہاں یونس بٹ میں آپ کو صرف ایک مزاح نگار ہی نہیں ایک فلسفی بھی نظر آئے گا۔ جیسے:

* مشکل کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ بڑی آسانی سے شروع ہوجاتی ہے۔

* اگر شیطان نہ رہے تو سب فرشتے ہوجائیں۔ ہمیں انسان رہنے کے لئے شیطان چاہئے۔
* سائنس داں یہ سوچتا ہے کہ چوزہ انڈے سے باہر کیسے آتا ہے اور مولوی یہ سوچتا ہے کہ چوزہ انڈے کے اندر کیسے جاتا ہے۔

طنز اگر مزاح کے بغیر ہو تو صرف ایک احتجاج بن کر رہ جاتا ہے اور مزاح میں پوشیدہ کوئی تلخ حقیقت اگر قاری تک نہ پہنچے تو وہ صرف مذاق یا لطیفہ بن کر رہ جاتا ہے۔ طنز ایک کڑوا سفوف ہے جو مزاح کی کیپسول میں بند ہو تو مسیحائی کا کام کر جاتا ہے۔ یونس بٹ کے طنز میں مزاح اور مزاح میں طنز اس قدر پیوست ہیں کہ قاری کے ذہن میں مکمل پس منظر گھومنے لگتا ہے۔ قاری محظوظ بھی ہوتا اور سنجیدگی سے سوچنے بھی لگتا ہے۔

"پاکستان میں تیرہ چودہ کروڑ انسان اور بے شمار سیاستداں رہتے ہیں۔ سیاستداں اس دن مرتا ہے جس دن وہ فوت ہوتا ہے جب کہ بہت کم غریب اس دن تک زندہ رہتے ہیں جس دن ان کا انتقال ہوتا ہے۔"

"خودکشی کرنے والے کو برا کہتے ہیں حالانکہ وہ تو ایک برے آدمی کو ختم کرنے والا ہوتا ہے اس سے بڑا آدمی اور کون ہوگا کہ جو اپنے جرم کی سزا خود کو دے"۔

"اللہ تعالی نے اپنے برگزیدہ بندوں پر کتابیں نازل کی ہیں۔ کئی ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شیطان نے بھی اپنے برگزیدہ بندوں پر کتابیں نازل کی ہیں"۔

"آدمی کو احمد فراز ہونے میں دیر نہیں لگتی کہتے ہیں عورت سے باتیں کرنا غزل ہے کچھ شاعروں کو سنکر لگتا ہے عورتوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں"۔

طنز و مزاح میں شخصیات پر خاکے لکھنا ایک نازک فن ہے۔ بلکہ شعلوں سے کھیلنے کے برابر ہے۔ یونس بٹ اس کھیل میں ماہر ہیں لیکن کہیں کہیں چوک جاتے ہیں۔ شخصی خاکے اکثر ادیب کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔ ادیب قوم کا ضمیر ہوتا ہے وہ اپنے حالات کی تاریخ لکھتا ہے۔ اگر وہ مروت یا خوف کی وجہ سے دب جائے تو اس معاشرے کو بگاڑ سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس لئے ادیب کا مقصد جب تک اصلاح نہ ہو وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ایک بار وہ مخصوص شخص کے حق میں ایک پر خلوص دردمند کی حیثیت کو سوالے تو پھر وہ اپنی تحریر کے ذریعہ احتساب کا کام انجام دے سکتا ہے۔ یونس بٹ ایک حد تک اس میں کامیاب ہیں لکھتے ہیں:

* مسرت شاہین — فلموں میں ان کا وہی مقام ہے جو مولانا فضل الرحمان کا سیاست میں اور سیاست میں مسرت شاہین کا وہی مستقبل ہے جو فلموں میں مولانا کا۔
* فیض احمد فیض — ان کی 52 فیصد فکریں خواتین کی وجہ سے تھیں کیوں کہ خواتین آبادی کا 52 فیصد ہی تھیں۔
* اصغر خان — اپنے بیٹے عمر اصغر پر گئے۔ ریٹائرڈ ایر مارشل کہلاتے ہیں لیکن لگتا ہے ریٹائرڈ صرف ایر ہوئی ہے مارشل نہیں بلامقابلہ بھی کھڑے ہوں تو ہار جائیں۔
* قتیل شفائی — ہم یہ نہیں کہتے کہ سب ان کو جانتے ہیں۔ کیوں بہت سے لوگ ان کی عزت بھی کرتے ہیں۔
* مسلم لیگ — جماعت اسلامی میں ایک امیر ہوتا ہے مسلم لیگ میں سبھی۔
* نور جہاں — کبھی بچوں کو نصیحت نہیں کی کبھی کی تو بچوں نے ہی کی۔
  اچھی کیریکٹر ایکٹر ہیں کیوں کہ جہاں کیریکٹر ہو وہیں ایکٹر لگتی ہیں۔

● عبدالعزیز خالد یہ وہ نائٹ کلب ہے جو دن کو بھی کھلا رہتا ہے۔
● میاں طفیل انہوں نے جماعت کے لئے بڑے بڑے کام کئے جن میں سے ایک یہ ہے کہ امارت سے معذرت کرلی۔
● نوابزادہ نصر اللہ خاں مارشل لا میں جمہوریت کی اور جمہوریت میں مارشل لا کی راہ چلتے ہیں اس لئے ہمیشہ راہ ہی میں رہتے ہیں۔
● بیگم عابد حسین پہلی بار جب گھر سے اسمبلی آئیں تو برقعہ پہن کر آئیں پھر اسمبلی کو گھر کر گئیں۔ پاکستان کلچر کی نمائندہ بنکر امریکہ گئی ہیں پہلے پاکستان میں امریکی کلچر کی نمائندہ تھیں۔
● مولانا کوثر نیازی زندگی میں کسی سے بے وفائی نہیں کی سوائے ایک شخص کے وہ ہے مولانا کوثر نیازی۔
● الطاف حسین ہر کام یقین سے کرتے ہیں حتیٰ کہ شک بھی۔
● بے نظیر بھٹو شروع میں اردو بولنا نہیں آتی تھی سننا تو اب تک نہیں آیا۔

قاضی حسین احمد پر ان کا خاکہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کی فکر مثبت اور ان کی تحریریں مقصدی ہیں۔ کہتے ہیں:

"رکے بھی ہوں تو لگتا ہے ہم سے تیز ہیں۔ وہ زمین کے اوپر نہیں چلتے زمین ان کے نیچے چلتی ہے۔ 1970 میں جماعت کے نظم میں ضبط ہوئے۔ اپنے والد اور جاوید اقبال کے والد سے بہت متاثر ہیں۔ جب بھی تقریر کرتے ہیں لگتا ہے یوم اقبال پر تقریر کر رہے ہوں۔ غصے میں سرخ رنگ ان کے چہرے کی طرح ہوجاتا ہے اگر کہدیں کہ ایوان حکومت میں زلزلہ لادیں گے تو اسی وقت یعنے ایک بج کر دس منٹ پر زلزلے کے جھٹکے ضرور آئیں گے۔ عربی فارسی انگریزی اردو اور پشتو وغیرہ ساری زبانوں میں بول سکتے ہیں۔ لیکن چپ کسی زبان میں نہیں رہ سکتے۔ قاضی صاحب مخالف کے لئے قاضی بھی ہیں اور حسین بھی۔ بلاشبہ یہ مصلیٰ افواج کے سربراہ ہیں۔"

یونس بٹ کا مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ تلخی محسوس تو ہوتی ہے لیکن حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص عورت اور شادی شدہ لوگوں کے بارے میں ان کے مشاہدات جو کہ انہوں نے کنوار پن میں زیادہ لکھے اور مسلمہ شادی شدہ مشاہدات ہیں جن کی بندہ شادی کرکے ہی صحیح طور پر داد دے سکتا ہے۔ مثلاً:

"کم سے کم لفظوں میں دنیا کا طویل ترین جملہ - میں نے قبول کیا"۔

"اللہ تعالیٰ نے عورت سے پہلے آدم کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ یہ کام کسی کے مشورے کے بغیر کرنا چاہتا تھا۔"

"مرد اس سے زیادہ پیار کرتا ہے جس کے بارے میں وہ اچھی رائے رکھتا ہو اور عورت اس سے زیادہ پیار کرتی ہے جو اس کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو۔"

"واجپائی کو اس عمر میں شادی کا آفر دینا دھمکی دینے کے برابر ہے"۔

"ساڑی وہ لباس ہے جس میں کسی لمحے یہ پتہ نہیں چلتا کہ پہن رہے ہیں یا اتار رہے ہیں"۔

"امریکی سپریم کورٹ نے مرد کو بیوی کی ڈاک کھولنے کا حق تو دیا لیکن ہمت نہ دے سکا"۔

ان کا کہنا ہے کہ دنیا میں ایک ہی احمق ہوتا ہے اور وہ دنیا کی ہر بیوی کے پاس ہوتا ہے۔ ہم اس خوش نصیبی پر مسز یونس بٹ کو مبارکباد دینا چاہتے تھے لیکن وہ آئیں نہیں۔ واجپائی کے شادی نہ کرنے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی تھی کہ انہیں یقین ہے کہ وہ مزید بڑے ہوں گے۔ یونس بٹ کو شاید یقین ہوگیا کہ یہ مزید بڑے نہیں ہوں گے اس لئے گھبرا کر انہوں نے شادی کرلی۔ ☆

محمد یونس بٹ
(پاکستان)

مسکراہٹ بیگم

پی وی اور ٹی وی میں یہ فرق ہے کہ ٹی وی کی نشریات کے محدود اوقات میں جبکہ پی وی کے معاملے میں یہ سب آپ کی اوقات پر منحصر ہے لیکن بی بی سی ٹی وی ایک تو پی بی اوپر سے ٹی وی گویا بہت ہی ٹی وی۔ گذشتہ دنوں بی بی سی نے بڑی بی بی سی بات کی۔ اس نے ایک ایسا پروگرام نشر کیا جسے دیکھ کر ہم ابھی تک مسکرا رہے ہیں۔ یہ پروگرام نامی گرامی گلوکارہ مس سینڈی کا تھا۔ یہاں گرامی سے مراد گراموں میں موصوفہ کا وزنی ہونا نہیں، اگرچہ وہ دیکھنے میں ہماری ایک اداکارہ سے ملتی ہیں۔ جنہیں ایک صحافی نے موصوفہ کہا تو ناراض ہوگئیں کہ اس نے ہمیں منہ صوفہ کہا۔ بہر حال اس انٹرویو میں مس سینڈی نے کہا ہے کہ مجھے ہزاروں نوجوانوں کے والدین نے شادی کی درخواستیں دی ہیں۔ میں آئندہ ماہ ایک تقریب میں سب کو مدعو کروں گی جہاں جو زیادہ دیر تک مسکرائے گا اس سے شادی کرلوں گی۔

بی بی سی کی اس بی بی کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر ہزاروں نوجوانوں کے والدین نے ہی موصوفہ کو شادی کی درخواستیں کیوں دیں۔ نوجوانوں نے کوشش کیوں نہیں کی۔ شاید محترمہ نے مسکراہٹ کی یہ شرط رکھی ہی اس لئے ہو کہ شادی شدہ اور والدین قسم کے لوگوں کی چھانٹی ہوسکے کیونکہ شادی شدہ کو اتنا مسکرانے کی عادت نہیں ہوتی۔ شادی کے بعد تو یہ حال ہوتا ہے کہ کسی نے ایک شخص سے پوچھا آپ شادی شدہ ہیں؟ اس نے کہا نہیں دراصل میری ابھی ابھی کار چوری ہوئی ہے اس لئے آپ کو لگ رہا ہوگا۔ لوئیس سفیان بڑی مزے کی بات لکھتا ہے۔ "خاوند اور بیوی خوشیوں بھری زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک دن ان کی ملاقات ہوگئی" مس سینڈی کا تعلق فرانس سے ہے اگرچہ خواتین کے نام کے ساتھ مس دراصل ضرورت رشتہ کا اشتہار ہی ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ایک صحافی نے مس سینڈی کا مس ان کے نام حصہ سمجھ کر پوچھا۔ "آپ شادی شدہ ہیں" تو اس نے کہا "نہیں۔ آج کل تو نہیں" فرانس میں لڑکیوں نے ایک تنظیم بنائی جس کی ممبر بننے کے لئے واحد شرط کنواری ہونا تھا۔ اس تنظیم کی سالانہ تقریب ہو رہی تھی جس میں صرف کنواری لڑکیوں کو ہی آنے کی اجازت تھی۔ ایک محترمہ اپنی پانچ سال کی بچی کے ساتھ تقریب میں گھس آئی تو انتظامیہ نے کہا آپ کو نہیں پتہ یہاں صرف کنواری لڑکیوں کو ہی آنے کی اجازت ہے۔ آپ ساتھ بچی لئے آرہی ہیں تو وہ بولی اسی لئے تو اسے لے کر آئی ہوں۔

ایک فرانسیسی نے کہا تھا ہماری عورتیں بناؤ سنگھار پر جتنا خرچ کرتی ہیں اتنا تو ہماری فوج کا بجٹ نہیں تو فرانسیسی عورت نے کہا جتنے کارنامے ہمارے مشہور ہیں لتنے فوج کے تو نہیں۔ نازک اندام فرانسیسی عورتیں چہرے کی جھریوں سے نہیں گھبراتیں بشرطیکہ وہ ان کے اپنے چہرے پر نہ ہوں۔ مس سینڈی کی سب سے خوبصورت چیز اس کی آواز ہے جس میں اس قدر سوز ہے کہ جب وہ گاتی ہے تو چلتے لوگ رک جاتے ہیں تاکہ اسے چپ کرا سکیں۔ ایک فرانسیسی سیاست دان نے کہا تھا میرے نزدیک آئیڈیل عورت

وہ ہوتی ہے جو اتنی خوبصورت ہو کہ میں اس سے شادی کے لئے تیار ہو جاؤں اور وہ اس قدر کم عقل ہو کہ وہ مجھ سے شادی کے لئے تیار ہو جائے ۔ یوں اس لحاظ سے سینڈی آئیڈیل نہیں ۔ ویسے بھی فنکار کا حسن اس میں نہیں اس کے فن میں ہوتا ہے ۔ بہر حال سینڈی روایتی فرانسیسی عورتوں کی طرح زن مرید خاوند چاہتی ہے ۔ اس لئے اس نے اس کے انتخاب کے لئے مسکراتے رہنے کی شرط رکھی۔

آج تک جتنی بھی شادیاں ہوئی ہیں کسی نہ کسی شرط پر ہوئی ہیں ۔ ایک خاتون نے تو اپنے عاشق کو کہا تھا میں صرف اس شرط پر شادی کروں گی کہ وعدہ کرو تم ہمیشہ غیر شادی شدہ رہو گے ۔ لیکن مس سینڈی والی شرط تو قصے کہانیوں میں بھی کسی نے نہیں رکھی۔ البتہ شادی کے بعد کی بات اور ہے ۔ مس سینڈی نے شادی کے لیے مسکراتے رہنے کی صلاحیت لازمی قرار دے دی ہے ورنہ شادی تو وہ کام ہے جس کے لئے کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں ۔ ایک وکیل سے کسی نے پوچھا " جنون " کی وجہ سے طلاق ہو سکتی ہے تو اس نے کہا اس کا تو پکا پتہ نہیں البتہ اتنا پتہ ہے کہ اس کی وجہ سے شادی ہو سکتی ہے ۔ اس سے قبل سر عام مرد ہی عورت کا انتخاب کرتے مگر اب عورتیں بھی اسی طرح خاوند چننے لگی ہیں لیکن وہ اس پر بھی خوش نہیں ۔ کسی نے ایک خاتون سے پوچھا کہ آپ کو کیسا خاوند چاہیئے ؟ تو اس نے ناراض ہو کر کہا آخر تم کیوں چاہتے ہو میں کسی کنوارے کی بجائے کسی خاوند سے شادی کروں ۔ کہتے ہیں دنیا میں سب سے نالائق اور بے وقوف شخص صرف ایک ہوتا ہے ۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر بیوی کے پاس ہوتا ہے ۔ بہر حال ہر خاوند میں ایک خوبی ایسی ہوتی ہے جو دنیا کے کسی اور مرد میں نہیں ہوتی ۔ ایک افریقی لڑکی نے اخبار کو اسی خوبی کا بتاتے ہوئے کہا " میرے منگیتر میں وہ خوبی ہے جو دنیا کے کسی اور مرد میں نہیں " پوچھا وہ کیا خوبی ہے ؟ بولی " وہ یہ ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ۔"

گلوکارہ ہونے کے ناطے مس سینڈی کو مسکراہٹوں کا مقابلہ کرانے کی بجائے گلوکاری کا مقابلہ کرانا چاہیئے تھا لیکن یہ شاید اس لئے نہیں کرایا گیا کہ اس مقابلے میں صرف ایک زبان کے لوگ آتے ۔ وہ نہ آسکتے جن کی زبان سینڈی نہیں جانتی ۔ سو اس نے مسکراہٹ کو چنا کیونکہ یہ وہ زبان ہے جو ہر ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ ہماری خواہش ہے کہ وہاں پاکستان کی نمائندگی کے لئے فلمسٹار رنگیلے کو بھیجا جائے تو یقیناً یہ مقابلہ جیت لیں گے ، کیونکہ ان سے طویل مسکراہٹ کس کی ہو سکتی ہے وہ تو مسکرا رہے ہوں تو لگتا ہے پورا محلہ مسکرا رہا ہے ۔ اتنی وسیع و عریض مسکراہٹ اور کہاں ملے گی لیکن رنگیلا صاحب شادیوں کے معاملے میں محمد شاہ رنگیلا ہیں ۔ سو یہ ڈر ہے کہ وہ مسکرانے کی بجائے مس سینڈی کو دیکھ کر سنجیدہ نہ ہو جائیں ۔

استاد بڑے صدام حسین خان صاحب

ہمیں تو اب پتہ چلا ہے کہ صدام حسین " بڑے استاد " ہی نہیں استاد بڑے صدام حسین خان صاحب بھی ہیں اور امریکہ پر ان کے بہت سے احسانوں میں ایک احسان امریکی موسیقی پر بھی ہے ۔ یہ بات امریکیوں نے آج تک شاید اس لئے چھپاتے رکھی کہ کہیں صدام حسین رائلٹی نہ مانگ لیں ۔ یہ تو اتفاقاً موسیقی کی ایک تقریب میں صدر بش کے منہ سے نکل گیا کہ مجھے موسیقی سے بس اتنا ہی لگاؤ ہے کہ جب صدام حسین کا کوئی بیان پڑھ کر طبیعت خراب ہوتی ہے تو موسیقی سے دل بہلاتا ہوں ۔ جس سے جہاں یہ پتہ چلا کہ صدام نے موسیقی کو فروغ دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے وہاں یہ بھی لگتا ہے کہ جونہی صدام حسین کا امریکہ کے بارے میں کوئی بیان چھپتا ہوگا امریکی اپنے صدر سمیت کیسٹیں خریدنے کیلئے سٹوروں کی طرف بھاگ اٹھتے ہوں گے ہو سکتا ہے گلوکار باقاعدہ انتظار کرتے ہوں کہ صدام حسین کا بیان آئے اور وہ اپنی کیسٹیں ریلیز کریں تاکہ وہ ہاتھوں ہاتھ بک سکیں ۔

جیسے ہمارے ہاں قیمت کی جمع قیامت ہوتی ہے ایسے ہی صدام امریکیوں کے لئے صدمے کی جمع ہے ۔ مسلم ممالک کو تو صدام

حسین کا صرف یہی فائدہ ہوا ہے کہ لوگوں کو اپنے بچوں کا نام رکھنے کے معاملے میں پریشان نہیں ہونا پڑتا۔ ہمارے ایک دوست نے بھی اپنے بیٹے کا نام صدام حسین رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد اس نے بدل کر خدام حسین رکھ دیا۔ کسی نے مشہور فاسٹ بالر للی سے پوچھا آپ کی پسندیدہ موسیقی ؟ تو اس نے کہا میری بال مخالف بیٹسمین کے سر سے ٹکرانے کی آواز۔ ایسے ہی صدام حسین کی پسندیدہ موسیقی امریکیوں کے چلانے کی آواز ہے۔ ویسے بھی امریکی موسیقی ایسی ہے کہ ایک شخص نے امریکی گلوکار کو گاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ گاتے کیوں ہیں ؟"

"تاکہ چلا سکوں"

"آپ چلاتے کیوں ہیں ؟"

"کیونکہ میں گا نہیں سکتا"

بہر حال اب پتہ چلا ہے کہ امریکی موسیقی میں گانا کم اور چلانا زیادہ کیوں ہے۔ ہمارے گلوکار پکا راگ گاتے وقت جیسا منہ بناتے ہیں ایسا تو امریکیوں کا صدام کا نام سن کر ہی ہوجاتا ہے۔ ویسے امریکی موسیقی سنتے وقت کسی دوسرے کی بات نہیں سنتے۔ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ موسیقی کی آواز اس قدر بلند ہوتی ہے کہ دوسرے کی آواز ان تک پہنچتی ہی نہیں۔ میرے پاس کوئی امریکی بیٹھا ہو تو میں شور کے خلاف کوئی بات نہیں کرتا کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں ان کے میوزک پر تنقید کر رہا ہوں۔

موسیقی روح کی غذا ہے اسی لئے امریکی گلوکار گا رہے ہوں تو لگتا ہے کہ کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صدام حسین فوجی آدمی ہے، جس دن کسی فوجی کو نہ دیکھنا چاہے اس روز شیشہ نہیں دیکھا۔ فوجیوں کو بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ ہوتا ہے بس فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ ہاتھ اور منہ سے موسیقی پیدا کرتے ہیں فوجی پاؤں سے پیدا کرتے ہیں ان کی پریڈ موسیقی میں شامل ہے اسی لئے تو ہٹ موسیقی کو ہٹ پریڈ کہتے ہیں۔

پہلے ایسے گلوکار ہوتے تھے جو راگ چھیڑتے تو جنگل میں آگ لگ جاتی۔ اب تو ایسے ہیں کہ راگ چھیڑیں تو سننے والوں کو لگتا ہے کہ ہمیں چھیڑ رہے ہیں۔ البتہ ان کے راگ سے آگ اب بھی لگتی ہے مگر سننے والوں کو۔ لیکن استاد بڑے صدام حسین خان صاحب نے ایسا راگ چھیڑا کہ ریت میں آگ لگا دی پانی تیل کی طرح جلنے لگا اور تیل پانی کی طرح بہنے لگا۔ اسی لئے انہی دنوں استاد روشنی خان صاحب نے اخباری بیان دیا تھا کہ خلیج کی لڑائی راگوں کو بے وقت گانے کی وجہ سے ہوئی ہے ہمیں یہ اس لئے بھی ٹھیک لگا کہ ہم نے خود اپنے محلے میں راگوں کو بے وقت گانے پر کئی لڑائیاں ہوتی دیکھی ہیں۔ یہی نہیں استاد روشنی خان نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مجھے موقع دیا جائے تو میں ایسا راگ چھیڑوں گا کہ جنگ بند ہوجائے گی۔ یعنی عراق کویت کو خالی کر دے گا۔ امریکہ کویت کو "خود خالی" کرنے کے چکروں میں تھا ورنہ استاد روشنی خان کو کویت بلا لیتا اور وہ استاد بڑے صدام حسین خان صاحب ایسا توڑ کرتے کہ جہاں جہاں استاد روشنی خان کی آواز جاتی کویت خالی ہونے لگتا۔ استاد روشنی خان کو ایک بار کسی نے اپنے گھر محفل موسیقی پر بلایا۔ استاد نے پوچھا کیا سناؤں ؟ تو اہل خانہ نے کہا استاد جو مرضی سنائیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہمیں تو ساتھ والا مکان ہی خالی کروانا ہے ایک ایسے استاد کے والد نے بتایا کہ بیٹے کے گانے سے مجھے بڑا مالی فائدہ ہوا۔ دوسرے نے کہا مگر اس نے تو کبھی گھر سے باہر نہیں گایا تو والد نے کہا "اسی لئے مجھے ساتھ والا مکان آدھی قیمت پر مل گیا ہے۔" بہر حال استاد روشنی خان نے راگ گانا شروع کیا اور اس وقت تک گاتے رہے جب تک خلیج کی جنگ بند نہ ہو گئی اور جب انہوں نے گانا بند کیا تو ان کے محلے داروں کو واقعی یقین آگیا۔ جنگ بند ہو گئی

ہے ۔ یوں خلیج کی جنگ دراصل مقابلہ موسیقی تھا جس میں عراقی ہار گئے اور استاد بڑے صدام حسین خان صاحب جیت گئے ۔ آج کل سنا ہے وہ پھر کوئی نیا راگ چھیڑنے کی کوشش میں ہیں اس لئے استاد روشنی خان کو تیار ہو جانا چاہئے ۔

SEL FISH

خبر ملی ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد سے کویت میں مرد کم اور عورتیں زیادہ نظر آتی ہیں ۔ صاحب ہمیں تو اسی دن اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ کویت میں مرد کم ہیں جب عراق نے کویت پر قبضہ کیا تھا اور جہاں تک عورتوں کے زیادہ نظر آنے کی بات ہے تو ساری دنیا میں یہی حال ہے کہ دیکھنے والوں کو جتنی زیادہ ایک اکیلی عورت نظر آتی ہے کئی مرد مل کر اتنے نظر نہیں آتے ۔ پھر جنگ میں عورتیں بھی کام آئیں یہ الگ بات ہے کہ ایک کویتی جنگ میں ہلاک ہونے والی اپنی بیوی کی قبر پر زار و قطار رو رہا تھا تو کسی نے کہا اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہیں آجائے گی تو کویتی نے کہا اسی لئے تو رو رہا ہوں ۔ لیکن حکومت کویت نے عورتوں کو کم کرنے کیلئے سرکاری اعلان کیا ہے کہ کویتی فوراً دوسری شادی کریں اور جو یہ کرے گا اسے تین ہزار ڈالر انعام دیا جائے گا ۔ یہ دنیا میں پہلی بار ہے کہ شادی کرنے کی بہادری کا مظاہرہ کرنے والے کے لئے حوصلہ افزائی کے اعلان کا اعلان کیا گیا ہے ویسے بھی دوسری شادی کرنا بچوں کا کھیل نہیں بڑوں کا ہے ۔ ہم نے بڑے بڑوں کو دیکھا ہے مگر کوئی بھی ایک سے زیادہ بار دوسری شادی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔

نوجوان شاعر عباس تابش راتوں کو سڑکوں پر پھرتا رہتا ہے ایک بار ایک صحافی نے پوچھا " اتنی رات گئے گھر جاتے ہو بیوی کچھ نہیں کہتی ؟ " کہا " نہیں ۔ " پوچھا " کیوں ؟ " بولا اس لئے کہ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی ۔ تو صحافی بولا " پھر تم رات کو اتنی دیر تک گھر سے باہر کیوں رہتے ہو ؟ " اگرچہ شادیوں کی فی ایکڑ پیداوار عالی وڈ میں سب سے زیادہ ہے ۔ لیکن بیک وقت عرب جتنی بیویاں رکھتے ہیں اتنے تو ہمارے گھروں میں بچے نہیں ہوتے ۔ عرب شیخ تو جب دفتر سے باہر جاتے ہیں ملازم کو یہ کہہ کر جاتے ہیں کہ ہماری غیر موجودگی میں بیوی کا فون آئے تو اس کا نام پوچھ کر لکھ لینا ۔ سنگاپور میں یہ حکومتی شرط ہے کہ جتنے بچے پیدا کرو اتنے درخت لگاؤ اور وہاں جس گھر میں دور سے درختوں کے جھنڈ لہراتے ہوئے نظر آئیں سمجھ لیں کہ کسی عرب شیخ کا گھر ہے ۔ کویت میں اب یہ کام قوم کی خدمت کے زمرے میں آگیا ہے سو سنا ہے قومی خدمت کے جذبے سے سرشار وہاں کے کنوارے بھی دوسری شادی پر تیار ہو رہے ہیں کچھ یہ بھی پوچھ رہے کہ صرف ایک بار ہی دوسری شادی کرنے پر تین ہزار ڈالر ملیں گے یا ہر بار دوسری شادی کرنے پر ۔ بہر حال لگتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب مس کویت بھی کوئی مسز ہی ہو گی کیونکہ کویتی سلطان جابر الصباح سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ ایک اخبار میں یہ پڑھ کر کہ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا سب بڑا جہاد ہے ۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ہمارے کویتی کلاس فیلو بہت ناراض ہو گئے کہ آپ اپنے سلطان کے سامنے کلمہ حق کہیں ہمارے سلطان کا نام بیچ میں کیوں لاتے ہیں ؟

ویسے صاحب ہم تو یہ جانتے ہیں جو بیوی اپنے خاوند سے لڑائی نہ کرے یقین کر لیں وہ اسے خاوند سمجھتی ہی نہیں پھر جہاں کمان کرنے کے لئے دو دو ساسیں ہوں وہاں لڑائی کیسے نہ ہو ۔ کون سی بیوی ہے جس نے لڑ کر یہ نہ کہا ہو کہ میں اپنی ماں کے ہاں چلی جاؤں گی ۔ کبھی یہ وعدہ ہوتا ہے اور کبھی دھمکی ۔ آپ پوچھیں گے دونوں میں کیا فرق ہے ؟ تو صاحب اگر وہ ماں کے پاس چلی جائے تو وعدہ اور اگر یہ کہے کہ میں ماں کے پاس جا کر اسے یہاں لا رہی ہوں تو دھمکی ۔ بہر حال ہمیں تو لگتا ہے عراق کویت جنگ کے بعد حکومت ان کو لڑائی کی ٹریننگ دینا چاہتی ہے اور یہ ٹریننگ یونٹ گھر گھر کھولنا چاہتی ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے سلطان جنگ میں بزدلی دکھانے پر کویتیوں کو سزا دینا چاہتے ہوں ۔ ان کے پاس جیل تو اتنی بڑی ہے نہیں کہ انہیں قید کی سزا دیں سو وہ انہیں ان ہی کے گھروں میں عمر قید یا دینا چاہ رہے ہوں وہ بھی دوہری ہتھکڑی سے ۔ لیکن ہمیں تو یہ سزا عورت کو دی گئی لگتی ہے کیونکہ کسی شاعر کو سزا دینا ہو تو اس کا

طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی مشاعرے پر بلواؤ اور نہ پڑھواؤ ۔ عورت کو سزا دینا ہو تو اس کے خاوند کی شادی کرا دو ۔ یہ بھی ممکن ہے جنگ کے دوران غیر تسلی بخش کارکردگی پر حکومت کویت اخباروں کو سبق سکھانا چاہتی ہو کیونکہ کویت اتنا چھوٹا ملک ہے کہ ایک کویتی نے کہا میں پہلے روزانہ اخبار خریدتا تھا کہ نت نئی خبریں ملتی رہیں لیکن اب مجھے ایسی خبروں کے لئے اخبار کی ضرورت نہیں رہی، میں نے شادی کرلی ہے ۔ کویت کے "چھوٹا" ہونے کی وجہ سے ایک بار ایک شیخ صاحب کو اپنی دلہن دیکھ کر یہ کہنا پڑا آپ بڑی جانی پہچانی لگتی ہیں ۔ کیا واقعی آپ کی مجھ سے پہلے شادی نہیں ہوئی ؟

ڈچ کہاوت ہے پہلی شادی ڈیوٹی، دوسری حماقت اور تیسری پاگل پن ہے سو کویت میں یہ حماقت جب سے ڈیوٹی قرار پائی ہے شیخ صاحبان اس قومی فریضے سے بخوبی عہدہ براہ ہونے کے لئے دن رات ایک کررہے ہیں ۔ سنا ہے انہوں نے خوراک پر بھی خصوصی توجہ دینا شروع کردی ہے ۔ ہم نے پوچھا کیا وہ گھی مکھن کھا رہے ہیں ؟ پتہ چلا نہیں وہ فش پسند فرما رہے ہیں کیونکہ ایسے کاموں کے لئے فش ضروری ہوتی ہے ۔ ہم نے پوچھا "کونسی فش ؟" جواب ملا SEL-FISH

نقل مندی

کہتے ہیں نقل کے لئے عقل چاہئے حالانکہ اب تو عقل کی بھی نقل دستیاب ہے یوں عقلمندی اب نقلمندی ہو کر رہ گئی ہے ۔ مارکیٹ میں آپ کو ہر چیز کی نقل مل جائے گی ۔ اب تو وزیر تک نقلی ملنے لگے ہیں ۔ چند روز قبل حسنات نامی ایک شخص انار کلی لاہور کے سر رشتہ تعلیم کے ڈائریکٹوریٹ میں آیا اور خود کو وزیر ظاہر کرکے محکمہ تعلیم کے افسروں سے فراڈ کرنا چاہا ۔ لیکن انہوں نے بھی نقلی وزیر کو مہمان خصوصی کے طور پر بلا کر پودا لگوانے کے بہانے پکڑوا دیا ۔ اگرچہ خبر سے لگتا ہے کہ یہ سب محکمہ شجر کاری کی مہم کو سبوتاژ کرنے کے لئے کیا گیا ہے کہ اب تو ہم جیسا شخص بھی پودا لگاتا ہوا ڈرے گا کہ کہیں وزیر سمجھ کر دھر نہ لیا جاؤں، ویسے تو ہم بھی ایک ممبر کے اختلاف سے وزیر بننے سے رہے ہیں ۔ ہوا یوں کہ جب ہمارا نام رکھا جانے لگا تو ایک رشتہ دار نے کہا "وزیر" نام ٹھیک رہے گا مگر گھر کے ایک ممبر نے اختلاف کیا کہ وزیر زنانہ نام ہے ۔ ہمارے ایک ادیب دوست نے تو اس زنانہ نام کا بڑا سکوپ بتایا ہے کہ اگر کسی کا نام وزیر بی بی ہو اور اس کی شادی کسی اعظم نامی شخص سے ہو جائے تو وہ گھر بیٹھے وزیر اعظم کہلا سکتی ہے ۔ بلکہ اب تو لگتا ہے پاکستان میں خواتین اسی طرح وزیر اعظم بن سکیں گی ۔

وزیر وہ ہوتا ہے جو وہ نہیں کرتا جو اسے کرنا ہوتا ہے اور وہ کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا ہوتا ۔ ہمارے ہاں اسمبلی میں ہر تیسرا رکن وزیر ہے ، ہر پہلا رکن وزیر تھا اور ہر دوسرا رکن وزیر ہوگا ۔ اتنے وزیر ہیں کہ بچے ان پر گنتی سیکھ سکتے ہیں ۔ ایسے ہی ایک اخبار کے ایڈیٹر نے بہت زیادہ رپورٹر رکھے ہوئے تھے ۔ اسے پتہ چلا کہ شہر کی سب سے بڑی سڑک کے عین درمیان بجلی کے ننگے تار پڑے ہیں تو اس نے فوراً دو رپورٹر بھیجے ایک کو کہا "تم جاکر تار کو ہاتھ لگانا اور دوسرے کو کہا تم اس کی اسٹوری لکھنا" اگرچہ اتنا تو ہمیں نہیں پتہ کہ ان وزیروں سے اصل کیا کام لیا جائے گا ۔ اتنا پتہ ہے کہ ایک نئے وزیر اپنے دفتر گئے اور اسٹاف کے ایک بندے سے پوچھا "تمہیں پتہ ہے کہ میں کون ہوں ؟" تو اس نے کہا "سر ! آپ تشریف رکھیں ، میں ابھی پتہ کرکے آپ کو مطلع کرتا ہوں ۔"

ایکسل ہوف نے کہا ہے کہ اگر آپ سو فیصد ذمہ داری دو آدمیوں میں برابر برابر تقسیم کریں تو ہر کسی کے حصے میں ۱۰ فیصد آتی ہے ۔ یہی نہیں ہمارے دو ادیبوں نے مل کر ایک کتاب لکھی اور اسکی تقریب پر ایک نے کہا "اگر دوسرا کتاب لکھنے میں میری مدد نہ کرتا تو یہ کتاب اس سے آدھے وقت میں لکھی جا سکتی تھی" ۔ بہرحال وزیروں کے زیادہ ہونے سے کئی ملین ماہانہ کا خرچہ بھی نہیں بڑھا ،

ہمیں یہ مسئلہ بھی آن پڑا ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ جو وزیر ہمیں مل رہا ہے وہ اصلی ہے نقلی نہیں ویسے تو جو ہمیں مل رہا ہے وہ نقلی ہی ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں یہ پتہ کرنا ہو کہ دوسرا جھوٹ بول رہا ہے یا سچ، تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس سے پوچھو "آپ جھوٹ بولتے ہیں؟" اگر وہ کہے "ہاں" تو بات واضح ہے اور اگر وہ کہے "نہیں" تو وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک دور میں برطانیہ میں یہ پتہ کرنے کے لئے کہ یہ عورت جادو گرنی ہے یا نہیں، اسے باندھ کر دریا میں پھینک دیتے اگر وہ ڈوب جاتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ تو وہ جادو گرنی نہیں تھی اور اگر وہ بچ جاتی تو اسے جادو گرنی مان لیا جاتا اور ان دنوں جادو گری کی سزا موت تھی جو اسے ملتی۔ دور کیا جانا ہے بلوچستان میں اکبر بگٹی کے قبیلے میں یہ پتہ کرنے کے لئے کہ یہ اصلی مجرم ہے یا نہیں، اسے دو فٹ گہری ایک فٹ چوڑی دہکتے کوئلوں سے بھری کھائی میں ننگے پاؤں سات قدم چلایا جاتا ہے پھر بکری کے خون سے اس کے پاؤں دھو کر دیکھا جاتا ہے اگر اس کے پاؤں جلے ہیں تو وہ قصور وار اگر آگ نہیں جلاتی تو قصور وار آگ دھکانے والا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں ہٹلر نے اپنی کئی نقلیں تیار کر رکھی تھیں یعنی ہو بہو ہٹلر سے ملتے جلتے ہم شکل افراد اکٹھے کر رکھے تھے۔ ایک جرمن آفیسر کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اصل ہٹلر سے ہم کلام ہے یا نقلی سے، تو اس نے کہا "سر! آج میں نے ایک ہزار یہودی قتل کئے" تو ہٹلر نے بے ساختہ کہا "شاباش!" تو جرمن افسر فوراً بولا آپ اصلی ہٹلر نہیں ہیں کیونکہ صرف ایک ہزار یہودیوں کو قتل کرنے پر ہٹلر شاباشی نہیں دے سکتا۔" ذہنی آزمائش کے امتحان میں طلبہ کو ایک تصویر دی گئی، جس میں ایک شخص پولیس کی وردی پہنے چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ پتہ کرنا تھا کہ وہ اصلی پولیس والا ہے یا نقلی۔ ایک لڑکے نے تصویر دیکھتے ہی کہا "یہ نقلی پولیس والا ہے۔" ممتحن نے پوچھا "کیسے؟" لڑکے نے کہا "سر، اگر یہ اصلی ہوتا تو اس کا ہاتھ کبھی اپنی جیب میں نہ ہوتا"۔ لیکن صاحب! ابھی تک ہمیں یہ پتا نہیں چلا کہ اصلی اور نقلی وزیر کا فرق کیسے کریں گے۔ ہم نے آئی جے آئی کے ایک نمائندے سے پوچھا تو اس نے کہا "اصلی وزیر وہ ہو گا جو لوگوں کے کام آئے گا"۔ ایک ایسے ہی اصلی وزیر سے مقامی اخبار کے صحافی نے کہا "سر! آپ گھنٹہ لیٹ ہیں"۔ تو وزیر موصوف نے کہا "دراصل راستے میں، میں ایک اندھے کو سڑک پار کرانے لگ گیا" صحافی بہت متاثر ہوا اور پوچھا "لیکن سر! اس میں ایک گھنٹہ کیسے لگ گیا؟" تو وزیر نے کہا "گھنٹہ اس طرح لگ گیا کہ وہ اندھا سڑک پار کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

وٹامن بی۔ وی

امریکی سائنس دانوں نے کئی سالوں کی تحقیق کے بعد یہ اعلان کر دیا ہے کہ شادی کرنے سے دل کا دورہ نہیں پڑتا۔ اگر چہ یہ تو ہمیں بھی علم تھا کہ دل کا دورہ تب پڑتا ہے جب بندہ زیادہ سوچنے والا کام کرے۔ شادی پر کیسے پڑ سکتا ہے لیکن انہوں نے شادی کو دوا بنا کے پیش کیا ہے۔ شاید اسی لئے ان کے ہاں شادی بھی یوں ہی ہوتی ہے جیسے ہمارے ہاں دوائی استعمال ہوتی ہے۔ یعنی صبح دوپہر شام۔ ایک امریکی پاپ سنگر جوڑا شادی کرنے چرچ جا رہا تھا کہ راستے میں پٹرول ختم ہو گیا۔ دولہا نے ہونے والی دلہن سے کہا میں ساتھ والے پٹرول پمپ سے پٹرول لینے جا رہا ہوں پلیز جب تک میں آ نہ جاؤں کسی سے شادی نہ کرنا۔ ہمارے ہاں یادداشت کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کا نام بتائیں؟ تو امریکہ میں خواتین کی یادداشت کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ آپ اپنے پہلے خاوند کا نام بتا دیں۔ اور جو یہ نام نہ بتا سکے اسے ذہنی طور پر تندرست مان لیا جاتا ہے۔ البتہ اگر بچی سات سال سے چھوٹی ہو تو اس سے پوچھتے ہیں آپ اپنے "الد کا نام بتائیں؟ امریکی رائٹر میری میک کارتھی کے بقول ہم بیس ملین غسل خانوں کی قوم ہیں اور ہر غسل خانے میں ایک صاحب درد ہے شکر ہے۔ انہوں نے ماحول کے مطابق اس صاحب درد کی دوائی ڈھونڈلی ہے۔

ویسے دیکھا جائے تو یہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے ہمارے ہاں برسوں سے یہی ہوتا آیا ہے بڑے بوڑھے اکثر لاعلاج نوجوانوں کی اسی طریقہ علاج سے درستی کرتے رہے ہیں اردو ادب میں بھی دل کے درد کا علاج یہی تجویز ہوتا رہا ہے ۔ صبح دوپہر شام محبوب ۔ اب امریکیوں نے صرف یہ سہرا اپنے سر باندھنے کے لئے محبوبہ کی جگہ منکوحہ کردی ہے ۔ ہوسکتا ہے انہوں نے محبوبہ کی جگہ منکوحہ کو درد دل کی دوائی اس لئے قرار دیا ہو کہ وہ دوائی ہی کیا جو کڑوی نہ ہو ۔ بیوی دیکھنے میں کیپسول ہی کیوں نہ ہو مگر وہ لگتی گولی کی طرح ہی ہے ۔ خوف المیہ اور خوف اہلیہ کیسے نہیں ۔ بیوی کی تو تجاویز اور تجاوزات سے دل تنگ ہی رہتا ہے ۔ شاید اسی لئے بلونت سنگھ نے لکھا ہے کہ بیوی تو خود بیماری ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ اس کا علاج نہ کرایا جائے ویسے اتنا تو ہمیں بھی پتا ہے کو جو بیوی مہینے میں ایک بار بیمار نہ ہو یقین کرلیں وہ تندرست نہیں ہے ۔

سابق امریکی صدر روز ویلٹ نے کہا ہے کہ دل سخت ہونے سے بری چیز ایک ہی ہے اور وہ ہے دماغ کا نرم ہونا ۔ شادی کے لئے دونوں ضروری ہیں ۔ امریکہ میں دل کے روگ اسکول کے بچوں میں بڑھ رہے ہیں ۔ اگر چہ وہاں علاج ملاحظے کی اتنی سہولتیں ہیں کہ بچیوں کے ہر اسکول کے ساتھ میٹرنٹی ہوم کھولنے کا سوچا جارہا ہے ۔ لیکن اس میں ہم ان سے پیچھے نہیں وہاں اسکول میں طلبہ باپ بن جاتے ہیں تو ہمارے طلبہ کالج آنے سے پہلے ہی " دادے " بن چکے ہوتے ہیں ۔ ہوسکتا ہے یہ سب امریکہ کی " خاوند بناؤ " مہم کا حصہ ہو کیونکہ جو بندہ غلط بات پر معافی مانگے وہ عقلمند ہوتا ہے اور جو صحیح بات پر بھی معافی مانگے اسے خاوند کہتے ہیں ، اور امریکیوں کو خاوند سے اچھا کون لگے گا شاید اسی لئے عرب ممالک میں تیس سال کی عمر تک عورتیں سو فیصد اور مرد چار سو فیصد تک شادی شدہ ہوتے ہیں البتہ امریکہ کی اپنی صورتحال یہ ہے کہ ۳۰ سے ۳۵ سال کی عمر تک ۹۵ فیصد غیر شادی شدہ ہوتے ہیں جبکہ پندرہ سے بیس سال کی عمر میں صرف تیس فیصد غیر شادی شدہ ہوتے ہیں ۔

ہمارے ہاں دل میں درد ہونا تو بڑی خوبی مانا جاتا ہے ۔ ہمارے تو مشہور شعراء تک نے کہہ دیا ہے کہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ہوسکتا ہے آئندہ خود کو انسان ثابت کرنے کے لئے درد دل ہی نہیں ساتھ ای سی جی (ECG) رپورٹ بھی دکھانا پڑے ۔ پہلے تو ہم محبوب کو اپنے دل میں رکھتے ۔ اب تو اسے بھی الگ سے مکان لے دیتے ہیں ۔ یوں ہمارے ہاں دل کا مسئلہ شروع سے ہی طبی مسائل کی بجائے عائلی مسائل میں سے ایک رہا ہے ۔ مسرت نذیر کی ڈاکٹر ارشد سے کے تو چند سال بعد نذیر کو دل کی پھر تکلیف ہوئی دوائی افاقہ نہ ہوا تو ساتھی اداکارہ نے کہا بھئی ہم کو دوائی سے افاقہ نہ ہو تو ہم ڈاکٹر بدل لیتے ہیں ۔ سو اگر تم کہو تم ڈاکٹر بدلنے کے لیے وکیل سے بات کروں لیکن اس ریسرچ کے بعد تو لگتا ہے کہ دل کے مریضوں کو باقاعدہ مشوروں کے لئے ڈاکٹروں کی بجائے وکیلوں کے پاس جانا پڑے گا ۔ اور ڈاکٹروں کے نسخوں میں وٹامن بی کے ساتھ ساتھ وٹامن بی ۔ وی بھی لکھی ملے گی اور ساتھ درج ہوگا بچوں کی پہنچ میں رکھیں ۔ علامات برقرار ہیں تو قریبی میرج سنٹر سے رابطہ کریں ۔ ☆

● قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ تخلیقات پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں ۔

محمد یونس بٹ

مسلح شاعری

چند روز پہلے کی بات ہے ایک نوجوان نقاد پاک ٹی ہاؤس میں منیر نیازی پر تنقید کر رہا تھا کہ ایک دانشور نے اس کے کان میں کچھ کہا تو وہ فوراً تعریف کرنے لگا۔ ہم نے دانشور سے پوچھا "آپ نے کیا کہا تھا؟" وہ بولا "میں نے کہا تھا منیر نیازی صاحب نے پستول کا لائسنس بنوالیا ہے" ہم منیر نیازی کے واقف کار ہیں۔ کچھ کے نزدیک واقف کار اس کو کہتے ہیں جس سے آپ اتنے واقف ہوں کہ ادھار لے سکیں اور وہ اتنا واقف نہ ہو کہ آپ سے ادھار مانگ سکے۔ بہرحال ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ وہ شخص جس نے زندگی شاعری کے لئے وقف کردی اور شاعری زندگی کے لئے وقف کردی اسے اب پستول کی کیا ضرورت آپڑی؟ کسی شاعر کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے پیٹ سے ہوتا ہے لیکن منیر نیازی جینئس کی طرح سوچتے، بڑے لکھاریوں کی طرح لکھتے اور بچوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے مجھے بہت عرصہ پہلے ہی پستول لے لینا چاہئے تھا جس سے لگتا ہے اتنے برس وہ پستول کا کام اپنی زبان سے ہی لیتے رہے۔ شاعری کا تو ویسے بھی ہمارے معاشرے میں اس قدر احترام ہے کہ جیب کترے تک شاعر کی جیب نہیں کاٹتے۔ چند برس پہلے کی بات ہے ڈاکوؤں نے فلائنگ کوچ روکی اور ہر کسی کو لوٹنے لگے۔ ہمارے ایک مشہور شاعر اس میں سوار تھے ڈاکوؤں کو انہوں نے بتایا کہ میں فلاں شاعر ہوں تو ڈاکوؤں نے انہیں لوٹنے سے معذرت کرلی۔ بعد میں شاعر موصوف کے مداحین کہتے رہے کہ ڈاکو تک شاعر موصوف کے مداحین ہیں، جبکہ ناراضگین کہتے رہے کہ ڈاکوؤں نے اس لئے نہ لوٹا کہ یہ شاعر ہیں ان کی تلاشی پر کیوں وقت ضائع کریں۔ کراچی کے حالات ایسے ہیں کہ پہلے اس کے ساحل پر بچے ریت سے گھروندے بنایا کرتے تھے اب قبریں بناتے ہیں۔ سو جب اختر الایمان کراچی آئے اور ڈاکوؤں نے ان کی بیاض چھیننے کی کوشش کی تو ہم نے یہی سمجھا چونکہ کراچی میں زیادہ تر اسلحہ حکومت نے قبضے میں لے لیا ہے سو ڈاکو اس لئے بیاض چھیننا چاہتے ہوں گے تاکہ آئندہ اختر الایمان کا کلام سنا کر لوگوں کو لوٹ سکیں۔ لیکن جب لاہور میں روحی کنجاہی کی چار غزلیں دن دہاڑے ہتھیالی گئیں تو ہمیں پریشانی ہوئی روحی کنجاہی صاحب نے تو جب سے ہیئرنگ ایڈ لگوایا ہے تب سے انہیں سننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ انہیں دیکھ کر ہی اب لوگ چلا کر بولنے لگتے ہیں۔ سنا ہے آج کل وہ اپنے غزلیں بینک میں جمع کروانے کا سوچ رہے ہیں۔ اگرچہ کئی شاعر روحی کنجاہی صاحب سے حسد کرنے لگے ہیں کہ آخر ہماری غزلوں میں کیا کمی ہے؟ اس بار جب پنجاب یونیورسٹی میں کتاب میلہ لگا تو ہمارے ایک وسیع المطالعہ شاعر روز کتب میلے میں جاتے۔ بقول خامہ بگوش وہ اس لئے بڑے وسیع المطالعہ شاعر ہیں کیونکہ سارا سال مشاعرے پڑھتے رہتے ہیں، وہ روز سٹال پر اپنی کتابیں جوں کی توں دیکھ کر کہتے "شاعری دو قسم کی ہے مقبول شاعری اور معقول شاعری اور میں نے کبھی معقول شاعر اور شاعری بکتے نہیں دیکھی" اس دن ملے تو بڑے خوش تھے ہم نے پوچھا "کیا کوئی کتاب بک گئی؟" بولے "نہیں ایک چوری ہوئی ہے۔ یہی بات ہے اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اب کوئی کسی ایرے غیرے کی کتاب تو چرانے سے رہا" سو اس دور میں سب سے زیادہ خطرہ منیر نیازی صاحب کو ہی تھا سو انہوں نے اپنی شاعری کی حفاظت کے لئے پستول رکھ لیا ممکن ہے پستول کی حفاظت کے لئے انہیں الگ سے ملازم رکھنا پڑے۔ ویسے انہیں کار اور پستول چلانا نہیں آتا سو پستول چلانے کے لئے بھی انہیں کوئی نہ کوئی تو چاہئے ہوگا۔ پولیس پر انہیں اعتبار نہیں ورنہ ہماری پولیس یوں

حفاظت کرتی ہے جیسے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سر ظفراللہ خان نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا۔ان کے باڈی گارڈ سفید کپڑوں میں بیٹھے تھے۔ ایک صحافی نے پوچھا "یہ آپ کے ساتھ جو بندہ بیٹھا ہے یہ کون ہے ؟" تو سر ظفراللہ نے اپنے باڈی گارڈ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا "یہ وہ بندہ ہے جو اسے شوٹ کرنے کی کوشش کرے گا جو مجھے شوٹ کرے گا" اب شاعر اور ادیب پستول سے ملک کی نظریاتی اور اپنی نظر آتی سرحدوں کی حفاظت کریں گے ،ہوسکتا ہے آئندہ مزاحمتی شاعری کی بجائے مسلح شاعری ہونے لگے۔ آنے والے دور میں تو آپ کو کسی شاپنگ سنٹر جانا ہوتا تو دو دن پہلے آپ کو وہاں کے پارکنگ لاٹ میں بکنگ کرانا ہوگی اتنی ٹریفک ہوگی کہ سڑک کی دوسری طرف پہنچنے کا ایک ہی محفوظ طریقہ ہوگا وہ یہ کہ بندہ پیدا ہی دوسری طرف ہو۔ شاعر مشاعروں میں یوں زرہ بکتر ہو کر جائیں گے جیسے لگے مورچوں پر جارہے ہوں۔

اب ہمیں لگتا ہے کہ یسین قدرت صاحب مستقبل کے شاعر تھے جو برسوں قبل بھی غزل اور پستول اکٹھی نکالتے۔ کچھ پتہ نہ ہوتا پہلا فائر کس کا کریں گے شہزاد احمد صاحب پر پچھلے برس حملہ ہوا اس کے بعد سے ان کا کوئی شعر پڑھو تو یہی لگتا ہے جیسے آپ پر حملہ ہورہا ہے ان کو پروین شاکر نے کہا تھا شہزاد صاحب سنا ہے آپ بڑے پڑھے لکھے ہیں مگر آپ اپنے کلام سے اس کا دوسروں کو پتہ نہیں چلنے دیتے۔ محققوں کے نزدیک تو مسلح شاعری ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے ویسے ہماری شاعری میں چھری، نیزہ، تیر، برچھی، تلوار، گولیاں اور دوسرے اسلحے کا ہمیشہ بے دریغ استعمال رہا ہے اردو شاعری میں تو اسے محبوب ہی نہیں گردانتے جو گزرتے گزرتے قتل نہ کرتا جائے۔ ایسی شاعری ہماری ہاں ہی نہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئی چین میں کئی شاعروں کی ایسی شاعری صوبہ ہونان کے تاریخی شہر چینگ دی میں اڑھائی کلو میٹر لمبی دیوار میں چن دی گئی ہے۔ ممکن ہے شاعر نہ لے ہوں اسے دیوار نظم کا نام دیا گیا ہے جو شہر کو سیلاب سے بچانے والے ایک پشتے کے طور پر استعمال ہوگی چلو شاعری سے لوگوں کا بچاؤ ہوا۔ محقق کوشش کریں تو ممکن ہے وہ مسلح شاعری کے ساتھ ساتھ مسلح شاعر بھی دریافت کرلیں جیسے اثر لکھنوی صاحب نے دریافت کیا کہ کوئی فلسفے اور سائنس کی تھیوری ایسی نہیں جو میرے کلام میں پوشیدہ نہ ہو۔ غالب کی سائنسی شاعری پر تو سید حامد علی شاہ نے پوری کتاب لکھ ماری ہے جس سے لگتا ہے غالب نے اپنے Relatives سے تنگ آکر Theory of Relativity پیش کی تھی۔ بہر حال آج کل لوگ لکھنا نہیں چاہتے رائٹر بننا چاہتے ہیں حالانکہ حالات ایسے ہیں کہ شعر اور شیئر کے بھاؤ گرتے جارہے ہیں لیکن شاعری تو منیر نیازی کی شریک حیات ہے وہ کہتے ہیں میں نے پستول کے بغیر جو وقت گزارا وہ ضائع کیا۔ خیر ابھی بھی موقع ہے وہ اپنا ماضی بہتر بناسکتے ہیں کیونکہ جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ ماضی تبدیل نہیں کیا جاسکتا یہ وہ ہے جس نے ابھی اپنی یادداشتیں لکھی ہی نہیں۔ مانا زندگی اللہ کی نعمت ہے اس کے بغیر تو بندہ بے کار ہے لیکن وہ شاعری کیا جو مرنے کے لئے تیار نہ ہو، شاعر کو تو بستر مرگ پر بھی کوئی اچھا چہرہ نظر آجائے تو فوراً اس پر مرنے کے لئے تیار ہوجائے گا پھر سیاست دانوں نے تو اسلحہ اس لئے رکھا ہے تاکہ عوام سے اپنی آپ کو بچاسکیں، منیر نیازی صاحب اپنے آپ کے علاوہ اور کسی سے خود کو بچانا چاہتے ہیں، ویسے ممکن ہے انہوں نے اس لئے پستول لیا ہو کہ آج کل قبضہ گروپ متنازعہ اور پبلک پراپرٹی پر قابض ہونے میں ذرا دیر نہیں کرتے اور منیر نیازی پبلک پراپرٹی بھی ہیں اور متنازعہ بھی۔ ☆

بیحس الہ آبادی
117/1 جی ٹی بی نگر کریلی
الہ آباد۔ ۱۶

غزل

عشق نے دل کو مرے کر دیا چمگادڑ سا
عمر بھر کیلئے قسمت میں لٹکنا ٹھہرا

مجھ سے ملنے کیلئے رات کے سناٹے میں
چھت کی دیوار پہ زلفوں کا جھٹکنا ٹھہرا

وہ رقیبوں کو گلے بڑھ کے لگالیتا ہے
میری تقدیر میں دن رات بھٹکنا ٹھہرا

دھرنا دینے پہ مرے اس نے جو بلوائی پولیس
اس کے دروازے سے چپ چاپ سٹکنا ٹھہرا

حسن فطرت کی حفاظت کیلئے گلشن میں
پھول کے پہلو میں کانٹوں کا کھٹکنا ٹھہرا

اس نے جب داد نہ دی جذبہ دل کی میرے
دل کے ارمانوں کا تاروں سا چھٹکنا ٹھہرا

پیٹ بھرنے کی نہ صورت نظر آئی جب اسے
فلمی اسٹیج پہ دن رات مٹکنا ٹھہرا

وہ ملی آنکھ کہ ہر ایک سے لڑتی ہی رہی
دل کا زلفوں کی گھٹاؤں میں اٹکنا ٹھہرا

عشق نے چھین لیا لب کا تبسم بیحس
اور آنکھوں کے لئے اشک ٹپکنا ٹھہرا

☆●☆

یوسف یکتا
سکندر آباد

غزل

دیکھ کر ان کے ہاتھ میں ڈنڈا
میرا غصہ تو ہوگیا ٹھنڈا

یہ کہا مجھ سے مرغی والوں نے
روز کھاتے رہو میاں انڈا

پھول کو تھام کر جو ڈرتے تھے
ان کے ہاتھوں میں آگیا ہنڈہ

ظلم ڈھاتے ہیں وہ غریبوں پر
امن عالم کا تھام کر جھنڈا

●☆●

سراج نرملی

غزل

دیکھے جو ۔ وہ اندھا کیسا
بھاگے جو ۔ وہ لنگڑا کیسا

سر پر تیرے چندا چمکے
پاکٹ میں یہ کنگھا کیسا

ساٹھ ہے اس کی ستر میری
بوڑھی کیسی بوڑھا کیسا

تیری کرنی کا یہ پھل ہے
قسمت کا یہ رونا کیسا

میری لاٹھی ۔ تیرا بھینسہ
اس کا کیسا ۔ میرا کیسا

جلدی سراج الدین ! یہ کیسی
بے صبر اپن ایسا کیسا

☆●☆

شاہدؔ عدیلی
(مغلپورہ)

غزل

لباسِ پیر پر ہیں سب عقیدت مند حیراں سے
ہیں جتنے جیب بھی اس میں وہ لمبے ہیں گریباں سے

حیاتِ جاوداں پائی نہیں جب آبِ حیواں سے
ہوا کیا فائدہ مل کر سکندر کو خضر خاں سے

انہیں اشعار پر کچھ داد دی ہے یار لوگوں نے
چرائے تھے بدل کر لفظ جو غالبؔ کے دیواں سے

تعجب ہے کہ بیٹی اس کی ہے سوکھی ہوئی مچھلی
نظر آتے ہیں جس کے والدِ ماجد پہلواں سے

کئے ہیں کام ایسے بھی جو شیطاں کر نہیں سکتا
بھلا انسان نچلا بیٹھتا کس طرح شیطاں سے

ہیں سالم پاؤں والوں سے تو لنگڑے ہی بہت اچھے
کبھی لوگوں نے ان کو بھاگتے دیکھا نہ میداں سے

جہازوں سے تو اچھی ہے ہماری ناؤ کاغذ کی
نہ کچھ خدشہ مگرمچھ سے نہ کچھ اندیشہ طوفاں سے

نہ سوچا تھا کہ موٹے ہونگے وہ اور اس قدر ہونگے
اترنا ہوگیا دشوار اب آنگن میں دالاں سے

ہماری دوستی اعلیٰ پٹھانوں سے ہے اے شاہدؔ
صمد خاں سے ظفر خاں سے میاں خاں سے زماں خاں سے

●☆●

م۔ آصف آروی
برہ تیرا۔ پوسٹ آرہ

گزارش

اے مدیرِ محترم عزت مآب — آپ سے میری گزارش ہے جناب
اپنا پرچہ اب مجھے مت بھیجئے — ختم اسکا سلسلہ کر دیجئے
بات یہ ہے ایک دن وائف مری — طیش میں بولیں کرونگی خودکشی
تنگ ہوں میں روز کی تکرار سے — دور ہوں ان کے بہت ہی پیار سے
آپ جی کے ساتھ پہلے گفتگو — انکے لب پر آگیا اب تم اور تو
ہوچکا غارت مرا امن و سکوں — ماجرائے رنج و غم کس سے کہوں
انتظار اس کا مجھے تھا روز و شب — زہر کی شیشی اٹھائینگی وہ کب
آیا جو پرچہ نیا کل میرے گھر — پہلے بیگم کی پڑی اس پر نظر
اس میں اک مضمون مہمل ساتھا — "خودکشی کرنی حرام" عنوان تھا
تھا لکھا یہ بھی کرے جو خودکشی — مر کے وہ ہوگا یقیناً دوزخی
اس ورق کو غور سے پڑھنے لگیں — اور وہ اپنے ارادہ سے پھریں
خودکشی کا اب نہیں لیتی ہیں نام — تذکرہ جس کا تھا لب پر صبح و شام
جو بلا ٹلنے کو تھی سر سے مرے — دردِ سر پھر بن گئی میرے لئے
مختصر آصفؔ کا جملہ ہے یہی — آپکو میرا سلام اب آخری

●☆●

اختر بستوی

دوستوں کی محفل سے

سائیکل ہوائی جہاز سے ٹکرا گئی :

ایک کل ہند مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر فراق گورکھپوری کی ایک غزل کی زمین میں غزل پڑھ رہا تھا۔ درمیان میں وہ فراق صاحب کی غزل کا ایک شعر بھی پڑھ گیا جس پر سامعین نے بہت داد دی۔ فراق صاحب خود بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ ان سے چوری برداشت نہ ہو سکی۔ جب وہ نوجوان شاعر اپنی غزل ختم کر چکا تو انہوں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "کیوں بھی۔ تم نے میرا شعر اپنی غزل میں کیوں شامل کر لیا ؟"

نوجوان شاعر نے جواب دیا۔ "حضرت یہ شعر میں نے کہا ہے۔"

فراق صاحب نے فرمایا۔ "یہ ناممکن ہے !"

نوجوان شاعر بولا۔ "ناممکن کیوں ہے ؟ کیا ایسا ہو نہیں سکتا کہ میرا خیال آپ کے خیال سے ٹکرا گیا ہو ؟"

فراق صاحب نے برافروختہ ہو کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سائیکل ہوائی جہاز سے ٹکرا جائے۔"

دعوت اور دال :

لکھنو کے ایک رئیس نے کچھ مشہور شاعروں اور ادیبوں کو اپنی کوٹھی پر دعوت دی۔ اس میں احمد جمال پاشا اور عثمان غنی بھی مدعو تھے۔ جب میز پر کھانا چنا جانے لگا تو طرح طرح کی مرغن غذاؤں کے ساتھ ساتھ کچھ پلیٹوں میں دال بھی آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صاحب خانہ کو دال بہت مرغوب تھی۔ عثمان غنی صاحب کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے احمد جمال پاشا کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "اتنی عظیم الشان دعوت میں دال کی آمد کیا معنی رکھتی ہے ؟ بھلا کہیں دعوت میں بھی دال آیا کرتی ہے ؟" پاشا صاحب نے جواب دیا "کیوں نہیں حضرت ! لفظ "دعوت" میں سب سے پہلے حرف دال ہی آتا ہے۔"

دعائے نکاح :

ایک بار انور صدیقی صاحب اپنے دوست محمد علی صدیقی کی بہن کی شادی میں شرکت کرنے کیلئے بستی تشریف لائے۔ نکاح سے کچھ دیر پہلے ان کی بغل میں تارا شنکر ناشاد صاحب آکر بیٹھ گئے اور بہت ہی گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد قاضی صاحب نے نکاح پڑھانا شروع کیا۔ آخر میں جب سب لوگوں نے دعاء کیلئے ہاتھ اٹھائے تو غیر ارادی طور پر تارا شنکر صاحب کے ہاتھ بھی اٹھ گئے لیکن اس دعاء کا مقصد ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے نکاح کے اختتام پر انہوں نے انور صاحب سے پوچھا۔ "بھئی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شادی کے موقع پر حاضرین بزم کس چیز کیلئے دعاء مانگتے ہیں ؟" انور صاحب نے انتہائی سنجیدہ چہرہ بنا کر جواب دیا۔ "جو لوگ کنوارے ہوتے ہیں وہ یہ دعاء مانگتے ہیں کہ انہیں جلد از جلد بیوی مل جائے اور جو شادی شدہ ہوتے ہیں وہ اس بات کیلئے دعاء مانگتے ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے بیوی سے چھٹکارا مل جائے"۔ ☆ (بیسویں صدی، اپریل ۱۹۶۴ء)۔

☆●☆

پروفیسر نادم بلخی
بہار

بازغ بہاری
(من خوب می شناسم کی روشنی میں)

بازغ بہاری نے جائے پیدائش اور سنہ پیدائش کے بارے میں یوں فرمایا ہے :

سنہ بیالیس میں کھلا جو گل یہی وہ بندہ ہے
گاؤں میرا ہے اجے پور اور ضلع نالندہ ہے

سوانحی خاکے نے مجھے خبر دی کہ اشہب ادب کے شہسوار بننے کا جب ارادہ کیا تو انہوں نے میدان افسانہ نگاری میں سبک روی سے قدم رکھا لیکن آج سے بائیس تئیس سال پہلے افسانہ نگاری چھوڑ کر شاہراہ شاعری پر طنز و مزاح کا تازیانہ لے کر گامزن ہوئے ۔ بازغ سے میری ملاقات بذریعہ مراسلت ہوئی اس سے میں نے یہ نتیجہ برآمد کیا کہ طنز و مزاح کی بھرپور صلاحیت اللہ نے انہیں عطا کی ہے ۔ موصوف میں کوٹ کوٹ کر بزلہ سنجی بھری ہوئی ہے ۔ ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں کہ اور سنائیے ! بھائی جان کی تعداد کتنی ہے ؟ دو بہوں کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی عنایت کی اور لکھا ۔ ممکن ہے اس کی ضرورت پڑ جائے ورنہ بصورت دیگر پوتے پوتیوں کو ڈرانے میں کام آئے گی ۔ بازغ کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے حد درجہ متاثر کیا وہ ان کی کتاب کا انتساب ہے ۔ جسے انہوں نے اپنی والدہ مرحومہ مجیدہ بی بی اور والد مرحوم دیانت علی انصاری کے نام معنون کرتے ہوئے یوں ارشاد کیا ہے ۔ جن کی دعاؤں نے محمود کو بازغ بنا دیا " وہ ادب میں زندگی سے فرار کو کفر سمجھتے ہیں اور رجعت پسند نہ ہو کر ترقی پسندی کے رسیا ہیں ۔ اسی لئے وہ طنز و مزاح بطور ہتھیار استعمال کر کے گل قند چھوڑنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ انگوٹھا دکھانے کا نازیبا نہیں بلکہ زیبا عمل ان سے سرزد ہوتا رہے ۔ مثلاً :

میں نے مزاح و طنز کا گل قند چھوڑ کر
دنیائے رنج و غم کو انگوٹھا دکھا دیا

" من خوب می شناسم " بازغ کا پہلا شعری مجموعہ ہے اور اس کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ یہ بنگال کی تاریخ میں اردو کا پہلا ظریفانہ مجموعہ کلام ہے جس کی قیمت صرف چھ ہزار پیسے ہے ۔ جملہ حقوق غیر محفوظ اور اشاعت کی تعداد پس پردہ ہے ۔ مجموعی طور پر کتاب میں سنتالیس شعری تخلیقات ہیں ان میں ایک بھی آزاد نظم نہیں ہے ۔ مزاح و طنز کو بروئے کار لانے کے لئے شاعر نے دل میں چبھتے ہوئے قوافی کا استعمال کیا ہے ۔ یعنی ویسے الفاظ کی حیثیت رکھنے والے قوافی جو بذات خود ظریفانہ اور طنزیہ پہلو رکھتے ہیں ۔ جگہ جگہ انگریزی الفاظ بطور قافیہ برت کر کلام میں یہ تیور پیدا کیا ہے جس کے نتیجے میں طنز و مزاح سے بھری ہوئی معنویت عیاں ہوتی ہے ۔ مثلاً : ہو آر یو ۔ شٹ اپ ۔ ایڈیٹ ۔ ٹکنی کلر وغیرہ ۔

ان کے کلام میں ایسے بھی کافی اشعار ہیں جن کے پہلے مصرعے کے خالق تو بانرغ ہیں اور دوسرے مصرعے دوسرے شاعروں کے ہیں۔ بانرغ نے ایسی تضمینوں میں طنز و مزاح کی جدت طرازی سے کام لیا ہے جو قابلِ ستائش ہے۔

حاجی سعید سے جو ملاقات ہوگئی
لب تھرتھرا رہے تھے مگر بات ہوگئی
کیا حال پوچھتے ہیں ظرافت نگار کا
افسانہ لکھ رہا ہوں دلِ بیقرار کا
عرض کی میں نے جزاک اللہ یہ گڈول مجھے
آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے
خواب کیا دیکھا تھا میں نے قوم کی تعمیر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کوئی کہتا ہے کہ رنگ تغزل غالباً باہے
سجن رے جھوٹ مت بولو خدا کے پاس جانا ہے
جو منظر دیکھ لے تو موشوں کی بے نیازی کا
بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا

عید کے موقع پر کس طرح ۲۹ اور ۳۰ کے چاند کا جھگڑا پیدا ہوتا ہے اور کس طرح مولوی حضرات چندے کا دھندا شروع کرتے ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان کس طرح بجٹ فیل ہونے کے نتیجے میں مہابھارت کا سماں درپیش ہوتا ہے۔ بچوں کی فرمائش کس طرح باپ کو پریشان کرتی ہے ان موضوعات کو ظرافت اور طنز سے ہمکنار کرکے بانرغ نے اپنی نظم ہلال عید میں بحسن و خوبی پیش کی ہے۔

کر کے ہمارے گھر کا بجٹ فیل ہائے ہائے
بیگم سے ورلڈ وار کرائے ہلال عید
چندے کا کاروبار کریں غیر شہر میں
بدنام مولوی کو کرائے ہلال عید

اس دور کے بلاشبہ سب سے بڑے طنز نگار شاعر تو رضا نقوی واہی ہیں جن کا ظریفانہ اور طنزیہ شعری سرمایہ بھی کثیر ہے لیکن بانرغ کا پہلا شعری مجموعہ "من خوب می شناسم" اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ یہ بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں جس پر چل کر واہی نے منفرد اور مخصوص مقام حاصل کیا ہے۔ ☆

دسے کے خط (مراسلے)

مخدومی و محترمی ڈاکٹر سید کمال صاحب زید مجدہ

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان "شگوفہ" اس ناچیز کے دور دراز پتہ پر ہر ماہ بتوسط و کرم جناب مسعود حسینی صاحب کے پہنچ جاتا ہے۔ شاید بلکہ یقیناً یہ واحد جریدہ ہے جو ایک طویل عرصہ سے اس خاکسار کے زیر مطالعہ ہے اور اس کی کشش اور رنگینی میں بالکل فرق نہیں آیا بلکہ ایک روز افزوں نکھار ہے جو دوسرے فنون لطیفہ اور طنز و مزاح کے جرائد میں مفقود ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مسعود حسینی صاحب کا دلی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اتنا خوبصورت رسالہ متعارف کروایا اور اس کے بعد آں محترم اور جملہ معاونین کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ایسے نا معقول حالات میں ایسا معقول پرچہ نکال رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات پر اپنا کرم فرمائے اور آپ لوگوں کی استطاعت اور ہمت میں اتنی برکت دے کہ آپ اس سے اور زیادہ بہت اور زور دار قلم کی خدمت کر سکیں۔ آمین۔

اس کے مطالعے سے جہاں کچھ وقت کے لئے اپنے اردگرد کے ماحولِ افرنگی سے نکل کر آپ کے گلشن میں پہنچ جاتے ہیں جس کا نام اردو ہے وہاں اس ذہنی اور اعصابی تناؤ سے بھی نجات ملتی ہے جو آج کل کی مشینی زندگی کا خاصہ ہے۔ آپ نہ صرف اردو ادب کی خدمت عالیہ میں مصروف ہیں بلکہ ایک بڑی تعداد میں مخلوق خدا کو پاگل اور نروس بریک ڈاؤن ہونے سے بچا رہے ہیں۔ کم از کم ایک آدمی تو بہر حال اس طبقہ سے محفوظ ہے اور وہ یہ آپ کا خادم ہے جو اس تناؤ کو آپ کے فراہم کردہ قہقہوں سے ڈھیلا کر لیتا ہے۔

آپ کی تھیلی میں جو نامی گرامی چٹے بٹے ہیں وہ کمال کے ہیں اور آپ اسم بامسمی باکمال ہیں اتنے عظیم مصنفین اور شعراء کا ایک گلدستہ جمع کر رکھا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ وقت پڑنے پر اپنا رس کسی کے حوالے کر دیں گے مگر اس خوبصورت رسالے کو سینچتے رہیں گے۔ میں نام اس لئے نہیں لے رہا کہ شاید غلطی سے کسی کا نام بھول جاؤں تو ان کی دل آزاری ہو۔ مگر براہ کرم اپنے معزز و موقر جریدہ کے ذریعہ ان سب کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض اور اتنی اچھی تحاریر پر دلی مبارکباد۔ خصوصاً شعراء کا کلام تو اپنی اہلیہ محترمہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ہر ماہ جب یہ شگوفہ کھلکھلاتا ہوا اس ناچیز کے پوسٹ بکس سے باہر آتا ہے تو بندہ اسے جی چاہنے کے باوجود ایک ہی نشست میں نہیں پڑھتا بلکہ اس کو ماہانہ نشستوں میں تقسیم کر دیتا ہے تاکہ سارا مہینہ اس کا مطالعہ جاری رہے اور جب یہ ختم ہو تو اگلا شمارہ ہاتھ میں ہو۔ مگر کیا کروں بعض دفعہ محبوب کی زلف دراز نہیں ہوتی اور مضامین جلدی ختم ہو جاتے ہیں کاش اس کی ضخامت اور زیادہ ہو مگر مجھے معلوم ہے اس موجودہ ضخامت کو بھی ہر ماہ پابندی سے نکالنے میں آپ کو اور معاونین کو جتنا خون تھوکنا پڑتا ہے وہ آپ حضرات ہی کی ہمت ہے ۔

وہ زلف دکھاتے ہیں کہ اس لام (ل) کو دیکھو
ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو
(اکبر)

محترم مسعود حسینی صاحب اتنے مشفق ہیں کہ ہر ماہ پابندی سے پوچھتے ہیں کہ پرچہ ملا کہ نہیں اور کبھی کسی سبب ناغہ ہو تو ازراہ شفقت اپنا پرچہ اس ناکارہ کو بھیج دیتے ہیں مگر ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ کچھ لکھئے۔ اب بندہ ان کی نسبت حسینی کے سبب انکار تو نہیں کر پاتا تاہم یہ خیال ضرور آتا ہے کہ یہ ناکارہ نہ کوئی قلم کار ہے نہ شاعر یہ تو محض ان کی مہربانی اور ذرہ نوازی ہے کہ وہ ایسا فرماتے ہیں۔ قلم تراش تو یہ ناکارہ ایک زمانے میں رہا ہے جب قبلہ والد صاحب مرحوم (مولانا سید نجم الحسن تھانوی) نبیرہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (مصنف بیان القرآن و بہشتی زیور) تختیاں لکھواتے تھے اور قلم تراشنا اور پھر قلم پکڑنا اور لکھنا سکھاتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ قلم کی حرمت اور عظمت کا احساس دلاتے تھے۔ کبھی وہ کانے کی لکڑی کا تراشیدہ قلم زمین پر پڑا رہ جاتا تھا تو سخت ناگواری قبلہ

عالم کو ہوتی تھی کہ اس کے تقدس کا احساس نہیں اور بے ادبی کا مرتکب ہورہا ہے۔ نتیجتاً سزا میں دو تختیاں لکھنا پڑتی تھیں۔ پھر ذرا شعور کی حدود میں جب یہ ناکارہ داخل ہوا (شعور کا یقین اس لئے کہ بقول دلشاد رضوی صاحب کے کہ "ہمعصر لڑکیاں اچھی معلوم ہونے لگی تھیں" (ماہ ستمبر ۲۰۰۰) بلکہ بندہ تو یہاں تک کہے گا کہ ہمعصر لڑکیاں ہمیں دیکھ کر اپنی اوڑھنیاں ٹھیک کرنے لگی تھیں۔ تو والد صاحب مرحوم نے قلم کی قوت کا احساس دلایا اور وجہ تخلیق کائنات اور مقصد تخلیق کائنات میں قلم کے بنیادی کردار کی افادیت واضح فرماکر اسے تلوار سے زیادہ زور آور بتایا۔ اس سے بھی حضرت والا نے ہی متعارف کرایا کہ چند قلموں کی آنکھوں میں مُوذ کا بال ہوتا ہے اور اس سے ہوشیار رہنے اور مقابلہ کرنے کی ترغیب و ہمت بندھائی۔ یہی وجہ ہے کہ قلم ہاتھ میں لینے سے بہت گھبراتا ہوں۔ نہ معلوم اس کا حق ادا کرسکوں گا یا نہیں۔ ہر ماہ شگوفہ کا شمارہ دیکھ کر اور مسعود حسینی صاحب کا اصرار دیکھ کر ایک دبی چنگاری سلگنے لگتی ہے کہ کچھ لکھوں اور نیت بھی کرتا ہوں مگر جب بھی قلم لے کر اس کی زبان کھول کر قرطاس کے شیشے پر رکھتا ہوں تو وہ مجھ سے سوال کرتی ہے کہ ذرا سوچ لیا تو اس قابل ہے؟ اور اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں اسے واپس اس کے چیمبر میں بھیج کر ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھ جاتا ہوں۔

آج پھر ماہ ستمبر ۲۰۰۰ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے چنانچہ اس کا سرسری مطالعہ کرکے ہمت باندھ لی اور آپ سے مخاطب ہوں۔ اب اگر آں محترم کی طرف سے حوصلہ مندانہ جواب عطاء ہوا تو شاید اس توسن کو اور مہمیز لگ جائے ورنہ ظاہر ہے اس ناکارہ کی کہاں اتنی ہمت۔

بہرحال کافی وقت لیا۔ امید کہ ان وصل کے چند لمحوں کی طوالت کو محسوس نہ فرمائیں گے جو اس عریضہ کے ذریعہ آں محترم سے ہوا۔

مورخہ ۳۰۔ ستمبر ۲۰۰۰ء

حافظ سید محمد نظیر الحسن تھانوی عفرلہ
P.O.Box.4277, Lakehaven,
NSW.2263. Australia.

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

اس شمارہ میں پاکستان کے مشہور کالم نگار ڈاکٹر محمد یونس بٹ کے لیے خصوصی گوشہ مختص کیا گیا ہے۔ حال میں محمد یونس بٹ کے دورہ جدہ کے موقع پر جناب رشید الدین نے شگوفہ کے لیے ان کا انٹرویو لیا اور جناب علیم فلکی نے یونس بٹ کے اعزاز میں منعقدہ جلسہ میں ان کے فن کا جائزہ لیا تھا ان دونوں مضامین کے علاوہ یونس بٹ کے چند منتخب کالم اس شمارہ میں شامل کیے گیے ہیں۔

یونس بٹ مسلسل اور بے تکان لکھ رہے ہیں۔ ان کے کالم کتابی شکل میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے فن کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ شگوفہ میں شامل یہ گوشہ اس سمت میں پہلا قدم ہے۔ طنز و مزاح نگار کسی علاقہ یا ملک کی میراث نہیں ہوتا۔ بنیادی طور پر وہ ہر قسم کی بداعمالیوں خرمستیوں اور بے اعتدالیوں کو اپنے انداز میں نشانہ بناتا ہے۔ کرداروں کے نام چاہے کچھ ہوں ہر ملک اور ہر علاقہ میں وہ ایک ہی طرح کا کام انجام دیتے ہیں۔ کالم نگاری کے روایتی اسلوب سے انحراف کرتے ہوئے یونس بٹ نے طنز و مزاح کی بنیادی اوصاف سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ امید ہے کہ یونس بٹ اپنے تخلیقی سفر کے ذریعہ کالم نگاری کی روایت کو مستحکم کریں گے۔ ☆

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ
اشاعت کا ۳۳ واں سال

شگوفہ

جلد ۳۳
شمارہ ۱۲

حیدرآباد

دسمبر ۲۰۰۰ء

کمپیوٹر کتابت :
SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 3373 ...4
سیل : 98480-30272

ویب ڈیزائن :
نوشاد سلطان

طباعت :
دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۱۴ روپئے زر سالانہ : ۱۵۰ روپئے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064
شگوفہ انٹرنٹ پر : http://www.shugoofa.cjb.net
ای میل : shugoofa @ india.com

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

افسانہ

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

چورن (منظومات)

بال کی کھال (تبصرہ)

PICK ONE WHICH WAS NOT 'FIXED'.
MISS INDIA...oops...Miss WORLD
Keshav

یوسف ناظم

نئی ریاستیں

ہم نے صرف سائنس پڑھی ہے پولٹیکل سائنس نہیں پڑھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ذہنی طور پر اتنی ترقی نہیں کرسکے جتنی کہ اس ملک کو ضرورت ہے۔ ہمیں یاد آرہا ہے کہ پولٹیکل سائنس پڑھنے والوں اور یہ نادر و نایاب علم پڑھانے والوں میں سے ہم نے کسی کی زبانی یہ نکتہ سنا تھا کہ جس ملک میں ریاستوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے وہ ملک تیزی سے ترقی نہیں کرسکتا۔ اس نکتے کی وضاحت میں پولیٹکل سائنس کے ماہرین نے یہ کہا تھا کہ ریاستیں کم ہوں گی تو ملک میں گورنر کم ہوں گے اور جس ملک میں گورنر کم ہوں گے وہاں وزرائے اعلیٰ بھی کم ہوں گے۔ کابینی وزراء کے علاوہ مملکتی وزراء بھی کم ہوں گے اور یہ کہ جب ایسے مقتدر، معتبر اور معزز لوگ کم ہوں گے تو ظاہر ہے ملک کی ترقی کی رفتار بھی مور ناتواں یعنی چیونٹی کی رفتار کے لگ بھگ ہوگی یا دونوں کی رفتار میں بس دو چار لمحوں کا فرق ہوگا۔ اچانک ہمیں کسی شاعر کا وہ شعر یاد آگیا جس میں شاعر نے کہا ہے کہ لمحوں نے خطا کی ہے لیکن صدیوں نے سزا پائی ہے۔ پھر ہم نے سوچا اس شعر کا یہاں کیا تک ہے۔ ملکی مسائل کے معاملے میں ہماری سوجھ بوجھ بس یونہی سی ہے لیکن اتنا تو ہم سمجھ ہی سکتے ہیں کہ ملک کی آبادی اگر ایک ارب ہو تو اس آبادی کے تناسب سے گورنروں کی تعداد کم سے کم (۱۰۰) تو ہونی ہی چاہئے لیکن پھر ہم نے سوچا اتنی بڑی تعداد میں گورنر کہاں سے آئیں گے کیونکہ گورنر کے عہدہ سنبھالنے کے لئے متعلقہ شخص کا زیرک، ذہین اور زود فہم ہونا ضروری ہے۔ ان میں ایک، خوبی یہ بھی ہونی چاہئے کہ اگر ان سے پوچھے بغیر ان کا تبادلہ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں کردیا جائے تو انھیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے اور اگر ہو بھی تو یہ شکایت دل کی دل ہی میں جاگزیں رہنی چاہئے۔ یہ نکتہ بھی پولیٹکل سائنس کے نصاب میں سنا ہے، درج ہے۔ بہر حال ریاستوں کی تعداد کتنی ہونی چاہئے یہ اس بات پر منحصر یا موقوف ہے کہ ملک میں کتنے گورنر پائے جاتے ہیں۔ وزراء اعلیٰ اور ان کے رفقائے کار کے تعلق سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کے ذمے جو فرائض منصبی ہوتے ہیں وہ سب کے سب ان کے پرسنل اسسٹنٹ کی فہم و فراست کی بدولت بحسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں اور انھیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ فرائض منصبی تھے کیا۔

پولیٹکل سائنس جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے ہم نے نہیں پڑھی ہے لیکن اس علم کو ہم نے عملی شکل میں پروان چڑھتے اور فروغ پاتے ضرور دیکھا ہے اور ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے جب ایک نئی ریاست کے وجود میں آتے ہی وہاں سیاسی سرگرمیاں فی الفور شروع ہوجاتی ہیں۔ یعنی ریاست کے گورنر کی رہائش گاہ کہاں ہوگی اور مترالیہ کی عمارت کا محل وقوع کیا ہوگا یہ ایسے مسائل ہوتے ہیں جن پر مذکورہ امور متعلقہ علاقے کے عوام جان چھڑکتے ہیں۔ اسے ہلچل کہا جاتا ہے۔ مولود ریاست کے اسپیکر کا تقرر اگر نہیں ہوا ہے تو کوئی حرج نہیں، ریاست بن گئی کافی ہے۔ سیاسی اور قانونی موشگافیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ روپے کی ریل پیل کے لئے یہ شامل لوازمات میں سے ہیں۔ نئی ریاستوں کے وجود میں آنے سے ایک حیرت ناک صورت یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ عوام، تعداد میں اچانک، کم

باتے ہیں کیونکہ بیشتر عوام، یا تو وزیر بن جاتے ہیں یا سفیر۔ میونسپل کاؤنسلر اور بے شمار کارپوریشنوں کے صدور اور سربراہ بن
نے کی وجہ سے بھی وہ عوام نہیں رہتے۔ پولیٹکل سائنس کا یہ نکتہ بھی ہمیں پسند آیا کہ جو عوام، عہدوں پر مامور ہوجاتے ہیں ان کی جگہ
ی ہی رہتی ہے۔ ان خالی جگہوں کو پر کرنے کی زحمت، سرکار کو کرنی پڑتی۔ عوام کے حافظے کے تعلق سے یہ خیال عام ہے کہ ان کا
ظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ بات یونہی مشہور ہوگئی ہے لیکن ملک کے حالات جتنے سنگین ہوتے جارہے ہیں کہ
ام کے حافظے کے تعلق سے یہ رائے سو فی صد صحیح معلوم ہونے لگی ہے۔ جو بھی عوام، سرکاری اور نیم سرکاری منصب قبول کرنے
، بعد رہائش کے لئے جب سرکاری عمارت میں منتقل ہوتا ہے تو اپنی منتقلی یعنی نقل مکانی کے بعد دوسرے دن قطعی بھول جاتا ہے
وہ گزشتہ کل کے دن عوام تھا اور ان کے آبائی مقام میں رہائش نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اگر کوئی چیز تھی تو وہ صرف آلائش تھی۔ سچ
پوچھئے تو ہم اس زود فراموشی کو حافظے کی چستی اور تندرستی پر محمول کرتے ہیں اور مقام مسرت ہے کہ ہمارے عوام کا حافظہ ان کے
سب کی تبدیلی کے نتیجے میں، زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتا جارہا ہے۔ اس تبدیلی کو بھی ملک کی عمومی ترقی کا ایک جز سمجھنا چاہئے۔
ب بھی کوئی خانگی عمارت، سرکاری عمارت بن جاتی ہے اس کا کرایہ عوام ادا کرتے ہیں۔ خسارے کے بجٹ میں اس کی کافی گنجائش
ھی جاتی ہے۔

آج سے ۵۰۔۵۵ سال پہلے جب ہندوستان میں نئی ریاستوں کی تشکیل لسانی بنیادوں پر عمل میں آرہی تھی تو سب کی زبانیں بند
یں۔ اب ان تشکیل شدہ ریاستوں پر نظر ثانی کی گئی تو ان میں کتابت کی کئی غلطیاں پائی گئیں۔ انہی غلطیوں کو دور کرنے کی غرض
ے تقسیم در تقسیم کا نسخہ استعمال کیا گیا۔ اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ نومولود ریاستوں کے باشندوں کا قد یکایک اونچا ہوجائے گا اور
میں ان کے نئے نشان شناخت کی وجہ سے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ سابقہ ریاست اور حالیہ ریاست کے باشندوں
ی غریبی بھی حسب پیمائش بانٹ دی جائے گی۔ جرائم بھی اسی حساب سے تقسیم ہوجائیں گے اور ممکن ہے ایک آدھ نومولود
یاست اس بناء پر مسرور و شاداں ہو کہ اس کے حصے میں کم جرائم آئے۔

بعض ریاستوں میں وزیروں اور قلمدانوں کی تعداد فاصلاتی بعد بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے ہر قلمدان کو دو یا تین حصوں میں تقسیم
رنا پڑتا ہے مثال کے طور پر تعلیم کا قلمدان، اس میں فنی تعلیم کی نوعیت اصلی تعلیم سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ پھر ابتدائی، ثانوی اور
لی تعلیم کے علاوہ جسمانی تعلیم اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے علاحدہ علاحدہ سوجھ بوجھ کے وزراء کا مطالبہ کرتی ہے۔ سنا جارہا ہے کہ
تشکیل شدہ ریاستوں میں تعلیم نسواں کا بھی ایک علاحدہ قلمدان رائج کیا جائے گا۔ اسی طرح کھیلوں کے قلمدانوں کو بھی دو اصناف میں
نسیم کردیا جائے گا۔

۳ ریاستوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے اردو زبان کو اچانک فروغ حاصل ہوگا وہ اس طرح کہ اب اس زبان کی ترویج و ترقی کے
لئے ۳ مزید اکادمیاں وجود میں آئیں گی اور اردو تیزی کے ساتھ جگہ جگہ پھیلے گی اور وہ نقصان جو ریاست مہاراشٹرا میں اردو اکادمی کے نہ
ہونے کی وجہ سے ہوا ہے اس کی پابجائی ہوجائے گی۔ کچھ لوگ جو بالعموم نشاطیے اور پر امید ہوتے ہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ ۳ نئی ریاستوں
کا وجود میں آنا، اردو کے خوش آئند مستقبل کی نوید ہے۔ اور یہ کہ یہ تبدیلی اردو زبان کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کے اضافے کا
باعث ہوگی۔ نومولود ریاستوں میں اردو داں طبقے نے تو کہا جاتا ہے اپنے اپنے حلقے کے لوگوں کی فہرست بھی مرتب کرلی ہے۔ سیاسی
جماعتوں میں بھی نئے انتخابات عمل میں آرہے ہیں اور کئی جگہوں سے مارپیٹ کی خبریں آنی شروع ہوگئی ہیں۔

صرف یہی نہیں، خود دہلی میں بھی تعمیراتی انقلابات کی آمد آمد ہے کیونکہ اگلی مرتبہ جب ہندوستان کی ساری ریاستوں کے

وزرائے اعلیٰ کی جو کانفرنس ہوگی اس میں شرکا، کی تعداد ظاہر ہے نسبتاً زیادہ ہوگی اور موجودہ کانفرنس ہال میں نہ تو مزید کرسیوں کی گنجائش ہے اور نہ اتنی بڑی میز موجود ہے کہ سارے وزرائے اعلیٰ شانہ بشانہ بیٹھ سکیں۔ کسی بھی وزیر اعلیٰ کو خواہ اس کی ریاست رقبے اور آبادی کے اعتبار سے کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو، کسی دوسرے وزیر اعلیٰ کے پیچھے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا جاسکتا۔

وزراء کی نئی جمعیت سے ہمیں اس لئے ہمدردی ہے کہ انھیں از سر نو حلف وفاداری و رازداری اٹھانی پڑے گی۔ جن وزراء کو پہلے ہی سے اس کی مشق ہے انھیں حلف کے آموختے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ جو عوام پہلی مرتبہ وزیر بنیں گے انھیں البتہ تھوڑی محنت کرنی ہوگی۔ (دو چار مرتبہ کے ریہرسل سے یہ مشکل آسان ہوجاتی ہے) ہمیں اس موقع پر اچانک جیوتی باسو کی یاد آگئی۔ ان جیسے وزیر کا پیدا ہونا اب ممکن نہیں ہے اور نرگس ہزاروں سال بھی اپنی بے نوری پر روتی رہے تو ایسا کوئی دیدہ ور پیدا نہیں ہوسکتا جو ۲۳ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کرسی وزارت پر بیٹھے اور اس طرح بیٹھے کہ ۲۳ سال تک روزانہ بلاناغہ وزارت کرتا رہے۔۔۔ کہاں ہے گنیز بک؟

ہم نے اوپر کی سطروں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نو مولود ریاستوں کی ولادت کے مخالف ہیں۔ ولادت، کسی کی ہو اور کہیں ہو ہم نے ہمیشہ اس موقعے پر خندہ پیشانی اور خندہ ذہنی سے اس کا استقبال کیا ہے۔ ہمیں ہمیشہ ایسے موقعوں پر شگفتن گل کی کیفیت کا احساس ہوا ہے اور ہم بھی خوشی سے پھولے نہیں سمائے ہیں۔ تاہم ہم نے اپنے آپ کو پھولنے کی معقول حد میں رکھا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کے چند موقعے اور آنے والے ہیں یوں بھی ہم میں اب زیادہ یعنی حد سے زیادہ پھولنے کی اہلیت ہے نہیں۔

یہ ۳ ریاستیں بالکل نارمل حالت میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ولادت کو مقراضی ولادت (سیزیرین) نہیں کہا جاسکتا ورنہ ہمیں یاد ہے کہ جب ملک جرمنی، مغربی اور مشرقی جرمنیوں کے عنوان سے تقسیم ہوا تھا تو بعض صورتوں میں مغربی جرمنی میں موقوعہ مکان کا باورچی خانہ، مشرقی جرمنی میں چلا گیا تھا اور ایک مشرقی جرمنی کے بلدی حدود میں واقع مکان کا بیت الخلاء مغربی جرمنی میں رہ گیا تھا اور اس دو عملی تقسیم کے نتیجے میں ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے مکینوں کو اپنے گھر سے باہر نکلے بغیر دن میں کئی مرتبہ اپنی ضروریات کی تکمیل کی غرض سے، ایک ملک سے دوسرے ملک اور دوسرے ملک سے اپنے ملک آنا جانا پڑتا تھا یعنی کھانا تو کھا رہے ہیں مغربی جرمنی کی حدود میں لیکن وہ پک رہا ہے مشرقی جرمنی کے علاقے میں۔ جرمن قوم نے بڑی پامردی کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کیا لیکن جب انھیں اندازہ ہوا کہ دوسرے ملکوں کے لوگ ان کی ان حرکات و افعال پر ہنس رہے ہیں تو دونوں علاقوں کے باشندوں نے تو من شدی من تو شدم کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے از سر نو متحدہ جرمنی کی رہائش اختیار کرلی اور اب وہ لوگ ایک ہی چانسلر کے زیر نگیں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اولمپک کھیلوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ شکر ہے کہ ہمارے یہاں ہر نئی ریاست کی ولادت باسعادت ہی ہوئی باطرافت نہیں ہوتی۔ ☆

Dr.Zafar Kamali,
At. Rampur, Siwan, Bihar-841232

غزل

نام سے گاندھی کے چڑ ہے بیر آزادی سے ہے
عالموں کا علم سے وہ ربط ہے اس دور میں
خوابِ غفلت سے وہی نسبت ہے میری قوم کو
شوہروں سے بیبیاں لڑتی ہیں چھاپہ مار جنگ
اے مری اردو خدا حافظ ہے تیرا جب تجھے
ذہن سے سوچو نہ کچھ آنکھوں سے بھی دیکھو نہ کچھ
کون اب کس کو پچھاڑے گا یہی ہے دیکھنا
سر پہ دشمن اور اس کا اونگھنا تو دیکھئے
جیسے صیادوں کو صیادی سے رہتی ہے غرض
باپ دادا کے ہی نسخے میں شفا اپنی بھی ہے
بے حیا کو کچھ حیا سے واسطہ ہوتا نہیں

نفرتوں کی کھاد ہیں الفت مگر کھادی سے ہے
ربط دھوبی کے گدھے کو جس طرح لادی سے ہے
عاشقوں کا جو تعلق دل کی بربادی سے ہے
رابطہ ان کا بھی کیا کشمیر کی وادی سے ہے
رحم کی امید جلادوں کی جلادی سے ہے
رہنما سے کیا شکایت کیا گلہ ہادی سے ہے
سامنا جنتا کا پھر کسی کے فریادی سے ہے
دیس کا پالا پڑا افیون کے عادی سے ہے
کام استادوں کو ویسے اپنی استادی سے ہے
ہم کو دیرینہ تعلق خانہ دامادی سے ہے
جو مخنث ہو اسے مطلب ہی کیا شادی سے ہے

دوستوں کی دوستی دیکھی ہے جب سے اے ظفرؔ
عشق ویرانے سے ہم کو وحشت آبادی سے ہے

اسرار جامعی۔ دہلی

بردکھاوا

بردکھاوے میں گیا جب جامعیؔ
دیکھ کر لڑکی کی ماں کہنے لگی
"مردوا" اب تک کنوارا رہ گیا
اس سے تو میں بھی کبھی منسوب تھی

بن بیاہی بیٹیاں

کہہ رہی تھیں ایک گھر کی بن بیاہی بیٹیاں
اے خدا ! ہم حال اپنا کیا کریں تجھ سے بیاں
لاکھ درجہ ہم سے تو بہتر ہیں ۔ بیوہ عورتیں
جن کو یہ معلوم تو ہے ان کے شوہر ہیں کہاں

ممتا

دس بچوں کو پالا تھا کسی ماں نے جتن سے
ممتا کا صلہ وہ بھی ضعیفی میں نہ پائی
ہر چیز تو تقسیم ہوئی باپ کے مرتے
اک ماں تھی جو حصے میں کسی کے بھی نہ آئی

عابد معز
(ریاض)

شاعر کی چھٹی حس

بزم اردو ادب کے کامیاب مشاعرے سے میں اپنے ایک شاعر دوست کے ساتھ سحر کے وقت واپس ہورہا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن میرے شاعر دوست بہت غصہ میں تھے۔ "بحر اور وزن کا خیال کئے بغیر منتظمین اور ناظم مشاعرہ کے خلاف باتیں کئے جارہے تھے۔ انھیں پتہ ہی نہیں ہے کہ ادب کیا ہے اور شاعری کیا ہوتی ہے۔ بس مشاعرہ کرنے کا شوق ہے، ہنگامہ بپا کردیا"۔

میرے خیال میں مشاعرہ ٹھیک ہی تھا۔ میں نے لب کشائی کی۔

تمہیں کیا پتہ، جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے تم میری صحبت میں مشاعرے سننے جارہے ہو، تم کیا جانو، مشاعرہ کے آداب کیا ہوتے ہیں اور شاعر کی قدر کیسے کی جاتی ہے۔ موصوف نے مجھے ڈانٹا، تم نے دیکھا نہیں۔ ناقدروں نے مجھے سب سے پہلے پڑھوادیا"۔

یہ بات میرے ذہن میں آئی ہی نہیں، ناظم مشاعرہ نے ایسا کیوں کیا حالانکہ آپ سے جونیر چند شعراء بھی موجود تھے۔ میں نے موصوف سے پوچھا۔

چند شعراء کیا مطلب، شاعر دوست مجھ پر پھر خفا ہونے لگے۔ مشاعرہ میں موجود شعراء کے درمیان میرا قد سب سے اونچا ہے۔ ان جاہلوں کو کیا معلوم کہ کون کس رتبہ پر فائز ہے اور وہ تمہارا ناظم، صحیح جملے ادا نہیں کرسکتا۔ کہنے لگا کہ میں تقدیم و تعظیم کی روایتی بندشوں میں مشاعرہ اور شعراء کو جکڑے رکھنا نہیں چاہتا۔ جو ذرہ جہاں ہے وہیں آفتاب ہے۔ شاعر کا کلام خود اس کا مرتبہ اور مقام معین کرے گا۔ اس "عذر لنگ" کے بعد مجھے پڑھنے کے لئے بلالیا۔ میں حیران اور پریشان، کچھ دیر کے لئے سکتہ میں آیا۔ سوچا کہ بغیر مشاعرہ پڑھے واپس ہوجاؤں۔ خیال ہوا کہ ایسا کرنا بدتمیزی ہوگی۔ پھر سوچا کہ ناظم کی شان میں کچھ کہوں لیکن غصہ کی شدت کے سبب مناسب الفاظ مل نہ سکے۔ اسٹیج سے غیر مناسب الفاظ کا استعمال ٹھیک نہیں تھا۔ اسی لئے خاموشی سے کلام سنا کر لوٹ آیا۔

پہلے پڑھنے کے باوجود آپ کی پذیرائی ہوئی اور آپ نے خوب داد سمیٹی۔ ناظم نے خود اعتراف کیا کہ آپ نے مشاعرہ کو ابتداء ہی سے اٹھادیا۔ میں نے شاعر دوست کی ستائش کی۔

یہ میرے کلام کا اثر تھا۔ ذرہ نوازی ہے تمہاری۔ میری ستائش کے جواب میں شاعر دوست آداب بجانے لگے۔ دو تین بار سلام کرنے کے بعد پھر گویا ہوئے۔ مشاعرے کے آداب ہیں کہ ابتداء میں نو آموز، نو مشق اور جونیر شعراء کو زحمت کلام دی جاتی ہے۔ وہ بھی ادب اور احترام کے ساتھ۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں چوٹی کے شاعروں کے ساتھ کتنے بڑے بڑے مشاعرے پڑھ چکا ہوں۔ کہاں کہاں اور کس کس رسالے میں نہیں چھپا۔ آج کا مشاعرہ کیا چیز ہے۔ لیکن ناظم کو چاہئے تھا کہ مجھے میرے مقام پر پڑھواتا۔

"چھوڑیئے اس بات کو، رات گئی بات گئی۔ یوں بھی پہلے پڑھنے میں کیا قباحت ہے"۔ میں نے شاعر دوست کی دلجوئی کی خاطر کہا لیکن ایسے لگا جیسے میں نے ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہے۔

جب میں پڑھ رہا تھا مشاعرہ گاہ آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ لوگ آ رہے تھے۔ مہمان خصوصی تشریف نہیں لائے تھے وہ میرے مداح ہیں۔ بعض شعراء بھی مسند پر آ رہے تھے اور مناسب مقام کی تلاش میں تھے۔ اس افراتفری میں ایک بڑا اور مستند شاعر کلام نہیں سنا سکتا۔ شور اور ہنگامہ کے دوران صرف لیڈر تقریر کرسکتے ہیں اور پھر میں یہ کیسے برداشت کرلوں کہ میرے سامنے کے بچے میرے بعد اپنا کلام سنائیں۔ وہ کلام جس پر میں نے اصلاح دی ہے۔ تم کیا جانو۔ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ مجھے پہلے پڑھوانے کے لئے سازش کی گئی ہے۔ میری بے عزتی کی گئی ہے۔ میں چپ نہیں رہوں گا۔ میں انہیں دیکھ لوں گا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا "کیا کرنے کا ارادہ ہے"۔

"سوچتا ہوں کہ ناظم مشاعرہ پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کردوں"۔ میں نے شاعر دوست کو یاد دلایا۔ ایسے معاملات کو عدالت میں گھسیٹنے کی گنجائش نہیں ہے پہلے قانون سازی کرنی پڑے گی۔

ٹھیک کہا تم نے۔ شاعر دوست نے حامی بھری۔ یوں کرتا ہوں کہ آئندہ سے ان کے مشاعروں میں نہیں جاؤں گا۔ کچھ لمحوں بعد ہی انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ نہیں یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ ایسا کرتا ہوں کہ اگلے ماہ ایک شاندار مشاعرہ کرواتا ہوں۔ صدارت میں ہی کروں گا۔ اس ناظم کے بچے کو سب سے پہلے پڑھواؤں گا اور اس کی درگت بنتے دیکھ کر محظوظ ہوں گا۔

یہ آپ نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو ملتے ہوئے کہا "صبح ہو چکی ہے چلئے نہاری کھاتے ہیں اور پھر گھر چل کر سو جائیں گے"۔

مجھے بھوک ہے اور نہ ہی نیند، شاعر دوست نے ناگواری سے جواب دیا۔

"بھوک اور نیند سے کیا ناراضگی"۔ میں انہیں منانے لگا۔ آپ مشاعرہ کیجئے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں اس مشاعرہ کی نقامت کروں گا۔ اب تو نہاری کھانے چلئے۔" اور ہم نہاری کھانے ہوٹل میں داخل ہوگئے"۔

اردو ادب سے شغف اور شاعری سے لگاؤ رکھنے کے سبب میں شاعروں سے قریب ہوں۔ میرے ایک اور شاعر دوست اپنے آپ کو بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں وہ جس معیار کا کلام کہتے ہیں وہ کسی دوسرے کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ان کے یہاں جو فصاحت اور بلاغت ہے وہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ وہ جو الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں کوئی دوسرا ویسا نہیں کرسکتا۔

بڑا شاعر ہونے کا عارضہ صرف میرے دوستوں کو لاحق نہیں ہے۔ تقریباً ہر شاعر اس خوش فہمی میں مبتلا نظر آتا ہے۔ عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ نوجوان شاعر جس کی شاعری کی عمر بمشکل چند گھنٹے ہوتی ہے۔ وہ بھی بڑا شاعر ہے۔

کوئی شاعر چھوٹا نہیں ہوتا، ہر شاعر بڑا ہوتا اور اس کا فرمایا ہوا مستند ہے۔ کسی سے جھگڑا کرنے سے بہتر ہے کہ اسے بڑا بلکہ بہت بڑا شاعر مان لیا جائے۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے ان کی بڑائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو عدد پناڈول کا نقصان ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے میں ہر شاعر کو اپنے دور اور اپنے وقت بلکہ اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر مان لیتا ہوں۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ایک سے زیادہ شاعر میرے مقابل ہوتے ہیں۔ تب میں بڑا شاعر ہونے کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود پرے ہٹ جاتا ہوں۔ بعض شاعر ایسے بھی ہیں جو اپنے اجداد کو چیلنج کرتے ہوئے صدیوں پر محیط ہونا چاہتے ہیں۔

کہہ دو میر و غالب سے شعر ہم بھی کہتے ہیں
وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

شاعر کے بڑے ہونے سے میں پریشان نہیں ہوں لیکن ایک سوال ہر دم مجھے تنگ کرتا رہتا ہے۔ یہ شاعر بڑے کیسے ہوتے ہیں۔

کیا ایسا کوئی پیمانہ ہے جس سے کوئی شاعر بڑا بنتا ہے ۔ کیا ایسا کوئی ادارہ ہے جو شاعر کو بڑا کرتا ہے ۔ میں نے قیاس کیا کہ جو شاعر بہت زیادہ پرگو ہوگا وہی بڑا ہوگا لیکن میں نے چند غزلوں کے خالق شاعر کو بھی بڑا شاعر سمجھتے ہوئے دیکھا ہے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نقاد، شاعر کو بڑا کرتے ہوں گے ۔ نقاد کا خیال آتے ہی میں نے اپنا مسئلہ ان سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا ۔

ایک نقاد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے شاعروں کی عظمت کا مسئلہ حل کردیا ۔ انہوں نے سگریٹ کا کش لے کر بتلایا مشاعر کی چھٹی حس " اس سے کہتی ہے کہ تو سب سے بڑا شاعر ہے ۔ ہر شاعر کے بڑا ہونے کا سبب اس کی اپنی چھٹی حس ہے جو پہلا شعر مکمل ہونے سے پہلے خالق شعر سے کہہ دیتی ہے کہ ایسا شعر پہلے کبھی کسی نے کہا ہی نہیں ہے ۔ تو سب سے بڑا شاعر ہے ۔ ☆

خاص بات

ایک نوجوان شاعر جنہیں اپنی "زبان دانی" پر غیر معمولی ناز ہے ، کسی محفل میں اپنی غزل سنا رہے تھے ۔

"اس شعر پر خاص طور پر داد چاہوں گا " ۔

یہ کہہ کر انہوں نے ایک شعر پڑھا :

یہ واقعات ہمیں روز روز ہوتے ہیں
کبھی کبھی ہی کوئی خاص بات ہوتی ہے

اہل محفل میں کسی " بے زبان " قسم کے شعر فہم نے دبی زبان میں کہا

" شعر میں اگرچہ " خاص بات " موجود ہے لیکن پھر بھی شعر میں کوئی خاص بات پیدا نہ ہوسکی " ۔

" کیوں نہیں پیدا ہوسکی ؟ " شاعر صاحب لال پیلے ہوتے ہوئے بولے ۔

" شعر میں ایسی کیا بات ہے جو آپ کو ناگوار گزری ہے ؟ زبان و بیان کی کونسی خامی رہ گئی ہے اس میں ؟ آخر کس لفظ پر اعتراض ہے آپ کو ؟ "

" مجھے کسی لفظ پر نہیں آپ پر اعتراض ہے " ۔ معترض نے نہایت ملائمیت سے کہنا شروع کیا ۔ " کسی درزی کو اگر آپ قمیص سینے کے لئے کپڑا دیں اور وہ اسی کپڑے سے قمیص کے بجائے آپ کے لئے نہایت نفیس اور مناسب پاجامہ تیار کردے تو ظاہر ہے آپ کو کپڑے یا پاجامے پر نہیں درزی ہی پر اعتراض ہوگا " ۔

سکوت

مشاعرہ کے اسٹیج سکریٹری نے حضرت دل شاہ جہانپوری کو کلام سنانے کی درخواست کی تو ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا :

آپ دلی میں اور عاشقوں کے پہلو میں رہتے ہیں " ۔

دل صاحب اس کے جواب میں شعر پڑھنے سے پہلے کہنے لگے :

" لیکن اب وہاں نہیں بلکہ معشوقوں کی مٹھیوں میں رہتا ہوں " ۔

تضمین بر غزل مولانا محمد علی جوہر

نظر برنی
جامعہ ملیہ، نئی دہلی

"کرسی" ہے تو پھر بنک کا بیلنس بڑھا دیکھ
ہاں چھوٹے بڑے "پونجی پتیوں" کو کھڑا دیکھ
غربت کا جو پردا تھا پڑا اس کو ہٹا دیکھ
" ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ "

جو دل کی تمنا تھی تری ہوگئی حاصل
" پیسہ " ترا مقصد تھا تو " عہدہ " تری منزل
اٹھ عیش اڑا جاگ بھی جا، کا ہے کی مشکل
" سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگِ فلکِ پیر، زمانے کی ہوا دیکھ "

ہم دونوں کی " یاری " میں نظر آیا دھند لکا
سورج جو محبت کا تھا وہ آپ ہی ڈھلکا
میں اپنی جگہ بھاری مگر تو تو ہے ہلکا
" خو تیری دو روزہ مرا پیماں ہے ازل کا
پابند جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ "

" انکوائری " اگر ہوتی ہے ہوجائے تو کیا ہے
" رشوت " ہی جو الزام مٹائے تو بجا ہے
افسر کو کسی طور " پٹانا " بھی کلا ہے
" اس طرح جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ "

انوکھی سفارشیں

سفارش کیا ہے؟ اس کی ابتدا کیسے اور کیوں کر ہوئی؟ پہلی سفارش کس نے کی اور کس سے کی؟ آیا وہ قبول ہوئی یا نہیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا یہ اور اس قبیل کے بہت سے سوالات ایسے ہیں کہ جن کا جواب ہمیں معلوم نہیں۔ یہ کام ہم سمجھتے ہیں کہ محققین کا ہے۔ وہ چاہیں تو اس موضوع پر تحقیق کر سکتے ہیں، ہمارے طرف سے انہیں پوری آزادی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ سفارش ایک اٹل حقیقت ہے جس سے مفر نہیں اور ہم میں سے اکثر لوگوں کا اس سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ہم نے بہت سے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ میں سفارش کی پرواہ نہیں کرتا ہوں لیکن فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ سب کی سن لیتے ہیں جب کہ اکثر سفارش اپنے سے اعلیٰ عہدہ داروں یا ان لوگوں کو مانتے ہیں جن سے انہیں خود سفارش کرنی ہو۔ بعض لوگ سفارش کے معاملے میں جائز اور ناجائز کی تفریق بھی کرتے ہیں حالانکہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ سفارش ہوتی ہی ناجائز کام کے لئے ہے ورنہ جو چیز ہونے والی ہو یا ٹھیک ہو، اس کے لئے سفارش کرنے یا کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم جس سفارش کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ عام قسم کی سفارشیں نہیں ہیں جن سے ہم سب کا روزانہ واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ مثلاً نوکری یا داخلہ دلوانا، چھٹی کے لئے ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ دلانا، تبادلہ کروانا یا رکوانا یا ترقی کرواناوغیرہ۔ ہم میں سے جن حضرات کا تعلق سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے ہے ان کا آئے دن اس قسم کی سفارشوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور یہ سفارشیں نہ ان کے لئے نئی ہوتی ہیں اور نہ سفارش کرنے والوں کے لئے ہی ان میں کوئی جدت ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب ان کی تعداد میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اگر اسی طرح قوم ترقی کرتی رہی اور کام کی رفتار معمول کے مطابق نہ ہوئی تو وہ دن دور نہیں جب لفافے اور پوسٹ کارڈ خریدنے کے لئے بھی سفارش تلاش کرنی پڑے گی۔

ویسے تو ہم سب کا واسطہ روزانہ ہی سفارشوں اور سفارشیوں سے پڑتا رہتا ہے مگر ان میں چند ایک ایسی ہوتی ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل انوکھی ہوتی ہیں، اس لئے بہت عرصہ تک یاد رہتی ہیں۔ انہیں میں سے چند ایک کا ہم آج تذکرہ کریں گے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب ملک پر ایوب خاں کی حکومت تھی۔ اور اصلاحات کا عشرہ منایا جا رہا تھا۔ اسی زمانے میں جہاں اور بہت سی باتوں کی شہرت اور بقول شخصے مشہوری ہوئی وہیں پر ایک بین الاقوامی شادی کا بہت چرچا ہوا۔ ایک اسلامی ملک کے سربراہ کے بھائی نے جو ولی عہد بہادر بھی ہیں۔ یہ طے کیا کہ وہ ایک پاکستانی خاتون سے شادی فرمائیں گے۔ اور شادی بھی کراچی میں ہوگی جس میں بادشاہ سلامت بھی بہ نفس نفیس شریک ہوں گے۔ اس کے علاوہ لوگوں کو یہ بھی توقعات تھیں کہ بہت سے دیگر ممالک کے سربراہ اور ان کی بیگمات اور شہزادے بھی اس تاریخی شادی میں شرکت کے لئے آئیں گے۔ یہ بات بھی مشہور ہوئی تھی کہ تمام رسومات اور تقریبات کی فلم بھی بنے گی۔ ٹی۔ وی بھی اسی زمانے میں پاکستان میں نیا نیا آیا تھا، اس لئے لوگوں کو قوی امید تھی کہ اس سلسلے کی تمام تقریبات ٹی۔ وی پر بھی دکھائی جائیں گی۔ اس کو اتفاق کہئیے یا ہماری بدنصیبی کہ ہونے والی دلہن کے ایک عزیز کبھی کبھار ہمارے پاس کسی کام کے سلسلے میں آجاتے تھے۔ یہ اطلاع نہ جانے کس طرح ہمارے دشمنوں نے ہمارے دوست احباب تک پہنچا دی۔ وہاں تک تو غنیمت تھا مگر غضب یہ ہوا کہ یہ اطلاع ان کی بیگمات تک بھی پہنچ گئی۔ اس اطلاع کا ملنا تھا کہ ہمارے پاس دھڑا دھڑ بیگمات کے فون

آنے شروع ہوگئے کہ بھائی دو تین کارڈ شادی کے منگوا دیجئیے ۔ اب ہم لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بھئی یہ ان کی ذاتی تقریب ہے ، بچی کی شادی ہے ، کوئی ڈراما یا اسٹیج شو نہیں ہے کہ جس کے کارڈ بٹ رہے ہوں مگر کیا مجال ہے جو کسی نیک بخت کو ہماری بات کا یقین آجائے وہی ڈھاک کے تین پات کہ بھائی آپ ٹال رہیں ہیں اور یہ چھوٹا سا کام نہیں کرنا چاہتے ورنہ کیا بات تھی کہ اگر دو چار کارڈ منگا دیتے ، ذرا بچیوں کا دل خوش ہوجاتا ، آپ کا کیا جاتا ۔ جب اس سے بھی کام نہیں چلا تو پھر ہمارے عزیزوں ، رشتہ داروں اور آخر میں ہماری بیوی سے سفارش کرائی گئی اور پھر جب ہم نے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کیا کہ یہ کسی کا ذاتی معاملہ ہے اور گھریلو تقریب ہے ، کوئی فلم شو یا ورائٹی پروگرام نہیں ہے کہ دوست احباب کے لئے دو چار کارڈ یا پاس منگوا دیئے جائیں تو بہت سی خواتین ہم سے یہ کہہ کر ناراض ہو گئیں کہ آپ کرنا نہیں چاہتے ورنہ کوئی مشکل بات نہیں ہے ۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہم کس منہ سے کسی کی گھریلو تقریب کے کارڈ منگا سکتے تھے ۔ یہ ناراضگیاں کافی عرصے تک جاری رہیں جس کا ایک فائدہ تو ہوا اور وہ یہ کہ ہم کافی عرصے تک فرمائشوں سے بچے رہے ۔

ہمارے ایک کرم فرما ہیں ، انہیں ہمیشہ ہماری شکل دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا ہے اور فوراً فرمائشی پروگرام شروع کردیتے ہیں ۔ ان کی فرمائشیں عام طور پر تو وہی عام نوعیت کی ہوتی ہیں مگر ایک دفعہ اس کی نوعیت بالکل بدل گئی ۔ ہوا یوں کہ ایک صاحبزادے کو لے کر ہمارے پاس آئے کہ یہ میرا ہونے والا داماد ہے ۔ اس کو فلاں صاحب سے کہہ کر ان کے دفتر میں نوکر رکھوادو ۔ ہم نے متعلقہ صاحب سے گزارش کی اور لڑکے کی قسمت اچھی تھی ، اسے نوکری مل گئی ۔ اس واقعہ کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک روز صبح ہی صبح وہ پھر ہمارے دفتر میں آدھمکے ۔ وہ سخت ناراض تھے ، آتے ہی غصے میں بولے "میاں تم نے جس لڑکے کو نوکر رکھوایا تھا ۔ وہ نہایت ہی نالائق نکلا ۔ ہم نے عرض کیا " حضور والا ! آپ ہی کی سفارش پر تو اس کو رکھوایا تھا ورنہ ہم کیا جانیں وہ کون تھا ۔ " کہنے لگے " وہ ناہنجار تو بڑا کمینہ نکلا ، میری لڑکی کو بہت تنگ کرتا ہے ، اب تم ایسا کرو کہ انہی صاحب سے کہہ کر اسے نوکری سے نکلوا دو ، پھر دیکھنا اس کا دماغ ٹھکانے آجائے گا ۔ " ہم نے عرض کیا کہ یہ کام ہم نہیں کرتے ہیں کہ کسی کی لگی لگائی نوکری ختم کرادیں اور اس کی روزی پر لات ماریں ، دوسری بات یہ کہ اب ہم ان صاحب کے پاس کس منہ سے جائیں جن سے تھوڑے ہی دن پہلے ہم نے اس لڑکے کی اتنی تعریفیں کر کے نوکر کرایا تھا ۔ " لیجئیے یہ صاحب بھی ناراض ہوگئے مگر ہمیں یقین ہے کہ ہم زیادہ دن ان کی یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکتے اور وہ بھی زیادہ دن تک بغیر سفارش کئے نہیں رہ سکتے ہیں کیونکہ بقول ہمارے دوست کے کہ اگر وہ آپ کے پاس بیٹھے ہوں اور کوئی آپ کا جاننے والا آجائے جس کے متعلق اگر انہیں ذرا سا بھی پتہ چل جائے کہ وہ کیا کرتا ہے ۔ تو وہ فوراً اس سے متعلق کوئی نہ کوئی کام ضرور بتادیں گے ۔ بلکہ وہ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ اگر ان صاحب کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کوئی چور بھی ہمارا جاننے والا ہے تو فوراً یہ فرمائش کردیں گے کہ اس سے کہہ کر فلاں صاحب کے ہاں چوری کرادیں ۔ ان کی ایک اور بھی عادت ہے کہ اگر انہیں یہ معلوم ہوجائے کہ کسی کا کوئی جاننے والا ملک سے باہر خواہ کسی ملک یا شہر جارہا ہو تو وہ اس سے ضرور کسی نہ کسی ایسی چیز کی فرمائش کر دیں گے جس کے متعلق اس بیچارے نے کبھی سنا بھی نہیں ہوگا ۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے ہمارے ایک جاننے والے صاحب چین جارہے تھے ، ان بیچاروں کی بد قسمتی کہ موصوف کو بھی اس کی اطلاع مل گئی ۔ فوراً ہمارے سر پر سوار ہوگئے کہ اپنے دوست سے کہو کہ چین سے فلاں بوٹی لیتے آئیں جو اکثر بیماریوں میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے ۔ بوٹی تو خیر کیا ملتی ، ہمیں پورا یقین ہے کہ اس بوٹی کا نام چین میں بھی شاید ہی کسی نے سنا ہو ، البتہ ان کی ناراضگی ضرور مل گئی فرمائش پوری نہ ہونے کی وجہ سے ۔

کام کروانے اور سفارش کے ضمن میں آج کل ایک نئی اصطلاح رائج ہوئی ہے ، پتہ نہیں آپ اس سے واقف ہیں یا نہیں اور وہ

ہے "دباتا" آئے دن اب اس قسم کی سفارشیں ملتی رہتی ہیں کہ فلاں کو دبلئیے تو وہ یہ کام کردے گا ورنہ نہیں ہوگا۔ کچھ روز پہلے کی بات ہے ہمارے کالج کے ایک پرانے ساتھی تشریف لائے اور اتے ہیں عرصۂ دراز تک نہ ملنے کی شکایت کی، ہم اس انتظار میں رہے کہ کب یہ رسمی شکوے شکایت ختم ہوں اور موصوف جو اتنی محبت اور شفقت فرمارہے ہیں، کب مطلب کی بات زبان پر لاتے ہیں اور شان نزول بیان کرتے ہیں۔ آخر ہماری دو عدد چائے کی پیالیاں پینے اور آدھ گھنٹے تک ہمیں مجسم "انتظار فرمائیے" بنائے رکھنے کے بعد گویا ہوئے۔ "بھئی یہ بتاؤ فلاں صاحب جو ہیں وہ تمہارے پاس اپنے کام کے سلسلے میں آتے ہیں یا نہیں۔" ہم سے جھوٹ نہ بولا گیا اور اس بات کا اقرار کرلیا۔ کہنے لگے "پھر ایسا کرو کہ انہیں ذرا دباؤ۔ ان کے چھوٹے بھائی میرے چھوٹے بھائی کو چھیڑتے ہیں اور بہت تنگ کرتے ہیں۔" ہم نے جواب دیا "بہت اچھا اب کی دفعہ وہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم ان پر کرسی رکھ کر بیٹھ جائیں گے اور انہیں اچھی طرح دبائیں گے۔" یہ سن کر وہ ناراض ہوگئے اور کہنے لگے "آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔" ہم نے عرض کیا "بھلے مانس ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ان کے بھائی کے خلاف تھانے میں پرچہ کٹوادو یا متعلقہ محکمے میں درخواست دے دو۔" سخت ناراض ہوگئے اور کہنے لگے "آپ تو مذاق کرنے لگے، میں آپ سے مشورہ لینے نہیں آیا تھا۔ میں تو ایک "چھوٹی سی" سفارش لے کر آیا تھا اور آپ مجھے دوسرے راستے بتانے لگے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ کام کرنا نہیں چاہتے۔" یہ کہا اور اٹھ کر چل دیئے۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ہم کس طرح متعلقہ لوگوں کو "دبائیں" تاکہ ان کے بھائی دوسروں کے بھائیوں کو تنگ نہ کریں۔

سفارش کی بیماری یا وبا معاشرے میں کس حد تک پھیل گئی ہے اس کا کچھ اندازہ صرف وہی لوگ لگاسکتے ہیں جن کا آئے دن سفارشوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ کس کس کام اور کیسی کیسی باتوں کے لئے سفارشیں آتی ہیں اس بات کا آپ کو صرف اسی وقت پتہ لگتا ہے جو آپ کے دوست احباب اور رشتہ دار ان کاموں کے لئے کہتے ہیں اور ان کی تعمیل پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ مثبت قسم کی سفارشیں جن میں کسی کام کو کروانے کے لئے کہا جائے، اب عام سی بات ہوگئی ہیں اور ان سے ہم سب کا واسطہ روزانہ ہی پڑتا رہتا ہے مگر اب تو اس قسم کی سفارشیں بھی اکثر آتی رہتی ہیں کہ فلاں کا یہ کام نہ ہونے پائے۔ یہ کام واقعی مشکل ہے۔ کسی کے فائدے کے لئے کوئی کہے تو بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ مگر کام بگاڑنے والی بات بعید از فہم ہے۔ اس بات کا صحیح اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ہمیں ایک مشہور کلب کی مجلس انتظامیہ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں پر ممبر سازی کا یہ طریقہ تھا کہ ممبر بننے کے انتخاب کے وقت یہ ضروری تھا کہ امیدوار کے خلاف دو ووٹ نہ ہوں جو کلب کی اصطلاح میں "بلیک بال" کہلاتے تھے۔ اگر کہیں امیدوار کے خلاف دو یا اس سے زیادہ ممبروں نے ووٹ دے دیئے تو پھر امیدوار اس کلب کا ممبر نہیں بن سکتا تھا۔ اس سلسلے میں دوست احباب کی طرف سے اکثر و بیشتر اس قسم کے فون آتے رہتے تھے "بھئی فلاں شخص میرا جاننے والا یا رشتہ دار ہے اور آدمی بھی معقول ہے، اسے کوشش کرکے یا سفارش کرکے ممبر بنادو۔" ایسی سفارشوں کے تو ہم عادی تھے اور ان میں کوئی انوکھی بات بھی نہیں تھی مگر مشکل تو جب آپڑی جب ایک روز ایک صاحب نے ہمیں فون کیا کہ وہ ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور باقاعدہ وقت مقرر کرکے ہم سے ملنے آئے۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "فلاں شخص کو جانتے ہو؟" ہم نے عرض کیا "محض اس حد تک کہ وہ کلب کی ممبری کے امیدوار ہیں اور وہیں پر دو ایک دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔" بہت راز داری سے آگے کی طرف جھکتے ہوئے گویا ہوئے "وہ بہت خراب آدمی ہے اور ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ اسے کلب کا ممبر بنایا جائے۔" ہم نے پوچھا آخر کیوں، اس میں کیا خرابی ہے؟ پڑھا لکھا آدمی ہے اور اچھی جگہ پر کام بھی کررہا ہے۔ "خفا ہوکر بولے "تم نہیں جانتے وہ میری بھتیجی کا شوہر ہے اور اسے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے طلاق بھی دے دے۔ تم ایسا کرو کہ اسے "بلیک بال" کرادو تو اس کا دماغ ٹھکانے آجائے گا اور اسے بھی

پتہ چل جائے گا کہ ہم لوگ ایسے گرے پڑے لوگ نہیں ہیں۔" ہم نے عرض کیا" جناب یہ آپ کے خاندانی اور گھریلو معاملات ہیں۔ ان کو وہیں تک رہنے دیں، کلب سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس کے علاوہ ہم سے جب کوئی پوچھے گا کہ اچھے بھلے عزت دار آدمی کو تم کیوں " بلیک بال " کر رہے ہو تو ہم کیا جواب دیں گے۔" یہ سنتے ہی موصوف ناراض ہوگئے اور فوراً اٹھ کر چل دیئے۔ نہ صرف یہ کہ ہم سے خفا ہوئے بلکہ کافی عرصے تک ہمارے ملنے جلنے والے آدمیوں سے ہماری شکایت بھی کی اور ہماری نا اہلی کا رونا بھی رویا۔

اسی سلسلے کا دوسرا قصہ بھی سن لیجئے۔ ایک خاتون نے کلب کی ممبری کے لئے درخواست دی یہ خاتون اتفاق سے مطلقہ تھیں اور اس کے بعد انہوں نے کسی دوسری جگہ شادی بھی کرلی تھی۔ جیسے ہی ممبران کے لئے انٹرویو میں بلائے جانے والے خواتین و حضرات کے لسٹ لگی، ان کے خلاف کمیٹی کے ممبران کے نام مختلف ناموں سے خطوط آنے لگے کہ ان خاتون کو ممبر نہ بنایا جائے۔ اس قسم کے خطوط ہم لوگوں کو وقتاً فوقتاً اکثر ملا کرتے تھے۔ اور اس پر ہم لوگ کوئی توجہ بھی نہیں دیتے تھے جب تک کہ خط میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو واقعی امیدوار کو نااہل بناتی ہو۔ تعجب تو جب ہوا کہ جب ان کے پہلے شوہر کے بھائی نے ہم سے درخواست کی کہ ان خاتون کو ممبر نہ بننے دیا جائے۔ ہم نے عرض کیا" جناب کے خاندان سے تو اب اس بیچاری کا تعلق ختم ہوگیا ہے اس کی خطا معاف کردیں۔ ویسے بھی اس واقعے کا کلب کی ممبری سے کیا تعلق ہے؟" ہمارا جواب سن کر وہ بہت لال پیلے ہوئے اور آئندہ ہمیں کلب کے انتخاب میں ووٹ نہ دینے کی دھونس بھی دی اور اس پر بھی بس نہیں کی اور جب ان کا دل اس سے بھی خوش نہیں ہوا تو پچھلے انتخاب میں ہمیں ووٹ دینے پر افسوس کا اظہار بھی کیا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ باگ کیسی کیسی سفارشیں لے کر آتے ہیں اور پھر آپ سے توقع بھی رکھتے ہیں کہ نہ صرف آپ ان کی سفارش سنیں بلکہ اس پر پوری طرح عمل بھی کریں۔ ہوا یوں کہ ایک خاتون نے کلب کی ممبری کے لئے درخواست دی اور چونکہ خواتین کی درخواستیں ممبری کے لئے زیادہ تعداد میں وصول نہیں ہوتیں، اس لئے ان کی درخوست کا نمبر بھی جلد ہی آگیا۔ پہلی پیشی پر معلوم ہوا کہ کافی پڑھی لکھی اور معقول خاتون تھیں جو اپنے طور پر کچھ کام بھی کرتی تھیں۔ اگلے ہی دن ہمارے ایک شناسا کا فون آیا" کل فلاں خاتون بھی کلب میں کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی تھیں۔ کیا تم ان سے ملے تھے؟" ہم نے جواب دیا" ان سمیت تمام امیدواروں سے ملاقات ہوئی تھی۔ کیوں کیا ان میں کوئی خاص بات تھی؟" بولے" تمہیں نہیں پتہ اس کی اپنے شوہر سے نہیں بنتی اور حال ہی میں ان کی طلاق ہوگئی ہے۔" ہم نے عرض کیا" ہوگئی ہوگی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے نا اہلی کی۔ بظاہر معقول اور پڑھی لکھی خاتون لگتی ہے۔" کہنے لگے" یار بات یہ ہے کہ میرا ایک بھتیجا ہے جو اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" ہم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا" تو کرے، بخدا ہمیں یا کلب کب کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" خفا ہو کر بولے" بھئی پوری بات تو سنا کرو، میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ شادی ہو، اگر تم کسی طرح اس کو ممبر نہ ہونے دو تو شاید یہ شادی نہ ہو۔" ہم نے کہا" بھئی تم اپنے عزیز طول عمرہ، کو کیوں نہیں سمجھاتے اور اسے شادی کرنے سے کیوں نہیں منع کرتے ہو۔ میں آخر کس وجہ سے اس غریب کو" بلیک بال " کردوں۔"

سخت ناراض ہو کر بولے" میں نے تو ایک چھوٹا سا کام کہا تھا۔ آپ سے مشورہ نہیں مانگا تھا اور آپ الٹا سمجھانے لگے۔" وہ خاتون تو خیر ممبر بن گئی تھیں، پتہ نہیں موصوف کے بھتیجے کا کیا بنا۔ بہر حال وہ ہم سے بہت عرصے تک ناراض رہے جس کا ویسے ہمیں رتی افسوس بھی نہیں۔ ☆

☆●☆

جمیل صدیقی بدایونی

دیکھ کر چلیں

خوش خرامی کے ضمن میں سب سے زیادہ خطرناک تلوار کی دھار پر چلنا سمجھا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت اب ایک فرسودہ
یت بن کر رہ گئی ہے ۔ ہم آپ کو اس سے زیادہ تیز اور خطرناک دھار والی چیز کا نام بتا سکتے ہیں جس پر چل کر تلوار کی دھار پر چلنا
ں کا کھیل معلوم ہوگا۔ بس آپ کو یہ کرنا ہے کہ گھر کی چہار دیواری سے باہر آکر کسی بھری پری سڑک پر پیدل یا کسی سواری پر ہوا
ی کے لئے نکل پڑیں۔ یقین کیجئے کہ آپ گھر واپس آکر دو رکعت نماز شکرانہ ضرور ادا کریں گے اور اگر نل سے پانی نہیں آرہا ہوگا
یم کر کے اس فرض کو ادا کریں گے لیکن یہ سب اسی صورت میں ممکن ہوگا جب آپ صحیح و سالم واپس آگئے ہوں۔ ورنہ آپ خود
سمجھ لیں کہ آج کل تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز دھار والی سڑکوں پر مٹر گشتی کرنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے ۔

آج سے سو یا سوا سو برس پہلے بنائی گئی سڑکیں جو اس زمانے کی آبادی کے تناسب سے تعمیر کی گئی تھیں آج ان پر انسانوں کا
ب بحر ذخار موجیں مارتا نظر آتا ہے اور جس کی طغیانی مسلسل سے نہ صرف ان سڑکوں کے سینے شق ہوئے جاتے ہیں بلکہ ان کے
ارے بھی نذر موجہ بلا ہوگئے ہیں۔ سڑکیں ہی نہیں بلکہ گلی کوچوں کا بھی ہجوم رہرواں سے برا حال ہوا جاتا ہے۔ انواع اقسام کی دھواں
اتی، شور مچاتی گاڑیاں، ملک الموت کی مانند منہ پھاڑے سر پر چڑھی چلی آتی ہیں۔ اور اسی طوفان بدتمیزی میں آوارہ جانور اور خونخوار
انڈ تمام ٹریفک قوانین پر بول و براز کرتے ہوئے انجانی منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ اگر آپ اپنی جان [illegible] کی خیر مناتے
ئے کسی پتلی گلی سے اپنی منزل تک پہنچنا چاہیں تو اور بھی آفت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس گلی میں دو رکشے یا دو صد جھگڑے
نبرد ہوں راستہ بند ہو اور جب تک آپ راستہ کھلنے کا انتظار فرمائیں جب تک آپ کے پیچھے رکشوں، اسکوٹروں اور سائیکلوں کی اتنی
ں قطار لگ چکی ہو کہ واپس لوٹنا چاہیں تو قطعی ناممکن ہو۔

بڑے بڑے شہروں میں کم از کم اتنا تو ہے کہ وہاں ٹریفک کے نظام کی وجہ سے آنے اور جانے والوں کی راہیں جدا جدا ہوتی
۔ بعض چوراہوں پر لال پیلی اور ہری بتیاں آنکھیں جھپکا جھپکا کر لوگوں کو اپنے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ ان کے
ب ہوجانے پر (ویسے وہ زیادہ تر خراب ہی رہتی ہیں) ٹریفک کانسٹبل بھیڑ کو اپنی انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے ۔ لیکن چھوٹے چھوٹے
ں کے مقدر میں یہ نعمتیں کہاں؟ وہاں کے چوراہوں کے گول چبوتروں پر کانسٹبل کی بجائے آوارہ کتے اور جگالی کرتی گائیں
ہوتی ہیں۔ یہی دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آخر اتنی ساری گائیں شہروں میں کہاں سے آجاتی ہیں۔ اور رات دن شہر کی سڑکوں پر
پھرتی ہیں خواہ چارے کی جگہ ردی کاغذ اور کوڑا کرکٹ ہی کیوں نہ کھانا پڑے ۔ کبھی کوئی بھینس یا بکری اس طرح آوارہ گھومتی
ں دکھائی دیتی۔ سن سینتالیس کے بعد جیسی آزادی اس ملک میں گائیں، سانڈوں، سوروں اور بندروں کو ملی ویسی اس دیس میں

رہنے والے انسانوں کو تو میسر ہی نہیں ہوئی۔

ہماری سمجھ میں ایک بات اور نہیں آتی کہ آزادی کے بعد ہمارے ملک کی آبادی اتنی تیزی سے کیوں بڑھنے لگی؟ انگریزی دور حکومت میں آبادی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ تقسیم ملک کے دوران مار کاٹ اور بھاگم بھاگ میں کافی لوگ ادھر سے ادھر ہوگئے لیکن آبادی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزادی کا خارجی پہلو اتنا تابناک نہیں تھا جتنا داخلی پہلو۔ جو ایک روح روشن مستقبل کی نشان دہی کر رہا تھا۔ لیکن اس سرزمین پر اولاد کی اتنی روشنی ہوگی اس کا تو کسی کو سان گمان بھی نہیں تھا۔ حضرت اقبال نے غالباً ہماری اسی ناسمجھی سے ہمیں خبردار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ ایک دن ہماری تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ بڑے سے بڑے ایٹمی اور کیمیاوی ہتھیار بھی ہمارا نام و نشاں مٹانے میں ناکام رہیں گے۔ کیوں کہ ہمارے ہر قطرہ خوں سے یہی آواز آئے گی:

ہر اک قطرے میں ہے ساز انا البحر
ہم اسے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ایک شب ہم نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہم کسی اخبار کے دفتر میں اس کی پرانی فائلیں الٹ پلٹ رہے ہیں۔ اچانک اس کے ایک پرانے شمارے پر نظر جم کر رہ گئی اس پر پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ درج تھی اور جلی الفاظ میں ایک خبر شائع کی گئی تھی جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کی آزادی کے مبارک موقع پر پیام تہنیت ارسال فرمایا تھا اور یہاں کے جذبہ عقیدت سے خوش ہو کر اہل ہند کی ایک دل پسند اور بکثرت مانگی جانے والی دعا کو شرف قبولیت عطاء فرمادیا تھا۔ یعنی اب خدا کے فضل سے ہر گھر میں بغیر کسی دعا اور منت کے صبح و شام اولاد کی نعمت سے بھرے خوان پر خوان اترا کریں گے۔ خبر میں آگے یہ بھی کہا گیا تھا کہ خدا نے یہاں سے پہنچنے والی دعاؤں، منتوں، نذروں، نیازوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہاں پر باپ کا نام چلانے اور ماں کو طلاق سے بچانے کے لئے کم از کم ایک چاند سے بیٹے کی اشد ضرورت ہے اور اس کی تصدیق تعویذوں اور گنڈوں کے ذریعہ پہنچنے والے ٹیلی گراموں سے بھی ہوتی تھی۔ جس میں اکثر و بیشتر اولاد کی مانگ کی جاتی تھی۔ لہٰذا لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا کہ پچاس سال کے اندر اولاد کے معاملے میں ہندوستان نہ صرف خود کفیل ہوجائے گا بلکہ غیر ممالک کو اولاد سپلائی کرنے والا واحد ملک بن جائے گا۔ ابھی ہم یہیں تک پڑھ پائے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ کیوں کہ ہم پر چودہ طبق روشن ہوگئے تھے اور آبادی میں اضافے کی حقیقی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔

یہ تو تھی جگ بیتی اب ذرا آپ بیتی بھی سن لیجئے۔ ہم ایک ایسے سرکاری دفتر میں ملازم ہیں جو ہمارے گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ہے۔ ایک بدنصیبی ہمارے ساتھ یہ بھی ہے کہ ہم اسکوٹر یا موٹر سائیکل تو کیا سائیکل بھی چلانا نہیں جانتے۔ بچپن میں ایک بار سائیکل چلانے کی کوشش کی تھی لیکن اس مشق کے دوران سر پر ایسی چوٹ کھائی کہ دوبارہ پیڈل پر قدم رکھنے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ ہماری اس کمزوری کا ہمارے بہت سے احباب مذاق اڑاتے ہیں لیکن ہم پرواہ نہیں کرتے۔ ہمارے خیال میں اگر سڑک پر ہی مرنا لکھا ہے تو اپنے ہاتھ پیروں پر ہی کیوں نہ مریں کسی اسکوٹر یا سائیکل کا احسان کیوں اٹھائیں۔ لیکن کبھی کبھی اشد ضرورت کے تحت رکشا کا زیر بار احسان ہونا پڑتا ہے۔ یونہی ایک بار ہم رکشے پر سوار ہو کر دفتر جارہے تھے۔ سڑک پر حسب معمول پیدل انسانوں کی

بھیڑ کے پہلو بہ پہلو سائیکل سوار، اسکوٹر سوار، موٹر سوار، ٹریکٹر سوار اور بیل گاڑی سوار سبھی اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ ہارن کی آوازوں۔ ڈیزل اور پیٹرول کے دھوئیں سے فضائیں معطر اور مترنم تھیں اس جم غفیر کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہو رہی تھی کہ ٹریفک کانسٹبل کی عدم موجودگی کے باوجود کوئی حادثہ نہیں ہوتا جب کہ دہلی ممبئی جیسے شہروں میں باوجود نظم و ضبط کے آئے دن حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ اچانک ہمارے رکشے کی پچھلی سائیڈ پر ایک زوردار ٹکر پڑی اور ہم رکشے کے آگے سربسجود ہوگئے۔ ہمارا رکشہ کسی شریر بچے کی طرح ہمارے کاندھوں پر سوار ہوگیا۔ چند لمحوں تک ہم اسی حالت میں رہے لیکن جب سجدے سے سر اٹھایا تو پیشانی پر ایک عدد گومڑا نمودار ہو چکا تھا۔ ٹھیک اس مقام پر جہاں مخفقہ نمازیوں کے گٹے ہوتا ہے۔

ہم نے پلٹ کر اپنے عدوئے جاں کی طرف نظر ڈالی تو بڑا ترس آیا ایک آٹھ یا نو سالہ طفل مکتب اسکوٹر کو سنبھالے ہماری جانب رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چوٹ ہی تو لگی ہے مر تو نہیں گئے۔ پھر یہ کتنے فخر کی بات ہے کہ اب ننھے ننھے بچے تک کار یا اسکوٹر چلانے لگے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب شکم مادر سے تربیت یافتہ انجینیر، ڈاکٹر اور یا پھر ڈرائیور پیدا ہوا کریں گے۔۔

قصہ کوتاہ یہ کہ ہم نے پوری صدق دلی سے ننھے اسکوٹر سوار کو معاف کر دیا۔ رکشے والے پر ترس کھا کر اس کی ٹوٹ پھوٹ کا ہرجانہ ادا کیا۔ اپنی مرہم پٹی کا خرچ اٹھایا۔ ایک دن کی چھٹی گنوائی اور لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ ماتھے کی چوٹ کچھ دن میں ٹھیک ہوگئی لیکن پیشانی پر نمازیوں جیسا سیاہی مائل گٹہ ضرور پڑ گیا اور اس طرح مفت میں خون بہا کر نمازیوں میں شامل ہوگئے۔ خیر جو بھی ہوا سو ہوا۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ چاہے خرگوش کی طرح دوڑیں چاہے ہماری طرح کچھوے کی چال چلیں۔ جس طرح چاہے چلیں لیکن دیکھ کر چلیں کیوں کہ:

"یہ گھڑی محشر کی ہے ہم عرصۂ محشر میں ہیں"

غزلیں

اقبال شانہ
(حقل، سعودی عرب)

مارکٹ میں تو آگیا البم
چار دن بھی نہ چل سکا البم

مجھ کو اب اور نہ سنا البم
سامنے سے مرے ہٹا البم

گیت سارے ہیں اس میں جناتی
ہے یہ شیطانیت بھرا البم

رقص اس میں ہے بس چڑیلوں کا
کوئی آفت ہے یا بلا البم

کوئی اس کی سنے ، سنے نہ سنے
تو مسلسل مگر بجا البم

ٹنک، ٹڑک تن، ٹڑک، ٹڑک تن تا
یہ بتاؤ کہ ہے یہ کیا البم

کوئی بھی نہ سمجھ سکا لیکن
مارکٹ میں تو چل گیا البم

چار پاگل جو مل گئے شانہ
یہ سمجھ لو کہ بن گیا البم

●☆●

ان کے ڈیڈی کی کرم فرمائیاں میری طرف
تان دی بندوق کی دو نالیاں میری طرف

ایک دروازہ تمہارا بند کیا مجھ پر ہوا
جانے کتنی کھل گئیں ہیں کھڑکیاں میری طرف

کوئی بتلائے کہ مجھ میں کیا ہے ایسی خاص بات
مسکرا کر دیکھتی ہیں لڑکیاں میری طرف

کیا میں آثار قدیمہ کی نشانی ہوں کوئی
دیکھتی ہیں غور سے کیوں بوڑھیاں میری طرف

آم کھاتے ہیں چچا غالب کی طرح شوق سے
پھینکتے ہیں چوس کر وہ گٹھلیاں میری طرف

اگ رہی ہے گھاس میرے سونے آنگن میں بہت
آرہی ہیں دوڑ کر اب بکریاں میری طرف

جیب سے باہر چونی تو ابھی نکلی نہیں
بے تحاشہ بڑھ رہی ہیں جھولیاں میری طرف

کارخانے شہر کے تم کو مبارک دوستو
گاؤں کی ہیں لہلہاتی کھیتیاں میری طرف

بزم شعر و شاعری کا ماجرا مت پوچھئے
تالیاں ان کی طرف اور گالیاں میری طرف

جب سوال اٹھا کہ دیوانوں میں شانہ کون ہے
اٹھ گئیں یارو ہزاروں انگلیاں میری طرف

للی چودھری
یو۔ایس۔اے

کھٹ میٹھے رشتے

یادش بخیر۔ اگر مغلیہ دور نے ہمیں تاج محل اور غالب جیسے دو عظیم الشان تحفے دیئے ہیں تو انگریزی زبان نے ہمیں ایک بے حد رسیلا اور کھٹ مٹھا لفظ کزن دیا ہے۔ دیکھنے میں یہ مناسا سہ حرفی لفظ ہے۔ لیکن اس میں شیرے سے تربتر جلیبی جیسی حلاوت کھوئے ملائی والی قلفی جیسی گھلاوٹ اور مٹی کے کونڈے میں گھوٹی ہوئی بادام، الائچی اور چار مغز والی سردائی جیسی طراوت ہے۔ اس لفظ میں ساون کی پہلی پھوار کی سوندھی سوندھی مہک ہے اور چودھویں رات کے چاند کی پر اسرار ٹھنڈک۔ اس میں صبح بنارس کی لطافت ہے اور شام اودھ کی ملاحت۔ میں لاکھ تشبیہیں اور استعارے استعمال کرنے کی کوشش کروں لیکن اس سہ حرفی لفظ کا ست رنگیا کبوتر میری گرفت سے پھڑپھڑا کر نکل جاتا ہے۔ یہ لفظ ارض و سما کی کونسی البیلی وسعتیں چھپائے ہوئے ہے۔ اس کا پتا ہوسٹل کا جاکر لگا۔ وہاں تو کزن والیوں کی شان ہی نرالی تھی۔ اس طرح اٹھلا کے چلپتیں جیسے ان میں سرخاب کے پر لگے ہوں۔ اتوار کے دن ہوسٹل میں بسنت کے میلے جیسی گہما گہمی ہوتی۔ بڑے ٹھاٹ باٹ سے لڑکیوں کے کزنوں کا ورود مسعود ہوتا۔ کسی کے ہاتھ میں پھول ہیں اور کوئی ٹافیاں لئے چلا آرہا ہے چوکیدار جب کسی لڑکی کو اس کے کزن کی آمد کی اطلاع دیتا تو وہ کزن کا لفظ ایسے اہتمام سے ادا کرتا جیسے جہلم اور راولپنڈی سے نہیں غرناطہ اور قرطبہ کے محلوں سے کوئی شہزادہ ملنے آیا ہو۔ اور کزن والی لڑکی کچھ اس طرح دوپٹے کو لہراتی ڈرائنگ روم میں جاتی ہے جیسے فضا میں مچلتی بل کھاتی پتنگ ہو۔

اور کزنز کے جانے کے بعد ان کی لائی ہوئی ٹافیوں کتابوں اور پھولوں کے بارے میں ایسی ایسی خیال آرائیاں ہوتیں کہ:

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

والی بات صادق آتی نیر اپنی نیل پالش والی مخروطی انگلیوں میں پارکرپن تھامے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ لیے کتاب پہ کچھ اس انداز سے شعر لکھتی جیسے صفحہ قرطاس کے بجائے کسی کے دامن پہ کوئی پیغام لکھا جارہا ہو۔ مسرت اس طرح ٹافی منہ میں رکھتی کہ بس پوچھو مت۔ عذرا کو کازیتن کے پھول سونگھتے دیکھ دیکھ کر جی اوب گیا اور اس پھول سے ایسی الرجی ہوئی جو آج تک نہیں گئی۔

کوئی اپنی کزن کو آئسکریم کھلانے لے جارہا ہوتا اور کوئی Movie دکھانے اور یہ سب کچھ دیکھ کر اپنے ناس مارے خاندان پہ بے تحاشا غصہ آتا جہاں ڈھنگ کے کزنوں کا کال پڑا ہوا تھا۔ اور مارے غشی کے برا حال تو اس دن ہوا جب پنسلین کے ری ایکشن سے دو دن ہسپتال پڑی سڑتی رہی اور فلم سٹار جیسا کوئی کزن عیادت کے لیے نہ آیا۔

احساس محرومی کزن نے دل پہ وہ تازیانے لگائے کہ اس کی ضربوں سے نڈھال جینے کی ہر امنگ اور ہر ترنگ ختم ہونے لگی۔ اور چھٹی والے دن ہوسٹل رہنے کے بجائے گھر سدھارنا شروع کردیا۔ کچھ ہفتے تو امی نے برداشت کیا۔ اندر ایک دن کہنے لگیں:

"بے بی اگر تمہارا دل ہاسٹل میں نہیں لگتا تو ٹرانسفر کرا کے واپس یہاں آجاؤ۔ میں تو تمہیں لاہور بھیجنے کے حق میں نہ

تمہارے ابا جان کو پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرانے کا جنون تھا۔"

"امی دل تو لگا ہوا ہے"۔ میں نے ان کی تسلی کرتے ہوئے کہا

"پھر یہ شکل پہ ہر وقت بارہ کیوں بجے رہتے ہیں"؟ امی نے دل جلانے والا دوسرا وار کیا۔ "پڑھائی اور سفر کی تھکان کا عذر پیش کر کے اپنے کمرے میں آئی تو ہوسٹل کا منظر کسی چور دروازے سے ذہن میں آوارد ہوا۔ اور میں اس میں یوں محو ہو گئی کہ امی کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ وہ میرے بیڈ پہ بیٹھ کر کہنے لگیں

"اگر تمہارا دل لگا ہوا ہے تو ہر ہفتے گھر آکر اس طرح کیوں پڑی رہتی ہو"۔

"امی آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ میں ہوسٹل میں بہت خوش ہوں۔ میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ سوا سوا گز لمبے ہوکے کیوں بھرتی ہو"۔ امی جیسے راز اگلوانے پہ تلی ہوئی تھیں۔

"یہ سب احساس محرومی ہے" نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا اور امی تو غضبناک ہو گئیں۔

"کفران نعمت کی حد ہوتی ہے بے بی جس چیز کی طرف تم نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تمہارے باپ نے وہ چیز حاضر کر دی۔ شہزادیوں کی طرح تمہیں پالا ہے۔ اپنی کتابیں تک اٹھا کر کبھی اسکول اور کالج نہیں گئی تھیں۔ کچھ خدا خوفی کرو کیوں ٹھنڈے دودھ میں پھونکیں مار رہی ہو۔

"امی یہ احساس محرومی دنیاوی آسائشوں کا نہیں ہے یہ سارا سوگ تو محرومی کزن کا ہے"۔

"یہ اوتترا کزن کیا ہوتا ہے؟" امی نے پوچھا

"خالہ، ماموں، پھپو، تایا اور چچا زاد کو انگریزی میں کزن کہتے ہیں"۔ میں نے ٹھنڈی لیتے ہوئے کہا۔

"بے بی ہوش کی بات کرو۔ امی شجرہ نسب کھولتے ہوئے بولیں "خالہ کی طرف سے حمید، رشید اور نرگس۔ ماموں کی طرف سے مختار اور نثار۔ پھپھو کی طرف سے اسماعیل۔ حاجرہ اور خدیجہ، تایا کی طرف سے صدیق۔ شفیع اور خورشید اتنے سارے کزن موجود ہیں۔ پھر یہ احساس محرومی کیسا"۔

"امی آپ بھی کمال کرتی ہیں کزن تو ہوتے ہیں ہیرو جیسے جن کے نام شہزاد فراز، زبیر، عامر اور عمران ہوں یہ دقیانوسی ناموں والے بڑھے کو موسٹ کزن کہلانے کے قابل کہاں ہیں۔ پچھلے ماہ جب بھائی جان حمید ہوسٹل چیزیں دینے آئے تھے تو ساری لڑکیاں سر پہ پیار لینے کے لئے لائن لگا کر کھڑی ہو گئی تھیں اور ایسی ندامت ہوئی کہ مر جانے کو جی چاہتا تھا"۔

"اس اوتتری انگریزی نے تمہارا دماغ خراب کر رکھا ہے"۔ امی سارا الزام انگریزی پہ ڈال کے چلی گئیں۔ اب ہر ہفتے گھر آتے ہوئے ڈر لگتا۔ اور چھٹی والے دن ہوسٹل میں جان جاتی تھی دن رات یہی آہیں بھرتی ۔۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے یہ کزن بری بلا ہے

پہلے کزن والیوں کو حسرت سے دیکھتی تھی پھر ان سے خار آنے لگی اور ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچ گئی جسے الہامی زبان میں حسد کہتے ہیں۔ ہوم ورک کے بعد فارغ وقت اس سوچ میں گزر جاتا کہ کسی طرح کہیں سے یونانی دیوتاؤں جیسا ایک کزن مل جائے یا کوئی ایسا سلسلہ بنے جس میں سب کے گلفام جیسے کزنوں کو دیس نکالا دے کر کالے پانی بھیجا جاسکے ۔۔

دن کو پوری نہ ہونے والی تمنائیں رات کو سپنوں کا روپ دھار لیتیں اور میرے گھر کزنوں کی بارش ہوتی۔ کلارک گیبل راک ھڈسن اور کیری گرانٹ جیسے کزن رنگ برنگے پیراشوٹ سے آنگن میں یوں گرتے جیسے خزاں میں درختوں سے پتے ۔

رات کو دور کہیں سے مینڈک کے ٹرانے کی آواز آتی تو دل چاہتا چپکے سے جاکر اسے پکڑ لاؤں ہوسکتا ہے Kiss کرنے سے وہ ہینڈسم اور چارمنگ کزن کا روپ دھار لے ۔ لیکن اس کے سلائمی پن کا سوچ کر جی کچا ہونے لگتا ۔ ہر بند بوتل کو اس آس پہ کھولنا شروع کیا کہ ہوسکتا ہے پھک سے جن نمودار ہو کر کہے " مانگو جو مانگتی ہو میں تمہاری خواہش پوری کرنے کو حاضر ہوں " تو جھٹ سے کہوں گی کہ کوہ قاف سے ایسا خوبصورت کزن لاکر دو کہ اسے دیکھ کر سب کزن والیاں اگر اپنے ہاتھ کاٹیں نہیں تو ہاتھ ملتی ضرور رہ جائیں ۔ لیکن سب بوتلیں خالی اور بے کار گئیں ۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر چپکے چپکے اللہ سے دعائیں مانگنی شروع کیں ۔ اکیس دن تک فجر کی نماز کے دوران سورۂ یٰسین سات مبین کے ساتھ پڑھی اور گڑگڑا کر اللہ سے فریاد کی کہ پروردگار تیرے کہنے سے فیکون ہوجاتا ہے ۔ کہیں سے دور پار رشتے کا ہی کزن بھیج دے تاکہ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے اترا سکوں ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دن بلھے شاہ کے مزار پہ جا حاضری دی ۔ داتا صاحب کے دربار جاجاکر دعائیں مانگیں ۔ باہو سلطان کے مزار پہ دعا مانگ کر بہت دیر تک ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہی لیکن مراد پوری کرنے کے لیے درخت کا کوئی پتہ ٹوٹ کر میرے ہاتھوں میں نہ گرا ۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ بارہ سال بعد اللہ روڑی (کوڑے کے ڈھیر) کی بھی سن لیتا ہے میری بارہ مہینوں کی گریہ زاری بھی کام کر گئی ۔ ابا کے تایازاد بھائی جو مدت گزری لاپتا ہوگئے تھے اور گھر والے رو پیٹ کر اور ختم درود دلا کر صبر سے بیٹھ گئے تھے ۔ اپنی برٹش بیوی میری (Marry) اور بیٹے ریاض کو جسے راجی کہتے تھے ہانگ کانگ سے پاکستان سیر کے لئیے لے آئے ۔ مجھے اپنی دعاؤں کی قبولیت پہ اچنبھا بھی ہوا اور کل یوم ہونی شان کا مفہوم بھی سمجھ میں آگیا ۔ میرے تو قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے لگتا تھا ہوا کے دوش پہ سوار ہوں ۔ روپہلی بادلوں کے سنگ سنگ اڑ رہی ہوں ۔ کزن اور وہ بھی میڈان ہانگ کانگ بڑا Sophisticated بڑا گیلانٹ ۔ برٹش لہجے میں انگریزی بولتا تو سب کو مسحور کر دیتا ۔ میرا دل چاہتا بلھے شاہ کے مزار پہ جاکے دھمالیں ڈالوں اور گاؤں

واہ واہ بلھے شاہ جی

جینے کزن دتا راجی

ایک دن امی نے میری ازلی ابدی محرومیوں کی تلافی کرنے کے لئے راجی کو چند چیزیں دے کر ہوسٹل بھیج دیا جیسے ہی چوکیدار نے مجھے اطلاع دی کہ تمہارا کزن آیا ہے تو حسب معمول میری سہلیاں سروں پہ ڈوپٹے اوڑھتے ہوئے پیار لینے کے لئے ایک دوسری کے آگے دگڑ دگڑ کرتی بھاگیں ۔ عذرا کو ڈوپٹہ نہ ملا تو اس نے بستر کی چادر کھینچ کر بکل مارلی ۔ لیکن وزیٹنگ روم میں گورے چٹے اونچے لمبے راجی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں ۔ عذرا اپنی چادر گچا مچا کرتے ہوئے بولی ۔

" یہ تمہارا کزن ہے یا کوہ قاف کا شہزادہ ؟ اب تک کس ظالم جن کی قید میں تھا یہ ؟ "

اور مجھے یوں لگا جیسے میرے بھی سرخاب کا پر نکل آیا ہو ۔

اس کے بعد وہ کئی دفعہ ہوسٹل آیا ۔ تابی اور عذرا اس کے برٹش لہجے پہ مری جاتی تھیں ۔ لیکن مجھے اس کی ایک بات بہت کھٹکنے لگی تھی ۔ کم بخت ایسا کنجوس مکھی چوس تھا کہ کیا مجال کبھی پھول یا چاکلیٹ لے آئے باتوں باتوں میں دس مرتبہ اسے بتایا بھی کہ چاکلیٹ میری کمزوری ہے اور سفید گلاب اور نرگس کے پھولوں پہ جان جاتی ہے ۔ لیکن اس چکنے گھڑے پہ کوئی اثر نہ ہوا ۔ میں سوچتی یہ موران ہانگ کانگ سے آیا ہے یا ٹوبہ کمالیہ سے ذرا بھی تمیز نہیں پتا نہیں کیسی انگریز ماں تھی جس نے اسے اتنی بھی تربیت نہیں دی تھی کہ ہوسٹل جاتے وقت لڑکیوں کے لئے پھول یا چاکلیٹ لے جاتے ہیں ۔ کم بخت نرے پینڈو ۔

اور مجھے اپنے آپ پہ بھی غصہ آتا ۔ امی ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ کفران نعمت کی حد ہوتی ہے ۔ ایک کزن مانگا تھا سو مل گیا اور وہ

بھی کسی مصور کے شاہکار جیسا جسے اللہ تعالیٰ نے گرمیوں کی چھٹیوں کے فارغ دنوں میں بڑی لگن اور چاہت سے بنایا تھا۔ اگر اس میں ایٹی کیٹس نہیں تو کیا ہوا۔ میں نے کونسا اس سے شادی کرنی ہے جو اس کی خامیاں ڈھونڈنے بیٹھ جاؤں۔

اس دوران فائنل ایگزام دیا شادی ہوئی اور لاس اینجلس آگئی۔ ایک دن کیمپس اور ہوسٹل کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اپنے شوہر کو محروی کزن کی داستان بھی سنا ڈالی۔ وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے "تم نے راجی کو اس لئے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا کہ وہ چاکلیٹ اور نرگس کے پھول لے کر تمہارے ہوسٹل نہیں آتا تھا"۔

"بات چاکلیٹ اور نرگس کی نہیں وہ رموز الفت اور آداب محبت سے بالکل ناواقف تھا۔ اور پہلے درجے کا کنجوس۔ اب دیکھئے وہ ہانگ کانگ سے چلا تھا اگر اس میں رومانیت کا ایک اونس (Ounce) بھی ہوتا تو وہ سلکی سکارف کوئی Exotic پرفیوم یا کم از کم ہرشی چاکلیٹ ہی لے کر آتا۔ اور وہاں سے کچھ نہیں لایا تھا تو لاہور سے خرید سکتا تھا۔ وہ کم بخت تو اپنے خالی ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے ہوسٹل کے دروازے پہ آکر یوں کھڑا ہو جاتا جیسے پبلک کے چندے سے نصب کیا ہوا کوئی مجسمہ ہو"۔

میرے شوہر کہتے "رموز عشق اور آداب محبت پہ اگر تم نے تھیسس لکھا ہے تو مجھے پتا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بقول تمہارے اگر وہ کنجوس تھا تو تم بھی پہلے درجے کی لالچی اور ندیدی تھیں جو اس کے تحفوں کی آس میں بیٹھی رہتی تھیں"۔

"یہ لالچ اور ندیدہ پن نہیں مسٹر، اصول کی بات ہے کہ ہوسٹل میں کسی لڑکی اور وہ بھی کزن سے ملنے جاتے ہوئے ایسے تحفے لے کر جاتے ہیں کہ اس کی سب دوست حسد سے جل نہیں اٹھیں تو گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگیں ضرور۔ میں اپنے بیٹے کی ایسی زبردست تربیت کروں گی کہ بنا چاکلیٹ اور پھولوں کے کبھی کسی کزن سے ملنے نہیں جائے گا"۔

ہمارے بچے ہوئے تو جب بھی میں پاکستان اپنے عزیز و اقارب کو ملنے جاتی۔ میرے شوہر ایرپورٹ پہ سی آف کرتے ہوئے مذاق پر اتر آتے۔ "بے بی مجھے پتا ہے کہ تمہاری رگوں میں راوی گردش کرتا ہے لاہور تمہارے دل و جان میں سمایا ہوا ہے اور تمہارے ذہن میں کزن کا رومانوی تصور اب تک کلبلاتا ہے لیکن پلیز اپنے کسی بہن بھائی سے بچوں کے بارے میں ہاں نہ کر آنا۔ میں کزن کے ساتھ شادی کے بہت خلاف ہوں۔

گزشتہ چند سالوں سے میری دیدی کو یہ گلہ تھا کہ اس کا بیٹا ٹیپو آنے بہانے زرقا (ہماری بھانجی) کے ہاسٹل کچھ نہ کچھ لے کر پہنچ جاتا ہے اور مجھے زرقا کی قسمت پہ رشک آتا وہ صحیح معنوں میں ایسی بھرپور زندگی گزار رہی تھی جو کزن والیوں کا حق ہوتی ہے۔ میں یہ بات اپنے شوہر کو بتاتی تو وہ چھیڑنے لگتے۔

"بے بی یہ کہو کہ زرقا وہ زندگی گزار رہی ہے جس کی تمنا میں تم مری جاتی تھیں اور جس کا داغ تمہارے دل سے ابھی تک نہیں مٹا"۔

پچھلے ہفتے خوشی سے سرشار میں نے اپنے بچوں کو ٹیپو اور زرقا کی منگنی کی اطلاع دی تو میرا بیٹا حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگا۔

"مم وہ تو فرسٹ کزن ہیں"

"یہی تو سارا چارم ہے"۔ میں نے اسی والہانہ پن سے جواب دیا۔

میری بیٹی جو کمپیوٹر پہ اپنا ہوم ورک کر رہی تھی "How gross" کہہ کر اپنے منہ پہ ہاتھ رکھتی ہوئی باتھ روم میں Throw up کرنے بھاگ گئی اور کالج کے زمانے سے لے کر اب تک کزن کا وہ الف لیلوی تصور جو بڑے اہتمام سے سینت سینت کر رکھا ہوا تھا ان دو لفظوں سے یوں ٹھنا کے سے ٹوٹ کر چکنا چور ہوا کہ کرچیاں تک ہاتھ نہ آسکیں۔ ☆

صابر والد
تحصیل مسجد جی ٹی روڈ
ایٹہ۔یوپی۔۲۰۷۰۰۱

زنجیر

ایک بار استعمال کیا تھا برین کا
وہ میرا پہلا پہلا سفر تھا ٹرین کا

وہ دن کا واقعہ تھا کوئی رات کا نہیں
میرے قریب بیٹھی تھی لڑکی بڑی حسیں

میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے
ڈرنے کی بات ہو تو مجھے ڈرنا چاہئے

غلطی پہ ہوں اگر تو سزا مجھ کو دیجئے
لکھا ہوا تھا ریل میں زنجیر کھینچئے

مطلب کی جتنی بات لکھی تھی وہ پڑھ گیا
اس کے گلے کی سمت میرا ہاتھ بڑھ گیا

زنجیر کھینچنے پہ عجب شور ہوگیا
میں اک شریف آدمی سے چور ہوگیا

یہ تجربہ ہوا ہے مجھے آکے جیل میں
سرکار خود ہی چوری کراتی ہے ریل میں

☆●☆

پاگل عادل آبادی

لیجئے دوستوں کی دعا
قرض دے کر بھلا دیجئے

دم دلاسے پہ کب تک رہوں
عقد میرا پڑھا دیجئے

جاکے ان سے کچن میں کہا
دال میری گلا دیجئے

ان کی ہابی ہے دل توڑنا
کچھ کھلونے دلا دیجئے

ٹالنا ہو اگر مسئلہ
اک کمیٹی بٹھا دیجئے

دیجئے شاک پاگل کو کیوں
میری غزلیں سنا دیجئے

●☆●

روشن علی کرنل
کریمنگر

لطف آیا تھا رات ڈینر کا
ٹپ تو خالی گیا نہ ویٹر کا

ذائقہ الگ گیا ہے مدراسی
دوسہ اڈلی کے ساتھ سامبر کا

موج مستی میں ہوگیا مشغول
پیسہ آتا ہے جس کو باہر کا

شہر کی بڑھ گئی ہے آبادی
کال اب پڑ گیا ہے واٹر کا

اونٹ اور بکریاں چراتے ہیں
لے کے ویزا گئے تھے شوفر کا

ہیرو بننے چلے تھے شیخ گھڑو
رول ان کو ملا نہ جوکر کا

لوگ برسا رہے ہیں کرنل پر
دوش اس میں ہے کیا ٹماٹر کا

☆●☆

حیدر بیابانی

مچھروں کا شکوہ

چپہ چپہ ہوگئے ہم نالی نالی ہوگئے —
نام ہے مچھر ہمارا ہم مثالی ہوگئے —
دن میں سرگرم عمل ہم شب میں کب غافل رہے
مدتوں انسان کے دکھ درد میں شامل رہے
ساتھ اپنا ہے پرانا پتھروں کے دور سے
رات بھر لوری سنے دنیا ہماری غور سے
اب مگر انسان ہم سے ہر گھڑی بیزار ہیں
ہر جگہ ہر موڑ پر وہ برسر پیکار ہیں
ہم پہ ڈی ڈی ٹی چھڑک کر کر رہے ہیں قتل عام
ایک ننھی جان کی دشمن ہوئی دنیا تمام
تان لیتے ہیں ہمارے ڈر سے مچھر دانیاں
رات بھر تقدیر پر چھائی رہیں ویرانیاں
چھت کے پنکھے سے سدا کٹ کٹ کے ہم مرنے لگے
اک ذرا سی دیر بھی اڑنے سے ہم ڈرنے لگے
ہم نے اپنا گھر بنایا جس جگہ بھی چاؤ سے
ہم کو بیگانہ کیا بیگان کے چھڑکاؤ سے
مل رہے ہیں ہاتھ منہ پر لوگ اوڈوماس کو
اب کہاں بجھنے وہ دیتے ہیں ہماری پیاس کو
توڑتے رہتے ہیں ہم پر ظلم کے ایسے پہاڑ
گندگی کو صاف کر کے دیں ہمارے گھر اجاڑ
ٹھوکریں در در کی کھانے پر ہوئے مجبور ہم
اپنے آبائی ٹھکانوں سے ہوئے جب دور ہم
کچھ ٹھکانے ہیں ابھی ایسے جہاں موجود ہم
ایک دن ایسا نہ ہو دنیا سے ہوں نابود ہم

منہ پھٹ، ناگپور

غزل

اپنا کے سر پھروں نے ٹکٹک مزار والی
مسجد بنا ہی ڈالی نقش و نگار والی
کچھ قوم کو کھنگالو، کچھ جیب سے نکالو
یارو مزا نہ دے گی دعوت ادھار والی
پھر آگیا چناؤ پکنے لگے پلاؤ
رت بھیج دی خدا نے قول و قرار والی
کہلا رہے ہیں غازی بھولے ہوئے ہیں ماضی
رکھتے نہیں مسلماں تلوار دھار والی
میں نے تو کی شکایت کل رات گیسٹرو کی
اس نے مجھے کھلا دی گولی بخار والی
کچھ بدگمانیوں کا گھر میں دھواں نہیں ہے
حقہ نواز مسٹر، میڈم سگار والی
تگڑم کئی لڑائے، کرتب کئی دکھائے
لیکن ملی نہ کرسی اس کو وقار والی
دشمن قدم قدم پر کھینچے ہوئے ہیں خنجر
بندوق ساتھ رکھئے اپنے شکار والی
یک نفری سلطنت کا نقشہ بدل گیا ہے
اب چل پڑی روایت دنیا میں چار والی
منہ پھٹ مشاعروں میں کیا داد پا رہے ہیں
تھوڑی بہت چرا کر ہزلیں فگار والی

ڈاکٹر لئیق صلاح
حیدرآباد

خاکہ نگار کا خاکہ!

لفظ خاکہ کی تاریخ بلکہ جغرافیہ بھی اتنی ہی قدیم ہے، جتنی کہ ہماری تہذیبی علوم کی عمر رواں۔ روایت کو بدلتے دیر نہیں لگتی، اب
لفظ سماجی علوم سے زیادہ، ادب کی اصطلاح کے طور پر مستعمل ہونے لگا ہے۔ کسی زمانے میں جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو جب
یخ و جغرافیہ پڑھانے والے اساتذہ، اسکی اتنی تکرار کرتے کہ ہم اپنا جغرافیہ بھول جاتے۔ نئے سبق کے ساتھ ہی، بورڈ پر ایک نئی تصویر
آتی۔ برسوں بعد ہم نے پھر وہی غلطی کی، تصویر نہیں خاکہ۔ پھر ایک آواز فضائے بسیط میں گونجتی یہ "براعظم فلاں" ہے "براعظم"
ے ساتھ ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دینی مدرسے میں معلمہ "براعظم" اور "بحراعظم" کا فرق ذہن نشین کرارہی تھیں اسی اثناء میں مدرسہ
ے سکریٹری نے ایک نوٹس محترمہ کے یہاں روانہ کی جس میں لکھا تھا کہ، خبردار! کمسن بچوں کو دینی تعلیم کے بجائے "فلمی" تعلیم نہ
ں۔ لگاتار جب سے "مغل اعظم"، "مغل اعظم" از بر کرایا جارہا ہے۔

ہاں تو ہمارے اساتذہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ گفتار کے علاوہ کردار کے بھی غازی بنانا چاہتے تھے۔ لہذا تے سبق
ے ساتھ ہی ارشاد ہوتا کہ براعظم افریقہ کا خاکہ اتارا جائے بات یہیں پر ختم ہوجاتی تو شائد شکایت کی گنجائش نہ نکلتی۔ جب بھی کوئی ایسا
کم آتا تو پھر قلم سنبھالنا پڑتا۔ سنا تھا کہ سات براعظم ہیں۔ پتہ نہیں ابھی مزید اور کتنے دریافت ہوں گے۔ بھلا ہو اس کولمبس کا جس
نے "امریکہ" دریافت کیا۔ ورنہ ہمیں نہ U.N.O کی ضرورت لاحق ہوتی اور نہ نت نئے مسائل کھڑے ہوتے، دیہاتیوں کی طرح ہم بھی
رحی سادی زندگی گزار کے جاں بحق ہوتے۔ اچھا ہی ہوا کہ اب اس علم کا تعلق ہم سے نہیں رہا۔ ورنہ کئی اور خاکے اتارنے پڑتے۔
ج کل کی طرح بنے بنائے خاکے اس دور میں کہاں نصیب تھے۔ لیکن ان خاکوں کی جگہ، اب ادبی خاکوں نے لے لی ہے۔ کسی نے
اب لکھی اور اس کی "رسم اجراء" کا اہتمام ہورہا ہے۔ منتظمین جلسہ کی جانب سے حکم نازل ہوا کہ "خاکہ" لکھیں۔ کسی کے جشن کا
قاد عمل میں آرہا ہے۔ لہذا موصوف پر ایک خاکہ تیار کریں۔ جیسا کہ کل فون پر جناب وہاب عندلیب صاحب نے آج کے جشن کی
وت اسی شرط پر دی کہ خالی ہاتھ نہ آئیں۔ ایک "توصیف نامہ" ضرور پڑھیں۔

ہم نے ایک دفعہ مدیر "شگوفہ" سے دریافت کیا کہ، آج کل مزاح نگار دوسرے موضوعات پر قلم فرسائی کی بجائے "خاکہ"
رنے پر کیوں اتر آئے ہیں؟ تو پتہ چلا کہ خاکہ نگاری مزاح کا لیٹیسٹ فیشن ہے۔ مزاح نگار کو کوئی اور موضوع نہ ملے تو سب سے آسان
ہ یہی ہے۔

ہاں تو! ۱۹۶۶ء کے لگ بھگ مجتبیٰ سے غائبانہ تعارف ہوا۔ زندہ دلان حیدرآباد کا وہ خصوصی اجلاس، جس میں مجتبیٰ نے "ناز
مانے کو ہم رہ گئے ڈاکٹروں کے" بڑے پر لطف انداز میں پیش کیا تھا۔ کئی افراد مزے لے لے کر، اس مضمون کا ذکر بار بار کرتے
ہے۔ مگر چند لوگ شاکی بھی تھے۔ اور مخالفین کے اس گروپ میں صرف ڈاکٹرس اور خواتین شامل تھیں کیونکہ جہاں ڈاکٹروں کے

کارناموں کو طشت از بام کیا گیا تھا ۔ یعنی ان کی کوتاہیوں اور خامیوں کو علی الاعلان پبلک کے علم میں لایا گیا وہیں خواتین کی کمزوریوں کا پردہ بھی چاک کیا ۔ ڈاکٹروں کے تعلق سے لکھا تھا کہ ایک مصروف ترین ڈاکٹر ، ایک مریض کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے ، دوسرے مریض سے کیفیت دریافت کرتا ہے اور تیسرے مریض کا نسخہ تجویز کرتا ہے ۔ اب تینوں مریضوں کا جو حال ہو سو ہو ، ڈاکٹر صاحب اپنا فریضہ ادا کر چکے ۔

اسی طرح ایک اور مصروف بہ کار ڈاکٹر صاحب خواتین کے وارڈ میں راؤنڈ پر جانے سے پہلے یہ حکم صادر فرماتے کہ ، ان کے منہ میں تھرمامیٹر رکھ دیا جائے ۔ اتفاق سے ایک روز ڈاکٹر صاحب اس اعلان کے بعد کسی میٹنگ میں مصروف ہوگئے ۔ اور بھول کر گھر روانہ ہوئے ۔ ڈاکٹر صاحب کے دوسرے دن راؤنڈ پر آنے تک بے چاریوں کے منہ میں تھرمامیٹر رکھا رہا !

اس لطیفے نے یقیناً نہ صرف خواتین کا بلکہ ڈاکٹر صاحب کا پارہ بھی چڑھا دیا ہوگا ۔ " شیشہ و تیشہ " کا کوہکن ، پہاڑ کھود کر ، اور تیشہ سے سر پھوڑ کر جاں بحق ہوا ۔ معاف کیجئے آپ نے غلط سمجھا ، پہاڑ کھودنے پر چوہا نہیں نکلا اس کی بجائے " جوئے شیر " مجتبیٰ کی صورت میں ادبی دنیا کو دے گیا ۔ اور انھوں نے اپنی شیریں بیانی سے نہ صرف اس شیریں زباں کے جاننے والوں بلکہ اس سے دور کا تعلق بھی نہ رکھنے والوں کا دل موہ لیا ۔

مجتبیٰ حسین کو اپنے بڑے بھائیوں یعنی محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس سے وراثت میں پہلے صحافت ملی یا ظرافت ، اس تعلق سے فیصلہ کرنا مشکل ہے جتنا کہ وہ سوال یعنی مرغی کا وجود پہلے ہوا یا انڈے کا ؟ موصوف سے وضاحت چاہیں تو وہ کہیں گے کہ پہلا سوال ہی اب تک حل نہیں ہوا ؟ تو دوسرے سوال کے بارے میں کون ذہنی کاوش کرے ؟ بہتر یہی ہے کہ پہلے مرغی اور انڈے کو پیش کردو ، خوب سیر ہونے کے بعد ان سوالات کا حل بیک جنبشِ قلم ، سپردِ قلم کیا جائے گا ۔

مجتبیٰ کے یہاں مزاح نظری اور عملی دونوں صورتوں میں موجود ہے مختلف واقعات جن کو انھوں نے بیان کیا ہے ۔ ان میں عملی مزاح کے مختلف نمونے موجود ہیں ۔ مزاح کی عملی اور نظری صورتوں کے علاوہ طنز کی تلخی بھی پائی جاتی ہے ۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ راشن کی دوکان سے غذائی اشیاء کا حاصل کرنا کس قدر دشوار طلب ہے ۔ اس دشواری کا اندازہ مجتبیٰ کے ایک بیان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو بطور لطیفہ انھوں نے اسے پیش کیا تھا ۔ ملاحظہ کیجئے ۔

" ایک شخص نیچی نظر کئے راستے سے گزر رہا تھا ۔ حقیقتاً سڑک پر نظر نیچی رکھنا ۔ خلاف فطرت سمجھا جاتا ہے اور خصوصاً زنانی مدرسوں اور کالجوں کے آگے سے گذرتے ہوئے ۔ لوگ متعجب ہوئے اور اس آدمی سے دریافت کرنے لگے کہ بات کیا ہے ؟ اس نے جھنجھلا کر جواب دیا کہ دیکھتے نہیں ، یہاں چیونٹیوں کی قطار ہے ۔ لوگوں کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی کہ برسوں بعد ایک آدمی پھر سلیمان کی طرح ، چیونٹیوں کی اس لائن کو کیوں اہمیت دے رہا ہے ؟ اور زیادہ مضطرب ہو کر پوچھنے لگے کہ ، چیونٹیوں کی قطار سے آپ کو کیا لینا دینا ہے ؟ جواباً اس نے کہا ارے عقلمند تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ چیونٹیوں کی اس لائن ہی سے اس راز کا انکشاف ہوگا کہ سیٹھ جی نے کون سی راشن کی شاپ میں شکر رکھی ہے ؟ آج کا دور ہوتا تو مجتبیٰ چیونٹیوں کے شناختی کارڈ کی بھی ضرورت محسوس کرتے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کون سی چیونٹی کے کارڈ پر شکر زیادہ ملے گی ؟

مجتبیٰ نے لاتعداد مزاحیہ مضامین مختلف عنوانات سے تحریر کئے جس کا بار گراں " شگوفہ " کے علاوہ دیگر رسالوں کو بھی برداشت کرنا دشوار ہوگیا ۔ بالآخر مدیروں کی ایک خفیہ کانفرنس ہوئی جس میں انھوں نے نہایت رازدارانہ انداز میں یہ ، ریزولوشن ، پاس کیا کہ مجتبیٰ کو لکھنے سے روکنا خلاف قواعد ہے ۔ لہٰذا ان کا بوجھ ان ہی کے کندھوں پر ڈالنے کے لئے ، انھیں ۔ مشورہ دینا چاہیے کہ وہ اپنے

مضامین کے مجموعے شائع کریں۔ جس سے ان کی شہرت دن دوگنی اور رات چوگنی ہوگی۔ چنانچہ ان کی یہ تجویز کامیاب رہی۔ اور مجتبیٰ
ان کے جال میں پھنس گئے جس کے نتیجے میں "تکلف برطرف" سے لے کر "بالآخر" تک بے حساب مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔
حساب کتاب اب آپ انھیں سے دریافت کریں کہ گھاٹے کا سودا ہے یا نفع کا ؟ ان مجموعوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ بات
سفرناموں اور خاکوں تک پہنچ گئی ہے اب تک صرف اس لطیفے سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے کہ کسی زمانے میں، ایک صاحب کے
یہاں مختلف دوست احباب جمع ہوئے اور رات کے کھانے کے بعد، محفل شعر و سخن آراستہ ہوئی چائے نوشی کا اہتمام تھا، پھر اس
اہتمام کی تکمیل کے لیے پان چھالیہ سے بھی لطف اندوز ہورہے تھے۔ جن میں کچھ تمباکو نوش بھی تھے۔ اس لیے بار بار نوکر کو اس بات
کی زحمت دی جارہی تھی کہ وہ پان لائے "جا پان لا" "جا پان لا" دن نکلنے تک یہ تکرار جاری رہی صبح ہوتے ہوتے لوگوں نے اس جزیرے
کا نام "جاپان" رکھدیا۔ لیکن آج اس لطیفے کی بجائے ہم "جاپان چلو" پڑھ کر ان گنت واقعات سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

مجتبیٰ نے خاکوں پر جب قلم فرسائی کی تو نہ صرف مُردوں کو بلکہ مُردوں کو زندہ جاوید بنادیا۔ "آدمی نامے" میں بے شمار آدمیوں
کی اقسام موجود ہیں۔ میں نے چاہا تھا کہ مجتبیٰ کے لیے بھی، کوئی عنوان تجویز کردوں، لیکن ایسا محسوس ہورہا ہے کہ آدمیوں کی تمام اقسام
ختم ہوگئی ہیں۔ اب مجتبیٰ کا شمار کروں تو کس میں ؟

"صندور کیاں قلعہ بنائے" دکنی کے اس لوک گیت کے بول زندہ دلان حیدرآباد کی کاوشوں کی من و عن ترجمانی کرتے ہیں۔ "
بزرگاہ" کی یہ عمارت قلعہ سے کم نہیں اور اس میں بسنے والوں نے جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر کا اندازہ نہیں تھا۔ عموماً لوگ
منصوبے تو بہت بناتے ہیں مگر ان پر عمل پیرا ہونا ناممکن محسوس ہوتا ہے۔ لیکن زندہ دلان کو خدا نظر بد سے بچائے، ان کے خواب،
خواب نہیں بلکہ حقیقت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ پہلے اجلاس کے بعد کسے یقین تھا کہ یہ لاابالی اور شوخی و شرارت سے بھرپور شخصیتیں،
اتنی سنجیدگی سے وعدوں کا ایفا کرتی رہیں گی۔ ناموافق و ناساز گار حالات بھی ان کے عزائم کو متزلزل نہیں کرپاتے، چنانچہ ریاستی اور کل
ہند صلح پر اجلاس تو اس کے لیے ادنیٰ کرشمے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اب تو دیگر ممالک کے لوگ بھی ان کے ہمنوا بن گئے۔ زبان
مختلف کیوں نہ ہو ؟ ان کے قہقہوں کی زبان ایک ہی ہے۔ ادبی اجلاس، مشاعرے، محفل لطیفہ گوئی اور ان کا ترجمان رسالہ "شگوفہ"
سب ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ☆

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ • بیتیا • بہار

"باقی ادھار ہے"

چاہت ہے مالدار کی مفلس کا پیار ہے
صحن جہاں میں نعمتِ پروردگار ہے
اس زندگی کی گاڑی کو دوڑانے کیلئے
تھوڑا بہت تو نقد ہے باقی ادھار ہے

دفتر کے بابوؤں کی دل و جان ہے ادھار
اور ان کی بیگموں کے لئے شان ہے ادھار
لیکن ادھار کو جو سمجھتے ہیں مال مفت
ان کو تباہ کرنے کا سامان ہے ادھار
بنیا کا منشی سر پہ ہمیشہ سوار ہے

حاکم ہو اردلی ہو گر ایک ہو یا ہو سیٹھ
جو نقد کھا رہا ہے وہ کھاتا ہے آدھا پیٹ
لیکن ادھار والوں کی کیا بات پوچھئے
کھاتے ہیں ٹوٹ کر تو بڑھاتے ہیں اپنا ریٹ
ان کے لئے یہ چٹنی مربہ اچار ہے

جیسے ملے جہاں سے ملے لائیے ادھار
جب تک بدن میں جان رہے کھائیے ادھار
دینے کا وقت آئے تو وعدوں پہ ٹالئے
مرغا نیا پھنسائیے اور پائیے ادھار
اس فن پہ آپ کا ہی سدا اختیار ہے

کھتا ہے کون گھر مرے بھگوان آئے ہیں
کرنے یہ میری جان کو ہلکان آئے ہیں
بد قسمتی اسی کو کہی جاتی ہے جناب
پیسہ نہیں ہے پاس تو مہمان آئے ہیں
ایسے میں بس ادھار پہ دار و مدار ہے

ویسے تو ہم اور آپ بھی کھالیتے ہیں ادھار
ان کا ہے ہاضمہ جو پچا لیتے ہیں ادھار
ان سے ادھار لے لیا ان کو ادا کیا
کچھ اس طرح سے آدھا بچا لیتے ہیں ادھار
موسم بھی ان کے واسطے ہی سازگار ہے

جس کو ادھار مل گیا وہ خوش نصیب ہے
اس سے جو خالی ہاتھ رہا وہ غریب ہے
ذرہ کو آفتاب بناتا ہے یہ ادھار
اس کی عنایتوں کا تماشہ عجیب ہے
یعنی بنا ادھار کے ٹھپ کاروبار ہے

یارب دعا قبول ہو اس خاکسار کی
مجھکو ذرا نصیب ہو لذت بہار کی
میں بھی مشاعرے میں سرہٹ بنا رہوں
مل جائیں جو کہیں سے بھی غزلیں ادھار کی
مرزا کو اپنے شعروں پہ کب اعتبار ہے

سگ لیلیٰ (بیسویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی

"HAND" کنگن کو "MIRROR" کیا

تھانہ انچارج ان افسروں میں سے تھے جو متلون مزاج ہوتے ہیں گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، اپنی بات منوانے کے لیے کبھی فولاد کی طرح سخت ہوجاتے ہیں تو کبھی موم کی طرح نرم، چنانچہ ہم سے اقبال جرم کروانے کے لیے ایکبار پھر نرم اور گھلاوٹ بھرے لہجے میں بولے۔ دیکھو نوجوان میں آخری موقع لاسٹ چانس دیتا ہوں انڈر ورلڈ کے بارے میں تم جتنا بھی جانتے ہو مجھے بتادو میں پرامز (promise) کرتا ہوں تمہیں وعدہ معاف وٹنس (witness) بنا کے، قانون کے لانگ ہینڈس (Long Hands) سے بچالوں گا اوئے۔ ایکبار۔ صرف ایکبار میرے ہینڈس، سے انڈر ورلڈ، کی حکومت کو فنِش (finish) ہوجانے دو پھر میری پروموشن جو پچھلے پندرہ سال سے پنڈنگ میں پڑی ہے مجھے مل جائے گی، اور تمہیں سرکار سے انعام اسکے بعد تمہاری پریزینٹ لائف جو دتھ آؤٹ وائف (with out wife) ہے دتھ بیوٹی فل وائف، شریفوں کی ورلڈ میں آرام سے گزرے گی اوئے!!! موصوف کی اس پیشکش پر ہم نے جواباً ٹھہرے ہوئے لب ولہجے میں کہنا شروع کیا۔ جناب عالی آپ مجھے بلڈ پریشر کے مریض معلوم ہوتے ہیں اس لیے آپ کو مزید الجھن میں نہیں ڈالوں گا۔ اور شاید سچ کہدینے سے میری بھی پوزیشن صاف ہوجائے گی۔" ہمارے اس طرز تخاطب پر موصوف ہمہ تن متوجہ ہوگئے ہم نے آگے اعتراف کیا۔ میں دراصل وہاں ایک کتے کی جنس کی شناخت کے سلسلے میں گیا تھا۔! موصوف جھنکہ کھا کر بولے۔ کتے کی۔۔ جنس۔۔ یعنی کہ وہاٹ ڈو یو مین اوئے (what do you mean)۔؟ کتے کی جنس کی شناخت۔۔ مطلب یہ جاننے کے لیے وہاں گیا تھا کہ وہ کتا اصل میں کتا ہے یا کتیا۔! ہم نے وضاحت کی "وہاٹ۔۔ کتا۔۔ کتیا۔ اوئے۔" وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگے پھر چلا کر انسپکٹر کو آواز دی اوئے انسپکٹر۔ کم ہیر اٹ ونس۔" ابھی ان کی پکار کی گونج باقی تھی کہ انسپکٹر چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوگیا۔ اسے دیکھ کر دانت پیستے ہوئے بولے۔ اوئے یہ کیسے آدمی کو اریسٹ (Arrest) کر کے لائے ہو تم یہ تو میٹل کیس (Mental case) معلوم ہوتا ہے۔! کہتا ہے۔ وہاں کسی کتے کی وہ معلوم کرنے گیا تھا وہ یعنی کہ آئی ڈینٹی (Identity) کہ وہ ہی ڈاگ" (He Dog) ہے کہ شی ڈاگ (she dog) اوئے۔۔!!

جناب عالی آپ اپنے آپ کو سنبھالیں یہ سب اسکے ہتھکنڈے ہیں، مجھے تو یہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔! انسپکٹر نے انچارج کو دلاسہ دیا پھر راست ہم سے بولا۔ اوے یہ کیا نیا ڈرامہ چالو کردیا تو نے کتا کتی کا۔ کیسا کتا؟ کیسی کتی۔! کوئی ثبوت! کوئی گواہ ہے تیرے پاس اس کا۔؟ فی الوقت تو نہیں ہے! لیکن آپ اگر چند گھنٹوں کی مہلت دیں تو ثبوت اور گواہ دونوں کو پیش کر سکتا ہوں! ہم نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

اچھا بیٹا جی، فرار ہونے کے لیے مہلت مانگ رہے ہو اپنے مفرور ساتھی کی طرح۔ انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں وار کیا۔ ہم نے جواباً عرض کیا۔ اچھا ہوا آپ کو خود میرے مفرور ساتھی کا خیال آگیا وہی تو میری بے گناہی کا ثبوت میری سچائی کا گواہ۔! ثبوت گواہ.... پروف.... ساتھی اوئے"۔ انچارج ایک بار پھر اپنے بال نوچتے ہوئے بولے "یہ مجرم تو مجھے مینٹل ہاسپٹل

نریش کمار شاد

شاعر جمال حضرت فراق گورکھپوری سے انٹرویو

فراق صاحب اس شام بجھے بجھے سے بیٹھے تھے۔ میں نے آداب بجالانے کے بعد جب صحت کے متعلق دریافت کیا تو اور بھی بجھ گئے اور بہت بے دلی سے کہنے لگے "اب صحت کیا ٹھیک ہوگی، گرتی دیوار ہوں، دونوں ہاتھوں میں ہر وقت درد رہتا ہے اور یہ درد بعض اوقات تو ناقابل برداشت ہوجاتا ہے" اتنا کہنے کے بعد وہ درد سے کراہنے لگے۔ اس کے بعد کچھ رسمی سی بات چیت ہوئی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آج اس گل افشانی گفتار کے پیکر کا جلال میں آنا بہت محال ہے بہرحال میں نے اس محل کو ممکن بنانے کے لئے خواہ مخواہ جوش ملیح آبادی کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جوش صاحب کے متعلق پاکستان کے کسی جریدے میں آپ نے لکھا ہے کہ جوش نے بہت سے ناخوشگوار اثرات مجھ پر پیدا کردیئے ہیں۔ یہ اثرات ہیں کیا؟"

فراق صاحب نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا "جوش میرے جگری دوست ہیں۔ میں انہیں شاعر اعظم مانتا ہوں۔ وہ ہفتوں بلکہ مہینوں میرے گھر میں گھر کا ایک فرد بن کر رہ چکے ہیں۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں۔ لیکن ان کی شخصیت کے ڈیڑھ دو فیصدی ناخوشگوار اثرات بھی مجھ پر ہیں۔ انھوں نے ایک خیالی خواب دیکھ کر ہندوستان کو چھوڑا جس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں بہت زیادہ غم پیدا ہوا میرا ماتھا اگرچہ اس وقت بھی ٹھنکا تھا لیکن ان سے قدرے ناآسودگی اور بیزاری کے میرے جذبے کا ان کے وہاں چلے جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں تو کئی سال پہلے میری ان سے ان بن بھی ہوگئی تھی۔ بعد میں اپنی رباعیات کے مجموعے "روپ" کا ان کے نام انتساب کرتے ہوئے میں نے اس ان بن کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ اعتراف ہے کہ جوش صاحب کا دل بھی میرے دل کی طرح صاف ہے۔ وہ میرے لئے بدی کا لفظ کبھی نہیں بولے اور نہایت خلوص سے میری شاعری کے معتقد ہیں"۔ فراق صاحب جذبات کی رو میں بہے جارہے تھے۔ میں نے انہیں چونکاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو سب ٹھیک ہے حضرت! لیکن میں تو ان ناخوشگوار اثرات کی بات کررہا تھا۔"

"ہاں ناخوشگوار اثرات ۔۔۔" فراق صاحب واقعی چونکتے ہوئے بولے "ارے کچھ ایسے ناخوشگوار بھی نہیں میرے یہ ڈیڑھ دو لفظ جنہیں آپ مہمل بھی کہہ سکتے ہیں محض اس احساس کی پیداوار ہیں کہ جوش صاحب صرف مخدوم ہوکر رہ گئے ہیں۔ وہ خراج عقیدت لیتے تو ہیں مگر دیتے نہیں۔ یوں تو میرے اپنے کردار میں بھی بہت سی خرابیاں ہیں۔ جنسی زندگی جو ایک انسان کی پرائیویٹ ملکیت ہوتی ہے میرے یہاں کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے لیکن جوش صاحب کی ناآسودہ کرنے والی باتیں ۔۔" اور اس کے بعد مسکراتے ہوئے کہنے لگے ۔۔۔ "اب جوش صاحب اگر "آپ" "پونا سے کب آئے" نہیں سن سکتے اور انہیں پونے سے کب کی بجائے پونہ سے کب بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی "گھوڑا کی" "دم" کہے تو جوش صاحب کی ایسی باتوں پر غصہ نہیں پیار آنا چاہئے یہ تو ان کے حسین نخرے ہیں ۔۔۔"

فراق صاحب کے چہرے پر ہلکی سی برہمی کی پرچھائیں پڑی اور انہوں نے کہا۔ مثلاً بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جوش، نہرو، آزاد اور شنکر لال سے اپنے اثر سے کچھ کام کرالیتے تھے اس میں ان کا رویہ ایسا ہوتا تھا کہ دوسروں کا فائدہ کراتے کراتے اپنا بھی فائدہ کرلیتے تھے۔"

"تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہوتا ہے؟"

"جی ہاں ـــــ" فراق صاحب نے میری تائید کی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ذرا جھنجھلا کر بولے۔ "جوش سے میری ناآسودگی محبت کی ناآسودگی ہے۔ جوش صاحب کی عظمت کو دیکھتے ہوئے ان کے بارے میں ایسی باتیں سننا بھی اچھا نہیں لگتا۔ ایک بات در کہدوں کہ میں پروفیسر آدمی ہوں۔ معاملے کا آدمی نہیں۔ اس لئے ایسے معاملات میں اپنی رائے پر اعتماد بھی نہیں کرتا۔" اور پھر بہت ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگے "جوش کے ساتھ کچھ مجبوریاں بھی ہیں۔ بے چارے کا بیٹا لائق نہیں ہوا۔ داماد بھی جب تک یہاں تھے تو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود کچھ نہیں کرتے تھیں۔ جوش پر متعلقین کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ ایسے عالم میں ہماری تو کمر خم ہوجاتی جناب!" "جناب" کا لفظ فراق صاحب نے اپنے خاص انداز میں لمبا کرکے ادا کیا۔

میں ناخوشگوار اثرات کے سلسلے میں تو فراق کے جواب سے مطمئن نہ ہوسکا لیکن یہ امر میرے لئے تسلی بخش تھا کہ جوش صاحب کے ذکر خیر نے فراق کی "رگ تکلم" کو چھیڑ دیا ہے۔

"فراق صاحب! پچھلے دنوں جب جوش صاحب یہاں تشریف لائے تھے تو ـــــ" میں نے ارادتاً جوش صاحب کے ذکر کو طول دیتے ہوئے کہا "میں نے ان سے پوچھا کہ اردو کے جدید ترین شاعروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ میری رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ بھی ان شاعروں کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہیں؟"

"نہیں بھائی! میں ایک ڈنڈے سے سب کو نہیں ہانکوں گا۔" فراق صاحب کی طبعی شگفتگی عود کر آئی "میں محسوس کرتا ہوں کہ یورپ کے ادیبوں میں مطالعے کی روایات ہم سے زیادہ مضبوط ہے۔ آج کل کے اردو شاعروں کو خالص اردو کتابوں کا مطالعہ اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتا جتنا انگریزی کتابوں کا لیکن ہمارے یہاں سماجی اور اقتصادی حالات کچھ ایسے ناہموار ہیں کہ ہمارا نیا شاعر ذاتی طباعی کو مطالعہ سے زرخیز نہیں بناسکتا اور پھر یہ زمانہ بھی انتشار کا زمانہ ہے جو شاعری کے لئے زیادہ سازگار نہیں۔ آج شاعری پوری دنیا میں ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔ ہمارے وہ شاعر جن کی عمر پچاس سال سے کم اور تیس سال سے زیادہ ہے ان میں بعض کی شاعری اچھی خاصی تو ہے۔ لیکن پر عظمت نہیں۔ جدید [illegible] کچھ حسین آوازیں تو بے شک سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی بڑی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن نئے شاعروں کی طرف سے جو تجربے کئے جارہے ہیں وہ سب کے سب ایسے نہیں ہیں کہ انہیں لغو قرار دے دیا جائے۔"

"ہم جدید شاعروں کے کماں دار فیض احمد فیض کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

فراق صاحب کچھ سوچتے ہوئے رک رک کر بولنے لگے "دست صبا" میں اور اس کے بعد سے فیض نہ جانے کیوں زبان کی صحت سے بے پرواہوگئے ہیں۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں لیکن ان کے کلام کی اشاریت میرے لئے ناقابل فہم ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کی ناسازی کے باوجود فراق صاحب اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوکر باتیں کرنے کے موڈ میں آگئے ہیں۔

"فراق صاحب کیوں نہ اس پر لطف گفتگو کو باقاعدہ انٹرویو کی شکل دے دی جائے۔" اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے سوال کردیا "آپ عالم وجود میں کب آئے قبلہ!"

"۲۸ اگست ۱۸۹۶ء، بروز جمعہ۔ بوقت دوپہر"

خوب ــــ اور شاعری کا آغاز کب ہوا ؟"

"والد محترم حضرت عبرت بھی شاعر تھے ۔ بچپن میں ان سے شعر سن کر متاثر ہوتا تھا ۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ڈرتے ڈرتے خود بھی کچھ مصرع موزوں کئے ۔"

"اپنے ابتدائی کلام پر اصلاح کس سے لی ؟"

"والد کو کچھ اشعار ضرور دکھائے لیکن ان کے انتقال کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی ۔ ویسے میرے چند مصرعوں میں پروفیسر مہدی حسن ناصری اور امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیر آبادی نے بھی ترمیم کی ۔ ریاض خیر آبادی نے بھی دو ایک مصرعے دیکھے تھے لیکن حقیقت میں میرا مطالعہ ہی میرا استاد ثابت ہوا ۔

"کس کس شاعر سے آپ غیر معمولی طور پر متاثر ہیں ؟"

"۲۴-۱۹۲۳ء میں امیر مینائی کی شگفتہ بیانی سے بہت متاثر تھا ۔ لیکن جلد ہی میں اردو شاعری سے نا آسودہ ہونے لگا ۔ اس میں لفاظی اور سطحیت کی بہتات اور رمزیت کی کمی محسوس ہونے لگی ۔ اس وقت اپنے آپ کو مطمئن کرنے میں میر نے میری بہت امداد کی ۔ میر کے علاوہ اردو میں غالب اور آتش انگریزی میں ورڈز ورتھ اور کٹیس اور ہندی میں تلسی داس سے بھی متاثر ہوں ۔

"کیا آپ اس کلیے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے ؟"

فراق صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لگاتے ہوئے جواب دیا "ایک آدمی کے کردار کی ساخت میں مختلف قوتیں کار فرما ہوتی ہیں والدین کا خون ۔ گھریلو زندگی ۔ سماجی روایات ۔ جس زمانے میں میں پیدا ہوا ۔ اس زمانے کے حالات اور تعلیم و تربیت اور پھر اچھے آدمی کا معیار بھی ہر ماحول میں علیحدہ ہوتا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ جو اچھا شاعر ہوگا وہ کسی ماحول میں بھی بری زندگی کا معاون نہیں ہو سکتا ۔ وہ ظلم اور بے دردی کی کبھی حمایت نہیں کر سکتا ۔ بولتے بولتے فراق صاحب کھو سے گئے اور چند لمحوں تک چپ چاپ کچھ سوچتے رہنے کے بعد بولے "ایک اچھے شاعر میں شخصی کمزوریاں ہو سکتی ہیں اس کی جنسی زندگی غیر متوازن ہو سکتی ہے ۔ وہ شراب کا عادی ہو سکتا ہے ۔ نیک نیتی کے باوجود اس سے کسی وقت کسی غلطی کا ارتکاب ہو سکتا ہے ۔ یعنی وہ خلوص کے ساتھ کسی مسئلے میں غلطی کر سکتا ہے ۔ لیکن شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کا مقصد ہی نیکی کی قوتوں کو مدد پہنچانا ہے ۔ اس لئے سماج کی بہبودی کے لئے ایک اچھا شاعر بہر صورت معاون ثابت ہوگا ۔"

فراق صاحب کی زبان سے شراب کا ذکر سن کر میں نے اگلا سوال شراب ہی کے متعلق کیا "کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں ؟"

فراق صاحب نے ایک دم تردید کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "جوش، جگر اور میں اپنے اپنے طور پر الگ الگ شراب کے سلسلے میں اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ شعر کا کوئی تعلق شراب سے نہیں ہے ۔ کسی نشہ باز فن کار نے کبھی نشے کے زیر اثر کوئی اپنا شاہکار نہیں لکھا ۔ ٹیگور کو دیکھئے وہ کبھی شراب نہیں پیتے تھے ۔ اقبال نے بھی جوانی میں ضرور پی لیکن بعد ازاں اسے مطلقاً منہ نہیں لگایا ۔ داغ نے اتنی چلبلی اور رنگین شاعری کرنے کے باوجود شراب کو کبھی چھوا تک نہیں ۔ چکبست انیس اور نظیر کے بارے میں بھی کسی سے نہیں سنا کہ وہ پیتے تھے ۔ یہ صحیح ہے کہ ایک آدھ پیگ پی لینے کے بعد شاعر باتیں بہت اچھی کر سکتا ہے لیکن شعر نہیں کہہ سکتا اور زیادہ پینے کے بعد تو ظاہر ہے وہ سو ہی جائے گا اور شراب کا نشہ اترنے کے بعد بھی اس سے کسی اچھی تخلیق کی توقع لا حاصل ہے ۔" "تو پھر یہ فرمایئے کہ آپ کیوں پیتے ہیں ؟"

فراق صاحب کچھ غمگین ہو کر کہنے لگے "میری ازدواجی زندگی جہنم کی طرح اذیت ناک رہی ہے ۔ گھر کی برکتوں کو کھو کر دولت اور

شہرت حاصل کرنے کے باوجود دل کی ہائے ہائے نہیں مٹ سکتی تھی حالانکہ میں بڑا چٹم آدمی ہوں۔"

"چٹم ـــــ؟" میں سوالیہ نظروں سے فراق صاحب کی طرف دیکھنے لگا ـــ "جی ہاں چٹم ہے ہمارے علاقے کی بولی ہے۔ غالباً آپ کے پنجاب میں یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔ چٹم یعنی چہ غم" اور پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے فراق صاحب نے کہنا شروع کیا "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ گھریلو زندگی کی تلخی نے مجھے شراب کی تلخی کا عادی بنا دیا۔ ۴۲ سال کی عمر کے بعد سے اسے روزانہ پی رہا ہوں اب تو دوسرے عادی شراب نوشوں کی طرح نیند کے لئے بھی اس کا پینا میرے لئے ضروری ہو گیا ہے لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی کردار پر شراب کا اثر کچھ زیادہ اچھا ثابت نہیں ہوتا۔"

پھر تو اس کا مطلب ہے کہ ـــ" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ حکومت کی امتناع شراب کی پالیسی کے بھی حامی ہوں گے؟"

"بڑے شریر ہیں آپ؟!" فراق صاحب بہت سنجیدگی سے کہنے لگے "قانون بنا کر شراب نوشی کی ممانعت نہیں کرنی چاہئے۔ سماج کو ایسی فضا پیدا کرنی چاہئے کہ ـــ"

"سماج کو ایسی فضا کیونکر پیدا کرنی چاہئے؟" میں نے فراق صاحب کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سوال آپ نے بہت اہم کیا ہے" فراق صاحب اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولے "خاندانی روایتوں کے اثر سے مزاج ہی ایسا بنا دینا چاہئے کہ انسان شراب سے دور رہے جیسے ہندو گائے کا یا مسلمان سور کا گوشت نہیں کھاتا لیکن ایسا کرنے کی راہ میں دقتیں بہت ہیں ـــ بہر کیف دنیا بھر کے مفکروں کے لئے یہ مسئلہ خاصا پریشان کن ہے بلکہ اب تو روس کے لئے بھی یہ ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ شراب نوشی سے اگر ایک فیصدی یا نصف فیصدی لوگ بھی برباد ہو جاتے ہیں تو یہ بہت بڑے سماجی نقصان کا باعث ہے۔"

"فراق صاحب ایک نہایت عام سا سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں"۔ میں نے بہت انکسار سے کہا "وہ یہ کہ آپ کیونکر شعر کہتے ہیں۔؟"

"شعر کیونکر کہتا ہوں ـــ؟" فراق صاحب نے آہستہ سے کہا جیسے خود اپنے آپ سے یہ پوچھ رہے ہوں اور پھر کہنے لگے "ہوتا یہ ہے کہ کوئی ایک مصرع اچانک گونجتا ہوا تحت الشعور سے شعور میں آجاتا ہے اور پھر یہی مصرع بعد میں یک سوئی کے ساتھ پوری غزل کہلانے کا محرک بنتا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کا خیال رکھئے کہ مختلف شاعروں کے ذہن میں ان کی وجدانی شخصیت کے مطابق مصرعے ذہن میں آتے ہیں۔ مثلاً داغ کے ذہن میں ہمیشہ چھیڑ چھاڑ کے مصرعے آتے ہوں گے۔ لیکن میرے یہاں مصرعے کیفیت۔ اثر۔ نرمی اور گھلاوٹ لے کر آتے ہیں۔

"گستاخی معاف آپ اتنی لمبی لمبی غزلیں کیوں کہتے ہیں؟"

"اس کی دو وجہیں ہیں۔" فراق صاحب نے بلا تامل بہت تحمل کے ساتھ جواب دیا۔

"میں نے جوانی میں لکھنو کے شاعروں کے دیوان پہلے دیکھے اور دہلوی شاعروں کے بعد میں۔ امیر اور وزیر وغیرہ اکثر سہ غزلہ تک کہتے تھے۔ انہیں کی تقلید میں لمبی لمبی غزلیں کہنے کا میں بھی عادی ہو گیا اور دوسری وجہ جو اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ میں جب فکر سخن کرتا ہوں تو روایتی انداز میں شعر نہیں کہتا ہوں۔ میرے ذہن پر ایک موڈ طاری ہو جاتا ہے۔ کائنات حسن و عشق اور زندگی کی معنویت مجھ پر چھا جاتی ہے میرا ہر شعر حسن عشق اور زندگی کی کسی خاص کیفیت کا ایک تھرتھراتا ہوا لبریز پیالہ ہوتا ہے۔ میرے دوست مجنوں گورکھپوری نے میرے متعلق بہت اچھی بات کہی ہے کہ میں مزاجاً نظم گو تھا لیکن طبیعت میں انتشار کی وجہ سے غزل کہنے لگا ہوں

ی تسلسل سے شعر نہیں کہتا، ایک خاص عالم میں ڈوب کر اس کی مختلف کیفیتوں کو نظم کرنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ میں شعر پر مسلط
ں ہوتا، شعر مجھ پر مسلط ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے میں قادر الکلام نہیں بلکہ عاجز الکلام ہوں عام شاعر موزوں کلام میں نثر کہتے ہیں لیکن
جمالیاتی حقائق پر نظر رکھتا ہوں"۔ "بے شک۔ بے شک!" بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

"اور سنئے ــــ" فراق صاحب نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں بیدل کی طرز میں بھی شاعری نہیں کرتا جو غریب غالب تک کے لئے بھی مصیبت کا موجب تھی۔

طرز بیدل میں شاعری کرنا

اسداللہ خاں قیامت ہے

میرے اچھے اشعار اسرار حیات کے مظہر ہونے کے باوجود ایک بہت پڑھے لکھے آدمی اور ایک معمولی پڑھے لکھے آدمی
ساں طور پر متاثر کرتے ہیں جیسے میرا یہ شعر سن کر ــ

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست!

سوچ لیں اور اداس ہوجائیں

ایک عام آدمی بھی اسی طرح اداس ہوجاتا ہے جس طرح کوئی خاص باذوق آدمی۔"

اور اتنا کہتے کہتے فراق صاحب پھر اپنے ہاتھوں میں تکلیف محسوس کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی سردی بھی۔ اور انہوں نے
نے آپ کو ایک کمبل میں لپیٹ لیا۔ "فراق صاحب! اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں بھائی ــــ!" فراق صاحب نے بہت حسرت ناک لہجے میں میری تائید کرتے ہوئے غالب کا یہ مصرع پڑھ دیا۔

"اب عناصر میں اعتدال کہاں"

"پوچھنا تو آپ سے بہت کچھ چاہتا تھا لیکن اس انٹرویں کے سلسلے کو ختم کرنے سے پہلے اتنا بتانے کی ضرور تکلیف فرمائیے کہ
پ کے نزدیک ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟"

فراق صاحب نے سچ مچ کسی قدر نہیں بلکہ بہت حد تک تکلیف سے کہنا شروع کیا۔

"جو ہندی ادب بنایا جارہا ہے کروڑوں آدمیوں کی بول چال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اس ادب کے جس حصے کا
اری بولی سے کچھ تعلق ہے بھی تو وہ ہماری بولی کے نہایت کھردرے کمزور اور بے جان نمونے سے ہے۔ ہماری بولی کبھی موجودہ
دی ادب کے مطابق نہیں ہوگی۔ عام لوگ آج کا ہندی ادب پڑھ کر جھوم نہیں سکتے۔ حسین شکل میں جو بولی آج مستعمل ہے وہ
رف اردو ہے۔"

"لیکن فراق صاحب! ہماری نئی نسل تو اردو سے قطعی ناواقف ہے۔ اردو کا مستقبل تو آخر اسی سے وابستہ ہے" میں نے کہا۔

فراق صاحب پر اعتماد لہجے میں بولے "اس کے باوجود میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں یہ درست ہے کہ اردو کے
ی ارتقا کی رفتار کم ہوجائے گی لیکن ہماری بولی ہندی کے موجودہ ادب کے مطابق تو کبھی نہ ہوگی۔ اردو کے ساتھ بے انصافی دیر تک
یں ہوسکتی۔ سات آٹھ برس کے بعد یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کے بعد اردو سے انصاف ضرور ہوگا۔"

"ع تری آواز مکے اور مدینے" میں نے ہنستے ہوئے یہ مصرع پڑھا اور فراق صاحب کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔☆

(مطبوعہ بیسویں صدی اپریل ۱۹۶۴ء)

ڈاکٹر اشفاق احمد
ٹیچرس کالونی، جعفر نگر، ناگپور ۱۳

مکاں سے لامکاں تک

ابتدا میں انسان کے پیش نظر مکان بنا کر رہنے کی خاص وجہ خونخوار جنگلی جانوروں سے حفاظت مقصود تھی لیکن جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا اور انسان تہذیب یافتہ ہوگیا اسکے اس خاص مقصد میں خونخوار جنگلی جانوروں کی جگہ انسان نے لے لی اور اب انسان، انسان ہی سے حفاظت کی خاطر مکان تعمیر کر رہا ہے۔

مکان بنانے کے مقصد کی تبدیلی کی وجہ شاید ایک یہ بھی ہو کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اپنے مسکن تعمیر کرنے کی خاطر جنگلات صاف کر کے جانوروں کی بستیاں خالی کر رہی ہے جہاں کچھ جانوروں نے زندہ رہنے کی ضد میں چھوٹے چھوٹے خطوں میں پناہ لے لی وہیں سینکڑوں جانوروں کو انسان نے اپنے ہاتھوں زیر زمین بھی کر دیا۔ انسان کا خام خیال یہ ہیکہ سب کچھ ختم ہوگیا اب صرف اسی کی حکمرانی ہے لیکن اس کا ضمیر اس بات سے بے خبر رہا کہ زمین میں خونخوار جانوروں کا خمیر زندہ ہے اور اس خمیر نے انسان کو انسانیت سے نجات دلاکر اسمیں اپنی صفتیں پیدا کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ لھذا نہ جانے کتنے کھیتوں، باغوں اور جنگلات کو نگل گئیں یہ انسانی بستیاں۔ جہاں عالیشان خوبصورت عمارتیں، محدے، لمبی لمبی ڈگریاں تزئین کائنات کا سامان تو بن رہی ہیں لیکن باطن کا مہذب انسان کب کا لاپتہ ہوچکا ہے۔ ہماری تحقیقی نظریں جب مکانات کا جائزہ لیتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس ضمن میں انسان تین گروہ میں بٹا اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جسے اللہ تعالی نے چھپڑ پھاڑ کر دے رکھا ہے۔ لھذا عیش و عشرت میں ڈوبا یہ گروہ مغل آرٹ، چینی آرٹ اور یوروپین آرٹ کی خوبصورت حویلیاں، کوٹھیاں یا بنگلے بنا کر خوش حال زندگی بسر کر رہا ہے ان لوگوں نے حویلیوں میں ساری دنیا سمیٹ رکھی ہے اسلئے باہر کی دنیا سے انھیں کم ہی سروکار رہتا ہے حویلی میں کئی کمرے ہوتے ہیں یہ کمرے مختلف ناموں سے منسوب ہوتے ہیں۔

جیسے؛ ڈرائنگ روم، سلیپنگ روم، ریڈنگ روم، ویٹنگ روم، گیسٹ روم، ڈانس روم، چلڈرنس روم، کچن روم، سرونٹ روم، اسٹور روم وغیرہ۔ ایک ہی حویلی میں خاندان کے مختلف افراد کمروں کی طرح ہمیشہ بٹے ہوئے رہتے ہیں یہ خاص خاص موقعوں پر ہی سب سے مل پاتے ہیں۔ یہ گروہ اپنی حویلیوں میں بنے زائد کمروں کو کرائے پر دینے سے پرہیز کرتا ہے تاہم کسی پر رحم اور ترس آ بھی جائے اور کرائے دار حویلی کے کمرے کرائے سے لینے کی حماقت کر بھی لے تو وہ وہاں اپنے آپ کو بے کار سی شئے تصور کرتا ہے اور اپنا قد بونے کی طرح پاکر بہت جلد بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان کے اعلیٰ اور تہذیب یافتہ ہونے کی پہچان اسکی انسانیت ہوتی تھی لیکن آج کے تہذیب یافتہ دور میں ایک شاندار کوٹھی اور کوٹھی کے سامنے بندھا اعلی نسل کا ولایتی کتا ہی انسان کے اعلی اور تہذیب یافتہ ہونے کی پہچان بن گیا ہے اس گروہ میں ایک طبقہ وہ بھی ہے جو سماج میں اوسط درجہ کا مالک ہے اس طبقہ کا ہر شخص اللہ تعالی سے یہ دعا ضرور کرتا ہے کہ خدا اسے

صاحب مکان بنادے تو وہ دوسروں کو بھی پناہ دے گا لهذا اس طبقہ کی کثیر تعداد مکان کے معاملے میں خود کفیل ہی نہیں بلکہ دوسروں کی کفالت کا بھی باعث ہے ۔ دراصل دور شرافت میں والدین اپنے بیٹوں کے مستقبل میں کام آنے والا بینک بیلنس تصور کیا کرتے تھے لیکن دور جدید کے زیادہ تر نوجوان والدین کو سہارا دینے کی بات کو دقیانوسی خیال کرتے ہیں وہ والدین کو خاطر میں نہیں لاتے ۔ ان کی نظروں میں والدین کی حیثیت دیوار پر لٹکی اس گھڑی کی طرح ہو گئی ہے جو سل صرف ہوجانے پر چلتے چلتے رک جاتی ہے لهذا اوسط درجہ کے سمجھدار لوگوں نے اپنی توجہ خود غرض اور آوارہ بیٹوں سے ہٹا کر مکانات کی تعمیر کی جانب کر دی ۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل مکانات تعمیر کر کے کرائے پر دیئے اور انھیں اپنے ہونہار اور فرمانبردار بیٹے تصور کئے ۔ اسطرح انھیں کرائے کے مکانوں سے ہر ماہ موٹی رقم ہاتھ آجاتی ہے اور یہ لوگ اپنے ناخلف بیٹوں سے جو مالی نقصان ہوا اس کا ازالہ کرائے کے مکانوں سے کسی طرح کر لیتے ہیں ۔

ہمارا ملک دنیا کے تمام ممالک میں سب سے زیادہ پائی جانے والی دو چیزوں کے لئے بے حد مشہور ہے ان میں ایک تو لیڈر ہیں جن کا ہر گھر میں پیدا ہونا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے اور دوسرے کرائے کے مکانوں میں زندگی گذارنے والے کرائے دار ہیں لهذا ہم نے کرائے داروں کی کثیر تعداد کو اہمیت دیکر انھیں دوسرا بڑا گروہ مان لیا ہے ۔ ان کرایہ داروں میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو صاحب مکان ہونے کی خواہش تو رکھتے ہیں لیکن استطاعت نہیں رکھتے وہ صرف ذہنوں میں مکان بناتے ہیں اور ذاتی مکان کا خواب دیکھتے دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں ۔ کچھ تجارت پیشہ لوگ بھی ہیں جو اپنے پاس جمع پونجی کو مکان کی تعمیر میں صرف کرنے کی بجائے اپنی تجارت میں مصروف کر کے کرایہ کے مکان میں رہ کر زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے حق میں نظر آتے ہیں ۔ کرائے کے مکانوں میں زندگی گزارنے والوں میں ان کی تعداد اچھی خاصی نظر آتی ہے جو دنیا کو سرائے فانی کہکر صاحب مکان ہونے کی خواہش دل سے نکال پھینکتے ہیں اور کامل یقین رکھتے ہیں کہ سب کچھ چھوڑ جانا ہے ۔

لهذا ان کی زندگی زیستن برائے خوردن کے مقولے کی نذر ہو کر رہ جاتی ہے وہ صرف حال کا خیال رکھ کر روزانہ کما پی کر حساب برابر کر لیتے ہیں لیکن ان میں کچھ لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جنکے چہرے پر مصنوعی شرافت چسپاں ہوتی ہے یہ بظاہر بہت بھولے بھالے معلوم ہوتے ہیں اور مالک مکان ان کے بھولے پن پر لٹو ہو کر انھیں اپنا کرایہ دار بنا بھی لیتا ہے لیکن بعد میں یہ لوگ چادر سے پیر باہر نکالتے ہیں امانت میں خیانت کا جذبہ ان کے دل کے سمندر میں ٹھاٹھیں مارتا ہے اور کرایہ کے مکان پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے " اب یہ مکان ہمارا ہے تو جو بن پڑے کر دکھاؤ " اور پھر یہ تنازعہ عدالت تک پہنچتا ہے اس سلسلے میں فی الواقعی ہماری تحقیق تو یہ بتاتی ہے کہ عدالتوں میں زر زمین اور زن سے متعلق چلنے والے تنازعات میں زمین اور زمین پر بنائے گئے مکانات کے تنازعات کی فہرست طویل ہے ۔ مالک مکان جہاں کرائے دار کو کرایہ دار ثابت کرنے اور اپنے مکانوں سے نکالنے کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں وہیں کرایہ دار مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے کے مصداق مکان پر اپنا حق جمانے کے لئے وکیلوں کی جیبیں گرم کرتے ہیں بالآخر عدالت بھی مالک مکان کو اپنا فیصلہ اسطرح سناتی ہے کہ ۔

تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

تیسرے گروہ میں مزدور پیشہ لوگ شامل ہیں جو سمٹی ہوئی زندگی سے پرے کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارتے ہیں ۔ ان کا کوئی مکان نہیں ہوتا آسمان ہی ان کا چھت اور زمین ان کا فرش ہوتی ہے ۔ یہ لوگ ریلوے پٹریوں کے کنارے پل کے اوپر نیچے ، پلیٹ فارم پر درگاہوں و مندروں کے آس پاس اور فٹ پاتھ پر اخبار بچھائے مفلسی کی چادر اوڑھے بے کواڑ دروازوں پر ہر آن خوشی کے لمحوں کا انتظار کرتے ملیں گے ۔ یہ لوگ تاج محل جیسی خوبصورت عمارت بنانے کا ہنر تو رکھتے ہیں لیکن ذاتی مکان کی تعمیر ان کے لئے

خواب سے بالاتر ہوتی ہے خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے والے لوگوں کی حالت بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی یہ لوگ بھی روزگار کی تلاش میں اپنے کاندھوں پر جگی جھونپڑیوں کے چھپر اٹھائے گھومتے ہیں جہاں چٹیل میدان دیکھا اور روزگار کے لئے ساز گار ماحول دیکھا اپنا ڈیرہ ڈال دیتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ویران جگہوں پر جنگلی پودوں کی طرح جھونپڑیاں اگ آتی ہیں ۔ جہاں سناٹے بھٹکتے تھے اور خاموشی اپنا قبضہ جمائے رہتی تھی لوگ مردہ زمین پر زندہ دلی کے ساتھ جیتے دکھائی دیتے ہیں ۔ جب روزگار کے وسائل ختم ہوجاتے ہیں تو دشت و بیاباں کے دن عود آتے ہیں میدان پھر ویرانی میں تبدیل ہوجاتا ہے اور یہ لوگ روزگار کی تلاش میں دوسرے پڑاؤ کے لئے نکل پڑتے ہیں ۔ دنیا میں امیری اور غریبی کے درجات پیدائش سے موت تک برابر دکھائی دیتے ہیں ۔ قبرستان میں بھی مفلسوں کی قبروں کے نام و نشان تک نہیں ملتے جبکہ امیروں کی پختہ قبریں ان کی امیری کی داستاں سناتی ہیں ۔

انسان اپنی زندگی کی آخری منزل یعنی لحد تک اپنے آپ کو دولت کی بنیاد پر مختلف خانوں میں بانٹتا ہے جبکہ فنا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اعمال کی بنیاد پر ان کے درجات متعین کرتا ہے ۔ انسان اس ناپائیدار دنیا میں قیمتی لباس، مہکتا خلوص اور پائیدار مکان سے عزت پاکر اکثر یہ بھول جاتا ہے کہ دائمی زندگی کے لئے بھی اسے نیکی کے گھر کی تعمیر کرنی ہے اور یہ گھر اینٹ اور گارے سے تعمیر نہیں ہوتا بلکہ اسکی تعمیر میں لگنے والے لوازمات ہمارے چھوٹے بڑے صالح اعمال ہوتے ہیں جنھیں اسے اپنی زندگی میں ہی یکجا کرنے ہوتے ہیں ۔ ☆

یوسف امتیاز
ٹورانٹو (کینیڈا)

یہ تبسم بھی کسے ملتا ہے

بیسویں صدی کے آخری دہے میں جہاں صدی کی مشہور ہستیوں کے دلچسپ واقعات کو یکجا کرنا اور ان کے انتخاب کا کام شروع ہوگیا ہے وہیں اس ریسرچ میں مشغول اس بات پر متفق ہیں کہ قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ، جنگ، سازشوں، بدعنوانیوں اور بدنامیوں وغیرہ سے بھرپور صدی کے آخری حصوں میں لطیفوں، قہقہوں، طنز و مزاح سے بھرپور لمحات فراہم کرنے میں کوئی اور نہیں بلکہ امریکہ کے صدر کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کے اسکینڈل کا بھی ہاتھ ہے ۔ کچھ دیر کے لئے انکے جنسی پہلو، تہذیب اخلاق سے گری ہوئی روزمرہ کی کہانیوں کو فراموش کردیں تو احساس ہوگا کہ اس اسکینڈل نے مفت تفریح کے ساماں بھی فراہم کردیے ہیں۔

کلنٹن لیونسکی کے بعض لطیفے نہ تو کسی اچھے فیملی میگزین میں شائع ہوسکتے ہیں اور نہ کسی شائستہ محفل میں دہرائے جاسکتے ہیں لیکن ان میں بعض شستہ و معیاری بھی ہیں اور برمحل بھی ۔ اسی اسکینڈل کے دوران بیس بال کی ٹی وی پر کامنٹری دینے والے مشہور مقبول ترین شخص مارون البرٹ ان کی بیوی اور گرل فرینڈ کے مثلث نے سارے امریکہ میں عدالت سے باہر ٹی وی اور اخبارات کی جلی سرخیوں میں جگہ لے لی ۔ یہ اسکینڈل بھی کلنٹن کے اسکینڈل سے کم نہ تھا کسی نے پوچھا کلنٹن کو اپنی کہانی اور صفائی سنانے میں کیوں دیر ہوئی ۔ جواب ملا صدر کو مارون البرٹ کے انٹرویو لینے کا انتظار تھا ۔ امریکہ کے اسکولوں اور کالجوں میں بڑھتی ہوئی جنسی بیماریوں، ٹوٹنے والی شادیوں اور کم عمر میں لڑکے اور لڑکیوں کا سیکس میں حصہ لینا ایک تعلیمی موضوع بنا ہوا ہے اور اسبات پر وقتاً فوقتاً کھلے عام یہ بحث ہورہی ہے کہ آیا ابتدائی اسکولوں میں سیکس کی تعلیم دی جائے ۔

صدر کے اس اسکینڈل میں وہائٹ ہاوز کے سب ہی کارندے و ملازم لپیٹ میں آگئے ہیں یہاں تک خبر آئی کہ صدر کلنٹن کا کتا BUDDY اپنی ایک پریس کانفرنس طلب کررہا ہے جس میں وہ یہ تجویز پیش کررہا ہے کہ صدر کو NEUTRATED کردیا جائے ۔ ہلیری کلنٹن سنا ہے کتاب لکھنے میں مشغول ہے جسکا عنوان ہوگا It takes a village to watch my husband اور جب کلنٹن وہائٹ ہاوز سے باہر آجائیں گے تب ہی ہلیری کلنٹن ایک اور کتاب شائع کریں گی جس کا نام ہوگا it takes a village idiot ۔ مونیکا لیونسکی اور صدر کلنٹن کے اسکینڈل کے بارے میں ایک عرصہ تک سارے اخبارات ٹی وی اور ریڈیو بھرے پڑے تھے ۔ خبریں، افواہیں کہانیاں اتنی گرما گرم تھیں کہ خبروں کی دنیا اس برق رفتاری میں پیچھے رہ گئی ۔ ہر تازہ چھپنے والی خبر باہر آنے تک جیسے ایک ہفتہ پرانی ہوچکی تھی ۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس ہنگامے کے وکیل کو بجلی کے بلب میں اسکرو کرنے میں کتنے مرحلے درپیش تھے ۔ ۴ سال اور ۴۰ ڈالر پھر بھی وہ اب تک اندھیرے میں ہے ۔

صدر کلنٹن اور رچرڈ نکسن میں کیا فرق ہے جواب ہے Nixon couldnt stop Kissinger Clinton could'nt stop kissing her ایک مقامی ڈپارٹمنٹ اسٹور نے گرینڈ جیوری کے آگے کلنٹن کے بیان کے اعزاز میں ایک

مخصوص سیل کا اہتمام کیا تھا جہاں مردوں کے سارے پتلون نصف قیمت HALFOFF تھے۔ امریکہ کا ہر صدر اپنے دور کے اختتام پر اپنے سارے کاغذات کی لائبریری بنا کر واشنگٹن ڈی سی میں مطالعے اور ریسرچ کے لئے دے دیتا ہے مگر صدر کلنٹن وہ پہلے صدر ہونگے جس کی لائبریری کا ایک سکشن صرف بالغوں کے لئے ہوگا۔ مغربی دنیا میں بچوں اور بڑوں کے کھیل کود اور پارٹیوں کا ایک کھیل بہت ہی مقبول ہے وہ ہے knock knock۔ پوچھا کون ہے۔ جواب آیا صدر کلنٹن۔ پھر آواز آئی کون صدر کلنٹن۔ آواز آئی ٹھیک ہے مونیکا اب تم گرینڈ جیوری کے آگے پیش ہو سکتی ہو صدر کلنٹن ایک طویل عرصے سے مڈل ایسٹ کے مسائل سلجھانے میں بے انتہا دلچسپی لے رہے ہیں کیونکہ سمجھتے ہیں غازہ strip ایک topless joint ہے۔

اسد اللہ خاں غالب تو بس اسی میں خوش تھے کہ وہ شیریں لبوں کی گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہ ہوئے۔ وہائٹ ہاوز کے بند دروازوں کے اندر کیا کیا ہوا کچھ سامنے آیا اور کچھ کے لئے اسکے در و دیوار گواہ رہ گئے لیکن قابل مبارکباد ہیں مونیکا لیونسکی اور صدر کلنٹن کہ اس عالم ناپائدار میں کسی کی بھی نہ بن سکی۔ زندگی کے چار دن چاہے آرزو میں کٹ جائیں یا انتظار میں مگر ہم جیسے تماشہ بینوں کے لئے کچھ لمحے مسرت اور تبسم کے بھی فراہم کر دیے ورنہ کیا ہے۔

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارہ

انصاری اصغر جمیل
فاروق نگر۔ ٹیکہ۔ ناگپور

فوٹو کھنچوانا بھی ایک ہنر ہے

آج کے ترقی یافتہ دور میں ویڈیو ریکارڈنگ ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزو ہے ۔ لیکن جناب ! ہر شخص کے پاس اتنی رقم کہاں کہ وہ اپنی نقل و حرکت کی ویڈیو ریکارڈنگ کرواتا پھرے ۔ اگر مان لیں ایسا ہوجائے تو دیوالی آنے سے پہلے ہی دیوالیہ نکل جائے ۔ اسلئے فوٹو کھنچوانا ہی سب سے آسان اور سستا نسخہ ہے ۔ فوٹو کھنچوانے کا سلسلہ ماں کی گود سے قبر کی گود تک جاری و ساری رہتا ہے ۔ بلکہ ہم تو ایسے بہت سے افراد کو بھی جانتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی فوٹو کھنچوانے سے باز نہیں آتے ۔

فوٹو کھنچوانے کے ہنر میں ماہر ہر ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی، عوامی اور نجی تقریب کا اپنے پاس ریکارڈ رکھتے ہیں ۔ وہ ہر تقریب میں موجود رہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور تقریب شروع ہونے سے قبل ہی نمایاں اور اہم نشست پر قبضہ جما لیتے ہیں بلکہ کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو منتظمین کے ساتھ مل کر اس طرح کام میں ہاتھ بٹانے لگتے ہیں گویا خود بھی تنظیم کے اہم رکن ہوں ۔ کبھی ڈائس پر کرسیاں ٹھیک کرتے ہیں اور کبھی منتظمین کے کانوں میں سرگوشیاں ۔ کبھی والینٹر کو ہدایت دیتے نظر آتے ہیں اور مدعوئین کو اکڑی ہوئی گردن اور زیرلب تبسم کے ساتھ یوں گھورتے ہیں جیسے باور کرا رہے ہوں کہ اس تقریب کا مکمل اہتمام ان ہی کا مرہون منت ہے ۔

کسی بھی تقریب میں فوٹو کھنچوانے کی جگہ کا انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ صدر تقریب کہاں براجمان ہوں گے ؟ مہمانان خصوصی کدھر ہوں گے ؟ منتظمین کس طرف ہوں گے ؟ فوٹوگرافر کس زاویہ سے فوٹو کھینچے گا ؟ پہلے ان سب باتوں کا بغور جائزہ لیا جاتا ہے اس کے بعد ایسی جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے جہاں سے ہر فوٹو میں نظر آنے کے امکانات روشن ہوں ۔

ایک اور طریقہ بھی ماہرین اپناتے ہیں ۔ وہ کسی بھی تقریب میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس فوٹوگرافر کو تلاش کرتے ہیں جو وہاں فوٹو اتارنے کے لئے مدعو ہے ۔ پھر اس سے دوستی بڑھاتے ہیں ۔ پرانی جان پہچان نکالتے ہیں ۔ کسی بہانے اسے تقریب گاہ سے باہر لاتے ہیں ۔ چائے پلواتے ہیں ۔ پان سگریٹ سے اس کی تواضع کرتے ہیں اور پھر باتوں ہی باتوں میں یہ باور کرواتے ہیں کہ اس تقریب کے وہ اہم ترین رکن ہیں ۔ اب چوں کہ فوٹوگرافر ان کی چائے کے بوجھ تلے دبا ہوتا ہے ۔ اسلئے چائے حرامی نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ جب فوٹو بن کر آتی ہے تو منتظمین اپنا سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں کیوں کہ ہر فوٹو میں "وہ صاحب" نمایاں نظر آتے ہیں اب ان کی نظروں کے سامنے تقریب کا سارا منظر گردش کرنے لگتا ہے ۔

ایک اور بھی ہنر ہے فوٹو کھنچوانے کا جو ماہرین کو بہت راس آتا ہے ۔ سامعین کی صفوں میں وہ خاموشی سے بیٹھے نہیں رہتے ۔ وہ بار بار اپنی نشست سے اٹھتے ہیں اور ہر نئے آنے والے مہمان کا استقبال یوں کرتے ہیں گویا محفل کے اہم رکن ہوں ۔ اسی طرز عمل سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ نئے آنے والے مہمانوں میں نہ جانے کون "وی ۔ آئی ۔ پی" ہو اور ان کے ہمراہ فوٹو کھنچ جانے سے وہ محروم رہ جائیں ۔ اس ہنر میں انہیں کسی شرمندگی کا احساس بھی نہیں ہوتا بلکہ منتظمین خوش رہتے ہیں کہ ان کا کام کسی حد تک کم ہوگیا ہے

ہر مہمان کو کرسی پر بیٹھانے کے بعد وہ فخر سے سینہ اسی طرح پھیلاتے ہیں گویا کوئی اہم معرکہ سر کیا ہو۔

فوٹو کھنچوانے کے لئے لباس کا بھی بڑا دھیان رکھا جاتا ہے۔ دراصل تقاریب میں ایسا لباس پہن کر جانا چاہئے کہ عام شخص کو محسوس ہو کہ آپ "مخصوص شخص" ہیں۔ ہمارے ناقص خیال میں کرتا، پائجامہ زیب تن ہو بشرطیکہ اس پر شیروانی بھی ہو۔ ویسے ان دنوں سفاری سوٹ کا چلن عام ہے۔ لیکن سفاری سوٹ پہننے سے شخصیت اتنی نمایاں نہیں ہوتی جتنی کہ شیروانی میں، پھر فوٹو میں شیروانی کا گیٹ اپ بہت ہی عمدہ آتا ہے۔ اگر اس پر جناح کیپ لگالی جائے تو سونے پہ سہاگہ کا کام دے گی۔ شیروانی پہننے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ حسب ضرورت اس کی بٹنیں کھولی اور بند کی جاسکتی ہیں۔ مزید یہ کہ کسی کے بھی ہمراہ فوٹو کھنچوانے سے کوئی مائی کا لعل روک بھی نہیں سکتا۔ فوٹو کھنچوانے کے دن اپنے لباس کو تہ کر کے الماری میں بند کردینا ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ لوگ ناعاقبت اندیشی میں اس کے برعکس عمل کرتے ہیں اور بجائے نفع کے نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان تقاریب کے جن میں فوٹو کھینچے جانے کا عمل متوقع ہو، دعوت نامے حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے کی طرح کم نہیں لیکن فوٹو کھنچوانے کے ماہرین کسی نہ کسی چالبازی سے حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو فوٹو کھنچوانے کے ہنر میں یکتا ہیں۔ انھوں نے اخبار والوں سے بھی خفیہ سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب اخبارات میں، کسی نہ کسی اہم شخصیت کے ہمراہ ان کا کوئی فوٹو نہ شائع ہوتا ہو۔ چاہے وہ کوئی سیاسی و ادبی تقریب ہو یا سماجی و مذہبی محفل۔ وہ ہر فوٹو میں کسی نہ کسی کونے میں دبکے ہوئے یا مہمان خصوصی کے پیچھے مسکراتے چہرے کے ساتھ ضرور نظر آئیں گے۔ یہ ان کے دعوت نامہ حاصل کرنے کا ہی کمال ہے۔

ہمارے ایک دوست اور ہیں جنھیں فوٹو کھنچوانے اور اس کی پبلسٹی کروانے کا جنون ہے۔ اس خبط کی وجہ سے انھیں کئی بار ذلتیں بھی اٹھانی پڑی ہیں لیکن ان کے جنون میں اب تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ موصوف ایک ٹٹ پونجیے لیڈر ہیں۔ غلطی سے ایک مرتبہ بلدیہ کا الکشن لڑلیا اور شومئ قسمت سے کامیاب بھی ہوگئے۔ ان کی اس کامیابی کے بعد بے چارے فوٹوگرافروں کے تو بھاگ ہی جاگ گئے۔ کوئی نہ کوئی فوٹوگرافر ہر وقت ان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا ہے۔ گھر کی دہلیز سے باہر قدم نکالتے ہی ان کے فوٹو کھنچوانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ چھینک رہے ہوں تو اس پوزیشن میں بھی ایک فوٹو اور کھانسنے کے اسٹائل کی فوٹو کھینچنا فوٹوگرافر کی ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ خدا نہ کرے کہیں وہ ان کی آخری چھینک ہو۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ وہ ایک ایسی ترکیب سے آشنا ہوئے ہیں، جس سے فوٹو میں شامل ہونے میں آسانی رہتی ہے۔ ہمارے بھی منہ میں پانی بھر آیا اور ہم پوچھ بیٹھے کہ آخر وہ کون سی ترکیب ہے؟ انھوں نے ترکیب یہ بتائی کہ کسی بھی تقریب میں اول نہ جائیے ذرا تاخیر سے جائیے بلکہ ممکن ہو تو تقریب گاہ سے باہر ہی انتظار کیجئے اور جیسے ہی کسی "وی۔ آئی۔ پی" کی کار آکر رکے، فوراً ان کے ہمراہ ہولیں، خود بخود آپ کی تصویر کھینچی چلی جائے گی۔ منتظمین سمجھیں گے کہ آپ وی آئی پی کے ہمراہ ہیں اور وی آئی پی سمجھیں گے کہ آپ منتظمین میں سے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ فوٹو کھنچوانے کے معاملے میں ہم بہت ہی بودے واقع ہوئے ہیں۔ معمولی سے معمولی شخص ہمارے سامنے فوٹو کھنچوا کر رفو چکر ہو جاتا ہے اور ہم اپنے بال سنوارتے، کپڑوں کی کریز درست کرتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جوں ہی فوٹوگرافر فوٹو کھینچنے کے لئے کیمرہ درست کرتا ہے، ہمارے پہلو میں بیٹھے ہوئے ہنر مند عین وقت پر ہماری گود میں اسطرح گرتے ہیں کہ لاکھ کوشش کے باوجود فوٹو میں ہمارا چہرہ نظر نہیں آتا۔ کس محفل میں کون کتنی دفعہ فوٹو کھنچواتا ہے یہ جاننے کے لئے ہم محفلوں میں اکثر بن بلائے پہنچ جاتے ہیں اور آپ یقین جانئے کہ یہ مشاہدہ ہمارے بہت کام آتا ہے۔ جس محفل میں سب سے زیادہ فوٹو کھنچوانے کے ہنر مند کی فوٹو کھینچی جائے اور منتظمین اس پر ہنگامہ آرائی کریں تو ہمارے نزدیک وہی محفل سب سے زیادہ مزیدار ہوتی ہے۔ ●

جہاں قدر چغتائی، بھوپال

مل کر چلیں گے

اردو ادب میں شاعروں کی کمی نہیں ۔ لیکن جو بات غالب کے کلام میں دیکھنے میں آئی وہ دوسرے شاعروں میں کم ہی ملتی ہے۔ حقیقت میں یہ غالب کا انداز بیان ہے جس کا اندازہ خود غالب کو بھی پوری طرح سے تھا ۔ لیکن ہم کو غالب کے انداز بیان کا تجربہ اس وقت ہوا جب ہم نے بچپن میں غالب کا یہ شعر پڑھا تھا ۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

لفظ آبرو ہم نے اپنے بچپن میں سنا تھا جب ہماری والدہ ایک لیڈی ڈاکٹر آبرو بیگم کو اپنی بیماری کا حال سنانے جایا کرتی تھیں ۔ اس وقت اس لفظ کو شاید ہم پوری طرح اپنی زبان سے ادا بھی نہ کر سکتے تھے ۔ بچپن بیتا لڑکپن گزرا پھر ہمارے کانوں کے سامنے سے یہ لفظ مدتوں نہیں گزرا ۔ ایک لمبی مدت کے بعد جب اخبار پڑھنے کے لائق ہوئے تو اس لفظ کے آگے "ریزی" لگا ہوا دیکھا پوچھا تو بتانے والا پہلے تو کچھ شرمایا پھر ایسے معنی بتائے جس سے ہم اور بھی الجھ کر رہ گئے ۔

ہمیں داغ دہلوی کی یہ بات کہ ـــ آتی ہے اردو زبان آتے آتے ـــ بہت پتے کی بات لگی ـــ اگر چہ ہمارا اوڑھنا بچھانا اردو رہی ۔ ہم نے اردو پڑھی زندگی بھر اردو پڑھائی ۔ مگر ہم سینہ تان کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو اردو زبان آگئی ۔ زبان کوئی بھی ہو یہ آتے آتے ہی آتی ہے ۔ اس لئے ہم اپنا شمار بھی اردو بولنے والوں میں ہی کرتے آئے ہیں ۔ زمانہ بدل گیا ہے ۔ ہماری نئی نسل جو ہمارے آس پاس رہتی ہے ہماری زبان ٹھیک سے نہیں سمجھتی ۔ ہمارے گھر اور خاندان میں ہم باتیں کرتے وقت اپنے کو غیر ملکی کی طرح اجنبی سمجھنے پر مجبور ہو چکے ہیں ۔ ادبی جلسوں میں ہم اس لئے شرکت کرتے ہیں کہ دیکھنے والے یہ جان لیں کہ اردو باقی ہے ، اردو داں طبقہ ہندوستان میں موجود ہے ۔

ہندوستان کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو یاد کیا جاتا ہے ۔ ایسے جلسوں میں حاضرین کی تعداد اتنی کم کہ لفظ "تعداد" پورے معنی دینے میں کوتاہی محسوس کرتا ہے ۔ سر سید احمد خان کو بڑے شاندار طریقے پر ہر سال یاد کیا جاتا ہے ۔ تقاریر ہوتی ہیں ۔ ڈنر ہوتا ہے ۔ عالم و فاضل لوگ پر مغز مقالے پڑھتے ہیں جو لوگ باہر سے بلائے جاتے ہیں ان کو آنے جانے کا ہوائی جہاز اور فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کیا جاتا ہے ۔ مقامی بڑے ادیب ان مہمانوں کے سامنے اپنا قد چھوٹا کر لیتے اور ان مہمانوں کو نہایت انکساری کے ساتھ مقالہ نویسی کی اجرت پیش کی جاتی ہے لیکن یادگار جلسے میں مقالہ سنتے وقت اکثر سامعین سوتے پائے جاتے ہیں چاہے وہ یادگاری جلسہ ہال میں دس بجے دن کو ہی کیوں نہ منعقد کیا گیا ہو ۔

ہر زبان میں لفظ آتے جاتے رہتے ہیں ۔ اردو زبان میں کسی زمانے میں یہ لفظ آبرو شان و شوکت اور عزت کے معنی میں استعمال ہوتا ہوگا جیسا کہ اس شعر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ۔

کیا آبرو عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ لفظ ترک تو نہیں کیا گیا، پس پشت ضرور ڈال دیا گیا۔ ابھی چند دن کی بات ہے کہ ہمارے ایک اردو داں دوست جو ہندوستان کے باہر سفر کرتے رہتے ہیں ہم سے غصہ کے انداز میں فرمانے لگے جب سے ہندوستانی روپیہ کی آبرو ریزی ہوئی ہے ہوائی جہاز کا سفر مجھ کو بہت مہنگا پڑنے لگا ہے۔ ان کی پریشانی کا سبب ہماری سمجھ میں آگیا۔ وہ ہندوستانی روپیہ کی ڈی ویلیوئیشن (ان مولن) کا رونا رو رہے تھے۔ غالب اب سے سو سال پہلے اپنے محبوب کے گھر سے بے آبرو ہو کر نکلے تھے مگر ہمارے ملک کے اندر ہمارے ملک کا سکہ یعنی روپیہ بے آبرو ہو گیا اور وہ بھی اس طرح کہ سو پیسہ کا تھا دو پیسے کا رہ گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ روپے کی آبرو کم ہونے سے اس ملک کے باشندوں کی بھی آبرو کم ہو گئی ہے یہاں تک کہ سلسلہ کسی وزیر اعظم کی آبرو تک پہنچ سکتا ہے۔

انگریزوں کے رواج میں ایک چھوٹا سکہ چلا کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے سکہ کا نام تھا چھدام۔ ایک پیسے کے بدلے اس وقت چار چھدام ملتے تھے۔ کیا با آبرو تھا۔ یہ سکہ۔ اس سکہ پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر ہوتی تھی۔ ایک چھدام بھڑ بھونجے کو دو جھولی بھر بھنے چنے کرتے کے دامن میں بھر کر بیٹھ جاؤ خود کھاؤ دوستوں کو کھلاؤ پھر بھی بچ جائیں تو فقیر کی جھولی میں ڈال دو اور گھر کو سدھارو۔ ہم تو خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے خدا ہمارے ملک کے ہر شہری کو وہ عزت و آبرو عطا کر جو تو نے انگریزوں کے زمانے میں چھدام کو دے رکھی تھی۔ یہ سچ ہے کہ چھدام کے دور اقتدار میں ملک کے باشندوں کی بھی بہت عزت و آبرو تھی۔ آپس میں محبت تھی بھائی چارہ تھا ہمدردی تھی خیال تھا ایک دوسرے کا لحاظ تھا۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر ہم نے مان لیا ہے پیسہ کی آبرو کم ہو تو عزت سادات بھی باقی نہیں رہتی۔

اتنی باتیں ہمیں اس لیے کرنی پڑیں کہ کل ہم جب شہر کے بڑے بازار سے گزر رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ میونسپل کے کامگار دوکان کے نیچے کی نالیاں صاف کر کے سڑک کے کنارے کیچڑ کا ڈھیر لگاتے جا رہے تھے۔ کیچڑ کے ایک ڈھیر میں دس اور پانچ پیسے کے دو چار سکے بھی چمکتے جوتے کے ایک دوکاندار کی نظر میں آئے۔ اتفاق سے ایک فقیر ہاتھ پھیلائے بھیک مانگتا دوکان کے پاس سے گزر گیا۔ جوتے کے دوکاندار نے بڑی ہمدردی کے لہجے میں فقیر کو اپنے پاس بلایا اور کیچڑ کے اس ڈھیر پر پڑے چمکتے سکوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس فقیر نے ڈھیر پر پڑے ان سکوں کو پل بھر دیکھا اور بولا یہ میرے کام کے نہیں ہیں۔ آپ کے پاس ایسے بہت سے سکے رکھے ہوں گے ان سکوں کو ان سکوں میں ملا کر چلا لینا۔ ان سکوں میں کوئی سکہ اکیلا نہیں چلتا۔ ہم نے سوچا ہم اٹھا لیں مگر فقیر کا قول یاد آگیا کہ کوئی اکیلا نہیں چلتا۔ کبھی کبھی یہ فقیر بھی تجربہ کی بات کہہ جاتے ہیں۔ پھر ہمیں یاد آئی سفید ٹرانس پیرینٹ سیلوٹیپ میں لپٹی ایک چھوٹی سی چیز جو سبزی کا ٹھیلے والا دروازے پر ہماری بیگم کو دے گیا تھا جو ہماری انہوں نے غصہ میں ہمارے ہاتھ پر یہ کہتے ہوئے رکھ دی تھی دیکھو تمہارا چہیتا سبزی والا یہ کیا دے گیا ہے دراصل وہ چار چونیاں تھیں جو سفید سیلوٹیپ میں جوڑ کر روپیہ بنا دی گئی تھیں۔

دو پیسے کا ایک سکہ تانبے کا ہم نے بازار میں چلتا دیکھا ہے۔ اگر وہ پرانے سکے آج سو سوا سو سے زیادہ ہوتے تو ہم آج صد پتی تو ہو ہی جاتے۔ ملکہ وکٹوریہ کا ہندوستانی روپیہ اگر جمع کر کے پاس رکھ لیتے تو ایک روپیہ کے ساٹھ پینسٹھ روپے پا لیتے۔ اگر شہروں کے نام بدلنے سے فائدہ ہوا ہے تو کرنسی کا نام بھی بدل دیا جاتے مگر سکے کی آبرو ریزی نہ کی جائے۔

اس ساری کہانی میں بس ایک بات فقیر کی اچھی لگی اور وہ بات یہ تھی کہ ہندوستان کا سکہ اکیلا نہیں چلتا۔ سو پیسے ہوں تو روپیہ بن کر چلتے ہیں۔ ہم اگر فقیر کے قریب ہوتے تو اس سے یہ ضرور کہتے کہ بابا۔ ہندوستان میں سکے تو مل کر چلنے لگے ہیں وہ دن بھی آتے گا جب ہم سب آپس میں مل کر چلنے اور رہنے لگیں گے۔؟ ☆

پروفیسر حبیب ضیا

مصنف : ڈاکٹر طیب انصاری

"تبصرہ و تجزیہ"

ذہین طالب علم اور ممتاز نقاد طیب انصاری ...... ادبی دنیا برسوں سے اس نام سے آشنا ہے زمانہ طالب علمی ہی سے انھوں نے اپنی ذہانت سے اساتذہ اور ساتھی طلباء کے دل موہ لئے فعال شخصیت کے مالک ہیں چنانچہ اسکول اور کالج کی مختلف ادبی تنظیموں کے سربراہ رہے چادر گھاٹ ہائی اسکول کی بزم اردو کے صدر ، اسکول میگزین کے نائب مدیر ۔ انوارالعلوم کالج میگزین کے ایڈیٹر ، عثمانیہ یونیورسٹی بزم اردو کے صدر ۔

نومبر ۱۹۶۷ء میں وہ کالج کے طالب علم کی حیثیت سے نکل کر گلبرگہ کالج میں اردو اور فارسی کے استاد بن گئے ۔ میں حساب میں شروع ہی سے کمزور ہوں ۔ اسکول میں یہ میرا ناپسندیدہ مضمون تھا ۔ لیکن جہاں کسی کی عمر کا ذکر ہوتا ہے اور جب معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر عمر غلط بتائی گئی تو میرا قلم حرکت میں آجاتا ہے طیب انصاری نے ایسا کچھ نہیں کیا ۔ تاریخ پیدائش میں کوئی ہیر پھیر نہیں ان کے استاد بننے کی تاریخ یعنی ۱۹۶۷ء میں سے تاریخ پیدائش ۱۹۴۱ء کو منہا کیا تو ۲۶ کا عدد ہاتھ لگا ۔ دوبارہ جانچ کرلی ۔ طیب انصاری صرف ۲۶ سال کی عمر میں اردو اور فارسی کے استاد بنے ۔ اور بہت جلد ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے پروفیسر اور پھر پرنسپل بن گئے ۔ ان مدارج کو دیکھ کر ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ حسد کرتے ہوں گے ۔ حسد نہیں تو رشک ۔ واقعی رشک آتا ہے ایسی ترقی دیکھ کر ۔ تیس سال میں ۲۱ کتابیں شائع کروانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ۔ طیب انصاری کا اردو زبان و ادب سے والہانہ لگاؤ ہے کہ وہ مسلسل لکھتے ہیں ۔ طیب سے ان کے لئے راہیں ہموار ہوتی ہیں ۔ کئی کتابوں پر ایوارڈ مل چکے ہیں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔

تبصرہ و تجزیہ اکیسویں کتاب ہے جس میں طیب انصاری نے مختلف کتابوں پر جامع تبصرے کئے ہیں ۔ ان میں بیشتر روزنامہ سیاست میں شائع ہوچکے ہیں ۔ تبصرہ نگاری بظاہر بہت آسان لیکن در حقیقت بڑا مشکل فن ہے ۔ تبصرہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر جانب دار رویہ اختیار کرے ورنہ یا تو قصیدہ گوئی ہوگی یا پھر ہجو ۔ مراسم ، روابط ، بزرگی کا خیال کئے بغیر قلم اٹھانا ہوتا ہے ۔ طیب انصاری نے ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھا ہے ۔

ایک خصوصیت جو انھیں دوسرے تبصرہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ تبصرہ کرنے سے پہلے وہ تمہید کے طور پر کسی مخصوص صنف ادب یا مصنف کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں ۔ اقبال انصاری کے افسانوں کے مجموعے " عورت " پر تبصرہ کرنے سے قبل انھوں نے اردو افسانے کے ارتقاء کا مختصر جائزہ لیا ہے ۔ اسی طرح رشید الدین کی کتاب " علامہ حیرت بدایونی " کے جائزے سے قبل علامہ کے بارے میں بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں ۔

" علامہ حیرت بدایونی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ۔ مزاج میں بھی یکرنگی نہیں تھی ۔ قوس قزح کے رنگ تھے ۔ وہ بچوں میں بچے ، جوانوں میں جواں اور بوڑھوں میں تو جواں تھے ۔ جیسے جیسے ان کی عمر ڈھلتی گئی ویسے ویسے ان کی جوانی پلٹ کر آتی گئی ۔"

آگے سطروں میں لکھتے ہیں کہ ان کی اولاد میں موئید حسن، جیلانی بانو، افضل محمد اور احمد جلیس ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کے معتبر نام ہیں۔ کتاب میں شامل ایسے کئی تبصرے ہیں جن میں تبصرہ نگار نے کسی شاعر یا ادیب یا صنف سخن کے بارے میں لکھ کر قاری کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ یہ ان کے وسعت مطالعہ اور ادب پر گہری نظر کا واضح ثبوت ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "سلیمان اطہر جاوید کی شاعری ذوقیہ ہے شوقیہ نہیں ـــ جب جب شعر کی آمد ہوئی یا موڈ آیا کچھ کہہ دیا"

شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاعر کے کلام سے جگر مراد آبادی اور صفی اورنگ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے تقابلی مطالعہ کر کے شاعر کے اصل مقام کا تعین کیا ہے۔ کسی مصنف اور اس کی کتاب پر لکھتے ہوئے اپنی رائے کے علاوہ کسی اور نقاد کا اقتباس یا جملہ بطور سند نقل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی کتاب حیدرآباد میں اردو زبان کی ترقی پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے حوالے سے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی کتاب کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر مسعود حسین خاں ماہر لسانیات ہیں اور لسانیات کے استاد بھی۔ ہم نے مقدمہ تاریخ زبانِ اردو ان ہی سے پڑھی ہے لسانی شعور ان ہی کی دین ہے۔ اگر وہ مصطفیٰ کمال کی اس تحقیق سے مطمئن ہو کر کہتے ہیں یہ مصطفیٰ کمال کا تحقیقی کارنامہ دکن میں اردو کی تاریخ کے لئے ایک دستاویز کا حکم رکھتا ہے" ـــ تو یہ ایک جملہ مصطفیٰ کمال کے لئے سند کا حکم رکھتا ہے۔

طیب انصاری کو جب غصہ آتا ہے تو پتہ نہیں وہ گھر میں کیا کرتے ہوں گے۔ روزانہ ایک گلاس یا رکابی پٹک دیتے ہوں گے۔ لیکن تصنیف و تالیف، زبان ادب کے معاملے میں کسی مصنف یا کسی تحریک کے نام لیوا پر بگڑ جائیں تو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سارا غصہ کاغذ پر اتارتے ہیں جب تک کہ قلم کار راہ راست پر نہ آجائے۔ جدیدیت کے سخت مخالف بلکہ کٹر دشمن ہیں۔ تبصروں میں جہاں جہاں ممکن ہوسکا انھوں نے جدیدیت کی مخالفت کی ہے۔ اس کی خامیاں گنائی ہیں۔ کسی شاعر یا ادیب کے پاس جدیدیت نہیں ملتی تو وہ مسرور نظر آتے ہیں۔

حمید سہروردی کی کتاب بین السطور پر تبصرہ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعلان کردیا ہے "مجھے عام طور پر جدیدیت سے ہی نفرت ہے اس رجحان نے بہت سے ذہین اور باشعور فنکاروں کو ہم سے چھین لیا ہے۔"

اقبال انصاری کے افسانوں کے مجموعے "عورت" پر تبصرہ کرنے سے قبل چند مشہور افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "جدیدیت کے نام پر جو افسانے لکھے گئے ان کی سڑاند نے آج بھی افسانے کی فضاء کو پراگندہ بنائے رکھا ہے" صلاح الدین نیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں اگر نیر نے جدت کے نام پر لفظوں کا حلیہ بگاڑا نہیں ہے تو یہ ان کی خامی نہیں خوبی ہے۔ جدیدیت ان کے خیال میں گمراہ کن مہمل اصطلاح ہے۔

مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب ہر لحاظ سے عمدہ تبصرہ نگاری کا بے مثل نمونہ ہے۔ ان تبصروں سے جہاں متعلقہ کتاب یا مصنف کے بارے میں آگہی ملتی ہے وہیں تبصرہ نگار کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ طیب انصاری کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور اسلوب نہایت دلکش۔ اس سے تبصروں کی اہمیت اور قدر اور بھی بڑھ گئی ہے۔

آخر میں ایک بات کی وضاحت کردوں۔ آج طیب انصاری اور ان [illegible]

وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی سالی خالدہ اسکول میں میری ہم جماعت تھیں یا بیگم منیر طیب انصاری میری چھوٹی بہن کے ساتھ تھیں۔ یہ بھی نہیں کہ گذشتہ چند سال قبل گلبرگہ میں منظور وقار کی کتاب کی رسم اجرا کے موقع پر طیب انصاری کے گھر شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ طیب انصاری نے فون پر اپنی کتاب کی رسم اجرا کا ذکر کر کے، تبصرہ کرنے کے لئے پرخلوص دعوت دی ان کے اسی خلوص کی بناء پر میں نے اس ادبی جلسے میں شرکت کی ہے۔ (یہ تبصرہ جلسہ رسم اجرا میں پڑھا گیا)۔☆

بے چارہ

کسی مشاعرے میں حفیظ جالندھری اپنی غزل سناتے سناتے چراغ حسرت سے مخاطب ہو کر بولے۔

"حسرت صاحب! ملاحظہ فرمائیے، مصرع عرض کیا ہے"

اور حسرت صاحب حفیظ صاحب کا مصرع سننے سے پہلے ہی نہایت بے چارگی سے کہنے لگے۔

"فرمائیے حضرت شوق سے فرمائیے۔ اپنی تو عمر ہی غزلوں کے مصرعے اٹھانے اور مردوں کو کندھا دینے میں کٹ گئی ہے"۔

دسے کے خط.....مراسلے

محترمی مصطفیٰ کمال صاحب

آداب۔ امید ہے مزاج گرامی شگفتہ ہونگے۔ کبھی کبھی آپ اپنی نوازشوں کی بارش برساتے ہوئے کچھ بوندیں "شگوفے" کی شکل میں برسادیتے ہیں۔ جب ۲۰۲ ماہ تک انتظار کرنے کے بعد رسید تک نہیں آتی تو آپ کے صبر کا دامن لبریز ہوجاتا ہے اور نتیجے کے طور پر آپ "شگوفہ" کی روانگی ملتوی کردیتے ہیں کہ کہیں زیادہ شگفتگی سے ہمارا معدہ ہی نہ خراب ہوجائے۔ بہر حال شکر گزار ہوں اس بہانے آپ کبھی کبھی یاد کرلیتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا مضمون "ویراپن کبھی ہمیں بھی اغواء کرو" معرکے کی چیز ہے اس سے متاثر ہوکر ویراپن تو چل کر دلی نہیں آیا البتہ ہاسٹل والے ضرور اسے اغواء کرکے لے گئے اور اب رہائی کے لئے مل کی صورت میں ایک بڑی رقم طلب کررہے ہیں۔ "ٹوٹے گھٹنا اور پھوٹے آنکھ" کا محاورہ تو سنتے آئے تھے لیکن "ٹوٹے گھٹنا اور پھٹے جیب" کا محاورہ اب مجتبیٰ پر صادق آرہا ہے۔

عابد معز صاحب کو پڑھا۔ ماشاء اللہ ان میں وہ سب جراثیم موجود پائے جو مزاح نگار کو چین نہیں لینے دیتے۔ فضل جاوید صاحب نے "نزیش کمار شاد۔ حالی اور میر کے ساتھ" لکھ کر دل خوش کردیا پڑھکر تشنگی باقی رہتی ہے۔ پرویز ید اللہ کی "سنگ لیلیٰ کی انیسویں قسط" تفتیش کے تیتر بیٹر" میں انھوں نے ہمارے ملک کی پولیس کی حقیقی صورت پیش کردی ہے۔ حصہ غزل میں اقبال شانہ، مرزا کھونچ اور رؤف رحیم کی غزلیں معیاری ہیں۔ کوثر صدیقی کے ماہیے واقعی "دل کو چھوتے ہیں" مثلاً مضبوط پکڑ لونگی۔ پیار سے میں اس کو۔ بانہوں میں جکڑ لونگی۔ دروازہ لگادونگی۔ آج وہ آیا تو۔ بجلی بھی بجھادونگی۔

خصوصی طور پر اگر گوشہ یونس بٹ کا ذکر نہ کیا جائے تو حق ادا نہیں ہوگا۔ رشید انصاری کا مضمون "یونس بٹ سے ملاقات" اور علیم خاں فلکی کا مضمون "طنز و مزاح کی نئی آواز" اور یونس بٹ صاحب کے مضامین جن میں کوٹ کوٹ کر بذلہ سنجی بھری ہوئی ہے، کو پڑھکر گوشے کی خوبصورتی کا احساس ہوا اس کے لئے یقیناً آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نیاز مند

(کے ایل) نارنگ ساقی، نئی دلی

نے شگوفہ ہر ماہ دیکھنے کی خواہش بھی کی ہے اور کہا کہ پاکستان میں مزاح کے میدان میں مستقل مزاجی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی پرچہ پانچ دس سال سے زیادہ کی عمر نہیں پاتا اس کے علاوہ اتنے بڑے ملک میں مزاح میں پابندی سے لکھنے والے انگلیوں کی بے حد کمی ہے۔ جو ہیں وہ ٹی وی اور فلموں کی نذر ہوجاتے ہیں اس صنفِ ادب کو باقی رکھنے کے لئے خصوصی توجہ کرنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں۔

علیم خان فلکی، جدہ

محترم مصطفیٰ کمال جی۔ آداب و نیاز

آپ کا تحریر نامہ ایرگرام دستیاب ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹپہ خانے نے اسے بجائے ہوائی جہاز کے سمندری جہاز میں سوار کردیا تھا۔ تبھی تو خراماں خراماں چلا آیا۔ شکر ہے کہ پہنچ گیا۔ ایک عرصہ دراز بعد آپ نے اپنے قلم کو جنبش دی۔ مسرت ہوئی۔ شکریہ۔ پچھلی صدی نے جاتے جاتے اپنے جوہر دکھلائے۔ مجھے سراپا سفید لباس میں ملبوس کردیا۔ سید غیاث الدین کی اچانک رحلت نے زندگی کی کایا پلٹ کر رکھدی۔ ادب یا ادبی کاموں سے دور رہی۔ ہم لوگوں نے ہجرت کرکے معاشی و سماجی بحران یا سیاسی بے چینیوں سے نجات حاصل کی تو کیا ہوا۔ قصے اور بھی ہیں غم جہاں کے۔ تیغ کے منزل پر آنکھ بھر آئی۔ یہاں کی زندگی آج کے دور میں اپنی تہذیبی اقدار کا خاموشی سے مکالمہ کررہی ہے۔

طنز و مزاح میں کام کرنے والوں میں آپ کی واحد ذات ہے جو سارے ہندوستان میں قابل فخر ہے۔ اس روتی دنیا میں ترسیل مسرت کا ذریعہ ایک نام ہے جو شگوفہ کہلاتا ہے اور یہ آپ کی سعی اور پیہم جدوجہد کا بلا شبہ تاریخی کارنامہ ہے۔ خدا آپ اور پرچہ دونوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔

دو عدد ادبی کتابوں کا جنم ہوا ہے۔ اگسٹ میں نسیم کلثوم نسیم کی دوسری کتاب غزلوں کا مجموعہ لفظ لفظ غم، افکار نسیم کے بعد شائع ہوئی۔ دو ملک ایک کہانی افسانوی مجموعہ بقلم ڈاکٹر محمد مظفر فاروقی۔ جشن مظفر فاروقی ۳۔ اگسٹ کی شام معہ عشائیہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر سووینیر بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ بہرکیف یہاں اردو کی سرگرمیاں جاری ہیں۔

بقیہ پھر

خورشید سلطانہ غیاث الدین، 911-60103 یو ایس اے

محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب، مدیر شگوفہ

السلام علیکم؛ آپ کی عظیم خدمات کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر یونس بٹ نے ایک [illegible] اس بات پر بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ خالص مزاح کا ایک پرچہ تیس سال سے حیدرآباد سے نکل رہا ہے۔ انھوں

محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب، السلام علیکم

امید کہ آپ حسب معمول صحت مند اور چاق چوبند ہوں گے۔ شگوفے برابر کھل رہے ہیں۔ ماشاء اللہ پرانے اور نئے طنز و مزاح نگار خوب

لکھ رہے ہیں ۔ آپ نے انھیں ایک پلیٹ فارم مہیا کیا ہوا ہے ۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے ۔ (آمین) ۔ پتہ چلا کہ پروفیسر آفاق صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی ۔ مجتبیٰ حسین صاحب کے گھٹنے کا آپریشن ہوا ۔ نیک خواہشات کا اظہار کرنے والوں میں میرا نام بھی شامل کرلیجئے ۔ پرویز ید اللہ مہدی امریکہ میں خوب نیوز میں رہے ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ۔

فضل جاوید ۔ حیدرآباد

برادر محترم سید مصطفیٰ کمال صاحب زید مجدکم

تسلیمات و تحیات

ڈاکٹر محمد یونس بٹ کو پڑھ رہا ہوں ۔ بہت جاندار نثر نگار ثابت ہوں گے ۔ طنز کی کاٹ ہوتی ہے ۔ ان پر نظر رکھئے ۔ ان کا کوئی مضمون یا کالم چھپنے سے نہ رہ جائے ۔ یہ کام صرف آپ انجام دے سکتے ہیں ۔ روزنامہ منصف میں آپ کا اعمال نامہ باصرہ نواز ہوا ۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آپ نے بھی بہت دوڑ دھوپ کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے ۔

فاضل قریشی ، اورنگ آباد

مکرمی

پچھلے شمارے میں یونس بٹ صاحب کو پڑھا ۔ بڑا لطف آیا ۔ ایک طرح سے احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا ۔ آج کل اچھا ادب تو صرف اس پار لکھا جارہا ہے ۔ میری طرف سے اس بہترین انتخاب پر مبارکباد قبول فرمائیے ۔

آپ کا

احمد علی نفیس ، گلبرگہ شریف

مکرمی

شگوفہ میں ظفر کمالی صاحب کی نظم " خفیہ ایجنڈا " بہت ہی خوب ہے ۔ میری طرف سے انھیں بہت بہت مبارکباد پیش کردیں ۔ اتنی سچی اور بے باک حقیقت کے لئے میں تو صرف ایک شعر کہہ کر رہ گیا تھا

مرغانِ چمن چپ ہیں غزالاں ہیں ہراساں
صیاد کو گلشن کی نگہبانی ملی ہے

پرچہ آپ کی کاوشوں کا آئنہ دار ہے ۔ مضامین کے معیار کو آپ نے برقرار رکھا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگے رہتے ہیں ۔ جو اس دور میں یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔

نیاز کیش

مظفر عالم ضیاء عظیم آبادی

●☆●☆●

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

انگریزی کے استاد اور اردو کے نامور ادیب و محقق ڈاکٹر سید حامد حسین کا ۲۶ ۔ اکتوبر کی شب اندور میں انتقال ہوگیا ۔ حامد حسین صاحب نے معاشیات اور پھر انگریزی میں ایم اے کیا اور ای ایم فورسٹر کی ناول نگاری پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ گو کہ انگریزی کے پروفیسر تھے ، لیکن اردو میں وہ مسلسل لکھتے رہے اور ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں ۔

علمی و تحقیقی کاوشوں کے علاوہ ڈاکٹر حامد حسین کو طنز و مزاح سے خاص رغبت تھی ۔ ان کے کئی مضامین اور ڈرامے شگوفہ میں شائع ہوچکے ہیں ۔ حیدرآباد کا وہ دو تین بار دورہ کرچکے تھے ۔ ان کے اعزاز میں شگوفہ کی جانب سے محفلیں بھی آراستہ ہوئی تھیں ۔ وہ بے حد منکسر المزاج ، پر خلوص اور سادہ انسان تھے ۔ ایک معتبر محقق و ادیب اور شگوفہ کے مشفق ، مہربان و ہمدرد کے انتقال پر ہم دلی رنج و ملال کا اظہار کرتے اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں ۔

نامور ادیب پروفیسر شفیقہ فرحت کی اعانت سے ماہنامہ شگوفہ بہت جلد ڈاکٹر حامد حسین کو خراج عقیدت پیش کرے گا ۔

شگوفہ کا آئندہ شمارہ سالنامہ ہوگا ۔ قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ اپنی تخلیقات جلد سے جلد ارسال فرمادیں ۔

R.N NO. 15822/68

SHUGOOFA
HYDERABAD

Postal Regd. No. H/HD.

Vol. 33 Copy : 12

Ph : 4745716

Dec 2000